DUE DATE

Acc No. 124628

1941 No. 2

Vol. 2.3

(Urdu Serial)

Saqi (Delhi)

ساقی

امریکن سائنسدانوں نے آبِ حیات ڈھونڈھ نکال

سدا جوان رہنے کا آسان طریقہ

موڈرن سائنس کا معجزہ

ہرمون اور وٹامن دریافت کرنے کے بعد بھی سائنس دائمی جوانی کا کوئی کامیاب طریقہ دریافت نہ کرسکی۔ لیکن اب دنیا کو ڈاکٹر ہرشفیلڈ ایم ڈی۔ کا شکرگذار ہونا چاہیے کہ انھوں نے انتہائی جدوجہد اور ریسرچ کے بعد افریقہ کے ایک درخت سے ایسا ایلکلائڈ دریافت کیا ہے جو انسان میں ہمیشہ جوانی قائم رکھ سکتا ہے۔ اس کے تجربات سیکشویل سائنس انسٹی ٹیوٹ اوف برلن امریکہ اور یورپ کے دیگر ممالک میں کئے گئے جس سے شاندار اور حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی۔

اس جادو اثر آب حیات کا نام اوٹون" **Otone** " ہے جسے سلور ڈراپ (SILVER DROPS) میں پیش کیا گیا ہے۔

اوٹون کے سلور ڈراپ کھانے کے بعد آپ اپنے جسم میں ایک خوشگوار اور دل خوشکن تبدیلی محسوس کریں گے۔ چہرے کی جھریاں غایب ہو جائیں گی۔ بدن کی جلد پر شباب کی تروتازگی اور ملائمت آجائیگی رخسارے گوشت و خون سے بھر کر کشمیری سیب کی طرح دکنے لگیں گے چہرہ پر حسن و جوانی کی شادابی اور نورانیت اپنی پوری رعنائیوں سے ظہور پذیر ہوجائیگی۔ اور آپ اپنی اصلی عمر سے بہت کم عمر کے نظر آنے لگیں گے۔ مثلاً آپ پینتالیس سال کے ہیں تو پچیس سال کے معلوم ہوں گے

اوٹون کے سلور ڈراپ مندرجہ ذیل شکایتوں کا حکمی علاج ہیں۔

خون کی کمی۔ دماغی و جسمانی کمزوری۔ سر کا چکرانا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آنا چڑچڑاپن۔ دل کی دھڑکن۔ بے تکا موٹاپا۔ ذیابیطس۔ دمہ۔ نابینائی۔ بھوک نہ لگنا جلد تھک جانا۔ دائمی قبض۔ سانس کا پھولنا۔ بالوں کا قبل از وقت سفید ہوجانا یا گرنا۔ کمر کا درد۔ ضعف گردہ، مثانہ۔ ضعف اعضائے رئیسہ رئیی۔ دل۔ دماغ۔ جگر کی کمزوری) اور مردانہ و زنانہ جنسی امراض کو آناً فاناً دور کر دیتے ہیں۔

اوٹون کی آب حیات تاثیرات کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنا صحیح وزن کرائیں۔ اور ایک فوٹو بنوائیں ایک ہفتہ استعمال کے بعد پھر اپنا وزن کریں اور فوٹو لیں اس سے آپ کو اس دوا کی حیرت انگیز تاثیرات کا اندازہ ہوگا۔

اوٹون کے سلور ڈراپ عورتیں بچے۔ بوڑھے ہر موسم میں استعمال کرسکتے ہیں۔ اس کے لئے کسی موسم یا عمر کی قید نہیں ہے۔

15,000 روپیہ کا نقد انعام

اوٹون ریسرچ لیبارٹری اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ اگر کوئی فرد یا ادارہ یہ ثابت کردے کہ اوٹون کی آب حیات تاثیرات کسی حیوانی ہرمون یا وٹامن کی موجودگی کا باعث ہیں تو ہم اسے مبلغ ۱۵۰۰۰ ہزار روپیہ کا انعام دیں گے۔

اوٹون کے سلور ڈراپ کی اصلی قیمت ممالک غیر میں بارہ روپیہ ہے۔ لیکن ہم نے اسے ہندوستان میں رائج کرنے کے لئے اس کی قیمت کچھ مدت کے لئے تین روپیہ آٹھ آنہ رکھی ہے کہہ سکتے کہ اوٹون لیبارٹری کب اس کی قیمت میں اضافہ کردے۔

...one An Ideal and Unique Preparation for Rejuvination

...xir of Life

...ER DROPS

سول ڈسٹری بیوٹرز

میسرز گرانڈ فارمیسی (S. D.) پوسٹ بکس...

تار کا پتہ "اوٹون" کلکتہ۔ ٹیلیفون۔ بڑا بازار...

Sole Distr...ors S. D.

...D PHARM...

...BOX 23

...ALCUTTA

ہر سال ساقی کے دو خاص نمبر شائع ہوتے ہیں۔ مستقل خریداروں سے ان کی قیمت الگ نہیں لی جاتی

جرعات

ساقی ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے۔ چندہ سالانہ پانچ روپے ششماہی تین روپے مع محصول ڈاک ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ

جلد ۲۳ | ساقی دہلی۔ بابت فروری سنہ ۱۹۴۱ء | نمبر ۲

قیمت فی پرچہ چھ آنے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

سالنامہ ساقی کے متعلق اکثر خواتین و حضرات نے توصیفی خطوط لکھکر ہماری حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ ہم ان سب کے شکر گذار ہیں کہ انہوں نے اپنی رائے سے مطلع فرمایا۔ بعض حضرات نے ہمیں مفید مشورے بھی دئے ہیں اور چند خطوط ایسے بھی موصول ہوئے ہیں جن میں صرف نکتہ چینی کی گئی ہے۔ ہماری رائے میں عیب جوئی سے بہتر یہ ہے کہ محاسن کی تلاش کی جائے۔ عیوب کو اگر چشمِ حسود کے لئے چھوڑ دیا جائے تو مناسب ہوگا ؂:-

عیب بیں عیب، ہنرمند ہنر دیکھتے ہیں

آپ اس نظر سے سالنامے کو دیکھیں کہ گزشتہ سالناموں اور اپنے ہمعصروں میں کیسا رہا۔

سالنامہ کے لئے مضامین کئی کئی مہینے پہلے سے فراہم کئے جاتے ہیں۔ اسکے باوجود بعض اچھے مضامین کے لئے ہمیں آخر تک منتظر رہنا پڑتا ہے۔ اور جب یہ مضامین موصول ہوتے ہیں تو اکثر لکھے لکھائے مضامین رد کرنے پڑتے ہیں۔ کاتبوں سے انہیں مارا مار لکھوایا جاتا ہے اور عجلت ہی میں انہیں چھاپ دیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ رسالے کی ترتیب خراب ہوتی ہے۔ کتابت کی غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ کیونکہ تصحیح جیسی کہ ہونی چاہئے نہیں ہوسکتی اور چھپائی بھی صاف ستھری نہیں ہوتی۔ کاتب "نقل را چہ عقل" کے مقولے کا پورا پورا ثبوت دینا چاہتا ہے۔ اور سالنامہ میں بفضلہٖ کئی جگہ کاتب کامیاب نظر آتا ہے۔ مثلاً کاتب سے کہا گیا تھا کہ راجندر سنگھ بیدی کے مضمون "جہلم اور تارو" کے پہلو میں یہ عبارت لکھدو:- "زیرِ طبع ناول "دوسرا کنارہ" کے دو باب" اور کاپی فوراً پریس میں بھیجدو۔ سالنامہ شائع ہونے کے ایک ہفتہ بعد مسٹر کرشن چندر نے کہا "میں تو کوئی ناول اس نام کا نہیں لکھ رہا"۔ "پورب دیس ہے دتی" "کسی ناول کے دو باب ہیں"۔ اب جو سالنامہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ کاتب نے بیدی اور کرشن میں تمیز کرنے کی سرے سے ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ اب ناظرینِ ساقی سے درخواست کی جاتی ہے کہ اس ستم ظریفی کی اصلاح فرمالیں۔ اور ہاں لگے ہاتھوں مندرجہ ذیل اشعار کی بھی تصحیح کرلیں:-

(۱) ایک جھلک:- از حضرت کوکب شاہجہان پوری۔ صہ ۵۶

شعر ۱۰۔ مصرع ثانی:- اک برق ہر طپش کو مٹاتی چلی گئی۔

شعر ۲۱۔ مصرع اولیٰ:- کوکب! محیطِ حسن کی اک موجِ بے پناہ۔

(۲) نذرِ ساقی:- از حضرت شاد عارفی۔ صہ ۳۱

شعر ۱۱۔ مصرع ثانی:- کہتے ہیں چھلکنا ہے کم ظرفیِ پیمانہ۔

شعر ۱۳۔ مصرع ثانی:- لپکی ہوئی پروائی دہکا ہوا کاشانہ۔

بعض مضامینِ نثر میں کتابت کی غلطیوں نے بڑا ستم ڈھایا ہے۔ امید ہے کہ خوش ذوق ناظرینِ ساقی انہیں خود درست فرمالیں گے۔ مضمون نگار حضرات اگر ترسیلِ مضامین میں تساہل نہ فرمائیں تو ایسی غلطیوں کا امکان بڑی حد تک کم ہوجائے۔

شاہد

ضروری اعلان

جو مسودے ساقی کیلئے موصول ہوتے ہیں انہیں حفاظت سے رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، تاہم اس بارے میں دفترِ ساقی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا۔ اس لئے اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھا کیجئے۔

جو مضامین قابلِ اشاعت قرار پائیں گے صرف انہی کے بارے میں مزید مراسلت کی جائے گی۔ مضامین ایڈیٹر ساقی کے نام بھیجنے چاہئیں۔

جواب طلب امور کے لئے محصول ڈاک بھیجنا ضروری ہے۔ اور رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے ورنہ تعمیلِ ارشاد ممکن نہ ہوگی۔ انتظامی امور کے سلسلے میں منیجر ساقی سے مراسلت کرنی چاہیئے۔

شاہد

نیل کی ناگن

تمہید

شہر اور بت خانہ ابی دوس کی پشت پر لیبیا کے پہاڑ خشک دریا کی طرح پھیلے پڑے ہیں۔ مشہور ہے کہ یہی شہر یا بت خانہ اوسیرس کا مدفن ہے جو مصر قدیم میں اُن کا رب مانا جاتا تھا۔ زمانہ حال میں انہی خشک اور ویران پہاڑوں کے اندر ایک زمین دوز مومیا خانہ دریافت ہوا ہے اور وہیں سے پتوں پر لکھے ہوئے چند کتبات ایسے دستیاب ہوئے ہیں جن سے یہ تاریخ لکھی جاتی ہے۔ مومیا خانہ جہاں تابوتوں میں مومیا بنے پرانے وقتوں کے مُردے بند ہیں خاصا کشادہ کمرہ ہے۔ مگر جو چیز یہاں عجیب ہے وہ ایک پہاڑ میں کھدا ہوا چوکور زمنہ کا ایک کنواں ہے جو گہرائی میں تقریباً تیس گز ہے۔ جس کمرے میں یہ کنواں ہے وہ خود ایک بڑے چٹان کو کھوکھلا کر کے بنایا گیا تھا۔ دراصل یہ کمرہ ان مُردوں کے عزیزوں اور دوستوں کیلئے جن کے تابوت مومیا خانے میں بند تھے بطور تسبیح خانے کے تھا۔ جہاں جمع ہو کر وہ مردوں کے حق میں دُعا کرتے تھے۔ اور یہ کنواں جو کمرے کے داہنی طرف کے گوشے میں تھا، راستہ تھا اُس زمین دوز مومیا خانے کا جس میں تابوت رکھے تھے۔ اس زمین دوز کمرے میں تین تابوت رکھے تھے، گو گنجائش زیادہ کی تھی۔ ان میں دو تابوت ایسے تھے جن میں بتخانہ ابی دوس کے کاہن اکبر عونیم حط کی لاش تھی۔ دوسرے میں اُس کی بیوی رکھی تھی۔ اور یہ دونوں ماں باپ تھے ہرماکس کے جو اس تاریخ کا ہیرو یا موضوع ہے۔ وہاں کے بدو عربوں نے اس مومیا خانے کو کسی طرح معلوم کر کے وہ اس کے اندر گھسے تھے اور دونوں تابوتوں کو انہوں نے توڑ ڈالا تھا۔

ان بدوؤں نے تابوتوں ہی کو نہیں توڑا تھا بلکہ ایک تابوت میں کاہن اکبر کی لاش کو جو مومیا کی شکل میں بند تھی اسے باہر نکال کر ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ اور یہی حال اُس کی بیوی کی مومیا کا کیا تھا۔ یہ بیوی بھی ایسی عابدہ اور زاہدہ تھی کہ لوگ کہتے تھے کہ تقدیر کی دیبیاں اُس میں حلول کر چکی ہیں اور اس میں آئندہ کی خبریں سنانے کی قابلیت پیدا ہو گئی تھی۔ بدو عربوں نے دونوں میاں بیوی کی مومیا کے اعضا توڑ کر جدا جدا کر دیے تھے، اور ان کی ہڈیوں میں مال و دولت تلاش کی تھی۔ ان بدوؤں کا حال یہ تھا کہ وہ ان ہڈیوں تک کو کوڑیوں کے مول بیچ ڈالتے تھے اور یورپ کا کوئی نہ کوئی جاہل سیاح جس کا کام یہ تھا کہ جو کچھ دستیاب ہو اُسے غارت کر دے، ان ہڈیوں کو خرید لیتا تھا۔ کیونکہ مصر میں جو مفلس زندہ ہیں وہ مُردہ امیروں کی لاشوں سے جو کچھ مل جائے اُس پر گذر کرتے ہیں۔

لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ اس مومیا خانے کے دریافت ہونے کے چند روز بعد میرا ایک واقف کار جو ڈاکٹری کا پیشہ کرتا تھا دریائے نیل کے رستے سفر کرتا ہوا شہر ابی دوس میں جا نکلا اور کسی طرح اس کا ملنا ان بدوؤں سے ہو گیا جنہوں نے تابوت کھول کر لاشوں کو توڑا تھا اور ہمارے ڈاکٹر کو ان بدوؤں کو مومیا خانے تک پہونچنے کے راستے بتائے۔ اور کہا کہ وہاں ایک تابوت اب بھی ایسا ہے جسے انہوں نے نہیں کھولا ہے۔ مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس میں کسی مفلس کی مومیا بند ہے چونکہ ہمیں اس وقت اور کام تھا ہم نے اس تابوت یا صندوق کو نہیں کھولا۔ اس کو جیسا تھا ویسا ہی چھوڑ کر باہر آ گئے۔ اب ہمارے دوست ڈاکٹر کو شوق ہوا کہ مومیا خانے کو دیکھنا چاہیئے، جہاں ابھی تک یورپ کے کسی سیاح کی رسائی نہیں ہوئی ہے۔ پس اُس نے ان بدوؤں کو بہت سا روپیہ دیا کہ وہ اسے یہ مومیا خانہ دکھا دیں۔ اب جو کچھ پیش آیا اسے ڈاکٹر کے الفاظ میں بجنسہ میں یہاں نقل کرتا ہوں۔

"ایک رات میں بتخانہ سیتی کے قریب سو رہا۔ دوسرے روز دن نکلتے ہی وہاں سے چل پڑا۔ میرے ہمراہ ایک بھینگا بدو علی تامی تھا۔ جسے میں اُس کے ساتھی چوروں کی رعایت سے علی بابا کہا کرتا تھا۔ یہی وہ آدمی ہے جس سے ایک انگوٹھی لیکر اور اُس کے ساتھیوں سے چند اور نادر چیزیں خرید کر میں آپ کو اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ سورج نکلنے کے بعد ہم ایک گھنٹے کے اندر اس وادی میں پہونچ گئے جہاں مومیا خانہ تھا۔ یہ مقام وادی میں بڑی ہی ویران اور اُجاڑ جگہ تھا۔ دن بھر یہ وادی دھوپ میں تپتی رہتی تھی اور وہاں گرمی اس شدت کی ہوتی تھی کہ بڑے بڑے چٹان جو یہاں بکثرت زمین پر موجود تھے صدہا برس کی دھوپ، ہوا اور ریت کو بالکل چکنے نظر آتے تھے۔ اور اتنے گرم ہو جاتے تھے کہ انہیں ہاتھ تک لگانا گوارا نہ ہوتا تھا۔ چونکہ اس گرمی اور دھوپ

میں پیدل چلنا دشوار تھا اس لئے ہم گدھوں پر سوار ہوئے۔ اور اس وادی میں پہونچے جہاں وہ تابوت خانہ یا مومیاگھر تھا یہاں ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ بجز ایک گدھ کے جو نیلے آسمان کے نیچے منڈلا رہا تھا اور کوئی ہمارا ساتھی یہاں نہ تھا۔ اب ہم ایک بہت بڑے گول چٹان کے پاس پہونچے۔ گدھوں سے اُترے۔ اور ایک کسان کے لڑکے کو گدھے حوالے کرکے خود چٹان کے قریب آئے۔ اس چٹان کی جڑ میں ایک موکھا سا تھا۔ اور اس کا منہ اتنا چھوٹا تھا کہ صرف ایک آدمی ہاتھ اور گھٹنے ٹیکتا اندر جا سکتا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ یہ موکھا یا سوراخ گیدڑوں نے بنایا تھا۔ چٹان کو کھوکھلا کرکے جو دروازہ اگلے وقتوں میں بنایا گیا تھا ریت سے ڈھک گیا تھا۔ علی جلدی سے ہاتھ اور گھٹنے ٹیک کر اندر گھُسا۔ اسکے بعد مَیں اندر گیا۔ اندر باہر کی گرمی کو مقابلے میں ٹھنڈک تھی۔ اور باہر کی تیز روشنی کی جگہ یہاں گھُپ اندھیرا تھا۔ میں نے اندر پہنچکر ہر چیز کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ کمرے میں دُور کا حصہ ریت سے پاک تھا۔ دیواروں پر مذہبی تصاویر بطلیموسیوں کے زمانہ کی بہت سی بنی تھیں۔ انہی میں ایک تصویر ایک بڑے شاندار پیرمرد کی تھی جو ایک سنگین کرسی پر جسپر بہت سے گل بوٹے تھے بیٹھا دکھایا تھا۔ ہاتھ میں اُس کے ایک عصا تھا اور سامنے ایک جلوس کاہنوں کا گزرتا دکھایا تھا۔ ہر کاہن کے پاس کسی خدا کی صورت تھی۔ اِسی چٹان والے والے کمرے کے دائیں ہاتھ والے گوشے میں ایک کنواں تھا جو مومیا والے کمرے میں جانے کا راستہ تھا۔ کنواں چوکور شکل کا پہاڑ کو کاٹ کر بنایا تھا۔ ہم اپنے ساتھ ایک شہتیر کا ٹکڑا لائے تھے۔ اب ہم نے اس شہتیر کو کنویں کے منہ پر رکھا اور اس میں ایک رسّی باندھ کر کنویں میں لٹکائی۔ علی گو قبروں کا چور تھا مگر بڑا جیوٹ اور بہادر آدمی تھا۔ عبا میں دو چار موم بتیاں رکھکر اُس نے رسّی کو پکڑا اور ننگے پاؤں کنویں کی دیوار میں اڑا کر بڑی تیزی سے نیچے اُترنے لگا اور بہت جلد وہ اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ جو کچھ نیچے گذر رہا تھا وہ صرف رسّی کے ہلنے سے معلوم ہوتا تھا۔ آخر کار رسی کا ہلنا بند ہوا۔ اور ایک آواز کنویں سے گونجتی ہوئی اُوپر سُنائی دی۔ اتنے میں کنویں کی تہ پر ایک روشنی تارے کی مانند چمکتی دکھائی دی اور اس کے ساتھ ہی چمگادڑوں کی ایک فوج چُپ چاپ پروں میں مطلق آواز نہیں کنویں کے منہ سے اُوپر اُبلتی نظر آئی۔ چمگادڑیں کیا یہ معلوم ہوتا تھا کہ کالی کالی رُوحیں کنویں سے اوپر نکل پڑی ہیں۔ اب رسّی اُوپر کھینچ لی گئی۔ اور کنویں میں اُترنے کی باری میری آئی۔ میں نے رسی پکڑ کر نیچے اُترنے سے انکار کیا۔ کیونکہ اس طرح اُترنے میں مَیں ڈرتا تھا کہ کہیں گردن اینٹھ کر رہ جائے۔ بس رسّی کا ایک سرا میری کمر میں باندھا گیا۔ اور اس طرح میں پورا کا پورا کنویں میں اُتارا گیا۔ جو لوگ رسّی کو تھامے ہوئے تھے اگر اُن سے ذرا سی چوک بھی ہوتی تو پھر میرا پتہ چلنا ممکن نہ تھا۔ گر کر ہڈیاں چورا ہو جاتیں۔ آخر کار میں کنویں کی تہ پر علی کے پاس پہونچ گیا۔ یہاں تک پہونچنے میں چمگادڑوں نے خدا جانے کتنے جھپٹے اپنے پروں سے میرے منہ پر مارے تھے۔ بہت سی میری بالوں میں چمٹ گئی تھیں۔ چمگادڑوں سے مجھے ویسے بھی بڑی گھِن آتی ہے۔ میں علی کے پاس پسینے میں ڈوبا سر کو چمگادڑیں لپٹی، کھڑا ہوگیا۔ یہاں دیکھا کہ کنویں کی بغل میں ایک راستہ پہاڑ میں کٹا ہوا ایک طرف کو گیا ہے۔ علاوہ چمگادڑوں کے جو میرے سر کو لپٹی تھیں میرے گھٹنے اور ٹخنے بھی جگہ جگہ سے چھل گئے تھے۔ اب دوسرا بدو کنویں میں اُترا۔ باقی آدمیوں کو جو اُوپر تھے اُنہیں علی نے حکم دیا کہ وہ جہاں ہیں وہیں رہیں۔ اب ہم تین آدمی کنویں کے بغلی راستے سے آگے بڑھے۔ آگے علی ہاتھ میں موم بتی جلائے تھا اور اسکے پیچھے ہم بھی موم بتیاں ہاتھ میں لئے تھے۔ یہ راستہ آگے چلکر زیادہ چوڑا ہوتا گیا، یہاں تک کہ ہم اُس کوٹھے میں آ گئے جہاں تابوت رکھے تھے۔ کمرہ بالکل خاموش اور شدّت سے گرم تھا۔ میں نے کبھی اتنی گرم جگہ نہ دیکھی تھی۔ میرا تو وہاں دم گھُٹنے لگا۔ اس کمرے میں دیواروں پر تصویریں مطلق نہ تھیں۔ عرض و طول میں کمرہ یکساں تھا اور پہاڑ کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ میں نے شمع اُونچی کرکے ہر طرف غور سے دیکھا۔ ٹوٹے ہوئے صندوقوں کے ٹکڑے جن میں مومیائی لاشیں بند تھیں بکھیرے پھیلے تھے۔ بلکہ لاشوں کے ہاتھ پاؤں بھی ٹوٹے ہوئے جا بجا پڑے تھے۔ یہ لاشیں وہی تھیں جن کے صندوق یا تابوت بدوؤں نے پہلے کھول ڈالے تھے۔ دونوں تابوتوں پر نقش و نگار بہت عمدہ قسم کے تھے اور ان پر صوری و رمزی خط میں عبارتیں لکھی تھیں۔ مصر کا یہ قدیم خط مجھے پڑھنا نہ آتا

تھا۔ مگر اُن کی خوشنائی ظاہر تھی۔ ٹوٹی مومیائیوں کے چھکڑ بھی ٹوٹے ہوئے چاروں طرف بکھرے تھے۔ مرد کی لاش کا سر دھڑ سے جدا پڑا تھا۔ میں نے اُسے اٹھا کر غور سے دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سر کے اور ڈاڑھی کے بال مرنے کے بعد مونڈ دئے گئے تھے۔ چہرے پر سونے کے ورق چپکے تھے جن سے نقشہ اچھی طرح نہ دکھائی دیتا تھا۔ چہرے کا گوشت اور کھال گو بہت سکڑ گئی تھی مگر پھر بھی چہرے پر ایک شان اور رعب برس رہا تھا۔ سر بہت ہی سن رسیدہ کا معلوم ہوتا تھا۔ چہرے پر متانت اور خودداری کی شان تھی میرے دل میں طرح طرح کے وہم اور خوف گذرنے لگے۔ حالانکہ میرا پیشہ ایسا تھا کہ مجھے مُردوں سے رات دن کام رہتا تھا۔ سر کو دیکھکر میں نے آہستہ سے زمین پر رکھدیا۔ دوسری مومیائی جو عورت کی تھی اُس کے چہرے پر چیتھڑے ابھی تک لپٹے تھے۔ میں نے اِن چیتھڑوں کو چہرے سے علیحدہ نہیں کیا مگر اتنا ضرور معلوم ہوا کہ یہ مومیا کسی بھاری بھرکم عورت کی ہے۔

اب علی نے تیسرے تابوت یا صندوق کی طرف اشارہ کیا۔ یہ تابوت بہت ہی بے احتیاطی سے کروٹ کے بل ایک گوشے میں پڑا تھا۔ میں قریب جا کر اُسے دیکھنے لگا۔ صندوق بہت ہی مضبوط صنوبر کی لکڑی کا تھا۔ اُس پر کوئی نقش یا کتبہ نہ تھا، اور نہ کسی مصر کے معبود کی اُس پر تصویر تھی۔

علی بولا کہ "ایسا تابوت میری نظر سے کبھی نہیں گذرا۔ معلوم ہوتا ہے کہ لاش کی مومیا بنا کر اس میں بڑی جلدی اور گھبراہٹ میں بند کی گئی ہے" کوئی اہتمام و بندوبست نہ تھا۔ صندوق کو بڑی بے پرواہی سے کروٹ کے بل ڈال دیا گیا تھا۔

میں نے صندوق کو غور سے دیکھا اور مجھے اسکی تحقیق کا شوق ہوا۔ مگر کمرے میں ان پُرانے وقتوں کے بزرگوں کی مٹی کو خراب اور برباد دیکھکر مجھے بہت صدمہ ہوا۔ اور میں نے ارادہ کر لیا کہ جو تابوت یا صندوق ابھی تک نہیں کھولا گیا ہے اُسے ہاتھ تک نہ لگاؤں گا۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ میرا شوق بڑھا اور ہم تینوں آدمی اس تابوت کو کھولنے میں مصروف ہو گئے۔

علی اپنے ساتھ ایک ہتوڑی اور چھینی لایا تھا۔ صندوق کو سیدھا کر کے علی بڑے ذوق و شوق سے جو قبروں کو توڑتے ہیں اس قبیل کے لوگوں کو ہوتا ہے مشغول ہوا۔ اُس نے ایک اور بات بھی بتائی۔ وہ یہ کہ مومیا جن صندوقوں میں بند کی جاتی ہیں اکثر ایسے ہوتے ہیں کہ ڈھکنا بند کر کے صندوق کے دونوں طرف لکڑی کے دو دو بندھن تختے میں کھانچا بنا کر جڑ دئے جاتے ہیں۔ گویا سب بندھن چار ہوتے ہیں۔ مگر اس صندوق پر بجائے چار کے آٹھ بندھن جڑے گئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بند کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ صندوق انسان سے نہ کھل سکے۔ آخر بڑی مشکل سے بندھنوں کو کھول کر ہم نے صندوق کا ڈھکنا اُٹھایا۔ ڈھکنے کے تختے کی موٹائی تین انچ سے کم نہ تھی۔ ڈھکنا اُٹھاتے ہی معلوم ہوا کہ مومیائی کے اوپر ایک تہ خوشبودار جڑی بوٹیوں کی جمی ہے۔ یہ بالکل غیر معمولی بات تھی۔

علی نے اپنے چہرے سے تو کوئی تعجب ظاہر نہ ہونے دیا مگر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ضرور تھا۔ وجہ یہ تھی کہ یہ لاش دوسری لاشوں جیسی نہ تھی۔ بالعموم لاش کو مومیا بنا کر تابوت میں چت لٹا دیا جاتا ہے اور وہ ایسی بے حس و حرکت ہوتی ہے گویا لکڑی کی بنی ہوئی کوئی چیز پڑی ہے۔ لیکن یہ مومیا صندوق میں کروٹ کے بل رکھی تھی۔ اور باوجودیکہ اس کے گھٹنوں پر کپڑے لپٹے تھے مگر گھٹنے سیدھے نہ تھے۔ مڑے معلوم ہوتے تھے۔ اسکے علاوہ سونے کے موٹے موٹے ورق جو بطلیموسیوں کے زمانہ میں مومیا کے چہرے پر چپکائے جاتے تھے وہ کھال میں بہت اندر دھنس گئے تھے۔

علی بولا "یہ مومیا تو عجب چیز نکلی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ صندوق میں رکھی گئی ہے تو پوری مری نہ تھی"

ان باتوں کو دیکھکر یہ ممکن نہ تھا کہ اس مومیا کی نسبت ایک خاص خیال پیدا نہ ہوتا ہو۔ اور وہ یہ کہ صندوق میں بند ہونے کے بعد لاش زور زور سے صندوق میں تڑپی ہے۔

میں نے کہا "کیا واہیات بکتے ہو۔ بھلا آج تک کسی زندہ ممی کا حال بھی کبھی کسی نے سُنا ہے"

اب ہم نے صندوق میں سے لاش کو باہر نکالا۔ اور اس کام

میں مومیا سے جو گرد اٹھی اُس سے میرا دم گھٹنے لگا۔ خوشبودار مصالحہ جن میں لاش چھپی ہوئی تھی اُنکی تیز بو سے اور بھی ناک میں دم ہوا۔ پہلی بات جو بڑے کام کی ہمیں تحقیق ہوئی وہ پتوں کا ایک مٹھا سا تھا جن پر کچھ عبارت لکھی ہوئی تھی۔ یہ مٹھا ایک خاص طرح کے کپڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کپڑے کو مومیا کا کپڑا کہتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ جب لاش کو صندوق میں بند کرنے لگے تو پتوں کا یہ مٹھا بھی ساتھ بند کر دیا۔

قلی نے اِن پتوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ لیکن میں نے فوراً مٹھا اُٹھا اپنی جیب میں رکھ لیا۔ کیونکہ یہ پہلے ہی قرار پا چکا تھا کہ جو چیزیں اس قسم کی دستیاب ہونگی وہ میرا مال ہوگا۔ مومیا پر جو پٹیاں کپڑے کی لپٹی تھیں اب ہم نے اُنہیں کھولنا شروع کیا۔ کپڑا بہت مضبوط قسم کا تھا۔ اور پٹیاں ایک کے اُوپر ایک کئی کئی لپٹی ہوئی تھیں۔ اور اُن کے سِرے بھی خوب مضبوطی کے ساتھ بندھے تھے۔ مگر گرہیں موٹی موٹی لگائی تھیں۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ یہ کُل کام بہت جلدی میں کیا گیا تھا۔ لاش کے سر کے اُوپر ایک گول سا ڈبا تھا۔ جب اُس پر سے پٹیاں کھولیں تو چہرے پر پتوں کی ایک پرت اور نظر آئی۔ ان پتوں پر بھی کچھ عبارت لکھی تھی۔ میں نے پتوں کی اس پرت کو چہرے سے اُکھیڑنا چاہا مگر ممکن نہ ہوا۔ معلوم ہوا کہ جس کفن میں لاش لپٹی ہے اس میں کہیں سیون نہیں ہے۔ اور اسی کفن سے یہ پتے لپٹ گئے ہیں۔ پاؤں کی طرف یہ کفن جنیٹ دیکر مٹھا سا بندھا تھا۔ کفن پر موم چڑھا تھا اور وہ سالم ایک پارچہ کا تھا اور مُردے کے پورے جسم کو لپٹا ہوا تھا۔ میں نے پتوں پر جو عبارت لکھی تھی اُس کو پڑھنا چاہا۔ مگر یہ پتے چہرے پر خوشبودار مصالحوں کے جم جانے سے ایسے چپک گئے تھے کہ بہر کیف میں نے بغیر اس کے کہ اُوپر کے پتے ٹوٹ جائیں اُنہیں کسی طرح مُردے سے جُدا کر کے اُنہیں بھی اپنی جیب میں رکھ لیا۔

ہم نہایت مشکل اور محنت سے اپنے اس خوفناک کام میں مصروف رہے اور آخر کار ہم نے وہ کفن جس میں لاش لپٹی تھی ہٹا دیا۔ اب ہماری آنکھوں کے سامنے ایک انسان کی لاش تھی۔ روشنی پاس لاکر ہم نے لاش کو بغور دیکھا۔ پہلی ہی نظر میں ایک ڈاکٹر کے لئے یہ معلوم کرنا کہ موت کس طرح پیش آئی مشکل نہ تھا۔

مُردے کا جسم ابھی تک زیادہ خشک نہ ہوا تھا اور ظاہر تھا کہ مومیا بناتے وقت مُردے کو حسب معمول ستر دن تک شورے میں نہ ڈالے رکھا تھا۔ اس مدت کے پورے نہ ہونے کی وجہ سے چہرے کے انداز اور شباہت میں زیادہ فرق نہ پیدا ہوا تھا اور وہ اپنی اصلی حالت میں تھا۔ اور مومیاؤں میں یہ بات نہیں دیکھی گئی تھی۔ تفصیل یہاں لکھنی میں نہیں چاہتا۔ لیکن مجھے اُمید ہے کہ جو بات اس مُردے کے چہرے میں میں نے دیکھی یہ بات میں پھر کبھی نہ دیکھونگا۔ بدو جو میرے ساتھ تھے وہ بھی اس چہرے کو دیکھکر خوفزدہ ہوئے اور منہ ہی منہ میں کچھ دُعا پڑھنے لگے۔

باقی جو کچھ دیکھا وہ یہ تھا کہ مومیا ساز مُردے کی بغل کی طرف جو سوراخ کر کے مومیا تیار کرتے ہیں وہ سوراخ اس مومیا میں نہ تھا۔ چہرے کے نقشے سے ظاہر تھا کہ ادھیڑ عمر کا آدمی ہے۔ اور ہاتھ پاؤں بھی ایک مضبوط آدمی کے رکھتا ہے سینہ بھی غیر معمولی طور پر چوڑا چکلا تھا۔ اتنا وقت نہ تھا کہ میں زیادہ غور سے اس مومیا کو دیکھ سکتا۔ بہرحال کفن کو علیحدہ کرنے کے بعد یہ لاش ہوا لگتے ہی چند منٹ میں بُھربُھری ہو کر ریت کی طرح بکھرنے لگی۔ اور پانچ چھ منٹ میں صرف کھوپڑی اور چند بڑی ہڈیاں جسم کی باقی رہ گئیں باقی سب مٹی کا ڈھیر ہو گئی۔ غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ران کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔ یہ یاد نہیں کہ بائیں ران تھی یا دائیں۔ اس ٹوٹی ہڈی کو بہت بُری طرح جوڑا گیا تھا۔ جسکی وجہ سے ایک ٹانگ دوسری ٹانگ سے قریب ایک انچ کے چھوٹی رہ گئی تھی۔

اب یہاں کوئی اور عجیب چیز دستیاب ہونے والی نہ رہی تھی۔ اب وہ پہلا سا شوق اور انہماک بھی نہ رہا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ گرمی اور مشقت، اور مومیا سے جو گرد اٹھتی ہے اور مصالحوں کی تیز بو نے مجھے تو ایسا پریشان کیا کہ مرنے کی نوبت آگئی۔

جہاز میں بیٹھا یہ لکھ رہا ہوں اور لکھتے لکھتے تھک گیا ہوں جہاز بہت ہل رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ میرا یہ خط آپکے پاس خشکی کے رستے جائیگا اور میں سمندر کے لمبے رستے سے لندن آرہا ہوں۔ آپ کو یہ خط میرے لندن پہونچنے سے دس دن پہلے

مل جائے گا۔ ملاقات پر میں بتاؤں گا کہ مومیا گھر سے ادھر آنے میں کیا کیا دقتیں پیش آئیں۔ اور ان چوروں کا بادشاہ یعنی علی بابا مع اپنے ساتھیوں کے کس طرح اس کوشش میں ہوا کہ پتوں کے مکتوب مجھ سے لے لے۔ بہت سی دھمکیاں اور ڈراوے دیتے کہ کسی طرح مکتوبوں کو وہ مجھ سے حاصل کرلے۔ مگر میں نے وہ مکتوب اپنے ہی پاس رکھے۔ اُسے نہ دئے۔

اب ہمیں ان مکتوبوں کو پڑھنا اور اُن کا مفہوم معلوم کرنا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان میں وہی معمولی کتاب یعنی "مصر کے مُردے" نقل کر دی ہے۔ ممکن ہے کہ کچھ اور بھی ہو۔ میں نے مصر میں اپنی اس تحقیقات کا کسی سے ذکر نہیں کیا ہے۔ ورنہ بولاق کے محاسب خانے کے لوگ میرے پیچھے پڑ جاتے۔

زیادہ سلام"

پھر یہ ہوا کہ میرا یہ دوست جس نے مجھے یہ خط بھیجا تھا لندن آیا اور آنے کے دوسرے ہی دن ہم سب ملکر ایک بڈھے عالم جید کے پاس گئے جو مصر قدیم کے صوری اور رمزی خط پڑھنے میں بڑی دستگاہ رکھتا تھا۔ جب ہم نے پتوں پر لکھے ہوتے وہ مکتوب اُس کے سامنے رکھے تو اُس نے عینک لگا کر اُنہیں دیکھنا شروع کیا۔ اور ہم غور سے دیکھنے لگے کہ اُس نے ایک ایک پتے کو بڑی احتیاط سے جدا کر کے اسکی عبارت کو پڑھنے کی کوشش کی۔ جس غور اور توجہ سے وہ ان پتوں کو پڑھنے کی کوشش کرتا تھا ہمکو اس پر حیرت ہوئی۔

اتنے میں وہ بولا "جو کچھ بھی ان پر لکھا ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ وہ مصر قدیم کے مُردوں والی کتاب کی نقل نہیں ہے۔ ارے۔ قسم ہے۔ یہ کیا لکھا ہے۔ کلا۔ کلا ابطرہ۔ جناب والا جہاں تک میرا علم بتاتا ہے یہ تو کسی شخص کے تاریخی حالات ہیں جو کلا ابطرہ کے زمانے میں زندہ تھا۔ وہی مشہور ملکۂ مصر کلا ابطرہ۔ کیونکہ اس نام کے آگے انطونی کا نام بھی آتا ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ ان پتوں کی عبارت پڑھنے میں کم از کم چھ مہینے درکار ہونگے۔ کم سے کم چھ ماہ عرض کرتا ہوں" اور وہ اس خیال سے اتنا خوش ہوا کہ ضبط نہ کر سکا۔ اور ہم میں ہر ایک سے ہاتھ ملا ملا کر کہنے لگا "میں اس عبارت کا ترجمہ کر دونگا۔ ترجمہ۔ اور پھر اس ترجمہ کو شائع کر دونگا۔ قسم ہے کہ میرا یہ ترجمہ ایسا ہوگا کہ یورپ میں مصریات قدیم کے جتنے عالم ہونگے وہ مجھ سے رشک و حسد کرنے لگیں گے۔ واقعی آپکو یہ چیز عجیب و غریب حاصل ہوئی ہے"

اور اے شخص جس کی نظر ان اوراق پر پڑیگی وہ دیکھے گا کہ وہ تمام مضمون جو تصویری اور رمزی خط میں بیان ہوا تھا اُس کا فی الواقع ترجمہ ہو گیا ہے۔ اور وہ ترجمہ ہو کر طبع و شائع بھی کر دیا گیا ہے اور وہی ترجمہ اس وقت آپ کے سامنے ہے۔ گویا وہ مضمون ایسی سرزمین ہے جو ابھی دریافت ہوئی ہے اور اس پر لوگ چلنے پھرنے لگے ہیں۔ آزاد و خود مختار ہیں۔

ہرماکس اپنی قبر سے جسے دُنیا نے فراموش کر دیا ہے باتیں کر رہا ہے۔ وقت و زمانہ کی دیوار جو صداقت کے ان حالات کو دریافت کرنے میں حائل تھی وہ گر چکی ہے۔ اور بجلی کی سی سرعت سے ایک تصویر آپ کی نظروں کے سامنے زمانے کے ورقِ سیاہ پر نمودار ہوتی ہے۔ "مصر بالا" "مصر زیریں" جن پر مصر کے اہرام صدیوں سے خاموش نظر سے دیکھ رہے تھے آپ کی آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ یعنی ایک مصر تو وہ جو یونانیوں، رومانیوں اور بطلیموسیوں کا تھا۔ دوسرا مصر قدیم جو فراعنہ کا مصر تھا۔ یہ ملک بہت پُرانا تھا جس کے قصے نہایت شاندار اور دلچسپ تھے۔

اس میں بیان آئے گا کہ ارض خیم کی حب الوطنی کس طرح گل ہونے سے پہلے یکلخت کس طرح روشن ہوئی۔ دفعتاً چمکی اور پھر ہمیشہ کو بجھ گئی۔ کس طرح مذہب قدیم نے انقلاب کے زبردست سیل کا مقابلہ اس طرح کرنا چاہا جیسے کوئی نیل کی طغیانی کو روکنے کی کوشش کرے۔

اِن صفحات میں آپ ربۃ آئی سیس جس کی بہت سی شکلیں تھیں اور جو حکم قضا و قدر کی اجرا کرنے والی دیبی تھی اپنے جاہ و جلال میں نمودار ہوتی ہے۔ یہاں آپ اس شعلہ جوالہ یعنی کلا ابطرہ کی رُوح سے ملاقات کرینگے۔ یہ وہ حسن جہاں سوز تھا جس نے سلطنتوں کی صورتیں بدل دی تھیں۔ یہاں آپ پڑھینگے کہ چارمیوں کی رُوح کس طرح اُس تلوار سے غارت ہو گئی جسے انتقام نے تیار کیا تھا۔

یہاں وہ بدقسمت مصری ہرماکس جس کا اب دم واپسیں ہے آپ کو سلام کر کے عرض کرتا ہے کہ جس راستے پر وہ چلا تھا اُسی پر آپ بھی چلیں۔ اپنی آخری غمزدہ عمر میں وہ آپ کو بتائے گا کہ ممکن ہے کہ آپ کی زندگی کا بھی وہی قصہ نہ ہو جو اس کی زندگی کا ہوا ہے۔ اعراف (اعراف) میں پڑا جہاں وہ اپنی مدت العمر کے گناہوں کو پاک کرنے کے لئے طرح طرح کے عذاب اُٹھا رہا ہے، چیخ چیخ کر اس شخص کی تقدیر کا حال سُنائے گا جو دُنیا کی سخت آزمائشوں میں پڑ کر اپنے خدا کو، اپنی عزت و ناموس اپنے ملک کو بھول گیا۔

کتاب اوّل

ہرمِاکس کی تیاری

پہلا باب

ہرماکس کی پیدائش. تقدیر کی دیویوں کی پیشینگوئی.
معصوم بچے کا قتل.

قسم ہے اوسیرس کی جو ابوتیس میں آسودہ ہے کہ جو کچھ لکھتا ہوں وہ سب سچ ہے.

میں ہرماکس موروثی کاہن ہیکل مقدس کا جسے قدیم فراعنہ مصر سیتی نے تعمیر کیا تھا جو اب اوسیرس کی اقلیم میں وارد ہو کر اعراف (امنتی) پر حکومت کرتا ہے. میں ہرماکس جو اپنے استحقاق ربانی اور عالی نسبی کی بنا پر کہ فراعنہ قدیم کی نسل سے ہوں. مصر شمال وجنوب کا فرعون اور ان دونوں ملکوں کا تاج سر پر رکھنے کا مستحق ہوں. میں ہرماکس جس نے اہل مصر کی امیدوں کے کھلتے پھولوں کو نوچ پھینکا جو جاہ وعظمت کے رستے سے ہٹ گیا. میں ہرماکس جو بلندی سے پستی میں گر چکا ہوں جس میں تمام آلام ومصائب اس طرح جمع ہوتے ہیں جیسے صحرا کے کسی کنوئیں میں ہر طرف سے پانی جمع ہو. میں وہ ہوں جو ہر طرح کی ندامت اور شرمندگی کی تلخی چکھ چکا ہوں. جس نے خود غیروں سے دھوکا کھا کر اپنوں کے ساتھ بیوفائی کی. انہیں دھوکا دیا. جو دنیا کی صولت وحشمت کو کھو کر عاقبت کے عزوجلال سے محروم ہوا. میں ہرماکس جو یہ عبارت لکھ رہا ہوں بالکل تباہ وغارت ہو چکا ہوں. اسکی قسم کھا کر کہتا ہوں جو ابوتیس میں خوابیدہ ہے کہ جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ سب سچ ہے.

اے مصر اے خِطۂ قدیم کی ارض عزیز، جس کی سیاہ مٹی سے میرے اجزا فانی پرورش پاتے تھے، ہائے وہ سرزمین جس سے میں نے بیوفائی کی، اُسے دھوکا دیا. اے معبودانِ مصر اوسیرس، آئی سیس، ہورس، اور اے مصر کے معبد اور بُت خانو، جن کے دروازے سر بفلک کشیدہ ہیں تمہارے ساتھ میں نے دغا کی. اے فراعنۂ قدیم کے خون جو اب تک میری رگوں میں دوڑتا ہے میں نے اس کی قوت وندرت کو غارت کر دیا. اور اے خیر وخوبی کے ناپدید جوہر اور اے تقدیر جس کی میزانِ عدل جس کے ہاتھ میں تھی تم سب میری یہ باتیں سنو اور اُس دن جبکہ یہ کون ومکاں سب غارت ومعدوم ہو جائینگے میرے قول پر گواہی دینا کہ جو کچھ کہتا ہوں سب سچ ہے.

شاداب اور سرسبز کھیتوں کے دوسری طرف نیل کا پانی سُرخ ہے گویا خون کا دریا بہہ رہا ہے. میری آنکھوں کے سامنے عربستان کی پہاڑیوں پر دھوپ کھلی ہے. اور یہی دھوپ ابوتیس کی عمارتوں کو بھی روشن کرتی ہے. ابوتیس کے بُت خانوں میں کاہن اب تک دُعائیں پڑھتے ہیں. مگر افسوس مجھ سے کوئی واقف نہ رہا. اب تک بُتوں کے سامنے قربانیاں ہو رہی ہیں. سنگین چھتوں میں عبادت کے وقت لوگوں کی آواز گونجتی ہے. مگر میں اپنے زندان تاریک کی کالی کوٹھڑی میں اکیلا ہوں. میں جو مجسّم حرف ندامت وشرمندگی ہوں. ابوتیس کی بلند اور عالیشان دیواروں اور برجوں سے پھریرے اُڑتے اور بڑے بڑے جلوس ایک بتخانے کے حرم سے دوسرے بتخانے کے حرم کو جاتے دیکھتا ہوں.

ابوتیس، اے اُجڑے اور برباد ابوتیس میرا دل تیری طرف کھنچا جاتا ہے. کیونکہ وہ دن قریب ہے کہ تیرے تمام خفیہ اور متبرک مقامات کو ریگِ بیاباں ڈھک دیگی. تیرے معبود اور خدا سب غارت ہونے والے ہیں. اے ابوتیس نئے نئے کیش ومذہب تیرے مقدس اور متبرک مقامات کی تحقیر وتذلیل کریں گے. اور فوجوں پر فوجیں تیرے قلعہ کی دیواروں کو گھیر لیں گی. میں روتا ہوں، خون کے آنسو روتا ہوں کیونکہ یہ میرا ہی قصور میرا ہی گناہ ہے جس نے یہ سب تباہیاں ڈالی ہیں. اور جو ندامت وشرمندگی اس میں ہوتی ہے وہ میرے ہی کئے سے ہوتی ہے.

دیکھو آگے جو کچھ لکھا ہے.

یہیں ابوتیس میں میں ہرماکس پیدا ہوا تھا. میرا باپ جو اب اوسیرس کی اقلیم میں آسودہ ہے، بت خانہ سیتی کا سردار کاہن تھا. جس دن میں نے دُنیا میں آنکھیں کھولی تھیں اُسی دن کلابطرہ ملکۂ مصر بھی پیدا ہوئی تھی. میرا لڑکپن سامنے والے کھیتوں میں فلاحین کو کام کاج کرتے دیکھنے اور بتخانوں کے صحنوں میں گشت لگانے میں گذرا. مجھے اپنی ماں یاد نہیں کیونکہ میں دودھ پیتا تھا کہ وہ قضا کر گئی. بڑھیا اتوا نے مجھ سے کہا کہ جب بطلیموس جسے "نے نواز" کا لقب حاصل تھا اسکے دور حکومت میں وہ مرنے کو ہوئی تو مرنے سے پہلے اُس نے سونے کا ایک سانپ جو مصر کا شاہی نشان تھا ہاتھی دانت کے ایک صندوقچہ سے نکالا اور اُسے

میری پیشانی پر رکھدیا۔ جن لوگوں نے میری ماں کو یہ کرتے دیکھا تو وہ سمجھے کہ اس وقت میری ماں پر تقدیر کی دیبیاں اپنا عمل کر رہی ہیں۔ اور میری ماں کی اس مجنونانہ حرکت سے لوگوں کو خیال گذرا کہ اب مقدونیہ کے بطلیموسیوں کا دورِ حکومت ختم ہونے والا ہے۔ اور اب مصر کا شاہی عصاء بطلیموسیوں کے ہاتھ سے نکل کر مصر کے اصلی و حقیقی خاندان کی طرف منتقل ہونے کو ہے۔ لیکن جب میرے باپ عمونیم ہبط سردار کاہن نے جن کا میں ایک ہی بچہ تھا یہ ماجرا دیکھا، کیونکہ میری ماں سے پہلے جو بیوی میرے باپ کی تھی وہ کسی ریتانی اثر سے بانجھ ہوگئی تھی۔ غرض جب میرا باپ آیا اور اُس نے دیکھا کہ میری ماں نے یہ کیا حرکت کی ہے تو اُس نے آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھائے اور جو علامت اُس وقت ظاہر ہوئی تھی اس پر شکر کیا۔ جب وہ خدا کا شکر بجالانے میں مصروف تھا تو تقدیر کی دیبیوں نے میری ماں میں جو مرنے کو تھی پیشین گوئی کی قوت پیدا کر دی اور اُس میں اتنی طاقت آگئی کہ وہ اپنے بستر سے اُٹھی اور میرے پنگوڑے کے سامنے آکر اُس نے تین بار سجدہ کیا۔ میں اس وقت سوتا تھا۔ سونے کا سانپ شاہی نشان میرے ماتھے پر تھا۔ اب میری ماں نے بہ آوازِ بلند کہنا شروع کیا: "مرحبا۔ اے میرے بطن کے ثمر۔ مرحبا اے شاہی بچے تو فرعون ہونے والا ہے۔ اے مصر کے خدا تجھے اس زمین کو پاک کرنا مبارک ہو اے بخت ہیف کے ربانی تخم جو دیبی آئی سیس کی نسل سے ہے، اپنے کو پاک رکھ اور ایک دن تو مصر پر حکومت کرکے اُسے پاک کریگا۔ دیکھ اس بات سے بچیو۔ اگر تو نے اپنی اس سخت آزمائش میں جو کچھ تجھے کرنا ہے نہ کیا تو پھر خدایانِ مصر کا غضب تجھ پہ ٹوٹے گا، اور شاہی بزرگانِ سلف تجھ پر لعنت کرینگے جو اب دُنیا سے چل بسے ہیں۔ مگر یہ وہ تھے جنہوں نے ہورس کے زمانہ سے اس مُلک پر حکومت کی تھی۔ پھر تیری زندگی آلام و مصائب کی ہوگی۔ اور جب تو مریگا تو خدائے اوسیرس تجھے اپنی اقلیم میں داخل نہ ہونے دیگا۔ تجھے لینے سے وہ انکار کریگا۔ امنتی (اعراف) کا حاکم تیرے خلاف تجویز سُنائے گا۔ دیوست اور سانقیط تجھے عذاب دینگے حتی کہ تیرے سب گناہ دُھل جائیں۔ اور مصر کے بُت خانوں میں مصر کے خداؤں کی پرستش جن کے عجیب عجیب نام ہیں پھر ہونے لگے گی۔ ظالم کا عصا لُوٹ جائے گا۔ اور باہر کے لوگ اس ملک سے قطعی خارج کر دئے جائیں گے۔ یہ کام اُس وقت ختم ہوگا جب تو اُسے اپنی کمزور حالت میں انجام کو پہونچائیگا"۔

جب میری ماں نے یہ جُملے ختم کرلئے تو پھر پیشینگوئی کی قوت اُس سے زائل ہوگئی۔ اور میرے پنگوڑے کے سامنے وہ مر کر گری۔ میں پنگوڑے میں پڑا سوتا تھا۔ اُس کے گرنے کی آواز سُنکر میں جاگا۔ مگر میرا باپ عمونیم ہبط یہ باتیں سُنکر سر سے پاؤں تک کانپنے لگا۔ وہ دل میں ڈرا کہ جو جُملے میری ماں کے مُنہ سے تقدیر کی دیبیوں نے کہلوائے تھے وہ بادشاہِ وقت بطلیموس کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے والے تھے۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ اگر یہ جُملے بطلیموس کے کان تک پہونچے تو پھر فرعون اپنے سپاہی اس بچے کی جان لینے کو بھیجدیگا۔ جس کی نسبت ایسی پیشینگوئی کی گئی تھی۔ پس میرے باپ نے کمرے کے سب دروازے بند کروادئے اور جتنے لوگ وہاں کھڑے یہ باتیں سُن چکے تھے اُن سے کہا کہ میری کاہنت کے اس عصا اور تقدیر کی دیبیوں کی قسم کھاؤ کہ جو کچھ تم نے یہاں دیکھا یا سُنا ہے اُسے اپنے ہی تک رکھوگے۔ کسی سے اس کا ذکر نہ کروگے۔

جو لوگ اس وقت یہاں تھے، اُن میں بڑھیا اتوا بھی تھی۔ اس نے میری ماں کو دودھ پلایا تھا۔ اور میری ماں کو وہ بہت چاہتی تھی۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ مجھے علم نہ تھا کہ پہلے کیا ہوا اور آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ مگر کوئی فہم ایسی نہ تھی کہ عورت کی زبان کو بند رکھ سکے۔ اور یہی ہوا بھی۔ جب بڑھیا اتوا کے دل میں یہ قصہ پُرانا ہوگیا اور کچھ دن گذر لئے اور ڈر خوف سب دُور ہوا تو اُس نے اپنی بیٹی سے جو مجھے دودھ پلاتی تھی کیونکہ میری ماں مر چکی تھی، سارا حال پیشینگوئی کا کہدیا۔ اور اس حالت میں کہا جبکہ اُس کی بیٹی اپنے شوہر کو روٹی کھلانے صحرا میں جارہی تھی۔ بڑھیا اتوا کا داماد پیشہ بُت تراشی کا کرتا تھا اور جو بُت پہاڑوں کو کاٹ کر بنائے جاتے تھے اُنہیں تیار کرتا تھا۔ بڑھیا اتوا اپنی بیٹی سے کہنے لگی: "دیکھ بیٹی۔ تو اس بچے کو دودھ پلاتی ہے بس دل وجان سے اسکی خبرگیری کرتی رہ۔ کیونکہ ایک دن وہ مصر کا فرعون ہونے والا ہے۔ اور وہ اس مُلک سے بطلیموسیوں کو نکال باہر کریگا"۔ لیکن اتوا کی بیٹی جو میری انا تھی یہ بات سُنکر اتنی حیرت زدہ ہوئی کہ وہ اس قصے کو اپنے ہی تک نہ رکھ سکی اور رات کے وقت اُس نے اپنے شوہر کو جگایا اور سارا حال چپکے چپکے اس کے کان میں کہدیا اور اس طرح خود اپنی اور اپنے بچے کی موت کا باعث ہوگئی۔ اُسکے شوہر نے اپنے ایک دوست سے اس کا ذکر کیا۔ یہ دوست بادشاہی جاسوس تھا۔ غرض شدہ شدہ یہ قصہ بطلیموس بادشاہِ وقت کے کان تک پہونچا۔ اس خبر سے وہ سخت پریشان ہوا۔ بطلیموس جب شراب کے نشے میں ہوتا تھا تو مصر کے خداؤں کی بے ادبی کیا کرتا تھا۔ اور قسم کھا کر کہا کرتا تھا کہ رومانیوں کی مجلس سیاسی ہی اس کا خدا ہے جس کی اطاعت اُسی پر لازمی ہے۔ مگر اب جو بات اُسکے کان تک پہونچی اُسے سُنکر وہ بہت ڈرا۔ اور یہ

نکل حال ایک زمانے کے بعد مجھے اُس کے طبیب سے معلوم ہوا۔ جب رات کو سوتا تھا تو چیختا اور رو رو کر سراکیس کا نام پکارتا تھا۔ جو نہ خدا ہے اور نہ مصری اُسے اپنا خدا مانتے ہیں۔ اُسے خوف تھا کہ کہیں کوئی اُسے قتل نہ کر دے اور عاقبت میں اُس کی رُوح عذاب دینے والوں کے حوالے کر دی جائے۔ جب تخت کے ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ ہوتا تھا تو وں مصریوں کے بُت خانے میں بڑی بڑی نذریں چڑھاتا۔ چنانچہ جب اُس نے سُنا کہ ابوتیس کے بت خانہ کے سردار کاہن کی بیوی نے اپنے مرنے سے پہلے تقدیر کی دیبیوں سے متاثر ہو کر جو پیشین گوئی کی ہے اور کہا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اُس کا بیٹا فرعون مصر ہو گا تو اُس نے اپنے چند معتبر سپاہیوں کو طلب کیا۔ یہ سب یونانی تھے اور وہ مصر کی کسی مقدس چیز کی بے حُرمتی کرنے سے ڈرتے نہ تھے۔ بطلیوس نے اُنکو یہ کہکر کشتی میں بٹھا روانہ کیا کہ وہ ابوتیس جائیں اور وہاں کے سردار کاہن کے بچے کا سر کاٹ کر ہمارے پاس حاضر کریں۔

لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ جس کشتی میں یہ سپاہی ابوتیس کو جارہے تھے اُس کا پیندا زیادہ گہرا تھا اور دریا میں پانی کم تھا۔ جب دریا میں کشتی اس سڑک کے سامنے پہونچی جہاں سے میدان میں سڑک ابوتیس کو مُڑتی تھی تو کشتی کنارے پر کیچڑ میں پھنس گئی۔ چونکہ بادِ شمال اس وقت بہت تیز چل رہی تھی اس لئے اندیشہ ہوا کہ کشتی ڈوب نہ جائے۔ یہ حال دیکھکر فرعون کے سپاہیوں نے چند کاشتکاروں کو آواز دی جو ڈھیکلیوں سے دریا کا پانی کھینچ رہے تھے کہ وہ اپنی کشتیاں لاکر سپاہیوں کو اس خطرے سے نکالیں۔ لیکن کاشتکاروں نے یہ دیکھکر کہ یہ سپاہی اسکندریہ کے یونانی ہیں ان کا کچھ خیال نہ کیا۔ وجہ یہ تھی کہ مصریوں کو اسکندریہ کے یونانیوں سے نفرت تھی۔ اس پر سپاہیوں نے چیخ چیخکر کہنا شروع کیا کہ ہم فرعون کے ایک ضروری کام کو آئے ہیں۔ پھر بھی اِن مصریوں نے اُن کی طرف توجہ نہ کی اور یہی پوچھتے رہے کہ فرعون کا کیا کام ہے۔

ان سپاہیوں کے ساتھ کشتی میں ایک خواجہ سرا بھی تھا۔ وہ ایسا خوفزدہ ہوا کہ اُس نے للکار کر کہا کہ ہم عموتیم ہیط سردار کاہن کے بچے کو قتل کرنے آئے ہیں۔ کیونکہ اس بچے کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ ایک دن فرعون ہو جائے گا۔ اور وہ یونانیوں کو اس ملک سے نکال باہر کریگا۔ اب مصریوں کو خیال ہوا کہ اس معاملے میں زیادہ تامل نہ کرنا چاہیئے۔ پوری بات تو وہ اچھی طرح سمجھے نہیں مگر جلدی سے وہ اپنی کشتیاں لائے۔ اِن مصریوں میں ایک آدمی تھا جو میری ماں کا رشتہ دار

تھا اور نہر کے محکمہ میں ملازم تھا۔ وہ یہاں سے بھاگا اور پون گھنٹے تک دوڑنے کے بعد وہاں آیا جہاں میں پڑا تھا۔ یعنی بُت خانے کی شمالی دیوار کے باہر۔ اتفاق سے میرا باپ اس وقت اُن مقبروں کی طرف گیا ہوا تھا جو بڑے قلعہ کے بائیں ہاتھ کو تھے۔ دریا سے اُترتے ہی فرعون کے سپاہی گدھوں پر سوار ہوتے اور تیزی سے میری طرف چل پڑے۔ اب اُس آدمی نے جو بھاگا ہوا آیا تھا بُڑھیا آتوا سے کہا۔ یہ بُڑھیا وہی تھی جس کے پیٹ میں بات نہ پچنے کی وجہ سے یہ ساری خرابی پیدا ہوئی تھی کہ آج سپاہی میرے قتل کو آرہے ہیں۔ اب جتنے لوگ یہاں تھے وہ ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے اور اُن کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔ کیونکہ اگر وہ مجھے کہیں چھپا بھی دیتے تو سپاہی ڈھونڈ کر مجھے پکڑ لیتے۔ لیکن جب اس آدمی نے کواڑوں میں سے جھانکا تو معلوم ہوا کہ ایک بچہ اندر کھیل رہا ہے ——!

اس آدمی نے آتوا سے پوچھا "بڑھیا بتا یہ بچہ کس کا ہو؟"

آتوا بولی "یہ میری بیٹی کا بچہ ہے اور بہرا کس کا دودھ بھائی ہے۔ یہ بچہ وہ ہے جسکی ماں کی وجہ سے یہ کل آفت آئی ہے۔"

وہ آدمی کہنے لگا "بڑھیا تجھے معلوم ہے کہ تیرا کیا کام ہو۔ بس میں تجھے قسم دلا کر کہتا ہوں کہ اپنا کام جو تیرا فرض ہے جلد انجام دے۔"

گو بچہ بڑھیا کا نواسا تھا مگر اُس نے بچے کو اُٹھایا اور اسے نہلا دُھلا کر ریشمیں کپڑے پہنا کر ہنگورے میں جا لٹایا۔ اور مجھے ہنگورے سے اُٹھا کر کیچڑ اور مٹی میں ایسا لت پت کیا کہ میرا گورا رنگ کالا معلوم ہونے لگا۔ اور جلدی سے میرے کپڑے اُتار کر مجھے ننگا کیچڑ میں بٹھا دیا۔ میں کیچڑ میں خوش ہو کر کھیلنے لگا۔

جس آدمی نے آتوا سے بات کی تھی وہ کہیں چھپ گیا۔ اتنے میں سپاہی گدھوں پر سوار اندر آئے۔ اُنہوں نے آتوا سے پوچھا کہ "کیا عموتیم ہیط سردار کاہن کا مکان یہی ہے؟"

بڑھیا نے جواب دیا "ہاں"

سپاہی جب اندر آئے تو وہ پیاسے تھے۔ بڑھیا آتوا نے اُنہیں دودھ اور شہد پینے کو دیا۔

جب وہ دودھ پی چکے تو جو خواجہ سرا سپاہیوں کے ساتھ تھا اُس نے پوچھا کہ "یہ بچہ جو ہنگورے میں پڑا ہے کیا عموتیم ہیط کا بیٹا ہے؟"

بڑھیا بولی "ہاں ہاں اُسی کا تو ہے" سپاہیوں سے کہنے لگی کہ "یہ بچہ ایک دن بڑا آدمی ہو گا اور ہم سب پر حکومت کریگا"

اس پر سب سپاہی ہنسنے لگے۔ اور ایک سپاہی نے اس بچے کو

اُٹھا تلوار سے اُسکی گردن اُڑا دی۔ اور خواجہ سرا نے فوراً اپنی جیب سے ایک مہر نکال کر دکھائی تاکہ معلوم ہو جائے کہ کس کے حکم سے یہ کام کیا گیا ہے۔ اور وہ شاہی مہر اُس نے بڑھیا آتوا کو بھی دکھائی اور کہا کہ "جب عزیزم ہیط آئے تو اُس سے کہد ینا کہ بیٹا تمہارا بادشاہ تو ہوگا مگر بے سر کا ہوگا"۔

جب سپاہی جانے لگے تو اُنہوں نے مجھے کیچڑ میں کھیتے دیکھا۔ اور کہا کہ "اس بچے میں تو وہ شان برستی ہے کہ ہرماکس پر نہ تھی۔ جسے ہم نے ابھی قتل کیا ہے"۔ کچھ دیر سوچتے رہے کہ "مجھے بھی قتل کر دیں لیکن مجھے قتل نہیں کیا اور میرے دودھ بھائی کا سر ہاتھ میں لئے چلے گئے۔ وجہ یہ تھی کہ چھوٹے بچوں کو جان سے مارنا یونانیوں کو پسند نہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد مقتول بچے کی ماں بازار سے واپس ہوئی۔ جب اُسے اپنے بچے کے مارے جانے کا حال معلوم ہوا تو وہ اور اُس کا شوہر دونو مل کر بڑھیا آتوا کو جان سے مارنے کو تیار ہو گئے اور اُنہوں نے چاہا کہ مجھے بھی سپاہیوں کے حوالے کر دیں۔ لیکن اتنے میں میرا باپ آ گیا جب اُسے سارا حال معلوم ہوا تو اُس نے آتوا کی بیٹی اور داماد کو پکڑوا کر تہخانے کے کسی تاریک کمرے میں بند کرا دیا۔ پھر ان دونوں کا حال کسی کو نہ معلوم ہوا۔

مگر اے کاش خدا کی مرضی یہی ہوتی کہ اُس دن فرعون کے سپاہی مجھے مار ڈالتے۔ نہ کہ وہ میرے بے گناہ دودھ بھائی کو قتل کرتے اور آج کو میں زندہ ہوتا۔

دوسرا باب

ہرماکس کی نافرمانی۔ شیر کو مارنا۔ بڑھیا آتوا کی تقریر۔

اِن واقعات کے بعد بادشاہِ مصر بطلیموس نے نواز نے ہمیں مطلق نہ ستایا۔ نہ پھر اُس نے اپنے سپاہی ابوتمیں میں اس غرض سے بھیجے کہ جس کی نسبت پیشین گوئی کی گئی تھی کہ وہ فرعون ہوگا اُسے تلاش کیا جائے۔ وہ خواجہ سرا میرے دودھ بھائی کا سر بادشاہ کے سامنے لایا۔ بادشاہ اس وقت اسکندریہ میں اپنے سنگ مرمر والے محل میں بیٹھا قبرص کی شراب پی رہا تھا اور اپنی حرموں کے سامنے بانسری بجانے میں مصروف تھا۔ حکم سُنتے ہی خواجہ سرا نے بچے کا سر بال پکڑ کر اُونچا کیا تاکہ فرعون سر کو اچھی طرح دیکھے۔ بادشاہ نے اپنی جوتی پاؤں سے اُتار کر اس بچے کے گال کو لگائی۔ جو عورتیں حاضر تھیں اُن میں سے ایک نے کہا کہ اس فرعون کے سر پر پھولوں کا تاج رکھئے۔ تب اُس نے تخت سے اُتر کر گھٹنے زمین پر ٹیک اِس سر کو تعظیم دی۔ اور ہنس ہنس کر اس بچے کے سارے چہرے پر بنانے لگا تاکہ اسکی تحقیر ہو۔ لیکن وہ عورت جس نے بچے کے سر پر پھولوں کا تاج رکھا تھا بڑی تیز مزاج تھی۔ یہ دیکھکر وہ بولی "حضور نے اچھا کیا کہ اس کٹے سر کو تعظیم دی۔ یہ بچہ حقیقت میں فرعون ہوگا اور فرعون بھی ایسا جو سب فرعونوں میں ممتاز ہوگا۔ نام اسکا اوسیرس ہوگا اور تخت اس کا موت"۔

یہ باتیں میں نے بڑے ہو کر سُنی تھیں۔

بطلیموس نے نواز یہ باتیں سُنکر ایسا برہم ہوا کہ سر سے پاؤں تک کانپنے لگا۔ کیونکہ وہ دل کا کھوٹا اور طبیعت کا شریر آدمی تھا۔ اور ڈرتا تھا کہ مرنے کے بعد اَمنتی (اعراف) میں کیسے عذاب اُٹھانے پڑیں۔ غرض اُس نے عورت کو ایسی بُری زبان نکالنے پر قتل کا حکم دیدیا۔ جتنی عورتیں وہاں تھیں اُنہیں رُخصت کر کے بانسری بجانی بند کی۔ شراب پی کر بدمست نہ ہوا۔ پھر بانسری کو ہاتھ نہ لگایا۔ اسکندریہ کے لوگوں کو جب یہ واقعات معلوم ہوتے تو اُنہوں نے اُس کا ایک گیت بنایا اور شہر کے گلی کوچوں میں اُسے گاتے پھرے۔

اسکے بعد برسوں اس پر گذرنے لگے۔ اس زمانے میں چونکہ میں بہت ہی کم عمر تھا اس لئے مصر میں جو بڑی باتیں پیش آئیں اُن کا مجھے علم نہیں اور نہ میرا مقصد اُنہیں یہاں بیان کرنے کا ہے۔ مجھ ہرماکس کے پاس اب وقت بہت کم ہے اور سوائے ایسی باتوں کے جن کا تعلق خاص میری ذات ہو اور باتوں سے مجھے بحث نہیں۔

وقت گزرتا گیا۔ میرے باپ اور اُستادوں نے ہماری قوم کے علوم و فنون مجھے سکھائے۔ بالخصوص خداؤں کی وہ باتیں سکھائیں جن کا جاننا بچوں کیلئے ضروری تھا۔ میں روز بروز مضبوط اور صورت شکل کا اچھا ہوتا گیا۔ بال میرے بالکل سیاہ تھے اور آنکھوں کا رنگ گُلِ نیلوفر کے رنگ سے ملتا تھا۔ جلد میری ایسی اُجلی اور سپید تھی جیسے بتخانوں میں سنگ مرمر والے اندرونی ایوان ہوں۔ چونکہ یہ خوبیاں اب مجھ میں نہیں رہیں اس لئے اُنکے بیان کرنے سے کیوں شرماؤں۔ سارے ابوتمیں میں کوئی میرا ہم عمر کشتی لڑنے میں مجھ سے بڑھکر نہ تھا۔ اور نہ گوپیا پھر اگر پتھر اتنی دُور پھینک سکتا تھا جتنی دُور میں پھینکتا تھا۔ اب مجھے شیر شکار کرنے کا شوق چرایا۔ لیکن جسے میں باپ کہا کرتا تھا اُس نے مجھے ایسے شوق سے منع کیا۔ اور کہا کہ "میری جان بڑی قیمتی شے ہے اُسے ایسے فضول کاموں میں پڑ کر خطرے میں ڈالنا ہرگز دُرست نہیں"۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا"۔ اتنا سُنکر میرے بڈھے باپ کی پیشانی پر بل آ گیا۔ کہنے لگا کہ "جس بات کا جب وقت آتا ہے تو

لہٰذا اس بات کو روشن کر دیتے ہیں۔ میں دل میں خفا وہاں سے چلا۔ وجہ یہ تھی کہ ابوتمیں میں ایک جوان آدمی رہتا تھا جس نے اور آدمیوں کو ساتھ لیکر بہت سے شیر مارے تھے۔ یہ شیر اُس کے باپ کے گلوں پر حملہ کرتے تھے۔ چونکہ وہ میری طاقت اور خوبصورتی سے جلتا تھا اس لئے اُسنے مشہور کر دیا کہ میں دل کا ہیٹا اور بزدل ہوں۔ جب شکار کو نکلتا ہوں تو سوائے گیدڑوں اور ہرنوں کے اور کچھ نہیں مار سکتا۔ یہ باتیں اُس وقت کی ہیں جب مَیں سترہ برس کا تھا۔ اور خاصا مضبوط جوان تھا۔

اُس دن ایسا ہوا کہ جب میں دل میں خفا اور افسُردہ خاطر ہو کر بڈھے سردار کاہن کے پاس سے چلا تو رستے میں وہ جوان مجھے ملا۔ اور مجھے چھیڑنے اور ذلیل کرنے کی غرض سے کہنے لگا "تمہیں خبر بھی ہے کہ ابوتمیں سے چار پانچ میل کے فاصلے پر جو نہر ایک بت خانے کے پاس سے نکلی ہے وہاں کنارے کے نرسلوں میں ایک شیر آیا ہوا ہے" اور چھیڑنے کے طور پر کہنے لگا "کہو میرے ساتھ شیر مارنے چلتے ہو۔ یا بڑھیوں میں بیٹھ کر بالوں میں کنگھی کے لئے گھر ہی میں پڑے رہو گے" مجھے اس کا یہ آخیر کا جملہ بہت ہی ناگوار گزرا۔ میں نے جواب دیا "اگر تم ایک شیر کا شکار کرنے چلتے ہو تو چلتا ہوں۔ اور شیر کو ڈھونڈ کر شکار کرتا ہوں پھر تمہیں معلوم ہوگا کہ میں دل کا ہیٹا اور بزدل ہوں"

پہلے تو اُس نے انکار کیا کیونکہ اُس زمانے میں عام طریقہ یہ تھا کہ بہت سے آدمی ملکر شیر مارنے نکلا کرتے تھے۔ انکار سُننے پر اب میری باری آئی کہ مَیں اُسے چھیڑوں اور ذلیل کروں۔ غرض وہ جوان راضی ہو گیا اور اپنے گھر جا کر ایک کمان کچھ تیر اور ایک تیز چاقو لایا۔ میں نے بھی ایک بھاری برچھا جس کا پھل بہت چوڑا اور تیز تھا سنبھالا۔ برچھا جدھر سے پکڑا جاتا تھا وہاں لٹو کی جگہ چاندی کا ایک انار بنا لگا تھا تاکہ برچھا چلاتے وقت ہاتھ نہ پھسلے۔

اب ہم دونوں چپ چاپ ادھر چلے جہاں سُنا تھا کہ شیر آیا ہوا ہے۔ جب ہم اس مقام پر پہونچے تو سورج ڈوبنے کو تھا۔ نہر کے کنارے ہم نے شیر کے پاؤں کے نشان دیکھے اور یہ بھی دیکھا کہ یہ نشان نرسلوں کے ایک جھنڈ تک گئے ہیں۔ اب میں نے اِس جوان آدمی سے کہا "ڈینگیں تو بہت مارتے تھے اب کہئے تو آپ پہلے نرسلوں میں جاتے ہیں یا مَیں چلوں" اور میں نے اس طرح قدم بڑھایا گویا مَیں آگے چلتا ہوں۔

اس پر وہ جوان بولا "کہیں ایسے پاگل نہ بننا۔ ہرگز اُدھر نہ جانا۔ ورنہ شیر ایک ہی جست میں ہمیں چیتھڑے کر دے گا۔ دیکھو، مَیں نرسلوں کے جھنڈ پر تیر چلاتا ہوں، اگر شیر سوتا ہوگا تو جاگ جائیگا" اتنا کہہ اُس نے نرسلوں کی طرف ایک تیر چلایا۔

نہیں کہہ سکتا کہ کیا بات ہوئی کہ اس کا تیر سوتے شیر کی کمر پر لگا اور جس طرح بجلی بادل میں چمکے اُس نے نرسلوں کے جھنڈ سے ایک جست لگائی۔ گردن کے بال سوئیوں کی طرح چمکتے پیلی پیلی ڈراؤنی آنکھوں سے وہ ہم دونوں کے سامنے دھم سے آن کودا۔ کمر میں تیر گھسا لرز رہا تھا۔ غصّے اور تکلیف میں شیر اس طرح دھاڑنے لگا کہ ساری زمین لرز اُٹھی ـــــ!

اب میرے اِن ڈینگئے دوست کے اَوسان خطا ہوئے۔ نیچے کا جبڑا لٹک گیا۔ جن انگلیوں سے کمان پکڑ لے تھا ایسی بے جان ہو گئیں کہ کمان اُن سے چھوٹ کر زمین پر گری اور ایک چیخ مار مُنہ پھیر وہ میری پشت کی طرف بھاگا۔ اس کے ہٹتے ہی میرا اور شیر کا اب بالکل آمنا سامنا ہو گیا۔ اب میں موت کے انتظار میں جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ خوف مجھ پر بیحد طاری تھا مگر میں بھاگا نہیں۔ شیر زمین پر دبک کر اس طرح بیٹھا جیسے شکار پر جست لگانے کو ہو۔ ادھر ہلا نہ اُدھر ایک زقند لگائی اور میرے سر سے اتنا اونچا اڑا کہ مجھے چھوا تک نہیں اور اس بھاگتے جوان کی پیٹھ پر جا گرا اور ایک پنجے سے اس زور کا تھپڑ مارا کہ سر پاش پاش ہو گیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے انڈے کو پتھر پر مارا ہو۔ وہ جوان مر کر گرا۔ اور شیر اُس کی لاش پر کھڑا زور زور سے دھاڑنے لگا۔ اب خوف سے میرے حواس جاتے رہے اور کچھ خبر نہ ہوئی کہ کیا کر رہا ہوں۔ برچھا مضبوط پکڑا اور ایک چیخ مار میں نے وہ برچھا شیر کے مُنہ پر مارا۔ برچھا اس کے حلق میں لگا۔ برچھے کا لگنا تھا کہ شیر پچھلے دونوں پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اُس کا سر میرے سر سے اونچا تھا۔ بار بار میری طرف پنجہ چلاتا مگر میں نے بھی جتنی طاقت مجھ میں تھی برچھا اسکے حلق میں گھسیڑا۔ چونکہ برچھے کا پھل شیر کے حلق میں دُور تک پہونچ گیا تھا اس لئے اُس کا پنجہ مجھ تک نہ پہونچ سکا۔ گو میرے سینے کی کھال کہیں کہیں سے وہ نوچ لے گیا۔ اب وہ [illegible] کے بل چت گرا۔ مگر تکلیف میں دھاڑتا ہوا اُٹھا اور ہوا میں دو قدِ آدم اونچا اُڑا۔ برچھے پر برابر پنجہ چلاتا رہا۔ دو مرتبہ اسی طرح ہوا میں اُڑ کر دونوں مرتبہ زمین پر پیٹھ کے بل گرا۔ پھر خون کے زیادہ نکل جانے کی وجہ سے اُس کی قوت نے جواب دیدیا اور ایک بیل کی طرح ڈکارتا ہوا وہ مر گیا۔ چونکہ میں ابھی لڑکا ہی تھا خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ حالانکہ جو چیز خوف کی تھی اب وہ زندہ نہ تھی۔

جب میں اس آدمی کی لاش کو جو مجھے ہمیشہ چھیڑا اور ذلیل کیا کرتا

تھا اور مردہ شیر کو دیکھ رہا تھا تو ایک عورت دوڑتی ہوئی میری طرف آئی۔ یہ دہی بڑھیا تو تھی جس نے (گو مجھے اس وقت علم نہ تھا) اپنے خون اپنے گوشت پوست کو میری جان بچانے کے لئے قربان کر دیا تھا۔ یہ عورت پانی کے کنارے جڑی بوٹیاں چن رہی تھی۔ اُسے ان چیزوں کی بڑی پہچان تھی۔ اُسے بالکل خبر نہ تھی کہ یہاں ایک شیر آیا ہوا ہے۔ (اور حقیقت بھی یہ تھی کہ کھیتوں میں شیر بہت کم آیا کرتے تھے۔ صحرا یا لیبیہ کے پہاڑوں میں البتہ انکی کثرت ہوتی تھی۔) مگر اس بڑھیا نے مجھے دور سے دیکھ لیا تھا کہ میں کس کام میں مصروف ہوں۔ جب وہ قریب آئی تو یہ تو وہ جانتی ہی تھی کہ میں ہرماکس ہوں۔ اس نے بہت ہی جھک کر اُس نے مجھے سلام کیا۔ اور شاہی القاب و آداب کے ساتھ وہ مجھے پکارنے لگی۔ اور کہا کہ عزت کے لائق صرف تم ہی ہو۔ شان و بزرگی کے لئے تقدیر نے تمہیں ہی منتخب کیا ہے۔ اُس نے مجھے فرعون اور ظالموں سے نجات دینے والا کہہ کر خطاب کیا۔

لیکن میں نے سوچا کہ خوف کی وجہ سے یہ بڑھیا دیوانی سی ہوگئی ہے۔ میں نے اُس سے دریافت کیا "آخر تم کیا کہنا چاہتی ہو؟۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ شیر مارنا کوئی بڑی بات ہے۔ تم کیوں مجھے ایسے عزت کے جملوں سے خطاب کرتی ہو۔ بہت لوگ پہلے بھی اور اب بھی موجود ہیں جنہوں نے شیر مارے ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ امن ہیتف اوسیری نے اپنے ہاتھ سے سو شیروں سے بھی زیادہ مارے تھے۔ میرے باپ کے کمرے میں جو اسکاربیوس لٹکا ہے کیا اُس پر یہ نہیں لکھا ہے کہ امن ہیتف نے اپنے ہاتھ سے سو شیروں سے بھی زیادہ کا شکار کیا تھا۔ کیا اور لوگوں نے بھی ایسا نہیں کیا تھا تو پھر بڑی بی تم کیوں ایسے بڑے بڑے القاب آداب سے مجھے پکارتی ہو۔"

بڑھیا سے جو کچھ میں نے اس وقت کہا اُس کی وجہ یہ تھی کہ شیر تو میں مار ہی چکا تھا اب نوجوانوں کی طرح میں یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ لیکن بڑھیا نے بڑے ادب سے بار بار سلام کر کے ایسے عزت کے الفاظ سے مجھے خطاب کرنا بند نہ کیا۔ میں اسکے ان تعریف اور عزت کے جملوں کو اپنے لئے اتنا برتر اور بلند سمجھتا تھا کہ ان کو یہاں لکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔

بڑھیا کہنے لگی بولے شاہانِ گذشتہ کی یادگار، تیری ماں کی یہ بڑی دانشمندی تھی کہ اُس نے تیرے حق میں پیشین گوئی کی۔ اُس وقت ضرور اُس میں نیفت کی مقدس روح حلول کر چکی تھی۔ تجھے ایک خدا نے عورت کے بطن میں ڈالا تھا۔ دیکھ یہ اس پیشینگوئی کا نتیجہ۔ یہ شیر جو وہاں مرا پڑا ہے۔ روما کے قصر کپیتول میں گرجا کرتا تھا۔ اور وہ آدمی جو مرا پڑا ہے وہ بطلیموس مقدونیہ کا بچہ ہے جو نیل کی زمین پر ستیاناسی کی بیل کی طرح پھیل چکا ہے۔ تو اس مقدونی فرعون کے ساتھ روما کے شیر کو مارنے جاتے گا لیکن یہ مقدونی بچہ سگ بھاگ جائیگا اور روما کا شیر اُسے مار ڈالے گا۔ اور تو اس شیر کو ہلاک کریگا۔ اور خیم کی یہ مقدس زمین ایک مرتبہ پھر آزاد ہو جائیگی۔ آزاد۔ بالکل آزاد۔ پر اتنا ضروری ہے کہ تو اپنے کو پاک اور پوتر رکھے، جیسے کہ خداؤں کے احکام میں آتا ہے۔ اے خاندانِ شاہی کے فرزند ارجمند اور اے خیم کی اُمید و توقع۔ لیکن ہوشیار رہیو اُس عورت سے جو غارت گر ہے۔ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہی ہوگا۔ میں محتاج اور مصیبت زدہ ہوں اور تو غموں کا مارا ہے۔ میں نے ایک ایسی بات ظاہر کر کے جسے چھپانا چاہیئے تھا ایک بڑا گناہ کیا ہے۔ اور اسی گناہ کی پاداش میں اُسے کھو بیٹھی ہوں جو میرے خون اور بطن سے تھا۔ میں نے خوشی سے یہ سب کچھ گوارا کیا۔ لیکن مجھ میں اپنی قوم کی کچھ عقل باقی ہے، اور خدا جن کی نظروں میں سب ایک ہیں مفلسوں اور محتاجوں سے منہ نہیں پھیرتے۔ دیبی آئی سیس نے مجھ سے بات کی اور کل رات کو اس نے مجھ سے کہا کہ میں یہاں جڑی بوٹیاں چننے آؤں۔ اور جو علامتیں مجھے نظر آئیں وہ تجھ پر ظاہر کروں۔ اور یہ کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ اسی طرح پیش آئے گا۔ اگر تو نے اُس شیطانی اغوا سے اپنے تئیں بچالیا جو تجھے پیش آنے والا ہے۔ اے شاہانِ ماضی کی یادگار ادھر آ" یہ اتنا کہہ وہ بڑھیا مجھے نہر کے کنارے لے گئی۔ نہر کا پانی یہاں بہت گہرا اور شفاف تھا۔ پھر وہ بولی کہ "پانی میں اپنا عکس دیکھ کیا یہ پیشانی اس لائق نہیں ہے کہ دونوں مصروں کا تاج اُس پر رہے۔ کیا ان آنکھوں سے شاہانِ ذوالقدر کا دبدبہ ظاہر نہیں ہوتا۔ کیا خالقِ عالم ربِ جاج نے تیرا قد و قامت اس لئے نہیں بنایا ہے کہ ردائے قیصری اس پر زیب دے اور مخلوق کی نظریں تیرے ذریعے خدا کو دیکھیں۔"

بڑھیا نے اب آواز بدل کر اور ایک عورت کی سی تیز آواز بنا کر کہا "نہیں، نہیں میں اتنی احمق نہیں ہوں۔ کیا اتنا بھی نہیں جانتی کہ شیر کے ناخن کا نہٹا زہریلا ہوتا ہے اور وہ سانپ کے کاٹے کی سمیت کم نہیں ہوتا۔ علاج اس کا فوراً ہونا ضروری ہے۔ ورنہ زخم پک کر جلد پھٹنے لگے گی۔ اور ساری عمر رات کو خواب میں شیر ہی شیر بلکہ سانپ دیکھا کریگا۔ اور پھر اس زخم کی وجہ سے اور بیسیوں پھنسی پھوڑے نکل آئیں گے۔ میں یہ بات خوب جانتی ہوں اچھی طرح جانتی ہوں۔ بڑھاپے نے مجھے مفت میں پاگل نہیں بنایا ہے سمجھ لے ہر چیز میں تو انائی

موجود ہے۔ دیوانگی میں عقل اور عقل میں دیوانگی موجود ہے۔ لا۔ لا۔ فرعون بھی نہیں بتا سکتا کہ ایک کہاں شروع ہوتی ہے اور دوسری کہاں ختم ہوتی ہے۔ بس اب وہاں ہر چیز کو کھڑا بُت بنا دیکھنا بند کر۔ ذرا تن کر کھڑا ہو کہ میں تیرے سینے کے زخموں پر یہ ہری ہری بُوٹیاں لگا دوں اور تیری جلد ایسی صاف ستھری ہو جائے جیسے دودھ پیتے بچّے کی ہوتی ہے۔ لگاتے ہی جلن تھوڑی سی ضرور ہوگی اُسے سہار لیجیو۔ قسم ہے اس کی جو فیلی یا اَنُوبیر یا ابی دوس میں یا جیسا کچھ بھی خیال اس بارے میں ہمارے معلمانِ دین کا ہو، غرض جہاں کہیں بھی وہ آسودہ ہے۔ قسم ہے اس مقام کی جسے ہم ضرور کے وقت دریافت کر لیں گے اور قسم ہے اوسیرس کی کہ تو زخموں سے ایسا پاک صاف ہو جائے گا جیسے نیا چاند نکلنے پر دیبی آئی سیس کی قربانی کا جانور پاک صاف ہوتا ہے۔ بس اب مجھے یہ بُوٹیاں اپنے زخموں پر لگانے دے۔

لوگو جو کچھ میں کہہ رہی ہوں کیا وہ ٹھیک بات نہیں ہے؟" اتنا کہکر اس بُڑھیا نے ان آدمیوں کی طرف مُنہ کیا جو اس وقت جبکہ بڑھیا میری نسبت پیشین گوئی کر رہی تھی جمع ہو گئے تھے۔ اور مجھے اُن کے جمع ہو جانے کی مطلق خبر نہیں ہوئی تھی۔ "میں ابھی ایک منتر پڑھ رہی تھی تاکہ دوا کا اثر پورا پورا ہو۔ لا۔ لا۔ منتر کے برابر بھی کوئی چیز نہیں۔ اگر تمہیں یقین نہ آئے تو دو سو برس جب تمہاری بیویاں بانجھ ہو جائیں تو میرے پاس آنا۔ یہ چیز اوسیرس کے بُت خانوں کے ستونوں کو کھُرچ کر صاف کرنے سے نہیں ملتی۔ میں تو تمہاری بیویوں کو بچّوں والا اس طرح بنا دوں گی جیسے بیس برس کا جوان کھجور کا پیڑ کھجوروں سے لد جاتا ہے۔ پہلے یہ تو سمجھ لو کہ تم کیا کہہ سکتے ہو۔ اصل بات تو یہی ہے۔ ویسے تو انسان کسی نہ کسی مطلب پر پہونچ ہی جاتا ہے"

جب مجھ ہرماکس نے یہ باتیں سُنیں تو میں نے سر کو ہاتھ سے پکڑ لیا۔ اور سوچنے لگا کہ جو کچھ سُنتا ہوں یہ خواب میں سنتا ہوں یا بیداری کی حالت میں۔ لیکن جب نظر اونچی کی تو دیکھا کہ اس مجمع میں ایک سپید سر کا آدمی بھی موجود ہے جو ہم سب کو بہت غور سے دیکھ رہا ہے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ بادشاہِ مصر بطلیموس کا جاسوس ہے۔ بلکہ یہ وہی آدمی ہے جس نے مجھے جبکہ میں بچّہ سا پنگھوڑے میں پڑا تھا جان سے مارنا چاہا تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ بڑھیا اَتوا نے اس آدمی سے کیوں ایسی بیوقوفی کی باتیں کیں ——!

اس جاسوس نے کہا "بڑھیا تیرے منتر تو عجیب ہیں۔ تُو نے تو فرعون اور دو سکندر تاج اور ایسے قد و قامت کا ذکر کیا ہے جسے خالقِ عالم ربِ فلاح نے خلق کیا ہے۔ کیوں کیا میں جھوٹ کہتا ہوں؟"

بُڑھیا اَتوا بولی "ہاں ہاں، یہ سب باتیں میرے منتر میں آتی ہیں پر احمق نہ بنو۔ بجز بطلیموس نے نواز کے دوسرا کون نام ہے جس کی کوئی قسم کھا سکے۔ بطلیموس کی نے نوازی تو وہ ہنر ہے جو اس ملک کے حسن و مسرت کو بڑھاتا ہے۔ دو ملکوں کا تاج حکومت جو اس کے سر پر ہے اس سے بڑھکر کیا چیز ہو سکتی ہے۔ یہ چیز تو وہ ہے کہ مقدونیہ کا اسکندر اعظم بھی ہوتا تو فخر کرتا۔ اچھا تم تو سب باتیں جانتے ہو۔ بھلا بتاؤ تو اسکندر کی قبائے شاہی جو تھرادلیس کوس کے شہر کو لے گیا تھا وہ واپس ملی یا نہیں۔ سب سے آخر میں پومپی نے فتح کی خوشی میں اُسے پہنا تھا۔ ذرا خیال تو کرو پومپی اور اسکندر اعظم کی قبا پہنے۔ یوں سمجھو کہ کتّے کے پلّے نے شیر کی کھال پہن لی۔ رہی شیر دل کی بات چیت تو دیکھو اس لڑکے نے اپنے برچھے سے کیسا زبردست شیر شکار کیا ہے۔ گاؤں والو تمہیں خوش ہونا چاہیئے۔ یہ شیر بڑا ہی خونخوار تھا۔ اسکے دانت اور ناخن تو دیکھو، مجھ بڑھیا احمق کا تو دیکھتے ہی چیخیں مارنیکو جی چاہتا ہے اور ذرا اس مرد کی لاش کو بھی دیکھئے جسے شیر نے مارا ہے۔ افسوس اُسکی رُوح تو اوسیرس میں پہونچ گئی اور جسم یہیں پڑا رہا۔ خیال تو کرو ابھی پورا ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا ہے کہ یہ میری تمہاری طرح ایک فانی انسان تھا۔ اچھا اب جلدی سے اُٹھا کر اس لاش کو مومیا سازوں کے حوالے کرو۔ ورنہ ایسی جلتی دُھوپ میں لاش پھولنے لگے گی۔ اور پھٹ کر اُسکے اتنے ٹکڑے ہو جائیں گے کہ مومیا سازوں کو لاش کے کاٹنے کی بھی ضرورت نہ رہے گی۔ بہرکیف کچھ روپیہ ضرور خرچ کرنا پڑیگا اور ستر دن تک اس غریب کو ضرور شورے کے پانی میں پڑا رہنا پڑیگا۔ لا۔ لا۔ میری زبان تو دیکھو کیسی فر فر چلنے لگی ہے۔ اب تو اندھیرا ہو چلا۔ ہائیں کیا تم اس غریب کی اور شیر کی لاش کو یہاں سے نہ اُٹھاؤ گے۔ اچھا میرے لال، بُوٹیاں جو میں نے لگائی ہیں اُنہیں اپنے سینے پر لگا رہنے دیجیو۔ پھر شیر نے جو نہتّے تیرے سینے پر لگائے ہیں دملچے ہو کر معدوم تک نہ ہونگے۔ دو چار باتیں البتہ مجھے آتی ہیں باقی تو نکلی بڑھیا ہوں اور تُو میرا نواسہ ہے۔ اور مجھے تو بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ سردار کاہن نے تجھے اپنا بیٹا بنا لیا۔ اور بیٹا اُس وقت بنایا جبکہ بادشاہِ وقت نے (خدا اسکے نام کو برکت دے) اس سردار کاہن کے بیٹے کو قتل کرا دیا تھا۔ تُو تو بڑا بہادر ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ اگر ہرماکس جیتا ہوتا تو وہ ایسا زبردست شیر مار سکتا"

جاسوس بولا "بڑھیا باتیں تو تُو بہت جانتی ہے اور زبان بھی تیری بڑی تیزی سے چلتی ہے"

غرض اس بڑھیا نے جاسوس کو دھوکے میں ڈال دیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ جوان بڑا بہادر اور دلیر ہے۔ لوگو ادھر آؤ۔ اس آدمی کی لاش کو اٹھا لے چلو اور کچھ لوگ میرے ساتھ ہوں پھر اس شیر کی کھال اتاریں۔ جوان آدمی، ہم کھال اُتار کر تجھے بھیج دیں گے۔ اسے انعام نہ سمجھیو۔ کیونکہ اس جیسے شیر پر حملہ کرنا بیوقوفی میں داخل تھا اور اسکے صلے میں بجز موت کے اور کیا ہو سکتا تھا۔

"کبھی مضبوطوں کا مقابلہ نہ کرو تاوقتیکہ تم اُن سے زیادہ مضبوط اور قوی نہ ہو۔"

میں یہ سب کچھ دیکھتا سنتا تعجب کرتا اپنے گھر چلا گیا۔

عنایت اللہ دہلوی

سلام

تمہیں چمن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں
یہ مست مست گھٹائیں سلام کہتی ہیں

گلوں کے خندۂ رنگین و پُرحیا کی قسم
کلی کلی کی ادائیں سلام کہتی ہیں

ہر ایک خارِ گلستاں ہے سر جھکائے ہوئے
گلوں کی تنگ قبائیں سلام کہتی ہیں

وہ جنکو تم نے کبھی آج تک سُنا ہی نہیں
وہ نامراد صدائیں سلام کہتی ہیں

خدا رکھے مرے قائم یہ دیدۂ پُرآب
برس برس کے گھٹائیں سلام کہتی ہیں

قبول ہوں کہ نہ ہوں یہ تو اور بات رہی
مگر یہ دل کی دُعائیں سلام کہتی ہیں

تمہیں کریم ہو تم کو ہے بندگی میری
تمہیں کو میری خطائیں سلام کہتی ہیں

تمہارے ظلم و ستم کا گلہ نہیں ہے کوئی
جفا پسند وفائیں سلام کہتی ہیں

خُدا تمہیں مری دُنیا میں بامُراد رکھے
مجھے فسُردہ رکھے اور تم کو شاد رکھے

بہزاد لکھنوی

ناداں ترا ماحول ہے خود تیرے اثر میں

فطرت کا تقاضا ہے کہ رکھ کھول کے آنکھیں ۔۔۔ اور دیکھ کہ ہستی کا طلسمات یہ کیا ہے؟
کیوں شمس و قمر وقفِ تگ و دو ہیں شب و روز؟ ۔۔۔ دن ہے کبھی اور رات کبھی۔ بات یہ کیا ہے؟
اثبات بھی ہر چیز میں اور نفی بھی موجود ۔۔۔ ردّ و کشش باہمِ ذرّات! یہ کیا ہے!
گلبانگِ بہاراں ہے جہاں خلد مسرّت ۔۔۔ گلشن میں وہیں محشرِ ہیہات! یہ کیا ہے!
عالم کی ہے جو شے بھی بظاہر تو ہے خاموش ۔۔۔ باطن میں مگر حرف و حکایات! یہ کیا ہے!
ہر لحظہ خاموش ہے یا عدل کی میزاں ۔۔۔ ہے وقت کہ قانونِ مکافات! یہ کیا ہے!
یہ پردۂ رنگیں ہے کہ اک عکسِ نگاریں ۔۔۔ یوں نور میں ڈوبی ہوئی ظلمات! یہ کیا ہے!

نظّارے سے کھو جا نہ مگر وہم و گماں میں
میخانہ بہ پہلو ہے تو ہی بزمِ جہاں میں

ہر چیز کی ہستی میں جدالِ ازلی ہے[1] ۔۔۔ اضداد جبھی تو ہیں تخیّل کا سراپا
ہر وصف کی ضد اُس میں ہی موجود ازل سے ۔۔۔ اعجاز ہے اعجاز یہ فطرت کا کرشمہ!
ہوتی نہ کبھی شام اگر صبح نہ ہوتی ۔۔۔ شب روز کی بیٹی ہے تو دن رات کا بیٹا
ہے "مثبت و منفی"[2] کا تعاون و تصادم ۔۔۔ آتی ہے نظر آپ کو جو آپ کی دُنیا
ہوتی نہ اگر ردّ و کشش ذرّوں میں مضمر ۔۔۔ دُنیا میں کبھی نظم یہ قائم ہی نہ رہتا
ہستی کی ہے تنظیم اسی رُوحِ رواں سے ۔۔۔ فطرت کا ہے تنظیم ہی عاقل کو اشارہ
تو خود بھی تو "پیکار کی دُنیا" ہے کفِ خاک ۔۔۔ تنظیم مگر اپنی نہیں تجھکو گوارا
افکار پریشاں ہیں تو افعال ہیں بے ضبط ۔۔۔ لے عقل سے کچھ کام کفِ خاک خدارا

خوبی و خرابی ہے اِسی فکر و نظر میں
ناداں! ترا ماحول ہے خود تیری نظر میں

امینِ حزیں

[1] Plus and Minus [2] Dialectic

اُردو

اُردو زبان کا تعلق کئی زبانوں سے ہے اور السنۂ قدیم کا تعلق بہت دُور تک پہونچتا ہے، اس لئے اُردو سے پہلے چند قدیم زبانوں کا ذکر کرنا نہایت ضروری ہے۔

دُنیا میں کوئی زبان مفرد نہیں ہوتی کیونکہ ایک ملک نہ تو تمام دنیا کی چیزوں کو مہیا کرسکتا ہے نہ تمام اشیاء کے اسماء الفاظ پر کوئی ایک قوم حاوی ہوسکتی ہے، باہر کی چیزیں خصوصاً فاتحوں اور ہمسایہ ممالک کی لائی ہوئی اشیا اور انکے نام ہر ملک اور ہر زبان میں داخل ہوتے ہیں، آغاز تمدن سے یہ سلسلہ جاری ہے۔

دُنیا میں سب سے قدیم زبانیں دو ہی ہیں، ایک سامی (آرامی) اور دوسری سومری یا اکادی، سامی زبان کو ہم مذہبی روایت کی رُو سے حضرت نوح کی زبان قرار دے سکتے ہیں، جسے ان کے سب بیٹے استعمال کرتے تھے، لیکن جب وہ جُدا ہو کر مختلف ملکوں میں آباد ہوئے تو سب کی زبانیں مختلف ہوگئیں۔ سام کی اولاد میں توریت کے مطابق، آرام، عیلام اور اشور وغیرہ تھے۔ عرب میں یمن سے حجاز تک آرام اور اُن کی نسل آباد تھی، جو عراق تک بڑھ گئے تھے، ان تمام مقامات کی زبان حضرت مسیح سے چار ہزار برس پہلے سامی تھی، جب ان لوگوں نے بابل پر حملہ کرکے غلبہ حاصل کیا تو ان کی زبان وہاں سومری اور اکادی میں شامل ہوکر غالب ہوگئی۔ اس طرح سوریا (شام) میں جہاں اشور کی اولاد آباد تھی عابد کی وجہ سے عربی یا عیرانی زبان شامل اور جاری ہوگئی۔ سوریا میں شام کی زبان سریانی صرف توریت میں اور عبرانی صرف انجیل میں باقی رہ گئی۔

تقریباً اس سے کچھ پہلے مصر میں تین زبانیں مستعمل تھیں ایک مقدس اور مذہبی، دوسری علمی اور تیسری بازاری۔ اسی زمانے میں فینشن اور آرین قوموں کو دُور دراز ملکوں کا سفر کرنا پڑا، یہ سفر شام سے ایران تک اور ایران سے ہندوستان تک کئے گئے، فینشن چین کی طرف چلے گئے اور آرین ہندوستان میں رہ گئے، ایران میں ژند، پاژند اور اوستا کی زبان آریوں کی سنسکرت سے اس قدر ملتی جلتی ہے کہ ہزاروں الفاظ میں یہ امتیاز مشکل ہوگیا ہے کہ وہ سنسکرت کے الفاظ ہیں یا دری پہلوی اور اس سے قبل کی ایرانی زبانوں کے۔

آریہ جب ہندوستان میں داخل ہوئے تو اُنکے ساتھ سنسکرت میں وہ بکثرت تھے جو ایران و سنسکرت میں مشترک ہیں اور جو اس لئے ابتک محفوظ و موجود اور بے تغیر ہیں کہ سنسکرت کی تعلیم عوام کو نہیں دی گئی، اور فارسی زبان میں جس طرح عرب پڑوسیوں اور فاتحوں کے بے شمار الفاظ داخل ہوگئے اسی طرح سنسکرت میں غیر زبان کے الفاظ ہندوستان میں آنے کے بعد سنسکرت میں مخلوط نہ ہوسکے۔ مگر فارسی اور سنسکرت کا میل جول ایران کو چھوڑنے اور ہندوستان آنے سے پہلے جو کچھ ہوچکا تھا وہ نہ صرف مضبوط رہا، بلکہ اُس نے دو بنیادی اور تاریخی اُصول قائم کردئے، اوّل یہ کہ ایران و سنسکرت الفاظ کے باہمی اتحاد و اشتراک کے ثبوت میں ایک بڑی فرہنگ تیار ہوسکتی ہے۔ دوم یہ کہ اگر ہم یہ مان لیں اور ماننا پڑیگا کہ فارسی اور ہندی کے میل جول سے اُردو مرکب ہوئی تو یہ بھی تسلیم کرنا لازمی ہے کہ فارسی الفاظ کا داخلہ سنسکرت کے پردے میں سب سے پہلے آریوں کے ہاتھ سے ہوا۔ یعنی اُردو کی تخم ریزی کے موجد آریہ ہیں ۔

آریوں کے بعد ایک ایسی زبان سے ہندوستان کو سابقہ پڑا جو ہندوستانی زبانوں سے نامناسبت اور بُعد رکھتی ہے: یعنی عربی، جس طرح ہندوستان کو ملک عرب کی ملاقات کے لئے خلیج فارس پھاندنا پڑتی ہے اسی طرح ہندی بھاشا اور عربی کے درمیان فارسی کڑی جب تک نہ ملی، دونوں کا میل جول نہ ہوسکا، اور میل کے بغیر اُردو کا بننا غیر ممکن تھا۔

چارسو برس ہند میں عربوں کا دور دورہ رہا ہرچند کہ عربی اثر سندھ، کشمیر اور تمام سواحل عرب پر اس قدر رہا کہ آج تک پنجاب سرحدی مقامات پر مسلمانوں اور ہندوؤں میں امتیاز مشکل ہے، وضع قطع، تمدن، معاشرت اور چال چلن میں دونوں قومیں متحد ہیں، مگر اس پر بھی ان ملکوں کی پراکرتوں نے عربی سے ملکر ادبی بُعد کی وجہ سے کوئی بین الاقوامی زبان پیدا نہ کی۔

آریوں کے بعد فارسی الفاظ کی دوسری کھیپ سلطان محمود کے ساتھ ہندوستان میں آئی۔ یہ درآمد صرف تلواروں ہی کے ذیل میں نہ تھی بلکہ تجارتی، اقتصادی، معاشرتی اور علمی و ادبی ذرائع سے بھی

تبادلۂ الفاظ کا سلسلہ جاری ہوا۔ پنجابی، پالی، سوراسینی، گجراتی اور بہت سی مختلف زبانوں میں فارسی مضامین اور کتابوں کے ترجمے ہونے لگے۔ ان ترجموں کے ذریعے سے ایجاد اُردو کی جو داغ بیل پڑی اس کے بانی بھی اتفاق سے ہندو ہی تھے۔ کیونکہ پنڈت تلک ہی پہلا شخص تھا جس نے اصفہان جاکر فارسی کی تعلیم حاصل کی، اور واپس آکر سنسکرت کو فارسی میں کتابوں کا ترجمہ کیا جو بنیاد اُردو میں سب سے اہم چیز ہے، اسکے بعد رواج اُردو کا جو مستقل کاروبار شروع ہوا وہ ہندوستان میں فارسی کی تعلیم کی ترویج تھی۔ ہندوستانی سپاہی سلطان محمود کی فوج میں ملازم ہوکر غزنی تک گئے اور فتح وظفر کے تمغے لیکر ہندوستان واپس آئے۔ اسی زمانے میں اُردو نے دوسری منزل طے کی۔

تین سو برس میں پنجاب نے اُردو کو مکمل تو نہیں مگر مضبوط اس قدر کردیا کہ وہ فنا نہ ہوسکی۔ بلکہ یہاں تک پہونچ گئی کہ اُس زمانے کی اُردو میں سعد بن مسعود کا دیوان تیار ہوگیا۔ اس کا تذکرہ لب الالباب اور خسرو کے دیباچے غرۃ الکمال میں بھی آگیا اور جب آٹھویں صدی میں قطب الدین ایبک نے اپنا دارالسلطنت لاہور سے دہلی کو منتقل کیا ہے تو لغت آدات الفضلاء میں فارسی الفاظ کے معنی ہندی یعنی اس زمانے کی اُردو میں لکھے گئے۔ تقریباً اسی زمانے میں حضرت فریدالدین شکر گنج کی ایک نظم جس میں اس قسم کے اُردو ٹکڑے ہیں: "ابھی رات ہے" "وہی سات ہے" وغیرہ وغیرہ تصنیف ہوئی، اور جب اُنہوں نے اپنے مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح سے کہا کہ "آنکھ آئی ہے" تو آپ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ "اگر آئی ہے جرابستہ اند" امیر خسرو کے اُردو ٹکڑے نظم و شعر میں شہرۂ آفاق ہیں اور وہ اس قدر مشہور اور اتنے زیادہ ہیں کہ مثال اور ثبوت کی حاجت نہیں۔

اسکے بعد تقریباً اسی صدی میں حاجی قوام الدین، شیخ الاسلام، مولانا سعداللہ لکھنؤ میں، شیخ احمد عبدالخالق ردولی میں، شاہ مینا لکھنؤ میں، شیخ شرف الدین یحیی منیری بہار میں، شیخ اشرف جہانگیر سمنانی، شیخ نورالحق پنڈوی بنگال میں، قطب عالم بن محمود بن سید جلال الدین اور عبداللہ الحسینی گجرات میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز دکن میں ابتدائے اُردو پر احسان کرنے والوں میں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ کبیر، گرو نانک اور سورداس خاص طور پر اُردو کے محسنوں میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے بعد ان کے جانشینوں نے اپنے اُردو اقوال سے گویا اعلان کردیا ہے کہ اُردو کے موجودہ اور ترقی دینے والوں میں مسلمان اور ہندو یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔

بعض کم نظر خسرو اور کبیر وغیرہ پر اعتراض کرتے ہیں اور ان کے کلام کو مشکوک بتاتے ہیں، میری گذارش یہ ہے کہ جس زمانے میں فن تاریخ نہ تھا اُسی زمانے کے واقعات کا تاریخوں اور دلیلوں سے ثبوت بہم پہونچانا ناممکن ہے، یہ روایتیں اُسی وقت غلط ثابت ہونگی جب یہ یقین ہو جائے کہ ان اشعار کے مصنف بجائے خسرو اور شکر گنج، فلاں اور فلاں ہیں، اور جب تک یہ بات یقینی طور پر ثابت نہ ہو جائے تو ہم یکساں روایات پر شک کرنے کی وہم کے سوا کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔

دلی میں آکر اُردو پروان چڑھی اور رن چڑھ کر سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ اودھ ہوتی ہوئی بہار، بہار کی راہ سے بنگال، بنگال سے مرشدآباد اور ڈھاکہ غرض تمام مشرقی ہند میں پہونچ گئی، جب محمد تغلق نے دارالسلطنت دہلی سے دیوگڈھ منتقل کیا اور اس کا نام دولت آباد رکھا اس وقت اُردو کا داخلہ گجرات میں ہوا۔ اگرچہ اس سے پیشتر بھی ہزارہا فارسی الفاظ کا ذخیرہ وہاں پہونچ گیا تھا، مگر دارالسلطنت ہونے کے بعد اُردو نے رفتہ رفتہ اپنے کو انتہائی عروج تک پہونچا دیا، بیشمار شعراء اور ادیب اُردو زبان کے مصنف اور مولف شہرۂ آفاق ہو گئے۔

بہمنی، قطب شاہی اور نظام شاہی قلمرو کے اُردو مخطوطے ابھی تک نہیں ملے ہیں، اگر کبھی نہ ملیں تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ تاریخی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ گجرات میں اُردو بہت قدیم اور عام زبان تھی مثلاً قطب عالم نے ۸۰۰ھ سے پہلے گجرات میں فرمایا ("بیٹے تسانیب دوہوں دیکھ") یعنی بیٹے تیرے نصیب میں دونوں ہیں۔ اور " لوہا یا لکڑیا پتھر یا کیاہے" اور حضرت خواجہ بندہ نواز مصنف معراج العاشقین نے ساٹھ برس دہلی رہ کر اسی برس کی عمر میں گجرات و دکن کا سفر کیا۔ تاریخ دیجانگر اور تاریخ فرشتہ میں جابجا ظاہر کیاہے کہ گجرات اور بیجاپور میں ہندی (اُس زمانے کی اُردو) اچھی طرح بولی جاتی تھی۔ تاریخ فتوحات عادل شاہی میں فارسی سے زیادہ ہندی کا رواج تھا۔ غرضکہ یہ سب باتیں اس امر کے استدلال کے لئے کافی ہیں کہ گجرات میں بہمنی عہد میں اُردو شعر و ادب اچھی خاصی ترقی کر رہا تھا۔ لیکن یوسف عادل شاہ نے بیجاپور میں خودمختار حکومت قائم کرتے ہی ترکوں اور ایرانیوں کو بڑے بڑے عہدے دے دئے اور اُردو کی طرف سے نگاہیں پھیرلیں۔ اپنے بیٹے اسمٰعیل کو بھی اُردو کی طرف توجہ کرنے سے منع کیا۔ خیر اُردو غریب نے اتنے دنوں صبر کیا مگر ابراہیم عادل شاہ اول کے عہد میں پھر اُردو کے دن پھرے، گجرات کے شعرا بکثرت آنے لگے۔ ایرانیوں اور ترکوں سے جگہیں خالی کراکے برہمنوں اور ہندوستانی مسلمانوں کو عہدے دئے گئے، یہاں تک کہ سرکاری حسابات

فارسی کی جگہ اُس زمانے کی اُردو میں لکھے جانے لگے۔ یہ کام خاص طور سے دکھنی برہمنوں کا تھا۔ اسی زمانے میں شاہ برہان الدین جانم کے اُردو نثر و نظم کی کتابیں تصنیف ہوگئیں۔ ابراہیم کے بعد علی عادل شاہ نے پھر اُردو کی طرف سے سرد مہری کی۔ لیکن اب یہ اس منزل پر پہونچ چکی تھی کہ وہاں سے پیچھے لانا غیر ممکن تھا۔ اگرچہ اُس زمانے میں اُردو کی رفتار کچھ سست ہوگئی تھی لیکن جب ابراہیم عادل شاہ کا زمانہ آیا تو ساری کمی پوری ہوئی اور اُردو نے حد سے زیادہ ترقی کی، خود بادشاہ اُردو شعر کہنے لگا۔ اور نثر میں ایک کتاب فن موسیقی پر نورس نامہ کے نام سے ایسی لکھی کہ ظہوری کے مقدمہ نے اُسے سند دوام لکھدی۔ اب جبکہ بادشاہ اُردو کا شاعر اور ادیب ہوگیا تو رعایا کا کیا ذکر ہے۔ ایرانی بھی اُردو شعر کہنے لگے۔ آتشی اور مقیمی فارسی گو تھے اُردو گو ہوگئے۔ مقیمی نے ایک مثنوی بہرام و بانو حسن تصنیف کی۔ انکے علاوہ صنعتی، نصرتی، شاہ ملک، امین، مرزا، آیاغی، سیوا، مومن وغیرہ بھی بڑے قادر الکلام شعرا تھے جنہوں نے اُردو میں کمال ہنر دکھایا۔

زوال گجرات کے بعد شاعری اور انشاپردازی انتقال حکومت کے ساتھ دکن میں منتقل ہوئی، یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ گجرات میں اُردو نے زیادہ وسعت حاصل کی یا دکن میں۔ کیونکہ دکن میں بھی ہزاروں مثنویاں اور بیشمار مرثیے اور تمام اصناف سخن اس کثرت سے تصنیف و شائع ہوئے کہ اُن کا احاطہ نہیں ہوسکتا، یہاں تک کہ بادشاہوں نے کمال ذوق و شوق سے اس فن کی طرف توجہ کی بلکہ سینکڑوں شاعروں کو سلاطین عادل و قطبیہ اصلاح دیا کرتے تھے۔ ان سلاطین میں خصوصیت سے قابل ذکر محمد عادل شاہ اس کی ملکہ خدیجہ، محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تاناشاہ تھے۔

دکن کے مقابلے میں شمالی ہند اُردو کے شاعر و ادیب اسی لئے زیادہ پیدا نہ کرسکا کہ تمام آبادی اور حکومت پر ایرانیوں کا اثر غالب تھا۔ ان کا ادبی ذوق فارسی زبان میں محدود تھا اور ایرانیوں کا سلسلہ ایک سیلاب عظیم کی طرح جاری اور محیط رہا۔ یہ سلسلہ اُس وقت تک رہا کہ عالمگیر نے دکن کو فتح کرلیا۔ لیکن جس وقت شمالی ہند کے ادیبوں نے اُردو کی طرف توجہ کی ہے اُسی وقت سے ان لوگوں کے دماغ اُردو کی اصلاح و تصحیح کی طرف متوجہ ہوتے۔ اسی اصلاح نے یہاں تک ترقی کی کہ آگرہ و دہلی میں خان آرزو، جان جاناں مظہر، شاہ حاتم، میر محمد تقی میر، مرزا سودا، میر درد، قائم، مرزا غالب، مومن اور ذوق، ایسے ایسے باکمال شعرا نے ترقی یافتہ اُردو کا مظاہرہ کیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا جواب ہندوستان بھر کے شاعروں میں مشکل سے ملیگا۔

غرضکہ زبان کی ترقی و اصلاح شمالی ہند کے حصے میں آئی، اور ترویج و توسیع اور اشاعت جنوبی ہند کی قسمت میں تھی۔

اُردو ادبیات کے متعلق یہ امر خصوصیت سے قابل توجہ ہے کہ عالمگیر کے فتح دکن سے پہلے ایک صوبے کی اُردو دوسرے صوبے میں بہت مشکل سے سمجھی جاتی تھی، لیکن جب شمالی و جنوبی شاعروں کا میل جول شروع ہوا تو زبان میں مساوات کی ابتدا ہوئی اور تمام ہندوستان میں اصلاح شدہ اُردو کے ذریعے نثر و نظم میں تصنیفات و تالیفات کا سلسلہ قائم ہوا۔ یہی وہ منزل ہے جو ہر شائستہ کی منزل تکمیل ہے۔

افسوس ہے کہ مجھے اس مقام پر ایک دلخراش حقیقت کا ذکر کرنا پڑ رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ مساوات جو دنیا بھر میں ہر ادب کی محبوب و مرغوب شے ہے اُس سے آجکل ہندوستانی دُور ہوتے جارہے ہیں اور پھر اس مقام پر پہونچ رہے ہیں جس مقام پر اب سے کئی سو برس پہلے تھے۔ بعض مسلمان عربی اور فارسی کے مشکل اور نامانوس الفاظ اور اکثر ہندو سنسکرت کے غیر مستعمل اور ثقیل کلمات اُردو میں شامل کرکے اُردو کو ناقابل فہم بنا رہے ہیں گویا اگلا زمانہ پھر واپس آرہا ہے۔

اس سلسلے میں اُردو شاعری کے متعلق مجھکو یہ کہنا ہے کہ ہزاروں شاعر اپنی تمام قوت کو بے نفع شاعری خصوصاً غزل گوئی پر صرف کررہے ہیں، اور اپنی ذہنی اور دماغی قابلیت کو غیر مفید شاعری پر قربان کررہے ہیں، قطع نظر تضیع اوقات کے مشاعروں میں اکثر طلبہ کی طرف سے جو ہنگامے اور غیر مہذب حوادث پیش آتے ہیں وہ اس قابل ہیں کہ شاعروں کو موقوف کرنے کا اب اس سے بہتر کوئی اور زمانہ نہ آئے گا۔ طلبہ کا ذوق ادب موسیقی کی طرف اس قدر منتقل ہوگیا ہے کہ وہ ایک بدترین شاعر مگر خوش آواز کو ایک بہترین مگر غیر مترنم شاعر پر ترجیح دیتے ہیں۔

اُردو کی مکمل تاریخ "نظم اُردو" کے نام سے شائع ہوچکی ہے جن صاحبان کو مفصل دیکھنا ہو اُسے ملاحظہ فرمائیں۔

ناطق لکھنوی،

اندھی بھکارن

سِلوٹیں ماتھے کی نم آلود، رخساروں پہ گرد
خشک ہونٹوں کی لکیروں میں ہے لرزاں آہِ سرد

بال، بیوہ کے مقدر کی طرح اُلجھے ہوئے
ضعف کی شدّت سے پڑتے ہیں قدم بہکے ہوئے

نیم کے ٹوٹے ہوئے تِنکے پڑے ہیں کان میں
جا رہی ہے چند باسی روٹیوں کے دھیان میں

پسلیوں کی ہڈیاں نکلی ہوئیں، اُبھری ہوئیں
سنگریزوں کی زمیں اور پنڈلیاں سوجی ہوئیں

چند اُمیدیں مگر مبہم اشارے کی طرح
زیست لیکن ڈوبنے والے ستارے کی طرح

ہیں بدن پر اوڑھنی کی دھجیاں لٹکی ہوئیں
خانقاہوں میں ہوں جیسے نیکیاں بھٹکی ہوئیں

ملگجے کُرتے میں پیوندوں کی حالت کیا کہوں
جی میں آتا ہے کہ اِس دُنیا کا سینہ چیر دوں

پُتلیاں بے نور، زخمی پاؤں، منزل سخت و دُور
زندگی کی تلخیوں سے شیشۂ دل چُور چُور

ہاتھ میں ٹوٹی سی لکڑی، رہبرِ راہِ وفا
چلچلاتی دُھوپ، تپتی ریت، گرمی کی ہوا

مُفلسی میں کور چشمی کی مصیبت ہائے! ہائے!
ہر قدم پر ہے اُسے خطرہ کہ ٹکر ہو نہ جائے

تھوڑی تھوڑی دُور پر اٹکل سے کتراتی ہوئی
جا رہی ہے راستہ میں ٹھوکریں کھاتی ہوئی

دے رہی ہے کس تمنّا سے صدا ہر گام پر
"دے خُدا کے نام پر، دلوا خُدا کے نام پر"

چلتے چلتے رُک گئی مجروح دل، زخمی جگر
پیڑ کے نیچے دُکاں کے پاس ہی فٹ پاتھ پر

بولا چلّا کر سپاہی اُس کو بیٹھا دیکھ کر
یہ سڑک ہے دیکھ او اندھی! نہیں باوا کا گھر

اپنی لکڑی ٹیک کر اُٹھی وہ یہ کہتی ہوئی
"مانتی ہوں میں سپاہی جی! بڑی غلطی[1] ہوئی

آپ کے اِس راستہ پر میں نہ بیٹھوں گی کبھی
تھوکئے غصّہ کو میں تو ہوں بھکارن آپ کی"

اپنی لکڑی کے سہارے راہ میں چلنے لگی
اتفاقاً خونچے والے سے ٹکر ہو گئی

خونچے کے ساتھ ہی پکّی زمیں پر گر پڑے
سونٹھ کا پانی، دہی، مرچیں، نمک، آلو بڑے

لگ گئی اِک بھیڑ سی چلتے مُسافر رُک گئے
اک تماشا تھا یہ منظر راہگیروں کے لئے

دیکھ کر مجمع کو تھانے کا سپاہی آگیا
واقعہ کو خونچہ والے نے رُک رُک کر کہا

[1] بھکارن کی گفتگو ہے، اہلِ عروض معاف فرمائیں۔ ماہرؔ القادری۔

واقعہ سُن کر ہوا اِن سخت تن وحشتمیں ⁏ نُطق کے سانچے میں پیہم گالیاں ڈھلنے لگیں
ہم پولس والے ہیں ہم کو سب خبر ہے حال چال ⁏ یہ بھکارن کاہے کو ہے، یہ تو ہے پکّی چھنال
مانگ کر پیسے پیا کرتی ہے چنڈو رات کو ⁏ جانتا ہوں ایک مدّت سے میں اِس بدذات کو"

گالیاں دیتے ہوئے ڈنڈے کو جنبش دی گئی
خوب اُس اندھی بھکارن کی مرمّت کی گئی

آج کرنا ہے مجھے اہلِ سیاست سے سوال ⁏ کیا اِسی قانون کا منشا ہے حفظِ جان ومال
کیا یہی دستور ہے انسانیت کے واسطے ⁏ کیا ضروری ہیں مظالم سلطنت کے واسطے
ایسے منظر دیکھ کر قانون کیوں مجبور ہے؟ ⁏ ضابطوں میں صرف لکھنے کے لئے دستور ہے!
کیا اِسی قانون سے قائم ہے نظمِ سلطنت ⁏ کیا "ڈسپلن"[1] میں یہی ہوتی ہے مجبوروں کی گت
سینۂ قانون میں سچ مچ ہے کیا پتھر کا دل ⁏ ہے غریبوں کے لئے جینا عذابِ مُستقل
کیا ہوئی قانون کی روشن نگاہِ احتساب ⁏ کیا یہی عدل وتوازن ہے؟ دیا جائے جواب
اہلِ دولت کے لئے قانون میں ہے کیوں لچک ⁏ اک حسیں دھوکا ہے یہ دستور سازی کی چمک

کیا بنی ہے اہلِ دولت کے لئے ہی یہ زمیں
مُفلسوں کی زندگی کیا زندگی ہوتی نہیں

افسروں کے واسطے موٹر بھی ہیں پنکھے بھی ہیں ⁏ خوشنما دفتر بھی ہیں، جنّت نشاں بنگلے بھی ہیں
چین ہے آرام ہے، بھتّے ہیں تنخواہیں بھی ہیں ⁏ بہرِ جلبِ منفعت سو طرح کی راہیں بھی ہیں

اور غریبوں کے لئے پابندیاں مجبوریاں
طبعِ دولت پہ ہے اک حرفِ شکایت بھی گراں

یہ نظامِ خود تراشیدہ تہ و بالا کریں ⁏ آؤ اس دُنیا میں اک عالم نیا پیدا کریں
اِن حدودِ افسری وسروری کو توڑ دیں ⁏ پھر نئے سر سے شکستہ آئینوں کو جوڑ دیں
ہم کو وہ قانون اور ایسی حکومت چاہیئے ⁏ جس میں اک بُڑھیا[2] خلیفہ کا گریباں تھام لے
صرف تقوے پر ہو انساں کی بڑائی کا مدار ⁏ گلشنِ ہستی میں پھر اگلی سی آجائے بہار

پھر زمانے میں الٰہی سلطنت کا دَور ہو
گلستانِ دہر کی آب وہوا کچھ اور ہو

ماہر القادری

---

[1] Discipline [2] حضرت عمر فاروق کی خلافت کا مشہور واقعہ!

ایک گولہ

دھائیں دھائیں توپیں چلنا شروع ہو گئیں۔ پورے آٹھ بجے سے جرمن ہوائی جہاز ہمارے سروں پر منڈلا رہے تھے۔ بہت دور کبھی کبھی بم پھٹنے کی آواز بھی آجاتی تھی۔ ہمارے مکان پر سے زائیں زائیں دشمن کے سیٹی والے بم گذر رہے تھے۔ کھڑکی کا پردہ ہم نے شام سے ہی کھینچ لیا تھا۔ اور لمپ پر کاغذ لگا کر روشنی بہت مدھم کر لی تھی۔ ہم تینوں کمرے میں اپنے اپنے پلنگ پر بیٹھے تھے۔ اگرچہ گنجائش اس کمرے میں دس بارہ چارپائیوں کی تھی۔ لیکن ابھی اور لوگ رہنے کے لئے نہیں آئے تھے۔ اس لئے سارے کمرے میں ہمارا ہی راج تھا۔ میں کمرے کے ایک سرے پر تھا۔ پنڈت جی اور سیٹھی دوسرے کونے میں لیٹے تھے۔ یکایک قریب ہی ایک بم آکر پھٹا۔ سارا کمرہ ہل گیا۔ جیسے زلزلہ آگیا۔ کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹ کر زمین پر پٹاخ سے گرا۔

کہتے ہیں جب آدمی مصیبت میں ہو تو اُسے کوئی اور بات سوچنی چاہیئے۔ دُکھ کم ہو جاتا ہے۔ میں کمبلوں میں دبکا اپنی جماعت اور شاگردوں کا نقشہ ذہن میں جما رہا تھا۔ کتنے شریر لڑکے ہیں۔ شوخ آنکھوں سے ذہانت ٹپکی پڑتی ہے۔ برج بہار کبھی گھر کا کام کر کے نہیں لاتا۔ لیکن میرے آنے سے پہلے بلیک بورڈ صاف کرنے لگتا ہے۔ کہ شاید میں اس کی محنت اور تن دہی دیکھ کر گھر کا کام نہ مانگوں۔ بھلا میں کب چھوڑتا ہوں۔ میں آتے ہی سب سے پہلے اس سے گھر کا کام مانگتا ہوں جماعت ہنس پڑتی ہے۔ برج بہار جھینپ کر بیٹھ جاتا ہے۔ میں یہ سوچ کر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کہ کمرے کے پرلے سرے سے سیٹھی نے دبی ہوئی آواز میں کہا: "پنڈت جی۔ کل میں اپنا نیا سوٹ پہنوں گا۔"

پنڈت جی نے نہایت بے اعتنائی سے جواب دیا: "کیوں کل میں کیا خاص بات ہے۔ پرسوں کیوں نہیں پہنو گے؟"

اس جواب پر جیسے سیٹھی کا دل ٹوٹ گیا۔ اُس نے زور سے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ توپ کے گولوں کے دھماکوں میں سیٹھی کی آہ ایسی معلوم ہوتی جیسے خزاں کے موسم میں ہوا سے پتے کھڑکھڑا جائیں۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی۔ شاید سیٹھی سوچ رہا تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ پنڈت جی سوٹ پہننے کے بارے میں پھر سوال کرینگے لیکن خدا جانے اس وقت پنڈت جی کو سیٹھی کے نئے سوٹ میں دلچسپی کیوں نہیں تھی۔ جب بہت دیر گذر گئی اور پنڈت جی پھر بھی نہ بولے تو سیٹھی نے کہا: "پنڈت جی۔ کتنی میٹھی ہے۔"

پنڈت جی نے جیسے چونک کر کہا: "کہاں میٹھی ہے۔ کمبخت ایک چمچہ ناپ کر ڈالتے ہیں۔ وہ بھی پورا نہیں۔"

سیٹھی کے دل کو ٹھیس سی لگی۔ بھنا کر کہا: "میں امی کا ذکر کر رہا تھا پنڈت جی۔"

پنڈت جی نے معذرت کے لہجے میں کہا: "ارے۔ مَیں سمجھا تم چائے کا ذکر کر رہے ہو۔"

سیٹھی نے دبی آواز میں کہا: "آج رات کلب سے اُس کے ساتھ ہی گھر تک آیا تھا۔"

سیٹھی کے اس فقرے میں بچوں کا سا غرور چھپا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا پنڈت جی اس بات کو سُنکر حیران ہو جائیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی بچے کو بہت اُونچے سے پھلانگتے دیکھ کر بڑے حیرت میں رہ جاتے ہیں۔ لیکن پنڈت جی اب بھی خاموش تھے۔ برابر سے ہوا مار توپ دھائیں سے چلی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے بالکل سر پر گولہ آن گرے گا۔ سیٹھی اپنے بستر سے نکل کر پنڈت جی کے بستر پر جا پہونچا۔ سیٹھی نے پنڈت جی کو جھنجوڑتے ہوتے کہا: "پنڈت جی۔ میں اندھیرے میں اُسکے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلا۔"

پنڈت جی نے ہنکارا بھرا۔ سیٹھی کی اُمید کا ٹمٹماتا ہوا دیا جیسے بھڑک اُٹھا: "پنڈت جی۔ میں نے اُس سے پوچھا تمہارا نام کیا ہے، اُس نے مسکرا کر کہا امی۔"

پنڈت جی رومانس کی نسبت واقعیت کے زیادہ شیدائی تھے، بولے: "بالکل غلط۔ اندھیرے میں تم اس کی مُسکراہٹ کیسے دیکھ سکتے تھے؟ البتہ اگر وہ ہنسی ہو تو اور بات ہے۔ اور اگر وہ ہنسی تو اُسکی ہنسی میں یقیناً طنز کا پہلو زیادہ شامل ہوگا۔"

سیٹھی نے زچ ہو کر کہا: "اچھا مان لو وہ مُسکرائی نہیں لیکن اُس نے کہا میرا نام امی ہے۔ پنڈت جی۔ امی!"

پنڈت جی بولے: "پھر؟"

سیٹھی چاہتا تھا کہ پنڈت جی اس لفظ کی اہمیت سے واقف ہو جائیں۔ اس لئے تشریح کرتے ہوئے بولا "پنڈت جی۔ ہر ایک لڑکی کے دو نام ہوتے ہیں۔ ایک اُس کا اپنا، ایک خاندان کا۔ عام طور پر لڑکی غیروں کو اپنے خاندان کا نام بتاتی ہے۔ لیکن جب وہ کسی کی بےحد عزیز ہو جاتے تو پھر پنا، بس صرف اپنا نام بتاتی ہے۔ سمجھے آپ؟"

پنڈت جی بولے "پھر؟"

اب سیٹھی سے نہ رہا گیا۔ بولا "پنڈت جی۔ اگر آپ میں ذرا بھی شعور ہے تو سمجھ لیجئے کہ آمی مجھے چاہتی ہے"

پنڈت جی بہت بےپروائی سے بولے "اچھا تو پھر؟"

سیٹھی نے پنڈت جی کے سرد سینے میں جذبات ٹٹولنے کی ایک بار پھر کوشش کی "پنڈت جی۔ آج سے میں نے اپنا زندگی کا پروگرام بدل لیا ہے۔ صبح سویرے اُٹھا کرونگا۔ روز شیو (shave) کرونگا۔ نیا سوٹ پہنونگا، اُسے روز استری کرونگا۔ تاکہ اس کا شکن تلوار کی دھار کی طرح تیز رہے۔ بالوں میں کنگھی اور بُرش بھی دن میں کئی بار کرتا رہونگا۔ شام کو آمی کے ساتھ سیر کو جایا کرونگا۔ شوکت میرا دوست ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگر میں نے شوکت سے چھڑی مانگی تو شوکت انکار نہیں کریگا۔ بھلا دوستوں میں چھڑی بھی کوئی چیز ہے۔ مجھے شوکت کی چھڑی بہت پسند ہے۔ چھڑی لیکر چلنے میں انسان کا رُعب بڑھ جاتا ہے۔ سڑک پر چلنے والے عزت کرتے ہیں۔ یہ بھی کوئی سیر ہے کہ خالی ہاتھ چلے جا رہے ہیں۔ چھڑی ہو تو کبھی اُسے گھمایا۔ کبھی گھماتے گھماتے کوئی فطرت کا منظر نظر آیا تو چھڑی ایک خاص زاویہ سے ہوا میں معلق رہ گئی۔ اور سیٹی بجاتے بجاتے منہ صفر کا ہندسہ بنا رہا۔ پھر اس منظر کو ایک خاص انداز سے دیکھا، اور آگے بڑھ گئے ——— اب میں ورزش بھی کرونگا۔ پھر میری صحت دیکھنا۔ سمجھے پنڈت جی؟" سیٹھی نے عاجزانہ لہجے میں کہا "پنڈت جی کل آپ کی چھٹی کا دن ہے۔ ذرا میری ٹائی پر استری کر دیجیئے گا"

پنڈت جی نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا "بھئی اب مجھے نیند آرہی ہے۔ سونے دو۔ کل صبح مجھے جلدی اُٹھنا ہے۔ میں سائیکل پر ایک دوست کے ساتھ جا رہا ہوں۔ وہ میرا سات بجے ڈاک خانے کے پاس انتظار کریگی"

سیٹھی نے بہت دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا "پنڈت جی۔ یہ دوست کون ہے۔ اس لڑکی کا کیا نام ہے؟"

پنڈت جی شاید کچھ سو سے گئے تھے، بولے "بھئی پورا نام تو یاد نہیں رہا۔ ہاں ہاں سائمن ہے"

سیٹھی نے پنڈت جی کا شانہ جھنجوڑتے ہوئے کہا "پنڈت جی۔ آمی سائمن تو نہیں ہے؟ آمی سائمن تو نہیں ہے؟" پنڈت جی کبھی کے سو چکے تھے۔

سیٹھی سیدھا اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ اور خدا سے دُعا مانگنے لگا۔ اے مالک ایک گولہ! صرف ایک گولہ! آج ہمیں بھی مل جائے۔ پھٹنے والا نہ سہی۔ آگن بم ہی سہی۔ تیرے خزانے میں کس چیز کی کمی ہے۔

توپیں دھائیں دھائیں چل رہی تھیں۔ گولے بھی برس رہے تھے۔ لیکن ——— دُور ——— بہت دُور۔

آغا محمد اشرف

اعتراف

نومبر ۱۹۴۱ء کے ساقی میں حضرت فانی بدایونی کے بعض اشعار پر میں نے جو کچھ اعتراضات کئے تھے۔ میرے محترم دوست قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر، سابق مدیر معیار، بانکی پور (پٹنہ) نے مجھے لکھا ہے کہ اس شعر پر:۔

میں ہوں عالم کو بیدلی کا پیام
خیر و شر مدعا نہ صلح نہ جنگ

آپ نے جو اعتراض کیا ہے مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ میرے نزدیک شاعر کا مقصد یہ ہے کہ "مجھے نہ خیر و شر سے غرض ہے نہ صلح و جنگ سے"

میں نے لکھا تھا کہ دوسرے مصراع کی عبارت اس طرح ہونی چاہئیے، "نہ خیر و شر، نہ مدعا، نہ صلح نہ جنگ" ورنہ شاعر کا مفہوم ادا نہیں ہو سکتا۔ دراصل دوسرے مصراع کا مفہوم سمجھنے میں مجھ سے چُوک ہوئی۔ شعر کا مطلب وہی ہے جو قاضی صاحب نے بیان کیا اور میرا اعتراض بیجا ہے۔

البتہ اب اس شعر پر ایک اور اعتراض وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ بیدلی کی تکمیل کے لئے "خیر و شر اور صلح و جنگ" کے علاوہ بعض اور چیزوں سے بےتعلقی بھی ضروری ہے جن کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ "خیر و شر" میں سب کچھ آگیا تو پھر "صلح و جنگ" کا ذکر بھی محض بیکار ہے۔

عندلیب شادانی

.....ہر نقطہ مقامے دارد

سیرتِ حُسنِ خود آرا سمجھیں | پھول کو آپ شرارا سمجھیں
آستے خون کو پارا سمجھیں | دُشمن اسکو بھی اشارا سمجھیں
"جی حضوری" کو وہ پیارا سمجھیں | بزم سے مجھکو سدھارا سمجھیں
وہ ہمیں دل کا سہارا سمجھیں | اب ہوا کو تے خسارا سمجھیں
مہ حالات کو جگنو جانیں | مہرِ ضوتاب کو تارا سمجھیں
بہ تقاضائے مآل اندیشی | جیتنے والے کو ہارا سمجھیں
حکم یہ ہے ستم آرا نہ کہیں | کیوں نہ اُن کو ستم آرا سمجھیں
کیوں کہیں، قصۂ غم پھر کہیے | جب نہ سمجھیں تو دوبارا سمجھیں
ختم ہر شکوۂ ناانصافی | ہر قصور آپ ہمارا سمجھیں
اُسنے شہ رگ پہ چھُری رکھدی ہے | وہ چھُری جس کو سہارا سمجھیں
جدّت طرزِ نوازش۔ یہ ستم! | بے رُخی کو بھی اشارا سمجھیں
ہم چمن زاد و چمن پروردہ | اب چمن آپ ہمارا سمجھیں
اور ہوتے ہیں وہ اے ابرِ کرم | بوند پڑ جائے تو دھارا سمجھیں
وہ نکلتا ہے پشیمانِ خودی | ہم جسے عشق کا مارا سمجھیں
صرف کہنے سے اگر کام چلے | موج کو ہم بھی کنارا سمجھیں
کس توقع میں ہیں یارانِ قفس | کیا بھروسہ ہے؟ خدارا سمجھیں
ہائے پیرانِ "تبرک پیشہ" | ذلّتِ نفس گوارا سمجھیں

یہ بھی پامالیِ کردار ہے شاؔد
ہم تباہی کو نظارا سمجھیں

شاؔد عارفی

تضاد کا اک حسین کرشمہ

یہ مختصر نظم عزیزی خواجہ عبدالحمید پال سلمہٗ کی تقریب شادی خانہ آبادی پر ۲۶ دسمبر ۱۹۴۰ء کو محفلِ شادی میں پڑھی گئی۔ "امین حزیں"

(۱)

تضاد اک شانِ اوّلیں ہے وجودِ ہستی این و آں کی ॥ یہ تم باذنیٔ جاوداں ہے لبِ مسیحائے کن فکاں کی
تضاد سے ہے طلسمِ فطرت تضاد اعجازِ سرمدی ہے ॥ نمودِ ہستی اسی کے دم سے اسی سے بنیاد ہے جہاں کی
تضاد سے رات اور دن ہیں کہیں اندھیرا کہیں اُجالا ॥ زمین کا فرش ہے اسی سے اسی سے قائم چھت آسماں کی
سمجھ میں آئی کبھی نہ آئیگی جو حقیقت ہے اس میں مضمر ॥ اسی سے ہے نغمۂ مسرّت اسی سے لَے نالہ و فغاں کی

حیات کا ہے ظہور اس سے حیات میں ہے شعور اس کا
یہی وہ نورِ جمالِ فطرت ہے ذرہ ذرہ ہے طور جس سے

(۲)

طفیل اسی کا ہے آج کی یہ خجستہ و پُرخلوص محفل ॥ اسی کا یہ جذبِ باہمی ہے کہ قیس ہے ہمکنارِ محمل
یہ رشتۂ ازدواج کیا ہے؟ تضاد کا اک حسیں کرشمہ ॥ الگ الگ جو پلے ہوئے تھے وہ ایک ہونے لگے ہیں دو دل
خلوصِ نیت سے ہی مگر اس حسیں کشش کا قیام ممکن ॥ جہاں یہ جوہر نہیں نمایاں وہاں مودت ہے زعم باطل
خلوص ہی سے ہے سرفرازی خلوص ہی رمزِ زندگی ہے ॥ خلوص ہی سے ہے شادمانی اسی سے ہوتا ہے چین حاصل

خلوص اوّل خلوص آخر خلوص پیمانۂ وفا ہے
خلوص ہر زوج کو خدا دے! مری شب و روز کی دعا ہے

(۳)

مری تمناؤں کے چمن کا ہرا بھرا نونہال تُو ہے ॥ جوانِ رعنا، خجستہ خصلت، قبول صورت، ستودہ خو ہے
ہو رنج پیری اُسے جوانی نظر نہ آتی ہو جس کو اپنی ॥ مری جوانی کا پوچھتے ہو! یہ دیکھ لو سب کے روبرو ہے
مری نگاہیں نثار اس پر رواں رواں دے نہ کیوں دعائیں! ॥ یہ میری اک نوجواں تمنا یہ میری اک بالغ آرزو ہے
سرورِ جانِ پدر عمل سے جہاں میں ہوتا ہے نام روشن ॥ تو میری ناموسِ زندگی ہے تو میری دنیائے آبرو ہے

حمید دونوں جہاں میں تجھکو خدا کرے کامیابِ الفت!
ہزار جاں سے تجھے مبارک امیں کا یہ انتخابِ الفت!

امین حزیں۔

سپاہی

گاؤں میں بھرتی کرنے والا افسر آیا ہوا تھا۔

گاؤں میں ایک بوڑھا زمیندار تھا۔ کوئی پانچ دس بیگہ زمین تھی اور وہ بھی کچھ ناقص۔ اس بوڑھے کا اکلوتا بیٹا نوردادپہر رات گئے جب ایک دنیا محوِ خواب ہوتی بیلوں کو لیکر کھیتوں پر جا پہونچتا اور کام شروع کر دیتا۔ پہلے زمین میں ہل چلاتا۔ سہاگہ کی ضرورت ہوتی تو سہاگہ چلاتا۔ جہاں کچھ بونا ہوتا وہاں بیج بوتا۔ جہاں پانی دینا ہوتا وہاں پانی دیتا۔ چارہ کاٹ کر بیلوں کے آگے ڈالتا۔ پھر رات کے لئے چارہ کاٹ کر گٹھا باندھتا۔ اسی طرح غروب آفتاب تک خون پانی ایک کر دیتا۔ لیکن اس پر بھی پیٹ بھر کر روٹی نصیب نہ ہوتی۔ زمین کا کام تو خیر اس کا موروثی پیشہ تھا۔ لیکن آئے دن کی بیگار نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ نمبردار کو جب کوئی ضرورت ہوتی کارِ سرکار کے بہانے نورداد سے ہی کام لیتا۔ پھر گاؤں کے چوکیدار کی دھونس، پٹواری کی دھونس، گشت کے سپاہی کی دھونس، نورداد غریب سب کچھ سہتا۔ جب بہت پریشان ہوتا تو ایک آہ بھر کر کہتا "مولا! یہ بھی تیرے رنگ ہیں! غریب کا تیرے بغیر کون ہے"!

نمبردار کے دو بیٹے تھے۔ دونوں کڑیل جوان۔ نہ کچھ کام نہ کوئی فکر۔ مونچھوں پر تاؤ دئے دن بھر گاؤں میں گھومتے۔ صبح و شام جب کنوئیں پر گاؤں والیاں پانی بھرنے آتیں تو یہ کنوئیں کا طواف کرتے نظر آتے اور جب چھوکریاں کھیتوں پر کام کرنے والوں کا کھانا لیکر جاتیں تو یہ اِدھر اُدھر منڈلاتے۔ کسی سے اشارہ، کسی سے چھیڑ کسی سے مذاق! یہ تھے ان کے دن بھر کے مشاغل۔ نہ کسی کا خوف نہ ڈر۔ اور ہوتا بھی کیسے آخر نمبردار کے بیٹے تھے۔

نمبردار سرکار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بڑی کوشش سے بھرتی کروا رہا تھا۔ کچھ تو بہ رضا و رغبت بھرتی ہو رہے تھے۔ اور بعض کو نمبردار کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا۔ نورداد کی بوڑھی ماں چپکے چپکے دل میں دعائیں مانگتی رہتی تھی کہ اس کا نورِ نظر اس مصیبت سے بچا رہے۔ ایک آدھ بار دن میں نمبردارنی کی بھی منت خوشامد کر آتی کہ اسکے بچے پر آنچ نہ آنے دے۔

شام ہو چکی تھی۔ گاؤں پر ایک سکوت طاری ہو رہا تھا۔ کچھ کسان کھیتوں سے لوٹ چکے تھے، کچھ لوٹ رہے تھے۔ کسی کے سر پر گھاس کا گٹھا تھا کوئی مویشی ہانکتا چلا آتا تھا۔ کپڑے بھی گرد آلود اور چہروں پر بھی گرد۔ دن بھر کی مشقت کے بعد قدم بھی کچھ ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

نورداد بھی آکر بیٹھا ہی تھا کہ گاؤں کے چوکیدار نے آکر کہا۔

"چلو! چوہدری نے بلایا ہے!"

"کیا ہے؟" نورداد نے ذرا ناراضگی سے پوچھا "ابھی تو آکر بیٹھا ہی ہوں۔ کیا کام آپڑا اس وقت؟"

"چل کر پوچھ لو!" چوکیدار نے جواب دیا۔

"تمہیں بھی تو معلوم ہی ہوگا" نورداد نے کہا "کوئی نئی بیگار آپڑی"

"میں کیا جانوں" چوکیدار نے خشک جواب دیا۔

اتنے میں نورداد کا بوڑھا باپ بھی نماز پڑھکر آگیا اور چوکیدار کو دروازے پر کھڑے دیکھکر بولا "کیسے آئے؟"

"نورداد کو چوہدری نے بلایا ہے" چوکیدار نے جو لٹھ کا سہارا لئے کھڑا تھا جواب دیا۔

"کام کیا ہے؟" بوڑھے زمیندار نے پوچھا۔

"کچھ کام ہی ہے تو بلوایا ہے" چوکیدار نے کہا "یہاں بیٹھے کیا پوچھتے ہو۔ چل کر پوچھ لو"

نورداد پیڑھی پر سے اٹھا اور بولا "چلو بھائی! پوچھ لیتے ہیں چل کر"

ماں بولی "بیٹا روٹی تو کھا لو پہلے"

"کھالوں گا آکر" نورداد نے برہمی سے جواب دیا "روٹی کہیں بھاگی نہیں جاتی" اتنا کہہ کر وہ چوکیدار کے ساتھ ہو لیا۔

نمبردار چوپال میں بیٹھا تھا پانچ سات اور آدمی بھی اِدھر اُدھر بیٹھے تھے۔ نورداد نے سلام کرکے پوچھا "کیا حکم ہے چوہدری جی؟"

"ابے نورا!" نمبردار بولا "نوکری کریگا؟"

"کرونگا چوہدری" نورداد نے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"شاباش!" چوہدری خوش ہوکر بولا "سب دلدر دور

ہو جائے گا۔"

"کیا کام ہے چوہدری؟" نور داد نے پوچھا۔

"پلٹن کی نوکری ہے" نمبردار نے کہا۔

"پلٹن کی نوکری؟" نور داد نے تعجب سے کہا۔

"ہاں ہاں" نمبردار بولا: "جاٹوں کی پلٹن میں تمہارا نام آج میں نے لکھا دیا ہے۔ پرسوں فوجی لاری آئیگی، تیار بیٹھو۔"

"اچھا چوہدری" نور داد نے کچھ متفکرانہ انداز سے جواب دیا۔

"اب جاؤ" نمبردار بولا "اور گھر والوں کو بھی یہ خوشخبری سنا۔"

نور داد نمبردار کے یہاں سے لوٹ کر جب گھر آیا تو کچھ چپ چاپ سا تھا۔ باپ نے پوچھا "کیا کہا نمبردار نے؟"

"پلٹن میں نام لکھدیا میرا" نور داد نے جواب دیا۔

"تمہارا؟" باپ نے تعجب سے پوچھا "کب؟"

"آج ہی لکھادیا" نور داد نے جواب دیا۔

اتنے میں بڑھیا جو کہیں پڑوس میں گئی تھی، آگئی اور بولی۔

"کیا کہا نمبردار نے؟"

بوڑھا بولا "نور کا نام پلٹن میں لکھدیا۔"

"پرسوں جانا ہے" نور داد نے کہا۔

"تمہیں؟" ماں نے پاس بیٹھکر پوچھا۔

"نہیں جاتے ہم" بڑھیا بولی "ہر بات میں ہم پر دھونس جمائی جاتی ہے۔ جیسے گاؤں میں اور کوئی ہے ہی نہیں کسی روز ٹکا سا جواب سنے گا۔ بہت سر چڑھ چلا ہے!"

"کوئی باندھکر بھیجدے تو ہم کیا کریں" بوڑھے نے کہا۔

"کون باندھکر بھیجدے" بڑھیا بولی "محنت کرکے کھاتے ہیں چرا کے نہیں۔"

"کیوں مفت میں ہٹ مچا رہی ہو" بوڑھا بولا "غریب کی کون سنتا ہے۔"

بڑھیا چمک کر بولی "حاکم کون؟ نمبردار ہی تو ہے۔ کوئی تھانیدار تو نہیں۔ اسکے بھی تو دو بیٹے ہیں انہیں کیوں نہیں بھیجتا۔"

ان لوگوں میں یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ پڑوسن جس کی بیٹی رحمت سے نور داد کی بات پکی ہوتے ابھی تھوڑے ہی روز ہوئے تھے گھبرائی ہوئی آئی، اور پاس بیٹھکر بولی: "یہ ظلم کیا کیا چوہدری نے؟"

"تم نے بھی سن لیا نا؟" نور داد کی ماں نے کہا "کب تک لحاظ کریں گے ہم۔"

پڑوسن بولی "تم تو کہتی تھیں کہ نمبردارنی نے حامی بھرلی ہے کہ وہ نور کو نہ جانے دیگی۔"

"کہا تو ایسا ہی تھا" نور داد کی ماں نے جواب دیا "تم کہو تو ابھی جاکر پوچھوں۔"

نور داد جو اس وقت تک خاموش بیٹھا تھا بولا "ماں! اب جو ہونا تھا ہو چکا۔ ایک بار پلٹن میں نام لکھا جائے تو پھر کٹ نہیں سکتا۔"

رحمت کی ماں بولی "کٹ کیسے نہیں سکتا۔ کہدو نہیں جاتے ہم۔"

"سال دو سال کی بات ہے" نور داد بولا "دریا میں رہتے ہوئے مگر مچھ سے بیر اچھا نہیں۔"

بوڑھا بولا "ہاں بیٹا! یہ تو تم نے سچی بات کہی۔"

"تم بھی لگے نادانوں ایسی باتیں کرنے" رحمت کی ماں بولی "نور چلا گیا تو تم کیا کروگے۔ کھیتی باڑی کون سنبھالے گا؟"

"کوئی ساجھی رکھ لینگے" بوڑھے نے جواب دیا۔

پاس سے نور کی ماں بولی "تم ساجھی رکھ لینا۔ میں نور کو نہیں جانے دوں گی۔" پہلے بیاہ کرلوں پھر نوکری بھی دیکھ لینگے۔"

ان لوگوں میں بہت دیر تک ایسے ہی باتیں ہوتی رہیں۔

لیکن آج رات نور کو نیند نہ آئی۔ وہ اس خیال سے دل ہی دل میں خوش ہوا کرتا تھا کہ بیساکھ کے بعد رحمت سے اسکی شادی ہو جائے گی۔ رحمت گو ایک غریب لڑکی تھی لیکن اس کی آنکھ ہرن کی آنکھ کی طرح خوبصورت تھی۔ گو اس کا رنگ کچھ سانولا ہی تھا، تاہم خدوخال میں بلا کی دلکشی تھی۔ گو اس کے پاؤں عموماً جوتے سے خالی ہوتے پھر بھی اس کی چال میں کبک کی سبک خرامی تھی۔ گو اسکے کپڑے میلے کچیلے ہی رہتے لیکن ان میلے کپڑوں میں بھی پھوٹتی جوانی کی جھلک دل میں آرزو اور تمنا پیدا کر دیتی تھی۔

بہرکیف نور داد کی رات کروٹیں بدلتے ہی کٹ گئی۔ جب ظلمت شب کی آغوش میں سے سویرا مچل مچل کر بیدار ہونے لگا تو سب سے پہلے اس چڑیا کی چوں چوں سنائی دی جس نے گھر میں کہیں گھونسلا بنا رکھا تھا۔ پھر نعرۂ توحید فضا میں گونجا اور آسودگان خواب پیغام عمل پاکر سرگرم عمل ہونے لگے۔ کچھ اللہ والوں نے مسجد کی راہ لی اور دنیا والے کھیتوں کو ہو لئے۔

آج بھی نور داد حسب دستور صبح صبح بیلوں کو لیکر کھیتوں کو ہو لیا۔ چاروں طرف کھیتیاں لہلہا رہی تھیں، کہیں کہیں سرسوں

پھول تھی ــــ

گندم و جو کی فضا ہی ترے گلشن سے سوا
پھول سرسوں کے جو دیکھے تو سمن بھول گئے

شبنم کے موتی ہر یالی پر اس طرح چمک رہے تھے جیسے کسی لڑکی کی ساڑی پر تارے۔ دو چار ہل کوتے جو بڑے میں کیڑے مکوڑوں کی تلاش میں سپاہیوں کی طرح ایک قطار میں ایک طرف سے دوسری جانب جا رہے تھے۔ ہوا جب سرسوں سے چھیڑ چھاڑ کرتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے چنچل لڑکیاں فرط انبساط سے جھوم رہی ہیں۔ بیری کے پیڑ پر بلبلیں میٹھی میٹھی سیٹیاں بجا رہی تھیں۔ اور طوطوں نے ٹیں ٹیں سے ابھی سے ہنگامہ محشر برپا کر رکھا تھا۔ دو ایک گلہریاں بیری کے نیچے اکڑوں بیٹھی بیر کھا رہی تھیں۔ یہ نظارے نور داد کے لئے کوئی انوکھے نہ تھے لیکن آج وہ ہر چیز کو ایک خاص دلچسپی سے دیکھتا تھا۔ اُسے جب یہ خیال آتا کہ اب وہ ان سے جدا ہونے والا ہے تو اس کا دل کچھ اندر ہی اندر بیٹھنے لگتا۔

وہی نور داد جو گاؤں سے نکلتے ہی یہ...

گوری ادھیکے چلو گاگر یا چھلک نہ جائے

کی تانیں لگایا کرتا تھا، آج خاموش تھا۔ کام میں دل لگتا ہی نہ تھا۔ آس پاس والوں نے ہل جوت رکھے تھے۔ "وہت، وہت" "برّی برّی" کی آوازیں اِدھر اُدھر سے آ رہی تھیں لیکن نور داد کے بیل اپنی مرضی سے چل رہے تھے۔

پہر دن چڑھے جب اُس کی ماں روٹی لیکر آئی تو وہ بیری کے نیچے ہاتھ کا سرہانہ بنائے لیٹا ہوا تھا اور بیل ایک طرف بیٹھے جگالی کر رہے تھے۔ بیلوں کے کنڈ پر ایک کوا بیٹھا کائیں کائیں کر رہا تھا۔

"خیر تو ہے نور!" ماں نے پاس بیٹھکر پوچھا۔ "آج بڑے کیوں لیٹے ہو ــ؟"

"ایسے ہی ماں!" نور داد نے جمائی لیکر جواب دیا۔

"طبیعت تو اچھی ہے میرے لال؟" ماں نے اس کے ماتھے کو ہاتھ سے چھوتے ہوئے کہا۔ "تمہارا باپ آج ایک ساجھی کو ساتھ لانے کو کہتا تھا بٹائی پر کھیت دیدینگے"

"ماں!" نور داد بولا۔ "کھیت جسے چاہو دو۔ لیکن میرے بیلوں کو کوئی مارے نہیں"

"مجال ہے کسی کی" ماں نے جواب دیا۔ "جو تمہاری کوئی چیز بگاڑے"

ماں بیٹے میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ نور داد کا باپ ایک زمیندار کو ساتھ لیکر آگیا۔ وہ دونوں تو کھیتوں کی گرداوری کرنے لگے اور نور داد روٹی کھانے لگا۔

جب باپ ساجھی کو کھیت دکھا چکا اور بیٹا روٹی کھا چکا تو بوڑھا اور بڑھیا گاؤں کو لوٹے۔

"تم بھی آجاؤ" باپ نے بیٹے سے کہا۔ "کل تو تمہیں جانا ہی ہے"

"تم چلو" نور داد نے جواب دیا۔ "مجھے تو ابھی ڈھوروں کیلئے چارہ کاٹنا ہے"

دونوں نے گاؤں کی راہ لی۔

نور داد کی ماں بولی۔ "اب رحمت کی ماں کو کیا جواب دوں"

"ابھی رحمت کی عمر ہی کیا ہے" بوڑھے نے جواب دیا۔

"تم تو سٹھیا گئے" بڑھیا بولی۔ "لڑکی اور کڑوی بیل کو بڑھتے دیر نہیں لگتی، رحمت تیرہ چودہ سال کی تو ہوگی"

"تیرہ چودہ سال کی بھی بیاہنے کی عمر ہوتی ہے" بوڑھے نے کہا۔

"میرے ارمان تو پورے ہو جاتے" بڑھیا نے کہا۔

"باتوں سے تو بیاہ نہیں ہوتے" بوڑھا بولا۔ "چار پیسے بھی تو پاس ہونے چاہئیں"

"اللہ مالک ہے" بڑھیا نے جواب دیا۔ "بے آس کی آس وہی پوری کرتا ہے"

"اللہ ہی کے بھروسے پر تو نور کو بھیج رہا ہوں" بوڑھے نے جواب دیا۔

بڑھیا شکوے کے طور پر بولی۔ "تم سے تو اتنا بھی نہ ہوا کہ چوہدری سے جاکر کچھ کہتے سنتے"

"تم نے کہہ کر کیا لیا" بوڑھے نے جواب دیا۔ "پیسے والے کب غریب کی بات سنتے ہیں"

"میں نے صاف کہدیا تھا کہ چوہدری نے میرے نور کو تو دھکیل دیا آگے۔ اپنے بیٹوں میں سے بھی ایک کو بھیجدیا ہوتا"

"فائدہ؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"دل کی بھڑاس تو نکل گئی" بڑھیا نے جواب دیا۔

دونوں یوں ہی باتیں کرتے گھر پہونچ گئے۔ بڑھیا بیٹے کے لئے چاول کے آٹے کے لڈو بنانے کی تیاری کرنے لگی۔

آج نور داد کی رخصت کا دن تھا۔ پانچ سات آدمی اور پانچ سات عورتیں اسے الوداع کہنے آئے ہوئے تھے۔ نور داد نے بوسکی کی

قمیص، ریشم کی دھاری والا تہبند، سُرخ پگڑی اور آسمانی رنگ کی گورنمنٹ کی واسکٹ پہنی تھی، یہ لباس وہ میلے تہوار پر پہنا کرتا تھا۔ نور کی ماں نے مہانوں کی میٹھے چاولوں سے تواضع کی۔

جب رخصت کا وقت آیا تو نور داد بیلوں کی طرف جو تھان پر جگالی کر رہے تھے گیا۔ اُس نے پہلے ایک بیل کی پھر دوسرے کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ ساتھ ہی اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ماں بھی رونے لگی۔ دیکھنے والوں نے تسلّی اور حوصلہ دلایا۔

دروازے کے پاس پہونچ کر اس کے گھر کی طرف حسرت سے دیکھا پھر لپک کر اپنی کوٹھڑی کی کچی دیوار سے تھوڑی سی مٹی اُتار کر اور پُڑیا بنا کر واسکٹ کی جیب میں ڈال لی۔

جس وقت وہ گھر سے چلا تو رحمت بھی اپنے گھر کے دروازے میں کھڑی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا لیکن تہذیب تمدن نے بات کرنے کی اجازت نہ دی۔ سڑک گاؤں سے کوئی دو تین فرلانگ پر تھی۔ جب یہ لوگ گاؤں سے نکل گئے تو رحمت بھی چپکے سے گھر سے نکلی اور کھیتوں کی اوٹ لیتی ہوئی دوسروں سے الگ ہٹ کر سڑک سے کچھ فاصلے پر شیشم کے ایک پیڑ کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر بعد لاری کے آنے کی آواز سُنائی دینے لگی۔ رحمت غریب کا دل اندر ہی اندر بیٹھنے لگا۔ اور وہ اُچک اُچک کر اس طرف جہاں سب لوگ کھڑے تھے دیکھنے لگی۔ لاری آئی اور رُک گئی۔ نور داد سب مردوں سے گلے ملا پھر ماں نے اُسے سینے سے لگایا۔ پھر لاری میں سوار ہوا اور لاری حرکت کرنے لگی۔ جو چھوڑنے ساتھ آئے تھے دس پانچ قدم ساتھ گئے۔ ادھر لاری آنکھوں سے اوجھل ہوئی اُدھر نور داد کی ماں سڑک پر بیٹھکر رونے لگی۔ ایک طرف ماں مامتا کی ماری ماں بیٹے کی جدائی میں آنکھوں سے سیلاب اشک بہا رہی تھی دوسری طرف رحمت شیشم سے لگی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

نور داد کو وطن سے گئے سینکڑوں لیل و نہار گذر گئے۔ ماں اور باپ دونوں اُسے یاد کرتے کرتے عدم کو سدھارے۔ جب تک وہ جیتے رہے نور داد کا مہینے دوسرے مہینے خط آجاتا اور خط کے ساتھ کچھ روپے بھی۔ لیکن جب وہ اس دُنیا میں نہ رہے تو یہ سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔ گاؤں والے تو تقریباً اُسے بھول ہی چکے تھے اور وہ شخص جو اب اُسکی کھیت بوتا تھا دل میں یہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ قارون کا یہ خزانہ عمر بھر اسکے پاس رہیگا۔ ہاں! ایک رحمت تھی یا اسکی بوڑھی ماں جن کے دل میں اُسکی یاد ابھی تازہ تھی۔

رحمت اب شباب کی آغوش میں مسرّتوں کے خواب دیکھتی تھی۔ لیکن وہ خواب جو ہمیشہ شرمندۂ تعبیر ہی رہتے وہ مسرّتیں جو دل میں پیدا ہو کر دل ہی دل میں ڈوب جاتیں۔ وہ کبھی اس سڑک پر جس پر دن میں دو چار لاریاں گذرتی تھیں جا کر کھڑی ہوتی اور ہمیشہ مایوس ہو کر

نہ آیو ری پردیسی بالموا

گاتی ہوئی واپس آجاتی۔ وہ اس خوشرنگ کلی کی طرح تھی جو ہمیشہ مُرجھائی ہوئی نظر آتی۔

اور اگر کسی وقت کوئی اُس کی ماں سے جو یہ کہتی کہ کب تک جوان بیٹی کو گھر بٹھائے رہوگی، جس کی آس لگائے بیٹھی ہو وہ تو اب آنے سے رہا تو رحمت کے دل پر چوٹ سی لگتی۔ وہ مہینے میں دو ایک بار نور داد کے گھر میں جھاڑو دے آتی اور اُسکی دو ایک چیزوں کو جو جوں کی توں رکھی تھیں جھاڑ پھونک آتی۔

ساون رُت تھی۔ گھٹائیں آتیں برستیں اور گذر جاتیں۔ کبھی اودی اودی گھٹائیں کبھی نیلے نیلے بادل! گاؤں کی لڑکیوں نے پیڑوں میں جھولے ڈال رکھے تھے۔ جھولتیں، پینگیں بھرتیں اور گاتیں۔ جوانی اور مستی کے گیت، وہ گیت جو دوسروں کے سامنے وہ نہیں گا سکتیں؛ لیکن رحمت کے دل کا کنول کبھی نہ کھلتا۔ اور کھلتا بھی تو کیسے جبکہ کنول کا طواف کرنے والا بھونرا ہی کسی اور سرزمین کا ہو رہا تھا۔

ساون کی راتیں اور اُٹھتی جوانی۔ قیامت پر قیامت! اور رحمت غریب کی یہ حالت کہ

کبھی جو یاد آگئے ہیں تو پہروں نیندیں اُچٹ گئی ہیں!

کبھی جو جھڑی لگتی تو سات سات دن متواتر پانی پڑتا۔ رحمت جہاں اپنے گھر کو لیپتی پوتتی رہتی وہاں نور داد کے گھر کو بھی لیپ پوت کر دُرست کر آتی۔

ایک روز ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ رحمت کوٹھڑی میں بیٹھی چکی پیس رہی تھی اور ہولے ہولے گا

اب کے ساون گھر آجا!

گا رہی تھی۔ کبھی کبھی اُس کی آہو ایسی مست آنکھوں سے ایک دو آنسو بیخبری کے عالم میں نکل کر اور گلاب ایسے رُخساروں پر سے لڑھک کر اُس کے سینے پر آگرتے۔ اچانک لاری کے ہارن کی آواز سُنائی دی۔

وہ ہاتھ روک کر کان لگا کر سننے لگی۔ پھر وہی آواز آئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی لاری گاؤں والی سڑک پر آرہی ہے۔

رحمت چکی چھوڑ کر دروازے پر کھڑی ہوگئی۔ سڑک پر پانی اور کیچڑ ہونے کی وجہ سے انجن کی آواز بہت زور سے سنائی دے رہی تھی۔ پانچ سات لڑکے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی لاٹھیاں پکڑے کیچڑ میں سے کودتے پھاندتے پاس سے بھاگتے ہوئے گزرے۔ پھر ایک عورت سر پر گھڑا اُٹھائے جو پاس سے گذری تو رحمت نے پوچھا "چچی! یہ شور کیسا ہے"؟

"کوئی لاری آئی ہے" گھڑے والی نے چلتے چلتے جواب دیا۔ "مسجد کے پاس کھڑی ہے"۔

رحمت کا دل تو چاہتا تھا کہ وہ بھی جاکر دیکھے لیکن نہ جانے یہ دل اس وقت اتنا دھڑک کیوں رہا تھا۔ اتنے میں اُس کی ماں بھی کہیں سے آگئی اور بیٹی کو دروازے میں کھڑا دیکھکر بولی "آٹا پیس چکی ---؟"

"کچھ تھوڑا باقی ہے"

"تو بیکار کیوں کھڑی ہو یہاں" ماں نے جواب دیا۔

"کوئی لاری آئی ہے؟" رحمت نے پوچھا۔

"آئی ہوگی" ماں نے چولھے کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

رحمت پھر چکی پر آ بیٹھی۔ لیکن ابھی دو ایک گالے ہی ڈالے تھے کہ ایک خوبصورت جوان فوجی وردی پہنے اندر آیا۔ یہ نور داد تھا۔ اسکا سینہ تمغوں سے مزین تھا۔

"چچی سلام!" نور داد نے رحمت کی ماں کو جھک کر سلام کیا۔ بڑھیا نے اُٹھکر اُسے سینے سے لگالیا۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے، اور رحمت چکی چھوڑ کر کواڑ کی اوٹ میں سے اُسے جھانک رہی تھی۔ اور موتیوں کی ٹوٹی ہوئی لڑی کی طرح اس کی نرگسی آنکھوں سے بھی ایک ایک کرکے آنسو گر رہے تھے۔ لیکن اس وقت ان آنسوؤں میں بھی اسے مسرت رقص کرتی نظر آرہی تھی۔ کیونکہ آج اس کا منگیتر پھر اس کے سامنے کھڑا تھا۔

خدا کی شان! وہی نمبردار جو کبھی نور داد سے بیگار لیا کرتا تھا، آج اس کا اسباب دو چار آدمیوں کے سر پر اُٹھوائے دروازے کے پاس کھڑا تھا۔

ایم۔ اسلم؛

دیہاتی بولیاں

پنجاب کے چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں بنجاروں کی آمد بہت اہمیت رکھتی ہے۔ عورتیں عام طور پر اپنے سنگھار کا سامان انہی بنجاروں سے خریدتی ہیں۔ دیہاتی زندگی میں بنجارے کو اپنے پیشے اور اپنی چلتی پھرتی دکان کی وجہ سے کافی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ دیہاتی گیتوں اور بولیوں میں اُن کا ذکر عام ہے۔ چونکہ وہ ایک جگہ ٹِک کر نہیں رہتا اس لئے اُسے بیوفائی کی تجسیم بنا دیا گیا ہے۔ مجھے اس وقت کوئی ایسا گیت یاد نہیں آرہا جس میں بنجارے کا ذکر ہو مگر چند بول میرے ذہن میں گونج رہے ہیں جو میں نے خدا معلوم کہاں اور کب سُنے تھے :-

او ونجارا، بھلا ونجارا — او یار کوارا
ساڈے اوہاں دا — ٹھگ ونجارا

مطلب :- وہ بنجارا، وہ بھلا بنجارا — وہ ہمارا کنوارا یار — ہمارا ہم عمر ہی وہ ٹھگ بنجارا — یہ شاید ایک کنواری لڑکی کے جذبات ہیں جس میں دوشیزہ محبت کے اُتار چڑھاؤ بڑی پیاری لہروں کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔

یہ بنجارے کانچ کی رنگ برنگ چوڑیاں بھی لاتے ہیں جو دیہات کی کنواریاں ہاتھوں ہاتھ لیتی ہیں۔ چوڑیاں چڑھانے میں یہ بنجارے بڑی مہارت رکھتے ہیں چنانچہ پارے کی طرح مچلتی ہوئی کلائیوں میں بھی بڑی پھرتی سے کانچ کی کھنکھناتی ہوئی چوڑیاں یوں چٹکیوں میں چڑھا دیتے ہیں۔ وہ کس انداز سے دیہات کی نوجوان لڑکیوں کی انگلیاں چٹخاتے ہیں اور کس انداز سے اُن کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دباتے ہیں اس کا تصور آپ خود کیجئے ..... میرے تصور میں وہ جوان لڑکی ہے جس نے نیلی چوڑیاں پہنی ہیں، اس کی سانولی باہوں میں یہ چوڑیاں دیکھکر آسمان بھی نکھر گیا ہے .... لڑکی بڑے چاؤ سے بار بار اپنی چوڑیوں کو داد بھری نگاہوں سے دیکھتی جا رہی ہے اُدھر کھیتوں کی طرف جہاں کپاس اُگ رہی ہے — بھولوں کے جھنڈ میں سے دفعتاً اس کا عاشق نکلتا ہے اور دونوں کی مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔ جانے کیا بات ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے نظر آتے ہیں۔ نوجوان اُسکو سخت ہاتھوں سے پکڑنا چاہتا ہے مگر وہ مچھلی کے مانند اسکی گرفت سے پھسل پھسل جاتی ہے۔ تھوڑی سی کشمکش کے بعد وہ کھلکھلا کر ہنستی ہے مگر فوراً ہی مصنوعی سنجیدگی اختیار کرکے کہتی ہے :-

اساں نوِیاں چڑھایاں چُوڑیاں
ہتھاں تے نہ مارِیں ویریا

مطلب :- ہم نے یہ چُوڑیاں نئی نئی پہنی ہیں — دیکھو ہمارے ہاتھوں پر نہ مارنا۔

ہنسی مذاق ختم ہوتا ہے۔ لڑکی جس کا نام بنتو ہے بار بار اپنی آنکھ ملتی ہے۔ اُس کا چاہنے والا اُس سے پوچھتا ہے "کیا ہوا بنتو تیری آنکھ کو کیا ہو گیا ہے؟"

وہ آنکھ مل کر کہتی ہے "تنکا پڑ گیا ہے"

اس پر حاسد عاشق کہتا ہے :-

کیہڑے یار دا گُتّا وا کیتا اکھ وِچ ککھ پے گیا

مطلب :- تو نے کس یار کیلئے گائے بھینسوں کا چارہ تیار کیا ہے کہ تیری آنکھ میں تنکا پڑ گیا ہے۔

تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کے بعد میلے کی بات چیت ہوتی ہے۔ بنتو کا دوست بڑے ٹھاٹ سے بیساکھی کے میلے پر جا رہا ہے۔ گلے میں سونے کا یہ موٹا کنٹھا (زیور) پڑا ہے۔ قمیص دھاری دار کپڑے کی ہے جس سے شہری شب خوابی کا لباس بناتے ہیں۔ ہاتھ میں نئی لاٹھی ہے جسکو تیل پلایا گیا ہے۔ چرچر کرتا جوتا ہے، بالکل نیا جس نے ابھی سے کاٹنا شروع کر دیا ہے۔ جب میلے جانے کیلئے سب لوگ نکلیں گے تو یہ جوتا اُسکی لاٹھی کے ساتھ بندھا ہوگا۔ اُسکے پاس ایک چھاتا بھی ہے جو گاؤں میں اور کسی کے پاس نہیں، اس لئے وہ اُسے ضرور ساتھ لیکر جائے گا۔ بارش نہیں تو کیا شان تو بڑھ جائے گی۔

میلے کا سُنکر بنتو کے مُنہ میں پانی آجاتا ہے۔ وہ اس سے کہتی ہے :-

میلے چلیاں تے لیا دویں ہنجی — وے لیجا میرا گُٹ مِن کے

مطلب :- تو میلے پر جا رہا ہے تو میرے لئے ایک پہنچی ضرور لانا — لو میری کلائی کا ناپ لیتے جاؤ۔

ستانے کیلئے وہ انکار کر دیتا ہے "ہم تمہارے کیا ہوتے ہیں کہ تمہاری روز روز کی فرمائشیں پوری کرتے رہیں۔ نہیں ہم تمہارے لئے میلے سے کچھ نہیں لائیں گے"

تھوڑی دیر چخ چخ ہوتی ہے، آخر بنتو ملامت آمیز لہجے میں تھک ہار کر اپنے دوست سے کہتی ہے :-

میری اک نہ منی کہانا۔ تیریاں میں لکھ مندی

مطلب۔ کم ذات تو نے میری یہ ایک چھوٹی سی بات نہیں مانی اور میں تو تیری لاکھوں باتیں مانتی ہوں۔

اس پہ از راہ مذاق بنتو کا دوست اُس سے کہتا ہے "کیوں؟۔۔ بس؟۔۔ یہ تو دہی ہوا۔۔۔۔

کچی یاری لڈواں دی۔ لڈو مک گئے یارانے ٹٹ گئے

مطلب۔ لڈوؤں کی دوستی (یعنی وہ دوستی جس میں چیزوں کا لین دین ہو) کچی ہوتی ہے۔ لڈو ختم ہوگئے اور دوستی بھی ختم ہو گئی۔

یہ سنکر بنتو کے احساس کو ٹھیس لگتی ہے۔ اسکی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور ایکدم اسکے سینے سے آہ اٹھتی ہے وہ سوچتی ہے:۔

کھٹیا ای عشق گل لا کے۔ جندڑی نوں روگ لا لیا

مطلب۔ عشق کو گلے لگا کر یعنی محبت کر کے تو نے کیا فائدہ حاصل کیا ہے سوائے اسکے کہ اپنی جان کو ایک روگ لگا لیا ہے۔۔ عشق کرنے سے پہلے کیا اسکے کانوں نے بار بار نہیں سنا تھا۔۔۔۔

کتے ڈب نہ مریں بجا نائے۔ عشقے دی نہر وگدی

مطلب۔ اے انجان تو کہیں ڈوب مرے۔ تیرے آگے عشق کی نہر چل رہی ہے۔

اسکو یہ سب کچھ معلوم تھا مگر پھر بھی وہ عشق میں گرفتار ہو گئی اور ہر وقت بن ٹھن کے رہنے لگی۔۔ ابھی تھوڑے ہی روز ہوئے اُس نے محلے کے رنگریز سے کہا تھا۔

چنی رنگ دے للاریا میری۔ وے السی دے پھل ورگی

مطلب۔ اے رنگریز میرا دوپٹہ رنگ دے۔ ایسے رنگ میں جو السی کے پھول کی طرح ہو۔ (السی کے پھول کا رنگ بہت خوبصورت ہوتا ہے)

اور اُس کا عشق کتنا صادق تھا۔ جس روز اُس نے یہ سنا تھا کہ وہ بیمار ہے تو اُسکو کتنا دکھ ہوا تھا اور جب چوتھے روز دھان کے کھیتوں میں بنتو کی اُس سے ملاقات ہوئی تھی تو اُس نے کہا تھا۔

تیری میری اک جندڑی۔ تینوں تاپ چڑھے میں ہونگاں

مطلب۔ تیری میری ایک جان ہے یعنی یک جان و دو قالب والا معاملہ ہے۔ تجھے بخار چڑھے تو میں ہنکارے بھرتی ہوں۔

سوچتے سوچتے وہ اپنے دوست کی طرف ملامت بھری نظروں سے دیکھتی ہے اور کہتی ہے "کیا میں نے تم سے کہا نہیں تھا۔۔۔۔

میرا کالجا گنڈے دے چھل ورگا۔ دیکھیں یارا پاڑ نہ سٹیں

مطلب۔ میرا کلیجہ یعنی دل پیاز کے چھلکے کی طرح نازک ہے، دیکھنا کہیں اُسے چیر پھاڑ نہ دینا۔

یہ کہکر وہ بیری کے پاس بیٹھکر زار و قطار رونا شروع کر دیتی ہے۔ اُس کا عاشق جس نے صرف چھیڑنے کی خاطر اُسے لڈوؤں کا طعنہ دیا تھا سخت پریشان ہوتا ہے۔ اُسکی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے۔ وہ اُس کو ہزار دلاسہ دیتا ہے مگر وہ روئے جاتی ہے۔ معافیاں مانگتا ہے مگر اسکے آنسو نہیں تھمتے۔ "بھئی میں نے کیا کہا ہے جو تمہارے آنسو ہی بند نہیں ہوتے۔۔ کوئی مجھ سے خطا ہو گئی ہو تو معاف کر دو۔۔ لو اب چپ ہو جاؤ غصے کو تھوک دو۔۔ حد ہو گئی ہے۔۔۔۔ ارے بھئی کچھ تو خیال کرو۔ کوئی یہاں آنکلے تو کیا سمجھے۔۔۔۔ بس اب چپ ہو جاؤ۔۔۔۔ آخر ہوا کیا ہے؟۔۔۔۔ کچھ مجھے بھی تو پتہ چلے"

وہ روئے جاتی ہے اور اس بات پر اڑ جاتی ہے۔۔۔

تیرے سامنے بیٹھ کے رووّاں۔ تے دکھ تینوں نہیوں دسنا

مطلب۔ تیرے سامنے بیٹھ کے روؤنگی پر یہ نہیں بتاؤں گی کہ مجھے دکھ کیا پہونچا ہے۔۔۔۔۔۔

عاشق کیلئے یہ کتنا بڑا دکھ ہے۔۔ بنتو سامنے بیٹھکر روتے چلی جا رہی ہے پر یہ بتانے کیلئے تیار نہیں کہ اُسے کیا دکھ پہونچا ہے۔۔ اس سے بڑھ کر روحانی سزا وہ اپنے عاشق کو اور کیا دے سکتی ہے۔

چند روز کے بعد یہ بات سارے گاؤں میں پھیل جاتی ہے کہ بنتو اور اُسکے عاشق کا آپس میں بگاڑ ہو گیا ہے۔ چنانچہ طرح طرح کی باتیں سننے میں آتی ہیں۔ بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔ لوگ بنتو کے عاشق کو طعنے دیتے ہیں چنانچہ وہ بنتو کو مخاطب کر کے کہتا ہے:۔

کی کچے تیری یاری۔ مہنا مہنا ہو کے ٹٹ گئی۔

مطلب۔ اے خام عورت "کچی یعنی وہ عورت جو عشق کرنیکے معاملے میں بالکل خام ہو) تیری دوستی بھی کیا تھی جو طعنہ طعنہ ہو کر ٹوٹ گئی۔

ایک روز بنتو نے اُسے دور کٹے ہوئے درختوں کے پاس بیٹھے دیکھا اُسکے دل میں ایک ہیجان سا برپا ہو گیا۔

یاری توڑ کے کھنڈاں تے بہ گیاں۔ نے ہن تیکھڑا رب ہو گیا

مطلب۔ دوستی ختم کر کے تو مجھ سے دور کٹے ہوئے درختوں کی جڑوں پر بیٹھ گیا ہے، لیکن تو ایسا کرنے سے خدا تو نہیں ہو گیا۔

درختوں کی ٹنڈ منڈ جڑوں پر ایسے کئی خدا دیہاتوں میں بیٹھے رہتے ہیں جن کی خدائی آن کی آن میں اندھی ہو جاتی ہے۔۔۔۔ آسمانوں کا اللہ خدا اوپر بیٹھکر یہ تماشا دیکھتا رہتا ہے اور خاموش رہتا ہے۔

سعادت حسن منٹو،

(ہولناک کہانی۔)

جو کچھ کہ دیکھا!

۱

کسی طرح جان نکلتی نہ تھی۔

پندرہ دن سے بستر مرگ پر نزع کی رُوح فرسا ہچکیوں میں گرفتار پڑا رہنا، اور جان دیدینے کی انتہائی کوشش کے باوجود رُوح کا جسد خاکی سے چمٹے رہنا ایک جہنمی عذاب تھا! نہ صرف مریضہ کے لئے ۔۔۔ بلکہ معالجوں اور تیمارداروں کے لئے بھی!

پندرہ دن پہلے، ایک صبح جب میں زبیدہ کو دیکھنے سنوٹوریم گئی تو میرا خیال تھا کہ اسی دن غروب آفتاب تک اسکے سرنگوں پیمانۂ حیات کی آخری بوند کنارے پر سے ٹپک پڑے گی۔ اُس کی آنکھیں پتھرا چکی تھیں۔ سینے میں درد کی شدت نے چہرہ مستقل طور پر مسخ کر رکھا تھا۔ بیماری کی طوالت سے سانس اُکھڑ گیا تھا۔ زبان لکڑی کی طرح سخت ہوگئی تھی اور اکثر منہ کے باہر نکل آتی تھی۔

جب میں کار میں بیٹھنے لگی تو ڈاکٹر نے سرگوشی میں مجھ سے کہا۔

"خاتون روحی۔ نہ جایئے۔ دو بجے تک انتظار کر لیجئے۔ شاید اس سے پہلے ہی ۔۔۔"

یہ سنکر میں سہم گئی تھی۔ میرا ایک ہاتھ وہیں سٹیرنگ پر دھرا کا دھرا رہ گیا۔ اک لمحہ بعد سسکی لیکر میں کار سے اتر آئی اور زبیدہ کے وارڈ کے آگے برآمدے میں آنکھوں پر رومال رکھکر بیٹھ گئی۔ کبھی کبھی دریچے سے اندر نظر ڈال لیتی۔ دو نوجوان نرسیں اُس کے قریب بیٹھی اپنے عاشقوں کے لئے سوئٹر بُن رہی اور آہستہ آہستہ ہنس بول رہی تھیں۔ جیسے موت اُنہیں کبھی اس رنگین دُنیا سے جُدا نہ کرے گی! عالم نزع کے اس گرفتار کی طرف ان کا خیال بھولے سے بھی نہ جاتا تھا۔

میرا دل کٹ گیا۔

زبیدہ! ۔۔۔ میرا خیال ماضی کی طرف جانکلا۔ جامعہ سلطانیہ میں اُس کی میری سالہا سال کی یکجائی، وہ لطف کے دن، اور عیش کی راتیں! وہ ہم مکتبی کا زریں زمانہ! ۔۔۔ پھر تکمیل تعلیم کے بعد میرا سیاحت چین میں، اور زبیدہ کا دشت عشق کی سیاحی میں بادیہ پیمائی کرنا!! راہ عشق کی گمراہیاں ۔۔۔ بے وفائی کی ٹھوکریں۔ اور پھر؟ ۔۔۔ اور پھر اس کا المناک نتیجہ دق!

زبیدہ کوئی دولتمند لڑکی نہ تھی۔ اُس کے زمانۂ طالب علمی میں بھی میں اُس کی کفیل رہی، اسکے بعد بھی اُسے میرا ہی سہارا رہا اور جب وہ کاروان حیات سے بچھڑ کر رہ عشق کی گمراہی سے خستہ حال میرے پاس پہونچی تو اپنی پیاری سہیلی کو دیکھکر میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔

مجھے یاد ہے ایک سال قبل میں نے اس سے کہا تھا "زبیدہ! عشق کی ناکامی کوئی ایسی چیز ہے کہ انسان اس کے پیچھے اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے؟"

"روحی! تم کچھ بھی نہیں جانتیں"

"مگر زبیدہ! تمہیں ہلکی ہلکی کھانسی شروع ہوگئی ہے"

پھر میں اسے لئے لئے شہر کے مشہور ٹی بی کے ماہر ڈاکٹروں کے پاس پھرتی رہی، اسکے بعد دق کا شدید حملہ شروع ہوگیا۔ اور میں نے اسے سنوٹوریم میں داخل کرا دیا۔

میں نے گھڑی دیکھی تو تین بج رہے تھے۔ میں اپنے خیالات سے چونک پڑی۔ گھبرا کر زبیدہ کی طرف دیکھا، بالکل اسی حالت میں پڑی کراہ رہی تھی۔

یہ آج سے پندرہ دن پہلے کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد میں جب بھی گئی اُسے اسی حال میں پایا۔ نرسیں اُس کی زندگی سے اُکتا چکی تھیں اور ڈاکٹر حیران تھے۔

۲

پندرہ دن اسی حالت میں گذر گئے۔

جب سولھویں دن صبح میں سنوٹوریم گئی تو نرس نے مسرت کو دبا کر کہا: "جلد پر نیلاہٹ نمودار ہوگئی۔ آخری علامت!"

میں نے ایک ستون کا سہارا لے لیا اور نرس کو اپنے سامنے سے ہٹا دیا۔

زبیدہ کی چارپائی کے پاس جانے کا مجھ میں حوصلہ نہ تھا ۔۔۔ وہ ہیبتناک طور پر بدل چکی تھی۔ جیسے موت کی بے صبری نے زندگی تمام ہونے سے پیشتر ہی اُس کے جسم کو اپنی دستبرد کا شکار بنانا شروع کر دیا تھا وہ ایک نرالی لاش معلوم ہوتی تھی جو حشرات الارض کی اذیتوں سے بیتاب ہوکر زمین سے باہر پھلانگ پڑی تھی۔ خشک زبان باہر کو لٹکی ہوئی تھی۔

آنکھیں نیم وا تھیں۔ چڑھی ہوئی پتلیوں نے کرب کی شدت کو عیاں کرنے کے لئے صرف ڈھیلوں کی خوفناک سفیدی کھلی چھوڑ دی تھی۔ ناک، منہ چکی تھی اور جبڑے کی ہڈیاں کیلوں کی طرح اوپر کو ابھر آئی تھیں۔ بے بس پھیپھڑے ہر سانس کے ساتھ جواب دیتے معلوم ہوتے تھے اور گلے سے ایک ہولناک مدھم آواز مسلسل نکل رہی تھی غرض، وغ۔

"تین مریضں میں دم کا شمار باقی تھا"

میں دہشت کے عالم میں ڈاکٹر کو ٹیلیفون کرنے کی تاکید کر کے گھر چلی آئی۔

۳

شام تک ٹیلیفون کی ہر گھنٹی پر شبہ ہوتا تھا کہ زبیدہ کی موت کی اطلاع ہے مگر رات کے گیارہ بج گئے اور کوئی اطلاع نہ آئی۔

آخر میری بوڑھی حبشن خادمہ زدناش کو سنوٹوریم سے پوچھنے پر نرس نے اطلاع دی کہ ابھی زندہ ہے۔

تمام دن کے شدید تردد نے مجھے نڈھال کر رکھا تھا۔ زدناش کو ٹیلیفون کے پاس بٹھا کر میں تیسری منزل پر اپنی خوابگاہ میں چلی آئی۔ برقی پنکھا زور سے چلایا۔ چمن کے تمام دریچے ہوا کے لئے کھول دئے۔ صرف ایک بند رکھا جس میں سے قبرستان کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ دریچوں سے باہر گرمی کی سنسان رات دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ سنہری چاندنی میں ہر چیز سُن سی نظر آرہی تھی۔

بستر پر لیٹی تو پندرہ دن کے ہولناک تصورات نے مجھے اپنے نرغے میں لے لیا۔

میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چادر اپنے اوپر کھینچ لی۔

۴

دفعتاً زینے پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔

"زدناش! زدناش!" میں نے آواز دی۔ مجھے یقین ہوگیا بوڑھی زدناش زبیدہ کی خبر مرگ سنانے آرہی ہے مگر قدموں کی چاپ اچانک غائب ہوگئی اور کچھ دیر بعد دروازہ آپ سے آپ آہستہ سے کھلنے لگا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ شاید گرم موسم کے ہوا کا کوئی جھونکا تھا ــــــ؟؟

پھر یکلخت میری نظریں چھت پر روشندان کی طرف اٹھ گئیں۔

میں نے دیکھا وہاں ایک عورت سفید چادر لپیٹے ٹانگیں لٹکائے یوں آمادہ بیٹھی تھی جیسے نیچے کودنے والی ہو۔

میں پسینے میں نہا گئی۔ اور میرا دل خوفناک طور پر دھک دھک کرنے لگا۔

عورت میری طرف مڑ گئی۔ مگر اس کا چہرہ مجھے نظر نہ آیا۔ میری بینائی کام نہ کر رہی تھی، اس نے گھونگٹ کر رکھا تھا۔ وہ بولی: "پانی! مجھے پیاس لگی ہے!"

اسے بولتے دیکھ کر میری سوکھی ہوئی زبان نے بمشکل پوچھا: "تم وہاں کیوں بیٹھی ہو؟ اور یہاں آئیں کیسے؟"

وہ بولی: "میں وہاں کی زندگی سے تنگ آگئی تھی۔ اب اچھی ہوں۔ اس لئے آگئی"

"کہاں کی زندگی سے؟" میں نے اپنی آواز سنی: "کیا تم بیمار تھیں؟"

"بہت سخت!" پھر بولی: "لیکن اب بالکل اچھی ہوں۔ کیا تمہیں یقین نہیں آتا؟ اگر تمہیں یقین نہیں آتا؟ اگر تمہیں میری تندرستی کا یقین نہیں تو دیکھ لو مجھ میں اب کتنی طاقت آگئی ہے"

یہ کہتے وہ روشن دان سے نیچے کود پڑی۔

میں نے دہشت زدہ ہو کر ایک چیخ ماری اور اپنے بستر سے اٹھ کر ہانپتی ہوئی صوفے کے پیچھے بھاگی۔

اس نے کندھے سے ایڑیوں تک ایک سفید چادر لپیٹ رکھی تھی۔ وہ تیزی سے بڑھی اور قالین پر بے حد سرعت سے قلابازیاں کھانے لگی اس پھرتی سے کہ مجھے اس کی شکل نظر نہ آتی تھی۔ صرف ہوا میں ایک شفاف سفید چیز گھومتی نظر آرہی تھی۔ وہ گویا اپنی طاقت اور تندرستی کا سکہ مجھ پر جمانا چاہتی تھی۔

میں ایڑی تک پسینے میں نہا چکی تھی میرا دل جیسے تھم چکا تھا۔ اس خوفناک شغل کو روکنے کے لئے ایک چیخ مجھ میں سے پھوٹ پڑی: "بس کرو"

اور جب وہ تھم کر کھڑی ہوگئی تو میرے منہ سے ایک اور چیخ نکل گئی کیونکہ اس کی سفید چادر والے گھونگٹ میں سے مجھے ایک خشک و سخت زبان باہر لٹکی ہوئی نظر آئی۔ زبان! ــــ بالکل زبیدہ کی سی خشک زبان! اور میں دیوار کے ساتھ اک بت بنکر رہ گئی۔

"مجھے پیاس لگی ہے" اس نے کہا اور پھر خود ہی صراحی میں سے پانی انڈیل انڈیل کر پینے لگی۔ گلاس پر گلاس۔ گلاس پر گلاس۔ گلاس پر گلاس! اور ذرا دیر بعد خالی صراحی کو دیوار پر دے مارا۔

یکایک گھوم کر بولی: "میں جارہی ہوں روحی!"

روحی! ــــ کیا وہ میرا نام جانتی تھی؟ ــــ کیا وہ ــــ کیا وہ زبیدہ تھی۔۔۔۔؟ نہیں نہیں ــــ

"کہاں ــــ" شاید میں نے پوچھا۔

"اُدھر ــــ" اس نے بند دریچے کی طرف اشارہ کیا۔ (بقیہ بر صفحہ ۸۸)

مُرغی

(نوٹ:- کہانی، افراد اور مقام سب یکسر فرضی ہیں۔)

تعارف

"نگار" بابت ماہِ مارچ سنہ ۴۵ء میں ایک مضمون "ہوسٹل کے ایک گوشہ میں بیٹھکر" شائع ہوا تھا۔ مسٹر نظیر حیدر اپنے اس مضمون کا آغاز اس طرح کرتے ہیں:- "مجھے یقین ہے کہ آپ ڈگری کلاس کے طلبا سے کبھی نہ کبھی ضرور ملے ہونگے کیونکہ اس جنس کا سد کی کمی نہیں، لیکن اگر ایسا نہیں ہوا تو یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ آپ دُنیا کی ایک بڑی دلچسپ چیز کے مطالعہ سے محروم ہیں!"

اب چونکہ دُنیا کی اس "بڑی دلچسپ چیز" سے تعلقات پیدا کرکے انکے خیالات سے محظوظ ہونے کی ہر شخص کو فرصت حاصل نہیں اس لئے ایسے حاجتمندوں کے لئے میں نے یہ تمثیل قلمبند کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں میری ذاتی غرض پوشیدہ نہیں ہے؛ اِسے تو محض رفاہِ عام کا کام سمجھ کر کہا گیا ہے۔ رہا سوال ثواب کا، اس سے میں دست بردار ہونے کا اعلان کرتا ہوں۔

یہ ایک ہوسٹل کا قصہ ہے۔ اس ہوسٹل میں پچاس کمرے ہیں؛ بائیں طرف سے کمروں کے نمبر شروع ہوتے ہیں۔ ایک سے لیکر چوبیس نمبر تک مسلمانوں کی آبادی ہے۔ صرف کمرہ نمبر ۱۶ میں راجہ راؤ سنگھ ایک عیسائی لڑکا رہتا ہے۔ کمرہ نمبر ۲۵ میں فتح سنگھ نامی ایک آن گڑھ سکھ نوجوان رہتا ہے۔ جو کہ پنجاب سے، الہ آباد تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آیا ہوا ہے۔ یو۔ پی کا ایک بنیا ہندو سکھ بن چکا ہے۔ وہ فتح سنگھ کے پڑوس میں رہتا ہے۔ فتح سنگھ کا اس پر رعب طاری ہے اور اس سے بہت سی خدمات لیا کرتا ہے۔ باقی کمروں میں ہندو رہتے ہیں۔ سوائے محمود کے جو کہ سوشلسٹ خیالات کا شخص ہے۔ اور کمرہ نمبر ۳۵ میں مقیم ہے۔

لڑکے کالجوں سے نکلکر آتے ہیں۔ نیا خون، مالی حالت مستحکم، کھانا پیٹ بھر کر ملتا ہے۔ اس لئے ان لوگوں کو بہت دُور دُور کی سوجھتی ہے۔ اگر کوئی ملٹن ہے تو کوئی شیلی، کوئی سوشلسٹ اور کوئی تھیکرے، کوئی مسلم لیگی ہے تو کوئی مہاسبھائی، کوئی کانگرسی ہے تو کوئی پاکستانی مگر جونہی وہ لوگ یونیورسٹیوں سے نکلتے ہیں تو دال روٹی کے چکر میں سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ ہم صرف بیس یا پچیس منٹ کے لئے آپ کو ان بےفکروں میں لے چلتے ہیں۔

صرف اتنی بات اور عرض کردیں کہ اگر مقطع میں، یا مطلع میں، یا کسی اور مقام پر "سخن گسترانہ" بات آپڑے تو،- ع

مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے؛

منظرِ اوّل

کمرہ نمبر ۳۔ وقت دس بجے شب۔ بادل کی گرج اور بارش کی بوچھاڑ۔ جمیل اور حیدر کمرہ میں موجود ہیں۔ تقریبًا دو برس پہلے جمیل کمزوریِ اعصاب میں مبتلا ہوگیا تھا۔ نحیف و کمزور، صورت ایسی جیسے سلیم کی انارکلی، مزاج شاعرانہ، اس وقت بستر پر دراز چھت کتر رہے ہیں۔ حیدر قوی ہیکل نوجوان، موٹی موٹی انگلیاں، بڑے بڑے کھُردرے ہاتھ، وہ کھڑکی کے پاس کھڑا پاکستان اسکیم کے نمائندوں کو مسلم طلبا کی طرف سے پیش کئے جانے والے ایڈریس کو بہت غور سے دیکھ رہا ہے۔ اس وقت اُس کے چہرے پر قوم و ملت کی خدمات کے جذبات خوفناک صورت اختیار کرچکے ہیں۔ کمرے میں دو الماریاں ہیں، ایک میں کتابیں اور رسائل، دوسری میں آئینہ، اُسترہ، پاؤڈر، غرض میک اَپ کا کل سامان۔ ایک طرف میز پر کتابیں، لغات، اوراق، پنسلیں، نبیں، دوات، رائٹنگ پیڈ، مس روز اور کانن کی تصویریں رکھی ہیں۔ ایک اور بانس کی تپائی پر پاندان اور برہنہ تصویروں کا البم رکھا ہے

یہ وہی تصویریں ہیں جن کی مشتہرین بے طرح تعریف کرنے کے بعد اشتہار کے نیچے " ایک خاص نوٹس " نمایاں حروف میں لکھ دیتے ہیں : طالب علم اس خفیہ البم کو ہرگز ہرگز طلب نہ کریں ؟

حیدر ۔ (آئینے میں چہرہ دیکھتے ہوئے) میں کچھ کمزور سا ہوگیا ہوں۔

جمیل ۔ نہیں تو ـــ لاؤ اپنا بائسپ پھلاؤ تو ذرا ۔ (حیدر بائسپ پھلاتا اور جمیل اس کا ڈنڈ ٹٹول کر آسکے پھلاؤ کو دیکھتا ہے۔) نہیں یار نہیں تم بالکل تندرست ہو۔ تم کمزور ہرگز نہیں ہوسکتے۔

حیدر ۔ (مطمئن ہوکر) ابھی تک کوئی بھی نہیں آیا۔

جمیل ۔ آتے ہی ہونگے۔

حیدر ۔ (تھنے پھلا کر) تین منٹ گذر چکے ہیں ـــ کام بہت جلدی کا ہے۔

(دروازہ کھلتا ہے اور بہت سے مسلمان لڑکے یکے بعد دیگرے اندر داخل ہوتے ہیں۔)

سب ۔ (مختلف لہجوں میں) آداب عرض ... اسلام علیکم ـــ والیکم ـــ بسم اللہ ... لاحول ... قبلہ قبلہ ... نہیں نہیں ... آپ ... پہلے آپ ... ادھر کرسی ... اُدھر ... واہ ... آفریں ... نہیں نہیں ... بس بس ... دُعا ہے ... میں ٹھیک ہوں ... پان ... سگرٹ ...

(مختلف صورتیں، مختلف ڈیل ڈول، مختلف آوازیں، کچھ دیر تک ایک ہنگامہ سا بپا رہتا ہے ......)

حیدر ۔ (کھڑے ہوکر تحکمانہ انداز میں) آرڈر آرڈر۔ (خاموشی)

ایک ۔ ہم جاننا چاہتے ہیں کہ ہم کو بے وقت کیوں طلب کیا گیا ہے ؟

دوسرا ۔ ہم اپنے بستروں میں نہایت آرام کے ساتھ لیٹے ہوئے تھے۔

تیسرا ۔ میں سیاست حاضرہ پر ایک مضمون قلمبند کر رہا تھا۔

حیدر ۔ (سنجیدگی اور متانت سے) مجھکو اس بات کا افسوس ہے لیکن دوستو ! ہم کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہم کس قوم کے افراد ہیں۔ ہمارے آباد اجداد نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دئے تھے۔ یہ موقع آرام کا نہیں بلکہ عمل کا ہے ... اسلام ...

جمیل ۔ (چلاکر) لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ میاموں نے شرکت کیوں نہیں کی ؟

دوسرا ۔ وہ شرماتا ہے۔

چوتھا ۔ کیوں ؟ کیا وہ لڑکی ہے ؟

پہلا ۔ وہ شی بوائے (she-[illegible]) ہے۔

دوسرا ۔ وہ بچارا کمزور ہے۔

جمیل ۔ لیکن وہ " سبزہ بیگانہ " کی طرح کیوں رہتا ہے۔

حاضرین ۔ (سوائے محمود کے) سبحان اللہ ! جمیل صاحب۔ سبزۂ بیگانہ کا استعمال برمحل کیا ہے۔

چھٹا ۔ مگر ایسے نوجوان ہمارے کس کام کے ؟ ـــ ہدایت جاؤ، اس کو حاضر کرو۔ کان پکڑ کر لاؤ۔

جمیل ۔ (اُچھل کر) اس کی ہتک ہرگز نہیں ہونی چاہئے۔ کیا یہ درست نہیں کہ وہ ہمارے ہوسٹل میں سب سے زیادہ کمسن لڑکا ہے، اور کیا یہ صحیح نہیں کہ وہ مسلمان لڑکوں میں سب سے زیادہ ذہین طالب علم ہے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ اس مرتبہ وہ جغرافیہ میں گولڈ میڈل لانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اس کو جغرافیہ سے خاص شغف ہے۔ ہمیشہ اسی قسم کی کتابیں پڑھا کرتا ہے۔ ہم کو اُس پر اور اُسکی جغرافیہ دانی پر فخر ہونا چاہئے۔

محمود ۔ مگر میرا دعویٰ ہے کہ اس کو کوڑی بھر عقل نہیں، کتابیں رٹ کر امتحان پاس کر لینا اور بات ہے اور انسانیت کا ہونا اور بات۔

ہدایت ۔ (جس کی آنکھیں ایسی ہیں جیسے ابھی اُبل کر باہر آگریں گی اور جسکی مونچھیں تنی ہوئی ہیں۔) تو میں جاؤں ؟

جمیل ۔ جاؤ ـــ اور اس کو باعزت تمام بُلا کر لاؤ۔ اُس کو اُن جنگلات کا واسطہ دیکر بُلاؤ جو کہ ہمالیہ پہاڑ کی چوٹیوں پر اُگے ہوتے ہیں۔ اُن مانسون ہواؤں کے نام پر بلاؤ جو کہ بحرِ عرب اور خلیج بنگال سے اُٹھ کر ہندوستان جنت نشان کو سر سبز بناتی ہیں۔ اس کو ان زمین دوز ریل گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ کی قسم دیکر بُلاؤ جو کہ لندن شہر کے نیچے ہی نیچے بھاگتی پھرتی ہیں۔ اس کو ماہِ کامل کی کرنوں کا واسطہ دو جو کہ بحر الکاہل کی لہروں میں تلاطم پیدا کر دیتی ہیں۔ اس کو ...... (ہدایت کی روانگی)

حاضرین ۔ (تالیاں بجا کر) واللہ کمال کر دیا آپ نے۔ آزاد بحر میں اس سے زیادہ موثر نظم ....

حیدر ۔ (چلاکر) آرڈر، آرڈر۔

محمود ۔ (طنز سے) واہ کیا داد دی جاتے جمیل صاحب ! اب آپ کمبل لپیٹ کر بیٹھ جائیے کہیں۔ آپ کے دست و بازو کو نظر نہ لگ جائے ....

جمیل ۔ (چڑ کر) سنو کارل مارکس ! تم ہمیشہ مجھ سے بھڑا کرتے ہو ... جب تم بولتے ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی غلاظت سے لبریز گھڑے پر سے ڈھکنا اٹھا دے۔

محمود ۔ آپ کو میری ہتک کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

جمیل ۔ آغاز کس کی طرف سے ہوا۔

محمود ۔ آپ نے وہ مہمل اور مبہم فقرات کیوں کہے ؟

جمیل ۔ یہ ادب جدید ہے .... یہی تعمیری ادب ہے جس پر ہماری آنیوالی

نسلیں فخر کریں گی۔ کیا جناب نے وہ نظم پڑھی ہے .... جو ہوتا میں راجہ .....

ساحن ... جو ہوتا میں راجہ!

پہلا ۔ میں نے پڑھی ہے۔

تیسرا ۔ میاموں کے ہاں وہ پرچہ بھی پڑا ہے۔

دوسرا ۔ جب میں ابھی ابھی آ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ وہی نظم پڑھ رہا ہے اور منہ پر "بل ڈاک" آئنیں کریم بھی لگا رہا تھا۔

پہلا ۔ (قہقہہ لگا کر) ارے میاں! آئنیں کریم نہیں ۔ سنو کریم کہو ۔ کیوں جمیل صاحب!

چوتھا ۔ میاموں کا علم وسیع ہے۔ وہ جنرل نالج بھی کافی رکھتا ہے۔

تیسرا ۔ اس نے حکمت کی کتابیں بھی پڑھنا شروع کر دی ہیں۔ بو علی سینا ...

جمیل ۔ (بات کاٹ کر) کیا وہ نبض بھی دیکھ لیتا ہے؟

محمود ۔ وہ تمہارا گلا تک دبا سکتا ہے۔

جمیل ۔ (چیخ کر) محمود!!!

پہلا ۔ محمود تم خاموش رہو (جمیل سے) جمیل میں نے ہومیو پیتھی کی کتابیں بہت پڑھی ہیں۔

(میاموں ہدایت کے ساتھ اندر داخل ہوتا ہے۔ ناک چوڑی، ہونٹ موٹے، شیخی خور، بدمذاق، ناشکر گذار۔)

حیدر ۔ (کرخت آواز میں) جلدی بیٹھو میاموں۔ تم اتنی دیر بعد آتے اور اب اسقدر آہستہ آہستہ چل رہے ہو ؎

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

میاموں ۔ (بگڑ کر) میں جاتا ہوں۔

محمود ۔ کعبہ کو؟

جمیل ۔ (حیدر کی طرف ملامت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے) حیدر! تم کو شرم آنی چاہیئے۔ وہ ہمارا ہی تو چھوٹا بھائی ہے۔ اگر اس کا مزاج کچھ تیز ہے تو تم میں ساتی ہونی چاہیئے۔ (شفقت سے میاموں کا ہاتھ تھام کر) آؤ تم یہاں بیٹھ جاؤ۔ میرے پاس چارپائی پر۔

حیدر ۔ برادرانِ ملت! اب میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ نہایت خاموشی اور توجہ کے ساتھ میری بات سنئے۔

سب ۔ ہم ہمہ تن گوش ہیں۔

حیدر ۔ دوستو آج اسلام کی ہتک ہو رہی ہے۔ آج موقع ہے کہ ہم اپنی عزت آپ کرنے کا گر سیکھیں۔ آج جب کہ سب طرف گھٹائیں چھا رہی ہیں .....

پہلا ۔ اور بارش بھی ہو رہی ہے۔

حیدر ۔ (گرج کر) آپ خاموش رہیئے ... میں جن گھٹاؤں کا ذکر کر رہا ہوں۔ وہ یہ گھٹائیں نہیں ہیں۔ ان سے مراد مصائب کی گھٹائیں ہیں جو کہ ہماری قوم پر چھا رہی ہیں۔

پہلا ۔ (سر جھکا کر) میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔

جمیل ۔ (آہستہ سے) سنو میاموں۔ کیا یہ درست ہے کہ تم نے علم طب کی کتابیں پڑھنا شروع کر دی ہیں۔

میاموں ۔ لیکن آپ کو اس سے غرض؟

جمیل ۔ (ربک کر) اوہ! یونہی، یونہی۔ میاموں بھائی (دانت نکال کر) لو میری نبض دیکھو ذرا۔

میاموں ۔ (آنکھیں دکھا کر) یہ میرا پیشہ نہیں۔

جمیل ۔ (کانوں پر ہاتھ رکھ کر) نہیں توبہ توبہ، میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ پیشہ ور ہیں ..... ہت (اپنا منہ اپنے ہاتھ سے فوراً بند کر لیتا ہے)

میاموں ۔ (چیخ کر) جمیل ---!!

(سب لوگ چونک کر اُن کی طرف دیکھنے لگتے ہیں)

حیدر ۔ (خشمگیں نظروں سے میاموں کی طرف دیکھتے ہوئے) کیا بات ہے؟

جمیل ۔ (ڈرتے ڈرتے) کچھ نہیں، میں میاموں سے کہہ رہا تھا کہ وہ میری نبض کو محسوس کرے۔

حیدر ۔ یہ نبض دکھلانے کا کیا موقع ہے؟

جمیل ۔ (سر تسلیم خم کر کے) لیکن تم جانتے ہو میرے اعصاب ...

حیدر ۔ اُف۔ میں کہتا ہوں بھاڑ میں جھونک دو اعصاب کو ---

جمیل ۔ لیکن میاموں کر ہی کیا رہا تھا۔ ہاتھ تو اُس کے خالی تھے۔

حاضرین میں سے بیشتر ۔ بیشک بیشک میاموں کیا کر رہا ہے؟

چھٹا ۔ بھلا میاموں جیسے نوجوان ملت کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟

ساتواں ۔ میاموں کو اس بات پر مجبور کیا جانا چاہیئے۔

میاموں ۔ (منہ پھلا کر) میں جاتا ہوں۔ (اُٹھ کھڑا ہوتا ہے)

(چھٹا لڑکا اُسے اُجڈ پن سے دھکیل دیتا ہے اور وہ پھر چارپائی پر گر پڑتا ہے۔)

میاموں ۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) حیدر صاحب! دیکھ لیجئے، آپ دیکھ لیجئے۔

حاضرین ۔ ہم تم کو مجبور کر سکتے ہیں۔ ہم کو اس بات کا حق حاصل ہے۔ تم کو چاہیئے کہ تم جمیل بھائی کی نبض دیکھو۔ کیا تم اتنی سی خدمت ملت کے ایک سرگرم کارکن کی نہیں کر سکتے؟

موں۔ (رحم طلب آنکھوں سے حیدر کی طرف دیکھتے ہوئے) حیدر صاحب
لیجئے آپ دیکھ لیجئے۔

یدر۔ (حاضرین کی آوازوں سے مرعوب ہو کر) اچھے میاموں تم بچوں
سی باتیں کیوں کرتے ہو۔ جمیل کی نبض ضرور دیکھو۔ اس میں ہرج ہی
ہے۔

اموں۔ لیکن مجھ کو نبض کی پہچان نہیں۔

یدر۔ پھر بھی دیکھو تو۔

ہلا۔ (ناصحانہ انداز سے) یہ سب مشق کی باتیں ہیں۔ آہستہ آہستہ
پہچان ہو جائے گی۔

(میاموں مجبوری کے عالم میں جمیل کی کلائی ہاتھ میں تھام لیتا
ہے۔ چھٹا لڑکا انتہائی خفگی کے ساتھ جھپٹ کر پاندان میں سے
پان کی گلوری منہ میں رکھ لیتا ہے اور میاموں کی طرف
قہرآلود نظروں سے دیکھتا ہوا جگالی کرنے لگتا ہے۔)

ہلا۔ (اپنے دونوں ہاتھ جھاڑتے ہوئے) ولے بخیر گذشت۔۔۔ (ادھر ادھر
سب کو خاموش دیکھکر) اچھا تو جلسہ برخاست ہونیوالا ہے کیا؟

یسرا۔ کیا تم افیون کھاتے ہو؟

ہلا۔ تمہارا مطلب؟

چوتھا۔ مطلب یہ کہ ابھی تو کارروائی شروع بھی نہیں ہوئی۔

ہلا۔ لیکن کیا اسلام میں ہر قسم کا نشہ حرام نہیں؟

ساتواں۔ (منہ پھاڑکر) بیشک بیشک۔ اب ہوئی کام کی بات۔

چوتھا۔ (پیچھے سے) ہے تو۔۔۔۔

ہلا۔ تو پھر اس نے میرے لئے یہ الفاظ کیوں استعمال کئے۔

دوسرا	اسے بھاڑ جانے دو ۔۔۔۔ ہاں صاحب ۔۔۔۔۔۔۔
پانچواں	۔۔۔ حرام ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔ بے شک حرام ہے ۔۔۔۔۔۔۔
چھٹا	توبہ ۔۔۔۔۔ مگر وگر کچھ نہیں ۔۔۔۔۔۔ نکل جاؤ ۔۔۔
جمیل	۔۔۔۔ شرم شرم ۔۔۔۔ بیٹھ جاؤ ۔۔۔۔ بس بس ۔۔۔
ہدایت	۔۔۔ افسوس ۔۔۔۔ صد ۔۔۔۔۔

یدر۔ (آئینہ میز پر پٹخ کر) آرڈر آرڈر۔۔۔ آرڈر، آرڈر۔

جمیل۔ (منہ پھیلاکر) آپنے میرا آئینہ چکنا چور کر دیا۔

یدر۔ (جھلاکر) خاموش (آستین چڑھاتے ہوئے) میں آپ لوگوں
آخری مرتبہ اطلاع دیتا ہوں کہ آپ لوگ خاموش ہو جائیے۔ اُف،
ی توہین۔۔۔

(سب مرعوب ہو کر خاموش ہو جاتے ہیں۔)

حیدر۔ (مدھم مگر مضبوط آواز میں) جمیل!

جمیل۔ (خوفزدہ ہو کر) جی!

حیدر۔ آئینہ کے ٹکڑے باہر پھینک دو۔

(جمیل حکم کی تعمیل کرنے کے بعد پھر اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا ہے
اور نبض میاموں کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔)

حیدر۔ دوستو! عزیز برادران ملت!! یہ ہندوستان وہی مقام ہے
جہاں ہمارے آبا و اجداد نے اپنی قوت اور بہادری کی دھاک بٹھادی
تھی۔ گنگا کی ایک ایک لہر اس کی گواہ ہے۔ چپہ چپہ اس سرزمین کا ہمارے
بزرگوں نے تلواریں مار مار کر لیا۔ یہ چوٹی دار ہندو بھائی ہمارا پانی بھرتے
تھے۔۔۔۔ اور آج لے دوستو ہم کو دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ نہ صرف
کل ہندوستان میں ہمارے خلاف ایک زبردست سازش ہو رہی
ہے، بلکہ خاص اس ہوسٹل میں۔۔۔۔۔۔۔۔ مولانا نحیف! تم یہ سلوچنا
کی تصویر کی طرف کیا دیکھ رہے ہو؟

مولانا نحیف۔ (خوفزدہ ہو کر) میں۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔۔

حیدر۔ خیر۔۔۔ اب محتاط رہو۔۔۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔۔۔؟

ہدایت۔ (چپکے سے میاموں کے قریب سرک کر) میاموں تم کو ایک
خوشخبری سناؤں؟

میاموں۔ (جو اب سیدھے رستے پر آچکا تھا) فرمائیے۔

ہدایت۔ اب میں ان مونچھوں کو اڑا دونگا۔ اب میں رونالڈ کالمن کی
طرح مونچھیں رکھونگا۔

میاموں۔ (ہمدردی حاصل کرنے کے لئے دلچسپی لیتے ہوئے) بہت
عمدہ، بہت عمدہ۔

ہدایت (ہاتھ بڑھاکر) دوسرے ہاتھ سے میری کلائی تھام لو۔

(میاموں غصہ دباتے ہوئے اسکی کلائی تھام لیتا ہے۔)

جمیل۔ (ہدایت سے) تم ابھی کیا خوشخبری سنا رہے تھے؟۔۔۔ (جوشیلے
انداز میں) آہ، لیکن ایک بہت منحوس خبر ہے۔ میں نے پترا اخبار میں
وہ خبر پڑھی تھی۔

(سب لوگ جمیل کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔)

حیدر (بگڑکر) پھر وہی بات۔

سب لوگ (دلچسپی لیتے ہوئے) ہاں ہاں جمیل بھائی کیا منحوس خبر ہے؟

حیدر (گرم ہو کر) میں برداشت نہیں کر سکتا۔

سب۔ حیدر! خدا کے لئے خاموش رہو۔ کیا معلوم وہ منحوس خبر کیا ہو۔
ممکن ہے ہم کو کچھ مدد مل سکے۔ یا ملت کے فائدہ کی کوئی بات نکل آئے،

(جمیل سے) ہاں بھائی جمیل!

جمیل:۔ (ہچکچاتے ہوئے) مجھے حیدر سے خوف معلوم ہوتا ہے (مہاموس) تم میری نبض تھامے رہو۔

سب:۔ (حیدر سے) حیدر صاحب ہم اُمید کرتے ہیں کہ آپ انتہائی فراخدلی سے کام لیتے ہوئے اس بات کا اسپیشل آرڈر دید یںگے۔

حیدر:۔ (پھول کر) جمیل بتلاؤ۔۔۔۔ ممکن ہے ملّت کی بہبودی کی راہ پیدا ہو جائے۔۔۔۔

سب:۔ (انتہائی توجّہ کے ساتھ دلاسہ دیتے ہوئے) ہاں بھائی جمیل ممکن ہے ملّت کی بہبودی۔۔۔

جمیل:۔ (تاریکی کی طرف تاکتے ہوئے) آہ، اے دوستو! کانتن اب مس نہیں رہی۔ اس کی شادی ہوگئی ہے۔ میں نے خود "چترا" اخبار۔۔۔

حیدر:۔ (برافروختہ ہو کر) بس حد ہوگئی۔ (گرج کر) او ہ اسلام کے نونہالو یہ موقع جبکہ۔۔۔ جبکہ۔۔۔ جبکہ۔۔۔۔

پہلا:۔ (لقمہ دیتے ہوئے) جبکہ ہم پیٹ بھر کر قورمہ پلاؤ اڑا چکے ہیں اور ہم سب کو نیند کا خمار سا محسوس۔۔۔۔۔

حیدر:۔ شٹ اپ یو فول۔۔۔۔ (جوش میں) اب جبکہ ہم پر مصائب کی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔۔۔۔ یہ کانتن وانتن کی باتیں؟۔۔۔۔ اُف ہمارے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔۔۔ چلو بھر پانی۔۔۔۔

پہلا:۔ یہاں دو دریا گنگا جمنا بھی ہیں۔۔۔

حیدر:۔ (بھنا کر اور پہلے لڑکے پر محض ایک قہر آلود نگاہ ڈالنے پر اکتفا کرتے ہوئے) ہاں۔۔۔ آہ!۔۔۔۔ اب اس ہوسٹل میں ان کافروں کی یہ ہمت؟۔۔۔۔۔۔

سب (ہمہ تن گوش بن کر) یعنی؟

حیدر:۔ یعنی۔۔ یعنی۔۔۔ ایک مرغی۔۔۔ (ہانپ کر بیٹھ جاتا ہے)

سب لوگ:۔ (جوش میں آکر) یار و شہادت کا موقع آگیا۔ کفن سر باندھ لو۔۔۔۔۔

(ہدایت ایک بڑا سا کاغذ کا ٹکڑا کھونٹی سے لٹکا دیتا ہے جس پر جلی حروف میں سُرخ پنسل سے لکھا ہے:۔

"اسلام خطرے میں")

حیدر (چلّا کر) دوستو! اب کھڑے ہو جاؤ۔

(یکایک سب لوگ اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بہت لے دے ہوتی ہے۔ اتنے میں دروازے پر دستک کی آواز سُنائی دیتی ہے۔ سب لوگ خطرہ محسوس کر کے لڑنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ کوئی ہاکی اُٹھا لیتا ہے کوئی اینٹ اُٹھا لیتا ہے۔ کوئی کرسی کا ٹوٹا ہوا پایہ ہاتھ میں لے لیتا ہے اور کوئی لوٹا پکڑ کر ڈٹ جاتا ہے۔ سب خشمگیں نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ مولانا نحیف، حیدر کا اشارہ پا کر دروازہ کھول کر خود الگ جا کھڑا ہوتا ہے۔۔۔۔ نوکر دودھ کا گلاس لیکر اندر داخل ہوتا ہے۔)

نوکر:۔ (سہم کر جمیل سے) حضور آپ کا دودھ۔

(جمیل ایک ہاتھ میں کرسی کا پایہ اور دوسرے ہاتھ کی کلائی مہاموس کے ہاتھ میں دئے نہایت خاموشی اور رُعب سے کھڑا رہتا ہے۔ نوکر خوفزدہ ہو کر حیدر کی طرف دیکھتا ہے۔ دروازے میں سے تیز ہوا آرہی ہے۔ حیدر کے بال اُڑ رہے ہیں اور وہ خود مجسّم "اسلام کا مستقبل" بنا کھڑا ہے۔ نوکر قدم ناپتا ہوا آہستہ آہستہ واپس جاتا ہے۔ اتنے میں چھت پر سے ایک مکڑی ایک لڑکے کی گردن پر گرتی ہے۔ وہ گھبراہٹ میں اُچھل پڑتا ہے۔ لوٹا اُس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور نوکر انتہائی خوف کی حالت میں جست لگا کر دروازے سے باہر نکل جاتا ہے۔)

حیدر:۔ (اسی خاموشی و سکون کے ساتھ خلا میں گھورتے ہوئے) ایک مُرغی۔۔۔۔۔

(نحیف دروازہ بند کرنے کے لئے بڑھتا ہے۔)

(ہٹلر کی طرح ہاتھ اُٹھا کر) مت بند کرو۔ (سکوت)۔۔۔ (چلّا کر) بس چلو۔۔۔ دوستو۔۔۔ مارچ۔۔۔

(کچھ لڑکے رستہ روک لیتے ہیں۔)

ہدایت:۔ لیکن بھائی سیاست کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے۔

سب لوگ:۔ ہاں حیدر صاحب وہ مُرغی کیا؟

حیدر:۔ (گویا ہوش میں آکر) اوہ دروازہ بند کرو۔ دروازہ بند کرو۔ سیاست کا یہ تقاضہ نہیں ہے۔ (دھیمی اور پُر اثر آواز میں) دوستو! آج ایک مرغی لائی گئی ہے۔ پروفیسر رام کا چوکیدار وہ گورکھا آج اس کو ذبح کر رہا ہے۔۔۔!

سب:۔ پھر؟

حیدر (گردن بڑھا کر) تم لوگ سمجھے نہیں۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ وہ اس مُرغی کو اسلامی طریقے پر ذبح کریگا؟ (سب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے) نہیں دوستو نہیں۔۔۔ آہ اسلام کے نونہالو! میں نے خود اس کو اپنی آنکھوں سے مُرغی کے پیچھے بھاگتے دیکھا ہے۔ وہ ساتھ

گلاب کے پیڑ کے نیچے چنبیلی کے جھرمٹ کے پاس مرغی بُری طرح سے کڑکڑا رہی تھی.....

ساتواں۔ (آستین چڑھا کر) اب؟

جمیل۔ (آگے بڑھ کر) ٹھہرو ـــ یہ سب کافروں کی شرارت ہے۔ لیکن ہم اپنا ایک ایلچی بھیج کر معلوم کریں گے کہ اس حرکت سے اُن کا مطلب کیا ہے۔

سب۔ بیشک بیشک، اسلام زندہ باد!

حیدر۔ (جوش میں آکر) نعرۂ تکبیر!

سب۔ اللہ ہو اکبر!

جمیل۔ مگر ایلچی کون ہوگا؟

سب۔ (ہم آواز ہوکر) حیدر!

حیدر۔ میں جان تک لڑا دونگا ـــ اور میرا نائب؟

ہدایت۔ میاموں۔

جمیل۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں (میاموں سے) تم میری نبض تھامے رہو۔ (حاضرین سے) بہتر ہوگا اگر ہدایت کو نائب بنا دیا جائے کیونکہ اس کی مونچھیں.......

ہدایت۔ (کچھ پشیمان سا ہوکر) مگر میاموں کو میرے ساتھ میری کلائی تھامے ہوئے وہاں تک جانا ہوگا۔

سب۔ ناممکن ناممکن، بالکل لغو بات۔

جمیل۔ (کاغذ کے پھولوں کا ہار لا کر حیدر کے گلے میں پہنا دیتا ہے) یہ پھولوں کا ہار میں مس تسنیم کی تصویر کو پہنانے کے واسطے لایا تھا۔ لیکن ملت کے کام آئے اس سے بہتر بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

حیدر۔ (پرجوش آواز میں) نعرۂ تکبیر!

سب۔ اللہ ہو اکبر!

(حیدر اور ہدایت اسلام زندہ باد گاتے ہوئے چل دیتے ہیں۔ اور باقی لڑکوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگتی ہیں۔)

منظر دوّم

(کمرہ نمبر ۲۴۔ بوقت دس بجے رات۔ بجلی کی چمک اور بارش کی بوچھاڑ۔ جگت سنگھ اپنے کمرے میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس لالہ لکیر چند دل کی حرکت ناپنے والا آلہ ہاتھ میں لئے بیٹھے ہیں۔ دوسری کرسی پر مہاشہ اوم دیو جی براجمان ہیں جن کے دادا کے دادا (اسی طرح "دادا" کو دو سو آٹھ کیجئے) کے دادا کے دادا چانکیہ کے رتھبان تھے۔ اس لئے اوم دیو جی سیاست میں ہٹلر اور چرچل کے بھی کان کترنے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ کمرہ اچھا خاصہ سجا ہوا ہے۔ صرف ایک کھڑکی ہے جو کہ سڑک کی طرف کھلتی ہے۔ روشندان ہے لیکن بارش کی وجہ سے بند کر دیا گیا ہے۔ فرش پر دری بچھی ہے۔ کرایہ کا فرنیچر ہے۔ ایک بڑی ڈریسنگ ٹیبل بھی موجود ہے۔ دروازے کے پاس کونے میں شو، چپل، فل بوٹ، اور تیل کا چولھا یعنی اسٹو رکھا ہے۔ گھڑے کے پاس مراد آبادی پاندان اور لوٹا چمک رہا ہے۔ پاس ہی کالی دیوی کی ایک مورتی ہے جس کے قریب خوشبو سلگ رہی ہے۔ پلنگ کے سرہانے کی طرف ہنومان جی کی ایک تصویر ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ ہنومان جی ہتھیلی پر پہاڑ رکھے اُڑے جا رہے ہیں۔)

لکیر چند۔ بھائی جگت سنگھ۔

جگت سنگھ۔ کہو۔

لکیر چند۔ یار ایک شخص کے ہردے کو ایک منٹ میں کتنی دفعہ دھڑکنا چاہیئے؟

اوم دیو۔ (حافظے پر زور دیکر) نپولین بوناپارٹ کا دل ایک منٹ میں صرف تیس دفعے دھڑکا کرتا تھا۔

لکیر چند۔ (دل تھام کر) اوہ ـــ صرف تیس....

جگت سنگھ۔ (سینہ تان کر) ارے نہیں ـــ لکیر چند مت گھبراؤ ـــ میں بتاتا ہوں۔ دیکھو اگر تمہارا دل ایک منٹ میں ایک سو بیس دفعے بھی دھڑکے تو اس کو کم سمجھ۔

لکیر چند۔ (اطمینان کا سانس لیکر) اچھا۔ تو تم... (مشکوک ہوکر) نہیں تم مذاق کرتے ہو۔

جگت سنگھ۔ نہیں نہیں میں ٹھیک بتا رہا ہوں۔

لکیر چند۔ اوہ! تم کو کالی مائی کی کسم! ٹھیک بتلاؤ۔

جگت سنگھ۔ اسّی سے لیکر چوراسی دفعے تک دھڑکنا چاہیئے۔

لکیر چند۔ یدی میں ذرا سا بھی دھماکا سُن لوں تو میرا ہردے بہت تیجی سے دھڑکنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ گِننا مشکل ہو جاتا ہے... اور...

اوم دیو۔ (جگت سنگھ سے) کیوں جناب! آپ نے یہ کیسے کہہ دیا کہ نپولین کا ہردے ایک منٹ میں.....

جگت سنگھ (زوردار آواز میں) میں کہتا ہوں یہ بالکل غلط ہے۔

اوم دیو۔ یہ راج نیتی کی باتیں ہیں تم کیا سمجھ سکتے ہو۔

جگت سنگھ (سر بلند کر کے) میں بھی راجپوت ہوں۔
اوم دیو۔ رجپوت ہو تو یہ بھی راج نیتی ہے۔ کوئی لاٹھی چلانا نہیں ہے۔
جگت سنگھ (بھنا کر) میں تمہارا سر توڑ دونگا۔
اوم دیو۔ (گھبرا کر) یہی تو بری بات ہے تم میں ـــ ارے بھائی جِش کا کارج آشی کو شا جھے۔
جگت سنگھ۔ (تعجب سے) اس کا مطلب؟
اوم دیو۔ (حوصلہ پاکر) مے کہتا ہوں تم راج نیتی کی باتوں کو بالکل نہیں شمجھ سکتے۔ (اسکے مضبوط بازوؤں کو دیکھکر) تم اتی بلوان ہو، یہ مے مانتا ہوں.... کچھ پتہ بھی ہے؟
جگت سنگھ (کڑک کر) کچھ بکو گے بھی؟
لکھیر چند۔ (سہم کر) اووہ اود میرا دل... میرا ہارٹ... دیکھو جگت بھائی دھیرے سے بولا کرو... میرا دل پھر دھڑکنے لگا ہے... دھڑکتے دھڑکتے یہ ایک دم رک جاتے گا... میں اپنے ماتا پتا کا ایک ہی پتر ہوں......)
اوم دیو۔ (اسکے دل پہ ہاتھ رکھکر) دھیرج کرو، دھیرج کرو۔ تم بھی ابھی راج نیتی کی باتوں کو نہیں سمجھتے۔
جگت سنگھ (اوم دیو کا گریبان پکڑ کر) او دیکھو اوم دیو مہاشہ! اگر تم نے مجھکو یہ نہ بتلایا کہ راج نیتی سے تمہارا کیا مطلب ہے تو میں تم کو اُٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دونگا۔
اوم دیو۔ (کانپ کر) دھیرج دھیرج۔ دیکھو تم ہم سب میں مہابلی کے نام سے مشہور ہو۔ ہم بشرف ارہر کی دال کھاتے ہیں، پرنت تم مُرغی، انڈا، گوست، سب ہجم کر جاتے ہو۔ مے پوچھتا ہوں کیا بیدوں میں کستریوں کے لئے یہ آرڈر نہیں ہے کہ وے اشتری، گاتے اور براہمن کی رکشا کریں ــ؟
جگت سنگھ (اس کا گریبان چھوڑ کر) تو ایسا بچن بیدوں میں ہے؟
اوم دیو (حوصلہ پاکر) ہے کیوں نہیں، تبھی تو مے کہتا ہوں کہ تم راج نیتی کی باتوں کو بالکل نہیں جانتے۔
جگت سنگھ۔ (کھسیانہ ہو کر) دیکھو اوم دیو تم مجھکو جھینپاتے ہو تبھی مجھکو کرودھ بھی آتا ہے۔
اوم دیو۔ (طنزسے) ہم کمزوروں پر کرودھ نہ آئیگا تو اورکس پر آئیگا۔
جگت سنگھ۔ (اکڑ کر) میں کسی سے بھے نہیں کھاتا۔
اوم دیو۔ (ہاتھ جھٹک کر اور مُنہ بنا کر) کِسی شے سے بھے نہیں کھاتا ــ اُونہہ شامنے ملیچھ لوگ وے وے کر تو یہ کرتے ہیں پرنت تم کو شرم نہیں آتی۔
بس تبھی تو میں کہتا ہوں کہ تم کو راج.....
جگت سنگھ۔ خاموش رہو بکو مت۔ اب بتاؤ ملیچھوں نے کیا کیا؟
اوم دیو۔ (گردن بڑھا کر) کیا کیا؟ آج یہ لوگ ایک مُرغی پکڑ کر لاتے ہیں اور اسکو ہمارے شامنے ہی گلاب کے پیڑ کے نیچے ذبح کر رہے ہیں۔ تم نے کھُد مُرغی کے کُرکُرانے کی آواج شُنی ہے۔
جگت سنگھ (تنکر) کیا ان لوگوں کو ہمارے فیلنگز کا خیال نہیں؟
اوم دیو۔ سپینگز کا کھیال ملیچھ کیا کریں گے۔ وے جانتے ہیں کہ ہندو ارہر کی دال اور چاول کے شوا کچھ بھی نہیں کھاتے۔ اور تم ایک جو مُرغی انڈا کھانے والے ہو تو تم....
جگت سنگھ۔ او بیوقوف چُپ رہو۔ (جوش میں آکر) میں بھی راجپوت ہوں۔ ہم نے ملیچھوں کو ناکوں چنے چبوا دئے ہیں، ایسے کہ ایک دفے یاد بھی کریں۔ ہم آریہ ہیں۔ بھارت ورش پر ہمارا ہی ادھیکار ہونا چاہیئے۔ کیا مجال جو یہ تُچھ ملیچھ اس پوتربھومی میں ایک پل بھی ٹھہر سکیں (ہاکی اُٹھا کر) میں ابھی جا کر اُن کی خبر لیتا ہوں۔ (کڑک کر) بس اوم دیو جی مجھکو آشیرباد دیجئے۔

(اوم دیو ہاتھ اُٹھا دیتا ہے۔ جگت سنگھ ایک دھماکے کے ساتھ دروازہ کھول دیتا ہے.... سامنے حیدر سینہ تانے کھڑا ہے... اور اُس کی اوٹ میں ہدایت "مصلحت" بنا دبکا ہوا ہے۔ جگت سنگھ دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے۔)

حیدر۔ (اپنی دانست میں نہایت فصیح البیانی سے) ہمارا دل اس صدمہ سے چُور چُور ہے کہ ہم کو اپنی ہمسایہ قوم کے ساتھ جنگ جدل کرنے کیلئے کمربستہ ہونا پڑا ہے۔ ہم نے ہرچند چاہا کہ آپ لوگ اپنے ضمیر اور حق کی صدا کو سنیں۔ لیکن چونکہ آپکے ضمیر مُردہ، آپکے قلب بیجان اور آپ کی چشم ہائے آتشگیر پر کفر و خباثت کی پٹی بندھی ہوئی ہے لہٰذا برادرانِ ملت؛ نونہالانِ اسلام نے اِن دو حقیر خادموں کو بحیثیت ایلچی آپ لوگوں کی سرکوبی یا کم ازکم جواب طلبی کیلئے ارسال کیا ہے۔ اگر آپ کو عبرت حاصل نہ ہوئی تو پھر تیغ حق کا سرِ کفر پہ چمکنا برحق، برمحل ہوگا۔ نیز یہ عین برضائے اللہ واحد لاشریک و بہ رضائے رسولِ اللہ، نبی آخرالزماں یعنی آقائے دوجہاں حضرت........
لکھیر چند۔ (سینے پر ہاتھ رکھکر) اوہ! حیدر علی کھان! کھُدا کیلئے دھیرے بولو۔
جگت سنگھ (حیدر کی باتیں نہ سمجھتے ہوئے) اوم دیو جی!
اوم دیو۔ (جو کہ مُنہ ہی مُنہ میں بڑبڑا رہے ہیں) جگت سنگھ جی اسوقت

ہنومان چالیسا پڑھیے۔

حیدر۔ (ٹھٹک کر) ہدایت اللہ خاں! یہ کیا چیز ہوتی ہے۔

ہدایت۔ یہ ہنومان چالیسا کافر لوگ پڑھتے ہیں تاکہ تمام بلائیں دُور رہیں۔

حیدر۔ تو گویا یہ ہم کو بلا میں سمجھتے ہیں۔

ہدایت۔ الحذر! یہ بہت نازک موقع ہے۔ مولانا حقیق کو ساتھ لے آتے تو بہتر رہتا۔

حیدر۔ کیا تم کو کوئی آیت یاد نہیں، میں۔ تم جانتے ہی ہو ۔۔ عربی کی ایک سطر بھی نہیں پڑھ سکتا۔

ہدایت۔ ارے بھائی میں کہاں کا نمازی ہوں۔ پہلے میری دادی مجھ کو زبردستی پڑھواتی تھیں۔ مگر وہ بچپن کی باتیں اب یاد کہاں۔۔۔ نہ میں نے کبھی روزہ رکھا نہ میں نے کبھی نماز پڑھی۔۔۔۔ اف میری دادی کہا کرتی تھیں "بیٹے نماز نہیں پڑھتے۔ یاد رکھنا پچھتاؤ گے"۔ لیکن میرا خیال تھا کہ جب کبھی ہم بوڑھے ہوں گے تو ایسا ہوگا۔ یہ وہم میں بھی نہ تھا کہ وہ گھڑی اتنی جلدی آن پہونچے گی۔

اوم دیو۔ (جگت سنگھ کو آنکھ مار کر، آہستہ سے) دیکھا تم نے راج نیتی۔

(حیدر شش و پنج کے عالم میں ایک شکستہ کرسی پر بیٹھ جاتا ہے لیکن کرسی ایک بڑی آواز کے ساتھ ٹوٹ کر زمین پر جا رہتی ہے۔ پنڈت اوم دیو جی گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ہنومان چالیسا بھول جاتے ہیں۔)

اوم دیو۔ دیکھو جی! مے پوچھتا ہوں آپ لوگوں کو سرم نہیں آتی؟ آپ کو کِسّی کے کمرے میں گھسنے کا کیا ادھیکار ہے۔

حیدر۔ (حوصلہ پاکر) خاموش!

اوم دیو۔ (جگت سنگھ کی اوٹ میں ہو کر) دیا لی جگت سنگھ جی، میں راج نیتی بتا دُنگا۔ آپ آگے سے بولتے جائیے۔

جگت سنگھ۔ دیکھو حیدر علی خاں جی! آپ اگر خان ہیں تو اپنے گھر کے ہونگے یہاں اس سے کام نہیں چلیگا۔

اوم دیو (جگت سنگھ کی اچھی طرح سے ڈھال بنا کر) اونہہ۔ انکی شورت اور شیرت دونوں کھراب ہیں۔ راچھش کہیں کے۔

حیدر (بدک کر) ہدایت اللہ خاں! یہ شورت اور شیرت کیا بلا ہیں؟

ہدایت۔ مطلب اس سے صورت اور سیرت ہے۔

حیدر۔ (گرم ہو کر) تو گویا اس نے ہماری ہی زبان کے دو الفاظ ہمارے ہی خلاف استعمال کئے۔ اسی کو جس کی لاٹھی اُسی کی بھینس کہتے ہیں۔

ہدایت۔ بہت نازک موقع ہے۔ (ہاتھ بڑھا کر) میاں موں ذرا میری نبض (چونک کر) اوہ ۔۔ اونہہ، خیر۔۔۔۔

حیدر۔ ہدایت اللہ خاں! تم ہندی کا کوئی لفظ سوچو، تاکہ جواب دیا جاسکے۔

اوم دیو۔ (مسکرا کر جگت سنگھ سے) اسی کو راج ۔۔

ہدایت۔ (حافظے پر زور دیکر) آہ ہاں خوب یاد آیا۔ آپ "یدی" کہیے۔ "یدی" بمعنی "اگر"۔

حیدر۔ (مٹھیاں کس کر اور پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر) یدی اگر۔۔۔۔

لکیر چند۔ (سینہ دبا کر) اووہ! کھُدا کیلئے حیدر علی کھان۔۔۔۔

حیدر۔ (لکیر چند سے) تم نے میری بات کیوں کاٹی؟

لکیر چند۔ (آلہ بڑھا کر) مگر یہ تو دل کی دھڑکن ناپنے کا اوجار ہے، قینچی نہیں۔

حیدر۔ (شیروانی اتارتے ہوئے) ٹھہرو! میں تم کو بتاتا ہوں۔

(جگت سنگھ بھی آستین چڑھا کر وار کا انتظار کرتا ہے۔ اور حیدر آستین کو خوب اُوپر تک چڑھا کر آئینے کے سامنے اپنی ماسپ کو دو تین مرتبہ پھلا کر دیکھتا ہے۔)

حیدر۔ (لکیر چند سے) دیکھا تم نے۔

لکیر چند۔ (خودداری کے جذبے کو دبا کر، جگت سنگھ حیدر علی کھان کو کہو کہ وہ اپنی آستین نیچے کر لے۔

حیدر۔ (ماسپ پھلا کر) نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ دیکھتا ہوں کون مائی کا لال میری آستین نیچے کرتا ہے۔

لکیر چند۔ (منت سے) میں تم سے بہت کھاس بات کہنے والا ہوں مگر پہلے تم آستین نیچے کر لو۔

جگت سنگھ۔ (جو کہ راج نیتی نہیں جانتا) کہو بھائی لکیر چند کہو تم کیا کہنے والے تھے؟

لکیر چند۔ (جو کہ راج نیتی کچھ نہ کچھ ضرور سمجھتا ہے۔) جگت سنگھ تم جانتے ہی ہو، حیدر علی کھان کی ہارس پاور مجھ سے بہت زیادہ ہے۔ ایک ٹرک اور موٹر سائیکل میں کیا مقابلہ؟

اوم دیو۔ (لکیر چند کو مشفقانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے) لکیر چند! اب تم بھی تھوڑی بہت راج نیتی۔۔۔۔۔

جگت سنگھ۔ دیکھو حیدر خان! یہ بہت بُری بات ہے۔ ایک تو تم ہمارے دلوں کو بُری بُری باتوں سے چوٹ پہنچاتے ہو اور دوسرے۔۔۔۔۔

حیدر (انتہائی جوش کی حالت میں پاؤں پھیلا کر اور ہاتھ ہوا میں بلند کر کے

بڑی بھیانک آواز میں چلاتا ہے) کفر کفر۔ اُف۔ او خدا تو ہم کو اتنی طاقت دے کہ ہم ان سفید جھوٹ بولنے والوں کا مقابلہ کر سکیں۔

لکیر چند۔ (آنہ سنبھالتے ہوئے) میں پیشاب کرنے جاتا ہوں۔

جگت سنگھ۔ (دلاسہ دیتے ہوئے) ٹھہرو ٹھہرو۔

لکیر چند۔ (بگڑ کر) نہیں ہرگز نہیں ـــ حیدر کھان کو کہو کہ وہ آستین نیچے کرلے اور پھر شیروانی بھی پہن لے ورنہ ـــ

حیدر۔ (گرج کر) ورنہ کیا؟

لکیر چند۔ ورنہ کیا!ـــ ہم پیشاب کرنے چلے جائیں گے۔

ہدایت۔ واہ کیا دھمکی ہے۔

حیدر۔ (کچھ مشکوک ہو کر) ہدایت اللہ خاں! اگر لکیر چند پیشاب کرنے چلا جائیگا۔ تو کیا ہوگا؟

ہدایت۔ (حافظے پر زور دیکر) اگر برآمدے سے باہر جائیگا تو بارش میں ضرور بھیگ جائے گا۔ ممکن ہے سردی کھا جائے، زکام ہو جائے، یا نمونیا سے مر جائے۔

حیدر۔ (سوچ میں پڑکر) ہم ـــ تو کیا اسکی ذمہ داری ہم پر عائد ہوگی؟۔

اوم دیو۔ (زوردار آواز میں) بیشک ذمے داری تمہاری ہوگی ـــ (جگت سنگھ سے) اسے راج .....

ہدایت۔ اوہ نہیں ـــ ہم پر کیا ذمہ داری ہوگی۔

(کچھ ہندو لڑکے دھوتیاں سنبھالتے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں)

ایک۔ آپ لوگوں نے کیا شور مچا رکھا ہے۔

دوسرا۔ نیند حرام کر دی۔

تیسرا۔ شرم کی بات ہے کچھ ایٹی کیٹ بھی ہونا چاہیئے۔

چوتھا۔ حیدر صاحب! کہئے آپ ہی کتنے زور سے چنگھاڑ رہے تھے۔

دوسرا۔ (چوتھے سے) ذرا نرمی سے بات کرو۔

ہدایت۔ (حیدر سے) ہم کافروں میں گھر گئے ہیں۔

حیدر۔ (سر بلند کر کے) پروا نہیں۔ آج ہم ان کافروں کو سیدھا رستہ بتا کر ہی رہیں گے۔

چوتھا۔ آخر آپنے یہ کافر کافر کی کیا رٹ لگا رکھی ہے۔

حیدر۔ کیا تم ایلچیوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے ہو؟

چوتھا۔ (حیرت سے) ایلچی کیا ہوتا ہے؟

حیدر۔ ہدایت اللہ خاں اس کا ہندی لفظ بتاؤ۔

ہدایت۔ ہم ... (سوچتے ہوئے) مجھے اس وقت یاد نہیں۔

حیدر۔ تو انگریزی کا کوئی لفظ بتاؤ۔

ہدایت۔ (حافظے پر زور دیتے ہوئے) ملے۔ ایمب۔ ایمب۔ (سر کھجا کر) یاد نہیں آتا ... بس مینجر سمجھ لیجئے۔

چوتھا۔ دوسرا۔ پہلا۔ تیسرا۔ مینجر؟

حیدر۔ (سینہ پھلا کر) ہاں مینجر!

چوتھا۔ کیا میسج ہے؟

حیدر۔ ہدایت اللہ خاں! اس نے کیا کہا؟

ہدایت۔ وہ پوچھتے ہیں کہ کیا پیغام ہے؟

تیسرا۔ اور کس نے بھیجا ہے؟

اوم دیو۔ بھگت جنو! میں بتلاتا ہوں۔ آج یہ ملیچھ لوگ ایک مُرغی کہیں سے پکڑ لاتے ہیں۔ اور ہوسٹل کے کمپاؤنڈ میں گلاب کے پیڑ کے نیچے اسکو ذبح کر رہے ہیں۔

سب۔ ہائیں ـــ ہا بلی جگت سنگھ! تمہارے ہوتے ہوئے یہ اندھکار؟

حیدر۔ غلط بالکل غلط۔

اوم دیو۔ بھارت سپوتو! نر اور ناریو! یہ سمے بلیدان کا ہے۔ ان ملیچھوں نے ہمارا دھرم ناش کر دیا ہے۔ ہماری ہند دجاتی پر ان کے ظلم بہت بڑھ گئے ہیں۔ یدی آپ لوگوں نے اب بھی سب کچھ کھاکر بلیدان کرنے سے سنکوچ کیا تو پھر بھارت ورش میں مسلم راجیہ شر دھو جائیگا۔

حیدر۔ غلط بالکل غلط۔

دوسرا۔ ان کی بھی سنو۔

سب۔ ہاں بھائی صاحب آپ بھی کہئے۔

حیدر۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ پروفیسر راتیس کا گورکھا چوکیدار کہیں سے ایک مُرغی پکڑ لایا ہے اور اسکو گلاب کے پیڑ کے نیچے غیر اسلامی طریقے پر ذبح کر رہا ہے۔ اس لئے ہمارے جذبات کو ٹھیس لگی ہے۔

(سب خاموش رہتے ہیں۔)

اوم دیو۔ لیکن ہولی میں جب مسجد پر رنگ کی ایک چھینٹ گر جاتی ہے تو آپ ہندوؤں کا کھون بہا دیتے ہیں۔ وہ جاد نہیں؟

ہدایت۔ محرم کے جلوس میں جب کسی پیپل کی ایک پتی ہمارا جھنڈا چھو جانے سے گر پڑتی ہے تو کیا آپ معصوم مسلمانوں کا خون نہیں بہاتے؟

اوم دیو۔ آپ گائے کاٹ کر مندر میں پھینک دیتے ہیں۔

ہدایت۔ اور آپ بد جانور کاٹ کر مسجد میں پھینک دیتے ہیں۔

اوم دیو۔ (اکڑ کر) تو جو ہمارے دل میں آئیگی ہم کرینگے۔

ہدایت۔ (جوش میں بھڑ اکر) اور جو ہمارے دل میں آئیگی ہم کرینگے۔
ادم دیو۔ (جگت سنگھ کو اشارہ کرکے) ہم گورکھے کی طرف داری کرینگے۔
ہدایت۔ (حیدر کو کہنی مارکر) ہم اُسکی بوٹی بوٹی اُڑا دینگے۔
جگت سنگھ۔ (ہدایت سے) بکومت۔
حیدر۔ (آگے بڑھکر جگت سنگھ سے) زبان بند کرو۔
اودم دیو۔ (لکیر چند سے اُسکا چھین کر جھنڈے کی طرح ہوا میں بلند کرتے ہوئے) ہم ادم کا جھنڈا اونچا رکھنے کے لئے تن، من، دھن سب کا بلیدان دینگے۔ بولو مہابلی ہنومان جی کی
سب ہندو۔ (اُچھل کر) جے!
حیدر۔ (کڑک کر) نعرہ تکبیر!
ہدایت۔ اللہ اکبر!
(حیدر شیروانی کندھے پر ڈال کر ہدایت کا ہاتھ پکڑ بگولے کی طرح دروازے کی طرف جھپٹتا ہے۔ ہندو اپنی اپنی دھوتیاں سنبھالتے ہوئے رستہ چھوڑ دیتے ہیں۔ اور وہ دونوں کمرے سے باہر نکل جاتے ہیں۔)

منظر سوئم

کمرہ نمبر ۲۵۔ بوقت سوا دس بجے شب۔ بجلی کی چمک اور بارش کی بوچھاڑ۔ فتح سنگھ بیٹھک لگا رہے ہیں۔ قد چھ فٹ چار انچ۔ رنگ کالے کوے کی طرح۔ ڈاڑھی بے تحاشہ اُگی ہوئی جیسے بیّے کا گھونسلہ۔ ایک آنکھ بھینگی۔ جسم گٹھا ہوا جیسے ہڈی اور گوشت کا پہاڑ۔ پاس دوسرا بنیا سکھ کھڑا ہے۔ قد پانچ فٹ، ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ فتح سنگھ کی ہر بیٹھک پر وہ سر سے پاؤں تک لرز جاتا ہے۔ کمرے میں سینڈو اور گاما پہلوان کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ کسی حسین عورت کی تصویر نہیں ہے۔ سوائے دو بھونڈی اور بھدی پہلوان عورتوں کی تصویروں کے۔ ایک کونے میں لوہے کا گولا۔ ہیمر، ڈمبل، چیسٹ اکسپنڈر اور پاس ہی کڑوے تیل کی ایک عدد بوتل۔ ایک طرف ایک پلنگ، چند کرسیاں اور باقی ضروری سامان اور فرنیچر۔ ایک چھوٹی سی تپائی جس پر دو بکروں کا بھیجا گھی میں تلا ہوا رکھا ہے۔)
فتح سنگھ۔ جیون سنگھ! بیٹھک لگا و نا!
جیون سنگھ۔ (رونی صورت بناکر) میرا دم پھول رہا ہے۔
فتح سنگھ۔ (بھاری آواز میں) میں نہیں سمجھتا کہ آخر یو۔ پی میں سکلانم کا پرچار کیوں کیا جا رہا ہے ... کمبخت تم ایک سانس میں پانسو بیٹھک بھی نہیں لگا سکتے۔
جیون سنگھ۔ (دل میں کچھ سکھی جوش محسوس کرکے بیٹھک لگانا شروع کرتا ہے) ایک، دو، تین، چار ...... دس، بیس۔
فتح سنگھ۔ کیوں بس ختم؟
جیون سنگھ۔ (منت) میں اب کچھ اور کرونگا۔
فتح سنگھ۔ اچھا ڈمبل کرو۔
جیون سنگھ۔ (خوش ہوکر) بہت اچھی بات۔ (ایسے دم میں دم آجاتا ہے) فتح سنگھ! میں نے ایک بہت مزے کی بات سنی ہے۔
فتح سنگھ۔ (بیٹھک لگاتے ہوئے) وہ کیا؟
جیون سنگھ۔ کل، سنتے ہیں بہت لطف آگیا۔
فتح سنگھ۔ کیسا لطف؟
جیون سنگھ۔ میں نے سنا ہے کہ جب آپ لوگ ہاکی کھیل رہے تھے۔
... جب آپ ہاکی کھیل رہے تھے ......
فتح سنگھ۔ ہاں ہاں کہو۔
جیون سنگھ۔ (خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے) تو ... تو ... تو گیند ایک دم اچھلی اور اچھلکر غائب ہو گئی۔
فتح سنگھ۔ (انجان بن کر) اچھا پھر؟
جیون سنگھ۔ بہت دیر تک لوگ اِدھر اُدھر ڈھونڈتے رہے — دس منٹ کے بعد وہ آپ کی ڈاڑھی میں سے نکل آئی .... کیا یہ بات درست ہے؟
فتح سنگھ۔ (کھسیانہ سا ہوکر) اوہ ... ہاں۔ ہاں .... (ڈانٹ کر) اور تم باتیں کر رہے ہو۔ ڈمبل کرو۔
جیون سنگھ۔ (جھنجلا کر) لیکن مجھ سے اتنا جھنجھٹ نہیں ہوتا — اب تو بارش بھی زیادہ ہو رہی ہے ..... دس سے اوپر ٹائم ہو چکا ہے۔ نیند آرہی ہے۔
فتح سنگھ۔ تو کیا تم کچھ انوکھے پیدا ہوتے ہو — میں بھی تو تمہارے ساتھ ہی ورزش کرتا ہوں۔
جیون سنگھ۔ آپ تو چوبیسوں گھنٹے یہی کچھ کیا کرتے ہیں۔
فتح سنگھ۔ ٹورنمنٹ شروع ہونے والے ہیں۔ مجھ کو کشتی، باکسنگ ہیمر تھرو ئنگ، اور ہیوی ویٹ لفٹنگ میں پچھلے کل ریکارڈ توڑنا ہیں۔
جیون سنگھ۔ ہمارا دوسرا سال ہے۔ امتحان سر پر آرہے ہیں۔ اس کی بھی خبر ہے۔ اس میں کون ریکارڈ توڑے گا — یہاں تو پاس

ہونے کی اُمید تک نہیں۔

فتح سنگھ:۔ (لاپرواہی سے) یہ ریکارڈ راجہ راؤ سنگھ توڑ لے گا۔ اور جغرافیہ میں گولڈ میڈل ماموں لے جائیگا۔ چلو قصہ پاک ہوا۔

جیون سنگھ:۔ لیکن جس شخص کو ٹورنمنٹ میں ریکارڈ ہی نہ توڑنا ہو وہ کسرت کیوں کرے۔

فتح سنگھ:۔ اگر تم میرے سامنے فلسفیانہ باتیں کروگے تو میں تمہاری ٹانگیں باندھ کر برآمدے میں لٹکا دونگا۔

(دروازے پر دستک)

فتح سنگھ:۔ کون؟ (جیون سنگھ سے) دروازہ کھولو۔

(جیون سنگھ دروازہ کھولتا ہے)

حیدر:۔ آداب عرض مسٹر فتح سنگھ! کہو بھائی ٹورنمنٹ کی تیاری ہو رہی ہے کیا؟

فتح سنگھ:۔ (گرمجوشی سے) آداب عرض بھائی حیدر علی خاں۔ آؤ بیٹھو۔ کیا کیا جائے اب تو سب کچھ کرنا ہی پڑیگا۔

ہدایت:۔ (مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے) آداب عرض کرتا ہوں بڑے بھائی۔

فتح سنگھ:۔ (نہایت تپاک کے ساتھ) آداب عرض ہدایت بھائی۔ آپ دونوں صاحبان کرسیوں پر تشریف رکھیں .... آپ کی کیا خدمت کی جائے۔

جیون سنگھ:۔ (جس کا دل چائے پینے کے لئے بیقرار ہے) فتح سنگھ بھائی، چائے بناؤں۔

فتح سنگھ:۔ (دانت پیستے ہوئے مگر بظاہر نرم آواز میں) ہاں ہاں بناؤ۔ ضرور تیار کرو۔

(دروازے پر دستک)

فتح سنگھ:۔ جیون سنگھ دروازہ کھولو۔

(جیون سنگھ دروازہ کھولتا ہے۔ راجہ راؤ سنگھ اندر داخل ہوتا ہے۔ رنگ گندمی، ڈاڑھی مونچھ صفاچٹ۔ سیدھا سادا مسکراتا ہوا چہرہ۔)

راجہ راؤ:۔ گڈ ایوننگ سردار۔

فتح سنگھ:۔ (حسب معمول گرمجوشی سے) گڈ ایوننگ پوپ۔

جیون سنگھ:۔ (حلیمی سے) چائے کا ایک پیالہ اور بڑھا دوں کیا؟

فتح سنگھ:۔ (دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے، بظاہر) ہاں ہاں شاباش۔

(جیون سنگھ نہایت سعادت مندی کے ساتھ اسٹو جلانے میں مصروف ہو جاتا ہے۔)

راجہ راؤ:۔ (فتح سنگھ سے) تم نے وہ ٹالسٹائی کا ناول پڑھ لیا کیا؟

فتح سنگھ:۔ اوہ نہیں — میں پڑھنے کیلئے ٹائم نہ نکال سکا۔

راجہ راؤ:۔ بھئی اس کو ضرور پڑھو۔ ٹالسٹائی دنیا کے زبردست ترین مصنفوں میں شمار ہوتا ہے۔

فتح سنگھ:۔ (تولیہ سے بدن کی چکنائی پونچھتے ہوئے) ہاں ہاں بھائی اُس نے تو کنیڈا کا نام دُنیا بھر میں مشہور کر دیا ہے۔

راجہ راؤ:۔ کنیڈا نہیں روس .... روس۔

فتح سنگھ:۔ اوہ روس۔ روس۔ بیشک۔ ایم سوری۔ (اپنی قابلیت کا مزید ثبوت دینے کے لئے) ٹالسٹائی پر مہاتما گاندھی کی تعلیم کا خاص اثر ہوا ہے۔ اسکی تصانیف میں اسکی خاص جھلک نظر آتی ہے۔

راجہ راؤ:۔ (جھنجھلا کر) او ڈیم اِٹ .... تم اُلٹی بات کہہ رہے ہو۔ ٹالسٹائی کے فلسفہ کی مہاتما گاندھی کی تعلیم میں خاص جھلک نظر آتی ہے۔

فتح سنگھ:۔ (کھسیانہ ہو کر) اوہو ہو ہو — اُف میرا ذہن بھی ... (بھنا کر) جیون سنگھ !!!

جیون سنگھ:۔ (عاجزی سے) جی!

فتح سنگھ:۔ (کچھ بہانہ نہ پاکر) تم ... تم ... اچھا چائے بنا رہے ہو؟ ہاں بس ٹھیک بالکل ٹھیک (مصنوعی قہقہہ لگا کر) جیون سنگھ بچارا بہت خدمت کرتا ہے۔ کر سیوا کھا میوا۔

حیدر:۔ (کہنی مار کر ہدایت سے) اب بہت ڈپلومیسی کے ساتھ اپنے یہاں آنے کا مدعا بیان کرنا چاہیئے۔

ہدایت:۔ بہتر ہو اگر تم کہو۔ کیونکہ تمہاری بات کا اُسے خاص احترام ہے۔

حیدر:۔ (کھانس کر ذرا بلند آواز میں) مسٹر فتح سنگھ آج میں ایک خاص کام کی وجہ سے حاضر ہوا تھا۔

فتح سنگھ:۔ (نہایت جوشیلے طریقے سے) کہیئے، کہیئے۔

حیدر:۔ (ہچکچاتے ہوئے) ممکن ہے آپ .....

فتح سنگھ:۔ (ہمت افزا انداز میں) ارے صاحب بلا تکلف فرمایئے۔ جان تک حاضر ہے۔ جہاں آپ کا خون گرے میں پسینہ ......

ہدایت:۔ (بات کاٹ کر) سردار فتح سنگھ آپ کو شاید محاورے کا صحیح استعمال معلوم نہیں۔

فتح سنگھ:۔ (مشکوک ہو کر) ارے بھئی زبان اُردو ہمارے لئے ایک

اجنبی زبان سے اس پہ کمانڈ — اور پھر آپ میرا مطلب تو سمجھ ہی گئے ہوں گے۔

حیدر۔ بیشک بیشک۔ اچھا آپ سُنئے

فتح سنگھ۔ (ہمہ تن گوش ہوکر) فرمایئے۔

(دروازے پر دستک)

فتح سنگھ۔ کون ہے بھائی؟ جیون سنگھ دروازہ کھولو۔

(جیون سنگھ دروازہ کھولتا ہے)

جگت سنگھ، ادم دیو۔ جے رام جی کی سردار فتح سنگھ۔

فتح سنگھ۔ جے رام جی کی — آؤ بھائیو! بیٹھو۔

جیون سنگھ۔ (نہایت عقیدتمندانہ انداز سے) سردار فتح سنگھ کیا چائے دو پیالے اور بڑھا دی جائے۔

فتح سنگھ۔ (دل ہی دل میں آگ بگولا ہوکر، بظاہر) اوہ! ہاں ہاں ..... بیشک ... ضرور .....

(ادم دیو جی چائے کا نام سنکر دانت نکال کر اظہار خوشنودی کرتا ہے)

فتح سنگھ۔ (جگت سنگھ سے مخاطب ہوکر) آج تو سردی بھی خوب ہے۔ چائے پینے میں بہت مزا آئیگا۔ (چینی کے اخراجات کا خیال آتے ہی جیون سنگھ کی طرف گھور کر دیکھتا ہے۔)

جگت سنگھ۔ جی ہاں ۔ (سکوت) میں ذرا ایک خاص کام کی وجہ سے آیا تھا.... اگر آپ کچھ مدد دے سکیں۔

فتح سنگھ۔ (گرمجوشی سے) ہاں ہاں بندہ حاضر ہے۔ جہاں آپ کا خون گرے بندہ اپنا (مشکوک ہوکر) یعنی میرا مطلب ہے جہاں میرا پسینہ گرے وہاں آپ کا (پھر مشکوک ہوکر ہدایت کی طرف دیکھتا ہے) ہدایت صاحب محاورہ ٹھیک بیٹھتا نہیں۔

ہدائت۔ (حیدر کے کان میں) پہلے ہم کو اپنا قصہ بیان کرنا چاہیئے (فتح سنگھ سے) جی ہاں جی ہاں — وہ محاورہ ٹھیک ہوجائے گا... آہستہ آہستہ مشق کرنے سے سب ٹھیک ہوجائیگا۔

فتح سنگھ۔ (لجاجت سے) ہدایت اللہ خاں! کیا بہتر نہ ہوگا کہ آپ مجھکو اردو محاورات کا صحیح استعمال سکھلا دیں۔

ہدایت۔ ضرور ضرور میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔ کل ہی سے شروع کر دیجے نا۔

فتح سنگھ۔ اور میں بھی آپکی خدمت کیلئے ہر طرح سے تیار ہوں۔

حیدر۔ سردار فتح سنگھ! آپنے پہلے ہمارا قصہ سننے کا وعدہ کیا ہے۔

فتح سنگھ۔ (کرسی حیدر کے قریب کھسکا کر) ہاں ہاں فرمایئے۔

جگت سنگھ۔ مگر میری بات تو ابھی پوری ہوئی نہیں۔

فتح سنگھ۔ (کرسی جگت سنگھ کے قریب کھسکا کر) ہاں ہاں فرمایئے۔

حیدر۔ (جگت سنگھ سے) تم بدتمیز ہو۔

جگت سنگھ۔ (حیدر سے) تم بدتمیز ہو۔

حیدر۔ (فتح سنگھ سے) ادھر دیکھئے۔

جگت سنگھ (فتح سنگھ سے) ادھر دیکھئے۔

فتح سنگھ۔ (گھبرا کر) آپ لوگ کچھ فرمایئے بھی۔

جگت سنگھ، حیدر۔ (دونوں ایک ساتھ) آج ایک مُرغی .....

فتح سنگھ۔ (جھلا کر اُچھل کھڑا ہوتا ہے) آہا ایک مرغی، ایک مرغی، کہاں ہے مُرغی؟

(فتح سنگھ کے سر کے بال کھُل جاتے ہیں۔ راجہ راؤ سنگھ اُس کی صورت دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔)

راجہ راؤ۔ (فتح سنگھ کے سینے پر ہاتھ رکھکر) پلیس، پلیس .... دوستو ہم سب یسوع مسیح کی بھیڑیں ہیں۔

فتح سنگھ۔ (وحشیانہ انداز میں) بکریاں، بکریاں یسوع مسیح کی بکریاں .....

راجہ راؤ۔ ڈیم اٹ۔ بکریاں نہیں بھیڑیں۔

فتح سنگھ۔ (چونک کر) بھیڑیں۔ اچھا بھیڑیں ہی سہی، یسوع مسیح کی بھیڑیں۔ لیکن اس کے کیا معنی؟ کل تم کہو گے کہ ہم سب کامن روم کی چھپکلیاں ہیں۔

جیون سنگھ۔ (سب کے آگے چائے کے پیالے رکھتے ہوئے) آپ لوگ خاموش ہوجایئے۔ (فتح سنگھ سے) میں کُل قصہ سُناتا ہوں۔ پندرہ منٹ پہلے کی بات ہے کہ ایک مُرغی ہوسٹل کے احاطہ میں آئی یا لائی گئی۔ مسلمان کہتے ہیں کہ گورکھا اس کو غیر اسلامی طریقے سے ذبح کر رہا ہے۔ اور اس سے ان کے جذبات کو ٹھیس لگتی ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ ملیچھ پکڑ کر لایا ہے اور اب اُس کو حلال کرنا چاہتا ہے۔ اور اس طرح سے اُن کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا احتمال ہے۔ اور پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر یہ صحیح بات ہے کہ گورکھا اس کو غیر اسلامی طریقے پر ذبح کر رہا ہے تو اس کو ایسا کرنے کا حق حاصل ہے۔ مسلمان اس میں ٹانگ اڑانے والے کون؟

فتح سنگھ۔ (شش و پنج میں پڑکر) کیوں پوپ تمہارا کیا خیال ہے؟

راجہ راؤ۔ مرغی خواہ کسی بھی طریقے سے ذبح کیوں نہ کی جائے میں صرف اسکے پک کر تیار ہوجانے پر اپنی خدمات پیش کر سکتا ہوں۔

جیون سنگھ۔ چائے سرد ہوئی جا رہی ہے۔ آپ لوگ چائے نوش فرمایئے۔ (فتح سنگھ کو چائے کا نام سُنکر پھر چینی کا خرچ یاد آجاتا ہے اور اُس کا خُون کھولنے لگتا ہے) اور آیئے سردار صاحب ہم دونوں "ہم مذہب" اس .

بات پر مشورہ کرلیں۔
فتح سنگھ۔ (گرم ہوکر) تُونے چینی بہت خرچ کردی۔
جیون سنگھ۔ (دلاسہ دیتے ہوتے) ارے میں آپ کو آج مُرغی کھلاؤں گا۔ آپ آدھ پاؤ چینی کو روتے ہیں۔
فتح سنگھ۔ (خوش ہوکر) ارے بھائی وہ کیسے؟
جیون سنگھ۔ آپ اِن دونوں پارٹیوں کے نمائندوں سے کہہ دیجئے کہ میرے دونوں سے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ اس لئے میں یا ہم دونوں غیر جانبدار گویا نیوٹرل رہیں گے۔
فتح سنگھ۔ معقول۔ اچھا پھر کیا ہوگا؟
جیون سنگھ۔ ہوگا کیا؟ جب وے دونوں لڑیں گے تو ہم اس ہنگامہ میں مُرغی اڑا دیں گے ـــــ
فتح سنگھ۔ (اچھلکر) بہت خوب آخر تمہارا "بنیا پن" کام آہی گیا۔
(دونوں واپس جاتے ہیں)
فتح سنگھ۔ (متانت سے) مسٹر جگت سنگھ مہا بلی! میرے حیدر علی خاں سے برادرانہ تعلقات ہیں۔ اس لئے میں ان کے خلاف کوئی کارروائی ہرگز ہرگز نہیں کرسکتا۔ (حیدر سے) مسٹر حیدر علی خاں آپ جانتے ہی ہیں کہ میرے مہا بلی جگت سنگھ سے کیسے مراسم ہیں۔ اسلئے میں ان کے خلاف کچھ کارروائی نہیں کرنا چاہتا۔ علاوہ ازیں (جیون سنگھ کی طرف اشارہ کرکے) ہماری آبادی کے پچاس فی صدی حصہ کا پہلے ہی سے غیر جانبدار رہنے کا ارادہ ہے اسلئے... کیوں پوپ؟
راجہ راؤ۔ میں تو اب بھی یہی کہونگا کہ ہم سب یسوع مسیح کی بھیڑیں ہیں۔
حیدر } تو گویا مطلب یہ کہ آپ اگر ہماری طرف سے نہیں لڑینگے
جگت سنگھ } تو ہمارے خلاف بھی نہیں کرینگے۔
فتح سنگھ (جیون سنگھ سے) کیوں جیون سنگھ یہی مطلب ہے نا ہمارا؟
جیون سنگھ۔ (آداب بجالاکر) جی ہاں! بالکل... بالکل....
حیدر } (ایک دوسرے کو قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے) { نعرۂ تکبیر!
جگت سنگھ } { مہابلی ہنومان کی
ہدایت } (ایک دوسرے کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے) { اللہ اکبر
اوم دیو } { جے!
(زمین پر اخبار کا ایک ٹکڑا پڑا ہے جس پر لکھا ہے "یورپ کے وہ کتب خانے جہاں کتوں اور ہندوستانیوں کو جانے کی اجازت نہیں" حیدر، جگت سنگھ، ہدایت، اوم دیو اس کو پاؤں تلے روندتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔)

راجہ راؤ۔ چائے کیلئے شکریہ سردار، شب بخیر۔
فتح سنگھ (اتفاق سے اسی کاغذ پہ پاؤں رکھتے ہوئے، جھک کر) شب بخیر پوپ!
(راجہ راؤ سنگھ کی روانگی)

منظر چہارم

ہوسٹل کا درمیانی پارک۔ جہاں بارش موسلا دھار ہورہی ہے۔ چاروں طرف تاریکی ہے کبھی کبھی بجلی بھی چمک جاتی ہے۔ بارش کا شور اور بادل کی گرج۔ ٹھنڈی ہوا تیزی اور تندی کے ساتھ چل رہی ہے۔ بائیں ہاتھ والے برآمدے میں ہندو لڑکے جمع ہورہے ہیں۔

مسلم کیمپ

حیدر۔ ہدایت اللہ خاں! کیا یہ سب لوگ تیار ہیں؟
ہدایت۔ جی ہاں!
حیدر۔ کیا سب لوگ سامان حرب و ضرب سے لیس ہیں؟
ہدایت۔ میاںموں کے سوا سب کے ہاتھ میں کچھ نہ کچھ چیز ہے۔ مثلاً کرسی یا کھاٹ کا پایہ، جھاڑو، لوٹا، چھتری، ہاکی، ڈنڈا وغیرہ۔
حیدر۔ اور میاںموں؟
ہدایت۔ اسکے ایک ہاتھ میں میری کلائی ہوگی دوسرے میں جمیل کی۔
حیدر۔ بہت خوب۔ ـــ اچھا اب روانہ ہوجانا چاہیئے۔
ہدایت۔ (اپنی ترکی ٹوپی ہوا میں لہراکر) چلو۔ (میاںموں سے) میاںموں ادھر آؤ تم میری نبض تھامو۔ (سب کی روانگی)
میاںموں۔ (ہدایت اور جمیل سے) آپ لوگ ساتھ ساتھ چلئے۔ میں دونوں کی کلائیاں کیونکر تھام سکتا ہوں؟
(وہ دونوں تھوڑی دور ساتھ ساتھ چلتے ہیں پھر دُور دُور ہوجاتے ہیں)
میاںموں۔ دیکھئے آپ میری بات ہی نہیں سنتے۔
ایک لڑکا۔ نقار خانہ میں طوطی کی صدا کون سُنتا ہے؟
میاںموں۔ (بگڑکر) تمہارا اس سے مطلب؟
وہی لڑکا۔ بہت افسوس کی بات ہے کہ میں تو آپ کی طرفداری کروں اور آپ مجھی کو ڈانٹ رہے ہیں۔ اس محاورے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ تمہاری بات نہیں سنتے۔
میاںموں۔ (محتاط ہوکر) بھئی معاف کرنا، اردو میں میری ڈکیبولری بہت کم ہے۔
دوسرا لڑکا۔ (جو کہ ہومیوپیتھی پڑھ رہا ہے، "وکیبولری" کو کسی قسم کا پھوڑا سمجھتے ہوئے) پھر بھی احتیاط لازمی ہے۔ تمہارا خون خراب ہے۔ آرسنک ۲۰۰ ڈیلیوشن ہر ہفتہ یک بوند ہمراہ آب تازہ۔ خوشبودار اشیاء از قسم لونگ، لہسن،

پیاز، الائچی سے پرہیز کلی۔
جمیل۔ (گھبرا کر) میری نبض تیز چل رہی ہے۔
حیدر۔ (ہاتھ سے اشارہ کر کے) بس خاموشی سے ساتھ چلے آؤ۔ وہ دیکھو سامنے، وہ لوگ بھی چلے آ رہے ہیں۔

ہندو کیمپ

(بہت سے ہندو لڑکے دھوتیاں سنبھالے اور مسلمانوں کی طرح وہ بھی اسی قسم کے ہتھیاروں کے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔)
لکیر چند۔ (آہ کانوں سے لگا کر) مہابلی تم نے کیا بتایا۔ ایک منٹ کا ہر دے ایک منٹ ......
ایک لڑکا۔ (ہونٹوں پر انگلی رکھ کر) اس وقت خاموش رہو۔
لکیر چند۔ (غرا کر) دیکھو میں تم سے نہیں پوچھ رہا ہوں!
دوسرا۔ دیکھو بھارت سپوتو! یہ موقع جھگڑنے کا نہیں۔
لکیر چند۔ کیوں مہابلی۔
جگت سنگھ۔ (ڈانٹ کر) ایک دفعہ اور بتاؤ نگا۔ اگر تم نے پھر پوچھا تو تمہارا سر توڑ دونگا۔
لکیر چند۔ (سہم کر) اچھی بات۔
جگت سنگھ۔ اسّی سے لیکر چوراسی تک۔
لکیر چند۔ (اوم دیو سے) اوم دیو جی! آپ ایک طرف ہو جائیے۔ مہابلی کے پیچھے پیچھے مجھ کو چلنے دیجئے۔
اوم دیو۔ تم میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔
لکیر چند۔ (اوم دیو کی اوٹ میں ہو کر) میرا ہردے بہت تیزی سے دھڑکنے لگا ہے۔ اب نوّے رفتار ہو گئی ... اب سنو ... اب ایک سو دس ... اُف ... ایک سو بیس ... اور دو ہ۔
جگت سنگھ۔ سب لوگ خاموش رہو۔ وہ دیکھو وے لوگ چلے آ رہے ہیں۔
اوم دیو۔ گلاب کے پیڑ کی طرف چلو۔
(مرغی کے پھڑ پھڑانے کی آواز آتی ہے جس سے دونوں کیمپوں میں ہلچل پیدا ہو جاتی ہے۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے نزدیک پہونچ رہی ہیں۔ آخر کار دونوں پارٹیاں بارش میں شرابور گلاب کے پیڑ کے قریب پہونچ جاتی ہیں۔)
حیدر۔ (لاٹھی ہوا میں بلند کر کے اور مہیب آواز میں چلاتا ہے) نعرۂ تکبیر!
مسلم پارٹی۔ (چلا کر) اللہ اکبر!
جگت سنگھ۔ (ہوا میں اُچھل کر) بولو مہابلی ہنومان جی کی
ہندو پارٹی۔ جے!

معاً اسقدر مہیب و درکرخت آوازیں سنکر بھورے رنگ کا ایک جنگلی بلا منہ میں ایک مرغی دابے گلاب کے پیڑ کے نیچے سے جست لگا کر باہر آتا ہے اور بے طرح بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ دونوں کیمپوں میں گڑبڑ پیدا ہو جاتی ہے۔ مسلم کیمپ میں جمیل کی نبض ایک اسکندری کھاتی ہے اور وہ بیہوش ہو کر گر پڑتا ہے۔ ہندو کیمپ میں لکیر چند کا دل کپڑا سینے والی سنگر مشین کی سی تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگتا ہے۔ اور وہ اس حادثہ میں مورچپت ہو کر لڑھک جاتا ہے۔ دونوں پارٹیاں ہتھیار ڈالدیتی ہیں اور اپنے اپنے بیہوش سورماؤں کو لیکر اپنے اپنے برآمدوں کی طرف چلدیتے ہیں۔

(وقفہ)

فتح سنگھ ہاتھ میں ایک بڑا سا لٹھ لیکر جیون سنگھ کے ساتھ میدانِ کارزار میں نمودار ہوتا ہے۔
فتح سنگھ۔ (حیرت سے) سب لوگ کدھر گئے؟
جیون سنگھ۔ (ٹنکچر آئڈین کی شیشی نہایت اطمینان کیساتھ جیب میں رکھتے ہوئے) نمعلوم کہاں چلدئے سب لوگ۔ اور وہ مرغی۔
(گورکھا چوکیدار آتا ہے)
فتح سنگھ۔ کہو گورکھے! تم کہاں گھوم رہے ہو؟ کسکو ڈھونڈ رہے ہو؟
گورکھا۔ پروفیسر آئمیں کی مرغی تلاش کر رہا ہوں۔ کھو گئی ہے۔ جمعدار کہہ رہا تھا کہ اس کو بلی پکڑ کر اسی طرف لاتی ہے۔ مگر یہاں تو کچھ بھی نہیں۔
(چوکیدار کی روانگی)
فتح سنگھ (آہ بھر کر جیون سنگھ کے کاندھے پر ہاتھ مار کر) جیون سنگھ۔
جیون سنگھ (ہاتھ کی ضرب سے لرز کر) اگر تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہو یا میرے ہونیوالے بچوں کیلئے کوئی وصیت کروانا چاہو، یا میری ہونیوالی بیوی کے نام کوئی پیغام حاصل کرنا چاہو یا جو بھی خدمت لینا چاہتے ہو وہ دوسرا دھپ مارنے سے پہلے لے لو۔
(بجلی چمکتی ہے اور راجہ راؤ اپنے کمرے کے آگے کھڑا نظر آتا ہے۔)
فتح سنگھ۔ (پکار کر) سنو پوپ! تم جو کہہ رہے تھے کہ ہم سب یسوع مسیح کی بھیڑیں ہیں، میں کہتا ہوں کہ اگر کل تم یہ کہنے لگو کہ ہم سب کامن رُوم کی چھپکل ......
(بجلی دوبارہ چمکتی ہے۔ اور راجہ راؤ زبان باہر نکال کر منہ چڑا کمرے کے اندر گھس دروازہ بند کرلیتا ہے۔)

(پردہ)

بلونت سنگھ

"پارمینو کا سوال"

"مشہور کتاب ڈیکامیرن (Decameron) کے مصنف گیو وانی بکاچیو (۱۳۱۳ - ۱۳۷۵) (Giovanni Boccaccio) کی دوسری تصنیف فلکالو (Filocolo) بمقام وینس ۱۴۷۲ء میں شائع ہوئی۔ دونوں کتابیں تقریبًا ایک ہی طرز پر لکھی گئی ہیں اور باوجود اپنی طوالت اور فلسفیانہ بحث کے جابجا دلچسپیوں کا سامان لئے ہوئے ہیں۔ زمانہ مابعد کے اکثر مصنف خاص کر انگلستان کی شاعری کا باوا آدم چاسر (Chaucer) تو اکثر مقامات پر اسی خرمن کا خوشہ چیں ہے۔

مندرجہ ذیل قصہ فلکالو سے منتخب کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں بہت سے قصے محبت کے موضوع پر ہیں اور اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ ایک باغ میں چند نوجوان عورتیں اور مرد جمع ہیں۔ ایک ممتاز اور حسین و جمیل خاتون صدارت کا کام انجام دیتی ہے اور وقت گزارنے کے لئے ان میں سے ہر ایک، ایک سوال کرتا یا کرتی ہے اور پھر اسی پر بحث ہوتی ہے۔ صاحبہ صدر کا فیصلہ آخری فیصلہ ہے اور فی الحقیقت اس کی دانائی پر دال ہے۔ ڈیوک پارمینو کا سوال حسب ذیل ہے :-

---

پارمینو دوسرے نمبر پر بیٹھا ہوا تھا اور جوں ہی ملکہ نے بات ختم کی، کسی دوسری جانب متوجہ ہوئے بغیر اس نے یوں کہنا شروع کیا :-

"اے جلیل القدر ملکہ! میں ایک عرصے تک ایک نوجوان شخص کے ساتھ رہا ہوں۔ اس کے ساتھ وہ واقعہ پیش آیا جو میں اب بیان کرنا چاہتا ہوں۔

جتنی محبت ایک مرد، عورت کے ساتھ کر سکتا ہے اتنی ہی محبت اس نوجوان کو ہمارے شہر کی ایک حسین عورت کے ساتھ تھی۔ جو ایک کریم النفس، عالی خاندان، زر و جواہر اور والدین کی دولت سے ما ز ا ال تھی۔ اور میں، جو اس راز محبت سے آگاہ تھا، یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ بھی اس کو پیار کرتی تھی۔ یہ بھلا مانس بہت چھپا کر اس سے محبت کرتا تھا، چونکہ اسے ڈر تھا کہ اگر راز کھل گیا تو پھر اس سے بات کرنے کا موقع بھی نہ رہیگا۔ اس لئے اسے کسی شخص پر آخر تک اعتبار نہ آیا جو اس کا بھی ارادہ جان لے اور خاتون کا عند یہ بھی لے لے۔ اور اس معاملہ میں سلسلہ جنبانی کی کوشش کرے۔ مگر وہ خواہشوں سے مجبور تھا اور اس خاتون سے بیوفائی نہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح اسے ان مصیبتوں سے آگاہ کر دے جو اس کی وجہ سے جھیلنی پڑتی تھیں۔

بہت دن اس بات پر غور کرتے کرتے کہ اپنا ارادہ کس کے ذریعہ سے اس پر ظاہر کرے بالآخر اس نے ایک بڑھیا کو دیکھا جس کے جسم پر پیلی نارنگی کی طرح جھریاں پڑ گئی تھیں اور دیکھنے میں وہ اتنی قابل نفرت تھی جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ وہ اس نوجوان عورت کے گھر میں بھیک مانگنے کے لئے اکثر آیا جایا کرتی تھی اور ایسے ہی ایک موقع پر جوان نے اسے نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔ اسی عورت پر اعتبار کرنے کو اسکا دل ٹھکا اور اسے یقین ہو گیا کہ اس پر کبھی شک نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ اس کی امیدوں کو بر لائیگی۔ چنانچہ بڑھیا کو بلا کر اس نے بڑے بڑے تحفے تحائف کا وعدہ کیا بشرطیکہ اس کی خواہشات کو پورا کرنے میں مدد کرے، اس بڑھیا نے پوری کوشش کا وعدہ کیا اور اس نوجوان نے اپنی ساری رام کہانی اسے سنا دی۔ بڑھیا چلی گئی اور یہ یقین کر کے کہ میرے ساتھی کو اس خاتون سے اور خاتون کو میرے ساتھی سے ہر چیز سے بڑھ چڑھ کر محبت ہے اس نے ایک تدبیر اختیار کی کہ نوجوان اپنی مطلوبہ کے ساتھ خفیہ طور پر ایک شب بسر کرے۔

اور اس طرح وہ بڑھیا کے پیچھے پیچھے چلا اور جیسا کہ طے ہو چکا تھا اس نے نوجوان خاتون کے گھر کی طرف رخ کیا۔ مگر جوں ہی وہ مکان میں داخل ہوئے شومئی قسمت، نوجوان عورت بڑھیا اور جوان کو عورت کے بھائیوں نے پکڑ لیا۔ اور انہیں سچ بولنے پر مجبور کیا۔ انہوں نے تمام قصے کا من وعن اقبال کیا۔

یہ بھائی جو اس شخص کے دوست بھی تھے یہ جانتے ہوئے کہ اسے ہنوز وہ موقع حاصل نہیں ہوا جس سے ان کو ندامت ہو، اس کو (جیسا کہ وہ شاید کر گذرے ہوتے) نقصان پہنچانے سے باز رہے بلکہ ہنستے ہوئے اس سے یوں مخاطب ہوئے "تم اب ہمارے ہاتھ میں ہو۔ تم نے ہماری بے عزتی کی کوشش کی ہے اور اس کے لئے اگر ہم چاہیں تو تمہیں سزا دے سکتے ہیں۔ ورنہ تم ان دو صورتوں میں سے ایک منظور کرو۔ یا تو ہم تمہاری جان لے لیں یا تم ایک ایک سال اس بڑھیا کے ساتھ بھی رہو اور ہماری بہن کے بھی۔ اور اس بات کی پکی قسم کھاؤ کہ اگر تم ایک ایک سال تک ان کے ساتھ رہنے پر راضی ہو اور پہلا سال نوجوان عورت کے ساتھ بسر کروگے تو جتنی مرتبہ تم اس کے ساتھ بوس و کنار کروگے اتنی ہی مرتبہ تمہیں بڑھیا کے ساتھ بھی بوس و کنار کرنا پڑے گا۔ اور اگر تم بڑھیا کے ساتھ پہلے سال رہوگے تو جتنی مرتبہ تم اس سے پیار و اختلاط کروگے اتنی ہی دفعہ نہ زیادہ نہ کم، تمہیں نوجوان عورت سے دوسرے سال پیار و اختلاط کرنا پڑے گا۔"

جوان آدمی نے یہ جملہ سنا، اور چونکہ وہ زندہ رہنے کا خواہشمند تھا اس نے کہا کہ دونوں عورتوں کے ساتھ دو سال رہیگا۔ مگر وہ اس شش و پنج میں رہا کہ کس عورت کے ساتھ پہلے رہے۔ جوان کے ساتھ یا بڑھیا کے....... اب آپ ان دونوں میں سے کس کے ساتھ رہنے کی رائے دیںگی کہ اس شخص کی زیادہ سے زیادہ تسلی ہو جائے۔"

ملکہ اور تمام حاضرین اس قصے پر قدرے متبسم ہوئے اور بعد ازاں اس نے یوں جواب دیا:۔

"جوان شخص کو پہلے حسین اور نوجوان عورت کے ساتھ بسر کرنا چاہیئے نہ کہ اس نفرت انگیز پیرزال کے ساتھ۔ کیونکہ ایک موجودہ اچھے موقع کو آیندہ کے لئے نہیں چھوڑا جاتا۔ اور نہ آیندہ کی بھلائی کے لئے موجودہ برائی لینی چاہیئے۔ چونکہ ہم جانتے ہیں کہ آنے والے واقعات غیر یقینی ہیں۔ اس کے خلاف چل کر اکثر کو بعد میں پچھتانا پڑا اور اگر کسی شخص نے پہلے ہی لطف اٹھا لیا تو فرض نے نہیں بلکہ قسمت نے اس کی مدد کی۔ اس وجہ سے حسین عورت کو پہلے منتخب کرنا چاہیئے۔"

"آپ کی بات پر مجھے بڑا تعجب ہوا"، پارمینو نے جواب دیا۔ "یہ دیکھتے ہوئے کہ موجودہ بھلائی کو آیندہ کی برائی پر نہیں چھوڑنا چاہیئے! پس یہ ہمارے لئے کہاں تک درست ہے کہ ہم جوانمردی سے موجودہ تکلیفوں کا مقابلہ کریں۔ جب ہم ان سے بھاگ سکتے ہیں۔ چاہے ہمیں آیندہ کی موعودہ دائمی حکومت کا یقین دلایا گیا ہو۔ یہ امر تعجب خیز ہے کہ دنیا کے تمام سرگرداں اور پریشان آدمی جو اس لئے محنت مشقت کر رہے ہیں کہ ایک وقت آرام کا مزہ چکھیں گے حالانکہ وہ محنت سے راحت حاصل کر سکتے ہیں، اتنے عرصے تک اس غلطی میں مبتلا رہیں جب کہ راحت کے بعد محنت پہلی شرط کے مقابلہ میں بہتر ہے۔

یہ چیز (میرے خیال میں) حق بجانب معلوم ہوتی ہے کہ محنت کے بعد راحت کی تلاش کی جائے مگر بغیر محنت کے راحت کی خواہش میرے فیصلے کے مطابق ہرگز نہیں ہونی چاہیئے۔ اور نہ اس سے مسرت حاصل ہو سکتی ہے۔ پس کون کسی کو یہ رائے دے سکتا ہے۔ کہ وہ ایک سال حسین اور نوجوان عورت کے ساتھ ہم خواب ہو کہ اس کے ساتھ کٹھنا راحت و مسرت ہے اور اس کے بعد وہ مصیبت انگیز اور ناگوار زندگی گذارے کہ جتنے دن جوان عورت کے ساتھ بسر ہوئے اتنے ہی دن ایک نفرت انگیز بڑھیا کے ساتھ گذارنے پڑیں۔ ایک مسرت انگیز زندگی میں کوئی چیز اتنی ناگوار نہیں ہوتی جتنا یہ یاد آنا کہ بعد مرنے کے ہمارا جسم داغدار پڑا ہوا ملے گا۔ یہ موت ہمارے ذہن میں اسی طرح آتی ہے جیسے کہ ہماری ہستی کا کوئی دشمن ہمارے تمام عیش و عشرت کو منغص کرتا ہو اور جب تک یہ خیال ہے اس وقت تک دنیاوی چیزوں میں کوئی لطف حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جوان عورت کے ساتھ کوئی خوشی میسر نہیں آسکتی جبکہ اس خیال اور یاد نے مصیبت پیدا کردی ہو کہ ایک ذلیل بڑھیا کے ساتھ بھی اتنی ہی دیر بسر کرنی ہے اور یہ خیال چشم بصیرت کے سامنے ہمیشہ رہے گا۔ کہ وقت جو بازووں کی بے اندازہ تیزی کے ساتھ اڑتا ہے اور بھی تیز پرواز معلوم ہوگا۔ اور ہر روز واجب ساعتوں کا ایک بہت بڑا حصہ کم ہوتا دکھلائی دے گا اور اس مسرت کا مزہ بھی نہیں لیا جا سکتا۔ بلکہ آیندہ کے یقینی صدمے کے لئے منتظر رہنا پڑتا ہے۔

اس وجہ سے میرا فیصلہ ہے کہ اس کے خلاف رائے بہتر ہوگی کہ وہ تمام مصیبت جس کے بعد خوشگوار راحت کی امید ہے زیادہ

مسرت انگیز ہے بہ مقابلہ اس خوشی کے جسمیں مصیبت کا انتظار رہتا ہے۔

جب لینڈر[1] (Leander) اپنے بازوؤں کی طاقت سے سیسٹاس (Sestos) اور ایبی ڈاس (Abydos) کی کھاری لہروں میں تیرتا ہوا ہیرو (Hero) کے پاس جا رہا تھا، صرف اس خوشی میں کہ وہ اس کے آنے کی منتظر ہو گی سرد پانی اسکو گرم معلوم ہونے لگا۔ اور اندھیری رات کا خوفناک وقت صاف و شفاف دن، اور شورشیں دبی ہوئی دکھلائی دینے لگیں۔ پس خدا بچائے اگر کوئی شخص سفر سے پہلے آرام کی خواہش کرے یا کام سے پہلے انعام چاہے، یا مصیبتیں جھیلنے سے قبل خوشی مانگے۔ اس لئے اگر وہ راستہ پکڑا جائیگا (جو میں ابھی بتا چکی ہوں) آیندہ کی بدمزگی موجودہ خوشی کو اتنا منغص کر دے گی کہ وہ خوشی خود بدمزگی کہی جا سکتی ہے۔ ظالم ڈایونی سس (Dionysius) کو عمدہ گوشت اور ماہرفن ہاتھوں سے بجتے ہوئے آلات موسیقی اور دوسری خوشیوں میں کیسا مزہ آیا ہوگا۔ جبکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ ایک باریک نوک کی تلوار کچے دھاگے سے بندھی ہوئی اس کے سر پر لٹک رہی ہے؟ اس لئے پہلے اندوہگیں لمحات کو گذارنا چاہیئے تاکہ پھر خوشی سے اور وہ بھی بلا کسی خلل اندازی کے دلفریب مزے حاصل ہوں!"

ملکہ اس طرح پاسخ گذار ہوئی:

"تمہارا جواب صرف سوال کے ایک حصہ سے متعلق ہے گویا ہم دائمی مسرتوں کا ذکر کر رہے ہیں، جن کے خریدنے کے لئے بیشک تمام مصیبتیں اُٹھانی چاہیں، اور دُنیا کی تمام دولتوں اور خوشیوں کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ مگر اس موقع پر ہم اُن کا ذکر نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہاں صرف دُنیاوی لذتوں اور دُنیاوی تکلیفوں کا سوال ہے۔ اس کے لئے ہمارا جواب وہی ہے جو پہلے تھا کہ ہر دُنیاوی خوشی جس کے بعد دُنیاوی تکلیف ملتی ہو پہلے حاصل کرنی چاہیئے۔ نہ کہ دُنیاوی تکلیف جس کے بعد دُنیاوی خوشی آتی ہے۔ تقدیر کی مہربانیاں مختلف تغیرات کے ساتھ ہوتی ہیں، جن کو جب ملیں فوراً حاصل کر لینا چاہیئے۔ نہ کہ ان ہی چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے تمام شورشوں اور تکلیفوں کو برداشت کیا جائے۔ اگر قسمت کا چکر یقینی اور اٹل ہے کہ جب ایک شخص نے اتنی محنت کر لی جس کے بعد اور محنت کی ضرورت نہیں پڑے گی تب ہم کہہ سکتے ہیں کہ تکلیفیں پہلے اٹھانی چاہئیں مگر کون جانتا ہے کہ ایک مصیبت کے بعد اس سے بڑی مصیبت نہ آ جائے یا وہی آرام میسر آئے جسکا انتظار ہے۔

دُنیاوی چیزوں کی طرح وقت بھی عارضی ہے اور اگر بڑھیا کے ساتھ گذر کی جائے تو قبل اس کے کہ سال ختم ہوا جو کبھی ختم ہوتا ہوا معلوم نہیں ہوگا۔ ممکن ہے کہ جوان عورت مر جائے اور اس کے بھائی اپنے کئے پر پچھتائیں یا یہ کہ وہ کسی اور کے قبضے میں چلی جائے۔ یا اتفاقاً چُرالی جائے۔ اس طرح ایک مصیبت کے بعد اس سے بڑی مصیبتیں اس آدمی کے لئے موجود ہو جائیں۔

اس کے برخلاف اگر جوان عورت منتخب کی جائے گی، تو دیرینہ خواہشیں پوری ہوں گی اور جیسا کہ تم نے کہا تھا اس کے بعد تکلیف دہ خیالات بھی نہیں آئیں گے۔ چونکہ موت یقینی ہے۔ مگر ایک بڑھیا کے ساتھ رہنا ایسی چیز ہے کہ ہر عقلمند شخص کو اس سے بچنا چاہیئے۔ اور اس صورت میں دُنیاوی چیزیں ہوشیاری سے لینی چاہئیں تاکہ عین اس وقت جبکہ ان سے لطف حاصل کیا جا رہا ہو اور ضرورت آ پڑے تو اُن کو چھوڑ دیا جائے۔

وہ شخص جو آخیر تک آرام میں مشغول رہتا ہے ایک کھلی ہوئی مثال پیش کرتا ہے کہ اس کے علاوہ اصلی آرام نہیں ہے اور اگر وہ اخیر میں آرام پانے کے لئے تکلیف برداشت کرتا ہے تو اُس کا کہاں تک یقین ہے کہ آرام اسی آسانی سے حاصل ہو جائیگا جیسے تکلیف اور وہ اُس کے بجائے اِس پر اکتفا کرے۔

اِسی طرح یہ بھی خیال نہ کرنا چاہیئے کہ لینڈر اگر ہیرو کو بغیر سمندر کے طوفانی بازوؤں میں گذرے ہوئے حاصل کر سکتا، جس میں وہ ضائع ہو گیا، تو وہ اس کے حصول سے دست بردار

---

[1] لینڈر (Leander) ایبی ڈاس (Abydos) کا جوان تھا جو ہیرو (Hero) یعنی سیسٹاس (Sestos) کی پجارن کے عشق میں مبتلا ہو گیا اور پیرکر اُس کے پاس جا رہا تھا کہ ہیرو کا لمپ گل ہو گیا جس کی روشنی اس کی رہنمائی کرتی تھی۔ چنانچہ وہ ڈوب گیا۔ اُسکی محبوبہ بھی اس سانحہ کو سنکر سمندر میں گر گئی اور خود کشی کر لی۔

(باقی صفحہ ...)

”اُفق کے اِس پار“

چاند کی کرنیں ریت سے کھیل رہی تھیں جو دور تک پھیلی ہوئی تھی، دور اُفق میں زمین اور آسمان ہم رنگ معلوم ہو رہے تھے، ریتیلے گرد جنگل کے بیچوں بیچ ایک پگڈنڈی کسی عورت کی مانگ کی طرح چلی گئی تھی، آسمان کے تارے اور ریت کے ذرات بھی ہنسی ہنس رہے تھے، خاموشی کے ساتھ جھکے ہوئے چھوٹے چھوٹے درختوں کی چھاؤں میں سے جمنا بل کھاتی ہوئی جا رہی تھی اور چھوٹی چھوٹی مچھلیاں اس کی سطح پر اُچھل کر اس طرح آواز پیدا کر رہی تھیں جیسے کوئی موتیوں کی لڑیوں کو آپس میں ٹکرا رہا ہو۔ ابتدائے سرما کے ہلکے اور کیف آور جھونکے سوکھی ہوئی خس اور جھاؤ کی خوشبو سنسان فضا میں پھیلا رہے تھے، پل سے پرے کسی فقیر کی آواز نکل کر خاموش فضا میں گونجتی ہوئی لال قلعہ کی مضبوط دیواروں سے ٹکرا کر اسی خاموشی میں ڈوب جاتی تھی اور بلند اور گرد آلود برجیوں کے سائے ایسے معلوم دے رہے تھے جیسے روحیں ناچ رہی ہوں۔

سندر کے ذہن میں ابھی تک کل والی رقاصہ کی یاد تھی۔ گھنگروؤں کی آواز ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی، حرکت کرتے ہوئے پاؤں، لچکتا ہوا بدن، موجوں کی طرح بل کھاتی ہوئی ننگی مرمریں باہیں اور پتلے سے لہنگے میں سے چمکتی ہوئی سڈول پنڈلیاں اس کی نگاہوں کے سامنے ابھی تک اُسی طرح پھر رہی تھیں۔ ساز کے زیر و بم کے ساتھ اس کے پاؤں اُٹھ رہے تھے۔ سُرخ شراب! سُرخ ہونٹ، رگوں میں دوڑتا ہوا سُرخ خون، جوانی، زندگی!

اُس نے اپنے کوٹ کا کالر اونچا کر لیا، گردن کو سکیڑ لیا اور ایک پتلی سی پگڈنڈی پر ہو لیا جو غلیظ اور تنگ مکانوں اور جھونپڑیوں کی طرف مڑ جاتی تھی۔ گندی نالیوں کا پانی بہ کر تمام گلی میں پھیلا ہوا تھا، جانوروں کا گوبر، کیچڑ، نجاست ہر طرف بے ترتیبی کے ساتھ پڑی تھی۔ گھونسیں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں اور ایک نالی میں سے نکل کر تیزی کے ساتھ دوسری نالی میں گھس جاتی تھیں، وہ گلی کو کاٹ کر ایک چوڑی سڑک پر آ گیا جو انہیں گھروندوں کے درمیان سے گذرتی تھی۔

سڑک کے کنارے کی چند دکانیں کھلی ہوئی تھیں جن پر گرد کے سیو، تل کے لڈو، بیسن کی پکوڑیاں، گزک اور مونگ پھلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ چوڑے چوڑے تھال کھلے ہوئے تھے جن پر دھول اُڑ اُڑ کر جم گئی تھی اور تمام مٹھائیوں کا رنگ بدل دیا تھا۔ ان مٹھائیوں کے استعمال کرنے کے لئے سوائے آدمی کے کسی کی ممانعت نہ تھی۔ مکھیوں کی ایک اَن گنت تعداد پردوں اور چھتوں پر بیٹھی ہوئی اس بات کا انتظار کر رہی تھی کہ کب صبح ہو اور ہم یورش کریں۔ ہر چیز اصولِ فطرت کے مطابق تھی، سادہ اور کسی تصنع سے پاک!

دُور ایک چائے والا بیٹھا ہوا ایک دوسرے دُکاندار کے ساتھ چلم پی رہا تھا۔ اس کے بڑے سے پیتل کے برتن کے نچلے حصہ میں کوئلے دہک رہے تھے اور اُوپر کے حصہ میں چائے کھول رہی تھی۔ دودھ، شکر، پانی، چائے سب ایک جگہ تھے، کتنی اُستادی سے پکا پکا کر اس نے سب کا تال میل ملا دیا تھا۔ بڑے سے بڑا نظر باز بھی چائے، دودھ اور پانی کے رنگ میں امتیاز نہیں کر سکتا تھا۔ ہر ایک پیسہ دینے والے کو وہ ایک مٹی کا آبخورا بھر کے دے دیتا تھا۔ ”گرم چائے سردیوں میں گرمی اور گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔“ چائے کا رنگ دیکھ کر وہ بغیر پیئے ہی گرم ہو گیا۔ عمر کی درازی، بشاشت اور تندرستی کا پتہ چائے والے کی شکل سے بہت اچھی طرح لگ رہا تھا،

”روز چائے پیو، بہت دن جیو۔!“

تنگ جھونپڑیوں کے خلا میں سے جمنا اب بھی نظر آ رہی تھی کتابی بل کھاتی ہوئی۔ جمنا کے کنارے لگے ہوئے کارخانہ کا شور دُور تک سُنائی دے رہا تھا۔ اِس پار کے گھوسیوں کا کوئی ہلکارہ کبھی کبھی سُنائی دے جاتا تھا۔ آسمان اسی طرح صاف تھا، چند چھوٹے چھوٹے تارے اور ایک بڑا سا چاند! وہ پھر ایک پتلے سے راستے کی طرف مڑ گیا۔ کوچوں کی غلاظت، چھوٹے چھوٹے تنگ جھونپڑے، کچی نالیاں، نمی، بدبو ان سب سے گھبرا کر اُسے اپنا کمرہ یاد آنے لگا۔ جس میں کتابیں بے ترتیبی کے ساتھ پڑی ہونگی، کچھ میز کے اوپر اور کچھ اس کے نیچے، کچھ کرسی کے پیچھے کسی کونے میں اس بات کا انتظار کر رہی ہونگی کہ کب امتحان ہو اور سندر امتحان دینے کے لئے اُنہیں برائے نام اُٹھا کر دیکھ لے اور جھاڑ کر پھر انکی اصل جگہ پر رکھ دے۔

کچھ کا پیاں کھلی ہوئی الماریاں ہیں آدھی اندر آدھی باہر لٹک رہی ہونگی جن کے اوراق عرضیاں لکھنے کے لئے دوست مانگ مانگ کرلے گئے تھے۔ اگر نوکر کی بیوی بیمار نہ ہوئی یا جوتشی نے دعوت نامہ دے کر اسے کور کے یہاں نہ بھیج دیا ہوگا تو بستر تیار ہوگا، کھانا میز پر رکھا ہوا ٹھٹھرے ہوئے انداز میں اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ لاابالی زندگی بے فکری!

بندشیں کتنی بُری ہوتی ہیں اور پھر تعلیم خود ایک زبردست بندش ہے۔ خشک کتابیں، پڑھنا، امتحان، اُف، دولت جوانی عورت موسم کی چیزیں ہیں اور پھر پڑھکر اسے کرنا بھی کیا ہے۔ اس کا باپ دُور کسی محاذ پر فوجوں کی کمانڈ کر رہا ہوگا، موت وحیات کے ما بین، سنسناتی ہوئی گولیاں، گرجتی ہوئی توپیں، برستی ہوئی آگ، زمین پر بہتا ہوا، بلبلاتا ہوا سُرخ خون یہی تو زندگی ہے۔ اسے بھی ایک دن اسی طرح فوجوں کے دل بادل پر حکومت کرنا ہے۔ بستر پر سڑ سڑ کر، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا بھی کوئی مرنا ہے۔ وہاں زندگی کی یہ تمام دلچسپیاں کہاں میسر آئیں گی۔ زندگی ایک دھارا ہے جو دُور کسی ریگستان میں جا کر خشک ہو جاتا ہے۔ آخر خشک ہونے سے پہلے ہی کیوں نہ اس سے اچھی طرح سیراب ہو لیا جائے۔ کہتے ہیں اس کے دادا نے بیک وقت چار چار عورتیں رکھیں تھیں۔ یہ عورت کا رکھنا رکھانا بکواس ہے۔ عورت تو وقت کی چیز ہے، وقت گیا کہ گئی!

اس نے اپنی جیب کا جائزہ لیا اور اپنے اندر ایک گرمی سی محسوس کرنے لگا۔ وہ کل والی رقاصہ اور وہ....... وہ لڑکی کتنی زندہ دل تھی، اُس کی مُسکراتی ہوئی آنکھیں، اور آج. آج وہ پورے قلعہ کے گرد چکر لگا گیا اور کوئی بھی عورت دکھائی نہیں دی۔ یہ موسم اور یہ ویرانی!

وہ رُکا، چاروں طرف نظر دوڑائی، جمنا کے گھاٹ پر طویل خاموشی تھی اور مندر کا کلس آسمان کے سینے کا نشانہ باندھ رہا تھا۔ دور تک ایک احاطہ چھوٹا ہوا تھا اور اونچے نیچے راستے مختلف سمتوں میں کٹتے ہوئے جا رہے تھے۔ لہریں چاند کی کرنوں تلے اس طرح سو رہی تھیں جیسے کوئی شیر خوار بچہ ماں کی آغوش میں۔ کل یہاں صبح کا روپ دوبالا ہو جائے گا۔ حسین اور نوجوان لڑکیاں اپنی بوڑھی ماؤں، نوکرانیوں اور نوکروں کے ساتھ جمنا جی کے درشن کرنے آئیں گی، کل یہاں میلہ ہوگا، قرب وجوار کی ان پڑھ اور دیہاتی لڑکیاں، موٹی موٹی زرد اور گلابی دھوتیاں پہنے ہوئے جمنا کے پوتر پانی میں اشنان کرنے آئیں گی۔ دو دو تین تین کی جوڑیاں بنیں گی۔ ان کے ننگے پاؤں دھول اڑاتے ہوئے اِس چاٹ والے سے اُس چاٹ والے تک دوڑے پھرینگے، دھوتیوں کی گانٹھیں کھلیں گی، پیسے گن گن کر نکالے جائیں گے اور کھاتے میں دہی بہہ کر ان کے ہونٹوں سے ٹھوڑی تک آجائے گا۔

"اری چل نا تین پیسے تو کھا گئی!"

ایک دوسری کو ٹہوکا دے کر کہے گی اور اُن کی نگاہیں سیلے دیہاتی نوجوانوں پر پڑتی ہوئیں جن کے رنگین صافوں کے اونچے اونچے طرے ہوا میں لہراتے ہونگے اور الغوزوں کی تانیں ہوا میں تھرتھراتی ہونگی، گھروں کو لوٹ جائیں گی، کچھ مٹھائیاں چھوٹے بھائیوں کے لئے لے کر۔ شہری تیتریاں اپنے نرم و نازک لباسوں میں، سمٹتی، سُکڑتی، بچ بچا کر چلتی پھرتی ہونگی۔ نظر باز راستہ کاٹ کر ان کے سامنے اور برابر سے چبھتے ہوئے فقرے کستے ہوئے نکل جائیں گے۔ ظاہر ان کی تیوریوں پر بل آئیگا لیکن ساریوں کے دامنوں میں مُنہ چھپا کر مُسکرانے لگیں گی۔ پجاری مورتیوں کے سامنے بیٹھے ہوئے بھگوان کو یاد کرتے ہونگے، آنکھیں بند ہونگی، ٹیکہ لگاتے وقت ان کی انگلیاں نرم و نازک رُخساروں سے مس کرینگی اور ماتھے پر انگوٹھے کا دباؤ زیادہ ہو جائیگا۔ پیسوں کی جھنکار، پھولوں کے ڈھیر، چندن کی خوشبو، جمنا کی لہریں، سورج کی کرنیں، حسین چہرے، اُٹھتے ہوئے شباب، مچلتی ہوئی اُمیدیں، کل اُفق کے اس پار کیا کچھ نہیں ہوگا!

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ آنیوالے دن کی ساری خوبصورتی اور حُسن سمیٹ کر اپنے دل میں رکھ لے۔ کیا اچھا ہوتا اگر ہر عورت ہر مرد کی ملکیت ہوتی۔ کتنے بیوقوف ہیں وہ لوگ جنہوں نے حسن کے ساتھ کھیلنے کا نام گناہ رکھ دیا ہے۔ حُسن اور جوانی کہیں بار بار آتے ہیں۔ خوبصورتی دیکھنے کے لئے ہے چھونے کے لئے نہیں۔ چھی! اس کی اشتہا اور بڑھ گئی، وہ اُلٹے پاؤں لوٹ لیا، انہیں نالیوں کو پھلانگتا ہوا، انہیں راستوں کو عبور کرتا ہوا۔ جہالت اور غربت کتنی بُری چیزیں ہیں۔ آدمی کا ذاتی احساس مُردہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ کیا ان جاہل غریبوں میں حسین لڑکیاں نہیں ہوتیں۔ کتنی بیوقوف ہیں وہ جو اس وقت اپنے بستروں میں تنہا پڑی ہوئی کروٹیں لے رہی ہیں، اپنے حُسن سے بالکل بے خبر،

ایسے چشموں کی طرح جنکا پانی رک جاتا ہے اور اُس پر کائی کی تہیں چڑھ جاتی ہیں۔ اس کے خیال سے دُنیا کی ساری حسین لڑکیوں کو اس وقت گھروں سے باہر ہونا چاہیئے تھا۔

وہ پل کے سامنے سے گذر رہا تھا۔ ایک سپاہی ایک مٹیالے رنگ کا لمبا سا کوٹ پہنے ہوئے پل کا سہارا لئے ہوئے بیڑی پی رہا تھا۔ دوسرا سپاہی بندوق کندھے پر رکھے ہوئے شمالاً جنوباً منہ کرکے ٹہل رہا تھا۔ "رعایا کے خادم" وہ سوچنے لگا۔ یہ ابھی یہاں سے اٹھ کر قلعہ کی طرف چل دیگا۔ وہاں ایک مرد اور عورت کو پہچان کر کہ ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں روک لیگا۔ تھانے لیجانے کی دھمکی دیگا، پھر ہاتھ بڑھا دیگا اور کوئی چمکتی سی چیز لے کر جیب میں ڈال لیگا، تینوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائیں گے، اور پھر مختلف سمتوں میں چل دینگے۔ پھر یہ گھومتا ہوا ایک ایسی جگہ جائے گا جہاں مزدور طبقہ کے نوجوان گھٹیا شراب کے نشہ میں جوا کھیل رہے ہونگے، سامنے ایک میلی سی چادر پر بیڑیوں کے بنڈل پڑے ہونگے اور مکان کے ایک کونے میں آدھی پی ہوئی بیڑیوں کا ڈھیر لگا ہوگا۔ ایک شخص دروازہ پر بیٹھا ہوا اونگھ رہا ہوگا، آنکھوں میں کیچڑ بھری ہوگی، بال اُلجھے ہوئے ہونگے، دانتوں پر میل جما ہوا ہوگا، اور کپڑے کثیف اور بدبودار ہوں گے، وہ سپاہی کی آہٹ پاکر ایکدم اندر کی طرف بھاگے گا۔ وہ سننے کے باوجود بھی اسی طرح کھیلتے رہیں گے۔ یہ اُن کے چاروں طرف ایک ایک پر نظر ڈالتا ہوا پھر جائیگا۔ وہ کچھ پیسے اس طرح پھینک دیں گے جیسے کوئی کتے کے سامنے ہڈی پھینک دیتا ہے۔ یہ اٹھا کر جیب میں ڈال لے گا اور چلتا ہوا کہہ دیگا!

" دیکھ بھال کے کام کیجو بے تجو!"

" اچھا سنتری جی!" کہہ کر وہ پھر اپنے کام میں مشغول ہوجائینگے اور یہ اپنا فرض ادا کرکے واپس لوٹ آئیگا۔ پھر اگلے دن اخبار میں خبر شائع ہوجائے گی۔ "جمنا والی بستی میں جوئے کے معاملے پر ایک آدمی کا خون، پولیس موقعہ پر پہنچ گئی۔"

وہ سپاہی کو دیکھتا ہوا آگے نکل گیا۔ قلعہ کی دیوار اسی طرح خاموش کھڑی تھی۔ اس کا سایہ گہری اور خشک خندق کو بھیانک بنا رہا تھا، خندق کی گھاس سوکھ کر زمین سے لگ گئی تھی اور پتھروں کی جڑوں میں سے مٹی چھوٹ کر وہ ایسے معلوم ہونے لگے تھے جیسے کسی مُردہ جانور کے دانت۔ خندق کے ساتھ ساتھ کیکر کے درختوں کا ایک گھنا جنگل بن گیا تھا جس میں گاہے گاہے جنگلی جانور چلاتے

گئے تھے، قلعہ کے اندر گڑے ہوئے اونچے اونچے بے تار برقی کے کھمبوں پر لگی ہوئی بتیوں کی روشنی پھیکی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے قریب شراب کے نشہ میں دُھت دو ٹمی گورے بڑبڑاتے ہوئے سائیکل پر نکل گئے۔

اس نے سڑک چھوڑ کر ایک پتلا سا راستہ اختیار کرلیا جو دیوار کے ساتھ ساتھ جانے کے بجائے ایک اور چھوٹے سے محلہ کی طرف مڑ جاتا تھا، جگہ جگہ کوڑے اور غلاظت کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ مکانوں پر نحوست چھائی ہوئی تھی۔ اصول، طریقے، سماجی نظام، تہذیب، تمدن معلوم ہوتا تھا یہ ساری چیزیں شہر کے اس حصہ سے متعلق ہیں۔ چوڑی چوڑی نالیاں، مضبوط پتھر کے فرش، صفائی، روشنی ان سب کا تعلق اس دُنیا سے ہے جہاں صاف ستھرے مکانوں میں متمدن دُنیا کے خوش پوش لوگ رہتے ہیں جن کے چہرے پر بشاشت اور آنکھوں میں زندگی معلوم ہوتی ہے، جن کی ہر بات پر دھیان دیا جاتا ہے، جو تہذیب کا جزو ہیں، جن کے ہاتھ میں آئین و قوانین ہیں، صرف انہیں لوگوں کو صحت و تندرستی کی ضرورت ہے، اس نے ادھر اُدھر دیکھا راستہ آگے بند تھا۔

بائیں ہاتھ کی جانب ایک معمولی سے مکان کی کھڑکی میں سے اندر جلتی ہوئی ایک لالٹین لٹکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی جس کی روشنی مکان کی تاریکی پر غالب آنیکی کوشش کر رہی تھی۔ مکان کے ارد گرد گہری گہری کچی نالیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ دیواروں کا چونہ چھوٹ چھوٹ کر ان پر آہستہ آہستہ نمی چڑھتی جا رہی تھی، مکانوں کی خاموشی، مایوسی اور ایک لالٹین کو ٹمٹماتے ہوئے دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ کسی کے مزار پر دیا جل رہا ہے۔ اس کوچہ میں اور رومان کی تلاش! وہ وہیں کھڑا ہوکر ادھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے کوئی ابھی اس کی آہٹ پاکر کھڑکی سے باہر جھانکے گی، اس کی طرف دیکھ کر اُس کو قریب بلائیگی، وہ چاروں طرف دیکھتا ہوا دبے پاؤں چل کر اس کے قریب جائیگا، دونوں ایک دوسرے کی طرف اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ کر رازدارانہ لہجہ میں باتیں کریں گے اور پھر.... پھر اس غلیظ کوچہ کو چھوڑ کر اس ساحل پر پہنچ جائیں گے جس کے قریب سے وہ دو مرتبہ گذر کر آ چکا ہے۔

جمنا کی ہلکی ہلکی لہریں، چاند کی کرنیں، مسکراتے ہوئے ستارے، چمکتے ہوئے ذرات، جھاؤ اور خس کی خوشبو، زندگی، رومان!

زندگی ایک چشمہ ہے جو نامعلوم کہاں سے پھوٹتا ہے، بہتا ہے، ایک نامعلوم سمت میں اور دُور.... دُور کسی ریگستان میں جاکر خشک

ہوجاتا ہے!

اُس نے وہیں کھڑے کھڑے اندر کا جائزہ لینا چاہا لیکن سوائے ایک طویل خاموشی اور لالٹین کے اُسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا، تنہائی، خاموشی، روشنی، وہ کھڑا سوچتا رہا، ایک اجنبی محلہ میں بالکل بےخطر زندگی کا وہ حصّہ جسے جوانی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے جب سے اس کے حصّہ میں آیا تھا وہ اکثر خطرات کا مقابلہ کر چکا تھا، عورت کے معاملہ میں، اس صنف کی خاطر وہ ہر وقت بڑے سے بڑے مقابلہ کے لئے تیار رہتا تھا۔

اُسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا جب اس نے اُچٹتی ہوئی نظر سے دوبارہ کھڑکی کی طرف دیکھا۔ ایک سیاہ چہرہ جس پر عمر کے تقاضے سے جھُریاں پڑی ہوئی تھیں، اتنی جھُریاں کہ غالباً ہر شکن عمر کے ایک سال سے متعلق تھی اور جنہیں گن کر بخوبی اُس کی عمر کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا، اُلجھے ہوئے سفید بال کانوں اور گدّی سے ذرا نیچے تک لٹک رہے تھے، آنکھیں بالکل ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسے کیچڑ میں دو کنچے پڑے ہوں، ٹھوڑی اِس طرح نکیلی ہوتی چلی گئی تھی جیسے کسی کھنڈر کی بُرجی، ناک ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے کسی ہموار زمین کا کوئی حصہ زلزلہ سے اُبھر آیا ہو، جب وہ مُسکرائی تو محسوس ہوا کہ علاقہ برآر میں کسی جگہ سے زمین شق ہو گئی ہے، اس کے چند مصنوعی اور چند اصلی دانت اس کے ہونٹوں کے پیچھے سے جھانک رہے تھے۔ اس نے ہاتھ ہلا کر سُندر کو اپنے قریب بُلایا، وہ بلا جھجک چلا گیا۔

"اندر آیئے نا!"

اُس نے دروازہ پر ایک نظر ڈالی جو کھول دیا گیا تھا اور اندر چلا گیا۔

"کیا چاہیئے آپ کو؟"

"عورت!"

اُس نے مکان کی دیواروں کو دیکھنا شروع کر دیا، دیواروں پہ پان کی پیک، تھوک، ناک اور اس قسم کی نہ معلوم کتنی غلاظت مختلف قسم کے نقوش بنا رہی تھی، ایک دو کونوں میں چوہوں نے کھود کر مٹی کا ڈھیر لگا رکھا تھا، چھت کی کڑیاں جگہ جگہ سے جھُکی ہوئی تھیں، مکان کی کثافت، بڑھیا کا چہرہ، لالٹین کی ٹمٹاتی ہوئی مدھم روشنی۔ اس نے نظر اٹھا کر بڑھیا کی طرف دیکھا جو ابھی تک اس کے برابر کھڑی اُس کے دوسرے حکم کا انتظار کر رہی تھی۔ مکان کی دیواروں کے مختلف حصّوں میں آٹھ دس دروازے بنے ہوئے تھے جو بند تھے۔ بڑھیا کی نظر کبھی دروازوں پر اور کبھی سُندر کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس نے سُندر کی طرف دیکھ کر ایک دفعہ اور پوچھا،

"کیسی عورت چاہیئے آپکو؟"

"جوان اور خوبصورت!"

بڑھیا نے جواب سُن کر چاروں طرف نظر دوڑائی اور اس کی کرخت اور کریہ آواز گونجنے لگی، "شانتا، شیلا، منوہر امنی، کملا...!"

سُندر کھڑا ہوا اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا، اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی فلم دیکھ رہا تھا، اس کے سامنے ہی سامنے بند دروازے کھُلے اور لڑکیاں ایک ایک کر کے اُسکے سامنے آنے لگیں۔ اور ایک قطار لڑکیوں کی اس کے سامنے کھڑی تھی جس میں دس سال کی لڑکی سے پچیس سال تک کی لڑکی موجود تھی۔ اُس نے ایک ایک پر تنقیدی نظر ڈالنی شروع کی جیسے کوئی قربانی کے لئے بکرے کا انتخاب کیا کرتا ہے۔

لڑکیوں کے ہونٹ مُسکرانے لگے اور اُن کی بھوکی نگاہیں اسکی جیب میں اپنی روزی تلاش کرنے لگیں۔ ان کا لباس معمولی اور میلا تھا۔ سُندر نے آج تک جتنی لڑکیوں کے ساتھ وقت گذارا تھا وہ تمام رنگین تیتریاں تھیں، تہذیب و تمدن سے واقف، وقت کی ضرورت سے آشنا۔ اسے آج تک کبھی عورت کی بے بسی اور مجبوری کا احساس نہیں ہوا تھا اور آج بھی اسے اس وقت تک کوئی احساس نہیں تھا۔ اُس کے سامنے ایک ایسی کھیتی کھڑی تھی جس میں سے کچھ کچّی کاٹی جا رہی تھی اور کچھ پکنے سے پہلے مُرجھا گئی تھی۔ اُس نے بھی مُسکرا کر لڑکیوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ کسی کو سرتاپا دیکھا۔ اور کسی کے چہرے کو بغور دیکھا، کسی کے قد کا جائزہ لیا، کسی کے بدن اور رخساروں کو مس کیا، لڑکیاں مُسکرا رہی تھیں اور حزن و ملال اُن کے چہروں پر برس رہا تھا۔ سُندر کو اس میں بھی ایک خوبی نظر آ رہی تھی۔ عورت کی مایوسی اس کے حُسن میں اضافہ کر دیتی ہے، ارمانوں کی دُنیا میں آگ لگا دیتی ہے، جذبات کو بے لگام کر دیتی ہے۔ عورت کی ہر ادا خوبصورت ہوتی ہے۔ مایوسی اور مسرت حُسن کے لئے دونوں برابر ہیں۔ وہ انکے جذبات سے کھیلنے لگا اور وہ اُس کی جیب پر نظریں جمائے مُسکراتی رہیں۔

اُسکی نظر انتخاب پچیس سالہ لڑکی پر پڑی جس کی جوانی اُس کی آنکھوں میں زیادہ نمایاں تھی، جس کا شباب شہوانیت کے تندو تیز

مجموں میں مجلس گیا تھا جس کی خوبصورتی انسان کی ہوا و ہوس نے بگاڑ دی تھی جس کے آثار کچھ کچھ اب بھی باقی تھے: جسے دُنیا کی چیرہ دستیوں نے مسکرانا سکھا دیا تھا یا مسلسل مشق سے اس کے ہونٹوں کو یونہی بلا وجہ کھل جانے کی عادت پڑ گئی جسے دیکھنے والے مسکراہٹ ہی تصور کرتے تھے۔ اس کے پھیکے رخسارے سمٹ کر اکٹھے ہونے لگے اور اس کے چمکدار دانت اس کے مرجھائے ہوئے ہونٹوں کے پیچھے سے چمکنے لگے۔

"دو روپے!"

بڑھیا نے جھک کر سُندر کے کان میں کہا۔ اُس نے بٹوا نکال کر دو روپے بڑھیا کے ہاتھ میں دیدیئے اور لڑکی کے پیچھے پیچھے اندر کمرے میں چلا گیا۔ باقی لڑکیاں افسوس کرتی ہوئی کہ اُن کی قیمت نہ لگ سکی واپس لوٹ گئیں۔ سُندر نے کمرے کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ایک کونے میں ایک چھوٹی سی چارپائی اور ایک میلا سا بستر پڑا تھا، دیواریں اکثر جگہ سے ایسی دکھائی دے رہی تھیں جیسے چاندماری کی گئی ہے، مکڑی کے جالوں کی ایک کثیر تعداد چھت میں نظر آ رہی تھی، فرش کچی مٹی کا تھا جس میں نمی کے کافی اثرات تھے۔ اُس نے لڑکی کی نگاہوں میں نگاہیں ڈالیں اور ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا چاہا۔ لڑکی نے اس کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھا۔

"مجھے ایک روپیہ دو گے؟"

"مگر میں تو تمہاری اتنے وقت کی قیمت دے چکا ہوں!"

لڑکی کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں، ایک تاریکی سی اس کے چہرے پر چھا گئی، اس کی پلکیں جھک گئیں اور اُس کی گردن نیچے کو لٹک گئی۔

"تم یقین کرو گے؟"

"ہاں کہو!"

"آج تین روز کے بعد تم پہلے آدمی ہو جو میرے پاس آئے ہو۔ مجھے بڑی شدت کی بھوک لگی ہے، ان روپوں میں سے جو تم نے دئے ہیں میرا حصہ صرف آٹھ آنے ہے!"

یکے بعد دیگرے دو تین موٹے موٹے آنسو اُس کی آنکھوں سے گرے اُسے کچھ غنودگی سی آ گئی۔ سُندر نے سہارا دے کر اُسے چارپائی پر بٹھا دیا، جیب سے بٹوہ نکال کر چارپائی پر پھینک دیا اور خود تیزی سے باہر نکل گیا۔

مسکراتے ہوئے تارے چمکتے ہوئے ذرات ٹپکتے ہوئے

حُسنِ سُخن

ابھی بے پردہ ظرفِ ساز بھی ہو
کریں کیا تابِ ضبطِ راز بھی ہو

تصوّر کی حقیقت کس سے پوچھیں
کسی تصویر میں آواز بھی ہو

ہزاروں یاد ہیں بُلبُل کو نغمے!
کوئی گل گوش بر آواز بھی ہو

رہیں یوں ہم اسیرِ دام ہو کر
پروں میں طاقتِ پرواز بھی ہو

مری ہستی ہے اک دورِ تسلسل
جو ہو انجام تو آغاز بھی ہو

دلِ مضطر کی بے ربطی مُسلّم
نگہ ان کی غلط انداز بھی ہو

دکھائیں کیا تمہیں ہم اپنی صورت
کہ تم آئینۂ غمّاز بھی ہو

ابھی جی اُٹھتے ہیں جانبازِ عشق
تمہارے حُسن میں اعجاز بھی ہو

تپش کس کو سنائیں اپنی بیتی
کوئی ہمدم کوئی دمساز بھی ہو

عبداللطیف تپش!

*****

رُبابِ شکستہ

برقِ جمال نے تو نہ کھوئے تھے میرے ہوش
ہاں تم نے مجھکو چاہ کے دیوانہ کر دیا

چاندنی، موسمِ گل، صحنِ چمن، خلوتِ ناز
خواب دیکھا تھا کہ کچھ یاد ہے کچھ یاد نہیں

شکنِ بسترِ و نمناکیِ بالشں ہیں گواہ
پوچھ لو اِن سے فسانہ شبِ تنہائی کا

اب میری خموشی کے بھی ہونے لگے چرچے
افسانہ نہ بن جائے کہیں راز کسی کا

میں نے مانا تمہیں کچھ مجھ سے سروکار نہ تھا
جاتے جاتے مجھے کیوں تمنے پلٹ کر دیکھا

جی چاہتا ہے اُسکے رُخ سے نقاب اُلٹ دُوں
میں تنگ آ گیا ہوں سب کی ملامتوں سے

اے کاش ہوں پھر جلوہ گر اک شب میں دو ماہِ تمام
اک زینتِ افلاک ہو، اک زینتِ آغوش ہو

میں ہنس دیتا ہوں سُنکر اپنی خاموشی کی تعبیریں
کوئی مغرور کہتا ہے، کوئی دیوانہ کہتا ہے

حُسن محوِ خواب تھا شب یا مری آغوش میں
بوستاں بھر پھُول تھے اور آسماں بھر چاندنی

پریم پجاری،

پریتم! میری رُوح کی تسکین!

کیاتم اس وقت مجھے یاد کر رہے ہو؟ مجھے ہچکیاں آرہی ہیں اور دل بے اختیار تمہاری طرف کھنچا جا رہا ہے۔ رات تو ابھی کچھ ایسی زیادہ نہیں آئی مگر ہر طرف سنّاٹا چھایا ہوا ہے۔ ہَوا سائیں سائیں چل رہی ہے۔ بادل گھرا ہوا ہے۔ فضا تاریک ہے۔ میرا دل، آہ میرا دل تڑپ کر تمہارے آغوش میں جا پڑنے کے لئے بُری طرح مچل رہا ہے۔ پریتم! میں اسے کیونکر سنبھالوں؟ ہائے میں کیا کروں؟ بہت دیر سے اپنے کمرے میں اکیلی لیٹی ہوئی ہوں۔ تھوڑی دیر ہوئی تمہارا پیارا خط پڑھکر تمام کیا ہے۔ میرے دل و دماغ پر تم چھائے ہوئے ہو۔ میری رُوح میں تم سمائے ہوئے ہو۔ آہ! تم مجھ سے اتنے قریب ہو تو پھر مجھے دکھائی کیوں نہیں دیتے؟ تمہارے معطر گریبان کی خوشبو تو مجھے آرہی ہے پھر میرے ہاتھ تمہیں چھُو کیوں نہیں سکتے؟ دسمبر کی سرد رات ہے۔ دیکھو تو میرا تمام بدن کیسا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ تم مجھے اپنے آغوش میں لیکر بھینچ کیوں نہیں لیتے؟

خدا کے بندے ایسے بھی ہیں جنہیں پورا اوڑھنا بچھونا بھی نصیب نہیں، پھر بھی وہ چین سے پڑے سوتے ہیں۔ میں مخمل کے گدّے پر لیٹی ہوں۔ نرم تکیوں پر سر دھرا ہے۔ بہترین قسم کا لحاف جسم پر ہے، پھر بھی آرام نصیب نہیں۔ معلوم ہوتا ہے بستر پر کانٹے بچھے ہوئے ہیں جو ہر کروٹ کے ساتھ پہلو میں چُبھ جاتے ہیں۔

تم کہو گے "رضیہ! کیا میرا خط پاکر تمہیں ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی؟" میرے محبوب! کیا یہ ممکن بھی ہے کہ تمہارا خط پاکر مجھے خوشی نہ ہو؟ تمہاری تحریر نہ تھی، کرنوں کا ایک آبشار تھا جس نے میری رُوح کو انوار سے نہلا دیا۔ ستاروں کا ایک خرمن تھا جس نے میرے دل کی تاریک فضا کو کہکشاں بنا دیا۔ آہ! یہ پیارا خط! نغموں، پھولوں اور چاندنی کا مجموعہ آہ! یہ دلنواز تحریر! رنگین خوابوں کی دُنیا۔ معصوم مسرتوں کی بہشت۔ سکون لائی، شادمانیاں لائی، نئی اُمیدیں لائی اور اپنے حجابوں میں چھُپائے ہوئے تمہیں بھی اپنے ساتھ لائی۔ مگر آہ! یہ سب کچھ ایک آنی کیفیت تھی جیسے دھنک دیکھتے دیکھتے آنکھوں سے غائب ہو جائے جیسے مہتابی چھوٹتے چھوٹتے بُجھ جائے۔ ابھی سب کچھ تھا، ابھی کچھ بھی نہیں۔ اب کہاں ہے وہ مسرّت؟ کہاں ہے وہ سکون؟ چراغ تھا کہ بُجھ گیا۔ پھول تھا کہ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ میں ہوں اور میری حرماں نصیبیاں۔ آہ!

پریتم! کیونکر دکھلاؤں تمہیں اپنے دل کی ویرانیاں۔ کیونکر سمجھاؤں تمہیں یاس کی جاں گداز باں۔

کچھ عجب حال ہے طبیعت کا۔ تنہائی سے گھبراتی بھی ہوں اور تنہائی کی آرزو بھی کرتی ہوں۔ جی کھُول کے رونا فقط تنہائی ہی میں تو ممکن ہے جہاں کوئی یہ پوچھنے والا نہ ہو کہ آستین کیوں تر ہے؟ دامن کیوں بھیگا ہے؟ تکیہ کیوں نمناک ہے؟ شاعر تو اپنے تخیّل کی مدد سے ایک دُنیا بسا لیتے ہیں۔ خلوت کو انجمن بنا لیتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ ع:-
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو۔ مگر یہاں تو یہ حال ہے کہ تمہارے بغیر انجمن بھی رُوح فرسا تنہائی بن جاتی ہے۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہاں اپنے سوا کوئی اور بھی ہے۔ ہائے کیسا جی اُلجھتا ہے۔ کیسی وحشت ہوتی ہے۔ پیارے! آج سمجھ میں آیا تمہارے اس شعر کا مطلب:-

قیامت ہے دلِ مہجور کا احساسِ تنہائی
اکیلے اب تو ہم اکثر بھری محفل میں رہتے ہیں

اچھا! ایک بات تو مجھے بتاؤ۔ کوئی دلربا صورت دیکھکر اگر تمہاری تصویر آنکھوں میں پھر جائے تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔ کیونکہ تم بھی ایک دل چھین لینے والی صورت کے مالک ہو۔ کہہ سکتے ہیں کہ ظاہری مشابہت نے تمہاری یاد دلا دی۔ مگر شام کو جب دامنِ فلک شفق کی حمرت سے لالہ زار بن جاتا ہے تو اُسے دیکھکر تمہاری یاد کیوں آتی ہے؟ تاروں بھری رات کی پُرسکُون فضا میں جب ٹھنڈی ہَوا ہلکتی ہے تو اسوقت کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آسمان کے روپہلی پردے کے پیچھے تم کھڑے مسکرا رہے ہو؟ سپیدۂ سحر جب اُفقِ مشرق پر نمودار ہوتا ہے تو کیوں تمہارا خیالی پیکر اُس نور کی چادر میں لپٹا ہوا میری نگاہوں کو جذب کر لیتا ہے؟ بادل جب برس کر کھُل جاتے ہیں اور آسمان پر قوسِ قزح نمودار ہوتی ہے تو کیوں اُس پر نظر پڑتے ہی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ میرا رنگین آنچل ہے جو میں نے تمہارے چہرے پر ڈھانک دیا ہے تاکہ دھوپ کی چمک تمہاری نیند میں خلل انداز نہ ہو؟ رس بھرے نغموں کی صدا کان میں پہنچتے ہی کیوں تمہاری یاد دل میں چٹکیاں لینے لگتی ہے؟ سبزہ کے مخملیں فرش پر شبنم کے موتی بکھرے ہوئے دیکھ کر کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تم یہیں کہیں ہو اور میں

دیوانہ وار اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی ہوں؟ باغ میں گھنے درختوں کے شاداب اور خنک سایہ میں پہنچتے ہی کیوں مجھے اچانک تمہاری موجودگی کا احساس ہونے لگتا ہے؟ چمن میں گلاب کے بہار آفریں تختوں میں داخل ہوتے ہی تم میرے سامنے کیوں آجاتے ہو؟ مجھے آزادی سے گلگشت کیوں نہیں کرنے دیتے؟ قدم قدم پر میرا دامن کیوں تھام لیتے ہو؟ بار بار میرے گلے میں باہیں کیوں ڈال دیتے ہو؟ اس طرح بے جھجک میرے لب کیوں چوم لیتے ہو؟ ہائے تم مجھے کس کس طرح دیوانہ بناتے ہو۔ بتاؤ! ہائے تم مجھے بتاؤ! یہ تم نے مجھے کیا کر دیا؟

رات کے وقت جب ستھرے نکھرے آسمان کے پرسکون سمندر میں چاند کی نقرئی کشتی آہستہ آہستہ بہتی ہوئی نظر آتی ہے اور روپہلی چاندنی میں کائنات کا ذرہ ذرہ خوشی سے مسکراتا ہوا دکھائی دیتا ہو تو اُس وقت میری نگاہیں بے اختیار آسمان کی طرف کیوں اُٹھ جاتی ہیں؟ جیسے چاند مجھ سے کچھ کہہ رہا ہے۔ جیسے تم نے اُسے بھیجا ہو۔ ہاں میں تمہارا پیغام سنتی ہوں۔ ایسی آوازوں میں جو میرے سوا کسی کو سنائی نہیں دیتیں۔ مجھے اس ماہتابی آئینہ میں تمہارا عکس جلوہ گر نظر آتا ہے۔ مجھے تمہارے لبوں کی جنبش تک صاف دکھائی دیتی ہے۔ تم آہستہ سے کہتے ہو "رضیہ پیاری!" عجب ایک بیخودی سی میرے حواس پر چھا جاتی ہے۔ میں کچھ بھی زبان سے نہیں کہتی۔ جیسے میری قوتِ گفتار کسی نے مجھ سے چھین لی ہے۔ کبھی ایک ٹھنڈی آہ میرے منہ سے نکل جاتی ہے اور کبھی دو گرم آنسو میرے تمتاتے ہوئے رخساروں پر ڈھلک پڑتے ہیں۔ آہ! میرے محبوب! کتنے مختصر لفظوں میں تم نے میری اس کیفیت کو بیان کر دیا ہے:-

کچھ سرد آہیں، کچھ گرم آنسو
کیا مختصر ہے میری کہانی

ابھی چند روز ہوئے میں ایک پہاڑی مقام پر گئی تھی۔ سیر و تفریح کے لئے نہیں۔ دل کی وحشت سے تنگ آکر، شہر کے شور و شغب سے پیچھا چھڑا کر بھاگی تھی۔ تھوڑے سے سکون کی تلاش میں۔ اتفاق سے وہاں دو سہیلیاں مل گئیں۔ ایک دن انہوں نے کہا "چلو، اُس پہاڑی کی سیر کو چلیں۔ اُس کی چوٹی پر چڑھیں گے۔ بڑا دلفریب منظر ہے۔ بڑی پُرکیف فضا ہے۔" میں گئی۔ گھومتے پھرتے، چڑھتے اترتے دن ڈھل گیا۔ ہم تینوں سب سے اونچی پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ گئے۔ وہاں سے گرد و پیش کا منظر بہت ہی حسین معلوم ہوتا تھا۔ پہاڑی کی دائیں جانب نشیب میں ایک چھوٹا سا چشمہ بہ رہا تھا۔ بہت ہی پیچ در پیچ جیسے بھول بھلیاں۔ اس کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں گھنے جنگل سے ڈھکی ہوئی دور تک چلی گئی تھیں۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی زرد زرد کرنوں سے چشمہ کا رنگ بالکل سنہرا ہو گیا تھا۔ کنارے پر ایک کشتی پڑی تھی یکایک میں نے تیزی سے چشمہ کی طرف اُترنا شروع کیا۔ میری دونوں سہیلیاں پیچھے رہ گئیں۔ ایک نے چلا کر کہا۔ "رضیہ خدا کے لئے ذرا سنبھل کر اُترو۔ کہیں پاؤں نہ پھسل جائے۔" دوسری نے کہا۔ "اور یہ تم اُدھر چشمہ کی طرف کیوں جا رہی ہو؟ ادھر راستہ نہیں ہے۔"

میں بالکل ایک خود فراموشی کے عالم میں تیزی سے چشمہ کی طرف اُترتی چلی جا رہی تھی۔ کیوں؟ تمہیں یقین نہیں آئیگا۔ آہ پریتم! مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے تم اُس کشتی کے پاس کھڑے مجھے بلا رہے ہو کہ "رضیہ! آؤ! جلدی آؤ۔ دن چھپا جا رہا ہے۔ کشتی کا سفر ہے اور دور جانا ہے۔" اس عالمِ خود فراموشی میں میں اپنے کو سنبھال نہ سکی، پاؤں پھسل گیا۔ قریب ہی ایک پیڑ تھا۔ اُس نے مدد کی۔ سنبھل گئی گھٹنے میں تھوڑی سی خراش آئی اور بس۔ بتاؤ! آہ پریتم! مجھے بتاؤ کہ تم اس طرح مجھے کیوں یاد آتے ہو؟ کیوں سچ مچ اس تشنہ کام روح کو سیراب نہیں کر دیتے؟ آجاؤ، میرے اچھے پریتم آجاؤ۔ تمہاری یہ نامراد کنیز تمہارے بغیر بہت تکلیف میں ہے۔ ہائے اللہ! کیا کروں میں؟

ہاں، کسی گانے والے کی زبان سے ایک مناسبِ حال شعر سنکر تمہاری حالت غیر ہو گئی۔ مستقبل کے یاس انگیز تصور نے تمہارا کلیجہ مسل کر رکھ دیا۔ میں اچھی طرح اندازہ کر سکتی ہوں کہ اُس وقت تمہاری کیا کیفیت ہوئی ہوگی۔ مگر پیارے! تم خود اپنا یہ شعر بھول گئے جو اِن دنوں ہر وقت میرے دماغ کی فضا میں گونجتا رہتا ہے:-

مایوسیِ پیہم سے ہمدوش تمنا ہے
اب تجھ کو نہ دیکھیں گے ایسا نظر آتا ہے

یہ شعر تم نے اُس وقت کہا تھا جبکہ حالات نے ابھی اتنی نازک صورت اختیار نہیں کی تھی۔ سنہری اُمیدوں کی بلند عمارتیں یاس و ناکامی کے خوفناک زلزلوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ حوادث کی پرشور آندھیاں ہماری تمناؤں کے ننھے ننھے نازک پھولوں کو توڑتی بکھیرتی چلی جا رہی تھیں۔ پھر بھی سکون کے وقفے آتے تھے اور ایسا محسوس ہونے لگتا تھا جیسے سسکتی ہوئی آرزوئیں پھر جی اٹھیں گی۔ مگر تم تو الہامی شاعر ہو۔ لفظوں کے صنعت گر نہیں۔ تم نے جو کچھ کہا تھا وہ غیب کی آواز تھی۔ وہ ہمارے نوشتۂ تقدیر کی ایک سطر تھی جو

تم نے پڑھکر مجھے سُنائی تھی۔ میری عید کے چاند! کاش میں تمہیں اتنی دُور ہی سے دیکھ سکتی جتنی دُور سے آسمان کے چاند کو دیکھتی ہوں۔ ہائے! کیا یہ بھی گناہ ہے؟ یہ بھی جرم ہے؟ چکور تو چاند پر قربان ہو جاتا ہے مگر اُسے کوئی بھی مجرم قرار نہیں دیتا۔ بھونرا تو آزادی کے ساتھ کلیوں کا رس چوس لیتا ہے اور کوئی بھی اُسے نہیں روکتا۔ پھر میں نے ہی کیا جرم کیا ہے؟ میں کیوں اپنے چاند کو نہیں دیکھ سکتی؟ کیوں اپنے پھول کو اپنے ہونٹوں سے نہیں لگا سکتی؟

کبھی کبھی حد درجہ مجنونانہ خیالات دماغ میں آتے ہیں ناممکن کو ممکن بنانے کی بے معنی تدبیریں سوچتی ہوں۔ خطرناک اقدامات کی طرف خیال جاتا ہے مگر پھر پاسِ ناموس دامنگیر ہوتا ہے۔ اپنا نہیں، تمہارا۔ آہ! مجھ بدنصیب کی وجہ سے تمہیں کیسی کیسی اذیتیں، کیسی کیسی رسوائیاں سہنی پڑیں۔ ذرا سی دیر کے لئے اپنے دل کی جلن مٹانے کی خاطر تمہیں آگ میں کس طرح جھونکدوں۔ میرا جل جانا، جل کر خاک ہو جانا اس سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ میرے محبوب پر ذرا سی بھی آنچ آئے۔ یہ سب کچھ ہے، پھر بھی ناکام کوششیں جاری ہیں۔ اور بعض اوقات تو ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے اب کامیابی قریب ہے۔ مگر آہ! یہ سب خود فریبیاں ہیں۔ کہاں کامیابی اور کہاں ایک نامرادِ ازل۔ بس:۔

یہ عالم ہے مری ہستی کا جیسے کوئی کشتی
کنارہ تک سلامت آکے ٹکرا جائے ساحل سے

اب پھر کچھ دنوں سے یہی دُھن سوار ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو، ایک نظر تمہیں دیکھ لوں۔ دعا کرو کہ خدا مجھے میرے ارادوں میں کامیاب کرے۔

ہاں پیارے۔ اب میں اچھی ہوں، بالکل اچھی ہوں، تم فکر نہ کرو۔ انسان جب تک اُن تمام تلخیوں کا مزہ نہ چکھ لے جو روزِ ازل اُس کے حصے میں آئی ہیں اس وقت تک فرشتۂ موت بھی چاہے تو اُسے ہلاک نہیں کر سکتا۔

یکم جنوری ۱۹۴۲ء۔ میرے پیارے! نیا سال مبارک ہو۔

میں تمہیں نئے سال کی مبارکباد دے رہی ہوں اور یہ بھول گئی کہ یہ خط تو کہیں مہینہ بھر کے بعد تمہارے پاس پہنچے گا۔ وہ بھی اگر پہنچا۔ تمہاری تحریر سے مجھے ایسا اندازہ ہوا کہ تمہاری خط و کتابت پر اب وہ پہلی سی پابندیاں نہیں ہیں یعنی اگر تم چاہو تو جلد جلد مجھے خط لکھ سکتے ہو۔ اگر یہ صحیح ہے تو میری روح کی تسکین! تم کیوں مجھے مہینوں انتظار کے جانگسل عذاب میں مبتلا رکھتے ہو؟

رسالوں میں تو اب تم مدت سے کچھ نہیں لکھتے۔ کسی نے مجھے بتایا کہ تم نے "ساقی" میں ایک افسانہ لکھا ہے۔ میں نے وہ رسالہ منگا کر پڑھا۔ کیوں پیارے! یہ فرضی نام کے نقاب میں تم نے اپنا چہرہ کیوں چھپایا ہے؟ کیا سورج پر بادل آجائے تو لوگ سورج کو نہیں پہچان سکتے؟ خوشبو کہیں پنکھڑیوں کے پردوں میں بند رہ سکتی ہے؟ فانوس سے کہیں شمع چھپتی ہے؟ نام کے بدل جانے سے کیا اندازِ تحریر بھی بدل جائیگا؟ کیا میں اتنا بھی نہیں سمجھ سکتی کہ یہ نغمہ کس ساز سے نکل رہا ہے۔ تمہارے طرزِ نگارش کی رنگینی، دلربائی اور کیف آگینی قدم قدم پر تمہاری غمازی کر رہی ہے۔ واقعات کے آئینوں میں جا بجا خود تمہارا عکس صاف نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں میری نامراد زندگی کے نقوش بھی تم نے کھینچ دئے ہیں۔

میں نے اس افسانے کو بڑی محویت کے ساتھ پڑھا اور ختم کر کے دو شبنمیں ستارے اس پر نچھاور کر دئے۔ اس سے زیادہ خراجِ تحسین پیش کرنے کی مجھے استطاعت کہاں۔ ہاں تو اُس وقت سے میں ساقی کی مستقل خریدار بن گئی ہوں۔ مگر اس افسانہ کے بعد تو تم نے کچھ لکھا ہی نہیں۔ جب رسالہ آتا ہے تو میں بڑی بیتابی کے ساتھ فہرستِ مضامین پر نظر ڈالتی ہوں مگر تمہارا مضمون اُس میں نہ پاکر رسالہ کھولنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ پریتم پیارے! تم میری خاطر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا کرو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے اندازِ نگارش نے کتنے دلوں کو موہ لیا ہے اور دیکھو میں اپنی رقیبوں سے ذرا بھی تو آزردہ نہیں ہوتی بلکہ جب کسی کو تم سے اظہارِ عقیدت کرتے دیکھتی ہوں تو فرطِ مسرت سے میرا دل بیخود ہو جاتا ہے۔ تمہارا وہ افسانہ میں نے اپنی کئی سہیلیوں کو دکھایا۔ سبھی نے اُسے پسند کیا۔

پچھلے دنوں کا ایک واقعہ تو میں تمہیں لکھنا بھول ہی گئی۔ ایکدن دل بہت ہی بے چین ہو رہا تھا۔ شام ہو چکی تھی میں نے تمہارا صحیفۂ محبت نکال کر پڑھا۔ پھر تمہارے عکسِ جمیل سے اپنے تشنہ کام لبوں کو تسکین دی اور اُسے دل کے قریب رکھ کر عالمِ خیال میں تم سے باتیں کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو گئیں۔ جلد ہی میں سو گئی اور خیال نے مجھے خواب کی دُنیا میں پہنچا دیا۔ دیکھا کہ ایک لق و دق صحرا ہے۔ سُنسان۔ ویران۔ حدِ نظر تک ریت ہی ریت۔ تپتی ہوئی جلتی ہوئی۔ آب و گیاہ کا نشان نہیں گرم ہوا کے تھپیڑے شعلوں کی طرح

بدن کو جھلسے دیتے ہیں۔ پیاس سے بُرا حال ہے۔ ہونٹ خشک۔ زبان خشک حلق خشک۔ جسم تھکن سے چور۔ قدم نہیں اُٹھتا۔ زمین پاؤں پکڑے لیتی ہے۔ تشنگی کے مارے جان نکلی جاتی ہے۔ کئی بار میں گر گر پڑی۔ پھر سنبھلی۔ پھر چلی۔ پھر گری۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میری زندگی کی آخری ساعتیں اب دُور نہیں۔ پھر ایکبار لڑکھڑا کر گری اور بیہوش ہوگئی۔

اس کے بعد جو آنکھ کھلی تو دیکھا کہ عالم ہی دوسرا ہے۔ ایک سبزہ زار ہے۔ ہر طرف ہریالی چھائی ہے۔ کہیں ہرے ہرے کھیت لہرا رہے ہیں۔ کہیں باغوں کا سلسلہ دُور تک چلا گیا ہے۔ ہری ہری گھنی اور شاداب گھاس نے زمین پر مخمل کا فرش بچھا دیا ہے۔ شام ہو رہی ہے۔ ابر گھرا ہوا ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ میں اب بھی پیاسی تھی۔ میں نے دیکھا کہ پاس ہی شفاف پانی کا ایک خوبصورت چشمہ بہہ رہا ہے۔ میں اُٹھی۔ پہلے ہاتھ دھو کر تھوڑا سا پانی پیا۔ ذرا دل ٹھہرا۔ تسکین ہوئی۔ اس کے بعد اچھی طرح منہ دھویا۔ پھر پاؤں دھوئے۔ ٹھنڈی ہوا سے رُوح تازہ ہوگئی۔ اتنے میں کہیں دور سے کئی سازوں کے ایک ساتھ بجنے کی آواز کان میں آئی۔ یہ صدائے نغمہ حد درجہ دلکش تھی۔ میں بے اختیار اُسی طرف کو چل نکلی۔ عجب پُرکیف سماں تھا۔ ہوا کا ہر جھونکا جسم میں ایک نئی روح پھونک دیتا تھا۔ میں چلتی چلی گئی۔

یہاں تک کہ ایک عالیشان قصر دکھائی دیا۔ اس کے باہر میدان میں بہت سے آدمی سفید وردیاں پہنے اسبز پگڑیاں باندھے بینڈ بجا رہے تھے مجھے دیکھتے ہی انہوں نے بینڈ بجانا موقوف کر دیا۔ اُن کا سردار آگے بڑھا۔ اُس نے بڑے ادب سے جُھک کر مجھے سلام کیا۔ اس کے بعد اپنے آدمیوں کی طرف ہاتھ سے ایک خاص اشارہ کیا۔ آن واحد میں نغموں کے شور سے فضا گونج اٹھی۔ میں حیران کھڑی دیکھ رہی تھی کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ اتنے میں سبز پوش خوبصورت لڑکیوں کا ایک غول نمودار ہوا۔ سب کے ہاتھوں میں چاندی کے تاروں سے بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی، نازک نازک، پھولوں کی ٹوکریاں تھیں۔ وہ سب مسکراتی ہوئی میری طرف بڑھیں اور مجھے اپنے حلقہ میں لے لیا۔ اور ہر طرف سے مجھ پر پھول برسانے شروع کر دئے۔ پھول برساتی جاتی تھیں اور ملکر گاتی جاتی تھیں۔ اور میرے گرد گھومتی جاتی تھیں۔ عجب پُرکیف سماں تھا۔

میرا دل خوشی سے بیخود ہوا جا رہا تھا۔ بے اختیار ہنسنے کو جی چاہتا تھا۔ اُن کے فردوسی نغموں نے میری رُوح کو غم سے یکسر آزاد کر دیا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم سب ایک دوسرے کو ہمیشہ سے جانتے ہیں۔

اُن میں سے ایک نوجوان، طرار، خوبرو لڑکی آگے بڑھی اور مجھ سے کہا۔ "بہت دیر کی آپ نے۔ اچھا اب جلد چلئے۔ انتظار ہو رہا ہے"۔ میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ مسکراتی ہوئی اُس کے ساتھ ہولی۔ باقی ارضی حوریں بھی پھولوں اور نغموں کی بارش کرتی ہوئی ہمارے ساتھ روانہ ہوئیں۔ اب سورج غروب ہو چکا تھا۔ محل کا دروازہ بجلی کے بیشمار قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تاروں بھرا آسمان زمین پر اُتر آیا ہے۔ ہم محل میں داخل ہوئی۔ اندر بھی روشنی کا خاص اہتمام تھا۔ مگر یہاں ہر چیز دھانی لباس پہنے ہوئے تھی۔ سبز رنگ کے بڑے بڑے گلوب ہر طرف آویزاں تھے۔ دروازوں پر سبز پردے پڑے ہوئے تھے۔ دیواروں پر ہلکا ہلکا سبز رنگ کیا ہوا تھا۔ سبز روشنی میں ہر چیز سبز نظر آتی تھی۔ ایک لمبی گیلری طے کر کے ہم ایک بڑے ہال میں پہنچے۔ اتنا بڑا ہال میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس کی آرائش میں تم سے کیا بیان کروں۔ بس دُلہن بنا ہوا تھا۔ یہاں بھی ہر چیز سبز تھی۔ دیواروں پر پھولوں اور پتوں سے رنگ برنگ کے بیل بوٹے اور گلدستے بنائے گئے تھے۔ اُن کے اندر چھوٹے چھوٹے سبز قمقمے عجب بہار دے رہے تھے۔

مگر ان قمقموں کے علاوہ اور کوئی بڑا گلوب اس ہال میں نظر نہیں آتا تھا۔ پھر بھی روشنی کا یہ عالم تھا کہ رات دن بنگئی تھی۔ ہر طرف سے نور کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ خصوصاً چھت میں سے نور کا ایک آبشار سا جاری تھا۔ میں ایک سرخوشی کے عالم میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ ہال کے ایک جانب ایک بہت بڑا اُونچا تخت بچھا تھا۔ اُس پر سبز مخمل کا فرش تھا۔ تخت پر ایک بہت ہی خوبصورت زرّین کرسی بچھی ہوئی تھی۔ اُس پر ایک نہایت ہی خوبرو بانکا جوان، سبز رنگ کا زرتار لباس پہنے، جواہرات اور موتیوں میں لدا ہوا، شاہانہ شان سے متمکن تھا۔ ایک چھوٹا سا تابناک زمردین تاج اُس کے سر پر دھرا تھا۔ بہت سی گوری گوری، خوبصورت لڑکیاں ایک ہی قطع کا سبز لباس پہنے تخت کے آس پاس مودب کھڑی تھیں۔ ہر ایک کی پیشانی پر ایک بڑا زمرد بجلی کی مہتابی روشنی میں عجب بہار دکھا رہا تھا۔

جوں ہی میں تخت کے سامنے پہنچی۔ اس جوان کا چہرہ خوشی سے شگفتہ ہوگیا۔ خدا جانے کیوں اُسے دیکھکر میرا دل زور زور سے دھڑکنے

لگا۔ وہ ایک نہایت ہی دلربایانہ انداز سے مسکرایا اور سب اُس کی تعظیم کو جھک گئے۔ میں بھی بے اختیار جُھک گئی۔ آن واحد میں پھر نغموں اور پھولوں کی بارش ہونے لگی۔

یکایک منظر بدلا۔ ہال ایک چھوٹے کمرے میں تبدیل ہوگیا۔ جہاں میرے اور اس جوانِ رعنا کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اُس نے بڑے ہی والہانہ انداز سے میری طرف دیکھا۔ میں کچھ شرما سی گئی اور میں نے آنکھیں نیچی کرلیں۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔ "رضیہ!" میں اپنا نام سُنکر اُچھل پڑی۔ اب جو غور سے دیکھتی ہوں تو وہ میری رُوح کا مالک، میرے خوابوں کا دیوتا۔ میری بیداریوں کی بہشت۔ میری تمنّاؤں کا مرکز، میرا محبوب۔ میرا پریتم ہے۔ آہ نہ پوچھو اُس وقت جو دل کی کیفیت تھی۔ میں تڑپ کر اُس کے آغوش میں پہنچ گئی۔ اُس نے زور سے مجھے بھینچ لیا۔ اور میرے تشنہ کام ہونٹ اب امرت کے چشموں سے سیراب ہو رہے تھے۔ اُسی عالم میں آنکھ کُھل گئی۔ تمہاری تصویر میرے سینہ پر تھی اور میں نے اُسے آغوش میں لے کر زور سے بھینچ لیا تھا۔

رنگین خواب تمام ہوگیا مگر ایک نہ مٹنے والا نقش میرے دل و دماغ پر چھوڑ گیا۔ تم چاہے اسے واہمہ سے تعبیر کرو مگر میں تو اسے ایک آسمانی بشارت سمجھتی ہوں۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ ہم ایکبار ضرور ملیں گے۔ اب ہمیں ناکامیوں اور مایوسیوں سے یکسر بے نیاز ہوکر سرگرمِ عمل ہونا چاہیئے۔ خدا ہماری مدد کریگا۔ مگر پہلے ہمیں اپنی مدد آپ کرنی چاہیئے۔ خدارا کوئی تدبیر سوچو۔ کوئی راہ نکالو۔ اور جلد مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں۔ خطروں میں پڑنے سے میں کبھی نہیں ڈری۔ نہ اب ڈرتی ہوں۔ مگر تمہارے ناموس کا پاس مجھے اپنی جان سے زیادہ ہے۔ میرے خط کا جواب جلد دینا۔ دیر کروگے تو میں تم سے خفا ہوجاؤنگی۔ پھر میں تمہیں خط بھی نہیں لکھونگی اور تم سے بولونگی بھی نہیں۔ میرے اچھے پریتم! خط جلد لکھنا اور خوب بڑا سا لکھنا۔ اچھا خدا حافظ، میری رُوح کے مالک۔

تمہاری اپنی
رضیہ

تمہارا دو سطری خط ملگیا تھا مگر افسوس میں مجبور تھی۔ شاید کبھی ممکن ہو۔

"ل، م" سے!

تجھکو تری نگاہ نے فرصتِ بندگی نہ دی
مجھکو ستم ظریف نے مُہلتِ زندگی نہ دی

یوں تو عطا کیا مجھے درد و الم فراق و غم
تو نے مگر بہ ایں ستم "زحمتِ بیخودی" نہ دی

میری حیات تیرہ تر ہوتی چلی گئی مگر
تو نے تو جگمگا کے بھی عشرتِ روشنی نہ دی

ہوش نہ مجھکو آسکا تیرے تصوّرات سے
تو نے مگر جمالِ دوست حسرتِ زندگی نہ دی

ہوگئی میری شاعری رنج و الم کی رازداں
بن گئی میری زندگی تیرے "کرم" کی داستاں

راحت سعید

نوٹ:۔ مطلع میں مُقیّد قوافی کے باوجود اور اشعار میں غیر مُقیّد قوافی دانستہ رکھے گئے ہیں۔

موت کا راز

چندرا کیسی ہے یہ تو میں آپکو ٹھیک بتا نہیں سکتا۔ خوبصورت اُسے سب کہتے ہیں اور اچھی بھی وہ سب کو لگتی ہے، مگر میں تو اس سے محبت کرتا تھا، کرتا کیا تھا، کرتا ہوں، یعنی میں اُس کی زلف پیچاں کا اسیر ہوں، اُس کی سیاہ آنکھوں کی اُداس گہرائیوں پر میں سب کچھ قربان کرسکتا ہوں، اُس کے لئے میں دوزخ کی آگ تک میں کودنے کو تیار تھا یعنی مجھے اُس سے دلی پیار تھا۔ ممکن ہے آپ کہنے لگیں کہ یہ محبت تو الف لیلوی قسم کی ہوئی، بہرحال مجھے تو چندرا کے سُرخ ہونٹوں سے محبت تھی اور مجسم چندرا سے!

جس دن میں نے چندرا کو دیکھا اُس روز نہ تو دُھند چھائی ہوئی تھی نہ بارش ہو رہی تھی، دھوپ بھی نہیں نکلی ہوئی تھی، ہاں ایک ہلکا سا ابر چھایا ہوا تھا، بالکل ہلکا سا، جیسے کسی نے نیلے سمندر پر ہلکی ہلکی برف جمادی ہو۔ تو یہ دن آپکو پسند نہ آیا؟ بس ایسے اچھے دن میں نے ایسی اچھی چندرا کو دیکھا تھا پھر مجھے اُس سے محبت ہوگئی تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔

پھر آہستہ آہستہ شام کا دُھندلکا کائنات پر چھاتا گیا اور فضا اُداس ہو چلی۔ میں سوچنے لگا، یونہی ذرا مجھے سوچنے کی عادت تھی، کہ قدرت رات کا استقبال اُداسی سے کیوں کرتی ہے؟ بس میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میں چونک پڑا، چونک کر میں نے دیکھا کہ چندرا اپنی گود میں پانی کا گھڑا لئے آہستہ آہستہ جارہی تھی، اُس کے چہرے پر معصومیت تھی اور اُس کی چال میں الھڑپن، الھڑ حسینہ! اور ویسے بھی تو وہ برہمن ذات کی تھی اور میں نے سوچا، اچھا جانے دیجئے میں تو سوچتا ہی رہتا ہوں کہاں تک آپکو بتاؤنگا کہ میں نے کیا سوچا۔

تو چندرا اُس وقت ایک الھڑ حسینہ معلوم ہوتی تھی اور اسکے چند دن بعد جب وہ ہمارے گھر آئی تو وہ شرما رہی تھی، ماں نے اس سے کہا۔ اری پگلی شرماتی ہے، ماں ویسے بہت ہی سادہ لوح عورت ہیں مجھ سے بولیں، بہت سیدھی لڑکی ہے بیٹا!

"ہُوں، اور بہت خوبصورت بھی" میں نے مُسکراتے ہوئے کہا اور اُس کے خوبصورت چہرے پر حیا کی ایک ہلکی سی سُرخی دوڑ گئی۔

ماں نے کہا "چندرا بچاری بہت سیدھی لڑکی ہے، کیوں چندرا؟"

"جی" اُس نے آہستہ سے کہا، جیسے وہ بہت سیدھی ہو، اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے نمو سحر کے دُھندلے سناٹے میں دُور کسی مندر کا گھنٹہ بج اُٹھے۔ چندرا! اور میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ چندرا خوب نام ہے اور تم ہو بھی بالکل چندرما سی...... اور پھر یونہی میں ہنس پڑا۔

اُس نے سر جُھکا لیا، اُس کی گھنی بوجھل پلکوں کے نیچے، مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے خوشیوں کے سینکڑوں چشمے پنہاں ہوں۔

"اور یہ بولتی بالکل نہیں ماں"

"شرماتی ہے" اُنھوں نے سادگی سے جواب دیا۔

شرماتی ہے، میں سوچنے لگا، یعنی وہ مجھے پسند کرتی ہے یا کم از کم نفرت نہیں کرتی۔ شرم و حیا، یہ ایسے جذبات ہیں جو صرف پسندیدہ آدمیوں پر ہی ظاہر ہوتے ہیں، جو لڑکیاں تم سے شرماتی ہیں وہ خود نجانے ہوئے بھی تم سے محبت کرتی ہیں یا کم از کم عزت ضرور کرتی ہیں۔ نفرت کا اظہار شرما کر نہیں کیا جاسکتا، اُسوقت اُس کے چہرے پر حقارت اور نفرت کی ایک گہری یا ہلکی سی لہر ہوگی، آنکھیں معمول سے چھوٹی ہوجائینگی، ممکن ہے پیشانی پر کچھ بل بھی ہوں۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ وہ تمہیں دیکھ کر شرما جائے......

چھت کی کڑیوں میں سے جہاں اُسکا گھونسلا تھا کوئی کبوتر نکل کر باہر چلا گیا، اُسی کے ساتھ میری نظر بھی کمرے کی محدود فضا سے باہر نکل گئی۔ نیم کے خزاں رسیدہ درخت کے پیچھے سورج غروب ہو رہا تھا۔ اُس کی ارغوانی کرنیں دُور کھیتوں کے پیچھے بہتی ہوئی ندی کے پانی پر ناچ رہی تھیں۔ دُور، زمین کے آخری کونے پر جہاں زمین آسمان سے بغلگیر ہو رہی تھی، آسمان لال ہوگیا تھا۔ کبوتر چلا جارہا تھا جیسے کسی نے سورج کو تاک کر ایک تیر چھوڑ دیا ہو یہاں تک کہ وہ ایک سیاہ دھبہ بن کر رہ گیا۔

"شام ہوگئی!" میں نے ایک لمبا سانس لیا۔

"اب میں جاؤں" وہ ماں سے بولی۔

"ابھی سے کیا کروگی جاکر" ماں نے نجانے کیوں کہہ دیا۔

"اندھیرا ہو جائیگا" وہ آہستہ سے بولی: آہستہ سے، اور ایک لمحہ کے لئے مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک گہرے اندھیرے میں ڈوبتا چلا جا رہا ہوں، پھر یکایک میں روشنی میں آگیا۔ میں نے پوچھا۔ "اندھیرے میں ڈر لگتا ہے تمہیں؟"

"ڈر؟ نہیں تو!" اُس نے پہلی بار میری بات کا جواب دیا۔ ماں بولیں "جا بیٹی، سیانی لڑکیاں رات میں نہیں پھرا کرتیں"۔

"بھوت چمٹ جاتے ہیں"! میں نے طنزاً مسکرا کر کہا۔

"ہاں، بھوت!" دبی زبان سے وہ چلتے چلتے بولی، اور پھر چلی گئی۔

چنچل، سیدھی، سُندر لڑکی۔ اچھی لگتی ہے نا؟

تو وہ سُندر لڑکی چلی گئی: چلی گئی، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیشہ کے لئے چلی گئی، نہیں اس کے بعد تو وہ کئی بار آئی اور ایکبار...... مگر ذرا ٹھہریئے، پہلے میں آپکو چندرا کے متعلق ایک بات بتا دوں، وہ جسنے مجھے چندرا کے بہت قریب کر دیا تھا، وہ بات جس نے چندرا کو میری نظروں میں ایک دیوی بنا دیا تھا۔ مگر وہ بات میں آپکو بتانا نہیں چاہتا، آخر میں آپکو کیوں بتاؤں، اب میں کسی لڑکی کو دیوی نہیں سمجھتا، اب میں کسی لڑکی کی پرستش کرنا نہیں چاہتا۔ ایک معمولی سی لڑکی کو دیوی سمجھ لینا کیا بیوقوفی نہیں ہے، پھر میں آپکو اپنی بیوقوفی کی وجہ کیوں بتاؤں...... تو ایکبار جب چندرا آئی تو اُس کے ہاتھ میں بہت سے پھول تھے۔ پھول، جن کے متعلق کسی شاعر نے کہا ہے... نجانے کیا کہا ہے، کچھ یاد نہیں آرہا...... شریک محفل شادی بھی ہیں اور.... اور..... اور نجانے کیا۔ مطلب یہ کہ پھول شادی اور غمی دونوں موقعوں پر یکساں طور سے ضروری اور موزوں ہیں۔ اور اس دن چندرا کے ہاتھ میں بہت سے پھول دیکھ کر نجانے میری کیا حالت ہوئی تھی، شاید غم کے جذبات ہوں، نہیں غم بالکل نہیں، خوشی بھی نہیں...... ایک عجیب سی آرزو، ایک عجیب سی خواہش، پھولوں کو نہیں، چندرا کے ہاتھوں کو چھونے کی، خوبصورت سپید ہاتھ! اور میں نے مُسکراتے ہوئے کہا تھا۔ کہاں سے توڑے یہ پھول؟" اُس نے بتایا تو تھا مگر مجھے یاد نہیں کہ وہ پھول اُس نے کہاں سے توڑے تھے۔ میں نے کہا۔ برباد کردی اِن کی زندگی!

اُس نے اپنا سر جھکا لیا۔ میں نے کہا، حیرت ہے مجھے یہ کہنے کی ہمت کیسے ہوئی" دیکھوں۔ اچھا لاؤ تمہارا ہاتھ دیکھوں، ہاتھ دیکھ کر میں سارے جنم کا حال بتا سکتا ہوں، سارے جنم کا!" اُس کے چہرے پر تعجب کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی، میں نے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اُس کے ہاتھ میں اسفنج کا سا گداز تھا!

کئی منٹ تک مصنوعی طور سے میں اُسکا ہاتھ دیکھتا رہا، آج مجھے اپنی جسارت پر تعجب ہوتا ہے، مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ میں ہی تھا۔ اور وہ بھولی لڑکی، وہ سمجھ رہی تھی کہ میں ایک ماسٹر ہوں، اُسکی نبض کی رفتار تیز تھی، ضرور اس نے اس مس کو محسوس کیا ہے، ورنہ اُس کی نبض کی رفتار میں فرق کیوں آگیا...... اِسی خیال نے مجھے ذرا دلیر بنا دیا۔

"شاید کوئی تم سے محبت کرتا ہے....." میں نے اپنی جھجک کو چھپانے کے لئے اُس کی ہتھیلی پر نظریں جماتے ہوئے کہا، اور دوسرے لمحہ جب میں نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ ذرا چونک پڑی، پھر شرما گئی، شرما گئی اور اچھی معلوم ہوئی۔

ممکن ہے آپ سمجھیں کہ اُس وقت میں نے اپنی محبت کا اظہار کر دیا ہو۔ مگر نہیں، یہ تو میں باوجود کوشش کے بھی نہ کرسکا، جلدی جلدی سانس لیتے ہوئے بس میں یہی کہہ سکا۔ چندرا... تمہاری آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں، چندرا اور تمہارے یہ سُرخ ہونٹ...

اُس کا ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا، ہاتھ چھڑانے کی کوشش کئے بغیر وہ بات کاٹ کر بولی۔ میں تم سے یہ تو نہیں پوچھ رہی۔

میں کچھ گھبرا گیا، گھبرا گیا، اس میں میرا کیا قصور ہے، محبت کے اظہار کا یہ میرے لئے پہلا ہی تو موقعہ تھا۔ پھر سوچا کہ شاید اس سے اچھا موقعہ زندگی میں پھر کبھی نہ آئے، اور جس وقت یہ چاہتا تھا کہ اس کے ہاتھ کو اپنے سینے پر رکھ کر کہہ دوں کہ چندرا میں تم سے پاگلوں کی طرح محبت کرتا ہوں۔ باہر آہستہ سے کوئی کھانس اُٹھا۔

میں آپ سے سچ کہتا ہوں، اُس لمحہ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میں ایک بڑا جُرم کرتے ہوئے دیکھ لیا گیا ہوں۔ اُسی وقت میں نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ آخر میں ایک ہندوستانی تھا، ہمارے یہاں نوجوان لڑکے اور لڑکی کی ایک جگہ موجودگی کو ہمیشہ خطرناک سمجھا گیا ہے۔ بات کا رُخ بدلتے ہوئے میں نے کہا۔ تو تم نے یہ پھول..... ہیں تو خوبصورت......

وہ خاموش رہی، میں اُٹھ کر باہر آیا، دیکھا کوئی بھی نہیں، صرف بُڈھا رنگی اپنی کوٹھری میں بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔ دوپہر کی خاموشیوں میں سب طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دور پیپل کے کسی درخت کی ٹھنڈی

چھاؤں میں فاختہ بول رہی تھی۔ کوکوکو، کوکوکو۔ وہی مبہم مسلسل کوکو جو بار بار کانوں میں ایک خوشگوار انداز سے گونجتی ہے، اور لوگوں کو تھپک تھپک کر سُلا دیتی ہے۔

پلٹ کر آکر جو دیکھا تو چندرا دوسرے دروازے سے جا چکی تھی۔

مگر میری محبت کی داستان ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ ابھی تو میرا افسانۂ دل شروع بھی نہیں ہوا ہے، ابھی تو بہت دیر تک میں آپکو اپنا دردِ دل سُنانا چاہتا ہوں۔ آپ اکتا نہ گئے ہوں، تو سُنیئے، پھر ہولی آئی، ہولی جاڑوں کا آخری سانس ہے، اِس کے بعد جاڑے ختم ہو جاتے ہیں اور گرمیاں شروع ہوتی ہیں، رنگ کھلتے ہیں، گلال اُڑائے جاتے ہیں، فضا رنگین قہقہوں سے معمور ہو جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ زندگی ایک قہقہہ ہی مسرت اور خوشی سے بھرپور، مگر پھر بھی بعض لوگوں کے لئے ایک غمگین سا قہقہہ، یا ایک بیمار کی حسرت آمیز مسکراہٹ جو لوگوں کو ہنستے دیکھ کر مُسکرا دیتا ہو۔ آخر زندگی میں غم کا وجود ہی کیوں ہے، قدرت کی غلطی، نہیں انسان کی بیوقوفی یا شاید دونوں ہی کا قصور!

تو ہولی آئی، میری آرزوؤں اور تمناؤں کی پہلی ہولی۔ نوجوانوں کے لئے کنواری لڑکیوں کے گداز گرم جسم اور نازک رخساروں کو چھُونے کا ایک غیر ممنوع موقعہ، جب نوجوانوں کے خوابیدہ جذبات میں ایک ہیجان سا پیدا ہو جاتا ہے، لڑکیوں کی دبی ہوئی جنسی خواہشات بیدار ہو جاتی ہیں۔ عورتوں کو بے مطلب اور بیہودہ گیت گا گا کر اپنے جنسی جذبات کی تسکین کا ایک اور موقعہ ملتا ہے، اور بیچارے بڈھے! وہ حسرت سے لوگوں کو ہنستا کھیلتا دیکھتے ہیں، اُس وقت اُن کی نظروں میں گذری ہوئی ہولیوں کی کتنی ہی تصویریں پھر جاتی ہیں۔ ہولی کھیلنے کے بعد وہ دھوپ میں کھڑے ہیں، اُن کے دماغ میں کتنی ہی سیتا، للیتا اور نازو کی تصویریں ہیں اور اُس نگارخانے میں وہ کچھ کھوسے گئے ہیں کہ اچانک کوئی اُن پر رنگ اُلٹ دیتا ہے اور وہ پلٹ کر دیکھتے ہیں، رجنی نے اُن کے اُوپر لوٹا لوٹ دیا ہے اور وہ مسکرا کر کہہ رہے ہیں۔ میں تو پہلے ہی بھیگا ہوا ہوں......

اُسی وقت باہر ہونے والے کسی غیر معمولی شور و غل سے اُنکا وہ خواب درہم برہم ہو جاتا اور وہ چلا کر کہتے۔ ارے کیوں دھرتی پھاڑے ڈالتے ہو، آدمی بنے رہو، اور لوگ جواب دیتے، کچھ نہیں بابا، کچھ نہیں، ہا ہا ہا!......

کنوئیں کے پاس والے بڑے حوض میں بہت سا رنگ گھولا گیا تھا، گاؤں کی ساری لڑکیاں، بہت سے لڑکے، بچے اور بڑے ہمارے گھر ہولی کھیلنے آئے تھے۔ سارے گھر میں ایک خوشگوار سا شور و غل مچ گیا تھا۔ برتنوں کی کھٹ پٹ، شیریں اور تلخ قہقہے، حسین اور بدصورت لڑکیوں کے جھنڈ کے جھنڈ، زندگی اور خوشی! ایک عجیب چہل پہل تھی۔ اور اس مجمع میں مَیں نے چندرا کو ڈھونڈھ لیا، گیلے کپڑے اُس کے جسم سے چپک گئے تھے اور چندرا کسی یونانی اصنام گر کا ایک شاہکار مجسمہ معلوم ہوتی تھی، خوبصورت اور دلکش! اُسکا سینہ۔ آہ، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسکے سینے میں دو فاختائیں چھُپی ہوں، دو فاختائیں جو سردی سے ٹھٹھر کر کانپ رہی ہوں۔

پھر ہولی کا وہ شور و غل کم ہوتا گیا، لوگ جا رہے تھے، وہ بھی جا رہی تھی، اُس کے قریب پہنچ کر میں نے کہا۔ ہم سے تو ہولی کھیلی نہیں۔

' میں تو تمہیں ڈھونڈھتی رہی، اُس نے جواب دیا، اور میں نے سوچا، وہ مجھے ڈھونڈھتی رہی، آخر مجھے ہی کیوں؟

مگر سوچنا تو ایک فضول سی بات ہے، خاصکر ایسے موقعہ پر جب کوئی تمہیں ڈھونڈھتا رہا ہو۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور ہنستے ہنستے اُس نے اپنی دونوں مٹھیوں کا گلال میرے چہرے پر بکھیر دیا، سُرخ اور گلابی گلال، سُرخ اور گلابی ہونٹ، نرم اور گداز جسم! میں نے اپنا بایاں ہاتھ اُسکی کمر کے گرد ڈال دیا۔ اور دائیں ہاتھ سے میں اس کے چہرے پر گلال ملنے لگا، اُس کے رخساروں کو میں نے خوب رگڑا، اُس کے پھُول سے نازک رخساروں کو میں نے مسل ڈالا۔

"اوہ......" اُس نے آہستہ سے کہا، اور نجانے میری جھجک کہاں غائب ہوگئی، نجانے اُس وقت میں نے کیا سوچا، آہستہ سے میں نے اُسے جواب دیا، چندرا میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ والہانہ محبت! اور بیچاری چندرا، اُسکا سر میرے شانوں پر ڈھلک گیا، اُس نے خود کو بالکل میرے بازوؤں میں چھوڑ دیا، اور میں، عورت کا بھوکا! میں نے اُسے اپنے بازوؤں میں ایک وحشی ریچھ کی طرح دبایا۔ یہاں تک کہ میں نے اُس کے سینے کی گداز دیواروں کے پیچھے اُس کے ننھے سے دل کو دھڑکتے محسوس کیا، اُس کے ننھے سے دل کو زور زور سے دھڑکتے ہوئے۔ اُس میں ایک لذّت تھی، ایک کیف تھا، ایک لطف

تھی۔

عشق و محبت سے ناآشنا کوئی صحرائی کوّا ہمارے سروں کے اُوپر سے کائیں کائیں کرتا ہوا گزر گیا۔ اور میں نے چندرا کو اپنی محبت کا یقین دلایا، لرزتے ہوئے الفاظ میں جو خود بخود میرے دل سے نکل رہے تھے، اور چندرا اُنہیں سُنتی رہی۔ جیسے وہ شام کے دُھندلکے میں اپنے آشیانوں کو لوٹتے ہوئے پرندوں کے سرمدی نغمے کو خود فراموشی کی حالت میں سُن رہی ہو۔ آخر چندرا بھی ایک عورت تھی، حسین عورت اور سب عورتوں کی طرح محبت کی بھوکی اور دلسوز عشق کی شائق!

بہت دیر تک ہم اُسی طرح کھڑے رہے۔ مغرب کی طرف لہلہاتے ہوئے چنے کے کھیت تھے، اُس کے پار ندی، ندی کے پار پھر کھیت اور اُس کے پار آسمان، سُرخ آسمان اور ڈوبتا ہوا سُورج۔ ہولی کا دن بھر کا گلال اُڑ کر اُفق پر جمع ہو گیا تھا، اُس نے سُورج تک کو سُرخ رنگ دیا تھا اور اس کی قرمزی روشنی سبز کھیتوں پر ایک عجیب انداز سے پڑ رہی تھی۔ پھر اچانک بہت سی گھنٹیوں کے ایک ساتھ بجنے کی مدھم آواز آنے لگی۔ آواز ہوا پر لہراتی ہوئی آ رہی تھی، ایک مسلسل گونج، موسیقی اور نغموں کی ایک لامتناہی لہر، جیسے سنسان چاندنی راتوں میں کوئی جلترنگ پر ایک شیریں راگ چھیڑ دے۔ ایک راگ جو دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے اور رُوح کو مست کر دے۔

کھیتوں کے بیچوں بیچ، پگڈنڈی پر مویشیوں کا ایک جھُنڈ جا رہا تھا۔ اُن کے گلوں میں پڑی ہوئی گھنٹیاں ایک عجیب انداز سے بج رہی تھیں۔ سب سے آگے بھینسیں تھیں، اُن کی چال مست تھی، اُنکے چہرے اُداس تھے، وہ چل رہی تھیں جیسے وہ اپنی زندگی کی اس بے پناہ یکسانیت کے لئے قدرت سے شاکی ہوں۔ اُن کے پیچھے گائیں تھیں اور اُن کے درمیان ایک سانڈ، ایک موٹا اور بدشکل سانڈ، آخر قدرت کو افزائشِ نسل کی بھی تو بہت ضرورت ہے۔

اور سب سے پیچھے گوالا تھا، اُس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی اور لبوں پر ایک گیت۔

امبوا کی ڈال میں کوئلیا بولے
پریتم گئے پردیس، کوئلیا بولے
پریتم، ہاں پریتم گئے پردیس

جس میں ہماری محبت کی غیر مختصر سی ابتدا تھی۔ نہ میں اُس دن چندرا سے اپنی محبت کا اظہار کرتا نہ چندرا اب مجھے چاندنی راتوں میں ندی کے کنارے اور دوپہر کے سناٹوں میں آموں کے باغ میں ملتی۔

اُن دنوں مجھے اپنے طرزِ معاشرت پر ہنسی آتی تھی، یونہی کہ کیا والدین لڑکے اور لڑکیوں کو ملنے سے روکنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، کیا اُنکی پابندیوں سے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے دلوں میں محبت جنم نہیں لیتی اور وہ اچھوتی اور کنواری اور بے داغ اپنے خاوندوں کی گود میں سر رکھدیتی ہیں۔ بس اِس فضول پابندی اور روک تھام پر ہی مجھے ہنسی آتی تھی کہ اُن تمام بندشوں کے باوجود بھی چندرا مجھ سے ملتی رہی۔

اُس دن بھی میں چندرا کی انتظار کرتا رہا تھا۔ دن ڈوب گیا مگر چندرا نہیں آئی، پھر رات کی رانی اپنے سیاہ آنچل کو ہوا میں اُڑاتی ہوئی، اپنے دونوں ہاتھوں سے تارے بکھیرتی ہوئی آئی مگر چندرا نہیں آئی۔ پھر چاند نکل آیا...... اور چاند کی سحر فشاں کرنوں کے جلو میں مَیں نے چندرا کو دُور سے آتے دیکھا، اور پھر بہت دیر تک ہم ندی کے کنارے کنارے گھومتے رہے۔ ندی دُور تک لہراتی، بل کھاتی چلی گئی تھی، چاند کی سحر طراز روشنی، شفاف اور چمکدار، کائنات پر برس رہی تھی اور چاند ندی کے پانی میں ہچکولے لے رہا تھا۔ ساری فضا میں ایک سناٹا تھا، ایک خواب کی سی خاموشی، ایک موت کا سا سکون، کبھی کبھی ہوا کا کوئی جھونکا درختوں کے درمیان سے نغمے گاتا ہوا گزر جاتا تھا۔ اُن دنوں چندرا کے دل میں ہر وقت ایک گھبراہٹ رہتی، اُسے راتوں کو نیند بھی نہ آتی تھی۔ اُس دن اُس نے پوچھا کہ اگر ہماری شادی نہ ہو سکی تو کیا ہوگا اور میں اُس کی اس بات سے چونک پڑا۔ میں نے سوچا اگر چندرا کی ماں نے اِس شادی سے انکار کر دیا تو پھر چاندنی راتوں میں ہم اس طرح نہیں مل سکیں گے۔ مگر اس کے برخلاف میں نے چاند کی چھنتی ہوئی روشنی میں چندرا کو دُلہن بنے ہوئے دیکھا۔ وہ شرمائی سی بیٹھی ہے، اُس کے ہاتھوں میں مہندی ہے، اُس کی مانگ میں سیندور ہے، اُس کی پلکیں بوجھل ہو کر جھُک گئی ہیں، آہستہ آہستہ میں اُس کے پاس تک پہنچ گیا ہوں پھر......

سامنے کے درخت پر دو پرندے پھڑپھڑا اُٹھے اور اُن کی آواز سے میں اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ سفید پرندے نے ایکبار درخت کا چکر کاٹا اور پھر پتوں میں گھُس گیا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" میں نے چندرا سے پوچھا۔

"کچھ نہیں، اُس دن کو سوچ رہی تھی جب ہم ایک ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرینگے۔"

اور آج چندرا کی شادی ہے۔

چندرا کی ماں نے شادی سے انکار کر دیا کیونکہ وہ برہمن تھے اور میں برہمن نہ تھا۔ انہوں نے کہا "غیر برادری میں شادی کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے، ساری برادری سر ہو جائے گی، نہ کہیں آنے کے، نہ کہیں جانے کے، نہ کوئی دُکھ میں آکر جھانکے نہ کوئی سُکھ میں شکل دکھائے۔ بیٹھے کو تے اُڑایا کرو، باز آئے ہم ایسی شادی سے۔"

اور چندرا کی ماں کی اجازت بغیر شادی ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ نہ انہوں نے اجازت دی نہ میں چندرا کو اپنا بنا سکا۔ آخر یہ دو زندگیوں کے برباد کرنے کا مقصد کیا، انسان میں یہ تفرقہ پیدا ہی کیوں ہوا جس نے محبت کی راہ میں پہاڑ اٹکا دیئے، جس نے انسانی زندگی کو ٹریجڈی بنا کر رکھ دیا۔ جس نے لاکھوں آدمیوں کی زندگی کی خوشی کو مسل دیا۔ جس نے کتنے ہی آدمیوں کو جنہوں نے ان غیر فطری قوانین سے باہر نکل جانا چاہا، سماج کی نظروں میں مجرم بنا کر رکھ دیا۔

اور آج چندرا کی شادی ہے!

اُس کے ہونیوالے خاوند کی عمر پینتیس سال ہے، وہ بمبئی کے کسی کارخانے میں کام کرتا ہے، صحت ذرا ویسی ہے، میرا مطلب ہے جیسی بمبئی کے کارخانوں میں کام کرنے والوں کی عموماً ہوتی ہے۔ پہلی بیوی مر چکی ہے، اُس کا ایک بچہ ہے، اور اسی لئے وہ "پانچسو نقد اور زیور کپڑا علیحدہ" پر راضی ہو گیا ہے۔ لوگ خوش ہیں، پینتیس برس کی عمر کچھ زیادہ نہیں، صحت اپنے ہاتھ کی بات ہے اور پھر شادی برادری میں ہوئی ہے۔

گلی میں جھنڈیاں لگی ہیں، ہری لال، پیلی، رنگ برنگی جھنڈیاں جو گلی کے موڑ سے شروع ہو کر چندرا کے دروازے تک چلی گئی ہیں۔ دروازہ خوب سجا ہے، بندھن وار بندھی ہے، اچھا شگون ہے، دروازے پر شہنائی بج رہی ہے، شہنائی کی آواز میں درد ہے، اس میں ایک سوز سا محسوس کرتا ہوں جیسے میرے دل کی آواز شہنائی سے نکل رہی ہو اور لوگوں سے چیخ چیخ کر کہہ رہی ہو کہ دیکھو میری اُمیدوں کو کچلا جا رہا ہے، میری حسرتوں کو مسلا جا رہا ہے۔

آنگن میں منڈپ بنایا گیا ہے، ویدی بنائی گئی ہے، یہاں میری، اور چندرا کی آرزوں کی قربانی دی جائیگی، یہاں ہمیشہ کے لئے کھینچ کر ہمیں خوشیوں سے علیحدہ کر دیا جائیگا۔ اور یہ ہون کنڈ ہے، یہاں میری اور چندرا کی تمناؤں کی چتا جلے گی، یہاں چندرا زبردستی اپنے بیمار خاوند کو سونپی جائے گی! منڈپ خوب سجا ہے، کیلے کے پتوں سے اُسکی چھت بنائی گئی ہے اور اس کے چاروں ستونوں کو سُرخ رنگ دیا ہے۔

اور آگے چلئے، یہ دالان ہے، اس میں مہمان ہیں، جن میں اکثر لڑکیاں ہیں، موٹی اور ادھیڑ عورتیں ہیں جن کے نو نو بچے زندہ ہیں، بُوڑھی عورتیں ہیں جن کے چہروں سے جوانی گوشت تک لے گئی ہے۔ ان میں بال ودھوائیں بھی ہیں جن کی شادی پانچ پانچ برس کی عمر میں ہوئی، جنہوں نے اپنے خاوندوں کے ساتھ صرف گڑیاں کھیلی ہیں۔ یہ سب خوشی خوشی ہماری زندگی پر ماتم کرنے آئے ہیں۔

ان میں ایسی لڑکیاں بھی ہیں جو سہاگ گائے جانے پر شرما جاتی ہیں، ان میں ایسی لڑکیاں بھی ہیں جو اس وقت خود کو دُلہن بنی ہوئی دیکھتی ہیں، اور یہ چندرا کی ماں ہے، اس نے آج برت رکھا ہے، آج یہ اپنی لڑکی کے ہاتھ پیلے کر دیگی، آج یہ اُسے پینتیس برس کے ایک بیمار آدمی کو سونپ دیگی جو بمبئی کے کارخانے میں بیس روپے کا ملازم ہے، اور وہ خوش ہے، شادی برادری ہی میں ہوئی ہے!

رات کے تین بجے پھیرے پڑیں گے، لڑکے لڑکی کے پلّے آپس میں باندھ دئے جائیں گے۔ پنڈت منتر پڑھیں گے اور وہ پنڈت کا طواف کریں گے۔ ہر پھیرے کے بعد میں چندرا سے دُور ہوتا جاؤنگا، ہر پھیرے کے بعد چندرا کا دل بیٹھتا جائے گا، اور پھر ساتواں پھیرا ہوگا، چندرا کی دوشیزگی ختم ہو جاتے گی، وہ ہمیشہ کے لئے ایک بیمار آدمی کے سر تھوپ دی جائے گی، کپڑے دھوؤ، کھانا بناؤ، برتن مانجھو اور سو جاؤ، یہی اُس کی زندگی کا معمول ہوگا! اور میں اپنے ٹوٹے ہوئے دل کو برہما کے مندر میں چڑھا دونگا، جس نے یہ حسین دُنیا بنائی ہے! اور اس حسین دُنیا کا وہ رحم دل خالق خوش ہو جائے گا، مجھے موکش ملے گی، مکتی ملے گی، دُنیا نہ ملی نہ سہی، خوشی نہ سہی!

بارات دروازے پر آگئی، نقارہ بجاتے ہوئے وہ چندرا کو لینے آپہنچے۔ میں نے دیکھا، دولھا کا چہرہ زرد ہے، اُس کے رُخساروں پر ہڈیاں اُبھری ہوئی ہیں، اُس کی آنکھوں میں بجھی ہوئی زندگی ہے، سہرے کے پھول خشک ہو گئے ہیں مُرجھا گئے ہیں۔

بارات دروازے پر رُک گئی، دولھا کے کوئی دُور کے چچا اُسوقت باپ بن گئے اور چچا ایسے شادی وغیرہ کے موقعوں پر باپ بن بھی جاتا ہے۔

دروازے کا چار ہونے لگا۔ دُنیا میں ذلیل اور کمینے آدمی بھی ہوتے ہیں، یہ اُن سب سے بڑھ کر ہیں، یہ طے شدہ رقم سے بھی زیادہ مانگتے ہیں۔ یہ بھوکے کتّے، یہ چاندی کے چند ٹکڑوں کے لئے دوسروں کی عزت کا خیال نہیں کرتے، یہ دوسروں کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں، اور وہ روپیہ لے کر ہی اندر قدم رکھیں گے، وہ جانتے

ہیں کہ لوگ ایک اندھے اپاہج بھکاری کو اپنے دروازے سے دُھتکار کر لوٹا سکتے ہیں مگر ایک بارات کو خواہ اُس میں تمام بھوکے کتّے ہی شامل ہوں واپس نہیں کر سکتے، اس میں بدنامی ہے، رسوائی ہے، لوگ کیا کہینگے!

اور وہ روپیہ لے کر ہی آگے بڑھیں گے۔ روپیہ دینا ہی پڑیگا، قرض لے کر دیں، یا مانگ کر دیں! بھیڑ میں سے کسی نے چچا کے کان میں جا کر کہا کہ لے لو، کیوں کسی کو بے عزّت کرتے ہو۔ اور جواب میں اُس نے گھُور کر دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ اندھے یہی تو موقعہ ہے۔

اُسی وقت سارا گھر چندرا چندرا کی آوازوں سے گونج اُٹھا۔

ساتھ والی لڑکیوں نے کہا، ذرا اُٹھ کر بارات دیکھنے گئیں تھیں، آکر دیکھا تو چندرا نہیں تھی۔ حیران ہوں چندرا کہاں گئی، بارات لوٹ گئی ہے۔

صبح نندو کے کنوئیں میں چندرا کی لاش پائی گئی، پنہاری کی لڑکی نے اُسے سب سے پہلے دیکھا۔ اُسکا جسم پھُولا ہوا تھا، اُس کے پاؤں میں مہاور تھا، اُس کی ناک میں نتھ تھی اور مانگ میں سیندور۔

آہ، چندرا! اپنی نامکمل آرزوں کو لے کر وہ چلی گئی اور اب میں اُسے کہیں نہیں پا سکتا۔

غیر ارادی طور پر میں نے کنوئیں میں جھانکا، اور میرے مُنہ سے نکل گیا —— چندرا!

اندر سے کوئی چیخ کر بولا —— چندرا —— آ —— آ!

چندرا! —— چندرا!!

مدھوسودن

کلامِ فرحت

اے گریۂ مسلسل! ہم یوں ہیں بیخبر سے
پانی گذر گیا ہے، کیا جانیں کتنا سر سے

مجبوریوں کی محفل، مایوسیوں کی حاصل
اپنی نظر کو دیکھا، میں نے تری نظر سے

بُلبُل چہک رہا ہے، گلشن مہک رہا ہے
ہر بات سے ہے ظاہر، گذری ہیں وہ اِدھر سے

مایوسیٔ محبّت، ہے داستاں پُرانی
برسیں گذر گئیں ہیں، اِک اِک نظر کو ترسے

کیفِ نگاہِ مست و چشمِ سیاہِ ساقی
ایسی شراب ہی خود، زاہد بھی جسکو ترسے

بیگانہ وار ہی تم، میری طرف بھی دیکھو
قائم ہے دلکی دھڑکن، نیرنگیٔ نظر سے

اِس سادگی کے صدقے، جو رازِ غم نہ سمجھے
اور حالِ دل کو پرکھے، اخبار کی خبر سے

میری خموشیاں ہیں، سچ پوچھیئے تو بہتر
تیری چُناں چُنیں سے، تیری اگر مگر سے

دُنیا نے خوب سمجھا، دُنیا نے خوب پرکھا
میری نظر کو دیکھا، جب آپکی نظر سے

اِک تیرِ نیمکش میں، اُلجھے ہیں سینکڑوں دل
وہ تنگ آگئے ہیں، سرمایۂ ظفر سے

کچھ خط میں لکھدیا ہے، کچھ دلمیں رکھ لیا ہے
چاہیں تو سب سمجھ لیں، اندازِ نامہ بر سے

اب منزلِ لحد میں فرحتؔ کو تم نہ چھیڑو
سویا ہوا ہے تھک کر، سرگرمیٔ سفر سے

رشتہ

گرمی کی ایک لمبی سنسان دوپہر تھی۔ فیضو اپنے مکان کے آگے سڑک کی دوسری جانب ریلوے کمپاؤنڈ کے سائے میں چارپائی پر ٹانگیں پھیلائے سستا رہا تھا۔ سامنے برآمدے میں اُس کی بیوی چرخہ کات رہی تھی۔ وہ خیالات کی گہرائیوں میں گم تھا۔ نیلے آسمان کی گہرائیوں میں اُڑتی ہوئی چیل کی طرح گم۔ وہ اپنی زندگی پر غور کر رہا تھا۔ غریب کی زندگی۔ پیٹ خالی ہونے پر دماغ بہت بھر جاتا ہے۔ طرح طرح کے خیالات سے۔ قریب ہی قصاب کی دُکان کے آگے ایک نوکر کسی بڑے آدمی کے خوبصورت کتّے کو تازہ کچا گوشت کھلا رہا تھا اور نزدیک ہی ایک بیمار بھوکا کُتّا للچائی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ بڑے آدمی کا خوبصورت کتّا۔ بیمار بھوکا کتّا۔ تازہ کچا گوشت بڑے آدمی۔ بھوکے غریب۔ زندگی۔ بڑا اُونچا فلسفہ تھا۔ فیضو کے دماغ میں کسی طرح نہ آتا تھا۔

اچانک وہ چونک پڑا۔ کوئی اُسے پکار رہا تھا۔

”فیضو بھیّا۔ ارے او فیضو بھیّا!“

فیضو نے چارپائی سے اُٹھ کر دیکھا۔ ایک دیہاتی کندھے پر کپڑوں کی گٹھری ہاتھ میں ایک موٹا سا لٹھ تھامے لمبے لمبے ڈگ بھرتا فیضو کی طرف آ رہا تھا۔

”ارے کون رحیمو!“ فیضو کے چہرے سے خوشی ٹپکی پڑ رہی تھی۔

”بستی سے آ رہا ہے بھیّا۔ راضی خوشی تو ہے۔ اور سب تو اچھے ہیں، بیٹھ جا بھیّا۔ یہاں بیٹھ۔“

ایک نامعلوم مسرت آگیں جذبہ میں جو کسی اپنے کو دیکھنے پر پیدا ہوتا ہے اُس نے ایک ہی سانس میں سب سوالات کر ڈالے۔

رحیمو نے کپڑوں کی گٹھری چارپائی پر رکھ دی۔ لٹھ کمپاؤنڈ کے سہارے کھڑا کر دیا۔ سامنے برآمدے میں فیضو کی بیوی چرخہ کاتنے میں مشغول تھی۔ رحیمو نے دیکھا۔ کچھ معنی خیز نظروں سے۔ اور رومال سے پیروں کی گرد جھاڑتے ہوئے کہا۔

”واہ بھیّا فیضو! شادی کب کی۔ ہمیں خبر تک نہ کی!“

فیضو نے شرما کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اور بیوی نے یہ لمبا گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ فیضو نے شرم مٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

وہاں بھیّا۔ تُو نے تو بتایا ہی نہیں بستی چھوڑ کر کیسے آنا ہوا۔ بستی کی کیا خبر ہے۔ کیا تجھے اپنی بستی سے نفرت ہوگئی ہے۔ رحیمو تو ابھی بچہ ہے۔ اپنی بستی ان بڑے شہروں سے اچھی ہے۔ اپنے لوگ یہاں کے اچھے اچھے کپڑے پہننے والوں سے اچھے ہیں۔ بھیّا۔ اب بھی جب کبھی میں اپنی بستی اور اپنے لوگوں کو یاد کر لیتا ہوں تو بہت دیر تک میں کچھ سوچنے لگ جاتا ہوں اور میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔“

”فیضو بھیّا“ رحیمو نے بات کاٹ کر کہا۔ ”تو اپنی بستی اپنے لوگ کہہ رہا ہے۔ اب اپنی بستی میں کیا دھرا ہے۔ جہاں پیٹ بھر جائے اپنی تو وہی بستی ٹھہری اب۔ تو اپنے لوگ اپنی بستی کہہ رہا ہے۔ یہ تیری بھول ہے۔ دُنیا میں اپنا کوئی نہیں۔ ایک کا رشتہ دوسرے سے کچا دھاگا ہے۔ سُنا بھیّا!“

”اور سنیو۔ پچھلی وبا میں میرے ماں باپ دونوں مر گئے۔ چاچا خدا بخش میت تک میں بھی شریک نہ ہو سکے۔ میرے پاس جو کچھ تھا سب کفن دفن فاتحہ زیارت میں خرچ ہو گیا۔ ابھی باپ کی لاش کا کفن بھی میلا نہ ہوا ہوگا کہ چاچا خدا بخش شہر سے دو تین سوٹ بوٹ پہنے ہوئے بابوؤں کو ساتھ لئے لوٹے۔ ایک دن ایک بابو نے مجھ سے کہا۔ ”قانون کی رُو سے ساری جائیداد تمہارے چچا خدا بخش کی ہے“ کچھ نہ پوچھو بھیّا، اس خیال کے ساتھ ہی میرے دل پر بجلی سی گری عجیب نرالا قانون ہے یہ بھیّا۔ حقداروں کے گلے پر ہی چھری پھیرتا ہے۔“

فیضو نے رحیمو پر اپنی شہریت کا رُعب ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

”ارے بھیّا۔ یہ قانون مایا کا کھیل ہے۔ جس کی جیب گرم ہو وہ قانون بیچ سکتا ہے۔ وہ قانون توڑ سکتا ہے مصیبت تو ہماری تمہاری ہے۔“

رحیمو پھر کہنے لگا۔

”چچا خدا بخش نے تیسرے ہی روز مجھے گھر سے بے دخل کر دیا۔ پنچ نے بھی اپنا یہ بڑا سر ہلا دیا۔ میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ لیکن کہیں سر پیٹ لینے سے پیٹ کی آگ بجھ سکتی ہے۔ چودھری نے شہر میں نوکری کرنے کو کہا۔ میں سمجھتا تھا جس طرح تلسی کے باغ کے آم چُرانا آسان ہے اُسی طرح شہر میں نوکری حاصل کرنا بھی آسان ہے لیکن آج چار روز سے نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں لیکن نوکری کا

کہیں پتہ نہیں۔ تمہاری ہی تلاش تھی بھیا۔ اچھا ہوا تم مل گئے"۔
فیقنو نے اپنی مہمان نوازطبیعت کا اس طرح مظاہرہ کیا۔
"ہاں ہاں بھیا۔ اب تو کہیں نہ جائیو۔ ارے تو کوئی غیر ہے۔ میرا گھر تیرا گھر ہے۔ یہیں رہیو"۔

دن گزرتے گئے۔
ایک دن شام کو فیقنو کارخانے سے خوش خوش گھر کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔ اُس کی میلی چکٹ کالی نکر کی جیب میں آج ساڑھے آٹھ آنے تھے ایک دم ساڑھے آٹھ آنے۔ آج وہ بہت خوش تھا وہ سوچ رہا تھا کہ رحیمو کے آگے اب کیسی ڈینگیں مارے۔ اپنی بیوی پر اپنے تمول کا کیسے رعب ڈالے۔ اسی قسم کے کئی خوش آیند خیالات اس کے دماغ میں بے پناہ تیزی سے گھسے جا رہے تھے۔ لیکن جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوا اُسے ایسا معلوم ہوا وہ کسی آسیب زدہ ویران مکان میں گھس آیا ہے۔ مکان میں قبرستان کی سی خاموشی تھی۔ موت کا سا سناٹا۔ اُس کی بیوی اور رحیمو کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اُس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے سامنے دیوار پر دیکھا۔ ایک مکڑی ایک مکھی کو پکڑے اپنے جالے میں گھس رہی تھی۔

اب فیقنو کی دُنیا ہی بدل گئی تھی۔ اُس کی زندگی میں نئی تبدیلی تھی۔ اُسے زندگی میں بربادیاں ہی بربادیاں نظر آ رہی تھیں۔ زندگی کی کانٹوں بھری سیج پر کانٹوں کی خلش سے وہ تڑپ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے وجود سے زندگی اور موت کا بخیہ کر دے لیکن قدرت اسے زندگی کا ایک اہم مہرہ سمجھ کر موت کی گھات سے بچا رہی تھی۔
ایک دن تڑکے ہی وہ اپنے مکان کے آگے چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک میلا گندہ شخص اس کے سر کی چمپی کر رہا تھا۔ چمپی کرنے والے نے اس کے سر پر چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔
"چاچا۔ کچھ سُنا تم نے۔ جرمن کی جنگ پھر ہو گئی ہے بھرتی ہو رہی ہے۔ بھرتی"۔
"کیا کہا۔ بھرتی ہو رہی ہے"۔ فیقنو نے چونک کر پوچھا اور پھر گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔
تھوڑی دیر بعد چمپی کرنے والے نے دُور سے جمعدار کو آتے دیکھا اور کہا۔
"چاچا۔ جمعدار آ رہا ہے۔ اب میں چلا"۔
چمپی کرنے والا تیل کی رنگین شیشیاں لئے دوڑا چلا جا رہا تھا۔ جمعدار اپنی گل مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا آگے بڑھا۔ اُسکی نظریں فیقنو کے مضبوط اور گٹھے ہوئے جسم پر پھسل رہی تھیں۔ قبل اس کے کہ جمعدار پہلے کوئی گالی اور بعد میں کوئی کام کی بات کہے فیقنو نے آگے بڑھکر کہا۔
"حجور سُنا ہے جرمن کی جنگ پھر ہو رہی ہے۔ میں بھی بھرتی ہونا چاہتا ہوں۔ میرا بھی نام لکھ دیا"۔
جمعدار نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور ایک بڑے رجسٹر میں فیقنو کا نام لکھ دیا اور فیقنو نے اپنے نام کے آگے سیاہی میں بھیگا انگوٹھا لگا دیا۔

لندن کی آئینہ جیسی شفاف سڑک پر فیقنو اور اُسکے ہندوستانی ساتھی جو بھرتی ہو کر آئے تھے فوجی جرنیلوں کی طرح اکڑتے پھر رہے تھے۔ فیقنو ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے کسی نے اُسے دوزخ سے نکال کر جنت میں پہنچا دیا ہے۔ عجیب رنگین دُنیا دیکھ رہا تھا وہ۔ حسین حسین عورتیں رنگ برنگ کے لباسوں میں۔ گورے گورے مرد کالے کالے سوٹوں میں۔ رنگ برنگ کی تیتریاں کالے کالے بھونرے۔ لیکن اِس خوش باش دُنیا میں پہنچ جانے کے بعد بھی وہ ہندوستان کو نہ بھول سکا۔ وہ ایک اجنبیت محسوس کر رہا تھا۔ اس پُرتصنع اور بناوٹی زندگی کو دیکھکر اسے ہندوستان کی سادہ اور فطری زندگی یاد آ رہی تھی۔ اچانک اُس کی نظر سامنے سے آتے ہوئے ایک خوش باش جوڑے پر پڑی۔ مرد ایک کالے سوٹ میں ملبوس تھا اور اُس کے سوٹ کا رنگ چہرے کے رنگ سے بڑا اچھا مقابلہ کر رہا تھا۔ اُس کا ایک ہاتھ ایک گوری میم کی پتلی کمر کے اطراف نصف دائرہ بنا رہا تھا۔ فیقنو نے اپنے دیس کی وضع قطع کا پہلا آدمی یہاں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اُس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا۔
"یہ بابو اپنے دیس کا معلوم ہوتا ہے"۔
اُس کے ساتھی نے اسے مذاق میں ٹال دیا لیکن فیقنو نے ایسا محسوس کیا گویا وہ شخص ایک بڑا مقناطیس ہے جو بڑی قوت سے اُسے اپنی جانب کھینچ رہا ہے۔ اُس کے دل میں ایک نامعلوم جذبہ مچل رہا تھا۔ اُس کا دل اُسکی جانب کھنچا جا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ دوڑ کر اُس کے قریب جائے اور اُس سے پوچھے کہ

اُس کے دیکھنے پر اس کے دل کا یہ حال کیوں ہو رہا ہے۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ ضرور اس کے دیس کا رہنے والا ہے۔ اس لئے آہستہ آہستہ قریب جاکر اُسے سلام کیا اور کہا۔

"بابو۔ کیا تم ہندوستانی ہو۔ میں بھی ہندوستانی ہوں جنگ کے لئے بھرتی ہو کر آیا ہوں۔ مجھے اپنے دیس سے دور آج اپنے دیس کے آدمی کو دیکھ کر کتنی خوشی ہوتی ہے۔ میں ———"

"بکومت ——— خاموش رہو" اس کالے سوٹ والے بابو نے اُسے جھڑک کر کہا۔ گوری میم فیضو کو اس کے خاکی لباس کو غور سے دیکھ رہی تھی "کہہ رہا ہے کیا تم ہندوستانی ہو۔ ہاں ہندوستانی ہوں مگر کیا تمہارے پیر پر سر رکھ دوں۔ ڈیمٹ بھاگ جاؤ یہاں سے"

فیضو جھینپ گیا۔ میم ہنس پڑی۔ ایک عورت کے سامنے اس کی ہتک۔ اُس کے ساتھیوں کے سامنے یہ بے عزتی۔ مگر فیضو نے جھینپ مٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا

"بابو ——— مجھے معاف کر دو۔ میں ———"

"شٹ اپ یو فول"

دونوں قہقہے لگاتے ہوئے چلے گئے۔ اس کے ساتھی اُس کا مذاق اُڑانے لگے مگر وہ سوچ رہا تھا کہ پردیس میں اپنے دیس والے کو دیکھ کر جو خیالات اور جذبات فیضو کے دل میں پیدا ہوئے وہ کیوں اس کالے سوٹ والے بابو کے دل میں پیدا نہیں ہوئے۔ اس نے فیضو کو اپنا کیوں نہیں سمجھا۔ فیضو "اپنے" فلسفے پر غور کرنے لگا۔

صبح ہو رہی تھی۔ دھوئیں کے بادلوں کو چیرتی ہوئی سورج کی نظر نے دیکھا کہ زمین پر بڑی تباہی مچی ہوئی ہے۔ خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ لاشوں کے ڈھیر کے ڈھیر روندے جا رہے ہیں۔ زخمی اپنی کراہ سے فضا میں درد ملا رہے ہیں۔ فیضو بھی ایک ریت کے ٹیلے کے پیچھے منہ کے بل لیٹا یہ بھیانک منظر دیکھ رہا تھا۔ اچانک دشمن کا ایک سپاہی بُری طرح چوٹ کھا کر اُس کے قریب گرا۔ فیضو نے اپنی بندوق اُٹھائی اور قریب تھا کہ وہ بندوق کا لبلبہ دبا دیتا مگر اُس نے ایسا محسوس کیا کہ کوئی اُس کے کان میں چیخ رہا ہے۔

"کیا کرتا ہے فیضو ——— ارے ——— دیکھتا نہیں یہ تیرا بھائی ہے۔ انسان ——— ایک باپ کی اولاد۔ رشتہ خون کا رشتہ۔"

فیضو کی بندوق ایک دم جُھک گئی۔

دشمن کے سپاہی نے فیضو کی جھکی ہوئی بندوق کو دیکھا اور اپنی بندوق اُٹھائی اور دھڑ سے چلا دی۔ فیضو نے ایک بڑی خوفناک چیخ ماری اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا کہ:-

گرمی کی ایک لمبی سنسان دوپہر ہے۔ وہ اپنے مکان کے آگے ریلوے کمپاونڈ کے سائے میں چارپائی پر ٹانگیں پھیلائے سُستا رہا ہے۔ اُس کی بیوی برآمدے میں چرخہ کات رہی ہے۔ اس کی بستی کا رہنے والا رحیمو چارپائی پر بیٹھا اُس کی بیوی کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ کر کہہ رہا ہے۔

"یہ تیری بھول ہے فیضو بھیّا۔ اپنا اِس دُنیا میں کوئی نہیں۔ ایک انسان کا رشتہ دوسرے سے گویا کچا دھاگا ہے!"

ابراہیم جلیس!

انتشار

("ل،م" کے نام!)

کبھی یہ وہم کہ مجھ سے تمہیں محبّت ہے
کبھی یقین کہ تم پر یونہی یہ تہمت ہے
کبھی فریب دو عالم تمہاری نظروں میں
کبھی فریبِ تبسّم بھی اک قیامت ہے

کبھی تمہارا کرم بھی رہینِ رسم و رواج
کبھی "خلوص" میں بھی جلوہ گر شرارت ہے
کبھی تمہاری محبّت بھی صرف پاسِ زباں
کبھی تغافلِ بیجا بھی اک محبّت ہے

کبھی تمہارا تصوّر عذابِ روح و نظر
کبھی ہر آفتِ تازہ میں میری جنّت ہے
کبھی یہ ناز کہ تم پر ہے اختیار مجھے
یہی گمان کبھی باعثِ مصیبت ہے

تمہیں سمجھ نہ سکا باوجودِ کوشش کے
خدا کیواسطے کہدو کہ کیا حقیقت ہے؟
اگر فریب ہی سب کچھ تو کیوں ستاتی ہو؟
یہ کس لئے مجھے رہ رہ کے یاد آتی ہو؟

راحت سعید،

ہوجاتا، بمقابلہ اس کے کہ سمندر میں پیراکی کرے۔ قسمت کے مواقع جب ملیں اُس وقت تو حاصل کر لینا کم از کم سہل ہے۔ کیونکہ کوئی تحفہ اتنا حقیر نہیں ہے جو ایک موعودہ بڑے تحفہ سے بہتر نہ ہو۔

جہاں تک مستقبل کا تعلق ہے اس کے لئے چارۂ کار سوچنا چاہیئے۔ اور حال کو نوعیت کے مطابق چلانا چاہیئے۔

بُرائی کے مقابلے میں اچھائی کی خواہش کرنا جب کہ وہ بھی ساتھ ساتھ ہی واقع ہو ایک قدرتی امر ہے اور اگر کوئی شخص اس کے خلاف چلتا ہے تو وہ فطری استدلال کے بجائے اپنی حماقت کا اتباع کرتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مصائب کے بعد آسائش زیادہ خوشگوار اور زیادہ معروف ہوتی ہے مگر اسکے یہ معنی نہیں کہ اول الذکر کو آخر الذکر پر ترجیح دی جائے۔

داناؤں اور احمقوں دونوں کے لئے ممکن ہے کہ اپنی اپنی پسند کے مطابق داناؤں یا احمقوں ہی کی بات مانیں مگر چونکہ حقیقت بدلتی نہیں اس لئے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس شخص کو جسے ان دونوں میں انتخاب کرنا ہے حسین اور جوان عورت کو کریہہ اور بُوڑھی کے مقابلہ میں ترجیح دینی چاہیئے۔

مترجمہ۔ **محمد مختار زمن**

اے دوست!

گر حُسنِ بصارت سے تہی ہے ترا داماں
اور دیکھ نہیں سکتا مری رُوحِ درخشاں
جو نورِ سحرگاہی کی مانند ہے تاباں
تو ہمدم و ہمراز مرا ہو نہیں سکتا

وہ میری تخیّل کی فلک بوس چٹانیں
کرتی ہیں اشارے جنہیں خاموش ہوائیں
ہمدوش نہیں انکی اگر تیری نگاہیں
تو ہمدم و ہمراز مرا ہو نہیں سکتا

مُٹھی میں مری قید ہے قسمت کی بلکہ
تدبیر ہے یعنی مری تقدیر کا لکھا
گر یہ بھی فراست سے تری بالا ہے نکتہ
تو ہمدم و ہمراز مرا ہو نہیں سکتا

(ہرندرا ناتھ) ...... مترجمہ ...... **عبد الجلیل دہلوی**

جو کچھ کہ دیکھا

(بسلسلۂ صفحہ ۳۴)

جس میں سے قبرستان کا کچھ حصہ نظر آتا تھا اور جسے میں اکثر بند رکھا کرتی تھی۔

اُس نے دریچہ کھول دیا اور اُس میں چڑھ گئی اور پھر باہر کو دوڑی۔ میری ششدر نظروں نے چاندنی کے افسوں میں دیکھا کہ وہ اپنی سفید چادر سمیت قبروں پر ہوا میں کسی عظیم خفاش کی طرح تیر رہی ہے۔ دفعتاً اُس نے چادر اپنے چہرے سے ہٹا دی جس نے اس کا چہرہ دیکھا تو ایک ذرا دیر کے لئے مجھے احساس ہوا کہ میری ٹانگیں کانپ رہی ہیں اور میرا بوجھ اُٹھانے سے جواب دے رہی ہیں! بستر مرگ پر پڑی ہوئی زیدہ تھی! اور قبروں پر سفید چادر میں لپٹی ہوئی چیل کی طرح گھوم رہی تھی۔

(۵)

• رات کے ساڑھے بارہ بجے زنداش مجھے اُٹھا رہی تھی۔ "خاتون روحی۔ خاتون روحی! اُٹھیئے۔ سنوٹوریم سے ٹیلیفون آگیا!"

حجاب امتیاز علی؛

Rs 10000/-
دس ہزار روپیہ کی گھڑیاں مفت
ہماری کمپنی نے اپنی تین چمتکاری فائدہ دوائیوں کی مشہوری کے لئے ہر شیشی کے ہر خریدار کو ایک عدد فینسی رسٹ واچ مفت دینے کا فیصلہ کیا ہے جلدی کریں اور فائدہ حاصل کریں۔
بال عمر بھر نہیں اگتے
ہماری مشہور دوائی اصلی اکسیر حسن رجسٹرڈ کے استعمال سے ہر جگہ کے بال بغیر کسی تکلیف کے ہمیشہ کے لئے دور ہو جاتے ہیں اور پھر زندگی بھر دوبارہ اس جگہ کبھی پیدا نہیں ہوتے جگہ ریشم کی طرح نرم ملائم اور خوبصورت نکل آتی ہے۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ پندرہ آنہ (عہ) محصولڈاک علاوہ تین شیشی کی رعایتی قیمت صرف پانچ روپے (صہ) اس دوائی کو مشہور کرنے کے لئے ہر شیشی کے ہمراہ ایک عدد فینسی رسٹ واچ مفت بھیجی جاتی ہے یہ گھڑی نہایت خوبصورت اور مضبوط ہے مضبوطی اور خوبصورتی کی گارنٹی دس سال ہے گارنٹی کا اقرار نامہ ہر گھڑی کے ہمراہ بھیجا جاتا ہے۔
ضروری نوٹ:۔ مال ناپسند ہونے پر قیمت فوراً واپس کردی جائیگی۔ تین شیشی دوائی کے خریدار کو محصول ڈاک معاف اور تین عدد گھڑیاں بالکل مفت انعام۔
بال کالا تیل
اس بال کالا تیل کے استعمال سے بال ہمیشہ کے لئے سیاہ ہو جاتے ہیں اور پھر تمام عمر کالے ہی پیدا ہوتے ہیں بینظیر سنیاسی تحفہ ہے فائدہ نہ ہونے پر قیمت واپس ہوگی قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ پندرہ آنہ محصولڈاک علاوہ تین شیشی کی رعایتی قیمت صرف پانچ روپے (صہ) اس دوائی کو مشہور کرنے کے لئے ہر شیشی کے ہمراہ ایک فینسی رسٹ واچ مفت بھیجی جاتی ہے یہ گھڑی نہایت خوبصورت ہے مضبوطی اور خوبصورتی کی گارنٹی دس سال ہے۔ گارنٹی کا اقرار نامہ ہمراہ بھیجا جاتا ہے۔ ضروری نوٹ:۔ مال ناپسند ہونے پر قیمت فوراً واپس کردی جائیگی۔ تین شیشی کے خریدار کو محصولڈاک اور تین عدد گھڑیاں بالکل مفت انعام۔
کالے گورے ہو گئے
اگر آپ اپنے چہرہ یا جسم کا رنگ کالے سے گورا کرنا چاہتے ہیں یا اپنے مرجھائے ہوئے چہرے پر بدنما کالے داغ، کیل، پھنسیاں، چیچک کے داغ اور چھائیاں دور کرنے کی خواہش رکھتے ہیں تو ہمارا سائنس سے تیار کردہ لنڈن بیوٹی لوشن رجسٹرڈ استعمال کریں جس سے آپ کے جسم یا چہرہ کا رنگ شرطیہ طور پر کالے سے گورا ہو جائے گا۔ قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ پندرہ آنے (عہ) محصولڈاک علاوہ۔ تین شیشی کی رعایتی قیمت صرف پانچ روپے اس دوائی کو مشہور کرنے کے لئے ہر شیشی کے ہمراہ ایک عدد فینسی رسٹ واچ مفت بھیجی جاتی ہے یہ گھڑی نہایت خوبصورت اور مضبوط ہے مضبوطی اور خوبصورتی کی گارنٹی دس سال ہے۔ گارنٹی کا اقرار نامہ ہر گھڑی کے ہمراہ بھیجا جاتا ہے۔
ضروری نوٹ:۔ مال ناپسند ہونے پر قیمت فوراً واپس کردی جائے گی۔ تین شیشی دوائی کے خریدار کو محصول ڈاک معاف اور تین عدد گھڑیاں بالکل مفت انعام!!!
ملنے کا پتہ:۔ اصلی سنیاسی دواخانہ پوسٹ بکس ۱۲ امرتسر

چندہ سالانہ پانچ روپے
ششماہی تین روپے
مع محصول ڈاک فی پرچہ ۶/
ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ

جرعات

ہر سال ساقی کے دو خاص
نمبر شائع ہوتے ہیں مستقل
خریداروں سے انکی قیمت
الگ نہیں لی جاتی۔

جلد ۲۳ | ساقی دہلی۔ بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۴۱ء | نمبر ۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

ساقی کی زیرِ نظر اشاعت میں بعض مضامین بہت قابلِ قدر ہیں۔ محمد مرزا صاحب ایک کہنہ مشق جرنلسٹ ہیں۔ جنگ کے متعلق آپ کا مختصر مضمون ہماری معلومات میں بہت کچھ اضافہ کرتا ہے۔ دیوندر ستیارتھی اپنا ایک خاص اسلوبِ بیان رکھتے ہیں۔ جسے اگر ہم چاہیں تو سادہ پرکار کہہ سکتے ہیں۔ ساقی کے لئے آپ نے کئی افسانے لکھے ہیں جو آئندہ اشاعتوں میں شامل ہوتے رہیں گے۔ منٹو صاحب ساقی کے ابتدائی دَور سے اسکے قلمی معاون ہیں اور اپنی بہترین ادبی کاوشوں سے ساقی کو آراستہ کرتے ہیں۔ ساقی کے " افسانہ نمبر" کے لئے آپ بطورِ خاص ایک افسانہ لکھ رہے ہیں۔ جو مرزا غالب کی زندگی سے متعلق ہے۔ اُمید ہے کہ یہ افسانہ اس سال کے بہترین افسانوں میں شمار ہوگا۔ مختار انور نے پنجاب کے دیہاتی گیت کے زیرِ عنوان ایک نیا سلسلۂ مضامین شروع کیا ہے۔ اس کی پہلی کڑی " مرزا صاحبان " ہے۔ وجاہت سندیلوی کے افسانوں میں ترقی پسند عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ اس پرچے میں اُن کا ایک دلکش افسانہ شریک ہے۔ بھارت چند کھنہ کے مضامین میں ظرافت کی چاشنی بڑا لطف دیتی ہے۔ جب تک آپ ان کا مضمون پڑھتے رہیں گے دل میں ایک ہلکی سی گدگدی سی محسوس کرتے رہیں گے۔ رفیق اجمیری مرحوم کا اسکیچ قیسی رامپوری نے لکھ کر دل کا زخم ہرا کر دیا۔ قیسی صاحب کی کوششوں سے مرحوم کے مضامین کا مجموعہ شائع ہوگیا۔ ادب کی یہ ایک بڑی خدمت ہے جو قیسی صاحب کے ہاتھوں انجام پائی۔ نئے لکھنے والوں میں آنور کے نام کا اور اضافہ ہوا ہے۔ ان کا افسانہ اس اشاعت میں شریک ہے۔

ساقی کا " افسانہ نمبر" حسبِ دستور جولائی کے پہلے ہفتے میں شائع ہوگا۔ اس خاص نمبر میں صرف افسانے اور افسانوی نظمیں شریک ہوں گی۔ مفصل اعلان اسی اشاعت میں کسی اور صفحے پر ملاحظہ فرمایئے۔ بیشتر مضامین فراہم کئے جا چکے ہیں۔ اُمید ہے کہ ۱۵ مئی تک بقیہ مضامین بھی آجائیں گے۔

ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد دکن اُردو کی بیش بہا خدمت انجام دے رہا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اس ادارے کے روحِ رواں ہیں۔ حیدرآباد کے نوجوانوں میں ادبی ذوق پیدا کرنے میں ڈاکٹر زور سب سے پیش پیش ہیں۔ ادارہ ایک ماہوار رسالہ " سب رس " کے نام سے شائع کرتا ہے اور اب تک سو کے قریب چھوٹی بڑی کتابیں شائع کرچکا ہے۔ اب ایک بہت بڑا کام ادارے کے پیشِ نظر ہے۔ اُردو انسائیکلوپیڈیا کئی جلدوں میں شائع کرنے کا کام شروع ہوچکا ہے۔ مُلک کے مشہور ماہرینِ فن اور باکمال اساتذہ کی مُستقل خدمات حاصل کی جاچکی ہیں۔ سید بادشاہ حسین صاحب جو اس شعبہ کے معتمد ہیں ہمیں اطلاع دیتے ہیں کہ اگر انسائیکلوپیڈیا کے سلسلے میں کوئی صاحب اپنی مفید خدمات پیش کرنا چاہتے ہوں تو بذریعہ خط و کتابت شرائطِ تعاون طے کرسکتے ہیں۔ اُمید ہے کہ اُردو کے بہی خواہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد کو اس ارادے کی تکمیل میں بیش از بیش امداد دیں گے۔

"شاھد"

ضروری اعلان۔ جو مسودے ساقی کے لئے موصول ہوتے ہیں اُنہیں حفاظت سے رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاہم اس بارے میں دفترِ ساقی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا۔ اس لئے اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھا کیجئے۔

جو مضامین قابلِ اشاعت قرار پائیں گے صرف ان ہی کے بارے میں مزید مراسلت کی جائیگی۔ مضامین ایڈیٹر ساقی کے نام بھیجنے چاہئیں۔

ساقی ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو بھیجدیا جاتا ہے۔ پرچہ نہ پہونچنے کی شکایت ۱۵ تاریخ تک کرنی چاہیئے۔ اس کے بعد دوبارہ پرچہ نہیں بھیجا جائے گا۔ خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے ورنہ تعمیلِ ارشاد ممکن نہ ہوگی۔ جواب طلب اُمور کے لئے محصول ڈاک بھیجنا ضروری ہے۔

نمونے کا پرچہ مفت نہیں بھیجا جائیگا چھ آنے کے ٹکٹ بھیجکر نمونہ منگایا جاسکتا ہے۔

نیل کی ناگن

ساتواں باب

ہرماکس کا بیدار ہونا۔ ہرماکس کے سر پر ارض شمال و جنوب کا تاج رکھا جانا۔ رسم تاجپوشی۔ ہرماکس فرعون کے سامنے جو نذریں پیش ہوئیں۔

ایک بار پھر میں جاگا۔ اور دیکھا کہ دیوی آئی سیس کے مقدس حجرے میں جو ابوتیس کے ہیکل میں تھا، میں سنگین فرش کے ایک پتھر پر بیٹھا ہوں، اور میرے قریب ہی وہ بڈھا جو باطنیات کا کاہن تھا، ہاتھ میں چراغ لئے کھڑا ہے اور میرے چہرے پر جھکا میری صورت غور سے دیکھ رہا ہے۔ اور کہتا ہے:۔

"دن یہ ہے اور دن بھی وہ جس میں تو نے نئی زندگی پائی ہے۔ شکر ہے ہرماکس کہ تجھے اپنی زندگی میں یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔ شکر ہے ہزار شکر ہے۔ اے شاہوں کی یادگار کھڑا ہو۔ نہیں۔ تجھ پر جو کچھ گذری ہے اسکے کہنے کی ضرورت نہیں۔ اے مادرِ مقدس کے محبوب کھڑا ہو جا۔ تو تو آزمائش کی آگ سے نکل چکا ہے۔ جس نے معدوم کر لیا ہے کہ تاریکی کے پیچھے کیا ہے۔ برآمد ہو۔ اے دنیا میں نوزائیدہ باہر آ۔"

میں فرش سے اُٹھا اور بڑی نقاہت کے ساتھ کاہن کے سہارے سے چلا۔ اور حجروں کی تاریکی سے نکل خیال و حیرت میں غرق صبح کی روشنی میں آیا۔ پھر میں اپنے کمرے میں گیا اور جاتے ہی سو گیا۔ نیند ایسی گہری تھی کہ خواب تک نظر نہ آیا۔ یہاں کسی نے، حتیٰ کہ میرے باپ نے بھی نہ پوچھا کہ میں نے اس خوفناک نیند میں کیا کیا دیکھا، یا دیوی سے بات چیت کس طریقے سے ہوئی۔

جو واقعات میں نے یہاں تحریر کیے ہیں ان کے بعد میں نے اپنا وقت دیوی آئی سیس کی پرستش اور ان رموز و اسرار کی ظاہری صورتوں کے مطالعہ میں صرف کیا جن کی کنجی اب میرے پاس تھی۔ علاوہ اس کے مجھے سیاسی تعلیم بھی دی گئی اور ہمارے فریق کے بڑے بڑے آدمی خفیہ طریقے سے ملنے آئے۔ ملک مصر کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں سے لوگ میری ملاقات کو نہ آئے ہوں۔ کلا بطرہ ملکۂ مصر کے ظلم و جور کی جو شکایتیں رعایا کو تھیں انہوں نے مجھ سے بیان کیں۔ انکے علاوہ اور باتیں بھی کہیں۔

آخر کار وہ دن قریب آ گیا جس رات کو میں اپنا جسم چھوڑ کر، مگر پھر بھی دنیا کی زندگی میں رہ کر، آئی سیس دیوی کے سینے سے جا لگا تھا۔ اُس رات کو یہ قرار پایا تھا کہ تمام ضروری اور جائز رسموں کے ساتھ مگر بالکل خفیہ طریقے سے مجھے ارض شمال و جنوب کے تخت شاہی پر بٹھایا جائے۔ پس ہوا یہ کہ جب وقت قریب آ تا گیا تو مصری فریق کے بڑے بڑے اعیانِ عظام جن کی تعداد سب ملکر سینتیس تھی، تمام اضلاع اور علاقوں سے اور علاقوں کے بڑے شہروں سے آکر ابوتیس میں جمع ہوئے۔ یہ سب لوگ طرح طرح کے بھیس بدل کر آتے تھے۔ کوئی کاہن کے روپ میں تھا۔ کوئی زائر کی صورت میں، بہت سے فقیر بنے وہاں پہونچے تھے۔ ان ہی میں میرا ماموں سپیا بھی تھا۔ اُس نے گو ایک گشتی طبیب کا بھیس اختیار کر رکھا تھا مگر جو مشکلیں اُسے سب سے زیادہ پیش آئی تھیں وہ یہ تھیں کہ کہیں اس کی تیز اور کرخت آواز سارا بھانڈا نہ پھوڑ دے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس کی بھونڈی اور تیز آواز سے میں نے اُسے پہچانا تھا۔ میں اس وقت اپنے کسی خیال میں محو نہر کے کنارے جا رہا تھا۔ گو اس وقت اندھیرا ہو چلا تھا، اور ماموں نے سر کے رومال سے، جو اس زمانے میں گشتی طبیبوں کے لباس کا ایک ضروری جز ہوتا تھا، اپنا منہ کسی قدر ڈھک رکھا تھا۔

جب میں نے سلام کیا تو اُس نے چیخکر کہا: "اے تیرا بھلا ہو۔ کیا کوئی گھنٹہ بھر کو بھی اپنی صورت دوسری نہیں بنا سکتا۔ تجھے کیا معلوم کہ اس بھیس بھرنے میں مجھے کیسی کیسی مشکلیں پیش آئی تھیں مگر پھر بھی مجھ سے بن نہ پڑا اور تو نے اندھیرے میں بھی مجھے پہچان لیا!"

غرض اسی طرح چیخ چیخکر وہ مجھ سے باتیں کرتا رہا اور کہنے لگا کہ "میں یہاں تک پیادہ پا آیا ہوں تاکہ دریا پر جو جاسوسوں کی کشتیاں ماری ماری پھرتی ہیں اُن سے بچکر نکلوں۔" مگر کہنے لگا کہ "واپسی میں دریا کے رستے جاؤنگا یا پھر کوئی دوسرا بھیس بھرونگا۔ چونکہ طبیب بنکر یہاں آیا تھا اسلئے راستے بھر طبیب ہی کی خدمت ادا کرنی پڑی۔ حالانکہ اس فن سے مجھے مس نہیں اور ڈرتا ہوں کہ آتو اور ابوتیس کے درمیان جن لوگوں کا علاج معالجہ کیا انہیں ضرور تکلیف پہونچی ہوگی۔" اتنا کہہ اُس نے ایک

زور کا قہقہہ لگا کر مجھے گلے لگایا۔ اس وقت اُسے یاد نہ رہا کہ کس بھیس میں ہے۔ وہ دل کا ایسا صاف اور سچا تھا کہ سوائے اپنے وہ کسی دوسرے کا رُوپ اختیار نہ کرسکتا تھا۔ اور یوں ہی میرا ہاتھ پکڑے وہ ابوتیس کے تبخانے میں داخل ہوتا مگر میں نے اُسے ہوشیار کردیا۔

آخرکار سب لوگ جمع ہوگئے۔

رات کا وقت تھا۔ بت خانے کے تمام دروازے بند کر دئے گئے تھے اور سوائے ان سینتیس آدمیوں کے کوئی دوسرا وہاں نہ تھا۔ ان میں ایک میرا باپ عمونیم ہط سردار کاہن اور وہ بڈھا کاہن تھا جو مجھے دیبی کے مقدس حجرے میں لے گیا تھا۔ ایک بڑھیا اتوا تھی جس کی خدمت دستور کے مطابق یہ تھی کہ جب میں فرعون بنایا جاؤں تو وہ میری پیشانی پر روغن ملے۔ انکے علاوہ پانچ کاہن ایسے تھے جنہوں نے اس معاملے کو خفیہ رکھنے کی وہ قسم کھائی تھی جو ٹوٹ نہ سکتی تھی۔ یہ سب آدمی بت خانے کے دوسرے ایوان میں جمع ہوئے۔ لیکن میں اکیلا عمارت کے اُس حصے میں رہا جہاں ایک لوح پر ستر اور چھ فراعنہ قدیم کے نام کندہ تھے۔ اور یہ سب فرعون سیتی فرعون مقدس سے قبل کے تھے۔ یہاں میں اندھیرے میں پھرتا تھا کہ اتنے میں میرا باپ عمونیم ہط آیا۔ پہلے اُس نے مجھے جھک کر تعظیم دی اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر وہ مجھے بڑے ایوان میں لایا۔ جہاں سب لوگ جمع تھے۔

اس ایوان کے دیوہیکل ستونوں کے درمیان روشنیاں تھیں جن سے دیواروں پر جو بت کندہ تھے اُن کی صورتیں کچھ کچھ نظر آتی تھیں۔ کچھ روشنی ان ۳۷ امرائے عظام اور نسل فراعنہ کے شہزادگان پر پڑتی تھی جو سنگین نقشیں کرسیوں پر میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے مگر حرم ہیکل کی پشت پر ایک تخت بچھا تھا۔ تخت کے گرد بہت سے کاہن ہاتھوں میں بت اور جھنڈے لئے کھڑے تھے۔ جب میں اس روشن اور مقدس مقام پر پہونچا تو حاضرین سرو قد کھڑے ہوگئے اور انہوں نے جھک کر مجھے تعظیم دی۔ مگر زبان سے کوئی کچھ نہ بولا۔ میرا باپ مجھے تخت کی سیڑھیوں تک لے گیا۔ اور بہت آہستہ سے مجھ سے کہا کہ تخت کے سامنے کھڑے رہو۔

پھر میرے والد نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"ارض خیم کے طبقات قدیم کے معزز امیرو، کاہنو، نسل فراعنہ کے شہزادو، ارض شمال وجنوب کے اعیان وشرفا، جنہوں نے میرے بلانے سے یہاں تک تکلیف فرمائی ہے۔ جو کچھ عرض کروں اُسے سنیئے۔ موقع مجبور کرتا ہے کہ میں آپ کا تعارف بہت کم مراسم ادب وتعظیم کے ساتھ شہزادہ ہرماکس سے کراؤں۔ جو خون اور نسل دونوں اعتبار سے ہمارے اس ناشاد ملک کے فراعنہ قدیم کا صحیح اور جائز وارث ہے۔ وہ مقدس دیبی آئی سیس کے سب سے اندرونی راز ورموز کا کاہن ہے۔ اور شہر منف کے قریب جو اہرام ہیں ان کی کہانت بھی اُسی کے سپرد ہے۔ اور وہ تعلیم پاچکا ہے۔ اوسیرس کی تمام مقدس رسموں میں۔ کیا آپ صاحبوں میں کوئی ایسا ہے جسے اس کی نسل ونسب کے متعلق کسی قسم کا اعتراض ہو؟"

میرا باپ تقریر کرنے سے رکا۔ میرا موں سیپا کرسی سے اُٹھا اور کہا کہ "ہم نے تمام نسلوں کا معائنہ کرلیا ہے مگر کوئی اعتراض ہرماکس کے نسب پر پیدا نہیں ہوتا۔ اے عمونیم ہط، ہرماکس شاہی خون سے ہے اس کا نسب بالکل صحیح ہے۔"

پھر میرے والد نے کہا: "کیا آپ میں سے کوئی صاحب ایسے ہیں جنہیں اس بات سے انکار ہو کہ یہ شاہانِ ماضی کی یادگار ہرماکس خداؤں کی اجازت سے مرکر دیبی آئی سیس کی حضور میں پیش ہوا تھا اور وہاں اُسے اوسیرس تک پہونچنے کا راستہ بتایا گیا تھا۔ اور جسے منف والے اہرام کے کاہنوں کے طبقے میں شامل کیا گیا تھا۔ اور نیز اُسے اہرام والے تبخانوں کی خدمت بھی سپرد ہوئی تھی؟"

اب وہ بڈھا کاہن جو مجھے دیبی آئی سیس کے مقدس حجرے میں لے گیا تھا اُٹھا۔ اور کہا: "عمونیم ہم ان کل باتوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ ہمیں ان سے مطلق انکار نہیں اور یہ میں اپنے ذاتی علم سے کہتا ہوں۔"

اب ایک بار پھر میرے والد نے کہا: "کیا اب میں کوئی صاحب ایسے ہیں جنہیں شاہانِ ماضی کی اس یادگار ہرماکس کے خلاف کچھ بھی کہنا ہے یعنی یہ کہ اسکے دل یا اس کی زندگی میں کوئی شر یا اسی قسم کی کوئی ناپاکی، کذب، یا دروغ ظاہر ہوا؟"

اتنا سنکر منف کا ایک رئیس کھڑا ہوا اور کہا کہ "اس خصوص میں ہم نے پوری تحقیقات کی ہے اور عمونیم ہمیں کسی طرح کا عیب یا نقص دریافت نہ ہوا۔"

اس پر میرے والد عمونیم ہط نے کہا: "اچھا تو یہاں تک سب درست ہے۔ یعنی ہرماکس میں کوئی عیب یا نقص نہیں ہے، ہرماکس جو اولاد میں ہے بنکت زوجہ اوسیرس کی۔ اچھا اب بڑھیا اتوا کو اس مجمع کے سامنے آکر وہ باتیں کہنی چاہئیں جو ایک عورت نے اپنے مرنے کے وقت کہی تھیں۔ وہ عورت میری بیوی تھی۔ اس شہزادے کی ولادت کے وقت ربات تقدیر کے محل میں آکر اپنے بچے کی نسبت پیشینگوئی کی تھی۔"

اب بڑھیا اتوا ستونوں کے تاریک سائے میں سے نکل کر سب کے سامنے آئی۔ اور اس نے سب کے سامنے وہ باتیں کہیں جنہیں میں ضبط

تحریر میں لا چکا ہوں۔

میرے باپ نے کہا "صاحبو، آپ نے وہ باتیں سن لیں جن کا آپکو یقین ہے کہ اس عورت نے جو میری بیوی تھی اس نے ربانی آواز سے متاثر ہوکر یہ پیشینگوئی کی تھی۔"

اس پر سب بولے کہ "ہاں ہمیں کامل یقین ہے۔"

اب میرا ماموں سیپا اپنی کرسی سے اٹھا اور اس نے تقریر شروع کی۔ "اے شاہوں کی یادگار تو نے بھی کچھ سنا۔ اب سمجھ لے کہ ہمارے یہاں آنے کا کیا مقصد ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ تیرے سر پر ارضِ شمال وجنوب کا تاج رکھیں۔ تیرے محترم باپ نے اپنے جملہ حقوق شاہی تیری طرف منتقل کر دیے ہیں۔ ہم یہاں اس تزک اور احتشام کے ساتھ جمع نہیں ہوتے ہیں جو اس موقع کی شان کے مطابق ہوتا۔ جو کچھ اس وقت ہم کرتے ہیں اس کا خفیہ طور پر عمل میں آنا لازمی تھا۔ تاکہ ہماری جانیں اور ہمارا منصوبہ جو ہمیں اپنی جانوں سے بھی زیادہ عزیز ہے تلف نہ ہو جائیں۔ پھر بھی جہاں تک موقع اجازت دیتا ہے ہم قدیم رسمیں ادا کرتے ہیں تاکہ تو   کی اصلیت کو سمجھ جائے۔ اگر سب کچھ معلوم ہونے کے بعد تیرا دل انہیں قبول کرے تو پھر اے فرعون تو اپنے تخت پر جلوہ افروز ہو۔ اور حلف لے کہ ملک مصر جو یونان کی ہمیزِ آہن سے زخمی ہو رہا ہے اور اہل رومہ کے برچھوں کے سائے کو دیکھکر لرزتا اور کانپتا ہے۔ مدتوں سے اسکے خداؤں کی پرستش کو ناپاک کیا گیا ہے اور اس کے رہنے والوں پر طرح طرح کے جور وستم کئے گئے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس کی نجات کا وقت قریب ہے۔ پس مصر کی متفقہ آوازیں اور اسکے قدیم خداؤں کی قسم کھاکر جن کی اطاعت اور پاسداری میں تمام مخلوق میں تو سب سے زیادہ پابند ہے، اے شاہانِ سلف کی یادگار ہم تجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ تو ہمارے حق میں نجات کی شمشیر بن۔ سن لے کہ بیس ہزار جوانانِ قوی ہیکل جاں نثار تیرے حکم کے منتظر ہیں اور تیرے ایک اشارے پر وہ تن واحد بن کر مسافت پر آمادہ ہیں تاکہ یونان کے اس تاجور کو تہ تیغ کر دیں۔ اور اسکے خون اور گوشت سے اس تخت کی بنا ڈالیں جس کی بنیادیں اہرام مصر کی بنیادوں سے بھی زیادہ استوار و مستحکم ہوں۔ اور وہ تخت ایسا ہو کہ جس کی ہیبت سے رومہ کی جرار فوجیں بھی پسپا ہوتی نظر آئیں۔

اور تیرا اشارہ اس بہادر بیوہ کلا بطرہ کا پیغام اجل ہو جائے۔ پس تو اسکی موت کی تدبیر کر اور یہ تدابیر اس کی موت کی اسی طریقے سے ہوگی جو تجھے بتائی جائیگی۔ پس اسی کا خون کرنے کیلئے تو تخت مصر پر جلوہ گر ہو۔

اے ہماری امید اور سہارے کیا تو ہماری اس درخواست کو منظور کرنے سے انکار کریگا۔ کیا آزادی کا جام اپنے لبوں تک لاکر اسے بغیر پئے پھینک دیگا، اور اس پانی کا پینا گوارا کریگا جو غلام پیا کرتے ہیں۔ کام بڑا ہے ممکن ہے کہ ہمیں ناکامی ہو۔ اور اس کوشش میں ہماری جانیں غارت ہو جائیں۔ لیکن ہرماکس جان کوئی چیز نہیں ہے۔ کیا جان بہت ہی عزیز اور شیریں ہے۔ کیا زمین کے اس پتھریلے بستر پر ہم بہت ہی نرم تکیے لگائے بیٹھے ہیں۔ کیا عداوت اور رنج جب یہ دونوں مل جائیں خفیف اور ادنیٰ چیزیں ہیں؟ کیا یہاں کی ہوا جس میں ہم سانس لیتے ہیں ایسی پاک وصاف ہے کہ اپنے سانس کو اس میں سے گذارنا

یہاں ہمارے لئے سوائے یادِ ماضی اور امید آیندہ کے اور دھرا کیا ہے۔ یہاں سوائے پرچھائیوں کے ہم دیکھتے ہی کیا ہیں۔ پھر کیوں پاک تھا اور پاک دامن لئے ہم وہاں جانے سے ڈریں جہاں امید کا پورا ہونا اترا ہے۔ ہرماکس سمجھ لے کہ صرف اسی آدمی کو خوش قسمت کہہ سکتے ہیں جو اپنی زندگی میں شہرت اور نام کا تاج مرصع اپنے سر پر رکھتا ہے۔ دنیا میں کونسی مخلوق ہے جسے موت کے پھول نہ ملتے ہوں مگر خوش اور شادکام وہی ہے جو ان پھولوں سے عظمت وبزرگی کا تاج گوندھے، اور اس سے بہتر کون ہو سکتا ہے جو اپنے ملک کے پاؤں سے بیڑیوں کو توڑ دے، تاکہ اس کا پا بہ زنجیر ملک اپنے پیروں پر کھڑا ہو۔ اور آزادی کی تیز صدا لگائے اور اس طرح مضبوطی اور قوت حاصل کرکے غلامی کی زنجیروں کو پیروں میں روند ڈالے اور دنیا کی ان ظالم اقوام کی کچھ حقیقت نہ سمجھے جو ہماری پیشانیوں کو مہر لگاکر داغنا چاہتی ہیں۔

ہرماکس دیکھ خیم کی زمین تجھے بلاتی ہے۔ آ۔ نجات کے دینے والے آ۔ ہورس کی طرح آسمان سے کود پڑ۔ اور ارض خیم کی زنجیریں توڑ دے۔ دشمن کو پامال کر۔ اور فرعون بنکر فرعون کے تخت سے حکومت کر۔"

اس تقریر کو سنکر تمام مجمع نے نعرۂ تحسین بلند کیا جو عمارت کی سنگین دیواروں اور ستونوں میں گونجا۔ میں نے کہا "کیا اتنے وعدے مجھ سے لینے کی ضرورت ہے۔ اگر میں سو جانیں بھی رکھتا ہوتا تو میں ان سب کو مصر کیلئے فدا کر دیتا۔"

سیپا نے جواب دیا "شاباش خوب۔ کیا خوب کہا۔ اب یہ بڑھیا جو سامنے کھڑی ہے اسکے ساتھ جا۔ وہ تیرے ہاتھ دھوکر انہیں پاک کریگی اور سر پر تاج رکھنے کیلئے تیری پیشانی پر روغن ملے گی۔"

پھر میں بڑھیا اتوا کے ساتھ پاس کے ایک کمرے میں گیا۔ اتوا منہ ہی منہ میں کچھ دعا پڑھتی رہی اور سونے کا ایک طشت رکھکر اس نے میرے ہاتھوں پر پانی ڈالا۔ اور ایک باریک کپڑا روغن میں

بھگو کر میری پیشانی پر ملا۔

"بڑھیا کہنے لگی۔ "اے مصر شاداب اور اے شاہان ماضی کی مبارک یادگار، جو آپ اس ملک پر حکومت کرنے والا ہے۔ اے شاہی جوان تیرا رتبہ کاہن ہونے سے کہیں بڑھکر ہے۔ کیا کاہنات کا سخت قاعدہ تیرے لئے ہلکا کر دیا جائیگا، کیونکہ بغیر اس کے فرعونوں کا سلسلہ کیونکر جاری رہ سکتا ہے۔ میرا نصیبہ بھی کیسا اچھا ہے کہ تجھے میں نے گود میں کھلایا تھا۔ اور تیری جان بچانے کے لئے اپنے گوشت اور خون کو قربان کر دیا۔ اے حسین شاہوں کے نام لیوا ہرماکس جو دنیا شان و شوکت، موت اور عشق کیلئے پیدا ہوا ہے۔"

مجھے بڑھیا کی یہ باتیں ناگوار ہوئیں اور میں نے کہا "بڑی بی چپ بھی رہوگی۔ جب تک تمہیں میرا انجام معلوم نہ ہو مجھے خوش قسمت کیونکر سمجھ سکتی ہو۔ عشق کا تو تم میرے سامنے نام نہ لو۔ کیونکہ جہاں عشق ہوتا ہے وہاں درد اور مصیبتیں بھی تو ہوتی ہیں۔ اور میرا راستہ دوسرا ہے۔ اور عشق سے وہ اعلیٰ تر ہے۔"

"بڑھیا بولی۔ "کہتے تو تم بھی ہو مگر عشق کے ساتھ چین و آرام بھی تو ہے۔ دیکھو عشق کا ذکر کسی حقارت سے نہ کرنا۔ میرے بادشاہ، عشق ہی تمہیں یہاں تک لایا ہے۔ لا۔ لا۔ مگر ہوا ہمیشہ یوں ہی ہے اور یہی طریقہ ہمیشہ رہا ہے۔ دریا پر بط جب بلند پرواز ہوتا ہے تو وہ نہنگ پر ہنستا ہے۔ اسکندریہ کہاوت یوں ہی تو کہی جاتی ہے۔ لیکن جب وہی بط پانی پر سوتا ہوتا ہے تو نہنگ اس پر ہنستا ہے۔ یہی نہیں کہ عورتیں نہنگ ہوتی ہیں اور حسین نہنگ ہوتی ہیں۔ مرد تو انتھری بس یعنی نہنگوں والے شہر میں نہنگوں کو پوجتے ہیں۔ کیوں کیا یہ بات نہیں ہے۔ لیکن عورت کو تو تمام دنیا پوجتی ہے۔ لا۔ ارے میری زبان کیسی فرفر چلنے لگی۔ تمہارے سر پر تو اب مصر کا تاج رکھا جانے والا ہے۔ لیکن کیا میں نے پہلے ہی سے یہ بات نہیں کہی تھی۔ اچھا تو دونوں رستوں کا مالک پاک اور طاہر ہے۔ جا بیٹا تجھے مبارک ہو۔۔۔۔۔"

غرض میں باہر آیا۔ بڑھیا کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ گو یہ سچ ہے کہ اسکی بیوقوفی کی باتوں میں کچھ عقل ضرور ہوتی تھی۔

جب پھر ایوان میں آیا تو حاضرین سروقد کھڑے ہوگئے، اور جھک کر سب نے مجھے تعظیم دی۔ اسکے بعد میرا باپ میرے قریب آیا۔ اور مقدس ما کی ایک سونے کی مورتی اس نے میرے ہاتھ پر رکھدی کہ ما دیوی اتھی حق کی۔ اور اس کی مورتی کے ساتھ امن راع، مادت اور مقدس خون کی مورتیاں تھیں جو اس وقت میرے سپرد کی گئیں۔ اور اب میرے باپ نے بڑی سنجیدہ آواز میں کہا "کھا۔ امن راع، مادت اور خون کے عظمت و جلال کی قسم کھا۔"

میں نے کہا "ہاں میں قسم کھاتا ہوں۔"

پھر میرے باپ نے کہا "تو پاک اور متبرک سرزمین خیم اور شیہور کی ملنیاں، خداؤں کے ہیکلوں کی، ازلی و ابدی اہرام کی قسم کھا۔"

میں نے کہا "ہاں میں قسم کھاتا ہوں۔"

میرے باپ نے کہا "اچھا حالت ناکامی میں جو سخت انجام تیرا ہوگا اس کا خیال جما کر قسم کھا کہ مصر پر تو اسکے قدیم آئین و قوانین کے مطابق حکومت کریگا۔ تو کسی پر ظلم نہ کریگا۔ سب کے ساتھ ایک سا انصاف کریگا، اور تو پرانے خداؤں کی پرستش کا ہمیشہ حامی و مددگار رہیگا۔ اور تو ہمارے کسی راز کو افشا کر کے ہم سے دغا نہ کریگا۔ اور کبھی یونانیوں یا اہل روما کے ساتھ میل ملاپ نہ کریگا۔ اور غیروں نے جن بتوں کی پرستش ملک میں جاری کی ہے تو ان بتوں کو غارت کر دیگا۔ انہیں ملک سے خارج کریگا اور تو اپنی ساری زندگی سرزمین خیم کی آزادی اور بہبود کیلئے وقف کر دیگا۔"

"ہاں۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ ایسا ہی کرونگا۔"

"اچھا تو سب درست ہے۔ جا اور تخت پر بیٹھ اور انکی موجودگی میں جو یہاں حاضر ہیں۔ ان سب کے سامنے میں تجھے فرعون کے مبارک لقب سے پکارتا ہوں۔۔۔" میں تخت پر جا بیٹھا۔ پاؤں رکھنے کی چوکی جو تخت پر رکھی تھی اسکی شکل اسفنکس کی تھی۔ اور شامیانہ کی شکل ما کے کھلے پروں کی تھی۔ اب عوئیم ہط پھر میرے قریب آیا اور اس نے شدت میری بھوؤں پر ملا اور مصر کا تاج دو گونہ میرے سر پر رکھا اور ردائے شاہی میرے کندھے پر ڈالی۔ میرے ایک ہاتھ میں عصائے حکومت اور دوسرے میں تازیانہ دیا۔ پھر میرے باپ نے کہا "اے فرعون ہرماکس۔ میں ہیکل راع من ما کے تہخانے کا سردار کاہن کاہن مقدس علامتوں اور نشانیوں کے ساتھ مصر شمال و جنوب کا تاج فرعونی تیرے سر پر رکھتا ہوں۔ حکومت کر پھل پھول۔ اے سرزمین خیم کی توقع اور امید خوش رہ۔"

مجمع میں جسقدر لوگ تھے ان سب نے ملکر باآواز بلند کہا "حکومت کر اور پھل پھول۔" اور اسکے بعد سب نے جھک کر مجھے تعظیم دی۔ پھر حاضرین میں سے ایک ایک نے آکر میرے سامنے حلف اطاعت لیا۔ جب سب حلف لے چکے میرے باپ نے میرا ہاتھ پکڑا۔ میرے پیچھے پیچھے جلوس تھا اور اب میں امن راع کے تہخانے میں جتنے حرم تھے ان سب میں سے گذارا گیا۔ ہر حرم میں نذریں چڑھاتا جاتا تھا۔ اور اگردان میں عود روشن کر کے میں ایک کاہن کی حیثیت سے چکر دیتا رہا تاکہ خوشبو ہر طرف پھیلے۔ شاہی لباس پہنے میں نے ہورس، امن راع، ہوئیم خوا اور طاع کے معبدوں میں نذریں چڑھائیں۔ آخر کار میں ایوان شاہی میں واپس آیا۔ یہاں سب نے

مکالمہ

اس نظم میں یورپ کے Super-man (فوق البشر) اور ایشیا کے انسانِ کامل (مومن) کا بنیادی فرق بتایا گیا ہے۔ ہر کل کا کنٹرولنگ گیئر ہوتا ہے۔ انسان جو فطرت کی بہترین کل ہے بغیر کنٹرولنگ گیئر کے ہو نہ سکتی تھی۔ اس کا کنٹرولنگ گیئر خشیۃ اللہ ہے۔ خدا کا ڈر ہی اس کل کو ٹھیک رکھ سکتا ہے۔ یہ اثر نہ ہو تو یہ موٹر کار تیز سے تیز تر دوڑتی ہوئی ایک نہ ایک دن الٹ کر تباہ و برباد ہوجاتی ہے۔ یا کسی بھیانک اور ہیبتناک غار میں گر کر چکنا چور ہوجاتی ہے۔ سوپرمین اور مومن کی فاتحانہ قوتوں میں کوئی فرق نہیں۔ مگر سوپرمین بندۂ حرص و ہوا ہونے کے باعث نہ صرف دنیا ہی کو ایک دن تباہ و برباد کر کے رہتا ہے، بلکہ اپنی ذات کو بھی اسکے خلاف چونکہ مومن کا ہر فعل مرضیٔ مولا کے تحت ہوتا ہے اس لئے وہ نہ صرف اپنی ذات کیلئے موجب فلاح و برکت ہوتا ہے بلکہ باقی دنیا کے لئے بھی اس کا اصولِ زندگی ہی الحب للہ والبغض للہ ہوتا ہے۔ اس کا کوئی فعل ذاتی اغراض کے تحت نہیں ہوتا۔

ملحدِ مغرب

حدیثِ کن فکاں دُہرا رہا ہوں ۔۔۔ زمین و آسماں پر چھا رہا ہوں
خرد کے عرش کا مسند نشیں ہوں ۔۔۔ کہ اپنا آپ ہی رُوح الامیں ہوں
حریمِ فطرتِ چالاک مَیں ہوں ۔۔۔ مقامِ مستیِ ادراک مَیں ہوں
نگاہِ دُوربیں ہوں نکتہ رس ہوں ۔۔۔ بہارِ بے نیازِ خار و خس ہوں
"مکاں" میری نظر میں "لامکاں" ہے ۔۔۔ زماں کی داستاں ہی داستاں ہے
میری تدبیر کا تقدیر ہے نام ۔۔۔ خطِ لوح و قلم سے مجھکو کیا کام؟
کلیدِ گنجِ امکاں ہے مرے پاس ۔۔۔ مری اُمید ہے بیگانۂ یاس
تمنّائے فلک میری رضا ہے ۔۔۔ "خودی" میری خدائے ماسوا ہے
مری مجبوریوں کا ختم ہے دَور ۔۔۔ خرد کے کب غلامانہ رہے طور؟
خرد کی "آمریت" حکمراں ہے ۔۔۔ زمیں میری ہے میرا آسماں ہے
مجال دم زدن کیا ماسوا کو؟ ۔۔۔ کوئی ٹھکرا تو دے میری رضا کو
خدا کی شان ہے میرے عمل میں ۔۔۔ نہاں ہے دستِ قدرت میری کل میں
جہنم ریزیاں ہیں میرے بم میں ۔۔۔ میں جو چاہوں وہ کر سکتا ہوں دم میں
"ملک پرواز" ہے میرے سوا کون؟ ۔۔۔ "نرالا ساز" ہے میرے سوا کون؟
فضاؤں میں مری "آوازِ بے ساز" ۔۔۔ خرد کی لن ترانی کا ہے اعجاز
زمیں پر ماہ پارے ناچتے ہیں ۔۔۔ مری گت پر ستارے ناچتے ہیں
حجابِ روئے فطرت ہو چکا دُور ۔۔۔ کہ تھا دَورِ جہالت کا یہ دستور
نقابِ رُوئے زیبا پھٹ چکی ہے ۔۔۔ برس کر یہ گھٹا بھی چھٹ چکی ہے

ادھر فردوس کا نقشہ مری بزم
جہنم کا ادھر چربہ مری رزم
مری جنت مرا دوزخ یہیں ہیں
یہی دنیا مری دنیا و دیں ہیں
خرد کے آستانے پر ہے سر خم
خدا ہوگا کوئی واللہ اعلم

مومنِ مشرق

ارے او منکرِ نور السموات!
سوارِ اشہبِ برق و بخارات!
کمندِ عقل کے صیدِ زبوں حال!
غلامِ گردشِ روز و مہ و سال
ہوس کا بندۂ بیدام ہے تو
مئے خامِ خرد کا جام ہے تو
خرد تیری خرِ بے راہرو ہے
جسے گندم سمجھ رکھا ہے جو ہے
تری جولانیاں ہیں رقصِ بسمل
جبھی تو ہے سکوں ناآشنا دل
ہوس رانی ترے مدِ نظر ہے
کہ دنیا ہی تری حدِ نظر ہے
"خودی" دیکھی خدا کو بھول بیٹھا
دوا دیکھی دعا کو بھول بیٹھا
خودی تھی جوہرِ آئینۂ دل
مگر اے دیدۂ سفاکِ قاتل
اسے تو جوہرِ شمشیر سمجھا
نگاہِ نکتہ رس کو تیر سمجھا
خودی خود کامیوں میں صرف کر دی
یہ تو نے خیرہ سر دادِ ہنر دی؟
خودی کو خود غرض سمجھا کہاں تو؟
بھٹک کر راہ سے پہنچا کہاں تو؟
خودی تیری درندوں کی خودی ہے
پرندوں کی چرندوں کی خودی ہے
خودی آدم کی بے حرص و ہوا ہے
خرد تیری خودی کی ابتلا ہے
خودی کو خود غرض جس نے بنایا
ستم ڈھانا اسے جس نے سکھایا
خودی کی جس نے لٹیا ہی ڈبو دی
خودی کی آبرو ہی جس نے کھو دی
خرد تیری وہ ابلیسِ لعیں ہے
یہی مردار وہ بئس القرین[1] ہے
خودی سمجھا خرد نے خود سری کو
خدا سے جا ملایا قیصری کو
خودی خوفِ خدا کا آستانہ ہے
خودی کی فطرتِ عالی غنا ہے
خودی بے خشیۃ اللہ عینِ شیطان
خرد سے رک نہیں سکتا یہ طوفاں
امیں یہ عقل کے بس کا نہیں روگ
مگر اتنا سمجھتے ہی نہیں لوگ
خودی بے خشیۃ اللہ آفتِ جاں
خودی خوفِ خدا سے نورِ یزداں

امینِ حزیں سیالکوٹی

[1] بئس القرین۔ برا ساتھی۔

جنگ اور انسانیت

جنگ و پیکار، عہدِ وحشت کی یادگار اور اپنے اثرات کے اعتبار سے بربریت کا نشان سمجھا جاتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ جذبہ کچھ اس طرح انسانی فطرت میں رچا ہوا اور انسانیت کے خمیر میں گندھا ہوا ہے کہ ہزاروں برس کے علم و خرد، تحقیق و تجربے، اور مسلسل اخلاقی اور روحانی ریاض کے بعد یہ آج بھی اسی شدت و قوت سے دنیا پر مستولی نظر آتا ہے!

تہذیب و تمدن کے اثر سے یہ ضرور ہوا کہ اسباب و بواعث جنگ میں بڑی حد تک اعتدال پیدا ہو گیا ــــــ علم و تجربہ کے ساتھ ضبط و تحمل بڑھا اور نفرت و حقارت کا جذبہ کمزور پڑ گیا۔ اختلاط باہمی کے ساتھ رواداری اور فراخ حوصلگی پیدا ہوئی اور عصبیت کے قدیم نظریہ کی تلخی کم ہو گئی۔ اخلاقی اور روحانی ریاضتوں سے رحمانی قوتوں میں جلا آگئی اور قصاص اور انتقام کی روایتی شدت دور ہو گئی ــــ لیکن اس تہذیب نفس کے باوجود جنگ و پیکار کا جذبہ بدستور زندہ اور انسانی فطرت میں اپنی مخصوص ہیجان اور اضطراری کیفیتوں کے ساتھ برقرار رہا۔ بلکہ تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ تہذیب و ترقی کے ساتھ ساتھ جنگ کی ہولناکیوں، تباہ کاریوں اور ہلاکت آفرینیوں کا معیار بھی برابر اونچا ہوتا چلا گیا جس کے باعث زمانہ حال اور زمانہ قدیم کی لڑائیوں میں صرف اس قدر مناسبت رہ گئی کہ زمانہ قدیم کی لڑائیوں کو اگر اپنے اثرات کے لحاظ سے مقامی زلزلے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے تو انکے مقابلے میں زمانہ حال کی لڑائیاں اپنی ہولناکیوں اور عالمگیر تباہ کاریوں کے اعتبار سے "قیامت صغریٰ" سے کسی طرح کم نہیں ہوتیں!

زمانہ حال کے بعض مفکرین کا خیال ہے کہ ہماری موجودہ دنیا تمدن و تہذیب کے برکات سے اس درجہ بہرہ اندوز ہو چکی ہے کہ آپس کے اختلافات کو دور کرنے کیلئے اسے اب اس وحشیانہ جذبہ سے کام لینے کی ضرورت نہ ہونی چاہئیے ــــ یہاں ہمیں ان حضرات کی رائے سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کی نیت نیک ہے اور زمانہ حال کی لڑائیوں کا انداز اپنی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں کے ساتھ انہیں اس درجہ متاثر کر چکا ہے کہ وہ دل سے یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح یہ لعنت انسانیت کے سر سے دور ہو جائے ــــ خدا کرے ایسا ہو! کیونکہ اگر ایسا ہو گیا تو بقول ان کے شاید ہمارا تمدن بہت زیادہ حسین اور دلکش بن سکے اور شاید ہماری دنیا جنت کا ہم پلہ ہو سکے!

لیکن یہ ابھی ہمارا محض تصور ہی تصور ہے، حالات نے ابھی ہمیں یہ موقع نہیں دیا کہ ہم اس وجد آفریں تصور کو اپنے دل و دماغ میں باقاعدہ پرورش کر سکیں اور تہذیب و تمدن کی موجودہ رفتار سے حال یا مستقبل قریب میں کسی خوشنما تعبیر کی آس لگا بیٹھیں۔ اس لئے کہ ابتدائی دور تہذیب کی طرح موجودہ دور میں بھی جنگ کی ضرورت اور عدم ضرورت کا فیصلہ صرف "محرکات جنگ" کے ہاتھ ہے۔ جب تک یہ قوی اور توانا ہیں اُس وقت تک ہماری تہذیب غالباً جنگ کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ البتہ اگر ان میں ضعف آجائے تو پھر جنگ کی عدم ضرورت کی گفتگو کا موقع پیدا ہو جاتا ہے۔

محرکات جنگ، تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ ابتدا سے اب تک ہر زمانے اور ہر دور میں تقریباً یکساں رہے ہیں۔ رفتارِ تمدن کیساتھ ساتھ یہ ضرور ہوا کہ انکے اظہار کا پیرایہ زیادہ معتدل اور زیادہ بلیغ ہوتا چلا گیا لیکن اس ظاہری نمائش کے پیچھے "روح" ہمیشہ وہی متحرک رہی ہے جو ابتدائے دورِ انسانیت میں مشاہدہ کی جا چکی ہے۔

مثلاً خودی اور انانیت کی نمود، جذبہ نفرت کی تسکین، شوکت و حشمت کی نمائش، مال غنیمت کا لالچ، ملک گیری کی ہوس، نسلی یا قومی تفوق اور برتری کا احساس، تجارتی اور معاشی منفعت کی حرص وغیرہ غالباً جنگ کے سب سے نمایاں محرکات ہیں، جو تہذیب اور شائستگی کی معراج کے باوجود اب تک کسی نہ کسی شکل میں باقی چلے آتے ہیں۔

انکے علاوہ جنگ کے دو اور مقاصد ہوا کرتے ہیں۔ ایک "مدافعانہ" اور دوسرا "مصلحانہ"۔ مدافعانہ جنگ وہ کہی جاتی ہے جو اپنی قومی، نسلی یا ملکی وجود کی حفاظت کیلئے کی جاتی ہے۔ یا اپنے اخلاقی، مذہبی اور روایتی عقائد کے تحفظ کی خاطر لڑی جاتی ہے۔ اور "مصلحانہ" جنگ وہ ہوتی ہے جو اپنے اخلاقی، مذہبی، معاشی اور معاشرتی مسلمات کی تبلیغ کی خاطر

برپا کی جاتی ہے۔ پست اقوام پر اپنا انتداب قائم کرنا، انکے ملکی وسائل کے اپنے مفاد کی خاطر نگرانی کرنا، انہیں اپنے تمدن اپنی معاشرت اور اپنے رسم و رواج کا پابند بنانا اس جنگ کا اصلی مقصد ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے ابھی کہا ہے کہ محرکات جنگ آج بھی تقریباً وہی ہیں جو تاریخ کے ابتدائی دور میں پائے جاتے تھے۔ البتہ موجودہ تہذیب میں ان محرکات اور مقاصد کو خوشنما الفاظ اور شاندار پیرایۂ بیان کے پردے ڈال کر ان کی اصلیت کو عام نظروں سے چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ دنیا کی نظریں مقاصد جنگ کی پستی پر نہ پڑیں بلکہ الفاظ کی دلفریبی اور خیالات کی باریکی اور نزاکت کے تصور میں الجھ کر رہ جائیں۔

چنانچہ اس پروپگنڈے کے فن کی دریافت کے بعد یہ بالکل ممکن ہوگیا ہے کہ پست سے پست مقاصد جنگ کو بھی مقدس اور متبرک ثابت کیا جاسکے۔ اور حقیر سے حقیر شکایت کو بھی وجہِ اشتعال اور محرکِ جنگ بنایا جاسکے۔ یا یوں سمجھئے کہ جذبۂ نفرت کی تسکین کی خاطر، شوکت و حشمت کی نمائش کے لئے نسلی یا قومی برتری کے نشہ میں سرشار ہو کر، یا تجارتی اور معاشی منفعت کی طمع میں جو جنگیں لڑی جاتی ہیں انہیں اس پروپگنڈے کی مدد سے نہایت آسانی کے ساتھ مدافعانہ اور مصلحانہ جنگوں میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اور اس قلب ماہیت کے بعد ظاہر ہے کہ کسی جنگ کے متعلق جائز اور ناجائز اور حق و ناحق کی گفتگو محض بے معنی ہوجاتی ہے اور فیصلہ کن صرف وہی قدیم تدبیر رہ جاتی ہے کہ "حق" کا سہرا "قوت" کے سر باندھا جائے اور طاقت ہی کو "عین حق" سمجھ لیا جائے! —— اور یہی وہ "سنہرا اصول" ہے جس کے آگے آج بھی ساری مہذب دنیا سر جھکاتی ہے!

طاقت کو حق سمجھنا بہت پرانا اصول ہے اور دراصل دنیا میں یہی سارے جھگڑے کی بنیاد بھی ہے! —— ایام جاہلیت میں بھی حق و ناحق کا قضیہ تلوار ہی کے ذریعے چکایا جاتا تھا اور آج کی متمدن دنیا بھی حق اور ناحق کا فیصلہ تلوار ہی پر چھوڑتی ہے۔ لیکن تلوار چونکہ کسی کی میراث نہیں ہوتی اس لئے اس کے فیصلوں میں بھی استقامت نہیں پائی جاتی۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ تلوار کا ہر فیصلہ ہر زمانہ اور ہر عہد کے لئے اٹل سمجھ لیا جائے۔ بلکہ حالات اور واقعات کے اعتبار سے اس کے فیصلے برابر بدلتے رہتے ہیں اور اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ حق و ناحق کے پلے بھی برابر جھولتے رہتے ہیں ——

بات یہ نہیں ہے کہ آج کل کی مہذب دنیا اس اصول کی اس کمزوری اور لغویت کو نہیں جانتی بلکہ حقیقت صرف اس قدر ہے کہ اس اصول کو کمزور، ناقص، غیر مہذب اور وحشیانہ سمجھنے کے باوجود وہ آج تک اسکو ترک کرنے اور اس کا کوئی نعم البدل تلاش کرنے پر قادر نہ ہوسکی!

کیا فی الحقیقت یہ مسئلہ اس قدر پیچیدہ اس قدر گنجلک اور لاینحل ہے کہ ہم اس کے حل کرنے پر قادر نہیں ہوسکتے؟ اور کیا فی الواقعی مستقل قیام امن کا کوئی مناسب "فارمولا" تلاش کرنے سے ہماری موجودہ تہذیب عاجز ہے؟

سب سے پہلے ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگ کے دوران میں یہ سوال پیدا ہوئے تھے، اور جیسی کہ توقع تھی، جنگ کے خاتمہ پر جنگ کے فاتح اور تہذیب جدید کے علمبرداروں (امریکہ، فرانس اور انگلستان) نے دنیا کے آگے مستقل قیام امن کا ایک مناسب "فارمولا" پیش کر دیا۔ نئے اصولوں کے ماتحت نئی قومیں عالم وجود میں آگئیں۔ دنیا کے نقشے کی دوبارہ تقسیم ہوئی۔ سیاسی قوتوں کے نئے پیمانے مقرر ہوئے۔ معاشی نظام میں اصلاح کی گئی، اور مہذب قوموں کے آپس کے قضیے چکانے کے لئے ایک بین الاقوامی مجلس بھی قائم ہوگئی —— بظاہر دنیا نے اطمینان کا سانس لیا کہ بالآخر مستقل قیام امن کی داغ بیل پڑ گئی۔

لیکن دنیا کا یہ اطمینان محض عارضی ثابت ہوا! ابھی اس "فارمولے" کی سیاہی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ یہ چاک چاک کر دیا گیا اور اس کے پرزے فضائے آسمانی میں بکھیر دئے گئے۔ دنیا میں پھر بےچینی کے آثار نظر آنے لگے۔ پھر بے اطمینانی اور بیزاری کی فضا پیدا ہونے لگی۔ پھر رشک و رقابت کے بخارات اٹھنے لگے۔ پھر انتقام اور قصاص کے نعرے بلند ہونے لگے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے پہلے سے بھی زیادہ شدت اور قوت کے ساتھ دنیا پر پھر جنگ کے مہیب بادل گرجنے لگے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے برسنے بھی لگے! —— مستقل قیام امن کا فارمولا ناکام رہا اور دنیا پھر اپنے اسی قدیم اصول کے آگے جھک گئی —— طاقت "حق" ہے، اور حق "طاقت" ہے!

محمد مرزا دہلوی؛

عرضِ نیاز

جمعیتِ نشاط کا ساماں نہ کیجئے
یعنی شفائے درد کا امکاں نہ کیجئے

عارض پہ کاکلوں کو پریشاں نہ کیجئے
یوں اہتمامِ سنبل و ریحاں نہ کیجئے

خود دیکھئے اُٹھا کے زلیخائے آئنہ
ذکرِ جمالِ یوسفِ کنعاں نہ کیجئے

دکھلائیے نہ چہرۂ پُر نور ہجر میں
تاریکیوں میں صبحِ درخشاں نہ کیجئے

میری نگاہِ یاس سے محشر نہ جاگ اُٹھے
خاموشیوں کو سلسلہ جنباں نہ کیجئے

افسردہ ہے ریاضِ جنوں کی کلی کلی
اب فکرِ چاک چاک گریباں نہ کیجئے

مُرجھا چلے ہیں خلدِ محبت کے برگ و بار
اب آپ فکرِ منتِ رضواں نہ کیجئے

پژمردہ ہے ریاضِ شگفتہ شباب کا
اب آپ فکرِ خاطرِ سوزاں نہ کیجئے

ہے چاک چاک جوشِ جنوں سے لباسِ زیست
اب اہتمامِ جیب و گریباں نہ کیجئے

مت کیجئے عیادتِ جوشِ جنونِ شوق
بے التفاتیوں کو پشیماں نہ کیجئے

قلبِ قریبِ مرگ پہ تیر افگنی فضول
زخمِ جگر پہ سایۂ مژگاں نہ کیجئے

اب لُٹ چکا قرارِ حیات و سکونِ زیست
اب سعیِ التفات کا احساں نہ کیجئے

اب باغِ دل پہ رنگِ خزاں نے جما لیا
اب اہتمامِ بزمِ گلستاں نہ کیجئے

اب ٹوٹنے لگے مرے زخموں کے بند بند
اب زحمتِ تبسمِ پنہاں نہ کیجئے

اب دل کے داغ داغ میں روشن ہے شمعِ زیست
اب اہتمامِ بزمِ چراغاں نہ کیجئے

اب دل ہے نازِ بالش و بستر سے بے نیاز
اب اہتمامِ شمع و شبستاں نہ کیجئے

اب درد بڑھ چلا ہے دوا کی حدوں سے پار
اب آپ لن ترانیِ درماں نہ کیجئے

اب نیند آ چلی ہے مریضِ فراق کو
اب آپ کاکلوں کو پریشاں نہ کیجئے

فرحتؔ کو اُس غریب کی حالت پہ چھوڑیئے
اب آپ فکرِ کلبۂ احزاں نہ کیجئے

فرحت کانپوری

ریڈیو ڈرامہ۔

نیلی رگیں

(سعید ذیل کے شعر کھوئے کھوئے انداز میں گاتا ہے)

مرمریں پیکر پہ نیلم کے خطوط
چاندنی میں جس طرح نیلی شعاعوں کی جھلک
سرد ہے دنیائے خواب
میرے برفانی تصور میں مگر
بہہ رہا ہے نیلگوں سیماب سا
جس طرح ساری ہو قلب و روح میں
اک حسین افعی کا زہر
مرمریں پیکر پہ نیلم کے خطوط (مسعود پرویز)

کرشن۔ تم اب دن بدن شاعر ہوتے چلے جا رہے ہو۔

سعید۔ مجھے خود بھی محسوس ہوتا ہے ـــ ان نیلی رگوں نے مجھے شاعر بنا دیا ہے۔ میرے ذہن کی ہر سلوٹ میں یہ رگیں رینگتی رینگتی پہونچ گئی ہیں۔ (کرشن سے شدت کے ساتھ مخاطب ہو کر) کرشن تم نے کبھی کسی عورت کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبائے ہیں۔

کرشن۔ ٹھنڈے ہاتھ....

سعید۔ ٹھہرو مجھے اپنا فقرہ درست کر لینے دو، پھر جواب دینا۔ اب بتاؤ۔ کیا تم نے کبھی کسی اجنبی عورت کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے ہیں.... ایسے ہاتھ جو چاند کی طرح خنک ہوں.... کسی اجنبی عورت کے ہاتھ جو تمہاری زندگی میں اس طور پر داخل ہوئی ہو جیسے رات کے سنسان اندھیرے میں کوئی جگنو بھٹکتا ہوا آ نکلے۔

کرشن۔ (ہنستا ہے) اپنی دُم میں لالٹین باندھے، نہیں.... چاند کی ایک ذلیل چوستا ہوا اُدھر آ نکلے۔ (ہنستا ہے) تمہیں آج کیا ہو گیا ہے سعید.... یہ ٹھنڈی یخ عورت تمہاری زندگی میں کب داخل ہوئی؟.... اگر سامنے انگیٹھی میں دہکتے ہوئے کوئلے واقعی گرم ہیں تو جناب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ آج دسمبر کی ایک سرد رات ہے اور سرد راتوں میں مئے تو کوئی نہیں پیتا.... شراب تک کو اس کی سرد آغوش سے دُور رکھا جاتا ہے.... مگر میں تو سبق پڑھانے لگا.... بتاؤ یہ سرد ہاتھوں والی عورت کون تھی۔

سعید۔ سرد ہاتھوں والی؟ اجنبی، عورت کہو.... اجنبی.... (آہ بھر کر) کرشن تم نہیں جانتے یہ اجنبیت کس قدر پُر لطف شے ہے.... سوچو تو اگر خدا بھی ہمارے دیس کا ہوتا، ہمارا دیکھا بھالا ہوتا تو.... تو اس کی خدائی کیسی ہوتی.... اجنبیت کیا ہے؟.... نہیں تم نہیں سمجھ سکتے.... اجنبیت.... کبھی کبھی ہمارا جسم تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح جس کی سطح پر کوئی اُڑتا اُڑتا پتا آن گرے، کپکپا اُٹھا کرتا ہے.... یہ کپکپاہٹ جس کا کچھ مطلب ہوتا ہے اور کچھ مطلب نہیں بھی ہوتا۔ یہ کپکپاہٹ جو سرد اور گرم لہروں کا ایک اُلجھاؤ سا ہوتا ہے.... نہیں، اجنبی عورت کی اجنبیت اس سے زیادہ اجنبی ہوتی ہے۔

کرشن۔ ٹھنڈے ہاتھوں والی اجنبی عورت کی اجنبیت ظاہر ہے کہ اس سے بھی زیادہ اجنبی ہوگی اور سرد بھی۔

سعید۔ گورے گورے ٹھنڈے ہاتھ اور اُن پر پھیلی ہوئی نیلی رگیں جیسے برف میں نیلم کی لکیریں ـــ ان نیلی رگوں میں کہیں کہیں ہانپتی ہوئی بلبل کے سینے کی سی پھڑپھڑاہٹ.... نہیں میں کہیں بہک نہ جاؤں۔

کرشن۔ آپ کو یہ اندیشہ بہت بعد میں ہوا ہے۔ آپ بہک چکے ہیں، نہیں، بہکے ہوئے ہیں۔

سعید۔ یہ سُن کر مجھے تعجب نہیں ہوا۔ جب تک اس دُنیا میں عورت، شراب اور پھول موجود ہیں انسان ضرور بہکیں گے اور بہکا ہوا انسان عورت، شراب اور پھول سے زیادہ خوبصورت ہوتا ہے....

(موسیقی ـــ دھیمے دھیمے سُر جن میں انبساط کروٹیں لے۔ ایسا انبساط جس میں دبے دبے درد کی جھلک بھی ہو ـــ عورت کی ہنسی بکھر سی جاتے.... یہ ہنسی معصومانہ ہو.... چند لمحات تک یہ نغمہ جاری رہے اور آہستہ آہستہ دھیما ہو کر بیک گراؤنڈ میں چلا جائے۔)

ثریا۔ میں بہک رہی ہوں۔

سعید۔ تمہاری زندگی نیا لباس پہن رہی ہے....

ثریا۔ مجھے حجاب محسوس ہوتا ہے۔

سعید۔ یہ نئے کپڑوں کا قصور ہے۔

ثریا۔ میرے ہاتھ کتنے ٹھنڈے ہیں۔

سعید۔ میرے ہاتھوں میں دیدو… جوانی کے خیالوں کی سی گرمی تم ان میں پاؤگی…

(سردی کے باعث سی سی کرنے کی آواز)

ثریا۔ آہ! تمہارے ہاتھ… گرم ہیں… ماں کی گود کی طرح… مجھے یاد ہے میری ماں بھی تھی۔

سعید۔ ایک میری بھی تھی — مائیں سب کی ہوتی ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر کی مرجاتی ہیں — میری ماں کو مرے اتنے ہی برس ہوگئے ہیں جتنے کہ مجھے زندہ رہتے۔

ثریا۔ (ہلکی سی ہنسی) تم… تم… تم دلچسپ آدمی ہو۔ تمہارا نام کیا ہے

سعید۔ میرا نام؟… بھئی حد ہوگئی… پہلے تم اپنا تو بتاؤ۔

ثریا۔ سردی زیادہ ہوگئی ہے۔

سعید۔ انگیٹھی میں کوئلے اور ڈال دیتا ہوں۔

ثریا۔ ختم ہوگئے تو کیا کروگے…

سعید۔ کچھ بھی نہیں، ختم ہوجائیں گے تو… ختم ہوجائیں گے… میرے پاس کاغذوں کا ایک انبار جو موجود ہے۔ اُس کو جلانا شروع کردونگا۔

ثریا۔ لیکن اُن کاغذوں پر تو شعر لکھے ہوتے ہیں۔

سعید۔ اسی لئے تو کہتا ہوں کہ جلانے کے لئے اچھے رہیں گے — تمہارے آنے سے پہلے میں اُن شعروں کو بہت سنبھال سنبھال کر رکھتا تھا، پر تمہارے آنے پر معلوم ہوا کہ ان میں سے ہر ایک لکڑی کا کھلونا ہے… لکڑی جلانے ہی کے کام تو آتی ہے۔

ثریا۔ دھواں دیگی۔

سعید۔ تمہارا نام کیا ہے؟

ثریا۔ میرا نام؟… میرا نام… دیکھو تم نے ابھی تک انگیٹھی میں کوئلے نہیں ڈالے۔ میں یہ سردی برداشت نہیں کرسکتی — میرے ہاتھ… دیکھو میرے ہاتھ پھر یخ ہوگئے ہیں… لاؤ مجھے اپنے ہاتھ دو… کہاں ہیں تمہارے ہاتھ؟

سعید۔ یہ رہے… اوہ… کمرے میں روشنی نہیں ہے… ٹھیک، لالٹین تو کونے میں پڑی ہے، اُس کی چمنی کا تلا ٹوٹ گیا تھا لیکن پھر میں اس اندھیرے میں تمہیں دیکھتا کیسے رہا — بخدا تمہارے چہرے کا ایک ایک خط میں نے غور سے دیکھا ہے… تمہارا تل…

ثریا۔ کہاں پر ہے میرا یہ تل؟

سعید۔ گویا میں نے دیکھا ہی نہیں — میں سچ کہتا ہوں ابھی ابھی تمہارا یہ تل چمک رہا تھا… کہاں پر تھا؟… ہاں، ہونٹوں کی اختتامی نکون کے اوپر۔ تمہاری دائیں آنکھ کی پتلی کی سیدھ میں، یعنی اوپر سے اگر عمود گرا جائے تو اس تل کو ضرور چھوئے — کیا غلط کہتا ہوں۔

ثریا۔ بالکل غلط۔

سعید۔ تو پھر میں نے کہاں دیکھا تھا۔

ثریا۔ یہ تل ٹھیک اسی جگہ تمہارے چہرے پر ہے۔

سعید۔ میرے چہرے پر؟ نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا — لیکن… ارے؟… تم ٹھیک کہتی ہو۔ اب مجھے یاد آیا۔ یہ تل میرے ہی چہرے پر ہے۔ کل جب تم برفانی رات میں مجھ سے ملی تھیں اور میں نے دیاسلائی جلا کر تمہاری طرف دیکھا تھا تو مجھے تمہارے ہونٹوں کے اختتامی کونوں کے اُوپر کی جگہ بہت پسند آئی تھی اور میں نے سوچا تھا کہ اگر وہ تل جو میرے چہرے پر بیکار پڑا ہے اُڑ کر وہاں چلا جاتے تو کیسا بھلا معلوم ہو… وہاں یہ تل ضرور ہونا چاہیئے۔ چاہے میرا ہو یا تمہارا اپنا…

ثریا۔ وہاں تل کا ہونا اتنا ضروری کیوں ہے؟

سعید۔ ارے بھئی، وہاں تل کا ہونا اشد ضروری ہے۔ اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں… دیکھو… ٹھہرو میں کاغذ پر تمہیں تصویر بنا کر سمجھاتا ہوں… لیکن تم دیکھو گی کیسے… سخت اندھیرا ہے… اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں… تل کا وہاں ہونا بہت ضروری ہے۔ مجھے بہت روحانی کوفت ہوگی اگر وہاں تل پیدا نہ ہوا۔

ثریا۔ تمہیں روحانی کوفت نہیں ہوگی، اس لئے کہ تل وہاں پر موجود ہے۔

سعید۔ ہونا چاہیئے تھا — اگر نہ ہوتا تو بھی ہوتا… لیکن… لیکن تم نے جھوٹ کیوں بولا؟

ثریا۔ اس لئے کہ یہ تل سے زیادہ خوبصورت چیز ہے… میرا جی چاہتا تھا کہ تمہیں چھیڑوں… میں بڑی شریر ہوں۔

سعید۔ تمہیں جھوٹ نہیں بولنا چاہیئے۔ داناؤں نے کہا ہے کہ جھوٹ نقصان دہ ہوتا ہے۔

ثریا۔ یہ سب سے بڑا اور سب سے خوبصورت جھوٹ ہے جو داناؤں نے بولا — لیکن میں پوچھتی ہوں تم نے جھوٹ کیوں بولا — ابھی ابھی تم کہہ رہے تھے کہ تمہارے ہونٹوں کے اوپر واقعی ایک تل موجود ہے — کیا میں دیکھ سکتی ہوں۔

سعید۔ (بوکھلا کر) بھئی نہیں ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ ہو… بہرحال کہیں نہ کہیں ضرور ہے — بات یہ ہے کہ میں اپنا چہرہ بہت کم دیکھا

کرتا ہوں۔ آئینے سے مجھے نفرت ہے۔ اس میں اصل شکل نظر نہیں آتی ــــ
میں نے جب اپنا چہرہ دیکھا مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس پر کسی نے قلعی
کر دی ہے.... لعنت بھیجو ایسی واہیات چیز پر ــــ جب آئینہ نہیں
تھا لوگ زیادہ خوبصورت تھے۔ اب آئینے موجود ہیں مگر لوگ خوبصورت
نہیں رہے۔

ثریا:۔ سردی ناقابل برداشت ہوگئی ہے.... اگر کوئلے ختم ہوگئے۔

سعید:۔ تو میں آئینے جلانا شروع کر دوں گا

ثریا:۔ آئینے؟

سعید:۔ میں بھولا۔ آئینے نہیں، وہ کاغذ جن پر میں نے شعر لکھے
ہیں ــــ یہ آئینوں سے بھی بدتر ہیں۔

ثریا:۔ (ہنستی ہے) تم دلچسپ آدمی ہو.... میں بہت خوش ہوں....
لیکن کوئلے؟......

(ایسا نغمہ شروع ہو جس کے سُر شروع شروع میں بلند ہوں مگر
آہستہ آہستہ دھیمے ہوتے جائیں۔ ایسا معلوم ہو کہ سازوں
میں سُر باقی نہیں رہے ــــ موسیقی کے اس ٹکڑے کے
بیچ بیچ میں "لیکن کوئلے ــــ لیکن کوئلے" کی آواز آتی رہے۔
یہ آواز سعید کی ہو۔)

سعید:۔ لیکن کوئلے، لیکن کوئلے؟ کتنا اہم سوال ہے۔ (وقفہ)....

کرشن:۔ یہ شاعری سب بکواس ہے۔ آدھ سیر کوئلے، شاعر کے دو دیوانوں
کے مقابلے میں زیادہ دیر تک جلتے ہیں اور زیادہ گرمی پہونچاتے ہیں۔
ٹھنڈے ٹھنڈے گورے ہاتھ جن پر نیلی لکیروں کا جال سا بنا ہو ضرور
گرم ہونے چاہئیں۔

کرشن:۔ ضرور گرم ہونے چاہئیں ــــ تمہارے چار دیوان کیا ان دو
ہاتھوں کو گرم نہیں کر سکے۔

سعید:۔ (آہ بھر کر) نہیں ــــ کاش میں نے شاعری کے بجائے
کوئلے چننے کا کام کیا ہوتا۔ اب تک میں نے چار بوریاں بھری ہوتیں
.... (وقفہ)

کرشن:۔ کس سوچ میں پڑ گئے؟

سعید:۔ سوچ رہا تھا اگر چار بوریاں کوئلوں سے بھری ہوتیں تو اس
عورت کو شعروں کی ضرورت ہوتی ــــ ٹھنڈے شعروں کی ــــ میں
ایسی کئی عورتوں کو جانتا ہوں جو شعروں کو ملائی کے برف کی طرح
پلیٹ میں ڈال کر چمچے سے کھاتی ہیں ــــ عورت نرالی ہے یا وہ جو
عورتوں کو بناتا ہے نرالا ہے۔

کرشن:۔ دونوں نرالے ہیں، اس لئے کہ دونوں ہماری سمجھ سے بالاتر
ہیں۔

سعید:۔ لوگ کہتے ہیں کہ شاعر دونوں کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔

کرشن:۔ یہ بھی شاعری ہے۔

سعید:۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے عورت کو سمجھنے کا گُر
پا لیا ہے۔

کرشن:۔ بتاؤ وہ گُر کیا ہے۔

سعید:۔ اس کو سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے۔

(دونوں ہنستے ہیں۔ اس ہنسی کے ساتھ ہی طرب انگیز موسیقی
کا ٹکڑا شروع ہو۔ آخر میں ثریا کے ہنسنے کی آواز آتے۔)

ثریا:۔ تم مجھے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔

سعید:۔ ہر شے جو میرے گرد و پیش ہے یہ کہتی ہے کہ مجھے سمجھو ــــ
اس انگیٹھی کا ہر جھتا ہوا کوئلہ بھی یہی کہتا ہے کہ مجھے سمجھو۔ دور آسمان
پر ٹھٹھرے ہوئے تارے بھی اسی تمنا میں ٹمٹما رہے ہیں ــــ چاند.... یہ
نقرئی طشتری میں جما ہوا پانی.... یہ کیا ہے؟ ــــ یہ بھی تو کہتا ہے مجھے
سمجھو.... اور تمہارے ٹھنڈے ٹھنڈے ہاتھوں پر یہ نیلی نیلی رگیں جو
کنوارے خیالوں کی طرح معصوم ہیں کیا ان کو سمجھنے کی کوشش نہ کرنی
چاہیے......

ثریا:۔ کھڑکی بند کر دو۔ چاند کی شعاعیں سردی میں اضافہ کر رہی ہیں
.... کوئلے.... بس یہ کوئلے آخری تھے کیا؟

سعید:۔ ہاں آخری تھے۔

ثریا:۔ تو اب کیا ہوگا.... سعید.... میرے ہاتھ.... میرے ہاتھ....
ہائے میرے ہاتھوں کا کیا ہوگا....

سعید:۔ میرا نام تمہیں کیسے معلوم ہوا؟....

ثریا:۔ کیا تمہارا نام سعید ہے؟

سعید:۔ سعید ہی تو ہے، سعید ہی تو ہے، اور ہو بھی کیا سکتا ہے پر تمہیں
معلوم کیسے ہوا۔

ثریا:۔ (ہنستی ہے) ایک نجومی نے مجھ سے کہا تھا کہ ان سردیوں میں تیری
زندگی میں ایک ساعت سعید آئے گی.... کیا یہ ساعت سعید نہیں تھی....
یہ چند گھڑیاں جن میں میرے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ آگ تاپتے رہے ہیں۔

سعید:۔ ثریا.... ثریا.... (رک کر) کاش میرے پاس اور کوئلے ہوتے۔

ثریا:۔ (چونک کر) لیکن یہ تو میرا نام ہے.... تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ
میرا نام ثریا ہے؟

سعید۔ یہ تارہ بہت اونچا ہے، ناقابلِ رسا اور بہت خوبصورت۔
ثریا۔ کیا میں خوبصورت ہوں۔
سعید۔ خوبصورت بھی اور ناقابلِ رسا بھی۔
ثریا۔ خوبصورت عورتوں سے تو لوگ محبت کرتے آئے ہیں۔ تم مجھ کو محبت کیوں نہیں کرتے.... تم نے ابتک مجھ سے یہ راز کیوں چھپائے رکھا کہ میں خوبصورت ہوں۔ آج جبکہ کوئلے ختم ہو چکے ہیں اور میری انگلیاں برف کی ڈلیاں بن رہی ہیں تم نے مجھے بتایا ہے کہ میں خوبصورت ہوں۔ میں خوش نہیں ہوئی... میں تم سے ناراض ہو رہی ہوں... سچ کہتی ہوں، تم سے ناراض ہونے کیلئے میں تیار ہو گئی ہوں... میں عنقریب تم سے بگڑنے والی ہوں.... (وقفہ) اچھا یہ تو بتاؤ، میں کتنی خوبصورت ہوں، تمہیں اندازہ تو ہوگا....

سعید۔ کاغذ جلا دوں، کوئلے بجھ رہے ہیں
ثریا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ میں کتنی خوبصورت ہوں... تمہیں میری جان کی قسم ٹھیک ٹھیک بتاؤ میں کتنی خوبصورت ہوں۔

(چند لمحات کے لئے خاموشی)

ثریا۔ بتاتے کیوں نہیں — آہ، میں سمجھ گئی.... تم کبھی نہیں بتاؤگے تم نہیں چاہتے کہ مجھے اپنے حسن کا ٹھیک اندازہ ہو.... تم... تم حاسد ہو.... چونکہ آج تک کوئی خوبصورت عورت تمہاری زندگی میں نہیں آئی اس لئے تم چاہتے ہو کہ مجھے میرے حسن سے غافل رکھو۔ اس غفلت کا تم ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہو... لیکن میں خوبصورت ہوں، تمہارے اس دباؤ سے میرا حسن دب تو نہیں جائیگا... میرے ہاتھوں کی نیلی رگیں... کیا کہا تھا ایک بار تم نے — برف میں نیلم کی لکیریں... نہیں یہ ان سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں۔ . اور میرا تِل... ہونٹوں کے اختتامی کونے کے اوپر وہ ننھا سا نقطہ.... تم مجھے بتا چکے ہو کہ یہ خوبصورت ہے — اب یہ اور بھی خوبصورت ہوگا۔ (ہنستی ہے) میں اب سنگھار کیا کروں گی۔ سولہ سنگھار۔ ان سے میری اور بھی چھب نکلے گی۔ تم مجھے اب نزدیک سے دیکھتے ہو، لیکن بہت جلد دُور سے دیکھا کروگے اور... ترسا کروگے۔ (وقفہ) تم مجھے کیوں نہیں بتاتے کہ میں کتنی خوبصورت ہوں۔
سعید۔ کوئلے بالکل بجھ گئے ہیں — انگیٹھی میں ایک آخری چنگاری سفید راکھ کی گود میں مچل رہی ہے۔
ثریا۔ تم میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے... میں تم سے کیا پوچھ رہی ہوں — بتاؤ — بتاؤ۔
سعید۔ لو وہ آخری چنگاری بھی سو گئی۔

ثریا۔ سعید، میں تنگ آگئی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ غصے میں زور زور سے اپنے پیر اس فرش پر ماروں.... تم.... تم.... تم بہت بدصورت ہو.... اور.... اور تمہارے پاس نگوڑے کوئلے بھی نہیں ہیں جو میں ہاتھ تاپ سکوں.... تم کچھ بھی نہیں ہو.... میں نے غلطی کی جو تمہارے پاس چلی آئی.... میں اب فوراً چلی جاؤں گی، تمہارے پاس میں ایک منٹ نہیں ٹھہر سکتی۔

(وقفہ)

سعید۔ سچ مچ جا رہی ہو۔
ثریا۔ (غصے میں) تم مجھے روکنے والے کون ہو۔
سعید۔ جاتی ہو تو میرا یہ کمبل لیتی جاؤ — باہر ناقابلِ برداشت سردی ہے۔
ثریا۔ تمہاری اس ہمدردی کا میرے دل پر کچھ اثر نہیں ہوا۔
سعید۔ کمبل لپیٹ لو، کہیں سردی نہ لگ جائے۔
ثریا۔ تم میرے دل و دماغ پر طاری ہونے کی کوشش نہ کرو.... تمہارا یہ کمبل مجھے پسند نہیں ہے۔ اس کا رنگ نہایت ہی فضول ہے۔ اچھا تو میں چلی۔
سعید۔ خدا حافظ۔
ثریا۔ تم کچھ نہ کہو... کچھ نہ بولو۔ خاموش رہو۔ میں جانا چاہتی ہوں۔
سعید۔ جاؤ۔
ثریا۔ (وقفہ، دروازہ کھولنے کی آواز۔ ثریا کی آواز دُور سے آتے۔) چلی گئی، لیکن اب پھر نہ آؤ گی۔
سعید۔ جاتے وقت تم بہت زیادہ حسین ہو گئی ہو.... اتنی خوبصورت تم پہلے کبھی نہ تھیں......

(دھیمے دھیمے سُروں میں ساز بجتا ہے۔ پھر سعید یہ شعر گاتا ہے۔)

موج سی پانی میں اک پیدا ہوئی
بہہ گئی۔
جیسے ایک جھونکا ہوا کا
پاس سے ہو کر نکل جائے کہیں
چند روزہ آرزوؤں کا چراغ
جھلملا کر بجھ گیا۔ (مسعود پرویز)

(فیڈ آؤٹ)

سعادت حسن منٹو

تیرِ جستہ

جان کر روشن دماغ اپنے کو اک میرا رفیق ۔۔۔ مے یہیں بیٹھے ہوئے کرتا ہے یورپ کے طریق

نذرِ ظلمت ہے مگر ذہنیتِ "روشن دماغ" ۔۔۔ زد میں صرصر کی فنا آمادہ ہو جیسے چراغ

(۲)

اُس کی یورپ دوستی میں جب نہ مجھکو شک رہا ۔۔۔ میں نے اُس "روشن دماغ انسان" سے اک دن کہا

کچھ خبر بھی ہے تجھے اکی یہ تیرے سُوٹ بُوٹ ۔۔۔ تیری نسبت کہہ رہے ہیں آہ کیا کیا جھُوٹ مُوٹ

(۳)

مانتا ہوں میں کہ تُو بدخواہ ملّت کا نہیں ۔۔۔ تیری ملّت دُشمنی کا یہ دلاتے ہیں یقیں

خیر، اس بُہتان سے تجھکو نہ ڈرنا چاہیئے ۔۔۔ خوشنُما ملبوس سے نفرت نہ کرنا چاہیئے

(۴)

زیب تن انسان کرسکتا ہے وہ موزوں لباس ۔۔۔ چشمِ ظاہر بیں میں چُست و چاق ہو جس کی اساس

لیکن اے نادان! ۔ ہو کردار میں تبدیل کیوں ۔۔۔ ضم کتابِ دل میں ہو بدلی ہوئی انجیل کیوں

(۵)

فرقِ اخلاصِ عمل کی شان میں آنے نہ دے ۔۔۔ اس کو بھی انجیل کی صورت بدل جانے نہ دے

ایشیا والوں کو اخلاصِ عمل پر ناز ہے ۔۔۔ اہلِ یورپ کی فطانت حق کشی کا راز ہے

(۶)

آہ پندِ بے محل مقبول ہو کیا اس کی آس ۔۔۔ کرچکا ہے جبکہ تُو تبدیل کردار و لباس

لے زمانہ سے "جدید العصر" بننے کا صلہ ۔۔۔ غاصبانِ حق سے اب اے حق طلب کیوں ہو گلہ

علی منظور

اَنّ دیوتا

"تب انّ دیو، برہما کے پاس رہتا تھا۔ ایک دن برہما نے کہا: "او بھلے دیوتا! دھرتی پر کیوں نہیں چلا جاتا؟" "

اِن الفاظ کے ساتھ چنتو نے اپنی دل پسند کہانی شروع کی۔ گونڈوں کو ایسی بیسیوں کہانیاں یاد ہیں۔ وہ جنگل کے آدمی ہیں اور ٹھیک جنگل کے درختوں کی طرح اُن کی جڑیں دھرتی میں گہری چلی گئی ہیں۔ مگر وہ غریب ہیں ـــ بھوک کے پیدائشی عادی۔ چنتو کو دیکھکر مجھے یہ گمان ہوا کہ وہ بھی دیوتا ہے جو دھرتی کے باسیوں کو انّ دیو کی کہانی سُنانے کے لئے آنکلا ہے۔ گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ الاؤ کی روشنی میں بغل کی پگڈنڈی کسی جوان گونڈن کی مانگ معلوم ہوتی تھی۔ گھوم پھر کر میری نگاہ چنتو کے جھریوں والے چہرے پر جم جاتی۔

کہانی جاری رہی ـــ

"دیوتا دھرتی پر کھڑا تھا۔ پر وہ بہت اونچا تھا۔ بارہ آدمی ایک دوسرے کے کندھوں پر کھڑے ہوتے، تب جاکر وہ اسکے سر کو چھو سکتے۔

"ایک دن برہما نے سندیس بھیجا ـــ یہ تو بہت کٹھن ہے، بھلے دیوتا! تجھے چھوٹا ہونا ہوگا۔ آدمی کا آرام تو دیکھنا ہوگا۔

دیوتا آدھا رہ گیا۔ پر برہما کی تسلی نہ ہوئی۔ آدمی کی مشکل اب بھی پوری طرح حل نہ ہوئی تھی۔ اُس نے پھر سندیس بھیجا اور دیوتا ایک چوتھائی رہ گیا۔ اب صرف تین آدمی ایک دوسرے کے کندھوں پر کھڑے ہوکر اسکے سر کو چھو سکتے تھے۔

پھر آدمی خود بولا: "تم اب بھی اونچے ہو میرے دیوتا!"

انّ دیو اور بھی چھوٹا ہو گیا۔ اب وہ آدمی کے سینے تک آنے لگا۔

پھر جب وہ کمر تک رہ گیا تو آدمی بہت خوش ہوا۔

اُس کے جسم سے بالیں پھوٹ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ سونے کا پیڑ کھڑا ہے۔

آدمی نے اُسے جھنجوڑا اور بالیں دھرتی پر آگریں۔"

میں نے سوچا۔ اور سب دیوتاؤں کے مندر ہیں۔ مگر انّ دیو، وہ کھیتوں کا قدیمی سرپرست، کھلے کھیتوں میں رہتا ہے، جہاں ہر سال دھان اُگتا اور نئے دانوں میں دودھ پیدا ہوتا ہے ـــ ماں ہونے والی لڑکی کی چھاتیوں کی طرح۔

ہلدی بولی: "اب تو دیوتا دھرتی کے بیچوں بیچ کہیں پاتال کی طرف چلا گیا ہے۔"

چنتو نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ ایسا بھیانک کال اُسنے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ دھرتی اس طرح بنجر ہوگئی تھی، جیسے عورت بانجھ ہوجائے یا کسی ننھے کی ماں کی چھاتی سُوکھ جائے۔

ہلدی پھر بولی: "اور دیوتاؤں کی طرح انّ دیو بھی بہرہ ہوگیا ہے۔"

چنتو نے پوچھا: "پر انّ دیو کیوں بہرہ ہوگیا؟"

"یہ میں مورکھ کیا جانوں؟ پر بہرہ تو وہ ہو ہی گیا ہے۔"

سال کے سال ہلدی انّ دیو کی منت مانتی تھی۔ ایک ہلدی پر ہی بس نہیں، ہر ایک گونڈ عورت یہ منت ماننا ضروری سمجھتی ہے۔ مگر اس سال دیوتا نے ایک نہ سُنی۔ کس بات نے دیوتا کو ناراض کر دیا؟ غصہ تو اور دیوتاؤں کو بھی آتا ہے مگر انّ دیو کو تو غصہ نہ کرنا چاہیئے۔

ہلدی کی گود میں تین سال کا بچہ تھا۔ میں نے اُسے اپنی گود میں لے لیا۔ اس کا رنگ اپنے باپ سے کم سانولا تھا۔ اُسے دیکھکر مجھے تازہ پہاڑی شہد کا رنگ یاد آرہا تھا۔

ہلدی بولی: "ہائے! انّ دیو نے میری کوکھ ہری کی اور وہ بھی بھوک میں اور لاچاری میں۔"

بچہ مسکراتا تو ہلدی کو یہ خیال آتا کہ دیوتا اُس کی آنکھوں میں اپنی مُسکراہٹ ڈال رہا ہے۔ پر اس کا مطلب؟ دیوتا مذاق تو نہیں کرتا؟ پھر اُس کے دل میں غصہ بھڑک اُٹھتا۔ دیوتا آدمی کو بھوکوں بھی مارتا ہے اور مذاق اُڑا کر اُس کا دل بھی جلاتا ہے۔

چنتو بولا: "سچ جانو تو اب مجھے انّ دیو پر وسواس ہی نہیں رہا۔ اور اس کی کہانی، جو میں آج کی طرح سینکڑوں بار سُنا چکا ہوں، اب مجھے نری گپ معلوم ہوتی ہے۔"

ہلدی یہ نہ جانتی تھی کہ چنتو کا طنز بہت حد تک سطحی ہے۔ یہ تو وہ خود بھی سمجھنے لگی تھی کہ دیوتا روز روز کے پاپ ناٹک سے ناراض ہوگیا ہے۔

"انّ دیو کو نہیں مانتے پر بھگوان کو تو مانو گے؟"

"میرا دل تو تیرے بھگوان کو بھی نہ مانے۔ مردود بھگوان کہاں

ہیں اس کے میکہ رلج۔ اور کہاں سو رہا ہے وہ خود؟ ایک بوند بھی تو نہیں برستی!"

"دیوتا سے ڈرنا چاہیئے اور بھگوان سے بھی۔"

چنتو نے سنبھلکر جواب دیا "ضرور ڈرنا چاہیئے۔ ہاں، ہاں ہاں.... اور اب تک ہم ڈرتے ہی رہے ہیں!"

"اب لگتے نا سید سے ہوتے ہو۔ جب میں چھوٹی تھی ماں نے کہا تھا دیوتا کے غصّہ سے سدا بچیو۔"

"اری کہا تو میری ماں نے بھی کچھ ایسا ہی تھا، پر کب تک لگا رہیگا یہ ڈر، ہلدی؟"

"دیوتا پھر خوش ہوگا اور پھر لہلہانے لگا دیکھ، پیارا پیارا دھان!"

کال میں پیدا ہونے بچے کی طرف دیکھتے ہوئے میں سوچنے لگا۔ اتنا بڑا پاپ کیا ہو گیا کہ اتنا بڑا دیوتا بھی آدمی کو چھماں نہیں کر سکتا!

کال نے ہلدی کی ساری سندرتا چھین لی تھی۔ چنتو بھی اب اپنی بہار کو بھول رہا تھا۔۔۔ درخت اب بھی کھڑا تھا، مگر ٹہنیاں پرانی ہو گئی تھیں اور نئی کونپلیں نظر نہیں آتی تھیں۔

ہلدی نے مجھے بتایا کہ اس کی چلبلاہٹ اور اُسکے ہنس ہنس کر باتیں کرنے کے انداز نے چنتو کو اس کی طرف متوجہ کیا تھا۔ تب وہ جوان تھی۔ ایک مست ہرنی۔ اس کی ناک موٹی تھی اور نتھنے بھی کم چوڑے نہ تھے۔ پر جب وہ اچھلتی کودتی ایک کھیت سے دوسرے کھیت میں جا گئی اور چنتو نے اُسے دیکھا تو اس کے دل میں بھی ایک ہرن جاگ اٹھا۔ وہ بھی دوڑنے لگا۔ ایک روز وہ اُسکے پیچھے بھاگ نکلا تو وہ پیپل کے پیڑ تلے کھڑی ہو گئی۔ کھیتوں میں دھان لہلہا رہا تھا۔۔۔ پیار کی طرح جو دل میں اُگتا ہے۔ پہلے وہ کچھ کچھ ڈری۔ پھر وہ مسکرانے لگی۔ جب چنتو نے اپنی انگلیوں سے اُس کے بال سلجھانے شروع کئے اور بیاہ کی بات چھیڑی تو ہلدی نے سہمی ہوئی آواز سے کہا تھا۔

"ان دیو ہمیں دیکھ رہا ہے۔ پہلے اس کا دھیان کر لو۔ پھر بیاہ کا نام لینا!" ہلدی کا خیال تھا کہ دیوتا دھان کے پودوں میں چھپا بیٹھا ہے اور اُن کا پیار اس نے دیکھ لیا ہے۔ جب چنتو نے ریشم کے کیڑوں کا گیت گایا تھا تو ہلدی نے یہ محسوس کیا تھا کہ چنتو بھی ایسا ہی ایک کیڑا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کیڑے بیاہ نہیں کرتے، صرف پیار کرتے ہیں۔ ہلدی نے ان دیو کی سوگند کھا کر اپنی سچائی کا یقین دلایا تھا۔ اور چنتو نے کہا تھا "تم ضرور بول کی سچی رہوگی، ہلدی! ان دیو کی سوگند بہت بڑی سوگند ہوتی ہے۔"

ہلدی کا بچہ میری گود میں رونے لگا۔ اُسے لیتے ہوئے اس نے سہمی ہوئی نگاہ سے اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔ بولی: "یہ کال کب جائیگا؟"

"جب ہم مر جائیں گے۔ اور نہ جانے یہ تب بھی نہ جائے۔"

"یہ کنگنی اور کودوں دھان کی طرح پانی نہیں مانگتے۔ یہ بھی نہ اُگے ہوتے تو ہم کبھی کے بھوک سے مر گئے ہوتے... انہوں نے ہماری لاج رکھ لی... ہماری بھی اور دیوتا کی بھی۔"

"دیوتا کا بس چلتا تو انہیں بھی اُگنے سے روک دیتا.... پاپی دیوتا!"

"ایسا بول نہ بولو۔ پاپ ہوگا۔"

"میں کب کہتا ہوں پاپ نہ ہو۔ ہو، سو بار ہو۔"

"نہ نہ، پاپ سے ڈرو۔ اور دیوتا کے غصّہ سے بھی۔"

میں نے بیچ بچاؤ کرتے ہوئے کہا "دوش تو سب آدمی کا ہے۔ دیوتا تو سدا نردوش ہوتا ہے۔"

رات غمزدہ عورت کی طرح پڑی تھی۔ دور کسی خونی درندے کی دھاڑ گونجی۔ چنتو بولا "ان بھوکے شیروں اور ریچھوں کو ان دیو مل جائے تو وہ اُسے کچا ہی کھا جائیں۔"

۲

بیساکھو کے گھر روپے آئے تو ہلدی اُسے بدھائی دینے آئی "بیٹا میں پچیس بھی پانچ سو ہیں۔ رامو سدا سکھی رہے۔"

"ان دیو سے تو رامو ہی اچھا نکلا!" بیساکھو نے فرمائشی قہقہہ لگا کر کہا۔

چنتو بولا "ارے یار! چھوڑ اس ان دیو کی بات.... ان دیو، ون دیو!"

ہلدی نے اپنے خاوند کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس طنز سے اُسے چڑ تھی۔ دیوتا کتنا بھی برا کیوں نہ ہو جائے، آدمی کو تو اپنا دل ٹھیک رکھنا چاہیئے، اپنا بول سنبھالنا چاہیئے۔

غصّہ میں جل بھنی ہلدی اپنی جھونپڑی کی طرف چلدی۔ بیساکھو نے پھر قہقہہ لگایا: "واہ بھئی واہ۔ رانڈ اب بھی ان دیو کا پیچھا نہیں چھوڑتی!"

چنتو بولا "چھینے دو اُسے ان دیو کی مالا۔ ہم تو کبھی نہ مانیں ایسے پاپی دیوتا کو!"

"تو سچ کہتا ہے چنتو! دیوتا پاپی ہو گیا ہے۔"

رامو بمبئی میں تھا۔ چنتو سوچنے لگا کاش اس کا بھی کوئی بھائی وہاں ہوتا اور پچیس روپے نہیں تو پانچ ہی بھیج دیتا۔

بیساکھو نے پوسٹ مین کو ایک دوانی دے دی تھی۔ مگر اُسے اِس بات کا افسوس ہی رہا۔ بار بار وہ اپنی نقدی گنتا اور ہر بار دیکھتا کہ اُس کے پاس چوبیس روپے چودہ آنے ہیں، پچیس روپے نہیں۔

جھونپڑی میں واپس آیا تو جنتو نے ہلدی کو بے ہوش پایا۔ اُس نے اُسے جھنجوڑا۔ "رسوئی کی بھی فکر ہے۔ اب سوؤ نہیں، ہلدی۔ دوپہر تو ڈھل گئی۔۔۔۔"

اس وقت اگر خود ان دیو بھی اُسے جھنجوڑتا تو ہوش میں آنے کیلئے اُسے کچھ دیر ضرور لگتی۔

تھوڑی دیر بعد ہلدی نے اپنے سرہانے بیٹھے خاوند کی طرف گھور کر دیکھا۔ جنتو بولا "آگ جلاؤ، ہلدی!۔۔۔ دیکھتی نہیں ہو۔ بھوک سے جان نکلی جا رہی ہے۔"

"پکاؤں اپنا سر؟"

جنتو نے ڈرتے ڈرتے سات آنے ہلدی کی ہتھیلی پر رکھ دئے اور اُس کے چہرے کی طرف دیکھکر بولا "یہ بیساکھو نے دئے ہیں، ہلدی! اور میں سچ کہتا ہوں میں نے اُس سے مانگے نہ تھے۔"

ہلدی شک بھری نگاہوں سے جنتو کی طرف دیکھنے لگی۔ کیا آدمی غریبی میں اتنا ہی گر جاتا ہے؟ مگر جنتو کے چہرے سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اُس نے مانگنے کی ذلیل حرکت نہیں کی تھی۔ اور پھر جب ایک ایک کر کے سب پیسے گنے تو اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔۔۔ چار روز دال بھات کا خرچ اور چل جائیگا۔

"شکر ہے۔ ان دیو کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔"

"ان دیو کا یا بیساکھو کا؟"

"ان دیو کا جس نے بیساکھو بھائی کے دل میں یہ پریم بھاؤ پیدا کیا۔"

جنتو کا چہرہ دیکھکر ہلدی کو اُس سوکھے پتے کا دھیان آیا جو ٹہنی سے لگا رہنا چاہتا ہو۔ دُور ایک بدلی کی طرف دیکھتی ہوئی بولی،— "کاش! بوندا باندی ہی ہو جائے—— انات چھوکری کے آنسوؤں کی طرح —" مگر تیز ہوا بدلی کو اُڑا لے گئی۔ اور دھرتی بارش کے لئے برابر ترستی رہی۔

کال نے زندگی کا سب لطف برباد کر دیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا دھرتی رو دے گی۔ مگر آنسوؤں سے تو سوکھے دھانوں کو پانی نہیں ملتا۔ ان دیو کو یہ شرارت کیسے سوجھی؟ مان لیا کہ وہ خود کسی وجہ سے کسانوں پر ناراض ہو گیا ہے۔ مگر بادلوں کا تو کسانوں نے کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ وہ کیوں نہیں گھِر آتے؟ کیوں نہیں برستے؟ کاش وہ دیوتا کی طرفداری کرنے سے انکار کر دیں!

۳

پار ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔

اُس روز یہاں دو تین سو گونڈ جمع ہوئے۔ پھنڈ کے صاحب اور منشی جی دھان بانٹ رہے تھے۔ اپنے حصّے کا دھان پاکر ہر کوئی دیوتا کی جے مناتا— ان دیو کی جے ہو۔

جنتو گاؤں کی پنچایت کا دایاں بازو تھا۔ دھان بانٹنے میں وہ مدد دے رہا تھا۔ لوگ اس کی طرف احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھتے اور وہ محسوس کرتا کہ وہ بھی ایک ضروری آدمی ہے۔ مگر لوگ دیوتا کی جے جے کار کیوں مناتے ہیں؟ کہاں ہے وہ مردود ان دیو؟۔۔۔ وہ خود بھی شاید ایک دیوتا ہے۔۔۔ اور شاید ان دیو سے کہیں بڑھکر۔۔۔۔

ہلدی نے سوچا کہ یہ دھان شاید ان دیو نے بھیجا ہے۔ اُسے دکھیارے گونڈوں کا خیال تو ضرور ہے۔ مگر جب اُس نے پھنڈ کے صاحب اور منشی جی کو حلوا اڑاتے دیکھا تو وہ کسی گہرے سوچ میں ڈوب گئی۔ پہلے تو اُس کے جی میں آئی کہ حلوے کا خیال اب آگے نہ بڑھے۔ پر یہ خیال بادل کی طرح اُس کے ذہن پر پھیلتا چلا گیا۔

قحط سبھا سے ملا ہوا دھان کتنے دن چلتا؟

جنتو کے چہرے پر موت کی دُھندلی پرچھائیاں نظر آتی تھیں مگر وہ دیوتا سے ڈرتا نہ تھا۔ کبھی کبھی گھٹنوں کے بل بیٹھا گھنٹوں غیر شعوری طور پر دیوتا کو گالیاں دیا کرتا۔ میں نے سمجھا کہ وہ پاگل ہو چلا ہے۔ دو چار بار میں نے اُسے روکا بھی۔ مگر یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ وہ دیوتا کو اپنے دل سے نکال دینا چاہتا تھا۔ مگر دیوتا کی جڑیں اُس کے جذبوں میں گہری چلی گئی تھیں۔

جنتو کی گالیاں سُنکر لوگوں کو ایک خاص طرح کی خوشی ہوتی۔ وہ محسوس کرتے کہ اُن کا بدلہ لیا جا رہا ہے جو کہ بہت ضروری ہے۔ ان دیو اگر کچھ بھی دم رکھتا ہے تو جنتو کو مار دے گا یا پھر پہلی طرح ٹھیک ہو کر اُن کا دوست بن جائے گا۔ گونڈوں کو اتنی دیوتا کی ضرورت نہیں جتنی کہ ایک دوست کی— وہ دیوتا کیا جو گھر کا آدمی نہ بن جائے!

ایک دن جنتو بہت سویرے اُٹھ بیٹھا اور بولا "دیوتا اَب دشمنوں کا ہو گیا ہے۔۔۔ مردود۔۔۔ پاپی دیوتا! اری میں تو نہ مانوں ایسے نیچ دیوتا کو۔"

"پر نہیں، میرے پتی، دیوتا تو سب کا ہے۔"

"سب کا ہے۔ اری پگلی، یہ سب گیان جھوٹا ہے۔"

"پر دیوتا تو جھوٹا نہیں"

"تو کیا وہ بہت سچا ہے؟ سچا ہے تو برکھا کیوں نہیں ہوتی!"

"دیوتا کو بُرا کہنے سے دوش ہوتا ہے"

"ہزار بار ہو..... دھورت دیوتا! نے سُن لیا؟ وہ اب ہمارے کھیتوں میں کیوں آئے گا؟ وہ دھنوانوں کی پوری کچوری کھانے لگا ہے۔ نردھن گونڈوں کی اب اُسے کیا پروا ہے؟"

چنتو کی نکتہ چینی ہلدی کے من میں غم گھول رہی تھی۔ اُس نے جھونپڑی کی دیوار سے ٹیک لگالی اور دھیرے دھیرے اچھے وقتوں کو یاد کرنے لگی، جب بھوک کا بھیانک منہ کبھی اتنا نہ کھلا تھا۔ وہ خوشی بھرنے لگی۔ دیوتا پھر کھیتوں میں آئے گا۔ اُس کی مسکراہٹ کھیت والوں میں دودھ بھر دے گی۔ اس کے من میں عجب کشمکش جاری تھی۔ دیوتا..... پاپی؟.. نہیں تو..... نیچ؟ نہیں تو۔ وہ باہر چلا گیا تو کیا ہوا۔ کبھی تو اُسے دیا آئے گی ہی۔

ہلدی سنبھل کر بولی: "سچ مانو، میرے پتی۔ دیوتا پھر آئیگا یہاں....."

چنتو کا طنز اور بھی تیکھا ہوگیا: "اری اب بس بھی کر، میری رانی! تیرا دیوتا کوئی سانپ تھوڑی ہے کہ تیری بین سُن کر بھاگا چلا آئیگا؟"

اس دن رامو بمبئی سے لوٹ آیا۔ اُسے دیکھ کر ہلدی کی آنکھوں کو ایک نئی ہی زبان مل گئی۔ بولی: "سناؤ، رامو بھائی ابھی تو دیوتا کو تو تم نے دیکھا ہوگا"

رامو خاموش رہا۔

میرا خیال تھا کہ رامو نے بمبئی میں مزدور سبھا کی تقریریں سُن رکھی ہوں گی اور وہ صاف صاف کہہ دے گا کہ دیوتا ویوتا کچھ نہیں ہوتا۔ اَن آدمی آپ اُپجاتا ہے۔ اپنے لہو سے، اپنے پسینے سے۔ اگر آدمی آدمی کا لہو چوسنا چھوڑ دے تو آج ہی سنسار کی کایا پلٹ جائے۔ کال تو پہلے سے پڑتے آئے ہیں، بڑے بڑے بھیانک کال۔ مگر اب سرمایہ دار روز روز کسانوں اور مزدوروں کا لہو چوستے ہیں اور غریبوں کیلئے تو اب سدا ہی کال پڑا رہتا ہے۔ اور یہ کال دیوتا کے چھو منتر سے نہیں جانے کا۔ اس کیلئے تو سارے سماج کو جھنجوڑنے کی ضرورت ہے۔

ہلدی پھر بولی: "رامو بھائی! چُپ کیوں سادھ لی تم نے؟ ..... ہمیں کچھ بتا دوگے تو تمہاری وِدّیا تو نہ گھٹ جائے گی۔ بمبئی میں تو بہت برکھا ہوتی ہوگی۔ پانی سے بھری کالی اودی بدلیاں گھِر آتی ہونگی..... اور بجلی چمکتی ہوگی ان بدلیوں میں رامو!..... اور وہاں بمبئی میں دیوتا کورتی بھر کشٹ نہ ہوگا....."

رامو کے چہرے پر مسکراہٹ پیدا ہونے کے فوراً بعد کسی قدر سنجیدگی میں بدل گئی۔ وہ بولا: "ہاں، ہلدی! اَن دیو اب بمبئی کے محلوں میں رہتا ہے..... روپوں میں کھیلتا ہے..... بمبئی میں، ہلدی، جہاں تم سے کہیں سندر رانیاں رہتی ہیں....."

ہلدی کچھ نہ بولی۔ شاید وہ اُن دنوں کے متعلق سوچنے لگی جب ریل ادھر آنکلی تھی اور اَن دیو پہلی گاڑی سے بمبئی چلا گیا تھا۔

آنسو کی ایک بوند جو ہلدی کی آنکھ میں اٹکی ہوئی تھی، اُس کے گال پر ٹپک پڑی۔ پرے آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے۔ میں نے کہا، "آج ضرور دھرتی پر پانی برسے گا"

ہلدی خاموشی سے اپنے بچے کو تھپکنے لگی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ کیا ہوا اگر دیوتا کو وہاں سُندر رانیاں مل جاتی ہیں۔ کبھی تو اُسے گھر کی یاد ستائے گی ہی اور پھر وہ آپ ہی آپ ادھر چلا آئے گا۔

دیوندر ستیارتھی

زِندگی اِک فریب ہے پیارے

افراد

جمیل:۔ ایک منچلا نوجوان۔ جو اپنے گھر کی چار دیواری سے تنگ آکر کلب کا ممبر بن گیا تھا۔ اور اب کافی عرصے سے مستقل طور پر یہیں رہتا ہے۔

ہمزہ:۔ کلب گھر کا خدمتگار۔

نرگس:۔ ایک نوجوان آزاد خیال خاتون۔ جو ہر روز کلب کے حوض میں تیرنے کے لئے آتی ہے۔ اور اپنی خوش مزاجی اور حسن کے باعث کلب والوں کو بہت عزیز ہے۔

مسعود اور اسکی بیوی زہرہ } جمیل کے دوست۔ شروع شروع میں کبھی کبھار جمیل سے ملنے آجاتے تھے۔ اب دونوں کلب کے سرگرم ممبر ہیں۔

منظر:۔ انجمن آرا کلب۔ کسی زمانے میں کاروباری زندگی سے اکتائے ہوئے چند تاجروں نے اس کلب کی داغ بیل ڈالی تھی۔ کہ کام کاج سے فراغت پاکر، یہاں دو گھڑی دل بہلا لیا کریں۔ جب یہاں کی تفریح کیرم، تاش اور شطرنج کے معصوم مشغلوں تک محدود تھی۔ آج یہ کلب ہر بڑھے لکھے، خوشحال شخص کی مرغوب آرامگاہ بنا ہوا ہے۔ نئے زمانے کی تمام ضروریات سے آراستہ ہے۔ اور اس میں ممبروں کی تفریح اور کھیل کود کے سامان کے علاوہ مستقل رہائش کا انتظام بھی ہے۔

جمیل:۔ (گنگنا رہا ہے شعر)

ہمزہ:۔ (داخل ہوتا ہے) سوڈا لیجیے، جمیل میاں!

جمیل:۔ رکھدو۔

(ہمزہ سوڈے کی بوتل کھولتا ہے اور گلاس میں انڈیلتا ہے۔)

جمیل:۔ (اب شعر گاتا ہے۔) ؎

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ہمزہ!

ہمزہ:۔ جی حضور!

جمیل:۔ بھئی اگر کوئی شخص یہی شعر کسی خوبصورت دوشیزہ کو سُنائے، تو بھلا وہ کیا کہے؟

ہمزہ:۔ صاحب، یہ سوال تو آپ کو کسی لڑکی سے پوچھنا چاہیئے۔

جمیل:۔ پھر بھی؟

ہمزہ:۔ اگر میں لڑکی ہوں اور مجھے کوئی ایسا شعر سُنائے۔ تو میں تو اسکے مُنہ پر ایسا تھپڑ رسید کروں کہ حضرت کا سارا نشہ ہرن ہو جائے۔

جمیل:۔ لیکن اگر تم اس شخص کو چاہتے ہو، تو؟

ہمزہ:۔ اجی سرکار ان فرضی باتوں سے فائدہ! نہ تو میں لڑکی ہوں، کہ مجھ سے کوئی نوجوان محبت کا دم بھرے، اور نہ میں اس لائق ہوں کہ کسی لڑکی سے چھیڑ چھاڑ کی جرأت کروں۔ لیکن آپ کو یہ خیال آیا کیونکر؟

جمیل:۔ یونہی!

ہمزہ:۔ آپ خود کیوں نہیں آزما لیتے؟

جمیل:۔ یعنی؟

ہمزہ:۔ مس نرگس کو سنائیے نا یہ شعر۔ دیکھئے کیا کہتی ہیں!

جمیل:۔ نرگس!؟

ہمزہ:۔ (کھسیانے پن سے) بھول ہوگئی سرکار۔

جمیل:۔ کیا مطلب؟

ہمزہ:۔ آپ خفا تو نہیں ہوگئے؟ میں معافی چاہتا ہوں۔

جمیل:۔ نہیں بھائی۔ اس میں ناراض ہونے کی کون سی بات ہے۔

ہمزہ۔ (سہم کر) مجھ سے غلطی ہوگئی حضور۔ مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔

جمیل۔ ارے میاں تم نے میرا کونسا قصور کیا ہے جو یوں سہمے ہوئے باتیں کر رہے ہو ۔۔۔ مگر۔ مگر۔ یہ نرگس کا خیال تمہیں کیسے آیا؟

ہمزہ۔ اجی صاحب کلب کا ہر شخص واقف ہے۔ کہ آپ اور مس نرگس دونوں ایک دوسرے پر مرتے مٹتے ہیں۔

جمیل۔ کیا کہا؟ دونوں؟ ایک دوسرے پر؟

ہمزہ۔ جی سرکار۔

جمیل۔ (قہقہہ لگا کر) بڑے میاں! اس بار تمہارا تیر نشانے پر نہیں بیٹھا۔

ہمزہ۔ تو پھر مجھے ہی دھوکا ہوا ہوگا، سرکار۔

جمیل۔ ہم نے تو آج تک کبھی ایک دوسرے سے بات تک نہیں کی۔

ہمزہ۔ سرکار، عقلمند آدمی کیلئے بس ایک اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔

جمیل۔ ارے میاں، اس نرگس کو ہم آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام!

ہمزہ۔ وہ جس انداز سے آپ کو دیکھتی رہتی ہیں، شاید آپ نے اس پر غور نہیں کیا۔

جمیل۔ مجھے دیکھتی رہتی ہیں!؟

ہمزہ۔ سرکار اس بات کا چرچا تو کلب کے کونے کونے میں ہے۔

جمیل۔ ارے یار لوگ تو یوں ہی بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں۔

ہمزہ۔ (طنزیہ ہنسی) میاں صاحب یہ خاکسار کچی گولیاں نہیں کھیلا۔ سات سال سے اسی کلب میں کام کر رہا ہوں۔ جب کبھی یہاں کوئی عورت شکار پر آمادہ ہوتی ہے تو میں اُسے ایک نظر میں بھانپ لیتا ہوں ۔۔۔ اب آپ شاید یہ بھی کہنے لگیں کہ آپ نے تو مس نرگس کو کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

جمیل۔ (خوش مزاجی سے) اچھا بھائی تم جیتے! مجھے سچ مچ مس نرگس سے بڑا لگاؤ ہے۔

ہمزہ۔ اور مس نرگس بھی آپ کو کچھ کم نہیں چاہتیں۔ مگر۔ مگر۔ سرکار۔ میری اور آپ کی بات ہے۔ کسی سے کہہ نہ دیجئے گا کہ یہ بات میری زبان سے نکلی ہے۔ ورنہ مجھے نوکری سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

جمیل۔ خاطر جمع رکھو۔ میں کسی سے نہیں کہونگا۔

مس نرگس۔ (داخل ہوتی ہے) جمیل صاحب آپ نے مسٹر منصور کو تو نہیں دیکھا؟

جمیل۔ معاف کیجئے گا، مجھے علم نہیں ۔۔۔ ہمزہ! تمہیں معلوم ہے۔ منصور صاحب کہاں ہیں؟

ہمزہ۔ نہیں سرکار۔

نرگس۔ نجانے حضرت کہاں چل دئے۔

ہمزہ۔ شاید گھر گئے ہوں، بیگم صاحب سے ملنے۔

نرگس۔ بیگم صاحب سے؟ پاگل ہوئے ہو! اچھا جب وہ آئیں تو انہیں یہاں بھیج دینا۔

جمیل۔ منصور صاحب آئیں تو انہیں فوراً مس نرگس کا پیغام دے دینا۔

ہمزہ۔ بہت اچھا حضور (جاتے ہوئے) کسی چیز کی ضرورت ہو تو آواز دے لیجئے گا۔

جمیل۔ اچھی بات!

نرگس۔ جمیل صاحب! میں مُخل تو نہیں ہوئی۔

جمیل۔ اجی نہیں۔

نرگس۔ کیا کتاب ہے یہ؟ میں بھی دیکھوں۔ معاف کیجئے گا میں کسی کو کچھ پڑھتے دیکھوں تو کتاب کا نام پوچھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں سمجھتی ہوں کتابوں سے، پڑھنے والے کی طبیعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کیوں؟ (وقفہ) شاید آپ کو اس بارے میں مجھ سے اتفاق نہیں۔

جمیل۔ بھئی کتابیں کتابیں ہیں میں نہیں مانتا۔ میرے خیال میں الفاظ انسان کو دھوکا دیتے ہیں۔

نرگس۔ بات تو معقول معلوم ہوتی ہے۔

جمیل۔ اور پھر یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ آیا پڑھنے والے کو کتاب لکھنے والے سے اتفاق بھی ہے یا نہیں۔ کسی آدمی کو اُس کی باتوں یا اُس کے مطالعے کی کتابوں سے جانچنا مناسب نہیں۔ میرے ایک دوست ہیں۔ وہ حضرت جب کبھی گھوڑے کا ذکر کرتے ہیں۔ تو اُسے گھوڑا کہنے کے بجائے بنی نوع انسان کے خیر خواہ دوست کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

نرگس۔ جانوروں کے شوقین ہونگے، شاید!

جمیل۔ جانوروں کے تو نہیں، البتہ گھوڑ دوڑ کے ضرور شائق ہیں۔

نرگس۔ (برہم ہو کر) آپ تو میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ آپ کو بھی گھوڑ دوڑ کا شوق ہے؟

جمیل۔ کبھی کبھی چلا جاتا ہوں۔

نرگس۔ میرا تو خیال تھا کہ آپ کو ان چیزوں کے لئے کہاں وقت ملتا ہوگا۔

جمیل۔ (پُر معنی انداز سے) میں ہر دلچسپ چیز کے لئے وقت نکال لیا کرتا ہوں۔

نرگس۔ (ذرا بے تکلفی کے انداز سے) ہوں ہوں! ۔ اور وقت کا مصرف

ہی کیا ہے! آئیے، دیوانِ حسرت سے فال نکالیں۔ دیکھیں کیا نکلتا ہے، وقت کے مصرف کے بارے میں۔

جمیل۔ دائیں صفحے کا آٹھواں شعر پڑھیے۔

نرگس۔ (کتاب کھولتی ہے) دایاں صفحہ۔ آٹھواں شعر۔ یہ لیجیے۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ۔ یہ رہا ــــ لکھا ہے ؎

آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں
زلف کی، رخسار کی باتیں کریں

جمیل۔ کتنا موزوں شعر ہے۔ کاش، لوگوں میں اتنی جرأت ہوتی۔

نرگس۔ یا وہ اتنے خوش مذاق ہوتے!

جمیل۔ کیا آپ کا یہی نظریہ ہے؟

نرگس۔ آپ اس سے کوئی بہتر نظریہ بتا سکتے ہیں؟

جمیل۔ (غور کرتے ہوئے) مجھے، تو، نہیں سوجھتا ــــ آپ، مجھے اپنا شاگرد کیوں نہیں بنا لیتیں!

نرگس۔ دیکھیے! آپ کو شاگرد بننے سے پہلے اپنے سلیقے کا ثبوت دینا پڑے گا۔

جمیل۔ بھئی نیک بننا میرے بس کا روگ نہیں۔ اور جو چاہیں، کرنے کے لئے حاضر ہوں۔

نرگس۔ نیک بننا ہی تو اصلی شرط ہے۔

جمیل۔ لیکن میری نیکی سے بے نیازی ہی تو مجھے دلچسپ بناتی ہے۔

نرگس۔ ہر شخص کی دلچسپی کا یہی راز ہے ــــ تو میری شرط منظور ہے آپ کو؟

جمیل۔ بھئی کوشش کرونگا نیک بننے کی، مگر کبھی کبھار ــــ

نرگس۔ یہ کبھی کبھار ہمیں منظور نہیں۔

جمیل۔ بھئی بڑی کڑی شرط لگائی ہے آپ نے!

نرگس۔ تو منظور ہے؟

جمیل۔ لیکن یہ بتائے دیتا ہوں کہ میں کبھی زیادہ دیر تک نیکی کا ڈھونگ قائم نہیں رکھ سکتا۔

نرگس۔ بہت عمر پڑی ہے۔ سیکھ لیجے گا۔

جمیل۔ آپ کی خوشی!

نرگس۔ تو منظور ہے؟

جمیل۔ ہے تو مگر زبردستی ہے ــــ اور کچھ فرمائیے۔

نرگس۔ آپ کئی ہفتوں سے مجھے گھور رہے ہیں ــــ میں جاننا چاہتی ہوں کہ مجھ میں کونسا ایسا سرخاب کا پر لگا ہے، جو آپ کی نظریں میرے چہرے سے نہیں ہٹتیں۔

جمیل۔ آپ کو!

نرگس۔ جی ہاں۔

جمیل۔ آپ۔ آپ۔ بے حد خوبصورت ہیں!

نرگس۔ (طنز سے) جی! جیسے آپ سچ مچ یہی سمجھتے ہیں!

جمیل۔ نرگس! میں سچ مچ یہی محسوس کرتا ہوں! میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ــــ

نرگس۔ (فوراً) آپ رک کیوں گئے۔

جمیل۔ (آہ بھر کر) میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ تم واقعی بے حد خوبصورت ہو۔

نرگس۔ آپ کو مجھ میں اور کیا پسند آیا؟

جمیل۔ تمہاری خوش مزاجی!

نرگس۔ اس کلب میں خوش مزاجی کی بیحد ضرورت ہے۔ میں خوش مزاج نہ ہوتی، تو اب تک میں نے اِن لوگوں سے اکتا کر کسی ایک آدھ کا ضرور گلا گھونٹ دیا ہوتا۔

جمیل۔ سچ مچ!

نرگس۔ (غصے سے) اور کیا۔ میں تو خوشی خوشی یہاں کے بیشتر ممبروں کا سر پھوڑ ڈالوں! (طنز سے) آزاد خیال لوگوں کا کلب کیا، اچھا خاصہ مذاق ہے۔ مجھے ممبر بنے تین مہینے ہوگئے۔ مگر اس عرصے میں مسعود اور زہرہ کے علاوہ صرف تم ایسے شخص ہو، جس میں انسانیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ باقی سب تو ہمیشہ اپنی روحوں کا رونا روتے رہتے ہیں۔

جمیل۔ بھئی مجھے تو اِن روح بازوں کے ساتھ پورے تین سال ہوگئے۔

نرگس۔ تعجب ہے۔ ابھی تک آپ کے ہوش قائم ہیں۔

جمیل۔ امید تو ہے۔ اچھا تو آپ کو مسعود اور اُن کی بیوی پسند آئیں؟

نرگس۔ نہایت اچھے لوگ ہیں۔ آپ کی تو اُن سے پرانی دوستی ہے؟

جمیل۔ ہاں۔ ہمارا مذاق ملتا جلتا ہے۔ میرے دوست اُن کے دوست ہیں، اور اُنکے میرے ہیں۔

نرگس۔ اُن کی آپس کی محبت دیکھ کر میرا دل خود بخود اُن کی طرف کھنچتا ہے۔

جمیل۔ میاں بیوی کے پیار سے بڑا اثر ہوتا ہے تمہارے دل پر!

نرگس۔ ہاں۔

جمیل۔ تمہاری اُن سے کب ملاقات ہوئی تھی۔

نرگس۔ جس روز ممبر بنی۔ اُسی دن سے اُن سے واقفیت ہے۔ آپ بھی تو موجود تھے ــــ یاد نہیں۔

جمیل۔ کیا میں وہ رات کبھی بھول سکتا ہوں!

نرگس۔ (بن کر) کیوں بن رہے ہیں آپ!

جمیل۔ یقین نہیں آتا؟

نرگس۔ بھلا میں نے اُس رات کس رنگ کی ساری پہنی تھی۔

جمیل۔ آسمانی رنگ کی۔

نرگس۔ (خوش ہوکر) تو تمہیں یاد ہے۔

جمیل۔ لیکن جب تمہارے سر کے بالوں کا اندازہ کچھ اور تھا ـــ تمہاری زلفیں تمہارے شانوں پر یوں بل کھا رہی تھیں جیسے ہوا میں دو کالے ناگ لہرا رہے ہوں۔

نرگس۔ (خوش ہو کر) تمہیں یہ بھی یاد ہے! لو میں پھر اسی طرح کئے دیتی ہوں۔ کیا تمہیں میرے بالوں کا یہ انداز بہت پسند ہے؟

جمیل۔ دیکھوں۔

نرگس۔ کیسے لگتے ہیں؟

جمیل۔ نرگس! تم کتنی خوبصورت ہو! اگر میں شاعر ہوتا تو میں اِس سرزمین کے چپّے چپّے پر تمہارے حُسن کے گیت گاتا۔ میں نے ایسی سیاہ آنکھیں آج تک نہیں دیکھیں۔

نرگس۔ (پیار سے) میرے جمیل۔

جمیل۔ نجانے تم میں کیا بات ہے! جب تم اپنا سر ناز سے اُٹھاتی ہو تو تم میں ایک ایسی کشش پیدا ہوتی ہے، جس سے میں بیتاب ہو جاتا ہوں۔

نرگس۔ (پیار اور شرارت سے) یوں؟

جمیل۔ میری اپنی نرگس!

(وقفہ ایک سیکنڈ)

ہمزہ۔ (داخل ہوتا ہے) مس نرگس، آپ کا ٹیلیفون آیا ہے۔

نرگس۔ کہہ دو میں یہاں نہیں۔

ہمزہ۔ معاف کیجے گا۔ میں بتا چکا ہوں کہ آپ یہیں ہیں۔

نرگس۔ اچھا۔ آتی ہوں۔

ہمزہ۔ جمیل میاں۔ مسعود صاحب نے ٹیلیفون کیا تھا کہ ابھی آپ کے پاس آرہے ہیں۔

جمیل۔ مسعود صاحب آج اتنی جلدی کیسے آرہے ہیں۔ اور کچھ نہیں کہا؟

ہمزہ۔ نہیں سرکار۔

جمیل۔ اچھا تم جاؤ۔

ہمزہ۔ (جاتا ہے)

جمیل۔ نرگس تم جاکر اپنا ٹیلیفون سُن آؤ۔

نرگس۔ (سہم کر) جس وقت تم میرے بالوں کو چھو رہے تھے، تو ہمزہ داخل ہوا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھ نہ لیا ہو۔

جمیل۔ (تسلی دلاتے ہوئے) تو پھر کیا ہوا؟

نرگس۔ کچھ نہیں۔

جمیل۔ جاؤ ٹیلیفون سُن آؤ۔ ذرا جلدی لَوٹ آنا۔

نرگس۔ امّی ہونگی ٹیلیفون پہ۔ ابھی آئی۔ مسعود آتے ہی ہوں گے۔ جب تک اُن سے باتیں کرنا۔

جمیل۔ تمہارے ساتھ چلوں؟

نرگس۔ میں ہوا میں تو نہیں اُڑ جاؤں گی؟

جمیل۔ کیا پتہ!

نرگس۔ تمہیں اتنا خیال ہے میرا!

جمیل۔ تمہیں کچھ شک ہے اس میں؟

نرگس۔ اور تمہارے ان دعووں کے باوجود مجھے کیا کچھ نہیں کرنا پڑا۔ کہ تم سے محبت کی باتیں چھیڑ کر تمہیں محبت کرنے پر آمادہ کروں۔ جمیل! تم محبت کے ذکر میں ایسے کھوئے گئے تھے کہ تم محبت کرنا تو کم و بیش بھول ہی چکے تھے۔

ہمزہ۔ (داخل ہوتا ہے۔ ایک دو قدم چل کر۔ دُور سے) مس نرگس! مہربانی سے ٹیلیفون سُن لیجے۔ کوئی صاحب دیر سے انتظار کر رہے ہیں۔

نرگس۔ (جاتے ہوئے) زیادہ دیر نہیں لگاؤں گی جمیل۔

(وقفہ۔ ایک سیکنڈ)

(مسعود داخل ہوتا ہے۔)

جمیل۔ (اُسے دیکھتے ہی فوراً) ہیلو مسعود! ـــ ہیں! بہت پریشان نظر آتے ہو ـــ خیر تو ہے۔

مسعود۔ (پریشان ہو) عجب جان اُلجھن میں میری پڑی ہے۔

جمیل۔ مالی پریشانی؟

مسعود۔ اس سے بھی زیادہ خطرناک بات ہے! روپے پیسے کی بات نہیں عورت کا معاملہ ہے۔

جمیل۔ (ہلکی سی سرارت سے) ہُوں ہُوں ـــ بیٹھو بیٹھو! ـــ مسعود! اب خدا کے واسطے یوں نہ دیکھو۔ گویا دُنیا کا خاتمہ ہوا جاتا ہے۔ (ذرا شفقت سے) ہاں تو قصّہ کیا ہے؟

مسعود۔ بھئی کچھ نہ پوچھو۔ بڑی حماقت ہو گئی ہے۔

جمیل۔ (ہنستا ہے خوب) کی نہیں۔ ہو گئی ہے! خوب!

مسعود۔ (ذرا بگڑ کر) تمہیں تو ہر وقت مذاق کی سوجھتی ہے ـــ ہاں

توسنو۔۔۔ میرا مطلب دراصل کچھ بھی نہیں تھا۔ بس غلطی ہوتی چلی گئی اور اس سے پیشتر کہ میں اندازہ کرسکتا کہ میں کہاں پہونچ گیا ہوں۔

جمیل:۔ ہوں ہوں! میں سمجھا! (آہ بھر کر شرارت سے، بڑے ڈرامائی انداز میں) وہ خوبصورت تھی، بیحد خوبصورت! جب چودھویں کا چاند اپنے پورے جوبن پر تھا، اور ساری دنیا پر مکمل سکون اور اطمینان چھایا ہوا تھا تو عام انسانوں کی بے رونق بستیوں سے دور، مہتاب کی ٹھنڈی روشنی میں تمہاری اس سے خدا ساز ملاقات ہوئی ۔۔۔ تم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ اُن نور کے چشموں نے تم سے سرگوشی میں کہا: "مسعود آؤ اور اپنی ناہید کو پھول کی طرح اپنے پاؤں تلے مسل ڈالو" (زور سے ہنستا ہے)

مسعود:۔ (بگڑ کر) بالکل پاجی ہو۔

جمیل:۔ تو میں کچھ غلط کہہ رہا ہوں۔

مسعود:۔ (التجا اور پریشانی) پوری بات تو سن لی ہوتی۔

جمیل:۔ بھائی میرے، نئی روشنی کی عورت جب دلوں کو فتح کرنے نکلتی ہے، تو بڑی سے بڑی رکاوٹ بھی اس کی رفتار میں حائل نہیں ہوسکتی۔ البتہ اس کے راستے میں کہیں آئینہ آجائے تو وہ رک جانے پر مجبور ہوجاتی ہے۔

مسعود:۔ کاش میں بھی تمہاری طرح بے فکری سے اِن چیزوں کو دیکھنے کا عادی ہوتا۔

جمیل:۔ خوب! تو آپ اس خاکسار کو بے فکر خیال فرمارہے ہیں۔ (بڑی متانت سے) میرے عزیز! میں خود اس وقت دو سیاہ آنکھوں کی یاد میں بیقرار بیٹھا ہوں۔ لیکن خیر! یہ میرا ذاتی جنازہ ہے ۔۔۔ ہاں تو میں سمجھتا ہوں کہ صرف یہ معمولی سی لغزش تو جس کا تم نے ابھی ذکر کیا ہے، تمہاری پریشانی کا باعث نہیں ہوسکتی۔؟

مسعود:۔ اسے بھی میری بیوی کو اس بات کا شبہ ہوگیا ہے!

جمیل:۔ (ہنکر) بری بات۔ بہت ہی بری بات!

مسعود:۔ بری بات؟ ارے میاں دوزخ کہو، دوزخ!

جمیل:۔ ہوں ہوں!

مسعود:۔ اس واقعہ سے پہلے میں کبھی محسوس نہیں کرسکتا تھا۔ کہ مجھے زہرہ کتنی پیاری ہے۔

جمیل:۔ (ہلکی سی شرارت) جب مرد دیکھتا ہے کہ عورت اس کی گرفت سے نکلی جارہی ہے، تو اس کی محبت میں قابل قدر اضافہ ہوجایا کرتا ہے۔

مسعود:۔ میں زہرہ سے اس بات کو چھپانے کی خاطر ہر قربانی کرنے کو تیار ہوں۔ اس کو پتہ چل گیا تو وہ ایک منٹ میرے گھر میں نہیں ٹھہرے گی۔ اور پریشانی سے، مجھ سے یہ برداشت نہ ہوسکے گا۔۔۔ بالکل برداشت نہ ہوسکے گا۔

جمیل:۔ ہمت سے کام لو مسعود! ہوسکتا ہے، حالات اتنے خراب نہ ہوں، جتنا تم سمجھے بیٹھے ہو۔

مسعود:۔ زہرہ چلی گئی تو میں زہر کھالوں گا۔

جمیل:۔ (ڈانٹ کر) جذباتی مت ہو۔ ہوش کی دوا کرو۔

مسعود:۔ (بالکل بچوں کی طرح) تم مجھے ڈانٹ کیوں رہے ہو۔؟

جمیل:۔ اور نہیں تو ۔۔۔ تم تو بالکل بچوں کی سی حرکتیں کررہے ہو! ۔۔۔ ہاں تو تم کہہ رہے تھے کہ زہرہ کو تم پر شبہ ہے۔

مسعود:۔ پچھلے دو ہفتوں سے گم صم بیٹھی رہتی ہے۔ اور کبھی کبھی تو میری طرف ایسی نظروں سے دیکھتی ہے کہ میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے ۔۔۔ میں اُس کی ناراضی اُس کے شبہ کو لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ مگر محسوس ضرور کرتا ہوں۔

جمیل:۔ کوئی اور بات؟

مسعود:۔ (چڑ کر) تو گویا یہ کافی نہیں؟

جمیل:۔ احمق ہو مسعود۔ تم جو کچھ محسوس کررہے ہو، وہ چھوٹی سی آواز ہے جو ہم سب کو بزدل بناتی ہے۔ (ذرا ہنسکر) تمہارا ضمیر خراب ہے۔ اور کچھ نہیں۔

مسعود:۔ کاش میں یوں سمجھ سکتا!

جمیل:۔ زہرہ ایک نہایت جذباتی عورت ہے۔ اُسے اس بات کا علم ہوتا تو وہ یوں نچلی بیٹھی رہتی؟ وہ تو تمہارا ناک میں دم کردیتی۔ تمہیں جینا دوبھر ہوجاتا۔

مسعود:۔ (بچوں کی طرح) تم کہیں مجھے محض تسلیاں تو نہیں دے رہے۔

جمیل:۔ ایک لمحے کے لئے اپنی گھبراہٹ کو بھول جاؤ، اور ذرا دماغ پر زور دو.....،

مسعود:۔ کسی طرح اسکی لاعلمی کا یقین ہوجا۔ تو مجھے اطمینان ہوجاتا۔

جمیل:۔ اگر اُسے شبہ ہوتا تو وہ مجھ سے ضرور اس کا ذکر کرتی۔

مسعود:۔ (سیدھا سادا) یہ بات میرے دل کو لگتی ہے۔

جمیل:۔ (فوراً) اور کیا! وہ ایسی بات سنے اور چپکی ہوجائے۔ ناممکن!

مسعود:۔ تو تمہارا خیال ہے کہ مجھے کوئی اندیشہ نہیں کرنا چاہیئے؟

جمیل:۔ (بگڑ کر) تو آپ اب تک میری ساری بکواس کا مطلب ہی نہیں سمجھے۔

مسعود:۔ اس دل کمبخت کا کیا کروں۔ اسے جو یقین نہیں آتا۔۔۔ یوں بات تو تمہاری معقول معلوم ہوتی ہے۔

جمیل:۔ بیشک۔ مسعود! میری بات کان کھول کر سنو۔ تم ان بکھیڑوں میں پڑنے کے قابل نہیں ہو۔ میرا مشورہ مانو۔ اور اُس جادوگرنی سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرو۔

مسعود:۔ (بڑے اطمینان سے) اُس سے تو میں نے پچھلے ہفتے ہی تعلقات ختم کر دئے۔

جمیل:۔ کچھ کہا نہیں اُس نے؟

مسعود:۔ (آہ بھر کر) خاموش رہی

جمیل:۔ غالباً تم نے اُسے اطلاع دئے بغیر جدائی کی خبر سنائی ہوگی۔ اور اُسے یہ سوچنے کا موقع نہ مل سکا ہوگا کہ کونسی سنیما ایکٹریس کیطرح اس دردناک خبر پر آنسو بہائے۔

مسعود:۔ (سمجھاتے ہوئے) اُس کے حق میں ایسی ناانصافی نہ کرو۔ (ذرا جذبے سے) اسکے جذبات نہایت گہرے اور سچے تھے۔

جمیل:۔ (طنز سے) جانتا ہوں۔ جیسے تمہارے!

مسعود:۔ جمیل! میں نے اُس سے کبھی بیوفائی نہیں کی۔ مجھے اُس سے واقعی محبت تھی۔

جمیل:۔ میں نے تو ایک لمحے کے لئے بھی اس پر شک کا اظہار نہیں کیا۔

مسعود:۔ اگر تم اُسے ایک مرتبہ دیکھ لو، تو ساری بات تمہاری سمجھ میں آجائے۔

جمیل:۔ رنگ روپ کیسا تھا؟

مسعود:۔ دلفریب! بے حد دلفریب! بس اُس میں بیسیوں چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں، جو مردوں کے دل میں گھر کر جاتی ہیں۔ (اُس کو یاد کر کے) جب میرے سر میں درد ہوتا تو وہ اپنے نازک ہاتھوں سے میرا سر سہلاتی۔ اور مجھ سے کہا کرتی "مسعود! تمہارے بال سنبل کی طرح ملائم ہیں"

جمیل:۔ (ہنس کر) بھئی واللہ! تو کیا تمہارے بال سچ مچ سنبل کے سے ہیں؟

مسعود:۔ سنبل تو کیا، بادام کی طرح کہہ لو۔

جمیل:۔ خیر جو ہوا اچھا ہوا! تمہیں سبق مل گیا۔ اگر پھر کوئی عورت تم سے کہے "تمہارے بال سنبل کی طرح ملائم ——"

مسعود:۔ (فیصلے سے) اب اور ہوگی جو نہیں۔

جمیل:۔ بھائی میرے! کچھ کہا نہیں جاتا۔ نجانے کب، کوئی نئی آفت آن پڑے!

مسعود:۔ بھئی مجھے تو کان ہو گئے —— جمیل! سچ مچ تم نے اس آڑے وقت میں میری بڑی ڈھارس بندھائی۔ کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔

جمیل:۔ زندگی اک مذاق ہے پیارے! ہمارے جذبات ہماری عقل پر اور عقل ہمارے جذبات پر غالب آنا چاہتی ہے۔ مسعود! آئندہ کبھی عقل کا دامن نہ چھوڑنا۔ شادی شدہ آدمی کی خیریت اسی میں ہے۔

مسعود:۔ بھئی جمیل تمہاری نصیحت پر عمل نہ کروں تو جو چور کی سزا سو میری سزا۔ مگر۔ مگر جمیل! مجھے تعجب ہوتا ہے کہ تم نے شادی کیوں نہیں کی۔

جمیل:۔ مجھے اس بات میں کوئی معقولیت نظر نہیں آتی، کہ میری آمدنی تو آدھی رہ جائے۔ اور میری ذمہ داریاں دگنی ہو جائیں۔

مسعود:۔ ایک نہ ایک دن تمہیں بھی اس میں معقولیت نظر آنے لگے گی۔

جمیل:۔ (بے پروائی سے) ممکن ہے۔

مسعود:۔ اور ہاں میں اپنی پریشانی میں تم سے پوچھنا بھول گیا۔ کون ہے، وہ سیاہ آنکھوں والی، جس کا تم نے شروع میں ذکر چھیڑا تھا۔

جمیل:۔ مسعود! میں ابھی اُسی کو یاد کر رہا تھا۔ وہ ——

مسعود:۔ (گھبرا کر فوراً) غضب ہوگیا!

جمیل:۔ کیا ہوا؟

مسعود:۔ میری بیوی اور مس نرگس چلی آرہی ہیں۔

جمیل:۔ تو انہیں دیکھکر آپ زرد کیوں ہوگئے؟

مسعود:۔ (گھبرا کر) کیا کروں اب! ابھی مجھ سے اُس کی نظریں نہیں سہی جاتیں۔ سارا بھانڈا پھوٹ جائیگا۔

جمیل:۔ (سرگوشی میں) ہمت کرو۔ بچے مت بنو۔

مسعود:۔ (گھبرا کر اپنے آپ سے) وہ اس وقت یہاں کیسے آرہی ہے؟ وہ تو کہتی تھی۔ میں لیکچر سننے جارہی ہوں۔

جمیل:۔ چپکے ہو جاؤ۔ نچلے بیٹھو۔ وہ کتاب اٹھالو۔

مسعود:۔ (گھبرا کر) میں... میں میں ——

جمیل:۔ (تسلی سے) گھبراؤ مت۔ اطمینان سے بیٹھو —— (ڈانٹ کر) مسعود؟

مسعود:۔ (گھبرا کر) کیا ہے؟

جمیل:۔ (ڈانٹ کر) کوشش کرو کہ لاش کی طرح پیلے نظر نہ آؤ۔

(زہرہ اور مس نرگس داخل ہوتی ہیں۔)

نرگس:۔ ہیلو مسعود!

مسعود:۔ (اپنی بیوی سے) زہرہ! تم یہاں کیسے آئیں؟

زہرہ:۔ اور جناب یہاں کیسے؟ تم تو لیکچر سننے جا رہے تھے۔

جمیل:۔ میں نے مسعود کو روک لیا۔ میں اس سے باتیں کرتا رہا۔

زہرہ:۔ (طنز سے) خوب! مسعود لیکچر سننے نہیں جا سکا تو لیکچر یہاں آگیا۔ خیر اچھا ہوا کہ تم یہاں ہو۔ ایک کام کرو مسعود میری جان۔ نرگس ٹینس کھیلنا چاہتی ہے۔ جاؤ اسکے ساتھ دو ایک سیٹ کھیل آؤ۔

مسعود:۔ لیکن زہرہ! سنو تو ـــــ

زہرہ:۔ (فوراً کاٹ کر) نرگس، لے جاؤ مسعود کو۔

نرگس:۔ مسعود! چل بھی دو۔

مسعود:۔ چلئے۔

زہرہ:۔ نرگس دیکھنا! مسعود کو صحیح سلامت واپس لے آنا۔

نرگس:۔ خاطر جمع رکھو۔

(مسعود اور نرگس جاتے ہیں۔)

جمیل:۔ زہرہ! یہ کیا پاگل پنے کی بات کی تم نے!

زہرہ:۔ میں تم سے آج ضروری ملنا چاہتی تھی۔

جمیل:۔ وہ تو جس طرح تم نے نرگس اور مسعود سے پیچھا چھڑایا اُس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔

زہرہ:۔ میں پھر اور کیا کرتی۔ جلدی میں مجھے اور کوئی بہانہ سوجھا نہیں۔ مجھے تم سے چند ضروری باتیں کرنی تھیں۔

جمیل:۔ کہو کیا بات ہے؟

زہرہ:۔ (سرگوشی میں) مسعود کو ہم دونوں پر شبہ ہے۔

جمیل:۔ کیا؟

زہرہ:۔ اُسے ہم پر شبہ ہے جمیل۔

جمیل:۔ واہیات۔

زہرہ:۔ (سہمی ہوئی) کاش ایسا ہی ہوتا۔

جمیل:۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو زہرہ۔ میں آج کتنی دیر اُسے بڑے بوڑھوں کی طرح لیکچر پلاتا رہا ہوں۔ اگر اُسے ذرا بھی ہم پر شبہ ہوتا تو وہ بھیگی بلی بنا میری باتیں سنا کرتا!؟

زہرہ:۔ اُسے تو آج لیکچر سننے جانا تھا۔ وہ یہاں کیوں آیا؟

جمیل:۔ پھرتے پھراتے ادھر آنکلا۔

زہرہ:۔ لیکن وہ تو کبھی ایک لیکچر سے بھی غیر حاضر نہیں ہوتا۔ پچھلے ہفتے اُسے اُٹھتے بیٹھتے لیکچر کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہ تھا ـــ اور، پھر اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم عام طور پر اس وقت یہاں اکیلے ہوتے ہو۔ اُسے یہاں آنے کو تم سے کہا تھا؟

جمیل:۔ (وقفے کے بعد) نہیں تو۔

زہرہ:۔ ذرا غور کرو جمیل! مسعود اتنا سیدھا نہیں جتنا دکھائی دیتا ہے۔

جمیل:۔ بجنا! بڑا کائیاں ہے۔

زہرہ:۔ تم مسعود سے کیا باتیں کرتے رہے ہو۔

جمیل:۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ کم از کم ـــــ

زہرہ:۔ کیا؟

جمیل:۔ تعجب ہے!

زہرہ:۔ (غصے سے چڑ کر) آئیں بائیں شائیں نہ کرو۔ صاف صاف بات کہو ـــ

جمیل:۔ (نرم ڈانٹ سے) نچلی بیٹھو۔ اِس طرح گلا پھاڑ پھاڑ کر باتیں کرنے سے فائدہ۔ تم اسی طرح شور مچاتی رہیں، تو میں کبھی اپنے خیال یکجا نہیں کر سکوں گا۔

زہرہ:۔ (ذرا بگڑ کر) اپنے خیالوں کو رہنے دو۔ تم یہ بتاؤ مسعود کیا کہہ رہا تھا؟

جمیل:۔ ایک اناڑی نوجوان کے متعلق مشورہ کر رہا تھا، جو حال ہی میں کسی مصیبت کا شکار ہوا ہے۔

زہرہ:۔ کسی لڑکی کے بارے میں؟

جمیل:۔ ہاں ـــ اُس کی بیوی کو اس بات کا شبہ ہو گیا ہے ـــ اور ـــ

زہرہ:۔ دیکھا ـــ میں نہ کہتی تھی۔

جمیل:۔ کیا مطلب؟

زہرہ:۔ (پریشانی) اب کیا کیا جائے؟

جمیل:۔ ہمیں اس سے کیا پڑی ہے!

زہرہ:۔ (طنز سے) تم تو دودھ پیتے بچے ہو۔ وہ اناڑی نوجوان جناب آپ ہی ہیں۔

جمیل:۔ کیا کہہ رہی ہو زہرہ؟

زہرہ:۔ مسعود نے ہمارے ہی تعلق کو الٹ پھیر کر، دوسرے پیرائے میں پیش کر دیا ہے۔ آپ اتنے حیران نہ ہوجئے! میں جو کہتی ہوں ٹھیک ہے ـــ!

جمیل:۔ بالکل غلط ہے۔

زہرہ:۔ (طنز سے) غلط کیسے ہے۔ یاد نہیں تمہیں آج سے پندرہ دن پہلے مسعود کو نوشہرے ہونا چاہئے تھا۔ مگر وہ نوشہرے کی بجائے نازی کی ہوا کھا رہا تھا۔ مسز بٹیری والا اس بات کی گواہ ہیں۔

جمیل:۔ (طنز سے) اب تم یہ بھی کہو گی کہ وہ ایک عورت کی بانہوں میں بانہیں ڈالے رنگ رلیوں میں مصروف تھا؟

زہرہ:۔ (گھبرا کر) تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا!

جمیل:۔ یہ سارا قصہ اتنا لغو ہے کہ اس کا ذکر کرنا سراسر دیوانگی ہے۔ (ہنس کر) مسعود کسی دوسری عورت کے ساتھ۔ (قہقہہ لگاتا ہے۔)

کتنی انہونی بات ہے۔
زہرہ:۔ اِسی بات پر تو میں بھی تھی کہ یہ سب جھوٹ ہے۔
جمیل:۔ (خوش مزاجی سے) زہرہ بعض اوقات تو حد کر دیتی ہو تم۔ رائی کا پہاڑ بنانا تمہارے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے ـــ مسعود نے غصے سے تمہاری طرف دیکھا تو تمہاری آنکھوں کے سامنے طلاق نامہ ناچنا شروع کر دیتا ہے۔
زہرہ:۔ بات کہیں سے کہیں جا پہنچی ہے جمیل۔ مسعود پچھلے دو ہفتوں سے بالکل گم سم بیٹھا رہتا ہے۔ زبان سے ایک لفظ نہیں کہتا۔ مگر اسکے رویہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُسے کوئی چیز ستا رہی ہے۔
جمیل:۔ زہرہ تم ابھی نوشہرے کا ذکر کر رہی تھیں۔ مسعود کو وہاں اچانک جانا پڑا۔ ان دنوں کلب کا ٹینس ٹورنمنٹ شروع تھا۔ اور وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اُسے میچ کب کھیلنا ہے۔ یہی بات دریافت کرنے کے لئے اُس نے مجھے نوشہرے سے خط لکھا تھا۔ اس سے غازی نگر میں جمیل کی ہواخوری اور مسز ہیڑی والا کی شہادت کی قلعی کھل جاتی ہے۔
زہرہ:۔ تو تم نے مجھے یہ بات پہلے کیوں نہ بتائی؟ کیا یہ بات صحیح ہے۔
جمیل:۔ بالکل ـــ میرا خیال ہے، وہ نوشہرے والا خط تو اب بھی یہاں کہیں پڑا ہوگا۔
زہرہ:۔ (اطمینان کی آہ) اب تو ہم کو کسی قسم کا خطرہ نہیں؟
جمیل:۔ اطمینان رکھو۔
زہرہ:۔ (اطمینان) خدا کا ہزار ہزار شکر ہے۔
جمیل:۔ زہرہ! اب اس واقعے کو بھول جاؤ۔ خدا کی قسم! تم نے تو یہ بات سنا کر مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔
زہرہ:۔ اور جو مجھے پریشانی ہوئی ہے۔ اس کا ذکر ہی نہیں ـــ اصل میں حالات ہی ایسے تھے کہ پریشانی کے علاوہ چارہ نہ تھا
جمیل:۔ حالات تو ہمیشہ ہی ایسے ہوتے ہیں
زہرہ:۔ شکر ہے میرا خیال غلط ثابت ہوا ـــ جمیل میں تو آئندہ کے لئے کان پکڑتی ہوں۔
جمیل:۔ (وقفہ دو سیکنڈ) کیا سوچ رہی ہو زہرہ؟
زہرہ:۔ تمہارا اور میرا ساتھ ختم ہو چکا!
جمیل:۔ کیا؟
زہرہ:۔ ختم ہو چکا ـــ ہمیشہ کیلئے!
جمیل:۔ نہیں زہرہ! تم ایسا نہیں کر سکتیں۔
زہرہ:۔ میں کر جو رہی ہوں ـــ مسعود مجھے بیحد عزیز ہے ـــ میں اُسے کسی قیمت پر بھی کھونا نہیں چاہتی۔

جمیل:۔ تمہیں اُس کا اتنا خیال ہے!
زہرہ:۔ خیال سے بہت کچھ زیادہ ـــ مجھے اُس کے چھن جانے کا خیال آتا تھا، تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ تم نہیں اندازہ کر سکتے کہ میں نے کتنی مصیبت اُٹھائی ہے۔
جمیل:۔ واقعی؟
زہرہ:۔ (روتی آواز) مسعود بیچارا اتنا اچھا ہے۔ اور میں... (رو دیتی ہے) میں اصل میں اُس کے قابل ہی نہیں۔
جمیل:۔ (مایوسی) میرا کیا ہوگا زہرہ؟
زہرہ:۔ مجھے معاف رکھو جمیل!
جمیل:۔ تو۔ یہ۔ آخری فیصلہ ہے تمہارا؟
زہرہ:۔ بالکل قطعی۔
جمیل:۔ (بڑی لمبی آہ بھر کر) اس عشقِ خوش آغاز کا انجام تو دیکھو!
زہرہ:۔ تمہیں کوئی اور مل جائیگی۔
جمیل:۔ کیوں زخموں پر نمک چھڑکتی ہو!
زہرہ:۔ میں نے نادانستہ یہ بات کہہ دی۔
جمیل:۔ جبھی تو زیادہ ٹھیس لگی ہے (آہ بھر کر) اچھا بھئی۔ قسمت میں یہی لکھا تھا ـــ میں سمجھتا ہوں، بھلائی اسی میں ہے۔
زہرہ:۔ سچ مچ تم یہی سمجھتے ہو؟
جمیل:۔ اور کیا؟
زہرہ:۔ سچ کہتے ہو۔
جمیل:۔ سچ کہہ رہا ہوں زہرہ۔
زہرہ:۔ ہونہہ! کسی نئی عورت پر آنکھ ہوگی تمہاری!
جمیل:۔ (بھونچکا ہو کر) کیا کہہ رہی ہو زہرہ!
زہرہ:۔ مجھے اُلو نہ بناؤ جمیل ـــ بتاؤ کون ہے یہ نئی عورت؟
جمیل:۔ اگر تم اسی بات سے خوش ہوتی ہو تو ـــــ،
زہرہ:۔ (چمک کر) میری بات سنو جمیل۔ تم کیا چاہتے ہو۔ میں تمہیں مرد سمجھوں یا جذبات کا ایک پلندا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم جس عورت کو دل سے چاہتے ہو اُسے تم کسی صورت ہاتھ سے نہیں نکلنے دیتے۔
جمیل:۔ تمہیں یاد نہیں رہا۔ کہ میں چاہوں تو جذبات کا پلندا بھی بن سکتا ہوں۔
زہرہ:۔ تم اس نفاست سے جھوٹ بول لیتے ہو کہ مجھے اپنی مرضی کے خلاف تمہاری باتوں پہ یقین کرنا پڑتا ہے۔

جمیل:۔ زہرہ! میں تمہیں بے حد چاہتا ہوں۔

زہرہ:۔ لیکن آپ کی محبت کاشعلہ پچھلے چند ہفتوں سے مدھم پڑ گیا ہے۔ اسے جھٹلانے کی زحمت گوارا نہ کیجے — عورت ان چیزوں کو ایک نظر میں بھانپ لیتی ہے — لیکن مجھے کوئی حسد نہیں — میں تو خود اکتا گئی تھی۔

جمیل:۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا۔

زہرہ:۔ اتنے خوش کیوں ہو رہے ہیں آپ؟

جمیل:۔ معافی چاہتا ہوں — (متانت سے) زہرہ، مسعود کا خیال رکھنا۔ ایسے شوہر کم ملتے ہیں۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ میرے دل میں اس کی کتنی عزت ہے۔

زہرہ:۔ میں سمجھ سکتی ہوں۔

جمیل:۔ ایک بات کا خاص طور پر خیال رکھنا۔ مسعود نے بڑی انوکھی طبیعت پائی ہے۔ اگر اسے کبھی غمگین دیکھو تو اس کا سر سہلا کر اس سے کہا کرو: مسعود! تمہارے بال سنبل کی طرح ملائم ہیں۔

زہرہ:۔ سنبل کی طرح! اچھا خیال ہے۔

جمیل:۔ وہ اس سے بہت خوش ہوگا۔

زہرہ:۔ اچھا جمیل — الوداع!

جمیل:۔ زہرہ! — میری جان!

زہرہ:۔ (فوراً) کوئی آرہا ہے۔

(نرگس داخل ہوتی ہے۔)

زہرہ:۔ نرگس، مسعود کو کہاں چھوڑ آئیں۔

نرگس:۔ ہم نے کھیل شروع ہی کیا تھا کہ وہ بیہودہ جعفر آدھمکا۔ منحوس مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اس لئے چلی آئی۔

زہرہ:۔ مجھے خود اس سے سخت نفرت ہے — حالانکہ میں سمجھتی تھی کہ میں ہر مرد سے، یہاں تک کہ جمیل سے بھی گھل مل کر بات چیت کر سکتی ہوں۔

جمیل:۔ میں تو کسی غیر عورت سے بے تکلف نہیں ہو سکتا۔

زہرہ:۔ نرگس! تمہیں یقین آتا ہے اس کی بات پر؟

نرگس:۔ اس بات کا جواب دینے سے پہلے میں تم سے چند سوال کرنا چاہتی ہوں۔

زہرہ:۔ میرے آنے سے پہلے تم دونوں یہاں تنہا تھے؟

نرگس:۔ تو کیا خلوت کوئی جرم ہے؟

جمیل:۔ میں تو نہیں سمجھتا کہ اس میں کوئی ہرج ہے۔

زہرہ:۔ میں اس تنہائی کو اتنا بے ضرر نہیں سمجھتی۔

جمیل:۔ مس نرگس ذرا غور کرو، زہرہ کی باتوں پر۔

زہرہ:۔ اچھا بھئی نرگس میں چلی۔ چل کے مسعود کا اس مردود جعفر سے پیچھا چھڑاؤں۔ خدا حافظ نرگس! خدا حافظ جمیل!

(چلی جاتی ہے۔)

نرگس جمیل:۔ خدا حافظ

جمیل:۔ زہرہ کا مطلب کیا ہو سکتا ہے ان باتوں سے؟

نرگس:۔ تمہیں جانو۔

جمیل:۔ میں؟

نرگس:۔ (خوش مزاجی سے) زہرہ اور تم پرانے دوست ہو۔ میرا خیال تھا تم ایک دوسرے کو خوب سمجھتے ہو۔

جمیل:۔ جی بجا!

نرگس:۔ اور نہیں کیا۔

جمیل:۔ جلنے لگیں اس سے!

نرگس:۔ اس سے جلے میری بلا۔

جمیل:۔ شکر ہے تمہیں کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔

نرگس:۔ (غصے سے) مجھے کیوں غلط فہمی ہونے لگی اس کے متعلق۔ کہاں میں اور کہاں وہ پینتیس برس کی بڑھیا۔ دیکھا نہیں، بالوں کو تو خضاب لگاتی ہے۔

جمیل:۔ بجا ہے زہرہ۔

نرگس:۔ (غصے سے) اس میں کونسا سرخاب کا پر لگا ہے جو میں اس سے جلوں

جمیل:۔ کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

نرگس:۔ (غصے سے) ہر بات پر ہاں میں ہاں ملائے چلے جاتے ہو۔

جمیل:۔ نرگس میری جان، اس لڑائی جھگڑے کا مطلب!

نرگس:۔ (غصے سے) تم مجھے جھگڑنے کا موقع ہی کیوں دیتے ہو؟

جمیل:۔ میں نے کیا کیا ہے؟

نرگس:۔ (طنز سے) ہونہہ۔

جمیل:۔ اس ہونہہ سے کیا مطلب ہے تمہارا؟

نرگس:۔ تمہاری اور زہرہ کی بہت گاڑھی چھنتی ہے نا۔

جمیل:۔ (ڈانٹ کر) نرگس تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے ہوئے۔ تمہیں اپنے اس شکی مزاج کا کچھ علاج کرنا چاہیے۔

نرگس:۔ (غصے سے) شکی مزاج۔ تم مجھ پر یہ الزام کیسے دھر سکتے ہو؟

جمیل:۔ زہرہ سے میری کئی سالوں سے بڑی گہری دوستی ہے ماداب

اس چیز کی طرف اشارہ کرنا ــــــ

نرگس۔ میں نے تو کسی چیز کی طرف بھی اشارہ نہیں کیا۔

جمیل۔ (ذرا چڑ کر) تو پھر اس لڑائی جھگڑے کے کیا معنی ہیں!

نرگس۔ (ذرا سے وقفے کے بعد) مجھے اس بدمزاجی کا افسوس ہے!

جمیل۔ (فوراً) ہمیں اس بات کو اب بھلا دینا چاہیے۔

نرگس۔ (وقفہ کے بعد لاڈ سے) جمیل! کیا میں سچ مچ تنک مزاج ہوں؟

جمیل۔ (نرمی سے) کوئی حد ہے تمہارے تنک دلی۔ (ذرا ہنسکر) اور تمہارا مزاج تو خدا کی پناہ!

نرگس۔ سچی جمیل! میں پہلے سے بتائے دیتی ہوں ــــ میری زبان میرے قابو میں نہیں رہتی۔

جمیل۔ میری جان میں کس منہ سے تمہیں ٹوک سکتا ہوں۔ میری اپنی طبیعت ذرا تیز واقع ہوئی ہے۔

نرگس۔ (نرمی سے) اچھا تو زہرہ کیا باتیں کر رہی تھی؟

جمیل۔ اسکے پاس باتیں کرنے کو مسعود کے علاوہ اور رکھا ہی کیا ہے ــــ اور مسعود نے کیا باتیں کیں تم سے؟

نرگس۔ اپنی بیوی زہرہ کے گیت گاتا رہا ــــ دونوں ایک دوسرے پر جیسے جان چھڑکتے ہوں۔

جمیل۔ شادی جو ہو چکی ہے ان کی۔

نرگس۔ شاید ہم بھی شادی کے بعد ایک دوسرے کو اسی قدر چاہنے لگیں۔

جمیل۔ ان سے کہیں زیادہ!

نرگس۔ مجھے ان میاں بیوی کی بے تکلفی دیکھکر حیرت ہوتی ہے۔ کیا مجال جو کبھی ایک دوسرے سے کوئی بات چھپا جائیں۔

جمیل۔ کیا کہنے ہیں انکی جرأت کے۔ بڑے آزاد خیال لوگ ہیں۔

نرگس۔ صرف آزاد خیالی نہ کہو۔ ان کی اس راستبازی میں کسی اور چیز کو بھی دخل ہے۔

جمیل۔ میری جان تم انکی تعریف کرتی ہو تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔ لیکن ایک بات سن رکھو۔ تعریف جب پرستش کی حد کو پہونچ جاتی ہے تو خطرے سے خالی نہیں ہوتی۔ بڑی بڑی مورتیوں کے پاؤں اسی مٹی کے ہوتے ہیں۔

نرگس۔ جمیل! سچ پوچھو تو مجھے زہرہ اور مسعود کی محبت بے مثال معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم ان سے سبق سیکھیں۔ ہم اپنی زندگی کی بنیادیں ایسی استوار کر لیں کہ بڑی سے بڑی پریشانی بھی انہیں اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے۔ میرے جمیل آؤ ہم زہرہ اور مسعود کو اپنی زندگی کا نمونہ بنا لیں۔

جمیل۔ کیا؟

نرگس۔ ان بے نظیر میاں بیوی کی زندگی کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔ (وقفہ) ــــ تم خاموش کیوں ہو گئے؟ کیا بات ہے؟

جمیل۔ تم مجھے چاہتی ہو نرگس؟

نرگس۔ (خوش مزاجی سے) ہاں جمیل، مگر تم نے یہ کیوں پوچھا؟

جمیل۔ اور اگر مجھ سے کبھی کوئی حماقت ہوئی ہو، تو اسے سنکر برا تو نہ مانو گی؟

نرگس۔ جمیل! دنیا کی کوئی چیز ہمیں جدا نہیں کر سکتی۔ کہو کیا بات ہے۔

جمیل۔ تمہیں سنکر صدمہ ہوگا۔

نرگس۔ (لاڈ سے) کہہ بھی چکو۔

جمیل۔ زہرہ سے مجھے عشق تھا۔

نرگس۔ (ذرا وقفے کے بعد) اسکی شادی سے پہلے؟

جمیل۔ کاش ایسا ہوتا۔ شادی کے بعد بھی رہا ــــ اب اس خیال سے افسوس ہوتا ہے۔ ہے نا افسوس کی بات۔

نرگس۔ اللہ جانے! انسان کو زندگی عجیب عجیب رنگ بدلتی ہے۔

جمیل۔ تو پھر؟

نرگس۔ میں تمہاری ہمت کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم نے ایسا راز مجھ سے کہہ دیا۔

جمیل۔ تم نے مسعود اور زہرہ کی تعریفوں کے پل باندھنے شروع کئے تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے سوچا کہ تم سے یہ بات چھپانا بڑی ناانصافی ہوگی۔

نرگس۔ میں بہت خوش ہوں کہ تم نے مجھے بتا دیا ــــ میں خود بھی جانتی تھی۔

جمیل۔ کیا مطلب؟

نرگس۔ میں نے تمہاری دو ایک باتیں دروازے کی آڑ میں کھڑے ہو کر سن لی تھیں۔ لیکن میں نے انہیں کوئی زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ ــــ آؤ جمیل، اس تکیئے پہ میرے قریب بیٹھو ــــ بھول جاؤ اس سارے واقعے کو!

جمیل۔ نرگس! نرگس!!

نرگس۔ تم خوش ہو نا، میری جان!

جمیل۔ بے حد خوش!

نرگس۔ جمیل! میری جان! تمہارے بال سنبل کی طرح ملائم ہیں۔

حفیظ جاوید

وفائے وعدہ

وہی.... ہے مسکراتی آرہی ہے ۔۔۔ مجھے اپنا بناتی آرہی ہے

وفا سے لَو لگاتی آرہی ہے ۔۔۔ تڑپتی۔ تلملاتی آرہی ہے

جو رازِ دل چھپاتی آرہی ہے ۔۔۔ تو گلدستہ بناتی آرہی ہے

کوئی وعدہ نہ کرلے "صنفِ مجبور" ۔۔۔ جھجکتی ہچکچاتی آرہی ہے

ہوا ہے نذرِ اُلفت نازِ خلوت ۔۔۔ کبھی تنہا نہ آتی۔ آرہی ہے

ڈرایا احتمالِ پاسباں نے ۔۔۔ رُکی۔ سمٹی۔ لجاتی آرہی ہے

دبا کے زور سے دانتوں میں اُنگلی ۔۔۔ "کوئی خطرہ" جتاتی آرہی ہے

انہیں قدموں پہ واپس ہو کے۔ پلٹی ۔۔۔ نقوش پامٹاتی آرہی ہے

سمن کے تختۂ دلکش سے گزری ۔۔۔ نیا رستہ بناتی آرہی ہے

جھٹکتی آرہی ہے زرد رومال ۔۔۔ "یہاں ہوں میں" بتاتی آرہی ہے

مٹر کی خوشنما بیلیں جہاں ہیں ۔۔۔ وہاں چھپتی چھپاتی آرہی ہے

ستم ڈھاتی ہوئی اوراقِ گل پر ۔۔۔ ہوا میں پھول اُڑاتی آرہی ہے

اِدھر سبزہ کیا پامالِ شوخی ۔۔۔ اُدھر ٹھوکر لگاتی آرہی ہے

وہ کانٹے دار تاروں کو اولانگا ۔۔۔ بہار آنچل اُڑاتی آرہی ہے

اُمنگوں پر ہے احساسِ جوانی ۔۔۔ بھرے شانے ہلاتی آرہی ہے

لٹیں ماتھے پہ گرتی جارہی ہیں ۔۔۔ ہٹاتی پھر ہٹاتی آرہی ہے

اندھیرا ہو چلا۔ اب کل ملیں گے ۔۔۔ مجھے کیا کیا ستاتی آرہی ہے

وہ فوارے کے چکّر کھل کے ٹھہری

مرے قبضے میں شانے پا کے ٹھہری

شاد عارفی

مکڑی کا جالا

چھٹے پھٹے برستے ہوئے بادلوں میں لپٹی ہوئی، سیلن اور کیچڑ میں تر، سردی سے ٹھٹھرتی، شروع ماگھ کی ایک سہ پہر شام کی طرف رینگے جا رہی تھی۔ سرد برفانی ہوا کی تند چھپکیں کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔

ایک زیر تعمیر قطعہ زمین کے کونے میں گھن کھائے بانسوں پر کھڑی گھاس پھوس، ٹین اور سرکنڈے کی ایک شکستہ جھونپڑی ان ہوا کے جھکڑوں میں ڈگمگا رہی تھی۔ اس کی لا تعداد جھولوں اور درزوں میں سے سردی کو لرزتی اور بھوک سے لڑکھڑاتی ہوئی غربت اپنے ارد گرد اونچے عالیشان مکانات میں سکونت پذیر خوشحالی کو حسرت بھری آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔

اس جھونپڑے میں ایک مزدورن گابھ سے پیدا ہونی چیتھڑوں کی بنی اوڑھنی اوڑھے زچگی کے درد سے جسم توڑ رہی تھی۔ جاڑے کی شدت اور کئی روز کی نیم فاقہ کشی نے اس اذیت کو ناقابل برداشت بنا رکھا تھا پل پل بعد دل ہلا دینے والی چیخیں مارتی اور لوٹ پوٹ ہوئے جاتی تھی۔ اس کا زرد بھیانک چہرہ اس انتہائی درد و بے چینی کا آئینہ دار تھا۔ اسکے سوجے ہوئے نچلے ہونٹ سے لعاب بہ بہ کر اس کی بے وضع میلی ٹھوڑی اور موٹی گردن کو تر کر رہا تھا۔ مزدورن کے قریب ہی اس کی چھوٹی لڑکی نمو پڑی ہوئی تھی جس کے سوکھے میلے نیم مردہ جسم میں متحرک دو مشتعل آنکھیں ہی زندگی کی واحد نشانی تھیں۔ جھونپڑی کی دوسری طرف مزدورن کی ساس دلی ٹانگیں پیٹ میں سکیڑے سردی سے ٹھٹھری بنی اوندھی لیٹی ہوئی تھی۔ مزدورن کا سب سے بڑا لڑکا کالو بازار میں مزدوری کرنے گیا ہوا تھا اور اس سے چھوٹی دلاری سات سال کی لڑکی ایندھن کے لئے مال گودام سے لکڑیاں چرانے گئی ہوئی تھی۔ مزدورن کی یہ پانچویں زچگی تھی۔

مزدورن کا خاوند مزدوری سے جلدی واپس آ گیا۔ اسی قطعہ زمین میں زیر تعمیر عمارت پر کام کر رہا تھا اور اپنی بیوی کی درد بھری چیخیں سن سن کر اسے کام کرنا ناممکن ہو رہا تھا۔ جھونپڑی کے قریب آ کر اس نے مزدورن کو مدھم شفقت آمیز لہجے میں آواز دی۔ "کیسی ہو چنڈی؟"

چنڈی درد زہ سے تڑپ رہی تھی۔ اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا مدھم مردنی دکھ بھری آنکھوں سے موتی کی طرف دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کی لیکن اسکی ٹھوڑی کانپنے لگی۔ نیچے لٹک گئی اور وہ اداس ہنسی اسکے زرد بے رونق ہونٹوں میں ہی رک گئی۔

موتی، چنڈی کے قریب آ بیٹھا اور اسکے اندر دھنسے ہوئے رخساروں کو تھپکنے لگا۔ چنڈی نے بھی اپنے کھردرے میلے لمبے لمبے ناخنوں والے ہاتھوں کو موتی کے بازوؤں پر ڈال دیا۔

"آج بھی کہیں سے پیسے ملے یا نہیں؟" چنڈی نے زیر لب پوچھا اور جواب کا انتظار کئے بغیر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ موتی کی مایوس آنکھوں سے اسے نفی میں جواب مل چکا تھا۔

ٹھیکیدار نے پچھلے دو ہفتوں سے مزدوری نہیں دی تھی اور انکے پاس پیٹ کی آگ بجھانے کیلئے کچھ بھی نہیں تھا۔

"منشی جی سے ہی کچھ مانگ لیا ہوتا!" چنڈی نے پر درد آواز میں کہا۔ "اماں کو بھی سندر لالہ کی دکان سے آٹا دال کچھ نہیں ملا۔"

"منشی بھی تو قصائی ہی کا کتا ہے۔" موتی مایوس اور بے بس لہجہ میں بڑبڑایا اور اس کا گلا بھر آیا۔

موتی ذرا پیچھے ہٹ کر آٹے کے خالی پیپے کا سہارا لیکر بیٹھ گیا اور سامنے لٹکی ہوئی رسی کو گھورنے لگا جو مکھیاں بیٹھنے سے کالی ہو گئی تھی۔ جھونپڑی اتنی غلیظ اور گرد آلود تھی کہ انتہائی سردی کے باوجود بھی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور چھت مکڑی کے جالوں سے اٹی ہوئی تھی۔ کافی دیر خاموشی کا بہرہ کرنے والا شور اس کے کانوں میں سائیں سائیں کرتا رہا۔ ایک بھیانک بے حسی اس کا مغز چاٹ رہی تھی۔ صرف چنڈی کی چیخیں اور دلی کی کھانسی کبھی کبھی اس وحشت خیز خاموشی میں مخل ہو رہی تھی۔

دلی نے اپنا منہ انکی طرف گھما لیا۔ ایک ناقابل بیان بھوک سب کے پیٹوں کو کرید رہی تھی۔

اسی عرصے میں دلاری بھی واپس آ گئی۔ بھوک سے اسکی انتڑیاں باہر نکل رہی تھیں۔ مال گودام تک کہاں جاتی۔ جو تھوڑے سے کاغذ لائی تھی کونے میں رکھ سہمی سہمی دادی کے قریب جا بیٹھی اور نزدیک پڑے ہوئے مٹکے پر سر ٹکا کر ماں کی طرف ترس بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

چنڈی کبھی آنکھیں کھولتی کبھی بند کرتی۔ اسے ہر صورت میں اندھیرا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بڑی بے صبری سے آنیوالی ڈراؤنی

ٹکڑوں کا انتظار کر رہی تھی۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کسی کی آہنی گرفت اس کی جان باہر نکالنے کی کوشش کر رہی ہے۔

موتی خاں میاں گھسیٹ کر چندی کے پاس آ بیٹھا۔ کام کی تھکاوٹ کی وجہ سے اُس کی ہڈیاں درد کر رہی تھیں۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر آج پھر اس کے پیٹ میں کچھ نہ گیا تو کل کام کیسے ہو گا۔ رلی کے پھولے ہوئے اندھے ڈھیلے کھوکھلے سے باہر نکل رہے تھے۔ دلاری کی ننھی جان بھی بھوک سے کھُل رہی تھی۔ چندی اسے قریب لیٹی ہوئی تھی تو سب کی طرف باری باری دیکھ کر کچھ کھانے کو مانگ رہی تھی۔ ایک عجیب خاموشی سب کے گلے کو گھیرے تھی۔ سب لالو کے کچھ کما لانے پر اُمیدیں لگائے ہوئے تھے۔

"پانی۔ پانی۔۔۔ پانی" چندی پھڑپھڑاتے خشک ہونٹوں میں بڑبڑائی۔

"خالی کلیجے پانی مت دینا" رلی اپنے آپ کو تھامتی ہوئی چلائی۔

"بڑا نازک وقت ہے۔ دو جانوں کا معاملہ ہے" یہ آواز بلغم سے اٹی ہوئی چھاتی سے بمشکل نکل رہی تھی۔

موتی خاموش رہا اور اپنی بے بٹن کُرتی سے جھانکتے کالے خشک بالوں کو کھجانے لگا۔ اُسے حجامت بنوائے کئی مہینے ہو گئے تھے۔ اُس کی دانتوں سے کاٹ یا چبا کر چھوٹی کی ہوئی ڈاڑھی مونچھیں لاتعداد چیونٹے چیونٹیاں معلوم دے رہی تھیں جو اُسکے نتھنوں میں گھُسے جا رہی تھیں۔ ایک اجنبی ملامت اُس کی انسوز میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ اُسے اپنی غربت پر غصہ کی بجائے اپنے آپ سے نفرت ہو رہی تھی۔ وہ غربت کی گود میں پیدا ہوا تھا۔ اُس نے فاقہ کشی کے ہنگوڑے میں بچپن جھولا تھا۔ لڑکپن کلفت اور فلاکت سے کھیل کر گزارا تھا۔ دکھ اور غم اُس کی زندگی کا حصہ بن چکے تھے لیکن اب پہلی دفعہ اس زبوں حالی پر ملامت اسکی رگ رگ میں سوزش پیدا کر رہی تھی۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی اُس کا خون کاٹ کر باہر نکال رہا ہے۔

"پانی ہائے پانی۔۔۔ میں مری" چندی نے پھر التجا کی اور کمزوری اور سردی سے لرزنے لگی۔

"خالی کلیجے پانی مت دینا" رلی نے پھر کھانستے ہوئے کہا "اگر کچھ ہو گیا تو کون سنبھالیگا۔ کھانڈ نمک ہی چٹا دو۔"

"پانی لاؤ۔ میں مٹی ہی چاٹ لیتی ہوں" چندی اپنے گرد آلود ہاتھ چاٹنے اور دانتوں کا میل کرید کرید کر چوسنے لگی۔ اُسکی کڑوی خشک زبان میں پیاس سے کانٹے چبھ رہے تھے۔

بائیں طرف ایک مکان کا باورچی خانہ تھا۔ دلاری کو وہاں کا باورچی سہ پہر کی چائے کی بچی کھچی چیزیں باہر پھینکتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ چپکے سے اٹھکر وہاں گئی اور سیب امرود کے تراشے، کیلے کے چھلکے، ادھ کھائے ٹوسٹ، مٹھائی وغیرہ اٹھا لائی اور چندی کو کھانے کے لئے دے دئے۔ موتی نے کونے میں پڑی ہوئی گرد آلود صراحی سے پانی ایک آبخورے میں انڈیل کر اسکے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ رلی بھی کیلے کا چھلکا لیکر اندر سے چاٹنے لگی۔۔۔!

سامنے والے مکان کے نیچے ایک سادھو کھڑا بھیک مانگ رہا تھا۔ ایک خوش پوش عورت نے مکان سے نکل کر آٹا اسکے جھولے میں ڈال دیا۔ یہ دیکھکر موتی کے دل میں بھی اُمید کروٹیں لیتی بیدار ہوئی اور اس نے دلاری کو وہاں جا کر آٹا مانگنے کیلئے اشارہ کیا۔ دلاری اپنی کمزور کانپتی ہوئی ٹانگوں کو جلدی جلدی حرکت دیتی ہوئی اس عورت کے پیچھے پیچھے مکان کے اندر چلی گئی اور جھجکتے جھجکتے آٹے کا سوال کرنے لگی۔ اس عورت نے دلاری کو حقارت اور غصہ بھری آنکھوں سے گھور کر دیکھا۔ اور ڈانٹ ڈپٹ کر باہر نکال دیا۔

جب دلاری اس مکان سے نااُمید ہو کر کانپتی لڑکھڑاتی باہر نکلی تو ساتھ والے مکان کے سنگ مرمری دروازے پر کھڑی ایک ادھیڑ عمر کی عورت ہاتھوں میں باسی روٹیاں لئے تھوڑے سے فاصلے پر کھڑی گائے کو پچکار کر روٹیاں کھلانے کے لئے بلا رہی تھی۔ دلاری بھوک سے بیکل، سردی سے بے بسانہ کانپتی خود بخود اُس عورت کی طرف بڑھی اور روٹیاں لینے کے لئے اضطراراً اُس کے ہاتھ اُوپر اُٹھ گئے۔

"پرے ہٹ چڑیل رنڈی کہیں کی" اس عورت نے دلاری کو ڈانٹا اور گائے کو پھر پچکارنے لگی۔ گائے اپنی گردن ہلاتی ہوئی آگے بڑھی اور اس عورت نے بڑے پیار سے روٹیاں اُسکے بے ڈھب جبڑوں میں ٹھونس دیں۔

دلاری کی برہنہ ٹانگیں سردی سے لکڑی کی طرح بے لچک ہو گئی تھیں۔ وہ روٹیوں کی طرف ٹکٹکی لگائے کھڑی تھی۔ ناقابل ضبط بھوک اُس کے دل میں ایک بے معنی آرزو بیدار کر رہی تھی۔ یکایک اس نے لپک کر اپنے کمزور ہاتھوں سے گائے کے جبڑوں میں سے روٹیاں چھیننے کی کوشش کی۔ اُس عورت نے دلاری کو اُسکے گھسے پھٹے کُرتے سے پیچھے کھینچا۔ کُرتا بالکل چاک ہو گیا۔ وہ کیچڑ بھری زمین پر گر پڑی اور چوٹ کھا کر بلکنے لگی۔ درد سے گھٹے ہوئے حلق سے نکلتی چیخوں کو روکنے کے لئے وہ اپنے کانپتے لبوں کو کاٹنے لگی۔ اُس کے دانت بے بس غصے سے دب رہے تھے۔ رگڑ سے چھلی ہوئی ٹھوڑی اور ناک سے خون کی چند بوندیں پھوٹ

پڑیں اور عورت گھورنے لگیں۔ گانے نے بھی روٹیوں کو جگالی کرنا بند کر دیا اور اپنی ماند آنکھوں سے دونوں کی طرف دیکھنے لگی۔

موتی یہ سب کچھ دیکھ کر زیرِ لب غصے سے جل رہا تھا۔ اس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ جس تنکے کو سہارے کیلئے پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے وہ مچھلی کی طرح اُسکے ہاتھ سے پھسلتا جا رہا ہے۔ اسکا سر لٹو کی طرح چکر کھا رہا تھا۔ یکایک اِرد گرد کے اونچے اونچے مکانات اُسکو جھولے کی طرح حرکت کرتے دکھائی دینے لگے۔

اُسی مکان سے ایک موٹا توندل چقندر جیسے لال رخساروں والا متوسط عمر کا آدمی نکلا۔ دلاری سے ایسے بچکر گزرا جیسے پلیگ کی چوہیا سے، اور ساتھ والے مکان کی بیٹھک میں تاش کھیلتے آدمیوں سے باتیں کرنے لگا۔ لمتنے عرصے میں اُس کا نوکر اُس کے کتے کتیا کو سیر کرا کر واپس آگیا۔ موٹا آدمی کتے کتیا کو جیک، نورا کہہ کہہ پیار کرنے، پچکارنے اور تھپکنے لگا، اور بعد میں نوکر کو ڈانٹتے ہوئے بولا "بیوقوف سیر کروانے میں اتنی دیر لگا دیتے ہو۔ جاؤ جلدی جیک کو گوشت کھلاؤ اور نورا کو دودھ پلاؤ۔"

گوشت اور دودھ کے الفاظ قریب ہی پڑی ہوئی دلاری کے کانوں میں گونجنے لگے۔ موٹے آدمی نے اپنے اوورکوٹ کی بیرونی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اندرونی جیب میں سنبھال کر رکھ لی اور آگے کو چلا گیا۔

دلاری سڑک سے آہستہ آہستہ اُٹھ کر جھونپڑی میں لوٹ آئی۔ چندی اور رلی جنہیں بڑھتی ہوئی سردی نے نیم بیہوش کر دیا تھا۔ اوندھی پڑیں ہائے ہائے کئے جا رہی تھیں۔ چندی کا بالائی ہونٹ زور زور سے پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس کا بے خون چہرہ زرد سے زرد تر ہوتا جا رہا تھا اور وہ بمشکل سانس لے رہی تھی۔

"لالو آ گئے ہو کیا؟" رلی نے دلاری کے قریب بیٹھنے کی آواز سے ہوش سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ لیکن کسی نے جواب نہ دیا۔

موتی نے سر باہر نکال کر آسمان کی طرف دیکھا۔ بے باک شام سائیں سائیں کر رہی تھی۔ گھونسلوں کی طرف اُڑتے پرندوں، آوارہ بدلیوں اور آزاد ہواؤں کو دیکھ کر اس کا دائمی غربت میں جکڑا ہوا دل للچانے لگا اور بے معنی ہوس و تمنا اُسکے ذہن میں پھدکنے لگی۔

لالو لڑکھڑاتا ڈگمگاتا جھونپڑی میں داخل ہوا۔ سب کی آنکھیں اُس کی طرف اُٹھ گئیں اور اُس کی مدھم غمگین آنکھوں سے اپنے سوال کا جواب لیکر پیچھے لٹک گئیں۔ رلی بھی سب کی خاموشی کا مطلب تاڑ گئی۔ دو تین پیسے میں نوجوان، زیادہ بوجھ اُٹھا سکنے والے مزدور مل جاتے تھے اسلئے لالو کو بہت دفعہ مزدوری نہیں ملتی تھی۔

جس اُمید پر اُن کا حوصلہ قائم تھا وہ اَب ٹوٹ چکی تھی۔ یکایک سب کا غم اور دُکھ اُس حد تک پہونچ گیا جبکہ حواس سُن ہو جاتے ہیں اور رونا بھول جاتا ہے۔ موتی کچھ بھی سوچنے سے قاصر تھا۔ ایک گہرا خوفناک ڈر اُسکے جسم میں سرایت کئے جا رہا تھا۔ چندی نے دو تین چیخوں سے اپنے بڑھتے درد کا اظہار کیا۔ دلاری نے ذرا آگے بڑھ کر اپنا سوکھا مریل سرہاں کے جسم پر لٹکا دیا۔ اُسکے پیٹے ہوئے کرتے سے جھانکتی بھوکی پسلیاں موتی کو اپنے سینے میں چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایک ناقابلِ برداشت بھوک سب جسموں کو بیرحمی سے چیرے جا رہی تھی۔

"اب کیا ہوگا؟" رلی کھانستی ہوئی کراہی۔ "ایسے کب تک جئیں گے... ہم کو تو بھوکا مرنا ہی ہے کل نہ سہی آج سہی۔ لیکن چندی کا تو خیال کرو۔ کم بخت بھی شکر نہیں اُسے سوکھی روٹی تو ملنی چاہیئے" چند لمحات کی خاموشی کے بعد رلی پھر بڑبڑائی "تم سے ہزار دفعہ کہا ہے دلاری کو ہی فروخت کر دو۔ تارو بابا کو ہی دیدو۔ بوڑھا ہے تو کیا پیسے تو کھرے دیتا ہے۔ وہاں جا کر دو وقت پیٹ بھر کر روٹی تو کھائیگی۔"

موتی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک گہری مایوسی اُسکے چہرے کو ڈراؤنا بنا رہی تھی۔ اسکے اعضا زور زور سے کپکپا رہے تھے۔ اس کی ہڈیوں سے جلن پھوٹ رہی تھی۔ اُس نے سوچنے کی کوشش کی لیکن اس کا دماغ ناقابلِ فہم گتھلکوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ اسکے ہونٹے تیزی سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ وہ بے بس ہو کر ماتھا رگڑنے لگا۔

چندی نے اپنی آنکھیں کھولیں اور ترچھی مدہوش نظروں سے موتی کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ بالآخر اسکی معصوم آنکھیں موتی کی متاسف پریشان آنکھوں میں جم گئیں۔ اُسکے پتلے زرد ہونٹ آپس میں ایسے جڑ چکے تھے جیسے سلے ہوئے ہیں اور اُسکے بے رونق چہرے پر نیلی دھاریاں نمودار ہو رہی تھیں۔

یکایک موتی اُٹھ کھڑا ہوا۔ گدلے، کڑوے خیالات اُسکے طوفان زدہ دماغ میں بے بس کشتی کی طرح ڈگمگا رہے تھے۔ اس کا دل بیٹھتا جا رہا تھا۔ اُسکے پاؤں بے اختیار کانپ رہے تھے۔ اُس کی ہر حرکت ایک تلخ غصے کے اثرات کا اظہار کر رہی تھی۔ وہ اپنی لرزتی ٹانگوں کو قوت دیتے ہوئے جھونپڑے سے باہر نکل گیا اور سامنے مکان کی بیٹھک کے قریب پہونچ کر اندر آتشدان کے ارد گرد بیٹھے تاش میں مشغول آدمیوں سے چند پیسے قرض مانگنے لگا۔ سب کی حقارت بھری آنکھیں اس کی طرف اُٹھ گئیں، اور ان میں سے ایک نے خشک کرخت بے دل لہجہ میں کہا "معاف کرو۔"

موتی نے خالی بے معنی طریقے سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اسکے ہوش

حواس جواب دے چکے تھے۔ اُس کا سینہ پھول رہا تھا۔ اُسے اپنے اردگرد کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بلور کی طرح منجمد و بے حس ہو چکی تھیں۔ وہ غصّہ سے اپنے دانت پیسنے لگا۔

سڑک کے دوسرے سرے پر بھیک مانگنے والے کمبل پوش فقیر کی آواز اُسکے کانوں میں پڑی اور بے سوچے سمجھے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اُسے اپنے قدموں کی آواز سے ڈر لگ رہا تھا۔ اُسکے ہاتھی سے وزنی پاؤں بڑی مشکل سے اُٹھ رہے تھے۔ وہ لڑکھڑانے لگا اور بے حس ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اس نیم بیہوشی کی حالت میں وہ رینگتا، اُٹھتا بیٹھتا، لڑکھڑاتا بے ارادہ طور پر جھونپڑے میں واپس لوٹا اور چنڈی کے قریب ہی چت لیٹ گیا۔ اُسی ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اُسے اس چند گز کی گہری خندق کو عبور کرنے میں کئی صدیاں لگیں، جس عرصے میں اُسکے ناتواں جسم کو طرح طرح کی اذیتیں سہنی پڑیں۔ اُسے اس نیم خوابیدہ حالت میں ایسا معلوم دینے لگا کہ ایک مریل دُبلا پتلا ٹٹو کا گھوڑا ایک ایسے یکّے کو کھینچنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے جس میں درجنوں آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ جو بے رُکے اس گھوڑے کے کان ناک، آنکھوں اور گردن پر چابک مارے جا رہے ہیں اور سونٹے سے اُسکی کمر کو پیٹے جا رہے ہیں۔ یکایک اُسے محسوس ہونے لگا کہ وہ اپنی زندگی کے لئے کسی قوی ہیکل چیز سے گتھم گتھا ہو رہا ہے اور اِردگرد کھڑے عالیشان محلات اسکی اِس کشمکش کو اس اشتیاق اور مسرّت سے دیکھ رہے ہیں جیسے ننھے بچے سانپ اور نیولے کی لڑائی کو دیکھتے ہیں۔

اتنے عرصے میں چنڈی کی ایک مزدور سہیلی بھی اُسے دیکھنے آگئی۔ زچّگی کو بالکل قریب دیکھکر وہیں ٹھہر گئی۔ اور چنڈی کے سردی سے کانپتے بے حس جسم کو اپنے ہاتھوں سے رگڑ رگڑ کر گرم کرنے لگی۔ اس آواز سے موتی بھی اپنی نیم غنودگی سے بیدار ہوا۔

شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ سردی سے کانپتی قدرت کالے کمبل اوڑھ اور مٹی معلوم دے رہی تھی۔ تیز برچھیوں سے لدی ہوئی برفانی ہوا جسم کو چیر رہی تھی۔ موتی اُٹھکر چنڈی کے ذرا اور قریب ہو بیٹھا۔ اِردگرد مکانوں کے اوپر ڈوبتے سورج کی سُرخی اُسے مرتے دن کی خون آلودہ لاش معلوم دے رہی تھی۔ دفعتاً موت اُسے بڑی پیاری محسوس ہونے لگی اور موت کے تخیل سے وہ میٹھے میٹھے ذائقے کا لطف لینے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ خدا نے اُس کے اور مسرّت و سکون کے درمیان اتنی وسیع خلیج کیوں بنا رکھی ہے۔ اور موت اُسے ایک آسمانی پری معلوم دے رہی تھی جسکی مدد سے وہ اس خلیج کو عبور کرنا چاہتا تھا۔

چنڈی کا درد اس وقت تک بہت بڑھ چکا تھا۔ اگرچہ بھوک اور کمزوری نے اسکی چیخوں کو ذرا مدھم کر دیا تھا۔ اُسکے ہاتھ پاؤں پتّے کی طرح کانپ رہے تھے۔ اسکی موٹی موٹی آنکھیں جو درد کی وجہ سے اور بھی پھیل گئی تھیں اُسکے چھوٹے بھولے چہرے کو بہت ڈراؤنا بنا رہی تھیں۔ اسکے ہونٹوں سے جھاگ ابھر رہا تھا۔ ایک بے رحم درد اُسکے جسم کو کتر رہا تھا۔ طرح طرح کے ڈراؤنے خیالات اسکے مدہوش دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ایک چنڈی نہیں تھی بلکہ بہت سی جو آپس میں زندہ رہنے کے لئے کشمکش کر رہی تھیں۔ سڑک پر بجلی کے قمقمے اُسے اپنی نشست میں بیٹھے ہوئے جن بھوتوں کے گھورتے دیدے معلوم دے رہے تھے۔ سرد ہوا کا ایک جھونکا چلا اور اُسکے بالوں کی گرد آلودہ لٹیں اُسکے غمگین رخساروں کو چوم کر اظہار ہمدردی کرنے لگیں۔

چنڈی کے منہ سے اُبلتے جھاگ پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ موتی اُنہیں ہاتھ سے اُڑانے لگا۔ ایک مکھی چنڈی کے سر پر لٹکی ہوئی مکڑی کے جالے میں جا پھنسی اور رہائی کے لئے کشمکش کرنے لگی۔ چنڈی کی سرد انکھیں موٹے موٹے بے پلک پپوٹوں سے اِس زندگی کے لئے جدوجہد کرنیوالی مکھی کو تاڑنے لگیں۔

یکایک چنڈی نے اپنے قلب میں حرکت محسوس کی۔ کچھ ہلتا پھڑکتا۔ اس پر ایک ناقابلِ برداشت لرزش طاری تھی۔ اُس نے بیٹھنے کی پُردرد مگر ناکامیاب کوشش کی۔ اُسے ایسا معلوم دے رہا تھا جیسے وہ وہاں سولی پہ لیٹی ہوئی ہے۔ اس کے سہمے ہوئے ڈیلے خولوں سے باہر گرتے معلوم دے رہے تھے۔ اسکے رخساروں کی اُبھری ہوئی ہڈیاں سُرخ تر ہوتی جا رہی تھیں۔ پسینے کے چند قطرے اُسکی پیشانی پر چمک رہے تھے اور اُسکے جسم سے عرق پھوٹ رہا تھا۔

چنڈی کی سہیلی نے نیم مُردہ ممتو کو اُٹھا کر بھوک سے بے ہوش لالی کے قریب لٹا دیا۔ اُس نے دلاری، لالو اور موتی کو چنڈی کے بازو پکڑ کر بیٹھ کے سہارے لٹانے کے لئے کہا اور خود اسکے گھٹنے پکڑ کر علیحدہ علیحدہ کر کے جسم کے اندر کی طرف جھکا دئے۔ چنڈی کے بازو پھڑ پھڑا رہے تھے، اور وہ انہیں موتی، لالو اور چنڈی کے نربل اور لرزتے ہاتھوں سے چھڑانے کی بہت کوشش کر رہی تھی۔ اسکے ناک سے پانی بہہ رہا تھا، منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ آنکھیں پتھرائی جا رہی تھیں۔ اور وہ بے بسی سے جسم مروڑتی لوٹ پوٹ ہوئے جا رہی تھی۔ درد کی اندوہناک کپکپی اور موت جیسے لرزے نے اسکی صورت کو ڈائنوں سا رنگ دے دیا تھا۔ اُسکی آنکھیں بھیانک غصّے سے سب کو گھور رہی تھیں۔ درد کی شدّت کی وجہ سے اُسے اپنے ننگے جسم پر ہوا کی تیز برچھیاں بھی محسوس نہیں ہو رہی تھیں۔

(بقیہ صفحہ ۵۰)

تہذیب کا مستقبل۔

ازدواجی زندگی

رشتۂ ازدواج اور تربیت اولاد نے قریباً دس ہزار سال سے دُنیا کی تاریخ میں ایک اہم جگہ لے رکھی ہے۔ کسی لڑائی کا بھی اصلی سبب معلوم کرنے کی کوشش کیجیے تو آپ اس نتیجے پر پہونچیں گے کہ کسی دوسرے شخص کی بیوی کو اپنانا یا بچوں کے لئے قوت کا سامان مہیا کرنا اس ترغیب کا باعث تھا۔ بہتیری بڑی بڑی مہموں میں آن کا یہی اغراض نظر آئیں گے۔ اگر افزائشِ نسل کی مشکلات کو حل کرنے کا مسئلہ انسان کے سامنے نہ ہوتا تو دُنیا کے بہت سے خطے اب تک نہ عالمِ تحقیق میں آتے اور نہ آباد ہوتے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آنے والے دور میں اس مسئلہ پر پوری طرح قابو پالیا جائیگا۔ جہاں تک افزائشِ نسل مردوں اور عورتوں کو نئی دُنیا میں تلاش کرنے کی ترغیب دیتی ہے بہت خوب ہے۔ محبت ہی تو تھی جس نے پہلا پل تعمیر کرکے انجنیری کی بنا ڈالی۔ قدیم زمانے میں انسان نے دریاؤں کی طرف کوئی توجہ نہ کی تھی لیکن جب اُسے ایک حسین عورت دوسرے کنارے پر دکھائی دی تو دریا کو پار کرنے کے طریقے سوچنے لگا۔ ضرورت نہیں بلکہ محبت ایجاد کی ماں تھی۔

دُنیا کی بہتیری بُرائیوں کی جڑ بھی یہی جذبہ ہے۔ چند صدی قبل تجار اور امرا نے بردہ فروشی کا بازار صرف اس لئے گرم کررکھا تھا کہ حسینانِ نازک اندام مشقت کی صعوبتوں سے بچی رہیں۔ محبت اور مذہب کی آڑ میں ہزاروں خوفناک لڑائیوں اور بھیانک قتل سے تاریخ عالم کے اوراق رنگ دئے گئے۔ ہماری آئندہ نسلوں کے سمجھدار لوگوں کو یہ خیال ہوگا کہ "ہمارے پاس ایک طوفانی جذبہ موجود ہے اور بدقسمتی سے انسانی تعلقات میں یہ سب سے زیادہ مستحکم بھی ہے۔ اس پر قابو پاکر اچھا یا بُرا تصرف کیا جاسکتا ہے۔ جس طرح ہم دریاؤں کو اپنے شہر کی گلیوں اور سڑکوں کو غرق نہیں کرنے دیتے یا آگ کو مکان کے ہر حصے میں جلنے نہیں دیتے اسی طرح ہم اس جذبہ کو بھی آزاد بھٹکنے نہ دینگے۔ کیونکہ طاقت اُسی وقت مفید ہوسکتی ہے جب اُسے کسی حد تک قابو میں رکھا جاسکے۔"

تہذیب کی گنگا جس طرف بہہ رہی ہے اُس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سو سال کے اندر ہی دُنیا کی حکومتوں کو یہ اختیار حاصل ہوجائیگا کہ وہ ہر عورت کی تعداد نسل کی حد قانوناً مقرر کردیں۔ حکام کو یہ خیال ہوجانا لازمی ہے کہ اگر رعایا حکومت سے امداد اور روزگار کے حقوق طلب کرسکتی ہے تو ملک کو بھی یہ اختیار ہے کہ وہ ہر فرد قوم کے لئے بچوں کی تعداد کا تعین کرسکے تاکہ بافراغت اُنکی پرورش کا انتظام کیا جاسکے۔

روگی اور کمزور لوگوں میں تجدیدِ نسل کی صلاحیت مفقود کردینے کے اُصول اور عمل کا جائزہ لینے کے لئے ۱۹۳۲ء میں حکومت برطانیہ نے ایک کمیشن مقرر کیا تھا۔ اس تفتیش کا کوئی عملی نتیجہ تو عالمِ ظہور میں نہ آیا لیکن اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ حکومت نے نااہل افراد کی قطع نسل کا اصول قابلِ غور سمجھا۔ ہماری آئندہ نسلیں تاریخ کے صفحات میں یہ پڑھکر تعجب کریں گی کہ بیسویں صدی کی ترقی یافتہ قوموں نے اس امر کی آزادی دے رکھی تھی کہ ہر باشعور یا بے شعور، تندرست یا روگی مرد کسی تندرست یا روگی عورت سے بغیر کسی مزاحمت کے شادی کرسکتا تھا اور غیر محدود تعداد میں سمجھدار یا خبطی، تندرست یا روگی بچے پیدا کرسکتا تھا۔ ممکن ہے اُنہیں یہ بھی محسوس ہو کہ اس سے ہزاروں برس قبل رومنوں نے یہ اُصول بنایا تھا کہ صرف صحیح اور تندرست افراد کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے لیکن بیسویں صدی کے مرد و عورت جن کا علم طب اور وراثت کے متعلق رومنوں سے کہیں زیادہ تھا، روگی بچوں کی پیدائش کے مسئلہ کو قابلِ اعتنا نہ سمجھتے تھے۔ وہ یہ دیکھتے تھے کہ ایک سودائی کمزور دماغ کے بچے پیدا کرتا جارہا ہے لیکن اُن کے کان پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔ ان خیالات کے ماتحت ہماری نسلیں ہمارے متعلق کیا رائے قائم کریں گی، اسکا تصفیہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔

ہمارے علم کو اس درجے پر پہونچنے کیلئے جبکہ ہم بے عیب والدین کا صحیح انتخاب کرکے بے نقص بچے پیدا کرسکیں گے صدیاں درکار ہیں۔ ایک صدی میں حکومت کو جو دخل ازدواجی رشتہ کے نفاذ میں ہوگا وہ اب سے بہت زیادہ مختلف نہ ہوگا۔ البتہ قوم اس بات پر ضرور زور دیگی کہ جن لوگوں میں ایسے عیوب ہیں جن کا اولاد میں منتقل ہونا یقینی ہے انہیں تجدیدِ نسل کا کوئی حق نہیں۔ روگی مجرموں کو لمبی قید کی سزا دینا بے سود خیال کیا جائیگا۔ کیونکہ اس سے اُن کی ذہنیت کا تدارک مطلق نہیں ہوتا، بلکہ عدالت ایسے عمل جراحی کا حکم دیگی جو بلا تکلیف صلاحیت تولید مفقود کردے تاکہ جرائم پیشہ لوگوں کی تعداد میں آئندہ اضافہ نہ ہو۔ ہمارا آجکل کا قانون مجرم کی ذہنیت کا علاج کرنا تو درکنار اُسے اس امر کی پوری آزادی دیتا ہے

کہ کئی جس کے ساتھ بھی چاہے ازدواجی رشتہ قائم کرے اور دُنیا کی آبادی میں درجنوں جسمانی اور دماغی نقص والے افراد کا اضافہ کرے۔

مزاحیہ مصنفین اس پر مُصر ہیں کہ انسانی زندگی میں رشتۂ ازدواج ایک نہایت ہی اہم اقدام ہے۔ ہندوستان کا تو ذکر ہی کیا نام نہاد "مہذب قوموں" میں بھی شادی کرنا آج اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ کتے کا لائسنس خریدنا۔ دونوں کی فیس بھی قریب قریب یکساں ہو۔ اس سے ان "ترقی یافتہ" قوموں کی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔ حکومت کہتی ہے "شادی کرلو، رجسٹر میں نام درج کرانے کے لئے تمہیں چند شلنگ دینے ہونگے۔ اور اگر دوسری شادی کی تو مناسب سزا دی جائے گی" بچوں کا کہیں ذکر نہیں حالانکہ اگر وہ روگی پیدا ہونے تو ملک یعنی آپ، میں اور دوسرے ہزاروں افراد قوم، پر اُن کی پرورش کا سارا بار پڑے گا۔ ہمیں تو یہ بتایا جاتا ہے کہ حرام کاری سے بچنا اور افزائش نسل شادی کے اصل مقاصد ہیں، خطبۂ نکاح کے متعلق ہمارا یہ تخیل ہے کہ چند دعاؤں اور صیغوں کے زبان پر لانے سے ایک مذموم اور ناجائز امر محبوب اور جائز ہوجاتا ہے۔!

ہماری نسلوں کو یہ ذہنیت نہایت حیرت انگیز معلوم ہوگی۔ انہیں شادی کرنے کے لئے کچھ صرف نہ کرنا پڑیگا لیکن کتے کا لائسنس خریدنے کے لئے غالباً سو روپے دینے ہونگے۔ حکومت کو یہ احساس ہوگا کہ شادی ایک نہایت محبوب رشتہ ہے، لوگوں کو اس کی ترغیب دینے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ لیکن کتے کے مالکوں کی طرح لائسنس کے متمنی کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ ہر طرح پر اس رشتہ کا اہل ہے۔ ایک بار اگر مرد اور عورت یہ ثابت کر دینگے کہ وہ جسمانی اور ذہنی صحت کے حامل ہیں اور اُن کے والدین بھی ہر طرح تندرست تھے تو حکومت تمام سہولتیں مہیا کر دیگی۔ ممکن ہے گورنمنٹ ایسے افسر بھی مقرر کر دے جو وقت ضرورت مفید مشورہ دیا کرینگے۔ قوم کی ذہنیت بدلجانے پر حکومت کو زیادہ دقتیں پیش نہ آئیں گی۔ لوگ از خود معائنہ کرا کے اس کا اطمینان کرلیا کریں گے کہ آیا ہونے والے میاں بیوی میں انکی محبت اور خوشی برقرار رہنے کے امکانات ہیں یا نہیں۔ دار التجربہ میں چند آزمائشوں سے طرفین کی خصوصیات کا پتہ لگا کر ان کو یہ بتا دیا جائیگا کہ انکی ازدواجی زندگی مسرت وسکون کے ساتھ بسر ہوسکیگی یا نہیں۔

طلاق جیسے قبیح عمل کو آنے والی نسلیں ہمارے نقطۂ نظر سے نہ دیکھیں گی۔ آج اگر کوئی جوڑا یہ سمجھتا ہے کہ ایک ہی مکان میں باہم زندگی بسر کرنا ہی شادی کا مقصد نہ تھا تو انہیں بہتیرے ناگزیر حالات کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ طلاق کی اجازت اس وقت تک نہیں ملتی جب تک کہ بیوفائی ثابت نہ ہوجائے۔ باہمی سمجھوتہ سے علیحدگی اختیار کرنے کا تخیل لوگوں کو اس قدر برافروختہ کر دیتا ہے کہ طرفین کو مجبوراً عدالت کے مصارف اور دیگر اخراجات سے زیر بار ہونا پڑتا ہے۔ آنے والے دور میں اگر میاں بیوی شادی کے کچھ عرصے بعد یہ محسوس کرینگے کہ باہم زندگی بسر کرنا اُن پر گراں گذرتا ہے تو ایک فارم بھر کر ازدواجی محکمہ کے افسر کے سامنے حاضر ہوجائینگے۔ پہلے ان کا طبی معائنہ کیا جائے گا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائیگی کہ کشیدگی کسی عارضی علالت مثلاً خراب ہاضمہ یا کمزور غدود وغیرہ کی وجہ سے تو نہیں ہے۔ دار التجربہ میں اصل وجہ دریافت ہوجانے پر اگر ناموافقت لاعلاج سمجھی گئی تو فارم پر فریقین کے دستخط لیکر عہد نامہ مسترد کر دیا جائیگا۔

اس کا بہت زیادہ امکان پایا جاتا ہے کہ دو تین قسم کی شادیاں رائج ہونگی۔ مثلاً ایک تو معمولی یکجائی جو ہر جوڑے کے لئے اس وقت تک جائز ہوگی جب تک کوئی اولاد نہ ہو۔ پہلے بچے کی پیدائش پر ایک دوسرا زیادہ بندش والا دور شروع ہوگا۔ اس زمانہ میں طلاق ہوجانے پر حکومت کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ بچوں کو والدین سے الگ کر کے مناسب تربیت گاہوں میں ان کی پرورش کا انتظام کرے۔ کیونکہ ننھی جانوں کا ایسے ماحول میں رہنا جہاں محبت معدوم ہو مخرب اخلاق تصور کیا جائے گا۔ غالباً نااہل والدین سے بچوں کو کسی وقت بھی الگ کرنیکا اختیار حکومت کو رہے گا۔ اس مہذب زمانے میں جبکہ تربیت اولاد کے متعلق لوگوں کو کما حقہ آگاہی ہو، والدین کو حسب منشا سب کچھ کرنے کی اجازت ہونا کس قدر حیرت انگیز ہے۔ مسرت سے خالی گھر کا بچے کی نشو ونما پر تشدد اور ظلم سے کہیں زیادہ خراب اثر پڑتا ہے لیکن بچوں کے سامنے والدین چاہے جیسی بھی غیر مہذب اور اخلاق شکن حرکتیں کریں، حکومت کو دخل اندازی کا استحقاق حاصل نہیں۔ اسی قسم کے اثرات اُن والدین کے حرکات سے بھی پیدا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے جو ایک دوسرے سے متنفر اور کشیدہ رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے احساسات کا لحاظ نہیں کرتے۔ اگر ہم مستقبل میں تھوڑا اور آگے بڑھیں تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید حکومت کو اس بات کے فیصلہ کا اختیار ہوگا کہ کونسے افراد والدین بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ابتدا میں غالباً ایسے لوگوں کو مفصل معائنہ کے بعد ہر بچے کی پیدائش پر الاؤنس وغیرہ کی ترغیب دی جائے گی لیکن بعد میں بلا اجازت تجدید نسل کو جرم قرار دیدیا جائے گا۔ علاوہ اسکے ہر فرد قوم کی تربیت اور پرورش کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوگی اور اس طرح وہ چند

ناکارہ، جرائم پیشہ اور اجٹ لوگ جو والدین کی بے رخی کا نتیجہ ہوتے ہیں قوم میں ناپید ہوجائیں گے۔

ناسمجھ لوگ محبت اور شادی کا ایک ہی مفہوم سمجھتے ہیں۔ اور جب کبھی اُن پر قابو پالینے کا ذکر آتا ہے تو بیساختہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ "فطرتِ انسانی کبھی نہیں بدل سکتی۔ مرد عورت دس ہزار برس بعد بھی دامِ محبت میں اسیر ہونگے اور ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جائیں گی"۔ لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ وہ احساس جسے وہ محبت سے تعبیر کرتے ہیں اور جس سے سنسنی خیز حرکات رونما ہوتے ہیں عام طور پر غصہ اور نفرت کا سا ایک جذبہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب سے ہزار سال قبل جب مصلحین نے یہ آواز بلند کی ہوگی کہ چتا پر عورتوں کو زندہ جلا دینا نہایت رُوح فرسا ہے اور اس رسم کو ترک کردیا جائے تو اس وقت بھی انہیں یہی جواب ملا ہوگا کہ فطرت انسانی کبھی بدل نہیں سکتی۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہی فطرت انسانی ایسی بدلی کہ اب اس رسم کو قبیح سمجھا جاتا ہے۔ دُنیا کے تغیرات کے ساتھ انسان کی فطرت بھی بدلتی رہتی ہے اور اب تو حیاتیاتی دار التجربوں میں فطرت کے بدلنے کے سریع التاثیر طریقے ایجاد کرنے کی فکر کی جارہی ہے۔

مجھے اس میں مطلق شبہ نہیں کہ آئندہ زمانے میں اگر کوئی نوجوان بے جوڑ شادی کرنے کا ارادہ کریگا تو بجائے اسکے کہ باپ پند و نصائح کے تلخ گھونٹ سے اُسے راہ راست پر لانے کی کوشش کرے، کسی میٹھی دوا کا ایک چمچہ ذہنیت کو آناً فاناً بدل دیگا۔ ہم زمانہ وسطیٰ کی جادوگرنیوں کی داروئے عشق یا موہنی وغیرہ کا تمسخر کرتے ہیں جس طرح تغیر فی الذات کی کوششوں پر کیمیاگروں کا مضحکہ اُڑایا کرتے تھے۔ لیکن آج بھی کیمیا دانوں کو کم از کم ایک درجن محبت کی دوائیں معلوم ہیں۔ اور کیا عجب کہ تھوڑے ہی عرصے میں جذبات اور خواہشات کی روک تھام کیمیاوی مرکبات کے ذریعے ہمہ گیر ہو جائے۔

سائنس کا یہ دعویٰ قرین قیاس ہے کہ اگر اُسے پورے طور سے آزادیِ عمل دی جائے تو وہ حسب خواہش بعض خواص انسانی کو قوی اور بعض کو کمزور بنانے میں کامیاب ہوجائے گی۔ ذاتوں کی تقسیم جو صدیوں سے ہندوستان میں رائج ہے کیا عجب کہ ایک نئے روپ میں دُنیا کا نظام بن جائے۔ اس تفریق کا مطمحِ نظر دراصل مختلف کاموں کے لئے مختلف ذہنیت اور صلاحیت کے افراد پیدا کرنا تھا۔ ہماری طرح سائنس کی معلومات نہ ہونے کے باوجود قدیم فلسفی یہ محسوس کرتے تھے کہ اگر ایک گروہ یا خاندان باغبانی کے پیشے میں منہمک ہے اور اُسے دوسرے گروہ کے ساتھ جس کا پیشہ ساہوکاری ہے قرابت کے ذریعے خلط ملط نہ ہونے دیا جائے تو یقیناً آئندہ نسلیں اور بھی بہتر باغبان بن سکیں گی۔ سائنس اس نظریہ کی حامی ہے۔ ہندوستان میں ذاتوں کی تفریق اس لئے کامیاب نہ ہوسکی کہ اسکے نفاذ میں زیادہ سختی سے کام نہیں لیا گیا۔ اور نہ اس نظام میں مناسب لوچ رکھا گیا۔ ایک طرف تو ناکارہ افراد کے مٹا دینے کی کوئی سبیل نہیں کی گئی اور دوسری طرف حالات کے تغیر کے مطابق نظام میں مناسب ردوبدل کے امکانات نظرانداز کردئے گئے۔ آئندہ دور میں اُن لوگوں کو جو کسی گروہ کے مطلوبہ خواص کے حامل نہ ہونگے الگ کرکے یا تو دوسرے مناسب گروہ میں شامل کردیا جائیگا یا اگر وہ کسی گروہ میں شامل ہونیکے لائق نہ ہوتے تو اُن کا ایک الگ گروہ بنا کر اُن کی ذہنیت کو سُدھارنے اور ممکن صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ نظام رائج الوقت اُصولوں سے بالکل مختلف ہوگا اور اسکی بُنیاد خالص سائنٹفک اُصولوں پر رکھی جائیگی۔ مردوں اور عورتوں کا بالتفصیل معائنہ کرکے اور اُن کی خصوصیات معلوم کرکے ان کو مناسب ماحولوں میں کھپا جائیگا۔ اس طرح اجتماعِ ضدین کے ناگوار اثرات سے سوسائٹی کو بچایا جائیگا۔ شعرا دفتروں میں محرری کرتے ہوئے نہ دکھائی دینگے یا انجنیری کی صلاحیت رکھنے والے ہل جوتتے نظر نہ آئیں گے۔ مخصوص غذاؤں اور تربیت کے ذریعے اس بات کی ہر ممکن کوشش کی جائیگی کہ پیدائش کے وقت جو انتخاب کیا گیا ہو وہ آگے چلکر بے سود نہ ہو جائے۔

ہماری اولادیں ہم سے بہتر مقصد زندگی کو سمجھ لیں گی اور اس لئے ترقی نسل کی زیادہ مفید راہیں اختیار کریں گی۔ سوسائٹی کی بہبودی کے لئے انہیں سب کچھ قربان کرنا گوارہ ہوگا۔ کسی ایک فرد کی زندگی یا خوشی کا معیار سوسائٹی کے حالات کے مطابق ہوگا۔ آج اگر آپ کسی سے پوچھئے کہ وہ کیوں زندہ ہے یا اُسے کیوں اور زندہ رہنے دیا جائے تو وہ بُڑبُڑانے لگیگا کہ ہر شخص کو زندہ رہنے کا حق ہے، یا آپ کو دیوانہ سمجھکر مُسکراتا ہوا اپنا راستہ لے گا۔ لیکن دراصل یہ بہت اہم سوال ہے۔ جبتک ہم اور آپ انسان کو بہتر انسان بنانے میں کچھ نہ کچھ سعی نہیں کررہے ہیں اس دُنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں اور ہماری جگہ ہم سے بہتر افراد کو ملنی چاہئیے۔

مذکورہ بالا نظام کے ماتحت ازدواجی رشتے قائم ہوا کرینگے۔ بشرطیکہ تجدید نسل مقصود ہو۔ کیونکہ ایسی صورت میں وراثت کا مسئلہ سوسائٹی کیلئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ قانونِ وراثت میں بہتیری باتیں اب بھی تشریح طلب ہیں۔ زندگی کی ابتدا کیمیاوی ترکیبوں سے کچھ زیادہ پیچیدہ ہے اور مفید علامات و ضوابط کے ذریعے اسکے اُصولوں کا بنا دینا آسان نہیں۔

محبت کی شادیوں سے جو اولاد پیدا ہوتی ہے وہ اکثر طباع اور ذہین ہوتی

سے چاہے بعد میں عدم موافقت کی بنا پر والدین میں علیحدگی ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ممکن ہے کچھ فضائی لہریں ایسی دریافت ہو جائیں جو بچے کی ذہنیت اور صلاحیت پر اثر ڈالتی ہوں۔ ہم آجکل اسکے تو ضرور قائل ہیں کہ ماں کے احساسات جنین کی جسمانی اور دماغی کیفیتوں میں بڑی حد تک تغیر پیدا کر سکتے ہیں۔

اگر ہم اپنے ہی معیار کی بنا پر جانچیں تو بھی میں نہیں سمجھتا کہ ہماری نسلیں ہم سے زیادہ اچھی اور غیر مہذب ہونگی۔ اگر آپ کو یہ تسلیم ہو کہ نیک چلنی اور بدچلنی کے معیار کا انحصار بہت کچھ جغرافیائی حالات اور زمانہ پر ہے تو آپ اس نتیجے پر پہونچیں گے کہ مردوں اور عورتوں کی اکثریت نیک چلن ہے اور ہمیشہ رہی ہے۔ جب اخلاقی قوانین کی تعمیر بجائے توہمات اور مذہبی ممانعتوں کے سائنس کے اصولوں پر ہوگی تو لوگ خوف سے نہیں بلکہ خود اپنی مرضی سے خوش اخلاق بن جائیں گے۔ اور جب ایسا ماحول پیدا ہو جائیگا تو بدنصیب یا نامبارک شادیاں قریب قریب عنقا ہونگی۔ غالباً یہ اعتقاد بھی باقی نہ رہیگا کہ چند صیغوں اور دعاؤں کی برکت سے دولھا دلہن ساری زندگی مسرت و انبساط کے ساتھ بسر کر سکیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ بہتیری غیر اصولی اور بدبخت شادیوں کے وجوہ بھی ناپید ہو جائیں گے۔ سائنسداں یہ جانتے ہیں کہ یگانگت یا کشش کا یقین کرنے کے لئے محض نگاہوں کا لڑ جانا ہی کافی نہیں ہے۔ دارالتجربوں کی آزمائشیں ممکن ہے ایسی مطابقت دریافت کرلیں جو پہلی نظر میں مفقود معلوم ہوتی ہو۔ ہم سب جانتے ہیں کہ بعض سہولتوں کے مدنظر بغیر محبت کی پینگوں کے بہتیری شادیاں اکثر محبت کے دعویداروں کی شادیوں سے کہیں زیادہ مبارک ثابت ہوئی ہیں۔

غالباً آنے والے دور کے لوگوں کو بیسویں صدی کی تاریخ میں یہ پڑھکر سخت ہیجان ہوگا کہ خطبۂ نکاح میں نفس کو جسم انسانی میں اہم ترین جگہ دی جاتی تھی اور اس کے ساتھ ہی آناً فاناً دو نفسوں کو مرتے دم تک کے لئے ایک مستحکم رشتہ میں جکڑ دیا جاتا تھا۔ ممکن ہے کہ ہماری محدود نظروں کو مستقبل کی شادیوں کی یہ تصویر بنیوں کے لین دین کی طرح پھیکی اور رومان سے خالی دکھائی دیتی ہو لیکن ہماری نسلوں کا رومان ساحلِ دریا اور چاندنی راتوں میں نہیں بلکہ معلومات حاصل کرنے اور اُن پر عمل کرنے میں مضمر ہوگا۔ وہ ہمارے رسوم کو بالکل اسی نظر سے دیکھیں گی جس طرح آج ہم اُن غیر مہذب قوموں کے رواجوں کو دیکھتے ہیں جن میں ایک دستور یہ ہے کہ دولھا دُلہن کے بال پکڑکر گھسیٹتا ہوا اپنے گھر لیجاتا ہے۔

سراج حسین نقوی

رُودادِ الم

نہ پوچھو ستم کیش ہندی کی حالت
حقیقت ہے یہ کچھ کہانی نہیں ہے

تبسّم کی قلّت تو ہے اس کرّے میں
مگر آنسوؤں کی گرانی نہیں ہے

نہ نالوں میں ڈھونڈو فراغت کی تانیں
یہاں نام کو شادمانی نہیں ہے

غریبوں کی محفل میں اک دن سُنو تو
کوئی لے بجز نوحہ خوانی نہیں ہے

سسکتا جنازہ ہے کرب و بلا کا
غریبوں کی مفلس جوانی نہیں ہے

کوئی رات آئی نہ ایسی کہ جس میں
غریبی کی خونی کہانی نہیں ہے

نہ پوچھو ستم کیش زندہ ہیں کیوں کر
ہے سکرات یہ زندگانی نہیں ہے

ہوں جبتک میں زندہ بغاوت ہے زندہ
مرا جذبہ صدق فانی نہیں ہے

صفیہ شمیم ملیح آبادی

پُرشور موسم

اُٹھے ہیں وہ پربتوں سے طوفاں — ہیں چرخ پہ بدلیاں خراماں
موہوم اُفق پگھل رہا ہے — اوجھل ہے نظر سے ماہِ تاباں
یوں مست گھٹا گرج رہی ہے — ٹکراتے ہیں جیسے دو کہستاں
رعشے میں ہے کائنات ساری — ہیں دونوں جہاں نزار و حیراں
بارش کی نہ تھی ابھی ضرورت — مغموم کھڑے ہوئے ہیں دہقاں

جب آتے ہیں سرد و تند جھونکے
تھرّاتے ہیں بدنصیب انساں

میلا سا چراغ جل رہا ہے — کُٹیا میں کھڑا ہوں میں ہراساں
انگڑائیاں لے رہا ہے احساس — اُمید ہے دل میں شعلہ افشاں
یاد آتے ہیں بار بار وہ دن — جب پاس تھا زندگی کا ساماں
غم ایک حقیر واہمہ تھا — ہر سو تھیں مسرتیں خراماں
سرما کی اُداس چاندنی میں — ہوتی تھی صبوحی میری مہماں
آنکھوں میں حسین سُرخ ڈورے — رُخسار میں قمقمے فروزاں
مسکا ہوا کہنیوں سے چولا — بکھری ہوئی زلفِ عنبر افشاں
سینے کی رگوں میں کپکپاہٹ — اور فرطِ حیا سے ہونٹ لرزاں
وہ بھیگی ہوئی حنائی پوریں — سمٹی ہوئی رُوحِ برق و باراں
ہر بات میں گیت کا ترنّم — ہر سانس میں موجِ آبِ حیواں
پیغامِ نشاط ہر نظر میں — ہر گام میں سو بہشت پنہاں

وہ جوشِ طرب میں میرا کہنا — "اے میری صبوحی۔ اے میری جاں
تجھ سے مِری زندگی عبارت — تجھ سے مری رات صبحِ خنداں
بس تیرے وجودِ محترم سے — لبریزِ حیات یہ شبستاں
بس تیری نگاہِ پُراثر سے — میں خفتہ نصیب، گل بداماں
اے کاش شباب جاوداں ہو — بے جان ہو نبضِ چرخِ گرداں"
یہ سُن کے صبوحی کا لجانا — لہرانا ہوا میں اپنا داماں
ناگاہ وہ چُپکے سے گجردم — پہلو سے میرے نکل کے جاناں[1]

طوفان سے دل میں اُٹھ رہے ہیں — اک عمر سے گِن رہا ہوں گھڑیاں
احساس پہ ہے جمود طاری — اُمید ہے رہنِ طاقِ نسیاں
بیکار ہے میرے دل کی دھڑکن — اب اس میں نہیں کوئی خراماں
کچھ سوچ رہے ہیں مدّتوں سے — موہوم شباب کے شبستاں
دل پر ہے خرد کا رنگ غالب — سینے میں نزاعِ کفر و ایماں
شاعر تو کبھی کا مر چکا ہے — اب تو ہے ندیم صرف انساں
اب سود و زیاں کی اُلجھنوں میں — کٹ جاتا ہے دورِ برق و باراں
اُمڈے ہوئے بادلو نہ برسو — پھیرو نہ میرے جگر پہ چُھریاں

میں بوڑھا ہوں۔ تم ابھی جواں ہو
تم میرے شباب کا نشاں ہو

احمد ندیم قاسمی۔

[1] صوتی لحاظ سے قوافی کا استعمال میرے نزدیک جائز بلکہ احسن ہے۔ ندیم

میرا پیشہ

میں نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں بہت سی غلطیاں کی ہیں اور ہر ایک غلطی کرنے پر خمیازہ بھگتا ہے۔ خیر یہ خمیازے تو غلطی کے بڑے چھوٹے یا متوسط درجہ ہونے کے لحاظ سے طویل یا قلیل ہوتے رہے ہیں اور بسا اوقات تو غلطی نہ کرنے پر بھی پشیمانیاں اٹھانی پڑی ہیں، مثال کے طور پر سائیکل کے ٹیوب میں بلا وجہ پنکچر ہو جانا یا پھر بیٹھے بٹھائے قبض کی شکایت میں مبتلا ہو جانا۔ یہ تو رہیں خدا کی عطا کی ہوئی برکتیں۔ مگر سب سے بڑی غلطی جو میں نے اپنی زندگی میں کی ہے وہ اپنے پیشہ کے انتخاب سے متعلق ہے۔

کہتے ہیں کہ جب چیونٹی کی موت آتی ہے تو اس کے پر لگ جاتے ہیں۔ جب گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے اسی طرح میری شامت یوں آئی کہ میں نے مدرس بننے کا فیصلہ کر لیا۔ بچپن ہی سے مجھے اس پیشے سے دلچسپی تھی۔ بعض اوقات استاد سے پٹ کر جب حالات پر غور کرتا تو اسی فیصلے پر پہونچتا کہ استاد بن کر پیٹنے والے استاد سے نہ سہی اُسکے بیٹے یا پوتے سے بدلہ لونگا۔ جب ذرا بڑا ہوا تو پیشہ ماسٹری میں اور بھی صفات نظر آئے۔ مثلاً یہ کہ یہ دنیا کا بہترین پیشہ ہے۔ بے عقلوں کو عقل سکھانا اور جاہلوں کو انسان بنانا تا کہ وہ دنیا میں اپنے اشرف المخلوقات ہونے کو ثابت کر سکیں۔ ایسے کئی خیالات دل میں چکر لگایا کرتے تھے۔ آخر جب میں نے امتحانات کا لا متناہی سلسلہ جو پہلی جماعت سے شروع ہو گیا تھا ختم کر کے اور ڈگریوں سے مسلح ہو کر وادیِ طالب علمی کی آخری سرحد پار کر دی تو میرے دل میں عجیب و غریب خیالات تھے۔ میری حالت ایک فاتح کی سی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا میری اپنی ملکیت ہے اور ہر جگہ خوشی کے نقارے بج رہے ہیں۔

میرے دماغ نے جو دنیا بسا رکھی تھی اس میں رنگینیاں ہی رنگینیاں تھیں۔ میں سوچا کرتا تھا کہ مصائب کا زمانہ اب ختم ہو گیا۔ امتحان پاس کرنے کیلئے جو دردسری اٹھانی پڑتی تھی اب وہ نہ رہیگی۔ اب تو میں ایک مدرس بلکہ کسی اسکول کا ہیڈ ماسٹر بن جاؤں گا۔ مونچھیں پالونگا۔ دو تین عدد موٹے ڈنڈے خرید لونگا۔ ایک دو قسم کے فونٹن پن اور کچھ پنسلیں جیب میں ٹانگ لونگا اور اس طرح ایک معزز ہستی بنکر رعب سے زندگی بسر کرونگا۔

اسی رنگین زمانے کا ذکر ہے کہ میں نے ایک اخبار میں ہیڈ ماسٹر کی ضرورت کا اشتہار پڑھا۔ انگلستان کا ڈگری یافتہ مطلوب تھا۔ تنخواہ ساڑھے چار سو تا سات سو بتلائی تھی۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ اشتہار تو خاص میرے ہی لئے چھاپا گیا ہے۔ میں نہ صرف انگلستان ہی کا ڈگری یافتہ تھا، بلکہ مادر وطن سے بھی دو عدد عمدہ قسم کی اسناد حاصل کر چکا تھا۔ فوراً عرضی لکھی، ٹائپ کروا، بذریعہ رجسٹری روانہ کر دی۔ امید تھی کہ فوراً جواب آئیگا بلکہ تار کے ذریعے بلا لیا جاؤنگا۔ ایک دو ہفتے تک کوئی جواب نہ آیا۔ بعد کے دو ہفتے ماہیِ بے آب کی طرح گزارے مگر تار کا چپراسی چٹھی رساں، سراغ رساں کوئی بھی نہیں آیا۔

کچھ عرصہ بعد ایک اور اشتہار نظر سے گزرا۔ یہ بھی ہیڈ ماسٹر کی ضرورت بتلاتا تھا۔ تنخواہ بھی معقول تھی اور یہ بھی میرے اندازے کے مطابق خاص میرے ہی لئے شائع کیا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ پھر عرضی ٹائپ کروائی اور ایک پنڈت جی سے نیک ساعت دریافت کر کے اس وقت ڈاک میں ڈالدی۔ انتظار کی گھڑیاں پھر شروع ہو گئیں۔ دن ہفتے اور آخر مہینہ گزر گیا معلوم ہوتا تھا کہ اشتہار دینے والے جواب دینے کے عادی نہیں۔ یا ایسے اشتہار اخبار والے محض اپنے خالی اوراق پُر کرنے کی غرض سے شائع کر دیتے ہیں۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے گرم و سرد، ہر دو قسم کی آہیں بھریں، آسمان کی طرف منہ کر کے آہ و زاری کی مگر میرے نالوں نے خاک بھی اثر نہ بتلایا۔ اسی طرح بہت سی عرضیاں بھیجیں اور ٹکٹ اور ٹائپ کروانے پر زر و مال لٹوایا مگر کسی بھلے مانس نے جواب تک نہ دیا۔

آخرکار چھ ماہ کے انتظار کے بعد ایک جگہ سے مددگار ہیڈ ماسٹر کی جگہ کیلئے انٹرویو کیلئے بلاوا آیا۔ میں نے تیاریاں شروع کر دیں۔ اپنے انگلستان سے سلائے ہوئے سوٹ کو استری کروایا۔ بال کٹوائے، اور انٹرویو کے لئے وقت پر پہونچ گیا۔ جس کمرے میں انٹرویو ہونیوالا تھا اسکے باہر پچاس کے لگ بھگ مختلف جسامت، قد، عمر و ہیئت کے انسان جمع تھے۔ یہ سب امیدوار تھے اور ایک ایک کر کے اندر بلائے جا رہے تھے۔ میری باری بھی آ گئی۔ ایک بڑی میز کے گرد تین چار عجیب الخلقت اشخاص براجمان تھے۔ بوڑھے، موٹے اور بظاہر خوش خوش ..... نہ معلوم یہ انٹرویو کرنے والے موٹے کیوں ہوتے ہیں ــــ میں اندر داخل ہوا اور

سب کو سلام کیا۔ ایک کرسی پر بیٹھنے کے لئے ایک طرف سے اشارہ ہوا۔ میرے بیٹھنے کے بعد ایک صاحب نے نام پوچھا۔ عمر دریافت کی۔ مذہب کے بارے میں استفسار کیا۔ صحت کے متعلق مختلف سوالات کئے۔ وطن پوچھا۔ یہ بھی پوچھا کہ بیوی کے بطن سے کتنے بچے ہو چکے ہیں۔ جب میں سوالات کا جواب دے چکا تو فرمانے لگے۔ "نوجوان۔ تم اس عہدے کے لئے بہت کم عمر ہو۔ تم پروفیسر ہو۔ کسی کالج میں تمہاری خوب بنے گی (پھر اپنے ساتھی کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں بندے خاں صاحب؟"

اور بندے خانصاحب نے یوں سر ہلایا جیسے کسی چابی سے چلنے والے کھلونے کو چابی دیکر چھوڑ دیا جائے اور کہا "جی ہاں۔ جی ہاں جی ہاں"

مجھے ان گپڑیوں پر سخت طیش آیا۔ آخر انہوں نے میرا شجرہ نسب دریافت کرنے کے لئے مجھے کیوں تکلیف دی تھی۔ میں نے کہا "حضرات شاید آپ نے محض میری صورت دیکھنے کے لئے مجھے بلایا تھا ورنہ میری نوجوانی کا حال تو آپ کو میری عرضی سے معلوم ہو جانا چاہئیے تھا" اور دل میں یہ سوچتے ہوئے باہر نکل آیا کہ۔۔

رُک تیرا کام نہیں چلنا تری شان
چل چل رے نوجوان
واپس تو چلے جا۔ آیا ہی کیوں تھا؟
اسناد لئے جا۔ پروفیسر بن جا
چل چل رے نوجوان

اس طرح یہ نوجوان ناتجربہ کار ایک تلخ تجربہ کر کے واپس لوٹا۔

سوچنے لگا کہ طالب علمی کا زمانہ کچھ اتنا برا نہ تھا۔ بیشک امتحان تھے۔ گھر کا کام کرنا ہوتا تھا مگر ان کے ساتھ ساتھ بے حد تسکین اور بےفکری بھی تھی۔ خیر۔ دن گزرنے لگے۔ اب مجھے اپنے بے روزگار ہونے کا احساس بہت زیادہ تنگ کرنے لگا۔ آخر کب تک انسان خواہ وہ نوجوان ہی کیوں نہ ہو والدین کی کمائی ہوئی روٹیاں چباتے؟ بندہ پھر سے تلاش ملازمت میں تندہی سے کوشش کرنے لگا۔ ہیڈ ماسٹری اور بڑے بڑے عہدے اب ذہن سے نکل چکے تھے۔ صرف مدرس بننے کا ولولہ ابھی تک باقی تھا۔ آخر بڑی کوششوں کے بعد ایک اسکول میں مددگار مدرس کی ملازمت مل ہی گئی۔ کامیابی پھر خوبصورت پریاں بن کر سامنے ناچنے لگی۔ تلخ شدہ زندگی میں پھر بہار آگئی۔ دنیا کا رنگ پھر گلابی ہو گیا۔ بچپن سے لگائی ہوئی آس پوری ہو گئی۔

پہلے دن مدرسہ گیا تو وہ پرانا زمانہ یاد آگیا۔ طلبا کا بستے بغل میں دبائے اِدھر سے اُدھر جانا۔ قلمیں، دواتیں، ہنسی مذاق، گریہ، اُستاد، سبق، گھنٹیاں، جماعتیں، بورڈ، چاک، کھیلنے کا میدان، وہی پرانا ماحول۔ مگر میں بحیثیت مدرس کے داخل ہو رہا تھا۔ انقلاب زندہ باد!

اپنے ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملا۔ فرشتہ خصلت اور نیک آدمی تھے۔ مجھے مدرس بننے پر مبارکباد دی اور چند ایک باتیں سمجھا کر اور ایک چپراسی کو بلا کر مجھے "مولوی صاحب" کے پاس لے جانے کی تاکید کی۔ میں بارعب چپراسی کے پیچھے پیچھے اسی طرح ہو لیا جس طرح کوئی ہندوستانی دلہن اپنے بے رعب خاوند کے پیچھے پیچھے پلیٹ فارم پر جا رہی ہو۔ دو چار کمرے چھوڑ کر چپراسی ایک کمرے میں داخل ہوا اور مجھے ایک ڈاڑھی پوش انسان کے پاس لیجا کر کہا۔ "مولوی صاحب یہ حضرت نئے استاد ہیں"

مولوی صاحب ایک چھوٹی سی میز کے پیچھے گھومنے والی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میز پر کچھ کاغذ، چند موٹے موٹے رجسٹر، سیاہی اور سرخی کی دواتیں، تین چار قلم، خود اُن کے سر پر دو پلڑی ٹوپی۔ منہ ڈاڑھی اور مونچھوں سے آلودہ۔ منہ کے اندر سفید دانت مگر ضعیفی کا ثبوت حاصل کئے ہوئے۔ جسم پر کوٹ پتلون اور کالر والی قمیص نکٹائی کے بغیر۔ مجھکو دیکھکر اُن کا منہ تبسم مسکراہٹ بن گیا۔ مجھ سے مل کر خوش ہوئے اور فرمانے لگے۔ "ہمارے مدرسہ کو آپ جیسے نوجوانوں کی سخت ضرورت ہے"

میں نے شکریہ ادا کیا اور پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

مولوی صاحب نے مجھے ایک ٹائم ٹیبل عطا کیا اور کہا کہ "لائبریری سے جا کر کورس کی کتابیں لے لو۔ اور ٹائم ٹیبل کے مطابق کل سے کام شروع کر دینا"

مولوی صاحب متواتر مسکرا رہے تھے اور آہستہ آہستہ سر بھی ہلا رہے تھے۔ نہ معلوم کیوں؟ میں پریشان تھا کہ۔ ع۔
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔

معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے فرائض میں سے نئے استاد کو ایک دو مرتبہ ہنسانا بھی تھا۔ میں بھی بڑے جوش سے مسکرایا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کا دل دکھاؤں۔ سوچا تھا کہ شاید میرے مسکرانے سے یہ مولوی صاحب اپنا مسکرانا بند کر دینگے مگر وہ متواتر مسکراتے ہی رہے اور میں لائبریری کا راستہ پوچھکر اسطرف چلتا بنا۔ کتابیں حاصل کیں اور جماعتوں اور مدرسے کے راستوں سے کچھ واقفیت کر کے گھر چلا گیا۔

دل میں عجب ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ یہ خیال کہ کل سے واقعی میں تعلیم دینا شروع کر دونگا میرے دل میں وہی احساسات پیدا کر رہا تھا جو کسی دوشیزہ کے دل میں اپنے محبوب سے بیاہے جانے کے خیال سے پیدا ہو جائیں۔ میں نے سوچا کہ کل جب پہلے پہل جماعت میں جاؤنگا تو لڑکے تعظیماً کھڑے ہو جائینگے اس پر میں حضرت نوح کے انداز سے ہاتھ ہلاتے ہوئے انہیں بٹھا دونگا

اور تاکید کرونگا کہ آیندہ سے وہ میرے آنے پر کھڑے نہ ہوا کریں اور مجھے اپنا دوست تصور کریں اور ایک ایسا رہبر جس سے وہ مدد طلب کریں۔ مشکلات حل کروائیں۔ مگر جس طرح میرا فرض اُن کی مدد کرنا ہے اسی طرح ان کا فرض سبق یاد کرنا ہے۔ اگر وہ اپنا کام ٹھیک کرینگے تو انہیں کوئی ڈر نہ ہونا چاہئے البتہ اگر وہ اپنے فرائض پورے نہ کرینگے تو پھر میں اُن کو سخت سے سخت سزائیں دونگا۔ مارونگا۔ ناک کان تراش لونگا۔ اُٹھ بیٹھ کراونگا وغیرہ وغیرہ۔ اور جب لڑکے میری تقریر سے خوش ہو کر پھر خاموش ہو جائیں گے تو ان سے پوچھونگا کہ کتاب کہاں تک پڑھی ہے۔ اور یہ دریافت کر کے درس دینا شروع کر دونگا۔ انہی خیالات میں ڈوبا ہوا میں نہ جانے کب سو گیا۔

دوسرے دن سویرے اُٹھا۔ اچھی طرح نہایا دھویا اور پھر ناشتہ کر کے اسکول روانہ ہو گیا۔ گھنٹہ بجا اور اساتذہ کے کمرے سے مدرس اس طرح نکلنے شروع ہوئے جس طرح کسی طیاروں کی فوجی بندرگاہ سے ہوائی حملے کا بگل سُنکر ہوائی جہاز رینگنے شروع ہو جائیں۔ میں بھی اپنی جماعت ششم (ج) کی طرف لپکا۔ وہاں پہونچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک لحیم شحیم اچھی خاصی مونچھوں والا انسان بورڈ صاف کر رہا ہے۔ میں نے سوچا شاید غلطی سے کوئی اور استاد میری جگہ آ گیا ہے۔ پھر ٹائم ٹیبل دیکھا اس میں اسی جماعت کا ذکر تھا۔ پھر خیال آیا کہ شاید مولوی صاحب سے غلطی ہو گئی ہو۔ مگر یہ خیال بھی جلد ہی دل سے خارج کرنا پڑا۔ کیونکہ اُن کا مسکراتا ہوا چہرہ اور اُن کی عمر اپنے کام پر حاوی ہونے کی دلیل تھے۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ کسی استاد کو غلطی ہو گئی ہوگی اور جماعت میں داخل ہو گیا! کچھ کانا پھوسیاں ہونی شروع ہوئیں۔ ایک دو قہقہے بلند ہوئے اور اس پہلوان نما انسان نے مجھکو جماعت کی آخری بنچ بتاتے ہوئے کہا "وہاں جا کر بیٹھ جاؤ"۔

میں نے کہا "مگر سنئیے تو میں یہاں اس لئے نہیں آیا کہ ..."

بات کاٹتے ہوئے اُس نے ذرا ڈپٹ کر کہا "یہی نا کہ کوئی آپ پر رعب جمائے۔ مگر میں رعب نہیں جما رہا۔ اس جماعت میں یہی قاعدہ ہے کہ ہر ایک لڑکا مقررہ جگہ پر بیٹھے۔ باقی سب ڈیسکیں دیگر طلباء کے لئے وقف کر دی گئی ہیں۔ آپ خاموشی سے وہاں جا کر بیٹھ جائیے ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑنے لگیں"۔

میں نے دل میں سوچا اور کیا اولے پڑینگے، یہ تو بم ہیں بم!

مرا مزاج لڑکپن سے مسخرانہ تھا

مگر رجا۔

میں جا کر بیٹھ ہی گیا۔ یہ سوچ کر کہ آج ان مولوی صاحب سے ایسے ایسے سوالات پوچھونگا کہ ساری عمر مجھے یاد کرینگے۔ لیکن میرے بیٹھتے ہی وہ مضبوط شخص بھی سامنے کی ایک خالی ڈیسک پر بیٹھ گیا!!! ارے توبہ وہ تو ایک طالب علم نکلا۔ میں نے اُس کو دل میں خوب کوسا اور اسکی ہیبتناک ساخت کو ہزاروں گالیاں دیں۔ اُس نے میرا سوچا ہوا تمام پروگرام درہم برہم کر دیا تھا۔ عجیب معاملہ درپیش تھا۔ سبق پڑھانے آیا تھا مگر سبق پڑھنے والا سمجھا گیا تھا۔ آخر ہمت کر کے اُٹھا اور استاد والے اونچے ڈیسک کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا اور گلا صاف کرتے ہوئے بولنا شروع کیا۔

"آج ہم سب غلطیوں کا شکار ہوئے ہیں۔ مجھکو اس جماعت کے مونیٹر نے نیا لڑکا سمجھا حالانکہ میں آپ کا نیا اُستاد ہوں۔ (بلند قہقہے) ہنسئے مت، یہ ایک حقیقت ہے۔ میری غلطی یہ تھی کہ میں نے آپ کے مونیٹر صاحب کو آپکا اُستاد سمجھا۔ اور حق تو یہ ہے کہ اُنکے تحتِ توش ہ مونچھوں اور پختہ شکل کے اعتبار سے میں تو کیا کوئی بھی نیا آدمی اُن کو طالب علم نہ سمجھتا۔ (تالیاں) مگر چھوڑیئے ان گزری ہوئی کہانیوں کو۔ آپ مجھکو اپنا دوست تصور کریں اور ایک ایسا رہبر ....." اور میں نے رات کی سوچی ہوئی تقریر دُہرا دی۔ یہ قصہ آیا گیا ہوا اور میں نے فرائض استادی انجام دینے شروع کر دیئے۔

جب میں نے دیگر اساتذہ کو یہ قصہ سُنایا تو وہ خوب ہنسے۔ مگر اُن کی ہنسی میں مردہ پن کی جھلک تھی۔ یہ ہنسی ایسی ہی تھی جیسے کوئی بھیڑ ہلاکت گاہ میں اپنے ایک ساتھی کو آتا دیکھکر مُسکرائے۔ ان میں سے بعض پختہ کار حضرات نے مجھکو اُستادوں کے عجیب و غریب قصّے سنائے۔ کس طرح ایک استاد کو لڑکوں نے اس قدر بنایا تھا کہ وہ استعفیٰ دیکر آجکل بمبئی کی ایک فلم کمپنی میں مسخرے کا پارٹ کرانے کے ماہر بن چکے تھے اور کس طرح ایک مولوی صاحب نے اپنے ایک شاگرد کو اس قدر پیٹا تھا کہ وہ اسپتال میں جا کر ڈیڑھ سال تک زندگی اور موت کی کشمکش کا مظاہرہ کرتا رہا تھا اور مولوی صاحب نوکری سے برطرف ہو کر گھر بار چھوڑ چکے تھے اور اب فقیر بنکر "دُنیا دیوانی۔ یہ دُنیا دیوانی" کے جگر خراش نعرے لگاتے پھرتے تھے مگر اسکول میں لڑکوں کو جسمانی سزا دینے کے خلاف احکام صادر کروائے گئے۔

ایک اُستاد کے فرائض کیا ہیں یہ ایک اُستاد ہی جانتا ہے۔ ان کو انگلیوں پر گِن دینا ناممکن ہے۔ ایسے ہی ناممکن جیسے ایک ماں کے فرائض کو شمار کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ فرائض گِنے نہیں جا سکتے بلکہ ان کو ادا کرنے والا انسان محسوس کر سکتا ہے۔ اوروں کی نظروں میں تو پیشہ استادی صرف یہ معنی رکھتا ہوگا کہ مدرسے کے اوقات میں کچھ نہ کچھ بک دینا اور گھر بیٹھکر مزے سے کھانا۔ سال میں تین چار ماہ چھٹیاں منانا۔ کھیل کود میں حصہ لینا۔ بچّوں کے ساتھ رہ کر ساری عمر جوان بنے رہنا۔ مگر کسی اُستاد سے پوچھئے کہ کیا یہ تشریح ٹھیک ہے؟

میں بھی ایک اُستاد ہوں اور اس پیشے میں اپنی زندگی کے تین نوجوان سال گذار چکا ہوں۔ اب حالت یہ ہے کہ دل مُردہ ہوچکا ہے! اعضا ہر دم کھاٹ ڈھونڈتے ہیں۔ سر کے بال اپنی رنگت بدل رہے ہیں۔ آنکھیں عینک سے شادی کرنا چاہتی ہیں مگر وہ لڑکیاں جو میرے اس پیشے کو اختیار کرنے سے پہلے مجھ پر مرتی تھیں اب مجھ سے شادی کرنے کو راضی نہیں۔ مالی اعتبار سے کوئی شخص ایک پیسے کا اُدھار دیکر واپس لینے کی اُمید نہیں رکھتا۔ شاگرد کوستے ہیں کہ اُستاد بہت سختی کرتا ہے، زیادہ کام کرواتا ہے۔ شاگردوں کے والدین ہر حالت میں ناخوش رہتے ہیں۔ اگر اُن کے لڑکے کو انسان بنانے کی کوشش کی جائے تو اُستاد کو وحشی قرار دیتے ہیں۔ اور جو ڈور ڈھیلی چھوڑ دی جائے تو کہتے ہیں کہ سختی کرو۔ اور اسکول انسپکٹر اپنی اہمیت بلکہ اپنی کارروائی بتلانے کے لئے بلاوجہ نقائص نکال کے رکھ دیتے ہیں۔ اگر بیٹھک پڑھاؤ تو حکم ہوتا ہے کہ اُستادوں کو کھڑے رہکر پڑھانا چاہیئے اور اگر کھڑے ہوکر پڑھایا جائے تو بیٹھے رہنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ اس طرح استاد ہر گھڑی ہر دم کسی نہ کسی کا تختۂ مشق بنا رہتا ہے۔

Engagement انگریزی زبان کا ایک لفظ ہے۔ اس کا مطلب سگائی ہے۔ یا سگائی اور شادی کا درمیانی وقفہ۔ اِسی کو انگریزی زبان میں اگر زیادہ وضاحت سے بیان کرنا ہو تو Engagement Period کہیں گے۔ سُنا ہے کہ جن ممالک میں عورتیں بندگوبھی کی طرح بُرقعوں میں پوشیدہ نہیں ہیں۔ یا صرف کھانا پکانے، کھلانے اور کھا کھا کر موٹا ہونے اور پھر درجنوں بچے پیدا کرکے پروردگاروں کی تعداد میں اضافہ کرنے کیلئے نہیں پالی جاتیں وہاں دو نوجوانوں کی زندگی کا بہترین زمانہ Engagement Period ہوتا ہے۔ کیونکہ یہی وہ زمانہ ہوتا ہے جس میں انگیج شدہ جوڑا انتہائی راحت اور سُکھ پاتا ہے۔ محبت کا دَور دورہ ہوتا ہے اور میاں بیوی والی ذمہ داریاں نہیں ہوتیں۔ مگر کسی مدرس سے پوچھئے کہ اُس کی لغت میں Engagement Period سے کیا مُراد ہے۔ جب کوئی اُستاد پیٹ کے درد، ٹانگ کے درد، کمر کے درد، سر کے درد، آنکھوں کے درد، کمزوری، بُخار یا کسی اور درد میں مبتلا ہوکر رخصت لینے پر مجبور ہو جاتا ہے تو اُسکے گھنٹے طوعاً کسی دوسرے اُستاد کو دئے جاتے ہیں وہ بھی Engagement Periods ہی کہلاتے ہیں۔ نام دونوں کا ایک ہی ہے مگر فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر سے بیاہے جانے والا جوڑا اپنی آئندہ زندگی کے رنگین خوابوں میں ڈوبا رہتا ہے اور انکو حقیقت بنانے کی خواہش میں ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے اور موخر الذکر سے اُستاد موت کا متلاشی اور گور میں چین حاصل کرنے کیلئے بیقرار رہتا ہے۔ یہی وہ بلا ہے جس میں ہر مدرس مبتلا ہے۔ ٹائم ٹیبل کے لحاظ سے جس وقت وہ فارغ سمجھا جاتا ہے اُس وقت وہ درحقیقت کسی دوسرے صاحب فراش ماسٹر کا کام کر رہا ہوتا ہے۔ اور اس طرح اگر نوجوان ہو تو نوجوانی کھو بیٹھتا ہے، اگر جوان ہو تو جوانی سے خالی ہاتھ رہ جاتا ہے اور اگر بوڑھا ہو تو وظیفہ پانے سے پہلے ہی کسی دن جماعت کی طرف جاتے ہوئے پیشۂ اُستادی پر خود کو بھینٹ چڑھا دیتا ہے!! مولوی صاحب کا وہ فقرہ کہ "ہمارے مدرسے کو آپ جیسے نوجوانوں کی سخت ضرورت ہے" میری اب سمجھ میں آرہا ہے۔ مگر مولوی صاحب کو یہ شکایت ہے کہ ہر نوجوان جو اُن کی قلم کی زد کے نیچے آجاتا ہے بہت جلد نوجوانی۔ جوانی۔ ادھیڑپن اور بڑھاپے کی منزلیں طے کرکے آخر ایک مدرس — محض ایک مدرس بنکر رہ جاتا ہے!

ہر ایک اُستاد کی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ حصہ جب وہ اسکول میں لڑکوں کو تعلیم دینے کی کوشش میں مصروف ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو چھٹی کے گھنٹے کے بعد سے شروع ہوکر دوسرے دن اسکول شروع ہونے پر ختم ہوتا ہے۔ اسکول کے اوقات کا زمانہ عجب پریشانی میں گزرتا ہے۔ آجکل کے طلبا اُن پُرانے زمانے کے طلبا کی طرح نہیں ہیں جو بغل میں جزدان دبائے دل میں یہی دھیان جمائے رہتے تھے کہ وقت پر پہونچکر اُستاد کو سبق سُنائیں اور ہونہار ثابت ہوں۔ آجکل کے لونڈے بھی عجب ہیں۔ جُزدان گھر میں چھوڑ آتے ہیں۔ دل پر یہی دھیان لگا رہتا ہے کہ شام کو خورشید کو "مسافر" میں دیکھیں یا لیلا چٹنس کو "بندھن" میں۔ ان میں سے بعض خود کو مرزا غالب تصور کرکے بال بڑھاتے ہیں اور ان کو اُستاد کی طرح پریشان رکھتے ہیں۔ منہ میں ہمیشہ پان ٹھونسے رکھتے ہیں مگر دماغ ہمیشہ خالی۔ بعض جیم کمپنی کے شیدائی منہ میں چیونگ گم رکھتے ہیں۔ جسم پر کوٹ پتلون اور دل میں یہ آرزو کہ کسی دن اُستاد کو جماعت میں ایسا پٹخیں جو کچھ دن کے لئے رخصت لینے پر مجبور ہو جائے۔ ایسے ہونہاروں کو تعلیم دینے کی کوشش میں تن من دھن کھو دیتا ہے۔ دھن ہوتا ہی نہیں اس لئے اس کو کھو نہیں سکتا۔ مختصراً جماعت میں جو شخص سب سے کم شور کر رہا ہوتا ہے وہ اُستاد ہی ہوتا ہے۔ وہ زیادہ شور اس لئے نہیں کرسکتا کہ اس کا گلا پکارتے پکارتے مستقل طور پر بیٹھ جاتا ہے!

تعلیمی اوقات ختم ہونے پر اُستاد کا ایک دن کا کام ختم نہیں ہو جاتا۔ "گھر کے کام" کی کاپیوں کو سائیکل کے پیچھے باندھکر وہ گھر کی طرف نیم بیہوشی

کی حالت میں روانہ ہوجاتا ہے۔ اگر کھیل کی مشق کرانے کی ذمہ داری ہو تو چھٹی کے گھنٹے کے بعد لڑکوں کے ساتھ کھیلنا پڑتا ہے۔ یعنی کمزور ٹانگوں کو بھگانا پڑتا ہے اور تھکے ہوئے دماغ کو چیخ چیخ کر اور تھکانا ہوتا ہے۔ مگر یہ کمبخت لڑکے کھیلنا بھی نہیں سیکھ سکتے۔ آخر یہ ڈیوٹی بھی ادا کر کے جب اُستاد گھر پہونچتا ہے تو تھکان سے چُور، بھوک اور پیاس سے مجبور، دُنیا سے بیزار صرف یہ چاہتا ہے کہ کچھ کھا پی کر خود کو چارپائی کی نظر کردے۔

مگر کھانا زہر مار کرنے کے بعد وہ فوراً نہیں سو سکتا۔ صبح سے شام تک شاگردوں کو یہ درس دینے کے بعد کہ "آج کا کام کل پر نہ چھوڑو" وہ خود کس طرح اپنے کام کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ فوراً سرخی کی دوات اور قلم لیکر گھر کے کام کی کاپیوں کے انبار کو سامنے رکھ تصحیح کا کام شروع کر دیتا ہے اور یہ کرتے کرتے کسی وقت بارہ بجے کے بعد کسی سپاہی کی طرح جو پہرہ دیتے ہوئے گولی کا نشانہ بن کر چوکی کے پاس ہی ڈھیر ہوجاتا ہے بیہوش ہوجاتا ہے' ایسی حالت میں کہ ایک کاپی گود میں ہوتی اور سر کاپیوں کے انبار پر! پھر جب رات کو اسکول کا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھکر نیند ہوشیار ہوجائے تو گھر کا کام درست کرنے کا سلسلہ پھر جاری ہوجاتا ہے!!!

چھٹی کے دن اسکول جانا نہیں ہوتا لیکن کسی نہ کسی جگہ لڑکوں کو پکنک کے لئے لے جانا ہوتا ہے۔ اگر یہ ذمہ داری عائد نہ ہو تو پرچے بنانے یا دیکھنے کا کام ہوتا ہے۔ اگر اتفاق سے یہ بھی نہ ہو تو اگلے ہفتے کے نوٹس بنانے کا کام تو ضرور ہی ہوتا ہے۔ جو تھوڑا بہت وقت بچ جاتا ہے وہ اپنے مضمون کے متعلق کوئی نئی کتاب کا مطالعہ کرنے یا گزرے ہوئے ہفتے کے اخبارات دیکھنے میں گزر جاتا ہے۔ شام کو اگر کچھ وقت فرصت کا نکل آئے تو شادی شدہ اُستاد تو شاید اپنے بیوی بچوں سے دل بہلانے میں گزارتے ہونگے۔ مگر میرے جیسے کنوارے اگر یہ فیصلہ کریں کہ چلو آج سینما دیکھیں تو یہ بھی نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ مالی حالت سے مجبور اگر کبھی سینما دیکھنے کے لئے وقت نکل آئے تو چار آنے والی نشست سے اونچے درجے میں بیٹھنے کا خیال نہیں آسکتا۔ مگر جب سینما گھر میں ٹکٹ کی کھڑکی کے پاس پہونچو تو پیچھے سے آواز آتی ہے "آداب صاحب" مڑ کر دیکھو تو کوئی شاگرد صاحب موت کے فرشتے کی طرح ایک ہاتھ پیٹھ کے پیچھے کئے (سگرٹ چھپانے کی کوشش) ایک ہاتھ سے آداب کر رہے ہوتے ہیں۔ اور ہم اُستاد شریف انسان ٹھہرے اپنے شاگردوں کے سامنے ادنیٰ درجے میں کس طرح بیٹھ سکتے ہیں۔ عزت کا خیال ہوتا ہے۔ اس لئے اس طرح کا کوئی بہانہ بنا کر کہ "ایک دوست نے یہاں ملنے کا وعدہ کیا تھا" وہاں سے نکل آتے ہیں۔ فلم دیکھنے کی خواہش دل میں رہ جاتی ہے اور تھکا ہوا جسم تین چار میل کی مسافت سے اور بھی تھک جاتا ہے۔

اس طرح دماغی اور جسمانی کام کر کر کے اُستاد آدھ موئے ہوجاتے ہیں اور گرمی کی چھٹیاں اکثر اسپتالوں میں گزارتے ہیں۔ اور جو سخت جان بیمار نہیں پڑتے اُن کو حکومت اعزازی کاموں پر لگا دیتی ہے۔ مثلاً مردم شماری کرنے یا کسی نمائش گاہ کے انتظام میں حصہ لینے کا کام، مدرس کو سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ شاگردوں کے ہتھکنڈے، انسپکٹروں کی نکتہ چینیاں۔ والدین کی طعن و تشنیع۔ کام کی زیادتی اور آمدن کی کمی۔ اعزازی ذمہ داریاں۔ کچھ عرصہ بعد اُستاد مجسم برداشت کا دیوتا بن جاتا ہے۔ دُنیا میں ایسے برداشت کے دیوتا دو قسم کے ہیں۔ ایک تو اُستاد اور دوسرا گدھا۔ ان دونوں کے کان ہوتے ہیں البتہ گدھے کے جسم میں دو ٹانگیں اور دم زیادہ ہیں مگر صفات کے اعتبار سے دونوں میں غیر معمولی طور پر مشابہت ہے!

بھارت چند کھنہ۔ ایم۔ اے!

مکڑی کا جالا

(بسلسلہ صفحہ ۳۵)

چند لمحات میں چنڈی کی سہیلی کے ہاتھوں میں چند سوکھی بے ماس ہڈیوں کا ایک ننھا بے خون بچہ تھا۔ موتی نے دانتوں سے اس کا نال کاٹا اور پیار و ہمدردی سے اُمڈتی آنکھوں سے چنڈی کی طرف دیکھنے لگا۔ چنڈی کی مایوس آنکھیں بیگانہ پھیکا پن سے اُسے گھُورنے لگیں۔ اُسکے کانپتے ہونٹوں نے کچھ حرکت کی جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اُن سے کوئی آواز نہ نکلی۔ اُسکے حلق سے سانس بمشکل نکل رہا تھا۔ موتی پر بھی ایک دردناک سراسیمگی غالب ہوگئی۔

"مبارک ہو چنڈی... لڑکا ہے" چنڈی کی سہیلی نے ہمدردانہ لہجے میں رُکتے ہوئے کہا۔

چنڈی خاموش رہی۔ اُسکی ٹمٹماتی آنکھیں مکڑی کے جالے میں آزادی کیلئے آخری کشمکش کرتی مکھی پر جمی ہوئی تھیں۔

نومولود بچے نے جھونپڑے کے باہر بے کنارہ اندھیرا دیکھا اور زور زور سے رونے لگا۔

چنڈی مُسکرائی۔ ایک درد میں بھیگی ہوئی مُسکراہٹ۔ اُسنے اپنی مشتعل آنکھوں کو اِدھر اُدھر گھمایا۔ سر جھٹکا۔ ایک دو ہچکیاں لیں اور دم توڑ دیا۔ مکڑی کے جالے میں پھنسی ہوئی مکھی بھی آزاد ہو چکی تھی۔

شمشیر سنگھ نرولا!

تیسرا منظر۔

موت

اسٹیج منظر اول کی طرح۔ وقت صبح پانچ بجے کا۔ بیگم نیند سے چونک کر کمرے کے چاروں طرف خوف و تعجب سے دیکھ رہی ہے۔ اس کی سانس رک رک کر آ رہی ہے۔
خاوند اسکے بستر کے پاس کھڑا ہے۔

خاوند۔ لالٹین میں تو کوئی خرابی نہیں۔ (چھت سے لٹکی ہوئی لالٹین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اگرچہ تیل ختم ہونے سے مدھم پڑ رہی ہے مگر صبح ہونے والی ہے۔

بیگم۔ تم کب واپس آئے؟

خاوند۔ میں کہیں گیا ہی نہیں واپس آنے کا کیا مطلب؟ شاید تم کوئی خواب دیکھ رہی تھیں۔ تبھی تو لالٹین لالٹین اور روشنی روشنی چلا رہی تھیں —!

بیگم۔ اُف کس قدر ڈراؤنا خواب تھا! کیا صبح ہو گئی؟

خاوند۔ ہاں خدا خدا کر کے پہاڑ سی رات ختم ہو گئی۔ مگر تم تو خوب سوئیں رات معلوم بھی نہ ہوئی ہو گی۔ میں نے رات میں دو مرتبہ برف کی تھیلیاں بدلوائیں لیکن تمہیں خبر تک نہ ہوئی۔ کہو اب طبیعت کیسی ہے، کچھ آرام ہے یا نہیں؟۔

بیگم۔ کاش وہ خواب نہ دکھائی دیتا! اُف بدن چور چور ہو رہا ہے۔ بہتر ہے تم میرے قریب نہ آؤ۔ ہائے میرا دم گھٹ رہا ہے۔ (خاوند پرے ہٹ جاتا ہے۔ بیگم کا تنفس پہلے سے بھی زیادہ رک رک کر آنے لگتا ہے۔ اور وہ درد سے بیتاب ہو کر چلاتی ہے) برف کی تھیلی ہٹاؤ — ہائے میرا سینہ — ہٹاؤ میرے سینے سے، ہائے میرا دم نکلا! (خاوند قریب آتا ہے مگر وہ اسے پرے رہنے کا اشارہ کرتی ہے۔) اُف! اُف! میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ آکسیجن! آکسیجن!.... آکسیجن لاؤ!

خاوند۔ (گھبرا کر) لو ابھی لو۔ (نرس کے کمرے کے پاس جا کر آواز دیتا ہے)
نرس! نرس! (کہاں مر گئی) نرس!

نرس۔ (گھبرا کر اٹھ بیٹھتی ہے) جناب! کیا برف چاہیئے؟

خاوند۔ بیگم کا تنفس بہت تشویشناک ہو رہا ہے، آکسیجن لاؤ!

نرس۔ بہت اچھا جناب!
(نرس کی آواز کم خوابی کی وجہ سے بیحد بھاری ہو رہی ہے۔ بہت اچھا کہہ کر نیند کے غلبہ سے پھر اُونگھنے لگتی ہے۔)

خاوند۔ جلدی آؤ جلدی! (کچن میں جا کر) گرینی گرینی!! اُٹھو صبح ہو گئی!

گرینی۔ (اندر سے) سرکار میں جاگ رہی ہوں ابھی آئی۔
(خاوند واپس آ کر کمرے کی اشیا درست کرنے لگتا ہے۔ نرس رات کا لباس پہنے آکسیجن کا ڈبہ لئے داخل ہوتی ہے۔ گرینی بھی داخل ہوتی ہے۔)

بیگم۔ ہائے گرمی! ہائے گرمی!! پنکھا لاؤ —
(خاوند پنکھا اٹھاتا ہے بیگم اس سے لیکر خود جھلنے لگتی ہے۔ نرس آکسیجن پہونچانے لگتی ہے۔ خاوند اٹھکر کمرے کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ پھر نہایت عجلت سے تین تار لکھکر گرینی کو پکارتا ہے)

گرینی۔ بیگم صاحبہ کی حالت آج مخدوش ہو رہی ہے۔

خاوند۔ ہاں مجھے خوف ہے کہ — (گھنٹہ پانچ بجاتا ہے) کیا پانچ بج گئے (جیب سے گھڑی نکال کر) گھنٹہ سات منٹ تیز ہے۔ ابھی پانچ بجنے میں سات منٹ ہیں۔ تار گھر پورے چھ بجے کھلتا ہے۔ بس جونہی کھلے یہ تار لے جانا۔ اور دیکھو بہت سا گرم پانی تیار رہنا چاہیئے۔ (واپس بستر کے قریب آ کر، نرس سے) کیوں کچھ افاقہ ہوا؟۔

نرس۔ جی ہاں اب سانس بالکل ٹھیک چلنے لگی۔ (بیگم سے) کیا اب بند کر دوں؟۔
(بیگم اثبات میں سر ہلاتی ہے۔ نرس آکسیجن کا بکس بند کرتی ہے)

بیگم۔ (خاوند سے) نرس... نرس کو... میرے پاس چھوڑ دو... تم... آرام کرو... میرے قریب... نہ آؤ... اُف... پھنک رہی ہوں۔

خاوند۔ بہت اچھا میں جا کر آرام کرتا ہوں تم بھی سونے کی کوشش کرو۔
(خاوند اپنے کمرے میں جاتا ہے۔ چند منٹ بعد نرس اُونگھنے لگتی ہے۔ بیگم کروٹیں بدلتے ہوئے نرس کو پکارتی ہے۔)

بیگم۔ نرس!

نرس۔ (چونک کر) ہاں بیگم!

بیگم۔ میرے بچوں کی تصویر... وہ سامنے میرے بچوں... کی تصویر ہے... اسے یہاں... میرے پاس... لے آؤ... میں دیکھنا چاہتی... ہوں۔
(نرس جھکر تصویر اُتار لاتی ہے اور غور سے دیکھکر بیگم کے پاس رکھ دیتی ہے۔)

نرس:۔ کتنے خوبصورت بچے ہیں، تینوں لڑکے ہیں۔ ان کے چہروں سے معلوم ہوتا ہے گویا آپ کی صحتیابی کی دعا کر رہے ہیں۔

(نرس پھر اونگھنے لگتی ہے۔ کچن سے گرینی کے مناجات پڑھنے کی آواز آ رہی ہے۔ نرس نیند سے مغلوب ہو کر فرش پر گر پڑتی ہے اور بیگم تصویر دیکھتے دیکھتے رونے لگتی ہے۔)

بیگم:۔ (خاوند کو پکارتے ہوئے) پیارے!

خاوند:۔ ہاں کیا بات ہے؟ (کمرے سے باہر آتا ہے۔)

بیگم:۔ تم... تم... میرے پاس... بیٹھو اور... نرس کو... بھیج دو۔

خاوند:۔ نرس جاؤ اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔ (نرس اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔) رات میوہ فروش کو ٹیلیفون کر دیا تھا۔

نرس:۔ نہیں جناب رات بہت جا چکی تھی میں نے سوچا صبح کر دوں گی۔

خاوند:۔ اچھا تو ابھی جاؤ۔

نرس:۔ بہت اچھا (گھنٹے کی طرف دیکھتے ہوئے) بیگم صاحبہ کو دوا پلا دوں؟

بیگم:۔ نہیں میں دوا نہیں پیتی۔

خاوند:۔ میرے خیال میں تمہیں دوا ضرور پینی چاہیے۔ جہاں تک ہو سکے کسی بات میں کوتاہی نہ ہونی چاہیے۔

بیگم:۔ اچھی بات... لاؤ۔ (نرس دوا پلاتی ہے)

نرس:۔ اب ٹمپریچر بھی لے لوں؟

خاوند:۔ تم رہنے دو میں دیکھ لیتا ہوں۔ جاؤ فوراً ٹیلیفون کر آؤ۔ (نرس جاتی ہے۔ رستے میں گرینی ملتی ہے) لاؤ میں خود تمہارا ٹمپریچر لیتا ہوں کیا حرارت تیز معلوم ہوتی ہے؟

بیگم:۔ ہاں۔

خاوند:۔ دیکھوں تو! (تھرمامیٹر لگاتا ہے۔)

نرس:۔ (ساتھ کے کمرے میں گرینی سے) گرینی جاؤ تو ذرا ہمسایہ کے ہاں جا کر میوہ فروش کو سیبوں کیلئے ٹیلیفون کر آؤ۔

گرینی:۔ مجھے پانی گرم کرنا ہے خود ہی چلی جاؤ۔ (خاوند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کیا ان کا مزاج برہم ہو رہا ہے؟

نرس:۔ ہاں بری طرح چڑچڑے ہو رہے ہیں ۔۔۔ سچی میں تو اس مصیبت سے تنگ آ گئی۔

گرینی:۔ (بیگم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اگر ان کی طبیعت خراب ہوتی تو دیکھتیں وہ کتنے خوش مزاج ہیں جب کبھی بیگم کی طبیعت ناساز ہوتی ہے بات بات پر بے سبب بگڑنے لگتے ہیں ۔۔۔ بیگم کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟

نرس:۔ اگرچہ یہ کہتے ہوتے افسوس ہوتا ہے مگر مجھے اب کوئی اُمید نہیں نظر آتی۔

گرینی:۔ (افسوس میں سر ہلاتے ہوئے) چہ۔ چہ۔ کیا بالکل آس ٹوٹ گئی۔

نرس:۔ اچھا میں ٹیلیفون کر آؤں۔

(نرس چلی جاتی ہے۔ گرینی کمرہ درست کرنے لگتی ہے۔)

بیگم:۔ کیا تم... بچوں کو ڈاکٹر... کے پاس... لے گئے... تھے؟

خاوند:۔ ہاں کل بڑے لڑکے کو لے گیا تھا۔ خیال تھا کہ بہت فساد مچائیگا مگر وہ تو بڑا بہادر نکلا۔ اچھا ایک منٹ ہو گیا۔ (تھرمامیٹر نکال کر پڑھتے ہوئے) ارے صرف ۹۹ ڈگری کل ـــ بخار تو رہا نہیں! (وقفہ) ہاں تو ڈاکٹر نے بجلی کے اوزار سے اس کا دانت اکھاڑا تھا اور جب اوزار اسکے منہ میں لگایا تو کہنے لگا کہ اسکے منہ میں موٹر چل رہا ہے۔ اس پر سب لوگ ہنس پڑے اور اس کی بہت تعریف کی۔ (دوسرا وقفہ) تمہاری سانس ٹھیک ہے نا؟ تمہیں پسینہ چھوٹ رہا ہے لاؤ پونچھ دوں۔ (تولیے سے پسینہ پونچھنے کے بعد باہر باغ کی طرف دیکھتا ہے) اوہ آج کیسے خوبصورت پھول کھل رہے ہیں! (دوڑ کر باہر سے دو گملے پھولوں کے اٹھا لاتا ہے اور بیگم کے بستر کے پاس رکھ دیتا ہے۔) کہو ہیں نا خوبصورت؟ (تیسرا وقفہ) کسی گذرے ہوئے خواب کی طرح حسین! ـــ یاد ہے تم نے ایک مرتبہ غزل لکھی تھی جس کا عنوان تھا "حسین شگفتہ پھول"

بیگم:۔ ہاں ـــ ایک دھندلے خواب کی طرح ـــ (خاموشی) پیارے!

خاوند:۔ جانِ من!

بیگم:۔ میں تم سے... ایک بات... پوچھنا چاہتی... ہوں... صرف.... ایک بات!

خاوند:۔ پوچھو۔

بیگم:۔ میں تم پر... کلی اعتماد... رکھنے... میں... حق بجانب... تھی؟

خاوند:۔ کیوں نہیں۔ بیشک بعض اوقات مجھے نفسِ لوامہ کے جذباتِ سفلی کے خلاف غلبہ پانے میں بجد جدوجہد کرنا پڑی مگر بالآخر میں نے اُسے مار گرایا۔ مجھے فخر ہے کہ تمہاری محبت میرے دل کی عمیق ترین پنہائیوں میں جاگزین تھی اور یہی آڑے وقتوں میں پورے جوش و خروش سے اُبھر آتی اور جذبات رذیلہ کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتی۔

بیگم:۔ شکر ہے... تم نے میرے... دل کا بوجھ... ہلکا کر دیا... اب میں... اطمینان کی موت... مر سکتی ہوں۔

خاوند:۔ لیکن افسوس جب صرف تمہاری محبت میرے دل پر بلا شرکتِ غیرے قابض ہو چکی اور مستقبل مسرت افزا دکھائی دینے لگا تم بیمار پڑ گئیں۔

تم میرے دل کی تنہا ملکہ ہو اور اگر تم نے مجھے اس وقت چھوڑ دیا جبکہ میں صحیح معنوں میں خود کو تمہارا شوہر سمجھنے لگا ہوں تو میری یہ زندگی میرے لئے وبال ہو جائے گی۔ تمہیں تندرست ہونا چاہیئے سمجھیں؟

(بیگم اثبات میں سر ہلاتی ہے)

میرے خون میں کچھ سفید ذرات تھے۔ تم سے شادی ہونے کے بعد میں بارہا دوسری عورتوں کی طرف مائل ہوا۔ اور بعض اوقات تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ شاید قسمت مجھے ان میں سے کسی کے ساتھ وابستہ کر ہی دیگی۔ مگر میں لڑا بالکل یکہ و تنہا جد و جہد کرتا رہا۔ تم سے کبھی تذکرہ نہ کیا...... یکے بعد دیگرے میں سب پر فتحیاب ہوتا گیا۔ اگرچہ مجھے پوری قوتِ ارادی صرف کرنا پڑی۔ مگر ہر فتح سے تمہاری محبت اجاگر ہوتی گئی۔ اور میرا دل تقویت پاکر اور زیادہ لڑنے کے قابل ہوتا گیا۔ ایکو میں ان لمحات پر متاسف نہیں جب ہم ایک دوسرے سے بگڑ کر بات چیت کرنا چھوڑ دیتے تھے۔ میرا مطلب سمجھیں؟۔ ہمارے وہ لمحات ضائع نہیں گئے۔ انہوں نے ہی حقیقی محبت کی قوت و طاقت آشکارا کی۔ ہمیں ان لمحوں کا شکرگذار ہونا چاہیئے۔

بیگم:۔ اب مجھے زندگی سے کسی اور شے کی تمنا نہیں ــ میرا دل.... تمہاری محبت.... سے معمور ہے.... اس میں کسی.. شے کی.... گنجائش نہیں.... اگر میں.... مر بھی گئی.... تو بھی.... تمہارے دل.... میں جاگزین.... رہوں گی۔

خاوند:۔ لاریب تمہاری یاد میرے دل پر نقش کالحجر رہیگی۔ مگر اس سے قطع نظر تمہارا مادی جسم بھی زندہ رہنا چاہیئے۔

بیگم:۔ وہ تو جب تک.... قسمت کو منظور ہے.... رہیگا.... میں مردانہ وار.... موت کا.... مقابلہ کرونگی.... اس سے زیادہ.... میں کچھ.... نہیں کہہ.... سکتی.... میرے پاؤں.... سرد ہو.... رہے ہیں.... گرم پانی کی.... بوتل رکھو.... ڈاکٹر کو.... بلاؤ۔

(آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور سانس تیزی سے آنے لگتی ہے)

خاوند:۔ نرس! نرس!!

(گرینی دوڑتی ہوئی آتی ہے)

گرینی:۔ نرس ہمسایہ کے ہاں سے واپس نہیں آئی.... کمبخت ایسی کاہل ہے کہ....

خاوند:۔ (بات کاٹتے ہوئے تیزی سے) جائے جہنم میں، جلدی سے تم ہی گرم پانی بوتل میں بھر لاؤ.... اور نرس سے کہو.... ارے ہاں وہ تو واپس ہی نہیں آئی میں اُسے ہسپتال بھیجنا چاہتا تھا ــ جاؤ تم اُسے بلا لاؤ۔ بوتل میں خود بھر لیتا ہوں۔

گرینی:۔ ٹھہریے میں پانی گرم کرتی جاؤں۔

خاوند:۔ کمبخت اب تک کیا کرتی رہی؟ (بیگم کے پاؤں چھوکر) دیکھو انکے پاؤں بالکل برف کی طرح سرد ہو رہے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے شکایت کر رہی تھیں کہ گرمی سے تپ رہے ہیں اور اب یخ ہو رہے ہیں۔ کیا کیتلی میں بھی پانی ہے یا نہیں؟

گرینی:۔ شاید تھوڑا سا ہوگا۔ (جاتی ہے اور کیتلی اٹھا لاتی ہے) اس میں تھوڑا سا ہے۔ (بوتل میں انڈیلنے لگتی ہے)

خاوند:۔ اتنے سے پانی سے کیا ہوگا ــ لاؤ مجھے دو۔ تم بھاگ کر ہمسایہ کے ہاں سے نرس کو بلا لاؤ۔

گرینی:۔ اس سے کیا کہوں؟

خاوند:۔ (غصے سے) لعنت ہو تم پر! اُسے بلا لاؤ اور کیا کرو!

گرینی:۔ ہاں ہاں یاد آگیا۔ ابھی لیجیے۔

(خادمہ جاتی ہے۔ خاوند دوا کی ایک شیشی خالی کر کے گرم پانی سے بھرتا ہے اور اس کے گرد اپنا رومال لپیٹ کر بیگم کے پاؤں پر رکھتا ہے اور سخت اضطراب سے چہرے کو تکور دیکھتا جاتا ہے۔)

خاوند:۔ یہ دونوں کہاں غارت ہو گئیں! آپکو اب بھی پاؤں ٹھنڈے محسوس ہو رہے ہیں؟

بیگم:۔ (حیرت و استعجاب چاروں طرف دیکھتی ہے اور خاوند کو پرے ہٹ جانے کا اشارہ کرتی ہے) اُف۔ سینے پر جیسے ــ منوں.... بوجھ رکھا.... ہو.... سانس نہیں آتی.... ہٹ جاؤ.... پرے ہٹ جاؤ.... ہر چیز ہٹا دو.... سب کچھ ہٹا دو!

(خاوند موقع کی نزاکت سمجھتے ہوئے پھولوں کے گملے باہر پھینک دیتا ہے اور کمرے کی اشیاء لے جا کر کچن میں رکھتا ہے۔ نرس اور گرینی داخل ہوتی ہیں۔)

خاوند:۔ (بوتل کی طرف اشارہ کر کے) یہ بھی ہٹا دوں؟

بیگم:۔ ہر چیز.... ہر چیز!

نرس:۔ (خاوند سے) ان کا کیا حال ہے۔ (مریضہ کی نبض دیکھنے کی کوشش کرتی ہے)

خاوند:۔ غالباً ڈاکٹر اسے تم سے بہتر سمجھ سکتا ہے، جاؤ جلد لاؤ۔

نرس:۔ کس ڈاکٹر کو؟

خاوند:۔ جو بھی ہسپتال میں موجود ہو۔ گرینی تم پانی گرم کرو گی۔

گرینی۔ ہاں سرکار ابھی لیجئے (نرس اور گرینی جاتی ہیں۔)
بیگم۔ (آنکھیں کھولتے ہوئے) ہر چیز... ہر چیز... کمرے کی۔ آرائشی تصاویر بھی۔
خاوند۔ بہت اچھا۔
(جملہ اشیا اُٹھا لیجاتا ہے بچوں کی تصویر اُٹھاتے دیکھکر بیگم بول اُٹھتی ہے۔)
بیگم۔ نہیں... اسے مت لے جاؤ... (خاوند کو خوف زدہ نظروں سے دیکھنے لگتی ہے)
اور دیکھو تم... صرف تم یہاں رہو... کسی کو نہ آنے دو... اُف سردی!
خاوند۔ گرینی گرم پانی لانے گئی ہے۔ تمہارے والدین بھی ابھی آتے ہونگے ــــ ہمت نہ ہارو۔
بیگم۔ پیارے...
خاوند۔ میری جان میں تمہارے پاس رہونگا گھبراؤ مت۔
(ڈاکٹر داخل ہوتا ہے سلام کرکے جلدی مریضہ کو انجکشن دیتا ہے۔)
ڈاکٹر۔ (خاوند سے) کیا آپنے تار بھجوا دئے؟
خاوند۔ ہاں آدھے رستے پہونچ چکے ہونگے۔
ڈاکٹر۔ میرے خیال میں کوئی دو ایک گھنٹے کی مہمان ہیں۔
خاوند۔ (مایوسی سے) آہ ڈاکٹر اسکے والدین کے آنے تک اسے زندہ رکھو۔
ڈاکٹر۔ انجکشن اسی لئے دیا ہے۔ (نبض دیکھکر) بہت نحیف اور بے قاعدہ ہے۔ (مریضہ کے ناخن دیکھتا ہے)
بیگم۔ (آنکھیں کھولتے ہوئے) صرف تم... صرف تم... ٹھہرو۔
ڈاکٹر۔ میں دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔
خاوند۔ اچھا آپ اتنے میں پانی گرم کرائیے۔
ڈاکٹر۔ ہاں میں دیکھتا ہوں۔

(دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ بیگم آنکھیں کھول کر محبت آمیز نظروں سے کمرے کو دیکھتی ہے۔ گرینی گرم پانی کی بوتل لئے داخل ہوتی ہے۔ حالت کی اہمیت و نزاکت کو دیکھکر افسوس سے سر ہلاتی بوتل رکھکر چلی جاتی ہے۔ ڈاکٹر دوسرے کمرے میں نرس سے مریضہ کے حالات سُنکر لکھتا جاتا ہے۔ گرینی ڈاکٹر کے پاس جاتی ہے)
گرینی۔ ڈاکٹر صاحب میں نے ابھی اپنی بیگم کو ہر چیز پر محبت آمیز نظریں ڈالتے دیکھا۔ مرنے سے قبل لوگ یہی کرتے ہیں۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ کیا کہوں کتنی رحمدل اور غریب پرور خاتون تھیں!
(خاوند بے بسی سے بیگم کے چہرے پر نظریں گاڑے دیکھ رہا ہے۔ گرینی کے الفاظ سُنکر آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔)
(اسٹیج پر اندھیرا چھاجاتا ہے)

عبدالرشید

عِشق

تم کو کیا معلوم ہے یہ عشق کہتے ہیں کسے

ہے بہارِ باغِ ہستی عشق کہتے ہیں جسے
یا خمارِ مے پرستی عشق کہتے ہیں جسے
ہے کتاب زندگی کا عشق اک رنگین باب
حاصلِ عنوانِ اوراقِ پریشاں ہے شباب
زمزمۂ تارِ رگِ جاں عشق ہی کا کام ہے
نغمۂ رُوح الامیں ہے عشق جس کا نام ہے
ساقیِ حسنِ ازل کی چشم مستانہ ہے عشق
محفلِ ہو حق میں اک لبریز پیمانہ ہے عشق
آشیانِ رنگ میں دامن کشِ گل ہے یہی
اور قفس میں طاقتِ پروازِ بلبل ہے یہی
اس کا فیضِ خاص پہنچا تا ہے بامِ عرش پر
اس سے جو محروم ہے زار و زبوں ہے فرش پر
گلشنِ خلدِ بریں کا چشمۂ شیریں ہے یہ
حُسن کی سرکار کا اک ہدیۂ زرّیں ہے یہ
اصل میں خوابِ زلیخا کی یہی تعبیر تھا
ذرّہ ذرّہ اس کا مصرِ حسن کی تصویر تھا
آدمی ہوتا نہیں محرم نوائے راز سے
عشق ہو پیدا نہ جبتک زندگی کے ساز سے
عِشق کے دم سے تپش موجِ رواں ہے زندگی
یہ نہ ہو تو کشتیِ بے بادباں ہے زندگی

جذبۂ معصوم ہے یہ عشق کہتے ہیں جسے

عبداللطیف تپش

پنجابی دیہات کے مشہور گیت

مرزا صاحبان

تعارف :- یہ مضمون "پنجابی دیہات کے مشہور گیت" کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ اور تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے ایک مختصر سی تمہید ہے۔ اس کے بعد اصل قصہ پر شاعر کے آفتابِ فن کی ہلکی ہلکی روشنی ڈالی گئی ہے، بعد میں نظر پ سیدھی اسی آفتاب پر جا پڑتی ہیں لیکن لامحالہ طور پر زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکیں۔

۱۔ نموتے گل حضرت نوشہ پیر پنجاب کے مقبول زماں نیک مردوں میں سے ہوئے ہیں آپ ایک صوفی منش بزرگ اور صاحب حال وقال ولی تھے۔ یوں تو اُن کے مُریدوں میں سے اکثر حضرات بارگاہِ شہرت میں باریاب ہوئے ہیں لیکن آج ہم اُن کے صرف دو عقیدتمندوں کا ذکر کریں گے۔ ان میں سے ایک تو ایک المناک داستانِ محبت کا ہیرو ہے اور دوسرے کے سر اسی داستان کو نظم کرنے کا سہرا بندھتا ہے۔ مرزا صاحبان کے قصے کو چند ایک دیگر پنجابی شعرا مثلاً محمد شاہ اور جیوا سنگھ نے بھی نظم کا لباس پہنایا ہے لیکن وہ پنجابی شعر جو فیروزپور، منٹگمری کے گردونواح میں خصوصاً اور تمام پنجاب میں عموماً النوزے، چھٹے یا الکنا سے پر سارنگ کی مخصوص تانوں میں گائے جاتے ہیں اور جنہیں پنجاب کے دیہاتی لوگ "سریں" کہتے ہیں۔ حافظ برخوردار[1] کی جودتِ طبع کا نتیجہ ہیں۔ ان اشعار میں تین باتیں نمایاں سے عیاں ہیں۔ ایک تو مضمون کی مخصوص پنجابی افتاد۔ دوسرا یہ امر کہ حافظ برخوردار اپنی اس تصنیف میں اپنے کسی پیشرو "پیلو شاعر" کا ذکر کرتا ہے اور اسکے مقابلے پر شعر لکھنے کے لئے پانچ پیروں کی مدد مانگتا ہے۔ تیسری بات یہ کہ شاعر پیر دکا پیر بھائی ہے۔ اور وہ یہ حق اشعار کے پیرائے میں ادا کیا چاہتا ہے۔ یہاں یہ اشارہ کرنا بھی لازم ٹھہرتا ہے کہ یہ قصہ محض افسانہ نہیں۔ بلکہ یہ تو گوشت پوست کے دو زندہ مجسموں کے فطری جذبات اور سماج کے کڑے اصولوں کا خطرناک تصادم ہے ـــــ چنانچہ جڑانوالہ کے پاس ہی مرزا خاں کی قبر ہے۔ جہاں زندہ دلانِ لاہور سال اس واقعہ کا عرس مناتے ہیں، مرزا کے رشتہ دار اب بھی صاحبِ جائدادہیں اور رائے کے خطاب سے یاد کئے جاتے ہیں۔

۲۔ سیر گل مورخ کے پیش نظر پنجاب کا وہ علاقہ ہے جو آجکل ضلع منٹگمری میں شامل ہے۔ ہر طرف حکومتِ مغلیہ کے چراغِ سحری کا ہلکا ہلکا نور پھیل رہا ہے، ایک گاؤں داتا آباد میں ونجل نام جاٹ کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ یہ مرزا خان ہے اور ونجل کا پانچواں بیٹا۔ باقی کیفیت شاعر کی زبان سے سُنئے :-

"جس دن مرزا خاں پیدا ہوا تو وہ نہلانے والی چوکی پر پڑا ہوا عشق ومحبت کے سوال جواب کرتا تھا، ـــ جس دن مرزا خاں پیدا ہوا اس دن قمری مہینے کی چودھویں تاریخ تھی۔ اس کا منہ کھانڈ سے بھر کر اسے "گڑھتی" دی گئی ـــ ملّا نے اس کے کان میں اذان دی اور ساتھ ہی کہا کہ اے مرزا خاں ہمیشہ عشق کا طالب ہونا، کیونکہ عشق اللہ کی ذات ہے"

تھوڑے عرصے بعد مرزا کے ماموں کے ہاں جو پاس کے گاؤں کھیوہ ماہی میں رہتا تھا۔ ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ یہ صاحبان تھی۔ اس کا سراپا شاعر کی زبان سے ملاحظہ ہو :-

"کھیوہ ماہی کے ایک گھر میں صاحباں پیدا ہوئی۔ اس پر حوریں رشک کرتی تھیں اور پریاں جی جان سے قربان تھیں۔

وہ مجیٹھ کے رنگ کی ایک ایسی پڑیا معلوم ہوتی تھی جو رس رس کر تمام عالم کو رنگین کر دینے کے انداز لئے ہو!!

اس کا قد لانبا اور جسم سیدھا تھا۔

اسکی کمر کی ہڈی میں بار بار خم پڑتا تھا۔

---

[1] حافظ برخوردار ۱۰۸۰ھ میں مشہور ہوئے۔ آپ اورنگ زیب کے ہم عصر تھے۔ رانجھائے دلیس یعنی تخت ہزارہ کے رہنے والے اور علوم متداولہ سے خاص طور پر واقف تھے۔ انہوں نے یوسف زلیخا، سسّی پنوں اور مرزا صاحبان کے قصے نظم کئے ہیں۔

اُسکی ناک تلوار کی مانند تھی اور زلفیں بلکھتے ہوئے سانپ،
اسکے سینے پر دو پکے ہوئے آم دھرے تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا
جیسے یہ آم اپنی بہار ایک جنڈ کے درخت پر دکھلا رہے ہوں۔
اسکے ہونٹ سرخ اور دانت سفید تھے۔
جیسے
لعل موتی نگل رہے ہوں۔
جب وہ ہنس ہنس کر باتیں کرتی تو اُسکے منہ سے پھول جھڑتے۔
اس کی شوخ اور طرار انکھڑیاں لاہوری کمان کی طرح خمدار تھیں
اسکے تیر دیکھنے والوں کے آر پار نکل جاتے تھے۔
ایسے ——
جیسے سورج کی کرنیں دریا کی لہروں کے ساتھ کرتی ہیں۔
اسکے دیدۂ نیم باز سرمہ اور کاجل کے بغیر ہی خونی تھے۔
جب اس طرح "گانٹھ گانٹھ میں پڑیا ہو زہر کی" تو عاشق کیونکر
جان سلامت لے جائیں!
اسکی رانیں صندل سے تراشی ہوئی اور مشک میں ڈوبی ہوئی
تھیں ——
اسکی ناف شراب سے لبریز ایک صراحی تھی جس سے عشاق تصور
میں بھی ایک سے زیادہ گھونٹ نہ پی سکتے تھے۔
اسکی چنری پر باغ کاڑھا ہوا تھا جس میں تلیر چگ رہے تھے۔
اُسے بناؤ سنگار کی حاجت نہ تھی۔
اور وہ خاص لگاوٹ کا اظہار بھی نہ کرتی۔
پھر بھی عشاق پروانوں کی طرح ازخود جل جل پڑتے۔"
یہ تو کہنے کی بات نہیں کہ بچپنے میں مرزا خاں گاہے ماہے اپنی
ننھیال جاتا تھا، البتہ یہ واقعہ ہے کہ گیارہ برس کی عمر میں وہ قرآن مجید
حفظ کرنے کے لئے کھیوہ ہی جا رہا۔ ادھر دو تین سال کے بعد اس کا
باپ چل بسا۔ مسجد کی تعلیم کے دوران میں مرزا صاحباں میں محبت کی
پینگ بڑھی۔ پہلے تو معمولی روشناسی ہوئی، پھر رفتہ رفتہ بقول شاعر
دونوں کے اندر عشق اس طرح سرایت کر گیا جیسے پیٹ بھر کھانا کھانے
پر افیم بہت جلد جسم میں سرایت کر جاتی ہے۔ ایک دن مرزا خاں کھیتوں
کے درمیان ٹہل رہا تھا کہ اُس کی نگاہ صاحباں پر جا پڑی۔ صاحباں
پگڈنڈی کے قریب ہی اپنی سہیلیوں میں اس طرح کھڑی تھی جیسے ڈاکوؤں
کا سردار اپنے گروہ میں کھڑا ہو یا ایک مست ہاتھی عشق سے سندھورا ہوا
علی علی کے نعرے لگا رہا ہو۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں اور عشق کا وار

دُہرا پڑا ——" یہ نین خونی ہیں۔ یہ نظریں چور ہیں اور یہ نگاہیں نیت میں
فتور ڈالنے والی ہیں ——" تھوڑے ہی عرصے میں معاملہ یہاں تک بڑھ
گیا کہ خود صاحباں کو مجبور ہو کر کہنا پڑا۔
"میرا اور مرزا خاں کا ایک ہی جسم ہے صرف قمیص کے کپڑے
کی موٹائی درمیان ہے۔
میں مرزا خاں کو اپنا چکی ہوں۔
لیکن
سنا ہے کہ عشق کے طوفان سے خود عاشقوں کے سینوں میں
شگاف پڑ جاتے ہیں۔"
ابتدا میں یہ دیکھکر کہ مرزا خاں موت سے کھیل رہا ہے صاحباں
نے اس کو عشق کے دریا میں کودنے سے باز رکھنا چاہا۔ اس موقع پر چند
سوال جواب ہوئے ہیں۔
صاحباں:۔ "بغیر چپو اور ملاح کے کشتیاں کب پار اُترتی ہیں؟"
مرزا:۔ "اے نیکبخت یہ دُنیا تو ایک خواب ہے اور موت خدا کو پانے
کا سیدھا راستہ۔
باہر باہر طبیعت کی آب چڑھی ہوئی ہے اندر جنون کا پنچھی ہے
ایک دفعہ بھی یہ جانور ہاتھ سے نکل جائے تو پھر اس کا قابو
میں آنا ناممکن ہے۔
سانس کا کیا اعتبار ہے ——
آگے آگ ہو یا راکھ
قدم آگے ہی پڑے گا۔
اگر محبت کرنے والا موت سے ڈر جائے تو اُس کا منہ سیاہ
اور پیر نیلے ہو جاتے ہیں۔"
اس پر صاحباں سمجھ گئی کہ یہ قتیلِ اُلفت ہے۔ اور اسکے خرمنِ
ہوش پر عشق کی بجلی گر چکی ہے۔ وہ اسکے لئے اور بھی گہرا کنواں کھودتی ہے۔
اے حافظ۔ عشق ہجوم کر کے آیا۔ اُس نے ہٹو بچو کی صدائیں
دیں ——
لیکن صاحباں نے ہوش و خرد کو
عشق کے جام میں ڈھال کر بیہوشی اور مستی میں تبدیل کر لیا۔
صاحباں:۔ "اے مرزا خاں
اگر عورتوں میں چرچے ہونے لگیں تو چاند کو بھی داغ لگ
جاتا ہے۔
اگر کنواری لڑکیاں نکل جائیں تو لڑکے والے اور لڑکی والے

دونوں کی بے عزتی ہے۔
نہ معلوم یہ رسوائی ہے یا شہرت؟
اے مرزا خاں، یہ تیغ ساگ نہ توڑ
اپنی جان کی خیر منا۔
جہاں قلمِ قدرت چل چکی وہاں واقعات اٹل ہو جاتے ہیں۔
اے حافظ آگ تو چراغ کے تن بدن میں لگی۔
لیکن ـــ
جان پتنگے کو دینا پڑی ـــ!!"

مرزا خاں:۔ اے صاحباں محبت کا جھول جھول رہا ہے!
آ ـــ
اور خوب شوق سے یہ زہر کا پیالہ
جسے عشق کہتے ہیں،
پیو ـــ اور جان جانے کی کچھ پروا نہ کرو۔
کہیں اس احتیاط میں عشق کی بے حرمتی نہ ہو جائے۔
اگر پتنگ جلنے سے ڈرے تو وہ عشق کی حرمت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔
پروانے کی ہمت دیدنی ہے۔
جل مرتا ہے مگر اپنے جسم کا کوئی حصّہ پیچھے نہیں پھراتا!!
اے صاحباں
یہ جلنا مرنا تو آسان کام ہے۔
لیکن ـــ
قول و اقرار پر قائم رہنا بہت مشکل ہے!!"

صاحباں:۔ اے مرزا خاں
یہ علاقہ میرے سوتیلے بھائی کے زیرنگیں ہے
اے دوست
اس شہر میں ہمارا کوئی غمخوار نہیں۔
یہاں تو ہر طرف دشمن ہی دشمن بستے ہیں!!
کھیوہ میں مغلوں کا راج نہیں۔
یہ تو اندھیر نگری ہے ـــ"

کچھ دن تو مرزا صاحباں کو یہ بہاریں نصیب رہیں پھر صاحباں شادی کے لئے مختلف جگہوں سے پیام آنے لگے۔ اور صاحباں سے مسجد کا آنا جانا چھوٹ گیا۔ مرزا خاں نے اپنی ماں کے ذریعے بہت ہاتھ پاؤں مارے، لیکن ننھیال والوں نے اس یتیم اور غریب کو رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ یہ کورا جواب لے کر مرزا خاں کو مجبوراً کھیوہ چھوڑنا پڑا۔ الوداع کرتے وقت صاحباں کی کاجل بھری آنکھوں سے سیاہ رنگ کے دھارے بہہ بہہ کر اسکے گورے گورے رخساروں پر جدول بنا رہے تھے۔ اس موقع پر شاعر تعجب کا اظہار کرتا ہے کہ صاحباں زندہ رہی۔ اگرچہ وہ سخت بیمار پڑ گئی۔ گاؤں کے وید نے اسے سونچل نمک، اجوائن اور عقر قرحہ کی کچھ گولیاں دیں:۔ ـــ

نبض نے عشق کے گھر تک جا کر کہا
کہ یہ وید بے خبر ہے۔
زندگی بولی
اس نیم ملّا نیم طبیب سے خدا میری شرم محفوظ رکھے!!
صاحباں فرقت میں رو رو کر اپنے آپ سے کہہ رہی ہے ـــ
"میں آپ ہی بکری ہوں آپ ہی قصائی۔
میں نے آپ ہی اپنے کباب بنائے۔
اور آنسوؤں کی صراحیوں کے ساتھ
آپ ہی
اپنے آگے رکھ لئے ـــ
اے دوست!
اپنے جسم سے کونسا کھانا بہتر ہے!!"

شاعر رودادِ الفت بیان کرتا ہے:۔
"جن کے رگ و پے میں عشق رچ جائے۔
وہ چراغ کی مانند
کھڑے کھڑے جل جاتے ہیں!
عاشق نہ تو موت سے ڈرتے ہیں
نہ ہی انہیں
بھوک پیاس اور نیند کی حاجت محسوس ہوتی ہے!!
صاحباں کو پروانے کی مانند
پریم کی مستی چڑھی ہوئی تھی۔
تلاش کرنے پر بھی عقل کا ہونا معلوم۔
کیونکہ عقل کو
اپنے منہ مانگے دام ملنا محال ہے!!"

مرزا خاں کے چلے جانے کے بعد صاحباں کے دل کو سخت ٹھیس لگی۔
لیکن چراغ کو

پروانے کی موت کی کب پروا ہوتی ہے۔
ایک اور مضمون سُنئے:۔
محبت میں آنسو اِس طرح گرتے ہیں۔
جیسے
انمول موتی لڑھک رہے ہوں!!
صاحباں
اس طرح روتی جیسے
چراغ سے پھول جھڑتے ہیں۔
جیون ساگر میں پریم کے بھنور بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔
یہاں
بڑے بڑے تیراک بھی چوکڑی بھول جاتے ہیں!!
چند دن بعد صاحباں کی شادی کی بات طاہر خاں چدھڑ سے پکّی ہوگئی۔
یہ خبر سُنکر صاحباں نے مرزا خاں کو پیغام بھجوایا۔
"میں نے جو قول و قرار تم سے کئے تھے،
وہ میرے دل پر نقش ہیں۔
میرے تمام آنسو
وہ نقوش نہیں مٹا سکے۔
اے مرزا خاں
ابھی تیرے پہونچنے کا وقت ہے۔
اگر ہوسکے
تو پہونچ جاؤ۔
میں عشق کی آگ میں جل رہی ہوں
تم وصل کے بادل بن کر
میری یہ آگ بجھاؤ!!۔
اگر مرزا خاں نظر نہ آیا
تو میرا مرنا بھی سہل نہ ہوگا"
مرزا خاں یہ اطلاع پاکر اپنی صبا رفتار گھوڑی پر زین کسواکر کھیوہ کو چل کھڑا ہوا۔ یہاں چند اشعار میں شاعر آنے والے المیہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔
"مرزا خاں نے چلتے وقت نہ ساعت دیکھی نہ مہورت،
گھوڑی پر سوار ہوتے وقت
اُسے ایک برہمن سامنے کی طرف سے آتا ملا۔
ظالم قبر دن رات عاشقوں کے انتظار میں

بازو پھیلائے ہوئے ہے!!۔
گھوڑی پر سوار ہوتے وقت مرزا خاں کا باپ[1] اسے نصیحت کرتا ہے:۔
"بیگانی عورت پر
صرف بیوقوف ہی ہاتھ ڈالتے ہیں۔
جن کی عقل گم ہوچکی ہو
وہی عورتوں کے ساتھ دوستی لگاتے ہیں۔
داناؤں کی باتیں
لکھو کھا روپیہ خرچ کرنے پر بھی
میسّر نہیں آتیں۔
حسین عورتیں پہلے تو ہنس ہنس کر دوستی لگالیتی ہیں۔
بعد میں
رو رو کر تمام راز طشت از بام کرتی ہیں۔
وہ اپنے عاشق کی چھاتی پر
پاؤں رکھکر
اسے قتل کرواتی ہیں۔"
مرزا کی ماں کی نصیحت ملاحظہ ہو:۔
بیٹا
جس گھر میں دوستی لگائی ہو
بھول کر بھی
اس گلی میں نہ جانا چاہیئے۔ کیونکہ
چوروں، عاشقوں اور یاری کرنے والوں کے سر پر
ہر گھڑی
موت سوار ہے۔
مرزا عشق کے جوش میں اِن باتوں پر مطلق کان نہیں دھرتا، وہ اکیلا اپنی گھوڑی اور تیر تلوار کے زور پر کھیوہ ماہی کو چل کھڑا ہوتا ہے۔
اس وقت کا سین ملاحظہ ہو:۔
ڈیک (ایک برساتی نالہ) پر
کیکر پھولوں کے گچھے پہنے،
کھڑے تھے۔
جھربیریوں کو بور لگ رہا تھا۔
جس وقت مرزا
اپنے ننھیال کو روانہ ہوا۔

[1] شاعر اپنے مضمون کے لئے مُردہ باپ کے مُنہ میں یہ الفاظ ڈال اُسے زندہ کرلیتا ہے۔

اسکے دل میں سو غرور بھرے ہوئے تھے۔
اور وہ
شاہ منصور کی طرح
عشق کا جام پئے تھا ——
اُدھر بہشت میں
کوئی حور
کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی ——
کھرل جاٹ کو
کھیوہ ماہی ایسا تھا۔

جیسے
موسیٰ کو کوہِ طور ہو —— !!

کھیوہ پہونچکر مرزا خاں نے قاصد دوڑایا کہ دروازے پر ایک فقیر کھڑا ہے جس کا نام مرزا خاں ہے، ذات کھرل ہے۔ اور جو ونجل جاٹ کا راج دلارا ہے۔ یہ سندیسہ سُن کر صاحباں کے تنِ مُردہ میں جان پڑ گئی۔
—— یہاں سے مرزا خاں اپنی پھوپی بیبو کے گھر پہونچا۔ جو کھیوہ ہی میں رہتی تھی۔ وہ آگے ہی تمام واقعات سے واقف تھی۔ اس نے مرزا خاں کو ہر طرح کی مدد کا یقین دلایا۔ آخر تجویز یہ ٹھہری کہ رات سے پہلے ہی صاحباں کسی بہانے سے بیبو کے گھر چلی آئے وہاں سے اُسے مرزا خاں اپنے ساتھ لے جائے گا۔ اس تجویز کے بعد مرزا خاں آکر برات میں شامل ہو گیا۔ صاحباں کے ہونے والے سسر نے مرزا کو نووارد سمجھکر تمسخر آمیز لہجے میں پوچھا کہ یہ دبلی پتلی گھوڑی والا غریب نوجوان کون ہے۔ اس پر مرزا خاں چُپ نہ رہ سکا تو بولا۔

ہم ونجل جاٹ کے پانچ بیٹے ہیں۔
جن میں ہر ایک کی طبع جدا جدا ہے۔
میں سب سے چھوٹا ہوں۔
میری گھوڑی کی باگ ڈور کے ساتھ
ریشم کے گچھے لٹکتے ہیں ——
میرے بھائی مور ہیں۔
اور میں
اُن میں شاہ مور ہوں۔
میرے مویشی
بار (جنگل) میں
بغیر رکھوالوں کے چرتے پھرتے ہیں۔

کسی کی مجال نہیں
کہ اُن کی طرف
آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔
اگر میں
زور دکھانے پہ آجاؤں
تو بڑے بڑے محل
اُٹھا کر ٹکرا دوں۔
مجھے تیروں کا مینہ برسا کر
صاحباں کو
ڈولی سے نکال لے جانا ہے!
جب تک
دو شانوں کے درمیان میری گردن سلامت ہے
اس وقت تک صاحباں کو
دوسرا کون لے جا سکتا ہے !! ——
اے چدھڑ قوم کے جاٹ
اگر خیر چاہتا ہے
تو برات ابھی واپس لے جا !!
یہ کہکر مرزا خاں اپنی پھوپی کے گھر چلا آیا۔ صاحباں کو اسکا پیغام مل ہی چکا تھا وہ بھی شام ہوتے ہی اُدھر کو چلی۔
شام کی تاریکی کے ساتھ
مرزا خاں کی کشش نے
صاحباں کو کھینچنا شروع کیا۔
اُسے
عروسی جوڑا اتارنے کی فرصت نہ ملی ——
وہ عطر پھلیل والی کپی بھی
ساتھ نہ لے جا سکی
اس کے گہنے
مثلاً حائل، جھانجھر پٹاریوں میں ہی
دھرے رہ گئے
چوروں، یاروں، عاشقوں کو
ہمیشہ دھاندلی رہتی ہے ! ——
مرزا گلاب کا پھول
اور صاحباں

روپل کی کلی ہے !!۔۔۔

بنیبو کے گھر بیٹھی صاحباں کہتی ہے :۔

اے دل

دیکھ تو کتنی رات گئی ہے!

مسافروں کو بڑے لمبے سفر پر جانا ہے۔

اور بوجھ

بہت بھاری ہے۔۔۔

کانپ کانپ کر میرے موتیوں کی آب کم ہو گئی ہے!!

میں نے دوستی لگا کر

اپنے پاؤں آپ کلہاڑی ماری

یہ پیار کا کھیل

میں نے تو لطف اٹھانے کو کھیلا تھا۔

مگر اب تو رو رو کر جان ہلکان کرنا پڑی ہے۔۔۔

ادھر صاحباں اپنے خیالات کو اس طرح الفاظ کے بار پہنا رہی ہے اُدھر مرزا خاں جلدی سے اپنی گھوڑی پر زین کس کر لاتا ہے۔ اور صاحباں سے سوار ہونے کو کہتا ہے۔ صاحباں نے اپنے بھائیوں کے قوی ہیکل گھوڑے دیکھے تھے، وہ اس دُبلی پتلی گھوڑی کو دیکھکر بولی:۔

اے مرزا خاں

یہ چوہے کے رنگ کی بھوسلی سی گھوڑی

کہاں سے ہاتھ آئی!

اے دوست

اگر تمہارے باپ کے ہاں

کوئی تیز رفتار جانور نہ تھا

تو کسی ہمسایہ سے ہی مانگ لائے ہوتے!

اسکی ہاتھ ہاتھ جتنی تو پسلیاں ہیں۔

اور اس کی ریڑھ کی ہڈی

جسم کے بالشت بھر باہر نکلی ہے۔

اس کی کمر میں تو زور ہی نہیں،

یہ کب میدان مار سکے گی۔۔۔

اے مرزا خاں

کھیوے کے جاٹوں کے گھوڑے گھنگھرو پہنتے ہیں

اور راتب خور ہیں۔

وہ اغوا کرنے والے ڈاکوؤں کو

ایک کھیت بھر کے فاصلے پر ہی جا لیتے ہیں!!

مرزا خاں کو اپنی گھوڑی پر بہت ناز تھا۔ وہ اسی دن برات کی تمام گھوڑیوں سے دوڑ میں جیت چکی تھی۔ مرزا خاں کو صاحباں کی یہ بات سخت ناگوار گذری۔ وہ طیش میں آکر بولا:۔

اے عورت

خدا کو یاد کر

اور ماتھے پر بل نہ ڈال!!

میں نے پانچ دریاؤں کی کمائی

اس ایک گھوڑی کو کھلا ڈالی ہے!۔۔۔

اس پر سوار ہونا نہ ہونا

تیرے اپنے شوق کی بات ہے۔

لیکن

اس کی بد تعریفی نہ کیجو!!

جب مرزا خاں نے صاحباں کو یقین دلایا کہ یہ گھوڑی سو کوس کا فاصلہ ایک دوڑ میں طے کر جاتی ہے اور یہ کہ اس کی تیز رفتاری کے ڈر سے پرندے زمین پر چوگا چگنے سے ڈرتے ہیں تو صاحباں اس پر سوار ہونے کو تیار ہو گئی۔ ۔۔۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ مرزا خاں رات کی تاریکی میں بار لعینی جنگل میں راستہ بھول گیا۔ اور وہ دونوں تمام رات اسی جنگل میں بھٹکتے پھرے۔ صبح کے وقت وہ تھک کر ایک جنڈ کے درخت کے نیچے اتر پڑے۔ صاحباں نے کہا بھی کہ اس جگہ قیام کرنا از حد خطرناک ہے۔ لیکن مرزا خاں نے یہ کہکر اس کا منہ بند کر دیا۔

کس میں اتنی طاقت ہے

کہ یہاں آئے۔

اگر شیر ببر بھی آجائے

تو میں اُسے مار کر

اس کی کھال کا بستر بناؤں!!

یہ کہکر مرزا خاں نے گھوڑی کی زین اتاری اور اُسے تکیہ بنا کر وہیں زمین پر دراز ہو گیا۔ صاحباں کو یہ فکر ہوئی کہ اس کے بھائی ضرور اس کے تعاقب میں آتے ہونگے۔ اس پر مرزا خاں کی بے مثل تیر اندازی آشکارا تھی۔ اس نے سوچا کہ تعاقب کرنے والوں میں اس کا بھائی شمیر ضرور سب سے آگے ہوگا۔ اور بلاشبہ وہی مرزا خاں کے پہلے تیر کا نشانہ ٹھہرے گا۔ بھائی کی جان بچانے کے لئے اس نے مرزا خاں کی کمان پیڑ کے ساتھ بہت اونچی باندھ دی اور اس کے تمام تیر توڑ ڈالے۔ اسکے

بعد ازاں بھی تھکی ماندی لیٹ رہی ـــــ دن چڑھتے چڑھتے خان شمیر کے سوار رستے اس جنڈ تک آ پہونچے۔ مرزا خاں گھوڑوں کی ٹاپ سے بیدار ہوا اور اچھل کر اپنی گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ اُس نے اپنے ترکش پر ہاتھ مارا تو خالی، وہ صاحباں سے مخاطب ہو کر بولا۔

اے صاحباں

تو نے سخت غلطی کی۔

مجھے تو موت کے منہ میں دھکیلا

مگر ساتھ ہی آپ بھی

بیوہ ہوئی ـــ

اگر اس وقت میرے پاس تین بھی تیر ہوتے

تو کافی تھے ـــ

پہلا تیر تو

خان شمیر کے سینے میں جگہ ڈھونڈتا۔

دوسرا تیر

تیرے دولھا کے گلے میں ترازو ہوتا۔

اور تیسرا تیر

میں آسمان کی طرف چلا دیتا۔

اور تو دیکھتی

کہ کس طرح اُڑنے والے جانور

گھبرا کر زمین پر گرنے لگتے ـــ

مرزا خاں صورت حال نازک دیکھ کر اپنی گھوڑی کو ایڑ لگاتا ہے اور اکیلا ہی دانا آباد کا رُخ کرتا ہے۔ وہ اگر چاہتا تو اپنی گھوڑی کی تیز رفتاری کے سبب اب بھی اپنی جان سلامت لے جاتا! لیکن

دو سو گز جا کر

اس کے دل میں خیال آیا

کہ یوں

خالی ہاتھ جانے پر اس کے حریف

اُسے بزدل خیال کریں گے!

پھر اُس نے نہ ابھی کچھ لطف اُٹھایا ہے

نہ کچھ داد عشرت دی ہے۔

یہ سوچ کر وہ پلٹا اور کھینچ کر صاحباں کے قریب ہی گھوڑی سے کود پڑا۔ اُس نے بہتیرے اپنی تلوار کے جوہر دکھلائے۔ لیکن ایک اور سو کا کیا مقابلہ۔ مرزا، صاحباں دونوں وہیں تہ تیغ کر دئے گئے ـــ

دانا آباد والے یہ خبر سُن کر کمیتوں پر چڑھ دوڑے۔ اور اُنہوں نے مرزا خاں کا بدلہ لینے کیلئے وہاں قتل عام رچایا ـــ

بنا کر دند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!

سہاگ گل مرزا خاں رات کی تاریکی میں صاحباں سے ملاقات کرنے کے لئے کس طرح اس کے بالا خانہ تک پہونچتا ہے۔

وہ گِن گِن کر منتیں گاڑتا ہوا۔

(اور ان پر قدم دھرتا ہوا)

اوپر کی چھت پر جا پہونچا۔

جلتے ہوئے چراغ گل ہو گئے،

ـــ اس نے صاحباں کو نیند سے بیدار کیا ـــ

چاندنی رات کا سین:- صاحباں بیٹھی چرخہ کات رہی ہے:-

اے جاٹ ـــ میری باریک باریک سی لٹیں ہیں

ـــ یہ میری حقیقی ماں نے گوندھی ہیں۔

اے جاٹ ـــ میرے ہاتھ میں رنگ کیا ہوا اٹیرن ہے۔

ـــ تو بھی مرزا خاں کے نام کی رٹ لگا۔

اے جاٹ ـــ چاندنی رات ہے

ـــ کوا اروٹی کا گالا معلوم ہوتا ہے ـــ،

آلور مختار صدیقی؛

بادلوں کے پیچھے

"مسٹر پنسارے! کیا یہ سچ ہے کہ بمبئی کی اخلاقی حالت بہت گری ہوئی ہے؟"

اصغر کا سوال سادہ تھا، اور فطرتی پہلو لیے ہوئے۔ ۲۴ گھنٹے ہوتے وہ بمبئی میں وارد ہوا۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے۔ ریزرو بنک آف انڈیا کے انٹرسٹ ڈیپارٹمنٹ میں ایک کلرک کی حیثیت سے اس کی ملازمت کا یہ پہلا دن تھا۔ مسٹر پنسارے اُس کا انچارج ہے۔

ادھیڑ عمر کے دروازے پر، سیدھا سادہ، شریف، وضع، پنسارے سوا روپے کی پتلی سفید دھوتی میں، ساڑھے تین آنے کی گاندھی ٹوپی میں، پانچ آنے گز کے کھنڈر کوٹ میں، اصغر کے شاندار ریشمی سوٹ کے پاس ایک چپڑاسی معلوم ہوتا ہے۔ چہرے پر تھکاوٹ کے آثار ہیں۔ ایک لمحہ کے لئے کاغذوں سے نظریں اُٹھانا نہیں چاہتا شاید کام سے زیادہ اصغر کے سوالوں نے اُسے پریشان کیا ہے۔

اُس نے اپنی عینک کے اُوپر سے غصہ کے ساتھ کہا:۔

"ارے بھائی۔ تم کچھ کام بھی کرو گے۔ یا یونہی میرا مغز چاٹ چاٹ کے مجھے پاگل بنا دو گے۔ خدا بچائے ان پنجابیوں سے۔ کام تو کرکے ہی نہیں دیتے۔ بس باتیں کیا کرو ان سے بیٹھ کے۔"

"کر تو رہا ہوں میں کام، مسٹر پنسارے!"

"کیا خاک کر رہے ہو۔ ساڑھے پانچ بج گئے ہیں۔ دفتر بند ہوگیا ہے۔ اور میرے حساب سے ابھی تک سات آنے چار پائی کی غلطی نہیں گئی۔ یہ سب تمہاری بدولت ہے۔"

"اصل میں یہ تمہارا قصور نہیں۔ مجھے پنجاب ہی میں معلوم ہوگیا تھا، کہ گجراتی لوگ بہت سڑیل مزاج ہوتے ہیں۔"

"اچھا! اچھا! زیادہ باتوں کی ضرورت نہیں۔ وہ ٹوٹل لاؤ۔"

"ابھی ختم نہیں ہوا۔"

"تین بجے تم نے کہا تھا۔ پانچ منٹ میں ختم ہو جائے گا۔ اور اب دو گھنٹے ہوگئے ہیں۔"

"صرف سات صفحے باقی رہتے ہیں۔"

"کیا کہا۔ سات صفحے! کل دس صفحے تھے۔ آدھے گھنٹے کا کام۔ اور تم نے سات گھنٹے میں صرف تین صفحے کئے ہیں۔"

"گھبراؤ نہیں۔ پانچ منٹ میں ہو جائیں گے، مسٹر پنسارے!"

پنسارے تلملاتا ہوا اپنے کام میں پھر مشغول ہوگیا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

یکایک اصغر ہنس پڑا۔

پنسارے نے پوچھا "کیوں؟ کوئی اور شرارت سُوجھی؟"

"مسٹر پنسارے! آپ جانتے ہیں پنجاب میں پنساری کس کو کہتے ہیں۔ پنساری ایک دکاندار ہوتا ہے، جو ہینگ، گندہ بروزہ، نیلا تھوتھا پھٹکڑی وغیرہ وغیرہ بیچتا ہے۔"

"اگر اب تم کوئی بات کرو گے تو میں کل تم کو سپرنٹنڈنٹ کے پاس لے جاؤں گا۔"

"سپرنٹنڈنٹ کے پاس لے جاتے ہو تو اس طرح لے جانا کہ تمہاری ناک سے لہو جاری ہو۔ اور تمہارے کپڑے خون میں بھیگے ہوئے ہوں۔ سپرنٹنڈنٹ مجھ سے پوچھے گا تم نے مسٹر پنسارے کو کیوں مارا؟ میں کہوں گا مسٹر پنسارے میری باتوں کا جواب نہیں دیتا تھا۔"

"کیا پنجاب کے کالجوں میں یہی پڑھایا جاتا ہے کہ عزت کرنے کی بجائے اپنے افسروں کو مارو۔"

"نہیں۔ اگر آپ میرے سوالوں کا جواب دیتے رہیں گے۔ تو یہاں تک نوبت کیوں پہنچے گی۔ نیا نیا آیا ہوں۔ آپ بمبئی کے حالات نہیں بتائیں گے تو اور کون بتائے گا۔"

"کم از کم کام کے وقت میں تمہیں چپ رہنا چاہیئے۔"

ایک دفعہ پھر کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

لیکن زیادہ دیر نہیں۔

اصغر نے کہا۔ "آپ نے بمبئی کے اخلاق کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔"

پنسارے نے جل کر جواب دیا۔ "ارے بھئی! ذرا غور کرو۔ جو شخص صبح سے لیکر شام تک تم جیسے پتھر سے ٹکریں کھائے جس کے حساب سے سات آنے چار پائی کی غلطی نکلنے کا نام ہی نہ لے۔ اور جو روزانہ چھ سات گھنٹے قید میں بسر کرے۔ وہ شخص اگر شام کو تھکا ماندہ ٹرام میں سوار ہو کر گھر جانا چاہتا ہے۔ اور اپنے پاس کسی دوسرے شخص کو کھڑا ہوا پاتا ہے۔ تو وہ اُس کو اپنی سیٹ پیش کرنے کے لئے

اخلاق کہاں سے لائے۔ اُس کا اخلاق تو دفتر میں کاغذوں کے پلندوں
کے نیچے دبا پڑا ہے۔"

"آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔"

"یہ لو اپنا کام چھوڑ دیتا ہوں۔ تم مطلب سمجھاؤ۔"

"اخلاق سے میرا مطلب جنسی اخلاق ہے۔"

"پنجابیوں کو عورتوں کی باتوں کے علاوہ اور کچھ سوجھتا
ہی نہیں۔"

"لیکن میں تو صرف ایک لڑکی کی باتیں کرنا چاہتا ہوں میں
نے کوئی چودہ لڑکیوں سے محبت کی ہوگی۔ لیکن اُس لڑکی کی محبت
کا نقش میرے دل سے ہٹتا ہی نہیں۔"

"اُس سے شادی کرلی ہوتی۔"

"مجھے اُس سے اسقدر محبت تھی کہ میں اُس سے شادی کرنا
نہیں چاہتا تھا۔ ایک دفعہ اُس نے مجھے ایک خط میں شادی کیلئے
لکھا بھی تھا لیکن میں نے اِدھر اُدھر کی باتیں کرکے ٹال دیا۔ وہ ایک
معزز [illegible] گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اُس نے لکھا کہ وہ مذہب
بدلنے کے لئے تیار ہے۔ اُس کو اپنے ماں باپ کی ناراضامندی کی بھی
پروا نہ تھی۔ دراصل میں جانتا تھا کہ اگر میری اُس کے ساتھ شادی
ہو گئی تو مجھے کسی دوسری عورت سے محبت کرنی پڑیگی۔"

"عجیب آدمی ہو۔"

"اور جب میں بتاؤں گا کہ میں اُس پر کیوں مرتا تھا تو تم اور
بھی زیادہ حیران ہوگے۔"

"تم اس پر کیوں مرتے تھے۔"

"وہ ایک گجراتی لڑکی تھی۔"

"گجراتی لڑکی۔"

"آہ وہ اُس کا گیندے کے پھول جیسا زرد رنگ۔ اُسکی
پلیر کے سگرٹ جیسی نازک کمر۔ اُس کا لکس کے صابن جیسا صاف
شفاف چہرہ۔ اُس کا آم کی آئس کریم جیسا ٹھنڈا بدن۔ اور اُسکے
زرد زرد، نازک نازک، صاف شفاف اور ٹھنڈے ٹھنڈے جسم
پر پتلی پھولدار ساڑی اور سر کے پیچھے بالوں کے گچھے میں پھولوں کا
ہار۔ میں اُس لڑکی کے عشق میں تین دفعہ بی۔ اے میں فیل ہوا۔"

"آخر کون تھی وہ۔"

"معلوم نہیں۔ میں نے اُس کا نام جاننے کی کبھی پروا نہیں کی۔
وہ بھی میری طرح اپنے ماں باپ کے ساتھ تین مہینے کیلئے شملہ آئی ہوئی
تھی۔ اُن کا بنگلہ ہمارے بنگلے سے ایک فرلانگ کے فاصلہ پر تھا۔ اور مجھے
اُس کو دیکھنے کا اتفاق صرف اُس وقت ہوتا تھا جب میں سائیکل پر اُن
کے بنگلے کے آگے سے گذرتا تھا۔ اُس کی محبت کو کم کرنے کے لئے میں نے
اُس سے ملاقات کرنے کی بہت کوشش کی لیکن مجھے موقعہ نہیں ملا فرضی
نام سے اُس کے خط اور میرے خط آتے جاتے رہتے تھے۔"

"فرضی نام!"

"ہاں میں نے اُس کا ایک فرضی نام رکھ لیا تھا۔"

"کیا۔"

"مدھوریکا مہندریکر! اور وہ مجھے بھاسکا بھسکر لکھتی تھی۔"

"شاباش! بڑے بہادر ہو۔"

پنسارے اُٹھ کھڑا ہوا۔ عینک اُتار کر کیس میں ڈال لی چھتری
بغل میں دبائی۔ کاغذوں کا پلندہ ہاتھ میں اُٹھاتے ہوئے بولا۔

"لو اب میں جاتا ہوں۔ حساب گھر پر مکمل کروں گا تم یہیں
رہنا۔ یہ ٹوٹل ختم کرکے جانا۔"

"لیکن آپ نے میرے سوال کا جواب تو دیا ہی نہیں۔"

"کونسا سوال؟"

"وہی بمبئی کی اخلاقی حالت کے متعلق۔"

"لیکن تم کو اِس معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟"

"مس میو نے مدر انڈیا لکھنے سے پہلے زیادہ تر جنوبی ہندوستان
کا مطالعہ کیا تھا میں دیکھنا چاہتا ہوں اُس کی باتوں میں کتنی
سچائی ہے۔"

"مسٹر گابا کا انکل شیم ہی جو پڑھ لو۔"

"مسٹر گابا نے مس میو کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ الزام کا
جواب الزام کے ساتھ دینے سے الزام نہیں مٹ سکتا۔ یوں بھی مس میو
کی مطالعہ کی قوت مسٹر گابا سے زیادہ تھی۔"

"اور تم سے کم؟"

"ہوسکتا ہے۔"

پنسارے ہنسنے لگا۔ اُس نے چھتری بغل سے نکال کر کرسی کی
بیک سے لٹکا دی۔ جیب سے سگرٹ کیس نکالا۔ ایک سگرٹ سلگایا۔
سگرٹ کو ختم کرنے کے لئے میز کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔ دھوئیں کے
بادل میں سے اصغر کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"ایک [illegible] ہے کہ مس میو نے ہندوستان کی بابت جو
کچھ لکھا ہے وہ سراسر بکواس ہے۔"

"اندھا نہیں چاہتا کہ اُس کو اندھا کہا جائے۔ وہ سُورداس کا نام پسند کرتا ہے۔"

"کیا تمہارا خیال ہے کہ مس میو ٹھیک کہتی ہے؟"

"میں یہی دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"اگر ہندوستان بدنام ہونے کے قابل ہے تو ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ اُس کو بدنام کرے۔"

پنسارے چُپ ہو گیا۔ اُس کی خاموشی میں سنجیدگی کی مقدار بڑھتی گئی۔ اُس کے دماغ پر سگرٹ کے دھوئیں کا سایہ چھا گیا۔ اُس کی نظر میں ایک بلب سے کچھ ہی تھیں۔ اب روشنی کی ضرورت ہے۔ روشنی کیوں نہیں دیتا۔ وہ میز سے اُٹھا۔ سگرٹ کو بجھا کر ایش ٹرے میں پھینک دیا۔ چھتری کو بغل میں دبایا۔ کاغذوں کا پلندہ ہاتھ میں لیا۔ جاتے جاتے کہنے لگا:

"مسٹر اصغر! جاؤ ہندوستان کو بدنام کرو۔ میں ٹوٹل کرونگا۔"

پنسارے چلا گیا۔ اصغر اُس کے آخری فقرے پر غور کرنے لگا۔ کیا اس سے ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے؟ لیکن اُس کے تیور بگڑے ہوئے نہیں تھے۔ اُس کی باتوں میں بشاشت تھی۔ اُس کے لفظوں میں سنجیدگی تھی۔ کیا اس کا خیال ہے کہ ہندوستان واقعی بدنام ہونے کے قابل ہے؟ لیکن وہ مس میو کی تصنیف کے خلاف ہے۔ اُس نے اس کے متعلق گفتگو کو پسند نہیں کیا۔ اصغر کچھ نہ سمجھ سکا۔

لیکن اُس کے جانے کے بعد سارے دن میں پہلی دفعہ اُس کے دل میں ٹوٹل کرنے کی تمنا پیدا ہوئی۔

اُس نے ٹوٹل ختم کر دیا۔

گھڑی نے ساڑھے چھ بجائے۔

اصغر کو معلوم نہیں دفتر کی دیواروں سے کمزور دھوپ کے زرد دھبے کب غائب ہوئے۔ اُس نے دیکھا کہ بلب نے روشنی دینا شروع کر دی ہے۔ اگر وہ دفتر میں ہوتا تو دفتر اُس کو کھانے کو آتا۔ وہ کہاں تھا؟

دفتر سے نکل کر وہ فیروز شاہ مہتہ روڈ پر آ گیا۔ بارش کا اندیشہ تھا۔

"ٹیکسی!"

ایک ٹیکسی اُس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ دروازہ کھولکر اندر بیٹھ گیا۔

"ریگل!"

اونچی اونچی بھاگتی ہوئی بلڈنگوں میں سے ہوتی ہوئی ٹیکسی ریگل کے سامنے ٹھہر گئی۔ معلوم ہوا پکچر شروع ہو گئی ہے۔ وہ کچھ دیر تک آنے والی پکچروں کا پروگرام دیکھتا رہا۔ ایک کونے میں وزن بتانے والی مشین تھی۔ وہ اُس پر کھڑا ہو گیا۔ سلٹ میں ایک آنہ ڈالو۔ اُس نے سلٹ میں ایک آنہ ڈال دیا۔ سامنے ایک چٹ آ کر گر گئی۔ ۹ سٹون ۲ پونڈ۔ چٹ میں اُس کی قسمت بھی لکھی ہوئی تھی

"تم فرمانبردار اور شرمیلے ہو۔ بڑوں کی عزت کرتے ہو۔ زیادہ نہیں بولتے۔ محبت میں تم ثابت قدم اور وفادار رہو۔ تم نے ابھی تک کسی عورت سے محبت نہیں کی لیکن جس عورت سے محبت کرو گے قیامت تک اُسی عورت سے محبت کرو گے۔" اصغر کو ہنسی آ گئی۔

سامنے ایک ٹیکسی کھڑی تھی وہ اُس میں جا بیٹھا۔

"میرین ڈرائیو۔ چوپاٹی۔ مالابار۔"

بمبئی کی بارشوں نے ان جگہوں کی جاذبیت کو خاک میں ملا رکھا تھا۔

"ڈرائیور!"

"جناب!"

"بمبئی میں کوئی ایسی جگہ بھی ہے جہاں کسی اجنبی کا دل لگ سکے۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں آپ کس صوبے کے رہنے والے ہیں؟"

"کیوں پوچھتے ہو؟"

"معاف کیجئے! ہم لوگ کسی شخص کا صوبہ جان کر بتا سکتے ہیں، اُس کو کیا چاہیئے۔ مثلاً بنگال کے رہنے والے کا دل زیادہ لائبریریوں اور جلسہ گاہوں میں لگتا ہے۔ بمبئی کا آدمی زیادہ تر کلبوں، میچوں اور گھوڑ دوڑوں کو پسند کرتا ہے۔ فرنٹیر کا پٹھان امیروں کے بنگلوں پر چوکیداری تلاش کرتا ہے۔ یو۔پی کے لوگ وہ جگہ پسند کرتے ہیں جہاں ہندی اُردو کا جھگڑا ہو۔ پنجاب کے باشندے کو عورت چاہیئے۔ گندی فلمیں اور ننگے ناچ وہ بہت پسند کرتا ہے۔ بہت سے پنجابی صرف ایکٹرسوں کو دیکھنے کے لئے یہاں آ جاتے ہیں۔"

"ڈرائیور! تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"میں پنجاب کا رہنے والا ہوں جناب۔"

"خوب! خوب! بھئی واہ! میں تمہاری عقلمندی کی داد دیتا

ہوں۔ تم یہاں کیسے آئے؟"

"عشق لے آیا۔"

"عشق!"

"بارہ سال کی عمر میں میں سلوچنا پر عاشق ہو گیا۔ اُس وقت میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اور مجھے انگریزی یاد نہیں ہوتی تھی۔ میں نے بمبئی کو بھاگ جانے کا ارادہ کر لیا۔ کرایہ میں چار روپیہ کی کمی تھی۔ میری نانی کا انتقال ہوا۔ مجھے کفن لانے کے لئے پانچ روپے کا نوٹ دیا گیا۔ میں بمبئی کا ٹکٹ لیکر بمبئی پہنچ گیا۔ اُس وقت سے یہیں ہوں۔"

"بھئی واہ دادا دا! بھئی تمہیں تمہاری معشوقہ بھی ملی؟"

"مجھے تیرہ سال بمبئی میں ہو گئے لیکن میں نے سلوچنا کا مُنہ تک نہیں دیکھا۔"

"اوہو، بڑا غضب ہوا۔ تمہارے خیال میں یہ شہر کیسا ہے؟"

"اونچی اونچی خوبصورت بلڈنگیں، صاف شفاف چمکدار سڑکیں، بڑے بڑے شاندار ہوٹل۔ مہذب شائستہ مغربی قسم کے لوگ۔ سینما، پارکیں، ٹرامیں، بسیں۔ لوگ کہتے ہیں بمبئی ہندوستان کا بہترین شہر ہے۔"

"تم کیا کہتے ہو؟"

اُس نے ٹیکسی ہینگنگ گارڈن کے سامنے کھڑی کر دی۔ وہ نیچے اُترا اور اُس نے اصغر کو بھی نیچے اُترنے کے لئے کہا۔ دونو پہاڑی کے کنارے پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ یہاں سے سمندر کے دو بازوؤں میں پھیلی ہوئی ساری بمبئی نظر آتی ہے۔ اندھیرا کافی ہو چکا تھا۔ بجلی کی روشنی نے اُن کے پاؤں کے نیچے دیوالی پھینک دی تھی۔

"ڈرائیور بولا۔" کیا آپ جاننا چاہتے ہیں کہ میں بمبئی کے متعلق کیا کہتا ہوں۔"

اصغر نے کہا۔ "ہاں۔"

"میں بمبئی کو سمندر کی ریت میں چمکدار پتھروں کا ایک ڈھیر سمجھتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"وہ سامنے نظر آنے والی روشن کھڑکیاں انسانیت کے ماتھے پر خونی داغ ہیں۔ یہاں بیٹھ کر گناہ سورج کے غروب ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ یہاں چھپ کر گناہگار رسیہ کاریوں سے ملوث ہوتے ہیں۔ یہاں سے سرمایہ مزدور کے سستے خون کی آبشار بن کر گرتا ہے۔ یہاں سرمایہ دار سینکڑوں ہزاروں اُمیدوں کے فرش پر بے دریغ رقص کرتا ہے۔"

"میں تم کو صرف ڈرائیور سمجھتا تھا۔"

"رات کو گیارہ بجے کے بعد ان شاندار بلڈنگوں کے نیچے فٹ پاتھ پر کراہنے والی تلخ نیندیں میری شاہد ہیں۔"

بوندا باندی شروع ہو گئی۔ اصغر کو ایسا محسوس ہوا جیسے ڈرائیور کی باتوں پر آسمان کو رونا آ گیا ہو۔ دونوں ٹیکسی میں جا بیٹھے۔ ٹیکسی چلنے لگی۔ اصغر ٹیکسی ڈرائیور کے کردار پر غور کرنے لگا۔ اُس میں بڑا آدمی بننے کی تمام صفات موجود ہیں۔ سوائے اِس کے کہ وہ ڈرائیور ہے۔ کیا ایک معمولی ڈرائیور ایسی بلند پایہ کی فلسفیانہ باتیں کر سکتا ہے؟ مشکل ہے۔ ناممکن نہیں۔

ٹیکسی دالکیشور کی طرف مڑ گئی۔

"کیا آپ بھی بمبئی کو سمجھنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں۔"

"آپ سمجھ سکتے ہیں۔"

"کس طرح؟"

"آپ میں واقعات کے اندر کود کر واقعات کا مطالعہ کرنے کی جرأت ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"آپ پنجابی ہیں۔"

"کس نے بتایا؟"

"میں پہچان سکتا ہوں۔ اور مجھے معلوم ہے آپ کو کس چیز کی ضرورت ہے۔"

"کیا وہی ضرورت جو تم کہتے ہو ہر پنجابی کو ہوتی ہے؟"

"ہاں۔"

"نہیں نہیں۔ میں ایسا پنجابی نہیں۔"

"آپ کے انکار میں اقرار ہے۔ گھبرایئے نہیں، آپ کو ڈاکٹر ملبوریا کے ۴۰۸ انجکشن نہیں لینے پڑیں گے۔ میں آپ کو ایک محفوظ جگہ پر لے جاؤں گا۔"

"میں نہیں مانتا کہ اِس راہ پر چلنے والے کو ٹھوکر نہیں لگتی۔"

"جس راستے پر میں تم کو لے جا رہا ہوں۔ وہاں پتھر نہیں۔"

"اچھا!"

"بمبئی کی زندگی بہت مہنگی ہے۔ متوسط طبقے کی آمدنیاں کم ہیں۔ بیویاں خاوندوں کی مدد کرتی ہیں۔"

"کس طرح؟"

ٹیکسی گرگام میں داخل ہوگئی۔ بھیڑ تھی۔ ہورن بار بار بجانا پڑتا تھا۔ ہوتے ہوتے چلتی چلتی ٹیکسی ایک مقام پر آکر ٹھہری۔ ڈرائیور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

"میں آپ کو یہاں اُتارتا ہوں۔"

اصغر کے چہرے پر احتجاج کے آثار پیدا ہوئے۔ اور پھر معلوم نہیں کیوں مر گئے۔ وہ غیر ارادی طور پر باہر آ گیا۔ میٹر پر میل دیکھ کر کرایہ ادا کرنے کے لئے تیار ہوا۔ لیکن وہ ابھی حساب کر رہا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے دس دس روپے کے دو نوٹ اُس کی طرف بڑھائے۔

"یہ بیس روپے آپ کے ضروری خرچ کے لئے ہیں۔"

اصغر حیران ہو گیا۔ "نہیں میرے پاس کافی روپے ہیں۔ ٹیکسی کا کرایہ لو۔"

ڈرائیور نے روپے لے لئے۔ "دیکھئے۔ ایک شخص آپ کو سیڑھیوں میں سے ہوتا ہوا۔ ایک فلیٹ میں لے جائے گا۔ اُس کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں آپ کو اُس کا خاوند ملے گا۔ اُس کے پاس سے خاموش گذر جائیے۔ دوسرے حصے میں دو بچے ہوں گے۔ وہاں سے بھی چُپ چاپ چلے جائیے۔ تیسرے حصے میں وہ آپ کا انتظار کر رہی ہوگی۔"

اُس نے اصغر کو ایک دوسرے شخص کے حوالے کر دیا۔

جاتے جاتے اصغر نے کہا۔ "ڈرائیور! کیا تم مجھے پھر بھی مل سکتے ہو۔؟"

"ہاں۔ اگر آپ چاہیں۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام شریف ہے۔ اور میرا نمبر ۵۲۰۳ ہے۔"

وہ شخص تاریک سیڑھیوں میں سے ہوتا ہوا ایک مکان پر پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ اُس نے اصغر کو بتایا کہ دروازہ بند نہیں ہے۔ معمولی کوشش سے کھل جائے گا۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ اصغر جھجکتا تھا۔ لیکن اُس کا ارادہ متزلزل نہیں ہوا۔ ڈرائیور نے کہا تھا کہ پنجابی واقعات کا مطالعہ کرنے کے لئے واقعات میں کود پڑتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ قول کہاں تک درست ہے لیکن اصغر ضرور ایسا پنجابی تھا۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا آہستہ آہستہ اندر گیا۔

اُس کے اوسان خطا ہوگئے۔

سامنے پنسارے بیٹھا تھا۔

اگر پنسارے نے اُس کو دیکھ نہ لیا ہوتا، تو وہ واپس بھاگ جاتا۔ گھبراہٹ میں اُس کے گلے سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ ایک لمحے کی خاموشی، قیامت کی صبر آزما خاموشی تھی۔

آخر پنسارے نے کہا "مسٹر اصغر! گھبراؤ نہیں تمہیں ٹھیک رستہ بتایا گیا ہے۔ تم اندر جا سکتے ہو۔"

"مسٹر پنسارے! مجھے اپنی حماقت پر بہت افسوس ہے۔ میں لوٹ جانا چاہتا ہوں۔"

"نہیں! تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"دراصل میں کسی ناپاک ارادوں سے نہیں آیا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ ایسا کیوں ہے؟ مجھے بتایا گیا ہے کہ بمبئی میں اخراجات کی زیادتی اِس کا سب سے بڑا سبب ہے۔ لیکن آپ کے کیس نے مجھے حیران کر دیا ہے۔ آپ معقول تنخواہ پاتے ہیں۔ آپ اِس بارے میں کیا کہیں گے؟"

"صرف یہ کہوں گا کہ میں اپنی بیوی کے معاملہ میں دخل نہیں دے سکتا۔"

"آپ کی بیوی کا معاملہ آپ کا معاملہ ہے۔ اور اپنے معاملہ پر آپکو پورا اختیار ہے۔"

"معاملے پر اختیار ہوسکتا ہے لیکن بیوی پر اختیار نہیں ہوسکتا۔"

"آپ اِس بے غیرتی کو کیسے برداشت کرتے ہیں۔ ——— اگر آپ اِس کو ٹی بی سمجھتے ہیں۔ تو آپکو اسے روکنا چاہیئے۔"

"روکنے سے مجھے نقصان پہنچتا ہے۔"

"نقصان!"

"میں تجارت کر رہا ہوں۔"

اصغر حیران ہو گیا۔ ٹی بی کیا! تجارت کیسی! اُس نے محسوس کیا کہ ان واقعات کے پیچھے کوئی دلچسپ کہانی ہے۔ اس کا وہ ابتدائی خوف دُور ہوگیا تھا۔ اُس کے سوالوں میں تجسس بڑھ گیا۔ پنسارے کے جذبات میں معمولی ہلچل بھی نہ تھی۔ وہ معمولی انداز میں کرسی کا منہ اصغر کی طرف کئے بائیں ہاتھ کی کہنی میز پر رکھے، دائیں ہاتھ میں عینک پکڑے، اصغر سے باتیں کر رہا تھا۔ اُس کے لفظوں میں کافی سے زیادہ خود اعتمادی تھی۔ سکون تھا، اطمینان تھا، اُس کے رویّہ میں اُس کی

زندگی کا فلسفہ جھلک رہا تھا۔

کمرے میں بجلی کے ایک ٹیبل لیمپ کے علاوہ اور کوئی روشنی نہ تھی۔ اُس کے بائیں جانب میز پر رکھے ہوئے ٹیبل لیمپ کی یہ روشنی اُس کے بائیں آدھے چہرے کو روشن کر رہی تھی۔ اُس کا سایہ سامنے کی آدھی دیوار پر ہوتا ہوا کونے میں سے دوسری دیوار تک پہنچ گیا تھا۔ کمرے کی اِس مشکوک فضا نے اُس کی باتوں میں زیادہ رُعب پیدا کر دیا تھا۔

وہاں صرف ایک کرسی تھی۔ جس پر پنسارے بیٹھا تھا پنسارے نے اپنے خلیق رویّے کے باوجود اصغر کو کرسی پیش کرنے کی پروا نہیں کی۔ شاید اُس کو خیال نہیں آیا۔ اصغر اپنے دائیں ہاتھ سے دروازے کا اُدھڑا ہوا ضلع پکڑے کھڑا تھا۔

"میں تجارت کا مطلب نہیں سمجھا مسٹر پنسارے"

"لوگ تمباکو کی تجارت کرتے ہیں، میں ٹی بی کی تجارت کرتا ہوں"

اصغر سمجھ گیا۔ "مجھے آپ سے ہمدردی ہے"

پنسارے نے پوچھا "کیوں؟"

"بیوی اور شوہر کے خراب تعلقات، زندگی دشوار کر دیتے ہیں۔"

"لیکن میرے تعلقات تو اپنی بیوی کے ساتھ بہت اچھے ہیں"

"پھر تم اُس کو ٹی بی کیوں کہتے ہو"

"جس طرح سوداگر تمباکو کو تمباکو کہتا ہے"

"تمباکو کو تو سوداگر کے ساتھ کوئی محبت نہیں ہوتی"

"میری بیوی کو بھی میرے ساتھ کوئی محبت نہیں"

"کیوں؟"

"اُس کی اور میری عمر میں ۱۸ سال کا فرق ہے۔ میں اِس وقت ۳۹ سال کا ہوں"

"میں حیران ہوں، کہ جب آپ بھی اِس فرق کو پسند نہیں کرتے تو آپ نے اُس سے شادی کیوں کی؟"

"کیونکہ میری پہلی بیوی مر چکی تھی"

"لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ ایک معصوم اُٹھتی جوانی کو اپنی ہوس کا شکار بنالیں"

"اگر شکار ملتا ہو تو کیوں چھوڑا جائے"

اصغر کو اُس کے اِس سنگدلانہ لہجہ پر غصہ آگیا۔ وہ ایک لمحہ کچھ نہیں کہہ سکا۔ اُس کا نیچے کا ہونٹ اُس کے دانتوں میں آگیا۔ اُس کی نظریں کھوئے کھوئے متفکرانہ انداز میں اُس کے پاؤں کے پاس پہنچ گئیں۔ اُس نے دروازے کا کنارہ چھوڑ دیا۔ آہستہ آہستہ میز کی طرف چلنے لگا۔ میز کے تین قدم کے فاصلے پر اپنی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر پنسارے کی طرف مُنہ کر کے کھڑا ہو گیا۔

"مسٹر پنسارے! آج دفتر میں جو سوال میں نے تم سے کیا تھا، اُس کا جواب مجھے مل گیا ہے"

"کیا"

"مِس میو ٹھیک لکھتی ہے"

"لیکن مِس میو کو ہماری تجارت میں دخل دینے کا کیا حق ہے؟"

اصغر تیز ہو گیا "تم کتنا نفرت انگیز لفظ استعمال کرتے ہو، مسٹر پنسارے ۔ تجارت ۔ کیا تم نے اپنی بیوی کو خریدا تھا"

پنسارے نے دائیں ہاتھ کی انگلیاں دکھاتے ہوئے کہا، "۵ ہزار روپے میں"

اصغر پر سکتے کا عالم ہو گیا۔

پنسارے کہتا رہا "میری بیوی کا باپ ایک لالچی آدمی ہے۔ وہ سٹے اور ریسوں میں بہت سی دولت برباد کر چکا تھا۔ وہ ڈوب رہا تھا، اُسے ایک تنکے کی ضرورت تھی۔ میں مارکٹ کے نرخ خوب سمجھتا ہوں۔ سُنہری موقع تھا۔ ہاتھ سے جانے نہیں دیا، ۵۰۰۰ روپے کو ایک اُنیس سال کی لڑکی ۔ اچھا سودا تھا"

"لیکن تم کو اِس سودے کے نتیجوں کا بھی تو پتہ ہو گا؟"

"بے شک تھا"

"پھر تم اب غیرت سے ڈوب کیوں نہیں مرتے"

"مسٹر اصغر! یہ میرے لئے نئی بات نہیں۔ بمبئی کی وائٹ سٹریٹ میں میرے چار اڈے ہیں۔ کلکتہ کے بو بازار میں میرے تین بال روم ہیں۔ لاہور کی ہیرا منڈی میں میرے چھ بالاخانے پبلک کی خدمت کر رہے ہیں۔ دہلی کے چاوڑی بازار میں میرے بالاخانوں کو بہترین دل لگی مہیا کرنے کا فخر حاصل ہے۔ مجھے اِس بزنس میں تقریباً تیس ہزار روپے سالانہ کی آمدنی ہے۔ اور تم سن کر حیران ہو گے کہ مجھے سب سے زیادہ آمدنی پنجاب سے ہے"

"پنسارے اگر تم چپ نہیں ہو جاؤ گے، تو تمہارے بتیس دانت تم کو سجدہ کریں گے"

"اصغر! تم ابھی بچے ہو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ میں ایک دولتمند

آدمی ہوں۔ اور قانون میرے بٹوے میں ہے۔"

"میں ابھی پولیس کمشنر کو فون کرتا ہوں۔"

"پولیس کمشنر یہاں بہت دفعہ آ چکا ہے وہ ہمارا گاہک ہے۔"

اصغر غصّہ کو زہر کی طرح پی گیا۔ اُس کی غضب آلود نگاہیں بنسارے کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ بنسارے کو اُس کی خاک بھی پروا نہ تھی۔ اُس نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ شاید دفتر کا کام تھا۔

"اب تم جا سکتے ہو۔ اندر یا باہر۔"

اصغر باہر کے دروازے کی طرف چل دیا۔ جب اُس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ اُسے کچھ خیال آیا اُس نے مڑ کر بنسارے کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے کام میں مشغول تھا۔

"مسٹر بنسارے! میں نے آپ کا بہت وقت ضائع کیا۔ قیمتی تجارتی وقت ــ اگر آپ چاہتے ہیں تو اپنی قیمت وصول کر سکتے ہیں۔"

بنسارے چُپ چاپ بیٹھا رہا۔

اصغر نے پھر کہا۔ "میں آپ کا وقت ضائع کرنے کے لئے دس روپے دیتا ہوں، مسٹر بنسارے!"

"آپ دے سکتے ہیں۔"

آواز اندر سے آئی تھی۔ اصغر نے چونک کر اندرونی دروازے کی طرف دیکھا۔

وہ حواس باختہ ہو گیا۔ "مدھوریکا مہندر ریکر!"

ہلکا سا حیرت آمیز جواب تھا۔ "بھاسکا بھسکر!"

بنسارے نے بےتکلّفانہ کہا۔ "ہے بھگوان کرم کریں"

ایک لمحہ کمرے میں تکلیف دہ خاموشی چھائی رہی۔

آخر اصغر نے کہا۔ "مدھوریکا! تم سے تو مجھے یہ اُمید نہ تھی۔"

مدھوریکا نے بنسارے سے کہا۔ "بنسارے! یہ سولہواں لڑکا تھا جس کو میں نے تمہارے پیچھے سے چھڑانے کے لئے کہا تھا۔ لیکن اس نے بھی میری شادی کی چٹھی کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم اُن دنوں شملے میں تھے۔ ماں کو سخت تپدق تھی۔ اُس کے مرنے کے بعد پتا جی نے کہا۔ اب میں تم کو نہیں سنبھال سکتا۔ تم بنسارے کے گھر میں سکھی رہو گی۔ وہ دولتمند ہے۔ اس لڑکے نے میری مدد کرنے کی کوئی پروا نہیں کی۔ میں سمجھ گئی کہ آج کل کی محبت میں ہوس ہی ہوس ہے۔ دولت کے سوائے اور کچھ نہیں ــــــ"

"مدھوریکا!" اصغر نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم نے بنسارے کے ساتھ شادی کر لی اچھا ہی کیا۔ لیکن شادی کر چکنے کے بعد اب تم یہ کیا کر رہی ہو؟"

"تجارت!"

"تجارت! تجارت! تجارت! ــــ" اصغر جھنجھلا گیا۔

"دولت اس دُنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔"

"لیکن دولت بنسارے کے پاس کافی ہے۔ اور وہ تمہارا شوہر ہے۔"

"بنسارے میرا شوہر نہیں، وہ مسٹر بنسارے ہے۔ میں اس کے ساتھ رہتی ہوں جس طرح بورڈنگ ہاؤس میں طالب علم اکٹھے رہتے ہیں۔ میں اُس کو اُس کے مکان کا کرایہ دیتی ہوں۔ اُس نے مجھ کو ۵۰۰۰ روپے میں خریدا ہے۔ اور وہ کہتا ہے کہ اگر میں اُس کو ۷۰۰۰ روپے ادا کر دوں تو وہ مجھ کو آزاد کر دے گا۔ میں اب تک اُس کو ۴۰۰۰ روپے ادا کر چکی ہوں۔"

"لیکن کیا آمدنی کے اس معمولی ذریعے سے تم کو اتنی آمدنی ہو جاتی ہے۔"

"اس کو آمدنی کا معمولی ذریعہ مت کہو۔ بمبئی کے گدھے جن کو عام زبان میں سیٹھ کہتے ہیں، عورت کے ایک اشارے پر ہزاروں روپے قربان کر دیتے ہیں بشرطیکہ وہ اُس کی بیوی نہ ہو۔ لیکن میری آمدنی کا یہی ایک ذریعہ نہیں میں ایک لکچرر ہوں۔ اپنے صُوبے میں دورے کرتی ہوں۔ اور ہزاروں روپے کما کر لاتی ہوں۔ پچھلے ہفتے میں نے استری اُدھار سبھا کو دو ہزار روپے چندہ دیا۔ اُنہوں نے مجھ کو سنہ ۱۹۴۲ء کے لئے استری اُدھار سبھا کی پریذیڈنٹ بنا دیا ہے۔"

"استری اُدھار سبھا کی پریذیڈنٹ!"

"ہاں۔ اور میں آئندہ اسمبلی کے الیکشن میں ایک اُمیدوار کی حیثیت سے کھڑی ہونے والی ہوں۔"

"لیکن کیا کبھی لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہو گا کہ تم اندر سے کیسی ہو؟"

"بے شک ہو گا۔ جب الیکشن میں کامیاب ہو کر کونسل چیمبر کے اسٹیج پر آؤں گی۔ اور جب میں پہلی دفعہ ملک کو اپنی زندگی کے حالات بتاؤں گی۔ تو سارا ہال تالیوں سے گونج اُٹھے گا۔ چاروں طرف سے نعروں کی بوچھاڑ ہو گی۔"

دروازہ کھلا۔ مدھوریکا مہندریکر کا باپ اندر آ گیا معمولی گجراتی کپڑوں میں تھا۔ اصغر کو دیکھ کر کسی قدر جھینپا۔ لیکن پھر جرأت کر کے مدھوریکا سے مخاطب ہوا۔

"بیٹی! کل جو تم نے ۱۰ روپے دئے تھے وہ آج ریس میں ہار گیا ہوں۔ اور اب میرے پاس کھانے کے لئے ایک پیسہ بھی نہیں۔"

"پتاجی! گھبرایئے نہیں جب تک میں زندہ ہوں تمہیں کس بات کا فکر ہے۔ یہ مسٹر بھاسکا بھسکر ہیں۔ جن دنوں ہم شملے میں تھے۔ یہ بھی شملے میں تھے۔ اُس وقت یہ مجھ سے محبت کرتے تھے۔ اور میں بھی ان سے محبت کرتی تھی۔ لیکن جب میں نے پنسارے سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اِن کو شادی کا خط لکھا اُنہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اتفاق سے آج یہ ہمارے گاہک کی حیثیت سے یہاں آئے ہیں ——— مسٹر بھاسکا بھسکر! وہ دس روپے جو ابھی تم ہمیں دے رہے تھے وہ میرے پتاجی کو دے دو۔"

اصغر نے غیر ارادی طور پر دس روپے کا نوٹ اُس کے باپ کو دے دیا۔

مدھوریکا نے اپنے باپ سے کہا۔ "پتاجی! اب آپ اپنی لعنتی شکل کو میری آنکھوں سے اوجھل کر لیں۔ آپ کو دیکھ کر میرے رونگٹے رونگٹے میں نفرت کی آگ لگ جاتی ہے۔"

وہ چلا گیا۔

یکایک مدھوریکا مضمحل ہو گئی۔ اُس کی پیشانی پر پسینہ آ گیا۔ وہ لڑکھڑائی اور بڑی مشکل سے دروازے کو پکڑ کر گرتے گرتے بچی۔ اصغر نے پوچھا:-

"کیوں؟ مدھوریکا!"

"تم میری طرف اِس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟ کیا تم مجھے عورتوں کی طرح کمزور سمجھتے ہو؟"

وہ دیوار سے گھسٹتی ہوئی نیچے گر پڑی۔ اصغر اُسکو سنبھالنے کے لئے دوڑا۔

"افسوس! مجھ کو استری اُدّھار سبھا کی خدمت کرنیکا موقع نہیں مل سکیگا۔ میں اسمبلی کی ممبر بھی نہیں ہو سکوں گی۔"

"کیوں؟" اصغر نے پوچھا۔

"بخار! بخار میں کھانسی، کھانسی میں خون! میری ماں کی تپدق میں جذبات کا مقابلہ کر سکتی تھی لیکن ———" اُسے کھانسی شروع ہو گئی۔

پنسارے دوڑا ہوا آیا۔

"اور میرے تین ہزار روپے؟"

کھانسی! کھانسی! کھانسی!

انورؔ

غزل

تجھے کون اپنا بنا سکے، تجھے کون دل میں چھپا سکے
یہ کسے مجال کہ اپنا دل تری بارگاہ بنا سکے

مری زندگی ہے وہ داستاں جو تری سمجھ میں نہ آ سکے
ترا حُسن ہے مرا رازداں جو زباں پہ راز نہ لا سکے

تری آنکھ سے جو چھلک گئی وہ مقدرات ہی میں تھی
غمِ زندگی تو فریب تھا سمِ زندگی بھی نہ کھا سکے

کبھی آ گئی تو جگا گئی جو بہک گئی تو سُلا گئی
مگر اپنا مرکزِ زندگی تری ہر نظر نہ بنا سکے

یہ ستم نہیں ہے تو اور کیا ذرا مجھ سے آنکھ ملاتے تھے
کہ نہ میری سمت ہی آ سکے، نہ مجھے ہی پاس بُلا سکے

دو جہاں کو دل سے بھلا دیا مگر اک کرشمۂ چشمِ ما
بہ ہزار منّت و جستجو تری یاد تک نہ بھلا سکے

مرے عشق سے انہیں کم سے کم ہوئی زندگی نظر عطا
بھلا وہ بھی کوئی حسین ہے جو جگا سکے نہ سُلا سکے

ذرا دیکھ تو سہی بے خبر کہ تری نظر نہ رہی نظر
کسی اور کا تو ہے ذکر کیا جو ہمیں فریب نہ کھا سکے

راحت سعید

رفیق اجمیری مرحوم

۱۹۲۵ء کا زمانہ تھا جب میں بقدر پندرہ سال جوان تھا اور رفیق صاحب (رفیق) بھی بقدر چہاردہ سال (کیونکہ وہ پچھلے سال انتقال کر گئے) جوان تھے اور یہ موت اور مصیبتوں کی بستی جسکو آپ دُنیا کہتے ہیں ہم کو بھی اسی قدر جوان تھی۔ میں پہلی بار اجمیر میں آیا تھا اور سوائے آستانہ عالیہ کے پوری خواجہ کی نگری میرے لئے اجنبی تھی۔

کوئی اچھا سا مکان تلاش کرنا ہمارے لئے۔ میں نے ایک دن اپنے سقّہ سے درخواست کی۔ دوسرے روز ہم اچھے۔ یہ مکان کی تلاش میں مرحوم کی کوٹھی میں تھے۔ رفیق صاحب سے پہلی ملاقات کا جو مختصر ڈراما ہے جب تک میں اس سے پہلے کا سین پیش نہیں کرونگا لطف نہیں آئے گا۔ میں نے اب تک ایک بھی افسانہ نہیں لکھا تھا اور نہ لکھنا آتا ہے۔ ہاں ناول دو تین لکھ چکا تھا۔ میں سمجھتا بھی نہ تھا کہ طول طویل ناول کے بجائے ایک مختصر افسانہ بھی لکھا جا سکتا ہے۔ اُسی زمانہ میں (نام یاد نہیں رہا) پنجاب کا کوئی رسالہ میری نظر سے گذرا جس میں بہترین افسانہ پر انعام کا اعلان تھا۔ ہم نے بھی قسمت آزمائی کی ٹھانی ایک افسانہ لکھا اور رکھکر ڈالدیا۔ ہمت نہ ہوئی کہ چھپنے بھیجیں۔ عین اُسی زمانہ میں اجمیر کی سنگلاخ سرزمین سے بھی ایک ادبی رسالہ کا اجراء ہوا جسکو اجمیر کا پہلا اور شاید آخری بھی، ادبی رسالہ کہنا چاہیئے۔ اُس کا نام کیف تھا اور اس کے ایڈیٹر کوئی ندیم صاحب تھے۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے اپنے ایک دوست کے ہاتھ دفتر کیف میں وہ اپنا افسانہ بھیجا۔ لیکن دوسرے دن معلوم ہوا کہ اُس کو ردّی کی ٹوکری میں ڈالدیا گیا ہے۔ الحمدللہ محنت وصول ہوئی پیچ و تاب کھا کر چُپ ہو گئے۔

ندیم صاحب کی نا اہلی کچھ عرصہ بعد لوگوں پر ظاہر ہو گئی اور اُن کو کرسی ادارت سے اُتار دیا گیا۔ اب کیف رفیق کی نگرانی میں آگیا۔ جو اجرائے کیف سے غالبًا دو سال پیشتر سے لکھ رہے تھے۔ اور اس قلیل مدت میں اپنی جدّت نگاری کی وجہ سے کافی مشہور ہو چکے تھے۔ اپنے افسانہ کی نقل میرے پاس موجود تھی اسکو پھر پڑھا۔ اپنی نگاہ میں پھر وہ قابلِ اشاعت معلوم ہوا چنانچہ ایکبار اور ہمت کی اور اس دفعہ ہی افسانہ نگار کے پاس اُسی شخص کے ذریعہ پھر روانہ کیا۔ اس بھلے آدمی نے معہ اس افسانہ کی ایکبار مسترد کئے جانے کی تعریف کے اسکو پیش کیا۔ شاید دوسرا ایڈیٹر تو اس تعریف کے بعد اس کی طرف نظر اُٹھا کر بھی دیکھنا پسند نہیں کرتا لیکن مرحوم کے کریکٹر میں یہ نمایاں ترین بات تھی کہ وہ ہر شے کے دقیق نظر سے حسن و قبح کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ افسانہ دیکھکر کہنے لگے "مجھے معلوم نہ تھا کہ اجمیر میں کوئی اور شخص بھی ایسے افسانے لکھنے والا موجود ہے" اس کے بعد اس میں دو ایک جگہ نہایت معقول اصلاح کر کے کیف میں چھاپ دیا۔

اس افسانے نے مجھے رفیق سے متعارف کرا دیا تھا لیکن وہ ابھی مجھ سے غیر متعارف ہی تھے کیونکہ ان کا کوئی مضمون اب تک میری نظر سے نہیں گذرا تھا ہاں اپنے دوست سے اُنکی تعریف بہت سُنی تھی۔ خبر تو ان کی کوٹھی کے کسی حصہ میں مکان تلاش کرتا پھیر رہا تھا کہ اُن کے برادرِ بزرگ جی۔ ایم شہاب الدین صاحب صدیقی سے نیاز حاصل ہوا۔ بزرگانہ شفقت سے فرمانے لگے "آیئے آپ کا رفیق سے بھی تعارف کرا دوں" میرے جسم میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ میں برادرِ محترم کے ساتھ رفیق کے کمرے میں پہونچا۔ مرحوم زمین پر بیٹھے (اُنکو میز کرسی سے کوئی دلچسپی نہ تھی ہمیشہ گاؤ تکیہ اور قالین پسند کرتے تھے اور اُسی پر کھانا کھاتے اُسی پر افسانہ لکھتے اور اور اُسی پر احباب کے ساتھ بیٹھتے تھے) داڑھیا گھوٹ رہے تھے۔

"یہ ہیں قیسی صاحب" برادرِ بزرگ نے مجھے آگے بڑھا کر فرمایا۔ مرحوم کی دلکش و بارعب آنکھیں چند سیکنڈ کے لئے میری جانب متوجہ ہوئیں اور لفظ "اچھا؟" کے ساتھ بایاں ہاتھ (سیدھے ہاتھ میں اُسترا تھا) مصافحہ کے لئے بڑھا دیا۔

مرحوم اجمیر کے ایک معزز گھرانے کے فرد تھے مجھے ان کا صحیح سن ولادت تو یاد نہیں لیکن بے تکلفی کے زمانہ میں جب میں نے اپنا سن پیدائش ان کو بتایا تو وہ اکثر کُشتی کے موقع پر کہا کرتے تھے "اَبے تو مجھ سے آٹھ مہینے بڑا ہے ورنہ کوڑی ٹپخنا دیتا" اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اُنکی پیدائش مارچ ۱۹۰۹ء کی تھی۔

بچپن ہی سے نہایت ذہین اور طباع واقع ہوئے تھے۔ اردو اور فارسی گھر میں ہی پڑھی۔ چونکہ علم دوست خاندان سے متعلق تھے اس لئے اُن کی تربیت بھی علمی ماحول میں ہوئی تھی۔ مرحوم نے لکھنے کی ابتدا شاعری سے کی تھی طبیعت میں چونکہ جدت اور اپج بہت زیادہ تھی اس لئے نظمیں بھی بڑی اثر انگیز ہوا کرتی تھیں۔ لڑکپن کا زمانہ تھا۔ نئی نئی شاعری شروع کی تھی جو چاہا سو لکھا اور خوب لکھا۔ ممتاز مرحوم ایڈیٹر "اودھ پنچ" اُن کی نظموں کے بڑے مداح تھے، اور "اودھ پنچ" ہی میں ان کی نظمیں چھپتی تھیں۔ یہ پرچہ اس زمانہ میں ایک چیز تھا اور اس میں کسی نظم یا نثر کا چھپ جانا بڑی بات تھی۔ کم عمری میں مرحوم کے اس عروج کو دیکھکر اُن کے مقامی ہم چشموں کو بڑا رشک ہوتا تھا۔

کچھ عرصہ بعد وحید کیلانی صاحب نے لاہور سے ایک پرچہ نکالا۔ شاید "بہارستان"۔ یہی پرچہ رفیقی کی شہرت کا باعث ہوا۔ یا یہ سمجھئے کہ رفیقی کی قلم نے اسکو مشہور کر دیا۔ اس زمانہ میں اردو صحافت کے اندر فن افسانہ نگاری کو وہ شان حاصل نہیں ہوئی تھی جو اب ہے۔ بھوپال سے "نگار" نکل رہا تھا۔ پنجاب سے "مخزن" و "شباب اردو" جاری تھے یہ دونوں پرچے کم و بیش سنجیدہ تھے۔ "نگار" اس زمانہ میں خالص ادبی پرچہ تھا اور یہاں "افسانہ" کو بھی نہیں بھولنا چاہیئے۔ اس عہد میں افسانہ نگاری پر [illegible] کا رنگ غالب تھا۔ بیشتر افسانے [illegible] پلاٹ، ضعیف کردار، بے ربط واقعات سے مملو ہوتے تھے۔ مرحوم نے اس فضا میں بیٹھکر ایسے افسانے لکھے جن سے اردو داں طبقہ بہت بڑی حد تک نابلد تھا۔ یہ میں پیشتر ہی عرض کر چکا ہوں مرحوم کی طبیعت میں جدت و طباعی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جو چیز پیش کرتے تقلید عامہ سے ہٹ کر ایک الگ چیز ہوتی تھی۔ پھر اُن کا انوکھا طرز بیان، خوش ترکیب جملے جن کے وہ شروع ہی سے اُستاد تھے، کم عمری میں "سالخوردہ" لوگوں کی سی پختہ کارانہ باتیں اور [illegible] (واقعیت) وہ بے بدل مضامین تھے جنہوں نے مرحوم کو بہت ہی تھوڑے عرصہ میں مشہور کر دیا۔

رفیقی نہایت ہی خوش فکر اور بڑے ہی ذہین تھے۔ نظم و نثر، تحریر و تقریر۔ سب کے بادشاہ تھے۔ جیسی بے نظیر تحریر تھی ایسی ہی دلکش تقریر تھی۔ سامعین کو بالعموم خاموش ہی پایا ہے مگر یہ بلبل ہزار داستاں جب چہکتا تو سحر گفتگو سے محفل مسحور ہو جاتی۔ اس میں کچھ مبالغہ صرف نہیں کر رہا ہوں، جو لوگ مرحوم کی پرائیویٹ مجالس میں رہے ہیں وہ اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ میں نے بڑے بڑے قابلوں کو اس سحر گفتار نوجوان کے مقابلہ میں گنگ پایا ہے۔ طبیعت میں شوخی و شرارت بھی بیحد تھی اور زندہ دلی، خوش مزاجی، مزاح اور شگفتہ گوئی کا تو یہ عالم تھا کہ بہت سے لوگ مرحوم کے پاس محض آتے ہی خوش وقتی کے لئے تھے۔ نیاز صاحب سے مرحوم کی خوبیاں پوچھئے۔ وہ بھی اُن کے مداحین میں سے ہیں۔ حافظہ اسقدر قوی تھا کہ پیش پا افتادہ و قابل فراموش باتوں سے لے کر دنیا کے اہم ترین امور تک یادداشت میں محفوظ تھے۔ ہر موضوع پر بول سکتے تھے۔ کمال کے ساتھ۔ فطرتاً رجائی واقع ہوئے تھے۔ ٹریجڈی اور قنوطیت سے سخت متنفر تھے جس زمانہ میں میں ٹامس ہارڈی کی تصانیف کا ترجمہ کر رہا تھا، وہ مجھے گالیاں دیتے تھے۔ میرا، ہارڈی کا اور تمام قنوط نگاروں کا مذاق اڑاتے۔ کوئی ٹریجڈی کی تحریر دیکھتے یا کوئی حزنیہ افسانہ پڑھتے تو کہتے "گدھا ہے لکھنے والا"۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اعتراف بھی کرتے کہ آرٹ ٹریجڈی ہی میں ہے۔ لکھنے والوں میں نیاز صاحب کے معترف تھے لیکن اُن کی مذہبی "موشگافیوں" سے سخت نالاں تھے۔ رشید احمد صدیقی کے بھی بہت مداح تھے۔ رشید صاحب کے تمام طنزیہ، چست اور مزاحیہ فقرے انکو ازبر تھے۔ عظیم بیگ کے افسانے پڑھکر بھی بہت خوش ہوتے تھے اور بزرگانہ تبسم کے ساتھ کہا کرتے تھے "بڑا نالائق ہے"۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اور کسی لکھنے والے کے افسانوں کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ میری عادت کے خلاف وہ ہر لکھنے والے کے افسانے کو پڑھتے تھے اور داد کے مستحق کو ہمیشہ داد دیتے تھے۔ داد کے باب میں مرحوم نے نہایت وسیع قلب پایا تھا۔ اپنے شدید سے شدید مخالف کو بھی قابل داد نظم یا نثر کی دل بھر داد دیتے تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ بعض نئے لکھنے والے بہت اچھا لکھ رہے ہیں، افسوس یہ ایڈیٹر لوگ انکی قدر نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ کچھ دن بعد لکھ کر اور اردو صحافت میں کچھ نہ پاکر خاموش ہو جائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا۔ میرے حقیر افسانوں کو سب سے پہلے پڑھتے تھے اور یہ اُن ہی کی بیجا حوصلہ افزائیوں کا نتیجہ ہے کہ میں تسوید قرطاس کے قابل ہوا ہوں۔ کہا کرتے تھے کہ حقیقی افسانویت توفیقی کے ہاں

ہی ہے اپنے پاس تو شکوہ الفاظ کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ حالانکہ ان کے ایک جملہ، ایک لفظ کی قیمت میرے تمام مزخرفات مل کر بھی ادا نہیں کر سکتے۔

رفیقی زبردست ایکٹر بھی تھے اور ایسے ہی زبردست نقال بھی۔ کسی کو عمر بھر میں ایک دفعہ کسی مخصوص انداز میں گفتگو کرتے دیکھ لیتے۔ بس پھر کیا تھا۔ ہو بہو اس کی نقل اتار کر رکھ دیتے ایکٹنگ کرتے تو اسقدر مکمل کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ بے تکلفی کا سلام چار انگلیاں ملا کر بڑے مزے سے کیا کرتے تھے۔ دیکھتے ہی ہنسی آ جاتی۔ ایک دفعہ ایک صاحب کی نقل اتار رہے کہ دفعتہً وہ بھی آ مرے۔ بھنّا کے پوچھنے لگے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مرحوم پہلے تو سٹ پٹائے پھر ہنسکر بولے آپ ہی کا ذکر خیر ہو رہا تھا۔

مرحوم نہایت راسخ عقیدے کے مسلمان تھے۔ شروع میں کچھ عرصہ تک تو تدبیریں مبتلا رہے تھے لیکن اس کے بعد تو ایسا پختہ رنگ چڑھا کہ مرتے دم تک نہ اترا۔ گنڈے دار نماز بھی ادا کر لیا کرتے تھے لیکن زکوٰۃ و خیرات کے سختی سے پابند تھے۔ جود و سخا ورثہ میں آئے تھے۔ آپکے نانا مرحوم نواب حاجی محمد خانصاحب نے بھی اللہ کی دی ہوئی دولت دونوں ہاتھوں سے خیرات کی۔ حضرت غوث پاکؓ کے شیدائی تھے اور اہل بیت سے بھی بیحد ارادت تھی۔ ایک دفعہ نماز کا وقت تھا۔ میں ادا نماز کے لئے اٹھا۔ کہنے لگے ہم بھی پڑھیں گے آج۔ میں نے کہا آجاؤ۔ کہا میں امام بنوں گا۔ میں نے کہا غلط بات ہے تم گنڈے دار نماز پڑھتے ہو۔ کہنے لگے اچھا تو امامت کرو لیکن مجھے ہنسی آئے بغیر نہ رہے گی۔ امام بننے سے یہ کہا کہ ذمہ داری عائد ہو جاتی اور شاید ہنسی بھی رک جاتی۔ خیر ہم امام بنے دو ایک اور مقتدی بھی تھے۔ آپ میرے پیچھے ہی کھڑے ہوئے تھے۔ دو ایک بار تو خوں خوں کی آواز آئی۔ دوسری رکعت کے بعد جو سجدہ سے اٹھا ہوں تو ان کی گردن میرے نیچے تھی۔ معلوم ہوا کہ ہنسی ضبط کرنیکی کوشش میں ابھی آپ سجدہ میں ہی پڑے ہوئے ہیں۔

مرحوم کو لڑائی جھگڑے اور بحث و مباحثہ سے سخت نفرت تھی۔ اگر کوئی ان سے بحث کرتا تو وہ اسکو بنا کر رکھ دیا کرتے تھے۔ میری عادت الجھنے کی تھی۔ الجھ پڑتا تھا۔ اختتام بحث پر بیٹھ ٹھونکتے اور کہتے خدا جانے تیرے دماغ میں کیا بھرا ہے لیکن کسی اہم موضوع پر کوئی اپنی قابلیت کے زعم میں ان سے الجھ پڑتا تو وہ اس موقع پر ڈٹ جاتے تھے۔ اس وقت لطف آ جاتا تھا۔ ان کی بحث اس قدر مدلل اور معقول ہوتی تھی کہ مخالف کا تیا پانچہ ان کے وزنی ادلہ اور مربوط طرز بیان کے مقابلہ میں پانی کی طرح بہ جاتا۔ ہمیشہ فی البدیہہ بولتے تھے اور ہمیشہ فتحمند اٹھتے تھے۔

ایک دفعہ ہم اور وہ لاہور ساتھ گئے۔ دلی تک تو سفر اچھی طرح کٹ گیا لیکن انٹر ڈبہ کی گاڑی میں بلا کی بھیڑ تھی۔ بولے۔ اب کیا کریں۔ میں نے کہا آجاؤ میرے پیچھے۔ خدا خدا کرکے جگہ ملی۔ ہم نے فوراً برتھ پر بستر دراز کر دئے اور خود بھی دراز ہو گئے۔ رات کا سفر تھا میں تو پڑ کر سو گیا۔ صبح جو اٹھا ہوں تو کوئی شخص میری ٹانگوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے غصہ سے اس کے ایک لات جو رسید کی تو آواز آئی "ابے یہ کیا حرکت ہے" آواز رفیقی کی لیکن شکل کسی اور کی۔ معلوم یہ ہوا کہ ایک دھوبی نے ڈانٹ ڈپٹ کر آپکی سیٹ پر قبضہ جما لیا تھا اور آپ رات بھر اسی طرح سکڑے ہوئے بیٹھے رہے۔ گرد و غبار کی چہرے پر تہ جمی ہوئی تھی جس سے آپکا حلیہ بھی بدل گیا تھا۔

مرحوم کو سینکڑوں لطائف و ظرائف یاد تھے اور انکی خود کی کوئی حرکت لطیفہ سے کم نہ ہوتی تھی۔ کوئی کہاں تک بیان کرے۔ اسپر انشاء اللہ پھر کبھی لکھونگا کیونکہ اس باب میں مجھے دوسرے احباب سے بھی مدد لینی ہے۔

رفیقی مردم بیزار واقع ہوئے تھے۔ مجالس سے گھبراتے تھے اور حتی الوسع کوشش کرتے تھے کہ اجنبیوں سے دور رہیں۔ لیکن جب نا آشنا لوگوں میں پھنس جاتے تھے تو ہر شخص کو اپنے کمال گفتگو سے دنگ کر دیا کرتے تھے۔ مگر بے تکلف دوستوں میں بات چیت کا ڈھنگ ہی دوسرا تھا۔

جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں جب ان سے پہلی دفعہ ۲۶ء یا ۲۵ء میں ملاقات ہوئی ہے حضرت ڈاڑھی مونڈ رہے تھے۔ ڈاڑھی ابھی اگرچہ نکلنی ہی شروع ہوئی تھی لیکن اسی کو گھوٹ رہے تھے۔ مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنے کام میں لگ گئے۔ میرے بھی حلق پہ چند بال نکلنے شروع ہو گئے تھے جواب تک بے نیاز استرہ تھے۔ میں نے کہا حضرت یہ آخر اتنے سے بال بھی آپکو اپنے رخ زیبا پر کیوں ناگوار معلوم ہوتے ہیں؟" ایک وقار کے ساتھ ہنس پڑے اور بولے "میں فاروق (میرے سب سے پہلے افسانے کے ہیرو کا نام) تو ہوں نہیں کہ اس بات میں بھی سستی کروں" یہ وہ

زمانہ تھا جب مرحوم ادب مجسم بنے ہوئے تھے گفتگو نہایت مغلق اور
ادیبانہ کیا کرتے تھے اور حرکات وسکنات، نشست وبرخاست،
میل جول سب میں ادیب بنے ہوئے تھے یوں کہنا چاہیئے کہ ایک
چلتی پھرتی بولتی چالتی ادبی کتاب تھی۔ چند منٹ تک ہم دونوں
خاموش بیٹھے رہے۔ آخر میں نے دریافت کیا "کہیے اختتام تعلیم
کے بعد کیا ارادہ ہے؟" اُس وقت وہ فرسٹ ایئر میں پڑھتے
تھے۔ ابرو پر بل ڈالکر اور کچھ عجیب ادیبانہ انداز میں بولے "مصوری
کا ارادہ ہے" بات شاعرانہ کہی تھی میں نے بھی لطف لیا مگر یہ
تصنع اور بناوٹ ناگوار گذری۔ آخر میں جانے کے ارادے سے
اُٹھ کھڑا ہوا۔ داد کے طور پر بولے آپکا افسانہ ماشاء اللہ خوب
تھا۔ داد کی عادت شروع ہی سے تھی میں نے شکریہ ادا کیا۔ کہنے
لگے "اور کچھ لکھ رہے ہو" اُس وقت میں نے اس مغرور انسان
کے سامنے اپنی بیچارگی کا اظہار پسند نہیں کیا جھوٹ کہدیا کہ ہاں
لکھ رہا ہوں۔ بولے "تو پھر سب سے پہلے کیف میں آجانا چاہیئے"۔
میں وعدہ کی جکڑبند سے نکلنے کے لئے وہاں سے بھاگا اور مکان
پر آکر کئی روز تک اس فکر میں مبتلا رہا کہ کیا لکھوں۔ آخر کچھ اپنا
جھوٹ نباہنے کی خاطر کچھ جذبۂ تفوق سے مغلوب ہو کر لکھنا
شروع کیا۔ وہ افسانہ بھی خاصہ رہا اور کیف ہی میں چھپا۔ مرحوم
نے اُس کی بھی داد دی میرا حوصلہ بڑھ گیا اور رفیقی کی اسی غیر
جانبدارانہ حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں افسانہ نگاری
کی سیدھی ڈگر پر چل نکلا۔ میں نے مرحوم سے بہت کچھ استفادہ کیا
ہے گو انھوں نے اس کا کبھی اعتراف نہیں کیا لیکن میرا دل جانتا ہے۔
میں نے اب تک جو کچھ لکھا ہے مرحوم کی (intellectual)
خوبیوں کے بارے میں لکھا ہے۔ سیرت کے متعلق ابھی میں نے زیادہ
نہیں لکھا ہے۔ اور یہ کام آسان بھی نہیں ہے کیونکہ مرحوم کی
سیرت اسقدر دقیق، اتنی اتھاہ اور اسقدر گوناگوں تھی کہ اسکو
سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں تھا۔ مرحوم عوام میں ان عام باتوں کے
ساتھ مشہور رہتے تھے کم آشنا، دیر پیوند، مردم بیزار۔ یہ باتیں
بے شک مرحوم میں تھیں اور اسی وجہ سے بہت سے لوگ اُن سے
نباہ نہیں کر سکتے تھے۔ مرحوم میں یہ بات بھی تھی کہ وہ عوام میں
اپنی بالادستی قائم رکھنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ اس سلسلہ
میں بہت سے لوگ اُنسے محض انکی خوش بیانی کی وجہ سے ملتے تھے،
بہت سے خوش وقتی کے خیال سے اور بہت سے انکی قابلیت سے
مرعوب ہو کر۔ یہ تمام چیزیں مرحوم کی نظر میں تھیں لیکن وہ گہرے اسقدر
تھے کہ اپنی رائے کا ایک شائبہ تک کبھی عریاں نہیں کرتے تھے ایسے
لوگ یہ تمیز نہیں کر سکتے تھے کہ انکی نظر میں کون محبوب ہے کون غیر محبوب
لیکن اُن کے دل کے نازک مقام کو کوئی نہیں چھو سکا تھا اور چھوتا
بھی کیسے اُن کے جذبات کو قیام کب تھا۔ کیا کوئی تیز رفتار موٹر کے
پہیوں کی تیلیوں کو دیکھ سکتا ہے؟

اکثر شناساؤں کو شکایت تھی کہ مرحوم میں دوستی کا عنصر
بالکل مفقود ہے۔ اُن میں دوستوں کے لئے ایثار کا مادہ نہیں ہے
سطحی نظر میں انکی یہ شکایت بجا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرحوم
کو کسی نے سمجھا ہی نہیں۔ بات یہ ہے کہ مرحوم کا مردم آزمائی کا طریقہ
کچھ عجیب وغریب تھا۔ ان کی پُراسرار کسوٹی پر بعض لوگ تو شروع
ہی سے نہیں چڑھ سکتے تھے اور جو چڑھنے کی کوشش کرتے وہ
درمیانی مدارج سے بھاگ جاتے تھے۔ مرحوم دوست کو ہمہ سپردگی
دیکھنے کے متمنی نہیں تھے بلکہ وہ یہ دیکھتے تھے کہ اس شخص کے دعوی
دوستی میں کسقدر صداقت ہے، اس میں کتنا خلوص اور کس قدر
منافقت ہے۔ ان باتوں کو پرکھنے کا انکو خاص ملکہ تھا۔

رفیقی کو اپنے حقیقی رنگ میں دیکھنے کی سعادت مجھے
حاصل ہوئی ہے۔ جب یہ ظاہرداری، رکھ رکھاؤ، تکلف اور ریا
کے حجابات ہمارے درمیان سے اُٹھ گئے تو میں نے مرحوم کو ایک
بے نظیر دوست پایا۔ وہ نہایت صادق محب تھے۔ بڑے ہی رقیق القلب
اور سچے دوست تھے اور نہایت پُرایثار اور کام آنے والے انسان
تھے۔ ان زبردست بندھنوں کا توڑنا نہایت ہی دشوار کام تھا۔
لیکن جب یہ سیلاب ٹوٹ نکلتا تھا تو مرحوم پھر اپنے سنبھالے
بھی نہیں سنبھلتے تھے۔ وہ پھر چاہتے تھے کہ وہ دوست سے اور
دوست اُن سے ایک سیکنڈ کیلئے جُدا نہ ہو۔

جیسی جاذبیت مرحوم کے افسانوں میں ہے اس سے زیادہ
کشش ان کی ذات میں تھی۔ انکے اندر ایک فطری محبوبیت تھی۔
وہ دوستوں کے محبوب تھے، طبقہ نسواں کے مسجود اور عوام میں
مرغوب۔

دوستی کے نازک مگر اہم مسائل انکے زندگی پر بھی اثر انداز
ہوئے ہیں۔ اگرچہ وہ شروع ہی سے دوستی کی پیدا کردہ توقعات میں
کبھی بے محابا نہیں ہوئے لیکن دوستوں کی غلط نمائی کا چندبار
انکو بھی شکار بننا پڑا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس مسئلہ میں کافی سے

زیادہ محتاط ہوگئے تھے لیکن، جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں جب وہ دوست سے مطمئن ہوکر یکبارگی چھٹ پڑتے تھے تو اُن کی حالت کچھ اور ہی ہوجاتی تھی۔ اس وقت ان کی تمام خودگیری مٹ جاتی تھی وہ ہمہ صداقت و محبت کا نمونہ بن جاتے تھے۔

اُردو سے بیزار ہوکر انگریزی کی طرف آئے۔ اُردو سے بیزاری کی وجہ بظاہر یہی تھی کہ اُردو داں طبقہ نے اور اُردو رسائل نے اُن کی وہ قدر نہیں کی جس کے وہ مستحق تھے چنانچہ اُردو میں لکھنے کی قسم ہی کھالی تھی اور اسکو ایسا نبھایا کہ اگر جناب سحر صاحبہ مدیرہ تنویر بمبئی اپنے خواہرانہ پیار سے مجبور کر کے مرحوم سے تنویر کے نئے "پتنگ کی جنگ" نہ لکھوا لیتیں، تو شاید وہ مرتے دم تک کچھ نہ لکھتے۔ یہ افسانہ مرحوم کا آخری افسانہ ہے اور نکہت میں شامل کر لیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ انگریزی صحافت کے لئے بڑے دماغی سرمایہ کی ضرورت ہے لیکن مرحوم کے پاس اس کی کیا کمی تھی۔ انگریزی میں سب سے پہلا افسانہ جو لکھا اُسکا عنوان تھا In defence of wife beaters اس عنوان کی شوخی سے ہی پتہ چل سکتا ہے کہ مضمون کیسا ہوگا۔ شان سے Hindustan Times میں چھپا اور بہت مقبول ہوا۔ بہت سی خواتین نے جلکر خط لکھے مرحوم ان سے بہت حظ لیتے اور پھر اس سے بھی شدید ادبی چٹکی لے لیتے۔ اس کے بعد اور کئی افسانے لکھے اور اُردو کی طرح بہت ہی قلیل عرصہ میں انگریزی میں بھی بہت معروف ہوگئے۔ انکے افسانے (Revolt of Hens) نے تو انگریزی صحافت میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ طبیعت میں بے انتہا —— Originality —— تھی۔ جو بات لکھتے نئی جو چیز پیش کرتے انوکھی۔ دُنیا والوں کے دماغوں سے کھیلتے تھے۔

بہت ہی تھوڑے عرصہ میں اُردو کی طرح انگریزی کے افسانوں کی بھی وہ لاؤ لاؤ مچی کہ مرحوم تھک گئے مگر انگریزی کی لاؤ لاؤ اُردو کی طرح خالی خولی نہیں تھی۔ انگریزی میں خاطر خواہ معاوضہ ملتا تھا لیکن مرحوم نے کبھی معاوضہ کے لالچ میں نہیں لکھا۔ جب لکھا اپنے تسکین ذوق کی خاطر۔ یہی وجہ تھی انکے مضامین میں شروع سے آخر تک نُدرت ہی نُدرت نظر آتی تھی۔

انگریزی میں مرحوم رفیقی اجمیری کے نام سے نہیں لکھتے تھے بلکہ اعظمی اجمیری کے نام سے لکھتے تھے۔ پچھلے سال میں تو اُردو میں بھی اعظمی اجمیری کے نام سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ انگریزی کے کم و بیش تمام ممتاز رسائل میں مرحوم کے افسانے چھپتے تھے۔ اُردو کی طرح مرحوم انگریزی میں بھی طبقہ نسواں کے طرفدار نہیں تھے۔ وہ نسوانی دُنیا کو چھیڑ دیتے تھے۔ انکی کمزوریاں بتاکر اُن کی سحر کاری کو ٹھکراتے ہوتے۔

حیف صد حیف کہ یہ بیمثال انسان پانچ جون ۱۹۳۹ء کو جرنلزم کی دُنیا کو ویران کر کے اللہ کو پیارا ہوا۔
تُربتش عنبریں باد!

قیسی رامپوری

(جوانی کی یاد) (بسلسلہ نمبر ۲) رات آدھی کے قریب جاچکی تھی۔ ہر طرف ہُو کا عالم اور گہرا سناٹا تھا۔ صرف کہیں کہیں کتے بھونک رہے تھے یا پھر جگدیش کھوں۔ کھوں کر رہا تھا۔ بھوسے کی کوٹھری سے اب سیتی کے رونے کی بھی آواز نہیں آتی۔ مُرلی اپنی چارپائی پر چُپ اور ساکت لیٹی شاید تاروں کو گننے کی کوشش کر رہی تھی آسمان پر ایک بہت روشن ستارہ ٹوٹا اور آسمان پر ایک سُنہری محراب بناتا ہوا فضا میں تحلیل ہوگیا بالکل اسی طرح جس طرح کہ مُرلی سمجھتی کہ اس کی جوانی چند پُرجوش دنوں اور رومان انگیز راتوں کی دھندلی سی یاد چھوڑتی ہوئی جگدیش کی "کھوں کھوں"، میں غائب ہوگئی۔ پھیکی چاندنی نے مرلی کا دل اور بھی پھیکا کر دیا۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس کی لمبی گھنی پلکوں پر دو آنسو تڑپنے لگے معلوم ہوتا جیسے اس کی بھوکی آتما کا نچوڑ یہی دو آنسو ہیں!

مُرلی نہ معلوم کتنی دیر تک اس حالت میں پڑی رہی لیکن پھر دفعتاً وہ چارپائی سے اُٹھکر چلنے لگی بالکل اس طرح جیسے وہ عالم خواب میں چل رہی ہو۔ وہ دھیرے دھیرے گئی اور اس نے دروازہ کی کنڈی کھولدی اور پھر وہیں انگنائی میں لیٹ رہی اور بے خبر ہوگئی۔

صبح سویرے مُرلی کی آنکھ کھلی تو وہ یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئی کہ وہ انگنائی میں زمین پر پڑی ہے اور دروازہ کی کنڈی کھلی ہوئی ہے۔ وہ اس طرح کود کر بھاگی جیسے کوئی لمبی ڈاڑھی والا مولوی غلطی سے شرابخانہ میں آجائے اور پھر سر پر پیر رکھکر بھاگے۔

"کھوں۔ کھوں۔ کھوں" جگدیش کھانس رہا تھا اور مُرلی کو...

جوانی کی یاد

"کائیں۔ کائیں۔ کائیں"؛ سامنے ٹُنڈ مُنڈ نیم پر ایک کوّا بول رہا تھا۔ "کھوں۔ کھوں۔ کھوں"؛ کوٹھری میں بیمار جگدیش کھانس کھانس کر اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔

"کھل کھل۔ کھل"؛ اندر مکان میں دروازہ بند کئے جگدیش کی لڑکی شُپنی نہا رہی تھی۔

باہر چھپّر کے نیچے جگدیش کی بیوی مُرلی اپنے سر کی جوئیں بین رہی تھی اور کبھی کبھی اپنے سینے کا میل بھی صاف کرنے لگتی۔

"کائیں۔ کائیں۔ کائیں"

"کھوں۔ کھوں۔ کھوں"

"کھل۔ کھل۔ کھل۔"

مُرلی یہ سب آوازیں سُن رہی تھی۔ لیکن وہ ان سب سے بے خبر اپنی ایک کھوئی ہوئی چیز سامنے والے سرسوں کے کھیت میں ڈھونڈھ رہی تھی۔ سرسوں کے زرد زرد خوشنما پھول جو حدِ نظر تک پھیلے ہوئے تھے جوانی کی سرمستیوں سے سرشار جھوم رہے تھے اور گلے مل رہے تھے اور مُرلی کو مُنہ چڑا چڑا کر یہ کہتے ہوئے معلوم ہوتے "دیکھو ہم جوان ہیں۔ ہمارا جوبن تو دیکھو اور تم بڈھی ہو چکیں!" اور مُرلی کی حسرت زدہ نظریں بھیک مانگ رہی تھیں "للہ اپنی جوانی میں سے تھوڑی ہم کو بھی دیدو۔ ہم بھی کبھی جوان تھے اور تمہاری ہی طرح سرمستیوں سے سرشار۔"

للّتو کہار جو گاؤں بھر میں سب سے زیادہ بدمعاش مشہور تھا اوٹ پٹانگ تانیں اُڑاتا ہوا سڑک پر سے گذرا۔

چھوٹی نہ سمجھو بالا!!

مورا جوبن تو دیکھو!!

مُرلی کو دیکھ کر وہ رُک گیا اور اپنے چکّی کے پاٹ ایسے سینے کے گندے اور گنجان بالوں میں اپنی انگلیوں سے خلال کرتے ہوئے پوچھنے لگا "کیوں مہارانی۔ آج چُپ کیوں ہو؟"

"کچھ نہیں۔ آج ان کو کھانسی بہت آ رہی تھی۔"

"کھوں۔ کھوں۔ کھوں" جگدیش برابر کھانس رہا تھا۔ اور "پچ پچ پچ" مُنہ سے بلغم کے گولے نکال کر تھوک رہا تھا۔

"ارے وہ تو پانچ چھ برس سے پڑا ہے۔ اس کے پیچھے تم کیوں اپنی جوانی بتائے دیتی ہو؟" للّتو نے کہا۔

"کیا کروں بھیا! اپنی اپنی قسمت!"

"کبھی شیشہ میں اپنا مُنہ تو دیکھو۔ اب بھی وہ رنگ روپ اور چکنائی ......" للّتو یہیں تک کہنے پایا تھا کہ مُرلی نے اُسے ڈپٹ دیا۔ "چُپ! پھر وہی بدمعاشی کی باتیں!"

للّتو چلا گیا ہنستا ہوا اور تانیں لگاتا ہوا۔ گاؤں بھر میں وہ چھیلا مشہور تھا اور اپنی اس شہرت کی بنا پر اسے حق حاصل تھا کہ وہ جس عورت سے چاہے مذاق کرے اور اُس کی بات گدھے کی لات تھی۔ کوئی بُرا نہ مانتا۔

مُرلی کا ہاتھ اُس کے سر سے پھسل کر اُس کے گالوں پر آ گیا۔ واقعی وہ ابھی تک چکنے تھے۔ شاید ایک کھٹمل نے اس کی ران میں کاٹ لیا اور وہ جلدی جلدی کھجلانے لگی۔

"کھوں۔ کھوں۔ کھوں"؛ جگدیش برابر کھانس رہا تھا۔

"کیسا پاجی ہے یہ للّتوا" مُرلی بڑبڑائی لیکن دل ہی دل میں اس کا جی چاہتا کہ وہ مل جائے تو اُس کا مُنہ چوم لے۔

الیشری ایک پنجی دبائے ہوئے مٹکتی نکلی۔ آج اس نے زرد ساری پہنی تھی اور خود بخود اپنی جھانجھ بجا رہی تھی۔ اُس کی صورت دیکھتے ہی مُرلی جل بھُن کر کباب ہو گئی۔

"کہاں چلیں؟"

"کھانا دینے جا رہی ہوں کھیت پر" الیشری نے مسکرا کر کہا۔

"آج تو بڑا نکھار ہے؟"

"کل ہی یہ ساری لا دی ہے بازار سے کہتے ہیں مجھے میلے کچیلے کپڑے اچھے نہیں لگتے۔"

الیشری چلی گئی لیکن مُرلی کے سینے پر ایک موگری سی پڑی۔ یہ کمبخت تیلن اب تک اپنے آپ کو جوان سمجھتی ہے۔ یہ مُرلی سے پانچ چھ سال بڑی تھی۔ مُرلی نے ایک ٹھنڈا سانس لیکر اپنے دل کو سمجھایا "عورت کی جوانی تو اُس کے مرد پر ہے۔"

"کھوں۔ کھوں۔ کھوں۔ کھوں۔ کھوں" جگدیش پانچ دفعہ کھانسا

اور اُس نے مُرلی کو یاد دلا دیا کہ وہ پانچ سال سے اپنی بیوی کو بیوہ کر چکا اور اس کی جوانی کو گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔

شُینی اب تک نہا کر نہیں نکلی تھی۔ مُرلی بلبلا کر اُٹھ بیٹھی اور کُنڈی کھٹکھٹا کر چیخنے لگی۔ "ارے نکل! کب تک پانی لنڈھاتی رہے گی۔ کیا مر گئی؟ گھر کا کچھ کام دھندا ہے کہ نہیں؟"

"آتی ہوں ماں!"

"آتی ہوں کی بچی! چل دو گھڑے پانی رکھدے میں بھی ذرا نہا ڈالوں!"

"بس کپڑے بدل لوں!"

"آج کل کی چھوکری! کہیں کنواری لڑکیاں اتنی دیر تک نہاتی ہیں!" مُرلی بڑبڑاتی ہوئی پھر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئی۔

"کنواری لڑکی!" ان دو الفاظ نے پھر مُرلی کو خیالات کے سمندر میں ڈھکیل دیا اور اس پر ایک نئی دُنیا کے دروازے کھُل گئے۔ کنواری لڑکی — کنوار پتہ — چُھپ چُھپ کر شادی کی باتیں — دلاور — ننھا — کلو — گردین — باتیں اور گھاتیں۔ سُنسان ویرانے اور باغ — ارہر کے کھیت!! — چاندنی کی ملاقاتیں — اندھیری راتیں — خوف اور دہشت — پُر لطف سسکیاں!!

کھٹ سے دروازے کی کُنڈی کھلی اور چھم چھم کرتی شُینی ماں کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ تیرہ چودہ سال کا سن اور ہندوستان کے ضرورت سے زیادہ گرم آفتاب میں گدراتی ہوئی شُینی اب مکمل عورت ہو چکی تھی اور اس کا احساس اس کی ماں کو آج پہلی دفعہ ہوا۔ ماں نے اس کی طرف دیکھا اس طرح جس طرح کہ اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا اور اُس نے جوانی کے رُعب سے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں۔

"کیا کر رہی تھی اتنی دیر تک!"

"نہا رہی تھی!" شُینی نے ٹھنک کر کہا۔

مُرلی کو وہ دن یاد آئے جب وہ بھی کبھی خوب جی بھر بھر کر نہاتی لیکن جگدیش کی کھوں کھوں نے اُسے سوچنے کا موقع نہ دیا۔

"جا دو گھڑے رکھدے میں بھی نہا ڈالوں!"

"تم ہی رکھ لو" کہتے ہوئے شُینی ناچ کر گھوم گئی۔ اس کے بھیگے ہوئے بال اُسکی پیٹھ سے کمر تک بل کھا رہے تھے۔ "دیکھو ابھی بال ہی نہیں سوکھے پھر کنگھی کرنا ہے!"

"بڑی کام چور ہو گئی ہے تو! ارے تُو جوان میں بڈھی جلدی سے کھینچ کر رکھدے!" مُرلی نے کہا۔

"کون کہتا ہے تم کو بڈھی۔ مجھ سے زیادہ مضبوط ہیں تمہارے ہاتھ پاؤں۔ بالکل میری بڑی بہن معلوم ہوتی ہو!" شُینی نے مُنہ بنا کر کہا۔

مُرلی اس جواب سے خوش ہو گئی اور ایکدم سے اس کے جسم میں چستی اور جوانی کی لہر دوڑ گئی اور وہ اُٹھ بیٹھی۔

"کھوں۔ کھوں۔ کھوں!" جگدیش کھانس رہا تھا۔

"اچھا جا۔ اپنے باپ کے مُنہ میں پانی ڈالدے میں خود پانی بھر لوں گی۔ آج کل کی لڑکیوں کے نخرے تو دیکھو!" مُرلی نے کہا اور پانی بھرنے چلی گئی۔

مُرلی نہا کر نکلی تو وہ جیسے ہی دوسری تھی معلوم ہوتا جیسے اُس نے اپنے سارے دلدّر دھو ڈالے۔ پیچ رنگا دوپٹہ سُرخ تول کی چُست انگیا۔ بوٹی دار چھینٹ کا لہنگا۔ بالوں میں تیل اور مانگ اور ماتھے پر سیندور کی بندی۔

"اے ذرا کاجل لا دے!" مُرلی نے شُینی کو پکارا۔ شُینی کاجل لئے دوڑتی ہوئی آئی اور ماں کے ٹھاٹ دیکھکر دنگ رہ گئی۔

"اماں کہیں بارات میں جاؤ گی؟ میں بھی ساتھ چلونگی!"

"بارات میں کہاں جاؤنگی؟"

"پھر ایسے اچھے اچھے کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں۔ اماں تم بڑی سُندر معلوم ہوتی ہو۔ اب ایسے ہی کپڑے پہنے رہا کرو!" شُینی دفور محبت سے ماں سے چمٹ گئی۔

"تُو تو نظر لگا دے گی مجھکو!" مُرلی حد سے زیادہ مسرور تھی۔

"اماں چلو بابا کو دکھا دو یہ کپڑے!"

"کھوں۔ کھوں۔ کھوں!" جگدیش نے اپنی کھانسی سے ان دونوں کو یاد دلا دیا کہ ابھی اس کے مردہ جسم میں چند سانسوں یا چند کھانسیوں کی گنجائش باقی ہے۔ بیٹی کی فرمائش پر ماں نے مُنہ چڑا دیا۔ آج اس کے دل میں کچھ اور ہی اُمنگ تھی جوانی کا بُجھتا ہوا شعلہ ایک دفعہ پھر بھڑک اُٹھا تھا جو جگدیش ایسے خاکستر سے بالکل ہی غیر متعلق تھا۔

مُرلی گھر سے باہر نکلی تو سُینی سائے کی طرح اُس کے ساتھ ساتھ تھی۔ ماں کو بیٹی کی یہ بات سخت ناگوار تھی۔ لیکن کیا کرتی۔ بیٹی بھی بڑی ضدی تھی۔ کلو بنئے نے ان دونوں کو دیکھکر آنکھیں مٹکائیں "ارے آج تو غضب ڈھا رہی ہو بہن مُرلی" وہ بات کر رہا تھا ماں سے لیکن اس کی نظر تھی لڑکی پر۔ مُرلی نے سُینی کو جھنجھوڑ کر کہا "ارے جاتی کیوں نہیں ہے گھر۔ آٹا گوندھ دال اور آلو اُبالنے کو چڑھا دے" لیکن سُینی صرف ٹھنک کر رہ گئی۔ سُندر بزاز نے ماں بیٹیوں کا جوڑا دیکھکر سر ہلایا "ارے کہاں چلیں لالائن آج کیا ارادے ہیں؟" لیکن وہ بھی سُینی ہی کو تک رہا تھا۔ جگناتھ حلوائی نے مُرلی کو آواز لگائی "ارے دو دن آج لڈو۔ برفی" اور یہ کہہ کر ایک دونہ سینی کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

مُرلی اسی طرح چاروں طرف سے اپنا خراج حسن لیتی ہوئی گیندا لالائن کے دروازہ پر پہونچ گئی اور وہیں چورا ہے پر اپنی میزبان کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔ آج سڑک پر جو کوئی نکلتا اس کی طرف گھورتا اور مسکراتا اور اندر ہی اندر مُرلی مارے غرور کے اینٹھی جاتی۔ باتیں تو وہ کرتی گیندا سے لیکن اُسکی نظر رہتی راہ چلتوں پر۔ بس ایک سُینی سے اُسے کھٹکا لگا ہوا تھا جو اُس کے مال غنیمت میں سے آدھے سے زیادہ تقسیم کرا لیتی تھوڑی دیر بعد سُینی اُٹھکر چلی گئی اور مُرلی نے بڑے اطمینان کا سانس لیا۔ اب جو کچھ تھا مُرلی کا تھا۔

جس طرح مفلس کا قہقہہ بہت جلد اسکی مایوسیوں میں ختم ہو جاتا ہے اسی طرح مُرلی کے بناؤ سنگار کا دن بھی شام کی بڑھتی ہوئی تاریکیوں میں کم ہو گیا۔ چند گھنٹوں میں تماشہ ختم ہو گیا اور ایک بھٹکے ہوئے ایکٹر کی طرح مُرلی اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ دن کی روشنی کے ساتھ مُرلی کی جوانی بھی نظروں سے اوجھل ہو گئی اور وہ پھر ایک پینتیس سال کی ادھیڑ عورت اور ایک تپ دق کے مریض کی بیوی رہ گئی۔ خوابوں کی دُنیا اُجڑتے دیر نہیں لگتی۔

مُرلی نے جیسے ہی اپنے چھپّر میں قدم رکھا جگدیش کی "کھوں، کھوں،" نے اُس کا پُر جوش استقبال کیا۔ اور وہ سمجھ گئی کہ اب وہ اپنے گھر میں آ گئی۔ اندر مکان میں اُسے کسی غیر شخص کی آہٹ معلوم ہوئی اور وہ کھمبے کی آڑ سے جھانکنے لگی۔ سامنے سُینی چولھے کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور اُس کے پاس دیودت کھڑا بڑے رازدارانہ لہجہ میں کہہ رہا تھا "بس جیسے ہی ماتا جی سو جائیں تم کنڈی کھول دینا اور وہیں انگنائی میں لیٹ رہنا میں آ جاؤنگا" سُینی کچھ نہ بولی اور بدستور روٹی سینکتی رہی۔ دیودت پھر بولا "سُینی! تجھ بن تو مجھے دنیا کا کوئی مزا نہیں، بس کہیں بھاگ نہ چلیں ہم تم"

"میں کہاں جاؤنگی!"

"میرے ساتھ"

سُینی پھر چُپ رہی اور اس کی اس خاموشی نے مُرلی کو جیسے دھکا سا دیدیا اور وہ سامنے آ گئی۔ دیودت اور سُینی دونوں بوکھلا گئے۔ مُرلی نے گرج کر دیودت سے پوچھا "اندر کیسے آئے تم؟"

"چاچا کو دیکھنے آ گیا تھا اسوقت۔ ابھی ابھی کام سے چھٹی ملی" یہ کہتا ہوا دیودت تو جلدی سے چلا گیا لیکن سُینی کی خیر نہ رہی۔ مُرلی نے پہلے تو اُسے سینکڑوں گالیاں اور کوسنے دئے اور جب اس سے بھی دل کی بھڑاس نہ نکلی تو ایک ڈنڈا لیکر لگی اُس کو مارنے اور اُس وقت تک برابر مارتی رہی جب تک کہ خود اس کے ہاتھ پاؤں شل نہیں ہو گئے۔

"اسی دن کے لئے پالا تھا تجھے حرامزادی! ناک کاٹ لی تُو نے خاندان بھر کی۔ کیا مُنہ دکھاؤں میں کسی کو۔ بالشت بھر کی چھوکری اور یہ گُن۔ سینہ پر مونگ دلتی ہے تُو۔ پاپن اجا نکل ابھی گھر سے۔ یہ تیری ہی نحوست سے سارے گھر کو چھوت لگ گئی ہے" وہ بار بار بڑبڑاتی جاتی۔ سُینی لاکھ روئی پیٹی۔ بلبلائی۔ گڑگڑائی لیکن اس کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی اور بالآخر جب انتقام لینے کا کوئی دوسرا طریقہ باقی نہیں رہا تو مُرلی نے اس کی چوٹی پکڑ کر اُسکو گھسیٹتے ہوئے بھوسے کی کوٹھری میں بند کر دیا۔

مُرلی نے دیودت اور سُینی کا قصہ خوب نمک مرچ لگا کر جگدیش سے بیان کیا۔ لیکن وہ بیچارہ کچھ نہ بولا اور صرف "کھوں کھوں" کر کر کے اپنے پاس والی دیوار پر بلغم کے گولوں سے چاندماری کیا کیا۔ مُرلی غصّہ میں تو بھری ہی ہوئی تھی اُس نے جگدیش کو بھی خوب جلی کٹی سُنائیں "تم ہی آج گت کے ہوتے تو یہ دن دیکھنا کیوں نصیب ہوتا۔ بے باپ کی لڑکی پر کون ہاتھ رکھے۔ ماری ماری پھرتی ہے جس کا جس طرح جی چاہتا ہے بہلاتا پھسلاتا ہے۔ اِس سے تو یہی اچھا تھا کہ میں بیوہ ہوتی۔ جہاں سینگ سماتا چلی تو جاتی۔ عزت آبرو تو باقی رہ جاتی"

نقد و تبصرہ

ظالم محبت — محترمہ حجاب امتیاز علی کی وہ تصنیف جس کا ایک عرصے سے انتظار تھا اب شائع ہوگئی ہے۔ مصنفہ اپنے دلکش اسلوبِ بیان اور اچھوتے خیالات کی وجہ سے اُردو افسانہ نگاری میں ایک خاص مرتبہ رکھتی ہیں۔ اب تک آپ کے افسانوں اور مضامین کے کئی مجموعے شائع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں، لیکن اُمید ہے کہ "ظالم محبت" جو ایک مختصر ناول ہے سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کریگا۔ اردو افسانوں کے شائقین اُس دُنیا سے بخوبی واقف ہیں جو مصنفہ کی ذہنی تخلیق ہے، مگر یہ تخیلی دُنیا دراصل ہماری ہی دُنیا کا ایک حصّہ معلوم ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ روحی کی افسانوی دنیا کی ترکیب میں شعریت، رومان، رنگینی اور دلآویزی کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس پر مصنوعی ہونے کا کہیں شک نہیں گزرتا۔ اس افسانوی دُنیا کے بسنے والے گڈے گڑیاں معلوم نہیں ہوتے بلکہ ہمیں جیسے گوشت پوست کے انسان ہیں۔ مگر ذی مرتبت و ذی ثروت۔ اور ہم ان کرداروں سے، چچا لوث، سر ہارلی، روحی، جسوتی، ڈاکٹر گار، بوڑھی حبشن زوناش، وغیرہ سے اس درجہ مانوس ہو چکے ہیں کہ اب انہیں دیکھکر ہمیں اچنبھا نہیں ہوتا۔ بلکہ جب کبھی ہم ان کے متعلق کچھ پڑھتے ہیں تو ان سے مل کر ہمیں وہ خوشی حاصل ہوتی ہے جو کسی ہمدمِ دیرینہ سے مل کر حاصل ہوتی ہے۔ "ظالم محبت" میں یہ سب کردار موجود ہیں اور ان کے علاوہ اور بھی ہیں۔ موضوع جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے "محبت" ہے۔ اور روحی کی افسانوی دُنیا میں یہ جذبہ اپنی پوری شدت سے کارفرما ہے۔ منیر اور منصور کی محبت، منیر اور جسوتی کی محبت، منصور اور جسوتی کی محبت، وہی ابدی مثلث ہے مگر "ظالم محبت" میں مصنفہ نے اسے حیرتناک بنا دیا ہے۔

کتاب میں بے شمار نشتر ہیں۔ محبت کے دلکش مناظر، احساسِ فرض، انکار، دلدوز کیفیات، اور بالآخر گھل گھل کر بھیانک موت۔ منظر کشی کے بہت عمدہ نمونے اس کتاب میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ کتاب کے آخری اوراق میں سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"یخ بستہ اداس پہاڑیوں اور صنوبر کے گونگے درختوں پر کچھ ایسی ماتمی افسردگی چھائی ہوئی تھی، جیسے عموماً دق کے مریضوں کے چہروں پر نظر آتی ہے۔ ایک ایک چیز سے ہویدا ہو رہا تھا کہ ہم وہاں پہونچ رہے ہیں جہاں موت اور حیات کی کشمکش میں بیمار روحیں بڑی بے بسی سے سسکا کرتی ہیں، اور پھر موت ان کا انجام ہوتا ہے۔ موت کی منتظر روحوں کے مسکن کا یہ راستہ ہم تینوں نے المناک خاموشی میں کاٹا۔ پھر.... یکلخت ایک ناہموار پہاڑ پر وہ سفید دیواروں والا اُداس گھر نظر آیا۔ سینو ٹوریم۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ ایک بہت بڑی قبر ہے جس کے اندر سینکڑوں مُردے موت کی آغوش میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ میں چونک سی پڑی۔ کیونکہ ہواؤں میں جراثیم کو مارنے والی دواؤں کی تیز بو کی لپٹیں آنے لگی تھیں۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو سورج اپنے طلائی کفن کو پھاڑ کر زرد چہرہ باہر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا پھر میری نظر نیچے گئی۔ صنوبر کی قطاروں کے قریب پہاڑ پر مجھے ایک انسان نظر آیا، جو انسان سے زیادہ انسانی پنجر کہلانے کا مستحق تھا۔ زرد.... اور ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ اپنے سکڑے ہوئے سینے پر دو سوکھے سوکھے ہاتھ رکھے بڑی تکلیف سے کھانس رہا تھا۔"

پوری کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہاتھ سے چھوڑی نہیں جاتی۔ کاغذ دبیز اور چکنا۔ ضخامت (۲۴۴) صفحات۔ مجلد۔ رنگین گرد پوش۔ قیمت دو روپے محصولڈاک ۱۲/۔ ساقی بُک ڈپو۔ دہلی۔ سے طلب کی جاسکتی ہے۔ "یشش"

صنعت و حرفت کے قیمتی راز — از جناب حامد صاحب۔ یہ ایک بیش قیمت کتاب ہے جس میں مشہور تجارتی مرکبات کے اجزا اور نسخے درج ہیں۔ اس کتاب کے گیارہ حصّے ہیں اور ہر حصّہ نہایت قیمتی معلومات کا حامل ہے۔ آج کل کی بے روزگاری میں بیکاروں کیلئے یہ کتاب بہت کار آمد ثابت ہوگی۔ اگر کتاب کی بتائی ہوئی ہدایتوں پر عمل کیا جائے اور تجارتی اُصول پر کسی صنعت کو اختیار کیا جائے تو کثیر منافع کی اُمید بھی کی جاسکتی ہے۔ کتاب کا دوسرا اڈیشن پیشِ نظر ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ ضخامت (۲۸۸) صفحات۔

قیمت عمر- ملنے کا پتہ:- سیوا بک ڈپو۔ پوسٹ بکس ۲۶۸ لاہور۔

نقشِ ناتمام:- جناب سحر رامپوری نے اپنا پسندیدہ کلام چھوٹی سی کتاب کی صورت میں "نقشِ ناتمام" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس میں (۳۲) صفحات پر نظمیں اور (۲۸) صفحات پر غزلیں شائع کی گئی ہیں۔ آخر میں چند قطعات اور متفرق اشعار درج کئے گئے ہیں۔ کلام پاکیزہ اور موثر ہے۔ قیمت ۶ر ملنے کا پتہ:- مرزا عباس علی بیگ۔ باغیچہ غازی مظفر خاں۔ رامپور اسٹیٹ۔ "ش"

آدھ گھنٹے میں ہندی:- جدت طراز ادیب عظیم بیگ چغتائی کی نرالی اپچ کا نیا نمونہ "آدھ گھنٹے میں ہندی" ہر پڑھے لکھے کے دیکھنے کی چیز ہے۔ مصنف کے ساتھ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ آدھ گھنٹے میں ہندی پڑھنی آجاتی ہے ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ہندی سیکھنے کے سب سے آسان قاعدے اسی کتاب میں درج ہیں۔ جن حضرات کو ہندی سیکھنے کا شوق ہو وہ اس کی مدد سے ہندی سیکھ سکتے ہیں۔ چار آنے کے ٹکٹ بھیجکر دفتر کتابت جودھپور سے یہ کتاب منگائی جا سکتی ہے۔ "ش"

پسِ پردہ:- جناب اختر بریلوی کے کلام جدید کا مجموعہ ہے۔ کتاب چند ابواب میں تقسیم کی گئی ہے:- (۱) ذکر و فکر۔ (۲) بادۂ تلخ۔ (۳) طنز لطیف اور (۴) حسن و نظر۔ یہ سب نظمیں جدید رجحانات کی حامل ہیں اور ترقی پسند عنصر ان میں شامل ہے۔ بریلی کے متعلق اس میں بیشتر نظمیں ہیں اور یہی نظمیں بطورِ خاص مطالعہ کے لائق ہیں۔ "حافظ رحمت خاں" اور "رام گنگا" دو پرانی نظمیں بھی اس مجموعے میں شامل ہیں۔ بعض نظموں میں تلخی حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اسے کم کرنے کی ضرورت ہے۔ ع:-

تلخی سہی کلام میں لیکن نہ اسقدر!

لیکن جب ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب نظمیں صرف پندرہ دن میں کہی گئی ہیں تو اس طرح کی لغزشوں کو نظر انداز کر دینا ہی مناسب نظر آتا ہے۔ بحیثیت مجموعی کتاب بہت دلچسپ ہے اور شاعر کی ذہانت کی داد نہ دینا ظلم ہے۔

شروع میں کئی دیباچے شامل ہیں جن کی مطلق ضرورت نہیں تھی۔ صرف کاظمی صاحب کا دیباچہ کافی تھا۔ کتاب کا نام کبھی بدلنے کی ضرورت ہے۔ اس نام کی ایک معروف کتاب پہلے سے موجود ہے جو اسم بامسمیٰ ہے۔ ضخامت (۸۴) صفحات۔ قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ:- میزان الادب۔ ذخیرہ اسٹریٹ۔ بریلی۔ "ش"

نمودِ زندگی:- اس نام سے مولوی سید علی منظور صاحب حیدرآبادی کے کلام کا دوسرا مجموعہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن نے شائع کیا ہے۔ شروع میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا تعارف نامہ اور اس کے بعد شاعر نے عرض حال کے عنوان سے اپنے مختصر حالات تحریر فرمائے ہیں۔ سید علی منظور صاحب کا کلام ایک عرصے سے ملک کے موقر رسالوں کے لئے وجہِ زینت بنا ہوا ہے اور ان کے کلام سے ملک کا بیشتر طبقہ اچھی طرح واقف ہے۔ چنانچہ ایک نظم میں اپنی ذات سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

کر گئے اُستاد دنیا سے سفر آ گئی ہے ان کی جگہ خالی نظر
لیکن اپنا رُخ اُدھر ہرگز نہ کر بیٹھ تو خود اپنی کرسی دیکھ کر
دل سے شوقِ جانشینی دُور کر
قدر اپنی اے علی منظور کر

ان کے کلام میں اکثر مقامات پر سادگی ہی نہیں بلکہ ضرورت سے زائد سادگی پائی جاتی ہے۔ اس مجموعے میں تاروں بھری رات، صبح چمن، اثر انقلاب، آہ وحید العصر (مرثیہ سر محمد اقبال مرحوم۔) نہایت اچھی نظمیں ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ نظمیں شیخ سالوس کے متعلق ہیں جو بہت دلچسپ ہیں۔

یہ دیدہ زیب مجموعہ (۳۱۲) صفحات پر مشتمل ہے اور عہ میں سب رس کتاب گھر، رفعت منزل۔ خیرت آباد۔ حیدرآباد۔ دکن سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ "ان۔ س"

چمنستان:- دہلی سے یہ رسالہ ماہ بماہ آغا سرخوش کی ادارت میں تقریباً ایک سال سے شائع ہو رہا ہے۔ آغا سرخوش آغا شاعر قزلباش مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ خوش ذوق و خوش فکر نوجوان ہیں۔ رسالہ کی ترتیب و تہذیب سے اُن کی شائستگیِ مذاق ظاہر ہے۔ مضامین کا معیار بلند ہے اور بعض بہت اچھے لکھنے والے اس رسالہ کے مستقل قلمی معاون ہیں۔ افسوس کہ آغا سرخوش نے ایسے زمانے میں پرچہ جاری کیا کہ کاغذ کی گرانی نے ایڈیٹروں کو بے دست و پا بنا دیا ہے۔ تاہم ان کی جواں ہمتی لائقِ ستائش ہے کہ بہت زیادہ مالی زیر باری گوارا کرکے اُنہوں نے چمنستان کا ایک خاص نمبر "شاعر نمبر" کے نام سے مارچ میں شائع کیا۔ یہ خاص نمبر اردو کے مشہور شاعر افسر الشعرا آغا شاعر مرحوم کی ادبی اور نجی زندگی کا بے مثل مُرقع ہے۔ شاعر مرحوم جملہ اصناف سخن پر حاوی تھے۔ غزل میں اپنے اُستاد داغ کا رنگ ایسا اُتارا کہ داغ کے کسی اور جانشین یا شاگرد کو اس حد تک کامیابی نہ ہو سکی۔ حضرت شاعر نثر بھی

شگفتہ اور ٹکسالی لکھتے تھے۔ افسوس کہ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ وہ ہم سے بچھڑ گئے۔ چمنستان کا "شاعر نمبر" کامیاب کہلانے مستحق ہے کہ شاعر مرحوم کے جملہ کمالات و ذاتی صفات کا آئینہ دار ہے۔ اُمید ہے کہ اردو ادب کے سرپرست چمنستان کی قدر کر کے اپنی خوش ذوقی کا ثبوت دینگے سالانہ چندہ دو روپے۔ فی پرچہ ۳ر پتہ۔ اڈیٹر چمنستان، نکلسن روڈ۔ دہلی۔

"ش"

ساقی بک ڈپو کی دلکش کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
کولتار	قیمت ۸ر	تفویض	قیمت ۸ر	نرگس	قیمت عہ
روح ظرافت	۱۲ر	فرزند سرحد	۵ر	رقاصہ	عہ
روح لطافت	۱۴ر	قرآن اور پردہ	عہ	طلسم ساحری	عہ
چچی	۱۲ر	حدیث اور پردہ	عہ	ریڈیو ڈرامے	عہ
لفٹننٹ	۶ر	نجم السحر	۸ر	لال قلعہ کی ایک جھلک	عہ
خطوط کی سٹینو گرافی	۸ر	تائیں	۸ر	دلی کا آخری دیدار	۱۲ر
کمزوری	عہ	سلامیہ	۸ر	چار چاند	۸ر
شہزوری	۸ر	ہیرو دیاس	۱۲ر	کہکشاں	۸ر
چغتائی کے افسانے	۸ر	دانتے کا جہنم	۱۲ر	ظالم محبت	۸ر
مضامین چغتائی	۱۲ر	چنگیز خان	۱۲ر	نغمات موت	۶ر
کھرپا بہادر	عہ	انطونی کلا بطرہ	عہ	تصویر کا دوسرا رُخ	عہ
فل بوٹ	عہ	ہیملٹ	عہ	ترکی میں مشرق	
کیوں اور کیسے	۱۲ر	نغمۂ نور	عہ	مغرب کی کشمکش	۸ر
دیکھا جائے گا	عہ	کیف و سرور	عہ	فرانسیسی افسانے	۴ر
جنت کا بھوت	۱۲ر	سحر بنگال	۸ر	دوشیزۂ صحرا	عہ
ملفوظات ٹامی	۱۲ر	چندرا موہنی	عہ	فاوسٹ	۸ر
شریر بیوی	۸ر	نجم نوری	۱۲ر	سرگذشت عروس	۸ر
حنا نمبر	للعہ	سلسلے	۸ر	نرگس جمال	عہ
مرزا جنگی	۱۲ر	تعلیم زدہ بیوی	۸ر	ریزۂ مینا	۲ر
قرض	۵ر	پروین و ثریا	عہ		

ملنے کا پتہ

ساقی بک ڈپو۔ دہلی۔

افسانہ نمبر

ساقی کا افسانہ نمبر حسب دستور جولائی کے پہلے ہفتے میں شائع ہوگا۔ مندرجۂ ذیل حضرات کے افسانے اس میں شامل ہونے کی اُمید ہے:۔

مولوی عنایت اللہ دہلوی؛ لطیف الدین احمد اکبرآبادی؛ ایم اسلم؛ ڈاکٹر اعظم کریوی؛ صادق الخیری دہلوی؛ حجاب امتیاز علی؛ سعادت حسن منٹو؛ کرشن چندر؛ انصار ناصری؛ ممتاز مفتی؛ عصمت چغتائی؛ راجندر سنگھ بیدی؛ پروفیسر محمد مُسلم؛ اوپندر ناتھ اشک؛ آوارہ؛ دیوندر ستیارتھی؛ قیسی رامپوری؛ وجاہت سندیلوی؛ بلونت سنگھ؛ سید رفیق حسین؛ جیندر ناتھ؛ احمد ندیم قاسمی؛ مدھوسودن؛ ڈاکٹر نصیر الدین؛ بھارت چند کھنہ؛ ریاض رؤفی؛ ساون مل ترکھا؛ اسعد گیلانی؛ شمشیر سنگھ نرولا؛ شفیق الرحمٰن؛ عصیم بیگ چغتائی؛

مندرجہ ذیل حضرات کی افسانوی نظمیں شامل ہونگی۔

امین حزیں؛ کوکب شاہجہانپوری؛ شاد عارفی؛ فرحت کانپوری؛ بہزاد لکھنوی؛ سید علی منظور؛ راحت سعید؛ تابش دہلوی؛ مخمور جالندھری؛ ماہر القادری؛ صفیہ شمیم؛

یہ فہرست ابھی نامکمل ہے۔ اُمید ہے کہ جون کے ساقی میں ہم زیادہ مکمل فہرست پیش کر سکیں گے۔

"افسانہ نمبر" کی قیمت ایک روپیہ ہوگی۔ مستقل خریداروں سے اسکی قیمت علیحدہ نہیں لی جائیگی۔

مجرّب اور خالص ادویہ

اگر آپ کو مجرب اور خالص ادویہ کی ضرورت ہے تو آپ ہمارے دواخانہ سے طلب کریں۔ ہر قسم کی ادویہ ہم آپ کو مہیا کر کے دینگے۔ اسکے علاوہ ہمارے دواخانہ میں خاص نسخے بھی تیار ہوتے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:۔

تریاق کبیر یہ گھر کا ڈاکٹر ہے۔ سر درد، پیٹ درد، دانت کے درد، گلے کے درد، سینہ کے درد، اسہال، سوء ہضمی، ہیضہ وغیرہ کے مریضوں کو اس دوا کے لگانے یا پلانے سے فوراً ہی فائدہ ہوتا ہے۔ بچھو، بھڑ، سانپ کاٹے تو اسکے زخموں کے لئے یہ تریاق ہے۔ بخار وغیرہ میں بھی اس سے فائدہ ہوتا ہے۔ عام مرضوں میں ڈاکٹر کی ضرورت ہی نہیں رہتی ہے۔ ہر گھر میں اس کا موجود ہونا نہایت ہی ضروری ہے۔ قیمت چھوٹی شیشی ۸ر درمیانی شیشی عہ بڑی شیشی ۱۲ اسکے اثر کے متعلق ذیل کا سرٹیفکٹ ملاحظہ فرمائیں:۔

جناب سید جلال الدین صاحب کشمیری تحریر فرماتے ہیں:۔ "آج عرصہ دو سال سے معدے کی سخت تکلیف تھی جس کی وجہ سے ایک چھٹانک غذا ہضم ہونی مشکل ہو گئی تھی۔ لیکن دواخانہ خدمت خلق قادیان سے تریاق کبیر بطور نمونہ لیا۔ اسے شروع کئے چند دن ہی گذرے ہونگے کہ اس نے حیرت انگیز فائدہ کیا۔ کھانا وغیرہ بخوبی ہضم ہو جاتا ہے اور خوب بھوک لگتی ہے۔ اور خدا کے فضل سے جو بدنی سستی کمزوری تھی اس میں بھی فائدہ ہو رہا ہے۔"

سرمہ ممیرا خاص یہ سرمہ ایک پرانے اور مجرب نسخہ کے مطابق تیار کیا گیا ہے اور پرانے آشوب چشم خصوصاً جو نزلہ یا دماغی یا اعصابی کمزوریوں کی وجہ سے ہو۔ اسی طرح نظر کی کمزوری اور دھند کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہوا ہے۔ پرانے ککروں اور آنکھوں کی سرخی کیلئے مفید ہے۔ قیمت فی تولہ عہ ۶ ماشہ عہ ۳ ماشہ ۱۲ر

سرمہ اکسیر چشم یہ سرمہ آنکھوں کی سب بیماریوں کے لئے مفید ہے۔ خصوصاً نیز اور پرانے ککروں کے لئے بہت ہی مفید ہے۔ نیز ناخنہ وغیرہ امراض کے لئے مفید ہے۔ قیمت فی تولہ عہ ۶ ماشہ عہ ۳ ماشہ ۱۲ر
ان کے اثر کے متعلق ذیل کے سرٹیفکٹ ملاحظہ فرمائیں:۔

مکرمی جناب عبد الرحمٰن صاحب چک ۱۱۸ ضلع لائلپور سے تحریر فرماتے ہیں کہ "آپ سے سرمہ ممیرا خاص بطور نمونہ والدہ صاحبہ کیلئے منگوایا تھا جس سے انہیں ککروں کی شکایت بفضل خدا آرام ہے۔ برائے مہربانی فی الحال ۳ ماشہ سرمہ ممیرا خاص قیمتاً اور بھیجدیں۔"

(۲) مکرمی جناب محمد عارف صاحب ایل۔ ایم۔ ایس۔ ایچ تیولہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ "آپ سے سرمہ اکسیر چشم جو بطور نمونہ منگایا تھا ہم نے ایک مریض کو استعمال کرایا جس سے اسکو بہت فائدہ ہوا ہے۔ سرمہ اکسیر چشم واقعی ہی اکسیر چشم ثابت ہوا ہے۔"

ہمیں مندرجہ بالا ادویہ اور اپنی دیگر ادویہ کیلئے مقامی ایجنٹوں کی ضرورت ہے جنہیں معقول کمیشن دیا جائیگا۔ جو صاحب یہ نفع مند کام کرنا چاہیں وہ بھی ذیل کے پتہ پر خط و کتابت کریں۔ (نوٹ) دوسری خاص ادویہ کے لئے ہماری فہرست منت طلب کریں۔

ملنے کا پتہ:۔ **دواخانہ خدمت خلق۔ قادیان۔ پنجاب**

دس ہزار روپیہ مفت انعام

امرتسر میں سونا دو (۲) روپے تولہ ہو گیا

ناظرین دیکھئے اس سونے کے متعلق دنیا کیا کہتی ہے۔ جس گھر میں یہ اصلی **امریکن نیو گولڈ** گیا وہاں سے دوبارہ سہ بارہ فرمائش آئی۔ یہ سونا ایک لاجواب چیز ہے۔ اصلی سونے اور اس سونے میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔

جناب لالہ رام پرکاش صاحب ساہنی دہلی سے ۲۵ نومبر کو تحریر فرماتے ہیں آپ کا **امریکن نیو گولڈ** کا پارسل ملا۔ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی چیز واقعی کمال کی ہے آپ کے امریکن نیو گولڈ اور اصلی سونے میں کوئی فرق نہیں آپ نے اس نئی چیز کو تیار کر کے دنیا کی سب سے بڑی ضرورت کو پورا کر دکھایا ہے۔ پندرہ۱۵ تولہ سونا فوراً میرے دوست کیلئے ارسال کر دیویں۔ اس کے بعد آپ کو اور بھی آرڈر دیا جاویگا۔ یہ سونا کسوٹی پر اصلی سونے کا رنگ دیتا ہے اصلی سونے کی طرح کوٹا اور پگھلایا جاتا ہے۔ بالکل اصلی سونے کے برابر ہے ہوشیار سے ہوشیار صراف بھی مشکل سے پہچان کر سکتا ہے اس کے بنے ہوئے زیورات ہر جگہ پسند کئے جا رہے ہیں۔ اس سے ہر قسم کے زیورات آجکل کے فیشن کے مطابق تیار ہو سکتے ہیں۔ مندرجہ بالا فرمائش کو غلط ثابت کرنے والے کو دس ہزار روپیہ نقد انعام دیا جائیگا۔ قیمت صرف مشہوری کی خاطر ایک تولہ دو روپیہ (عہ) تین تولہ پانچ روپے آٹھ آنہ۔ چھ تولہ دس روپے۔ پندرہ۱۵ تولہ بائیس روپیہ۲۲ چالیس تولہ پچاس روپیہ (ضروری نوٹ) ہر تین تولہ کے خریدار کو پیکنگ خرچ مفت چھ تولہ یا اس سے زیادہ منگوانے والے خریدار کو محصول ڈاک و پیکنگ دونوں بالکل معاف۔ پندرہ۱۵ تولہ کے خریدار کو ایک عدد اصلی گھڑی بالکل ٹھیک وقت دینے والی چابی ۲۴ گھنٹہ گارنٹی دس سال مفت بطور انعام دی جاویگی۔

گارنٹی: اگر پسند نہ ہو تو قیمت فوراً واپس ہوگی۔ جلدی منگوالیں ورنہ ختم ہونے پر مایوس ہونا پڑے گا۔

ملنے کا اصلی پتہ:- **میسرز امریکن بمبئی۔ کمپنی بمبئی۔ اوبحس** $\frac{27}{2}$ **ایس ڈی۔ امرتسر (پنجاب)**

ساقی ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے۔
چندہ سالانہ پانچ روپے ششماہی تین روپے
مع محصول ڈاک۔ ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ

جرعات

ہر سال ساقی کے دو خاص نمبر شائع ہوتے ہیں۔ مستقل خریداروں سے ان کی قیمت الگ نہیں لی جاتی۔ فی پرچہ چھ آنے

جلد ۲۳ | ساقی دھلی۔ بابت ماہ جون سنہ ۱۹۴۱ء | نمبر ۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

ساقی کی زیرِ نظر اشاعت میں بہت عمدہ مضامین یکجا کیے گئے ہیں۔ عنایت اللہ صاحب کا ترجمہ ادرامین حزیں کی ولولہ انگیز نظم ساقی کی امتیازی خصوصیت بن چکی ہے۔ مظہر عزیز نے ایک ایک طویل مدت کے بعد بزمِ ساقی میں شرکت کی ہے۔ علامہ اقبال کے متعلق آپکا بصیرت افروز مقالہ درج ساقی ہے۔ اوپندر ناتھ اشک نے ایک ایک دلکش ڈرامہ لکھا ہے۔ دیوندر ستیارتھی نے اپنے خاص اسلوب میں شانتی نکیتن کے متعلق بعض باتیں بڑے پتہ کی کہی ہیں۔ ڈاکٹر نصیر الدین کا افسانہ ان کی جدت پسندی کا اچھا نمونہ ہے۔ وجاہت سندیلوی نے ایک افسانے کے بدلے [illegible] لکھا ہے۔ اس طرز کے مضامین زیادہ لکھنے کی ضرورت ہے۔ سید رفیق حسین کا مضمون دلچسپ ہے۔ مہندر ناتھ نے چین و جاپان کی جنگ کے متعلق دلدوز واقعات کا ایک طویل افسانہ لکھنا شروع کیا ہے جو ساقی میں بالاقساط شائع ہوتا رہے گا۔ شیر محمد اختر کے افسانے ناظرین ساقی میں مقبولیت حاصل کر رہے ہیں اور یہی آن کی عمدگی کی دلیل ہے۔ "ہائی سو" کے مضامین ترقی پسند جذبہ سے معمور ہوتے ہیں۔ "کھڑکی" ہرندر ناتھ چٹوپادھیا کے ایک پاکیزہ ڈرامے کا ترجمہ ہے۔ مجتبیٰ حسین پہلی مرتبہ شریک ہوئے ہیں، امید ہے کہ ان کا مختصر افسانہ پسند کیا جائے گا۔ عبدالرشید صاحب کا جاپانی ڈرامہ اس اشاعت میں ختم ہو رہا ہے۔ ناظرین ساقی اگر اس کی پوری قسطیں ایک بار پھر ملا کر پڑھیں تو ان کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔ سعادت حسن منٹو کا افسانہ ایک لطیف طنز ہے اُمید ہے کہ خوش ذوق ناظرین ساقی اس کے مطالعہ سے لطف اندوز ہونگے۔ حصۂ نظم میں احمد ندیم قاسمی، شاد عارفی، تمنو رجالندھری، ضمیر جعفری، ناشاد، ماہر القادری، تابش دہلوی، فرحت کانپوری، راحت سعید اور صفیہ شمیم کا تازہ کلام شریک ہے۔

افسانہ نمبر مضمون نگار حضرات کی مہربانی سے ساقی کا افسانہ نمبر تقریباً مکمل مرتب ہو چکا ہے۔ افسانہ نگاروں کے نام آپ کو اسی اشاعت میں کسی اور صفحے پر نظر آئیں گے۔ کوشش کی گئی ہے کہ اُردو کے بہترین افسانے اس اشاعت میں شامل ہوں اور بحمداللہ ہماری کوشش کامیاب رہی۔ اُمید ہے کہ ناظرین ساقی افسانہ نمبر کے مضامین کو اعلیٰ درجے کے افسانوں کا بے مثل مجموعہ پائینگے۔

افسوس ہے کہ عدم گنجائش کی وجہ سے ایک ساقی میں نقد و تبصرہ نہیں کیا جا سکا۔ پبلشرز سے ہم معذرت خواہ ہیں کہ افسانہ نمبر میں بھی ہم اس فرض کو ادا نہیں کر سکیں گے۔ اُمید ہے کہ اگست کے ساقی میں بیشتر مطبوعات پر تبصرہ کیا جا سکے گا۔

"شاھد"

ضروری اعلان

جو مسودے ساقی کے لئے موصول ہوتے ہیں اُنہیں حفاظت سے رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاہم اس بارے میں دفتر ساقی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا۔ اس لئے اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھا کیجئے۔

جو مضامین قابل اشاعت قرار پائیں گے صرف انہی کے بارے میں مزید مراسلت کی جائے گی۔

مضامین ایڈیٹر ساقی کے نام بھیجنے چاہئیں۔

ساقی ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو بھیجدیا جاتا ہے۔ پرچہ نہ پہونچنے کی شکایت ۱۵ تاریخ تک کرنی چاہیئے۔ اس کے بعد دوبارہ پرچہ نہیں بھیجا جائیگا۔ خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے ورنہ تعمیل ارشاد ممکن نہ ہوگی۔ جواب طلب امور کیلئے محصول ڈاک بھیجنا ضروری ہے۔

نمونے کا پرچہ مفت نہیں بھیجا جائے گا۔ چھ آنے کے ٹکٹ بھیجکر نمونہ منگایا جا سکتا ہے۔

نیل کی ناگن

کتاب ثانی
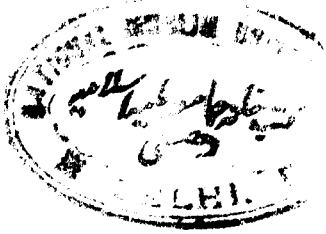
ہرماکس کا زوال

پہلا باب

عمِ نیم ہط کا ہرماکس کو رخصت کرنا۔ ہرماکس کا شہر اسکندریہ میں وارد ہونا۔ سیپا کی ہدایتیں۔ ملکہ کلا ابطرہ کا جلوس میں نکلنا۔ دیبی آئی سیس کا لباس زیب تن ہو۔ ہرماکس کا حبشی شمشیر باز کو مغلوب کرنا۔

اب تیاری کی مدتِ دراز ختم ہو چکی ہے۔ وقت قریب آن لگا ہے۔ دیبی آئی سیس کے دیدار کی ابتدائی رسمیں ادا کر چکا ہوں اور میرے سر پر تاج بھی رکھا جا چکا ہے۔ عوام الناس میرے حال سے واقف نہیں۔ وہ صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ میں دیبی کا ایک کاہن ہوں۔ لیکن ہزاروں آدمی ایسے بھی مصر میں ہیں جو مجھے دل میں فرعون سمجھ کر میرے سامنے جھکنے کو تیار ہیں۔ وقت قریب ہے، میری روح ورواں منتظر ہے کہ کب وہ وقت آئے، اور غیروں کو اپنے ملک سے خارج کیا جائے۔ کیونکہ اس کام کے لئے وہ سخت منتظر تھے تاکہ مصر کو ان سے آزاد کریں اور میں اس تخت پر بیٹھوں جو درحقیقت میرا ورثہ ہے اور اپنے خداؤں کے بت خانوں کو ان کی گندگی سے پاک کروں۔ جو کشمکش یا ہنگامہ اس سے ہوگا اسی میں شرکت کرنے سے میں خوش تھا۔ اور جو نتیجہ اس کا ہونے والا تھا اس میں بھی مجھے ذرا شبہ نہ تھا۔ ایک دن آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو فتح وفیروزی کو اپنی پیشانی پر لکھا دیکھا۔ مستقبل نے میرے قدموں کے آگے وہ راستہ پھیلا رکھا تھا جو سیہور کی سطح کی طرح دھوپ میں چمک رہا تھا۔ میں نے ماتا آئی سیس سے کلام کیا۔ بت خانوں اور ہیکلوں کے بہت سے نقشے سوچے۔ بڑے بڑے قاعدوں اور قوانین پر غور کیا جو میں اپنی رعایا کی دولت واقبال کی ترقی کے لئے وضع کرنے والا تھا۔ کانوں میں مبارکباد کے وہ نعرے سنائی دینے لگے جو میری تخت نشینی پر ہر ایک کی زبان سے بلند ہونگے۔ لیکن پھر بھی مجھے ابو تلیس میں کچھ دنوں اور قیام رکھنے کا حکم ہوا۔ تاکہ میرے سر کے بال جو منڈوا دئے گئے تھے پھر بڑھکر سیاہ بھونرا سے ہو جائیں۔ اس دوران میں میں نے بہت سی مردانہ ورزشوں میں مشق بہم پہونچائی اور ہتھیاروں کا چلانا بھی خوب سیکھ لیا۔ اور ایک خاص مقصد کے لئے جیسا کہ آگے چلکر معلوم ہوگا، میں نے مصریوں کا علم سحر اور ستاروں کو دیکھکر انسان کی قسمت کا حال معلوم کرنے میں بھی بڑی دستگاہ پیدا کی۔ ان چیزوں میں مجھے پہلے ہی سے بڑی مہارت تھی۔

اب جو تدبیر سوچی گئی تھی وہ یہ تھی کہ کچھ دنوں سے میرے ماموں سیپا نے یہ ظاہر کر کے کہ ان کی صحت خراب ہوتی جاتی تھی وہ انو کے بتخانے سے چلے گئے۔ اور وہاں سے اٹھکر وہ اسکندریہ میں ایک مکان میں جا رہے تھے کہ وہاں سمندر کی ہوا سے توانائی آجائے۔ اور وہاں کے مشہور و معروف میوزیم کے عجائبات بھی دیکھیں اور کلا ابطرہ کے دربار کے حالات بھی معلوم ہوتے رہیں۔ قرار یہ پایا تھا کہ میں اپنے ماموں سیپا سے اسکندریہ میں ملوں جہاں یہ کل منصوبہ پختہ ہو کر عملی شکل اختیار کریگا۔ آخرکار جب بلاوا آیا تو تیاری تو سب پہلے ہی ہو چکی تھی، میں نے سفر کا قصد کیا۔ پہلے میں اپنے والد کے کمرے میں گیا کہ چلتے وقت ان سے دعائے خیر سنوں۔ مگر میرے بوڑھے باپ آج بھی اسی طرح بیٹھے تھے جیسے کہ اس دن انہیں بیٹھا دیکھا تھا جبکہ میرے شیر کے مارنے پر وہ مجھ پر خفا ہوئے تھے۔ آج بھی ان کی لمبی سفید ڈاڑھی پتھر کی میز پر اسی طرح رکھی تھی جیسے کہ اس دن تھی۔ ہاتھ میں چند پاک اور مقدس مکتوب تھے۔ جب میں کمرے میں گھسا تو "اچھا فرعون" کہکر انہوں نے مجھے تعظیم دینے کو اٹھنا چاہا۔ مگر میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور انہیں تعظیم نہ دینے دی۔

"باباجان آپکے لئے یہ مناسب نہیں ہے۔"

میرے باپ نے جواب دیا "نہیں۔ بیشک مناسب ہے۔ اپنے بادشاہ کو تعظیم دینے کے لئے میرا جھکنا ضروری اور مناسب ہے۔ لیکن اچھا جیسی تمہاری مرضی۔ اچھا ہے۔ ہرماکس تم جاتے ہو میری دعائیں

تمہارے ساتھ رہیں۔ بیٹا، کاش وہ ارباب فلک جن کی عبادت میں میں نے اپنی ساری عمر بسر کی ہے اتنا کرتے کہ مجھے آئندہ جو کچھ گذرنے والا ہے اُس کا حال معلوم ہوجاتا۔ لیکن باوجود تمام عقل و دانش کے جو میں رکھتا ہوں مجھے مستقبل کا کچھ حال نہ کھلا۔ وہ مجھ سے قصداً مخفی رکھا گیا ہے۔ کوشش بہت کرتا ہوں مگر ہمت قاصر ہوجاتی ہے۔ لیکن بیٹا سُن رکھ تیری راہ میں ایک خطرہ ہے اور یہ خطرہ عورت کی شکل میں ہے۔ یہ بات مجھے پہلے ہی سے معلوم تھی اور اسی وجہ سے میں نے دیبی آئی سیس کے دیدار کے لئے تجھے طلب کیا تھا۔ یہ دیبی اپنے ماننے والوں کو حکم دیتی ہے کہ جب تک قاعدے میں ترمیم نہ ہو اُس کا کوئی معتقد عورت کا خیال تک اپنے ذہن میں نہ لائے۔ بیٹا، کاش تو اتنا حسین و طاقتور نہ ہوتا۔ بادشاہی کے لئے کوئی آدمی بھی تمام مصر میں تجھ سے زیادہ حسین اور طاقتور نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسی حسن و طاقت کے زعم میں ٹھوکر کھانی پڑے۔ پس خبردار رہ اور اسکندریہ کی اُن شغیقوں سے ہوشیار رہیو کہ کہیں وہ کیڑے کی طرح رینگتے رینگتے تیرے دل تک پہونچ کر اس کا راز نہ لے اُڑیں۔"

میں نے یہ باتیں چیں بجبیں ہوکر سنیں اور کہا: "باباجان میرے خیالات دوسری طرف رجوع ہیں۔ آپ ایسا خیال نہ کریں۔ عورتوں کے سُرخ لب اور ہنستی ہوئی آنکھیں مجھے اپنے فریب میں نہیں لاسکتیں۔"

باپ بولا: "یہ تو بہت اچھا ہے اور خدا کرے کہ ہو بھی ایسا ہی۔ اچھا فرزند اب رخصت ہو۔ جب ہم پھر ملیں تو خدا کرے وہ اچھا وقت ہو کہ میں شمالی مصر کے تمام کاہنوں کو ساتھ لئے فرعون کی تخت نشینی پر مبارکباد دینے اپوتیس میں آؤں۔"

اب میں باپ کے گلے لگا اور وہاں سے چلا گیا۔ افسوس اُس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ آگے چل کر ہم دونوں کس حالت اور صورت میں ملیں گے۔

بس اب یہ ہوا کہ ایک بار پھر میں نے دریائے نیل کے رستے ایک معمولی آدمی کی حیثیت سے سفر کیا۔ جو لوگ میرا حال پوچھتے تھے اُن سے یہی کہدیا جاتا تھا کہ میں اپوتیس کے سردار کاہن کا بھتیجا ہوں۔ پہلے مجھے کہانت کی تعلیم دی گئی تھی، مگر میں نے خداؤں کی خدمت کے پیشے سے انکار کیا۔ اور اب بتلاش روزگار اسکندریہ جارہا ہوں۔ یہ بات نہ بھولنی چاہئے کہ اب تک وہ لوگ مجھے بڑھیا آتو کا نواسہ ہی سمجھتے تھے جو حقیقت سے ناواقف تھے۔

دسویں رات کو باد موافق نے ہمیں اسکندریہ کے شہر میں پہونچادیا۔ یہ شہر وہ تھا جسے ایک ہزار روشنیوں کا شہر کہتے تھے۔ اور ان ہزاروں روشنیوں کے اوپر روشنی کا منارہ فاروس سنگ سپید کا بنا ہوا کھڑا تھا۔ یہ منارہ عجائبات روزگار سے تھا۔ اس کی چوٹی سے ایک روشنی جو تیزی میں سورج کی روشنی سے کم نہ تھی، بندرگاہ کے سامنے والے سمندر پر پڑتی تھی تاکہ جہاز رانوں کو بڑے سمندر میں پہونچنے کا راستہ آسانی سے معلوم ہوجائے۔ ہماری کشتی کو خشکی پر ایک اسکلہ میں بڑی احتیاط سے باندھ دیا گیا۔ اب رات ہوگئی تھی۔ میں کشتی سے اُترا اور ہزاروں مکانوں کو کھڑا حیرت سے دیکھتا رہا۔ لوگ مختلف زبانوں میں چیخ چیخکر میرا دماغ پریشان کئے دیتے تھے۔ یہاں جتنے آدمی تھے وہ اپنے اپنے ملک کی بولیاں بولتے تھے۔ میں اسی تحیر میں کھڑا تھا کہ ایک جوان آدمی میرے قریب آیا۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھکر اُس نے پوچھا: "کیا میں اپوتیس سے آتا ہوں اور ہرماکس میرا نام ہے؟"

میں نے جواب دیا: "ہاں۔"

پھر اُس نے جھک کر میرے کان میں وہ جملہ کہا جو بلا مزاحمت گذرنے کے لئے خفیہ طور پر باہم قرار پایا تھا۔ پھر اسی جوان آدمی نے دو حمالوں کو اشارہ کرکے بلایا اور اُن سے کہا کہ میرا سامان کشتی سے اُتاریں۔ یہ دونوں حمال قلیوں کے ہجوم میں سے لڑتے بھڑتے، جو مزدوری کے لئے غل مچا رہے تھے، کسی طرح کشتی تک پہونچے۔ اور میرا اسباب اُتار لائے۔ اب میں اسکلہ گاہ میں اُس جوان کے پیچھے پیچھے چلا۔ یہاں ایک طرف بہت سے مے فروشوں کی دکانیں تھیں۔ جہاں لوگ بیٹھے شرابیں پیتے تھے اور عورتوں کا ناچ بھی دیکھتے تھے۔ بعض عورتیں برائے نام لباس پہنے تھیں بعض بالکل برہنہ تھیں۔

غرض ہم اُن مکانات کے قریب سے گذرے جہاں چراغ خوب روشن تھے اور چلتے چلتے بڑے بندرگاہ کے کنارے پہونچے اور داہنے ہاتھ کو مڑ کر ایک چوڑی سڑک پر آئے جس پر سنگ خارا کا فرش تھا۔ سڑک کے دونوں طرف بڑے بڑے پختہ اور مستحکم مکانات تھے۔ ان مکانات کی بڑی خصوصیت جو پہلے میری نظر سے نہ گزری تھی وہ یہ تھی کہ تمام حجرے سڑک کی طرف کھلتے تھے۔ اب ایک بار ہم پھر داہنے ہاتھ کو مڑے، اور شہر کے ایسے حصے میں آگئے جہاں خاموشی تھی۔ کبھی کبھی دو دو چار چار شرابیوں کے جتھے جھومتے جھامتے سڑک پر ملے مگر ویسے یہاں سکوت اور سناٹا تھا۔ اب میرا رہبر ایک مکان کے سامنے ٹھہرا جو سنگ ابیض کا بنا ہوا تھا۔ مکان میں ہم داخل ہوئے۔ ایک چھوٹے سے صحن سے گذر کر ایک کمرے میں آئے۔ یہاں چراغ روشن تھا اور آخرکار میں اپنے ماموں سیپا سے ملا۔ جو میرے خیریت سے

پہونچنے پر بہت خوش ہوا۔

جب میں ہاتھ منہ دھوکر کھانے بیٹھا تو میرا ماموں کہنے لگا کہ سب باتیں بڑی خیر وخوبی سے ہو رہی ہیں۔ دربار میں کسی کو کوئی بُرا خیال تک نہیں ہے۔" اسکے علاوہ یہ بھی کہا "ملکہ کلا اَبطرہ کے کانوں تک یہ بات پہونچی ہے کہ اُنکا کاہن آجکل اسکندریہ میں ٹھہرا ہوا ہے۔ ملکہ نے سنتے ہی اُسے طلب کیا اور اُس سے بہت سے سوالات کئے۔ لیکن کوئی بات ہمارے منصوبے و معاملے کے متعلق دریافت نہیں کی کیونکہ اس کا تو وہاں وہم و گمان تک نہیں۔ ملکہ کے کان میں کسی طرح یہ افواہ پہونچی ہے کہ اُنو کے قریب جو بڑا اہرام ہے اس میں خزانہ دفن ہے۔ چونکہ ملکہ شدت سے مسرف اور فضول خرچ ہے اس لئے روپے کی ہمیشہ اسے ضرورت رہتی ہے۔ اب اُسنے یہ سوچا ہے کہ اس اہرام کو کھدوا ڈالے۔ لیکن یہ کاہن ملکہ کے اس خیال پر ہنسا اور کہا کہ وہ اہرام تو خفو کا مدفن ہے۔ اسکے علاوہ وہاں کے بھیدوں سے وہ قطعی ناواقف ہے۔ ملکہ اتنا سُنکر برہم ہوئی اور قسم کھائی کہ اگر مصر میں میری حکومت ہو تو اس اہرام کے کسی ایک پتھر کو دوسرے پتھر پر قائم نہ رہنے دونگی۔ یہ سنکر پھر وہ کاہن ہنسا اور اسکندریہ کی ایک مشہور کہاوت اُس نے کہی یعنی "پہاڑ بادشاہوں سے زیادہ دیرپا ہوتے ہیں" کاہن کی اس حاضر جوابی پر ملکہ بھی ہنس پڑی اور کاہن کو اپنے گھر جانے دیا۔" اتنا کہکر ماموں سیپا بولے کہ "کل تم کلا اَبطرہ کی سواری بھی دیکھ لوگے۔ کیونکہ کل اُس کا یوم ولادت ہے۔ (اتفاق سے کل ہی میرا یوم ولادت بھی تھا) کلا اَبطرہ کل دیوی آئی سیس کا لباس پہنے جلوس میں نکلے گی۔ اور اپنے قصر لوخیاس سے بڑی تزک و احتشام کے ساتھ سراپیوں کے تبخانے کو جائے گی اور وہاں نذر چڑھائے گی۔ اسراپیوں کے بُت خانے میں انکے بھولے خدا اسراپس کا بُت رکھا ہے۔ اچھا ہرماکس اب یہ سوچنا ہے کہ تمہارے لئے کیا صورت نکالی جائے کہ تم ملکہ کے محل تک پہونچ سکو"

میں بہت تھکا ہوا تھا اس لئے سونے چلا گیا۔ مگر نئی جگہ تھی دوسرے سڑک کا غل اور شور اور سب سے بڑھکر کل کا خیال۔ یہ سب باتیں ایسی تھیں کہ نیند خاک نہ آئی۔ صبح ابھی اندھیرا ہی تھا کہ میں بستر سے اٹھا اور زینہ چڑھکر مکان کی چھت پر پہونچا۔ اتنے میں مشرق سے سورج کی کرنیں تیروں کی طرح اُڑ پڑیں۔ اور سنگ مرمر کے مینار فادوس پر وہ چمکیں قلعہ مینار کی روشنی کم ہوکر رفتہ رفتہ گل ہو گئی۔ گویا سورج اس روشنی کا قاتل تھا۔ اب آفتاب کی شعاعیں لوخیاس والے محلوں اور قصروں پر پڑنے لگیں۔ یہاں ملکہ کلا اَبطرہ رہتی تھی۔ اور انہیں ایسا روشن کیا گویا سمندر کے سیاہ اور سرد سینے پر ایک گوہر آبدار چمک رہا ہے۔ اب روشنی اور پھیلی اور شعاعوں نے سوما کے مقدس مقبرے کے برج کو چوما۔ اس مقبرے میں اسکندر اعظم موت کی نیند سوتا ہے۔ پھر اس روشنی نے ہزاروں محلوں اور بُت خانوں کی چوٹیوں کو نور کر دیا۔ اور وہاں سے گذر کر اور میوزیم کی عالیشان عمارت کو جو قریب ہی بقعۂ نور بنا کر اس تبخانے کو روشن کر دیا جس میں خدائے باطل اوسیرس کا بُت علاج کا بنا ہوا نصب تھا۔ پھر آفتاب کی روشنی معلوم ہوتا تھا گورستان نکروپولس میں پہونچکر منتشر ہو گئی ہے۔ غرض جب صبح سے دن ہونے لگا اور روشنی نے رات کے تاریک ظرف سے اُبل کر طغیانی کی تو دھوپ تمام نشیب کے میدانوں اور راستوں پر پھیلی اور اب سارا شہر جو طلوع کے وقت سُرخ ہو رہا تھا اب وہ ایک جواہر ملکی شاہی ردا کی طرح چمکنے لگا۔ پھر شمال سے ہوا چلی اور جس قدر غبار اور کہر چھایا ہوا تھا اُسے غائب کر دیا۔ اور اب سمندر کے نیلگوں پانی پر ہزاروں جہاز جھومتے نظر آنے لگے۔ اور اب میں نے اس عظیم الشان سنگین چبوترے کو بھی دیکھا جو دُور تک سمندر میں چلا گیا تھا۔ میں نے صدہا سرائیں اور ہزارہا مکانات صاف صاف دیکھے۔ اسکندریہ کی دولت اور اسکی شان و عظمت کا اندازہ کیا معلوم ہوتا تھا کہ شہر کیا ہے ایک۔ ملکہ بے کھیل ہو رہی ہیں اور سمندر کے درمیان تخت بچھائے بیٹھی دونوں پر حکومت کر رہی ہے۔ میں حیرت زدہ تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ خوشنما زمینیں اور شہر میری موروثی ملک ہے۔ مگر تہہ اس قابل ہے کہ اس پر اپنا قبضہ ہونا چاہیئے۔ اس کی شان و شوکت کو میں نے بخوبی سیر ہو کر دیکھا۔ اور میں نے دیوی آئی سیس سے بات کی۔ پھر میں چھت سے نیچے اتر آیا۔

نیچے کمرے میں میرا ماموں سیپا بیٹھا تھا میں نے کہا کہ "میں بالاخانے پر اسکندریہ پر طلوع آفتاب کی سیر کرتا تھا"

اُس نے میری طرف غور سے دیکھکر پوچھا "کہو اسکندریہ کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے؟"

میں نے جواب دیا کہ "مجھے تو وہ انسان کا نہیں بلکہ خداؤں کا شہر معلوم ہوتا ہے"

اُس نے خفا ہوکر کہا "ہاں خداؤں کا شہر تو ہے مگر یہ خدا سب جہنم کے خدا ہیں۔ یہ شہر تو گناہوں اور بدکاریوں کا ایک گڑھا ہے۔ وہ ایک چشمہ ہے جس سے ظلم اور بے انصافی پانی کی طرح اُبلتا ہے۔ جھوٹے خداؤں کے بتائے ہوئے جھوٹے مذہبوں کا وہ گھر ہے۔ میرا بس چلے تو ایک پتھر کو دوسرے پتھر پر قائم نہ رہنے دوں۔ اور اس کی ساری

دولت وحشمت کو سامنے کے سمندر میں غرق کردوں۔ جی تو یہ چاہتا ہے کہ یہ شہر غارت ہوکر اس کے بجائے دقوع پر سمندر کے پرندے چیختے چلاتے اُڑا کریں۔ اور ہوا جس میں یونانیوں کا سانس شامل نہ ہو سمندر سے چل کر اسکے ویرانوں اور کھنڈروں پر سے گذرے۔ اے شاہی ہرماکس، اسکندریہ کے عیش وعشرت، حُسن، دریبائی کے زہر سے اپنے حواس کو متاثر نہ ہونے دے۔ اس کی قاتل ہوا میں ایمان غارت ہو جاتا ہے۔ اور مذہب اپنے آسمانی پر نہیں پھیلا سکتا۔ ہرماکس جب وقت آئے کہ تو یہاں حکومت کرے تو اس ملعون شہر کو ترک کرکے اپنے بزرگوں کے طریقے کے مطابق اپنا تختگاہ منف کی سپید چار دیواری میں قائم کیجو۔ دیکھ میں کہے دیتا ہوں کہ مصر کے حق میں اسکندریہ ایک عالیشان دروازہ بربادی اور غارتگری کا ہے۔ جب تک وہ قائم ہے دُنیا کی تمام قومیں اسی کے نیچے سے ہوتی ہوئی ملک میں داخل ہوکر اسے لوٹیں اور غارت کریں گی اور جھوٹے مذہب وہاں پھیل پھول کر مصر کے خداؤں کو نیست ونابود کر دینگے"۔

میں نے ماموں کی یہ باتیں سُنکر کچھ جواب نہ دیا۔ کیونکہ جو کچھ انہوں نے کہا تھا اس میں سب کچھ سچ تھا۔ مگر دیکھنے میں مجھے یہ شہر بہت ہی بھلا معلوم ہوتا تھا۔ جب ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو میرے ماموں سیپا نے کہا کہ اب وقت ہے کہ چلکر ملکہ کلا اُبطرہ کی سواری دیکھیں جو پورے جلوس کے ساتھ اسراپس کے ہیکل کو جائے گی۔ جلوس کا وقت گو دوپہر سے اِدھر دو گھنٹے کا ہے۔ مگر اسکندریہ کے لوگ کھیل تماشوں کے اس قدر شوقین ہیں کہ اگر ہم ابھی سے نہ چلے تو اُن سڑکوں پر جدھر سے سواری گذریگی خلقت کا اتنا ہجوم ہوگا کہ (اور ابھی سے لوگ وہاں بکثرت آگئے ہیں) کہ قدم اُٹھانا مشکل ہو جائے گا۔ غرض ہم گھر سے نکلے۔ باب کنوپی کے قریب تماشائیوں کے بیٹھنے کے لئے ایک کٹ گھر بنایا گیا تھا اور یہ اس سڑک کے کنارے تھا جو شہر کے ایک سرے سے دوسرے تک نکلکر کنوپی دروازے تک گئی تھی۔ میرے ماموں نے ایک بڑی رقم دیکر وہاں بیٹھنے کی اجازت حاصل کرلی تھی۔

غرض آدمیوں کی بھیڑ میں سے جیکے ٹھٹ سڑک پر ابھی سے لگ گئے تھے، ہم بہ ہزار مشکل رستہ نکالتے ہوئے اس کٹ گھر تک پہنچے۔ اس کی چھت سامنے کی تھی اور اندر سُرخ کپڑا منڈھا تھا۔ یہاں ہم ایک بنچ پر بیٹھ گئے اور کئی گھنٹے تک سواری کا انتظار کرتے رہے۔ اور دیکھا کہ خلقت کے ہجوم کی انتہا نہ تھی۔ لوگ چیختے چلاتے۔ طرح طرح کی زبانیں بولتے جارہے ہیں۔ غرض سواری کے انتظار میں اب کئی گھنٹے گذر گئے۔ آخر کار سپاہی آئے کہ راستہ صاف کریں۔ ان کی وردیاں روما کے سپاہیوں کی وضع کی تھیں۔ سینہ بند فولاد کی کڑیوں کی بناوٹ کے تھے۔ سپاہیوں کے بعد نقیب آواز لگاتے خاموش رہو خاموش رہو، آئے (ان کی آواز سنتے ہی خلقت نے اور شور مچایا۔) خاموش۔ خاموش۔ سامنے دیکھو حضور ملکۂ مصر کلا اُبطرہ کی سواری آرہی ہے۔ اسکے بعد ملک قلیقیہ، تھراکیہ، مقدونیہ، اور غالیہ کے ایک ایک ہزار سپاہی صفیں باندھ گذرے۔ اسکے بعد پانچ سو سوار اس رسالے کے جسے "زرہ پوش" کہتے تھے آئے۔ یہ رسالہ ایسا تھا جس کے سوار اور گھوڑے سب سر سے پاؤں تک زرہ پہنے تھے۔ ان کے بعد جوان مرد اور عورتیں پُر تکلف لباس پہنے سروں پر سونے کا تاج رکھے، ہاتھوں میں دن اور رات، صبح، دوپہر، آسمان وزمین کے نشان لئے آئے۔ اس کے بعد بعض حسین عورتیں سڑک پر خوشبوئیں چھڑکتی کچھ راستوں پر پھول بکھیرتی آئیں۔ اب یکایک شور ہوا کلا اُبطرہ۔ کلا اُبطرہ۔ میں سانس روک کر آگے کو جھکا کہ اس عورت کو دیکھوں جس نے دیبی آئی سیس کا لباس پہننے کی جرأت کی ہے۔ لیکن جوں ہی میں جھکا سامنے اتنے آدمی آگئے کہ کچھ صاف نہ دیکھ سکا۔ دیکھنے کے شوق اور اپنی طاقت کے بل پر میں کٹ گھر کو کود لوگوں کو ہٹاتا گراتا آگے کی صف میں پہونچ گیا۔ جب میں اس طرح پہلی صف میں جانے کی کوشش کرتا تھا تو میں نے دیکھا کہ بہت سے حبشی غلام سروں پر پتوں کے تاج رکھے ہاتھوں میں بڑے بھاری بھاری ڈنڈے لئے بھاگتے ہوئے آئے اور وہ لوگوں کو بے تحاشا پیٹنے لگے۔ ان میں خاص کر ایک آدمی جو آدمی کا ہیکو دیو معلوم ہوتا تھا ن سب سے بڑھکر مرکھنا تھا۔ جیسا کہ کمینوں کا قاعدہ ہے کہ اختیار پاتے ہی لوگوں پر تشدد کرنے لگتے ہیں اس کا بھی یہی حال تھا۔ اُس نے ایک عورت کو دیکھتے ہی کہ بہت نحیف وکمزور ہے اور گود میں بچہ بھی رکھتی ہے اُسکے سر پر زور سے ایک ڈنڈا مارا۔ عورت ڈنڈا کھاتے ہی فوراً زمین پر گری۔ آس پاس کے لوگ یہ ماجرا دیکھکر کچھ بڑبڑا کر خاموش ہو گئے۔ مگر میری رگوں میں خون ایسا جوش کھانے لگا کہ عقل معطل ہو گئی۔ میرے ہاتھ میں ایک بھاری لکڑی (قبرصی چوب زیتون کی تھی۔ وہ بدبخت روسیاہ حبشی اس وقت عورت کے گرنے اور اسکے بچے کے دُور جاکر پڑنے اور لوٹنے پر ہنس رہا تھا۔ میں نے اپنی بھاری لکڑی پھرا کر اس خبیث کے شانے پر زور سے ماری۔ میرا ہاتھ اس زور سے پڑا کہ اسکے کندھے سے خون کا ایک فوارہ جاری ہو گیا اور پتوں کا تاج جو اس کے سر پر تھا وہ خون میں لتھڑ گیا۔

اب جیسا کہ قاعدہ ہے کہ جو لوگ دوسروں کو مارنا پیٹنا چاہتے ہیں

نہ خود پٹنا نہیں چاہتے۔ لکڑی کے ٹوٹتے ہی وہ حبشی غصے اور درد سے بیتاب ہوکر میری طرف جھپٹ کر آیا۔ بجز اس عورت کے جو زمین پر پڑی تھی سب لوگ ہٹ گئے اور ایک حلقہ سا ہم دونوں کے گرد بنا دیا۔ اب وہ حبشی یکدم سے لپک کر میری طرف آیا۔ اسے مارنے کو میرے ہاتھ میں اس وقت کوئی چیز نہ تھی۔ میں نے گھونسا بنا کر اس کی ناک کے اوپر آنکھوں کے بیچ میں اس زور کا لگایا کہ وہ اس طرح لڑکھڑانے لگا جیسے قربانی کا بیل کہ پہلی کلہاڑی لگتے ہی لڑکھڑا جاتا ہے۔ چونکہ لوگوں کو لڑائی دیکھنے میں بہت لطف آتا تھا انہوں نے خوب غل شور مچایا۔ اور وہ یہ جانتے بھی تھے کہ یہ حبشی مشہور شمشیر باز ہے اور کئی لڑائیاں بھی جیت چکا ہے۔ اب حبشی اس میں طاقت تھی گالیاں دیکر اپنا ڈنڈا اونچا کر کے بڑھایا۔ اور بڑے زور سے وہ بھاری ڈنڈا میرے رسید کرنا چاہا۔ مگر میں نے فوراً جھک کر اس کا وار بچا لیا۔ ورنہ میرے مرنے میں کیا شبہ رہا تھا۔ لیکن اتفاق دیکھیے اس کا ڈنڈا زمین پر پڑا اور اس زور سے پڑا کہ پرخچے اڑ گئے۔ اس پر لوگوں نے پھر شور مچایا۔ اور وہ دیو کا دیو غصہ میں اندھا ہوکر پھر میری طرف آیا کہ کسی طرح مجھے مار کر گرا دے۔ مگر میں نے بچا ہوکر اپنا ہاتھ اسکے گلے کی طرف بڑھایا۔ کیونکہ وہ بھاری اتنا تھا کہ اس کو زمین سے اٹھا کر پٹخنا ممکن نہ تھا۔ اب اس کا گلا میرے ہاتھ میں خوب مضبوط آگیا۔ اس نے مجھے گھونسے مارتے مارتے ادھ موا کر دیا مگر میں نے اس کا گلا نہ چھوڑا۔ اور میں نے اپنا انگوٹھا اسکے گلے کی رگوں میں گھسیڑ دیا۔ اب ہم دونوں چکر کھانے لگے۔ اتنے میں اس خبیث نے اپنے تئیں زمین پر گرا دیا۔ سمجھا یہ تھا کہ اس طرح گرنے میں میرے ہاتھ سے اس کا گلا چھوٹ جائیگا۔ مگر میں نے گلا نہ چھوڑا۔ گو اب ہم دونوں زمین پر لوٹنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ سانس کے رکنے سے وہ کمزور پڑا۔ چونکہ میں اس وقت اس کے اوپر آگیا تھا اس لئے میں نے اپنا گھٹنا اسکے سینے میں اڑایا اور اس طرح میں اسے ضرور جان سے مار ڈالتا لیکن میرا ماموں اور کچھ اور لوگ دوڑ پڑے اور مجھے اس دیو کی لاش سے گھسیٹ کر دونوں کو جدا کیا۔

اس درمیان میں مجھے تو مطلق خبر نہیں ہوئی کہ وہ رتھ جس میں ملکہ بیٹھی تھی اس موقع پر آگیا۔ رتھ کے آگے آگے ہاتھی تھے اور پیچھے ببر شیر زنجیریں پڑیں چل رہے تھے۔ یہ ہنگامہ دیکھکر رتھ وہیں ٹھہر گیا۔ میرا سفید لباس اس کالے حبشی کے خون میں جو اسکے نتھنوں اور منہ سے نکلا تھا، رنگا ہوا تھا۔ ملکہ کے رتھ کی طرف نظر گئی تو دیکھا کہ وہ بالکل سونے کا ہے۔ اور دودھ سے زیادہ اجلے نقرے اس میں جُتے ہیں۔ ملکہ رتھ میں بیٹھی ہے اور اسکے دونوں طرف دو جوان بڑی حسین لڑکیاں چمکتے مورچھل ملکہ کو جھل رہی ہیں۔ سر کی پوشش ملکہ کی وہی تھی جو دیبی آئی سیس کی ہوتی ہے۔ اور کلغی کے دونوں سروں میں قرص ماہتاب اور تخت او سیرس کا نشان بنا ہے۔ ملکہ کی پیشانی پر اودریاس لپٹا ہے۔ سر کی پوشش کے نیچے سونے کی کرگسی کلاہ تھی۔ کرگسی کے پروں پر نیلے رنگ کی مینا کاری تھی۔ آنکھوں کی جگہ یاقوت جڑے تھے۔ اس کلاہ کے نیچے سے بالوں کی لٹیں نکل کر پاؤں تک آتی تھیں۔ ملکہ کے گلے میں ایک بڑا چوڑا طلائی گلوبند تھا۔ جس پر زمرد اور مرجان جڑے تھے۔ بازوؤں اور کلائی پر جوشن اور چوڑیاں تھیں۔ ان میں بھی فیروزے لگے تھے۔ ایک ہاتھ میں زندگی کا صلیب بلوریں تھا دوسرے ہاتھ میں حکومت کا عصا شاہی۔ چھاتیاں کھلی تھیں لیکن ان کے نیچے ایک لباس تھا جو سانپ کی کینچلی کی طرح چمکتا تھا۔ اور اس پر جگہ جگہ جواہرات ٹکے تھے۔ اس کے نیچے زربفت کی ایک چادر کمر کے لپٹی تھی اور وہ بہت کچھ ایک ریشمیں پٹکے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ پٹکے کی کئی کئی تہیں پاپوش تک آتی تھیں۔ پاپوش پر بڑے بڑے موتی تکموں کی جگہ تھے۔ یہ اسکے گورے گورے چھوٹے چھوٹے پاؤں کا زیور روز بہا لش تھے۔

یہ سب چیزیں گویا میں نے ایک نظر میں دیکھ لیں۔ اب میں نے نظر اونچی کی تو ملکہ کا چہرہ دیکھا۔ یہ صورت وہ تھی جس نے سیزر کو فریفتہ کر کے مصر کو غارت کرایا۔ اور اوکٹے ویوں کو ساری دنیا کی حکومت دلوادی۔ چہرے کا نقشہ دیکھا تو وہ بالکل یونانی تھا۔ کسی بات میں مطلق فرق نہ تھا۔ زنخداں گول، لب بھاری اور پرکار، نتھنے نازک اور پتلے، ایسے جیسے معلوم ہو کہ کسی بت تراش نے اپنی چھینی سے سنگ مرمر میں تراشے ہیں۔ کانوں کی ایسی گویا موتیوں کے سیپ رکھے ہیں۔ پیشانی دیکھی تو کچھ زیادہ اونچی نہ تھی مگر خوب چوڑی اور حسین تھی۔ سیاہ بالوں کی گھونگر والی لٹیں موج در موج دھوپ میں چمکتی تھیں۔ بھویں قوس نما تھیں۔ پلکیں لمبی اور جھکی ہوئی تھیں۔ غرض اس وقت ایک شہناز کی شکل پوری اور مکمل میرے سامنے تھی۔ آنکھیں اپنی جگہ روشن تھیں۔ رنگ ان کا نرگسی تھا۔ آنکھوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سو رہی ہیں۔ جب کسی ایسے معاملے پر غور کرتی تھی جسے دوسروں سے پوشیدہ رکھنا ہے تو محویت اتنی طاری ہوتی تھی جیسے صحرا پر رات چھاگئی ہو اور رات بھی وہ جس کی کیفیت بدلتی رہتی ہے۔ کبھی تاریک ہے، کبھی ستاروں کی روشنی میں چمک اٹھی ہے۔ یہی حال ان آنکھوں کا تھا۔ میں نے یہ کل عجائبات دیکھے۔ گو انہیں بیان کرنے کی مجھ میں قوت نہیں۔ مگر اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ یہ حسن و جمال وہ چیزیں نہ تھیں جن میں کلا اپطرہ کے حسن کی اصلی قوت مخفی تھی۔ یہ قوت اس کی روح سوزاں میں تھی کہ جسم کے

پردوں میں سے جھانک کر نور کی طرح روشن ہوجاتے۔ کلا اپطرہ از سر تا پا ایک شعلۂ جوالہ تھی۔ ایسی عورت نہ کبھی پیدا ہوئی تھی اور نہ اب پیدا ہو۔ جب کسی بات پر غور کرتی تھی تو اسکے دلِ مضطر کی آگ جسم سے بھڑک اُٹھتی تھی۔ لیکن جب وہ آنکھیں جاگتی ہوتیں تو بجلیاں دفعتاً ان سے کوندتیں اور جذبات میں ڈوبا ہوا نغمہ نطق بن کر لبوں سے نکلتا۔ جب یہ حال ہو تو کون کہہ سکتا ہے کہ کلا اپطرہ کیا چیز تھی۔ کیونکہ وہ تاب حُسن و رعنائی جو عورت کو آگی بزرگی کے لئے دی جاتی ہے اور وہ عقل و ذہانت جو مرد کو آسمان سے ملتی ہے وہ سب اس میں جمع تھیں۔ اور انکے ساتھ تمام وہ شوخیاں شرارتیں جو کسی کا خوف نہ ہونے یا ہر بات کو ایک کھیل سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اس میں موجود تھیں۔ اس کی یہ شرارتیں اور مذموم حرکتیں وہ تھیں جنہوں نے بڑی بڑی سلطنتوں کو کھیل کا میدان بنا دیا۔ مشاہیر وقت کے خون سے اپنی نفسانی خواہشوں کی آبیاری کی۔ یہی کل باتیں اس میں موجود تھیں اور ان ہی سے کلا اپطرہ بنی تھی۔ یہی باتیں وہ ہیں جنہیں نہ کوئی شخص بیان کر سکتا ہے اور نہ جس نے ایک دفعہ کلا اپطرہ کو دیکھا اسے بھول سکتا ہے۔ یہی چیزیں تھیں جنہوں نے اُسے ایک طوفان بلاخیز کی شکل دی تھی۔ حُسن میں بجلی۔ ظلم میں آگ ناگہانی۔ لیکن پھر بھی وہ ایک دل رکھتی تھی۔ جو کچھ اُس نے کیا سب کو معلوم ہے۔ اور غضب ہو جائیگا اگر پھر اس دُنیا میں کوئی کلا اپطرہ اس خاک ان کو معتوب و مغضوب کرنے پیدا ہوئی۔ ایک آنِ واحد کے لئے کلا اپطرہ کی نظر سے میری نظر ملی۔ اس ہنگامے کو وہ اپنے رتھ سے جھک کر دیکھنے اور اس کی وجہ معلوم کرنے لگی۔ پہلے اس کی آنکھیں سیاہ اور رنگین تھیں۔ گو وہ دیکھتی ضرور تھیں مگر دماغ اس دیکھنے کو محسوس نہ کرتا تھا۔ اب وہ آنکھیں بیدار ہوئیں اور ان کا رنگ اس طرح بدلا جیسے سمندر جوش کھانے میں رنگ بدلتا ہے۔

پہلے ان میں غصہ تھا، پھر بے پروائی پیدا ہوئی اور وہ اس منظر کو بے توجہی سے دیکھنے لگی۔ پھر جب اُس نے اس حبشی کے تن و توش کو دیکھا جسے میں نے مغلوب کیا تھا، اور یہ بھی وہ جانتی تھی کہ یہ حبشی ایک مشہور شمشیر باز ہے، تو اس کے مغلوب ہوجانے پر اُسے حیرت ہوئی۔ پھر یکایک نظر میں نرمی پیدا ہوئی۔ مگر چہرے پر کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ کیونکہ کلا اپطرہ کے دل کی کیفیت معلوم کرنے میں اسکی آنکھوں کو دیکھنا ضروری تھا۔ چہرے کو دیکھنا بیکار تھا کیونکہ اس میں کبھی کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوتی تھی۔ مُڑ کر اُس نے محافظوں سے کچھ کہا۔ وہ آگے آئے اور مجھے پکڑ کر ملکہ کے سامنے لائے۔ اب تمام خلقت بالکل خاموش اس انتظار میں تھی کہ دیکھئے میرے قتل کا حکم کب صادر ہوتا ہے۔

میں ملکہ کے سامنے سینے پر ہاتھ رکھے کھڑا رہا۔ گو اُسکے حسن و جمال نے میرے حواس درست نہ رکھے تھے۔ مگر دل میں میں اُس کا جانی دشمن تھا۔

ملکہ نے کہا "مصری۔ تو کون ہے اور کیا کرتا ہے۔ مصر کا رہنے والا تو تُو ضرور معلوم ہوتا ہے۔ بتا کیا بات تھی کہ تُو نے میرے غلام کو ایسے وقت میں جبکہ میں شہر میں جلوس کے ساتھ نکل رہی تھی تُو نے جان سے مارنا چاہا"

میں نے بالکل بیباکی سے جواب دیا "میں ہرماکس منجم ہوں۔ اور ابوتیس کے سردار کاہن اور حاکم کا متبنیٰ ہوں اور یہاں روزگار کی تلاش میں آیا تھا۔ ملکہ عالم میں نے حضور کے غلام کو اس وجہ سے مارا کہ اُس نے ایک غریب عورت کو جو حضور کے سامنے پڑی ہے بلا وجہ مارا تھا۔ جن لوگوں نے یہ کُل ماجرا دیکھا ہے حضور اُن سے دریافت فرمائیں"

ملکہ بولی "ہرماکس نام تو بڑا شاندار ہے اور آنکھوں سے بھی تو بڑا آدمی معلوم ہوتا ہے" پھر ملکہ نے ایک سپاہی کو جس کی نظر سے یہ کل معاملہ گذرا تھا حکم دیا کہ وہ کُل حقیقت بیان کرے۔ سپاہی نے کل واقعہ بے کم و کاست بیان کیا۔ وہ میرا طرفدار اور دوست اس وجہ سے ہوگیا تھا کہ میں نے اس خبیث حبشی کو مار گرایا تھا۔

اب ملکہ رتھ میں اُس لڑکی کی طرف متوجہ ہوئی جو کھڑی مورچھل ہلاتی تھی۔ اب اس گھونگر بال والی اور سیاہ آنکھوں والی جوان لڑکی نے جو دیکھنے میں بہت خوبصورت معلوم ہوتی تھی کچھ جواب دیا۔ تب ملکہ نے حکم دیا کہ "وہ حبشی غلام پیش کیا جائے"

غرض سپاہی اس حبشی غلام کو پکڑ کر ملکہ کے رو برو لائے۔ حبشی کا سانس اب چلنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ سپاہی اُس عورت کو بھی سامنے لائے جسے اس حبشی نے مارا تھا۔

کلا اپطرہ نے آہستہ سے کہا "ارے کتے، نامرد، بزدل، تو نے اپنی طاقت کے زعم میں اس غریب کمزور عورت کو مارا۔ چونکہ تو دل کا ہیٹا اور کمزور تھا تو اس جوان آدمی کے ہاتھوں مار کھا گیا۔ اب دیکھ۔ میں تجھے آدمیت کا سبق دیتی ہوں۔ جاؤ۔ اسے لے جاؤ۔ خبیث اب جب کبھی تو کسی عورت کو ماریگا تو اپنے بائیں ہاتھ سے ماریو۔ سپاہیو، اسے یہاں سے لیجاؤ اور اس کا دایاں ہاتھ کاٹ ڈالو"

یہ حکم دیکر ملکہ پھر رتھ میں تکیہ سے لگ کر ہو بیٹھی۔ پھر ایک غبار سا اسکی آنکھوں پر طاری ہوا۔ سپاہی اس حبشی کو جو چیخ چیخ کر رحم کی درخواست کرتا تھا پکڑ کر لے گئے اور انہوں نے اس کا دایاں ہاتھ کٹ گھر کی ایک بلی پر رکھکر تلوار سے اُڑا دیا۔ اب اِس چیختے چلاتے حبشی کو لوگ وہاں سے اُٹھا کر لے گئے۔ (بقیہ بر صفحہ ۳۱)

قدر کر قدر اس امانت کی

وسعتِ کائنات کی سوگند! ممکناتِ حیات کی سوگند
نقشِ فطرت کے دامِ رنگیں کی منظرِ بے ثبات کی سوگند
چشمِ ادراک کی نگاہوں کی اور حجابِ صفات کی سوگند
شوق کے اضطرابِ پیہم کی قلب کی واردات کی سوگند
آرزو کی حیاتِ شیریں کی اور انکی ممات کی سوگند
زینتِ لامکاں کی ہستی کی اور اسیرِ جہات کی سوگند
عشق کے غزنوی کی مجھکو قسم عقل کے سومنات کی سوگند

ہے "امانت" خودی امیں تو ہے
دستِ قدرت کی آستیں تو ہے

مشتِ گِل کی ہے آبرو اس سے صاحبِ کُن فکاں ہے تو اس سے
اس کے جوہر سے تو ہے آئینہ حُسن ہے تیرے روبرو اس سے
ہے خضر تیرا دشتِ ہستی میں برق ہے پائے جستجو اس سے
آرزو سے ہے زندگی کی نمود اور زندہ ہے آرزو اس سے
شعلۂ زندگی ہے نام اس کا سوز پرور ترا لہو اس سے
خود نگر خودگر و خدا آگاہ مختصر یہ کہ تُو ہے تُو اس سے

قدر کر قدر "اس امانت" کی
"نیستی" ہے سزا خیانت کی

امین حزیں۔

اور کہا علامہ اقبال نے

تو مپندار کہ ایں قصہ بہ خود می گویم
گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست (نظیری)

تکمیلِ انسانیت، فطرت کا مقصودِ اولیں ہے۔ فطرت ہمیشہ اس کوشش میں رہتی ہے کہ ہر نقش نو پہلے سے بہتر ہو اور اسی طرح بتدریج ترقی ہوتی رہے، حتیٰ کہ انسانیت معراجِ کمال کو پہونچ جائے۔ اس جدوجہد کشمکش پیہم، دار و گیر اور سرگرمی ہی میں زندگی اور ارتقا کا راز پوشیدہ ہے۔ یہ تمام کارخانۂ قدرت گویا ایک "دار التجارب" ہے جس میں فطرت طرح طرح کے نقش بنا بنا کر بگاڑتی رہتی ہے۔ مگر یہ اسکی ملاعبت اور اندازِ بے پروائی نہیں، یہ اسکا جنونِ تکمیل ہے۔ نہ اس کو یہ سمجھنا چاہیے جیسا کہ ٹینی سن (Tennyson) نے سمجھا تھا کہ فطرت خوں آشام ہے اور شکاری درندے کی طرح ہمیشہ اس کے دانت اور پنجے خون سے رنگین رہتے ہیں۔ خود علامہ اقبال کی زبان سے فطرت کے تخریبی اور تعمیری مقاصد کی غایت سنیئے۔

فطرتِ ہستی شہید آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے
ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام اس کو یوں نہ کر دیتا نظامِ کائنات
مختلف ہر منزلِ ہستی کی رسم و راہ ہے
آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہے

زندگی جامد نہیں بلکہ متحرک ہے اور ہر لحظہ نئے نئے رنگ بدلتی رہتی ہے۔ وہ بظاہر بے جان ذرات بھی جن سے اس تیرہ خاکداں کی بنا پڑی ہے سائنس کی روشنی میں متحرک اور مضطرب نظر آتے ہیں اور انکے اندر بھی ہنگامۂ رستاخیز برپا رہتے ہیں۔ اس دنیا میں ہر چیز رواں دواں ہے۔ یہاں سکون اور قیام ہی موت ہے۔ انسان کے اندر بھی فطرت نے اپنا یہ اصولِ تغیر و تبدل ودیعت کر دیا ہے۔ تبدیلی اور حرکت پیدا کرنے کی یہ طاقت، یہ آتشِ تیز، یہ ناصبوری، یہ تڑپ، یہ ذوقِ آگہی، یہ وسعت کی خواہش، یہ نصب العین کی تلاش ہی اشرف المخلوقات کو دیگر جانداروں سے ممیز کرتی ہے۔ مگر کبھی کبھی انسان کی یہ طاقت خارجی یا خود ساختہ اثرات کے باعث معدوم ہونے لگتی ہے۔ اسوقت ترقیٔ انسانی رک جاتی ہے اور فطرت کا مقصد فوت ہونے لگتا ہے۔ جو اسباب ترقیٔ انسانی میں مانع ہوتے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔ جہل (یعنی اصلیت سے ناواقفیت) رسم و رواج، قدامت پرستی، توہم پرستی، بے دینی، خود ناشناسی، خودغرضی، ہوس، امتیازاتِ رنگ و بو وغیرہ...

مگر ان رجعت پسند اثرات کے باوجود فطرت اپنا مقصد پورا کرنے کیلئے سرگرمِ عمل رہتی ہے اور اپنی مقصد براری کیلئے عجیب عجیب ڈھنگ اختیار کرتی ہے۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

علامہ اقبال کا معرضِ وجود میں آنا، موجودہ زمانے میں آنا اور پھر آجکل کے ہندوستان میں آنا بھی خالی از علت نہ تھا۔ اس میں فطرت کی ایک بڑی مصلحت پوشیدہ تھی ؎

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

موجودہ زمانہ میں جب دنیا عقل اور علم و حکمت کے ذریعہ ہر ممکن تدبیر فلاحِ انسانی کی سوچکر درماندہ ہو گئی ہے اور انسانیت کے ان دیرینہ امراض یعنی جہل، بھوک، افلاس اور غلامی کو دور نہیں کر سکی۔ جب ہر چہار طرف یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ:

دلِ گیتی "انا المسموم! انا المسموم!" فریادش
خرد نالاں کہ "ما عندی بتریاقٍ ولا راقی!"
چہ ملائی چہ درویشی چہ سلطانی چہ دربانی
فروغِ کار می جوید بہ سالوسی و زراقی!

ایسے کٹھن وقت ضرورت تھی کہ کوئی قلندر رموزِ ازل سے پردہ ہٹاتا اور اسرارِ ازل فاش کر دیتا۔ چنانچہ فطرت نے اس جبر کدہ میں اقبال کو پیدا کیا اور ان سے کہا کہ کہہ:

"اور کہا علامہ اقبال نے":

کوئی دیکھے تو میری نے نوازی
نفس ہندی مقامِ نغمہ تازی!
نگہ آلودۂ اندازِ افرنگ
طبیعت غزنوی قسمت ایازی!

اگر گوشِ حقیقت نیوش سے سنیئے تو فطرت کی یہی آواز تیرہ سو برس پہلے غارِ حرا میں یوں گونجی تھی۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ط۔ علامہ اقبال کا کلام تمامتر، از اول تا آخر، فطرت کی اسی محبوب آواز کی صدائے بازگشت ہے۔ یہ تفسیر ہے اس صحیفۂ فطرت کی جس کا دوسرا نام قرآن مجید ہے۔ اسے پڑھئے اور سمجھئے اور دیکھئے کہ

اس طرح موجودہ علم اور زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق علامہ اقبال نے آیاتِ قرآنی کی تفسیر بیان کی ہے اور پرانی تفاسیر کو بھول جاتیے۔

میں مختصر طور پر آج آپ کو بتاؤنگا کہ علامہ اقبال نے کیا کہا اور کیوں کہا۔ انکے کلام کو محض شاعری سمجھ کر ان کی تحقیر نہ کیجئے یہ فطرت کی زبان ہے اس میں قوموں کی، میری اور آپ کی، تمام عالمِ انسانیت کی تقدیر کا راز مضمر ہے، فطرت انہیں مجبور کر رہی ہے کہ وہ کہیں۔ خود فرماتے ہیں:-

نوا ز پردۂ غیب است اے مقام شناس
نہ از گلوئے غزلخواں نہ از رگِ ساز است

مجھے فطرت نوا پر پے بہ پے مجبور کرتی ہے
ابھی محفل میں شاید ہے کوئی درد آشنا باقی

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

ز عالم را تواں دیدن بہ مینائے کہ من دارم
کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم

مرے گلو میں ہے اک نغمہ جبرئیل آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لئے

اب کیا جو فغاں میری پہونچی ہے ستاروں تک
تو نے ہی سکھائی تھی مجھکو یہ غزل خوانی

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر

من اے میرِ اُمم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند

تہذیبِ حاضر کی تہی دستی اور تشنگی اور ناپائیداری کے علامہ اقبال شاکی ہیں کیونکہ اس کا دار و مدار تمامتر "عقل" پر ہے اور اسکی بناؤ بنانے میں "دل" (عشق) کا ذرا سا بھی ہاتھ نہیں۔ اس تہذیبِ نو کا انہوں نے جگہ جگہ بھانڈا پھوڑا ہے:-

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کیلئے مرگِ مفاجات

وہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اسکے کمالات کی ہے برق و بخارات

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتی ہیں آلات

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ،
"خواجگی" نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

لبالب شیشۂ تہذیبِ حاضر ہے مئے "لا" سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ "اِلّا"

دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے
بہت نیچے سُروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا

من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام
آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب!

مغرب اپنے ہر آئینِ حکومت اور طرزِ معاشرت کو آزما کر دیکھ چکا۔ مگر انسانیت ہنوز اسی دورِ ادبار و ہلاکت میں پڑی ہوئی ہے۔ اقتصادیات، معاشیات اور نہ معلوم کیا کیا بابات "عقل" نے دردِ انسانی کے علاج کیلئے وضع کیں، مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ سائنس کی مدد سے، مشینوں کے زور سے انسان نے زمین کے سینے سے دفینے اگلوائے، لہلہاتی ہوئی کھیتیاں بنجر زمینوں سے تیار کیں۔ ضرورت سے زیادہ خوراک و پوشاک پیدا کی —— مگر ننگے ننگے ہی رہے اور بھوکے بھوکے ہی۔ خود غرضی نے اپنی اقتصادی ساکھ قائم رکھنے کے لئے سامانِ خورد و نوش آتشدانوں کی نذر کر دیا مگر فاقہ کش انسانوں کو ایک دانہ دینا گوارا نہ کیا۔ عقلِ انسانی خود اپنے ہی ہاتھوں مات کھا گئی اور کیوں؟ چونکہ انسان اپنے آپ کو بھول بیٹھا، اپنے مقصدِ حیات کو گم کر کے عقل کے پُرپیچ و خم راستوں میں کھو گیا۔ عقل کی بدولت حکومت نے کلیسا اور مسجد اور معبد سے گلو خلاصی تو حاصل کر لی۔ مگر انسانی بہبودی کا راستہ نہ نکال سکی۔ "انقلابِ فرانس" جمہوریت و مساوات کے بلند بانگ دعووں کے ساتھ آیا، مگر انسانی غلامی کی زنجیریں اور مستحکم ہوگئیں۔ کیونکہ فطرت کے احکامات پس پشت ڈال دئے گئے۔ روس میں "زاریت" کا خاتمہ ہوا اور بظاہر ہر روحانی و جسمانی قید و بند سے انسان آزاد کر دیا گیا، مگر کیا وہاں بھی انسان واقعی آزاد ہے؟

عقلِ انسانی نے حیرت انگیز ایجادات کیں مگر دردِ انسانی کا علاج اس سے نہ ہو سکا۔ "پیامِ مشرق" میں ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے "طیارہ"۔ اس میں انسان اپنی علم و فراست پر ناز کرتے ہوئے ایک پرندے سے کہتا ہے کہ اگر خدا نے اس کو پر و بال عطا نہیں کئے تو کیا ہوا؟ اس نے طیارہ بنا لیا اور

کیسا طیارہ؟:۔

چو طیارہ آں مرغِ گردوں سپہر ۔۔۔ پر او ز بالِ مَلَک تیز تر
نہ پروازِ شاہیں، نہ نیرِ عقاب ۔۔۔ بہ جنبش ز لاہور تا فاریاب
بہ گردوں خرد فشندہ و تند جوش ۔۔۔ میانِ نشیمن چو ماہی خموش
خرد زآب و گِل جبرئیل آفرید ۔۔۔ زمیں را بہ گردوں دلیل آفرید!

پرندہ اس تعلّی آمیز گفتگو کے جواب میں شیخ سعدی شیرازی رح کا شعر دُہراتا ہے ؎

تو کارِ زمیں را نکو ساختی؟ ۔۔۔ کہ با آسماں نیز پرداختی؟

اور انسان سے اس کا جواب بن نہیں پڑتا، کیونکہ "زمانۂ حاضر کے انسان" کی یہ حالت ہے کہ:۔

"عشق ناپدید و خرد می گزدش صورتِ مار"

عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا

اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا

آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا

زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

"عقل" نے "دل" سے علیحدہ ہو کر ہر اعتبار سے انسانی تکالیف دور کرنے کے بجائے ان میں اضافہ ہی کیا۔ آج دُنیا ہلاکت اور تباہی کی طرف اسی عقلِ ستیزہ کار کے ہاتھوں دھکیلی جا رہی ہے۔ میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ:۔

؎ زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے
ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے

فطرت کیسے اپنے نقش کو خود اپنے ہی ہاتھوں تباہ ہوتے ہوئے دیکھ سکتی ہے؟ اس نے اپنے ترجمان اور مفسّر کے ذریعے سلامتی کا راستہ لوگوں کو دکھا دیا۔ اب لوگ اس پر عمل کریں یا نہ کریں یہ ان کا کام ہے۔ سلام و رحمت اس دانائے راز پر جس نے پہلے ہی سے اس "بُرے وقت" کا اندازہ کر کے لوگوں کو خطرہ سے آگاہ کیا تھا، سنیئے:۔

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

مرے خم و پیچ کو نجومی کی آنکھ پہچانتی نہیں ہے
ہدف سے بیگانہ تیر اس کا نظر نہیں جس کی عارفانہ

شفق نہیں مغربی اُفق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے
طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ

وہ فکرِ گستاخ جس نے عُریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

علامہ اقبال ان تمام بلاؤں کا مداوا (جو اس وقت کل عالمِ انسانیت پر چھائی ہوئی ہیں) "دین" بتلاتے ہیں۔ آپ کو غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے۔ یہ دین کسی مروجہ مذہب سے عبارت نہیں۔ یہ تمام مذاہب سے بلند چیز ہے اور اس کے معنی ہیں عشق، عرفانِ خودی، ذوقِ عمل، فقر و استغنا، ایک عالمگیر اخوت اور ایسی برادری جو نسل، رنگ، قومیت اور ہر قسم کے امتیازات سے پاک ہو۔ ان الفاظ کے معانی خود علامہ ہی کی زبان میں سنیئے:۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی ۔۔۔ نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

زندہ کن باز آں محبت را کہ از نیروئے او
بوریائے رہ نشینے در فتد با تختِ کَے

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا

تری زندگی اسی سے، تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو رُو سیاہی

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے ۔۔۔ کھوئی ہوئی شے کی جستجو کر
تاروں کی فضا ہے بیکرانہ ۔۔۔ تو بھی یہ مقامِ آرزو کر
بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت ۔۔۔ جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

کمالِ ترک نہیں آب و گِل سے مہجوری ۔۔۔ کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری
میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا ۔۔۔ تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری

تجھے گر فقر و شاہی کا بتا دوں
غریبی میں نگہبانی خودی کی
اگر خواہی خدا را فاش بینی
خودی را فاش تر دیدن بیاموز
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِّ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانی
خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
اسی "دین" سے علیحدگی اختیار کر کے دنیا نے اپنے اوپر ہر قسم کے مصائب و آلام مسلط کر لئے ہیں۔ دین و سیاست کو لازم و ملزوم ہونا چاہیئے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ سیاست اور ملائیت ہم آہنگ ہو جائیں اور جبہ و دستار تخت و تاج کے مستحق قرار دے جائیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اربابِ سیاست خدا ترس اور زیورِ نیت سے مزین ہوں۔ کیونکہ جس "دین" کا علامہ اقبال ذکر کرتے ہیں وہ عین فطرت و انسانیت ہے۔ موجودہ مغربی طرزِ حکومت کی ناکامی کا راز علامہ اقبال نے فاش کیا ہے۔

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی	سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں	کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا	چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی	ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری!
دوئی ملک و دیں کیلئے نامرادی	دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا	بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری
جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی
علامہ اقبال کا خطاب صرف مسلمانوں سے نہیں بلکہ تمام عالم انسانیت سے ہے۔ اُنکی نصیحتوں پر عمل کر کے ہر قوم و ملت فلاحِ دارین حاصل کر سکتی ہے وہ خود مردِ آفاقی تھے جس کی تعریف وہ خود یوں کرتے ہیں۔
نہ چینی و عربی وہ نہ رومی و شامی
سما سکا نہ دو عالم میں مردِ آفاقی
کی حق سے فرشتوں نے اقبال کی غمازی
گستاخ ہے، کرتا ہے فطرت کی حنابندی
خاکی ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی
رومی ہے نہ شامی ہے کاشی نہ سمرقندی
سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے
آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی
کرینگے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد
من اول آدم بے رنگ و بویم
ازاں پس ہندی و تورانیم من
فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند
درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلّی نہ صفاہاں نہ سمرقند

اُن کے بہت سے معترضین کہتے ہیں کہ وہ Parochial ہیں کیونکہ اسلام کا ذکر کرتے ہیں۔ میں اس بحث میں زیادہ وقت صرف نہ کرونگا، صرف اتنا عرض کروںگا کہ علامہ اقبال جس اسلام کا ذکر کرتے ہیں وہ موجودہ اسلام نہیں جس کی شکل خارجی اور مقامی اثرات کے باعث مسخ ہو چکی ہے۔ وہ تو خود مروجہ اسلام کے مخالف ہیں۔ دیکھئے:۔

کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں؟
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات!

ہاں، وہ اس اسلام کے مفسر ہیں جو صحیح معنوں میں تفسیرِ حیات اور زندہ قوموں کے لئے دستور العمل تھا۔ جو تمام دُنیا کی قوموں، ہر زمانہ اور ہر ملک کے لئے تھا، جس کے فطری اُصول پر عمل کر کے انسانیت اب بھی اپنے دکھوں سے نجات حاصل کر سکتی ہے، جو صحیح معنوں میں "سلامتی" تھا جس کے بارے میں خود علامہ اقبال نے کہا ہے:۔

ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتہ سے اب تک بےخبر

یہ اسلام کسی قوم اور کسی ملک کی میراث نہیں۔ اس کی نظر میں تُرکِ خرگاہی، اعرابیِ والا گہر، سلمانِ فارسی، اور بلالِ حبشی سب ایک ہیں۔ اس میں افتخار اور عزت اُسی کو دی جاتی ہے جس کے اعمال نیک ہوں۔ اگر قوانینِ فطرت کے اس مفسر کو (جن کے مجموعہ کا نام بدقسمتی سے اسلام ہے!) Parochial کہا جائے تو یہ کہنے والے کی سمجھ کا قصور نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا ایک متعصب شخص یہ اشعار کہہ سکتا ہے؟:۔

شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

تعصب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے بُرا تُو نے

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

مٹایا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو
مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہو

اگر علامہ اقبال متعصب ہوتے تو رامچندر جی کی شجاعت اور محبت سے متاثر ہو کر یہ شعر نہ لکھتے:۔

تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوشِ محبت میں فرد تھا

وہ عمل کے حامی ہیں۔ ترکوں کی جہدِ آزادی کو دیکھکر ان کا خون جوش میں آجاتا ہے اور وہ نغمہ سرائی کرنے لگتے ہیں:۔

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

لیکن آزادی حاصل کرنے کے بعد جب تُرک اپنی خودی کو چھوڑ کر ہمسایوں کی تقلید کرنے لگے تو پھر علامہ نے ان کا اس طرح کبھی ذکر نہ کیا۔

وہ ہر نظرِ حرکت سے متاثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اطالویوں کو سرگرمِ عمل پاکر وہ مسولینی پر ایک تعریفی نظم لکھتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں، جیسا بہت سے ناسمجھوں نے سمجھا، کہ علامہ اقبال فاشسطیت کے حامی اور ترجمان تھے۔ وہ تو محض تب و تابِ جاودانہ چاہتے ہیں جو خود مقصودِ فطرت ہے۔ کہتے ہیں:۔

مرے خاک و خوں سے پیدا یہ جہاں کیا ہے تُو نے
صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تابِ جاودانہ

بہت سے لوگ علامہ اقبال کی شاعری کی ارتقا کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شاعری کو مختلف ادوار میں منقسم کرتے ہیں اور کچھ لوگ تو یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ اُن کا آخر عمر کا کلام حد درجہ خشک اور غیر شاعرانہ ہو گیا تھا۔ مجھے اس رائے سے اختلاف ہے۔ اگر آپ غور فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ علامہ اقبال شروع سے آخر تک اپنے مسلکِ شاعری پر ثابت قدم رہے اور جس فرض کے پورا کرنے پر فطرت نے انہیں مامور کیا تھا اُسے کبھی نہیں بھولے۔ پیرایۂ اظہار میں فطری طور پر تبدیلیاں ہوتی رہیں مگر موضوعِ سخن وہی رہا۔ یعنی انکشافِ حقائق۔ خود انہوں نے اپنے بارے میں کتنی صداقت سے فرمایا ہے:۔

اسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

"بانگِ درا" کی شروع کی نظموں کو لیجئے۔ آپ کو ان میں بھی فلسفۂ خودی کی تشکیل ہوتی نظر آئے گی۔ وہ شروع ہی سے غور و فکر اور اپنے آپ کو سمجھنے کی دُھن میں لگے ہوئے تھے، یہ خصوصیت انکے شروع اور آخر کے کلام میں مشترک ہے۔

اپنے "عہدِ طفلی" کا ذکر کرتے ہوئے وہ نہایت خلوص سے فرماتے ہیں:۔

آنکھ وقفِ دید تھی، لب مائلِ گفتار تھا
دل نہ تھا میرا سراپا ذوقِ استفسار تھا

اوائلِ عمر ہی سے وہ غور و فکر میں مصروف رہتے تھے اور ہر شے کی ماہیت جاننے کے لئے بےچین تھے اور یہ بےچینی اور ذوقِ استفسار فطرت کا عطیہ تھا۔

یہ نہ بھول جانا چاہئے کہ پیغمبرِ عرب صلعم نے بھی چالیس سال غور و خوض اور مشاہدے کے بعد اپنا پیغام دنیا کو سنایا تھا۔

"بانگِ درا" میں ایک جگہ علامہ اقبال کہتے ہیں ؎

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہوں میں

اس ذوقِ جستجو کی منزل اُن کا آخری عمر کا کلام ہے۔

شروع میں تو مناظرِ فطرت کی پہنائیوں اور تنہائیوں میں بھی انکو اپنی حقیقت پہچاننے کا درس ملتا تھا۔ "کوہستانِ ہمالہ" سے فرماتے ہیں:

سوئے خلوت گاہِ دل دامن کشِ انساں ہے تو

یا

کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کنجِ خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

"جنتِ کشمیر" کی رنگینیوں اور رعنائیوں میں بھی وہ اپنے آپ سے غافل نہیں ہوتے۔ دیکھئے:

دختر کے رہینے لالہ رُخے سمن برے
چشم بروئے او کشا، باز بہ خویشتن نگر

"انسان اور بزمِ قدرت" میں خود ہی سوال کرتے ہیں اور خود ہی جواب دیتے ہیں۔

سوال:
نور سے دور ہوں، ظلمت میں گرفتار ہوں میں
کیوں سیہ روز و سیہ بخت و سیہ کار ہوں میں؟

جواب:
آہ! اے رازِ عیاں کے نہ سمجھنے والے
حلقۂ دامِ تمنا میں اُلجھنے والے
ہائے غفلت کہ تری آنکھ ہے پابندِ مجاز
نازِ زیبا تھا تجھے، تو ہے مگر گرمِ نیاز
تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے
نہ سیہ روز رہے پھر نہ سیہ کار رہے

اپنی نظم "خفتگانِ خاک سے استفسار" میں انہوں نے وہ ازلی سوالات موت و حیات کے بارے میں پوچھے ہیں جن کے جوابات کیلئے انسانیت ہمیشہ اپنے آپ سے اُلجھتی رہی ہے۔ اس نظم میں سوالات ہی سوالات ہیں۔ یہ اسی ذوقِ استفسار کا مظاہرہ ہے۔ ان کے بعد کے کلام میں ان تمام سوالات کے جوابات مکمل اور مدلل طریقے پر دئے گئے ہیں۔ ہر شخص کی زندگی میں کبھی نہ کبھی ایسا وقت آتا ہے کہ وہ شک و شبہ میں گرفتار ہو جاتا ہے کیونکہ جو ازلی سوالات اُسکے اندر سے پیدا ہوتے ہیں اُنکے خاطر خواہ جوابات اُسے نہیں ملتے۔ مثلاً:

"ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جائیں گے؟ یہ زندگی کی لعنت کیوں ہم پر مسلط کر دی گئی ہے؟ اُمیدیں، خطرات، واہمے، ذہنی اور جسمانی تکالیف کیوں ہوتی ہیں؟ آخر اس زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اس کی انتہا کیا ہے؟ کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟ کیوں نہ اسے ختم کرکے رہائی حاصل کی جائے؟ کیوں ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں خواہشیں، آرزوئیں اور ارمان پیدا تو ہوتے ہیں مگر پورے نہیں ہوتے؟ انسان کیوں اپنے مقامی اثرات سوسائٹی اور ماحول کے تعصبات، ظلم و ستم اور رسم و رواج کی قربانگاہ پر چڑھا دیا جاتا ہے؟"

"کیوں؟" اور "کیوں نہیں؟" کے ایک لامتناہی سلسلہ میں انسان جکڑ کر رہ جاتا ہے۔ اس تذبذب اور بے چینی اور بے یقینی سے افراد ہی نہیں بلکہ قومیں بھی دوچار ہوتی ہیں۔ علامہ اقبال ہم کو ان سب سوالات کے جوابات شخصی اور اجتماعی دونوں طریقوں پر دیتے ہیں۔ اور ہماری بے بسی، کمزوری اور توہمات کا سیدھا سادا علاج بتاتے ہیں:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

جو فلسفۂ زندگی وہ پیش کرتے ہیں اُس پر عمل کر کے نہ صرف فرد اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکتا ہے بلکہ قومیں بھی اپنے امراضِ دیرینہ سے شفا پاسکتی ہیں۔ ہندوستان میں جتنی قومیں آباد ہیں ان پر فلسفۂ ویدانت، اہنسا اور تیاگ کے نظرئے اس درجہ چھا گئے ہیں کہ ان کے قلب و نظر کو ان کے اثرات سے پاک کرنا دشوار ہے۔ تصوفِ اسلام میں بھی اگر ایک طرف یہ اثرات پائے جاتے ہیں تو دوسری طرف فلسفۂ یونان ساتھ ہی ساتھ اپنا زہر پھیلا چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل کے مسلمان بھی رہبانیت اور تقدیر کے پنجوں میں اسیر نظر آتے ہیں۔ یہ فلسفۂ تقدیر انسانیت اور فطرت کے خلاف ہے کیونکہ یہ لوگوں کو مجہولیت اور بے عملی کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی کی وجہ سے علم و عرفان دونوں جاں بلب ہیں۔ علامہ اقبال موجودہ تصوف اور فقہ دونوں کے مخالف ہیں۔

نہ باہانہ حرارت رہی نہ صوفی میں۔

بہانۂ بے عملی کا بنی شرابِ الست
فقیہہ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور
کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگِ دست بدست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

لوگوں نے اپنی کم ہمتی، کمزوری، اور خامی کے ناگوار احساس سے بچنے

کیلئے یہ لفظ "تقدیر" تراش لیا ہے اور وہ اپنی ہر لغزش اور ناکامی اور مصیبت کو اس خیالی تقدیر سے منسوب کر دیتے ہیں۔ عمل پر قادر نہیں اس لئے اس تقدیر کے طلسم میں پھنس کر نجوم، فال دیکھنے والوں، تام نہاد غیب دانوں اور بندۂ شکم پیروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں، را طلب میں مردانہ وار گامزن نہیں ہوتے، چونکہ مونشانِ خودی نہیں اور خود اعتمادی مفقود ہے اس لئے کسی بات کا یقین نہیں۔ ان لوگوں سے علامہ اقبال فرماتے ہیں:-

نہ ستارے میں ہے، نے گردشِ افلاک میں ہے
تیری تقدیر مرے نالۂ بیباک میں ہے

توڑ ڈالے گی یہی خاک طلسمِ شب و روز
گرچہ الجھی ہوئی تقدیر کے پیچاک میں ہے

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاک زندہ ہے تو، تابعِ ستارہ نہیں

نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازیِ افلاک
• خودی کی موت ہے تیرا زوالِ عزت و جاہ

تلاش اس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا
جہانِ تازہ مری آہِ صبحگاہ میں ہے

پڑھیئے، پڑھیئے، اور عمل کیجئے اس "پیغامِ فطرت" پر۔

باضعیفاں گاہ نیروئے پلنگاں می دہند
شعلۂ شاید برون آید ز فانوسِ حباب

انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!

جلدی کیجئے، کیونکہ معلوم نہیں فطرت کو پھر اپنا دوسرا ترجمان پیدا کرنے کیلئے کتنے قرن درکار ہونگے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

دیکھئے، قلندر نے نہ صرف اسرارِ فطرت کو بے نقاب کیا ہے بلکہ ماورائے فطرت بھی اسکی نگاہ پہونچی ہے۔

سما سکتا نہ تھا پہنائے فطرت میں مرا سودا • غلط تھا اے جنوں شاید ترا اندازۂ صحرا

اس نے موت و حیات کے تمام مسائل کا حل پیش کر دیا ہے: انسان اور خدا، یزداں اور اہرمن، خیر و شر، جزا و سزا سب ہی کے راز فاش کر دئے ہیں۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید

سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

(آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی)

مظہر عزیز۔ ایم۔ اے

من کا مَیل

میں کیا جانوں غم کیا شے ہے
اور آنکھوں کا نم کیا شے ہے

یہ بستی بسنے کے لئے ہے
یہ ہستی ہنسنے کیلئے ہے

کیوں چیخوں کیوں اشک بہاؤں
خاک میں کیوں تاروں کو ملاؤں

دُنیا کب جنت سے کم ہے
بس تیری آنکھوں میں نم ہے

تجھکو ہنسنے سے کس نے روکا؟
بس اندازِ نظر کا دھوکا!

کان دھر دل کی دھڑکن پر
دیکھ، گھٹا چھائی ہے بن پر

نیم کی شاخیں جھوم رہی ہیں
نیچے بھیڑیں گھوم رہی ہیں

دُور پپیہا بول رہا ہے
جھونکوں میں رس گھول رہا ہے

وہ الھڑ چرواہی آئی،
ماتھے پر اک مہر طلائی

اُڑتے ہیں جب بال ہوا میں
ناگ سے بل کھاتے ہیں فضا میں

ہونٹ گلابی سیب کی ڈلیاں
چٹکی ہوئی گالوں میں کلیاں

آنکھوں میں سپنوں کے سمندر
آنچل پھیلائے سینے پر

بھاگ اٹھی بارش کے ڈر سے
لیکن کوسوں دور ہے گھر سے

تنگ گپھا میں چھپ جائیگی
من گیتوں سے پرچائے گی

یا چقماق کے محل بنا کر
اور انہیں پھولوں سے سجا کر (ق)

اک پل میں تیار کرے گی
اک پل میں مسمار کرے گی

شام پڑے گھر لوٹ آئے گی
اور سمٹ کر سو جائے گی

اسکی پیاری چال تو دیکھو
ٹخنوں پر خلخال تو دیکھو

دل کی دھڑکن پر مت جاؤ
دُنیا کو دوزخ نہ بناؤ

آؤ ہنسیں ناچیں اور گائیں
گیتوں کی دھن میں کھو جائیں

ہستی کو مستی میں ڈبوئیں
مے سے من کے مَیل کو دھوئیں

احمد ندیم قاسمی

ایک ایکٹ کا ڈرامہ۔

دیوتاؤں کے سائے تلے

(ترقی کے اس دور میں، جب شہریوں کی زندگی کا معیار روز بروز اونچا ہوتا جا رہا ہے، اور شہروں کے تنگ، گندے، نمدار مکانوں میں انکا دم گھٹنے لگا ہے، بڑے بڑے نگروں کے ارد گرد میلوں تک نئی آبادیاں بستی چلی جا رہی ہیں۔ جن میں سے کئی دیہات کے بہت نزدیک تک پھیل گئی ہیں۔

کاکوکے۔ ایسی ہی ایک نئی آبادی کے پاس دو اڑھائی سو کچے گھروں کا ایک گاؤں ہے۔ ایک کاروباری سوسائٹی نے جو مہذب بیوپار کے آرٹ میں کامل ہے، اسکے پاس ہی تین چار سو ایکڑ بنجر زمین سستے داموں خرید لی ہے۔ اور پھر اس اپیل پر کہ اس دھرتی میں ایک نئے سماج کی بنیاد رکھی جائیگی جو فرقہ کی جگہ انسان سے محبت کرنا سکھائیگا اور ملک کے غریب اور معلوک الحال کسانوں کا سدھار کریگا مہنگے داموں پلاٹ فروخت کرکے "دیونگر" نام سے ایک نئی بستی کی بنیاد رکھی ہے۔ نواحی دیہات کے مزدور وہاں صبح سات آٹھ بجے سے شام کے سات آٹھ بجے تک سخت سردی یا سخت گرمی میں کام کرتے ہیں اور پانچ چھ آنے روزانہ مزدوری پاتے ہیں۔ اور وہ لوگ بڑے فخر سے رسائل و جرائد میں اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ انہوں نے لاکھوں روپے دیہات میں تقسیم کر دئے ہیں۔ اوران کے نگر کے نواحی گاؤں خوشحال ہو رہے ہیں

اسی کاکوکے کے ایک صحن میں پردہ اٹھتا ہے۔

مرجانہ بیٹھی اوکھلی میں دھان کوٹ رہی ہے۔ اوکھلی دھرتی میں گڑی ہوئی ہے۔ اس کے ارد گرد کی زمین پر ذرا اونچی اونچی مٹی کی تہ جما کر گوبری کر دی گئی ہے۔ موسل کی دھمک سے دھان اچھل اچھل کر باہر بکھر بکھر جاتے ہیں اور وہ انہیں پھر سمیٹ سمیٹ کر اوکھلی میں ڈالکر کوٹے جاتی ہے۔

مرجانہ سولہ سترہ برس کی دیہاتی لڑکی ہے۔ جسم بھرا ہوا اور سڈول ہے۔ رنگ گورا، لیکن ناصاف، بال روکھے اور الجھے۔ دو دو چار چار لٹیں دونوں طرف گالوں پر بکھری ہوئی ہیں۔ اوڑھنی کے نام پر پرانی دھرانی سی لوئی کا ٹکڑا سر پر ہے۔ جو دھان کوٹتے وقت کندھوں پر آ رہتا ہے۔

اوکھلی کے دائیں طرف مرجانہ کے پیچھے رسوئی ہے، جس کا بے چوکھٹ کا دروازہ کونے میں ہے۔ سامنے دو کوٹھڑیاں ہیں جن میں سے ایک کا دروازہ کھلا ہے، اور ایک کا بند، ایک تیسری کوٹھڑی کا دروازہ رسوئی کے بے چوکھٹ کے دروازے سے دکھائی دیتا ہے۔ رسوائی کی دیوار سات آٹھ فٹ سے کچھ ہی اونچی ہے۔ اس میں ایک جھروکا ہے، جس میں سے دھواں نکل کر دیوار کو سیاہ کر چکا ہے۔ اسی جھروکے کے نیچے کھونٹی سے چھاج لٹک رہا ہے۔

بائیں طرف اور رسوئی کے ادھر کو دائیں طرف، کچی، رسوئی جتنی ہی اونچی چار دیواری ہے۔ جس کے ساتھ ساتھ کچھ گل داؤدی کے پودے لگے ہوئے ہیں۔ بائیں طرف کی دیوار میں اسٹیج کی طرف کو گلی کا دروازہ ہے۔

آنگن میں ایک چارپائی پڑی ہے، جس کے پائے اور بان بیحد گھٹیا قسم کے ہیں۔ اسی چارپائی کے پاس بائیں طرف کو کچھ ہٹ کر دھریک (بکائن) کا ایک نوخیز درخت ہے۔ جو سرد ہوا کے جھونکوں سے کبھی کبھی ٹھٹھر اٹھتا ہے۔

مرجانہ چپ چاپ دھان کوٹ رہی ہے۔ ادھ کٹے دھانوں کا ڈھیر اسکے پاس لگا ہوا ہے۔ کاتک کو بیتے ابھی کچھ ہی دن گذرے ہیں۔ آسمان پر آج سارا دن بادل رہے ہیں۔ اور دھوپ نکلی بھی ہے تو سفید سفید سی، مرجھائی مرجھائی سی۔ دق کی مریضہ کی مسکراہٹ کی طرح ـــــ سرخی کہاں، اس میں زردی کا نشان تک نہیں۔

سرد ہوا کا ایک جھونکا آتا ہے اور ایک جھرجھری سی لیکر اور اوڑھنی کو سر پر کر کے وہ جلدی جلدی موسل چلانے لگتی ہے۔

گلی کے دروازے سے بھاگتی لیکن کانپتی ٹھٹھرتی ہوتی نوری داخل ہوتی ہے اور دھم سے آکر مرجانہ کے سامنے بیٹھ جاتی ہے۔ مرجانہ نہیں بولتی۔ سر نیچا کئے خاموشی سے دھان کوٹے جاتی ہے ـــــ)

نوری:۔ مرجی، مرجی!

(مرجانہ خاموشی سے موسل چلائے جاتی ہے)

نوری:۔ (پیار سے) مرجانی!

(مرجانہ چپ)

نوری:۔ (چڑاکر شرارت سے) مَر۔ جانی[1]

مرجانہ:۔ (سر اٹھاکر اور جھٹکے سے بالوں کی لٹوں کو پیچھے کرکے) میں نے تمہیں کتنی بار کہا ہے نوری کہ گالی نہ دیا کرو۔

(پھر موسل چلاتی ہے۔)

نوری:۔ اوہو! بڑے مزاج تیز ہیں میری بی بی کے۔ آج رحمے سے جھگڑا ہوگیا ہوگا.......

مرجانہ:۔ (کوٹنا چھوڑ کر) میں کہتی ہوں، تم باز نہ آؤگی۔

(مُنہ سُرخ ہوجاتا ہے)

نوری:۔ میں پوچھتی ہوں، بندر کی بلا طویلے کے سر کیوں؟ بھائی رحیم روٹھ گئے ہونگے تو مَن جائیں گے۔ کب تک روٹھیں گے؟ آخر پڑنا تو انہیں ایکدن تمہارے ہی پاؤں پر ہے نہ۔ آج منگیتر ہیں تو کل.....

مرجانہ:۔ (موسل اٹھاکر) تو پٹے بغیر نہ مانے گی۔

(نوری اُٹھکر بھاگتی ہے۔ مرجانہ موسل اٹھاکر اس کے پیچھے بھاگتی ہے۔ دونوں چارپائی کے اردگرد چکر کاٹتی ہیں۔ دھریک کا درخت آہستہ آہستہ ہلتا ہے۔)

(بیگاں۔ (مرجانہ کی ماں) تیسری کوٹھڑی سے رسوئی کے دروازے میں سے ہوتی ہوئی نکلتی ہے۔ کھونٹی سے چھاج اُٹھاتی ہے)

بیگاں:۔ اری یہ کیا دھما چوکڑی مچا رکھی ہے۔ یہ دھان کوٹے جارہے ہیں یا زمین ـــ!

(اوکھلی کے پاس بیٹھکر پھٹکنے کے لئے دھان چھاج میں بھرتی ہے)

ـــ شرم نہیں آتی تجھے!

(نوری دھم سے آکر اس کے پاس بیٹھ جاتی ہے۔ کچھ شرمندہ سی ہوکر مرجانہ بھی آبیٹھتی ہے۔ موسل چلانے لگتی ہے، بیگاں دھان پھٹکتی ہے)

بیگاں:۔ اتنی بڑی ہوگئی ہے۔ ابھی بچوں کی طرح بھاگ دوڑ کر رہی ہے، تمہارے جتنی لڑکیاں تو دو دو بچوں کی مائیں ہیں۔ (ہاتھ سے بھوسی چاولوں سے الگ کرتی ہوئی۔) اور کیوں ری نوری، کوئی کام نہیں تجھے؟

نوری:۔ میں تو چچی، بھری کے شوہر کی بات سُنانے آئی تھی کہ یہ میرے پیچھے پڑگئی۔

مرجانہ:۔ (کوٹنا چھوڑ کر) گالی نہیں دی تُونے؟

نوری:۔ میں نے گالی دی۔ اللہ قسم میں نے تو پیار سے مرجانی کہکر بلایا تھا۔

مرجانہ:۔ مر ـــ جانی!

بیگاں:۔ (پھٹکنا چھوڑ کر) کیا ہوا بھری کے شوہر کو؟

نوری:۔ میں نے 'مر۔ جانی' کب کہا۔ روٹھی بیٹھی ہے کسی سے اور لڑتی ہے کسی سے، آلینے دے بھائی رحیم کو.....

(شرارت سے مرجانہ کی طرف دیکھتی ہے۔ مرجانہ قہر بھری نظر سے ایک بار اسکی طرف دیکھکر پھر جلدی جلدی دھان کوٹنے لگتی ہے۔)

بیگاں:۔ (اشتیاق سے) بھری کے خاوند کی کیا بات تھی؟

نوری:۔ کل بکوا لیکر اپنی ساس کے گھر جا پہونچا۔ رجی لاہور گئی ہوئی تھی۔ گھر میں اس کی بہن اور اُس کی لڑکی تھی۔ وہ بھری کو زبردستی اُٹھانے لگا۔ بہن نے روکا تو بل پڑا اُس پر۔ کہنے لگا: میں قتل کردونگا سب کو۔ اسنے ہائے توبہ مچائی تو لوگ اکٹھے ہوگئے۔

(رجی پریشان، گھبرائی ہوئی، پُرنم آنکھیں لئے داخل ہوتی ہے۔)

رجی:۔ (آتے آتے) سُنی مرجی کی اماں، تو نے اس لڑکے کی بات! میں تو ابھی آئی لاہور، معلوم ہوا کہ رات قتل کرنے چڑھ دوڑا۔ (بیٹھکر آنسو پونچھتے ہوئے بھرے ہوئے گلے سے) میری بہن تک پر اُس نے ہاتھ اُٹھایا۔ میں تو اب پنچایت سے فیصلہ کرواکے رہونگی۔

بیگاں:۔ میں نے ابھی نوری سے سُنا۔ لیکن وہ تو گیا ہوا تھا۔

رجی:۔ گیا تھا جہنم میں۔ یہاں حلوائی کی دکان کھولی تھی۔ جو بناتا تھا وہ اپنے یاروں دوستوں کو کھلا دیتا تھا کہ وہ ہمیں تنگ کریں۔ چھ روپیہ نگوڑا سال کا کرایہ، وہ تو دکان سے نکال نہ سکا۔ اور کیا تیر ماریتا؟ پھر پھیرا لگانے لگا لیکن پھیرا لگانا کیا آسان ہے؟ جوانوں کی موت مرنا ہے۔ دُھول اور مٹی میں گاؤں گاؤں خونچہ اُٹھائے پھرنا اور پیسہ پیسہ کرکے دام وصول کرنا۔ اسے چھوڑ تانگہ چلانے لگا۔ پھر سُنا تھا فوج میں بھرتی ہونے چلا گیا ہے۔ میں نے سکھ کی سانس لی تھی۔ لیکن کل پھر کہیں آسمان سے آٹپکا۔

(دھیرے دھیرے سسکنے لگتی ہے۔ بیگاں ایک دوبار دھان پھٹکتی ہے۔ مرجانہ چپ چاپ اپنے خیالات میں محو، دھان کوٹے جاتی ہے)

---

[1] مرنے کے قابل۔

رحجی:۔ (آنسو پونچھکر) کرنے کو کام کی کیا کمی ہے۔ اپنی کھیتی باڑی، تو نیہ گئی بھاڑ میں۔ کھیت ہی میرے کماؤ نے گروی رکھ دئے۔ لیکن نزدیک تک لیں رہا ہے۔ خدا نے گھر بیٹھے روزی دی ہے۔ دوسرے لڑکے بھی تو مزدوری کرتے ہیں۔ لیکن مزدوری کرنا تو وہ اپنی توہین سمجھتا ہے۔ (پھر گلا بھر آتا ہے) خود بیکار اور آوارہ پھرتا ہے اور غصہ ہوتا ہے میری غریب بیٹی پر۔

(گلا صاف کرتی ہے اور دوپٹے سے آنسو پونچھتی ہے)

بیگاں:۔ ہاں اور کچھ نہیں تو پانچ چھ آنے روزانہ تو کما کر لا ہی سکتا ہے۔

رحجی:۔ کما کر کیا لائے گا خاک؟ اسے تو ان کی نقل کی پڑی ہوئی ہے جو اسے پردہ نہ کرنے دونگا، میں اسے سیر کرانے لے جایا کرونگا۔ یہ کچھ پڑھتی پڑھاتی نہیں کہ کوئی پوچھے تو۔ آٹھ جماعتیں پڑھکے کون سی کلکٹری کرنی ہے۔ وہ ایک بار لاہور گیا، وہاں سے خوشبودار صابن، تیل اور نہ جانے کیا کیا فضول کی چیزیں لے آیا جو دس بیس بیگھے زمین تھی انہی جھنجھٹوں میں گروی رکھدی۔ بہری کی ٹومیں تک بیچ باچ کر کھا ڈالیں۔ اور اس پر دم دہی ہے کہ ٹوکری نہ اُٹھاؤنگا۔ بھلا بی بی، بتاؤ، ہم ان امیروں کی برابری کر سکتے ہیں۔

بیگاں:۔ اللہ اللہ کرو۔

(ہمدردی سے بھری ہوئی لمبی سانس کھینچتی ہے)

رحجی:۔ میں تو کسی کو منہ دکھانے کی نہیں رہی مرجی کی اماں۔ سب کے خلاف ہوکر تو میں نے یہ ناطہ کیا۔ بہری کے تایا اپنے لڑکے کے لئے کتنا زور دے رہے تھے لیکن نند پیچھے پڑی تھی اپنے اس کپوت کے لئے اور پھر اللہ جانتا ہے جو میں نے ایک پیسہ بھی لیا ہو۔ سوچتی تھی سب یہی کہیں گے کہ رانڈ لڑکی کے دام لیکر موج اُڑا رہی ہے۔

(بیگاں پھر دھان پھٹکنے لگتی ہے۔ مرجانہ چپ چاپ موسل چلائے جاتی ہے، جیسے اسے بہری کی اس اماں کے افسانۂ غم سے کسی طرح کی دلچسپی نہ ہو۔)

رحجی:۔ (بدستور بھرے ہوئے گلے سے) میں تو کچھ نہیں چاہتی بھائی (ہاتھ کو ہوا میں پھیرتی ہے) وہ چوری کرے، یاری کرے، دکان کرے، تانگہ چلائے، بس ہمیں خلاصی دے۔

(اُٹھ کر پودوں میں گلا صاف کرنے جاتی ہے اور پھر آکر بیٹھ جاتی ہے۔)

نوری:۔ پھوپی۔ اگر وہ لے جانا چاہتا ہے تو تم کیوں نہیں بھیج دیتیں اس کے ساتھ؟

رحجی:۔ نا بی بی اب نہیں، دو بار بھیج چکی ہوں۔ لیکن وہ تو اسے پیٹتا ہے، اس کی پردادی تک نے جو باتیں نہ کیں وہ سب اُسے کرنے کو کہتا ہے۔ نہیں کرتی تو گنڈاسہ اور ٹکوا دکھاتا ہے۔ بہری کو تو تم جانتی ہو۔ سارا گاؤں اس کی گواہی دیگا۔ اس بے زبان کا کیا ہے؟ جیسے دھرتی کو پیٹ لیا، ویسے اسے پیٹ لیا۔ زمین جائداد خود گروی رکھدی، جو دو گہنے تھے خود اڑا دئے، اب غصہ اس پر اتارتا ہے۔ بہری کے تایا اس دن نند کے گھر گئے، یہ سُنکر کہ بہری کو زدوکوب کیا جا رہا ہے۔ بس انہیں دیکھتے ہی صادق کے سر پر خون سوار ہوگیا۔ کہنے لگا۔ میں اسے یہیں قتل کر دونگا۔ تب اس شریف آدمی نے کہا کہ بیٹا تو قتل کیوں کرتا ہے، میں ہی اسے ساتھ لے جاتا ہوں اور ابھی دس دن نہیں ہوئے اس بات کو کہ کل ٹکوا لیکر چڑھ دوڑا۔ ادھیڑ رہ سکتی ہے، پھر روتے روتے) نہ بھائی میں نہیں بھیجتی۔ (پھر آنسو پونچھ کر) بخشو بھی تلی چوہا لنڈورا ہی بھلا۔ (کانوں تک ہاتھ لے جاتی ہے۔) بھاڑ میں جائے سونا جو کان کاٹے۔ میں تو بی بی پہلے ہی غموں کی ماری ہوں۔ بہری دو برس کی تھی جب اسکے ابا کا انتقال ہوگیا۔ اس دقت سے نہ جانے کس طرح محنت مزدوری کرکے اسے پالا تھا۔ سنتی تھی لڑکا اچھے مزاج کا نہیں۔ لوگوں سے لڑ جھگڑ آتا ہے، لیکن نند نے کہا۔ لوگوں سے لاکھ لڑلے۔ اپنے گھر سے تو سب بنا کر رکھتے ہیں۔ (اچانک گلا بھر کر) نا بھائی، میں تو اب کچھ نہیں چاہتی بس اسے خلاصی دے۔

(آنکھوں سے آنسو پونچھتی ہے۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آتا ہے، دھریک کا درخت جھرجھری سی لیتا ہے۔)

بیگاں:۔ سوکھی ٹھنڈ پڑ رہی ہے۔ (جھرجھری لیکر) ہڈیوں میں گھسی جا رہی ہے۔ نوری بیٹی ذرا رسوئی سے انگیٹھی میں کوئلے تو ڈال لا۔ ہاتھ یخ ہو رہے ہیں۔

(نوری اُٹھ کر جاتی ہے۔)

۔ اور تو مرجانہ، کوئی کپڑا لے لے، یہ پالا تو......

(پھر جھرجھری لیتی ہے، مرجانہ جواب نہیں دیتی، اوکھلی سے کوٹے ہوئے دھان نکال کر باہر کر دیتی ہے اور پاس پڑی ٹوکری سے اور ڈال دیتی ہے اور موسل اٹھا لیتی ہے۔)

رحجی:۔ میں تو مرجی کی اماں پرسوں ہی آجاتی، لیکن ٹھنڈی سڑک پر ایک عمارت گر پڑی۔

بیگاں:۔ عمارت گر پڑی۔

رحجی:۔ ہاں ٹھنڈی سڑک کے عین اوپر۔ کسی کمپنی کا دفتر بن رہا تھا، تین منزلہ۔ ٹھیکے دار نے مصالحہ ہلکا لگایا یا نہ جانے کیا ہوا بس تیسری

منزل کی چھت آپڑی۔ بیس ایک مزدور نیچے آگئے۔

(مرجانہ اچانک کوٹنا چھوڑ دیتی ہے، اور سننے لگتی ہے۔)

بیگاں۔ بیس مزدور نیچے آگئے۔ اللہ رحم کرے، کوئی مرا تو نہیں۔

رجی۔ میرے بھائی کا لڑکا کام کرتا تھا۔ وہ تو بچ گیا۔ صرف ایک بازو ہی ٹوٹا۔ لیکن کئی بچارے دب گئے (کچھ کانپ کر) وہ بچارے تو پہچانے ہی نہیں جاتے تھے۔ للٹن (رنٹل) کی چھت تھی۔ لوہے کی کھپچیاں انکے دار پار ہوگئیں۔ ہڈیاں نکل آئیں۔ ہے میرے اللہ۔ . . .

مرجانہ۔ (اچانک بھرائی ہوئی آواز میں) اماں!

(اسکی آواز کی تشویش اور فکر سے سبھی چونک پڑتی ہیں۔)

بیگاں:۔ کیا بات ہے؟

مرجانہ:۔ رحیم کو اب کام پر نہ جانے دینا۔

بیگاں:۔ کیوں بیٹی؟

مرجانہ:۔ میں جو کہتی ہوں۔

(آواز میں اور بھی زیادہ نمی ہے)

بیگاں:۔ لیکن کیوں؟

مرجانہ:۔ اس نگر میں بھی تو اتنے اونچے اونچے مکان بنتے ہیں۔ اور رحیم بھی کچھ ایسا ہی نام لیا کرتا ہے۔ نلٹن یا لنٹن، جس کی چھتیں پڑتی ہیں۔

بیگاں۔ اللہ سب کا رکھوالا ہے بیٹی۔

مرجانہ:۔ وہ تو ہے، لیکن ماں کون جانے (کانپ کر) کوئی پانچ چھ آنے روزانہ کیلئے جان تو نہیں گنوا لینا۔

رجی:۔ بچی جس کی آ لگے اُسے کون بچا سکتا ہے، اور جس کی بنی ہوئی ہو اسے کون ہٹا سکتا ہے۔ ان بیچاروں کی تو آ لگی تھی۔ نہیں تو ہزاروں مکان بنتے ہیں کوئی سب تھوڑے ہی گر پڑتے ہیں۔ اور پھر وہاں ایک تانگے والا تانگہ کھڑا کر کے آرام کر رہا تھا وہ مر گیا۔ ایک سائیکل والا مر گیا۔ وہ کوئی مزدور تھے؟

(مرجانہ پھر موسل کی ضرب لگاتی ہے، لیکن اس کا من بے چین ہے، ایک چوٹ نہیں لگاتی (موسل رکھ دیتی ہے۔)

مرجانہ:۔ لیکن ماں اور بھی تو کام ہیں وہاں۔ سڑکیں بنانا، مٹی اٹھانا، پانی لانا، صفائی کرنا۔۔۔ وہ ان میں سے کوئی کیوں نہیں کر لیتا۔ یہ لنٹن کے مکان . . . رحیم آج آجائے۔ میں تو اسے نہ جانے دونگی۔

نوری:۔ (شرارت سے) ابھی سے اتنا حق جانے . . . .

(لیکن جونہی وہ مرجانہ کی طرف دیکھتی ہے، اُس کی آنکھوں کا سوز جیسے اس کا گلا دبا لیتا ہے اور باقی الفاظ اسکے دل میں ہی رہ جاتے ہیں۔)

بیگاں:۔ شام ہو چلی ہے، ابھی رحیم آجائیگا تو روک لینا۔

نوری:۔ (کھڑے ہو کر انگڑائی لیتی ہے) یہ کیسا سیندور سا چاروں طرف پھیل گیا ہے، اور وہ دیکھو پچھم کے آسمان پر بادلوں کا کیسا نگر سا بس گیا ہے۔ نہ جانے انکی چھتیں بھی لنٹن کی ہونگی۔

(دونوں عورتیں ہنستی ہیں، لیکن مرجانہ شامل نہیں ہوتی، وہ بدستور دھان کوٹے جاتی ہے۔)

نوری:۔ لنٹن کی چھتیں . . . . .

(خود اپنی بات پر ہنسنے لگتی ہے۔ اسی وقت باہر کچھ شور سنائی دیتا ہے، اور بگولے کی طرح بھری داخل ہوتی ہے۔)

رجی:۔ (گھبرا کر) کیا بات ہے، کیا بات ہے؟

بھری: مکان کی چھت آرہی ہے۔

رجی:۔ (چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے) کس مکان کی؟

بھری:۔ وہ جو دیو نگر میں تین منزل کا مکان بن رہا تھا۔

(موسل چھوڑ کر مرجانہ دروازے کی طرف بھاگتی ہے۔)

بیگاں:۔ (اٹھکر اسکے پیچھے بھاگتے ہوئے) مرجی، مرجی!

مرجانہ:۔ میں جاؤں گی۔

بیگاں:۔ پاگل ہوگئی ہے۔ جوان لڑکیاں اس طرح کبھی باہر جا سکتی ہیں مومن کے گھر میں . . . . . .

مرجانہ:۔ ماں . . . . !

(اوڑھنی سے منہ ڈھانپ کر زور زور سے رونے لگتی ہے۔)

بیگاں:۔ (اسکے پاس جاکر اسے کندھے سے تھپتھپاتی ہوئی) دیوانی نہ بنو، اللہ سب کا رکھوالا ہے۔ چلو میں دیکھتی ہوں۔

(گلی کے دروازے میں جا کھڑی ہوتی ہے، رجی بھی اٹھکر اُس کے پاس چلی جاتی ہے۔ نوری بھی وہیں چلی جاتی ہے، مرجانہ چپ چاپ اوکھلی کے پاس جاکر قریب قریب گر پڑتی ہے۔ صرف بھری دھڑک کا سہارا لئے چپ چاپ کھڑی ہے۔ باہر لحظہ بہ لحظہ شور بڑھ رہا ہے۔)

بیگاں:۔ (باہر گلی میں کسی بھاگے جاتے ہوئے شخص سے) چودھری۔ ۔ ۔ سنو تو . . . چودھری!

(چودھری ہانپتا کانپتا سا دروازے میں آکھڑا ہوتا ہے)

چودھری:۔ غضب ہوگیا مرجی کی اماں، وہ جو سب سے بڑی کوٹھی تھی نہ کسی رائے صاحب کی۔ تین منزلوں کی۔ وہ جو اِدھر کی طرف سڑک پر تِن

رہی تھی۔ اُس کی نعش کی چھت آرہی ہے۔

بیگاں:۔ قتل کی۔

(مرجانہ پھر بے چینی سے اُٹھتی ہے۔)

بیگاں:۔ (مڑکر) مرجی!۔۔

(آواز چیخ کی حد کو پہونچی ہوئی ہے، جس میں غصہ بھی ہے اور تشویش بھی۔)

۔ بیٹھ تو، میں جاکر دیکھتی ہوں، خبردار جو دروازے کے باہر پاؤں رکھا۔

(دونوں باہر جاتی ہیں)

نوری:۔ ٹھہرو پھوپی میں بھی آئی۔

بیگاں:۔ تو مرجی کے پاس بیٹھ

نوری:۔ اسکے پاس بھری بیٹھی ہے۔

(نکل جاتی ہے، کواڑ بند ہوجاتے ہیں، اور باہر سے سانکل لگنے کی آواز آتی ہے۔

مرجانہ پھر سے بیٹھ جاتی ہے، اور اوڑھنی سے مُنہ ڈھانپ کر رونے لگتی ہے، کچھ لمحوں تک خاموشی چھائی رہتی ہے جس میں دھریک کا درخت کانپتا ہے، اور ہوا کے جھونکوں سے انگیٹھی پر پڑی ہوئی راکھ اڑتی ہے۔ بھری آہستہ آہستہ مرجانہ کے پاس آتی ہے۔)

بھری:۔ مرجی!.....

(مرجانہ نہیں بولتی، نہ مُنہ سے اوڑھنی ہٹاتی ہے۔ ہوا کا تیز جھونکا آتا ہے، وہ کانپتی ہے؛

۔ مرجانہ، یہاں سردی ہے اندر چلو!

(رسوئی سے ایک برتن میں کوئلے لاکر انگیٹھی میں ڈال دیتی ہے۔ مرجانہ چُپ بیٹھی رہتی ہے)

۔ اندر سے لحاف لاکر ڈالدوں۔ یہاں بہت سردی ہے۔

(جانے لگتی ہے، مرجانہ اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے، اور اوڑھنی ہٹاکر پُرنم نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی ہے۔ بھری اُسے آغوش میں کس لیتی ہے۔)

۔ حوصلہ کرو، خدا پر بھروسہ رکھو۔ اللہ سب ٹھیک ہی کریگا۔ تم تو یونہی ڈرگئی ہو، ابھی بھائی رحیم ہنستے کھیلتے آجائیں گے۔

مرجانہ:۔ وہ ضرور.........

(اُونچے اُونچے سسک اُٹھتی ہے!)

بھری:۔ (اسکے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے) مرجانہ، مرجی!

مرجانہ:۔ (بھرے گلے سے) مجھے بُرے بُرے خیال آرہے ہیں۔ میری آنکھ پھڑک رہی ہے۔

بھری:۔ اللہ رحم کریگا۔

مرجانہ:۔ ضرور کچھ بُری بات ہوگی۔

بھری:۔ (اسکے کندھے کو پیار سے تھپتھپاتے ہوئے) حوصلہ کرو... اللہ....

مرجانہ:۔ (چہرے سے اوڑھنی ہٹاکر آنسو پونچھتے ہوئے) تم نہیں جانتی بھری، آج صبح میں نے اسے جاتے وقت ناراض کردیا تھا۔ وہ میرے ساتھ تھوڑی سی آزادی لینا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے....

(پھر منہ ڈھانپ لیتی ہے)

بھری:۔ ہم لڑکیاں ہیں۔ ہم اپنی مرضی سے ہنس نہیں سکتیں، بول نہیں سکتیں، دل ہی دل میں گھُٹ گھُٹ کر مرجائیں۔ مجھے ہی دیکھ لو، اماں چاہتی ہے کہ یہاں سے خلاصی ہو تو تایا کے لڑکے کے گھر بٹھادے اور اسکی نسبت مجھے صادق ہی منظور ہے۔

مرجانہ:۔ (آنسو پونچھ کر) لیکن وہ تو تمہیں مارتا ہے

بھری:۔ مارتا تو ہے لیکن میں مار کھالیتی ہوں۔

مرجانہ:۔ تو پھر تو آئی کیوں؟

بھری:۔ میں کب آتی تھی۔ تایا کو دیکھکر اسکے سر تو خون سوار ہوگیا۔ وہ گنڈاسہ اُٹھالایا، اور تایا مجھے لے آئے۔

مرجانہ:۔ تو اب چلی۔

بھری:۔ یہی تو دکھ ہے، جاؤں کہاں؟ وہاں تو کھانے کو سوکھی روٹی بھی نہیں، کل ٹکوا لیکر چڑھ آیا۔ میں نے کہا۔ مجھے لے جانا چاہتا ہے تو چار پیسے تو کما کرلا۔ صرف ماریگا ہی، یا کھانے کو بھی دیگا۔ کہنے لگا۔ کوشش تو کرتا ہوں۔ کچھ نہ بنے تو کیا کروں؟ میں نے کہا۔ تو پھر مجھے لے جاکر کیا کریگا؟ ساری دُنیا مجوری کرتی ہے، تو کیوں نہیں کرتا؟ پیٹ تو کھانے کو مانگے گا، مار سے وہ نہ بھریگا۔۔ سچ کہتی ہوں مرجانہ، اس پر وہ بولا نہیں، چُپ چاپ چلا گیا۔ دراصل آٹھ جماعتیں پڑھکر نوکری ڈھوتے اسے شرم آتی ہے۔ باپ مرگیا اور سکھایا کسی نے کچھ نہیں۔

مرجانہ:۔ تمہاری ماں تو کہہ رہی تھیں کہ اس نے تم پر بھی ٹکوا چلایا۔

بھری:۔ مجھ پر ٹکوا چلاتا تو میں یہاں بیٹھی رہتی۔ وہ تو یوں ہی موسی نے شور مچا دیا۔

(دونوں کچھ لمحہ آگ تاپتی ہیں، مرجانہ پھر بے چین ہوجاتی ہے)

مرجانہ:۔ میرے دل پر تو صبح ہی سے بھاری بوجھ ہے بھری۔ جاتے جاتے کہنے لگا۔ مرجی اگر میں مرجاؤں تو پھر!

(اچانک آنکھیں ڈبڈبا آتی ہیں)

بھری۔ (اُس کے کندھے پر پیار سے ہاتھ پھیر کر) تم تو پاگل ہو اللہ بہتر کرے گا۔

مرجانہ۔ مجھے اُسی وقت سے نہ جانے کیسے کیسے خیال آرہے ہیں، دل دھک دھک کر رہا ہے۔ اور دل جیسے صبح ہی سے رونے رونے کو ہو رہا ہے۔ آج رحیم خیر و عافیت سے آجائے تو پیر گلاب شاہ کی قبر پر سوا روپیہ چڑھاؤں گی۔

(دروازہ کھلتا ہے۔ آگے آگے چودھری، پھر بیہوش سے رحیم کو اُٹھائے ہوئے دو آدمی، پھر بیگاں، اور پھر اس کے پیچھے دوسرے لوگ داخل ہوتے ہیں۔ مرجانہ گھبرا کر رحیم کی طرف بڑھتی ہے۔)

بیگاں۔ اندر جاؤ، دیکھتی نہیں ہو، غیر آدمی آرہے ہیں۔

(دونوں لڑکیاں بھاگ کر رسوئی میں چلی جاتی ہیں۔ ایک شخص صحن میں پڑی ہوئی چارپائی کو ٹھیک کرتا ہے۔ بیگاں بھاگ کر اندر سے پرانی سی رُلائی لانے جاتی ہے۔)

مرجانہ۔ (جب بیگاں اندر سے رُلائی لا کر گذرتی ہے) اماں!

بیگاں۔ (چارپائی پر رُلائی بچھاتے ہوئے) گھبراؤ نہیں۔ اللہ نے بچا لیا ہے، صرف بھاری چوٹیں آئی ہیں۔

(رُلائی بچھا دیتی ہے، بیہوش سے رحیم کو اس پر لٹا دیا جاتا ہے۔ چودھری اُس کے ہاتھ پاؤں وغیرہ ٹھیک طرح رکھتا ہے، اور بیگاں سے کہتا ہے۔)

چودھری۔ مرجی کی اماں، اندر سے لحاف لا کر اس پر ڈال دے۔ سردی زیادہ ہے۔

(بیگاں کوٹھڑی میں جاتی ہے۔)

چودھری۔ (مڑ کر بھیڑ میں دیکھتے ہوئے) ارے کوئی مختار دیندار کو بلانے گیا ہے یا نہیں؟

ایک شخص۔ طافی ڈاکٹر کو بلانے گیا ہے۔

چودھری۔ ارے ڈاکٹر کیا لھا کر مختار کا مقابلہ کریگا۔ مختار چاہے تو ہڈیوں کی کرچوں تک کو جوڑ دے۔ جا بھاگ کر بلا لا اُسے۔

(ایک شخص بھاگ کر جاتا ہے۔)

چودھری۔ (بھیڑ میں دیکھکر) اور پھر وہاں نہ جانے کتنے زخمی پڑے ہیں۔ ڈاکٹر کس کس کو دیکھے گا؟

بیگاں۔ (رحیم پر جھکتے ہوئے) رحیم، بیٹا رحیم۔

چودھری۔ تم اُسے آرام سے پڑا رہنے دو بی بی، جا کر میٹھے تیل کا انتظام کرو، آگ جلا دو، پانی گرم کر دو، شاید ڈاکٹر ہی آجائے۔ (مڑ کر) ارے کوئی بھاگ کر کچھ گرم گرم دودھ تو لاؤ، اسے کچھ ہوش تو آئے۔ (ایک نوجوان سے) ارے جلال جا تو ذرا بھاگ کر گوجروں کے ہاں!

(جلال بھاگ کر جاتا ہے۔)

رحیم۔ (کراہ کر) مجی ... مرجانی!

بیگاں۔ بیٹا۔

چودھری۔ میں کہتا ہوں مرجی کی اماں، تم میٹھا تیل لاؤ، مختار ابھی آرہا ہوگا۔ اور اس انگیٹھی میں اور کوئلے ڈال کر اسے یہاں رکھدو، ضرورت ہی پڑ جاتی ہے کچھ چیز گرم کرنے کی۔

(بیگاں انگیٹھی اُٹھا کر جاتی ہے)

چودھری۔ (لمبا سانس لیکر) کچھ مکان گرا ہے! ساری کی ساری چھت آرہی۔ یہ ٹھیکیدار سب حرام کی کمائی کھاتے ہیں سالے۔ پیر بختیار شاہ کی خانقاہ کو بنے سو سال سے بھی زیادہ عرصہ گذر گیا ہے، لیکن مجال ہے جو ایک اینٹ بھی ہلی ہو۔ یہاں چیز تیار پیچھے ہوتی ہے مرمت پہلے شروع ہو جاتی ہے۔ نہ جانے کتنے آدمی دب گئے۔ (اچانک مڑ کر) کیوں بھائی باقیوں کا کیا حال ہے؟

دو شخص۔ (جو رحیم کو اٹھا کر لائے تھے) ہمیں کیا معلوم ہم تو اسے اٹھا کر لے آئے۔ ابھی تو ملبہ اٹھایا جا رہا تھا۔ صادق اور منگو بھی تو تھے۔

چودھری۔ کون صادق؟ لوہار!

وہ دونوں۔ نہیں رحّی کا داماد!

چودھری۔ لیکن وہ ....

وہ دونوں۔ آج ہی کام پر گیا تھا۔

(دروازہ کھلتا ہے۔ کچھ اور آدمی ہانپتے ہوئے داخل ہوتے ہیں)

چودھری۔ کیوں؟

ایک نووارد۔ صادق مر گیا۔

(رسوئی سے کسی کے دھڑام سے گرنے کی آواز آتی ہے۔ ساتھ ہی مرجانہ چیختی ہے۔)

مرجانہ۔ بھری کو غش آگیا، اماں۔

چودھری۔ ارے کوئی بھاگ کر کچھ دودھ لے آؤ۔

(جلال داخل ہوتا ہے۔)

جلال۔ گوجر کہتے ہیں دودھ کہاں ہے، دودھ تو سب دیونگر چلا جاتا ہے۔ بچوں تک کیلئے نہیں رہتا!

(پردہ)

اوپندر ناتھ اشک

قطعات

اس باب میں بیکار سخن سازی تاویل
ارژنگ ہے ارژنگ۔ اناجیل اناجیل
مطرب کی طرح تان اڑاتے رہیں شاعر
دشوار ہے ہم آہنگیٔ "ایقاع" و "افاعیل"

شعر کے اندر غنائی کیفیت درکار ہے
اس کا یہ مطلب نہیں "بزمِ ادب" میں گا و بھی
وہ غزل جس میں ترنم ہو مگر معنی نہ ہوں
"نرخِ بالا" کر نہیں سکتی بنا کر "بھاؤ" بھی

مانتا ہوں میں کہ تو ہے شاعرِ رنگیں نوا
توڑتی ہے جان موسیقی تری آواز پر
کام لے "ایجاز" سے پیغام تحت اللفظ میں
گنگری کے زور سے اشعار میں جادو نہ بھر

آج کل بزمِ سخن میں ہے ترانوں کا عمل
اب ہے تہذیب کا وہ حال کہ دل ہل جائے
درسِ اخلاق میں کوشاں ہے گویا شاعر
دل میں یہ "دھن" ہے کہ ٹھمری سی غزل مل جائے

شاد عارفی

خانہ بدوش کارواں

شام کے نکھرے دھندلکے میں رواں ہے کارواں
ہے ضیا افشاں نگینوں کی انگوٹھی آسماں
دھیمے دھیمے بج رہا ہے دل نشیں سازِ رحیل
نغمہ بن کر کان میں آتی ہے آوازِ رحیل
چل رہے ہیں خامشی کے ساتھ اہلِ کارواں
ساتھ ان کے انکی منزل بھی ہے تیزی سے رواں
سر خمیدہ ہیں، نگاہیں جھک رہی ہیں فرش پر
چاند بھی گردن جھکائے چل رہا ہے عرش پر
فی الحقیقت ہیں یہ رنگِ وقت پہچانے ہوئے
دہر میں ہیں زندگی کے راز کو جانے ہوئے
گم نہیں ہے کوئی ان کا اور نہیں ہے گاؤں بھی
سانس جبتک چل رہی ہے چل رہے ہیں پاؤں بھی
شوق سے رہتے ہیں صبح و شام سرگرمِ سفر
خوشنمیر، محدود ان کی، ساز و ساماں مختصر
شاہدِ فطرت کے یہ سچے پرستاروں میں ہیں
آج ویرانوں میں ہیں تو کل چمن زاروں میں ہیں
جانتے ہیں یہ کہ عالم کو نہیں حاصل ثبات
اس لئے کر لی ہے اپنی مختصر سی کائنات
ان کی دولت ڈھور ڈنگر اور پرندے ملکیت
کل زمین جاگیر ان کی ساری دنیا سلطنت
چور کر دیتی ہے ان کے پاؤں جب درماندگی
چھوڑ جاتا ہے نشانِ پا، قیامِ عارضی
گندگی کے ڈھیر کچھ اور راکھ کچھ بکھری ہوئی
خشک سی کچھ روٹیاں چاروں طرف پھینکی ہوئی
حسن کے نادر نمونے بھی ہیں زیبِ کارواں
جسم جن کے سیکڑوں ہیں رنگ جن کے ضوفشاں
سرخ چہروں پہ جھلکتے ہیں بشاشت کے نشاں
جس طرح لبریز ہو رنگ و نوا سے داستاں
پستے ان کے خالِ رخ بادام ان کی انکھڑیاں
سینے ان کے ہیں کنول اور ہونٹ انکے پنکھڑیاں
"لے چلو مجھکو بھی ساتھ اے قافلے والو سنو
تم کو منزل کی قسم، ٹھہرو، ذرا دیکھو، سنو
لے چلو مجھکو بھی بہتے آبشاروں کے قریب
دشت کے پھولوں بیابانوں کے، خاروں کے قریب

آتشیں صحرا کے چٹیل پُرفضا میدان میں ... میں جہاں بہہ جاؤں شعر و نغمہ کے طوفان میں
سبزہ زاروں میں چلو تم کو سناؤں اک غزل ... تم ذرا اک ساز چھیڑو اور میں گاؤں اک غزل
میری آوازوں کے آگے یہ تو جھکتے ہی نہیں ... یہ تو سنتے ہی نہیں ہیں، یہ تو رکتے ہی نہیں

مخمور جالندھری

اپنے "نوکر" ہونے پر

اے انیسِ جان و دل، اے غمگسارِ زندگی ... تجھ سے حاصل بیقراری میں قرارِ زندگی
اے مری ہمراز، میری ہم جلیس و ہمطریق ... میری مُرنا، زخم خوردہ زندگانی کی رفیق
کیوں ہے غمگین تو مرے بیٹھنے کے اس انداز پر؟ ... ادنیٰ درجے کی کلرکی کے زبوں آغاز پر؟
رو کہ اک آزاد و روشن شاعرہ نورانی دماغ ... بن گیا ہے اک سیہ دفتر کا بجھتا سا چراغ
رو کہ روزی کی طلب نے آج پامالِ زبوں ... کر دیا ہے میری غیرت، میری خودداری کا خوں
رو کہ اک بیدار دل شاعر کے الہامی خیال ... ہو رہے ہیں "خشک مثلوں" کے تلے یوں پائمال؟
رو کہ میری زندگی مرگِ دوامی بن گئی ... میری آزادہ روی آخر غلامی بن گئی
رو کہ تم نے مرد ہو کر، ایک لقمے کے لئے ... کاٹ ڈالے ہاتھ، روحیں بیچ دیں لب سی دئے
رو کہ اب مجھ کو مِرا سر بھی وبالِ دوش ہے ... "مصلحت" کے سامنے احساس بھی خاموش ہے
یاس کے شبرنگ و ظلمت بار پردوں کے تلے ... دب گئی ہیں زندگی کی آرزوئیں، ولولے
دیکھتی ہیں جو مری آنکھیں دکھا سکتی نہیں ... کتنی باتیں دل میں ہیں جو لب پہ آ سکتی نہیں
میرا نطقِ شعر آرا، میری پروازِ ضمیر ... زندگی کے تنگ اور تاریک حلقوں کی اسیر
میں وہ شاعر ہوں کہ میرے دل سے ہیں محوِ کلام ... رات کو شبنم کی مستی، دن کو کرنوں کا خرام
ہر کرن کا ساز اک پیغام ہوتا ہے مجھے ... عرش سے اک نوع کا الہام ہوتا ہے مجھے

میری خوددارانہ غیرت، میرا دل، میرا شعور
بھر رہے ہیں سسکیاں دیوِ غلامی کے حضور

سید ضمیر جعفری۔ بی۔ اے

غزل

سُن رہا ہوں نغمہ ہائے سرمدی ... رقصِ پیہم کر رہی ہے زندگی
تیرے جلووں ہی میں کھو کر رہ گئے ... سجدہ کیسا اور کہاں کی بندگی
سن لیں اہلِ ہوش گوشِ ہوش سے ... ہے نوا پرداز تیری خامشی
عشق کی تفسیر یا تشریح کیا ... کیفِ مبہم لذتِ ناگفتنی
یہ بھی کٹ جائیگی اُن کی یاد میں ... زندگی کیا چار دن کی زندگی
کیا بتائیں عشق میں کیا کیا ہوا ... کیا بتائیں جان پر کیا کیا بنی

ہو بُرا ناشاد عقل و ہوش کا
کر دیا برباد لطفِ زندگی

ناشاد۔ ایم۔ اے

شانتی نکیتن میں

میں پانتھ نواس جو ہوں۔ ڈگر ڈگر دُور کا راہی۔ شاید اِسی لئے یہ پانتھ نواس مجھے اِتنا پسند ہے۔ یہ سڑک جس کے کنارے یہ مکان کھڑا ہے پچھم کی طرف سنتھالوں کے دیہات سے جا ملی ہے۔

ہنسے جاؤ، سنتھال چھوکریو، تمہاری ہنسی میں تو دھرتی کھلکھلاتی ہے۔

صبح ہوتے ہی سنتھال عورتیں گاؤں سے نکل پڑتی ہیں، اور پانتھ نواس کے سامنے سے گزرتی ہوئی اپنے اپنے کام پر چلی جاتی ہیں۔ بھوک ہے، صدیوں کی غریبی ہے اور بڑی کٹھن مزدوری میں زندگی بسر ہوتی ہے۔ مگر روزانہ زندگی کی تلخ حقیقتیں اُن کی ہنسی پر چھاپا نہیں مار سکیں۔ شام کو اسی سڑک سے وہ واپس آتی ہیں، دن بھر کی محنت سے تھک کر۔

شہر اور گاؤں تو میں نے بہت چھان مارے ہیں۔ لوگ بھی میں نے بہت دیکھے بھالے ہیں۔ بار بار میرا مُنہ پانتھ نواس کی طرف گھوم جاتا ہے جب میں یہاں آتا ہوں، اسی کونے والے کمرے میں ٹھہرتا ہوں۔ بارہ سال سے میں اِسے جانتا ہوں۔ اب یہ میرا کمرہ ہے۔

اپنی کھڑکی سے، جو سڑک کی طرف کھلتی ہے، اُس چھدری چھاؤں والے درخت کی طرف دیکھتا رہتا ہوں، جس کے نیچے چوکڑی بھولے ہوئے ہرن کی طرح کوئی سنتھال آکھڑا ہوتا ہے۔ وہ بنسری پر اپنا نغمہ چھیڑتا ہے۔ صدیوں سے یہ بنسری جاگتی رہی ہے۔ صدیوں سے یہ نغمہ جاری ہے۔

"کیا ہیں آخر ہم سب مِل کر؟
ہم سب مِل کر۔
ان گنت درختوں کا اِک جھرمٹ!
ڈھول پرانے وقتوں کے
لچک لچک جاتی ہیں کمریں
بازو کالے چمکیلے
لچکیں جیسے کنول ہوا کے
ہلکے نرم تھپیڑوں سے
کیا ہیں آخر ہم سب مِل کر؟

ہم سب مِل کر۔
ان گنت درختوں کا اک جھرمٹ!

یہ جذبات، جو پہلی بار اِدھر آنے پر سنتھالوں کے ایک قدیم گیت میں مجھے مِل گئے تھے، میرے ذہن میں ناچ اُٹھتے ہیں۔ یہ کیسا نغمہ ہے۔ بنسری والے کی آنکھوں میں خودداری جھلکتی ہے۔

یہ جا، وہ جا، وہ دُور نکل جاتا ہے، دور سے نغمہ کی آواز سُنتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ دوری نزدیکی میں بدل رہی ہے۔ سوچتا ہوں کہ سنتھال نہ ہوتے تو شانتی نکیتن کے پس منظر کی بہت ساری سُندرتا پھیکی پڑ جاتی۔

اِدھر یہ لوگ کب آئے؟

اٹھارہویں صدی کے آخری دنوں میں۔

سنتھال پرگنہ (بہار) میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے کھیت بانجھ رہ گئے تھے۔ کال سے بچنے کے لئے کچھ لوگ اِدھر آنکلے۔ ہوشیار زمینداروں کی چاندی ہوگئی۔ معمولی مزدوری پر وہ اُن سے اپنی پتھریلی زمین کو کھیتی کے قابل بنواتے چلے گئے۔ اب بھی یہ لوگ انتھک محنت کرتے ہیں۔ صبح کی روشنی میں اُنہیں اپنی کھڑکی سے دیکھتا ہوں تو چاہتا ہوں کہ ایک ایک سنتھال سے پوچھوں کہ رات کو بھرپیٹ کھانے کو مِل گیا تھا یا نہیں اور صبح کا ناشتہ کتنا مزیدار رہا۔

......سب کے سب سنتھال اپنا مُنہ کھُلا رکھ کر ہی جیتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی کے سفر میں اُنہیں بار بار ہار ہوئی ہے اور زندگی کی مُٹھ بھیڑ کے لئے اُن کا علم اور تجربہ ناکافی رہا ہے۔ لطیف ہنسی مذاق نہ دیکھ پاتا تو اِن کو دبی ہوئی قوم ہی بتاتا۔ اگر ان لوگوں کو کسی خاص چیز نے بچایا ہے تو وہ ہے اِن کے سنگیت اور ان کے ناچ میں ظاہر ہونے والے آنند نے۔ جاپانیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ چاہے کتنی آفت، تکلیف، بے عزتی اور شکست کیوں نہ آپڑے جاپانی ہنستا ہی رہے گا۔ یہ کوئی بناوٹی انداز نہیں۔ حالات کتنے کڑے ہوں، جاپانی اپنی خود اعتمادی کو کھوتا ہی نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ اُسکی شخصیت حالات سے بڑھ چڑھ کر ہے اور موقع پاتے ہی حالات پر قابو پالینے کی ہمت اُس میں ہے۔ یہ سنتھال بھی ویسی ہی خود اعتمادی رکھتے

ہیں۔ ممکن ہے یہ خود اعتمادی نہ ہو بلکہ حالات کی لاعلمی ہو جو اکثر بچوں میں پائی جاتی ہے ...... یہ لاعلمی یوں حفاظت کیلئے حاضر نہ ہوتی تو ہم بیچے کبھی بڑے نہ ہو پاتے اور وسیع آسمان کا پھیلاؤ دیکھ کر یہ لوگ تصور کے بوجھ تلے ہی دب جاتے ...... اگر ہم جینا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے جیسا بنا کر اپنے ساتھ لئے بنا چل نہیں سکتے ...... [1]

ہنسے جاؤ کھلکھلا کر، بھولے سنتھالو! بجائے جاؤ بنسری۔
گائے جاؤ نغمے پرانے۔ مگر زندگی سے لڑنا ہوگا اپنے بل پر۔ دب کر نہ رہ جانا۔ کون کھاتا ہے ترس کسی پر؟ خود لڑنا ہوتا ہے دور اندیشی کے بل پر۔

چھتری چھاؤں والے درخت کے نیچے ایک بوڑھا سنتھال آبیٹھا ہے۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ اس کے پاس جا بیٹھنے کو جی چاہتا ہے۔ لو اب تو سندرم بھی اس کے پاس آبیٹھا ہے۔ وہ اس بوڑھے کا پنسل سکیچ بنانے آیا ہوگا۔ میں بھی دیکھوں چل کر۔

بوڑھا مسکرا رہا ہے۔ سندرم بھی اور میں بھی۔
کتنے بھولے لوگ ہیں یہ سنتھال۔
جی ہاں۔
کتنے بھولے لوگ ہیں یہ سنتھال! ایسا کہنے میں سندرم کا فائدہ ہے۔ پر وہ خود کیوں بھولا بننا پسند نہیں کرتا؟ یہی آدمی یوں اپنا سکیچ نہ بنانے دے اور اپنے وقت کی قیمت مانگنا سیکھ لے تو سندرم کو ہوش آجائے۔ جنوبی ہند کا یہ سندرم آخر کیسا ودیارتھی ہے۔ بصورت دیگر وہ پیسے کمائے گا اور بہت ممکن ہے یہی سکیچ جو وہ اس وقت تیار کر رہا ہے پانچ سات آنے میں کسی ٹورسٹ کے ہاتھ بیچ ڈالے ...... مگر اس سے اس بوڑھے کو کیا فائدہ۔ اسے اگر اس وقت دو رس گلے ہی کھلا دے جائیں تو وہ سندرم کی طرف احسان مندانہ نگاہ سے دیکھنے لگے۔

ایک انگریز ٹورسٹ کہہ رہا ہے "سنتال بہت اچھا لوگ ہے"
میں سوچتا ہوں کاش ہم سب اتنے اچھے ہوتے۔ اب اگر میں یہ بات کھلم کھلا اس ٹورسٹ کو کہہ دوں تو وہ شاید جھلا کر کہہ اٹھے۔ "ہم تو سنتال نائی بننے سکتا" [2]

کل سندرم نے ایک سنتھال چھوکری کا سکیچ بنایا تھا۔ پنسل چلاتے چلاتے وہ کہہ رہا تھا۔ سندرتا کیا صرف رنگ تک محدود ہوتا ہے؟ گورے رنگ اور تیکھی نوک پلک سے پرے بھی سندرتا کی سرحدیں پھیلتی چلی گئی ہیں۔

اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا۔ کاش سندرم نے یہی بات سنتھالی زبان میں یا سادہ بنگالی میں کہی ہوتی اور وہ چھوکری یوں اپنی سندرتا کی تعریف سن کر سمجھتی کہ اسے اس کے وقت کا معاوضہ مل گیا ہے۔ اور یہ سوچ کر کہ شاید اس کے جوڑے کا لال پھول نیچے کو ڈھلک گیا ہے، وہ اسے ٹھیک کرنے لگ جاتی۔ مگر وہ تو بت بنی بیٹھی رہی تھی۔ غالباً یہ اس کا پہلا تجربہ تو نہ تھا۔

سات پوس کے روز شانتی نکیتن کا جنم دن منایا جاتا ہے۔ یہ شانتی پوش، برسوں سے ایک میلے کا روپ دھار چکا ہے۔ سمندر کی اچھلتی ہوئی لہروں کی طرح سنتھال چھوکریاں اس ساحل پر آتی ہیں اور ان کے قہقہے آشرم کی خاموش فضا میں ہلچل پیدا کر دیتے ہیں۔

اپنی پنسل تیز کر لو، سندرم!
ہاں بھائی، شانتی پوش آگیا ایک سال بعد۔ آج میں نئی سکیچ بک میں کام شروع کروں گا۔
پہلے کس کا سکیچ بناؤ گے؟
کسی ڈاڑھی والے کا۔
میں جو ہوں۔

لہروں کے ریلے ملاحظہ ہوں۔ ایک لہر میری اپنی بیوی ہے سنتھال چھوکریوں کی دیکھا دیکھی اس نے قدیم ڈھنگ کے گلٹ کے بنے ہوئے کانٹے خرید کر اپنے کانوں میں پہن لئے ہیں۔ سنتھال عورتیں اسے دیکھتی ہیں اور عجب انداز سے مسکراتی ہیں۔ سندرم نے جلدی جلدی اس کا ایک سکیچ بنا ڈالا ہے۔
یہ سکیچ مجھے دیدو، سندرم بھائی!
نہیں یہ میرے پاس رہے گا۔
اب کو تیا میری بیٹی اپنی ماں کا سکیچ لینے کیلئے ضد کر رہی ہے۔ سندرم اس کے لئے اسی طرح کا دوسرا سکیچ تیار کر رہا ہے۔
میرے ذہن میں ایک سنتھال گیت کے جذبات بیدار ہو رہے ہیں۔

"ماتا پتا ہیں چاند اور سورج
بھائی بہن ہیں تارے سارے، سارے

---

[1] کاکا کالیلکر۔ دوشال بھارت، فروری ۱۹۳۶ء۔
[2] ہم تو سنتھال نہیں بن سکتا۔

سُورج کی کرنوں سے میں نے جنم لیا ہے۔
نام ہے سُورج مکھی، پیارے!"

پہلے پہل کب یہ پھول کھِلا تھا؟ کیا یہ دھرتی کبھی اتنی بانجھ ہو جائے گی کہ یہ پھول کھِلنے سے رہ جائیں؟ کیا میری اپنی بیوی بھی ایک سورج مکھی ہے؟

ماسٹر مہاشہ[1] آ رہے ہیں۔ بہت خوش نظر آتے ہیں۔ اِن انسانی لہروں کے ریلے یقیناً اُن کے دل کے ساحل کو چھُو چھُو جاتے ہیں۔ "کیا سوچ رہے ہیں۔ میں نے اپنا کیمرہ کھول لیا ہے۔
ماسٹر مہاشہ! اپنا فوٹو کھینچ لینے دیجئے آج۔
میرا فوٹو؟
جی ہاں۔

اپنے مخصوص انداز سے وہ پھر کہہ اُٹھتے ہیں۔ "میں تو اِتنا سُندر نہیں۔ یوں ہی فلم خراب کر دوگے۔ کسی سنتھال لڑکی کا فوٹو کیوں نہیں لے لیتے؟

۲

کیا سوچ رہے ہو، پنڈت جی؟
کچھ نہیں۔

پنڈت ہزاری پرشاد دویدی[2] عمر میں مشکل سے مجھ سے ایک آدھ سال بڑے ہونگے۔ مگر جنہوں نے کبھی اُنہیں دیکھا نہیں اُن کے مضامین پڑھ کر یہ سوچ لیتے ہیں کہ اُن کی عمر پچاس سے تو کیا کم ہوگی۔ شکر ہے مجھے یہ غلط فہمی نہ ہوئی تھی۔

پہلے پہل پنڈت جی مجھے کلکتہ میں ملے تھے۔ یہ کوئی آٹھ برس پہلے کی بات ہے۔ اُس وقت بھی وہ یوں زور سے قہقہے لگایا کرتے تھے۔ جو آدمی اُن کی نگاہ میں نہ جچے اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہنے سے وہ اُس وقت بھی اُکتاتے نہ تھے۔

رات کو اُن کیلئے ایک پلنگ پر بستر لگایا گیا۔ اور خود میں ایک بڑی میز پر چادر بچھا کر لیٹ گیا۔ پنڈت جی میری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہے۔ آخر میں نے کہا "شاستروں میں برہمچاری کے لئے یہی ہدایت کی گئی ہے کہ وہ نرم بستر پر نہ سوئے۔"

شادی کے کچھ ہی ماہ بعد بیوی کو گھر چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ کسی طرح یہ سمجھنے لگا تھا کہ پھر سے برہمچاری بن گیا ہوں۔ اور پھر جب پنڈت جی کو پتہ چل گیا کہ میں شادی شدہ ہوں تو انہوں نے زور سے قہقہہ لگایا۔

کیا سوچ رہے ہو، برہمچاری جی۔
کچھ نہیں۔

اکثر وہ تلوتما کو یاد کیا کرتے ہیں۔ اِس اپسرا کے متعلق پرانوں میں یہ بتلایا گیا ہے کہ برہما نے جگہ جگہ سے تِل تِل بھر حُسن جمع کیا اور پھر اس سے تلوتما کی تخلیق کی۔ پنڈت جی کا خیال ہے کہ اگر برہما نے صرف یہ مصالحہ ہی جمع کیا ہوتا اور یہ نہ سوچا ہوتا کہ آخر اس سے کس قسم کی چیز تیار کرنا ہوگی تو شاید یہ حُسن کا ڈھیر بجائے خود دُنیا کی ایک بدصورت ترین چیز تصوّر کیا جاتا۔ اس اپسرا کے جنم کا حوالہ دے کر وہ کہا کرتے ہیں: "دیہاتی گیت جمع کرنے والے ادیب کو چاہیئے کہ وہ بھی اپنی تلوتما کا تصوّر کرے۔" میں کہہ دیا کرتا ہوں "اپنی تلوتما کا تصوّر میں نے کر رکھا ہے، پنڈت جی!"

پنڈت جی یہ مانتے ہیں کہ کچھ دیہاتی گیت اتنے تاثیر میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں کہ کالی داس اور بھوبھوتی بھی اُن کے سامنے ہیچ نظر آتے ہیں۔ سبھی گیتوں پر تو یہ بات لاگو نہیں ہوتی۔ وہ یہ دلیل دیا کرتے ہیں: عوام کا دل بھی گیتوں کو جنم دیتے وقت اُنہیں جذبات اور احساسات سے متاثر ہوتا ہے جن سے کالی داس اور بھوبھوتی متاثر ہوتے تھے۔ اسی طرح گھاس اور بانس قدرت کے ایک ہی شعبہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر کوئی بھلا آدمی بانس کی جگہ گھاس کا استعمال نہیں کرے گا...... ہمارے پڑوسی سنتھال لوگ قدیم معاشرت کے دلدادہ ہیں۔ ہم اُن سے پیار کر سکتے ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم خود بھی سنتھال بن جائیں۔ سنتھال بن کر ہم وقت کی ہتک کریں گے۔ آج کی تہذیب کیا چاہتی ہے؟ یہی نا کہ ہم نئے زمانہ کے ساتھ ساتھ چلیں...... ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ دیہاتی گیتوں کے شاعر کالی داس بھوبھوتی اور ٹیگور کی برادری ہی سے ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آج کا شاعر دیہاتی گیت لکھنے لگے اور کالی داس بھوبھوتی اور ٹیگور سے مُنہ موڑ لے۔ کیا یہ بات افسوس کرنے کے قابل نہیں کہ ہمارے کچھ نوجوان شاعر اب گیت لکھنے لگے ہیں تا کہ کھدّر پرچار میں مدد دیں؟ اور ہمارے کچھ ادیب اُن کے گیتوں کی تعریف بھی کرنے لگے ہیں!"

---

[1] نندلال بوس، شانتی نکیتن میں کلا بھون (صیغۂ مصوّری) کے اُستاد اعلیٰ اور بنگال اسکول کے ایک صفِ اوّل کے مصوّر۔
[2] شانتی نکیتن میں ہندی اور سنسکرت کے پروفیسر۔

جب بھی میں دیہاتی گیتوں کے بل پر عوام کے دُکھ سُکھ کا ذکر چھیڑتا ہوں، پنڈت جی بات کا رُخ بدل کر میرا دھیان اُس تہذیب کی طرف موڑ دیتے ہیں جو کہ اُن کے خیال کے مطابق قدیم آریوں کے ہندوستان میں آنے سے پیشتر اس دیس میں موجود تھی۔ مجھے ہنسی آجاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی ترقی پسند ادیب اُنکی تقریر سُن لے تو ضرور انہیں رجعت پسندوں کی صف میں شمار کرنے لگے۔

اپنی بات پنڈت جی یوں شروع کیا کرتے ہیں: "دیہاتی گیتوں کی مدد سے ہم ایک پُرانی دنیا کو حاصل کریں گے جسے یا تو ہم بھول چکے ہیں یا جسے ہم غلط سمجھ بیٹھے ہیں۔ سیاسی حیثیت سے تو آریہ لوگ ہندوستان پر قابض ہو گئے تھے مگر اُس تہذیب کو جو یہاں پہلے سے موجود تھی اور اس وسیع ملک کے ہر حصّہ میں ذرا ذرا فرق کے ساتھ سانس لے رہی تھی، آریہ لوگ بالکل مسخر نہ کرسکتے تھے...... آج بھی ہمارے عوام کے رسم و رواج میں آریوں سے پہلے کی اُس تہذیب کی کچھ نہ کچھ جھلک پائی جاتی ہے۔ قدیم گیت اُس تہذیب پر روشنی ڈال سکتے ہیں، محکمۂ آثارِ قدیمہ والوں کو اگر یہ بات بُری نہ لگے تو میں کہوں گا کہ قدیم دیہاتی گیتوں کی اہمیت مہنجودڑو جیسے کھنڈرات سے کہیں زیادہ ہے۔"

یہ سُن کر میں سوچنے لگتا ہوں کہ کیا یہ الفاظ اُنہیں پنڈت جی کی زبان سے نکل رہے ہیں جو کہا کرتے ہیں کہ سنتھال بن کر ہم وقت کی ہتک کریں گے۔

ایک بار لیتھوآنیا کا ایک پروفیسر شانتی نکیتن دیکھنے آیا تھا۔ اپنے لیکچر میں اُس نے بتایا کہ پچھلے پانچ سو برس سے اس کا ملک عیسائیت کے زیرِ اثر رہا ہے اور برابر آزادی کیلئے جدوجہد کرتا رہا ہے۔ عیسائی حکمرانوں نے پُرانے قومی ادب کو تباہ کر دیا۔ اب جبکہ اُسے آزادی مل چکی ہے وہ اپنے قدیم قومی تمدّن کو پھر سے زندہ کرنا چاہتا ہے۔ لوگوں کے پاس صرف وہ گیت بچ پائے ہیں جو صدیوں سے اُن کے ہونٹ چومتے آئے ہیں۔ ان گیتوں کی روشنی میں لیتھوآنیا اپنی کھوئی ہوئی دُنیا کو ڈھونڈھ لینا چاہتا ہے۔ گیتوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اور ابھی کئی مجموعے تیار کئے جا رہے ہیں۔

پنڈت جی کہا کرتے ہیں کہ اُس پروفیسر نے اُنہیں بتلایا تھا کہ لیتھوآنیا کی پُرانی تہذیب پر ہندوستانی تمدّن کا بہت اثر رہ چکا ہے۔ جب ایک شخص وہاں دوسرے شخص سے ملتا تھا تو "رام رام" (!!!) کہا کرتا تھا۔ اور جب کوئی مرجاتا تھا تو اُس کے رشتہ دار "رام نام ست" (!!!) کہا کرتے تھے۔ مجھے یہ سُن کر ہنسی آجاتی ہے اور میں کہتا ہوں "لیتھوآنین گیتوں پر کوئی کتاب انگریزی میں ضرور مل جائے گی اور یہ سب باتیں میں دھیان سے پڑھوں گا، پنڈت جی!"

ایک بار پنڈت جی نے بھی اپنے گاؤں میں[1] دیہاتی گیتوں کا مطالعہ شروع کیا تھا۔ ماتا دیئی (شیتلا) کی پُوجا کے ایک گیت میں ایک بند ایسا بھی آتا تھا جس سے یہ پتہ چلا کہ ماتا دیئی کی شادی الی میر دعلی شیر) سے ہوئی تھی۔ یہ گیت لکھ کر اُنہوں نے اپنے ایک ہندو دوست کو دکھایا تو وہ بولا۔ "ہندو عورتوں کو یہ گیت گانے بند کر دینے چاہئیں۔" پھر جب یہ گیت منوموہن گھوش ایم۔ اے کو دکھایا گیا تو وہ بولے۔ "یہ الی میر علی شیر کی بگڑی ہوئی صورت نہیں ہے بلکہ بُدھ مت کے کسی بھکشو کا نام معلوم ہوتا ہے۔ اس سے ملتا جُلتا ایک نام میں نے بودھ بھکشوؤں کے درمیان پایا بھی ہے۔"

پنڈت جی کہا کرتے ہیں "کون کہہ سکتا ہے کہ الی میر کی واقفیت ہماری کسی عظیم تحقیق کی موجب نہیں ہو گی؟"

سنتھالی گیتوں کے بارے میں پنڈت جی دلچسپی سے سُنتے سُناتے ہیں۔ ایک بار وہ کھِتی بابو[2] کے ہمراہ گھومنے نکلے تو اُنہوں نے دیکھا کہ سنتھال عورتیں اپنے اپنے ہاتھ میں مشعل پکڑے گاتی چلی جا رہی ہیں۔ وہ دُور نکل گئیں تو کھِتی بابو نے پوچھا۔ "کہئے کیا سُنا؟" اور جب پنڈت جی نے تبلایا کہ گنگا پوجنے جاتی ہوئی عورتیں اُنکے اپنے گاؤں میں بھی اِسی لَے میں گایا کرتی ہیں۔ تو کھِتی بابو بولے۔ "گنگا آریوں کا لفظ نہیں ہے۔ اُن کے یہاں آنے سے پہلے بھی ہندوستان کی مقامی قوم میں رائج تھا۔ یہ سنتھال بھی اُسی قدیم قوم سے ہیں۔ آپ کے صوبے کی عورتوں نے گنگا پوجا کا وہ گیت کسی زمانے میں سنتھال عورتوں سے ہی سیکھا ہو گا۔"

میرے مجموعے میں پنڈت جی کو ایک گجراتی دُلہن کا المیہ گیت بہت پسند ہے۔ اُس بیچاری کا اپنا خاوند، ایک گھریلو غلط فہمی کی وجہ سے، سونے کے کٹورے میں زہر گھول کر اُسے پلا دیتا ہے۔ سارے گیت پر غم کی فضا چھا رہی ہے۔ ایسا کوئی گیت سنتھالوں سے بھی ضرور

---

[1] یو۔پی کی بہار والی سرحد پر۔
[2] کِشتی موہن سین۔ شانتی نکیتن میں ودیا بھون کے پرنسپل۔

مانا چاہیئے۔" یہ کہتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں کھو جاتے ہیں۔

پنڈت جی اکثر کہا کرتے ہیں کہ کبھی کسی لاٹری میں انہیں پچاس لاکھ روپے مل جائیں گے۔ پانچ لاکھ روپے مجھے دیدیں گے تاکہ دیہاتی گیتوں کے مجموعے خوبصورتی سے شائع کرسکوں۔ اور پچاس لاکھ روپے سے کہیں ہمالیہ پربت پر ایک دوسرے شانتی نکیتن کی بنیاد رکھیں گے۔ اور باقی روپیہ اپنی ضرورتوں پر خرچ کیا کریں گے۔

انہیں تنخواہ کم ملتی ہے۔ اس کا کافی حصہ پیچھے گھر پر بھیجنا ہوتا ہے۔ رات کی نیند حرام کرتے ہیں تب جا کر کچھ مضامین لکھ پاتے ہیں۔ اس سے کچھ بالائی آمدنی ہو جاتی ہے مگر انہیں یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں انتظامیہ کمیٹی یہ اعتراض نہ کرے کہ اتنے مضامین لکھنے والا پروفیسر کالج کا کام کیسے کرسکتا ہے۔

کلکتہ میں ترقی پسند ادیبوں کی آل انڈیا کانفرنس کا اجلاس ابھی ابھی ختم ہوا ہے۔ اگلے ہی روز جب اس کے صدر ڈاکٹر ملک راج آنند یہاں تشریف لائے تھے پنڈت جی سے بھی ملے تھے۔ شروع میں ڈاکٹر آنند نے پنڈت جی کے سامنے ایک گھنٹہ تک اپنی بات جاری رکھی۔ پنڈت جی بُت بنے سنتے رہے۔ بیچ میں کچھ بھی بولیں گے تو یقیناً رجعت پسند قرار دیئے جائیں گے، یہی ڈر لگا رہا۔

ادھر پنڈت جی کا یہ خیال ہو چلا ہے کہ اصلی ترقی پسند ادیب وہی ہے جو جب بھی کسی آدمی سے ملے ایک گھنٹہ تک اپنی بات سناتا رہے اور سننے والے کو اپنی زبان سے ایک بھی لفظ نہ کہنے دے۔

ترقی پسند ادیبوں کی اس کانفرنس کے سلسلے میں سُبّا راؤ اور ریڈی بُری طرح جھگڑ رہے ہیں۔ اس کی بھی ایک کہانی ہے۔ یہ دونوں لڑکے آندھرا دیس کے ہیں۔ ریڈی کالج کا کورس پورا کر چکا ہے اور اب سنگیت میں مہارت حاصل کر رہا ہے۔ سُبّا راؤ ابھی سیکنڈ ایئر میں پڑھتا ہے۔ جب ڈاکٹر آنند کو معلوم ہوا کہ یہاں سے وہ ایک آدمی کو تیلگو ادب کی نشست کیلئے کانفرنس پر لے جا سکتے ہیں تو وہ بہت خوش ہوئے۔

ریڈی سے پوچھا گیا تو اُس نے جانے سے انکار کر دیا۔ بولا۔ "میں ادیب ہی نہیں۔ ترقی پسند ادیب تو کجا!" مگر سُبّا راؤ مان گیا۔

جب سے سُبّا راؤ کانفرنس سے واپس آیا ہے اُسکی زندگی دوبھر ہو گئی ہے۔ ریڈی اُس کا مذاق اُڑاتا رہتا ہے۔ آج کچن میں ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ گئی...... سُبّا راؤ کہہ رہا تھا۔ ادب برائے ادب کا مسئلہ اب زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسے رجعت پسندوں نے جنم دیا تھا۔ جو زندگی کی تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنے کی بجائے رومان میں پناہ لیتے تھے،...... ریڈی بولا "تیلگو ادب پر برائے راست کچھ ہو تو تمہاری لیاقت کا اندازہ لگاؤں۔ وہ بغیر کچھ سمجھے بوجھے ترقی پسند ادیب بھی بن بیٹھے۔ کلکتہ کی کانفرنس میں تیلگو ادب کی نشست پر بیٹھ کر تم نے سارے آندھرا دیس کی ہتک کی ہے۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکتا۔"...... بس اسی پر ہاتھا پائی ہونے لگی۔

پنڈت جی کہہ رہے ہیں۔ اپنے شانتی نکیتن میں جسے ہم ہمالیہ پربت پر شروع کرنے والے ہیں اور جہاں سے آپکے دیہاتی گیتوں کے مجموعے شائع ہوں گے، ہم ایسا انتظام کریں گے کہ ایسی ہاتھا پائی کبھی نہ ہوا کرے۔

میں کہتا ہوں ــ پنڈت جی! یہ ہاتھا پائیاں تو رہتی دنیا تک جاری رہیں گی...... چھوٹی ہاتھا پائیاں ...... بڑی ہاتھا پائیاں!

۳

شانتی نکیتن کے میلے پر پچھلے سال سی۔ ایف اینڈریوز صاحب سے پہلی بار ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ وہ یوں بغلگیر ہو کر ملے تھے جیسے کوئی باپ برسوں کے بچھڑے ہوئے بیٹے سے ملتا ہے۔ جا بجا لوگوں کی طرف اُن کے ساتھ جاتے ہوئے میں نے دیکھا کہ وہ سبھی سے بغلگیر ہو کر ملتے ہیں۔ سامنے سے کوئی سنتھال آ جاتا تو وہ اُسے بھی سینے سے لگا لیتے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں خود حضرت یسوع مسیح کے ہمراہ چل رہا ہوں۔

اس بار انہیں کلکتہ میں کام تھا۔ اس لئے وہ شانتی پوش کے فوراً بعد یہاں سے چل دیئے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ کون جانے اگلے شانتی پوش پر تم کدھر رہو میں کدھر رہوں۔ پچھلے سال کی طرح اب کے ہم پھر مل سکے، یہ کچھ کم بات ہے...... تمہارے کام سے مجھے بہت دلچسپی ہے۔ ہر کام ایک سادھنا مانگتا ہے ایک دُھن۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ گاؤں والوں کے گیت بڑی خوبی کے ساتھ ہندوستان کا دھڑکتا ہوا دل ہمارے سامنے لے آتے ہیں۔

چلتے چلتے وہ کہہ گئے کہ میں انہیں اپنے کھینچے ہوئے فوٹو جلد

بیجوں۔ کرسمس کی صبح کو اُن کا جو فوٹو میں نے کھینچا تھا اُس میں اُن کی بھرپور دلی خوشی کو دکھانے کی سعی کی گئی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اُنہیں ایک دوسرا فوٹو اور بھی پسند آئے گا جس میں کوتیب میری بیٹی اُن کی گود میں بیٹھی ہے۔ اُنہوں نے بتایا تھا کہ بچوں سے اُنہیں سدا محبت رہی ہے۔

اِنسانی لہروں کے وہ زبردست ریلے اب نظر نہیں آتے پانتھ نواس کے سامنے والی سڑک پر پھر وہی خاموشی چھا رہی ہے۔

دُور سے بنسری کی لے کان تک پہنچتی ہے اور وقت گزرتا رہتا ہے پل پل کر کے۔

صبح، دوپہر، شام۔

حال ماضی بن جاتا ہے مستقبل حال بن جاتا ہے۔ گانے سے پیٹ تو نہیں بھرتا۔ مگر گانا بھی ضروری ہے۔ صدیوں سے یہ بنسری کانپتے ڈگمگاتے آدمی کا سہارا رہی ہے، صدیوں سے وہ کبھی سوئی نہیں۔ یہ یہاں نہ ہوتی تو شانتی نکیتن کی بہت ساری سُندرتا پھیکی پڑ جاتی۔ اور میں تو سمجھتا ہوں گورودیو[5] کی شاعری بھی اِس سے متاثر ہوئی ہے۔

آسام سے لوٹ کر دارجلنگ میں گورودیو سے ملا تھا تو میری آٹوگراف بک میں اُنہوں نے یہ الفاظ لکھ دیئے تھے۔

"اے دُنیا کی ننھی خانہ بدوش ہستیو!
میرے لفظوں میں چھوڑ جاؤ اپنا کھوج۔"

میں سوچنے لگا تھا کہ اُن سنتھالوں نے بھی، جو اٹھارہویں صدی کے آخری دنوں میں شانتی نکیتن کے پاس دیہات میں آبسے تھے اور جو روز اُس سڑک پر چلتے ہیں جو پانتھ نواس کے سامنے سے گزرتی ہے گورودیو کی شاعری میں ضرور اپنا کھوج چھوڑا ہوگا۔

کل ہی کی بات ہے میں گورودیو کو اپنے کھینچے ہوئے فوٹو دکھا رہا تھا۔ ایک سنتھال چھوکری کی پورٹریٹ پر اُن کا دھیان جم گیا میں نے پوچھا "آپ کو یہ چیز پسند آئی؟"

"ہاں" وہ بولے "اس کا نام ہونا چاہیئے۔ دھرتی کی بیٹی۔ کس طرح اپنی لاج بھری آنکھیں جھکا رکھی ہیں اُس نے۔ یہ لاج تو صدیوں کی لاج ہے جو دہان کی طرح اُگتی ہے..... ضرور وہ دھرتی کی بیٹی ہے۔"

"تو اسے آپ رکھ لیجئے" میں نے خوش ہو کر کہا۔

گورودیو نے مُسکرا کر میری طرف دیکھا اور تصویر اپنے سکرٹری کے سپرد کر دی۔

"میں تو سمجھتا ہوں" میں نے کہا "کہ وہ سنتھال لڑکی جس نے اپنے گیت میں دریا کنارے کی چٹان تلے سوئے ہوئے پانی سے اپنے پیار کو تشبیہ دی ہے اور کسی نوجوان کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ وہ بنسری نہ بجائے تاکہ یہ سویا ہوا پانی بیدار نہ ہو جائے۔ ضرور کوئی ایسی ہی کنواری ہوگی...... پر بنسری تو سوئے ہوئے پانی کو جگا کر چھوڑتی ہے....."

"میرا بھی یہی خیال ہے" گورودیو بولے۔

اُترائن[1] کے دروازے سے ذرا پرے سڑک کے کنارے کنکردا[2] سیمنٹ کنکریٹ سے دو تین قدِ آدم بُت بنوا رہے ہیں۔ ایک سنتھال عورت نے سر پر ٹوکرا اُٹھا رکھا ہے۔ ایک مرد بہنگی اُٹھائے ہوئے ہے۔ پاس اُن کا کتا حکم میں بندھے ہوئے خوددار آدمی کی طرح کھڑا ہے۔ پہلے کاٹھ کے ڈھانچے کھڑے کئے گئے تھے۔ اب سیمنٹ کنکریٹ سے کام کیا جا رہا ہے۔ جب یہ چیز مکمل ہو جائے گی تو آشرم کی سُندرتا میں خاص اضافہ ہو جائے گا۔ پرے دیہات سے آتے ہوئے سنتھال صبح کی روشنی میں دور سے ان بُتوں کو دیکھ کر کیا سوچا کریں گے، یہی سوچ رہا ہوں۔ دل کہتا ہے کہ یہ چیز تو آج سے بہت پہلے تیار ہو جانی چاہیئے تھی۔

کنکردا کہہ رہے ہیں۔ یہ بُت بہت زیادہ فنِش نہیں کئے جائیں گے۔ ویسی ہی سادہ اور کھردری حالت میں رہیں گے، جیسے کہ آج سے کئی سال پیشتر ایک اپسرا کے بُت میں تجربہ کیا گیا تھا جو کہ اب بھی کلا بھون ہوسٹل کے قریب کھڑا ہے۔

میں کہتا ہوں ـــ دیوتاؤں اور اپسراؤں کے سُندر بُت تو بہت بنائے گئے۔ مگر خود دھرتی کے باسیوں کی یہ نمائندگی الگ

---

[5] رابندرناتھ ٹیگور۔

[1] شاعر ٹیگور کے صاحبزادے کا مکان۔ اسی کے احاطہ میں خود شاعر ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے ہیں۔

[2] شانتی نکیتن میں کلا بھون کے ایک آرٹسٹ۔ دادا بنگالی میں بڑے بھائی کو کہتے ہیں، "دا" اسی کا مخفف ہے۔

اہمیت رکھتی ہے۔

دُور سے سنتھال بنسری کے سُر قریب آنے لگتے ہیں۔ میرے ذہن میں وہی پرانا گیت جاگ اٹھتا ہے جو بارہ سال پیشتر پہلی بار دھرتی نے پرسنا تھا۔—— کیا ہیں آخر ہم سب مل کر، ہم سب ان گنت درختوں کا ایک جھرمٹ!

بجائے جاؤ بنسری، بکھرے سُروں کو اکٹھا کئے جاؤ نغمے سے پرانے گانا بھی ضروری ہے۔ صدیوں کا بوجھ جو جھیلنا ہوتا ہے تمہارے گیتوں میں گاتی ہے دھرتی ماتا، اچھی قدیم دھرتی ماتا مگر زندگی سے لڑنا ہوگا اپنے بل پر۔ دب کر نہیں جاتا۔ کون کھاتا ہے ترس کبھی ہم پر؟...... ہائے! زندگی کی تلخ حقیقتیں!

شانتی نکیتن (بنگال)
جنوری ۱۹۳۹ء

دیوندر ستیارتھی

(نیل کی ناگن) بقیہ صفحہ

جلوس سڑک پر آگے بڑھا۔ جلوس جا رہا تھا کہ اس حسین عورت نے جس کے ہاتھ میں مورچھل تھا میری طرف دیکھا، سر ہلایا اور مسکرائی تاکہ حبشی کی سزا پر خوشی ظاہر کرے۔ مجھے اس کی ادا پر حیرت ہوئی۔

لوگ بھی خوش ہوئے۔ تالیاں پیٹیں۔ اور آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے اور مجھ سے کہنے لگے اب دربار میں تمہیں نجومی کی خدمت ضرور ملے گی۔ اب جس قدر جلد ممکن ہوا میں اور میرا ماموں سپاہی وہاں سے چل دیئے اور کسی طرح اپنے گھر واپس آئے۔ جب ہم گھر پہنچ لئے تو میرے ماموں نے مجھے گلے لگایا۔ اور وہ اس بات پر بہت خوش تھا کہ میں نے اس سیاہ فام حبشی کو خوب پیٹا اور خود چوٹ کم کھائی۔

عنایت اللہ دہلوی

سرودِ میکدہ

ابھی سے کس لئے آتش بجام ہے ساقی
یہ بزمِ خاص نہیں، بزمِ عام ہے ساقی

فروغِ جامِ مئے لالہ فام کیا کہنا!
کہ آفتاب بھی جس کا غلام ہے ساقی

کچھ اور شوق کی بیتابیاں بڑھاتا جا
حیات، صرف تڑپنے کا نام ہے ساقی

نگاہ پھیر کے ساغر بڑھا رہا ہے کدھر!
کرم کے بھیس میں یہ انتقام ہے ساقی

یہ جام مے ہے مری زندگی کا پیمانہ
اسی میں غرق مری صبح و شام ہے ساقی

جو ہو سکے تو ذرا اس کو سست رو کر دے
یہ زندگی جو بہت تیز گام ہے ساقی

اک اضطرابِ مسلسل کی پھر ضرورت ہے
فسانۂ غمِ دل ناتمام ہے ساقی

ترے لبوں پہ تبسم ابھی نہیں آیا
نگاہِ مست ادھورا پیام ہے ساقی

یہ خود فروش طریقے، یہ خانہ ساز اصول
زمانہ مقتدیِ بے امام ہے ساقی

درایں جہانِ ہوسناک طرح نو انداز
کہ عاشقی تو یہاں رسمِ عام ہے ساقی

ترے کرم سے ہوں مستی کی اس بلندی پر
جہاں تصورِ ہستی حرام ہے ساقی

سمجھ رہا ہوں میں مفہومِ قلقلِ مینا
مرے لبوں پہ درود و سلام ہے ساقی

وہیں عقیدتِ ماہر بھی کارفرما ہے
جہاں جہاں بھی ترا انتظام ہے ساقی

ماہر القادری

دادا

"دادا جی، بہت ہوا، اب اور بھٹے نہ کھایئے۔" لڑکی نے بڈھے کے سامنے سے بچے ہوئے بھٹوں کو ہٹاتے ہوئے کہا۔ بڈھا اپنے پوپلے مُنہ میں بھٹے کے دانوں کو مسوڑوں سے توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کپکپاتے ہوئے ہونٹ مُنہ سے اُبلتی ہوئی رال کو روکنے سے مجبور تھے اور رال کے قطرے بڈھے کی سفید ڈاڑھی پر گر کر شبنم کے قطروں کی طرح چمک رہے تھے۔ بڈھا اپنے سامنے سے سوندھے سوندھے، سرخ سرخ، موٹے موٹے بُھنے ہوئے بھٹوں کو ہٹتے دیکھ کر بے تاب ہو گیا۔ بھٹوں کے کھانے کا مزہ کرکرا ہوا چاہتا تھا۔ اُس نے لپک کر لڑکی کے ہاتھ تھام لئے اور ان سے جھنجھوڑ کر بھٹوں کو چھین لیا۔ لڑکی نے بڈھے کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جن میں محبت اور فریاد ملی ہوئی تھی۔ بڈھے کو ان باتوں کے دیکھنے اور سمجھنے کی کہاں مہلت تھی۔ وہ بھنے ہوئے بھٹے کے دانوں کو چبا رہا تھا۔ رہ رہ کر تشتری سے نمک، لیمو اور سیاہ مرچ کے "مرکب" کو اپنی کانپتی ہوئی اُنگلی میں لپیٹ کر چاٹ رہا تھا اور چٹخارے لے رہا تھا۔ رال اُمنڈتی ہوئی مُنہ سے باہر چلی آ رہی تھی جیسے کوئی ندی بند توڑ کر پھٹ پڑے۔ بڈھا سراپا احساس ذائقہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس کی آنکھیں لالچ سے بھٹوں کو دیکھ رہی تھیں جن کو کھانا باقی تھا۔ ناک کے نتھنے پھیل کر بھنے ہوئے بھٹوں کی سوندھی بو کو نگل رہے تھے۔ ہاتھ بیقراری سے بھٹے کے دانے نکالنے میں مشغول تھے۔ چہرہ پر بیتابی بھوکی بلی کی طرح غرا رہی تھی۔ بڈھا لطف سے جھوم رہا تھا اور بھٹے کے دانوں کو چبا چبا کر نگلتا چلا جا رہا تھا۔ لڑکی یہ کھڑی دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہوں میں ماں کی سی ہمدردی تھی جو اپنے ناسمجھ بچہ کو ضد سے کوئی بُرا کام کرتے دیکھے اور کچھ نہ کر سکے۔ لڑکی آخرش بڈھے کی اس بھوک اور بیتابی کو دیکھتے دیکھتے اُکتا گئی۔ اس سے نہ رہا گیا۔ اچانک بڈھے کی نظر بچا کر چیل کی طرح جھپٹی اور بھٹوں کو لے کر یہ کہتی ہوئی بھاگی "دادا جی، بہت نہ کھایئے، پیٹ میں درد ہو جائے گا۔" بڈھا اپنی دُھن میں کھویا ہوا تھا۔ پہلے سمجھ ہی نہ سکا کہ کیا ہوا۔ پھر بھٹوں سے خالی میز پر نگاہ پڑی۔ غصہ سے جھنجھلا اُٹھا۔ بھٹے اور بہت سے سوندھے بُھنے ہوئے بھٹوں کے کھانے کی تمنا کو یوں ختم ہوتے دیکھ کر بلبلا اُٹھا۔ برسات میں ہرے ہرے تازہ تازہ بھٹے کھانے کی اُمید جو سال بھر سے اُس کے خیال میں پرورش پا رہی تھی آج یوں فنا ہو کر رہ گئی۔ اب ان بھٹوں کو کھانے کے لئے اُسے پھر ایک سال یعنی تین سو پینسٹھ دن تک انتظار کرنا پڑے گا۔ ستّر سال کے بعد زندگی کا کیا ٹھکانا۔ آج ہے کل نہیں، دوسری برسات دیکھنا میسر ہو کہ نہ ہو۔ بڈھا مُنہ کے چند بچے ہوئے دانوں کو خوب مزے لے لیکر چبانے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ وہ بھٹوں سے خالی میز کو حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ نمک مرچ کی تشتری گزرے ہوئے لطیف ذائقہ کی یاد تازہ کر رہی تھی۔ بڈھے نے ایک بار اور اس مرکّب کو لیکر چاٹا۔ گویا وہ لذیذ بھٹوں کے مزے کی یاد میں آخری چٹخارا لے رہا ہے اور ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کو اپنے بائیں ہاتھ کی آستین سے پوچھا اور تشتری کو اپنی نظر سے دُور ہٹا کر رکھ دیا۔ بڈھا کچھ دیر تک اپنے غم میں کھویا بیٹھا رہا اور اُس دروازے کی طرف حسرت سے دیکھتا رہا جس سے لڑکی بھٹوں کو لے کر بھاگی تھی۔ جب بھٹے اور لڑکی کے لوٹنے کی اُمید قطعی جاتی رہی تو وہ اپنی پرانی بے رنگ و رونق، ٹوٹی پھوٹی کرسی سے ایک آہ کے ساتھ کانپتا ہوا اُٹھا اور پاس رکھی ہوئی سلفچی میں اپنا مُنہ اور ہاتھ دھونے لگا۔ مُنہ دھو کر اپنے پلنگ پر آ بیٹھا جس سے لگا ہوا ایک پرانا حقّہ رکھا تھا۔ چلم کو چھو کر دیکھا۔ وہ ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ بڈھے نے چلم کو یوں ضرورت کے وقت ٹھنڈا پا کر اِدھر اُدھر بیکسی سے دیکھا مگر حقّہ پینے کی زبردست خواہش ایسی نہ تھی کہ اِدھر اُدھر دیکھ کر ٹالی جا سکتی تھی۔ بڈھے نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پکارا "حلیمہ۔" لڑکی کچھ شرمندہ سی نظر آ رہی تھی مگر پھر بھی شوخی سے اٹھلاتی ہوئی دبے پاؤں بڈھے کے پاس آ کر چیخ اُٹھی "کیا ہے؟" بڈھا چونک پڑا۔ لڑکی کھلکھلا کر ہنستی ہوئی بڈھے کے پلنگ پر گر گئی۔ اور "دادا تم ڈر گئے، کیسے ڈرپوک ہو دادا" کہہ کہہ کر خوب ہنسنے لگی۔ بڈھے کے دل میں بھٹوں کے لے بھاگنے کا غبار باقی تھا۔ وہ اب تک بھرا بیٹھا تھا۔ لڑکی کی اس نئی شرارت سے بڈھے نے

غصّہ سے مُنہ پھیر لیا۔ لڑکی نے دیکھا کہ آج دادا اب تک غصہ میں اور اس کی یہ ہنسانے کی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو اُٹھ بیٹھی اور دادا کی گردن میں باہیں ڈالکر اس کے پھرے ہوئے چہرہ کو اپنی طرف پھیرنے لگی "دادا تم مجھ سے ناراض ہو، ہیں دادا؟ غصّہ منہ ہو" لڑکی کی آواز میں ماں کی مامتا اور نرس کی ہمدردی تھی۔ بڈھے نے روٹھ کر کہا "میرے بھٹے!" لڑکی نے مشفقانہ انداز میں کہا "دادا بھٹے زیادہ نہ کھایا کرو۔ پیٹ میں درد ہو جائیگا اور پھر دست آنے لگیں گے" لڑکی یوں ہی بڈھے کی تسلی کر رہی تھی اور اس کے بھٹوں کے نہ ملنے کا غم غلط کر رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور بڈھے کا اکلوتا لڑکا کمرے میں داخل ہوا اُسے دیکھ کر دونوں سہم گئے۔ نووارد نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بگڑ کر پوچھا "یہ بھٹوں کی کیا بات تھی؟" لڑکی خاموش رہی۔ بڈھے نے ہنسی کا چہرہ بنا کر ندامت اور خوف سے کہا "کچھ نہیں قمو، میں کہہ رہا تھا اب کے برسات میں کیا بھٹے گھر میں آنے ہی نہیں؟" قمو نے اپنے لہجہ کی تندی کو بغیر کچھ کم کئے ہوئے ڈانٹتے ہوئے کہا "بھٹے آئیں یا نہ آئیں، آپ سے تم کو مطلب؟" بڈھا اپنے لڑکے کی بدمزاجی سے واقف تھا۔ گھبرا اُٹھا اور معذرت خواہ ہوکر بولا "کچھ نہیں، میں تو یوں ہی پوچھ رہا تھا" قمو نے بپھرتے ہوئے زمین پر پاؤں پٹخ کر کہا "دیکھئے ابا۔ اب کے جو آپ نے بھٹے کھائے تو اچھی بات نہیں ہوگی۔ یہ رات کو اُٹھ اُٹھکر آپ کی دوا کون منگوائے گا اور آپکے غلاظت سے بھرے ہوئے بستر کو کون دھوئیگا؟" بڈھا نظریں نیچی کئے خاموش بیٹھا سُن رہا تھا۔ اُسکا خیال اُسے آج سے ۲۵ سال پیشتر کی دُنیا کی سیر کرا رہا تھا جب یہی ننّھا سا لختِ جگر قمو پیچش میں مبتلا تھا اور وہ رات رات بھر جاگ کر اس کے لئے دوائیں لاتا تھا اور اس کی غلاظت سے بھری ہوئی چادروں کو اپنے ہاتھوں سے دھوتا تھا۔ شوہر کو غصّہ کرتے سُن کر حلیمہ کی ماں بھی آگئی جسکے پیچھے حلیمہ کے چھوٹے بھائی بہن بھی تھے۔ بہو نے آتے ہی بڈھے سُسر پر جملہ چست کیا "اور اس بڑھاپے میں میں نے تو کسی کو بھٹا کھاتے نہیں سُنا۔ موئے بھٹے کیا ہوئے کباب ہوگئے کہ ہزار منع کیجئے کچھ سُنتے ہی نہیں۔ ان کو تو، نوج، وہی چیزیں پسند ہیں جن کے کھانے سے پیٹ دُکھے اور دست آئیں۔ کباب، بھنے ہوئے چنے، آم، ارہر کی دال، باقرخانی، پلاؤ۔ ہزار سمجھاتی ہوں کہ ابا یہ نہ کھایئے مگر ابا پر تو جیسے بھو کا جن سوار ہو جاتا ہے" لڑکے نے کہا "اب ان کو سوائے ملک الموت کے کون سمجھا سکتا ہے۔ عقل ہو تو سمجھیں۔ ان کی عقل تو نہ جانے کہاں ماری گئی" بوڑھا گردن جھکائے سُن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آج اُس کی عقل پر سمجھ پر مرغوب غذاؤں کی جائز خواہش پر پھبتیاں کسی جا رہی ہیں مگر یہ اُسی کی عقل اور سمجھ تھی جس نے آج قمو کو ڈپٹی کلکٹر بنا دیا تھا اور یہ وہی قمو ہے جسکو وہ طرح طرح اور رنگ برنگ کے کھانے پکوا کر کھلاتا تھا کہ اس کی صحت اچھی رہے اور دماغ کمزور نہ ہونے پائے۔ یہ وہی لڑکا ہے جس کی درازیِ عمر کے لئے وہ اب تک روز رات کو سوتے کے وقت دعائیں مانگتا ہے اور یہ آج اسے ملک الموت کے حوالہ کر رہا ہے۔ بہو شوہر کی شہ پاکر اپنی لسانی دکھانے لگی۔ "اور سُنا تم نے، یہ ابا کو ہو کیا گیا ہے؟ کل خوانچے والے سے قلاقند خرید کر کھا رہے تھے۔ وہ تو میری نگاہ پڑ گئی اور میں نے شور مچایا ہے، نہیں تو خدا جانے کل کیا حال ہو جاتا" لڑکے نے مونچھوں پر تاؤ دیکر کہا "غضب خدا کا ایسا اندھیر، ابا یہ آپ نے خودکشی کی کیوں ٹھان لی ہے؟" بڈھا بدستور جھکا بیٹھا تھا۔ اُس کی نظر کے سامنے قمو ایک پانچ سالہ لڑکے کی طرح اپنے ہاتھ میں چھوٹی سی لال چھڑی لئے کھیل رہا تھا کہ خوانچہ والا آ گذرا۔ قمو نے مچل کر کہا "ابا مجھے قلاقند لے دو" وہ قمو کو کس شوق سے قلاقند خرید کر کھلا رہا تھا اور اُس کے بھولے گالوں کو چوم رہا تھا۔ ماں باپ کو غصہ کرتے دیکھ کر حلیمہ کے بھائی نے بھی اپنی واقفیت سے اضافہ کرنا چاہا۔ کہنے لگا "اور دادا جان دال موٹھ بھی خریدتے ہیں اور کبھی کبھی دوپہر کو جب آپ دفتر میں ہوتے ہیں اور اماں سوتی رہتی ہیں تو آم والے کو بلا کر اس کھڑکی سے آم بھی خریدتے ہیں" باپ یہ سُن کر غصّہ سے تلملا اُٹھا اور کہنے لگا "کیوں ابا۔ آپ کا ارادہ کیا ہے؟" بڈھا خاموش رہا اور اُس زمانہ کو یاد کرنے لگا جب قمو کا تبادلہ ایسی جگہ میں ہو گیا تھا جہاں آم نہیں ملتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ قمو کو آم کسقدر پسند ہیں۔ قمو کے پسند کے آم اُس نے کس دردسری سے مہیا کئے تھے اور اُن کو پارسل کے ذریعہ قمو کے پاس بھیجا تھا۔ بھائی کو الزام لگاتے دیکھ کر حلیمہ کی چھوٹی بہن کیوں چپ رہتی۔ اُس نے بھی چغلی کھانا شروع کی "اور ابا جی، آج باجی جان دادا جی کے لئے بھٹے بھُون کر لائی تھیں" یہ سُننا تھا کہ لڑکے کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُس کے مُنہ میں جو کچھ آیا بکتا گیا۔ باپ کی خوب ڈانٹ پھٹکار کے بعد اپنی بیٹی حلیمہ کی طرف مخاطب ہوکر اُسپر

برس پڑا۔ حلیمہ جوان ہو چکی تھی ورنہ وہ آج یقیناً مار کھا جاتی۔ لڑکا دیر تک چیخنے چلانے کے بعد کمرہ سے باہر چلا گیا اور اس کے پیچھے اُسکی بیوی اور دونوں بچے بھی چلے گئے۔ بڈھے کی آنکھوں سے آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرے ٹپک کر گر رہے تھے اور پاس ہی حلیمہ بیٹھی سسکیاں لے رہی تھی۔ بڈھا اپنی زندگی کے اُس دور کو یاد کر رہا تھا جب وہ جوان اور مضبوط تھا۔ سب اُس کے دست نگر تھے اور وہ کسی کا محتاج نہ تھا۔ بڈھے کا خیال اپنی مرحومہ بیوی کی طرف گیا جسکو وہ بہت چاہتا تھا اور جو آج اگر زندہ ہوتی تو اُسکو اس بیکسی کی حالت میں ہرگز نہ چھوڑتی۔ اُس کا خیال پھر اُس کو اس گھڑی میں لے گیا جب بڑی آرزوؤں کے بعد قمو پیدا ہوا تھا اس وقت وہ اور اُس کی بیوی کتنے خوش تھے اور اس کے عقیقہ کی تقریب میں کیا کیا کچھ نہ کیا تھا۔ بڈھا پھر اُس زمانہ کو یاد کرنے لگا جب قمو پڑھتا تھا۔ ہر مہینہ وہ کس طرح اپنی پوری تنخواہ اُسکے کالج اور دیگر اخراجات کے لئے بھیج دیتا تھا اور خود دال روٹی پر بسر کرتا تھا۔ بڈھے نے ایک لمبی آہ بھری اور پھر سوچنے لگا۔ وہ اب اپنی اُس خوشی کو یاد کر رہا تھا جب قمو ڈپٹی کلکٹر ہوا تھا اُسنے قمو کی ڈپٹی کلکٹری پر کتنی خوشیاں منائی تھیں اور اس کی ذات سے اپنی کون کونسی اُمیدیں وابستہ کر رکھی تھی۔ پھر اُسکو اپنی بہو یاد آئی جب وہ بیاہ کر اُس کے گھر آئی تھی۔ اُس نے کس پیار سے اپنی کمدلی سی بہو کو اپنے گھر میں خوش آمدید کہا تھا اور نئی دُلہن کی ہر ضرورت کو کتنی فراخدلی اور حوصلہ سے پورا کرتا تھا۔ بڈھا اپنے گذرے ہوئے زمانہ کی باتوں کو آج دُہرا رہا تھا۔ جوشِ گریہ سے اُس کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ وہ بہت ضبط کر رہا تھا مگر پھر بھی کبھی کبھی گھٹی ہوئی چیخ باہر نکل جاتی تھی۔ اس ہلکی سی چیخ میں ارض و سما کا اثر پنہاں تھا۔ ایسی چیخ صرف محتاج بڈھے ہی مار سکتے ہیں۔

حلیمہ دادا کے رونے کو دم بدم بڑھتے دیکھکر اپنا رونا بھول گئی اور دادا کے گلے میں باہیں ڈالکر اُس کے آنسو اپنے آنچل سے پونچھنے لگی اور تسلیاں دینے لگی۔ "دادا جی۔ اب نہ روئیے، ابا اماں یونہی بکتے ہیں، اُن کو بکنے دیجئے، آپ تو مجھ سے کہا کیجئے کہ آپ کا جی فلاں چیز کھانے کو چاہتا ہے۔ میں آپ کو آم، بھٹے، قلاقند سب ہی کچھ لا دونگی۔ یہ ابا اماں کو کیا پڑی ہے کہ آپکو دست آجائیں گے؟ آتے ہیں تو آئیں! آپ کے کپڑے اور چادریں میں بدلتی ہوں۔ اگر کسی کو شکایت ہوسکتی ہے تو وہ میں ہوں! اُن کو کیا غرض؟ اُونہہ اُنکو چیخنے دیجئے!! دادا جی اب تو آپ چُپ ہوجائیے۔ لیجئے میں آپ کا حقہ بھر کر لا دوں۔" حلیمہ نے یہ کہہ کر حقہ سے چلم اُتاری اور اندر چلی گئی۔ بڈھا اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے لڑکی کو یوں دیکھنے لگا جیسے کوئی معصوم بچہ اپنی ماں کو دیکھے۔ حلیمہ چلم پھونکتی ہوئی واپس آئی اور حقہ پر رکھکر بولی "یہ لیجئے دادا جی اب حقہ پیجئے" بڈھے نے اپنی آستین سے ڈھلکتے ہوئے آنسو پونچھ ڈالے اور لیٹ کر حقہ پینے لگا۔ لڑکی نے کہا "دادا جان، روتے روتے آپ کے سر میں درد ہوگیا ہوگا لائیے میں داب دوں۔" یہ کہہ کر حلیمہ اپنے نرم و نازک ہاتھ سے دادا کا سر دبانے لگی اور نہ جانے کس خیال میں ڈوب گئی۔ شام کے سات بج رہے تھے فضا میں تاریکی پھیلنے لگی تھی۔ بڈھے کے حقہ کی آواز آہستہ آہستہ سُست ہونے لگی اور کچھ دیر بعد بالکل بند ہوگئی۔ بڈھا اپنے تمام غموں کو بھلائے ہوئے نیند کی آنندبھری دُنیا کی سیر کر رہا تھا۔ حلیمہ نے آہستہ سے اُٹھکر دادا کے سوئے ہوئے معصوم چہرہ کو پیار سے دیکھا اور اندر چلی گئی۔

برسات کی اندھیری رات تھی موسلادھار بارش کے بعد مطلع صاف ہوگیا تھا مگر اب تک چھت کے نیچے کھچے پانی کے قطرے رہ رہ کر ٹپ ٹپ کر رہے تھے۔ پاس کے جل تھل ندی نالوں سے مینڈکوں کا شور سُنائی دے رہا تھا مرغوب اور خُنک ہوا زور سے چل رہی تھی کہ دادا کے کمرہ کے باہر، برآمدہ میں کچھ آہٹ سُنائی دی اور سرگوشیوں میں بات کرنے کی آواز آنے لگی۔ لڑکی کہہ رہی تھی "مگر یہ نہیں ہوسکتا، یہ ناممکن ہے۔" لڑکے نے کہا "ممکن کیوں نہیں، کیا ایک غریب کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی امیر کی لڑکی سے شادی کرے۔" لڑکی نے اپنا مطلب صاف کرنے کی غرض سے کہا "نہیں یہ بات نہیں، تم ابا کے مزاج سے واقف نہیں، وہ اس بات پر ہرگز راضی نہ ہوں گے۔" لڑکے نے خوشامدانہ لہجہ میں کہا "اب جو کچھ بھی ہو، کل میں اُن کے سامنے جا کر اُن کے قدموں پر گر کر تمہاری بھیک مانگوں گا۔ کیا وہ میرے سوال کو رد کردیں گے؟" لڑکی نے گھبرا کر کہا "نہیں، نہیں، ایسا ہرگز نہ کرنا ورنہ میری خیریت نہیں، احسن تم میرے ابا کے غصّہ سے واقف نہیں، وہ میری شادی تم سے ہرگز ہرگز نہ کریں گے جب تک کہ تمہاری کوئی مستقل آمدنی نہ ہوجائے۔" لڑکے نے کہا "میری مستقل آمدنی کے ہونے کیلئے ایک مدت چاہیئے اور ہماری

حالات ایسی ہے کہ ہمیں جلد از جلد ایک دوسرے کا ہوجانا چاہیئے۔ یہ ہمارا چھپ چھپ کر ملنا بھی تو اچھا نہیں، کسی نہ کسی دن بھانڈا پھوٹ کر رہے گا۔" لڑکی نے روتے ہوئے کہا "اب جو کچھ بھی ہو، قسمت کا نوشتہ ہو کر رہے گا، تم کیوں گھبراتے ہو، جو کچھ ہونا ہوگا وہ میں برداشت کر لوں گی، پیارے تمہارا کالج اب کھلیگا، تم جلد یہاں سے چلے جاؤ۔" لڑکے نے لڑکی کے گلے میں باہیں ڈالکر کہا "اور تم کو یونہی چھوڑ دوں، نہیں مجھ سے یہ نہ ہوگا، تم بھی میرے ساتھ چلو۔" لڑکی کی سسکیوں کی آواز دمبدم بڑھ رہی تھی، اُس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا "اور اپنے باپ دادا کے نام پر دھبہ لگا دوں، احسن، میرے پیارے مجھ سے یہ نہ ہو سکیگا۔ اور دادا دادا جان کو چھوڑ کر چلی جاؤں۔ پھر اُن کی خدمت کون کریگا؟ اُن کی تنہائی میں اُن کا دل کون بہلائے گا؟ احسن، اب تو تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور جاؤ۔" لڑکا اب رو رہا تھا اور لڑکی کو اپنے کلیجہ سے لگا کر اُس کے رخساروں کو چوم رہا تھا۔ لڑکی نے دادا کے کمرہ کی طرف جہاں مدھم روشنی ہو رہی تھی دیکھکر کہا "پیارے، اب دیر نہ کرو، جاؤ، خدا حافظ۔"

لڑکے نے دلگرفتہ آواز میں "خدا حافظ" کہا اور مدہوش انسان کی طرح لڑکھڑاتا ہوا احاطہ سے باہر نکل گیا۔ وہ اس پگڈنڈی پر ہولیا جو ندی کو جاتی تھی۔ وہ سر جھکائے ہوئے اپنے خیال میں کھویا ندی کی طرف جا رہا تھا۔ اُس کے پاؤں کی دھمک سے ٹرّاتے ہوئے مینڈک تھوڑی دیر کیلئے چپ ہوجاتے تھے اور جھینگر کی جھنجھناتی ہوئی آواز بھی کچھ دیر کے لئے بند ہوجاتی تھی۔

"دادا جان، اُٹھئے بھی، چاء ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" یہ کہہ کر حلیمہ نے دادا کی چادر کھینچ لی۔ سویرے کا وقت تھا، ستمبر کا مہینہ، آسمان گہرے نیلے رنگ کا ہو رہا تھا۔ دُھلا دُھلایا سورج اپنی جگمگاتی کرنوں سے سنسار کو اُجالا کئے ہوئے تھا۔ بڈھا پڑا اپنے خیالات کی دُنیا میں سیر کر رہا تھا۔ حلیمہ کی یہ چھیڑ اُس کو ناگوار گذری اور اُس نے حلیمہ کے ہاتھ سے چادر چھین کر کروٹ بدل لی۔ حلیمہ نے زور آزمائی کرتے ہوئے کہا "آپ نہیں اُٹھتے تو لیجئے میں چاء واپس کر دیتی ہوں۔" حلیمہ یہ کہہ کر دادا کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ بڈھا بدستور کروٹ لئے دیوار کی طرف مُنہ پھیرے پڑا تھا۔ حلیمہ نے دادا کی بے رُخی اور لاپرواہی دیکھکر لاپرواہی والے لہجہ میں کہا "اور تو دیکھئے، دادا جی، کیسے گرم گرم چرمرے کباب ہیں۔ میں نے ان کو خاص آپ کے لئے اپنے ہاتھوں سے تلا ہے۔" بڈھے نے محسوس کیا کہ واقعی کباب گرم ہیں جن کی لذیذ خوشبو سارے کمرے میں پھیل رہی ہے۔ اب اُس کے جسم میں جنبش ہوئی۔ اُس نے مُسکراتے ہوئے مُنہ پھیر کر پوچھا "کباب ہیں؟"، حلیمہ نے شوخی سے جواب دیا "جی ہاں، آپ اُٹھئے بھی تو، یہ بیچارے کباب پڑے پڑے ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔" حلیمہ نے دادا کو اُٹھنے میں سہارا دیا۔ بڈھے نے بیٹھکر پلنگ سے لگی ہوئی میز پر تیز نگاہ ڈالی۔ واقعی تشتری میں گول گول، خوب تلے ہوئے سرخ سرخ، گرما گرم کباب پڑے اپنی بھینی بھینی خوشبو سے دُنیا کو معطر کئے ہوئے تھے۔ دادا نے بیتاب ہوکر پورے ایک کباب کو اپنے پوپلے مُنہ میں رکھ لیا اور جھوم جھوم کر چبانا شروع کیا۔ آنکھیں ذائقہ کے سرور سے مخمور ہوگئیں۔ نتھنے پھیل کر کباب کی سوندھی بو کو نگلنے لگے۔ رال اُمنڈتی ہوئی لبوں سے باہر ٹپک کر سفید ڈاڑھی پر صبح کے ستارے کی طرح چمکنے لگی۔ حلیمہ دادا کو اس بیتابی سے کھاتے دیکھکر اطمینان اور تشفی کا سانس لے رہی تھی۔ اسکی آنکھوں سے ممتا بھری محبت کے آنسو چھلکے پڑ رہے تھے۔ دادا نے پہلے کباب کو نگلنے کے بعد دوسرے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے حلیمہ کی طرف دیکھکر کہا "کباب بڑے اچھے ہیں۔" حلیمہ نے اپنے سر کی جنبش سے ہاں کہا اور دادا پر نظریں جمائے ہوئے کسی نیا ان، مضمحل خیال میں ڈوب گئی۔ بڈھے نے دوسرے کباب کو بھی چٹ کر لیا۔ اُس کے چہرہ پر مزید کبابوں کی خواہش اب تک دوڑتی پھر رہی تھی۔ اُس نے حلیمہ کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جن میں اور کبابوں کی فرمائش تھی مگر حلیمہ کو کسی اور خیال میں گم پاکر مُسکراتے ہوئے کہا "حلیمہ۔" حلیمہ چونک پڑی اور دادا کو اپنی طرف مُسکراتے دیکھکر ڈر گئی۔ اُسے خوف پیدا ہوا کہ کہیں دادا نے اُس کے دل کی بات جان تو نہیں لی۔ حلیمہ نے دادا کے چہرہ کو غور سے دیکھا جیسے وہ بڈھے کی مُسکراہٹ کی وجہ جاننا چاہتی ہے مگر بڈھے کی آنکھوں میں مزید کبابوں کی خواہش کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ بڈھے نے پوچھا "بیٹی، یہ کونسا مہینہ ہے؟" "ستمبر۔" "آج کیا تاریخ ہے؟" "دس۔" بڈھے نے چپکے سے کچھ کہا اور چُپ ہوگیا۔ بڈھے نے اب اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے چاء بنانا چاہا۔ حلیمہ نے بڈھے کو روک کر خود چاء بناتے ہوئے

دریافت کیا۔ "دادا جی، آپ کیا کہہ رہے تھے؟" بڈھے نے غمگین آواز میں کہا "بیٹی میں کہہ رہا تھا کہ دیکھئے اکتوبر کا مہینہ دیکھنا نصیب بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ زندگی آہ، یہ زندگی بڑھاپے میں بار گراں ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس ناگوار بوجھ کو اٹھائے اٹھائے پھرنا ایک عذاب سے کم نہیں۔ آج سالہا سال اسی انتظار اور امید میں گذر گئے کہ دیکھئے کب گلو خلاصی ہوتی ہے۔ اُف، یہ زندگی اور بلا وجہ زندگی کا بوجھل پتھر......" حلیمہ دادا کے گلے میں باہیں ڈالکر مغموم آواز میں کہنے لگی۔ "دادا جی، خدا نہ کرے، ایسا نہ کہیئے۔ آپ خدا کرے ہزاروں برس اور زندہ رہیں" بڈھے نے حلیمہ کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "بیٹی اپنے مجبور دادا کو ایسی سزا نہ دو۔ دعا کرو کہ خدا جلد اُٹھالے، تم گھبراؤ نہیں، مرنے کے بعد بھی میری روح تمہاری نگہبانی کریگی اور تم کو اپنی حفاظت میں رکھے گی۔ حلیمہ تونے میری جیسی خدمت کی ہے اُسکا اجر نیک خدا تجھ کو ضرور دیگا"۔ حلیمہ نے اس موضوع گفتگو کو روح فرسا پاکر بات کا رُخ پھیر دیا اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔

حلیمہ کی پریشانیوں نے ایک شدید صورت اختیار کر لی تھی۔ دادا کی اچانک موت سے وہ مضمحل ہو کر نڈھال ہو گئی تھی۔ اور اپنی ناامیدیوں سے مجبور ہو کر اپنے دماغ میں ایک نہایت خوفناک تہیہ کر لیا تھا۔ اس کی زندگی میں اس کے لئے اب کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی۔ دادا کی موت نے اُس کے لئے راستہ صاف کر دیا تھا۔ اب تک صرف دادا کی وجہ سے وہ اپنی جان کو ہلاکت سے بچائے ہوئی تھی ورنہ ہر روز جو اُس پر گذر رہا تھا اُس کے خوف و ہراس میں اضافہ کرتا جا رہا تھا۔ آخرش کب تک وہ اپنی جنسی کمزوری کے راز سے دُنیا کو بے خبر رکھ سکتی تھی۔ اور کب تک یہ راز راز بن کر رہ سکتا تھا؟ اس راز کے پھوٹنے کے خیال سے وہ کانپ جاتی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے باپ کی غصہ سے سُرخ سُرخ آنکھیں، ماں کی نفرت بھری صورت، بھائی بہنوں کا پریشانی سے رو رو کر اُس کی طرف دیکھنا، پھرنے لگتا تھا۔ وہ بے چین ہو کر ڈوبتے ہوئے انسان کی طرح آسمان کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔ حلیمہ برآمدہ میں بید کی کُرسی پر ایک رسالہ کھولے ہوئے بیٹھی تھی۔ مگر اُس کے پڑھنے کی بجائے وہ اپنے خیالات میں غرق تھی، اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی تھیں جن سے کبھی کوئی چمکتا ہوا قطرہ ڈھلک کر گال پر بہتا ہوا گود میں گر جاتا تھا۔ جیسے کوئی ستارہ آسمان سے ٹوٹ کر گرے اور ماہتاب کے سامنے سے گذرتا ہوا افق میں کھو جائے۔ حلیمہ اپنے خیال میں کھوئی ہوئی تھی کہ ایک نئی چمکتی ہوئی موٹر گاڑی نہایت خموشی سے اُس کی کوٹھی میں آئی جس سے احسن جیسا کوئی نوجوان نہایت نفیس لباس پہنے ہوئے اُترا اور اُس کے باپ سے ملنے کے لئے ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ حلیمہ کا بجھا ہوا دل اس کے ٹھنڈے سینے میں بلیوں اُچھلنے لگا۔ اُس کے آنسو خشک ہو گئے اور چہرہ گرم گرم خون کی تمازت سے سُرخ ہو کر تپنے لگا۔ اُس کی نظروں کے سامنے تنگ و تاریک دُنیا دفعتاً اتنی روشن ہو گئی کہ اُس کی چمک سے اس کی چندھیائی ہوئی آنکھیں دُکھنے لگیں۔ اُس نے محسوس کیا جیسے آفتاب نیچے اُتر آیا ہے جس کی گرم روشنی میں وہ پسینہ پسینہ ہوئی جا رہی ہے اور اس کے کانوں میں ہزاروں جھانجھ پیٹے جا رہے ہیں جن کے شور سے وہ بہری ہوئی جا رہی ہے۔ اُس کی نظروں کے سامنے ہر چیز لہرانے لگی تھی۔ برآمدہ کے کھمبے، احاطہ کے لمبے درخت، سڑک پر چلتا ہوا آدمی، احاطہ میں رکھا ہوا چمکدار سُرخ موٹر، ہر چیز لہرا کر ٹیڑھی ترچھی معلوم ہونے لگی تھی۔ حلیمہ نے گھبرا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کیا ہوا اور کیا ہونے والا ہے۔ وہ مدہوش، بے خبر، لاپروا اور خبط کی حالت میں آنکھیں بند کئے ہوئے بیٹھی تھی کہ جوتے کی گونجتی ہوئی آواز اُس کے کانوں میں آنے لگی جو دلیری اور اعتماد سے دمبدم اُس کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ حلیمہ نے محسوس کیا کہ جیسے وہ خواب دیکھ رہی ہے جہاں کوئی بڑھئی اپنے ہتوڑے سے لکڑی میں کیل ٹھونک رہا ہے کسی نے اُس کے شانہ پر ہاتھ رکھکر آہستہ سے محبت بھری آواز میں کہا "حلیمہ کیا سو رہی ہو؟" حلیمہ چونک پڑی اور اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں کو اُوپر اُٹھا کر دیکھنے لگی۔ واقعی احسن جھکا ہوا حلیمہ پر مسکراتی ہوئی نگاہ ڈال رہا تھا۔ حلیمہ کو اپنی آنکھوں اور کان پر اعتبار نہیں آیا۔ وہ ایک مفلوج لڑکی کی طرح ساکت اور خاموش بیٹھی ہوئی احسن کو مُڑ مُڑ کر دیکھتی رہی۔ احسن نے حلیمہ کے شانے ہلا کر کہا "کیوں کیا بات ہے؟ تم نے مجھے چار ماہ کے اندر ہی بھلا دیا"۔ حلیمہ اب بھی مدہوش تھی، احسن کی طرف دیدے پھاڑ کر دیکھتی رہی جیسے اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ احسن نے ادھر اُدھر دیکھ کر زمین پر اپنا گھٹنا ٹیک دیا۔ اور حلیمہ کی کھلی ہوئی آنکھوں کا اور پھر اُس کے خوبصورت بھولے لبوں کا ایک لمبا سا پیار لیکر کہا "پیاری، ہمارا آج

شام کو نکاح ہے، کل تم میرے ساتھ چلنے کے لئے تیار رہو۔" حلیمہ خاموش احسن کو ایسی نگاہوں سے دیکھتی رہی جیسے وہ کچھ بھولی ہوئی چیز کو یاد کرنا چاہتی ہے۔ احسن نے تھپ پیار سے کر کہا "اے لو اب تم نہیں بولتیں تو نہ بولو، مجھے بہت سے کام کرنے ہیں، میں چلا۔" احسن اٹھکر دوڑتا ہوا گاڑی میں جا بیٹھا۔ موٹر نے ہلکی سی غرّاہٹ کے بعد جنبش کی اور اپنے پیچھے دھول کی ایک موٹی سی چادر بچھاتا ہوا نظروں سے غائب ہو گیا۔ حلیمہ ان اُڑتے ہوئے خاک کے ذرّوں کو غور سے دیکھ رہی تھی جو آفتاب کی روشنی میں کلا بقراتے ہوئے چمک رہے تھے اور آہستہ آہستہ ہوا میں مل کر غائب ہو رہے تھے۔ حلیمہ نے محسوس کیا کہ جیسے وہ خواب دیکھ رہی ہے، جہاں احسن آکر چلا بھی گیا۔

"پیارے یہ خواب ہے یا حقیقت؟" حلیمہ نے احسن کے پہلو میں بیٹھے ہوئے پوچھا۔ احسن موٹر چلا رہا تھا اور اپنے ایک ہاتھ کو حلیمہ کی کمر میں حمائل کئے ہوئے تھا۔ اس نے حلیمہ کو محبت سے اپنی طرف کھینچتے ہوئے جواب دیا "میری جان، حقیقت اور ٹھوس قسم کی!" حلیمہ نے کہا "مگر یہ کیسے ممکن ہے کہ تم اسقدر جلد اتنے امیر ہو گئے؟" احسن نے حلیمہ کو پیار کرتے ہوئے کہا "پیاری یہ سب تمہارے دادا جان کا عطیہ ہے۔"

محمد نصیر الدین

تجلّیات

تصدقِ حجاب تجلّی دکھائی جاتی ہے
مری نگاہ تماشا بنائی جاتی ہے

خزاں کا شکوہ عبث، جامہ در رہو دیوانے
ابھی بہار گلستاں میں آتی جاتی ہے

ثمرۂ برق کا حاصل نہ ہو کوئی خرمن
کچھ اس حجاب سے بجلی گرائی جاتی ہے

نہ جانے حشر ہو کیا اُسکی پرسشِ دل کا
کہ عرضِ شوق کی تمہید اُٹھائی جاتی ہے

قبول شوق نہیں نامراد یاں شاید
دلِ حزیں میں ابھی آس پائی جاتی ہے

حجاب تیری تجلّی نہیں مگر پھر بھی
ترے حجاب کی کب تاب لائی جاتی ہے

عدم قبول بہر شکل!!! اسکو کیا کہیے؟
کہ مجھ پہ تہمتِ ہستی لگائی جاتی ہے

بغیر حسرتِ دل، دل کی زندگی معلوم
غضب ہے حسرتِ دل ہی مٹائی جاتی ہے

متاعِ عشق ہو اک آہِ زیرِ لب تابش
مرے لبوں پہ مگر وہ بھی آئی جاتی ہے

تابش دہلوی

کچہری

خواہ لیڈر ہو، خواہ پلیڈر۔ خواہ نائی ہو۔ خواہ قصائی۔ خواہ تھانیدار ہو خواہ خدائی فوجدار۔ خواہ بزاز ہو۔ خواہ عشوہ طراز۔ خواہ بہشتی کا سگا ہو خواہ بھٹیارن کا لڑکا، کوئی بھی ہو اور کچھ بھی ہو کسی نہ کسی دن ان دو مقامات پر ضرور آئے گا یا لایا جائیگا۔ ایک تو قبرستان یا مرگھٹ میں اور دوسرے کچہری میں۔ ممکن ہے کہ عجائب خانہ میں آپ کی ممی بنا کر رکھ لی جائے یا آپ کی نعش گنگا میں بہا دی جائے یا خدانخواستہ آپ کی موت کسی تشنددگی کی واردات یا بحری حادثہ کی بنا پر رونما اور آپ پیوندِ خاک نہ ہو سکیں اور اوّل الذکر مقام یعنی قبرستان یا مرگھٹ سے بچ جائیں لیکن یہ ناممکن اور قطعی ناممکن ہے کہ آپ آخر الذکر مقام یعنی کچہری کی زیارت اور طواف سے محروم رہ جائیں۔ غالب نے فرمایا ہے ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اس شعر میں اگر آپ غم کے بجائے کچہری کا لفظ استعمال کریں تو یہ شعر تو ناموزوں ہو جائے گا لیکن میری تمام یاوہ گوئی کا مطلب آپ کو خوب ذہن نشین ہو جائے گا۔ اور سچ پوچھئے تو اس شعر میں ترمیم کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ کچہری اور غم دو جدا جدا چیزیں نہیں اور ایک لفظ کے استعمال سے دوسرے لفظ کا مفہوم آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

قبل اس کے کہ میں کچہری کے متعلق کچھ اور عرض کروں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ کم از کم آپ کو اپنے اور کچہری کے تعلقات سے تو آگاہ کر دوں تاکہ آپ میری بات پر سنجیدگی سے کان دھریں اور اس کو از راہِ تمسخر نیو تھیٹرس کے نئے گیت

گگری موری چھلکی جائے

کی طرح محض ہوا پر نہ اُڑا دیں۔ اچھا تو سُنیئے۔ میں نے اپنے والد کے کاشتکاران کی کمائی کا بہترین حصہ (میرے والد زمیندار ہیں) ایل۔ ایل۔ بی پاس کرنے پر صرف کر دیا اور اب میں ماشاءاللہ وکیل ہوں اور صرف وکیل نہیں بلکہ سند یافتہ وکیل۔ اور اگر میری سند پر میری بیگم اپنے پان کی پیک نہ گرا دیتیں (یہاں یہ غیر از بحث ہے کہ وہ پیک ارادتاً گری تھی یا حادثتاً) تو میں آپ کو دکھا دیتا کہ میری سند پر خود لاٹ صاحب کے دستخط ثبت ہیں۔ مجھے عام اجازت ہے کہ جس کچہری میں جی چاہے جاؤں اور بحث کروں اور میرا ملازم ایک روز میری غیبت میں میرے ایک موکل سے کہہ رہا تھا کہ "ہمارے میاں کو تو سب قانون مُنہ زبانی یاد ہیں اور وہ سندیلہ کی چھوٹی کچہری سے لیکر لکھنؤ کی بڑی کچہری تک پڑھے ہوئے ہیں" اور میرے متعلق میرے گھر والوں کا خیال ہے کہ میں ہر وقت قانون کا جامہ پہنے رہتا ہوں اور میری رگ رگ میں قانون بھرا پڑا ہے اور میں دُنیا کے ہر قسم اور ہر طرز کے قانون سے حتیٰ کہ کتے کے کاٹنے کے قانون سے لیکر عورت کے بھگا لیجانے تک کے قانون سے کما حقہ واقف ہوں۔ کچہری میرے لئے مثل میری سسرال کے ہے اور میں اپنی بے کار زندگی میں سے ہر روز بلاناغہ چند گھنٹے کچہری میں آوارہ گردی کرنے میں صرف کرتا ہوں۔ مجھے یہ شلسٹ جانتے ہوئے عدالت میری قانون دانی کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھتی اور توہینِ عدالت کی تلوار ہمیشہ میرے سر پر لٹکی رہتی ہے۔ میں کچہری کو بہت بُری جگہ سمجھتا ہوں لیکن ہر روز گیارہ بجے گردن جُھکا کر کچہری چلا جاتا ہوں کیونکہ جانتا ہوں کہ اس سے بھاگ نہیں سکتا۔ کچہری انسان کو خود بلا لیتی ہے۔ میں اگر آج وکیل بن کر نہ جاؤں تو کل مجھے ملزم یا مدعا علیہ بن کر جانا پڑیگا۔

بدقسمتی سے اگر آپ آج تک کچہری نہیں جا سکے ہیں تو بلا شُبہ آپ نہایت منحوس قسم کے انسان ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سوسائٹی کے اندر آپ کی شخصیت صفر کے برابر ہے اور حکومت کی نظر میں آپ کا عدم اور وجود دونوں برابر ہیں اور آپ اپنی پیدائش سے پیشتر ہی اپنی اخلاقی موت مر سکے۔ آپ کے متعلق بار اسوسیشن یعنی وکیل گھر میں حسبِ ذیل قسم کی قیاس آرائیاں نہایت آسانی سے کی جا سکتی ہیں۔

آپ اِس قدر مفلس ہیں کہ آج تک کسی شخص نے آپ سے کوئی روپیہ قرض نہیں لیا۔

آپ میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ آپ اپنے مقروض عزیز داروں اور دوستوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر سکیں۔

لوگوں کو آپ پر اس قدر اعتماد نہیں کہ وہ آپ کو ایک حبہ بھی قرض دیں۔

آپ بدترین قسم کے دیوالیہ اور نامعتمد ہیں۔

آپ نے آج تک کسی شخص کو مارا نہیں بلکہ خود ہی مار کھاتے رہے اور آپ کے ذرائع اس قدر مسدود ہیں کہ آپ تھانہ کی ایک پولیس رپورٹ بھی نہیں لکھا سکے۔

باوجود اس کے کہ وکیل صاحبان کا جم غفیر موجود ہے کبھی ہزاروں میں ایک بھی وکیل آپ کا دوست یا عزیز نہیں۔ عرضی نویسوں، اسٹامپ فروشوں اور محرروں سے کبھی آپ کی دشمنی ہے۔

پولیس آپ سے ناراض ہے ورنہ وہ کسی نہ کسی مقدمہ میں ضرور آپ کو اپنی طرف سے شہادت میں پیش کرتی۔

آپ نہ قوم کے لیڈر ہیں نہ ستیہ گرہی۔

آپ کا مشاہدہ اس قدر لغو اور مہمل ہے کہ آپ کے سامنے آج تک کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔

آپ اس قدر ذلیل کیرکٹر کے انسان ہیں کہ آپ کے دوست آپ کو اس وجہ سے اپنی شہادت میں پیش نہیں کرتے کہ ان کو خوف ہے کہ آپ دوسری جانب مل جائیں گے۔

آپ کی قوت مردانگی میں فرق ہے اور کسی عورت نے آپ کو اس قدر بھی قابل توجہ نہیں سمجھا کہ آپ پر اپنے نان نفقہ کا دعویٰ کرتی۔

آپ اس قدر بیوقوف اور بزدل ہیں کہ آپ اپنی بائیکل میں ہمیشہ نمبر اور لالٹین لگاتے ہیں۔

آپ کے پاس اگر موٹر ہے تو اس قدر سڑا اور بیٹھا ہوا کہ اس کی کھڑکھڑاہٹ سن کر راہ گیر پہلے ہی سے بھاگ جاتے ہیں اور کچلے نہیں جاتے۔

آپ اس قدر غلامانہ ذہنیت کے علمبردار ہیں کہ آپ گورنمنٹ کے ہر قانون کو قابلِ لحاظ اور قابلِ پابندی سمجھتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں بلا کسی فیس کے آپ کو یہ قانونی نکتہ بتائے دیتا ہوں کہ آپ اپنی اولین فرصت میں کسی روز کچہری ہو آیئے اور وہاں کے مناظر فطرت کو اپنے دل و دماغ میں خوب نقش کر لیجئے تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت پر کام آئے۔ دیکھئے چچا غالب بھی تو کچہری سے بہت گھبراتے تھے اور وہاں جانے سے کانوں کانپتے تھے لیکن کچھ کیا ہوا۔ کتنا عبرت انگیز تھا ان کا انجام۔ ایک روز جج صاحب کی عدالت میں ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے یہ بیان تحریری داخل کرتے ہوئے دیکھے گئے ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن!

کچہری کے میدان کو میدانِ قیامت سے تشبیہ دینا اب ایک بہت پرانی اور فرسودہ رسم ہو چکی لیکن کیا کیا جائے مجبوری ہے۔ نہ کچہری کی ہیبت اور جلالت ثابت کرنے کے لئے کوئی دوسری تشبیہ ہے اور نہ میدانِ حشر کو ثابت کرنے کے لئے کوئی دوسرا نقشہ۔ اس مسئلہ میں مجھ سے اور مولانا عین القضا صاحب سے صرف اس قدر اختلاف ہے کہ مولانا صاحب کے ارشاد کے بموجب قیامت کچہری کی باپ ہے اور میری عرضداشت کے بموجب کچہری قیامت کی ماں۔ باقی دوسری تفصیلات کے متعلق ہم دونوں میں کامل اتحاد اور ہم آہنگی ہے۔ دونوں جگہ فرد جرم کا غل غپاڑہ۔ مدعا علیہم کی بیکسی۔ گواہوں کی چھیڑ چھاڑ۔ سزاؤں کی ظالمانہ سختی۔ فریادیوں کا ماتم اور بین۔ اہلکاروں کی بے رخی اور وکیلوں کی بدعنوانیاں قریب قریب بالکل یکساں ہیں۔ اس موقع پر مجھے چچا غالب کا ایک شعر یاد آرہا ہے جو انہوں نے شاید کسی کچہری کے ہنگامہ اور بلوہ سے متاثر ہو کر قلمبند کیا تھا۔ سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں ؎

ترے غل غپاڑہ سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

آپ صبح کو نو بجے کچہری تشریف لے جایئے تو آپ کو کچہری کے در و دیوار اور اس کے احاطہ سے ایک عجیب معصومیت اور مظلومیت ٹپکتی ہوئی معلوم ہوگی۔ فضا ساکت ہوگی جیسی کہ وہ عموماً کسی غیر معمولی طوفان کی آمد سے قبل ہوا کرتی ہے اور آپ کو اپنے گرد و پیش کا سماں کچھ ایسا نظر آئے گا جیسے کوئی گنہگار بڈھا ہاتھ جوڑے اپنے گناہوں پر نادم کھڑا ہو۔ اس وقت آپ شاید یہ بھی بھول جائیں کہ یہی تو قتل گاہ ہے جہاں بہت سی قسم حریت

کے پروانوں کو پھانسی کی سزا دی گئی اور جہاں آزادی کے سوال کا جواب بدترین قسم کی غلامی سے دیا گیا۔ یا یہ کہ یہی وہ اندھیر نگری ہے جہاں انسان کو انسان کا محکوم بنایا جاتا ہے۔ یا یہ کہ یہی اس اندھے انصاف کا مسکن ہے جو بکری کو اس جرم میں سزا دیتا ہو کہ وہ شیر کے منہ میں کیوں نہیں چلی جاتی۔ یا یہ کہ یہی وہ پیٹ بھرے اور بھوکے کا اکھاڑہ ہے جہاں مہاجن کو ڈگریاں ملتی ہیں اور کسان کو دو سال با مشقت کی قید۔

کچہری کے وقت سے کچھ دیر پہلے آپ کو چند لوگ ادھر اُدھر تخت اور چادریں صاف کرتے ہوئے ملیں گے۔ یہ لوگ وکیلوں کے محرر اور عرائض نویس ہونگے اور اُن کے حرکات و سکنات سے آپ کو شبہ ہوگا کہ یہ لوگ بٹیروں کے پھانسنے کا جال بچھا رہے ہیں۔ تھوڑے ہی عرصہ میں بٹیریں یعنی موکل اور مقدمہ باز تماش بینوں کی معیت میں آنا شروع ہو جائیں گی اور ایک انگڑائی کے ساتھ کچہری کی پوری دنیا بیدار ہو جائے گی۔ گنا پیلنے والی مشین کی طرح قانون کی مشین اپنی پوری حرکت اور گڑگڑاہٹ میں آجائے گی۔ موٹر اور تانگوں کی بھرمار ہو جائے گی، قدم قدم پر سائیکلوں کی گھنٹیاں سنائی دیں گی، اور ہر دس دس پانچ پانچ قدم پر میلی شیروانیوں اور پھٹی دھوتیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جائیں گے۔ نفسی نفسی کا عالم ہوگا۔ ہر شخص بے اختیارانہ اِدھر سے اُدھر دوڑ رہا ہوگا، اور چھوٹی چھوٹی چیخ پکار ہوا میں تحلیل ہو کر ایک بڑی طویل اور دلدوز "ہائے" کی صدا میں ساری کچہری کی فضا پر چھا جائے گی۔ ایک ہنگامہ۔ بلوہ۔ غل غپ جیسے بھٹ تو چل ہیں آ۔ مجمع۔ جلوس۔ گڑبڑ۔ غرض کہ اس طوفانِ بے تمیزی میں کیا ہو گا جو نہ ہو گا۔ میں اسکو بیان کر کے آپ کی طبیعت کو مکدر نہیں کرنا چاہتا۔

بارہ بجے کے بعد سے کچہری کے گرگ بہ مسکین چپراسی شیروں کی طرح ہونکنے لگتے ہیں۔

"مسماۃ دل افروز بنام نواب اعن کوئی حاضر ہے!"

"حاضر صاحب حاضر!" کہتا ہوا ایک مجمع عدالت میں گھس جاتا ہے۔

پھر آواز سنائی دیتی ہے "لالہ اشرفی مل بنام توکل حسین!"

"حاضر صاحب حاضر!" کہتا ہوا دو چار دس آدمیوں کا گروہ عدالت کے پنجرے میں چلا جاتا ہے۔

پھر آواز سنائی دیتی ہے "ٹھاکر ہربخش سنگھ بنام چھنی!"

اور اسی طرح شام تک یہ للکاریں اور ڈکاریں سنائی دیتی ہیں اور نہ معلوم کب تک سنائی دیتی رہیں؟

کچہری کی اندرونی دنیا میں کیا ہوتا ہے یعنی کس طرح نتھو تیلی کی گاڑھی کمائی کے پانچ روپے اس کی گرہ سے نکل کر بقدر حصہ بلکہ جثہ وکیل صاحب اور محرر صاحب اور اسٹامپ فروش صاحب اور پیشکار صاحب کی اندرونی جیب میں پہونچ جاتے ہیں یہ ایک سربستہ راز ہے اور میں اس کو طشت از بام کر کے اپنے ہم پیشہ حضرات کے خاندانی مجربات کو ایرے غیرے نتھو خیرے کے سپرد نہیں کرنا چاہتا۔ اگر آپ کو بہت زیادہ اشتیاق ہے تو صرف ایک گُر کی بات بتائے دیتا ہوں متمول وکیل پان کھا کر اور سر کھجلا کر اپنی فیس طلب کرتا ہے اور مفلس وکیل ناک سنک کر اور اپنے پائجامہ کو اوپر چڑھاتے ہوئے اپنی اُجرت کا خواستگار ہوتا ہے۔ دونوں ہی مرتے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں۔

کچہری میں پان اور سگرٹ کی ان گنت دکانیں ہوتی ہیں اور ایک چھوٹے موٹے وکیل سے یہ دکاندار زیادہ کماتے ہیں میرا عینی مشاہدہ ہے۔ پوری کچوری اور مٹھائیوں کی دکانوں کی بھی کمی نہیں۔ اور ان پر بھی کافی مجمع رہتا ہے لیکن یہ کچہری کی مستقل چیزیں ہیں اور اسی کا ایک جزو ہو کر اسی کی طرح بے جان اور مردہ ہو کر رہ گئیں ہیں۔ اصلی لطف تو فصلی بیوپاریوں سے رہتا ہے مثلاً کبھی "ہر مال دو آنہ" کی گاڑیاں آجاتی ہیں یا کبھی کوئی سادھو یا عامل نمودار ہو جاتا ہے یا کبھی کوئی جادوگر یا مداری آجاتا ہے، بہر حال ہر روز کوئی نہ کوئی نیا شگوفہ ضرور کھلتا ہے اور غریب مقدمہ باز اس کے گرد کھڑے ہو کر اور دو چار پیسے خرچ کر کے اپنے آپ کو بھلانے کی ضرور کوشش کرتے ہیں۔ آپ شاید اسے مذاق سمجھیں لیکن میں قسم کھا کر عرض کرتا ہوں کہ صرف میری ہی کچہری میں نہیں بلکہ قریب قریب ہر کچہری میں ایک قوت مردانگی کی گولیوں کی دکان ضرور ہوتی ہے۔ بہت سے موکل مقدمہ ہار کر ان ہی گولیوں سے اپنا دل بہلاتے ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو اس زندگی میں رکھا ہی کیا ہے سوائے مقدمہ بازی کے اور قوت مردانگی کی گولیوں کے۔!

یہ سب تو کچہری کے باہر کی باتیں ہیں۔ اب ہمت ہو تو کبھی کمرۂ عدالت میں تشریف لائیے۔ اصل کچہری تو وہیں ہے۔ آپ باہر کے سب بازیگروں کو بھول نہ جائیں تو میرا ذمہ۔

جج صاحب کے بڑی بڑی مونچھیں ہیں اور پیٹ پر ذرا پتلون تنگ ہے۔ چہرہ پر رعب و داب تو خاک نہیں البتہ تلون مزاجی کے گہرے نقوش کی بنا پر ایک ہونّاپن ضرور ہے۔ نہ معلوم جج صاحب کی کرسی میں اور ان کے سر پر لٹکی ہوئی بادشاہ کی تصویر میں کیا روحانی قرابت ہے جس کی بنا پر اس کرسی پر بیٹھتے ہی بیچارے جج صاحب اپنے آپ کو بادشاہ سمجھنے لگتے ہیں۔ ان کے اردگرد ایک کٹہرا لگا ہوا ہے بالکل اس طرح جس طرح زندہ عجائب خانہ میں ریچھ کے گرد۔ ان کی بغل میں ایک بائسکل سے پیشکار صاحب بیٹھے ہوتے ہیں جو کمرۂ عدالت میں منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ فوراً اپنے ہی کھاتہ میں ٹانک لیتے ہیں۔ اگلے جنم میں شاید وہ کراماً کاتبین کے درجہ پر فائز تھے لیکن بیچارے کی رشوت ستانی کی وہاں بھی عادت تھی۔ اسی وجہ سے اب پیشکاری کے عہدہ پر ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ اس وقت وہ اس قدر فرشتہ صفت انسان معلوم ہوتے ہیں کہ یہ خیال ہی نہیں گزرتا کہ یہی وہ حضرت ہیں جنہوں نے ابھی ابھی نتھو تیلی سے زبردستی ایک اٹھنی ہضم کر لی تھی۔

دائیں جانب ایک موٹے چاق چوبند وکیل صاحب کھڑے نرش پر اپنی ایڑیاں بجا رہے ہیں۔ اور بائیں جانب ایک مدقوق قحط زدہ مسکین صورت وکیل اپنی پھٹی شیروانی کے بٹن گن رہا ہے۔ ان دونوں کے درمیان ناک کے نتھنے پر عینک لگائے ایک لالہ پٹواری صاحب بیان دے رہے ہیں۔ بستہ انکی بغل میں ہے لیکن ان کو اپنا سبق اس قدر منہ زبانی یاد ہے کہ اس کو کھولنے کی چنداں حاجت نہیں۔ ایک طرف مدعی صاحب یعنی زمیندار زبان کا مزا لے رہے ہیں اور دوسری طرف نتھو تیلی یعنی مدعا علیہ خوف عدالت سے تھر تھر کانپ رہا ہے۔

موٹا وکیل: ہاں تو اس پر سینن متدعویہ میں کس قدر باقی ہے۔

پٹواری: آٹھ روپیہ ۴۵ فصلی میں نو روپیہ ۴۶ فصلی میں اور دس روپے ۴۷ فصلی میں۔

پیشکار درزی کی مشین کی طرح تیزی سے بخیہ کرتا چلا جا رہا ہے گویا نتھو تیلی کا کفن ہی رہا ہے۔

جج: اُفوہ! یہ تو بڑا باقی دار ہے۔

موٹا وکیل: جی ہاں۔ بہت شورہ پشتی سیکھی ہے ان لوگوں نے حضور۔

جج: (دُبلے وکیل سے نفرت کے ساتھ) آپ کیا ثبوت پیش کرنا چاہتے ہیں؟

دُبلا وکیل: حضور سب روپیہ دے چکا ہے کاشتکار!

موٹا وکیل: سب فیس دے چکا ہوگا سب لگان نہیں!

دُبلا وکیل: سرکار! زمیندار رسید نہیں دیتا۔

زمیندار: (بیچ میں بول اٹھتا ہے) زبان سنبھال کر بات کیجے۔

دُبلا وکیل: دکھلایئے آپ اپنے کاغذات؟

زمیندار: آپ پیش کیجئے اپنی شہادت؟

جج: (زمیندار سے) وہ بلغ کا بچّہ تو مر گیا۔

زمیندار: (کف افسوس مل کر) خیر کچھ غم نہیں حضور میرے ہاں ایک سارس کا فیٹل بچہ ہے۔

جج: (دُبلے وکیل سے) آپ فضول عدالت کا وقت مت ضائع کیجئے۔ جو شہادت پیش کرنا ہو پیش کیجئے۔

دُبلا وکیل: حضور کاشتکار کے گواہوں کو زمیندار نے روک دیا ہے۔ وہ آج آ نہیں سکے ہیں۔

موٹا وکیل: تو آپ ہرجہ دیجئے۔ عدالت اس کی ذمہ دار نہیں سمن نکلوائے تھے آپ نے؟

دُبلا وکیل: حضور ایک موقع اور دیا جائے۔

جج: پانچ روپیہ ہرجہ دیجئے دوسرے فریق کو۔

دُبلا وکیل: (سٹ پٹا کر) حضور مدعا علیہ کا بیان ہو جائے۔

جج: (ڈپٹ کر) کیوں آپ فضول وقت ضائع کرتے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پٹواری کے تحریری ثبوت کے مقابلہ میں آپکا زبانی ثبوت کچھ بھی اہمیت رکھتا ہے۔

دُبلا وکیل: حضور قسطیں کر دی جائیں۔

زمیندار: سرکار ابھی مالگذاری باقی ہے مجھ پر قسطیں ہو گئیں تو بھلا مالگذاری کہاں سے ادا کروں گا میں۔

جج: کچھ نہیں۔ ستائیس روپیہ اصل مع سود و خرچہ و فیس وکیل کے ڈگری۔ مدعا علیہ کوئی ثبوت نہیں پیش کر سکتا۔

نتھو: (اپنے وکیل کو چپ دیکھکر خود ہمت کرتا ہے) حضور کریا کھائے کے کہت ہوں میں آنہ پائی سے سب بیباک کر دیہوں ۴۵ م

بُکّی

گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد جب دُنیا کی تمام تجارتیں ٹھنڈی پڑ گئیں تو کوکین کے بیوپار نے ہندوستان میں زور پکڑا۔ کلکتہ اور بمبئی کے بندرگاہوں سے اس کی آمد ہونے لگی اور دہلی میں اسکی گرم بازاری ہوگئی۔ یہاں کے امیروں، رئیسوں اور طوائفوں نے اس شہزادی کی بڑی قدر کی۔ اہلِ دل نے اس کا پیار کا نام بُکّی رکھا۔ ہزاروں آدمی اس کے عشق میں زندہ درگور ہوگئے۔ سینکڑوں مرگھٹ میں پہنچ گئے اور مفلس ہندوستان کا لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں روپیہ نامعلوم نالیوں سے بہہ بہہ کر جرمنی اور جاپان کو نکل گیا۔

برٹش گورنمنٹ نے اِس بلا کو روکنے کیلئے جو جد وجہد کی اُس کا احسان مند ہندوستان کو تا قیامت رہنا چاہیئے۔ مگر گورنمنٹ اپنی اِس قسم کی کارروائیوں کی کبھی اشاعت نہیں کرتی اور نہ اشاعت ہونے دیتی ہے۔ اس لئے پبلک کو کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اگر برٹش حکومت نے نہایت سختی اور شد و مد سے اِس وبا کو نہ روکا ہوتا تو نہ معلوم کیا تباہیاں پھیلتیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس کی آمد قطعی طور پر آج بھی بند نہیں ہے۔ لیکن آج بھی خفیہ پولیس اپنی کارروائیوں میں مصروف ہے۔ اور چالاک کوکین فروش اور بیوپاری اُن سے بچکر اپنا کام کرنے میں لگے ہیں۔ ہر سال چار چھ گرفتاریاں ہوتی رہتی ہیں۔ اور ہر سال نئے گروہ بنتے ہیں۔ اور نئی نئی تدابیر سے اسکا بیوپار کرتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کی جسامت دیکھتے ہوئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اب کوکین کی آمد قریب قریب بالکل بند ہے۔ ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارے ملک میں سینکڑوں بندرگاہ ہیں اور ہمارے ملک کا ساحل (سمندر کا کنارہ) پانچ ہزار میل سے اُوپر لمبائی میں پھیلا ہوا ہے۔ کسی بندرگاہ میں کسی جاپانی یا جرمنی جہاز کے پاس رات کے اندھیرے میں ایک ماہی گیروں کی چھوٹی سی کشتی جا سکتی ہے اور اُس میں دو چھوٹے چھوٹے بنڈل گرا دئے جا سکتے ہیں۔ یہ ماہی گیر کشتیاں دن کو اُجالے میں اور رات کے اندھیرے میں ہر وقت مچھلیاں پکڑنے میں مصروف رہتی ہیں۔ یہ کشتیاں چھوٹے بڑے بندرگاہوں سے لے کر اُجاڑ سے اُجاڑ کناروں پر لنگر ڈالتی ہیں۔ ان ہی ماہی گیروں کے واسطے چھوٹے چھوٹے دو بنڈلوں کو سات آٹھ سو روپے کی اُجرت پر ایک جہاز سے لیکر کسی گاؤں کے مکان میں چھُپا دینا کچھ مشکل بات نہیں ہے۔ یہ ایک طریقہ ہے جو میں نے بیان کیا ہے پچاسوں اور ایسے ہی ذریعے استعمال ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں خفیہ پولیس کی کارروائیاں جن میں کبھی کبھی ان کو سخت ناکامیابی بھی ہو جاتی ہے۔ دلچسپی سے خالی نہیں ہیں ہر جہاز کے اِرد گرد ایک خفیہ کا آدمی لگا رہتا ہے۔ جو اپنے فن کا کافی ماہر ہوتا ہے۔ ایک دفعہ کلکتہ جے ٹی میں شام کے چھ بجے جب دس چینا خلاصی صاف کپڑے پہنکر شہر کی سیر کے واسطے جے ٹی کے پھاٹک میں سے نکل رہے تھے تو اُن کے پیچھے سے ایک ہندوستانی مزدور نے جس کے سر پر ٹوکرا تھا آتے آتے ہلکے سے ٹھوکر کھائی اور سنبھل کر پیر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ یورپین سارجنٹ جو دروازے پر پہرہ دے رہا تھا فوراً ان چینیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اُس نے ایک ایک کر کے ہر ایک کی تلاشی لی۔ جیبیں۔ بغلیں۔ ٹوپیاں۔ سب دیکھیں رانیں ٹٹولیں لیکن جب کچھ بھی نہ ملا تو پریشان ہوکر ان لوگوں کو نکل جانے کا اشارہ کیا۔ ہندوستانی مزدور اتنی دیر میں اپنے پیر کو سہلا کر پھر سر پر ٹوکرا رکھکر ان سب کے آگے پھرتی سے نکل باہر ہونے کو تھا ہی کہ پھر اُس نے ٹھوکر سی کھائی اور بیٹھ گیا۔ سارجنٹ نے ایک دفعہ پھر ان چینیوں کو روکا اور پاس کے دفتر کے برآمدے میں ٹھہرنے کو کہا۔ گورکھا سپاہی کو دروازے پر چھوڑ کر خود لکڑی کی چھوٹی سی ٹیلیفون کی کوٹھری میں آلہ پر کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ہندوستانی مزدور ٹوکرا لے کر چلدیا تھا۔ تھوڑی دیر میں آواز آئی "سارجنٹ ایک موچی کو بھیج رہا ہوں ان لوگوں کے جوتوں کے تلے اُدھیڑوا کر دیکھو۔ بارہ سپاہی بھی تمہاری مدد کو آرہے ہیں"۔ سارجنٹ نے باہر آکر اب جو غور کیا تو دراصل اُن لوگوں کے جوتوں کے تلے معمولی چینی جوتوں کے تلوں سے بھی کچھ زیادہ موٹے تھے۔ آخر ہر تلے میں سے پانچ پانچ شیشیاں کوکین کی نکلیں۔

ایک مرتبہ ایک سپاہی بھیس بدلے جیٹی نمبر ۲ میں پن ف
ارد جہاز کے برابر کھڑا بڑی دیر سے بھیک مانگ رہا تھا۔ چار جاپانی
ملاح جہاز کے کٹہرے سے لگے اُسے دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے
کہ ایک ہندوستانی میوہ فروش آیا اُس کے ٹوکرے میں لال کیلے
تھے۔ دو چار ملاح اور آگئے وہ بھی جہاز کے کٹہرے سے لگ کر
کھڑے ہو گئے۔ کیلے والے کو اشارہ سے اُوپر بلایا اس نے اشارہ
میں جانے سے انکار کیا۔ اور اشارے ہی سے کہا تم خود آجاؤ۔
تین جاپانی زینے سے نیچے اُترے دو نے جلدی جلدی درجن
کیلے اُٹھا لئے اور کھانے لگے۔ ایک نے بیٹھ کر کیلے گننا اور چُننا
شروع کر دئے۔ چھ کیلے اُس نے بھی اُٹھا لئے۔ تینوں چلدیئے
یہ پیسے مانگ رہا ہے۔ وہ ہنس رہے ہیں۔ اور اپنی زبان میں
کچھ کہتے ہوئے اُوپر چڑھ گئے۔ جب کیلے والے نے بڑا شور
مچایا تو اُس کو اشاروں سے اُوپر بلایا۔ کیلے والا گالیاں دیتا
اُوپر گیا۔ سب لوٹ پڑے یہ چلاّ رہا ہے۔ سات آٹھ نے گھیر
لیا اتنے میں جہاز کا ایک افسر وردی پہنے آیا اور اُس نے ڈانٹا
سب خاموش الگ کھڑے ہو گئے۔ ہندوستانی نے ٹوٹی
پھوٹی انگریزی میں کہا آٹھ آنے دلوا دو۔ اُس نے دلوا دیئے
اور اپنے سامنے ہی جہاز سے فوراً نیچے اتر جانیکا حکم دیا۔ یہ
بیچارہ بڑبڑاتا ہوا جلدی سے اُتر آیا۔ فقیر سے بولا "بھائی سالا
لوگ لینا بیچ گیا"

یہ کہتے ہوئے ٹوکرا زمین پر رکھکر بولا۔ "بہت بچا تکدیر
اچھا ہے تو تم بھی لو" دو موٹے موٹے کیلے فقیر کو بھی دیکر چلدیا۔
دوسرے دن انسپکٹر مسٹر بی نے سپاہی کو بہت ڈانٹا
"تم بالکل احمق ہو تمہاری سمجھ میں اتنا نہ آیا کہ کیلے کھائے بھی
گئے اٹھا بھی لے گئے اور پھر بھی کم نہ ہوئے جتنے کے اتنے ہی
رہے۔ دوسرے تم نے کبھی اتنے قیمتی کیلے اس طرح گلی گلی بکتے
دیکھے ہیں۔ یہ صرف اس لئے تھے کہ کیلوں کی سب سے موٹی قسم
یہی ہوتی ہے۔"

بمبئی کے ایک بڑے سوداگر سے دہلی کے ایک دوکاندار
نے ایک خاص قسم کے اور خاص ٹریڈ مارک کے کرکٹ کے
بلّوں کی فرمائش کی۔ ولایت کے ایجنٹ کا نام اور پتہ بھی بتا دیا۔
ایک درجن بلّے اُن کے واسطے منگائے گئے اور بھیج بھی دئے
گئے۔ پھر ایک درجن اور لیکن تیسری مرتبہ کے بلّوں میں سے ایک
دہلی کیواسطے پیک ہوتے وقت ہاتھ سے گر پڑا۔ گرتے ہی پھٹ گیا
اندر سے شیشیاں نکل کر بکھر گئیں۔

آپ نے خیال کیا ہوگا کہ اکثر دہلی کے اسٹیشن پر ایک سپاہی
کھڑا رہتا ہے۔ اور آنے والے مسافروں سے پوچھتا رہتا ہے کہ
اُن کے سامان میں افیون یا کوکین تو نہیں ہے۔ اور آپ دل
میں ہنستے ہوں گے کہ یہ شخص کس قدر بیوقوف ہے۔ ممکن ہے
وہ سپاہی بذاتِ خود نہایت بیوقوف ہو لیکن گورنمنٹ جسکے
حکم سے یہ سوال کیا جاتا ہے ہرگز بیوقوف نہیں ہے۔ اناڑی
سے اناڑی چور جس سے یہ سوال کیا جائے کہ تمہارے بکس میں
چوری کی چیز تو نہیں ہے۔ نہایت اطمینان کا چہرہ بنا کر کہہ سکتا ہے
"نہیں بھائی۔ اطمینان نہ ہو دیکھ لو"۔ لیکن اس سوال کے بعد بچکر
صندوق میں کوکین لئے ہوئے جس وقت آدمی باہر سڑک پر آجاتا
ہے تو اُس وقت پُرانے سے پُرانا اور تجربہ کار چور بھی ایک خاص
قسم کی مسرت کے آثار نہیں چھپا سکتا ہے۔ یہیں اسی بات پر
کبھی مونگ پھلی والے کے بھیس میں کبھی مسافر کے بھیس میں خفیہ
والا اس کو تاڑ لیتا ہے۔ ایک سال پولیس نے دہلی میں اپنا
ہاتھ ڈھیلا کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ گلی کوچوں میں کوکین کمال آسانی
سے بکنے لگی۔ حالانکہ خفیہ پولیس کی تعداد اس وقت یہاں دگنی
بلکہ چوگنی کر دی گئی تھی۔ مگر گرفتاریاں یکلخت منع کر دی گئی
تھیں۔ دو ہی مہینے بعد تمام بیچنے والے اور ان کے مدد پولیس
کے کاغذات پر آگئے تھے اب ان کے ذریعے ان کی رسدگاہوں کی
تلاش شروع ہوئی جہاں سے کوکین جاتی تھی ان لوگوں کی رسی
اور ڈھیلی کی گئی ان کے پیچھے پیچھے خفیہ پولیس نے بمبئی کلکتہ اور
چند اور بندرگاہوں کے بیوپاریوں کا پتہ چلا لیا۔ اور آخر میں
اس بُری طرح گرفتاریاں ہوئیں کہ ایک زمانہ تو ایسا آیا کہ آٹھ
آنے والا پان دہلی میں پندرہ روپے کو بھی میسّر نہ ہوتا تھا۔
کوکین آنا بالکل بند ہو گئی۔ اب بہت ہی کم آتی ہے۔ آجکل کوکین
کا بھاؤ غالبًا وہی ہے جو پہلے تھا۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آتی
بھی کم ہے اور مانگ بھی کم ہے یعنی خریداری بھی کم ہے اس لئے
قیمت بھی کم ہے جس زمانے میں دہلی میں کوکین کا عروج تھا تو
اُسی سلسلے میں ایک بڑا تماشہ ہوا۔ لوگ کوکین میں بڑی کمائیاں
کر رہے تھے۔ دو ایک آدمی دیکھتے دیکھتے لکھ پتی ہو گئے تھے۔ دو بڑے
کاروبار سرد پڑے تھے۔ سیٹھ جمنا پرشاد چاندنی چوک میں دوکان:

بیٹھے مکھیاں مارتے تھے۔ گرتے گرتے وہی پندرہ روپے روز کی بکری رہ گئی تھی۔ ایک دن دوپہر کو ایک ایجنٹ ہاتھ میں موزے بنیانیں وغیرہ لٹکائے پیچھے پیچھے مزدور سر پر صندوقچہ لئے آیا اور سر ہو گیا۔ "ارے بھائی بکری وکری ہے نہیں مال لے لیکر رکھتے جائیں کیا فائدہ۔ ہم نا نہیں گے۔ جاؤ"۔ ایجنٹ پیچھے ہی پڑ گیا۔ "سیٹھ جی آرڈر نہ دینا دیکھ تو لو۔ بیکار ہی تو بیٹھے ہو پھر کبھی ضرورت کے وقت یاد رکھنا۔ ہمارے بھاؤ تو دیکھ لو"۔ سیٹھ جی راضی ہو گئے۔ صندوقچہ مزدور کے سر سے اتروا کر۔ ایجنٹ نے مال کے نمونے دکھانا شروع کئے مزدور نے تھوڑی دیر بعد تقاضا کیا "مجھے مزدوری دیدو میں جاؤں۔ تم دوسرا بلا لینا۔" آخر ایجنٹ نے اُسے دو آنے دیکر رخصت کر دیا۔ سیٹھ جی بھی اب بھاؤ کی طرف متوجہ ہوئے۔ سب جاپانی مال تھا ۴۴ نمبر کا بھاؤ دو آنے کم تھا کھلونے بھی سستے تھے۔ بڑی دیر تک دیکھ بھال کرتے رہے ایک بج گیا۔ ایجنٹ نے سب سامان ترتیب سے بکس میں بند کر کے کہا "سیٹھ جی اب اس وقت یہ بکس یہیں چھوڑے جاتا ہوں۔ تین چار بجے آکر اُٹھا لوں گا۔" سیٹھ نے جی ہی کہا کیا حرج ہے۔ ایجنٹ صاحب چلے گئے۔ بکس اندر رکھوا دیا گیا۔ شام کو پانچ بجے کے قریب ایجنٹ صاحب گھبرائے ہوئے آئے اور بولے "سیٹھ جی یہ خط پڑھ لو۔ بہت ضروری ہے میں پرسوں آؤں گا۔" یہ کہکر ایک لفافہ سیٹھ جی کے ہاتھ میں دے ایجنٹ صاحب چلدئے لفافہ میں ۴۴ نمبر بنیان کے ڈبہ پر جو تصویر تھی اُس کی پھٹی ہوئی آدھی تصویر تھی اور ایک خط تھا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔ "اِس تصویر کو احتیاط سے رکھنا کل ایک آدمی آئے گا آدھی تصویر اس کے پاس ہو گی دونوں ٹکڑوں کو ملا کر دیکھنا اگر مل جائیں تو پھر اس آدمی کو میرا مال گن کر دیدینا اور ہر عدد پر ایک روپیہ اپنا کمیشن کاٹ لینا۔ خالی بکس میں کسی دن آکر لے جاؤں گا"۔ خط پڑھکر سیٹھ جی بڑے چکرائے عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔ کچھ یاد پر زور دیکر حساب لگایا تو ساٹھ ستر عدد بکس میں یاد آئے۔ اٹھے بکس کو کھول کر دیکھا۔ وہ کھلا ہوا تھا یہ خلاف اصول بات تھی۔ پھر ... کر دیا۔ اب یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مفت میں ہی ساٹھ ستر روپے مل جائیں گے۔ اور پھر کون ایسا پاگل ہے جو نمونوں کا کمیشن ایک روپیہ فی عدد دے گا۔ اُن میں سے بعض تو ایک ایک آنے سے بھی کم کی چیزیں تھیں۔ کل دورہی کیا تھی معاملہ کل پر چھوڑ دیا مگر پیٹ میں چوہے کودا کئے۔

دوسرے دن ایک آدمی ایک پھٹی ہوئی تصویر دکھا کر بولا "اِس مارکہ کی بنیانیں ہیں؟" سیٹھ کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا بولے "ہیں"۔ "دکھاؤ"۔ سیٹھ اٹھے لائے دکھاتے "چار ڈبے دیدو"۔ وہ بھی دیدیتے۔ اب اُس آدمی نے اِدھر اُدھر دیکھکر کہا اچھا وہ مال ہے کہاں۔ سیٹھ جی نے بھی سنبھل کر کہا۔ "ٹھہرو"۔ تصویر دوسانی گدی کے نیچے سے آدھی تصویر نکالی دونوں کو ملا کر دیکھا اطمینان کی صورت بنا کر بولے اندر آجاؤ۔ دونوں اندر گئے صندوقچے کی طرف سیٹھ جی نے اشارہ کیا "یہ ہے"۔ اُس آدمی نے صندوقچہ کی سب چیزیں جلدی جلدی نکال کر باہر ڈالدیں بکس کے پیندے کو ٹھیکی سے ہلا کر اٹھا لیا۔ پیندا چھوٹا تھا اس کے اندر قطار سے لگی ہوئی چھوٹی چھوٹی شیشیاں تھیں جن میں سفید میدہ سا بھرا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی سیٹھ جی کے ہاتھ پیر کانپنے لگے سمجھ گئے کوکین ہے۔ اُس آدمی نے جیب سے چاقو نکالا دو ایک شیشیوں کو احتیاط سے کھولکر اُن کے اندر کا سفوف زبان کی نوک پر چکھا کہا ٹھیک ہے چاروں ڈبے بنیانوں کے لیکر بنیانوں کے بیچ میں شیشیاں گن گن کر رکھنا شروع کر دیں اب سیٹھ جی بھی گنتے جاتے تھے سب ایک سو پچیس نکلیں۔

سیٹھ جی کو مفت کے سوا سو روپے کی گرمی تھی سویرے ہی سے دوکان بند کر دی۔ تیسرے دن جب ایجنٹ صاحب اپنا بکس واپس لینے آئے تو اب سیٹھ جی کا عجب حال تھا اِدھر لالچ اُدھر ڈر سے دم نکلا جائے۔ بولے "دیکھو جی خانصاحب اب کیا سو کیا اب ایسا کام نہ کرنا روپیہ کیا چیز ہے ہاتھ کا میل ہے ذرا سی بات میں عزت بگڑ جاتی ہے"۔ خانصاحب بولے "اجی سیٹھ جی دو روپے شیشی مجھے ملا ہے۔ ڈھائی سو روپے میں کہیں یہ کام چل سکتا ہے۔ پندرہ روپیہ شیشی کی تو وہیں کی خرید ہے یہ جو کیا یہ تو ہو گیا۔ روپیہ یہ آدمی خود ... آیا تھا میں تو لانے پر تھا۔"

"ارے باپ رے باپ پندرہ شیشی! اور یہاں کتنے کو بکے گی؟"

"یہاں ایک شیشی تیس روپے سے اوپر کی ہے۔ جیسا بھاؤ لگ جائے"۔

اب خانصاحب اور سیٹھ جی میں باتیں شروع ہوگئیں۔ خانصاحب چاہتے تھے کہ خود مال لائیں خود بیچیں۔ سیٹھ جی سب طرح پہ راضی تھے۔ مگر اپنی گرہ سے ایک دھیلا لگا نیکو تیار نہ تھے آخر یہ طے ہوا کہ سیٹھ جی کو جو کمیشن کے سوا سو ملے ہیں۔ بے سود کے قرض دیدیں خانصاحب مال لائیں گے۔ گرہک لائیں گے اور سیٹھ جی کو پانچ روپیہ فی شیشی کمیشن ملے گا۔ دو ایک دفعہ دیکھ بھال کر پھر ضرورت پڑے گی تو مال آجانے پر روپے بھی دیدیا کریں گے۔

اب خانصاحب نے دس بارہ پندرہ دن کا وقفہ دیکر مال لانا شروع کردیا۔ پہلے بیس شیشیاں لائے پھر اور زیادہ زیادہ لانے لگے۔ سیٹھ جی کو بہت سختی سے سمجھا دیا گیا تھا کہ سوائے گنتی کے تین چار گرہکوں کے جن کو ان سے خانصاحب نے ملا دیا تھا ہرگز ہرگز کسی نئے آدمی سے بات چیت نہ کریں سیٹھ جی کو ضرورت ہی کیا تھی۔ پھر وہ خود بھی بہت ڈر کر یہ کام کر رہے تھے۔ یہاں یہ گرہک ہر دوسرے تیسرے مال مانگنے کو تیار کھڑے رہتے تھے۔ اب بھاؤ بھی چڑھنے لگا۔ ایک شیشی چالیس چالیس روپے کو مانگی جانے لگی۔ پانچ روپے اپنا حلال کا کمیشن دو تین روپے قیمت زائد میں سے سیٹھ جی ہضم کر جاتیں۔ خانصاحب کبھی رات کو کبھی دوپہر میں آئیں شیشیاں گن دیں دام لیں اور چلے جائیں۔ قریب دو ہزار روپے کے سیٹھ جی نفع کھا چکے تھے۔ ایک دفعہ خانصاحب جو آئے تو بہت ہی عجب خبر لائے ایک جہاز کا پورا مال پکڑا گیا ہے، دوسرا جہاز اب بہت دن تک نہ آئیگا۔ مال کے دام چڑھ جائیں گے کلکتہ میں چالیس ہزار کا کھوک رکھا ہے۔ دس ہزار روپے دیدو کچھ میرے پاس ہیں بیس ہزار کا مال ایک دفعہ اٹھا لاؤں۔ جب مال تمہارے گودام میں آجائے تو اسکی قیمت پھر مجھے دیدو۔ اس سے باقی کا بیس ہزار کا مال دوسرے پھیرے میں لے آؤں۔ ایلور ریڈی کی دو دو بیٹیاں کرکے سب مال آجائیگا۔ سیٹھ جی راضی ہوگئے۔

پہلے پھیرے میں جب بیس ہزار کی قیمت کا مال آگیا۔ شیشیاں گن لیں تو ہزار ہزار کے بیس نوٹ پھیر دیدنے۔ خانصاحب جب باقی بیس ہزار کا مال بھی لے آئے تو بولے "لو سیٹھ جی مال تمہارا سب آگیا۔ اب یہ کیجے اسکا نفع جو ہو تمہاری قسمت مجھے تو ابھی دیدو۔ جو کچھ بھی تم سمجھو" سیٹھ جی بھی خوش ہوگئے بحث مباحثہ ہوا خانصاحب بگڑنے لگے بہت غصہ ہوگئے آخر سیٹھ جی بڑی مشکل سے دس ہزار روپے اُن کے حصے کے دینے پر راضی ہوگئے۔ جب یہ نوٹ سیٹھ جی دینے لگے تو بولے "خانصاحب ہو زوردار بڑا ہاتھ مارا دس ہزار کم ناہیں" خانصاحب نے ہنسکر کہا "تمہارے دونے ہیں دونے تم نے تو چالیس ہزار کے کرنے" روپے جیب میں رکھ نہایت خلوص دل سے سیٹھ جی سے ہاتھ ملا کر چلدیئے۔ سیٹھ جی نے کہا "ہے تو خان صاحب مگر آدمی بھلا معلوم ہوتا ہے"

جب آٹھ دن تک ان گرہکوں میں سے ایک نہ آیا تو سیٹھ جی کا پیٹ کھولنے لگا۔ پورا پورا پچاس ہزار روپیہ تجوری سے نکال چکے تھے، آخر نہ رہا گیا۔ اب بچارے گھبرائے گھبرائے نئے خریداروں کی تلاش میں نکلے۔ قسمت تو بگڑی ہی تھی ایک کوہین فروش خاص قسم کے ملے فوراً مال لینے کو تیار ہوگئے آئے آکر تمام مال دیکھا۔ چار چھ شیشیاں کھولکر ہر ایک کو چکھا بڑی تعریفیں کیں کہ مال اچھا ہے بہت تیز ہے۔ "کیوں سیٹھ جی تم نے بھی چکھا" سیٹھ جی "نا جی ہم نہیں کھاتے ہیں"۔ گرہک "ہاں تم اتنے نہ چکھنا بہت تیز ہے! مرجاؤ گے۔ اچھا ہم اگلے سے بات کر آئیں۔ روپے کا انتظام کرلیں کل یا پرسوں آئیں گے۔ بھاؤ ہم کو منظور رہے"

گرہک تسکین دیکر چلا گیا مگر بیچارے سیٹھ جی کے دل میں پنکھے لگے ہوئے تھے۔ دل کہتا تھا "اب لٹ گئے"۔ گرہک صاحب جو دوکان سے چلے تو سیدھے خفیہ کے سپرنٹنڈنٹ کے پاس گئے کیونکہ وہ سب انسپکٹر تھے۔

قانون میں رحم کی تو گنجائش ہے نہیں۔ مانا کہ شیشوں میں سوائے پسی ہوئی شکر کے کوکین کا نام نہ تھا لیکن سیٹھ جی کے مجرم ہونے میں کیا کلام تھا۔ اب آگے جو نتیجہ ہوا ہوگا آپ خود خیال کریں۔

سیّد رفیق حسین ؛

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں۔ پتہ صاف اور خوشخط ہونا چاہیئے۔ (مینجر)

زخمی چین

داستان ہے اُس دیارِ پُر آشوب کی جسے آجکل کا چین کہتے ہیں، چین اور جاپان کے درمیان اس وقت جو جنگ ہو رہی ہے۔ اُس کی ہولناکیوں کا مہیب منظر ایک امریکی عورت کی نگاہوں سے دیکھئے۔ یہ داستان بالاقساط پیش کی جائے گی۔ لیکن داستان کی ہر کڑی بذاتِ خود ایک تلخ فسانہ ہے۔ اور انسانیت کے تمام دعوے اور عزائم پر ایک مستقل طنز۔

پہلا حملہ

چین اور جاپان کے درمیان جنگ چھڑنے کی افواہ جب ہمارے کانوں تک پہونچی تھی کہ مجھے ہائی سکول کی چند لڑکیوں کے ساتھ باہر گاؤں میں جانا پڑا۔ اس جنگ کی افواہ بہت سے چینیوں کے لئے محض افواہ ہی تھی۔ کیونکہ ان کے کان ابھی تک بمب اور رائفلوں کی آوازوں سے آشنا نہ تھے۔ اُنہیں صرف یہ معلوم تھا کہ شمالی چین میں جنگ چھڑ گئی ہے۔ اور بس صرف اتنا ہی۔

اسی دوران میں مجھے اور چند ایک اور لڑکیوں کو ایک گاؤں میں تعلیم دینے کے لئے جانا پڑا۔ جس وادی میں ہم پہنچے وہ نہایت ہی خوبصورت وادی تھی، چاولوں کے کھیت دور دور تک پھیلے ہوئے تھے، اور چیل کے درخت اپنے سر اٹھائے ہوئے ہمارا خیر مقدم کر رہے تھے، جس فارم میں ہم ٹھیرے اُسکا مالک ایک بوڑھا کسان تھا۔ اُس کے تین لڑکے، تین بیویاں اور تین لڑکیاں تھیں، ایک جوان عورت اور ایک مرد، جو بیوی خاوند معلوم ہوتے تھے، وہ بھی وہاں رہتے تھے، لیکن یہ معلوم کرنے سے قاصر رہی کہ اُن کا اس خاندان سے کیا رشتہ ہے۔

دیہات میں زندگی بسر کرنا ہمارے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔ گائیں، بھینس، مرغیاں، ہمارے ساتھ ہی رہتی تھیں، یقیناً وہ بھی اس خاندان کے ممبر تھیں، اور جب کبھی ہم اِدھر اُدھر جاتے تو گائیں بھینس ہمیں ایک عجیب انداز سے دیکھتیں، مکھیاں اور مچھر بھی ہمیں پہلے تنگ کرتے تھے، لیکن اب ہم اُن سے کافی مانوس ہو چکے تھے، گھر کے افراد صفائی کو پیش نظر رکھتے تھے، اور صبح اٹھکر دالان وغیرہ کو جو کیچڑ سے بھرا ہوتا تھا صاف کرتے تھے، بچے باہر ٹب میں نہایا کرتے تھے، اور خاندان کے باقی ممبر اپنا کام کاج کر کے شام کو گھر آتے تھے، اور پانی کا لوٹا لے کر ہاتھ منہ دھولیا کرتے تھے، گو اس وادی کی آبادی تھوڑی معلوم ہوتی تھی، لیکن ہمارے سکول میں جلد ہی پڑھنے کے لئے کافی لڑکیاں آگئیں، شروع میں بیس تیس لڑکیاں آئیں اُس کے بعد پندرہ اور آگئیں، جس میں کچھ تو شادی شدہ تھیں، اور کچھ کنواریاں، یہ شاگرد ہماری ناتجربہ کاری سے کافی فائدہ اُٹھاتے رہے، اور ہمیں بہت تنگ کرتے رہے، اکثر وہ اپنا سبق اتنی بلند آواز میں پڑھتے کہ ہمارے کان بہرے ہو جاتے تھے، اور پھر کبھی کبھی نہایت بھدی اور بلند آواز میں وہ اپنے قومی گیت گایا کرتے تھے۔

ہمارے لئے یہ پہلا موقعہ تھا، کہ ہم شہر کی تنگ و تاریک گلیوں سے نکل کر گاؤں میں آئیں، اور کسانوں کے ساتھ آکر رہیں، اُن کسانوں کے ساتھ جو چین کی کل آبادی کا ۸۰ فیصدی حصہ ہیں، ہم نے کسانوں کی عزت، اُنکی ناچاری اور بیماریوں اور اُن کے گھر کی ناگفتہ بہ حالت کے متعلق پہلی بار اندازہ لگایا اور ساتھ ہی ہمیں اپنی بے بسی کا پہلی بار احساس ہوا۔

ہم نے نئی ہو میں ایک اور سکول کھول دیا۔ چھوٹے بڑے لڑکے لڑکیاں، گاؤں کی جوان عورتیں بوڑھی عورتیں سب کی سب سکول میں پڑھنے کے لئے جوق در جوق آنے لگیں، اور شام کی میٹنگ میں تو تقریباً سارا گاؤں آجاتا تھا، اس جگہ ہمیں زندگی کے اُن گھناؤنے مسائل کو حل کرنا پڑتا تھا، جو ہماری طاقت سے باہر نظر آتے تھے، ہمیں ایک لڑکی دکھائی گئی جس کی عمر بیس برس کے قریب تھی، بچپن میں بیچاری کی ٹانگیں چلنے پھرنے سے عاری ہو گئی تھیں، اسے ایک ایسے تاریک کمرہ میں رکھا ہوا تھا جہاں ہم اُس کا چہرہ بھی مشکل سے دیکھ سکتے تھے۔

دوپہر کے وقت سُورج کی کرنوں نے چند لمحوں کے لئے کمرے کو روشن کیا، اور ہم نے مسیح کی تصویر سامنے کی دیوار پر ٹانگ دی، اور پھر اُس کے بعد ہمیں ایک نہایت ہی بیوقوف اور اَن پڑھ نوجوان سے ملنا پڑا، جس کی شکل نہایت بھدی اور خدوخال مسیح معلوم ہوتے تھے، گنٹھیا کی بیماری نے اُس کا حُلیہ بگاڑ دیا تھا۔

ہمارے آنے کی خبر سُنکر اُس نے ہمیں اپنے گھر بُلایا اور کہا "آپ اِس گاؤں میں کیوں آئے ہیں؟"

ہم نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا، اُس نے ہماری باتیں سُنکر اپنے پاجامہ کو اوپر کھینچا، اور ایک بھدی اور مڑی ہوئی ٹانگ دکھلائی۔

"خدا محبت ہے" اُس نے کہا۔ "کیا اُس نے یہ ٹانگ بنائی ہے؟"

ہم نے اُسے انجیل میں سے ایک سبق دیا، اور چلتے بنے۔

دوسرے دن اُس نے ہمیں پھر بُلایا، اور کہنے لگا "کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، مجھے اُس سے انکار نہیں، لیکن میری زندگی اور اِس مڑی ہوئی ٹانگ کا کیا علاج ہو سکتا ہے، تمہارا مسیح کب کا مرچکا، کیا وہ میرے مسائل حل کر سکتا ہے، میں ایک نجومی ہوں اور لوگوں کی قسمت دیکھکر روٹی کھاتا ہوں اور میرا باپ بھی یہی کام کرتا ہے، اگر اِس خدا پر یقین رکھوں تو مجھے اس تجارت سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تجارت جھوٹی ہے، لیکن تم ہی بتاؤ، میں کیا کر سکتا ہوں، میں ان ہاتھوں سے کیا کر سکتا ہوں؟"

اِس قسم کا سوال سُنکر انسان کے مذہبی اعتقاد کو ایک ناقابل بیان ٹھیس پہنچتی ہے، اِس سے پہلے ہم میں سے بہت سے کم لوگوں کو ایسے مسائل کو حل کرنے کا موقع ملا تھا،

ہمیں جلد ہی شہر واپس آنا پڑا، دیہات کی زندگی ایک عجیب زندگی ہوتی ہے، دُنیا و ما فیہا سے الگ تھلگ، نہ اخبار، نہ ریڈیو، اور ڈاکخانہ بھی گاؤں سے پانچ میل کے فاصلے پر...... شہر میں ایک عجیب سماں طاری تھا، لڑائی اب لمبی ہوگئی تھی، اور جاپانیوں نے پی پنگ پر قبضہ کرلیا تھا، اس کے بعد جلد ہی یہ خبر سُننی پڑی کہ سیئن سیئن، چی نو، اور چینداو، شمالی شہر جاپانیوں کے قبضے میں آگئے ہیں، ان دنوں شنگھائی میں ایک واقعہ پیش آیا، جس سے لوگ یہ اُمید کرنے لگے، کہ اب لڑائی بند ہو جائے گی، اُمید اور یاس میں ٹکر ہونے لگی، لوگ کہتے تھے، کہ دُنیا کی بڑی بڑی طاقتیں لڑائی نہ ہونے دیں گی کیونکہ اُن کی تجارت اس لڑائی سے برباد ہو جائے گی، طاقتیں یہ پسند نہ کریں گی کہ شنگھائی جیسا خوبصورت شہر محض ایک اُجڑا ہوا گاؤں بن جائے۔ لیکن یہ اُمیدیں جلد ہی مسمار ہوگئیں جب لوگوں نے سُنا کہ جاپانی ہوا بازوں نے شہر شنگھائی پر بم برسائے ہیں اور پیلس ہوٹل کو بالکل مسمار کر دیا ہے، اب لوگوں کو یقین ہوگیا کہ آج کل کی لڑائی، دوست دشمن جانبدار اور غیر جانبدار میں کوئی تمیز نہیں کرتی۔

نہایت بے دلی سے ہم نے ہوائی حملوں سے بچنے کے لئے چند تدابیر سوچیں، پہلے فسٹ ایڈ کے لیکچروں کا ایک کورس تیار کیا، ایک منچلے دوکاندار نے اپنی الماری میں گیس ماسک کی نمائش کی اور ساتھ ہی Bicarbonate of Soda کی بوتل رکھدی، ہمیں یہ معلوم نہ تھا، کہ ہوائی حملوں سے بدہضمی کی شکایت بھی ہو سکتی ہے، کچھ لوگوں نے ہوائی حملوں سے بچنے کے لئے زمین دوز کمرے بنانے شروع کئے۔ اور چند نرسوں پر گورنر کی نصیحت کا یہ اثر ہوا کہ اُنہوں نے نوکری کو خیرباد کہہ کر گاؤں کا رُخ کیا۔

گورنر نے نہایت حلیمانہ انداز میں کہا: "ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے، بات تو صرف اتنی ہے کہ تم میں اتنی صلاحیت ہونی چاہیئے، کہ تم گیس اور آتشیں بم میں تمیز کر سکو۔ اگر گیس بم نکلے تو فوراً پناہ خانہ کی طرف رُخ کرو، اور آگ والا بم ہو تو فوراً چھت پر چڑھ جاؤ۔"

لوگوں کی عام رائے یہ تھی، کہ جنگ اُن کے نزدیک نہ آئے گی، اور جلد ہی، یا چند مہینوں کے اندر ختم ہو جائے گی، ہر ایک شخص کے لئے اپنے گھر کا کام کاج زیادہ ضروری تھا، بجائے اس کے وہ ایک دور کی جنگ کے لئے اپنا قیمتی وقت صرف کرتا۔

چین کی قومی انجمن نے دس ہزار پاجاموں کے لئے اپیل کی، لیکن لوگوں نے اپیل کی طرف بہت کم دھیان دیا، میں اور چند ممبر ملکر اپنے گروپ کے ممبروں کے گھر گئے، لیکن ہر طرف سے انکار کی آواز آئی

"کوئی کہتا، مجھے بہت کام ہے،"
"مجھے سینا پرونا نہیں آتا۔"
"میں تو پاجامہ سی نہیں سکتی!"

'میں تو نہیں، شاید میرا نوکر پاجامہ بنا سکے۔

خیر ہم نے کپڑا خرید، اور کاٹ چھانٹ کر لوگوں کے حوالے گیا، لوگوں نے جلد ہی کپڑے واپس کر دیئے۔ مجبور ہو کر ہم انگریز کمشنر کی بیوی کے پاس گئے، انہیں حیرت ہوئی، جب کمشنر کی بیوی نے کہا "میں ضرور اس کام کو کروں گی"

لیکن اب حالت بدل چکی ہے، دو سال کی متواتر جنگ نے لوگوں کی عادات کو بدل دیا ہے، اُن کے نظام میں ایک اہم تبدیلی آ چکی ہے، میڈم چیانگ کیشیک کی ذاتی مثال نے عورتوں میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے، اور وہ مردوں کے دوش بدوش اپنے مادرِ وطن کو آزاد کرنے کے لئے ہر کام کر رہی ہیں، انہیں اپنی آزادی سے محبت ہو گئی ہے۔

چین کی عورتیں اب ہر محکمہ، ہر ایک تجارت میں برابر حصہ لیتی ہیں، اور قانون کی تمام بندشیں جوان پر قائم تھیں، اب ہٹالی گئی ہیں، اس جنگ میں چینی عورتیں اپنے حقوق اچھی طرح جان گئی ہیں، اور قانونی طور پر انہیں شہریت کے تمام حقوق مل چکے ہیں۔

کئی ہفتوں کے انتظار کے بعد پہلے ہوائی حملہ کا سامنا کرنا پڑا۔ ہوائی حملہ سے باخبر کرنے کے لئے کوئی اطلاع نہ دی گئی، ہوائی حملے سے باخبر کرنے والے ملازم سیر و تفریح کے لئے باہر گئے ہوئے تھے، میرے دوست نے مجھے کلاس سے بلایا، اور نہایت دھیمی آواز میں کہا "آج سچ مچ ہوائی حملہ ہے"

میں نے آسمان کی طرف نگاہ کی، اور تین ہوائی جہازوں کو پرواز کرتے دیکھا، اور پھر میں نے اونچی آواز میں کہا "مجھے یقین نہیں آتا کہ ہوائی حملہ ہو"

یہ چند ثانیے جو زندگی اور موت کے درمیان ہوتے ہیں، دل پر ایک عجیب لرزتی ہوئی کیفیت طاری کر دیتے ہیں۔

میرے باغیچے میں کچھ پتھریلی چٹانیں تھیں اور ادھر اُدھر پھول کھلے ہوتے تھے، دوپہر کا وقت تھا، اور سورج کی کرنیں پھولوں پر پڑ رہی تھیں، اور ایک عجیب نظارہ پیش کر رہی تھیں، ہر طرف سکون تھا، موت جیسا سکون، صرف اپنے خیال کی پرواز کی آواز یا اوپر اڑنے والے ہوائی جہازوں کی آواز آ رہی تھی، "کتنی دل کو ہلا دینے والی آواز تھی، اور کیا معلوم کہ اس کے بعد زندگی یہیں ختم ہو جائے، پتہ نہیں، اب کیا ہو گا"

اور اس کے بعد آسمان سے ایک لمبی پتلی سی چیز گرتی ہوئی دکھائی دی، اور اُس کے بعد ایک زور کا دھماکا، اور پھر ایک دو، تین دھماکے سُنے گئے، اور پھر ہوائی جہاز شمال کی طرف پرواز کر گئے۔

تو یہ تھا ہوائی حملہ، ہم سب آفس میں اکٹھے ہو گئے، اور سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیئے، فسٹ ایڈ کے بیگ دیواروں پر لٹک رہے تھے، اور ساتھ ہی کچھ پٹیاں، ادویات اور لکڑی کے ٹکڑے۔

لیکن یہ ہوائی حملہ کہاں ہوا تھا؟ اور ہوائی حملے سے زخمی شدہ انسان کہاں ہیں، چونکہ ٹیلیفون خراب تھا، اس لئے مجھے حکم ملا کہ بائیسکل پر چڑھ کر معلوم کروں کہ ہوائی حملہ کہاں ہوا ہے، جب میں گلی میں پہنچی تو معلوم ہوا کہ دھماکا ریلوے سٹیشن پر ہوا ہے، میں جا رہی تھی تو راستے میں لوگوں نے چلانا شروع کیا ڈاکٹر، ڈاکٹر، اِدھر آؤ،

پولیس نے ٹریفک بند کر دیا تھا، لیکن ریڈ کراس کے بیگ نے جو میرے ساتھ لٹکا ہوا تھا آگے جانے پر مجبور کیا، آگے جا کر میں نے دیکھا کہ دو ہوٹل مسمار ہو گئے ہیں اور چند دوکانیں زمین سے جا لگی ہیں، آگ بجھانے کے انجن آ چکے تھے، اور لوگ نہایت زور شور سے ملبے کو کھود رہے تھے، چند ایک لاشیں نکالی گئیں۔

"ڈاکٹر اِدھر آؤ" یہ آواز بار بار میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی، بہت سے زخمی شدہ میری امداد کے قابل نہ تھے، لیکن پھر بھی ٹنکچر اور پٹیوں نے انہیں کافی آرام دیا، حتیٰ کہ سرکاری لاریاں آ گئیں، اور زخمی شدہ لوگوں کو ہسپتال پہنچایا گیا۔

میرے لئے یہی بہتر ہو گا کہ بربادی کے اُن نقشوں کو نہ کھینچوں جو میں نے دیکھے، لیکن اُس آواز کو میں کیسے بھول سکتی ہوں، جو مجھے گھر کی طرف واپس آتے ہوئے سُنائی دی، وہ آواز اب تک میرے دل و دماغ کے پردوں سے ٹکرا رہی ہے، جب میں سٹیشن سے واپس آ رہی تھی، تو راستہ میں میں نے ایک آدمی کو ہاتھوں میں ایک بچے کو لئے ہوئے دیکھا، ظاہری طور پر بچے کے چہرے پر کوئی نشان نہ تھا، لیکن اُس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی، آدمی نے مجھے ٹھہرنے کے لئے اشارہ کیا، جب میں سائیکل سے نیچے اُتر گئی تو اُس نے اپنے بچے کو میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "ڈاکٹر خدارا، اس بچے کو زندہ کر دو، یہ میرا اکلوتا بچہ ہے"

اور اس کے بعد جنگ زور سے شروع ہو گئی، نانکین کی شکست

کے بعد زخمی سپاہی جوق در جوق آنے لگے، ہر ایک ٹرین زخمی سپاہیوں سے بھرپور تھی، اور اب ملٹری ہسپتال میں اتنی جگہ نہ تھی، کہ ان زخمی سپاہیوں کے لئے جگہ مہیا کر سکے۔ زخمیوں کے لئے نہ ہسپتال تھے، نہ ڈاکٹر اور نہ ہی نرسیں، ادویات تک پاس نہ تھیں، زخموں کے دھونے کے لئے روئی تک نہ تھی، زخمیوں کے لئے نہ چارپائی تھی نہ بستر، اور نہ ہی خوراک، لیکن ہر ٹرین زخمی سپاہیوں سے لدی ہوئی آتی، اور یہ زخمی سپاہی تمام رات اسٹیشن پر گذار دیتے، اس وقت سخر بچے تک بھی نہ ملتا تھا، کہ زخمی سپاہیوں کو کسی محفوظ جگہ پہنچایا جاتا۔

پھر ہی نسٹ ایڈ کے تھیلوں سے کچھ والنیٹروں نے اپنی خدمات کو پیش کیا، اور دس دن تک زخمی سپاہیوں کے زخموں کو صاف کرتے رہے، یہ دل کو ہلا دینے والا کام تھا، کئی ہفتوں تک زخمی سپاہیوں کی چیخیں میرے کانوں میں گونجتی رہیں، وہ زمین پر گھاس پھوس پر لیٹے رہے، ایک دو دن کے بعد سپاہیوں کو بھوک لگی، تو وہ بھوک سے چلانے لگے، تب جا کر خوراک کا انتظام ہوا، دو ہفتوں کے بعد ہیلتھ بیورو نے کچھ ڈاکٹر اور نرسیں بھیجیں، جس کے بعد والنیٹر سکواڈ کو چھٹی ملی، دو مہینے کے بعد بہت سے ہسپتال تیار ہو گئے تھے، جس میں زخمی شدہ سپاہیوں کے علاج اور رہائش کا مکمل طور پر انتظام ہو گیا تھا۔

دن بدن جنگ نزدیک آتی گئی جنگ، افلاس، بھوک اور تباہی کا پیش خیمہ تھی، پناہ گیروں کا عظیم ہجوم جن کے چہروں پر جنگ کی تباہی کے آثار نمایاں تھے، گاؤں کی طرف دوڑتے ہوئے نظر آنے۔

پہلے وہ آئے جو امیر تھے، جن کے پاس کاریں تھیں، اور اس کے بعد وہ لوگ آئے، جو نہ بہت غریب تھے، نہ امیر۔ ان میں کلرک بھی تھے، استاد، اور سوداگر بھی، یہ لوگ گھر سے تھوڑی سی نقدی لیکر چل پڑے تھے، اور جہاں کہیں انہیں کشتی ملی، انہوں نے اس میں سفر کیا، جہاں ریل ملی تو ریل میں سفر کیا اور پناہ گیر اکثر کہتے تھے، کہ "دعا کرو کہ سردی کے موسم میں بھاگنا نہ پڑے"، ان دنوں بلا کی سردی تھی، لوگ اپنے ساتھ بستر اٹھا لائے تھے، لیکن راستے میں چلتے چلتے انکی ٹانگوں نے جواب دے دیا، تو مجبور ہو کر انہیں بستر پھینکنے پڑے۔

کئی پناہ گیروں کو لٹیروں نے لوٹ لیا، اور کئی ہوائی حملوں سے جان بحق ہوئے۔

چین کی گورنمنٹ نے ان پناہ گیروں کے لئے جگہ اور خوراک کے لئے دس سنٹ فی کس دینا منظور کیا۔ جبرا دس سنٹ سے دو وقت روٹی تو میسر ہو سکتی ہے۔

اس وقت جبکہ کپڑوں کی قلت کی وجہ سے شدید نقصان ہونے کا اندیشہ تھا، ([illegible]) سے وقت پر کپڑوں کی امداد پہنچی، بدقسمتی سے جو کپڑے بھیجے گئے تھے، وہ گرمیوں ہی میں پہننے کے قابل تھے۔ ہم نے بیس پناہ گیر والنیٹروں کو ساتھ لے کر کپڑوں کو مختلف کیمپوں میں بانٹ دیا، میں نہیں جانتی تھی، پاجاموں کے اتنے مختلف زاویئے ہو سکتے تھے، ہر ایک پھٹا ہوا کپڑا، چاہے وہ نکر ہو یا سویٹر یا پاجامہ یا قمیض سب کے سب نہایت اچھی طرح استعمال کئے گئے۔

ہوائی حملے، زخمی سپاہی، پناہ گیر، یہ ہے زندگی ایک عام چینی کی، آج کل کی جنگ کے دنوں میں جسمانی اور دماغی اذیت اتنی زیادہ ہے کہ اس سے چھٹکارا پانے کے لئے ایک دیوار حائل ہے، اور دیوار ہے ان احساسات کی کہ جو کچھ ہم ان زخمی سپاہیوں کے لئے کرتے ہیں وہ اتنا معمولی اور کم ہے کہ ہمیں اس تھوڑا بہت کرنے پر انتہائی شرم محسوس ہوتی ہے اور کبھی کبھی ایسا خیال آتا ہے، کہ ان لوگوں کے لئے کچھ بھی نہ کیا جائے۔

مہندر ناتھ

ڈاکہ

رستم علی اپنی تنگ و تاریک کوٹھری کے دروازے کے قریب بیٹھا صبح کے دھندلکے میں وظیفہ پڑھ رہا تھا، توئی اکبری و توئی سرودی۔ میری باریکیوں دیر اتنی گری۔ یکایک پڑوس میں چوہدری کے مکان کے پچھواڑے سے ایک تڑاخ کی آواز سُنائی دی اور پھر کوئی گالی دے کر کہہ رہا تھا "چور کہیں کی! ڈاکو۔ آج پکڑی گئی نا آخر"

صبح سویرے چوہدری کے گھر کون ڈاکہ ڈالنے آیا تھا۔ رستم علی کا وظیفہ رک گیا۔ تھپڑ کی آواز، چور کہیں کی: ان الفاظ نے اُسے چونکا دیا۔ وہ جلدی سے باہر نکلا اور موقع واردات پر جا پہنچا۔

چوہدری کا نوکر، بدشکل مُشٹنڈا، رحمو ایک تیرہ چودہ سالہ زرد رو اور نحیف و زار لڑکی کو پکڑے کھڑا تھا۔ لڑکی خاموش تھی۔ اُس نے قریب جا کر دیکھا۔ لڑکی اُن کے محلے ہی کی کرتمین بیوہ کی اکلوتی بیٹی مریم تھی۔ رستم علی کی بہن بھی بالکل مریم جیسی تھی مریم کی لمبی لمبی پلکوں میں آنسو اٹک کر رہ گئے تھے۔ تڑاخ کی آواز ابھی تک اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ مریم کو دیکھ کر اُسے ایسا محسوس ہوا گویا کسی نے اُس کے ہی مُنہ پر زور سے تھپڑ مارا ہے۔ دیوہیکل رحمو اور کمزور بچی مریم۔ اس گنوار کے تھپڑ کو برداشت کر سکتی تھی؟ مریم ساکت کھڑی تھی۔

"چور کہیں کی! ڈاکو" وہ حیران تھا کہ مریم بیچاری بھلا کیا چوری کر سکتی تھی۔ کونسا ڈاکہ ڈال سکتی تھی۔ اُس نے رحمو سے پوچھا۔

"کیا ہوا رحمو؟"

"منشی جی!" رحمو نے اس انداز سے کہا گویا وہ رستم علی کا مذاق اُڑا رہا تھا کہ تم بڑے آئے ہو ہمدردی کرنے والے۔ "یہ روز بھینس کا گوبر چرا لے جاتی تھی۔ آج پکڑی گئی۔ چور کہیں کی"

گوبر کی چوری، جرائم کی تاریخ میں یہ جرم سب سے زیادہ سنگین تھا اور خود رحمو تو بڑا ایمان دار آدمی تھا نا۔ اور چوہدری وہ بھی بڑا نیک اور پارسا شخص تھا۔ تھوڑا سا بددماغ تھا اور ــــ دولت یونہی پیدا ہوتی ہے۔ چوہدری سے بڑھ کر رحمو سے محلہ تنگ تھا۔ وہ اُس بُل ڈاگ کی طرح تھا جو دروازے پر بندھا ہر گذرنے والے پر بھونکتا ہے۔ محلہ میں اکثر غریب لوگ رہتے تھے اور چوہدری کے کرایہ دار۔ اس لئے رحمو کا دبدبہ اور بھی زیادہ تھا۔ وہ اُن کی بہو بیٹیوں پر آوازے کستا۔ کسی کی کیا مجال کہ کوئی چوں بھی کر جائے۔ کوٹھریوں کا کرایہ وصول کرنا بھی اُسی کے سپرد تھا۔ اس کی مرضی کا دخل ان کرایہ داروں کی زندگی میں بہت زیادہ تھا۔ ایک دو بار اس کی شکایت چوہدری سے کی گئی، مگر اُلٹا اُس نے بُل ڈاگ کو ہی پچکارا۔ کیونکہ اسی میں چوہدری کا رعب قائم رہ سکتا تھا۔ آخر رحمو اس کا نمائندہ تھا۔

رستم علی تھا تو نوجوان اور خوب مضبوط بدن مگر کر کیا سکتا تھا۔ رحمو سے مقابلہ خود اپنے لئے ایک وبال مول لینا تھا۔ بڑی مشکل سے اُسے اتنی سستی کوٹھری ملی تھی۔ لڑکی کمزور تھی، وہ مرد تھا...

...... تھوڑی دیر سوچنے کے بعد رستم علی نے رحمو کی کلائی پر ہاتھ رکھ کر ذرا جھٹکا دیا۔ اور لڑکی کا بازو چھڑاتے ہوئے بولا "اچھا پہلوان جانے دو۔ پھر نہ آئے گی۔ عورتوں سے مقابلہ کرتے ہو۔ دُنیا کیا کہیگی"

پہلوان اور ایک کمزور لڑکی پر دھونس، رحمو کی موٹی عقل میں یہ بات آگئی۔

"توئی اکبری و توئی سرودی" ــــ اُس نے اپنا وظیفہ پھر جاری رکھنا چاہا۔ لیکن اس کے خیالات میں ایک تلاطم برپا ہو چکا تھا۔ زبان خیالات کا ساتھ نہ دے سکی۔ اور اس کا وظیفہ رُک گیا۔ اُسے گال پر ابھی تک تھپڑ کی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے کانوں میں توئی اکبری و توئی سرودی کا فقرہ رحمو کے الفاظ بن کر سُنائی دے رہے تھے "چور کہیں کی۔ ڈاکو!"

اِس کی تعلیم صرف اُردو مڈل تک کی تھی۔ وہ گاؤں سے تلاشِ روزگار میں شہر آیا تھا۔ اس کی صحت خوب اچھی تھی۔ شہر میں اُسے کوئی اچھا سا کام تو نہ مل سکا۔ ایک کارخانہ میں مزدوری مل گئی۔ اور کچھ دنوں بعد مالک نے اس کے کام سے خوش ہو کر مزدوروں کی حاضری لگانے کا کام اُسکے سپرد کر دیا۔ اور وہ منشی بن گیا۔

چوری اور ڈاکہ دو ایسے الفاظ ہیں جن سے گاؤں کے لوگ بہت مانوس ہوتے ہیں۔ اور وہ ان کا مطلب خوب سمجھتے ہیں۔ اور رستم علی بھی ڈاکے کا مطلب خوب سمجھتا تھا۔ شہر میں اس نے کئی جلسے سُنے تھے۔ جن میں مزدوروں کو بیداری کا پیغام دیا جاتا اور انہیں بتایا جاتا کہ سرمایہ دار کس طرح مزدوروں کو بیوقوف بنا کر ان پر ڈاکہ ڈالتے ہیں ـــــ اب وہ اپنے کام سے خوب واقف ہو گیا تھا اور اُسے معلوم ہونے لگا کہ اُن کے کارخانہ کا مالک بھی ایک ڈاکو ہے۔ لیکن گاؤں کے ڈاکے اور شہر کے ڈاکے میں بڑا فرق تھا۔ گاؤں میں سرتن کی بازی لگا کر ڈاکو آتے ہیں۔ اُنہیں مقابلے کا خدشہ اور پولیس کا ڈر رہتا ہے۔ مگر شہر میں ڈاکہ میزوں پر بیٹھ کر آرام دہ کمروں میں ٹیلیفون کے ذریعے ڈالا جاتا ہے۔ گرفتاری کا ڈر نہیں ہوتا۔ دھن دولت خود بخود کھنچی آتی ہے۔ کارخانہ دار اپنے کاریگروں کو ہمیشہ دیانت داری کی تلقین کیا کرتا۔ لیکن خود اُسکا عمل برعکس ہوتا ہے۔

رستم علی کئی بار مالک کے گھر گیا۔ گھر کیا تھا ایک محل، موٹریں، بگھیاں، باغ، باغیچے سب موجود تھے۔ اور پھر اندرون خانہ ہیجان ہٹ اُسے الف لیلیٰ کی کہانیاں یاد آ جاتیں۔ اُس نے علی بابا چالیس چور والا کھیل بھی دیکھا تھا۔ ڈاکو کے غار زر و جواہر کے خزانوں سے پُر تھے۔ یہاں بھی وہی ماجرا تھا۔

پہلے پہل رستم علی کا بھولا بھالا دماغ مالک کی دولت کو اس کی محنت کا اجر سمجھتا رہا۔ لیکن جوں جوں اُسے سمجھ آتی گئی وہ جان گیا کہ اس کا پہلا خیال محض حسن اعتقاد پر مبنی تھا۔

کارخانے کا مالک، کیا مجال جو کسی کو پھوٹی کوڑی دے جائے۔ زیادہ سے زیادہ کام اور کم سے کم معاوضہ ہی اُس کی ڈاکے زنی کا اصول تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کا ڈاکہ بڑا عجیب اور کامیاب تھا۔ کاروں میں آنے والے ملاقاتی، دعوتوں میں ملنے والی عورتوں سے جب وہ ہنس ہنس کر باتیں کرتا تو ایسا معلوم ہوتا گویا وہ تہذیب و اخلاق کا ایک مجسمہ ہے۔ لیکن جب اُس کے ڈاکے کا وقت آتا تو کیا مجال جو کوئی ذرا اُف بھی کر جائے۔ اُس وقت انسان ـــــ گوشت پوست کا ڈھانچہ، محض روپیہ بنانے کی ایک مشین بن کر رہ جاتا۔ وہ چاہتا تھا کہ جس قدر زیادہ روپیہ تیار ہو سکے کرے۔

سب جانتے تھے کہ وہ بڑا ڈاکو ہے لیکن اس کے باوجود اس کی عزت بڑھتی جا رہی تھی۔ رستم علی جان گیا تھا۔ کہ عوام کسی کی عزت کریں یا نہ کریں، اس سے کیا بنتا یا بگڑتا ہے۔ اس کی دولت سماج میں اس کے لئے جگہ پیدا کر دیتی ہے۔ سرکار سے لے کر ملک کے بڑے سے بڑے لیڈر تک سب اس سے مل کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ ان دونوں طاقتوں کا امتزاج اس کی ڈاکہ زنی میں بڑا مددگار ثابت ہوتا ہے۔

"گوبر کو بر اٹھانا بھی چوری اور ڈاکہ ہو سکتا ہے؟" رستم علی سوچ رہا تھا۔ آخر غریب کا اتنا حق نہیں کہ وہ ایک جانور کا گوبر بھی اُٹھا سکے۔ اس کے لئے بھی کسی کی ہوس رانی کا شکار ہونا ضروری تھا۔ سونا تو خیر سونا ہوا مگر گوبر تو سونا نہ تھا۔ کہ بیچاری لڑکی چور بنی اور قابل سزا ٹھہری۔ اس نے بُرا کیا۔ وہ گوبر مانگ کر اُٹھا سکتی تھی۔ لڑکی نے بھی تو ایک دن رحمو کے مذاق کرنے پر اُسے بُرا بھلا کہا تھا۔ محلہ بھر میں رحمو کی بے عزتی کی۔ لیکن رحمو کا کوئی بگاڑ کیا سکا۔ مگر اس نے تو بدلہ لے لیا۔ تھپڑ بھی زور سے مارا اور گوبر بھی اُٹھانے نہ دیا۔ رحمو ایک اور لڑکی کو گوبر دے دیتا تھا۔ وہ اُس سے ہنس ہنس کر مٹک مٹک کر باتیں کرتی تھی۔ رحمو کی مہربانیوں کا ہاتھ اس پر روز بروز دراز ہوتا جا رہا تھا۔ اور مریم کمزور اور مریل سی۔ زرد رو، اور پردہ نشین بیوہ کی بیٹی۔ رحمو بھلا ان سے دبتا تھا۔

مریم شریف زادی تھی۔ اس لئے اُسے سزا ملی۔ دُنیا میں شرافت کا یہی انعام ملتا ہے۔ شرافت، اس نے کل ہی اخبار میں ایک دلچسپ واقعہ پڑھا تھا۔ ایک بہت بڑے شریف آدمی کے گھر سے چوری کا مال برآمد ہوا۔ مُخبر نے جب اطلاع کی تو پولیس کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ اس شخص پر ہاتھ ڈالے۔ جو سرکار اور بڑے لوگوں میں اس قدر بڑی حیثیت کا مالک تھا۔ لوگ اُسے شریف جانتے تھے۔ اور اُس کی شرافت کی بنیادیں چوری کے اس مال پر استوار ہوتی رہی تھیں جو وہ سستے داموں خریدا کرتا، وہ ڈاکہ ڈالتے وقت تو ساتھ نہ جاتا تھا۔ بلکہ اُس وقت نہایت آرام اور چین سے اپنے کمروں میں محو عیش ہوتا ہوگا۔ لیکن لوٹ کے مال میں اسکا حق برابر کا تھا۔ جب اس کے ہاتھوں میں مال پہنچتا تو محفوظ ہو جاتا۔ اُس نے اپنے گرد شرافت کے پیسے کی ایک ایسی دیوار بنائی تھی۔ جسے پار کرنے کے لئے کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ آخر ایک من چلا

پالیس افسر چور بن کر اس کے گھر میں داخل ہوا۔ اس نے تجوری کھولی۔ چوری کا مال موجود تھا۔ لیکن وہ موقع پر پکڑا گیا۔ شریف آدمی کو بھلا کب جرأت تھی کہ وہ چور کو پولیس کے حوالے کرکے خود پولیس کو اپنے گھر کے اندر داخل ہونے کی دعوت دے۔ راز کے افشا کا ڈر تھا۔ اُس نے معاملہ کو رفع دفع کرنے کی کوشش کی اور نوجوان پولیس افسر کو تلقین کرنے لگا کہ دیکھو! چوری ایک ذلیل حرکت ہے۔ ایک لعنت ہے۔ دوسروں کے خون پسینے کی کمائی پر ہاتھ ڈالنا بزدلی ہے۔ دین و مذہب کے خلاف ہے ــــــ نجانے وہ کتنی اور پند و نصائح کے دریا بہاتا رہتا۔ لیکن ــــــ وہ آخر پکڑا گیا۔

مریم نے ڈاکہ ڈالنے سے قبل اپنے گرد رحمو کے التفات کی دیوار حائل نہ کی تھی۔ ورنہ اُسے کبھی سزا نہ ملتی۔ وہ بیچاری ان اصولوں سے ناواقف تھی۔

ڈاکہ ڈالنے وہ کیوں گئی۔ یہ سوال بار بار رستم علی کے دماغ میں چکر لگانے لگا۔ ڈاکہ ڈال کر لوگ مالدار بن جاتے ہیں۔ دولت میں کھیلنے لگتے ہیں۔ مگر یہاں کیا تھا۔ کریمن بیوہ تھی۔ بنی بیوگی کے دن کپڑے سی کر کاٹ رہی تھی۔ جو کچھ اُسے ملتا اُس سے دونو ماں بیٹی کی مشکل سے گزر اوقات ہوتی۔ اُسے مریم کا غم کھائے جا رہا ہوگا۔ وہ جوان ہوتی جا رہی ہے۔ اور غریبوں کی بچیاں جوان بھی جلد ہو جاتی ہیں۔ جوان لڑکی کو گھر میں بٹھائے رکھنا بھی مشکل تھا۔ عورت ذات کی عزت پر ذرا سا حرف آجائے تو وہ پھر کہیں کی نہیں رہتی۔ وہ بھی بیوہ تھی اور کنگال، اُس کی بیٹی سے کون شادی کرتا۔ رحمو سے بھی اگر کوئی کہہ دیتا کہ وہ مریم سے شادی کرے تو نہ مانتا۔ جہیز کے بغیر بیاہنا، اس سے محلے بھر میں ناک کٹ جاتی۔

دن بھر بیوہ آنکھوں کا تیل نکال کر مشکل سے ۵ یا ۶ آنے کما سکتی ہوگی۔ جن کے وہ کپڑے سیتی تھی وہ بھی تو اس جیسے لوگ تھے، روز نئے کپڑے کہاں سے لاتے۔ اُسے اکثر پرانے کپڑے ہی مرمت کرنے پڑتے تھے۔ مرمت کرنے کا معاوضہ بھی کم دیا جاتا ہے۔ اِن پیسوں میں ان کا گذارہ مشکل سے ہوتا ہوگا۔ پیٹ کوئی کہاں تک کاٹ سکتا ہے۔

وہ سوچنے لگا کہ قدرت کا نظام بھی عجیب ہے۔ ایک طرف لوگ بھوکوں مرتے چوری اور ڈاکے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن دوسرے ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس دولت کی کمی نہیں۔ مگر وہ پھر بھی ڈاکے ڈال رہے ہیں۔ یہ معمہ اُس سے حل نہ ہوسکا۔ ہاں وہ اتنا سمجھ گیا کہ دونوں کو بھوک ہی مجبور کرتی ہے۔ ایک کو پیٹ کی تو دوسرے کو اور دولت کی ــــــ اور جہیز اس میں بھی تو ہوس کاری اور زر اندوزی کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ کئی شریف گھرانوں کی جوان لڑکیاں صرف اس لئے رد کر دی جاتی ہیں کہ وہ دولھا والوں کے حسب خاطر جہیز نہیں لاسکتیں۔ ازدواجی تعلق بقائے نسل انسانی کے لئے ایک مقدس ادارہ ہے اور دو روحوں کے ملاپ کا نام، مگر دولھا اور اس کے ساتھی ڈاکو بن کر آتے ہیں اور دُلہن اور جہیز اُن کے لئے گویا لوٹ کا مال ہوتا ہے۔

مریم کو بھی آخر کوئی ڈاکو اٹھا کر لے جاتا۔ بھوکے کے گھر ڈاکہ کون ڈالتا ہے۔ بیوہ ماں دولت جمع کرنا چاہتی تھی تاکہ اُس کو دیکھ کر شاید کسی کا دل للچا جائے اور وہ اُن کے گھر ڈاکہ ڈال سکے۔ خود تو وہ اس قابل نہ تھی کہ اور کام کر سکے، اس لئے مریم کا فرض تھا کہ وہ اپنے آرتھیاں کو تیار کرنے کے لئے خود تنکے اکٹھے کرے۔ شاید اس کا بخت بیدار ہو اور کوئی بجلی اُسے جلانے کے لئے آہی نکلے۔

تنکے اکٹھے کرنا مشکل کام تھا اور وہ ابھی بچی تھی۔ خوراک کم اور محنت کی وجہ سے اُس کی نشوونما پوری طرح نہ ہو سکی۔ اس کا جسم کمزور ہو گیا تھا۔ وہ دن بھر گھر کا کام کاج ہی کرتی اور کسی پڑوسن کے برتن مانجھ کر دو پیسے لے آتی۔ دو پیسے یا ایک آدھ روٹی لے آتی۔ صبح کے دھندلکے میں وہ اٹھتی، سڑکوں پر چلنے والے جانوروں کا گوبر اکٹھا کر کے لے آتی۔ ماں گوبر کے اُپلے تھاپ کر انہیں محلہ میں فروخت کر لیتی۔ اس طرح انہیں ایک دو روپے کی آمدنی ہو جاتی تھی اور گھر کے ایندھن کا خرچ بھی چل جاتا۔

رحمو خود تو نوکر تھا لیکن اپنے آپ کو دوسرے محلے والوں سے ممتاز سمجھتا کیونکہ وہ چوہدری کا نوکر تھا۔ اس لئے وہ خود بھی چوہدری تھا۔ اُسے کسی کی آبرو پر ہاتھ ڈالتے، غریبوں کی پگڑی اچھالتے یا کسی سے مذاق کرتے ہوئے ذرا جھجک نہ ہوتی تھی۔ چوہدری نے بھی تو کئی داشتہ ڈال رکھی تھیں اور پھر ــــــ محلے والے چوہدری کے محتاج بھی تو تھے۔ چوہدری تک رسائی کا ذریعہ رحمو ہی تھا۔

رحمو کو ناراض کر کے کوئی چوہدری کے گھر سے ایک تنکا بھی

نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ چوہدری کے گھر میں کئی گائے بھینسیں تھیں۔ اُنکا گوبر بھی کافی تھا۔ جسے بھنگن اُٹھا کرلے جاتی تھی یا اُوجس پر رحمو مہربان ہوتا اُسے مل جاتا ___

جب سے رحمو ناراض ہوا مریم کو اجازت نہ تھی کہ وہ گوبر اُٹھائے۔ دو تین بار تو اس کا داؤ چل گیا لیکن آج پکڑی گئی۔ رستم علی کو اپنا گاؤں یاد آگیا۔ گوبر، اُپلے اور خود اس کی اپنی بہن اُپلے تھاپتی تھی۔ اُسے کچھ مُنہ پر ایک تڑاخ سے تھپڑ لگتا محسوس ہوا۔ اس کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔ وہ زور زور سے وظیفہ پڑھنے لگا۔

توئی اکبری و توئی سروری۔ میری بار کیوں دیر اتنی کری۔

شیر محمد اختر!

(چونچلا) — بسلسلہ صفحہ ۴۵

اور ثابت ہوگیا کہ اُس کی پیدائش اُسی زمانہ میں ہوئی جب خداوند بیگم سے ناراض تھے، بیگم نے ایک بڑا جرم کیا، اور خداوند بیگم کو سزا دینا چاہتے تھے، شریعت نے بھی خداوند کا ساتھ دیا اور مذہبی رہنما نے خداوند کے حق میں فیصلہ کردیا۔ اور اس رنگین تتلی کو باضابطہ طور پر محل میں داخل کرلیا گیا۔

جس رات وہ محل میں داخل ہوئی، بیگم نے سر پیٹ لیا، شاید وہ حقیقت سے واقف تھی، مگر لوگ سمجھ رہے تھے کہ اُس کو اپنا زمانہ یاد آرہا ہے، بیگم یقین رکھتی تھی کہ آسمان ٹوٹ پڑے گا یا زمین پھٹ جائے گی، شاید اس منحوس رات کی صبح ہی نہ ہو۔ مگر صبح ہوئی اور سورج حسبِ معمول اپنی پوری آب و تاب سے نکلا، اور دُنیا میں ہر طرف اور ہر شے پر وہی سکون تھا جو ہر روز ہوا کرتا ہے،

بیگم اب بھی زندہ ہے۔ شاید دولت اور خدمت نے اُسکے دل کے ناسوروں کو مندمل کردیا ہے۔ مگر کیا اب بھی وہ اپنے آپکو دُنیا کی خوش قسمت عورت سمجھتی ہے ؟ ...

ہاجرہ سرور

ناگفتہ بہ

ہم نے یہ مانا کہ ہے رنج و الم ناگفتہ بہ
سچ تو یہ ہے آپ کا لطف و کرم ناگفتہ بہ

ہے مریضِ غم کی حالت دم بدم ناگفتہ بہ
اے تغافل کیش! یہ نوعِ ستم ناگفتہ بہ

بڑھتے بڑھتے نازِ بیجا حد سے آگے بڑھ گیا
اے نیازِ عاشقی اب اس کا غم ناگفتہ بہ

عشقِ مفلس کا جہاں میں قدرداں کوئی نہیں
شورشِ مجنوں ہے بے دام و درم ناگفتہ بہ

اے فریبِ منزلِ عشق و جنونِ عاشقی
حالتِ رہرو ہے اب ہر ہر قدم ناگفتہ بہ

پردۂ بخشش میں بھی مطلب پرستی ہے نہاں
فی الحقیقت صدقۂ اہلِ کرم ناگفتہ بہ

یا تو آگے ہی نہ بڑھ یا بڑھ کے پھر پیچھے نہ جا
راہِ اُلفت میں ہے لغزیدہ قدم ناگفتہ بہ

اس سے جی ہٹنے لگا اُس سے طبیعت بھر گئی
میری نظروں میں ہیں خود دیر و حرم ناگفتہ بہ

دیدۂ دانستہ ہے دل بے نیازِ عقل و ہوش
ہے فریبِ فطرتِ حُسنِ صنم ناگفتہ بہ

رہنمائی اک نمائش، رہبری گمراہ ہے
فی الحقیقت فتنۂ دیر و حرم ناگفتہ بہ

ہوتے ہوتے ہوگیا دامانِ ہستی چاک چاک
آہ اے جوشِ جنونِ رنج و غم ناگفتہ بہ

ہو چلا آخر نیازِ عاشقی بھی بے نیاز
بیحساب و بیکراں جور و ستم ناگفتہ بہ

شکوۂ دل، اہلِ دل سے ہو تو کوئی بات ہے
شکوہ پیشِ بانیٔ جور و ستم ناگفتہ بہ

سوچئے تو آپکو احساس خود ہوجائیگا
ہے دلِ فرحتؔ کا عالم بیش و کم ناگفتہ بہ

فرحت کانپوری

ہر انسان میں مختلف قسم کے جذبے پائے جاتے ہیں جیسے خوف، شرم، خوشی، غصہ وغیرہ، من جملہ اور جذبوں کے چونچلا بھی ایک جذبہ ہے، گو ماہرین نفسیات نے اسکو تسلیم نہیں کیا، جذبہ میں کیا ہوتا ہے؟ انسان پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی ہے، اور وہ اپنی حرکات وسکنات، قول وفعل اور رفتار وگفتار سے اس کا اظہار کرتا ہے، بعینہٖ یہی حال چونچلے کا ہے، اس میں انسان پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی ہے، اور وہ مختلف طریقوں سے ان کا اظہار کرتا ہے۔ بھکاری جب کوڑے پر سے لکڑی کا ایک بے ڈھنگا سا بھدا ٹوٹا پھوٹا کھلونا گھر پر لے کر آتا ہے تو اُس کا بچہ اس بے ہنگم سے کو دیکھکر ایسا خوش ہوتا ہے گویا اُسکو ایک بیش بہا خزانہ مل گیا تو بھکاری بھی خوشی سے مست ہو کر ناچنے لگتا ہے، وہ کھلونا اُس کے ہاتھ سے چھینتا ہے، اُس کو ہاتھ میں لیکر نچاتا ہے، گھٹنوں کے بل جھک کر، لیٹ کر، بیٹھ کر ہنستا ہے، اور آپے سے باہر ہو جاتا ہے تو یہ ساری حرکات چونچلے میں داخل ہیں۔ چونچلا جب شاہی محل میں پروان چڑھتا ہے تو اُس کا اور ہی رنگ ہوتا ہے، ایک کمسن، معصوم، امارت اور سرمایہ داری کے نشے سے بے خبر بچے کے لئے ہزاروں قسم کے قیمتی سے قیمتی کھلونے خریدے جاتے ہیں، یہاں درباری اُمرا، مصاحب اور ندیم وہی حرکات کرتے ہیں جو بھکاری اپنے بچے کے سامنے کرتا ہے، فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ یہ حرکات خلوص ومحبت سے کرتا ہے اور یہاں ان پر تصنع، بناوٹ، خوشامد اور ریاکاری کا ملمع ہوتا ہے، چونچلا صرف افراد تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ جماعتوں پر بھی طاری ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ مذہبی ادارے تک اس سے محفوظ نہیں ہیں۔ بزرگانِ دین کے مزارات پر عرس کے سلسلہ میں جب قوالیاں ہوتی ہیں اور معتقدین جھومتے ہوئے اپنی جیبیں خالی کر دیتے ہیں تو یہ مذہبی چونچلا بن جاتا ہے۔ یہ چونچلا ہی ہے جو مذہبی رہنماؤں کو ہیرے جواہرات اور سونے چاندی میں تلواتا ہے۔ بہر حال چونچلا ایک فطری چیز ہے جو ہر انسان میں پایا جاتا ہے، البتہ دولت کے اعتبار سے اُسکے مدارج میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔

بیراگڈھ رقبہ میں کوئی بڑی ریاست نہ تھی، مگر ساحل سمندر کے قریب تھی اس وجہ سے دو ایک چھوٹے چھوٹے بندرگاہ بن گئے تھے، عموماً ساحلی ریاستوں پر محاصل درآمد وبرآمد کم رکھے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے کشتیوں، معمولی قسم کے جہازوں اور ادنی کمپنیوں کی بدولت بیرونی تجارت کی مقدار کافی بڑھ جاتی ہے، گو محصول بحساب پیمانہ یا بحساب قیمت بہت کم ہوتا ہے مگر مجموعی حیثیت سے اُسکی مقدار بڑھ جاتی ہے، اور اس طرح ریاست کی آمدنی میں بھی اچھا خاصہ اضافہ ہو جاتا ہے، مگر اس بڑھی ہوئی آمدنی کا بیشتر حصہ عوام کی فلاح وبہبود پر صرف ہونے کے بجائے اخراجات شاہی پر صرف ہوتا ہے۔

بیراگڈھ کی آمدنی بھی اس طرح بڑھ گئی تھی، ریاست کا بڑا رقبہ ریگستان تھا، اور بارش بہت کم ہوتی تھی، ریاست میں اکثر قحط پڑا کرتے تھے، جب خدا کے بنائے ہوئے انسان روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کو ترسا کرتے تھے، چھوٹے چھوٹے بچے بھوک کی شدت سے بلکا کرتے تھے، اور جن کی ماؤں کا دودھ خشک ہو چکا ہوتا تو وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دیا کرتے تھے، اُس وقت شاہی کتوں کے راتب میں کوئی کمی نہ ہوتی تھی، انکو برابر دودھ ڈبل روٹی، گھی، بکری کا اُبلا ہوا گوشت ملا کرتا تھا، جب کبھی سات روپے ماہانہ تنخواہ پانے والا غریب محافظ نگراں کی آنکھ بچا کر راتب میں سے کچھ چُرا لیتا تھا تو ایسا خوش ہوتا تھا کہ گویا اُسکو من وسلوی مل گیا۔ اور جب نگراں اُسکی یہ حرکت پکڑ لیتا تھا تو دو درجن پانی میں بھیگے ہوئے بید اس کے اس طرح مارے جاتے تھے کہ وہ دو ہفتہ تک صاحب فراش رہتا۔ اس کے علاوہ اسکو کوئی اور سزا نہ ملتی تھی البتہ غیر حاضری کی تنخواہ قواعد کے تحت وضع کی جاتی تھی۔

خداوند ــــ یہ وہ خطاب تھا جس سے مصاحب، ندیم اور امرا، اپنے آقائے ولی نعمت کو مخاطب کرنے کے عزت حاصل کرتے تھے ــــ کی شادی پاس ہی کی ہمسایہ ریاست میں ایک

معمولی جاگیردار کی صاحبزادی سے ہوئی۔ شادی میں جو جشن منائے گئے اُن کی تفصیل ناممکن ہے، البتہ جب بعد میں اخراجات کا بجٹ پیش ہوا تو معلوم ہوا کہ ساڑھے گیارہ لاکھ کے مصارف ہوئے، خداوند کی ایک "اونہہ" سے بجٹ پاس ہوگیا۔ آراستہ و پیراستہ محلات میں بیگمات کو اپنے شوہروں پر وہ حقوق حاصل نہیں ہوتے جو ایک غریب بیوی کو اپنے غریب شوہر پر ہوتے ہیں۔ اور یوں بھی کس طرح جب متعدد بیگمات اور سینکڑوں کنیزیں ہوں۔ آج ایک کنیز بیگم ہوجاتی ہے، نورجہاں، دل آرام کا خطاب پاتی ہے، کل وہی محل کی کسی تنگ و تاریک کوٹھری میں ڈال دی جاتی ہے، اگر عتاب خداوندی بڑھ جائے تو وہ ندیموں اور مصاحبوں کے حوالے کردی جاتی ہے، جو اپنے خداوند کے سامنے اس کو ذلیل کرنے کیلئے ہر اُس حرکت سے دریغ نہیں کرتے جس سے اُن کی عزت میں اضافہ ہو، دنیوی نشیب و فراز کی جتنی اچھی اور واضح تصویریں تھوڑے عرصہ میں محلات کے اندر دیکھی جاسکتی ہیں، اتنی دنیوی بساط پر نظر آنا مشکل ہیں۔

ابتدا میں نئی بیگم ہی سب کچھ تھیں، عرضی اور درخواست گذار اُن کا ذریعہ تلاش کرتے، سفارش کے لئے ان کا بہانہ ڈھونڈا جاتا، ملازمتوں کیلئے ان کا سہارا تلاش کیا جاتا، جس سے بیگم خوش ہوجاتیں اس پر دنیا کی ہر شے خود بخود قربان ہونے لگتی، اور جس سے بیگم آنکھیں پھیر لیتیں اُس پر ساری دُنیا کا عتاب نازل ہوجاتا۔ ایک دن مالن پھولوں کا زیور بنا کر لائی، بیگم صاحبہ کو پسند آیا، پاس ہی خداوند تشریف فرما تھے، مالن کی کارگذاری کی تعریف سُن کر رحم و کرم کے داتا نے ایک گاؤں جاگیر میں بخش دیا۔ مالن خداوند کے قدموں پر گر پڑی اور ہزاروں دعائیں دیتی چلی گئی۔ شہر میں کئی روز تک خداوند کی فیاضی، سخاوت اور رحمدلی کے چرچے رہے، ایک دن بیگم کے میکہ کی ایک کنیز کسی کام کے سلسلہ میں ریاست کے نائب دیوان کے پاس گئی، جو بہت ہی با اصول اور اپنے کام میں بڑے ہوشیار تھے، اُنھوں نے سارا معاملہ سُن کر کنیز کی مدد کرنے سے انکار کردیا۔ شدہ شدہ یہ خبر بیگم کے کانوں تک بھی پہونچ گئی، اور "بحکم خداوندی" تین روز کے اندر اندر ان کو حدود ریاست سے باہر نکل جانا پڑا۔ بیگم خوش تھیں، وہ اپنے آپکو دُنیا کی خوش قسمت عورت سمجھتی تھیں، وہ بالکل بھول چکی تھیں کہ عروج و زوال ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہیں،

دولت و امارت اور محبت و خلوص میں دور کا بھی رشتہ نہیں، وہ بےخبر تھیں کہ خوشی اور سکون محلوں سے بہت دور رہتے ہیں، یہ چیزیں مٹی کے جھونپڑوں، خس پوش ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں مل سکتی تھیں، مگر اونچی اونچی بلند اور عالیشان عمارتیں ان سے بالکل خالی ہیں۔ دن تیزی سے گذرتے رہے، اور چھ ماہ بعد وہ ایک معمولی بیگم رہ گئیں جہاں خداوند ہفتہ میں ایک مرتبہ تشریف لاتے تھے، وقت گذرتا رہا۔ ہفتہ سے مہینہ ہوا، اور مہینہ سے مہینوں ہونے لگے، آخر ایک دن ایک سنگین الزام لگا کر اُن کو ریاست سے چلے جانے کا حکم مِل گیا۔

مختصر سے ساز و سامان اور دو بچوں کو لیکر بیگم اپنے میکہ آگئیں، شاہی محل میں بیگم کے ساتھ رہی ہوئی لونڈیاں اور باندیاں اچھی طرح جانتی تھیں کہ بیگم نے تین سال میکہ میں کس طرح بسر کئے۔ آخر بڑی کوششوں اور دوڑ دھوپ کے بعد صیغہ سیاسیہ کے ذریعہ بیگم کا دو ہزار منصب مقرر ہوگیا۔ وقت بغیر کسی رو رعایت کے ہمیشہ گذرتا رہتا ہے، اور دُنیا کا بڑے سے بڑا حادثہ اور سانحہ وقت کیلئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا، سولہ سال اسی طرح گذر گئے، بیگم بوڑھی اور بچے جوان ہوگئے، ایک مرتبہ خداوند کو اُن کا خیال آیا اور دریافت حال فرمایا اور جب پریشانیوں اور تکالیف کا علم ہوا تو اُن کو واپسی کا حکم ہوا، بیگم خوش خوش پھر اپنے دارالخلافہ پہونچ گئیں، اگرچہ اب وہ اگلی سی ناز برداریاں نہ تھیں، مگر چونکہ وہ تکالیف کی عادی ہوچکی تھیں اس لئے اُنہیں یہی چیزیں غنیمت معلوم ہوئیں۔

اپنی بچی کو سولہ سال کے بعد دیکھا تو خداوند کو اُس سے بہت محبت ہوگئی، اس بچی نے جب ریاست چھوڑی تھی اسوقت دودھ پیتی تھی اور اب وہ شباب کی پہلی منزل پر قدم رکھ رہی تھی، خداوند کو اس سے بے انتہا محبت تھی، وہ بھرے دربار میں اس کو گود میں بٹھا لیتے اور مُنہ اور سر کو چوما کرتے تھے، لوگ اسکو چونچلا بتاتے تھے، بیگم خوش تھیں کہ اگر اب اُن کا نہیں تو اُن کی بیٹی کا تو راج ضرور رہے گا۔ مگر تاڑنے والے تاڑ رہے تھے کہ بعض وقت خداوند کی نظریں ان نظروں سے مختلف ہوتی ہیں جو ایک باپ اپنی چاہیتی بیٹی پر ڈالتا ہے، ایک دن خداوند کو نہ معلوم کیا خیال آیا کہ اُسکو اپنی بیٹی تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ تحقیقات ہوئی

(بقیہ صفحہ ۵۷ پر)

"احساسات"

مجھے تم سے کچھ کہنا ہے! مجھے پوچھنا بھی ہے! تم نے بہت ستایا ہے!!

یہ بھی تو ممکن تھا کہ تم مجھے بھلا دیتیں، پھر تم نے مجھے کیوں نہ بھلا دیا؟ تم نے میری بڑھتی ہوئی وابستگی کو آخر کیوں نہ روک دیا ——— جبکہ تم اسے روک سکتی تھیں ——— تم نے یہ کیوں نہ کہدیا کہ میرے خواب بھی اپنی تعبیر نہ پا سکیں گے ..... تم اتنا تو کہہ سکتی تھیں ..... تم اس سے بہت زیادہ کہہ سکتی تھیں ..... مگر خیر اتنا کہہ دینے میں تو تمہارا کچھ ہرج نہ تھا ——— اور میں اسے خود کیوں نہ سمجھ سکا؟ اس لئے کہ تم نے مجھے کبھی سمجھنے ہی نہ دیا! تم جان بوجھکر رشتۂ تعلق کو مضبوط تر بناتی رہیں! آخر کیوں؟

تم تقدیر کے دلچسپ کھیل سے بالکل واقف نہ تھیں؟ — اس دنیا میں کبھی اُن دو ٹکڑوں کو نہیں ملنے دیا جاتا کہ جنکی تخلیق ایک دوسرے سے ملنے ہی کے لئے کی گئی ہے ..... ہاں اُن دو ٹکڑوں کو اور زیادہ قریب کر دیا جاتا ہے جو ازل ہی سے ایک دوسرے سے غیر متعلق اور غیر مربوط ہوتے ہیں ——— اور وہ جو ایک ہی چیز کے دو حصّے ہیں ..... اُنہیں توڑ کر ایک دوسرے سے بہت دور پھینک دیا جاتا ہے! ——— اور اسی کھیل پر مشیت کا نظام قائم ہے ——— کیا تمہیں یہ معلوم نہ تھا! اور مشیت کبھی اپنے اس کھیل کو نہیں بدل سکتی وہ آخر اسے کیوں بدل دے ..... صرف اس لئے کہ ہمیں اور تمہیں ملجانا چاہیئے ——— اُس کی بلا سے، ہمارا کچھ بھی ہو! خدا کی خدائی اسی کھیل پر قائم ہے، وہ اپنے نظام کو ہماری خاطر نہیں بگاڑ سکتا، اُس میں اتنی اولوالعزمی نہیں ہے ..... عبد و معبود کا رشتہ صرف اسی وقت تک قائم ہے کہ جب تک تقدیر اس دلچسپ کھیل کو کامیابی کے ساتھ کھیل رہی ہے ..... جس دن یہ ختم ہو جائے گا خدا اور بندے کا امتیاز مِٹ جائے گا۔ ..... یہ کھیل تو یوں ہی کھیلا جائے گا ——— !!

تم بتا سکتی ہو ——— جب ریڈیو پر تمہارا پسندیدہ ریکارڈ بجنے لگتا ہے، یا جب اپنے کمرے میں پڑے پڑے میں تمہارے دل پسند اشعار گنگنانے لگتا ہوں ..... تو آخر کیوں میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگتے ہیں! تم بتا سکتی ہو کہ مجھے ایسا کیوں ہوتے لگتا ہے ..... اس درد میں ایک لطف ہے ..... اس ٹیس میں ایک سکون ہے ..... اور میں اسے کھو دینے کے لئے بالکل تیار نہیں ——— تم بتا سکتی ہو کہ اس کیفیت کا کیا نام ہے؟ میں اسے معلوم کر لینا چاہتا ہوں ——— !

میں تمہیں بھولنا چاہتا ہوں ..... تمہیں یاد رکھنے میں مجھے کوئی نفع نہیں، مگر جب کبھی میں تمہیں بھلانا چاہتا ہوں ..... اور بُری طرح مجھے یاد آنے لگتی ہو ..... خدا کے لئے اسکا کوئی علاج بتا دو -!

——— مگر یہ سب کچھ تو تمہارا اپنا لیا ہوا ہے ..... تم سے کس نے کہا تھا کہ تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ؟ ..... تم تو خود ہی چلی گئیں ..... میں نے تمہیں بہت روکا مگر تم نہ رُکیں ..... تم طے کر چکیں تھیں کہ تم چلی جاؤ گی اور تم چلی گئیں ——— شاید اسی لئے کہ تم مجھے کچھ سکھانا چاہتی تھیں ..... مگر تم نے مجھے کیا سکھایا ہے اور میں نے کیا سیکھا ہے یہ مجھے اب بھی نہ معلوم ہو سکا ..... تم واپس آؤ تو تمہیں سے پُوچھوں گا ..... خود آ کر نہیں ..... خط لکھ کر!!

اس میں تقدیر کا کچھ قصور نہیں ..... یہ سب تم نے اپنی مرضی سے کیا ہے ——— ہاں یہ کہہ سکتا ہوں کہ تم نے تقدیر کی مدد کی ہے ..... تم نے اس کے کھیل کو خود ہی کامیاب بنایا ہے ——— مجھے ستانے کے لئے، مجھے جلانے کے لئے، مجھے چڑھانے کے لئے ——— سچ بتانا ..... کیا تم ہی میری تقدیر ہو!؟-

راحت سعیدؔ

کھڑکی

ایک مزدور کے کمرے کا اندرونی حصہ۔ سامنے والی دیوار کے بیچ میں ایک کھڑکی ہے جس میں سے آسمان نظر آرہا ہے۔ سیدھے ہاتھ کو ایک دروازہ۔ چولھے کے آگے مزدور کی بیوی بیٹھی ہے۔ دو بچے آجو اور جیوتی کھڑکی کے پاس کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔

اجو:- وہ بادل دیکھ رہی ہو بہن جیوتی؟ (جیوتی خوشی سے تالیاں بجاتی ہے)
بڑا پیارا سفید گھوڑا ہے بالکل، سچ مچ کا گھوڑا۔

جیوتی:- مگر لنگڑا ہے تیز نہیں دوڑ سکتا۔

اجو:- لنگڑا نہیں، بڈھا ہے۔

جیوتی:- کیوں بھیا، دیکھو تو بھیا! وہ بادل تو ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے دادا کی ڈاڑھی دکھائی دیتی تھی.... بالکل سفید!

اجو:- دیکھو دیکھو! وہ چل رہا ہے۔ نہ جانے کہاں جا رہا ہے؟

جیوتی:- دیکھو! اونٹ معلوم ہوتا ہے۔ وہ دیکھو کوہان۔ مجھے تو اس پر کوئی سوار بھی دکھائی دے رہا ہے۔ وہ کہیں بہت دور جا رہا ہے۔

اجو:- اونٹ کیسے ہو سکتا ہے؟ ننھی ننھی گھنٹیوں کی آواز تو آہی نہیں رہی۔ سنائی دے رہی ہے کہیں تمہیں؟ مجھے سنائی نہیں دیتی کیونکہ گھنٹیاں تو ہیں ہی نہیں۔ دیکھو، دیکھو! کتنا لال ہوتا جا رہا ہے! کس قدر لال — جیسے چاچا کی آنکھیں، جب رات گئے وہ گھر آتے ہیں، مجھے تو لال بادل اچھے نہیں لگتے، تمہیں اچھے لگتے ہیں؟

جیوتی:- نہیں! بڑے برے ہوتے ہیں۔ جیسے کارخانوں کی دہکتی ہوئی بھٹیوں میں آگ! مجھے تو لال بادل سے نفرت ہے۔ یہ اس آگ کی طرح ہوتا ہے جس میں دادا کو جلایا تھا — جب رات کو انہیں آنکھیں بند کرکے نیند آئی تھی، اور سب کہہ رہے تھے کہ وہ مر گئے۔

اجو:- ہاں۔ لال بادل ایسا ہوتا ہے۔ جیسے.... جیسے کیا بہن؟ تمہیں یاد ہے جیوا؟ چاچا کا دوست — جس کا ہاتھ مشین میں آکر کچلا گیا تھا؟ تمہیں یاد ہے اس کا لٹکتا ہوا گوشت.... کیسا دکھائی دے رہا تھا؟ او....!

جیوتی:- (اس کے یاد آنے پر چیخ کر) او....! مجھے لال بادلوں سے نفرت ہے۔

اجو:- مگر مجھے سرخ گلاب پسند ہیں۔ چاچا کے کارخانے کا مالک روز صبح کو ایک سرخ گلاب اپنے کوٹ میں لگاتا ہے۔

مزدور کی بیوی:- بس اب ختم کرو بچو۔ بتی تو جلا لے جاکر اجو۔

اجو:- مگر ابھی تو اندھیرا نہیں ہوا ماں — آسمان تو جاگ رہا ہے۔

جیوتی:- مجھے تو کھڑکی بڑی پیاری لگتی ہے۔ کیوں اجو، تمہیں بھی اچھی لگتی ہے؟

اجو:- مجھے تو آسمان بہت پیارا لگتا ہے جب کھڑکی کھلی ہو۔

جیوتی:- جب کھڑکی بند ہوتی ہے تو مجھے ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے رات کو جھانکنے میں بڑا مزا آتا ہے۔ یہ رات کیا ہوتی ہے اجو؟

اجو:- لو! یہ تو سب بتا سکتے ہیں۔ تمہیں نہیں معلوم؟

جیوتی:- کیوں نہیں۔ مجھے تو معلوم ہے.... مگر تمہیں بھی معلوم ہے؟

اجو:- کیوں نہیں۔ مجھے بھی معلوم ہے۔ جب پرماتما سو جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں رات ہوگئی، جب وہ جاگتا ہے تو دن ہو جاتا ہے۔

جیوتی:- اجو! بادل دور چلا گیا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ بھی وہیں جا رہا ہے جہاں دادا چلے گئے! دادا بڑے اچھے تھے۔ کیسے اچھے اور پیارے تھے۔ ہمارے دادا! سدا دکھی رہتے تھے۔

اجو:- جیوتی تمہیں بھی کبھی دکھ ہوتا ہے؟

جیوتی:- بس جب کبھی ماں کو روتا دیکھتی ہوں۔ مگر جب کھڑکی میں سے آسمان مسکراتا ہے تو میں خوش ہو جاتی ہوں۔

اجو:- ماں، بتی میں جلاؤں گا۔ بکس کہاں ہے؟

مزدور کی بیوی:- لو یہ رہا۔ بس تیرہ دیا سلائیاں ہیں اس میں۔ بڑی ہوشیاری سے جلانا۔ جب بتی جلاؤ تو کھڑکی بند کر لینا۔ نہیں تو ہوا سے دیا سلائیاں بجھ جائیں گی۔

اجو:- نہیں ماں، تم دیکھنا کس ہوشیاری سے بتی جلاتا ہوں۔ پہلی ہی دیا سلائی میں جلاؤں گا۔ (دیا سلائی جلاتا ہے)

جیوتی:- ہو ہو!.... کیسا اچھا معلوم ہو رہا ہے! شعلہ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے آنکھ۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ کچھ ڈھونڈ رہا ہے۔

اجو:- اچھا اچھا جیوتی۔ ذرا چپکی رہو۔ (شعلہ بجھ جاتا ہے)

مزدور کی بیوی:- دیکھا ایک دیا سلائی خراب کی۔ میں نے پہلی ہی کہا تھا تم سے۔

اجو:- ماں: یہ غلطی میری نہیں ہے۔ جیوتی....

جیوتی۔ اجو! میں نے کچھ نہیں کیا۔ جھوٹ مت بولو۔

اجو۔ ہاں، ماں! پہلے تو کبھی دیا سلائیاں اتنی بری نہیں ہوتی تھیں۔

مزدور کی بیوی۔ دو سلائیاں جلا دیں۔ اب صرف گیارہ رہ گئیں۔ تیرہ تھیں پہلے۔

جیوتی۔ ماں! کارخانہ میں سب کہا کرتے ہیں کہ تیرہ منحوس ہوتا ہے۔

مزدور کی بیوی۔ (لڑکے کے ہاتھ سے بکس لیکر) میں خود جلاؤں گی۔ بھاگو یہاں سے، فتنے کہیں کے۔ اگر چاچا ابھی گھر آجائیں اور دیکھیں کہ اندھیرا پڑا ہے، تو کوسنے اور گالیاں دینے لگیں۔ بیچارے چاچا.... سارے دن انہوں نے اتنی سخت محنت کی ہوگی.... سارے دن... جیسے مشین.... جیسے مشین۔ (بچے کھڑکی کے پاس چلے جاتے ہیں) اتنے میں بتی جلاؤں تم کھڑکی بند کردو۔ (بچے کھڑکی بند کر دیتے ہیں۔)

اجو۔ جیوتی، تمہیں اندھیرے کا ڈر لگتا ہے؟

جیوتی۔ نہیں تو۔ تمہیں لگتا ہے؟

اجو۔ ارے نہیں۔ مجھے اندھیرے سے ڈر نہیں لگتا۔

جیوتی۔ ایک دفعہ میں نے سنا تھا چاچا کہہ رہے تھے ماں سے "مجھے تو دن کے اجالے سے ڈر لگتا ہے"۔ بھلا اجالے سے چاچا کیوں ڈرتے ہیں؟

اجو۔ دیکھتی نہیں ہو؟ دن بھر انہیں کام کرنا پڑتا ہے۔ ارے دیکھو دیکھو! تمہیں وہ بڑی سی پیلی روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ وہ ان پہاڑوں کے پیچھے؟ وہ؟ وہ؟

جیوتی۔ ہاں، وہ چاند ہے.... چاند.... مجھے چاند اچھا لگتا ہے۔ بھیا، مجھے چاند چاہیئے۔

اجو۔ تمہیں چاند نہیں مل سکتا۔

مزدور کی بیوی۔ (طاق میں دیئے کو رکھ کر بڑبڑاتی ہے) جیسے بھیڑ بکریوں کا گلا.... جسے کوئی نہیں پوچھتا.... جس کی کسی کو پروا نہ ہو.... ہم غریب مزدوروں کے کنبے۔ جاہل، بے آرام، بھوکے، گندے، چیتھڑے لگے ہوئے میلے کچیلے ہوئے... اندھیرے بلوں میں بستے ہیں، سہمے ہوئے، چلتے پھرتے مردے... پرچھائیاں... ان انسانوں کا ہم پر قبضہ ہے جن کے قبضے میں کچھ بھی نہیں۔ گندگی، ابتری، بیماری... شکست اور اور سڑاندی موت!.... بس یہی بڑبڑایا کرتا ہے میرا غریب پتی سوتے میں۔ (بکانے رینڈ منے پھر چولھے کے پاس چلی جاتی ہے)

اجو۔ (نکلتے ہوئے چاند کی طرف اشارہ کرتے) کتنا بڑا اور گول ہے! جیسے سونے کی بڑی سی تھالی۔

جیوتی۔ مجھے تو سونے کا سکہ معلوم ہوتا ہے۔ میرے پاس ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا! کتنی ساری چیزیں اس سے خرید لیتی!

اجو۔ بھلا کیا کیا خریدو گی؟

جیوتی۔ ارے بہت ساری مٹھائیاں بازار سے خرید لوں۔

اجو۔ اور میں ایک گیند خریدوں اور اوہ! کیا مزا آئے کہ کل دن بھر اس سے کھیلتے رہیں! کیوں بہن؟ میں جانوں چاند تو سچ مچ ایک گیند ہے۔ شاید پرماتما اس سے کھیلتا ہے۔

جیوتی۔ مجھے یہ کھڑکی پیاری لگتی ہے۔ کیسی کیسی عجب چیزیں ہمیں اس میں سے دکھائی دیتی ہیں ــ اس کھڑکی میں سے۔ آؤ اجو! ہم گائیں۔

اجو۔ اچھا کیا گائیں؟

جیوتی۔ کھڑکی کا کوئی گیت۔

اجو۔ ہاں گاؤ۔ پہلے تم شروع کرو۔

جیوتی۔ نہیں، تم شروع کرو۔

اجو۔ چلو ہم دونوں مل کر شروع کریں۔

(جیوتی اور اجو اپنا گیت گاتے ہیں۔)

کھڑکی کھڑکی، پیاری کھڑکی!
چندا ماموں جھانک رہے ہیں
ہم دونوں کو تاک رہے ہیں
کھل جائے تو بادل دیکھیں
بند ہو، شیشوں میں سے جھانکیں
جھوم رہے ہیں گھوم رہے ہیں
چندا ماموں چوم رہے ہیں!
تجھ سے گذر کر ہم تک آئیں
چندا ماموں ہم کو رجھائیں
کھڑکی کھڑکی، پیاری کھڑکی

(گیت ختم کرکے خوشی سے دونوں چیخیں مارتے ہیں اور ان چیخوں میں سارے محلے اور گلیوں کے بچوں کی چیخیں بھی شامل ہو جاتی ہیں۔)

مزدور کی بیوی۔ چلو بچو۔ رات سر پر آرہی ہے۔ روٹی کھا کر سو رہو۔

(ایک روٹی لیکر دونوں بچے کمرے کے ایک کونے میں جا دبکتے ہیں)

(ایک ہمسائی داخل ہوتی ہے۔)

ہمسائی۔ کیوں بہن! ہمیں رات بھر کے لئے ایک ہانڈی دے سکتی ہو؟ــ ہماری ٹوٹ گئی۔

مزدور کی بیوی۔ ضرور بہن۔ لو، یہ لو۔ اور ہاں اسے واپس کرنیکا خیال

نہ کرنا۔

ہمسائی۔ تم بڑی اچھی ہو بہن۔ ننھے نے ہماری ہانڈی توڑ دی۔

مزدور کی بیوی۔ آہ بہن، دیر سویر ہر چیز ٹوٹ جاتی ہے۔

ہمسائی۔ تمہارے پتی کیا آج رات کو دیر سے گھر آئیں گے؟

مزدور کی بیوی۔ میں ابھی تم سے پوچھنا چاہ رہی تھی کہ تمہارے پتی کام پر سے واپس آگئے یا نہیں؟

ہمسائی۔ نہیں۔ دیکھنا بہن وہ کہہ رہے تھے کہ آج سب اکٹھے ہوں گے۔ سب مزدور۔ میرا مطلب ہے، ہاں سارے مزدور ــــ کسی بات کا فیصلہ کرنے کے لئے۔ انہوں نے مجھے بتایا نہیں کس بات کا۔ میں گھر لوٹ آئی، روز کی طرح۔

مزدور کی بیوی۔ ہاں۔ یہ سب کے سب تھک گئے ہیں۔ میرا غریب پتی، مجھے کیسا دکھ ہوتا ہے کہ میں اس کی مدد نہیں کر سکتی۔ کچھ کام میں بھی کرتی جس طرح تم اور اور پڑوسیوں کی بیویاں محنت مزدوری کرتی ہیں ــــ مگر کروں گی میں بھی ــــ بس ذرا جی ٹھیک ہو جائے۔ دیکھو تو بہن! میرے پھیپھڑوں میں درد ہوتا ہے اور منہ سے خون آرہا ہے۔ مگر میں اب اس کی پروا نہیں کروں گی۔ شاید کام پر لگ جانے سے جی کچھ اچھا ہو جائے۔

ہمسائی۔ کام، کام، کام! سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس کا انجام کیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم دکھ جھیلنے کے لئے کیوں پیدا ہوئے تھے۔ ہم سرے سے پیدا ہی کیوں ہوئے! کچھ آرام کرنے کے لئے پیدا ہوئے اور باقی محنت کرنے اور رونے! ایسا کیوں؟

مزدور کی بیوی۔ مالک ہم سے کہتے ہیں کہ یہ تمہارے کرم ہیں، ایک طرح سے نصیب کا لکھا سمجھو ــــ پرماتما کی مرضی۔ ہاں، یہی ہم سے سدا کہا جاتا ہے۔

ہمسائی۔ اور ہم دن رات پرماتما کے گیت گاتے رہتے ہیں اور آس لگائے رہتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن وہ ہماری دعائیں سنے گا اور ہماری مدد کرے گا!

اجو۔ (چپکے سے) جیوتی، کل ہم ایک لمبی سی رسّی میں پتھر باندھ کر نیچے لٹکائیں گے۔

جیوتی۔ ہاں، ہاں! (اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔)

مزدور کی بیوی۔ ہاں پرماتما کی تعریفیں گاتے ہیں۔ اس وقت بھی جبکہ کمر ٹوٹ رہی ہو اور ہونٹوں پر پپڑیاں بندھ رہی ہوں اور ہڈیاں تھک کر چورا ہو رہی ہوں اور گوشت پیلا پڑ گیا ہو ــــ پرماتما کے گیت گاتے ہیں۔ جب آواز مر گئی ہو ــــ جب ہر چیز دم توڑ رہی ہو!

ہمسائی۔ مگر پرماتما جیتا ہے!

مزدور کی بیوی۔ سمجھ میں نہیں آتا۔

(اس کے بعد ہی پڑوس میں سے کسی بچے کے رونے کی آواز فضا کو چیرتی ہوئی آتی ہے۔)

ہمسائی۔ یہ میرے ننھے کے رونے کی آواز ہے۔ اس کے رونے سے کل رات تمہاری نیند تو بڑی بے چین ہوئی ہوگی؟

مزدور کی بیوی۔ اچھا! یہ تمہارا بچہ کل رو رہا تھا۔ میں نے جانا کہ دوسری پڑوسن کا بچہ ہے، وہ جسے کالی کھانسی ہو رہی ہے۔ تمہارے بچے کو کیا ہوا؟

ہمسائی۔ کوئی نئی بات نہیں۔ اس کے سارے بدن پر پھوڑے ہو گئے ہیں اور اس کے سانس میں ایسی بو آتی ہے جیسی کسی گندی نالی میں سے لیکن اس سب کچھ کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے ــــ یہ نصیب ہے.... اچھا بہن، اس ہانڈی کا شکریہ۔ (چلی جاتی ہے)

مزدور کی بیوی۔ اے پرماتما! کیا تو سچ مچ وہاں گہرے اندھیرے آسمان پر ہے! کیا تو سن سکتا ہے؟ اگر نہیں سن سکتا تو کیا تو بہرہ ہے؟ اور اگر سن سکتا ہے تو کیا تو گونگا ہے؟ اے پرماتما! تو کون ہے؟ پرماتما، پرماتما، پرماتما! تو کیا ہے؟ اگر واقعی موجود ہے تو کیا ہے؟

(مزدور داخل ہوتا ہے۔ نشہ میں ہے، تھک کر چورا ہو رہا ہے)

مزدور۔ عورت! کیا اب بھی تو پرماتما کو پکار رہی ہے؟ تھکی نہیں؟ کیا تو نہیں جانتی کہ وہ سنگدل ہے، بے رحم اور بے پروا ہے؟ تجھے نہیں معلوم کہ سننے کے لئے اس کے پاس وقت نہیں ہے ــــ ہماری سننے کے لئے پسینے میں نہانے والے بدنصیبوں کی۔ نہیں جانتی کہ اسے کارخانوں کے مالکوں نے خرید لیا ہے؟ مشین کے مالکوں نے؟ اپنا وقت کیوں ضائع کر رہی ہے؟ عورت! کیوں اپنے پھیپھڑوں کو ضائع کر رہی ہے؟ بھٹیوں کے دھوئیں، کارخانوں کی زہریلی ہوا اور اس کال کوٹھڑی نے جس میں ہم رہتے ہیں، کیا تیرے پھیپھڑوں کو کافی تکلیف نہیں پہونچائی ہے؟

بیوی۔ آج تم بہت رات گئے آئے؟

مزدور۔ بچے کہاں ہیں؟

بیوی۔ ابھی ابھی سوئے ہیں۔ ٹک ٹک لگا رکھی تھی بادلوں، چاند اور آسمان کی۔ اور اپنے دادا کی سفید ڈاڑھی کی ــــ کھڑکی کے پاس کھڑے باتیں مٹھار رہے تھے۔

مزدور۔ کھڑکی۔ سب بچے محبت کرتے ہیں، ہے نا؟ بدنصیب بچے! صرف یہی ایک خوشی انہیں میسّر ہے۔ آسمان اور اس پر بادل، چاند اور تارے۔

یہی اُن کے کھلونے ہیں — ہاں! یہ نتیجہ ہے مزدور کے گھر پیدا ہونے کا۔ پرماتما غارت ہو جائے۔ میں کہتا ہوں غارت ہو جائے پرماتما!! اور اگر میں کفر بک رہا ہوں تو پرماتما مجھے معاف کرے۔

بیوی: تھوڑی دیر ہوئی میری سہیلی پڑوسن ایک ہانڈی مانگنے آئی تھی۔ تم نے جو پچھلے ہفتے میلے میں سے دو ہانڈیاں لی تھیں اُن میں سے ایک میں نے اُسے دیدی ہے۔

مزدور: اچھا کیا۔ ان کی ہانڈی کیا ہوئی؟ ٹوٹ گئی شاید!

بیوی: ہاں۔ اور میں نے اس کو کہا تھا کہ دیر سویر ہر چیز ٹوٹ ہی جاتی ہے۔

مزدور: واہ واہ! واہ واہ! ہاں، کیونکہ — ہر چیز دیر سویر ٹوٹ جاتی ہے — ہم سب ٹوٹ جاتے ہیں — زندگی کے ہر لمحے ہمیں توڑ دیا جاتا ہے — میں غارت ہو جاؤں — تم غارت ہو جاؤ اور — ہم سب غارت ہو جائیں — مٹی کی ہانڈیں، سستی ہانڈیاں!

بیوی: کیا تم سیدھے کارخانہ سے اب واپس آ رہے ہو؟

مزدور: ہاں۔ راستے میں ایک جگہ رک گیا تھا۔ تم تو جانتی ہو۔

بیوی: مجھے تاڑی کی بو آ رہی ہے۔

مزدور: ہاں تم نے شاید سمجھ لیا ہوگا۔

بیوی: ہاں میں سمجھتی تو ہوں۔ مگر دیکھو تو، کوشش کی جا رہی ہے کہ مزدور تاڑی پینا چھوڑ دیں اور اس کی بجائے پرماتما کے گیت گائیں۔

مزدور: غریب آدمی کے لئے تاڑی کو چھوڑنا ایسا ہی ہے جیسے پرماتما کو چھوڑ دے۔ اور پرماتما کو چھوڑنا ایسا ہی جیسے تاڑی کو چھوڑ دے۔

بیوی: آؤ بھوجن کر لو۔

مزدور: مجھے آج بھوک نہیں لگ رہی — میں تھکا ہوا ہوں — اتنا تھکا ہوا کہ ایک نوالہ بھی نہیں کھا سکتا۔

بیوی: تم کچھ پریشان نظر آتے ہو۔

مزدور: ہاں ایک اڑتی اڑتی خبر سنی ہے۔

بیوی: کیسی خبر؟

مزدور: کہا جا رہا ہے کہ اب ہر چیز پر ٹیکس لگنے والا ہے۔

بیوی: قانون کون بناتا ہے؟

مزدور: جو قانون بناتے ہیں وہ ہمیں کبھی نہیں دکھائی دیتے۔ وہ بڑے مقدس اور قیمتی ہوتے ہیں۔ وہ اُن دیوتاؤں کی طرح ہیں جنہیں ہمیں کبھی نہیں دیکھنا چاہیئے۔ کیونکہ اگر ہم انہیں ایک دفعہ بھی دیکھ لیں تو پھر وہ دیوتا نہیں رہتے، اور ساری قلعی کھل جاتی ہے۔

بیوی: عجب قانون ہیں! کیا سارے قانون انسان ہی بناتے ہیں؟

مزدور: سب — ہاں — سب! مِل کے قانون، کارخانوں کے قانون، — زمین کے قانون۔

بیوی: کرم کا قانون بھی؟

مزدور: ہاں، عورت! کرم کا قانون بھی — سارے قانونوں سے زیادہ چالاکی اور ہوشیاری کا قانون! یہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہم اس لئے کچلے جاتے ہیں، توڑے جاتے ہیں اور بھوکے ہیں کہ ہم نے پہلے گناہ کئے ہیں۔ پرماتما انہیں غارت کرے! اور ہم ان کے آگے اپنا سر جھکا دیتے ہیں۔ اری عورت، تو کیا سوچ رہی ہے! اب ایک اور قانون بننے والا ہے۔ یہ خبر سنی ہے ہم نے آج شام کو۔ تیرے تو خیال میں بھی نہیں آ سکتا۔

بیوی: بتاؤ تو، بتاؤ تو۔

مزدور: بھیانک، ذلیل اور سفاک — میرے غریب بچے!

بیوی: تمہارے کہنے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ وہ ہمارے بچوں کو ہم سے چھین لے جائیں گے؟

مزدور: عورت، اس کی تو ان میں ہمت بھی نہیں ہے، جب تک میں یہاں ہوں، جب تک خون کا ایک قطرہ بھی زندہ ہے اور ان زہر خوردہ رگوں میں دوڑ رہا ہے!

بیوی: تو پھر اور کیا ہے؟

مزدور: میں تمہیں بھی نہیں بتا سکتا۔ نہیں بتا ابھی نہیں چاہیئے۔ نہیں، میں نہیں بتاؤنگا۔ اچھا، اچھا۔ انہیں کوشش کر لینے دو۔ وہ اپنی سی کر کے دیکھ لیں۔ دیر سویر ہر چیز ٹوٹ جاتی ہے۔ (پاگلوں کی طرح ہنستا ہے) عورت! تو ٹھیک کہتی ہے!

پڑوسی: (ایک مزدور پڑوسی یکایک داخل ہوتا ہے) پڑوسی! وہ سچ ہے — افواہ سچی ہے۔ وہ آ پہونچا (یکایک چلا جاتا ہے)

مزدور: وہ ہمارے پیچھے پڑے ہیں کہ ہمیں کچل ڈالیں، زخمی کر دیں، ساری عمر کیلئے اپاہج کر دیں۔ کم تعداد، کم تعداد غاصب! جنہوں نے ہمارے ہاتھ پاؤں پن گاڑی کے پہیوں سے باندھ رکھے ہیں۔ گھوڑوں کی طرح مار مار کر ہنکاتے ہیں، جنہوں نے ہمیں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا رکھی ہیں، جنہیں یہ دیکھنے کی امید ہے کہ ہماری آنیوالی نسلیں ماں کے پیٹ ہی سے زنجیروں میں جکڑی پیدا ہونگی۔ وہ ہمیں گونگے عوام کہتے ہیں۔ ہم اب بھی انہیں بتا دینگے۔ گونگے عوام! ذرا انہیں ہماری تاریک بے نور کوٹھڑیوں اور تہ خانوں میں آنے دو۔ انہیں معلوم ہو جائیگا کہ عوام کوئی گونگی، اندھی حیوانی قوت نہیں ہے کہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے اُسے استعمال کریں۔ انہیں معلوم ہو جائیگا کہ عوام میں مرد، عورت اور بچے شامل ہیں۔ جن میں سے ہر ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے، بے مثل اور شاندار! ہر ایک میں ایک دل دھڑک رہا ہے جو طبلِ جنگ کی طرح گونج رہا ہے اور تیار ہے کہ آخری فتح کا نقارہ بجا دے۔

بیوی: میرے غریب تھکے ہوئے ساتھی! میں سمجھ گئی۔ میں سمجھ گئی۔

مزدور: مزدور غریب! وہ ڈر سکتا ہے، ہنس سکتا ہے، خواب دیکھ سکتا ہے، تکلیفیں جھیل سکتا ہے۔ ہاں محبت کرسکتا ہے، ان سب کو بھی۔ ہم عوام! ہاں۔ دیر سویر یہ بھی لوٹ جائیں گے، عورت! جیسے پانی، سمندر کا دھاڑتا ہوا پانی۔ ہم انہیں اسکی سزا دینگے — کل انہیں خوب معلوم ہوجائیگا کہ ہم خوب جاگ رہے ہیں، طویل موت سے یکایک جاگ اٹھے ہیں اور ایسے جاگے ہیں کہ پھر نہیں سوسکتے۔ عورت! آخرکار ہمیں ظالم کے ظلم کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ اس نے ہمیں ہماری نیند سے جگا دیا ہے۔ اب ہم وہ غلام نہیں رہینگے جو بیتوں سے بندھے رہتے ہیں، جن کے جسم ورُوح آج ان بھاری مشینوں سے کچل دئے گئے ہیں جو مٹھی بھر آدمیوں کی ملکیت ہیں۔ ہم اٹھیں گے اور مار دینگے اور مالک بن جائیں گے۔ اور پھر! فرصت! آرام! — مشینیں، کروڑوں کی فرمانبردار ہوجائیں گی۔ ٹھیک ہے — ہم قیدیوں کی طرح پڑے نہیں رہیں گے۔ کیا! امید؟ آزادی؟ ہمارے لئے، ہم تک کیلئے؟ بے بس، کچلے ہوئے جانور! زرد، غلام، تھکے ماندے مزدور؟ بھوک! کیا تو دھواں تھی کہ اتنی جلدی اڑ گئی؟ اور تو، اے مشقت! کیا تو ایک بھیانک خواب تھا جو ختم ہوگیا؟ کیا یہ ممکن ہے؟ کیا؟ کیا کہہ رہا ہوں میں؟ عورت! کیا میں پاگل ہوگیا ہوں؟ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ کیا ہمیں بھوک، غلامی اور بیماری سے چھٹکارا مل جائے گا؟

بیوی: ہاں میرے غریب تھکے ہوئے پتی۔ ہمارے لئے اچھا زمانہ جلد آنیوالا ہے۔

مزدور: نہیں... ابھی بہت دور ہے — اور — ہم تھک چکے ہیں۔

(ایک آدمی کولتار کی بالٹی ہاتھ میں لٹکائے داخل ہوتا ہے۔)

بالٹی والا: افسوس ہے کہ اتنی رات گئے میں آیا ہوں۔ اور وہ کھڑکی کہاں ہے؟

بیوی: اسے یہاں کیا چاہیئے، اور یہ ہے کون؟

مزدور: وہ افواہ سچ ثابت ہوئی، وہ ہے سامنے دیکھو — کیسی اچھی کھڑکی ہے اسلئے بھی کہ جب تم اپنی زندگی سے عاجز آجاؤ تو اس میں سے باہر کود پڑو۔

بالٹی والا: (کھڑکی کے سب شیشوں پر کولتار پھیرنا شروع کرتا ہے) گناہ کی طرح سیاہ۔ گناہ کی طرح سیاہ۔ کولتار کا رنگ ہے — اور میں تو صرف اپنا فرض ادا کررہا ہوں۔ بس۔

بیوی: کیا یہ پاگل ہے؟ یہ کیا کر رہا ہے؟

مزدور: کھڑکی پر کولتار پھیر رہا ہے اور ان ٹوٹے ہوئے شیشوں پر بھی جو اس میں باقی رہ گئے ہیں۔ مٹھی بھر آدمیوں نے ایک نیا قانون بنایا ہے۔ اب وہ روشنی پر ٹیکس لگا رہے ہیں۔

بیوی: روشنی پر ٹیکس لگا رہے ہیں؟ اور کیا روشنی اب ہمارے گھروں میں کبھی نہیں آئے گی؟

بالٹی والا: بس ختم ہوئی — جب تک تم اس کی قیمت ادا نہ کردو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ایک پیمانہ مقرر کردیا گیا ہے جسکے مطابق تم اپنی دن بھر کی روشنی خرید سکتے ہو۔ اچھا، تمہارا شکریہ، شب بخیر — بلکہ صباح بالخیر۔

(اپنی بالٹی اور برش لئے باہر چلا جاتا ہے۔)

مزدور: یہ آخری چھاپہ مارا ہے دن کی روشنی پر۔

بیوی: اب اسکے بعد وہ ہر چیز پر ٹیکس لگائینگے۔ ہماری آنکھوں پر، ہمارے بچوں کی آنکھوں پر، شاید ہمارے لبوں پر بھی مُہریں لگادینگے۔ بلکہ ہمارے خوابوں اور کانوں پر بھی ٹیکس لگادیں گے۔ ہماری چیخوں اور ہمارے قہقہوں پر بھی۔ ہر چیز پر وہ ٹیکس لگادینگے!

مزدور: لیکن ہمارے پرماتما کے گیتوں اور دعاؤں پر ٹیکس نہیں لگائیں گے۔ کیونکہ یہ تو ہمیں آزادی سے اُس پرماتما کی خدمت میں بھیجنی ہیں جو وہاں ہے۔ (آسمان کی طرف غصہ سے گھونسا تانتا ہے) جو ہر چیز کو دیکھتا ہے، سب کچھ اور پھر بھی — ایک لفظ تک نہیں کہتا۔ یہ ہے ہمارا پرماتما جسے زمینوں اور مشینوں کے توندل مالکوں نے بالکل خرید لیا ہے۔ اے عورت! وہ تو شاید تیرے جسم پر بھی ٹیکس لگادینگے اور پھر ہر دفعہ جب میں تجھ سے محبت کروں گا، مجھے ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔

بیوی: اسے ظالم، ظالم نصیب! کیا یہ سب سچ ہے؟

مزدور: بالکل سچ — اور پھر بھی سب کچھ ایک بہت بڑا جہنمی جھوٹ دکھائی دیتا ہے۔ وہ سب کے سب جھوٹے ہیں۔ (شہر میں سے سات بجنے کی آواز آتی ہے۔)

بیوی: یہ کیا بج رہا ہے؟ ارے! سات بج گئے! اور بتی بجھ گئی! اے پرماتما! کتنا اندھیرا، کتنا اندھیرا چھا یا ہوا ہے ہر چیز پر!

مزدور: اندھیرا جیسا تہ خانے میں ہوتا ہے۔ اندھیرا جیسے اندھے کی آنکھ، سیاہ جیسے جھلسی ہوئی لاش، کوئلے کی رنگت! پڑوس والو! پڑوس والو!! (پاگلوں کی طرح چیختا ہے۔)

اجو اور جیونی: (اندھیرے میں جاگ کر) ماں! چاچا! ہم کہاں ہیں؟

(سارے پڑوس کی کوٹھڑیوں میں سٹر پٹر کی آوازیں سنائی دیتی ہیں)

مزدور: اور باہر صبح انتظار کررہی ہوگی، راہ تک رہی ہوگی اور تعجب کررہی ہوگی کہ ہم سب کو کیا ہوگیا! روشنی! روشنی! عورت، تو ٹھیک کہہ رہی تھی! دیر سویر ہر چیز لوٹ جاتی ہے۔ روشنی! روشنی! روشنی! (کھڑکی کے شیشے توڑ ڈالتا ہے.... چاروں طرف سے شیشوں کے ٹوٹنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔) یہ ہماری طرف ان کو چیلنج ہے! روشنی! روشنی! مزدور کے گھر میں.... ہمیشہ کے لئے!

(خوشنما گلابی روشنی اندر آتی ہے اور اپنے ساتھ مزدوروں کیلئے ایک نئی اور شاندار زندگی لاتی ہے۔)

(ہرندر ناتھ چٹوپادھیا)

مترجمہ: شاہد

(ادبی دنیا)

لگاؤ

شام ہو رہی تھی اور ابھی دو کوس اور جانا تھا۔ دیہات کا راستہ، برسات کا زمانہ۔ ایک ایک قدم پہاڑ ہو رہا تھا۔ بہرحال جانا تھا اسی لئے قدم اُٹھتے چلے جا رہے تھے، لمحہ لمحہ تاریکی بڑھتی جاتی تھی۔ گمر بادل گھرے ہوئے تھے۔ ابھی ابھی اسٹیشن پر بارش کی وجہ سے آدھ گھنٹہ رُکنا پڑا تھا اور اب پھر یہی آثار نظر آتے ہیں، اب کہیں برسا تو خدا ہی حافظ ہے جان و مال کا ــــــ دیہات کی رشتہ داری بھی بڑی بلا ہوتی ہے۔ وہ دل ہی کڑھتا جلتا۔ کھولتا اور کوستا جلد قدم اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر خدا غارت کرے اِن جوار اور باجرے کے کھیتوں کو جو تمام جگہ گھیرے اور راستے کو چھپائے کھڑے ہیں۔ اگر فرصت ہوتی تو وہ راستے سے ایک ایک پیڑ کو اُکھاڑ کر پھینک دیتا جھکتے جھکتے اور بچتے بچتے اُس کی بُری گت ہو گئی۔ آنکھ ناک، مُنہ سر پیر ہر عضو بھیگی اور سرسراتی ہوئی پتیوں سے چھل رہے تھے۔ ہر کھیت سے شیں شیں کی سامعہ خراش آوازیں آ رہی تھیں، وہ چڑ چڑا رہا تھا۔ اب اِدھر آنے والے پر لعنت۔ باز آیا ایسی رشتہ داری سے۔ دُنیا کے اُس سرے پر تو گھر ہے۔ بھلا کوئی کس طرح صحیح سلامت پہنچ سکتا ہے ــــــ بادل گھڑگھڑانے لگے۔ بجلی چمکنے لگی۔ اب اُسے راستہ دکھائی دے جاتا مگر یہ اور زیادہ پریشان کُن تھا۔ بجلی چمکنے کے بعد اور زیادہ اندھیرا چھا جاتا۔ آنکھ بالکل چوندھیا جاتی۔ وہ رہ رہ کر اپنی حماقت پر دانت پیس رہا تھا۔ برسات کے زمانہ میں وہ چلا ہی کیوں؟ جانتا نہیں تھا کہ بارش میں دیہات کا سفر ہفت خواں سے کم نہیں ہوتا ــــــ تھکا ماندہ بھوک سے پریشان وہ غلط راستہ پر چلا جا رہا تھا۔ ایک مرتبہ خود بھی کھٹکا کہ یہ غلط راستہ نہ ہو مگر کہیں نہ کہیں تو پہنچ ہی جائیں گے۔ اِس طرح مارے مارے پھرنے سے تو اچھا ہی ہے!!.......ایک جھٹکے کے ساتھ وہ رُک گیا "کمبخت اٹیچی کو بھی اِسی وقت مرنا تھا!" اس کی اٹیچی جوار کے پیڑ سے اُلجھ گئی تھی۔ اُس کا بوجھ اب اُسے سخت گراں گذر رہا تھا۔ "نہ معلوم کیا سنک سوار تھی کہ اٹیچی لے کر چلا۔ میں تو خالی ہاتھ آ رہا تھا مگر اماں نے کہا نہیں اٹیچی میں دو تین جوڑے کپڑے رکھ لو شاید تین چار روز رُکنا پڑے۔ وہ بیچاری کیا جانیں کہ ایسے سفر میں تولیہ کا بوجھ بھی ناگوار گذرنے لگتا ہے!" کھیتوں کو چیرتا۔ بڑبڑاتا اٹیچی کو غصہ میں مسلسل جھٹکے دیتا، کیچڑ میں چپ چپ کرتا چلا جا رہا تھا۔ اُس کا جوتا گیلی مٹی میں سوندکر وزنی ہو گیا تھا۔ بادل کی گرج بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ ہوا ذرا تیز ہو گئی تھی۔ اندھیری رات سائیں سائیں کر رہی تھی، ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگیں۔ "اب خیریت نہیں۔ آخر یہ پانی کا کون سا وقت ہے۔ ابھی ابھی تو برس چکا ہے، خوب چیز ہیں اللہ میاں بھی!" ہوا کے ایک تیز جھونکے نے اُس کے سامنے سے شاخیں ہٹا دیں۔ تھوڑی دور پر روشنی جھلملا رہی تھی۔ کوئی گاؤں قریب ہے۔ وہ تیز چلنے لگا۔ تھوڑی دیر میں آم کے باغ میں پہنچ گیا۔ آم زمین پر بچھے ہوئے تھے۔ وہ پھسلنے کے ڈرنے سے نہایت سنبھل سنبھل کر اور احتیاط سے قدم رکھنے لگا۔ بوندیں پتوں کے درمیان سے رس رس کر گر رہی تھیں۔ اب گاؤں بالکل پاس ہی تھا۔ سامنے ایک بڑا سا مکان تھا جہاں لالٹین مدھم مدھم جل رہی تھی اور برآمدہ میں چارپائی پر دو تین آدمی بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور حقہ پی رہے تھے۔ کتّوں نے بھونکنا شروع کیا۔

"بیچارے کتے ــــــ دیہاتی کتے۔ ہاتھ میں بکس دیکھ کر سوچ رہے ہوں گے کہ میاں کا اسباب چُرا کر بھاگ رہا ہوں!" چند قدم کے فاصلے پر مکان اور رہ گیا تھا۔ قدم کی چاپ سُنکر ایک صاحب نے پکارا "کون؟ ــــــ"

"میں ــــــ" وہ گرتے گرتے بچا ایک کھونٹے سے ٹھوکر کھا گیا تھا۔ "گنوار ہوتے ہیں گنوار، دروازے کے سامنے ہی کھونٹے بیل باندھیں گے چاہے کسی کا سر ٹوٹے یا کسی کی ٹانگ" اُس نے دل میں کہا۔

"آداب عرض ہے!"

آداب عرض ہے!"

"کہاں سے آ رہے ہیں آپ؟" نہایت نرم اور شائستہ

ہجوم میں ایک نوجوان شخص نے پوچھا۔

"اسٹیشن سے۔"

"کسی کام سے گئے ہوئے تھے کیا؟"

"انجن دیکھنے گیا تھا۔ ایک رات کیواسطے پناہ دے سکتے ہیں؟"

"تشریف رکھئے" وہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ "آرام سے بیٹھئے۔ شیروانی وغیرہ اُتار دیجئے، مجھے دیجئے میں ٹانگ دوں۔ عیدو کھانا لاؤ...... انڈے تلوالینا۔" نوجوان بھی پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ "تو آپ اس آندھی پانی میں کس عزم سے نکلے ہیں؟"

"بغاوت کرنے۔"

"اشتراکی ——؟"

"جی ہاں" اس نے جیب سے سگرٹ نکالی۔ جلایا اور لیٹ کر لمبے لمبے کش لینے لگا۔

"آپ یہاں کے زمیندار ہیں؟" اب اُس کے لہجے سے تلخی زائل ہو چکی تھی۔

"زمیندار کا لڑکا ہوں۔ بی۔ اے میں ہوں چھٹیوں میں گھر آیا ہوں۔ ذکی مجھے کہتے ہیں۔"

"جمیل میرا نام ہے۔ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد حق رشتہ داری ادا کرنے آیا ہوں۔" اُس نے بھی اُسی بحر میں کہا۔

دونوں ہنس پڑے۔ یہ اندازِ تعارف ہی اس قسم کا تھا۔

کھانا آیا جمیل نے سیر ہو کر کھایا۔ اُس کے بعد آم پر جم گیا۔ فارغ ہونے کے بعد اُس نے پھر سگرٹ جلائی اور برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر کے واسطے وہ گھر بار رشتہ دار سفر کی صعوبتیں ہر چیز کو بھول گیا، وہ ٹہلتا رہا ٹہلتا رہا۔ یہاں تک کہ تھک کر چارپائی پر دراز ہو گیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا مزے لیتی ہوئی چل رہی تھی، ہلکی ہلکی بوندیں خواب آور انداز میں گر رہی تھیں۔ جمیل پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی مویشی نیند بھری آواز میں اپنے وجود کا ثبوت دے دیتے تھے۔

"سو رہے ہیں کیا؟" ذکی اندر سے تھالی میں پان لئے ہوئے آیا۔

"ہاں" دھیمی سی آواز نکلی اور پھر رات کے مخمور لمحات میں ڈوب گئی۔

"پان نہ کھائیے گا؟" ذکی نے پھر پوچھا۔

"نہیں" مگر جمیل کو فوراً ہی ایک مبہم سا خیال آیا کہ وہ کھانے کے بعد پان کھانے کا عادی ہے" ہو گا مگر اس وقت سونا چاہیئے"

نیند نے چپکے سے اُس کے تمام اعضا کو تھپکتے ہوئے کہا۔

"کھا لیجئے پھر سویئے گا۔"

اب وہ چونک پڑا۔ "کھا ہی لوں" اس نے سوچا "اچھا لایئے آپ کہتے ہیں تو یہی سہی" اُس نے وہ بیڑے پان کے منہ میں رکھ لئے۔

"اور سگرٹ؟" ذکی نے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

برسات میں چارپائی پر لیٹے لیٹے سگرٹ پینے میں بڑا لطف آتا ہے۔

"یہ بھی سہی مگر نیند اُڑ جائے گی۔"

"نیند تو اُڑ ہی گئی ہے" اُس نے ایسا محسوس کیا کہ واقعی سچی نیند اُڑ گئی۔ وہ اُٹھ بیٹھا۔

"تو آیئے اب کھل کر باتیں ہوں۔"

"ہاں تو آپ اشتراکی خیالات کے حامی ہیں" ذکی نے پھر وہی اگلی گفتگو چھیڑی۔

"ہاں"

پانی ذرا تیز ہو گیا تھا۔ بوچھاڑ کے ننھے ننھے قطرے چارپائی پر بھی آجاتے تھے۔ تمام گاؤں پر ایک پُراسرار سناٹا —— ایک طلسمی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مکانات دھندلے دھندلے سائے کی طرح نظر آرہے تھے۔ باغ سے کبھی کبھی پی پیہو۔ پی پیہو کی آواز آجاتی تھی۔ مدھم سی روشنی میں یہ دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ دور کسی غیر آباد اور خاموش جگہ پر تخیل حقیقتوں سے گریز کرکے اُن کو دیکھ رہا ہے۔

"تو آپ نے کچھ جواب نہیں دیا۔"

پی پیہو...... پی پیہو...... پی پیہو۔

"بھئی بات یہ ہے کہ ایسے خشک موضوع پر بحث کرنے کیلئے اس وقت طبیعت موزوں نہیں ہے۔"

"یہ!" ذکی نے زور دیتے ہوئے فاتحانہ انداز میں کہا "تعجب ہے آپ اس موضوع کو جس پر ساری دُنیا کی بہبودی کا انحصار ہے جس میں زندگی کی مسرتیں مضمر ہیں جس سے انسانیت آسودگی اور نجات حاصل کر سکتی ہے خشک کہتے ہیں۔"

جمیل اپنے قائم کردہ نظریے کی توہین نہ برداشت کر سکا۔ تن کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا "بیشک زندگی کی کثافتوں اور غلاظتوں کو دور کرنے والا مسئلہ خشک نہیں تو اور کیا ہو گا۔ مگر اس سے

مسئلہ کی دقعت کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھ ہی جاتی ہے؟"

"جی! زندگی کو لطافت اور پاکیزگی عطا کرنے والا مسئلہ بیک خشک ہوگا، ورانسی قابل کہ اس میں کوئی دلچسپی نہ لے!" ذکی نے طنز سے کہا۔

"ہاں ہوگا۔ چند آدمیوں کی ذہنی خشکیاں اکثریت کو لطافت عطا کرتی ہیں!"

"آپ حد سے زیادہ شاعرانہ رنگ میں ہیں" ذکی نے مسکراتے ہوئے کہا "میرے دوست میں یہی دیکھنا چاہتا تھا اور یہی ہوتا! خیالات ماحول کے پابند ہیں۔ اس وقت جبکہ ساون کی رات معہ اپنی تمام دلکشی اور راختلاجی کیفیتوں کے چھائی ہوئی ہے۔ تم سے اسی قسم کے جملوں کی توقع ہوسکتی ہے۔ نہیں نہیں کوئی بھی ہو۔ کارل مارکس ہو یا لینن۔ اُس کے دل کے گوشے میں بھی ان مواقع پر کبھی کبھی میٹھا میٹھا درد ضرور اُٹھ جاتا ہوگا۔ اُن کے کانوں میں بھی غریبوں کی فریاد کی جگہ ٹھنڈی ہوا ضرور کوئی نہ کوئی پیغام کہہ دیتی ہوگی۔ تمہاری طبیعت اس وقت اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ یہی تو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ تم اگر یہاں سے ابھی اٹھا کر تنگ و تاریک ماحول میں پھینک دئے جاؤ تو ساری شعریت بھول جاؤ۔ تو میرے دوست دراصل نہ شعریت کوئی چیز ہے نہ رومانیت اور نہ ان دونوں میں باہمی کشید گی کوئی معنی رکھتی ہے، نہ قرار کوئی وقعت رکھتا ہے نہ پیکار یہ صرف ماحول کا کرشمہ ہے۔ صرف ماحول کا۔ انتہا پسند کبھی نہ ہونا چاہیئے اور نہ کوئی ہوسکتا ہے۔ جو ایسا سمجھتا ہے وہ محض اپنے کو فریب دے رہا ہے!"

جمیل دم بخود سُن رہا تھا۔ اُس کے تمام خیالات صرف ذکی تک محدود ہوکر رہ گئے تھے، بارش تیز ہوگئی تھی۔ دری بھیگ رہی تھی۔ دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ذکی نے چارپائی کو اور اندر کھینچ لیا، ہوا کے جھونکے دمبدم رات کی تمام سنیاں سمیٹے ہوئے جمیل اور ذکی کے چہروں سے ٹکرا رہے تھے۔

"اب سونا چاہیئے" ذکی نے کہا۔

جمیل کو پھر نیند آنے لگی۔ وہ چارپائی پر لیٹ گیا۔ اُس نے لیٹے لیٹے سامنے دیکھا —— دور تک اندھیرا تھا۔ گھپ اندھیرا۔ رات گہری سانسیں لے رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں تاریکی میں کسی پُراسرار شئے کو ڈھونڈنے لگیں —— کیا چھپا ہوا ہے اندھیرے میں۔ دُور —— دُور۔ وہاں کیا ہے —— وہاں کیا ہے؟ اُسکی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

پی پیہو...... پی پیہو...... پی پیہو......!

پپیہے کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی۔ وہ کہیں دُور، دُور چلا گیا تھا۔ اندھیرے میں نہ معلوم کہاں وہ سوگیا۔ صبح دن چڑھے اُٹھا۔ اٹیچی کھولکر رات کے میلے کپڑے بدلے۔ ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے اجازت چاہی۔ ذکی نے بہت روکا مگر وہ نہ رُکا۔ صرف رسمی طور پر اور آن قائم رکھنے کے لئے اُس نے انکار کردیا۔ ورنہ اُس کا دل خود ایک آدھ دن اور رُک جانے کو چاہتا تھا۔ اگر ذکی ایک مرتبہ اور روکتا تو وہ یقیناً رُک جاتا۔ ذکی نے ایک آدمی ساتھ کردیا تاکہ گاؤں تک پہنچا آئے ——

جمیل سر جھکائے چلا جا رہا تھا...... اُس کے قدم بھاری پڑ رہے تھے گویا وہ اس عارضی لگاؤ کو کچل رہے ہیں...... وہ رشتہ دار کے یہاں جا رہا تھا......

مجتبیٰ حسین!

بارگاہِ جمال میں

(التجائے محبت)

اے خندۂ بہار بیاباں کو چھوڑ دے
اے حُسن ایک کشتۂ حرماں کو چھوڑ دے

اے غنچۂ بہار، خزاں کی ہوس نہ کر
اے ماہتاب رات کے داماں کو چھوڑ دے

اے خلد آرزوئے جہنم ہے کس لئے
اے سبزہ زار خارِ مغیلاں کو چھوڑ دے

دل سے بھلا دے یاد کسی نامراد کی
گر ہوسکے تو عشق کے ارماں کو چھوڑ دے

صفیہ شمیم۔ ملیح آبادی!

جاپانی ڈرامہ:-

منظر چہارم

اس منظر میں بیگم دوسرا خواب دیکھتی ہے۔ اسٹیج منظر دوم جیسا۔ پردہ آہستہ آہستہ اُٹھتا ہے۔ شمع کی روشنی جسکے پیچھے موت براجمان ہے آہستہ آہستہ غائب ہوجاتی ہے۔ دو لڑکے پانچ سال اور تین سال کی عمر کے فرش پر کھیل رہے ہیں۔ انکے قریب ایک پنگھورے میں ان کا ننھا بھائی سو رہا ہے۔ بیگم کام کاج میں مشغول ہے۔

بیگم:۔ (کام کاج سے فارغ ہو کر بچوں سے) آؤ بیٹو میں کام ختم کر چکی۔ (بچے دوڑتے ہوئے آتے ہیں، ماں دونوں کو آغوش میں لیکر پیار کرتی ہے) تمہارے بوسے کتنے شیریں ہیں۔ (دونوں کے منہ پر مٹھائی کے ذرے لگے دیکھکر تولیے سے پونچھتے ہوئے) واہ بھئی واہ مٹھائی ایسے کھائی جاتی ہے کہ سارے منہ پر لیپ دی؟ اچھا اب منے کی باری ہے۔ تم جاؤ کھیلو!

(شیر خوار بچے کیلئے دودھ تیار کرتی ہے)

بڑا بچہ:۔ امی ابا ابھی نہیں آئے؟

بیگم:۔ بیٹا آتے ہی ہونگے تم اُن کے آنے تک گرتینی سے کھیلو باہر نہ جانا آج بہت سردی ہے۔ (خادمہ کو پکارتے ہوئے) گرتینی؟

(سیاہ لباس والا شخص گرتینی کو لئے داخل ہوتا ہے)

گرتینی:۔ ہاں بیگم!

بیگم:۔ بچوں کو لے جاؤ۔

گرتینی:۔ بہت اچھا۔ اچھا بچو آؤ باغ میں کھیلیں!

(دونوں بچے اسکے ساتھ جاتے ہیں)

بیگم:۔ (شیر خوار بچے کو دودھ پلاتے ہوئے محبت آمیز لہجے میں) میٹھا ہے نا؟ (بچہ ماں کی طرف دیکھتے ہوئے غوں غوں کرتا ہے، ماں آنکھوں کا پیار لیکر گدگداتے ہوئے) غوں غوں غوں غوں! اہنیچھ دے ہنیچھ دے!

(طالب علم نمبر ۲ داخل ہوتا ہے)

طالب علم:۔ بیگم صاحبہ میں دے آیا وہ لوگ آپ کا بہت بہت شکریہ ادا کرتے تھے۔

بیگم:۔ مسٹر شیا کی طبیعت کیسی تھی؟

طالب علم:۔ بہت خراب۔ بیچاری بڑھیا شب و روز اسکی تیمارداری میں مشغول رہتی ہے۔

بیگم:۔ (افسوس میں سر ہلاتے ہوئے) چہ چہ!

طالب علم:۔ یہ پلیٹ اور کپڑا کہاں رکھوں؟

بیگم:۔ الماری پر رکھ دو۔

طالب علم:۔ (الماری کی طرف جاتے ہوئے) اُس کی بیوی کا انتقال ہوئے کتنا عرصہ ہوا؟

بیگم:۔ پونے دو سال بلکہ تقریباً پورے دو سال سمجھو۔

طالب علم:۔ بیگم صاحبہ یہ نامراد بیماری مسٹر شیا کو اپنی بیوی سے لگی تھی نا؟

بیگم:۔ ہاں۔

طالب علم:۔ اگرچہ اس کی حالت بہت ہی ناگفتہ بہ ہو چکی ہے مگر مرد خدا اب بھی رات بھر پڑھتا ہے۔ سکول میں ہر گھنٹے کے بعد اپنے کمرے میں جب تک کچھ آرام نہ کرلے کھڑا ایک ہونا محال ہوتا ہے۔ جب وہ بول رہا ہوتا ہے اُس کے منہ سے تھوک اُڑ اُڑ کر سامنے کی بنچوں پر بیٹھے ہوئے لڑکوں پر پڑتا ہے اور غریب خوف سے اُچھل اُچھل پڑتے ہیں۔ اور حفظانِ صحت کے اُصول سے یہ ہے بھی سخت خطرناک۔ مگر ان سب باتوں کے علاوہ اسکے لکچر اس قدر عالمانہ ہوتے ہیں کہ بس سنا کیجئے۔

بیگم:۔ ان کا خوف بالکل بجا ہے۔ اگر میرے بچے بھی اسکے شاگرد ہوتے تو مجھے بھی ہر دم دھڑکا لگا رہتا۔ مگر اس کی حالت کو دیکھکر دلی ہمدردی ہوتی ہے۔ ضعیف ماں اور دو بچوں کے سوا اُس کا کوئی غمخوار و غمگسار نہیں۔ نوکری کے سوا کوئی اور ذریعہ معاش نہیں۔ اور بیماری نے اُسے زندہ درگور کر رکھا ہے۔ نہ نوکری کئے بنے نہ چھوڑتے بنے۔ غریب جب کبھی یہاں آتا ہے یہی ذکر کرتا رہتا ہے کہ فلاں ڈاکٹر نے معائنہ کیا تو کوئی کسی قسم کے جراثیم نظر نہ آئے اور فلاں نے اُن کی موجودگی کی تصدیق کی۔ وہ سمجھتا ہے کہ اسے کوئی چھوت کی بیماری نہیں، مگر یہ سب دل بہلانے کی باتیں ہیں۔ مجھے اس سے دلی ہمدردی ہے۔ اتنا قابل آدمی اور اتنا محبت والا اُستاد بڑی مشکل سے ملتا ہے۔

طالب علم:۔ افسوس قدرت بھی کسقدر بے رحم ہے۔ اس کا دستِ ستم ہمیشہ قابل ہستیوں کو ہی تختۂ مشق بناتا ہے۔ بخدا آپ کے شوہر ہی ایک قسمت کے دھنی معلوم ہوتے ہیں۔ ورنہ جو بھی قابل شخص دیکھا دائم المریض!

بیگم:۔ بیشک ہم خدا کے لاکھ لاکھ شکر گذار ہیں۔

طالب علم۔ آج سے پورے پانچ سال پہلے میں نے انہیں سکول سے نکلوانے کی سازش کی تھی۔ جب کبھی مجھے اپنی وہ کمینہ حرکت یاد آجاتی ہے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔ مگر آفریں ہے اُن کی شرافت پہ کہ جب میں اُن کے پاس پناہ لینے آیا تو بجائے دھتکار کر نکال دینے کے انہوں نے مجھے اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دی اور ایک شفیق و مہربان باپ کی طرح میرے سر پر دستِ شفقت پھیرا۔

بیگم۔ اس واقعے سے مجھے بیشک بہت تشویش ہوئی تھی۔ مگر انہیں بالکل فکر نہ تھی۔

طالب علم۔ مجھے الفاظ نہیں ملتے کہ اُن کی تعریف کر سکوں یا اپنی ندامت کا اظہار کر سکوں۔

بیگم۔ ندامت کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ میں تمہاری شکرگزار ہوں کہ تم نے میری آنکھیں کھول دیں اور مجھے ان کی حقیقی قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔

طالب علم۔ بیگم صاحبہ واقعہ تو یہ ہے کہ میری آنکھیں کھل گئیں۔ جس ہمت مردانہ سے انہوں نے مصائب کا مقابلہ کیا میرے لئے شاہراہ زندگی میں قابل تقلید مشعل ہدایت ہے۔

بیگم۔ کیا مطلب؟

طالب علم۔ مطلب یہ ہے کہ جب ہم لوگوں نے اپنے ساتھیوں سے آپ کے خاوند کی گرفتاری کا قصہ بیان کیا تو سب نے متفقہ فیصلہ دیا کہ ان کی انفرادی آزادی کے تمام نظریوں کا لب لباب مناکحت و شادی کی جکڑ بندیوں کے بغیر جذبات سفلی کی بے روک ٹوک تسکین کے سوا کچھ نہ تھا اور یہ کہ وہ خود اس پر کاربند تھے اور چونکہ قوانین ان کے راستے میں حائل ہوتے تھے اسلئے وہ حکومت کے خلاف زہر اگلا کرتے تھے۔ چنانچہ ان نظریوں کو ملک و قوم کی بہبودی کے خلاف جانتے ہوئے ان کے خلاف عدم اعتماد کا ریزولیوشن پاس کیا جب انہوں نے اس کے چند روز بعد ہی ملازمت سے استعفیٰ دیدیا تو جو بچے کھچے طلبا اُن کے حامی تھے وہ بھی بدظن ہو گئے۔ ان کے خیال میں پروفیسر صاحب کو اپنے نظریات کی تائید میں استقلال سے کام لینا چاہئیے تھا اور یہ کہ ان کی یہ حرکت اخلاقی جرات کے فقدان کا ثبوت تھا۔ اور پروفیسر ان لوگوں میں سے تھے جو محض لوگوں کی توجہات کا مرکز بن کر سستی شہرت حاصل کرنے کیلئے نئے نئے نظریے گھڑا کرتے ہیں۔ مگر بیگم صاحبہ جب عدالت نے انہیں تمام الزامات سے بری کر دیا تو ہم لوگ ایک عجیب ناقابل بیان ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔ اور میں تو آج تک نہ جان سکا کہ اگر وہ بے گناہ تھے تو اپنی بریت کے لئے ثبوت دینے کی بجائے خاموش کیوں رہے اور کیوں عدالتی کارروائی کے دوران میں ایک حرف بھی اُن کی زبان سے نہ نکلا۔ (بات ادھوری چھوڑتے ہوئے) بیگم صاحبہ آپ کو شاید سردی لگ رہی ہے؟

بیگم۔ ہاں کچھ محسوس تو ہونے لگی ہے اور شاید بچے ابھی تک باہر ہی کھیل رہے ہیں۔

طالب علم۔ جی ہاں وہ ابھی باہر ہی ہیں۔ جب تک انسان طفلِ نادان ہے مادرِ فطرت اُسے اپنا بچہ سمجھکر شفیق نگہبانی کرتی ہے مگر آغاز شباب کے ساتھ ہی زندگی کے بحر زخار میں تلاطم بپا ہو جاتا ہے اور بے رحم موجیں اس کی حقیر کشتیِ حیات کو فنا کے گھاٹ اتارنے میں تند سے تند تر ہونے لگتی ہیں۔ (اپنا قصہ شروع کرتے ہوئے) ہاں تو بیگم صاحبہ جب عدالت نے انہیں بری کر دیا تو میرے ضمیر نے مجھے اس قدر ملامت کی کہ میں نادم و شرمسار ہوکر معذرت کیلئے اُن سے گھر پر ملنے آیا۔

بیگم۔ خوب! یہ قصہ اس وقت کا ہے جب میرا پہلا بچہ اس دنیا میں وارد ہونے والا تھا۔

طالب علم۔ جی ہاں مجھے خوب یاد ہے۔

(باہر سے بچوں کی زور زور سے باتیں کرنے کی آواز آتی ہے۔
باپ بچوں سے کھیلتا داخل ہوتا ہے)

خاوند۔ ہاں بھئی آگیا۔ باہر برف پڑ رہی تھی۔ ان شیطانوں کو دیکھو کہ بے خطر بکری کے بچوں کی طرح کلیلیں کر رہے تھے۔

بیگم۔ گرینی کہاں ہے؟

خاوند۔ وہ اپنے کمرے میں کھڑی مارے سردی کے بید کی طرح کانپ رہی ہے۔

بیگم۔ لیکن میں نے اُسے بچوں کے ساتھ بھیجا تھا کہ انکا خیال رکھے۔

خاوند۔ (ترکاریوں کی بوری کندھے سے اتارتے ہوئے) لو یہ آلو اور پیاز میرے خیال میں ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ کے لئے کافی ہونگے۔ برف کی تہ اتنی موٹی جمی ہوئی تھی کہ کھودتے کھودتے تھک کر چور ہوگیا۔ (طالب علم سے) اور پھر سبزی کھود چکنے کے بعد کھاد ڈالتا رہا۔

طالب علم۔ میرے خیال میں تو ابھی کھاد ڈالنے کا وقت نہیں آیا۔ برف پگھل جانے پر زیادہ موزوں ہوتا۔

خاوند۔ ارے اس سے کچھ خاص فرق نہیں پڑتا۔۔۔ اچھا بچو آؤ!

(اپنے بازو پھیلاتا ہے۔ بچے دوڑ کر اس سے چمٹ جاتے ہیں۔
وہ ان کے کپڑوں سے برف جھاڑنے لگتا ہے۔)

بیگم۔ (خاوند سے) تمہارے کپڑوں پر بھی تو برف جم رہی ہے (جھاڑنے لگتی ہے)

خاوند۔ منا کیسا ہے؟ سو رہا ہوگا؟ (بچوں سے) اچھا اب جاؤ یہ آلو گرینی کو دے آؤ۔

(بچے آلو لیکر گرتے گرتے چلاتے کمرے سے باہر نکل جاتے ہیں)

طالبعلم۔ (بیگم سے) جو کچھ میں کہہ رہا تھا آپ ان سے پوچھئے تو۔

خاوند۔ کیا قصہ ہے؟

طالبعلم۔ وہ آپکے اعتراف جرم کے متعلق!

خاوند۔ (غمگین ہو کر) اسے بھی جانے دو بار بار دکھتی رگ کو نہ چھیڑو۔ (بیگم سے) آج رستے میں شموٹا کی ماں ملی تھی، بچاری! ایسے خراب موسم میں بیٹھ پر بچے کو لادے ہوئے کوئی دوا لینے ہسپتال جا رہی تھی۔ نقاہت سے غریب کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ شاید تم نے اُسے آج کچھ بھیجا تھا اس کا بہت بہت شکریہ ادا کرتی تھی۔ میں نے اس سے کچھ سبزی بھیجنے کا وعدہ کیا تھا، تم دو دو سیر آلو اور پیاز بھجوا دو۔

طالب علم۔ پروفیسر۔۔۔۔

خاوند۔ خدارا تم مجھے اس لفظ سے نہ مخاطب کیا کرو میں کتنی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ اس عادت کو چھوڑ دو۔

طالب علم۔ تو پھر کس نام سے پکارا کروں؟ اچھا کیا میں بیگم صاحبہ کو بتا دوں لڑکیوں میں نے آپ کے دامن میں پناہ لی؟ وہ اب تک اس سے ناواقف ہیں ۔۔۔

خاوند۔ بتا دو۔ میں تو کچھ مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ (کتابوں کی میز کی طرف جاتا ہوا اور ایک نیلے رنگ کی نوٹ بک اٹھا کر دکھاتے ہوئے) آج یہ نوٹ بک تمہاری ہے ۔۔۔؟

بیگم۔ ہاں میری ہے۔

(تیزی سے اٹھ کر نوٹ بک چھین لیتی ہے۔)

خاوند۔ اچھا یہ تمہارے پوشیدہ رازوں کی نوٹ بک ہے لیکن اگر تم اس بے احتیاطی سے ادھر ادھر پھینکتی رہو گی تو ڈر ہے کسی دن میں پڑھ نہ لوں۔ خیال رکھا کرو۔

بیگم۔ (ہنستے ہوئے) تو کیا ہو گا؟

(نوٹ بک احتیاط سے بکس میں رکھتی ہے)

(خاوند مطالعہ میں مشغول ہو جاتا ہے۔ بیگم اور طالب علم باتیں کرنے لگتے ہیں۔)

طالب علم۔ آپ جانتی ہیں کہ میں فطرتاً صاف گو آدمی ہوں چنانچہ جب انہوں نے الزامات کی تردید نہ کی۔ میں نے نہایت بے باکی سے اس کا سبب دریافت کیا، اور جب انہوں نے بتایا کہ ان کے پاس کوئی ثبوت تھا ہی نہیں تو حیرت سے اُن کا منہ تکتا رہ گیا۔ میری تمام اُمیدوں پر پانی پھر گیا ۔۔۔ اور اسکے بعد انہوں نے اعترافِ جرم کیا ۔۔۔ مجھے ڈر ہے آپ سُنکر رنجیدہ ہوں گی ۔۔۔ خیر تو آپسے شادی ہو جانے کے بعد انہوں نے کسی دوسری عورتوں سے اظہارِ محبت کیا۔ شاید آپ اس سے واقف نہیں۔ بالآخر ایک مرتبہ معاملات نہایت پیچیدہ ہو گئے۔ کیونکہ جس سے اظہارِ تعشق کیا وہ شادی شدہ عورت تھی اور بدقسمتی سے ایک رات وہ اس کے گھر جا پہنچے۔

بیگم۔ لیکن ان کا دامن گناہ آلود تو نہ ہوا۔

طالب علم۔ اس میں کیا شک ہے۔

بیگم۔ تو بس الزام کی تردید کیلئے یہی کافی ہے۔

طالب علم۔ مگر ان کے خیال میں یہ کافی نہیں۔ وہ بمقول مسیح کے سمجھتے ہیں کہ جس نے کسی غیر عورت کو بُری نظر سے بھی دیکھا زنا کا مرتکب ہو گیا" اور اسکے پیشِ نظر وہ اپنے کو مجرم و تصوروار تصور کرتے ہیں۔

خاوند۔ (پڑھتے پڑھتے سر اٹھا کر) بالکل غلط! یہ وجہ ہرگز نہ تھی۔ (اُٹھکر ٹہلنے لگتا ہے) بلکہ ان دنوں جبکہ تم نے مجھ سے پوچھا تھا اگرچہ میں اپنے جذبات کو دبانے میں کسی حد تک کامیاب ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود بعض اوقات شباب کا گرم خون متلاطم ہو کر آمادہ بغاوت ہو جاتا اور میرے پائے ثبات میں لغزش پیدا ہونے لگتی۔ اس غیر یقینی حالت میں خاموشی ہی انسب تھی۔ تمہیں سکول سے نکال دئے جانے پر میں نے اس لئے اپنے ہاں پناہ دی کہ فطرتی کمزوری میں تم میری طبیعت سے مماثل تھے۔ اور اسی وجہ سے مجھے ہمدردی پیدا ہوئی۔

طالب علم۔ اس ہمدردی نے ہی تو مجھے آپ کا گرویدہ بنا لیا۔ آپ شاید اسے مبالغہ سمجھیں گے حقیقت یہ ہے کہ آپ ایک اعلیٰ کردار کے مالک ہیں کیونکہ ایک عام انسان اپنے دشمن کو اس فراخدلی سے کبھی معاف نہیں کر سکتا۔

خاوند۔ تم اپنے کو میرا دشمن سمجھا کرو میں تو تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ ایک نہایت کارآمد اور مفید دوست ۔۔۔ ہم ایک دوسرے کی معاونت سے اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر بنا سکتے ہیں اور یہی حیاتِ مستعار میں انسان کا نصب العین ہے۔

طالب علم۔ بیشک آپ بجا فرما رہے ہیں۔

خاوند۔ (بیگم سے) اب تمہیں معلوم ہو گیا کہ میں نے کیوں مدافعت نہ کی۔ اور کس وجہ سے ملازمت کو خیرباد کہنا قرینِ مصلحت جانا۔ ان حالات میں میرا وجود طلبا کے لئے سمِ قاتل تھا ۔۔۔ شموٹا کے مرض سے کہیں زیادہ خوفناک۔

طالب علم۔ اچھا چھوڑئیے ان پرانی باتوں کو، ان کی تلخ یاد سے روح کو تکلیف ہوتی ہے۔ (موضوع بدلتے ہوئے) کوئی خدمت میرے لائق ہو تو فرمائیے۔

خاوند۔ کوئی خاص کام تو ہے نہیں۔ البتہ اپنے کمرے جاتے ہوئے ذرا یہ آلو بل کی بوری گرینی کو دیتے جانا اور لیٹر بکس دیکھ لینا شاید کوئی خط آیا ہو۔

(طالب علم جاتا ہے)

(بیگم سے) اچھو آج تم نے ٹموٹا کو کیا بھجوایا تھا؟

بیگم۔ یہی روزمرہ کے استعمال کی دوچار چیزیں اور تھوڑی سی وہ دوا جو اُنکے خیال میں بہت مفید ہے۔

خاوند۔ اگر ان کا یہ اعتقاد ہے تو یقیناً فائدہ ہوگا۔ اس دوائی کے ذکر سے ایک پرانی بات یاد آگئی۔ تمہیں وہ وقت یاد ہے جب ہم ماہ عروس منانے ٹوکیو سے باہر جا رہے تھے؟

بیگم۔ بہت اچھی طرح۔ اور یہ بھی یاد ہے کہ یہ دوائی والد صاحب نے چلتے وقت احتیاطاً دے دی تھی۔ کیونکہ وقتی طور پر ہر مرض کے لئے اکسیر ثابت ہوتی ہے۔ یہ بھی یاد ہے کہ میں نے ذرا ضرورت سے زائد کھالی تھی اور مارے درد کے معلوم ہوتا تھا سر پھٹا جاتا ہو اور اس کے بعد بے تحاشا نکسیر پھوٹ پڑی تھی۔

خاوند۔ کچھ اور بھی یاد ہے؟

بیگم۔ اور؟ اور تو کچھ بھی یاد نہیں۔

خاوند۔ رستے میں ایک دوسرا نیا جوڑا ہمارے ڈبے میں آ بیٹھا تھا۔ عورت بیمار معلوم ہوتی تھی ـــ اسے دیکھ کر تم نے یہ دوا جیب سے نکالی تھی!

بیگم۔ ہوگا مجھے یاد نہیں۔

خاوند۔ مجھے خوب یاد ہے۔ میں تمہاری ہر حرکت بڑے غور سے دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ تم نے تھوڑی سی دوا کھائی اور جیب میں رکھ لی۔

بیگم۔ ہاں یاد آگیا۔

خاوند۔ تھوڑی دیر بعد تم نے پھر ایک خوراک لی۔ اور محض نمائش کی خاطر تھوڑے تھوڑے وقفے سے بغیر ضرورت کھاتی رہیں۔

بیگم۔ (جھینپ کر) جی ہاں بالکل غلط۔

خاوند۔ (مسکرا کر) تو جھینپ کیوں رہی ہو۔ خیر تو جب وہ اگلے اسٹیشن پر اُترنے لگی تم نے تھوڑی دوا نکال کر اُسے پیش کی، اس نے بہت انکار کیا مگر تم نے جب تک اُس نے قبول نہ کر لی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ یہ بھی محض احسان دھرنے کیلئے تھا۔

بیگم۔ (اور زیادہ جھینپ کر) جھوٹ جھوٹ سفید جھوٹ!

خاوند۔ اب تو تم یہی کہو گی مگر اس سے کیا ہوتا ہے ہمارے خاندان کا بچہ بچہ اس لطیفہ سے واقف ہے۔ بہرحال تمہاری یہ نمائش پسندی کم عمری اور وقت کے تقاضے کے لحاظ سے قابلِ معافی ہے۔ اب زندگی کے تلخ لمحات نے تمہیں ایسا سیدھا کر دیا ہے جیسے تیر۔

(طالب علم داخل ہو کر خط دیتا ہے)

خاوند۔ (پڑھ کر، اپنے کلام کو جاری رکھتے ہوئے) میں تمہیں کیا بتاؤں کہ کتنی مرتبہ تم سے قطع تعلق کرنے کا ارادہ کیا۔

بیگم۔ مگر میرے وہم و گمان میں بھی یہ خیال کبھی نہ آیا۔

خاوند۔ جی ہاں۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں ورنہ سب عورتوں کی طرح تمہاری بھی یہی تمنا ہوگی کہ آرام و آسائش کی زندگی بسر کرو۔ اور یہ خواہش کبھی تو اتنی بڑھ جاتی ہوگی کہ میری محبت بھی بھول جاتی ہوگی۔ ہر عورت حتیٰ کہ حیادار سے حیادار بھی اس تمنا کا خون ہوتے دیکھ کر مردوں سے نفرت کرنے لگتی ہے۔ اور یہ نفرت جبلی ہے جو انہیں اماں حوا سے وراثت میں ملی ہے۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ تم اپنے اس جذبے پر سخت کشمکش کے بعد بالآخر غالب آئیں۔ کیونکہ تمہاری قوتِ ارادی بہت مضبوط ہے۔ (مضمون خط کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے) یہ تمہارے والد صاحب کا خط ہے۔ لکھتے ہیں کہ آجکل ٹوکیو میں کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہے۔ گھر کے جملہ افراد بخیریت ہیں۔ پھولوں کی پتیاں جھڑنے لگی ہیں اور بیج بننا شروع ہو گئے ہیں۔ ہم بھی شباب کی آخری منزلیں طے کر کے شیب کی تکلیف دہ منزل میں داخل ہو چکے ہیں۔ اب تو ابا جان ہم سے بہت اُنس کرنے لگے ہیں۔ تم نے اس مرتبہ ماہانہ رقم بھیجدی تھی یا نہیں؟

(خط بیگم کے حوالے کرتا ہے)

بیگم۔ ہاں بھیجدی تھی۔ (خط پڑھ کر) ابا کتنے اچھے ہیں۔ کبھی ان کے ہنسمکھ چہرے کا خیال آتا ہے تو دل میں فرحت سی ہوتی ہے۔

خاوند۔ بیشک وہ ایک نہایت پاک طینت اور سلیم الفطرت انسان ہیں۔ شروع شروع میں معمولی باتوں پر میری اُن سے جھڑپ ہو جاتا کرتی تھی۔ کیونکہ وہ بزرگی کا رُعب ڈالتے تھے اور میں کسی سے مرعوب آج تک نہ ہوا۔ آخر کار انہیں ہتھیار ڈالنا پڑے اور نہایت مشفقانہ برتاؤ کرنے لگے، چنانچہ اب میرا جی اُن سے ملنے کو بیتاب رہتا ہے۔ تمنا ہے کہ اُنکا سایہ ہم پر مدت دراز تک رہے۔

بیگم۔ ارے یہ بعد میں لکھی ہوئی چند سطریں عجیب ہیں۔

خاوند۔ کیا لکھا ہے؟ میں نے خیال نہیں کیا۔ پڑھنا تو۔

بیگم۔ (پڑھتی ہے) "میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ زندگی کا بھروسہ نہیں۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ اسی لئے میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر وصیت لکھکر تمہاری اماں کے حوالے کر دی۔ میری موت کے بعد تم دونوں اُسکے مطابق

عمل کرنا؟ کیوں اس کا کیا مطلب؟

(متفکر ہو کر کچھ سوچنے لگتی ہے)

خاوند۔ کیا تحریر اباجان کی ہی ہے؟

بیگم۔ ہاں۔ (تھوڑے سکوت کے بعد) سنو! میں نے بھی اپنی وصیت تحریر کرکے بکس میں رکھ چھوڑی ہے۔

خاوند۔ بھلا کوئی تک بھی ہے؟

بیگم۔ زندگی کا کیا اعتبار نہ معلوم کب موت کا آہنی پنجہ حیات مستعار چھین لے۔

خاوند۔ چلو! ہم ایسی واہیات باتیں نہیں سنتے۔

بیگم۔ ذرا کرسی بڑھاکر میرے قریب آجاؤ میں تمہیں سناتی ہوں کہ کیا تحریر کیا ہے۔

(خاوند قریب آجاتا ہے۔ بیگم ایک وصیت نامہ پڑھتی ہے۔ کالے لباس والا ایک شخص اٹھ کر کمرے کی چیزیں ایک ایک کرکے باہر لے جاتا ہے۔)

"میں تمہیں ایک خط لکھنا چاہتی تھی مگر تمہاری موجودہ پریشانی کے مدنظر اس ارادے کو عمل میں لانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ لیکن میں اپنے دلی تاثرات کو تحریر میں لانے کیلئے سخت بے چین ہوں۔ چونکہ خط لکھنا گوارا نہیں اور کوئی ایسا رازداں بھی نہیں جس سے راز دل کہہ سکوں لہذا میں سب کچھ اس کتاب میں لکھے دیتی ہوں تم میری موت کے بعد اسے پڑھ سکتے ہو ــــ (موت کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھکر) لیکن اس وقت تم میرے بچھڑنے کا غم نہ کرنا۔ بچوں اور میرے بوڑھے والدین کی خبرگیری اور خدمت میں میرا غم بھلانے کی کوشش کرنا۔ (پھر 'موت' کی طرف دیکھکر) موت کا بے رحم چنگل میری طرف بڑھا چلا آتا ہے۔ میری نظریں اسے بہت قریب دیکھ رہی ہیں۔ اسکے قدموں کی چاپ صاف سنائی دے رہی ہے۔ تم شاید اسے میرے واہمہ اور بزدلی پر محمول کرو مگر یقین جانو میں موت سے نہیں ڈرتی۔ کیونکہ انسان پیدا ہی مرنے کے لئے ہوتا ہے۔ البتہ مجھے اپنے عزیزوں سے بچھڑنے کا رنج ضرور ہے۔ (پھر 'موت' کی طرف دیکھتی ہے) میں خود موت سے نہیں گھبراتی یہ الفاظ میں باہوش وحواس لکھ رہی ہوں ــــ مجھے یہ ارمان ضرور ہے کہ اس چند روزہ زندگی میں کسی کے کام نہ آسکی ــــ لیکن موت کا خوف مجھ پر قطعًا طاری نہیں ــــ بیماری نے مجھے مُردے سے بدتر بنا دیا ہے۔ اگرچہ سانس جاری رہنے کی وجہ سے تم مجھے زندہ سمجھتے ہو اور کسی حد تک یہ صحیح بھی ہے مگر میں اس بیچارگی پر موت کو ترجیح دیتی ہوں۔ اگر میں صحت یاب ہوگئی ــــ مگر یہ تو اب بالکل خارج از امکان ہے۔ میں پچھلے آٹھ دس روز موت کے متعلق غور و فکر کرتی رہی اور اب اسکے تصور سے دل کو اطمینان سا ہونے لگتا ہے اور ایک مسرت سی محسوس کرتی ہوں۔ گویا میری محبوبہ ہے۔ میری دلی تمنا تھی کہ میں تمہیں ایک بامراد و شادکام انسان دیکھتی مگر قضا و قدر کو منظور نہ تھا۔ میری التجا ہے کہ میرے بعد بچوں کی نگرانی سے غافل نہ ہونا یہ نہ سمجھنا کہ میرے دائم المریض ہونے کا اثر ان میں بھی ہوگا۔ قوت ارادی بڑی شے ہے۔ اور یہ چیز تم ان میں بدرجۂ اتم پاؤگے۔ میرا یقین ہے کہ وہ اپنے باپ کی طرح تندرست اور صحت مند ہونگے۔ تاہم اگر وہ کبھی بیمار پڑیں تو انکے علاج معالجہ میں تساہل نہ برتنا۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ان میں مردانہ جوہر پیدا کروں۔ میں چاہتی ہوں کہ میری موت کے وقت وہ میرے قریب نہ ہوں۔ میں تنہائی میں مکمل سکون کے ساتھ جان دینا چاہتی ہوں۔ اگر اس وقت دوسرے لوگ میرے پاس ہونگے تو مجھے تکلیف ہوگی۔ میں جانتی ہوں کہ عمومًا مرنے والے عزیزوں کو پاس کھڑا دیکھنا چاہتے ہیں لیکن میں ان لوگوں سے مختلف ہوں۔ بچوں کو میری موت سے آگاہ نہ کرنا۔ نہ انہیں جنازے میں شامل ہونے دینا۔ کہیں اُن کے صاف شفاف معصوم دل ابھی سے غم کی آماجگاہ بن کر نہ رہ جائیں۔ میرے جنازے کی تیاری کے دوران میں انہیں دور رکھنا۔ اور جب تک موت وحیات کے راز کو سمجھنے کے قابل نہ ہوجائیں میری موت سے آگاہ نہ کرنا۔

آخر میں میں تمہاری شکرگذار ہوں کہ تم نے مجھے بڑی محنت سے پڑھایا۔ ہر معاملے میں میری رہنمائی کی اور مجھے محبت کے قابل سمجھا۔ حالانکہ میں اس کی اہل نہ تھی۔ مجھے فخر تھا کہ خدا نے مجھے تم سا شوہر عطا کیا۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی تھی۔ اور اسی لئے تمہاری اور اپنے جگرگوشوں کی فرقت پر آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتی۔" (بے اختیار رونے لگتی ہے۔ کتاب ایک طرف رکھکر خاوند کی طرف بڑھتی ہے۔) جو کچھ کدورت میرے دل میں تھی مدت ہوئی دھل چکی۔ میرا دل آئینہ کی طرح شفاف ہے اور اب جنت کے دروازے میرے استقبال کے لئے آغوش مادر کی طرح وا کر دئے گئے ہیں۔

خاوند۔ (جو اس دوران میں خاموشی سے سب کچھ سنا کیا) کیا تم نے یہ سنجیدگی سے لکھا ہے؟

بیگم۔ میں نے کیا لکھا قضا و قدر نے لکھوایا۔ ہمارے بچھڑنے کا وقت آگیا۔ ہمارے پُرشباب قہقہے ختم ہونے کو ہیں۔

خاوند۔ (متفکر ہو کر) سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔ میری عقل جواب دے رہی ہے۔

بیگم۔ آہ صرف ہمارے نقرئی قہقہے ہی نہیں بلکہ ہر شے۔ ہمارا مکان، بچے، گرینی، اور وہ طالب علم، سب میری زندگی سے خارج ہونے والے ہیں۔

آہ ویرانی ہی ویرانی ہے۔

خاوند۔ میرا دل اداس ہو رہا ہے۔

بیگم۔ ہرطرف بے بسی اور تاریکی چھائی ہوئی ہے

خاوند۔ بے بسی، تاریکی، نامرادی، حسرت و یاس!

بیگم۔ (صحن میں دیکھ) بستہ برف پڑ رہی ہے۔ (کالے لباس والا ایک شخص برف سے بھری ایک ٹوکری لئے داخل ہوتا ہے اور سارے اسٹیج پر بکھیر کر چلا جاتا ہے۔ اوپر سے اور برف گرتی ہے۔ خاوند اور بیگم ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو جاتے ہیں۔) آہ تمہارے نرم و گرم سینے پر راحت و تسکین ہے۔ اچھا میرے بچوں کو لے آؤ انہیں بھی آخری نظر دیکھ لوں۔ (کالے لباس والا تین بچوں کو لئے داخل ہوتا ہے) اُف کس قدر سردی ہے! آؤ میرے دل کے ٹکڑے آؤ۔ میں تمہیں گرمی پہونچاؤں۔ (تینوں کو آغوش میں لیتی ہے) مگر افسوس میں مجبور ہوں، خود بیمار ہوں تمہیں کیونکر آرام پہونچا سکتی ہوں۔ (اپنے ارد گرد دیکھتی ہے اور اس کی نظریں "موت" کے سامنے جلتی ہوئی شمع پر رک جاتی ہیں۔) آہا! وہ ہے میری شمع زندگی! جب تک وہ جلتی رہے گی میں تمہیں اور تمہارے ابا کو حرارت پہونچاتی رہونگی (موت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اس ہیبتناک صورت کو دیکھتے ہو؟ مگر نہیں تم اس کی طرف نہ دیکھنا وہ تمہیں ضرر نہیں پہونچا سکتی۔ (خاوند سے) پیارے تم بھی اس کی طرف مت دیکھو۔

(بچوں کو سنبھالے شمع کے قریب جاتی ہے اور اس پر اپنا ہاتھ پھیلا دیتی ہے۔)

خاوند۔ بجھ تو نہیں گئی؟

بیگم۔ اسکے بجھتے ہی میرا خاتمہ ہو جائیگا۔

خاوند۔ (موت کو پہلی مرتبہ دیکھکر) وہ اسکے پیچھے کون بیٹھا ہے؟

بیگم۔ تم نے اسے اب دیکھا؟ میں تو ایک عرصے سے اسے دیکھ رہی ہوں۔ تم اس کی طرف نہ دیکھو۔ آہ اب آتشیں شعلہ گل ہونے کو ہے۔ سرد تاریکی پھیلنے والی ہے۔ تم بچوں کو لیکر یہاں سے بھاگ جاؤ!

خاوند۔ تم بھی چلو میں تمہارے بغیر نہیں جا سکتا۔

بیگم۔ (حسرت سے) کاش کہ میں تمہارے ساتھ چل سکتی۔ (رونے لگتی ہے۔) جاؤ بھاگ جاؤ۔ جلدی کرو۔

(کالے لباس والا شخص آکر بچوں اور خاوند کو شمع سے پرے ہٹا دیتا ہے۔ خاوند اس سے کشمکش کرتا ہے مگر آخرکار اُسے باہر نکلنا ہی پڑتا ہے۔ بیگم مایوسی سے اُسکے پیچھے دیکھتی جاتی ہے۔ ایک خیالی بوسہ لیکر۔)

بیگم۔ سب چلے گئے۔

(رونے لگتی ہے گھنٹہ سات بجاتا ہے۔ کالے لبادوں والے آکر بیگم کو گھیر لیتے ہیں۔)

موت۔ (بائیں ہاتھ میں ریت گھڑی اٹھائے ہوئے ہے۔) تھوڑی سی ریت ابھی باقی ہے۔ ذرا صبر کرو۔

(بیگم یہ آواز سنکر خوف سے دہشت زدہ ہو کر شعلہ پر گر پڑتی ہے۔ اسٹیج پر تاریکی چھا جاتی ہے۔)

(پردہ گرتا ہے)

منظر پنجم

(اسٹیج منظر اوّل و سوم کی طرح۔ سات بجنے میں سات منٹ باقی ہیں۔ بیگم بستر پر پڑی ہے۔ خاوند اس کی نبض ٹٹول رہا ہے۔ اور مضطربانہ چہرے کی طرف دیکھتا جاتا ہے۔ ساتھ کے کمرے میں ڈاکٹر اور نرس بیٹھے اطمینان سے اخبار پڑھنے میں مشغول ہیں۔)

خاوند۔ (دھیمی آواز سے) ایکو تم ٹکٹکی باندھے کیا دیکھ رہی ہو؟ (اچانک خوفزدہ ہو کر ڈاکٹر کو بلانے اٹھتا ہے مگر فوراً بیٹھ کر اپنا ہاتھ بیگم کی آنکھوں کے سامنے ہلاتا ہے۔ بیگم کی آنکھ نہیں جھپکتی۔ خاوند پر پھر خوف طاری ہو جاتا ہے اور چلانے لگتا ہے۔) ایکو ایکو۔ (ڈاکٹر اور نرس اخبار چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔) ڈاکٹر!

(ڈاکٹر اور نرس اندر داخل ہوتے ہیں)

ڈاکٹر اس کی آنکھ نہیں جھپک رہی۔ ذرا اس کی نبض دیکھئے۔ (ڈاکٹر نبض پر ہاتھ رکھتا ہے) لو اب اس کی آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ کیا ابھی نبض چل رہی ہے؟

ڈاکٹر۔ افسوس نبض چھوٹ چکی ہے۔ (نرس سے) گرم پانی لاؤ۔

(نرس کچن میں پانی گرم کرکے پیالی بھر لاتی ہے اور کھانا کھانے کی کھیچیاں بھی لیتی آتی ہے۔ کھیچی کے اگلے سرے میں روئی کا پھاہا لگاکر پانی سے ترکرتے ہوئے خاوند سے مخاطب ہو کر)

نرس۔ لیجئے جناب انہیں پانی دیجئے۔

(خاوند بابا پانی رسم کے مطابق روئی کو پانی میں ڈبو کر بیگم کے ہونٹ ترکرتا ہے۔)

(گرہنی زار و قطار روتی داخل ہوتی ہے)

خاوند۔ رونا دھونا بیکار ہے صبر کرو۔ تم بھی اُسے پانی دو۔

گرہنی۔ ہاں سرکار لائیے، مگر میں صبر کیسے کروں۔ (ڈھاریں مارنے لگتی ہے)

خاوند۔ چپ چپ!! ارے اُس نے حرکت کی، اے خدا اسے بچالے۔

ڈاکٹر۔ وہ بچانے والی طاقتوں سے بے نیاز ہو چکی ہیں۔ (اپنا اسٹیتھسکوپ بیگم کے سینے سے لگا کر) مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے۔

(خاوند مایوسی سے سر ہلاتا ہے)

ڈاکٹر۔ (گھڑی دیکھتے ہوئے) عین سات بجے دم دیا۔

(ڈاکٹر اور نرس باری باری سے بیگم کے ہونٹ تر کرتے ہیں)

گرینی۔ بیگم تم آخر جنت پہونچ گئیں۔ آہ میری پیاری بیگم! مگر میں بھی عنقریب آپ سے آملونگی۔ (بیگم کے ہونٹ تر کرتے ہوئے) آمین!

(خاموشی)

ڈاکٹر۔ (نرس سے) تم ان کی مدد کرو۔ میں ہسپتال جاتے ہی ایک آدمی اور بھیجتا ہوں اور اگر زائد مدد کی ضرورت ہو تو فوراً اطلاع کرنا۔ (خاوند سے) جناب عالی مجھے آپ کے غم و اندوہ کا پورا پورا احساس ہے۔ مگر موت کے سامنے کوئی چارہ نہیں۔ اچھا اب اجازت دیجئے۔

خاوند۔ ڈاکٹر میں آپ کی جانفشانی اور کوشش کا بیحد ممنون ہوں حتی الوسع انکی ادائیگی کی کوشش کرونگا۔

ڈاکٹر۔ (دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے) کوئی کام میرے لائق ہو تو فرمائیے!

خاوند۔ ہاں ذرا براہ نوازش میرے اور بیگم کے والدین کو تار دیتے جائیے۔

ڈاکٹر۔ الفاظ تو وہی رسمی ہی ہونگے؟

خاوند۔ ہاں یہی کہ — آپکو آج صبح سات بجے عالم جاودانی کو سدھار گئی —!

ڈاکٹر۔ بہت اچھا۔

(جاتا ہے۔ نرس اور گرینی تعزیت کے چند رسمی الفاظ کہتی ہیں۔)

خاوند۔ میں تم دونوں کی تیمارداری کا شکرگذار ہوں بعض اوقات وہ تم سے بھنا جاتی تھی مگر مجھے امید ہے تم اسے معاف کردوگی۔

نرس۔ اجی کوئی بات نہیں، انسان بیماری میں ایسا ہی ہو جاتا ہے۔

گرینی۔ سرکار مجھے انکے خلاف قطعاً کوئی شکایت نہیں۔

خاوند۔ (نرس سے) اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟

نرس۔ ہم انہیں غسل دینگے۔

خاوند۔ اچھا تو یہ کام تم دونوں کے سپرد کرتا ہوں۔ مگر — (دونوں عورتوں کی طرف دیکھتا ہے وہ مطلب سمجھکر باہر چلی جاتی ہیں۔ خاوند بیگم کی پیشانی اور لبوں پر بوسے دیتا ہے۔ عورتیں غسل کا سامان لیکر داخل ہیں۔ خاوند آنسو پونچھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ کتابوں کی الماری سے نیلی کاغذ والی نوٹ بک اٹھا کر باہر برآمدے میں جا بیٹھتا ہے۔ حسرت بھری نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھتا ہے اور نوٹ بک کھول کر پڑھنے لگتا ہے۔ یکدم پیچھے مڑ کر عورتوں سے، جو اب بیگم کے بال سنوار رہی ہیں، کہتا ہے۔)

گرینی تھوڑے سے بال کاٹ کر میرے پاس لاؤ۔

گرینی۔ بہت اچھا سرکار۔

(قینچی چلانے کی آواز آتی ہے اور خاوند اس طرح سہم جاتا ہے گویا کوئی اس کا گوشت کاٹ رہا ہو۔ گرینی بالوں کی ایک لٹ کاٹ کر سفید کاغذ پر رکھے خاوند کے پاس لاتی ہے۔)

گرینی۔ سرکار اسے کہاں رکھوں؟

خاوند۔ یہیں رکھدو۔

گرینی۔ یہاں فرش پر؟

خاوند۔ ہاں۔

(تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے۔ اچانک پھل فروش کی آواز آتی ہے۔ گرینی باہر جاکر سیبوں کی ٹوکری لاتی ہے۔)

گرینی۔ سرکار سیب آگئے۔

خاوند۔ انہیں میری بیگم کے سرہانے رکھدو۔

(نرس اور گرینی خاموشی سے میت کو کفنانے میں مشغول ہیں۔ خاوند نوٹ بک پڑھ رہا ہے اچانک زار زار رونے لگتا ہے اور بالوں کی لٹ اٹھا کر سینے سے لگاتا ہے۔) (پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے۔)

خاتمہ

(اسٹیج ابتدا کی طرح۔ بس اتنا فرق ہے کہ وسط میں جلنے والی شمع بجھ چکی ہے۔ اسٹیج پر اندھیرا ہے مگر آہستہ آہستہ روشنی ہو جاتی ہے۔ موت کے گرد گھیرا ڈالے بہت سے کالے لباس والے کھڑے ہیں۔ سب کے سر جھکے ہوئے ہیں۔ اسٹیج پر پھر تاریکی چھا جاتی ہے اور اندھیرے میں موت کی آواز بلند ہوتی ہے۔)

موت۔ وہ ننھا سا شعلہ بے رحمی سے بجھا دیا گیا۔ کیا تم نے کبھی نہ کھل سکنے والا قفل لگا دیا؟ (رونے کی آوازیں) بنی نوع انسان ابتدائے آفرینش سے اس حقیقت کا مشاہدہ کرتا چلا آتا ہے اور بغیر توجہ دئے تیزی سے چلا جا رہا ہے۔ (وقفہ) خاوند اور والدین کی گریہ وزاری بہت جلد ختم ہو جائیگی۔ (وقفہ) یہ صحیح ہے کہ خاوند کا غم دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ عرصہ رہیگا۔ مگر اسے غمزدہ ہی رہنے دو۔ جلد ہی اپنے باپ کی موت سے دوچار ہونیوالا ہے۔ کیا چابیاں در قفل تیار ہے؟ زنگ آلود نہ ہو۔ تیار ہو جاؤ۔ (ایک نہایت صبر آزما سکوت کے بعد) ہر شے کا انجام ایک ہے! (پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے۔)

عبدالرشید

سلام و پیام ... ل۔ م۔ کے نام!

جو گدگداتی تھیں برسات کی اندھیری میں ۔۔۔ وہ کیف بار ہوائیں سلام کہتی ہیں
قریب شام جو کرتی تھیں رقص موجوں پر ۔۔۔ وہ بانسری کی صدائیں سلام کہتی ہیں
جہاں بجھلکے بڑھائی تھی تشنگی دل کی ۔۔۔ وہ بھولی بھٹکی سی راہیں سلام کہتی ہیں
جنونِ عشق، محبت سے کے بھیجتا ہے پھول ۔۔۔ حریم دل کی فضائیں سلام کہتی ہیں
سلام کرنے کو آئی ہے اشکبار نسیم ۔۔۔ غم آشکار گھٹائیں سلام کہتی ہیں
جنہیں سکھا دیا رونا ترے تغافل نے ۔۔۔ وہ بدنصیب نگاہیں سلام کہتی ہیں
پہنچ سکیں نہ جو تیرے حرم کے پردوں تک ۔۔۔ وہ بیقرار سی آہیں سلام کہتی ہیں
جو اُٹھ کے اُٹھ نہ سکیں پھر کبھی تری جانب ۔۔۔ بصد ادب وہی باہیں سلام کہتی ہیں
تمہارے سر کی قسم میں تو کچھ نہیں کہتا ۔۔۔ یہ سوگوار نگاہیں سلام کہتی ہیں

تمہیں دُکھے ہوئے دل نے سلام بھیجا ہی ۔۔۔ جو لب پہ آنہ سکا وہ پیام بھیجا ہے
یہ کیا ہے دیدۂ خونناب بار کا آداب؟ ۔۔۔ یہ کس نے حاصلِ صد صبح و شام بھیجا ہے؟
جسے بھلا نہ سکیں باوجود کوشش کے ۔۔۔ اُسی غریب نے اب بھی سلام بھیجا ہے
جو ہو سکے تو اک انگڑائی لے کے ہنس دینا ۔۔۔ کہ اُس نے قصّۂ ماضی تمام بھیجا ہے

شباب نذر کو لایا ہے مضمحل تسلیم ۔۔۔ خدا کرے کہ قبولِ حریمِ ناز نہ ہو

راحت سعید

ترقی پسند

جوگندر سنگھ کے افسانے جب مقبول ہونا شروع ہوئے تو اُس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ مشہور ادیبوں اور شاعروں کو اپنے گھر بُلائے اور اُن کی دعوت کرے۔ اُس کا خیال تھا کہ یوں اسکی شہرت اور مقبولیت اور بھی زیادہ ہو جائیگی۔

جوگندر سنگھ بڑا خوش فہم انسان تھا مشہور ادیبوں اور شاعروں کو اپنے گھر بُلاکر اور اُن کی خاطر تواضع کرنے کے بعد جب وہ اپنی بیوی امرت کور کے پاس بیٹھتا تو کچھ دیر کے لئے بالکل بھول جاتا کہ اس کا کام ڈاکخانہ میں چٹھیوں کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ اپنی تین گزی پٹیالہ فیشن کی رنگی ہوئی پگڑی اتار کر جب وہ ایک طرف رکھ دیتا تو اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ اُس کے لمبے لمبے کالے گیسوؤں کے نیچے جو چھوٹا سا سر چھپا ہوا ہے اس میں ترقی پسند ادب کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اس احساس سے اس کے دل و دماغ میں ایک عجب قسم کی اہمیت پیدا ہو جاتی اور وہ یہ سمجھتا کہ دنیا میں جسقدر افسانہ نگار اور ناول نویس موجود ہیں سب کے سب اسکے ساتھ ایک نہایت ہی لطیف رشتے کے ذریعے سے منسلک ہیں۔

امرت کور کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اُس کا خاوند لوگوں کو مدعو کرنے پر اس سے ہر بار یہ کیوں کہا کرتا ہے "امرت، یہ جو آج چائے پر آرہے ہیں ہندوستان کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ سمجھیں، بہت بڑے شاعر۔ دیکھو انکی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ رہے"

آنے والا کبھی ہندوستان کا بہت بڑا شاعر ہوتا تھا یا بہت بڑا افسانہ نگار۔ اس سے کم پایہ کا کوئی آدمی وہ کبھی بُلاتا ہی نہیں تھا اور پھر دعوت میں اُونچے اُونچے سُروں میں جو باتیں ہوتی تھیں اُن کا مطلب وہ آج تک نہ سمجھ سکی تھی۔ ان گفتگوؤں میں ترقی پسندی کا ذکر عام ہوتا تھا۔ اس ترقی پسندی کا مطلب بھی امرت کور کو معلوم نہیں ہوا تھا۔

ایک دفعہ جب جوگندر سنگھ ایک بہت بڑے افسانہ نگار کو چائے پلاکر فارغ ہوا اور اندر رسوئی میں آکر بیٹھا تو امرت کور نے پوچھا "یہ موئی ترقی پسندی کیا ہے؟"

جوگندر سنگھ نے پگڑی سمیت اپنے سر کو ایک خفیف سی جنبش دی اور کہا "ترقی پسندی .... اس کا مطلب تم فوراً ہی نہیں سمجھ سکوگی۔ ترقی پسند اس کو کہتے ہیں جو ترقی پسند کرے۔ یہ لفظ فارسی کا ہے۔ انگریزی میں ترقی پسند کو ریڈیکل کہتے ہیں۔ وہ افسانہ نگار یعنی کہانیاں لکھنے والے، جو افسانہ نگاری میں ترقی چاہتے ہوں اُن کو ترقی پسند افسانہ نگار کہتے ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں صرف تین چار ترقی پسند افسانہ نگار ہیں جن میں میرا نام بھی شامل ہے"

جوگندر سنگھ عادتاً انگریزی لفظوں اور جملوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اُس کی یہ عادت پک کر اب طبیعت بن گئی تھی۔ چنانچہ اب وہ بلا تکلف ایک ایسی انگریزی زبان میں سوچتا تھا جو چند مشہور انگریزی ناول نویسوں کے اچھے اچھے چست فقروں پر مشتمل تھی۔ عام گفتگو میں وہ پچاس فی صدی انگریزی لفظ اور انگریزی کتابوں سے چُنے ہوئے فقرے استعمال کرتا تھا۔ افلاطون کو وہ ہمیشہ پلیٹو کہتا تھا۔ اسی طرح ارسطو کو ارسٹوٹل۔ ڈاکٹر سگمنڈ فروئڈ، شوپنہار اور نیٹشے کا ذکر وہ اپنی ہر معرکے کی گفتگو میں کیا کرتا تھا۔ عام بات چیت میں وہ ان فلسفیوں کا نام نہیں لیتا تھا اور بیوی سے گفتگو کرتے وقت وہ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتا تھا کہ انگریزی لفظ اور یہ فلسفی نہ آنے پائیں۔

جوگندر سنگھ سے جب اُس کی بیوی نے ترقی پسندی کا مطلب سمجھا تو اُسے بہت نا امیدی ہوئی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ترقی پسندی کوئی بہت بڑی چیز ہوگی جس پر بڑے بڑے شاعر اور افسانہ نگار اسکے خاوند کے ساتھ مل کر بحث کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب اُس نے یہ سوچا کہ ہندوستان میں صرف تین چار ترقی پسند افسانہ نگار ہیں تو اسکی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوگئی۔ یہ چمک دیکھکر جوگندر سنگھ کے مونچھوں بھرے ہونٹ ایک دبی دبی سی مسکراہٹ کے باعث کپکپائے "امرت .... تمہیں یہ سُنکر خوشی ہوگی کہ ہندوستان کا ایک بہت بڑا آدمی مجھ سے ملنے کی خواہش رکھتا ہے۔ اس نے میرے افسانے پڑھے ہیں اور بہت پسند کئے ہیں"

امرت کور نے پوچھا "یہ بڑا آدمی کون ہے یا آپ کی طرح کہانیاں لکھنے والا"

جوگندر سنگھ نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اُسے اپنے دوسرے ہاتھ کی پشت پر تھپتھپاتے ہوئے کہا "یہ آدمی کوئی بھی ہو افسانہ نگار بھی ہے لیکن اسکی سب سے بڑی خوبی جو اسکی نہ مٹنے والی شہرت کا باعث ہے

اور ہی ہے"

"وہ خوبی کیا ہے؟"

"وہ ایک آوارہ گرد ہے"

"آوارہ گرد؟"

"ہاں، وہ ایک آوارہ گرد ہے جس نے آوارہ گردی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا ہے — وہ ہمیشہ گھومتا رہتا ہے — کبھی کشمیر کی ٹھنڈی وادیوں میں ہوتا ہے اور کبھی ملتان کے تپتے ہوئے میدانوں میں — کبھی لنکا میں کبھی تبت میں....."

امرت کور کی دلچسپی بڑھ گئی "مگر یہ کرتا کیا ہے؟"

"گیت اکٹھے کرتا ہے — ہندوستان کے ہر حصے کے گیت — پنجابی، گجراتی، مرہٹی، پشاوری، سرحدی، کشمیری، مارواڑی،... ہندوستان میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں، ان کے جتنے گیت اس کو ملتے ہیں اکٹھے کرلیتا ہے"

"اتنے گیت اکٹھے کرکے کیا کریگا؟"

"کتابیں چھاپتا ہے، مضمون لکھتا ہے تاکہ دوسرے بھی یہ گیت سُن سکیں۔ انگریزی زبان کے کئی رسالوں میں اسکے مضمون چھپ چکے ہیں — گیت اکٹھے کرنا اور پھر ان کو سلیقے کے ساتھ پیش کرنا کوئی معمولی کام نہیں۔ وہ بہت بڑا آدمی ہے امرت، بہت بڑا آدمی ہے اور دیکھو اُس نے مجھے خط کیسا لکھا ہے"

یہ کہکر جوگندر سنگھ نے اپنی بیوی کو وہ خط پڑھکر سنایا جو ہرندر ناتھ ترپاٹھی نے اس کو اپنے گاؤں سے ڈاکخانہ کے پتے سے بھیجا تھا۔ اس خط میں ہرندر ناتھ ترپاٹھی نے بڑی میٹھی زبان میں جوگندر سنگھ کے افسانوں کی تعریف کی تھی اور لکھا تھا کہ آپ ہندوستان کے ترقی پسند افسانہ نگار ہیں۔ جب یہ فقرہ جوگندر سنگھ نے پڑھا تو بول اٹھا "لو دیکھو ترپاٹھی صاحب بھی لکھتے ہیں کہ میں ترقی پسند ہوں"

جوگندر سنگھ نے پورا خط سُنانے کے بعد ایک دو سیکنڈ اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور راز معلوم کرنے کے لئے پوچھا "کیوں —؟"

امرت کور اپنے خاوند کی تیز نگاہی کے باعث کچھ جھینپ سی گئی اور مسکراکر کہنے لگی "مجھے کیا معلوم — بڑے آدمیوں کی باتیں بڑے ہی سمجھ سکتے ہیں!"

جوگندر سنگھ نے اپنی بیوی کی اس ادا پر غور نہ کیا۔ وہ دراصل ہرندر ناتھ ترپاٹھی کو اپنے یہاں بُلانے اور اُسے کچھ دیر ٹھہرانے کی بابت سوچ رہا تھا "امرت، میں کہتا ہوں ترپاٹھی صاحب کو دعوت دیدی جائے، کیا خیال ہے تمہارا... لیکن میں یہ سوچتا ہوں کیا پتہ ہے وہ انکار کردے — بہت بڑا آدمی ہے، ممکن ہے وہ ہماری اس دعوت کو خوشامد سمجھے"

ایسے موقعوں پر وہ بیوی کو اپنے ساتھ شامل کرلیا کرتا تھا تاکہ دعوت کا بوجھ دو آدمیوں میں بٹ جائے۔ چنانچہ جب اُس نے "ہماری" کہا تو امرت کور نے جو اپنے خاوند جوگندر سنگھ کی طرح بے حد سادہ لوح تھی ہرندر ناتھ ترپاٹھی سے دلچسپی لینا شروع کردی۔ حالانکہ اس کا نام ہی اُس کے لئے ناقابلِ فہم تھا اور یہ بات بھی اُس کی سمجھ سے بالاتر تھی کہ ایک آوارہ گرد گیت جمع کرکرکے کیسے بہت بڑا آدمی بن سکتا ہے۔ جب اُس سے یہ کہا گیا تھا کہ ہرندر ناتھ ترپاٹھی گیت جمع کرتا ہے تو اُسے اپنے خاوند کی ایک سُنائی ہوئی بات یاد آگئی تھی کہ ولایت میں کئی لوگ تیتریاں پکڑنے کا کام کرتے ہیں اور یوں کافی روپیہ کماتے ہیں۔ چنانچہ اُس نے خیال کیا تھا کہ شاید ترپاٹھی صاحب نے گیت جمع کرنے کا کام ولایت کے کسی آدمی سے سیکھا ہوگا۔

جوگندر سنگھ نے پھر اپنا اندیشہ ظاہر کیا "ممکن ہے وہ ہماری اس دعوت کو خوشامد سمجھے"

"اس میں خوشامد کی کیا بات ہے۔ اور بھی تو کئی بڑے آدمی آپکے پاس آتے ہیں۔ آپ ان کو خط لکھدیجئے، میرا خیال ہے وہ آپکی دعوت ضرور قبول کرلیں گے اور پھر ان کو بھی تو آپ سے ملنے کا بہت شوق ہے — ہاں، یہ تو بتایئے کیا اُنکی بیوی بچے ہیں؟"

"بیوی۔ بچے؟" جوگندر سنگھ نے خط کا مضمون انگریزی زبان میں سوچتے ہوئے کہا "ہونگے — ضرور ہوں گے — ہاں ہیں۔ میں نے اُنکے ایک مضمون میں پڑھا تھا، اُن کی بیوی بھی ہے اور ایک بچی بھی ہے"

یہ کہکر جوگندر سنگھ اُٹھا، خط کا مضمون اسکے دماغ میں مکمل ہوچکا تھا۔ دوسرے کمرے میں جاکر اُس نے چھوٹے سائز کا پیڈ نکالا جس پر وہ خاص خاص آدمیوں کو خط لکھا کرتا تھا اور ہرندر ناتھ ترپاٹھی کے نام اُردو میں دعوت نامہ لکھا۔ یہ اس مضمون کا ترجمہ تھا جو اُس نے اپنی بیوی سے گفتگو کرتے وقت سوچ لیا تھا۔

تیسرے روز ہرندر ناتھ ترپاٹھی کا جواب آیا۔ جوگندر سنگھ نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ لفافہ کھولا۔ جب اُس نے پڑھا کہ اُسکی دعوت قبول کرلی گئی ہے تو اُس کا دل اور بھی دھڑکنے لگا۔ اسکی بیوی امرت کور دھوپ میں اپنے چھوٹے بچے کے کیسوں میں دہی ڈال کر مل رہی تھی کہ جوگندر سنگھ لفافہ ہاتھ میں لیکر اس کے پاس پہونچا "انہوں نے ہماری دعوت قبول کرلی، کہتے ہیں کہ وہ لاہور یوں بھی ایک ضروری کام سے آرہے تھے — اپنی تازہ کتاب چھپوانے کا ارادہ رکھتے ہیں.... اور ہاں، انہوں نے تم کو

پرنام کہا ہے۔"

امرت کور اس احساس سے بہت خوش ہوئی کہ اتنے بڑے آدمی نے جس کا کام گیت اکٹھے کرنا ہے اس کو پرنام کہا ہے۔ چنانچہ اُس نے دل ہی دل میں خدا کا شکرادا کیا کہ اس کا بیاہ ایسے آدمی سے ہوا جس کو ہندوستان کا ہر بڑا آدمی جانتا ہے۔

سردیوں کا موسم تھا۔ نومبر کے پہلے دن تھے۔ جوگندر سنگھ صبح سات بجے بیدار ہو گیا اور دیر تک بستر میں آنکھیں کھولے پڑا رہا۔ اُس کی بیوی امرت کور اور اس کا بچہ دونوں لحاف میں لیٹے پاس والی چارپائی پر پڑے تھے۔ جوگندر سنگھ نے سوچنا شروع کیا۔ ترپاٹھی صاحب سے مل کر اُسے کتنی خوشی ہوگی اور خود ترپاٹھی صاحب کو بھی یقیناً اس سے مل کر مسرت حاصل ہوگی۔ کیونکہ وہ ہندوستان کا جواں افکار افسانہ نویس اور ترقی پسند ادیب ہے — ترپاٹھی صاحب سے وہ ہر موضوع پہ گفتگو کریگا۔ گیتوں پر، دیہاتی بولیوں پر، افسانوں پر اور تازہ جنگی حالات پر — وہ ان کو بتائے گا کہ دفتر کا ایک محنتی کلرک ہونے پر بھی وہ کیسے اچھا افسانہ نگار بن گیا۔ یہ کیا عجیب سی بات نہیں کہ ڈاکخانے میں چٹھیوں کی دیکھ بھال کرنے والا انسان طبعاً آرٹسٹ ہو۔

جوگندر سنگھ کو اس بات پر بہت ناز تھا کہ ڈاکخانہ میں مزدوروں کی طرح چھ سات گھنٹے کام کرنے کے بعد بھی وہ اتنا وقت نکال لیتا ہے کہ ایک ماہانہ پرچہ مرتب کرتا ہے اور دو تین پرچوں کے لئے ہر مہینے ایک ایک افسانہ بھی لکھتا ہے۔ دوستوں کو ہر ہفتے جو لمبے چوڑے خط لکھے جاتے تھے اُن کا ذکر الگ رہا۔

دیر تک وہ بستر پر لیٹا ہرندرناتھ ترپاٹھی سے اپنی پہلی ملاقات کی ذہنی تیاریاں کرتا رہا۔ جوگندر سنگھ نے اُس کے افسانے اور مضمون پڑھے تھے اور اُس کا فوٹو بھی دیکھا تھا اور کسی کے افسانے پڑھکر اور فوٹو دیکھکر وہ عام طور پر یہی محسوس کیا کرتا تھا کہ اس نے اُس آدمی کو اچھی طرح جان لیا ہے۔ لیکن ہرندرناتھ ترپاٹھی کے معاملے میں اُس کو اپنے اوپر اعتبار نہیں آتا تھا۔ کبھی اس کا دل کہتا تھا کہ ترپاٹھی اُس کے لئے بالکل اجنبی ہے۔ اس کے افسانہ نگار دماغ میں بعض اوقات ترپاٹھی ایک ایسے آدمی کی صورت میں پیش ہوتا تھا جس نے کپڑوں کے بجائے اپنے جسم پر کاغذ لپیٹ رکھے ہوں۔ اور جب وہ کاغذوں کے متعلق سوچتا تھا تو اُسے انارکلی کی وہ دیوار یاد آجاتی تھی جس پر سینما کے اشتہار اوپر تلے اتنی تعداد میں چپکے ہوئے تھے کہ ایک اور دیوار بن گئی تھی۔

جوگندر سنگھ بستر پر لیٹا دیر تک سوچتا رہا کہ اگر وہ ایسا ہی آدمی نکل آیا تو اُس کو سمجھنا بہت دشوار ہو جائے گا۔ مگر بعد میں جب اس کو اپنی ذہانت کا خیال آیا تو اُسکی مشکلیں آسان ہو گئیں اور وہ اٹھکر ہرندرناتھ ترپاٹھی کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

خط و کتابت کے ذریعے سے یہ طے ہو گیا تھا کہ ہرندرناتھ ترپاٹھی خود جوگندر سنگھ کے مکان پر چلا آئے گا کیونکہ ترپاٹھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ لاری سے سفر کریگا یا ریلوے ٹرین سے۔ بہرحال یہ بات تو قطعی طور پر طے ہو گئی تھی کہ جوگندر سنگھ سوموار کو ڈاکخانے سے چھٹی لیکر سارا دن اپنے مہمان کا انتظار کرے گا۔

نہا دھوکر اور کپڑے بدل کر جوگندر دیر تک باورچی خانے میں اپنی بیوی کے پاس بیٹھا رہا۔ دونوں نے چاء دیر سے پی، اس خیال سے کہ شاید ترپاٹھی آجائے۔ لیکن جب وہ نہ آیا تو انہوں نے کیک وغیرہ سنبھال کر الماری میں رکھدئے اور خود خالی چاء پی کر مہمان کے انتظار میں بیٹھ گئے۔

جوگندر باورچی خانے سے اٹھکر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر جب اُس نے اپنی ڈاڑھی کے بالوں میں لوہے کے چھوٹے چھوٹے کلپ اٹکانے شروع کئے کہ وہ نیچے کی طرف تہہ ہو جائیں تو باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈاڑھی کو ویسے ہی نامکمل حالت میں چھوڑ کر اُس نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا۔ جیسا کہ اس کو معلوم تھا سب سے پہلے اُسکی نظر ہرندرناتھ ترپاٹھی کی سیاہ گھنی ڈاڑھی پر پڑی جو اُس کی ڈاڑھی سے دوگنا بڑی تھی بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔

ہرندرناتھ کے ہونٹوں پر جو بڑی بڑی مونچھوں کے اندر چھپے ہوئے تھے مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اُس کی ایک آنکھ جو قدرے ٹیڑھی تھی زیادہ ٹیڑھی ہو گئی اور اُس نے اپنی لمبی لمبی زلفوں کو ایک طرف جھٹک کر اپنا ہاتھ جو کسی کسان کا ہاتھ معلوم ہوتا تھا جوگندر سنگھ کی طرف بڑھا دیا۔

جوگندر سنگھ نے جب اُسکے ہاتھ کی مضبوط گرفت محسوس کی اور اس کو ترپاٹھی کا وہ چرمی تھیلا نظر آیا جو حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح پھولا ہوا تھا تو وہ بہت متاثر ہوا۔ وہ صرف اس قدر کہہ سکا "ترپاٹھی صاحب آپ سے مل کر مجھے بیحد خوشی ہوئی ہے۔"

ہرندرناتھ ترپاٹھی کو آئے اب پندرہ روز ہو چکے تھے۔ اسکی آمد کے دوسرے روز ہی اُس کی بیوی اور بچی بھی آگئی تھیں۔ یہ دونوں ترپاٹھی کے ساتھ ہی گاؤں سے آئی تھیں مگر دو روز کے لئے مزنگ میں ایک دُور کے رشتے دار کے ہاں ٹھہر گئی تھیں اور چونکہ ترپاٹھی نے اس رشتے دار کے پاس اُن کا زیادہ دیر تک ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا تھا اس لئے اُس نے

ان کو اپنے پاس بلوالیا تھا۔

پہلے چار دن بڑی دلچسپ باتوں میں صرف ہوئے۔ ہرندرناتھ تریپاٹھی سے اپنے افسانوں کی تعریف سنکر جوگندر بہت خوش ہوتا رہا۔ اس نے ایک مکمل افسانہ جو کہ غیر مطبوعہ تھا تریپاٹھی کو سنایا اور داد حاصل کی۔ دو نامکمل افسانے بھی سنائے جن کے متعلق تریپاٹھی نے اچھی رائے کا اظہار کیا۔ ترقی پسند ادب پر بھی بحثیں ہوتی رہیں۔ مختلف افسانہ نگاروں کی فنی کمزوریاں نکالی گئیں۔ نئی اور پرانی شاعری کا مقابلہ کیا گیا۔ غرضکہ یہ چار دن بڑی اچھی طرح گذرے اور جوگندر سنگھ، تریپاٹھی کے تشخص سے بہت متاثر ہوا۔ اسکی گفتگو کا انداز جس میں بیک وقت بچپنا اور بڑھاپا تھا جوگندر کو بہت پسند آیا۔ اس کی لمبی ڈاڑھی جو اس کی اپنی ڈاڑھی سے بیس گنا بڑی تھی اسکے خیالات پر چھاگئی اور اس کی کالی کالی زلفیں جن میں دیہاتی گیتوں کی سی روانی تھی ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے رہنے لگیں۔ ڈاکخانے میں چٹھیوں کی دیکھ بھال کرنے کے دوران میں بھی تریپاٹھی کی یہ زلفیں اسے نہ بھولتیں۔

چار دن میں تریپاٹھی نے جوگندر سنگھ کو موہ لیا۔ وہ اس کا گرویدہ ہوگیا۔ اس کی ٹیڑھی آنکھ میں بھی اس کو خوبصورتی نظر آنے لگی، بلکہ ایک بار تو اس نے سوچا "اگر ان کی آنکھ میں ٹیڑھا پن نہ ہوتا تو چہرے پر یہ بزرگی کبھی پیدا نہ ہوتی"۔

تریپاٹھی کے موٹے موٹے ہونٹ جب تریپاٹھی کی گھنی مونچھوں کے پیچھے ہلتے تو جوگندر ایسا محسوس کرتا کہ جھاڑیوں میں پرندے بول رہے ہیں۔ تریپاٹھی بھرے ہوئے بولتا تھا اور بولتے بولتے جب وہ اپنی لمبی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتا تو جوگندر کے دل کو بہت راحت پہونچتی۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اسکے دل پر پیار سے ہاتھ پھیرا جا رہا ہے۔

چار روز تک جوگندر ایسی فضا میں رہا جس کو اگر وہ اپنے کسی افسانے میں بھی بیان کرنا چاہتا تو نہ کرسکتا لیکن پانچویں روز ایکا ایکی تریپاٹھی نے اپنا چرمی تھیلا کھولا اور اس کو اپنے افسانے سنانے شروع کئے اور دس روز تک وہ متواتر اس کو اپنے افسانے سناتا رہا۔ اس دوران میں تریپاٹھی نے جوگندر کو کئی کتابیں سنادیں۔

جوگندر سنگھ تنگ آگیا۔ اب اس کو افسانوں سے نفرت پیدا ہوگئی۔ تریپاٹھی کا چرمی تھیلا جس کا پیٹ بنیوں کی توند کی طرح پھولا ہوا تھا اس کے لئے ایک مستقل عذاب بن گیا۔ ہر روز شام کو دفتر سے لوٹتے ہوئے اسے اس بات کا کھٹکا رہنے لگا کہ کمرے میں داخل ہوتے ہی اسکی تریپاٹھی سے ملاقات ہوگی۔ اِدھر اُدھر کی چند سرسری باتیں ہوں گی، وہ چرمی تھیلا کھولا جائے گا اور اس کو ایک یا دو طویل افسانے سنا دئے جائیں گے۔

جوگندر سنگھ ترقی پسند تھا۔ یہ ترقی پسندی اگر اسکے اندر نہ ہوتی تو وہ صاف لفظوں میں تریپاٹھی سے کہدیتا "بس۔ بس۔ تریپاٹھی صاحب بس۔ بس اب مجھ میں آپکے افسانے سننے کی طاقت نہیں رہی" مگر وہ سوچتا "نہیں نہیں۔ میں ترقی پسند ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیئے۔ دراصل یہ میری کمزوری ہے کہ اب انکے افسانے مجھے اچھے نہیں لگتے۔ ان میں ضرور کوئی نہ کوئی خوبی ہوگی.... اس لئے کہ ان کے پہلے افسانے مجھے خوبیوں سے بھرے ہوئے نظر آتے تھے... میں... میں... متعصب ہوگیا ہوں"۔

ایک ہفتے سے زیادہ عرصے تک جوگندر سنگھ کے ترقی پسند دماغ میں یہ کشمکش جاری رہی اور وہ سوچ سوچ کر اس حد تک پہونچ گیا جہاں سوچ بچار ہو ہی نہیں سکتا۔ طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آتے مگر وہ ان کی ٹھیک طور پر جانچ پڑتال نہ کرسکتا۔ اس کی ذہنی افراتفری آہستہ آہستہ بڑھتی گئی اور وہ ایسا محسوس کرنے لگا کہ ایک بہت بڑا مکان ہے جس میں بے شمار کھڑکیاں ہیں۔ اس مکان کے اندر وہ اکیلا ہے۔ آندھی آگئی ہے، کبھی اس کھڑکی کے پٹ بجتے ہیں، کبھی اس کھڑکی کے اور اسکی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اتنی کھڑکیوں کو ایک دم بند کیسے کرے۔

جب تریپاٹھی کو اس کے یہاں آئے بیس روز ہوگئے تو اسے بےچینی محسوس ہونے لگی۔ تریپاٹھی اب شام کو نیا افسانہ لکھ کر جب اسے سناتا تو جوگندر کو ایسا محسوس ہوتا کہ بہت سی مکھیاں اسکے کانوں کے پاس بھنبھنا رہی ہیں۔ وہ کسی اور ہی سوچ میں غرق ہوتا۔

ایک روز تریپاٹھی نے جب اس کو اپنا تازہ افسانہ سنایا جس میں کسی عورت اور مرد کے جنسی تعلقات کا ذکر تھا تو یہ سوچ کر اس کے دل کو دھکا سا لگا کہ پورے اکیس دن اپنی بیوی کے پاس سونے کے بجائے وہ ایک لمڈھینگ کے ساتھ ایک ہی لحاف میں سوتا رہا ہے۔ اس احساس نے جوگندر کے دل و دماغ میں ایک لمحے کیلئے انقلاب برپا کر دیا۔ "یہ کیسا مہمان ہے کہ جونک کی طرح چمٹ کر ہی رہ گیا ہے۔ یہاں سے ہلنے کا نام ہی نہیں لیتا.... اور.... اور.... میں ان کی بیوی صاحبہ کو تو بھول ہی گیا تھا اور انکی بچی.. .... سارا گھر اٹھکر یہاں چلا آیا ہے۔ ذرہ بھر خیال نہیں کہ ایک غریب آدمی کا کچومر نکل جائیگا۔ میں ڈاکخانہ میں ملازم ہوں صرف پچاس روپے ماہوار کماتا ہوں، آخر کب تک ان کی خاطر تواضع کرتا رہوں گا اور پھر افسانے .... اس کے افسانے جو کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتے۔ میں انسان ہوں۔

لوہے کا ٹرنک نہیں ہوں جو ہر روز اُس کے افسانے سنتا رہوں۔۔۔۔ اور کس قدر غضب ہے کہ میں اپنی بیوی کے پاس تک نہیں گیا۔۔۔ سردیوں کی یہ راتیں ضائع تو ہو رہی ہیں۔۔۔۔"

پچیس دنوں کے بعد جوگندر، ترپاٹھی کو ایک نئی روشنی میں دیکھنے لگا۔ اب اس کو ترپاٹھی کی ہر چیز معیوب نظر آنے لگی۔ اس کی ٹیڑھی آنکھ جس میں جوگندر پہلے خوبصورتی دیکھتا تھا اب صرف ایک ٹیڑھی آنکھ تھی۔ اُس کی کالی زلفوں میں بھی اب جوگندر کو وہ ملائمی دکھائی نہیں دیتی تھی اور اُس کی ڈاڑھی دیکھ کر اب وہ سوچتا تھا کہ اتنی لمبی ڈاڑھی رکھنا بہت بڑی حماقت ہے۔

جب ترپاٹھی کو اُسکے یہاں آئے پچیس دن ہو گئے تو ایک عجیب و غریب کیفیت اسکے اوپر طاری ہو گئی۔ وہ اپنے آپ کو اجنبی سمجھنے لگا۔ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ کبھی جوگندر سنگھ کو جانتا تھا مگر اب نہیں جانتا۔ اپنی بیوی کے متعلق وہ سوچتا "جب ترپاٹھی چلا جائے گا اور سب ٹھیک ہو جائیگا تو میری نئے سرے سے شادی ہوگی ۔۔۔ میری وہ پرانی زندگی جس کو ٹاٹ کے طور پر لوگ استعمال کر رہے ہیں پھر عود کر آئیگی۔۔۔ میں پھر اپنی بیوی کے ساتھ سو سکونگا۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔۔"

اس کے آگے جب وہ سوچتا تو جوگندر سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے اور اسکے حلق میں کوئی تلخ سی چیز پھنس جاتی۔ اس کا جی چاہتا کہ دوڑا دوڑا اندر جائے اور امرت کور کو جو کبھی اس کی بیوی ہوا کرتی تھی اپنے گلے سے لگا لے اور رونا شروع کر دے۔ مگر ایسا کرنے کی ہمت اس میں نہیں تھی کیونکہ وہ ترقی پسند افسانہ نگار تھا۔

کبھی کبھی جوگندر سنگھ کے دل میں یہ خیال دودھ کے ابال کی طرح اٹھتا کہ ترقی پسندی کا لحاف جو اُس نے اوڑھ رکھا ہے اُتار پھینکے اور چلانا شروع کر دے "ترپاٹھی، ترقی پسندی کی ایسی تیسی۔ تم اور تمہارے اکٹھے کئے ہوئے گیت سب بکواس ہیں ۔۔۔ مجھے اپنی بیوی چاہیئے۔۔۔۔ تمہاری خواہشیں تو ساری گیتوں میں جذب ہو چکی ہیں مگر میں ابھی نوجوان ہوں۔۔۔ میری حالت پر رحم کرو۔۔۔۔ ذرا غور تو کرو میں جو ایک منٹ اپنی بیوی کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا پچیس دنوں سے تمہارے ساتھ ایک ہی لحاف میں سو رہا ہوں۔۔۔۔ کیا یہ ظلم نہیں؟"

جوگندر سنگھ بس گھول کے رہ جاتا۔ ترپاٹھی اس کی حالت سے بے خبر ہر روز شام کو اُسے اپنا تازہ افسانہ سنا دیتا اور اُسکے ساتھ لحاف میں سو جاتا۔

جب ایک مہینہ گذر گیا تو جوگندر سنگھ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ موقع پا کر غسل خانے میں وہ اپنی بیوی سے ملا۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس ڈر کے مارے کہ ترپاٹھی کہیں نہ آ جائے اُس نے جلدی سے اُس کا بوسہ لیا جیسے ڈاکخانے میں لفافوں پر مہر لگائی جاتی ہے اور کہا "آج رات۔۔۔ تم جاگتی رہنا۔ میں ترپاٹھی سے یہ کہہ کر باہر جا رہا ہوں کہ رات کے دو ڈھائی بجے واپس آؤں گا۔ لیکن میں جلدی آ جاؤں گا۔ بارہ بجے ۔۔۔ پورے بارہ بجے میں ہولے ہولے دستک دونگا۔ تم چپکے سے دروازہ کھول دینا اور دیکھو۔۔۔۔ ترپاٹھی بالکل الگ تھلگ ہے۔ لیکن تم احتیاط کے طور پر وہ دروازہ جو غسل خانے کی طرف کھلتا ہے بند کر دینا۔"

بیوی کو اچھی طرح سمجھا کر وہ ترپاٹھی سے ملا اور اس سے رخصت لیکر چلا گیا۔ بارہ بجنے میں چار سرد گھنٹے باقی تھے جن میں سے دو جوگندر سنگھ نے اپنی سائیکل پر ادھر ادھر گھومنے میں کاٹے۔ اس کو سردی کی شدت کا بالکل احساس نہ ہوا اس لئے کہ بیوی سے ملنے کا خیال کافی گرم تھا۔

دو گھنٹے سائیکل پر گھومنے کے بعد وہ اپنے مکان کے پاس میدان میں بیٹھ گیا اور محسوس کرنے لگا کہ وہ رومانی ہو گیا ہے۔ جب اس نے سرد رات کی دھندلی خاموشی کا خیال کیا تو اُسے یہ ایک جانی پہچانی چیز معلوم ہوئی۔ اور ٹھٹھرے ہوئے آسمان پر تارے چمک رہے تھے جیسے بڑے بڑے موتی ٹھنڈ سے جم کر موتی بن گئی ہیں۔ کبھی کبھی ریلوے انجن کی چیخ خاموشی کو چھیڑ دیتی اور جوگندر سنگھ کا افسانہ نگار دماغ یہ سوچتا کہ خاموشی بہت بڑا برف کا ڈھیلا ہے اور سیٹی کی آواز میخ ہے جو اُسکے سینے میں کھب گئی ہے۔

بہت دیر تک جوگندر ایک نئے قسم کے رومان کو اپنے دل و دماغ میں پھیلاتا رہا اور رات کی اندھیاری خوبصورتیوں کو گنتا رہا۔ ایکا ایکی ان خیالات سے چونک کر اُس نے گھڑی میں وقت دیکھا تو بارہ بجنے میں دو منٹ باقی تھے۔ اٹھ کر اُس نے گھر کا رخ کیا اور دروازے پر ہولے سے دستک دی۔ پانچ سکنڈ گذر گئے، دروازہ نہ کھلا۔ ایکبار اُس نے پھر دستک دی۔

دروازہ کھلا۔ جوگندر سنگھ نے ہولے سے کہا "امرت۔۔۔۔"

اور جب نظریں اٹھا کر اُس نے دیکھا تو امرت کور کے بجائے ترپاٹھی کھڑا تھا۔ اندھیرے میں جوگندر سنگھ کو ایسا معلوم ہوا کہ ترپاٹھی کی ڈاڑھی اتنی لمبی ہو گئی ہے کہ زمین کو چھو رہی ہے۔ اُس کو ترپاٹھی کی آواز سنائی دی "تم جلدی آ گئے۔۔۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا۔۔۔ میں نے ابھی ابھی ایک افسانہ مکمل کیا ہے ۔۔۔ آؤ سنو!"

سعادت حسن منٹو

افسانہ نمبر

ساقی کا افسانہ نمبر حسب دستور جولائی کے پہلے ہفتے میں شائع ہوگا۔ مندرجہ ذیل حضرات کے افسانے اس میں شامل ہونے کی امید ہے:۔

مولوی عنایت اللہ دہلوی۔ لطیف الدین احمد اکبر آبادی۔ ایم۔ اسلم۔ ڈاکٹر اعظم کریوی۔ صادق الخیری دہلوی۔ حجاب امتیاز علی۔ سعادت حسن منٹو۔ کرشن چندر۔ انصار ناصری۔ ممتاز مفتی۔ عصمت چغتائی۔ راجندر سنگھ بیدی۔ پروفیسر محمد مسلم۔ اوپندر ناتھ اشک۔ آوارہ۔ دیوندر ستیارتھی۔ قیسی رامپوری۔ وجاہت سندیلوی۔ بلونت سنگھ۔ سید رفیق حسین۔ اشرف صبوحی۔ مہندر ناتھ۔ احمد ندیم قاسمی۔ مدھوسودن۔ ڈاکٹر نصیر الدین۔ بھارت چند کھنہ۔ ساون مل ترکھا۔ ریاض رومی۔ اسعد گیلانی۔ شمشیر سنگھ نرولا۔ شفیق الرحمٰن۔ عصیم بیگ چغتائی۔ اختر الایمان۔

مندرجہ ذیل حضرات کی افسانوی نظمیں شامل ہونگی:۔

امین حزیں۔ کوکب شاہجہانپوری۔ شاد عارفی۔ فرحت کانپوری۔ بہزاد لکھنوی۔ سید علی منظور۔ ناشاد ایم۔ اے۔ راحت سعید۔ تابش دہلوی۔ مخمور جالندھری۔ ماہر القادری۔ صفیہ شمیم۔

امید ہے کہ ان افسانہ نگاروں کے علاوہ اور افسانہ نگاروں کے افسانے بھی شریک ہونگے۔

"افسانہ نمبر" کی قیمت ایک روپیہ ہوگی۔ مستقل خریداروں سے اس کی قیمت علیحدہ نہیں لی جائے گی۔

مُجرّب اور خالص ادویہ

اگر آپ کو مجرب اور خالص ادویہ کی ضرورت ہے تو آپ ہمارے دواخانہ سے طلب کریں۔ ہر قسم کی ادویہ ہم آپ کو مہیا کر کے دینگے۔ اسکے علاوہ ہمارے دواخانے میں خاص نسخے بھی تیار ہوتے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:-

تریاق کبیر یہ گھر کا ڈاکٹر ہے۔ سر درد، پیٹ درد، دانت کے درد، گلے کے درد، سینہ کے درد، اسہال، سوء ہضمی، ہیضہ وغیرہ کے مریضوں کو اس دوا کے لگانے یا پلانے سے فوراً ہی فائدہ ہوتا ہے۔ بچھو، کیڑا، سانپ کاٹے تو انکے زخموں کے لئے یہ تریاق ہے۔ بخار وغیرہ میں بھی اس سے فائدہ ہوتا ہے۔ عام مرضوں میں ڈاکٹر کی ضرورت ہی نہیں رہتی ہے۔ ہر گھر میں اس کا موجود ہونا نہایت ہی ضروری ہے۔ قیمت چھوٹی شیشی [illegible] درمیانی شیشی [illegible] بڑی شیشی [illegible] اسکے اثر کے متعلق ذیل کا سرٹیفکٹ ملاحظہ فرمائیں:-

جناب سید جلال الدین صاحب [illegible] تحریر فرماتے ہیں کہ "مجھ عرصہ دو سال سے معدے کی سخت تکلیف تھی۔ جس کی وجہ سے ایک چھٹانک غذا ہضم ہونی مشکل ہو گئی تھی۔ لیکن دواخانہ خدمت خلق قادیان سے تریاق کبیر بطور نمونہ لیا۔ اسے شروع کئے چند دن ہی گذرے ہونگے کہ اس نے حیرت انگیز فائدہ کیا۔ کھانا وغیرہ بخوبی ہضم ہو جاتا ہے اور خوب بھوک لگتی ہے۔ اور خدا کے فضل سے جو بدنی [illegible] کمزوری تھی اس میں بھی فائدہ ہو رہا ہے۔"

سرمہ ممیرا خاص یہ سرمہ ایک پرانے اور مجرب نسخے کے مطابق تیار کیا گیا ہے اور پرانے آشوب چشم خصوصاً جو نزلہ یا دماغی یا اعصابی کمزوریوں کی وجہ سے ہو۔ اسی طرح نظر کی کمزوری اور دھند کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہوا ہے۔ پرانے ککروں اور آنکھوں کی سرخی کیلئے مفید ہے۔ قیمت فی تولہ [illegible] ۶ ماشہ [illegible] ۳ ماشہ [illegible]

سرمہ اکسیر چشم یہ سرمہ آنکھوں [illegible] بیماریوں کیلئے مفید ہے۔ خصوصاً نئے اور پرانے ککروں کے لئے بہت ہی مفید ہے۔ نیز [illegible] وغیرہ امراض کے لئے مجرب ہے۔ قیمت فی تولہ [illegible] ۶ ماشہ [illegible] ۳ ماشہ ۱۲

ان کے اثر کے متعلق ذیل کے سرٹیفکٹ ملاحظہ فرمائیں:-

مکرمی جناب عبدالرحمن صاحب [illegible] ضلع لائلپور سے تحریر فرماتے ہیں کہ "آپ سے سرمہ ممیرا خاص بطور نمونہ والدہ صاحبہ کیلئے منگوایا تھا جس سے انہیں ککروں کی شکایت بفضل خدا آرام ہے۔ برائے مہربانی فی الحال ۳ ماشہ سرمہ ممیرا خاص قیمتاً اور بھیجدیں۔"

(۲) مکرمی جناب محمد عارف صاحب ایل۔ ایم۔ ایس۔ ایچ تیولہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ "آپ سے سرمہ اکسیر چشم جو بطور نمونہ منگایا تھا میں نے ایک مریض کو استعمال کرایا جس سے اسکو بہت فائدہ ہوا ہے۔ سرمہ اکسیر چشم واقعی ہی اکسیر چشم ثابت ہوا ہے۔"

ہمیں مندرجہ بالا ادویہ اور اپنی دیگر ادویہ کیلئے مقامی ایجنٹوں کی ضرورت ہے جنہیں معقول کمیشن دیا جائیگا۔ جو صاحب یہ نفع مند کام کرنا چاہیں وہ بھی ذیل کے پتہ پر خط وکتابت کریں۔ (نوٹ) دوسری خاص ادویہ کیلئے ہماری فہرست مفت طلب کریں۔

ملنے کا پتہ:- **دواخانہ خدمت خلق۔ قادیان پنجاب**

چندہ سالانہ پانچ روپے ششماہی تین روپے
مع محصولڈاک۔ ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ

ہر سال ساقی کے دو خاص نمبر شائع ہوتے
ہیں مستقل خریداروں سے انکی قیمت نہیں لیجاتی

جلد ۲۴ . ساقی دھلی۔ بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۴۱ء نمبر ۲

قیمت فی پرچہ ۶؍

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

نگاہِ اولیں

موضع کوپا، ڈاکخانہ بکرم ضلع پٹنہ کے سید طفیل احمد مجنون لکھتے ہیں: "شاہد صاحب! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کس قسم کے مہمل لوگوں کو دفتر میں رکھتے ہیں؟ خط پر خط لکھ رہا ہوں لیکن جواب ندارد۔ اگر اس خط کا بھی جواب نہ آیا تو وحدہٗ لاشریک کی قسم امتِ محمدی سے خارج ہو جاؤں کہ ساقی کے پیچھے نہ پڑ جاؤں۔ اپنی جان اپنی مال نہ قربان کر دوں۔ اور دیکھوں گا اور آپ کو بھی معلوم ہو جائیگا کہ ۱۹۴۱ء کے دسمبر تک ساقی کی اشاعت ایکدم بند کیوں ہو گئی۔ یہ آخری خط لکھ رہا ہوں۔ اب مجھے اپنی قسم کا لاج رکھنا ہوگا" اور تو کچھ نہیں، اس خط کو دیکھنے کے بعد سید طفیل احمد صاحب کے تخلص کا فوراً قائل ہو جانا پڑا ؎

اے وقت توخوش کہ وقت ماخوش کردی۔

اگر وہ اس ضروری اعلان کو دیکھ لیتے جو ساقی میں شائع ہوتا رہتا ہے تو اس قسماقسمی کی نوبت نہ آتی۔ اللّٰھم احفظنا من شرورِ انفسنا۔

حضرتِ بہزاد لکھنوی کے دو دیوان ساقی بک ڈپو سے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک کا نام ہے "نغمۂ نور" اور دوسرے کا "کیف و سرور"۔ اب انکا تیسرا دیوان "موجِ طہور" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں وہ نعتیں اور سلام بھی شامل ہیں جو ریڈیو سے نشر ہو کر مقبولِ خاص و عام ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ غزلیں، نظمیں، گیت اور بھجن بھی شریک ہیں۔ آخیر میں بہزاد صاحب کے ابتدائی دور کا کلام بھی درج کیا گیا ہے جس میں ایک عجیب والہانہ انداز پایا جاتا ہے۔ "موجِ طہور" بھی مجلد اور سرورق سے آراستہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ کم رکھی گئی ہے تاکہ خریداروں پر بار نہ ہو۔

ن۔م۔ راشد اطلاع دیتے ہیں کہ ان کی آزاد نظموں کا مجموعہ "ماورا" کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ اس میں چالیس نظمیں ہیں جن میں سے بعض ساقی میں شائع ہو چکی ہیں۔ تعارف مسٹر کرشن چندر نے لکھا ہے اور دیباچہ خود راشد صاحب نے۔ جو حضرات جدید شاعری اور نظمِ آزاد سے دلچسپی رکھتے ہیں انہیں اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔ مکتبۂ اردو لاہور سے یہ کتاب ع۸ میں مل سکیگی۔

اس اشاعت میں چند ادیب پہلی مرتبہ بزمِ ساقی میں شریک ہوئے ہیں۔ گوپال متل، پریم ناتھ شرما، محمد حسن عسکری، ابن داؤد، جوہر فریدی اور ارتضیٰ حسین۔ ان کے مضامین نظم و نثر دیکھکر آپ خوش ہونگے کہ ہماری زبان میں کتنے اچھے اچھے لکھنے والوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ پروفیسر سراج حسین کا مضمون مستقبل کے لباس و غذا کا آئینہ دار ہے۔ ساقی کی گذشتہ اشاعتوں میں پروفیسر صاحب اسی سلسلے کے کئی بیش قیمت مضامین لکھ چکے ہیں۔ جدت طراز ادیب منٹو نے ایک ایک اچھوتے موضوع پر خیال آرائی کی ہے۔ عسکری نے حقِ تنقید خوب ادا کیا ہے۔ مہندر ناتھ کا افسانہ ان کے گذشتہ سب افسانوں سے اچھا ہے۔ رفیق حسین صاحب نے سنجیدہ ظرافت کا اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ شیر محمد اختر کا نفسیاتی افسانہ دلکش ہے۔ دیوندر ستیارتھی نے "ایراوتی" کی کہانی اپنے خاص اسلوب میں لکھی ہے۔ "افسانہ نمبر" میں ان کا افسانہ "کنگ پوش" شائع ہو کر بیحد مقبول ہوا ہے۔ دلی ریڈیو اسٹیشن کے پروگرام ڈائرکٹر نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ یہ افسانہ نشر بھی کیا گیا ہے۔ وجاہت سندیلوی کی "ایک روٹی" اور راانور کا افسانہ "اندھیرا" بہت متاثر کرنے والے افسانے ہیں۔ "ممتحن کی ترنگ" جدید طرز کا مختصر افسانہ ہے۔ حصۂ نظم میں حسبِ دستور ملک کے مشہور شعرا کا کلام درج ہے۔

"شاہد"

ضروری اعلان۔ جو مسودے ساقی کیلئے موصول ہوتے ہیں انہیں حفاظت سے رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاہم اس بارے میں دفترِ ساقی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا۔ اس لئے اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھا کیجئے۔ جو مضامین قابلِ اشاعت قرار پائیں گے صرف انہیں کے بارے میں مزید مراسلت کی جائیگی۔ مضامین ایڈیٹر ساقی کے نام بھیجنے چاہئیں؛ جواب طلب امور کیلئے محصول ڈاک بھیجنا ضروری ہے؛ ساقی ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو بھیجدیا جاتا ہے۔ پرچہ نہ پہونچنے کی شکایت پندرہ ۱۵ تاریخ تک کرنی چاہیئے۔ اسکے بعد پرچہ دوبارہ نہیں بھیجا جائیگا۔

تہذیب کا مستقبل

لباس و غذا

لباس و غذا کو زندگی کی دو اہم ضروریات تصور کیا جاتا ہے اور اگر خواتین کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو غالباً غذا پر پوشاک کے مسئلہ کو فوقیت حاصل ہے۔ اس راز سے غالباً ہر مرد آگاہ ہے کہ عورتوں کی محفلوں میں موجودہ اور آئندہ فیشن اکثر گفتگو کا موضوع رہتا ہے۔ لیکن اس پر بہت کم توجہ کی جاتی ہے کہ فیشن کی متواتر تبدیلیوں میں سائنس کی ایجادات کس طرح ان کی جا و بیجا خواہشات پوری کرنے میں معاون ہوتی ہیں۔

یہ تو آپ سب جانتے ہیں کہ اول اول جسم کو گرم رکھنے یا موسم کے تغیرات سے محفوظ رہنے کیلئے کپڑے پہنے گئے۔ اور اس کا امکان ہے کہ آئندہ غالباً پھر اسی مقصد سے لباس کا استعمال کیا جائے لیکن ایک مدت سے پوشاک جنس مخالف کے لبھانے کا آلہ بنی ہے اور اس میں طرح طرح کی جدتیں خصوصاً اسی نقطۂ نظر سے تراشی جاتی ہیں۔ اس مذاق نے فیشن کے موجدوں کی بھی ذہنیت بدل دی اور پوشاک کی اختراع اصول صحت کے مطابق ہونے کی بجائے نمائش کے لئے ہونے لگی۔ اقتصادی حالت خراب ہوجانے کے علاوہ فیشن پرستی کا ایک اور اثر یہ بھی ہوا کہ اکثریت کی ذہنیت غلامانہ ہوگئی۔ چند مردوں اور عورتوں نے دفعتاً فیشن کی تبدیلی کا اعلان کردیا اور بس کورانہ تقلید شروع ہوگئی۔

آپ نے یہ بھی ستم ظریفی ملاحظہ کی ہوگی کہ کڑاکے کی سردی میں شوہر صاحب تو اونی لبادہ زیب تن کئے ہوئے نشست گاہ میں تشریف فرما ہیں لیکن بیگم صاحبہ سر سے پیر تک آب رواں میں ملبوس ہیں۔

مردوں کی پوشاک گرمی میں نہایت اذیت دہ اور سردی میں اصول صحت کے بالکل خلاف ہوتی ہے۔ بالائے بنفشی (Ultra-Violet) شعاعیں جو تندرستی کے لئے نہایت ضروری ہیں کبھی جسم سے مس نہیں ہونے پاتیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ترکیب شدہ شعاعوں سے علاج کرکے ڈاکٹر اپنی جیبیں گرم کرتے ہیں۔ بھلا کبھی آپ نے یہ بھی غور کیا کہ مردوں اور عورتوں کا کتنا عزیز وقت جسم پر کپڑوں اور دھجیوں کے ٹکڑوں کی جوڑ گانٹھ میں روزانہ ضائع ہوتا ہے۔ اگر یہی وقت جو پوشاک پہننے اور اتارنے کی نذر کیا جاتا ہے زیادہ مفید کاموں میں صرف کیا جائے تو دنیا کی بہت کچھ غربت دور ہوسکتی ہے۔

دیگر ضروریات زندگی کی نسبت لباس میں بہت کم ترقی ہوئی ہے بلکہ کبھی تو یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید گذشتہ چند صدیوں سے تنزلی کی طرف میلان زیادہ ہوتا جارہا ہے۔ متقدمین کم از کم ایسے کپڑے تو پہنتے تھے جو بآسانی دھوئے جاسکتے تھے۔ اور جب وہ سمور یا پوستین استعمال کرتے تھے تو انکا مقصد محض جسم کو گرم رکھنا ہوتا تھا۔ لیکن آج کل سمور نظر فریبی کے لئے زیب تن کیا جاتا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ایک ہی سوٹ کو متواتر دو دن بغیر جراثیم کو دور کئے پہننا اتنا ہی خطرناک ہے جتنا کہ بغیر ہاتھ دھوئے کھانے کے لئے بیٹھ جانا۔ اگر ہمارے موزوں، جوتوں اور کپڑوں کا خوردبینی معائنہ کیا جائے تو ان میں جراثیم کے پوٹ نظر آئیں اور خاکدان سے کہیں زیادہ گندگی پائی جائے۔ لیکن حالات بہت تیزی سے بدل رہے ہیں۔ گذشتہ بیس بائیس سال میں اس ایجاد نے جسے عوام مصنوعی ریشم کہتے ہیں۔ حالانکہ نہ وہ مصنوعی ہے اور نہ ریشم۔ مہذب دنیا کے لباس میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کردی ہے۔ ریان (Rayon) کی ہنگامہ خیز کامیابی سے صنعتی کیمیاگروں کی ہمتیں کچھ ایسی بڑھ گئی ہیں کہ سب وہ مزید انہماک کے ساتھ جدید تحقیقات میں سرگرم ہوگئے ہیں۔ دودھ سے ایک ایسا مرکب تیار کیا گیا ہے جس سے طرح طرح کے خوبصورت زیور اختراع کئے جاتے ہیں اور بظاہر ہاتھی دانت کے معلوم ہوتے ہیں۔ ایلومینیم کے دھاگے سے ساڑی، پیشواز اور لبادے جیسی پوشاک کیلئے نہایت خوبصورت وضع کے کپڑے تیار کئے جاتے ہیں۔ (Lanital) لینیٹال جسے مصنوعی اون کہا جاتا ہے پنیر سے بنایا جاتا ہے۔ اس سے ہر قسم کے کپڑے بنے جاسکتے ہیں، اسپر بارش کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔

اور جملہ خصوصیات اصلی اُون کی سی ہیں۔ روئی کی بھی نقل اُتاری گئی ہے اور مصنوعی روئی اصل کی طرح پائدار ہونیکے علاوہ اس سے زیادہ ارزاں نرخ پر بازار میں دستیاب ہوتی ہے۔ اُس کو انفا سلیولوز ([illegible]) کہتے ہیں۔ اور یہ زود رو درختوں کی لکڑی سے تیار کیجاتی ہے۔ اس ایجاد میں کیمیاگروں نے اس مشکل کو بھی پیش نظر رکھا ہے جس سے دُنیا میں ایسی لکڑی کی قلت یا نایابی پر سابقہ کرنا ہوگا۔ انہوں نے مصنوعی لکڑی بھی تیار کرنی شروع کردی ہے۔ یہ نقل اصل سے کہیں زیادہ پائدار اور ہلکی ہوتی ہے نمی کے خراب اثرات سے بالکل بَری ہے، منوانرد ہونے سے نہ گھستی ہے اور نہ کوئی کمزوری پیدا ہوتی ہے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ یکساں حال پر قایم رہے گی۔ مختصر یہ کہ دُنیا کی نصف آبادی آج لکڑی میں ملبوس نظر آتی ہے۔

جوں جوں نئی تحقیقات سے نئی خصوصیات ظاہر ہونگی نئے قسم کے کپڑے تیار ہونگے۔ لیکن چونکہ آنیوالے دور میں قریبًا غیر فانی کپڑے ایجاد ہوجائیں گے، لاکھوں قیمتی گھنٹے جو آج کل دوکانوں میں انتخاب پر اور لباس کی اختراع اور پہننے پر صرف کئے جاتے ہیں، مفید کاموں کیلئے بچ سکیں گے حفظانِ صحت کے دو اصولوں پر لوگ یقینًا زیادہ انہماک کے ساتھ کاربند ہونگے۔ ایک تو ہوا کا جسم سے مَس ہونیکی ضرورت اور دوسرے بالائے بنفشی ([illegible]) شعاعوں کی جلد تک بہم رسانی۔ پہلے اصول کے ماتحت ممکن ہے کہ آئندہ کا لباس بغیر تکمے، بٹن اور جھالروں کے اوپر سے نیچے تک جسم پر ایک ڈھیلا غلاف سا ہو جو کہ کلائیوں، ٹخنوں اور گلے پر بند ہوگا تاکہ خاک اور جراثیم جلد تک نہ پہونچ سکیں۔ ڈھیلا اس لئے ہوگا کہ لوگوں کو ہوا کی اس خاصیت کا پوری طور سے احساس ہوگا کہ جسم کو گرم رکھنے کیلئے اس سے بہتر زیرجامہ اور کوئی نہیں۔ دوسرے چست لباس پہن کر اپنے جسم کی ساخت کی نمائش کرنا خلاف تہذیب تصور کیا جائے گا۔ دوسری ضرورت کو پورا کرنیکے لئے کیمیاگر انتہائی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ ایسے طریقوں کی فکر میں ہیں جن سے معمولی کپڑے بالائے بنفشی شعاعوں کے جلد تک پہونچنے میں سدِّ راہ نہوں۔ ایک ایسا شیشہ ترکیب دیا گیا ہے جسمیں سے یہ شعاعیں بآسانی گذر سکتی ہیں اور اس شیشہ سے اس خصوصیت کا حامل کپڑا تیار کرنے میں بہت کچھ کامیابی ہوئی ہے۔ مختصر یہ کہ کپڑا سائنس کے اصولوں کے ماتحت تیار کیا جائے گا نہ کہ فیشن پرستوں کی طفلانہ ذہنیت کے مطابق۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ساری دُنیا کا ایک فیشن ہوجائیگا۔ اور نام نہاد فیشن کے موجدوں کا وجود ہی نہ رہے گا۔ ہمہ گیر لاسلکی اور ٹیلیویژن کے زیر اثر فیشن کا تخیل ہی کالعدم ہو جائے گا۔ آج کل فیشن ایبل ہونیکے یہ معنی لئے جاتے ہیں کہ اکثریت سے جداگانہ وضع کا لباس اور سامان آرائش زیب تن ہو اور جونہی کوئی وضع رواج پاجاتی ہے فیشن کے موجد اسے ترک کرکے اور جدتیں تراشتے ہیں۔ لیکن جب فیشن کے مرکزوں سے دُنیا کے ہر گوشے میں ایک سکنڈ کے اندر ہر ایجاد شدہ وضع کی تشہیر ٹیلیویژن کے ذریعہ کی جاسکے گی اور کیمیاگر اپنے ترکیبی اجزا سے ہر چیز کی ارزاں نقل ایجاد کرکے فورًا اسے عوام تک پہونچا سکیں گے تو فیشن کا کوئی نام بھی نہ لے گا۔ کیونکہ اگر آج آپ کوئی نئی چیز پہنئے اور کل وہی ہزاروں کی تعداد میں لوگ پہنے ہوئے نظر آئیں تو نئی وضع کی اختراع کا تخیل ہی پھر کبھی نہ ہوگا۔

آج کل کے لباس تو جسم کو موسم کے اثرات سے بھی محفوظ نہیں رکھ سکتے لیکن جب موسم پر ایک حد تک قابو ہوجائے گا تو لباس کا معیار معین ہوجائے گا اور حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق کپڑوں کی اختراع کی جائے گی۔ پوشاک بنانے والوں کا مطمح نظر ایسا لباس ایجاد کرنا ہوگا جو بآسانی پہنا اور اُتارا جاسکے اور گرد و جراثیم سے پاک کیا جاسکے۔ غالبًا مردوں اور عورتوں کے لباس کی نوعیت ایک ہوجائے گی۔ غسل خانوں میں میلے کپڑوں کی پیٹی کی جگہ ایک ایسا بکس لے لیگا جس میں استعمال شدہ کپڑے شب کو ڈال دئے جائیں گے اور صبح کو جملہ جراثیم سے پاک و صاف نکال لئے جائیں گے۔ اور اگر کہیں میاں نے صبح اُٹھکر غلطی سے بیوی کا لباس زیب تن کرلیا تو ممکن ہے کہ طلاق کی سزا بھگتنی پڑے۔

قدیم مصنوعات کے جمع کرنیوالے اگر باقی رہے تو غالبًا یہی طبقہ ایسا ہوگا جسے لباس میں دلچسپی ہوگی انھیں بڑ ہمور، بند، تکمے وغیرہ تلاش کرنے میں بہت انہماک ہوگا۔ بہت ممکن ہے کہ

یہ لوگ اپنی دوکانوں کے مجسموں پر نمائش کیلئے قدیم لباس چڑھاتے وقت مرد کے مجسمے کو فراک یا ساری اور عورت کے مجسمے کو پتلون سے آراستہ کریں۔ ان کو یہی ترتیب قرین عقل معلوم ہوگی۔ وہ خیال کریں گے کہ مستورات جنہیں چولھا چکی اور جھاڑو سے ہروقت سابقہ رہتا تھا ایسی پوشاک پہنتی ہونگی جو ان کی مشقت میں حارج نہ ہوں اور اپنا سارا وقت کرسیوں پر بیٹھکر گذارنے والے مردوں کو سائے کی ٹھنڈک میں زیادہ آرام ملتا ہوگا۔ بعض طبقوں کی پوشاک ان میں غلط تخیل یا غلامانہ ذہنیت پیدا کرنے کے لئے اختراع کی گئی۔ گوہیوں کے لمبے بال ان کے عیوب پر پردہ ڈالتے ہیں۔ ماماؤں اور اصیلوں کی سادہ وردیاں انہیں ان کی حقیر حیثیت کی یاد دلاتی رہتی ہیں تاکہ ان میں کبھی اپنے مالک سے محبت کے پینگ بڑھانیکی امنگ پیدا نہونے پائے اور بیگم صاحبہ کو رقابت کا اندیشہ نہ رہے۔

اگر طعام سے لباس کا تناسب قائم رہا تو غالباً آیندہ پوشاک میں بہت زیادہ اختصار ہوجائے گا۔ کیونکہ لوگوں کو یہ گوارا نہ ہوگا کہ ان کے جاگنے کا چوتھائی حصہ کھانے کی میز پر صرف ہوجائے اور نہ وہ گوشت و شراب کی بھرمار سے بدہضمی پیدا کرنا امور منصبی کے انجام دینے کیلئے ضروری خیال کریں گے۔ یہ تو لازمی امر ہے کہ غذا کی مقدار بہت کم ہوجائے گی۔ غذا کا مقصد صرف جسم و دماغ کو چست و تندرست رکھنا ہوگا اور اس کی مقدار آجکل کے معیار سے بہت کم ہے جسکا اندازہ آپ اس سے کرسکتے ہیں کہ جیل خانے ملک کی بہترین صحت گاہیں ہیں۔ چند صدی قبل دستور کے مطابق لوگ اتنا کھاتے تھے کہ پھر اپنی جگہ سے ہل نہ سکتے تھے۔ لیکن یہ عادت اس لئے پڑی کہ ذریعۂ معاش غیر مستحکم تھا اور غذا کی رسد پر اعتماد نہ تھا۔ کئی روز کے فاقے کے بعد اگر کوئی تنکا ملا تو جتنا بھی کھایا جا سکا کھا لیا کیونکہ خیال یہ رہتا تھا کہ اب نہ معلوم پھر کب کھانے کا اتفاق ہو۔ آج یہ بات نہیں ہے اور اس قسم کی ذہنیت دماغی نشو ونما کے منافی بھی ہے۔ بھلا مستقبل کے مصروف لوگوں کے پاس اتنا وقت کہاں کہ وہ کھانیکی میز پر گھنٹوں ضائع کرسکیں۔ کیمیا گروں کی کوششیں وقت کی ضرورت کے مطابق غذا میں ایجاد کرنے میں بھی کامیاب ہونگی۔ مثلاً پچھلی جنگ عظیم کے دوران میں پروفیسر ایمڈن (Emden) نے یہ تحقیق کی کہ سات گرین تیزابی سوڈیم فاسفیٹ کھانے سے جسمانی مشقت کی صلاحیت میں بیس فی صدی اضافہ ہوجاتا ہے۔ اور دماغی کام بھی زیادہ عرصے تک کیا جاسکتا ہے۔ یہ مرکب عرصہ تک بغیر مضر اثرات کے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ چند کوئلہ کی کانوں میں کام کرنیوالوں نے اس کا استعمال متواتر نو مہینے تک کیا اور اس کی مدد سے ان کی مشقت کی رفتار میں بہت اضافہ ہوگیا۔ اس سے شراب جیسا نشہ بھی نہیں ہوتا اور زیادہ مقدار میں کھا لینے سے صرف تلئین کا فعل کرتی ہے۔ جرمنی میں اسے ہزاروں لوگ عادتاً استعمال کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ چائے اور قہوہ کی طرح کچھ عرصہ میں اس کا استعمال بھی عام ہوجائے لیکن قبل اس کے کہ ایسی چیزیں مقبول ہوں انسان کی غذاؤں میں بہت کچھ تبدیلیاں ہمہ گیر ہوجائیں گی۔ کیمیا گروں کا رجحان اس شعبہ کی طرف بہت انہماک کے ساتھ ہو رہا ہے۔ ارون (Irvine) نے سیلولوس سے پچانوے فیصدی شکر تیار کی ہے۔ اُمید یہ کی جاتی ہے کہ شکر اور سٹارچ لکڑی کے برادے کی طرح ارزاں ہوجائیں گے۔ پروٹین اور دوسری غذائیں بآسانی کوئلہ اور ہوا وغیرہ سے تیار کی جاسکیں گی۔ تجربات میں کامیابی یہ بتا رہی ہے کہ وہ دن دور نہیں جب کل ضروری غذائیں تجارتی پیمانے پر کیمیائی ترکیب سے بنائی جاسکیں گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زراعت کا شغل عیش و عشرت میں داخل ہوجائے گا۔ اور تمام بنی نوع انسان میں پوری طرح شائستگی آجائے گی۔ ترکیبی غذائیں دارالتجربہ میں تیار ہونگی اور کھاد کے ڈھیروں اور قصاب خانوں کی جگہ بڑے بڑے کارخانوں سے کھانیکی تمام اشیاء مہیا کی جائیں گی۔ شہر اور دیہات میں فرق باقی نہ رہے گا۔

علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ خصائل پر غذا کے اثرات زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آجائیں گے۔ ابھی تک اس شعبہ تحقیق کی طرف زیادہ رجحان نہیں دیا گیا۔ لیکن میں نے سنا ہے کہ انگریزی اسٹیج کا بہت مشہور و معروف اداکار کین (Kean) اپنی غذا کا انتخاب کردار کے مطابق کیا کرتا تھا۔ جابر کا پارٹ ادا کرنے کے لئے سور کا گوشت۔ قاتل کیلئے گائے کا گوشت اور عاشق

کے روپ میں ظاہر ہونے کے لئے بھیڑ کا گوشت اس کی خوراک ہوا کرتی تھی۔ اس کی غذا کے نظام سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاید مختلف قسم کے گوشت سے مختلف درجوں کی دیوانگی پیدا ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے ایک ہندوستانی کو عرصہ تک جاپانی غذائیں کھلا کر اس میں جاپانیوں کی بعض خصوصیات پیدا کرنے میں بھی کامیابی ہوئی ہے۔ ممکن ہے آگے چلکر یہ تحقیق ہو جائے کہ قومی خصوصیات کا بہت کچھ انحصار غذاؤں پر ہے۔

سر رابرٹ میکریسن کو اس مسئلہ پر ہندوستان میں سب سے پہلے تجربہ کرنیکا شرف حاصل ہے۔ انھوں نے چوہوں کو مختلف گروہوں میں بانٹ کر ہر گروہ کو مختلف غذا پر رکھا۔ ایک گروہ کو پٹھانوں کی۔ دوسرے کو سکھوں کی۔ تیسرے کو مدراسی، چوتھے کو بنگالی اور پانچویں کو گجراتی غذا دی گئی۔ جسمانی بناوٹ اور صحت میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں وہ امید کے مطابق تھیں۔ پٹھانی غذا والے چوہے خوب چکنے تندرست اور پھرتیلے ہو گئے، دوسرے نمبر پر سکھ غذا والے تھے اور سب سے کمزور و لاغر اور ذرا استعمال پر کاٹنے کے لئے تیار مدراسی اور بنگالی غذا والے تھے۔ اگر اس تجربہ کی تکمیل کے لئے انسانوں کی ایک جماعت اپنے آپکو سائنسدانوں کے حوالے کر دے تو بہت ممکن ہے کہ صحت اور چال چلن پر غذا کا اثر یقین کی حد تک تحقیق ہو جائے۔

روزمرہ کے استعمال کیلئے کیمیادان ایک ایسا عرق ترکیب دینے کی فکر میں ہیں جو تمام مطلوبہ اوصاف کا حامل ہو۔ فی الحال چار چیزیں لوگوں کے استعمال میں بکثرت ہیں۔ شراب، قہوہ، چائے اور تمباکو۔ اور ان چاروں میں سے ایک بھی خطرات سے مبرا نہیں ہے۔ آنے والے دور میں شراب یقیناً عام طور سے ممنوع ہو جائے گی۔ اس لئے نہیں کہ یہ بہتوں کیلئے خطرناک ہے بلکہ اس لئے کہ بعض لوگوں کیلئے مخدوش ہے۔ اس کی تباہی انہیں اصولوں کے ماتحت ہو گی جنکے تحت میں بلا لائسنس ریوالور رکھنا جرم ہے۔ بندوق اور طمنچہ بعض موقعوں کیلئے کارآمد ہتیار ضرور ہیں لیکن ان کا کسی خبطی یا سودائی کے ہاتھ میں پڑجانا اس قدر مخدوش ہے کہ ان کو قانوناً حاصل کرنے کے لئے لائسنس لینا ضروری قرار دیدیا گیا ہے۔ شراب میں بھی اسی قسم کے اندیشوں کا احتمال ہے اس لئے آئندہ اس کے استعمال کی صرف ان لوگوں کو اجازت دی جائیگی جن کے لئے اس کا مفید ہونا ثابت ہو جائے گا۔ صحیح تعلیم کے ذریعہ ناچنے کے کمرے میں مخمور لوگوں کی موجودگی مذموم سمجھی جانے لگے گی کیونکہ ہماری نسلوں کے تخیل میں یہ بات آہی نہ سکے گی کہ زیادہ کھانے سے اضمحلال تو ایسی محفلوں میں غیر مہذب سمجھا جائے لیکن ایک مدہوش کی احمقانہ حرکات سے روا داری برتی جائے۔ آجکل کی مفرح یا محرک اشیاء کے استعمال کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دماغ کچھ عرصہ کیلئے معطل ہو جاتا ہے اور صحیح احساسات مفقود ہو جاتے ہیں حالانکہ ایسی چیزوں کا استعمال اس کے برعکس مقصد کیلئے ہونا چاہیئے۔ ذہنی اور دماغی تھکن کو دور کر کے مزید صلاحیت پیدا کرنیکے لئے مفرحات ایجاد کئے جائیں گے۔ مثلاً اگر کوئی صناع یا دستکار کام کرتے کرتے جسمانی اور ذہنی تھکن محسوس کرنے لگے تو اسے ایک ایسی محرک شے استعمال کرانیکی ضرورت ہے جو اسکی نگاہوں اور دماغ کو پہلے سے دس گنا روشن کر دے تاکہ کام میں اسکا انہماک بجائے گھٹنے کے بڑھتا رہے۔

غذا اور دوا میں حد فاصل دریافت کرنا کسی قدر مشکل ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ ادویہ یا مرکبات جو دماغ کو معطل کر دیتے ہیں خود بخود متروک ہو جائیں گے کیونکہ رفتار کی ترقی کے ساتھ دماغ کو زیادہ چاق چوبند رکھنے کی ضرورت ہو گی۔ معاشرتی اصلاح کی جماعتوں نے انسانوں کو سنجیدہ رکھنے میں جو کوششیں کی ہیں اُن سے کہیں زیادہ موٹر کار کی ایجاد نے حالات کو سنبھال دیا ہے۔ ایک صحیح الدماغ انسان یہ جانتا ہے کہ موٹر چلاتے وقت اُسے اپنے آپ پر پورا قابو ہونا چاہیئے۔ اور شراب چاہے تھوڑی ہی مقدار میں کیوں نہ پی جائے، دماغ کو معطل کر دیتی ہے، اس لئے وہ اس سے پرہیز رکھتا ہے۔ وہ دردناک حادثے جو مخمور ڈرائیوروں کے ہاتھوں ہوا کرتے ہیں قابلِ افسوس ہیں اور ایسے مجرموں کے لئے کوئی بھی سزا سخت تصور نہیں کی جاسکتی لیکن باوجود ان مستثنیات کے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جہاں سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کو کامیابی نہیں ہو سکی وہاں سائنس نے مشکل کشائی کی اور دُنیا کو ایک حد تک سنجیدہ بنا دیا۔

بہتیرے حادثات تو اس وجہ سے بھی ہوتے ہیں کہ ہم

ابھی تک تیز رفتاری کے عادی نہیں ہوئے۔ تیز رفتار مشینوں پر آنے والے دور کے کاریگروں کو پورے طور پر قابو ہو جائیگا اور انہیں اس صلاحیت پر اتنا فخر ہوگا کہ اسے کھو نیکے لئے وہ کبھی نشی اشیاء کو ہاتھ نہ لگائیں گے۔ لیکن سب مرکبات مُضر نہیں ہوتے۔ مانا کہ تمباکو سے آپ مسموم ہو سکتے ہیں لیکن اعتدال سے زائد روٹی کھا لینے سے بھی سمیت پیدا ہو سکتی ہے۔ بہت عرصے سے دُنیا نے مفرح اور محرک اشیاء کی ایک محدود تعداد پر قناعت کر رکھی ہے۔ لیکن ایک نہ ایک دن مردوں اور عورتوں کے سامنے چائے، قہوہ اور سگریٹ کی بجائے بہت سے دوسرے مرکبات ہونگے جن میں سے وہ اپنے ذریعے کے مطابق انتخاب کر سکیں گے۔ ممکن ہے کہ خون کی ترکیب اور دیگر جسمانی نظام کے مطابق ہر شخص کیلئے موزوں مفرح تشخیص کر دیا جائے۔ اور اعتدال سے زیادہ ان اشیاء کا استعمال سنگین ترین جرم قرار دیدیا جائے۔

گو لباس و غذا کے تعلق کی طرف ابھی تک زیادہ رجحان نہیں ہو رہا لیکن یہ تو امر مسلمہ ہے کہ جذبات حیوانی کے ابھارنے کیلئے ہر قسم کے احساسات کو چھیڑنیکی طرف لوگ ضرور مائل ہو رہے ہیں۔ مختلف رنگوں کی روشنی میں بھینی بھینی خوشبو سے بسے ہوئے ماحول میں رقص کرنا، صنفِ نازک کی پوشاک میں برہنگی کے عنصر کا بڑھنا وغیرہ وغیرہ، یہ سب کس لئے ہے؟ لہذا اگر ہم یہ کہیں کہ آئندہ زمانہ کے محبوب اور ممتاز ہوٹل وہ ہونگے جن میں رنگ، طعام اور خوشبو وغیرہ کیمیاوی اور جذباتی اصول کے ماتحت مناسب طور پر ترکیب دیئے گئے ہونگے، تو شاید آپ اس دعوے کو الف لیلے کی داستان یا طلسم ہوشربا کی ذہنی جدت تصوّر نہ کریں گے۔ اس سوانگ کے قدر دانوں کو یہ لازم ہوگا کہ وہ ایسے لباس زیب تن کریں جن پر مناسب رنگوں کا عکس ڈالنے سے خاص موقعوں پر مخصوص کیفیتیں پیدا کی جا سکیں۔ اس کے بعد ایک دور یہ بھی آئیگا جب صنفِ نازک کی ذہنی تحریک جنسی حیا کا معیار بدلکر اس کو ایسی جگہیں تلاش کرنیکی ترغیب دیگی جہاں لباس پہننے کی قید نہ ہو۔ نقل و حرکت کے ذریعوں میں ترقی ہونے سے آرائش حسن کے طریقوں اور جگہوں میں بھی زیادتی ہونی لازمی ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ کسی فعل کے......

ساقی

بہار آئی ہی روحِ سرخوشی بیدار ہے ساقی
نشاطِ رنگ سے سارا چمن سرشار ہے ساقی

کچھ اس دریا دلی سے آسماں نے نور برسایا
کہ خاکِ تیرہ کا ہر ذرہ پُرانوار ہے ساقی

یہ فطرت کی طرف سے اذن ہی جشنِ مسرت کا
اس امرِ واقعی سے کب مجھے انکار ہے ساقی

نہ دعوے زہد کوشی کا، نہ پینے سے مجھے نفرت
پر اپنی نارسائی کا مجھے اقرار ہے ساقی

کہاں کا شغلِ مے کھانیکو روٹی تک نہیں ملتی
ترے بادہ کشوں پر یورشِ ادبار ہے ساقی

قیامت ہی کہ پینے کا سلیقہ تک نہیں جنکو
انہی کا رُخ فروغِ بادہ سے گلنار ہے ساقی

یہاں بھی اہلِ زر کو امتیازِ خاص حاصل ہے
زمینِ میکدہ کیوں اتنی ناہموار ہے ساقی

غلط بخشی نے تیری کر دیا ہی مشتعل شاید
ہجومِ تشنگاں آمادۂ پیکار ہے ساقی

نہ ایسا ہو کوئی اِس میکدے کو خاک کر ڈالے
نفس تشنہ لبوں کا برقِ آتش بار ہے ساقی

نہ دیکھ انگڑائیوں کو میری اندازِ تمسخر سے
کہ میری خستگی اِک فتنۂ بیدار ہے ساقی

گوپال مِتّل!

یہی زندگی ہے یہی زندگی ہے

تبسم بھی ہے یہ تبسم نہیں بھی ۔۔۔ نہ جانے ہے کیا ماہیت زندگی کی!
سحر ہے کبھی اور کبھی شامِ جذبات ۔۔۔ دکھاتی ہے فطرت طلسمات دن رات
کہیں چھاؤں ہے اور کہیں دھوپ من میں ۔۔۔ بھرے جاتے ہیں سینکڑوں روپ من میں
تمنا کے تاروں کی تابانیاں ہیں ۔۔۔ کبھی حسرتوں کی فراوانیاں ہیں
اُمیدوں کے گلشن کھلے جا رہے ہیں ۔۔۔ کبھی باغ یہ خود ہی مُرجھا رہے ہیں
خوشی کی سحر جلوہ گر ہو رہی ہے ۔۔۔ کبھی شامِ غم آ کے سر ہو رہی ہے
تخیل کا دھارا بہا جا رہا ہے ۔۔۔ جسے زندگانی کہا جا رہا ہے
سکوں ہے کبھی اور تلاطم کبھی ہے ۔۔۔ تسلسل ابھی تھا ابھی گڑبڑی ہے
بنا بلبلا اور بنتے ہی ٹوٹا ۔۔۔ مقدر کا بھانڈا تھا گویا جو پھوٹا
عجب سلسلہ ہے! عجب ساحری ہے! ۔۔۔ کہ دل کی لگی دل کی وابستگی ہے

نظر کو مگر جو نظر آ رہا ہے
تخیل کی تجسیم کا ماجرا ہے

تخیل تاثر تاثر تخیل ۔۔۔ بظاہر تو ہیں زیست کا جُزو اور کُل
عمل ہے تخیل کو محدود کرنا ۔۔۔ تصور کو غائب سے موجود کرنا
عمل سے تخیل کی تابندگی ہے ۔۔۔ یہی زندگی ہے یہی زندگی ہے
جہانِ تخیل ہی ایسا جہاں ہے ۔۔۔ ترے دسترس میں جہاں فن فکاں ہے
تو خلاق ہے کن فکانی کئے جا ۔۔۔ نمودِ تخیل کے بل پر جئے جا
عمل سے تخیل کی تشکیل کرنا ۔۔۔ ہے منشاء فطرت کی تکمیل کرنا

نمودِ تخیل میں جو کامراں ہے
وہی زندگی اے امیںؔ جاوداں ہے

امین حزیںؔ سیالکوٹی

اگر

اگر یہ ہوتا تو کیا ہوتا اور اگر یہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا اور اگر کچھ بھی نہ ہوتا تو پھر کیا ہوتا ــــــ ظاہر ہے کہ ان خطوط پر ہم جتنا سوچیں گے الجھاؤ پیدا ہوتے جائیں گے۔ اور جیسا یورپ کے ایک بڑے مفکر نے کہا ہے "یہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا" کے متعلق سوچ بچار کرنا بالکل لاحاصل ہے۔ یہ بات ایک عام آدمی کے نقطۂ نظر سے کہی گئی ہے اور بالکل صحیح ہے کیونکہ عام آدمی کا کام اگر کے چکر میں پھنسنا نہیں ہے، اس لئے کہ اس میں پھنس کر وہ اپنی حرکت، اپنی توجہ کی شدت اور اپنے عمل کی قوت کو بالکل کھو دے گا ــــ "وہ جو کچھ کہ ہوسکتا یا ہوجاتا" پر سوچ بچار کرنا "دماغی سٹہ بازی" ہے۔ کیونکہ اس میں بھی آدمی اسپیکولیشن کی بھول بھلیوں میں پھنس جاتا ہے۔ عام آدمی کا ایسی باتیں سوچنا بالکل بیکار ہے لیکن فلسفی کی بات الگ ہے۔ وہ جب نامعلوم ممکنات کا کھوج لگاتا ہے تو اُسے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل ہوجاتا ہے اس لئے کہ وہ حال اور مستقبل دونوں سے متعلق ہے۔ عارضی اور دائمی دونوں چیزوں سے اُسے واسطہ ہے۔ انسان کی متبدل اور غیر متبدل دونوں قسم کی عادات اُس کے پیش نظر رہتی ہیں۔ چنانچہ اس کے دماغ میں ایسے سوالوں کا پیدا ہونا ضروری ہے کہ اگر فلاں فلاں حادثہ وقوع پذیر نہ ہوتا تو زمانے کی رفتار کیسی ہوتی، فلاں ارادے یا فیصلے میں اگر تھوڑی سی ترمیم ہوتی تو واقعات کا رخ کیسا ہوتا یا اگر فلاں آدمی مقررہ وقت سے کچھ دیر پہلے یا کچھ دیر بعد مرتا تو زندگی میں کیا تبدیلی پیدا ہوتی۔

"اگر" کی بے شمار ایسی شکلیں ہوسکتی ہیں۔ کیونکہ اب تک جو کچھ ہوا ہے اس کو ہر رنگ میں دیکھا جاسکتا ہے "اگر" کے میدان میں ایسے کئی گھوڑے دوڑائے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر حکیم سقراط اُس مار دھاڑ میں جو کہ چار سو چوبیس سال قبل از مسیح ایتھنز کے باشندوں نے مچائی تھی، قتل ہوگیا ہوتا تو فلاطون اور ارسطو کا نام کبھی سننے میں نہ آتا، یونانی فلسفے کا وجود تک نہ ہوتا اور وہ سبق جو یورپ کی دانشگاہوں میں دو ہزار سال سے پڑھایا جارہا ہے معرضِ وجود ہی میں نہ آتا ــــ اس "اگر" پر اگر غور کیا جائے تو کتنی دلچسپ باتوں کا سلسلہ شروع ہوسکتا ہے۔ بیتے ہوئے زمانے کا دو ہزار سالہ لمبا تھان کھول کر اس کے تمام نقش و نگار مٹا کر نئے بیل بوٹے بنانا کم دلچسپ نہیں ــــ

اور اگر یہ سوچا جائے کہ اگر قلوپطرہ کی ناک ایک انچ کا آٹھواں حصہ بڑی یا چھوٹی ہوتی تو کیا ہوتا ــــ یہ "اگر" بہت مشہور ہے اور اس پر غور بھی کیا جاچکا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر قلوپطرہ کی ناک ایک انچ کا آٹھواں حصہ بڑی یا چھوٹی ہوتی تو عیسائیوں کی تاریخ تمدن بالکل مختلف ہوتی ممکن ہے کہ بعض لوگ عورتوں کی ناک کے سائز کو اتنا اہم نہ سمجھیں اور کسی خاتون کی ناک کو قوموں کی قسمت تبدیل کرنے والی نہ مانیں مگر اس بات پر پھر بھی بحث ہوسکتی ہے کہ اگر قلوپطرہ کی ناک ذرہ بھر بڑی یا چھوٹی ہوتی تو اس کی خوبصورتی میں نمایاں فرق پیدا ہوجاتا۔ اگر اسکی خوبصورتی میں فرق آجاتا تو وہ نہ جولیس سیزر کو اور نہ مارک انطونی کو مسحور کرسکتی۔ چنانچہ رومن ہسٹری بالکل مختلف طریقے پر لکھی جاتی۔ چنانچہ عیسائیوں کی تاریخ تمدن بھی بالکل مختلف ہوتی اور ــــ اور خدا جانے اور کیا کیا کچھ نہ ہوتا اور کیا کیا کچھ ہوتا۔

آئیے ہم چند تاریخی "اگروں" پر سرسری نظر ڈالیں۔

اگر سابق قیصر جرمنی ولیم دوئم اور شہنشاہ اڈورڈ ہفتم ایک دوسرے سے دلی نفرت نہ رکھتے ہوتے تو سن چودہ کی بڑی لڑائی معرضِ وجود ہی میں نہ آتی۔ کہتے ہیں کہ شہنشاہ اڈورڈ کو قیصر ولیم کی خود بینی پسند نہ تھی۔ پہلی ملاقات ہی میں اُن کے دل نفرت کے جذبات سے معمور ہوگئے جو سالہا سال تک قائم رہے۔ اس دوران میں چھوٹے چھوٹے معمولی واقعات بھی ان کو مشتعل کرتے رہے۔ چنانچہ کاونٹس آف واردک نے اس قسم کے ایک معمولی واقعے کا ذکر کیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شہنشاہ اڈورڈ اور قیصر بیٹھے گفتگو کررہے تھے کہ ان کے سامنے سے جنگی نامہ نگار ملٹن پرائر گذرا۔

قیصر نے پوچھا "یہ مختصر سا عجیب وغریب آدمی کون ہے؟"

اڈورڈ نے جواب دیا "مشہور و معروف جنگی نامہ نگار ملٹن پرائر"

قیصر نے حقارت آمیز لہجے میں کہا "اوہ ــــ ملٹن پرائر ــ دی جرنلسٹ"

شہنشاہ اڈورڈ قیصر کی اس بدتمیزی سے کبیدہ خاطر ہوگئے اور اس کو ذلیل کرنے کی ٹھان لی "آپ اس سے ملکر یقیناً خوش ہونگے"

شہنشاہ ایڈورڈ نے اس انداز میں کہ گویا انہوں نے قیصر کی حقارت آمیز گفتگو کا مقصد ہی نہیں سمجھا۔

اس سے پہلے کہ شہنشاہ ایڈورڈ کا مزاج دان بھانجہ کچھ کہے انہوں نے مٹن پیر کو قریب آنے کا اشارہ دیا۔ جب وہ پاس آگیا تو شہنشاہ نے یوں تعارف کرایا: میرے بھتیجے نے خواہش ظاہر کی ہے کہ میں تمہاری اس سے ملاقات کراؤں۔

چنانچہ کہا جاتا ہے کہ یہ شخصی منافرت جنگ کے دیوتا کو مشتعل کرنے کا سبب بنی اور انگریزوں سے جرمنی کے حسد اور نفرت کی آگ کا ایندھن بن گئی۔ اور ان چودہ میں جنگ عظیم شروع ہوئی۔

اگر نیپلز میں لیڈی ہملٹن سے نلسن کی ملاقات نہ ہوتی اور نہ اس پر عاشق نہ ہو جاتا تو بہت ممکن ہے نیل کی جنگ کبھی وقوع پذیر نہ ہوتی۔

اٹلی کا ارادہ نلسن کی مدد کرنے کا نہ تھا۔ اس کی راہ میں روڑے اٹکائے جا رہے تھے۔ لیکن حسین اور جادو نظر ایما یعنی لیڈی ہملٹن نے اپنے مدبر شوہر کے پردے میں زنجیر کو حرکت دی اور اس کے جہازوں کو سامان رسد فراہم کرنے اور مہم پر روانہ ہونے میں مدد دی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس خاتون نے اپنے عاشق نلسن کو بہت سی راز کی باتیں بھی معلوم کر کے بتائیں۔

اگر ملکہ الزبتھ اسپین کے شہنشاہ فلپ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتی اور ملکہ میری کے پروانۂ موت پر دستخط نہ کرتی تو انگلستان پر ارمیڈا یعنی اسپین کا زبردست جنگی بیڑہ کبھی حملہ نہ کرتا۔

سیاست کی بساط پر ملکہ انگلستان نے شاہ فرانس اور شاہ اسپین کو ایک دوسرے کے مقابلے میں لا کر یورپ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کا جھگڑا کھڑا کر دیا۔ ملکہ میری جب قتل ہوئی تو فلپ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ میری نے اپنی وصیت میں فلپ کو تاج و تخت کا مالک قرار دیا تھا جو اس کا سب سے زیادہ قریبی عزیز اور کیتھولک تھا۔ فلپ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر انگلستان فتح ہو گیا تو یورپ میں کیتھولک مذہب کا بچھا کھچا سا اقتدار ہو جائے گا۔ بس اس نے بغیر سوچے سمجھے ارمیڈا کو انگلستان فتح کرنے کے لئے روانہ کر دیا۔ لیکن نتیجہ برعکس ہوا اور اسپین کی ساری شان و شوکت خاک میں مل گئی۔

اگر شہنشاہ میکس میلیاں ایک مغرور اور ضدی عورت سے شادی نہ کرتا تو میکسیکو خونیں انقلاب سے محفوظ رہتا اور ساتھ ہی شہنشاہ کی جان بچ جاتی۔

میکسیکو کے باشندے اس بات کے خلاف تھے کہ اُن کے وطن پر کوئی غیر ملکی حکمران ہو۔ ان کی مرضی کے خلاف نپولین سوئم اُن پر میکس میلیاں کی حکومت عائد کر رہا تھا جس سے انہوں نے یکسر انکار کر دیا۔ میکس میلیاں نے جب دیکھا کہ معاملات دگرگوں ہو چکے ہیں تو اس نے چاہا کہ تخت سے دست بردار ہو جائے مگر اس کی ضدی اور مغرور ملکہ بیچ میں حائل ہوگئی۔ اس نے اپنے خاوند کو غیرت دلائی کہ ایسی باتیں صرف بڈھوں اور احمقوں کو زیب دیتی ہیں ——— چونتیس سال کے جوان شہنشاہ کے لئے یہ انتہائی ذلت اور بزدلی ہوگی اگر وہ تخت سے دستبردار ہو جائے۔

اس کے بعد وہ بعجلت تمام شہنشاہ فرانس کے پاس آئی اور نپولین سوئم سے فوجی امداد کی ملتجی ہوئی۔ لیکن امریکہ نے نپولین کو پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا، چنانچہ اس نے فوجی امداد سے صاف انکار کر دیا۔ ادھر ملکہ امداد و اعانت کی فکر میں سرگرداں تھی اُدھر میکس میلیاں اور اس کی فوج صدر واریز کے ہاتھوں شکست پر شکست کھا رہی تھی۔ ملکہ کی ضد آخر رنگ لائی اور اس کے نیک دل شوہر میکس میلیاں کو گرفتار کر لیا گیا اور بعد میں اُسے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا ——— کہتے ہیں کہ ملکہ کو پھر کبھی اپنے شوہر کا مُنہ دیکھنا نصیب نہ ہوا اور مدت تک اس پر غم کے باعث دیوانگی کی کیفیت طاری رہی۔

اگر ——— یہ بڑا عجیب اگر ہے ——— اگر کولمبس نے امریکہ دریافت نہ کیا ہوتا تو ظاہر ہے کہ کسی اور نے دریافت کر لیا ہوتا کیونکہ پُرانی دُنیا سے یہ نئی دنیا زیادہ دُور نہیں مگر ہمیں تو صرف یہ سوچنا ہے کہ اگر کولمبس نے یہ دُنیا دریافت نہ کی ہوتی تو کیا ہوتا ——— فورڈ کی موٹر کاریں نہ ہوتیں۔ لیگ آف نیشن نہ ہوتی۔ انگریزوں کا تمباکو سے تعارف نہ ہوتا۔ اور نہ آئرستان میں آلوؤں کی کاشت ہوتی ——— چارلی چپلن جیسا مسخرہ نہ ہوتا اور یہ فلم نہ ہوتے۔

فلموں اور آلوؤں کو چھوڑئیے ——— آپ یہ سوچئے کہ اگر راجہ دسرتھ کے رتھ کا پہیہ نہ نکلتا تو کیا ہوتا ——— ظاہر ہے کہ ہر سال دسہرے کے موقعے پر جو راون جلایا جاتا ہے نہ جلایا جاتا۔

تاریخی بیان ہے کہ جب راجہ دسرتھ کے رتھ کا پہیہ نکل گیا تو رانی کیکئی نے میخ کی جگہ اپنی اُنگلی داخل کر دی اور یوں رتھ کو بچا لیا۔ راجہ دسرتھ اپنی رانی کے اس ایثار سے بہت متاثر ہوا چنانچہ اس نے خوش ہو کر کہا: "مانگ مجھ سے کیا مانگتی ہے؟" رانی کیکئی نے اس وقت تو کچھ نہ مانگا مگر جب رام چندر جی کو گدی پر بٹھایا جانے لگا تو اُسنے

سپنے خاوند کو اس کا وچن یاد دلایا اور کہا میری یہ خواہش ہے کہ آپ رام کو چودہ سال کے لئے جنگلوں میں بھیج دیں اور میرے لڑکے بھرت کو گدی پر بٹھا دیں۔ چنانچہ رام چندر جی کا بن باس ہوا اور ان کی راون سے معرکہ خیز جنگ ہوئی۔

اس طرح اگر دروپدی طعن آمیز لہجے میں دریودھن سے یہ نہ کہتی کہ آخر تم اندھے ہی کے لڑکے ہو تمہیں سجھائی کیسے دیگا تو بہت ممکن ہے مہا بھارت نہ لڑی جاتی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ پانڈوں کے حصے میں بہت خراب زمین آئی تھی جس کو انہوں نے بڑی محنت سے صاف کیا اور کاریگری کے ایسے نمونے پیدا کئے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایسا فرش بنایا تھا کہ تالاب معلوم ہو۔ اور ایسا تالاب بنایا تھا جو فرش معلوم ہو۔ پانڈوں نے جب کوروں کو اپنے یہاں دعوت دی تو ان صنعت کے نادر نمونے دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے۔ دریودھن تو بوکھلا سا گیا۔ ایک فرش کو اس نے یہ سمجھا کہ تالاب ہے چنانچہ اس نے اپنا لباس اوپر اڑس لیا۔ کہتے ہیں اس موقع پر دروپدی نے یہ طعنہ زنی کی "آخر تم اندھے ہی کے لڑکے ہو۔ تمہیں سجھائی کیسے دیگا" — چنانچہ یہ طعنہ آگے چلکر مہا بھارت کا موجب ہوا۔

اگر چنگیز خاں پیدا نہ ہوتا تو مغرب کی بیداری میں ایک زمانہ صرف ہوتا چینیوں کو مقناطیسی سوئی کا استعمال ایک مدت سے آتا تھا مگر نئے یورپ سے اس ایجاد کا تعارف چنگیز خاں کے حملوں کی بدولت ہوا۔ ظاہر ہے کہ اگر قطب نما جیسی اہم ایجاد کا علم صرف چین تک ہی محدود رہتا تو کولمبس اور واسکوڈی گاما اتنے لمبے سمندری سفر کبھی نہ کرتے۔ اگر چنگیز خاں پیدا نہ ہوتا تو آج روس کی شکل ہی اور ہوتی کیونکہ وہ منگولوں کی غلامی سے بچا رہتا۔

دشمن کے بحری بیڑے کا کھوج لگانے کے سلسلے میں جنرل نلسن مالٹا سے مصر تک گیا۔ یہ ۱۷۹۸ء کا ذکر ہے۔ ۲۲ جون اور ۲۹ جون کے درمیانی عرصے میں انگریزوں کا جنگی بیڑہ فرانسیسیوں کے جنگی بیڑے کے پاس سے ہو کر گذرا مگر ان میں سے کسی کو ایک دوسرے کی موجودگی کا علم نہ ہوا — بحیرہ روم کی ایک کالی رات میں دنیا کی سب سے بڑی اگر دیر تک کانپتی رہی۔ اگر طرفین کے کسی جہاز میں روشنی کی ہلکی سی شعاع نظر آجاتی، کوئی آواز سنائی دے جاتی، کوئی فوجی موج میں آکر گیت گا دیتا اور نلسن کو دشمن کے بحری بیڑے کی موجودگی کا علم ہو جاتا تو دنیا نپولین کے نام سے بالکل ناآشنا ہوتی۔

اس کا نام جنگی تذکروں میں ایک ایسے جرنیل کی حیثیت سے لکھا جاتا جو کافی اہلیتوں کا مالک ہو اور بس — روس پر نپولین کا ناکام حملہ نہ ہوتا اور یوں فرانس کے ایک لاکھ پچیس ہزار آدمی مارے نہ جاتے، ایک لاکھ بتیس ہزار آدمی سردی اور تھکاوٹ کی بھینٹ نہ چڑھتے اور ایک لاکھ ترانوے ہزار فرانسیسی روسیوں کے قیدی نہ بنتے۔

اگر اسٹیفن جائے کی کیتلی کی ٹونٹی پر چمچہ نہ رکھتا تو اسے بھاپ کی طاقت معلوم نہ ہوتی اور ریلوے انجن کبھی نہ بنتا — اگر درخت سے سیب نہ گرتا تو نیوٹن کشش ثقل کیسے دریافت کر سکتا۔ اگر مہاتما گاندھی نہ ہوتے تو آج اس ونوبا بھاوے کو کون جانتا۔ اگر مارکونی نہ ہوتا تو ریڈیو نہ ہوتے — اگر ہٹلر نہ ہوتا تو یہ دوسری جنگ عظیم معرض وجود میں نہ آتی۔ اگر حضرت آدم بہشت سے نکالے نہ جاتے تو اس دنیا کے بجائے کوئی اور ہی دنیا ہوتی۔ اگر کچھ بھی نہ ہوتا تو خدا جانے کیا ہوتا اور اگر خدا نہ ہوتا تو ......

سعادت حسن منٹو

وہ نہیں آئے

وہ نہیں آئے! ان کا انتظار قیامت کا انتظار تھا۔ ہر کھٹکے پر لاکھوں کھٹکے۔ رات گذری، دن نکلا، دن بھی ڈھل چلا۔ انکا پتہ نہیں! صبر کی آخر کوئی انتہا! انتظار کی حد! آنکھیں دروازے کو تکتے تکتے پتھرا گئیں۔ واہمہ گوش برآواز — وہ آئے! آ رہے ضرور رہی ہیں! لیکن ؎

وہ اپنے رنگ میں ہونگے صبوحی تم انہیں مطلب
شراب حسن پی رکھی ہے متوالے ہیں جوبن میں

جاؤں، پوچھوں کہ کیوں نہیں آئے؟ محبت کے جھوٹے تو تھے ہی وعدے کے جھوٹے بھی ہو گئے! منہ نہ لگایا تو کیا ہوگا؟ کسی کو بھیجوں معلوم تو ہو۔ بگڑ بیٹھے تو چھیڑ چھاڑ کا لطف بھی گیا۔ انتظار کی زندگی بھی ختم۔ پوچھنا تو گناہ نہیں۔ سلام کہلا کر بھیجا۔ جواب آیا پاؤں میں درد ہے۔ اللہ اللہ، اس درد کی یار ماری دیکھی۔ میرے دل سے نکلکر انکے پاؤں میں جا پہونچا۔ میرے دل سے نکلا کب؟ یہ درد بھی عجیب شعبدہ گر ہے۔ مجھے ستاتے ستاتے انہیں بھی ستانے لگا

"کاش اب بھی وہ سمجھ جائیں کہ انکے پاؤں کا درد میرے دل کا ہمدم ہے میری سفارش کرنے انکے قدم لے رہا ہے"

"وہ آئیں اور میری چیز مجھے سونپ جائیں"

اشرف صبوحی

ڈھاک کے پھول

اُس نے ہاتھ کی دونوں ہتھکڑیوں کو آپس میں ٹکرایا۔ اُس چھوٹے تنگ و تاریک کمرے میں ایک جھنکار پیدا ہوئی۔ اور پھر وہی ہتھکڑی کے ٹکرانے کی آواز۔ شاید پھر اس نے ان کو آپس میں ٹکرایا ہو۔ نہیں وہی جھنکار کمرے کی فضا کی وسعت میں گھوم کر پھر اپنی جگہ واپس آگئی تھی۔ ماہتاب ابھی آسمان میں نمودار نہیں ہوا تھا۔ اور اُس چھوٹی سی جیل کی کوٹھری میں ایک چھوٹا سا روشندان تھا۔ شاید تارے اس روشندان کے ذریعے اس کو حیرت کی نگاہ سے تک رہے تھے۔ باہر ہوا سائیں سائیں چل رہی تھی اور پتوں کے آپس میں رگڑ کھانے سے پیدا کی ہوئی کھڑکھڑاہٹ کی صدا آرہی تھی۔

اُس کے دونوں ہاتھوں میں لوہے کی ہتھکڑیاں بندھی ہوئی تھیں۔ جن کے بیچ میں سے ایک لوہے کی زنجیر گذرتی تھی۔ جیل کی پکی دیوار میں لوہے کا مضبوط کڑا آویزاں تھا۔ جس کے اندر اس زنجیر کو مضبوطی کے ساتھ اٹکا دیا گیا تھا۔ کوئی ہوگا دو گز کا ٹکڑا... یہی تھا اُس قیدی کا دائرۂ عمل اور وہ اس سے آگے نہ بڑھ سکتا تھا۔

آخر کچھ سوچتے سوچتے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور لنگا ادھر سے ادھر قدم اٹھاتے سوہ رکا۔ روشندان کی طرف نظر ڈالی۔ آسمان کے تھوڑے حصے میں جس کو وہ دیکھ سکتا سوائے دو چار ٹمٹماتے ہوئے تاروں کے اور کچھ نہ دکھائی پڑا۔ اور روشندان کے باہر بھیانک تاریکی اور زبردست خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایک ایسا سکوت جو کبھی کبھی پہرے والے سنتری کی آواز اور دور کتے کے بھونکنے کی صدا سے چند لمحوں کے لئے ٹوٹ جاتا تھا۔ یا سپاہی کے مضبوط جوتوں کے زمین پر پڑنے سے....

اُسے آج امید تھی کہ وہ ضرور چاند کو دیکھ سکیگا۔ روشندان کے عین سامنے۔ آخر وہ تھک کر کوٹھری کے کھردرے فرش پر بیٹھ گیا۔ جس میں جگہ جگہ ریت کے تودے لگے ہوئے تھے۔ اور مٹی کے ڈھیلے پڑے ہوئے تھے۔ جو اس کے بدن میں چبھ رہے تھے۔ اور کبھی کبھی چوہوں کے آپس میں لڑنے کی باریک سی خراش آواز اس کے خیالات کے سلسلے کو توڑ دیتی تھی۔ وہ گردن جھکائے کسی گہرے سوچ میں غرق، دکھائی دیتا تھا۔ آج اسکی طبیعت سارے دن پریشان رہی تھی۔ اور جب سپاہی شام کا کھانا اُس کے سامنے رکھکر چلا گیا تھا تو اس کو بھی پکی روٹیاں اور دال کی ساگ کو دیکھکر ابکائی سی آنے لگی تھی۔ اس نے کھانے کو ایک کونے میں الگ رکھدیا جس پر تاریکی چوہے دعوت اڑا رہے تھے۔

چاند کی کرنیں روشندان کو پار کر کے کوٹھری کے فرش پر پڑنے لگی اور انکی روشنی میں ہتھکڑیوں میں ایک چمک پیدا ہوئی۔ اور وہ غور سے انکو دیکھنے لگا۔ کچھ جھلایا سا۔ لوہا، سخت لوہا، کیا یہی اُس کی زندگی کی تعبیر بنکر رہ گیا تھا۔ اور وہ غصہ میں ہتھکڑیوں کو آپس میں رگڑنے لگا۔ ایک چوہا اُدھر سے گذرا۔ اُس نے ہتھکڑیوں بھرا ہاتھ جو مارا تو اسکی دم پر پڑا اور آدھی دم الگ دو انچ کے فاصلے پر جا پڑی اور لگی تڑپنے۔ وہ اس تڑپتے ہوئے دم کے ٹکڑے کو دیکھنے لگا اور پُر مسرت آنکھوں سے اس کی طرف گھور رہا تھا۔ دنیا نے اس کو بھی تڑپایا ہے۔ جیل میں اس کی زندگی، ماہی بے آب کی مانند ہے۔ وہ دن بھر چکی پیستا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا ہر عضو درد درد پکارنے لگتا ہے۔ اُس کی رگیں سخت پڑ جاتی ہیں۔ اور اس کے ہاتھ جواب دے جاتے ہیں۔ اور رات کے وقت جب وہ سونے کیلئے آمادہ ہوتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے، سپاہی کے مضبوط جوتے کی سخت ٹھوکروں کو جس نے اس کی لاغر پیٹھ کو تختۂ مشق بنا رکھا ہے۔

اور وہ کپڑے جھاڑتا اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور چاند کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ اُس نے روشندان سے تھوڑی دور پر کھڑے ہوئے نیم کے درخت میں نازک نازک ٹہنیوں کو ہلکے ہلکے ہلتے ہوئے دیکھا۔ جن کا سایہ جیل کی دیواروں پر لرزاں تھا۔ آج پہلی دفعہ اس کو جیل کی زندگی میں، لطافت نظر آرہی تھی۔ خود نقرئی ماہتاب، اپنے پورے جوبن پر تھا۔ اور بے ساختہ اسکی طرف دیکھ رہا تھا۔ نہ معلوم کیوں گذشتہ واقعات کے دھندلے سائے اسکے دماغ میں حرکت کرتے نظر پڑے تھے۔ کچھ یوں ہی۔ اور وہ تیزی کے ساتھ سوچنے لگا۔ چاند اور درخت، ان دو چیزوں نے ضرور اسکی زندگی پر نمایاں پارٹ ادا کیا ہوگا۔ اور وہ پھر ادھر ادھر گھومنے لگا۔ اسکے دماغ کی مشینری پوری رفتار سے حرکت میں آگئی تھی۔ جیل کی محنت مشقت سے اُس کا دماغ اس قدر مضمحل ہوگیا تھا کہ پچھلی زندگی کے واقعات اُسے بھولتے جا رہے تھے۔ اور وہ پھر کھڑا ہوگیا۔ روشندان کے سامنے ماہتاب کے عین مقابل... ایک خنک ہوا کا جھونکا آیا، اور مسیحائی کا کام کر گیا۔

ایک ایسی ہی چاندنی رات تھی، جب نالے کے پار، ڈھاک کے جنگل میں راجو اُس سے ملنے آئی تھی۔ نالہ ان دنوں خشک پڑا تھا۔ اور اس کی تہ میں سُرخ بجری تھی جو طغیانی کے دنوں میں نزدیک کے پہاڑ سے بہہ کر آجاتی تھی اور نالے کی تہہ میں بیٹھ جاتی تھی۔ پہاڑ دور پر گوکل اور ڈھاک کے درخت نظر آتے تھے۔ اور اسکے دامن میں نالہ کے اردگرد ڈھاکہ کا جنگل تھا۔ ڈھاک کے درختوں کی ٹہنیاں اور نازک۔ تنے انگارے ایسے سُرخ پھولوں سے لدے پڑے تھے۔ جدھر نظر اُٹھایئے سُرخی ہی سُرخی دکھائی دیتی تھی۔ اور پہاڑیاں انہوں نے بھی سُرخ لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ زمین پر کہیں کہیں گھاس تھی اور کہیں کہیں کانٹے دار جھاڑیں۔ اور گھنی جھاڑیوں کے سائے میں بھورے خرگوشوں نے اپنے بھٹ کھود رکھے تھے۔ کبھی کبھی شکاری بندوقیں کندھے پر اُٹھائے اس علاقے میں آجاتے تھے اور ان معصوم خرگوشوں کے پیچھے اپنے کالے کتوں کو تعاقب کرنے کیلئے چھوڑ دیتے تھے۔ بچارے خرگوشوں کی جان جاتی اور شکاری کیلئے تفریح بہم پہونچتی۔ اور گاؤں والوں کو تماشہ دیکھنے میں آتا۔ جب شام کے وقت پھولوں سے لدی سُرخ مخملی ٹہنیوں پر طوطوں کی ٹکڑیاں آ کر بیٹھ جاتی تھیں، تو نازک ٹہنیاں لچکنے لگتیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی لعبت عشوہ و ناز کا آتشیں آنچل ہوا میں نزاکت سے لہرا رہا ہے اور بکریوں کی ٹولیاں ڈھاک کے ہرے ہرے چکنے نازک پتوں کو خوب چبا چبا کر کھاتی تھیں، حتیٰ کہ وہ درختوں کے اوپر چڑھ جاتی تھیں اور چرواہا مصیبت کو آتا ہوا دیکھ کر ہراساں اِدھر اُدھر بکریوں کو ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ کسی کو درخت سے نیچے اتارا، کسی کو ایک فرلانگ کی دوری سے پکڑا، تو کسی کو دو فرلانگ کی دوری سے گھیرا۔ اور ریوڑ کا سمیٹنا ایک وبالِ جان بن جاتا۔

وہ بھول گیا۔ ہاں، تو راجو اُس روز اُس سے ملی تھی۔ ایک ڈھاک کے درخت کے نیچے۔ جو سرتاسر پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ گویا وہ ایک نئی شادی شدہ دلہن تھا جس نے گہرے سُرخ رنگ کی چنری پہن رکھی ہو جس پر کہیں کہیں ہرے چھینٹے خوبصورتی کو دوبالا کرنے کیلئے ڈالدئے گئے ہوں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی، نمدار ہوا چل رہی تھی۔ اور لطیف چاندنی ملکر جنت کا سماں باندھ رہی تھی۔ ستارے خاموش، پہاڑی خاموش، نالا چپ، اور راجو اور رامو دونوں بھی چُپ سادھے کھڑے ایک دوسرے کے چہرے تک رہے تھے۔

آخر بجری پر چیتلوں کے پاؤں کے پڑنے کی مدھم آواز آہستہ آہستہ فضا میں گونجنے لگی۔ ہرنوں کی ایک لمبی قطار، نالے کو پار کرکے ڈھاکہ کے جنگل کا رُخ اختیار کرنے لگی۔ اور انکے کھُروں کے نالے میں پڑنے سے بجری کھڑکھڑ بولنے لگی۔ ان کے سر پر سینگ ایسے کھڑے تھے جیسے بندوق پر سنگین۔ ہرنوں کی قطار کو دیکھکر راجو کچھ سہم سی گئی۔

"ارے ڈرتی کیوں ہو۔ کوئی تمہیں کھا تھوڑے ہی جائیں گے" اور وہ پھولوں سے لدی ٹہنی سے کھیلنے لگا۔

"اور اگر یہ تمہیں سینگ پر اُٹھا کر پھینک دیں؟" اور وہ سکڑنے لگی۔

رامو نے ڈھاک کے مضبوط مگر لچکدار ٹہنے کو پکڑا۔ "دیکھو اگر تم سے چھیڑ چھاڑ کریں تو تم میری پیٹھ کو زینہ بنا کر اس پر چڑھ جانا اور آرام سے بیٹھ جانا۔" اور ٹیسو کے پھول زمین پر بکھر گئے، اُن کے قدموں کے نیچے۔ ہرنوں کی قطار کبھی کی غائب ہو چکی تھی۔

"کیسے پیارے ہیں یہ پھول" رامو نے پھولوں کو نزاکت سے اٹھایا۔ اور پھول جو پھینکا تو راجو کے ملکے پیازی رنگ کے رخساروں کو چھوتا ہوا زمین پر آ رہا اور راجو نے جھلا کر اس کو اپنی مرمریں پنڈلی والے نازک پیروں سے بیدردی سے مسل دیا۔

وہ سنجیدہ فلسفی کی طرح سوچنے لگا "یہ ہر ایک ایسے پھول کو پاؤں تلے ہی روندا جاتا ہے۔ میری راجو بھی تو ایک پھول ہے جس کی نازک گلابی پتیاں دیکھ کر نرگس کی بھی آنکھ جھپکے۔ گاؤں میں ایسی خوبصورت لڑکی چراغ لیکر بھی ڈھونڈو تو نہیں ملے۔"

ہلکی ہلکی ہوا میں راجو کی سُرخ چنری کا آنچل ناگن کی طرح لہرا رہا تھا۔ اور رامو کے رخساروں پر ملکے ہلکے چپت لگا رہا تھا گویا وہ اس کی ابھری جوانی کو تھپکی دے دے کر نشہ ہستی سے ہوشیار کر رہا تھا۔

"ارے کیا سوچ رہی ہو؟"

"اوں۔ کچھ نہیں۔"

"اے روٹھ گئی؟" اور راجو کا آنچل سر سے گر پڑا۔ اور کالی کالی لٹیں بل کھاتی ہوئی ہوا میں تھرکنے لگیں۔

اُس نے رامو کے شانے پر ہاتھ رکھدیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں۔ اور رامو آہستہ آہستہ اپنا خالی ہاتھ ملائم لچھے دار بالوں میں پھیرنے لگا۔ اُس نے ٹیسو کا ایک آدھ کھلا پھول توڑا اور انکے بالوں میں اٹکا دیا۔ ایک، دو، تین، چار... اور راجو کا سر پھولوں سے سُرخ مخملی گدے کی مانند بن گیا۔ رامو نے اپنے دونوں ہاتھ راجو کے کندھے پر رکھے اور اُسکے چہرے کو سیدھا کیا۔

"دیکھو تم بن گئی ہو اندر کی اپسرا!" اور وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔

"اندر کی اپسرا، اندر کی اپسرا!" گھاس میں چرچر کی آواز نکلنے لگی۔ بھورے بھورے خرگوش اِدھر سے اُدھر بھاگنے لگے۔ ڈھاک کی اَدھ کھلی کلیاں پھوٹ پڑیں۔ سُرخ پھولوں سے لدی ہوئی ڈالیاں ایسی معلوم پڑتی تھیں جیسے بہشت کی پریاں سُرخ رنگ کی ساڑیاں پہن کر اس جنت کے

رنگین کمیل کو دیکھنے جیسے جنت سے زمین پر اتر آئی ہیں۔

راجو آگے آگے بھاگی جا رہی تھی۔ رامو اسکے پیچھے پیچھے۔ آخر دونے نے جنگل کو پار کر لے۔ راجو پھونس کی بنی ہوئی جھونپڑیوں کی قطاروں میں رقی ڈراتی، سکڑتی سکڑاتی، چوروں کی طرح قدم رکھنے لی۔ اور اپنی جھونپڑی کے دروازے میں غائب ہو گئی۔ اور رامو آہستہ آہستہ قدم بڑھا کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا . . . . اندر کی اپسرا

قیدی کی پیشانی پسینے سے شرابور ہو گئی۔ اس نے اپنی نیلی کرتی سے پسینہ پونچھا۔ اور ٹوٹے پھوٹے آبخورے میں ایک مٹی کی صراحی میں سے پانی انڈیلا اور اپنے میں زبردستی اتار دیا اور پھر چاند کی طرف دیکھنے لگا۔ نیم کے درخت کی نازک ٹہنیاں اب بھی ہل رہی تھیں۔ چاند آہستہ آہستہ اوپر چڑھتا جا رہا تھا۔ چاندنی نے جیل کی کوٹھڑیوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ کچھ تھکا سا بیٹھ گیا۔ اور اپنی پیٹھ کو آہنی کا سہارا دیکر وہ پھر کچھ سوچنے لگا۔ باہر جوتوں کے زمین پر پڑنے سے آواز آرہی تھی کھٹ کھٹ . . .

اس روز جب گاؤں میں علی الصباح زندگی کے آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے تھے تو وہ نیند سے اٹھکر دروازے پر جا کھڑا ہوا تھا۔ اور ایک ڈیڑھ فرلانگ پرے آدمیوں کا زبردست ہجوم تھا۔ وہ بھی وہاں پہونچ گیا۔

سڑک کوٹنے کا انجن جسکو خاکی وردی میں ملبوس مستری چلا رہا تھا۔

دوسرے ہی روز سے سڑک بننے کا کام شروع ہو گیا۔ گاؤں والوں کو کام ہاتھ آیا۔ غرضیکہ گاؤں میں کوئی تندرست اور قابل مشقت انسان ایسا نہ تھا جو سڑک پر کام نہ کرتا ہو۔ تندرست بنٹے، ہٹے کٹے نوجوان، پہاڑی کے دامن میں بیٹھکر پتھر کے روڑے پھوڑتے تھے۔ اور ان کو اس قدر چھوٹا بناتے تھے جتنا کہ ایک موجودہ طرز کی سڑک بنانے کے لئے درکار ہیں۔ بارہ سال سے لیکر سولہ سترہ سال کے لڑکے اور لڑکیاں ٹوکریوں میں روڑیاں بھر کر سڑک کے لئے تیار کی ہوئی زمین پر ڈال دیتے تھے۔ سقے مشکیں بھر بھر کے پانی چھڑکتے تھے۔ اور چھک چھک کرتا ہوا انجن مٹی اور روڑی کو آپس میں ملاتا ہوا ادندناتا چلا جاتا تھا۔

سڑک مکمل طور پر تیار ہو گئی۔ اور دن رات موٹر گاڑیوں کا، فورڈ کی ٹرکوں، اور شورولٹ کی ٹھیلہ گاڑیوں کا تانتا بندھنے لگا۔ جہاں پہلے امن و خاموشی کا دور دورہ تھا۔ وہاں اب کان پڑی آواز سنائی نہ پڑتی تھی۔ گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچے سڑک کے کنارے کھڑے کھڑے تیزی سے گذر جانے والی لاریوں کا تماشہ دیکھتے رہتے تھے۔

دیکھتے دیکھتے سڑک کے آس پار دو چار شاندار کوٹھیاں بن گئی تھیں۔ ان میں سے ایک میں ایک لالہ رہتے تھے۔ جن کے گال پچکے ہوئے، آنکھیں ابھری ہوئی پیشانی پر شکن۔ بدن پر ریشمی چکن کی قمیص اور باریک ململ کی دھوتی۔ انہوں نے گاؤں کے آدمیوں کو اپنی کوٹھی پر بلایا تھا۔

"ہمیں آدمی چاہئیں۔ سمجھے۔ ہم نے نالے کی بجری کا ٹھیکہ لے لیا ہے"

اور ایک تئیس سالہ آدمی جسکے کان میں قلم لگی ہوئی تھی، لالہ صاحب کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا "ہمیں آدمی چاہئیں۔ اور اگر تم مناسب سمجھو تو تم لوگ اپنی عورتوں کو بھی کام پر لگا سکتے ہو"

اور رامو کے کاکا نے کہا "سرکار آپکا رام بھلا کرے۔ کیوں نہ بھولا"

اور راجو کے کاکا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ رامو کے کاکا اور راجو کے دادا، بھلا اس گاؤں میں انکی بات کون ٹال سکتا تھا۔ دوسرے دن صبح ڈھاک کے جنگل میں زندگی کے نئے آثار ہویدا ہوئے۔ سڑک نالے سے کچھ فاصلے پر تھی۔ نالے کے بیچوں بیچ پھاوڑے لئے گاؤں کی حسین دوشیزائیں بجری کو کھود کھود کر ٹوکریوں میں بھر دیتی تھیں اور ادھیڑ عمر اور نوجوان خوشی خوشی ان ٹوکریوں کو سر پر لاد کر، سڑک پر انتظار کرتی ہوئی لاریوں میں ڈال دیتے تھے۔ اور بجری سے بھری ہوئی لاریاں، سڑک کی چھاتی کو چیرتی، دندناتی، کرخت آواز نکالتی اپنی منزل مقصود کو روانہ ہو جاتی تھیں۔ گاؤں کا سونا لدا جا رہا تھا جسکے عوض گاؤں والوں کو چند چاندی کے ٹکڑے ملتے تھے جو انکا تن ڈھانپنے اور پیٹ پالنے کیلئے کافی ہوتے تھے۔

راجو بھی بجری ٹوکری میں بھرتی تھی اور رامو سر پر لاد کر موٹر گاڑی میں ڈال آیا کرتا تھا۔

"راجو تم ہانپ رہی ہو۔ ایں۔ لاؤ پھاوڑا مجھے دو۔ تم دم لے لو"

اس نے پھاوڑے کے دو چار ہاتھ مارے، ٹوکری بھری اور گاڑی میں ڈال پھرتی سے واپس آگیا۔ راجو ٹوکری بھرنے کیلئے اٹھی۔

"رہنے دو راجو۔ دیکھو تمہارا پھول سا چہرہ کملا گیا ہے"

بدن پر ہنٹنگ کوٹ، اور چست برجس، منہ میں پائپ اور ہاتھ میں دضعدار ڈنڈا۔ نیلگوں دھواں نکالتے ہوئے لالہ جی سر پر آ پہونچے "کیوں بیکار بیٹھی ہے۔ اٹھا پھاوڑا" اور رامو کو مخاطب کرتے ہوئے "ایک ساتھ دو دو کام کرنے سے کیسے کام بنے گا۔ جاؤ لے جاؤ اس ٹوکری کو" اور لالہ اپنے ڈنڈے کو ہوا میں ہلانے لگے۔ لالہ سوچنے لگے "شہر میں ایک سے ایک حسین عورت دیکھنے کو ملتی ہے لیکن ان میں راجو جیسی ملاحت اور رنگینی کہاں" انہوں نے پائپ کو منہ سے نکالا اور سفید راکھ کو جھاڑا "راجو بجری میں ملکر ہمیشہ کیلئے فنا ہو گئی" ایسا ابھار، ڈھلاؤ کہاں، شہر والی عورتوں میں اسقدر شعریت نہیں۔ گدرایا ہوا بدن اور بھری بھری پنڈلیاں" انہوں نے بجھے ہوئے پائپ کو پھر روشن کیا اور ڈھاک کے درختوں کے سایہ میں نالے کے کنارے کنارے کام کرتے ہوئے مزدوروں کی

طرف آنکھیں دکھاتے ہوئے آزردہ، اپنی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئے۔

شام کو جب رامو، راجو سے ملا تو کچھ غمگین صورت بنائے ہوئے۔ اب وہ موٹر ٹھیلے کے ساتھ شہر جانے کے کام پر تعینات کر دیا گیا تھا۔

اور دوسری صبح ڈھاک کے ایک ایسے سایہ دار درخت کے نیچے، جو راجو کو کھودنے کیلئے دئے ہوئے حصے کے عین سامنے کھڑا تھا، ہلکی پھلکی ساگوان کی میز بچھی ہوئی تھی۔ اور ایک بازو والی نفیس کرسی پر لالہ صاحب شان کے ساتھ متمکن تھے۔ کچھ لکھنے پڑھنے کا مختصر سامان۔ اور ہلکے بھورے رنگ کا پائپ میز پر پڑا ہوا تھا۔ مختلف بیل بوٹوں والا ریشمی ملائم رومال جس کو اٹھا کر کبھی شانے پر رکھتے تھے تو کبھی کلائی پر باندھنا شروع کر دیتے۔

راجو خاموشی کے ساتھ اپنا کام بخوبی انجام دئے جاتی تھی۔ لالہ کی طرف سے میٹھے موٹے۔ اب اسکے پاس سے ایک دھیڑ عمر کی مسکے چہرے پر جھریاں نمودار ہونا شروع ہو گئی تھیں، ٹوکری اٹھا کر لیجاتا تھا وہ زندگی میں بھاری پھیکا پن محسوس کرتی تھی۔ بغاوت پر آمادہ۔ لیکن کوئی وجہ؟ اسکی ماں کہیگی دلوائی۔ باپ کہیگا پگلی۔ لگے لگائے کام کو چھوڑنا اچھا نہیں۔ کچھ نہ کچھ تو گھر میں آئیگا ہی۔ اور پھر مستعدی سے اپنے کام میں مشغول ہو جاتی۔

سڑک بنی تھی! اور اب نیا کام۔ گاؤں والوں کے پاس تھوڑی سی پونجی جمع ہو گئی تھی۔ ایسے حالات میں گاؤں والوں کو سوائے شادی بیاہ کے اور کچھ سوجتا ہی نہیں۔ شام کے وقت دن بھر کے تھکے ماندے آدمی جب حقہ بھر کر گاؤں کی چوپال میں بیٹھتے تھے تو گاؤں کے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں پر اپنی اپنی سمجھ اور پسند کے مطابق تنقیدیں کی جاتی تھیں۔ خوش قسمت جوڑوں میں سے، اکی بار قدرت کا قرعہ راجو اور رامو پر بھی پڑا۔

راجو اور رامو۔ رامو اور راجو۔

راجو اکیلے میں ہرن ایسی قلانچیں بھرتی۔ راہ میں آنیوالی ہر ایک چیز سے چھڑتی، جنگلی خود دار پھولوں کو توڑتی پھینکتی، کانٹوں کی جھاڑیوں سے الجھتی ڈھاک کے پھولوں کو توڑتی۔ گاتی تھی پریم کے اچھوتے راگ۔ رامو ڈھاک کے پرانے درخت کے نیچے پتھروں کی چوٹی پر بیٹھتا تھا اور اپنا الغوزہ نکالکر ایک مدھ بھری سُریلی تان اڑاتا تھا جسکو سنکر ریوڑ سمیت چرواہے ٹھہر جاتے خرگوش کے چھوٹے چھوٹے بچے بھٹوں میں سے منہ نکالدیتے۔ جب نالے پار سے کوئل آواز نکالتی تھی کو کو۔ بکریوں کے ریوڑ اور ممیاتے ہوئے انکے چھوٹے چھوٹے بچے۔ اور کبھی کبھی تارکول کی بنی ہوئی پتی سڑک پر چلنے والی موٹر گاڑی کے بھونپو کی آواز اس پُر امن فضا میں انتشار پیدا کر دیتی تھی۔

"راجو مجسم شعریت ہے۔ شباب کا جیتا جاگتا مجسمہ۔ ریتیلی وادی کا یہ پھول زمانہ کے گرم و سرد سے مرجھا جائیگا۔" اس نے بوتل میں بچی ہوئی شراب کو گلاس میں انڈیل دیا۔

"شباب کا جیتا جاگتا مجسمہ۔ گاؤں کی چہچہاتی ہوئی بلبل۔ میں اسے نرم مخملی گدوں پر بٹھاؤنگا لچکدار کرسیوں پر۔۔۔ سوہن، سوہن۔ ایں، تم دروازے پر کھڑے کیا سن رہے ہو۔ یہ بوتل لاؤ۔۔۔ تم نے راجو دیکھی ہے؟"

"جی سرکار!" اس نے گلابی شراب کو بلوری گلاس میں انڈیلتے ہوئے جواب دیا۔ "مگر۔۔۔"

"مگر۔۔۔ مگر کیا؟ بولو؟"

"اسکی تو رامو سے شادی قرار پائی ہے سرکار۔"

"شادی۔۔۔ شادی، ہیں ہیں ہیں۔" اور گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر میز پر آ رہا اور زمین پر ایک سرخ ندی رواں ہو گئی۔ "شادی۔ پاگل۔ عورت۔ خوبصورت عورت۔ دوشیزہ۔ اور میں خوبرو انسان۔" اور لالہ مستی میں سانپ کے پھن کی طرح لہرانے لگے۔

"سرکار گاؤں کے آدمی جان کے دشمن ہو جائیں گے۔"

"ہم کو بالکل پروا نہیں سوہن۔ بالکل پروا نہیں۔ تو ہمکو راجو سے ملا دیگا ایں۔۔۔ یہ لو۔" اور نوٹ کی گڈی سوہن کے ہاتھ کی گہرائی میں پہنچ گئی۔ اور وہ للچائی ہوئی نگاہ سے اُنکی طرف دیکھ رہا تھا۔

تالاب میں کانٹا ڈالا جا چکا تھا معصوم مچھلی کو پھانسنے کے لئے۔

اور پھر لالہ جی چلانے لگے "سوہن، سوہن۔" بنگلے کے باغیچے میں چاند کی روشنی میں آرام کرسی بچھادی گئی۔ اور لالہ جی اس پر دراز ہو گئے۔ اور نشہ کی ترنگ میں بڑبڑانے لگے "چاند کیسا سندر ہے سوہن۔ بولو۔"

"جی سرکار۔"

"نہیں نہیں۔ اس گاؤں کا چاند اس سے لاکھ درجے اچھا۔ تو راجو سے ملائیگا؟"

"جی سرکار!"

"ہم کو نیند آتی ہے۔ ہمارا کوٹ اتارو۔"

"جی سرکار۔۔۔ سو جائیے۔"

اور گاؤں میں سناٹا چھا گیا۔ چاروں طرف۔ کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز خاموش فضا کو چیرتی نظر آتی تھی۔ چاندنی ڈھاک کے سرخ پھولوں کو دیکھ کر کھل پڑتی تھی۔ صبح گاؤں والے بستر استراحت سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ضروریات سے فراغت پا، کام پر جانے کی تیاری کرنے لگے۔ ڈھاک کے جنگل میں ایک پگڈنڈی تھی جو نالہ کے پاس ختم ہوتی تھی اور اس پر مختلف لباس، مختلف شکل انسانوں کے قدم، کھردرے چہرے، مرجھائے ہوئے بال، گھٹنے تک بندھی ہوئی موٹے گاڑھے کی دھوتیاں، رنگ برنگی گھاگریں، پاؤں میں کھڑکھڑاتے چاندی کے کڑے۔ کسی کے گلے میں ریشمی پھولوں کی مالا۔ ہاتھوں میں نیلا کنٹھا۔ انسانی

سموں کا ایک بہت بڑا سمندر تھا۔ آخر مہم لاٹ صاحب بلندی کا رخ اختیار کرینگے۔ اور ڈھاک کے جنگل میں پہنچ کر پتوں کے چرچرانے کی آوازسے گونجنے لگا۔ موٹر کی پوں پوں۔ اور انجنوں کی چھک چھک۔۔۔ راجو بھی اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔ قریب دس بجے کا عمل ہوگا کہ لالہ صاحب بڑے کروفر سے قدم اٹھاتے ناک کے کنارے کنارے ادھر ادھر گھومنے لگے۔ آج انہوں نے گلے میں سرخ ریشمی رومال باندھ رکھا تھا۔ آخر وہ اس سے چند گز پرے آکر کھڑے ہو گئے۔ پتلون کی جیب کی گہرائی سے نکالا۔ دو چار سیکنڈ ہاتھ کی ہتھیلی پر ہلکے ہلکے ٹپ ٹپ کیا۔ تمباکو کی چٹکی ڈالی، دیا سلائی دکھائی اور پائپ میں نیلگوں دھواں اٹھنے لگا۔ چھڑی کو زمین میں گاڑ دیا اور دونوں ہتھیلیوں پر ٹیک کر پائپ سے لطف اندوز ہونے لگے۔ آج انکی آنکھوں میں لال ڈورے تھے اور بڑے غور سے راجو کے تمتماتے ہوئے چہرے کا مشاہدہ کرنے لگے۔ "راجو سرچشمہ محبت ہے۔ رومانیت کا مخزن" وہ پھاوڑا بجری پر مارتی تھی اور لالہ اخلش محسوس کر رہے تھے۔ "ایسے نازک ہاتھ اور اتنا سخت کام۔ جی چاہتا ہے میں اسکی جگہ کام کروں" اور کسی فوری جذبہ کے زیراثر وہ چھڑی ہلاتے ہوئے اپنی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئے۔

تین چار بجے ہونگے جمعدار راجو کے پاس آیا اور کہنے لگا "راجو"

"ہاں"

"دیکھو سرکار کے باغ کی سڑک پر بجری بچھانی ہے۔ تم کام ختم کرنے سے ایک گھنٹہ پہلے پہونچ جانا۔ سمجھی؟"

"اکیلی"

"نہیں، میں تمہیں ساتھ لے جاؤنگا۔ وہاں پر چمپو بھی ہوگی، اور مٹیا بھی۔ انار، گلاب دتی اور بسنتی"

"اچھا"

"کاکا، تاؤ، چاچا، ابا۔ ارے سب ہی لوگ آگئے" اور رامو سب کے چہروں کی طرف دیکھنے لگا۔ سامنے فلک بوس عمارتیں کھڑی تھیں اور بجلی کے کھمبے۔

"مالک کا حکم۔ ایک روزگار زیادہ کام سر پر آن پڑے تو کرنا ہی پڑتا ہے" اور بڑے میاں سڑک پر گذرنے والی ٹریموے کو بڑی حیرت سے دیکھنے لگے۔

"گاؤں کی بھولی بھالی لڑکیاں ہیں اور کمزور عورتیں۔ کوئی بھی تو حفاظت کیلئے وہاں پر نہیں ہے" آج صبح سویرے جب وہ کام پر روانہ ہوا تھا تو اس کی بائیں آنکھ پھڑکی تھی جبھی اس کا ماتھا ٹھنکا تھا کہ ضرور کوئی نہ کوئی برا واقعہ سننے یا دیکھنے میں آئیگا۔ اور ہاں راجو۔ راجو۔ ایسا معلوم پڑتا تھا کہ سڑک کا ذرہ ذرہ پکار رہا تھا راجو۔ راجو۔۔ "کاکا میری طبیعت کچھ اداس ہے۔ میں چلا"

"کہاں"

"گاؤں کو"

اور وہ آج دن چھپنے سے پہلے ہی گاؤں پہونچ چکا تھا۔ راجو کو اپنی مقررہ جگہ پر نہ پایا۔ "راجو کدھر ہے! تم نے راجو کو دیکھا ہے؟ بتاؤ راجو کہاں ہے؟"

"تمہیں بہت خیال ہے راجو کا۔ کیا تم نہیں جانتے۔ جاؤ لالہ کے باغیچے میں سڑک پر بجری بچھا رہی ہوگی۔ بھاگو نہیں وہ بھاگ جائیگی"

یہ وقت اور لالہ کا باغیچہ۔ وہ تیز سے تیز تر جا رہا تھا۔ ڈھاک کے درختوں میں مرجھائے اور گرے ہوئے پھول تھے جو دھوپ سے سوکھ کر زرد پڑ گئے تھے۔

اور کسی راجو لالہ کی نرم مخملی کرسی پر ماہیٔ بے آب کی مانند تڑپ رہی تھی۔

"راجو میں تمہیں موٹر میں لئے لئے پھرونگا۔ سینٹ، لونڈر، پاؤڈر، سنہری روپہلی ساڑھی۔۔۔۔"

"لالہ جی مجھے جانے دو۔ میری ماں انتظار دیکھ رہی ہوگی"

"جائے جہنم میں تیری ماں اور تیرا باپ جو شہر میں خون پسینہ ایک کر رہا ہے" راجو اٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن لالہ نے پھر اسے دھکا دیدیا۔ آرام کرسی نے اسپرنگ سے دو اوپر کو اچھلی اور وہیں جم گئی۔

"اسے تم رامو سے شادی کروگی، رامو سے۔ پگلی۔ بولو تم میری ہوگی۔ یہ سب تمہارا ہے۔ کوٹھی، روپیہ، زیورات"

"لالہ جی۔ لالہ جی۔ مجھے جانے دو" اور لالہ جی نے اسکی دھوتی کے پلے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ جو کشمکش میں پھٹتی جا رہی تھی۔

"راجو۔ راجو" اور رامو کمرے میں دوڑتا ہی چلا آیا۔ اور ہاتھ گھما کر جو لٹھ چلایا تو لالہ کی کنپٹی پر پڑا اور خون کا فوارہ بہنے لگا۔ اس نے راجو کو سنبھالا اور گاؤں کا رخ کیا۔

"میں نہیں گھر جانے کی۔ ماں حالت دیکھے گی تو کیا کہیگی" اور وہ بچے کی طرح بسور بسور کر رو رہی تھی۔

"پگلی" اور وہ چپ چاپ جھونپڑی کے ایک کونے میں جا کر سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اور آنسوؤں سے اسکا آنچل بھیگ گیا۔ اسکی ماں تھکی ماندی کھاٹ پر سو رہی تھی۔

چاندنی رات تھی گاؤں کے سب نوجوان اور ادھیڑ عمر لٹھ سنبھالے ہلہ بولے لالہ کی کوٹھی کی طرف گامزن تھے۔ انکے گاؤں کی عزت پر ہاتھ ڈالا جائے انکی غیر موجودگی میں۔ لالہ کتنا امیر ہی لیکن گاؤں کی عزت سستی نہیں ہے۔ وہ تو خیر ہوئی۔ رامو پہونچ گیا نہیں تو گاؤں کی ناک سدا کیلئے جڑ سے الگ ہو جاتی۔ اور لالہ کے باغ کے دروازے پر لاٹھیاں پڑنے لگیں "زندہ نہ چھوڑنا پاجی کو بیٹھے آئے ہیں بنکر لالہ" دروازہ آہستہ سے کھلا۔ بھیڑ نے ایکدم اندر گھسنے کی کوشش کی۔ لیکن یکایک رک گئی۔

"خبردار جو ایک بھی قدم آگے بڑھایا" اور سپاہی بندوقیں تانے۔۔۔

(باقی صفحہ [illegible] پر)

اُردو ادب میں ایک نئی آواز

کہا جاتا ہے کہ موجودہ دور اُردو میں ایجاد و اختراع اور تجربات کا ہے۔ اور یہ کچھ غلط بھی نہیں ہے۔ مگر یہ جدت طرازیاں محض چند شاعروں اور ادیبوں کی انفرادی کوششوں تک ہی محدود ہیں، ورنہ عام طور پر تو اُردو دنیا پر سب طرح روایت پرستی چھائی ہوئی ہے، گویا اُردو والوں کے نزدیک آسمان کے نیچے کوئی نئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ روایتوں کے چند سلسلے قائم ہو گئے ہیں، اور تجربات کے متعلق یہ پہلے ہی سے فرض کر لیا جاتا ہے کہ وہ اُن سلسلوں میں سے کسی ایک سے ضرور متعلق ہوگی — اوّل تو ہمارے یہاں حقیقی اور سچی آوازیں اُٹھ ہی نہیں سکتیں، لیکن اگر کبھی کبھار کوئی "آواز" سنائی بھی پڑتی ہے تو ہم اپنے کانوں کا یقین ہی نہیں کرتے، بلکہ یہ سمجھ لینے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں کہ یہ بھی اسی تمام شور و شغب کا ایک حصہ ہے۔ کچھ ایسا ہی کرشن چندر کے ساتھ بھی ہوا۔ یہ بات نہیں کہ ان کی قدر نہ کی گئی ہو۔ اس معاملے میں تو وہ خاصے خوش قسمت رہے۔ کافی جلدی انہیں مقبولیت حاصل ہو گئی۔ ان کی تعریفیں بھی کی گئیں، انہیں اُردو کا ممتاز ترین افسانہ نگار بھی تسلیم کر لیا گیا۔ مگر سچ پوچھیے تو ابھی تک انہیں تحسین ناشناس ہی زیادہ ترملی ہے، اور ان کا استقبال بھی کیا گیا ہے تو نہایت گھسے گھسائے روزمرہ کے استعمالی لفظوں میں، اُن کے ناقد عموماً توہمات میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں؛ ان کی توجہ کرشن چندر کے افسانوں کے جسم نے کچھ اس طرح جذب کر لی ہے کہ وہ روح کی طرف توجہ کر ہی نہیں سکے ہیں، یہ دیکھنے کی بالکل کوشش ہی نہیں کی گئی کہ انہوں نے اُردو ادب اور اسالیب بیان میں کیا اضافہ کیا ہے، اور وہ اُردو کے دوسرے افسانہ نگاروں سے کس طرح مختلف ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ یورپ کے موجودہ دور کے مصنفوں سے کس طرح مختلف ہیں، اور انہوں نے ان بتوں کو پوجا ہے یا توڑا ہے۔ نقادوں کے پاس محض چند کٹے لیبل ہیں، اور وہ بے قرار ہیں کہ کسی طرح کرشن چندر پر بھی اُن میں سے کوئی نہ کوئی چپکا دیں۔ چنانچہ کوئی تو کرشن چندر کو ترقی پسند بتاتا ہے، کوئی رومانی، اور کوئی رومانی کے ساتھ ساتھ حقیقت پرست بھی۔ اور کچھ ایسے لوگ بھی دیکھے گئے جو سرپرستانہ طور سے کہتے ہیں: "اوہ، کرشن چندر؟ ہاں... اچھا ہے، مگر جنس پر لکھتا ہے... اور جنس...." اوہ ہاں، ہمیں ادب کی اُن جونکوں، یعنی "شریف" عورتوں، کا ذکر نہ بھولنا چاہیے جو "بہشتی زیور" کے دوسرے حصے سے آگے بڑھ کر ادب میں قانون سازی کرنا چاہتی ہیں۔ یہ نیک بیویاں "ریشمی انگیا" اور برتھ کنٹرول کے اشتہاروں اور ایکٹرسیوں کی آپ بیتیوں سے لطف اندوز ہونے کی تو خاصی شوقین ہیں، مگر یہ "ٹوٹے ہوئے تارے" کی "خوبصورت شبیدہ" کی برہنگی کی تاب نہ لا سکیں۔ سنا جاتا ہے کہ بعض تو اتنی چراغ پا ہوئیں کہ انہوں نے احتجاجاً رسالہ "ساقی" کی خریداری ہی چھوڑ دی۔ کوئی ماہر نفسیات ہی بتا سکتا ہے کہ کہیں یہ "خوبصورت شبیدہ" کی قسمت پر رشک تو نہیں تھا! بہرحال ان داموں اپنی عفت کی ایسی شاندار نمائش بُری نہیں رہی۔ مجھے ان "شریف" عورتوں کی انگریز بہنیں یاد آتی ہیں جو ایپسٹائن کے برہنہ مجسّمے کو دیکھنے کے لئے جوق در جوق جاتی تھیں، مگر سامنے پہونچ کر چہرے پر جالی دار نقاب ڈال لیتی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان خاتونوں کو ایسی پڑی ہی کیا ہے کہ وہ کرشن چندر کے افسانے یا ادبی مضامین پڑھیں۔ اُن کے لئے تو یہی بہتر ہے کہ وہ اپنے بہشتی زیور کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کبھی کبھی جب ذرا ٹھنڈی ہوا چل رہی ہو، "سچ کہو سچ کہو ہمیشہ سچ" جیسے نصیحت آمیز شعر دبی آواز میں گنگنا لیا کریں۔ غرض کہ ہر ایک نے کرشن چندر کے افسانوں کو سمجھنے کے بجائے ان میں اپنے مفروضے پا لینے کی کوشش کی ہے یہاں تک کہ رنگ برنگے لیبلوں نے کرشن چندر کو چھپا لیا ہے۔

کرشن چندر میں سب سے مقدم چیز اس کا منفرد نقطۂ نظر ہے۔ وہ سب سے پہلے بھی کرشن چندر ہے اور سب سے آخر میں بھی کرشن چندر۔ اُس نے کسی مخصوص تحریک یا نقطۂ نظر کو اپنے اوپر غالب نہیں ہونے دیا ہے، نہ تو پرولیتاریت کو، نہ جنس کو، نہ رومانیت کو —— محض ترقی پسندی کو بھی نہیں۔ وہ زندگی کو دیکھنے کے لئے کسی مخصوص رنگ کے شیشوں کی مدد نہیں لیتا؛ اُسے اپنی آنکھوں پر پورا اعتماد ہے۔ اس کا افسانہ "زندگی کا ایک ذاتی اور بلاواسطہ تاثر" ہوتا ہے۔ نہ وہ زندگی کو من مانے ٹکڑوں میں بانٹتا ہے۔ اُسے زندگی سے محبت ہے، لامحدود اور بے اندازہ محبت —— اتنی ہی جتنی سرشار اور پریم چند کو تھی۔ اور اُردو افسانے میں ان دونوں سے زیادہ زندگی

کا شیدائی شاید ہی کوئی ہو۔ موجودہ افسانہ نگاروں میں اگر کوئی زندگی کو "پی سکتا ہے" تو وہ کرشن چندر ہے۔ اس کے دل میں درد ہے اور اس کی آنکھ میں بصیرت۔ اور زندگی کی وسعتیں اس کے سامنے پھیلی ہوئی ہیں جہاں نشیب بھی ہیں، فراز بھی، دریا بھی پہاڑ بھی، مرغزار بھی بنجر میدان بھی؛ اور کرشن چندر کسی نشے میں سرمست چلا جا رہا ہے؛ زندگی سے اس عشق کے باوجود اُسے یہ تسلیم ہے کہ دنیا وہ جگہ ہے "جہاں ذرا سے سوچنے تک سے دل رنجوں اور سیسے کی آنکھوں والی مایوسیوں سے بھر جاتا ہے"؛ لیکن کرشن چندر زندگی سے شرماتا نہیں، وہ حقیقتوں کے سامنے پہنچ کر آنکھیں نہیں بند کر لیتا۔ جی نہیں، وہ دیکھتا ہے، وہ سوچتا ہے خواہ اُس کا دل "رنجوں اور سیسے کی آنکھوں والی مایوسیوں" ہی سے کیوں نہ بھر جائے، یہ ہے اس "سوچنے کی قیمت" جو دیوتا اس سے وصول کرتے ہیں۔ اور وہ خوشی خوشی یہ قیمت ادا کرتا ہے کیونکہ اس کے دل میں سارے جہان کا درد ہے۔ جو نغمے کی شکل میں پھوٹ پڑنے کے لئے بیقرار ہے۔ ہمارے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر اکیلا راگی ہے: وہ زبان ہے بے زبانوں کی، وہ پکار ہے دُکھے ہوئے دلوں کی، وہ چیخ ہے پھڑپھڑاتی ہوئی روحوں کی۔ اُس کا راگ کسی ایک محدود طبقے یا گروہ کا رونا نہیں ہے، بلکہ اس کی آواز ایک پوری دُنیا کی۔ انسانیت کی ترجمان ہے۔ اگر وہ ایک لکڑی پھاڑنے والے کی ٹھوکر، تھکن اور بیزاری کی ہمدردی کر سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ایک دکاندار کی زندگی کی یکسانیت اور بے رنگی یا ایک بڈھے امیر کی زندگی کے خلا کو نہ محسوس کرے۔

اور نہ وہ اپنے آپ کو جسم کی تھکن اور پیٹ کی بھوک تک محدود کرتا ہے۔ اُسے اچھی طرح معلوم ہے کہ روح کی گرانباری اور رُوح کی بھوک بھی آدمی کو ستاتی ہے۔ وہ ایک کھوکلی عقلیت پرستی کا قائل نہیں ہے۔ وہ بغیر کسی شرم کے یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ انسان ایک زندگی عام نگاہوں سے چھپی ہوئی بسر کرتا ہے —— خوابوں اور آرزوؤں کی زندگی —— جو کسی طرح غیر اہم نہیں ہوتی۔ اگر دُنیا میں ایک روح دوسری روح کی طرف لپکتی ہے، اگر پروانہ ستارے کی آرزو میں سلگتا ہے، تو کرشن چندر ضرور ایسا ہی کہے گا اور چونکہ وہ ایسا کہتا ہے، اس لئے اُسے فوراً رومانی سمجھ لیا جاتا ہے۔ دراصل کرشن چندر ان مصنفوں میں سے جن کے متعلق حقیقت پرست اور رومان کی بحث بالکل بیکار رہتی ہے۔ جن کو آپ ایک لفظ سے بیان نہیں کر سکتے۔ آخر آپ ہارڈی کو کیا کہیں گے؟ اور بالزاک اور اناطول فرانس کو؟ اور پھر کٹر حقیقت پرستوں کو لیجئے: فلابیر اور تسیکرے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی اس شدید حقیقت نگاری کی تہ میں یہ سبب کارفرما تھا کہ اُن کے رومانی جذبے کی تسکین نہ ہو سکی تھی۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ اگر رومانیت ڈھونڈ نکالنا ہی مقصد ہو تو زولا کو بھی جس کی عمر رومانیت کے خلاف جہاد میں گزری، بڑی آسانی سے رومانی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ یوں تو رومانیت ہر زبان میں ہی ایک مشتبہ لفظ ہے۔ مگر اُردو میں تو اس کا استعمال سخت خطرناک ہے، کیونکہ ہمارے افسانوی ادب میں سچی اور صحت مندانہ رومانیت کی مثال دوا کے لئے بھی نہیں مل سکتی۔ ہمارے ہاں رومانیت کا صرف ایک مفہوم ہے جس میں اس لفظ کو بولا اور سمجھا جاتا ہے، اور اُردو افسانوں کو دیکھتے ہوئے یہ کچھ بے جا بھی نہیں ہے۔ اور وہ مفہوم ہے: تھکا پن، سطحیت، زندگی سے بے تعلقی، کھوکلی تخیل پرستی، بے جان لفاظی، بھولی خیال آرائی۔ ڈی۔ ایچ لارنس کا ایک کردار رومانیت کی تعریف یوں کرتا ہے کہ آپ غرض تو کریں بہت مگر جذبات کے نام ہوں بالکل کورے۔ یہ تعریف اردو کے اُن افسانوں پر پوری طرح صادق آتی ہے جو ابھی دو تین سال پہلے تک زیادہ تعداد میں لکھے جاتے تھے، اور آج بھی لکھے جاتے ہیں۔ ان افسانوں کی فارسی ترکیبوں میں ملبوس ہیروئین اپنی محبت کے تیسرے دن اچانک مغموم ہو جاتی تھی، اور پھر بڑی منت سماجت کے بعد اپنی غمگینی کا سبب بتانے پر راضی ہوتی تھی۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر منہ پھیرتے ہوئے ہیرو سے کہتی تھی، "اگر میں بدصورت ہوتی تو کیا تم مجھ سے اسی طرح محبت کرتے، فرض کرو اگر اب میری شکل بگڑ جائے تو کیا تم مجھ سے محبت کرتے رہو گے؟" اور جب یہ دونوں ملتے تھے تو باتیں کم کرتے تھے، اور آہیں زیادہ بھرتے تھے۔ اور اسی پر افسانہ ختم ہو جاتا تھا۔ ہاں۔ افسانہ ختم ہوتے ہوتے ہیرو کو ایک آدھ بوسہ بھی مل جایا کرتا تھا۔ یا پھر وہ افسانے ہیں جن کے کردار دور دراز جزیروں کے حلوے اور مٹھائیاں کھا کر قبرستان کی طرف ٹہلنے چلے جاتے ہیں، اور اُن کی بوڑھی دادی سر پر رومال باندھ کر کمرے میں بند ہو جاتی ہیں کیونکہ انہیں ہمیشہ زکام رہتا ہے۔ اگر رومانیت سے مراد اسی طرح کی کوئی رومانیت ہے تو کرشن چندر میں اس کا شائبہ تک نہیں ہے لیکن ایک حقیقی اور صحت مندانہ رومانیت بھی ہوتی ہے جو اس پہلی والی رومانیت سے اتنی ہی دُور ہے جتنا مشرق سے مغرب۔ اس سچی رومانیت کے معنی ہیں زندگی اور انسانیت سے گہری محبت، فطرت کا شدید احساس، انسان کے مستقبل کو روشن بنانے کی آرزو، دُنیا کے ظلموں کے خلاف بغاوت، انسانوں کی روحوں کو سمجھنے کی صلاحیت، اُن کے مصائب پر

غم کھانا، دنیا کے دُکھ درد کو یکسر مٹا دینے کی خواہش، ایک نئی اور بہتر دنیا کی تلاش، حُسن اور حقیقت کی جستجو، اسی مفہوم کو ذہن میں رکھ کر ڈنٹن مری نے کہا ہے کہ ہر بڑے مصنف اور شاعر میں رومانیت کا کچھ نہ کچھ جز ضرور ہوتا ہے۔ اور یہ ہے بھی واقعی سچ، کیونکہ ان باتوں کے بغیر وہ ہمارے دل پر حکمرانی کیسے کر سکتا ہے، ہمارا قانون ساز کیسے بن سکتا ہے۔ اگر رومانیت سے یہ مطلب لیا جائے تو میں کہونگا کہ کرشن چندر کی رگ رگ رومانی ہے، اور وہ اس رومانیت کی اردو میں عظیم ترین مثال ہے۔ انسانیت سے محبت میں اگر کوئی کرشن چندر کا مدمقابل ہو سکتا ہے تو وہ پریم چند ہیں۔ مگر پریم چند میں خواہ یہ جذبہ زیادہ وسیع ہو مگر اتنا شدید نہیں ہے جتنا کرشن چندر میں، اور نہ اُن میں ایسی بغاوت اور سرکشی اور دُنیا کے نظام کو یکسر بدل دینے کی ایسی آرزو ہے، اور ان چیزوں کے بغیر یہ رومانیت جسے میں نے سچی اور صحت مندانہ کہا ہے، تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہے، تو یہ ہے کرشن چندر کی اصلی رومانیت جس سے اُس کا ایک بھی افسانہ خالی نہیں ہے — "دو فرلانگ لمبی سڑک" جیسے افسانے بھی نہیں، بلکہ ان میں تو یہ رومانیت اپنی شدید ترین شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور اگر کرشن چندر اس رومانیت کو چھوڑ دے تو وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے آرٹ کا گلا گھونٹ دے گا۔

اب رہی وہ رومانیت جسے عام طور پر کرشن چندر کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور اسکے وہ افسانے جنہیں رومانی کہا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ افسانے رومانی ہیں، تب بھی کرشن چندر کی رومانیت اوروں سے مختلف ہے۔ وہ رومان کی تلاش میں بھاگ کر مالدیپ نہیں جاتا، بلکہ یہ تلاش کرتا ہے کہ روزمرّہ کی زندگی میں رومان کے امکانات ہیں یا نہیں، درحقیقت یہ افسانے رومانی نہیں ہیں، بلکہ رومان کے چہرے پر سے نقاب اُٹھاتے ہیں جو ہمارے افسانہ نگاروں نے ڈال رکھے ہیں۔ کرشن چندر بورژوا رومانیت کے چہرے کا روغن رگڑ رگڑ کر مٹاتا ہے اور اُس کے پرستار پیٹ بھرے نوجوانوں کو دکھا دکھا کر پوچھتا ہے "بنی اسرائیل یہ ہیں تیرے خدا؟" اُس کے "بہتر رومانی" افسانے کے آخر میں یہ سوال گونجتا ہے، مگر کرشن چندر جن لوگوں سے یہ سوال پوچھ رہا ہے وہ اسے اَن سُنا کر دیتے ہیں۔ اسکے افسانوں میں زندگی سے گریز نہیں ہے، بلکہ ایک زہرناک احتجاج متوسط طبقے کی شرافت اور خود پسندی کے خلاف، سماج کے رسم ورواج کے شکنجوں کے خلاف، دولت کے جبر کے خلاف، وہ ہر افسانے میں چیخ چیخ کر کہتا ہے کہ سچی رومانیت اور سچی محبت موجودہ سماجی نظام میں بالکل ناممکن ہے، ایسے نظام میں جہاں روپے کی پوجا ہوتی ہے، جہاں ایک جھوٹی شرافت کو ہر جذبے پر مقدم سمجھا جاتا ہے، جہاں ہوس اور وقتی تسکین کو محبت کا نام دیا جاتا ہے، اور ایک چیز جسے کرشن چندر بار بار دکھانا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ خوشحال طبقے کا نوجوان قطعاً محبت نہیں کر سکتا، نہ اس کی روح میں لگن ہے، نہ اُسکے تخیل میں بلندی؛ اس کے معیار محض دو ہیں، روپیہ اور شرافت۔ اور جس چیز کو یہ نوجوان رومانیت اور محبت کہتا ہے وہ محض ایک زرّیں فریب ہے جس میں وہ خود بھی مبتلا ہے اور دوسروں کو بھی پھنسانا چاہتا ہے، محض ایک بیکاری کا مشغلہ، محض خمارِ گندم — دھوئیں کی طرح ناپائدار۔ رومانیت کو اس بیدردی سے پامال کرنے کے بعد بھی کرشن چندر کو رومانی سمجھا جاتا ہے۔ اور بڑی حد تک اس کی ذمہ داری کرشن چندر کے افسانوں کے حسین پس منظر اور نرم و نازک بیان پر عائد ہوتی ہے۔ مگر کسی خوبصورت چیز کو خوبصورت کہنے بجائے خود رومانیت کیسے ہو گیا؟ جہاں تک مجھے معلوم ہے جمالیاتی حِس اور رومانیت مترادف الفاظ نہیں ہیں، حُسن کا دام تو اتنا سخت ہے کہ اس سے بچنا محال ہے۔ ادب میں حُسن کا شاید سب سے بڑا منکر زولا ہے؛ آپ اُس کا خشک سے خشک ناول اُٹھا لیجئے — "نورد" ہی سہی — اور پھر دیکھئے کہ نگار کی کیا سزا ملتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ کو سچی حُسن پرستی کی مثالیں درکار ہیں تو حقیقت نگاروں کے یہاں ہی ڈھونڈنا پڑیگا۔ خیر اسے بھی چھوڑیئے۔ کرشن چندر کی اس حُسن کاری میں ایک نفسیاتی نکتہ پوشیدہ ہے۔ جیسا میں نے کہا وہ رومانیت کو بے نقاب کرنا چاہتا ہے، اور وہ بڑی پرکاری سے ایسا کرتا ہے: وہ پہلے نقاب بُنتا ہے اور پھر اسے تار تار کرتا ہے۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے چیزوں کو اپنے ہیرو کی نظروں سے دیکھنے لگتا ہے۔ پہلے وہ اس ماحول اور اس نفسیاتی مغالطے یعنی رومانی جذبے کو تحریک میں لانے والے اثرات کے بیان سے ایک مخصوص فضا پیدا کر دیتا ہے تاکہ پڑھنے والا بھی اسی لطیف دھوکے میں مبتلا ہو جائے۔ مگر افسانے کے آخر تک معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے بورژوا ہیرو کی یہ ساری جذباتیت پادر ہوا تھی۔ "آنسوؤں والی" میں تو یہ چیز بہت ہی نمایاں ہے، یہاں اور دوسرے افسانوں میں بھی ہیروئن کے حُسن کا بیان اور پس منظر کی خوبصورتی سے افسانے کی تلخی بہت بڑھ جاتی ہے، اور یہ چیزیں بذاتِ خود ایک طنز اور ملامت بن جاتی ہیں۔ ہمارا دل خون ہو کر رہ جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایسی حسین عورتیں اور ایسے فردوسِ نظر ماحول بھی اس طبقے کے دل میں محبت کا بیج نہیں بو سکتے، اور یہ بلند بانگ دعوے محض روحانی افلاس کو چھپانے کی کوششیں ہیں۔ ذرا دیکھئے کرشن چندر

کی لطافت سے رومانیت کی پول کھولتا ہے۔ انجنیر صاحب ڈینگیں مارتے ہیں: "میں نے اُسے حسن و محبت کے افسانے سناتے اور سیاہ دلوں کی ابد فریبیاں بیان کیں۔۔۔۔ سب سے بڑھ کر میں نے اُسے اس چیز کے متعلق خبردار کیا جسے لوگ تہذیب کے مقدس نام سے پکارتے ہیں۔ تہذیب جو اَب جلد ہی اس سڑک کے ذریعے اس علاقے میں پھیلنے والی تھی" ہر لفظ اپنی تفسیر آپ ہے۔ تہذیب کو بُرا کہنا بھی ایک قسم کی بے معنی جذباتیت بن کر رہ گیا ہے، اور ایسا کرنے والوں کے پاس عموماً نہ تو کوئی اصول ہوتے ہیں اور نہ خلوص۔ یہاں کرشن چندر آپ کو اسی قسم کی رومانیت سے روشناس کر رہا ہے۔ "ہندوانی" میں دیکھئے، ایک ایسے نوجوان کا قصہ ہے جس کے پاس اپنے خالی وقت کا صرف اتنا مصرف ہے کہ وہ ولکاکس کے ناول پڑھا کرے۔ وہ ایک غریب دیہاتی لڑکی سے جنسی تسکین حاصل کرنا چاہتا ہے، اور وہ جنسی خواہش بھی دراصل حقیقی اور صحت مندانہ نہیں ہے، بلکہ ناولوں کی مدد سے پیدا کی ہوئی۔ وہ اس لڑکی کو تو فریب میں مبتلا کرتا ہی ہے، مگر خود بھی اس سے نہیں بچتا۔ اس کی "شرافت" نے جنس کا ڈر اُس کے دل میں بٹھا رکھا ہے؛ خالص جنسی تعلق کا خیال تک اُسے لرزہ براندام کر دیتا ہے۔ اس لئے وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنی ہوس پر نام نہاد محبت اور رومانیت کا ملمع چڑھائے۔ لیکن جب اس کی نظارہ بازی کا حال دوسروں کو معلوم ہو جاتا ہے تو کھلتا ہے کہ نہ تو اس کی جنسی بھوک ہی سچی تھی اور نہ محبت۔ فرنیزی جس کی آنکھیں دیکھ کر کل تک اُسے ڈل کے کنول کے پھول یاد آ جاتے تھے، اب اُسے دوسرے ہی رنگوں میں نظر آ رہی ہے: "یہ لڑکی تو مجھے مفت میں بدنام کرے گی۔ میں بھلا اس معاملے میں کیا کر سکتی ہوں کمبخت روئے جاتی ہے ــــ میں نے دل میں سوچا کتنی اجڈ ہے اور گنوار کس طرح میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہے اور روئے جاتی ہے"

اب اس کے بعد کیا آپ فیروزہ کے آنسوؤں پر اعتبار کر سکتے ہیں؟

"بچپن" ایک دلدوز چیخ ہے بچوں کے نرم و نازک دلوں کو مسلے جاتے دیکھ کر۔ رسم و رواج کی پابندی نے ہمارے یہاں کے والدین کے دل ایسے سخت کر دئے ہیں کہ انہیں کسی قسم کے جذبات ایک آنکھ نہیں بھاتے، وہ بڑے فخر سے کہتے ہیں: "کتنا اچھا لڑکا ہے، کھیل کود میں بالکل نہیں پڑتا، بس ہر وقت کتاب سے کام رکھتا ہے" بچوں کی لطیف احساسات اور خوابوں کا گلا پنپنے سے پہلے ہی گھونٹ دیا جاتا ہے۔ نہ تو رفیع کی ماں اُسکے جذبات کا جواب دیتی ہے، نہ اس کا باپ، مگر وہ بھولا بچہ ہے، تیتریوں سے اور نیلا سے محبت کئے جاتا ہے۔ لیکن بڑا ہو کر وہ بھی اپنے طبقے کا ایک فرد بن جاتا ہے، اور اُس کے جذبات بادلوں کی طرح اڑتے چلے جاتے ہیں، ہم اُسے آخر میں رنجیدہ دیکھتے ہیں، مگر اس کا اصلی سبب نیلا کی محبت نہیں ہے، بلکہ اپنے بچپن کی یاد جس میں نیلا کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا تیتریوں کا اور سنبل کے پھولوں کا۔

"جنت اور جہنم" کے عنوان میں تو کرشن چندر نے صاف صاف بتا دیا ہے کہ وہ رومانیت کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔ ذرا اُس کی فن کاری ملاحظہ فرمایئے۔ لڑتے میں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔ وہ شعلوں کو بڑی احتیاط سے پھولوں کے نیچے چھپا دیتا ہے۔ اب یہ دیکھنے والے کی نظر ہے کہ وہ نیچے تک دیکھے یا سطح ہی سے مطمئن ہو جائے۔ کیا یہ معلوم ہونے کے بعد بھی کہ اِسے پانچ روپے کے نوٹ سے خریدا گیا ہے اس رومان میں رومانیت باقی رہتی ہے؟ ان افسانوں میں نہ صرف رومانیت کی نقاب کشائی کی گئی ہے، بلکہ جنس کے مختلف پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

اگر یہی ہے کرشن چندر کی رومانیت، تو میں کہونگا کہ مجھے ایسی رومانیت اور دیجئے۔ ان افسانوں میں اتنی شدید تلخی ہے کہ کہیں شک ہونے لگتا ہے کہ کرشن چندر کو محبت کے وجود ہی سے انکار ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ اس نے چند افسانوں میں تسلیم کیا ہے کہ انسان کی روح واقعی دوسرے کے لئے بے قرار ہو سکتی ہے، اور اس میں جاذب ہو جانا چاہتی ہے۔ مگر یہ محبت ایسے لوگوں کے بس کی نہیں ہے جو تہذیب و تمدن کی بندشوں میں جکڑے ہوئے ہیں، اور رسوم و روایات کی پابندی نے جن میں مصنوعی جذبات پیدا کر دئے ہیں اور خلوص کی جڑ تک کھا ڑ پھینکی ہے۔ ایک کردار ہے جو کرشن چندر کے افسانوں میں بار بار ہمارے سامنے آتا ہے، یعنی ایک معصوم اور سادہ دل دیہاتی لڑکی جس کا دل محبت کر سکتا ہے ــــ سچی اور پائدار محبت، یہ لڑکی دراصل ایک ہی ہے خواہ اس کا نام نیرا ہو یا نیلا یا ذی شی، یہ لڑکی بہت جلد شہر سے آتے ہوئے نوجوان کے دھوکے میں آ جاتی ہے، اور کبھی حقیقت کو نہیں پہچانتی۔ دھوکہ کھا چکنے کے بعد بھی۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں پہونچکر کرشن چندر تھوڑا سا جذباتی ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں کرشن چندر کسی پر اعتراض نہیں کر رہا، نہ وہ کسی کا پردہ چاک کر رہا ہے جہاں جذبات کو ایک حد تک الگ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تو وہ اپنا ایک عقیدہ پیش کر رہا ہے جس پر اُسے دل سے یقین ہے، تو کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے جذبات کو الگ کر سکے اور اگر وہ کر بھی دے تو کیا تاثیر کم نہ ہو جائے گی؟ ایک کرشن چندر پر ہی کیا موقوف ہے، اپنا عقیدہ پیش کرتے ہوئے تو ہر شخص جذباتی بن جاتا ہے۔ جذبات کی شدت ہی تو ہے جو اوروں سے اُسکی بات منواتی ہے۔

کرشن چندر نے دو ایک مَردوں کو بھی محبت کرتے دکھایا ہے، مگر وہ ہمیں ہر جگہ یہی بتاتا ہے کہ ہماری دُنیا ایسی جگہ نہیں ہے جہاں محبت کی بیل منڈھے چڑھ سکے۔ کرشن چندر کے مَردوں میں شدید ترین محبت کرنے والا انسان کبالا ہے۔ اس کی رُوح واقعی بھوکی ہے، اور اُسے ایک ساتھی کی حقیقی تلاش ہے۔ مگر تہذیب ہے سینکڑوں میل دور بھی روپیہ اور شرافت کی پوجا ہوتی ہے جن کے پجاری کبالا کا دل نہیں دیکھ سکتے اور اُس کو قربانگاہ پر چڑھا دیتے ہیں۔ یہی کچھ گل فروش کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔

"دیکھی نیٹر" میں محبت کی ناکامی کا ایک گہرا اور حقیقت انگیز نفسیاتی مطالعہ ہے۔ میں تو یہ کہوں گا جس چیز کو دیکھی نیٹر محبت سمجھتا ہے وہ درحقیقت جنسی جذبہ ہے، اور بہت ہی تند اور تیز اور تندرست، مگر روپیہ اور شرافت اس کی راہ میں بھی حائل ہوتے ہیں، اور اس کو جنسی تسکین نہیں مل سکتی۔ اس کا ردِ عمل اُس کے دماغ پر عجیب ہوتا ہے۔ ایک طرف تو وہ لالچی، بدمزاج اور دولت کا غلام ہو جاتا ہے اور دوسری طرف وہ جاگیردار کا محل بارود سے اڑا دینے کی فکر میں ہے۔

"گرجن کی ایک شام" میں کرشن چندر نے دکھایا ہے کہ ایک مخصوص ماحول میں ممکن ہے کہ ایک خاص طبیعت کا آدمی شاید سچی محبت کرنے لگے۔ مگر اس افسانے کے آخر میں ایک قسم کا گریز ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سُندر سپنا کرشن چندر کو ایسا پسند آیا کہ انہوں نے اسے ہماری دُنیا سے ٹکرا کر پانی کے بلبلے کی طرح چُخ کر ٹوٹتے ہوئے نہیں دکھایا، اور جگدیش کی محبت کا امتحان نہیں لیا۔ ہمیں دیکھنا تو یہی تھا کہ ڈرائنگ روم کی مصنوعی روشنی اور مصنوعی حرارت میں پہونچکر اُس کی محبت کی کلی پھول بنتی ہے یا مُرجھا جاتی ہے۔ ہمیں یہ بتانے کے بجائے کرشن چندر نے جگدیش اور ذکی شی کو مار کر معاملہ ہی گول کر دیا ہے۔ اور اس طرح یہ افسانہ ایک دوسری، گو بہت ہی شاندار شکل اختیار کر گیا ہے۔ اب اس میں سماج اور ماحول کے اثرات کا سوال باقی نہیں رہا، بلکہ افسانہ بلند ہو کر انسان اور کائناتی قوتوں کی دائمی جنگ کی داستان بن گیا ہے ــــ اُس جنگ کی داستان جس میں قدرت آئے دن انسان پر بجلیاں گراتی ہے، مگر وہ پھر بھی ہار نہیں مانتا، اور کہے جاتا ہے "پھر کیا ہوا"۔

یہ ہے کرشن چندر کی رومانیت کی حقیقت۔ میرے خیال میں اگر کرشن چندر کو رومانی کے بجائے بچہ کہا جاتا تو زیادہ مناسب ہوتا۔ اُس کا ہر افسانہ عموماً ایک چیخ ہوتا ہے، اور صرف ایک بچہ چیخ سکتا ہے ــــ یا ایک فرشتہ۔ جن لوگوں نے کرشن چندر کو دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ واقعی وہ ایک بچہ ہے ــــ وہی مسکراہٹ، وہی بیقراری، زندگی سے وہی شغف اور دلچسپی، وہی خود فراموشی، ہر گزرتے ہوئے لمحے میں جذب ہو جانے کی وہی صلاحیت، آنکھوں کی وہی مسحور چمک، اور وہی معصومیت۔ صرف یہی نہیں، وہ جس سے باتیں کرتا ہے اُسے بھی اتنی دیر کے لئے معصوم بنا دیتا ہے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کرشن چندر کے جسم سے خلوص اور معصومیت کی لہریں نکل نکل کر سامنے بیٹھنے والے میں سرایت کر جاتی ہیں، اور وہ بھی چیزوں کو ایسی ہی سادہ اور خوش اعتقاد نظروں سے دیکھنے لگ جاتا ہے، ممکن ہے کہ آپ کو اس کی کسی رائے سے اتفاق نہ ہو، مگر اس وقت تو آپ یہی خواہش کرنے لگتے ہیں کہ اگر وہ بات یوں نہیں ہے تو ایسا ہونا ضرور چاہیئے تھا۔ کرشن چندر اپنی یہ صفت اپنے افسانوں میں بھی منتقل کر سکتا ہے، اور انہیں پڑھ کر آپ اُس کی کہی ہوئی باتوں پر ایمان لائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بچوں ہی کی طرح کرشن چندر میں اپنی تخلیقات کی طرف سے بے پروائی ہے، اور ویسے ہی وہ زندگی کو ہر چیز سے بلند و برتر سمجھتا ہے۔ آپ اُسے کبھی "میرا آرٹ" کہتے نہیں سُن سکتے۔ نہ وہ اپنے افسانوں کے بارے میں زیادہ گفتگو کرتا ہے۔ اگر ایسا کرنے سے دُنیا کو کوئی فائدہ پہونچتا ہو تو مجھے یقین ہے کہ ٹالسٹائی کی طرح کرشن چندر میں یہ ہمت ہے کہ وہ اپنے افسانوں کو جلا دینے کی اجازت دیدے۔ تو میں یہاں سے چلا تھا کہ کرشن چندر ایک بچہ ہے، اور اس کا افسانہ ایک چیخ ــــ اور ہمارے افسانہ نگاروں میں صرف وہی ہے جو چیخ سکتا ہے۔ وہ دہکتے ہوئے انگاروں کی آب و تاب اور رنگینی دیکھ کر لپکتا ہے، مگر وہ انگاروں کو چھو کر دیکھ چکا ہے اسی وجہ سے وہ چیختا ہے۔ دوسرے افسانہ نگاروں کو انگارے اس طرح اپنی طرف کھینچتے ہی نہیں۔ اسی وجہ سے نہ تو انہوں نے انگاروں کو چھو کر دیکھا ہے اور نہ وہ چیخ سکتے ہیں۔ کرشن چندر گویا ایسا فرد ہے جو زمین کی سیر کا شوق اور بڑی بڑی توقعات اور آرزوئیں لیکر نیچے اترا، مگر یہاں مصائب اور ظلم و ستم کی فراوانی کے سوا کچھ نہ دیکھ سکا، اور چیخ چیخکر اپنے ساتھیوں کو خبردار کرنے لگا۔

لائیے اب کرشن چندر کی حقیقت نگاری پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔ اس لفظ کا مفہوم کچھ ایسا مبہم ہے کہ اس تعریف میں متضاد چیزوں کو بھی بڑی آسانی سے شامل کیا جا سکتا ہے۔ مگر کرشن چندر کے نزدیک حقیقت نگاری کے صرف ایک معنی ہیں، زندگی کی حقیقت کو جیسا کچھ اُس نے سمجھا ہے اُسے بیان کر دینا۔ یہاں بھی وہ اُردو افسانوں کی عام روش سے بالکل الگ ہے۔ فرانسیسی فطرت نگاری Naturalism یورپ سے تو مدت ہوئی رخصت ہو چکی، مگر ہمارے یہاں اب پچاس سال بعد آئی ہے۔ گندگی اور غلاظت کے بیان، جنسی تفصیلات، اور چیزوں کی لمبی لمبی بے معنی

فحش سمجھا جاتا ہے یہ چیزیں دینے کو عموماً ترقی پسندی سمجھا جاتا ہے گویا ماحول اور جسموں کی گندگی ہی سب سے بڑی سماجی برائی ہے۔ یہ چیزیں آپ کو کرشن چندر کے یہاں نہیں مل سکیں گی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ چپ چاپ ان پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ اس میں سماجی احساس کی جتنی شدت ہے اتنی اردو کے کسی افسانہ نگار میں بھی نہیں۔ پھر وہ کیسے چشم پوشی کر سکتا تھا۔ مگر وہ ان کو اتنا نہیں پھیلاتا کہ ساری دنیا سڑے ہوئے بالوں اور پھٹے ہوئے کپڑوں سے ڈھک جائے۔ وہ ان چیزوں کی طرف محض اشارے کرتا ہے کیونکہ جسمانی گندگی اسے اتنی ہولناک نہیں معلوم ہوتی جتنا کہ وہ گھن جو سماج کی روح کو کھائے جا رہا ہے۔ کرشن چندر کی حقیقت نگاری کے سلسلے میں ہمیں اکثر اس کے مشاہدے کی تعریف سننے میں آتی ہے۔ میں نے مانا کہ وہ اکثر روزمرہ کی زندگی کی ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں بتاتا ہے جو ہمیں چونکا دیتی ہیں۔ لیکن اگر مشاہدہ واقعی کرشن چندر کی کوئی بڑی خصوصیت ہوتی تو میں یہ مضمون نہ لکھتا۔ کرشن چندر سے زیادہ مشاہدہ اور جزئیات نگاری تو کئی اور افسانہ نگاروں میں ملے گی۔ لیکن اگر محض مشاہدے اور جزئیات نگاری ہی پر ادبی خوبی کا انحصار ہوتا تو شاید گوں کور بھائی (The Goncourts) فرانس کے سب سے بڑے ناول نویس ہوتے۔

اس بارے میں تو لیس چیسٹرٹن آخری بات کہہ گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر آپ کسی جگہ کو یاد رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو چاہیئے کہ وہاں ایک گھنٹہ رہیں، اور وہاں ایک گھنٹے رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ ایک گھنٹے کے لئے اس جگہ کو بھلا دیں۔ یہی ہے بنیاد کرشن چندر کے "مشاہدے" کی۔ وہ اس جگہ کو ایک گھنٹے کے لئے بھلا سکتا ہے۔ فلابیر، موپساں کو اس کی شاگردی کے زمانے میں مجبور کیا کرتا تھا کہ وہ جنگل جائے اور کسی درخت کے سامنے بیٹھکر اس کی تصویر لفظوں میں کھینچنے کی کوشش کرے، لکھے اور کاٹے، یہاں تک کہ وہ درخت دوسرے درختوں سے مختلف معلوم ہونے لگے۔ کرشن چندر کے نزدیک ایسی کوشش محض ایک مزیدار حماقت ہوگی۔ درخت کی شکل وصورت بجائے خود ہمارے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ بلکہ وہ جذبہ جو مخصوص حالات میں ایک مخصوص طبیعت کے آدمی میں اس کے دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ کرشن چندر کی منظر نگاری میں یہی اصول کام کرتا ہے۔ وہ چیزوں کے نام گنوانے نہیں شروع کر دیتا، بلکہ وہ محض "ان ٹکڑوں کو جن کے گرد کوئی جذبہ لپٹ گیا ہے" Chips round which some emotion has curled. چن لیتا ہے، اور ان کی مدد سے وہ اس مخصوص جذبے سے لدی ہوئی فضا تیار کرتا ہے۔ جب کبھی وہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور پیش پا افتادہ باتیں بیان کرتا ہے تو اس کا مقصد یہ جتانا نہیں ہوتا کہ "دیکھا! آپ کا اس طرف خیال بھی نہ گیا ہوگا!" بلکہ عموماً ایسی چیز کی آڑ میں یا تو فطرت انسانی کے بارے میں کوئی لطیف نکتہ بتاتا ہے یا سماج پر تنقید کرتا ہے۔ اس چیز کو ہم مشاہدے کا نام نہیں دے سکتے۔ اس کے نفس تحت الشعور میں زندگی کے متعلق بہت سی باتیں جمع ہوتی ہیں، اور جب ان میں سے کوئی تیر کر سطح تک آ جاتی ہے تو وہ اسے اپنے شعور کی مدد سے اپنے مقصد کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔ اس طرح کرشن چندر کا آرٹ شعور اور غیر شعور کے مشترک عمل کا بہترین مرکب ہے، مگر ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس میں شعور کا حصہ بہت ہی کم ہے۔ اگر کہیں تھوڑی دیر کے لئے کرشن چندر محض مشاہدے پر تکیہ کرنا شروع کر دیتا ہے تو صاف دکھائی دے جاتا ہے کہ جو ل نہیں بیٹھ رہی۔ اس کی دو ایک مثالیں "زندگی کے موڑ پر" میں ملتی ہیں۔

تقریباً ہمیشہ کرشن چندر کا موضوع سماج ہوتا ہے۔ مگر اس کا مقصد اعداد و شمار جمع کرنا نہیں ہے، نہ وہ فرانسیسی فطرت نگاروں کی طرح اپنے آرٹ کو سائنس کی ایک شاخ بنا دینے پر راضی ہو سکتا ہے۔ نہ وہ محض ایک واقعہ نگار اور سماجی مورخ Chronicler & social historian ہے، اور نہ محض تصویر کھینچنے والا ہے۔ سماجی تاریخوں اور تصویروں کے بھی کچھ فائدے ضرور ہوتے ہیں۔ مگر وہ تصویریں لازمی طور پر سائنٹفک ہوتی ہیں، اور زمان و مکان میں ہر طرف سے محدود۔ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کی وجہ سے انہیں مشاہدے کا پابند ہونا پڑتا ہے، اور نہ وہ ان چیزوں کے دائرے میں قدم رکھ سکتی ہیں جن کی پشت پر سائنٹفک دلیلیں نہیں ہوتیں۔ اسی وجہ سے عموماً ان میں ایک طرح کی سطحیت ہوتی ہے، اور وہ ادب کی آزادی اور پائداری سے خالی ہوتی ہیں۔ اس کے برخلاف کرشن چندر کے افسانے ماحول کی ترجمانی کرتے ہوئے بھی اتنے مقید اور محدود نہیں ہوتے۔ ان میں ادب کی آزادی، پائداری اور آفاقیت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سماج کے جسم کو کھڑا دیکھتا نہیں رہ جاتا، بلکہ اس کی روح میں اتر جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ انسان کے دل کی دھڑکن سنتا ہے۔ وہ سماجی ماحول کی طرف اتنی توجہ نہیں کرتا جتنی ان اثرات کی طرف جو یہ ماحول انسانوں کے دلوں اور جذبات و احساسات پر ڈالتا ہے۔ وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ ایسے ماحول میں انسان کی روح کیا محسوس کرتی ہے۔ کرشن چندر کی نکھی

میں شعریت ہے، تفکر ہے، خوابوں کی سی نرمی ہے، سادگی اور معصومیت ہے، مگر میں ان سے بہت ڈرتا ہوں۔ وہ میرے اوپر ہنستی ہیں اور میں گھبرا اٹھتا ہوں۔ ہر انسان میں اتنی خود پرستی ہوتی ہے کہ وہ یہ کہتا ہے کہ "چاہے مجھ سے نفرت کرنے لگو مگر میرے اوپر ترس مت کھاؤ" اور کرشن چندر کی آنکھیں ہیں کہ ان سے ہمدردی کرتی معلوم ہوتی ہیں، آپ کی روح کی گہرائیوں میں اتر جانا چاہتی ہیں، آپ کی زندگی کی ٹریجڈی ڈھونڈ لینے کے لئے بیقرار ہیں۔ اور کیا آپ اس کے افسانے پڑھنے کے بعد کہہ سکتے ہیں کہ اس کی آنکھیں اپنی تلاش میں ناکامیاب رہیں؟ افراد کی طرح وہ سماج کی بھی ٹریجڈی دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اوروں کی طرح وہ بھی پیٹ خالی ہونے کو سماج کی بہت بڑی ٹریجڈی سمجھتا ہے، لیکن اس کی نظر میں دوسری ٹریجڈی بھی ہے جو بھوک کا نتیجہ ہے۔ مگر بذاتِ خود بہت اہم ہے۔ یعنی دلوں کا خالی ہونا۔ سرمایہ دارانہ نظام کی چکی میں صرف غریبوں ہی کی روحیں نہیں پسی ہیں۔ بلکہ امیروں کی بھی۔ ایک طرف تو وہ طبقہ ہے جس میں مزدور بھی شامل ہیں، آٹا نون اور تیل بیچنے والا سکھ دکاندار بھی، اور وہ کلرک اور اسکی بیوی بھی جو ہوں پر سُرخی لگا کر برتن مانجھتی ہے۔ یہ لوگ صبح ہوتے ہی باہر جمع خس و خاشاک نکل جاتے ہیں اور شام کو تھکن سے چور انسانوں سے اکتائے ہوئے "گھر لوٹتے ہیں۔ انہیں اتنی فرصت ہی نہیں کہ وہ جذبات و احساسات رکھنے کا خیال بھی کر سکیں، اور پھر یہ تعیشات انہیں مہنگے کتنے پڑتے ہیں۔ اُن کی زندگی میں ایک حوصلہ شکن یکسانی ہے؛ روز بس ایک ہی باتیں: "پیٹ، بھوک، بیماری، پیسے، حکیم کی دوا۔" آزادی و حریت تو دور چھوٹی چھوٹی خواہشیں بھی ان کے دلوں میں پیدا نہیں ہوتیں۔ متواتر مایوسیوں اور زندگی کی بے رنگی نے اُن کے دل سے امید کی جڑیں اکھاڑ پھینکی ہے۔ کبھی کبھی ان کی آنکھوں میں گرسنہ آرزوؤں کی ہلکی سی چمک پیدا ہوتی بھی ہے، مگر یہ شعلے بھڑکنے سے پہلے ہی بجھ جاتے ہیں۔ انکی زندگی میں بس یہ آواز گونجتی رہتی ہے:

"اپنے بہلے خواب کو اُڑواں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئیگا!"

دوسری طرف امیر لوگ ہیں جن کی زندگی کا مقصد زیادہ سے زیادہ روپیہ بٹورنا رہ گیا ہے، اور جو جذبات جیسی غیر منفعت بخش چیز سے طاعون کی طرح ڈرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو جذبات سے تو عاری ہیں مگر اپنی روح کے خلا کو کسی نہ کسی طرح پُر کرنا چاہتے ہیں، لیکن ہوس کاری اور مصنوعی دلچسپیاں ذرا بھی اُن کی مدد نہیں کر سکتیں۔ چاندی کے تاروں والی سڑک نہیں ایک ڈاک بنگلے سے دوسرے تک لے جاتی ہے، یا دہ فٹن میں بیٹھے ہوئے راستے پر چلتی عورتوں کو دیکھا کرتے ہیں، لیکن کسی طرح سے بھی ان کے ڈرائنگ روموں اور ناچ گھروں سے بھی اُن کی روحانی بے مائیگی کم ہونے میں نہیں آتی۔ غرض کہ سارے سماج پر ایک بے کیفی طاری ہے ۔۔۔ ایک مستقل بے مزگی، بے رنگی، اور مایوسی۔ انسانوں کی یہ حالت دیکھ کر کرشن چندر چیخ اٹھتا ہے۔ ہمارے اکثر افسانہ نگار ادبی شہرت حاصل کر لینے کے بعد اپنے آرٹ کو زندگی سے زیادہ پسند کرنے لگے ہیں۔ مگر کرشن چندر کی ہر چیخ پہلی سے زیادہ تند و تیز اور وحشت ناک ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارے شاعروں میں تو ن۔م۔ راشد کی زیادہ تر نظمیں اور فیض احمد کی بعض بعض نظمیں سماج کی اسی کیفیت کو پیش کرتی ہیں، مگر ہمارے افسانوی ادب میں، اگر ہم "دو فرلانگ لمبی سڑک" کو زیادہ مشتعل سمجھ کر چھوڑ دیں، صرف ایک افسانہ ہے جس نے ہمارے معاشرتی اور اقتصادی نظام کی روح کو لفظوں میں بند کر لیا ہے، اور وہ ہے "بے رنگ و بو"۔ یہ کام کوئی آسان نہ تھا، مگر جس فن کارانہ چابکدستی سے کرشن چندر نے ایسے وسیع موضوع کو اپنے قابو میں کیا ہے وہ اس کے ٹیکنیک کی کامیابی کی ایک روشن مثال ہے۔ سماج کی یہ خصوصیات تو جو ذرا سی بھی واقفیت رکھتا ہے گنوا سکتا ہے، مگر ایسی دھندلی، تنگ اور دم گھوٹنے والی فضا پیدا کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ اس افسانے کا مجموعی تاثر فیض احمد کی نظم "تنہائی" سے بہت زیادہ ہم آہنگ ہے۔ ان دونوں افسانوں میں بغاوت تو ہے مگر آخر میں مایوسی اور تھکن جھلکتی ہے۔ "بے رنگ و بو" کے آخری جملے "میرے لئے یہ سہارے ہی بہتر ہے" میں ایک عجیب اضمحلال ہے، اسی طرح "دو فرلانگ لمبی سڑک" کے آخری جملے "سڑک خاموش ہے اور سنسان، بلند ٹہنیوں پر گدھ بیٹھے اونگھ رہے ہیں" اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ خالی خولی بغاوتی جذبے محض بیکار رہیں، اور سماج اور معاشی نظام ان کے باوجود اسی طرح قائم ہیں۔

انسانوں پر ماحول کے اثر کے علاوہ بعض بعض جگہ ہمیں شبہ ہوتا ہے کہ کرشن چندر کو انسان کی فطرت پر پورا اعتماد نہیں ہے۔ اُسے غریبوں سے ہمدردی ضرور ہے، مگر وہ اُن کی حمایت میں جذباتی نہیں بنتا۔ وہ صرف امیروں ہی کو درد و محبت سے خالی نہیں پاتا، بلکہ یہ بھی جانتا ہے کہ اپنے موقع پر غریب بھی نہیں چوکتے۔ اُن میں بھی ایسی ہی خود غرضی اور خود مطلبی ہو سکتی ہے۔ اُپلوں والی جوان عورت کو صرف یہی خیال ہے کہ اُسے ابھی جا کر روٹی پکانا ہے، اور اُسے اپنی بوڑھی ماں

کی تھکی ہوئی ٹانگوں کی ذرا بھی پروا نہیں۔ زندگی کے موڑ پر میں پھینک دیا جاتا ہے جنہیں کوئی غریبی کی وجہ سے بیٹی نہیں دیتا۔ مگر وہ قحط زدہ کسانوں کی نوعمر لڑکی کو دو سو روپے میں خرید لاتے ہیں۔ پرکاش وتی کو ایک ہلدی بیچنے والے سے بیاہ کر دینے میں اگر روپے کا لالچ تھا، تو دوسری طرف ریشمان کے باپ نے بھی تو اسی وجہ سے اُسے جاگیردار کے بیٹے کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ مانا کہ کرشن چندر یہ دکھانا چاہتا ہے کہ موجودہ نظام نے ہر ایک شخص کو کتنا بے حس بنا دیا ہے۔ مگر اس میں انسانی فطرت پر تھوڑا سا الزام ضرور شامل ہے ــــ خصوصاً ایسوں والی کی باتوں میں۔

حقیقت نگاری کے سلسلے میں خارجیت (Objectivity)، انفصال (detachment) اور غیر جانب داری (disinterestedness) کی بہت تعریفیں کی جاتی ہیں۔ مگر کرشن چندر کے یہاں ان چیزوں کی تلاش بالکل بیکار ہے۔ وہ اپنی نظروں سے دیکھتا ہے، بلکہ یوں کہئے کہ وہ اپنے مزاج اور طبیعت کی عینک سے دیکھتا ہے، اور ساری چیزیں اسی کے رنگ میں رنگ جاتی ہیں۔ کرشن چندر سے غیر جانب داری کا مطالبہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے پنساری کی دکان پر گوشت لینے جانا۔ اسی طرح اس کے یہاں انفصال بھی نہیں ہے۔ اس کے افسانوں میں ہم ہر وقت اس کی شخصیت کو محسوس کرتے رہتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہو تو ان کی دلچسپی بہت کم ہو جائے۔ وہ دور سے کھڑا ہو کر زندگی کو نہیں دیکھتا، بلکہ اس سمندر میں کود پڑتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں اور تاثرات کو اپنے تخیل میں صرف تصویر کی طرح نہیں دیکھتا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنے آپ وہ کردار بن جاتا ہے اور ذہنی طور پر ان ہی تجربات سے گزرتا ہے۔ وہ اس کے جسم اور احساس کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔ چونکہ وہ اُن جذبوں کو جو وہ بیان کر رہا ہے اپنے اوپر طاری کر لیتا ہے، اسی لئے وہ اپنے افسانوں میں ایک مخصوص "جذباتی فضا" اور، ہنری جیمس کے لفظوں میں، "اصلیت کی سی شکل" (an air of reality) پیدا کر سکتا ہے۔

کرشن چندر نے افسانے کے مسلمہ اُصولوں کو ایسی بے اعتنائی سے کچلا ہے کہ ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا اور ہم اُسے انہیں پرانے پیمانوں سے ناپنے لگتے ہیں۔ انہیں میں سے ایک کردار نگاری کا ڈھکوسلا ہے۔ افسانے میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس میں زندگی کتنی ہے، بلکہ یہ کہ کردار کتنا ہے۔ ڈھونڈنے والوں کو کرشن چندر کے افسانوں میں بھی کردار مل گئے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ اس کا ہر افسانہ ایک سماجی تاثر ہوتا ہے، اس لئے کردار نگاری اُس کی نمایاں خصوصیت ہو ہی نہیں سکتی۔ کرشن چندر کی عظمت اس میں نہیں ہے کہ وہ بہت اچھے کردار پیش کر سکتا ہے ــــ جو دوسرے بھی کر سکتے ہیں، اور شاید کرشن چندر سے بہتر ــــ بلکہ اس میں کہ وہ سماجی تاثر کے ساتھ ساتھ آرٹ کو بھی قائم رکھ سکتا ہے۔ دراصل اُسکے افسانوں کے اشخاص پر کردار کا اطلاق پوری طرح نہیں ہو سکتا کیونکہ کردار کے لئے لازمی ہے کہ اُس میں اتنی انفرادیت ہو کہ وہ دوسروں سے الگ پہچانا جا سکے۔ لیکن کرشن چندر فرد اور انفرادیت کو اتنی اہمیت دیتا ہی نہیں۔ محض کردار نگاری اس کا مقصد نہیں ہوتا، بلکہ اپنے اشخاص کی مدد سے سماج کے بارے میں کوئی بات بتلانا، لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کے اشخاص محض پتھر کے ٹکڑے ہوتے ہیں، یا بے جان سماجی ٹائپ۔ وہ انہیں اتنی انفرادیت ضرور دیدیتا ہے کہ وہ جی سکیں۔ وہ ہماری طرح ہی گوشت پوست کے انسان ہوتے ہیں، وہ برابر سوچتے ہیں، محسوس کرتے ہیں، اور پوری طرح زندہ ہیں۔ کرشن چندر خود بھی فطرت کا دلدادہ ہے، اور وہ اپنے اشخاص کو بھی اس سے متاثر ہونے کی اجازت دیدیتا ہے۔ میرے خیال میں کرشن چندر کے افسانوں میں صرف دو شخص ہیں جنہیں واقعی کردار کہا جا سکتا ہے، ایک تو کبالا، دوسرا وکیسی نیٹر۔ ہاں "ٹوٹے ہوئے تارے" کے بارے میں بڑی آسانی سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے، اور اس کے "ہیرو" کو ایک کردار سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر دراصل اس میں ایک کردار کی نفسی کیفیت کا بیان نہیں ہے، بلکہ محض ایک نفسی کیفیت کا۔ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہی نفسی کیفیت اس دوسری کار کے مالک کی بھی نہ ہوگی؟ اس شخص سے زیادہ تو یہ افسانہ اُس چاندی کے سے تارکی سڑک کا ہے جو ایک ٹھنڈے چشمے کو دوسرے سے اور ایک امیر کی جیب کو دوسرے امیر کی جیب سے ملاتی ہے۔

کردار نگاری کو تو خیر وہ دوسرا درجہ دیتا ہی ہے، مگر کرشن چندر نفسیاتی تجزیے کے جادو سے خوب بچا ہے۔ یورپ میں تو تجزیے کی گویا پرستش ہوتی ہے، مگر ہمارے افسانہ نویس بھی اب بڑی تیزی سے اُس طرف بڑھ رہے ہیں۔ لیکن کرشن چندر نہ تو خود کسی کو مرعوب کرنا چاہتا ہے، اور نہ وہ خود کسی سے مرعوب ہوتا ہے، خواہ وہ جیمس جوئس ہی کیوں نہ ہو۔ وہ جانتا ہے کہ نفسیاتی تجزیہ افسانہ نگار کو کن کن گڑھوں میں لے جاتا ہے۔ یہ چیز بڑی آسانی سے زندگی سے فرار سکھا دیتی ہے۔ زندگی کی بڑی بڑی حقیقتوں کو بھول کر آدمی یہ دیکھنے

لگ جاتا ہے کہ ایک مکھی بیٹھنے سے دماغ میں کیا ردِ عمل ہوتا ہے، چونکہ وہ سوائے اپنے کسی اور کے نفسیاتی عمل کو نہیں سمجھ سکتا، اس لئے وہ اپنے آپ کو ایک مثالی آدمی سمجھ کر اپنے کپڑے اپنے کرداروں کو پہنانے لگتا ہے۔ وہ بہت جلد خود پرست بن جاتا ہے، اور اپنے آرٹ اور ٹیکنیک کو تمام انسانوں اور دُنیا بھر سے اعلیٰ وارفع سمجھنے لگتا ہے۔ یہی ٹریجیڈی ہے —— Finnegan's Wake والے جیمس جوئس کی۔ مگر کرشن چندر اس راستے کے خطروں سے خوب واقف ہے۔ اُس کے نزدیک آرٹ زندگی کا خادم ہے اور اسی وجہ سے قابلِ قدر ہے۔ اگر نفسیاتی تجزیہ اُسے زندگی کی خدمت سے غافل کرتا ہے، تو وہ کرشن چندر کے لئے قابلِ قبول نہیں ہے۔ وہ انسانوں کے دماغوں کو سمجھنے کی اتنی کوشش نہیں کرتا جتنی اُن کے دلوں کو۔ لیکن وہ انکی نفسیات کو بھی سمجھتا ہے۔ خیال اور احساس کا عمل دکھانے کیلئے وہ بے معنی اور بے ربط بک بک نہیں کرتا بلکہ اسمیں تصویروں، استعاروں اور علامتوں کی مدد لیتا ہے۔ اور اس چیز میں اس کا مقابل اُردو میں دوسرا نہیں ہے، ایسے اشخاص کے دماغ اور احساس ہمیشہ ماحول اور گرد و پیش کی چیزوں سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ لیکن ماحول کے اثرات دکھلانے کیلئے وہ متاثر ہونیوالے دماغ کو چیرنا پھاڑنا نہیں شروع کر دیتا، بلکہ خود اُن چیزوں کو بیان کرتا ہے جن سے وہ مخصوص کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ اس طرح وہ چیزیں اس ذہنی کیفیت کی زندہ علامتیں بنجاتی ہیں یہی علامتیت ہے جو غیر مرئی کو مرئی بناتی ہے اور کرشن چندر کے آرٹ میں ایک ٹھوس پن پیدا کرتی ہے۔ اسکی منظر نگاری اوروں کی طرح نہیں ہے۔ اُسکے افسانے کی فضا، نفسیاتی کیفیت اور مناظر باہم ایسے دست و گریباں ہوتے ہیں کہ آپ اُسکے بیان میں سے ایک لفظ نہیں نکال سکتے۔ کبھی کبھی وہ یہ کرتا ہے کہ خدوخال زیادہ واضح کرنے کیلئے تصویر کو تھوڑا سا دھندلا دیتا ہے۔ اس خصوصیت کی اور اسکی علامتیت کی بہترین مثالیں "ٹوٹے ہوئے تارے" میں ملتی ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہوئے میں بے جھجک کہہ سکتا ہوں کہ اس فسانہ سے عمدہ افسانہ شاید ہی اُردو میں ملے۔ کرشن چندر کو صاحبِ طرز نہیں سمجھا جاتا، مگر اس فسانے کی نثر اُردو میں افسانوی اور تاثراتی نثر کا مثالی نمونہ ہے۔ کرشن چندر کی نثر ایسی معین اور محدود نہیں ہوتی کہ ایک تصویر اور ایک مفہوم ہمارے دماغ میں گڑ کر رہ جائے۔ اسمیں ایک موسیقی کی سی کیفیت ہوتی ہے، ایک مبہم جھنجھناہٹ جو مدتوں ...

اپنے تازہ افسانوں میں تو خیر اس نے پلاٹ کو بالکل خیرباد ہی کہہ دیا ہے۔ مگر پہلے بھی وہ کبھی پلاٹ کا غلام بن کر نہیں رہا۔ اُس کے پرانے افسانوں میں بعض لوگوں کو خودکشیاں بہت کھٹکتی ہیں۔ لیکن یہ خودکشیاں کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتیں۔ اس کی بات تو اُن سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے۔ کرشن چندر فطری اور غیر فطری کے پھیر میں پڑتا ہی نہیں۔ اُسے تو بس یہ فکر رہتی ہے کہ وہ زندگی کا احساس پیدا کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہارڈی کی طرح بڑی بے پروائی سے ایسے حادثات کا استعمال کر لیتا ہے۔

نہ وہ وحدتِ تاثر اور دلچسپی کو ایک نقطے پر مرکوز رکھنے کی رسم کا پابند ہے۔ وہ کبھی یہ کھینچ تان نہیں کرتا کہ موضوع اور کہانی کے باہر ایک لفظ نہ آنے پائے۔ نہ وہ ہمیں یہ یقین کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ وہ آدمی، وہ اور وہ لمحہ جسے وہ بیان کر رہا ہے کائنات بھر میں سب سے اہم ہیں۔ بلکہ وہ تو ہمیں اشاروں سے، تشبیہ و استعارات سے ہمیں یہ یاد دلانے کی کوشش کرتا رہتا ہے کہ اس افسانے سے باہر بھی زندگی کا وجود ہے۔ اس کے افسانوں میں دروازے ہوتے ہیں جن سے ہم اندر باہر جا سکتے ہیں۔ "گرجن کی ایک شام" اور "سفید پھول" جیسے افسانوں میں بھی ایک آدھ کھڑکی تو ضرور ہوتی ہے جس سے ہم باہر جھانک سکتے ہیں۔ وہ زندگی کو ایک بہتے ہوئے دریا کی طرح دیکھتا ہے، اگر ہم اس کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم سامنے کے موڑ سے آگے کے ٹیلوں، کنجوں اور درختوں کے وجود کو بھلا دیں۔ لیکن میرا مطلب یہ نہیں ہے اُس کے افسانوں میں کوئی مجموعی تاثر نہیں ہوتا۔ ضرور ہوتا ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہونگا کہ اس کے سارے افسانوں کے مجموعے میں بھی ایک مجموعی تاثر ہے۔ اس کے افسانے گول گول لپٹی ہوئی چینی تصویروں کی طرح ہیں، جن کا ہر حصہ بذاتِ خود ایک تصویر ہوتا ہے اور ساتھ ہی پوری تصویر کا ایک جز بھی۔ اس کا افسانہ ختم کرنے کے بعد ہم اس واقعے کے نرالے پن پر تعجب کرتے نہیں رہ جاتے۔ وہ ہمیں خود بتا دیتا ہے کہ یہ واقعہ تو کتنی مرتبہ ہو چکا ہے اور ہوتا رہے گا۔ وہ چاہتا ہے کہ آپ یہی کہتے رہیں کہ "پھر کیا ہوا؟" اور ایک ہی قصے کو بار بار سُنے جائیں۔ اُس کے افسانوں کے خاتمے میں ایک ہولناک قطعیت نہیں ہوتی۔ ہمیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ افسانے کے ساتھ دُنیا بھی ختم ہو گئی، بلکہ افسانہ ختم ہو جاتا ہے اور زندگی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے، اپنے روزمرّہ کے واقعات کو بار بار دُہراتی ہوئی۔ زندگی کے تواتر اور تسلسل کا اعتراف کرنے کے لئے بڑی فن کارانہ ہمت کی ضرورت تھی۔ مگر کرشن چندر ہمیں دھوکہ نہیں دینا چاہتا۔ وہ افسانے کے آخر میں کہدیتا ہے کہ یہ تو ایسے ہی سینکڑوں واقعوں میں سے ایک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں کو ڈرامائی طریقے سے ختم نہیں کرتا۔ ڈرامائی خاتمے میں کچھ ایسا معلوم ہوا کرتا ہے جیسے پیٹ میں گھونسا مار دیا، یا جیسے ایک بم پھٹا اور سوائے اُس کے دھماکے کے ہر چیز ذہن سے غائب ہو گئی، اس کے بجائے کرشن چندر کے خاتمے ہمیشہ نرم اور ملائم ہوتے ہیں اور

ہمیں واقعات کو زیادہ وسیع پس منظر کے ساتھ دکھاتے ہیں۔ وہ ہماری دماغ سے پوری طرح کبھی غائب نہیں ہوتے، بلکہ بادلوں کی طرح اُڑتے ہی پھرتے ہیں۔ کبھی ہلکے ہو جاتے ہیں، کبھی گہرے۔ یہ خاتمے زندگی کے اِسی تسلسل اور تواتر کی طرف اشارہ کرتے ہیں، وہ ہمیں بتلاتے ہیں کہ "دُنیا کے اس بھوت ہسپتال" میں یہی ہوتا ہے۔ جب ایک مریض مرجاتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ فوراً آجاتا ہے"۔

ممکن ہے کہ اس کے افسانوں میں فلسفیانہ گہرائی کی کمی محسوس کی جائے، مگر کرشن چندر کبھی کبھی اپنے خاتموں میں تو فلسفی ہو جاتا ہے۔ "زندگی کے موڑ پر" کا سا عظیم الشان خاتمہ تو آج تک کسی اُردو افسانے کو نصیب نہیں ہوا۔ پرکاش چند صبح کے وقت نہانے جاتا ہے اور رہٹ کی اُوں اُوں سُنتا ہے "اس بے مطلب اور بے معنی صدا میں اُسے ایک نامعلوم سی مسرت محسوس ہونے لگی۔ اور وہ آنکھیں بند کر کے نہاتا گیا اور اُسے سنتا گیا... اوں... اوں... اوں... بے مطلب بے معنی... منبع نامعلوم... منزل ناپید... اب وہ آنکھیں بند کئے ہوئے بھی بیلوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے اُس کسان کو دیکھ رہا تھا جو کھلونے کی طرح معلوم ہو رہا تھا اور بیل جو رہٹ کے محور کے گرد گھومتے جاتے تھے... اوں... اوں... اوں..." ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو اس استعارے میں سماج کی چکی نظر آئے جو رسم ورواج کے محور پر گھومے جا رہی ہے اور جس نے انسان کو ایک کھلونا بنا دیا ہے۔ مگر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں کرشن چندر کے کان ستاروں کی موسیقی سُن رہے ہیں، وہ شادی بیاہ اور سماج سب سے بہت بلند ہو گیا ہے، اور وہ پوری کائنات کے نظام پر غور کر رہا ہے، جہاں انسان اور اُس کی دُنیا بالکل حقیر رہ جاتے ہیں۔ کائنات کے رقص کا تسلسل اور باقاعدگی دیکھ کر اُس کا دل لرز جاتا ہے، منجمد ہو کر رہ جاتا ہے، اور ساتھ ہی اُسے سکون سا بھی ملتا ہے۔ اِس تفکّر میں بغاوت بھی ہے، عجز بھی، جھنجلاہٹ بھی، تسکین بھی، شکستگی بھی ہے اور ہمّت بھی۔ یہ نہ سمجھئے کہ یہاں کرشن چندر سماج کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر راضی ہو گیا ہے۔ یہاں تو سماج کا سوال ہی نہیں ہے۔ ہر سچے باغی کی زندگی میں وہ لمحہ آتا ہے جب وہ کائنات اور زندگی ——— وہ کائنات اور زندگی جنہیں بہت ہی موٹے موٹے حرفوں میں لکھا جاتا ہے ——— کے سامنے سر جھکا دینے اور اُن میں اپنی ہستی گم کر دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ہمارے افسانہ نگار کی زندگی میں وہ لمحہ آچکا ہے۔

کرشن چندر کے افسانوں میں ہمیں مزاح اور طنز کی بھی اکثر مثالیں ملتی ہیں، لیکن طنز تو آجکل بڑی حد تک ناگزیر ہے۔ ہمارا زندگی کا نظام ہی کچھ ایسا اوندھا سیدھا ہے کہ اُس کے غیر جانبدارانہ بیان میں بھی ایک مضحکہ خیز پہلو پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ لیکن ساتھ ہی کرشن چندر کی طبیعت میں بھی کافی طنز ہے آپ اُس سے گفتگو کرتے کرتے یکایک چونک پڑیں گے، اور ڈریں گے کہ شاید وہ آپ کو اپنے طنز کا تختۂ مشق بنا رہا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ آپ پر واضح ہو گا کہ وہ آپ پر نہیں بلکہ اُس ماحول پر جس نے آپ کو پیدا کیا ہے طنز کر رہا ہے۔ وہ ذاتی گفتگو میں بھی کبھی فرد پر نہیں ہنستا بلکہ سماج پر جو درحقیقت فرد کے افعال کی ذمہ دار ہے۔ اس کے افسانوں میں بھی طنز کے نیچے گہری ہمدردی اور رنج چھپا ہوا ہے اور یہی زیادہ اہم ہے۔

ایک سوال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آیا کرشن چندر محض تنقید ہی کرتا ہے یا خود بھی کوئی عملی نظریہ پیش کرتا ہے: وہ صرف پُرانی زندگی کی قدروں کو برباد ہی کرتا ہے یا نئی قدروں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ لیکن آج کل کسی ایماندار آدمی سے یہ مطالبہ ذرا غیر منصفانہ ہے۔ جس نئی زندگی کو پیدا کرنے کی آرزو ہمارے دلوں میں ہے وہ کرۂ زمین پر بالکل نئی قسم کی ہو گی، اس لئے ہم اس کا صحیح اور واضح تصور کر ہی نہیں سکتے۔ نئی زندگی کی قدریں نئے اقتصادی نظام سے خود بخود پیدا ہو جائیں گی۔ اس لئے آج کل محض پُرانی قدروں کے ناکارہ اور کھوکھلا ہونے کا یقین دلانا اور نئے نظامِ زندگی کی آرزو پوری کرنا ہی آرٹسٹ کا کام ہے۔ یہ تخریب ہی تعمیر ہے۔

میں نے بار بار یہ کہا ہے کہ کرشن چندر کے یہاں آپ کو وہ چیزیں نہیں مل سکتیں جو آپ دوسروں میں ڈھونڈتے رہے ہیں۔ نہ اُس کے یہاں پلاٹ کی خوبیاں ہیں، نہ کردار نگاری کی، نہ نفسیاتی تجزئے کی، اور نہ حسین لفاظی ہے۔ اُس کے یہاں ایک چیز ہے جو ان سب سے بلند ہے ——— زندگی۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی ایسی وسیع اور بسیط اور مبہم چیز ہے جو کسی کے ہاتھ آتی ہی نہیں۔ آرٹسٹ کی معراج، جیسا ہنری جیمس نے کہا ہے، بس یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیق میں "چیزوں کی مشابہت" (Look of things) اور "زندگی کا ہلکا سا عکس" (illusion of life) پیدا کرے۔ اور کرشن چندر اس میں کامیاب ہوا ہے۔

———

محمد حسن عسکری

حنائی انگلیاں

کیا کرتے ہو راجندر بھیّا؟ کچھ نہیں۔ بی۔ اے پاس کرچکا ہوں۔ ایم۔ اے کی تیاری کر رہا ہوں۔ اوہ! پھر کیا کروگے؟ بی۔ اے کی ڈگری دوبارہ لونگا۔ کب تک۔ اجب تک سانس آتا ہے۔ آہا۔ آہا۔ ہی ہی ہی۔ ہو...

نوکری نہیں ملتی، بہت کوشش کرچکا ہوں۔ جھوٹ بکتے ہو۔ دن رات گھر میں رہتے ہو۔ اور اپنے ماں باپ کا روپیہ ضائع کر رہے ہو اور کہتے ہو بہت کوشش کر رہے ہو۔ تم کیا کوشش کروگے۔ تم میں کام کرنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ تم کام کر ہی نہیں سکتے۔ ارے بھئی، بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے میں اتنے سال خرچ کر دئے۔ کس الو نے تمہیں کالج میں داخل کروایا۔ تم تو کاٹھ کے الو ہو۔ جو کام کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کام حاصل کر لیتے ہیں۔ تم کیا کر سکے؟ بوٹ پالش کرالو اور پالش پہنا۔ نوکری مانگتے ہو۔ کسی کے پاس گئے۔ کسی سے سفارش حاصل کی۔ کہیں جوتیاں چٹخائیں۔ کسی کے لڑکوں کو مفت پڑھایا۔ کسی کے گھر کا کام کیا۔ پھر کہتے ہو بہت کوشش کرچکا ہوں۔ جاہل۔ بیوقوف، کیا نوکری اس طرح ملا کرتی ہے؟ جان کھپانی پڑتی ہے، جان۔ آج کل کے لڑکے کام کہاں کرتے ہیں۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ بیٹھے بٹھلائے کوئی کام مل جائے۔ دس ہزار کی تھیلی ہاتھ میں آجائے۔ اور پھر ہم گلچھرّے اڑائیں۔ ناک سے دھواں نکالیں، سینما دیکھیں، اور نسبت روڈ پر لڑکیوں کو گھوریں۔ بدمعاش لفنگے کہیں کے۔

میری طرف دیکھتے نہیں، سوکھ کر کانٹا ہوگیا ہوں۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہوں۔ کیسے کیونکر ہوا۔ میں بھی تمہاری طرح تھا۔ موٹا، تازہ، آنکھوں میں چمک۔ جسم گوشت سے بھرا ہوا۔ نظر عقاب جیسی۔ چہرے پر دلآویزی۔ کدھر گئی۔ کیا کہا! جونک پی گئی!! کہا نہ تھا۔ محنت کرو۔ خوب دل لگا کر پڑھو۔ ایم۔ اے میں فسٹ ڈویژن لو۔ میری طرف دیکھو۔ دن میں ۲۴ گھنٹے پڑھتا ہوں۔ کیا دن میں ۲۴ گھنٹے ہوتے ہیں۔ تم کیا جانو۔ جاؤ ڈنڑ پیلو! اکھاڑے میں جاؤ۔ تیل کی مالش کرو۔ آئے پڑھنے۔ اور پھر کہتے ہو نوکری نہیں ملتی۔

کام کرنے سے نوکری ملتی ہے میاں، پروفیسر گھوش کی طرف دیکھو۔ منہ سے خون آتا ہے، آنکھیں اندر دھنس چکی ہیں۔ چھاتی دکھتی ہے، رات کو بخار آتا ہے۔ اب گورنمنٹ نے انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی ہے اور سترّ روپے ماہوار کی تنخواہ پیش کی ہے۔ اب سولن جا رہے ہیں، تپ دق ہوگیا ہے انہیں۔

تم کو تپ دق چاہیئے یا نوکری۔ آہا۔ آہا۔ اوہ۔ ہو..... تپ دق، جاؤ سولن... وارڈ میں رہو۔ اور لوگوں سے پوچھو کہ انہیں تپ دق کیوں ہوگیا ہے۔ ارے وٹامن کھانے کو نہیں ملتا۔ دودھ پینے کو نہیں ملتا۔ اور ہوا سانس لینے کو نہیں ملتی۔ نوکری لیکر کیا کروگے۔ کیا دُنیا میں اور کوئی کام نہیں ہے۔ نوکری اور شادی.... شادی اور نوکری۔

اسی چکر میں ساری عمر بیت جائیگی۔ میں تو عورت چاہتا ہوں عورت۔ ارے بھئی عورتیں بازار میں پھرتی ہیں۔ کسی ایک کو پکڑ لو۔ جوتیوں سے ڈرتے ہو۔ ارے جوتیوں سے یا عورت سے۔ اوہ خدایا۔ غلام بھی کوئی نہ ہو۔ عورت سے ڈرنے لگے۔ غلام کہیں کے۔ پھر کہتے ہو آزادی نہیں ملتی۔ ملے کیونکر۔ اچھا آؤ۔ ایک اور راستہ دکھاؤں۔ جاؤ اس بازار میں... جہاں عورتیں بکتی ہیں... سمجھ گئے۔ میں بھی کئی بار گیا ہوں۔ جب تک شادی نہ کی تھی۔ ہر روز جاتا تھا۔ ارے کیا کہا۔ سوزاک سے ڈرتے ہو۔ دہلی کا دواخانہ موجود ہے۔ کوی شاد اس زندہ ہے۔ پاگل میرے پاس ایک مجرب نسخہ موجود ہے۔ (ایک دن میں پیپ چلنی بند) ایک بار مجھے بھی ہوا تھا۔ سنا تم نے؟ سوزاک نہیں آتشک۔ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ صرف خون خراب ہوجاتا ہے۔ جسم پر پھوڑے ہوجاتے ہیں اور پھر... پھر... اگر علاج نہ کراؤ تو مکتی حاصل۔ کتنا سہل طریقہ ہے مکتی حاصل کرنے کا۔ عورت کے ذریعے مکتی۔

کیا کہا۔ کوڑھ ہوجائے گا۔ کوڑھ سے ڈرتے ہو۔ میں سمجھ گیا۔ تم عورت سے ڈرتے ہو۔ تم نروان حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ میں۔ میں۔ چھ بچوں کا باپ ہوں۔ دو بچوں کو میں نے آتشک دیا ہے۔ ایک کی آنکھیں اندھی ہوگئی ہیں، اور دوسرے کی ٹانگیں ٹیڑھی ہوگئی ہیں۔ اور میری بیوی کو بھی آتشک ہوگیا ہے۔ لائل پور لے گیا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر کہنے لگی "ایسی لڑکی، رومت، تمہارا کوئی کسور نہیں۔ تمہارے خاوند کا کسور ہے وہ بدمعاش ہے۔ تم مت رو۔ اچھا ہو جائیگا"۔

خدا غارت کرے اس لیڈی ڈاکٹر کو۔ اس نے میری بیوی کو اچھا کر دیا۔ کیوں۔ مجھے اپنی بیوی سے نفرت ہے۔ کتنی بدصورت ہے۔ میں ایک آرٹسٹ ہوں۔ مجھے خوبصورتی پسند ہے۔ خوبصورت عورتیں، گول گول مکھن کی طرح سفید بازو۔ دلکش نکھری ہوئی رنگت۔ آنکھیں، جیسے۔ کیا کہا۔ کوئلے کی طرح۔ انجن کے کوئلے کی طرح۔

کیا کہا۔ مرگئی۔ نہیں نہیں میری بیوی زندہ ہے۔ ابد تک زندہ رہیگی۔ اور میں بھی زندہ ہوں۔ لیکن پھر بھی اس بازار میں جاتا ہوں۔ جہاں عورتیں اجناس کی طرح بکتی ہیں، تم تو کہتے تھے جانا بند کر دیا؟ جھوٹ بکتا تھا۔ مجھے حُسن چاہیے۔ خوبصورت عورتوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ کیا کہا۔ آس پاس کے گلی کوچوں میں ...... ارے بھئی انہیں شریف بھانپ سکتے ہیں۔ میں رات کے اندھیرے میں جاتا ہوں۔ کون کہتا ہے میں دن کو جاتا ہوں۔ لوگ رات کو جاتے ہیں میں ایک اچھے عہدے پر فائز ہوں۔ کیا کہا۔ رات کو جاؤں۔ ہاں سمجھ گیا تمہاری چالاکی۔ دفتر سے نکلوانا چاہتے ہو۔ اور میری جگہ حاصل کرنا چاہتے ہو۔ کبھی نہیں۔ میں دن کو جاؤں گا، رات کو بدمعاش جاتے ہیں۔ میں شریف ہوں میں نے شادی کر رکھی ہے۔ میرے بال بچے ہیں، میں دن کو جاتا ہوں۔

اوہ، تم نے مس قیصی کو نہیں دیکھا؟ خدا کی قسم نری مورت ہے، سونے کی مورت۔ تم کیا جانو اس میں کتنی کشش ہے۔ اُس کی گول گول باہوں میں کتنی لطافت ہے۔ ان سفید سفید مرمریں ہاتھوں میں کتنا سکون ہے۔ اور مس جلو۔ اُف اُس کی آنکھیں، تیر کی طرح کلیجے میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ اور ہاں یاد آیا۔ مس بانو! خدا اُس کی عمر لمبی کرے ارے دیکھو تو لوٹ پوٹ ہو جاؤ۔ اُسے مجھ سے کتنی محبت ہے۔ بے انداز محبت ایک دن میں اُس کے کوٹھے پر ایک ہفتے کے بعد گیا۔ اس نے مجھے پکڑ لیا خوب چوما اور پھر دو تین چانٹے رسید کئے۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ کہنے لگی "مجھے تم سے محبت ہے حرامزادے۔ تو تو دوسری عورتوں کے پاس جاتا ہے؟ بتاؤ مجھ میں کیا کمی ہے۔ تم مجھے حیوان سمجھتے ہو۔ کیا میں محبت نہیں کر سکتی۔ کیا میرے جذبات نہیں۔ کیا میں محسوس نہیں کر سکتی۔ حرامی! میں کتنے عرصے سے تمہارے فراق میں گھل رہی ہوں۔ آج چڑھ گئے میرے ہاتھ۔ میں تمہیں اور ماروں گی۔ کیوں جاؤ گے کسی اور کے پاس۔ بولو۔ کہو"

"نہیں نہیں۔ معاف کر دو۔ اب کبھی نہ جاؤنگا۔ اب کہیں نہ جاؤنگا۔ اب معاف کر دو"

لیکن اُس نے میرا بوٹ چھپا لیا اور کہنے لگی "جاؤ۔ ننگے پاؤں گھر جاؤ۔ تمہارا یہی علاج ہے۔ تمہیں یہی سزا ملنی چاہیے۔ مردود، بے حیا۔ دوسری عورتوں کے پاس جاتا ہے؟"

میں نے اُسکے پاؤں پکڑ لئے۔ خدارا کیوں دفتر سے نکلواتی ہو۔ کہاں جاؤں ننگے پاؤں، ننگے سر، کسی نے دیکھ لیا تو کہدینا کہ پاگل ہوں، حیوان ہوں۔ کیا کہا۔ میں پاگل ہوں۔ کیا میں پاگل ہو سکتا ہوں۔ میں پاگل نہیں ہیجڑا ہوں۔ میں۔ میں۔ میں۔ میرے چھ بچے ہیں۔ مجھے کون ہیجڑا کہتا ہے۔ میں چھ بچوں کا باپ ہوں۔

میں بھول گیا۔ تم بھی چلو گے۔ ارے بھئی، ایک اور پرانی واقف کار آئی ہے۔ بالکل نئی۔ راولپنڈی سے آئی ہے۔ دیکھو تو تڑپ اٹھو۔ کانوں میں دو چمکتے ہوئے آویزے۔ باہوں میں سبز رنگ کی چوڑیاں اور بدن پر سرسراتی ہوئی آسمانی رنگ کی ساری۔ کاش! تم اُسے دیکھ سکو۔ اوہ۔ تم بازار میں جانے سے ڈرتے ہو۔ کتنے ڈرپوک ہو تم۔ تم ہر بات سے ڈرتے ہو۔ عورتوں سے، مردوں سے، بڈھے آدمیوں، بچوں سے، اپنے آپ سے! چلو میرے ساتھ۔ اُس نے ایک محلہ میں جگہ لے رکھی ہے۔ میں ہر روز وہاں جاتا ہوں۔ کوئی پوچھتا ہے تو کہتا ہوں میری رشتہ دار کا گھر ہے۔ میرے ماموں کی لڑکی رہتی ہے۔ میری سالی رہتی ہے۔ ہنس رہے ہو۔ کیا کہا۔ روپیہ نہیں۔ پاگل۔ چوری کرو، ڈاکہ ڈالو۔ ارے ارے... ہر آدمی سے ڈرتے ہو۔ تم تو خوف سے بھی خوف کھاتے ہو۔ کیا کہا۔ بیماری، بیماری سے ڈرتے ہو، ڈاکٹروں سے ڈرتے ہو۔ اٹھو، چلو بھی، کتنے عرصے سے تمہارے ہاں بیٹھا ہوا ہوں، کچھ تو خیال کرو۔ میاں دُنیا دیکھ لو۔ ارے ارے، یہ کیا، رو رہے ہو۔ بیماری۔ بیماری۔ اتنا بھی کیا ڈر ہے۔ میں یک قلم کی طرح دبلا پتلا ہوں۔ دیکھو سانس برابر آ جا رہا ہے۔ ہر روز روٹی کھاتا ہوں۔ اور تم کیا کرتے ہو۔ دن رات گھر پر پڑے رہتے ہو۔ مکھیاں مارتے ہو۔ ہوش کی دوا کرو، راجندر بھائی۔

گھر، گھر، میاؤں۔ میاؤں۔ کون بول رہا ہے۔ اختر بھائی۔ بلیاں بلیاں۔ ارے چوہے کہاں ہیں۔ ارے چوہے کہاں ہیں۔ اوہ تم یہ بھی نہیں دیکھ سکتے۔ تمہارے سامنے، تمہارے آگے، تمہارے دائیں بائیں، اوپر نیچے۔ ہر روز دیکھتے ہو۔ گلیوں میں، بازاروں میں۔ ارے ۳۵۰ لاکھ چوہے ہیں۔ آہا۔ آہاہا۔ ہی ہی ہی۔ ۳۵۰ لاکھ چوہے۔ ارے بلیاں کدھر گئیں۔ وہ دیکھو سامنے۔ میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ کہاں ہیں دکھائی نہیں دیتیں۔ ارے بلیاں کہاں ہیں، دکھائی نہیں دیتیں۔ کھا جائینگی۔ کھانے دو۔ میں آنکھیں بند کئے دیتا ہوں۔ مجھے کوئی نہیں کھا سکتا۔ ۳۵۰ لاکھ چوہے... آہا۔ آہا۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔

کیا کہا۔ کیا کہا۔ اختر بھائی۔ ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں ادیب ہوں۔ نہایت حسّاس واقع ہوا ہوں۔ لوگوں کو دیکھکر مجھے رونا آتا ہے۔ تمہاری صورت دیکھکر بھی۔ ارے تمہیں کیا ہو گیا۔ آج کچھ نہیں کھایا۔ کچھ تو کھا لو۔ پانی پی لو۔ اختر بھائی۔ ٹھنڈا پانی۔ ہندو پانی۔ مسلم پانی کونسا پانی پیو گے۔ پانی پی لو۔ سن سٹروک نہیں ہوگا۔ لو نہیں لگتی۔ ہاں، ہاں، میں ادیب ہوں۔ کہانیاں لکھتا ہوں، شعر کہتا ہوں

ارے دیکھتے نہیں، مزدوروں کی حالت، کتنے مضمحل اور افسردہ نظر آتے ہیں۔ چہرے پر رنگت نہیں، لب مسکراہٹ سے عاری۔ اور کیا کہا۔ زندگی بے کیف، بے مزا، ہر وقت کا رونا۔

کہانیاں لکھتا ہوں، ترقی پسند ادیب ہوں، مزدوروں پر شعر لکھتا ہوں۔ لوگ سنتے ہیں، سر دھنتے ہیں۔ واہ بھئی واہ۔ خوب لکھا، مزدور کا کلیجہ نکال دیا۔ اب جیجا باہر نکالو۔ کیا کہا۔ کیا ملتا ہے۔ ارے مزدوروں کو کیا ملتا ہے۔ کہ ان پر لکھنے والوں کو کچھ ملے۔ مزدور بھی فاقے کرتے ہیں۔ اور ہم لکھنے والے بھی۔ ترقی پسند۔ ارے نام ہوتا ہے۔ عوام میں مشہور ہو گیا ہوں۔ یہ کون جا رہا ہے؟ ترقی پسند ادیب۔ ارے اس کی حالت، چہرے کی رنگت زرد، گال اندر پچکے ہوئے۔ چال ڈھال میں، مردنی۔ آنکھوں میں وحشت، اندھا کیا جانے بسنت کی بہار۔ میں مزدور بننا چاہتا ہوں۔ میں ایک۔ نئے ادب کی تخلیق کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک میں مزدور نہ بن لوں۔ جب تک میں ان کی طرح زندگی نہ بسر کروں۔ اُن کے احساسات، اُن کی اُمنگوں، اُن کی زندگی کی ترجمانی کس طرح کر سکتا ہوں۔ میں مزدور بن رہا ہوں۔ ہر روز، دن بدن، کیا کہا۔ تپ دق ہو جائے گا۔ ہونے دو۔ مجھے پروا نہیں میرا نام روشن ہو جائیگا مزدوروں کا ترجمان، اُن کا واحد نمائندہ۔ آج مزدور اکٹھے ہونگے، کہاں؟ موچی دروازے کے باہر۔ دُنیا کے مزدور اکٹھے ہونگے دنیا کے مزدور اکٹھے ہو جاؤ۔ تمہارے لئے کچھ نہیں بنے گا۔ صرف زنجیریں بنیں گی۔ کیا کہا۔ دُنیا کے مزدور آج اکٹھے ہونگے موچی دروازے کے باہر!!

ارے کون بھونک رہا ہے۔ کتے ہیں۔ الو۔ ارے الو تو رات کو بولتے ہیں۔ یہ کلجگ ہے۔ آجکل دن کو الو بولتے ہیں۔

ہاں۔ ٹھیک کہا۔ کلجگ۔ مجھے اپنی بیوی پسند ہے۔ اور تمہیں اختر بھائی۔ اوہ، تم نے تو شادی ہی نہیں کی۔ کیا کہا۔ میری بیوی بدصورت ہے۔ تو کیا ہوا۔ مجھے اُس کی انگلیاں پسند ہیں۔ تم نے اُس کی انگلیاں نہیں دیکھیں۔ وہ ہر روز پالش کرتی ہے۔ بوٹ پالش نہیں۔ ناخنوں کی پالش، ارے ہر روز۔ حنائی انگلیاں، خوبصورت، دل کو لبھانے والی۔ اور پالش کے بعد ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے سونے کی قاشیں۔ ارے سونے کی قاشیں تو ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ ان میں خون کھولتا ہے۔ نرم اور گرم ہاتھ، مخروطی انگلیاں، چغتائی کا شاہکار۔ کیا کہا۔ کام کون کرتا ہے میری بیوی۔ توبہ۔ توبہ۔ میری بیوی کیوں کام کرے۔ ارے نوکر! اتنی ہمت ہی نہیں کہ نوکر رکھ سکوں۔ ٹھیک کہا۔ تم بہت سیانے ہو۔ کالے کوے کی طرح۔ میرے دل کی بات بوجھ جاتے ہو۔ اُس کی ایک ساس ہے۔ وہ کام کرتی ہے۔ دن اور رات۔ میاں تمہاری کون ہوئی؟ کیا کہا۔ میری کون ہوئی۔ میری بیوی کی ساس، میری کون ہوئی۔ ٹھہرو۔ سوچ کر بتاتا ہوں۔ ہاں یاد آیا۔ میری کچھ بھی نہیں۔ ارے میری بیوی کی ساس میری کون ہوئی؟...... وہ دن رات کام کرتی ہے۔ بہت اچھا کام کرتی ہے۔ دن رات برتن صاف کرتی ہے، فرش دھوتی ہے۔ جھاڑو دیتی ہے۔ روٹی پکاتی ہے۔ گھر کا سارا کام میری بیوی کی ساس کے سپرد ہے۔ ایک دن بڑھیا کہنے لگی: تمہاری بیوی کام نہیں کرتی۔ میں نے ہنس کر ٹال دیا۔ خوب کیا۔ ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ کہتی ہے: بیوی کام نہیں کرتی، برتن صاف نہیں کرتی: کھوسٹ بڑھیا نہیں جانتی کہ اگر حنائی انگلیاں برتن صاف کرنے میں خراب ہو جائیں تو بتاؤ۔ بتاؤ۔ میری بیوی کی انگلیاں بدنما ہو جائیں تو اُس کا کون ذمہ دار ہے۔ میں کس کے سہارے زندہ رہ سکتا ہوں۔ کیا کہا سارا کام بڑھیا سے لیتا ہوں۔ کیا وہ انسان نہیں۔ ارے انسان۔ وہ بڑھیا ساٹھ سال کی بڑھیا۔ چلنے پھرنے سے عاری، ہاتھ کانپتے ہوئے۔ کہتی ہے منہ سے پیپ آتی ہے۔ دانت ہلتے ہیں۔ مسوڑے خراب ہو چکے ہیں ڈاکٹر کو بلا لاؤ۔ دانت نکلوا دو۔ ارے میاں جہاں خون ہوتا ہے، وہاں پیپ بھی آ سکتی ہے۔ اور ساٹھ سال کی عمر میں پیپ نہ آئے تو اور کیا آئے۔ شہد نکلے گا کیا؟ کہتی ہے مرونگی نہیں۔ تمہارا کام کروں گی، برتن صاف کروں گی۔ سو سال تک زندہ رہونگی۔ مرنے میں نہیں آتی۔ اتنا کام دے رکھا ہے، پھر بھی مرنے میں نہیں آتی۔ کتنی سخت جان ہے۔ مجھے اپنی بیوی کی انگلیاں پسند ہیں۔ نہایت خوبصورت اور حسین۔ ریشم کے تاروں سے زیادہ ملائم۔ بھلا وہ کیوں برتن صاف کرے۔ اگر انگلیاں بدنما ہو جائیں تو میں کیا کروں گا۔ اختر بھائی۔ تم مجھے کوستے ہو۔ بتاؤ! میں کس کے سہارے جی سکتا ہوں۔ یہی تو میرا سرمایہ حیات ہے۔ اگر یہ لٹ جائے تو پھر.. .. پھر... میں ادیب ہوں۔ نہایت حساس دل واقع ہوا ہوں۔ بڑھیا کام کرے، اور خوب کرے.... اور وہ حنائی انگلیاں۔

کیا کہا۔ ارے بولو بھی۔ میرے کان تو بہرے نہیں۔ گو دماغ میں بھوسہ بھرا ہوا ہے لیکن کان تو بہرے نہیں۔ اختر میاں، تم کیا جانو۔ شادی کے مزے۔ میں اُن حنائی انگلیوں کو خراب نہیں ہونے دونگا۔

کہتی ہے۔ میرا خیال کرو۔ کیا کہا۔ کون؟ ارے وہی۔ میری بیوی کی ساس۔ کہتی ہے میں نے تمہیں جایا، پالا، پوسا، پڑھایا۔

مجھ پر احسان جتاتی ہے۔ شرم نہیں آتی۔ اختر میاں۔ تم ہی بتاؤ۔ میں نے کبھی احسان جتایا۔ میں جس پر احسان کرتا ہوں.... جو احسان کر کے جتانے لگے.... تمہیں دو سال سے پڑھا رہا ہوں۔ تم ہی بتاؤ۔ تمہیں کچھ

کہا۔ کہو۔ بولو۔ کہتے کیوں نہیں۔ چپ کیوں ہو گئے۔ زبان کیوں گنگ ہو گئی۔ بولتے کیوں نہیں۔

ارے کون بھونکتا ہے؟ یہ بازاری کتے گولی سے اڑا دو۔ یہ کتے آدمیوں کو کاٹتے ہیں، بھونکتے ہیں۔ ناکارے کتوں کو کسوں جیسے دو۔ لیکن بابا۔ اونچی آواز میں کہو میں ہوں اور تو کوئی نہیں ہے۔ بیکار، بے تعلق پوچھتے ہو۔ اسکی نظر کمزور ہو گئی ہے۔ وہ عینک مانگتا ہے۔ کتنی عمر ہو گی؟ ۶۰ سال۔ ہی ہی ہی۔ ۱۰۰ سال ہو۔ ۶۵ سال کا بوڑھا عینک مانگتا ہے۔ کایا پلٹ چاہتا ہے۔ بوڑھے نوجوانوں سے دو قدم آگے بڑھ گئے۔ پھر کہو۔ آواز نہیں آتی۔ بازکی آنکھیں لا دوں عقاب کی آنکھیں۔ خوب کہا۔ اختر میاں میری بیوی کو دیکھنا چاہتا ہے عقاب کی آنکھیں، عینک چاہتا ہے۔ بینائی چاہتا ہے۔ عینک پر پندرہ روپے لگتے ہیں۔ قبر میں پیر لٹکے ہیں، پھر بھی بینائی چاہتا ہے۔ کہاں سے لادوں۔ پنڈت۔ لو یہ۔ ہاں کایا پلٹ ... روپیہ کہاں ہے۔ پندرہ روپے نہیں ملتے۔ ہاں ٹھیک کہتے ہو۔ پندرہ روپوں سے پندرہ فلمیں دیکھ سکتا ہوں۔ پندرہ عورتیں، خوبصورت رسیلے ہونٹ، نشیلی آنکھیں، ابھرے ہوئے سینے۔ بوڑھا کھوسٹ عینک مانگتا ہے۔ ۶۵ سال کے بعد۔ آہا۔ ہی ہی۔ ٹی ٹی ٹی، سی۔

پھٹ۔ پھٹ پھٹ۔ دھم، دھم دھم۔ کون آیا۔ بم گرا کہاں؟ لندن میں۔ ماسکو میں۔ لیکن آواز تو یہاں آ رہی ہے۔ کانوں میں حنائی انگلیاں ڈال لو۔ سونے کی قاشیں۔

آزادی۔ مسٹر ایمری کا بیان۔ انڈیا فسٹ۔ کیا کہا۔ خوب کہا۔ کون تقریر کر رہا ہے چرچل: ہم آزادی کیلئے لڑ رہے ہیں۔ ہم غلامی کو اس دنیا سے مٹا دینا چاہتے ہیں، ہم فرانس کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم لڑینگے ہر جگہ۔ زمین پر، خشکی پر، سمندر پر، آسمان پر، اپنی زمین پر، کنیڈا میں، آسٹریلیا میں۔ ہم سب کو آزاد کرنا چاہتے ہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ میں بھول گیا۔ ہم یورپ کو ہٹلر کے پنجے سے چھڑانا چاہتے ہیں۔ کیا یورپ میں ہندوستان بھی شامل ہے۔ خوب زور سے ہنسو۔ اختر میاں۔ آزادی مانگتے ہو۔ آزادی مانگنے سے نہیں ملتی اور کچھ مانگو۔ کیا کہا! موت! ابھی لو۔ اسی وقت لو۔ چلاؤ۔ خوب زور سے چلاؤ۔ ہاں کہو۔ مسجد مندر بن گئی! مسجد مندر بن گئی!! وہ دیکھو سامنے، بازار بند ہونے لگے۔ بنئے گھروں میں گھس گئے۔ لاٹھیاں چلنے لگیں۔ پتھر برسنے لگے۔ ہائے میرا لال! کسی ہندو نے گولی سے اڑا دیا۔ ہائے میرا بچہ! کسی مسلمان نے چھرا گھونپ دیا۔ دیکھو۔ خون کی ندیاں۔ کہاں۔ وہ دیکھو۔ مندر مسجد بن گئی۔ انڈیا فسٹ، مت چلاؤ۔ آزادی! ہٹلر کے بعد اور موت ابھی لے لو۔ اسی وقت جب جی چاہے۔

مہندر ناتھ

یادِ سفر

خلعت سے بزم نوائے رنگیں
پھر مجھے موسمِ گل یاد آیا

کر گیا رنگِ گلستاں پرواز
دام میں طائرِ بے پر یاد آیا

چشمِ خوابیدہ نے کروٹ بدلی
پھر خیالِ ستم ایجاد آیا

یوں ہی بے شمع سحر ہو جاتی
کیوں مجھے رشکِ قمر یاد آیا

تھا مقدر میں تماشا بننا
ہوش اڑانے کو پریزاد آیا

کتنا نادیدۂ حیرت ہوں کہ دل
بن کے آئینۂ ایجاد آیا

پھر ہوا آہ تخیل مجروح
پھر تصور میں وہ جلاد آیا

دیکھنا قافلۂ لغزشِ پا
پھر سرِ منزلِ افتاد آیا

جانِ شیریں ترا اللہ حافظ
بار پر تیشۂ فرہاد آیا

ہچکیاں موت کی پھر آنے لگیں
یاد پھر حسنِ خداداد آیا

پھر ہم آغوش ہیں شوق و ارماں
پھر مچلنے دلِ ناشاد آیا

سازِ بے سوز وفا تھا کہ تپش
لب پہ یہ نغمۂ استاد آیا

"دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا"

دسہرا اشنان

اے شاد آج صبح زمانے کے واسطے
پُروا سنک رہی تھی سُلانے کے واسطے
یہ "نظم" آئی مجھکو جگانے کے واسطے

چادر نسیمِ منظرِ فطرت نے کھینچ لی
آنکھوں سے نیند سیر کی عادت نے کھینچ لی
بستر چُھٹا۔ سمٹکے، اُٹھانے کے واسطے

بے اختیار اُٹھ کے چلا میں کدھر۔ اُدھر
دیوانہ وار اُٹھ کے چلا میں کدھر۔ اُدھر
جاتی ہے وہ جدھر سے نہانے کے واسطے

اُس پل نے جس سے ملکے گزرتے ہیں راستے
دریا عبور کرکے بکھرتے ہیں راستے
روکا ہے "اسکی" راہ دکھانے کے واسطے

چلتا ہوا ہجوم ہے۔ سیلاب کم خردشں
آنکھوں میں کیفِ عزمِ پرستش زباں خموش
"جیون" "پوترتا" میں سجانے کے واسطے

"حسن نظر نواز" بھی "جنسِ فضول" بھی
"شمشاد نونہال" بھی "بوڑھے ببول" بھی
انجام کشتِ عمر بتانے کے واسطے

دس بیس۔ ان میں "آنکھ مچولی کے راتدن"
چھ سات۔ "چھپکے" ہاتھ نہ آنیکے سال وسن"
دو چار منتظر چھوٹے جانے کے واسطے

مندر کے روبرو۔ یہ پرستانِ خوشخرام
ہے جس میں بیش بیش مری "شوخیِ کلام"
کوشش میں، اپنی جان جتانے کے واسطے

اب پاس آچکی ہے یہ "تمثیلِ کہکشاں"
اب مجھکو بھانپتا ہے یہ انبوہِ مہوشاں"
میری نظر سے لطف اُٹھانے کے واسطے

سر ڈھک لئے گئے تو ہوئیں ساریاں درست
سینوں پہ سلوٹوں کو، پریشاں لباسِ چُست
ہر "کوندنی" یہ ہاتھ، گھمانے کے واسطے

گھٹنوں کو جھول دیکے چھپائی ہیں پنڈلیاں
پھر بھی نظر نوازیِ "ساقِ غزل فشاں"
مضمونِ بے پناہ۔ سجھانے کے واسطے

جس کے لبوں پہ شرحِ تبسم۔ وہ "مثنوی"
جس کی جبیں پہ قشقۂ ابہامِ بےرُخی
کہتی ہے مجھ سے گھاٹ پہ آنیکے واسطے

وہ گھاٹ۔ جس کا ریت ہمیں فرشِ انجمن
وہ پاٹ جس کے گیت، محبت پہ نغمہ زن
وہ "جھاؤ" "میل جول" چھپانے کے واسطے

وہ ناؤ۔ رہ گئی جو کنارے پہ ٹوٹ کے
ریتی میں دب چکی ہے جو پانی سے چھوٹ کے
کافی ہے ولولوں میں بہانے کے واسطے

جھ بیریوں کی آڑ میں میلے کی حد سے دُور
پہونچا ہوں اس اُمید میں "آئیگی وہ ضرور"
کھو جائیگی کہیں۔ مجھے پانے کے واسطے

پلٹے گی جب۔ کہیگی سبھوں سے کہ تھک گئی
میلے کی بھیر بھاڑ میں رستہ بہک گئی
"چہرہ اُداس" بات بنانے کے واسطے

وہ طرزِ گفتگو کہ بہانہ نہ کھُل سکے
مژگاں پہ وہ نمی کہ بناوٹ نہ ڈھل سکے
"شبھوں" کو نشوِ یقین دلانے کے واسطے

جالے لگے ہوئے ہیں ابھی آستین پر
رفتار سست سست، نگاہیں زمین پر
پہونچی وہ... یا نہیں۔ یہ بتانے کے واسطے

شاد عارفی

دکن کی برسات[۱]

ہوائیں گیت گاتی جا رہی ہیں گھٹائیں لڑکھڑاتی جا رہی ہیں
سہانی رُت یہ کیف آلود موسم فضائیں مسکراتی جا رہی ہیں
یہ عنوانِ ترادشش، نرم بوندیں پکھاوج سی بجاتی جا رہی ہیں
ہوائیں راستے میں لڑکیوں کے دوپٹوں کو اڑاتی جا رہی ہیں

دل بیدرد کی دیرینہ چوٹیں
اُبھر کر کام آتی جا رہی ہیں

چمن کا پتہ پتہ دُھل رہا ہے اندھیرے میں اُجالا گھل رہا ہے
کسی بدمست دوشیزہ گھٹا کا سرِ کہسار جوڑا کھل رہا ہے

خوشی ماحول پہ چھائی ہوئی ہے
کہ پھولوں میں زمانہ تُل رہا ہے

پپیہا اک قیامت ڈھا رہا ہے بڑے اونچے سروں میں گا رہا ہے
ارے! یہ گرمیِ کیف و مسرت گھٹاؤں کو پسینہ آ رہا ہے
مرے گھر کی منڈیروں پر بھی سبزہ عجب انداز سے لہرا رہا ہے
بڑی ہلکی پھواریں پڑ رہی ہیں کہ جیسے عطر چھڑکا جا رہا ہے
کہیں ساری کا پلو ہاتھ میں ہے کہیں بالوں کو جھٹکا جا رہا ہے

میں خود ہوں لیے تیرو کا نشانہ
کوئی میری غزل کو گا رہا ہے

غزل

جگر میں درد پایا جا رہا ہے مجھے شاید بلایا جا رہا ہے
نقابِ رخ اٹھایا جا رہا ہے وہ نکلی دھوپ سایا[۲] جا رہا ہے
مریضِ غم کو آ کر دیکھ جاؤ کہ تم پر حرف آیا جا رہا ہے

نگاہیں بھی ہیں کچھ بہکی ہوئی سی قدم بھی لڑکھڑایا جا رہا ہے
وہ خاکِ دل سے بچ کر چل رہے ہیں ابھی تک آزمایا جا رہا ہے
شبِ وعدہ نہ آنا تھا نہ آئے چراغوں کو بجھایا جا رہا ہے

سُناتے ہو کسے روداد ماہر
وہاں تو مسکرایا جا رہا ہے

گلی کے موڑ پر جھٹکے[۳] کھڑے ہیں سڑک پہ تیز موٹر چل رہے ہیں
وہ دیکھو سائیکل والوں کی دوڑ پر ٹپکتی جا رہی ہیں سر سے بوندیں
اُمنگوں پر امنگیں ہیں دلوں میں کہیں جھولوں کے جھرمٹ بک رہے ہیں
کہیں پر ڈھیریاں ہیں بے نشاں[۴] کی کہیں پر قفلیاں[۵] ہندوستاں کی
گراکوں[۶] سے بھرے ہیں چائے خانے بڑے دلچسپ ہیں فلمی ترانے
وہ آئی سامنے سے آم والی لبوں پر پان کے بیڑے کی لالی
بدن پر ہے بہت ہی تنگ چولی جلو میں اس کے ارمانوں کی ٹولی
جبیں پر سرخ بٹو[۷] کی ہے دھری بڑے انداز سے باندھی ہے ساری
بہت ہی چاق چوبند اور چنچل زباں اردو مگر لہجہ تلنگی
ہوس کے سینکڑوں طوفاں نظر میں بہت سے تجربے غلطاں نظر میں

پھلوں کا اس کے سر پر ٹوکرا ہے
گھٹا کا جس پہ سایہ پڑ رہا ہے۔

ہوا ٹھنڈی، فضا بدمست سی ہے شرابِ زندگانی ڈھل رہی ہے
عجب رُت ہے نہ سردی ہے نہ گرمی ہوائیں انتہا درجے کی نرمی
بڑی پُر کیف رم جھم ہو رہی ہے گھٹا جیسے فضا کو دھو رہی ہے

مسرت کا رواں در کارواں ہے
دکن، برسات میں جنت نشاں ہے

ماہر القادری؛

---

۱ صبحِ بنارس، شامِ اودھ، اور شبِ مالوہ مشہور ہیں۔ مگر برشگالِ دکن" بھی آپ ہی اپنی نظیر ہے۔ ۲ سایہ۔ ۳ جھٹکہ کو یکہ کا قائم مقام سمجھنا چاہیئے۔ ۴ آم کی ایک قسم۔ ۵ اہلِ دکن، یو۔پی اور پنجاب کو عام طور پر" ہندوستان" کہتے ہیں۔ یو۔پی کے بعض لوگ حیدرآباد میں برف کی قفلیاں بیچتے ہیں، جن کو "ہندوستانی قفلی" کہا جاتا ہے۔
۶ دکن کے ہوٹلوں میں گاہکوں کو "گراک" کہا جاتا ہے۔ ۷ سیندور کا سُرخ ٹیکا۔

ہندوستان کی تباہی کا اصلی راز

اور اس کا واحد علاج

(بزرگوں سے ہوتی چلی آئی ہے۔)

ہندوستان تباہ اور برباد ہے اور کیوں اس پستی کی حالت میں پڑا ہے؟ یہ ایک ایسا اہم سوال ہے جس پر ہر ہر پہلو سے انتہائی غور کیا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مگر از کم میرے خیال میں ابھی تک کوئی بھی اصلیت کی تہ کو نہیں پہونچا ہے۔

کوئی کہتا ہے ہندوستانی کاہل اور سست ہوتے ہیں۔ کسی کا خیال ہے ہندوستانیوں کی فطرت میں اولوالعزمی نہیں ہوتی۔ کوئی بتاتا ہے کہ آپس کی پھوٹ ان کو تباہ اور برباد کئے ہوئے ہے۔ اور عقلائے مغرب نے تو آخری فتویٰ دیدیا ہے کہ ہندوستان کی آب و ہوا ہی ہندوستان کے زوال کا باعث ہے۔

آب و ہوا کوئی ایسی چیز نہیں جو بوریوں میں بھر بھر کے افریقہ کے صحرا میں پھینکدی جائے۔ اور یورپ یا امریکہ کے سر بہ مہر کنستر لالا کے ہندوستان کی زرخیزی بلکہ زر دماغی کی جائے۔ اس لئے ہم پر لازم ہے کہ ہم کوئی ممکن علاج ہی ڈھونڈیں۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ ہم ہندوستانیوں کی خصلت ہی قدرتاً خرابیوں کا ایک مجموعہ ہوتی ہے۔ ہم میں ایثار کے بجائے خود غرضی، ہمت کے بجائے پست ہمتی، اولوالعزمی کے بجائے مردہ دلی کے بہت گہرے اثرات پائے جاتے ہیں۔ ہمارے ارادے غیر مستقل ہوتے ہیں۔ ہمارے ولولے ناپائیدار اور ہمارے منصوبے بے بنیاد ہوتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر کیوں؟ کس لئے؟ کیا بات ہے؟ کیا چیز ہے جو ہم کو ایسا بنادیتی ہے؟۔ ہر انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اس وقت وہ خدا کی طرف سے بے عیب بھیجا جاتا ہے اور بعد میں اس کے ماحول کے زیر اثر اس کی طبیعت کا ہیولا بنتا ہے۔ اس کے ماں باپ اس کی تربیت، اسکی تعلیم اور اس کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات اسکے دماغ پر اثر ڈال کر اس کی طبیعت کا ڈھانچہ بناتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آخر کونسی چیز ہے جو ہر ہندوستانی بچے کو گھٹی کے وقت سے لیکر جوانی بلکہ ادھیڑ نہیں بلکہ بڑھاپے، بلکہ مرتے دم، ارے نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی ایکساں اپنی پستی، بے بسی اور ذلت کا احساس پیدا کرتی رہتی ہے۔ ہم آپ کو بتائیں یہ کیا ہے؟ یہ ظالم شے مکھی ہے۔ پیدا ہوتے ہی یہ ہمارے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ بچپن، جوانی، بڑھاپا اور مرنے کے بعد تک حاضر کر کر کے ہم میں بے بسی کا احساس تازہ رکھتی ہے۔ یورپ، امریکہ اور اور ممالک میں جہاں مکھی کی بھنک تک نہیں ہے ہٹلر، مسولینی، اور روزولٹ پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں اس بھنکار میں گاندھی کے سوا اور کیا پیدا ہو سکتے ہیں۔

قوم کی امیدوں کا گہوارہ، آنے والی نسلوں کا علم بردار، باپ کا دلارا، ماں کا لاڈلا، منا بیٹا کھاتے کھاتے سو گیا ہے۔ ماں گھر کے کاموں میں لگی ہے۔ مکھیاں اس ہونے والے ہندوستانی ہٹلر کی تربیت میں مشغول ہیں۔ کانوں میں گھسی ہوئی ہیں۔ ہاتھوں میں چمٹی ہوئی ہیں۔ ناک کے نتھنوں میں دھکا پیل مچی ہوئی ہے۔ آخر کہاں تک۔ پسینہ اور بھنکار۔ بچہ کچی نیند سے منہ پھاڑ کے بیدار ہوتا ہے۔ ماں آٹا گوندھنے سے جھلاتی، کوستی لپکتی ہے "تجھکو سوا پہر کی موت بھی نہیں آتی۔ کھلا دیا پلا دیا پھر بھی مردہ روتا ہی ہوا اٹھا۔ لے لے لے" سنے ہوئے ہاتھوں سے دو ہتڑ لگا سنناتی ہوتی اماں جان پھر آٹا گوندھنے میں مشغول ہو گئیں۔ ہندوستانی ہٹلر نے اپنا لاؤڈ اسپیکر آنکھیں بند کر کے پورا کھول دیا۔ پورے کھلے منہ پر اور مکھیاں دوڑ پڑیں۔ اب آپ مکھیوں کا ڈنگرا اپنے براڈ کاسٹ کر رہے ہیں۔ کیا مسولینی کا بچپن بھی اسی طرح گذرا ہوگا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ خدا رحم کرے ہم پر اور ہمارے ملک پر۔

اصلیت تو یہ ہے کہ ساری تباہی اور بربادی مکھیوں ہی کی مچائی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گرم ملکوں میں بڑے بڑے دماغ اس لئے پیدا نہیں ہوتے کہ گرمی سے دماغ چکرا کے رہتے ہیں۔ نہیں یہ کچھ نہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اس ملک میں ان مکھیوں کی وجہ سے کوئی بھی دماغی کام کرنا ممکن نہیں۔ وہاں ادنیٰ اور غریب طبقے میں بڑے

بڑے فلاسفر و رمدبر اسی لئے پیدا ہوتے ہیں کہ اہم مسائل پر سوچنے اور غور کرنے کے وقت ان کے دماغوں کو یکسوئی حاصل ہوتی ہے۔ یہاں مکھیاں ایک ایک منٹ کی بھی مہلت نہیں دیتیں۔ کبھی کان میں کبھی ناک میں۔ نیا سامان کھسنے کی کوشش۔ دماغ کو پراگندہ کئے رہتی ہیں۔ ہندوستان کا ہر شخص اپنی عمر کے ہر دن میں کم از کم دس دفعہ ضرور ان مکھیوں سے عاجز ہو کر شکست مان لیتا ہے۔ اور پھر بھی پناہ نہیں ملتی۔ ایسی حالت میں یقینی بات ہے کہ جسارت، اولوالعزمی اور استقلال کا شائبہ تک ہم بدنصیبوں میں سے غائب ہو جانا چاہیئے۔

ہر کامیابی کے واسطے استقلال بہت ضروری چیز ہے۔ یہاں مکھی کا استقلال دن میں دس دفعہ ہمارے استقلال کی دھجیاں اڑا دیتا ہے۔ آپ کسی کام کے کرنے کو بیٹھے اور اس نے آپ کی ناک پر بیٹھنے کی ٹھان لی تو نچا مارا۔ ہنکاتے جاتے۔ ترائی کترائی اور پھر آن بیٹھی۔ عاجز ہو کر کام دام چھوڑ جی چاہتا ہے کہ ناک کاٹ کر پھینکدو۔ اب بھی دیکھئے کہ ان چار سطروں کا لکھنا ایک مہم ہو گیا۔ چاروں طرف کبڈی مچی ہوئی ہے کوئی منہ پر، کوئی ناک پر کوئی ہاتھ پر چلی آرہی ہے۔ ایک ہاتھ سے جھل رہا ہوں دوسرے سے لکھ رہا ہوں۔ آدھا دماغ مکھیوں سے جنگ کرنے میں لگا ہے آدھا اس مضمون میں۔ ایک مکھی کہنی کے ایسا پیچھے پڑی ہے کہ شاید ہڈی پر کا گوشت چاٹ کر ہی پیچھا چھوڑے گی۔ بیس دفعہ کہنی کو جھٹکا دے چکا ہوں۔ ایک دفعہ جھٹکے سے دیوار میں بھی لگ چکی ہے۔ مگر وہ ظالم پیچھا نہیں چھوڑتی۔ دادات کے منہ پر سیاہی چاٹنے کے واسطے جان دے دیتی ہے کم بلا۔ اس پر دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔ یقین ہے کہ کئی ایک اندر ڈوب کر جان دے چکی ہیں۔ کیونکہ ابھی ڈوبا لیکر قلم جو نکالا تو نب کی نوک میں ایک عدد کچولایا۔ اب ایسی حالت میں کیا خاک دماغ کام کرے۔ نہ دماغ رجوع نہ طبیعت موزوں، نہ کام میں دلچسپی۔ لکھنے کو بیٹھے تھے بڑے عزم کے ساتھ۔ مکھیوں نے اتنا ستایا کہ وبال جان ہو گیا۔ مجھی پر کیا موقوف ہے یہاں ہر انسان کی ہر کام میں یہی حالت ہوتی ہے۔ اور الزام یہ دیا جاتا ہے کہ ہندوستانی اپنے کاموں میں پوری دلچسپی نہیں لیتے۔ ہم بچارے کیا کریں۔ شروع تو ہم ہر کام بڑی دلچسپی سے کرتے ہیں لیکن تھوڑی ہی دیر میں مکھیوں کو کوسنے اور گالیاں دینے میں یہ دلچسپی تبدیل ہو جاتی ہے۔

یہی کیا ہماری جس اخلاقی کمزوری پر غور کیا جائے اس کی بنا مکھیاں ہی نظر آئیں گی۔ بدطینتی اور لالچ ہماری طبیعت میں مکھی ہی سے داخل ہوئی ہے۔ ادبار سے بے خبر، ذلت سے بے بہرہ ہم کو مکھیوں نے ہی کر دیا۔ غرض کہ ہر طرح کی اخلاقی گندگی اور آلودگی انہیں مکھیوں کی پھیلائی ہوئی ہے۔

اگر اس مسئلے کو مان بھی لیا جائے کہ ہر چیز کسی نہ کسی مصرف اور ضرورت کے واسطے پیدا کی گئی ہے، تو پھر مکھی کی پیدائش میں مصلحت اسی قسم کی ہے جو مصلحت شیطان کے وجود میں ہے۔ شیطان عذاب بعد الموت کا سامان کرتا ہے اور مکھیاں زندگی بھر کے عذاب دینے پر تلی رہتی ہیں۔

باوجود ان تمام باتوں کے ہم لوگوں کی اندھی کھوپڑیوں میں یہ کبھی نہیں آتا کہ مکھیاں ماری جائیں۔ اگر کوئی بگڑے دل جھنجلا کر اپنے کھے پر آپ طمانچہ لگا اتفاقاً مکھی مار لیتا ہے تو اس کے احباب بجائے شاباشی دینے کے۔ تھو تھو کرنے لگتے ہیں۔ بھائیو، اگر ہندوستان کی فلاح اور اپنی بہبودی چاہتے ہو تو مکھیاں مارو۔ ہندو تو خیر مذہباً مجبور ہیں، مگر مسلمانوں کو آخر کیا ہو گیا ہے جو مکھیاں نہیں مارتے۔ اور پھر جبکہ ان کا بہت بڑا حصہ بیکار ہی رہتا ہے۔ بیکار ہو تو مکھیاں ہی مارو۔ اپنے ملک کو فائدہ پہونچاؤ۔ یہ مانا کہ اس بیگار سے کہاں کام چلے گا۔ اس عالمگیر شیطانی فوج کو تباہ کرنے کے واسطے ہم کو نہایت تنظیم کے ساتھ ایک عرصے دراز تک جنگ کرنا ہوگی۔ جب جا کے منحوس مکھی کی نسل فنا ہوگی۔

بدقسمت ہندوستان میں کس قدر مکھیاں ہیں اس کا موٹا موٹا حساب اس طرح لگایا جا سکتا ہے:۔

ہمارے ملک کا رقبہ ۰۰۸۶۸۸۱ مربع میل ہے یعنی اس میں ۰۰۰۰۰۰۹۵۸۵ مربع گز ہیں۔ اور اگر ہر گز میں اوسطاً صرف تین ہی مکھیاں مان لی جائیں تو ۰۰۰۸۶۳۸۵۰۲۵۲۴۳ مکھیاں کل ملک میں ہونگی۔ یہ شمار لکھنے میں تو آگیا لیکن یہ مقدار شمار بہت ہی بڑی ہے۔ اس قدر زیادہ بڑی ہے کہ انسانی دماغ کی گرفت سے باہر لیکن پھر بھی ہمیں چاہیئے کہ اس کا کچھ اندازہ ضرور لگائیں۔ اس لئے اس طرح سمجھیئے کہ چار مکھیاں اگر آگے پیچھے ایک لائن میں کھڑی ہوں تو اس قطار کی لمبائی ایک انچ ہوتی ہے۔ اب اگر ہندوستان کی سب مکھیاں ایک قطار میں کھڑی ہوں تو تیرہ کروڑ میل لمبی سے زیادہ قطار ہوگی۔ مگر نا ظرین اب بھی کچھ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ کیونکہ تیرہ کروڑ کا عدد خود اس قدر بڑا ہے کہ اس کا اندازہ بھی نہیں لگ سکتا۔ پانچ مہینے دن رات اگر کوئی آدمی گنتی گنے تو تیرہ کروڑ کی گنتی ختم ہوگی۔ اعداد کا لکھ دینا سہل ہے ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ بہرحال ان باتوں سے کیا حاصل ہم آپ کو کام کی

باتوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ہم کو اپنے ملک میں سے ۳۴۴۲۵۲۰۵۸۳۶۸۰۰۰ مکھیوں کی آبادی تباہ کرنی ہے اور ہماری انسانی آبادی ۴۰۰۰۰۰۰۰۰ ہے۔ اسلئے ہر ہندوستانی کے حصے میں ۸۵۶۳۰ مکھیاں آتی ہیں۔

اب اگر ہندوستان کے بوڑھے، بچے، مرد، عورت، سارے انسان بیک وقت ہمت باندھ، کمر بہ کس، جھاڑو تیں ہاتھ میں لے، مکھیوں پر دھاوا بول دیں۔ اور یہ بلائیں آٹھ گھنٹے روزانہ ہر نفر کے ہاتھ سے فی منٹ ایک مکھی کے اوسط سے جہنم واصل ہونے لگیں تو گویا شمار ہے چھ مہینے میں ہندوستان دراصل ہندوستان جنت نشان ہو جائے۔

مندرجہ بالا اسکیم پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ اس چھ مہینے کی مکمل جہاد کی وجہ سے ملک کی اگر دو نہیں تو ایک فصل تو بالکل ہی ختم ہو جائے گی۔ غلے کا ایک دانہ پیدا نہ ہوگا۔ اس کا سیدھا حل یہ ہے کہ چھ مہینے غلہ نہ کھایا جائے۔ گوشت، میوے، پھل، بسکٹ وغیرہ پر گزر کی جائے۔ دراصل یہ اسکیم بذات خود تو بالکل پکی ہے۔ مگر قباحت اس میں وہی ہے کہ ہم سست، کاہل ہندوستانی لوگ اپنی خوشی سے آپ منہ پر کی مکھیاں تو اڑاتے نہیں آٹھ گھنٹے روزانہ جھاڑو کے ہاتھ چلائیں گے؟ ہرگز نہیں۔ مجبور ہو جائیں اور پھنس جائیں تو جا کر افریقہ کے صحرا فتح کرا آئیں۔ ویسے لٹا سہا کرے اور خود بڑے ٹک ٹک دوسرے کا آسرا دیکھا کریں۔ ہم کو مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ اس ملک میں کوئی اسکیم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ گورنمنٹ کے ڈنڈے کا زور شامل حال نہ ہو۔

اس لئے زیادہ مناسب ہوگا کہ قوم کے بھاری بھرکم افراد میں سے منتخب کردہ ایک وفد حکومت کے پاس جائے اور پورا زور دے کر گورنمنٹ کو آمادہ کرے کہ وہ اس جہاد کو اپنے ہاتھوں میں لے کر نہایت شد و مد سے جاری کردے۔ چونکہ جب بھی ہندوستان کی ساری آبادی کا بیک وقت میدان کارزار میں آنا ممکن نہ ہوگا اس لئے اس مہم کے واسطے ایک پورا نظام عمل تیار کرنا ہوگا۔ ذیل کی چند تجاویز جو میری نگاہ میں ہیں پیش کئے دیتا ہوں اور مضمون ختم کرتا ہوں:۔

اوّل۔ پورے زور سے مکھیاں مارنے کا پروپگنڈا فوراً شروع کر دینا چاہیئے۔ اس میں ریڈیو اسٹیشنوں اور اخباروں کو پورا حصہ لینا چاہیئے۔ شہروں میں بڑے بڑے پوسٹر جابجا چسپاں ہونا چاہئیں۔ ٹاؤن ہالوں میں جلسے اور تقریریں ہوں۔ غرض کہ ہر ممکن طریقے پر مکھیاں مارنے کی ترغیب دلائی جائے اور نیز شاطر مکھی ماروں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ ریڈیو پکارے مکھی مارو۔ ریل کے ڈبوں میں، شہر کی دیواروں پر لکھا ہو مکھی مارو۔ اخباروں میں بڑی بڑی سرخیاں ہوں مکھی مارو۔ نوٹوں کے حاشیوں پر، خطوں کی مہروں میں، سگریٹ کی کوپنوں پر لکھا ہو کہ مکھی مارو۔ مطلب یہ کہ جس جس طرح ہو سکے یہی پروپگنڈا کیا جائے۔

دوم۔ تمام اسکولوں اور کالجوں میں ایک گھنٹہ مکھیاں مارنے کے واسطے وقف کر دیا جائے۔ استاد خود بھی مکھیاں ماریں اور اپنے شاگردوں کو بھی اس ہنر کی تعلیم دیں۔

سوم۔ سرکاری دفاتر اور کچہریوں میں بھی ایک گھنٹہ یہی کام ہو۔ تمام عملہ۔ جج، پیشکار، وکیل، مختار، مدعی، مدعا علیہ مع گواہان ہر دو جانب مکھیاں ماریں۔

چہارم۔ ہر رجسٹرڈ خط پر اور ہر اسٹامپ کے ساتھ حسب مقدار مکھیاں بھی چسپاں۔ ایک آنے کے ساتھ ایک مکھی اور ایک روپے کے ساتھ سولہ مکھیاں۔

پنجم۔ راجاؤں، نوابوں اور بڑے بڑے حکام کو چاہیئے کہ بغیر مکھیوں کا نذرانہ لئے کسی سے نہ ملیں۔ حکام کا حسب مراتب نذرانہ ہو۔ کسی کا ایک طشتری بھر مکھیاں نذرانہ ہے تو کسی کا دو۔ اور کوئی بہت بڑا حاکم ہے تو سولہ طشتری مکھیاں قبول کرتا ہو۔

ششم۔ اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹروں کو بھی لازم ہے کہ کوئی مضمون نگار کتنا ہی کیوں نہ گڑگڑائے اس کا مضمون ہرگز ہرگز نہ چھاپیں جب تک کہ مضمون کے ساتھ مکھیاں بھی نہ بھیجی گئی ہوں۔

لہٰذا ایڈیٹر صاحب ساقی سے عرض ہے کہ ایک درجن مکھیاں خورد و کلاں ارسال خدمت ہیں آن کو قبول فرما کر مضمون ہذا کو شرف باریابی بخشیں۔

سید رفیق حسین

قطعات

یاد

شام سے کچھ دیر پہلے دامنِ کہسار میں
سن رہا تھا گوشِ دل سے نغمہائے آبشار
اس طرح آتی تھی تیری یاد رہ رہ کر مجھے
جس طرح سوتے میں کوئی گدگدائے بار بار

معراجِ حیات

مرے قریب نہ آ مجھکو پائمال نہ کر
میں تجھ سے چھوٹ گیا اس کا کچھ ملال نہ کر
مری حیات کی معراج جستجو تیری
جو ہو سکے تو نگاہوں کو حسبِ حال نہ کر

ماضی و حال

یک بیک اک نرم جھونکے سے ہوا کے اس طرح
ابر کے ٹکڑوں سے باہر آگیا ہے ماہتاب
میری کیفِ شوق میں ڈوبی نگاہوں سے کبھی
دفعتاً جیسے ہوا تھا تجھکو احساسِ شباب

تمنا

تری "نہیں" سے ہے وابستہ ذوقِ تشنہ لبی
خدا کے واسطے ہنس کر اسے تباہ نہ کر
تجھے حیات کا مقصد بنا دیا دل نے
گناہگار کی دنیا کو بے گناہ نہ کر!

ل، م، تے

گیت اپنے سنا رہا ہوں تجھے
مست و بے خود بنا رہا ہوں تجھے
حسن اور عشق کی حدود سے دور
اپنی منزل بنا رہا ہوں تجھے

انتظار

شرارتیں ہیں ہمہ انتظار ارے توبہ
نزاکتیں ہیں سراپا بہار کیا کہنا
مگر یقین نہیں ہے جو میرے آنے کا
نگاہیں وقفِ غمِ انتظار کیا کہنا

آرزو

رات کی خاموشیوں میں ڈالکر رخ پر نقاب
جب ستارے دیکھنے لگتے ہیں رقصِ ماہتاب
اس طرح انگڑائیاں لیتی ہے دل میں آرزو
جیسے آئینے کے آگے ایک سرشار شباب

کشاکش

فریبِ نظر سوز و سازِ محبت
انہیں چند لفظوں کو دہرا رہا ہوں
محبت پہ کچھ اوس سی پڑ گئی ہے
مزاجِ نظر پھر سے گرما رہا ہوں!

راحت سعید

زیروبم

"کیوں جی! میں نے کہا! یہ کیا بات ہے؟" نجمہ نے اپنے خاوند کو جھنجوڑتے ہوئے جگایا۔ "نو بجنے کو آئے ہیں اور آپ ہیں کہ جاگنے کا نام ہی نہیں لیتے۔"

"اوں!" فیروز نے کروٹ بدلتے ہوئے جواب دیا۔ اور اس "اوں" میں دل کی ہزاروں ٹیسیں پنہاں تھیں۔ اسے ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے اس کے مُنہ پر زور سے تھپڑ مارا ہے۔ وہ ایک حسین خواب دیکھ رہا تھا جو ادھورا رہ گیا۔ اسکی زندگی انہیں خوابوں پر منحصر تھی۔ ورنہ وہ ایک عرصے سے خودکشی کر چکا ہوتا۔

اس نے ابھی اپنی نیند بھی پوری نہ کی تھی کہ جگا دیا گیا۔ کچی نیند سے جاگنے کا اُسے اتنا دکھ نہ تھا جتنا اپنے خواب کے ادھورا رہ جانے کا۔ فیروز کو اپنے گھر میں نیند پوری کرنے کا بھی حق نہ تھا۔ بدقسمت خاوند۔

آغا فیروز بمبئی کی ایک مشہور فلم کمپنی میں میوزیکل ڈائرکٹر تھا۔ اس کی وجہ سے کمپنی نے بڑی ترقی کی۔ بات یہ تھی کہ فیروز نے مشرق و مغرب کے نغمے کے امتزاج سے ایک ایسی چیز پیدا کی تھی جو زمانے کی ترقی پسندانہ طبیعت کو راس آئی۔ پردۂ سیمیں پر جب حسین اداکار اس کے ایجاد کئے ہوئے سُروں میں گاتے تو سارا ہال وجد میں آجاتا۔ اداکاری، ڈرامے کی ٹکنیک، کہانی، عکاسی: یہ سب چیزیں جن پر فلم کا انحصار ہوتا پس منظر میں چلی جاتیں۔ اس نے فلمی دُنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا۔

آغا فیروز نے موسیقی میں کئی نئے تجربے کئے اور وہ کامیاب رہا۔ لیکن زندگی کے لئے رفیقۂ حیات کا انتخاب اس کے لئے وبالِ جان بن گیا وہ فن کار تھا۔ اس کی دُنیا تخیل کی دُنیا تھی، اُس کی رُوح موسیقی کے سازوں کے تاروں میں تھی۔ اُن کا ارتعاش اس کے اندر ایک ایسی کیفیت پیدا کر دیتا کہ گوشت پوست کا انسان اپنے آپ کو ایک ملکوتی تخلیق خیال کرنے لگتا۔

نغمہ اور حُسن اُس کی زندگی تھے ــــ تخیلی زندگی، مگر جب وہ مادی دُنیا سے دوچار ہوتا تو بیوی کی ڈانٹ ڈپٹ، بچوں کی چیں چیں، نوکروں کے جھگڑے، شکوے، گلے اور بے رُخی کے طعنے۔

اُس نے سمجھا کہ اگر اس کا انتخاب غلط تھا تو کیا؟ وہ دولت کے ڈھیر سے بیوی کا مُنہ بند کر دیگا۔ لیکن اُسے کیا معلوم کہ بیوی کے جذبات کیا تھے۔ وہ اُسے ایک فنکار ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مرد ہونے کی حیثیت سے دیکھتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ بھی اسکے ساتھ بچوں کی حفاظت، گھر کی دیکھ بھال نوکروں کے جھگڑوں میں برابر کا شریک ہو۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ آغا فیروز اس گھریلو زندگی سے کسقدر دُور تھا۔ وہ تو موسیقی کے آسمان پر نصف النہار کا آفتاب بن چکا تھا۔ مگر اُس کی بیوی کے لئے وہ ابھی تک ایک نکما خاوند اور وبالِ جان مرد جو نصف رات گذرنے تک بھی گھر نہ آتے اور پھر نو دس بجے تک سوتا رہے۔ روپے کما لانا تو بڑی بات نہ تھی۔

ہر روز اُسے جھنجوڑ کر ہی جگایا جاتا تھا اور اس کا وہ عادی بھی ہو گیا مگر آج اُسے بیوی کا اس طرح جگانا بہت زیادہ ناگوار گزرا۔ وہ ایک حسین خواب دیکھ رہا تھا۔ رات وار فنڈ کے سلسلہ میں ورائیٹی شو تھا۔ اس میں آغا فیروز اپنے فنکاروں کے ساتھ مدعو تھا۔ اس نے اپنے وہ کمالات دکھائے کہ حاضرین مبہوت بنے بیٹھے رہے۔ خود ہزایکسلنسی دی گورنر بھی موجود تھے۔ وہ ہندوستانی نہ ہونے کے باوجود آغا فیروز کی تانوں سے لُطف اندوز ہوتے رہے۔ انگریزی ( ) اور ہندی تانیں مل کر ایک نیا راگ بن گئے تھے۔

یہ شو بمبئی کارپوریشن کے میئر کے زیرِ اہتمام ہوا تھا، وہ اپنے شو کی کامیابی پر پھولا نہ سماتا تھا اور پھر اس ساری کامیابی کا باعث آغا فیروز اور اُس کے فنکار تھے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ آغا فیروز ایک مغنی تھا جس کے ساز انسان اور مشین دونوں تھے۔ شو کے بعد کاک ٹیل کی ایک محفل تھی جس میں میئر، گورنر اور اُن کے چند بے تکلف دوست تھے۔ آغا فیروز کو بھی شامل کر لیا گیا تھا۔

"فیروز!" ہزایکسلنسی نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے تو کمال کر دیا!"

گورنر اور یوں بے تکلفی، وہ کس قدر مسرور تھا۔ اُسے محنت کا ثمر مل گیا۔ اب تو وہ ہزایکسلنسی کا دوست تھا ــ دوست۔ پھر انہوں نے اُسے گورنر ہاؤس آنے کی دعوت بھی دی۔

فیروز بہت دیر گئے لوٹا اور بے حد خوش تھا۔ آج وہ اس قدر خوش تھا کہ اُسے موٹر کے پہیے بھی نغمہ الاپتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ بلند مکانوں کے نیچے اور تاریک سائے بھی جیسے آج ایک نیا نغمہ گا رہے تھے۔ اُس نے موٹر کی طرف جانے کی بجائے کوئین روڈ کا رخ کیا۔ سمندر کے کنارے اُس کا موٹر خرام ناز کر رہا تھا اور وہ خود زیر لب گنگنا رہا تھا۔ خوشی نغمہ بن کر اُس کے اندر سے پھوٹ رہی تھی۔

کامیابی کی خوشی، شمپین کا سرور، راجکماری کی بے تکلفی، اور سمندر کے کنارے کی ٹھنڈی ہوا۔ چاند کی روشنی میں سمندر کی لہریں آج بے حد اُسے خوش نظر آ رہی تھیں۔ خاموش فضا میں پانی جب کناروں سے ٹکرا کر پیچھے ہٹتا تو اس آواز میں بھی فیروز کے لئے کئی نغمے موجود تھے۔ وہ نشے میں بھی سوچنے کے قابل تھا۔ اس کی زندگی ہی مدوجزر تھی۔ اس وقت وہ کتنا خوش تھا۔ اقبال نے اس کے قدم چومے، شہرت، عزت اور ثروت سب کچھ اس کے لئے تھا۔ صبح تمام اخبارات میں اسکی تعریف ہوگی۔ تصاویر شائع ہونگی۔ سرکاوس جی میہ بمبئی کارپوریشن، گورنر بمبئی اور اُن کے ساتھ آغا فیروز فلم کمپنی کا مالک بھی اب اس سے تم کہا گیا لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود بیوی، بچے، نوکر اور صبح نو بجے جھنجوڑنا ——— اُف خدایا ——— وہ اس سے زیادہ اور سوچ نہ سکا۔ اس نے کار تیز کر لی —— خیالات کی تیزی کے ساتھ ساتھ کار بھی تیز ہوتی گئی۔

پھر اٹھی اور پھر ساحل سے ٹکرا کر واپس چلی گئی۔ وہ سیٹی بجاتا ہوا سونے کے کمرے میں داخل ہوا۔

"سنو جی!" اس نے پیار سے کہا "ہم آج گورنر سے ملے ہیں ——— اور ——"

"جی! ذرا وقت دیکھئے۔ کسی کمبخت کو سونے بھی دیں گے یا نہیں ——— ہم گورنر سے ملے ہیں ——— تبھی رات کے دو بجے آئے ——" اور پھر کروٹ بدل کر نجمہ سو گئی۔

خواب میں بھی یہی منظر حسین اشکال کا جامہ پہن کر فیروز کو خوش کرنے کے لئے موجود ہوئے ——— لیکن خواب میں بھی اُسے راحت لینے کا حق نہ تھا۔

حسب معمول اُسے بری طرح ہلایا گیا "جی! چائے تیار ہے ——— خادم سے منگوا لیجئے گا ——— میں بچے کو ڈاکٹر کے پاس لئے جا رہی ہوں، پھر کرافورڈ مارکیٹ جاؤنگی، وہاں سے ذرا ایک سہیلی کے ہاں جانا ہے ——— کار لئے جا رہی ہوں ——— کیوں جی؟"

وہ مسلسل احکامات سنتا رہا۔ اور جواب میں صرف "جی"

کہہ سکا۔ بنگلے سے جب کار باہر نکل گئی تو اُس نے خدا کا شکر کیا۔ ایک گرفتار پرندے کی طرح جو پنجرے میں پھڑپھڑا لینا ہی غنیمت سمجھتا ہے اب وہ دن بھر گھومنے کے لئے آزاد تھا۔

اُس نے سارے روزنامے منگوا بھیجے اور سب میں ویدیا میٹی شو کا مفصل ذکر تھا۔ اس کی تصویر چھپی تھی۔ اس کی وجہ سے رات ایک لاکھ سے زائد چندہ وار فنڈ کے لئے اکٹھا ہو گیا۔ اس نے سارے اخبار پڑھ ڈالے۔ وہ خوش تھا۔ لیکن صرف خوش۔ رات والا جوش و خروش نہ رہا تھا۔ وہ اپنی خوشی میں کسی اور کو بھی شریک کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ کسے شریک کرے ——— نجمہ کو؟ ——— نجمہ ——— نجمہ اسے سمجھ ہی نہ سکی تھی۔ نجمہ کی دنیا ہی اور تھی۔ لیکن وہ اور کسے اس خوشی میں شریک کرے۔

جب وہ اسٹوڈیو پہونچا تو مالک خود استقبال کے لئے موجود تھا۔ سرکاوس جی کا ایک خط اس کے پاس بھی آیا تھا جس میں آغا فیروز اور اس کے ساتھیوں کی تعریف اور شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو حسین چہروں میں گھرے ہوئے پایا۔ حسین چہرے، مجسم نغمے۔

ریہرسل شروع ہوئی "مس کملا کماری یوں نہیں ——— تان یہاں توڑیئے ——— ہاں ہاں یہاں ——— واہ بھئی واہ! کمال کر دیا تم نے ——— شاباش ——— رات بھی تم نے کمال کر دیا تھا ——— شو ——"

ساز رک گئے۔

"ہاں کماری! معاف کرنا ذرا بے تکلف ہو رہا ہوں ——— میں خود پیانو بجاؤں گا ——— ہاں وہی گانا ——— درست، تم نے خوش کر دیا ——— فلمی دنیا میں تہلکہ مچا دے گا تمہارا یہ گانا ——— آج شام کو چائے میرے ساتھ پینا۔ تاج محل یا گرین ہوٹل ——— تاج محل ——— شکریہ"

مس کملا کماری خوش تھی۔ آغا نے اس کے گانے کی اس قدر تعریف کی۔ "اس کو ہیروئن کا رول ملنا اب مشکل نہ رہیگا" "آغا صاحب! کتنے بھلے آدمی ہیں" وہ سوچ رہی تھی۔

"حضور راجکماری چکرورتی اسٹیٹ ملنے آئی ہیں" خادم نے آکر اطلاع دی۔

"اوہ! راجکماری صاحبہ" آغا فیروز خود خیرمقدم کیلئے بڑھا، "آپ! ——— مجھے بلا لیا ہوتا"

"آغا صاحب میں مبارکباد عرض کرنے آئی ہوں۔ رات آپ تک نہ پہونچ سکی۔ پتا جی کی طبیعت خراب تھی۔ انہیں ساتھ لیکر شو سے فوراً

واپس آنا تھا!

"شکریہ! شکریہ!!"

"رات والا گانا ایک بار پھر سننے آئی ہوں!"

"ضرور ضرور!!" آغا فیروز تو یہی چاہتا تھا۔ وہ اپنی خوشی کو تقسیم کر رہا تھا۔ "لیکن ایک شرط پر۔ گائیے آپ اور پیانو میں بجاتا ہوں!!"

"جی! جیہ!! شاد۔ شیو۔ کی بات رد کون کرے۔"

"واہ بھئی واہ! واللہ کمال کر دیا راجکماری آپ نے! راجہ صاحب موجود ہوتے تو لطف آجاتا لطف! واہ! واہ! رات آپ بھی اگر شامل ہوتیں تو کامیابی زیادہ ہوتی۔ ۔ ۔ افسوس راجہ صاحب کی طبیعت خراب تھی ــــ خیر!!"

"راجہ صاحب نے آپ کو یاد فرمایا ہے کب تشریف لائیں گے آپ ــــ؟"

"میں ضرور حاضر ہوں گا۔ ضرور ضرور ــــ ہاں آج آپ "تاج محل" میں شام کو میرے ساتھ چائے نوش کیجئے۔ پانچ بجے۔ آپ، مس کملا ــــ اور کوئی ہو جائے گا ــــ پانچ بجے بھولئے گا نہیں ــــ شکریہ، شکریہ!!"

سٹوڈیو میں آغا فیروز دن بھر ایسی دولت تقسیم کرتا رہا جو ساری دنیا دیکر بھی نہیں مل سکتی۔ سازندے، خادم، اداکار، سب کے سب مالا مال کر دئے گئے۔ نو آموز تک تان سین کے ثانی بن گئے۔ معمولی معمولی ایکٹرسیں اپنے آپ کو "ہیروئن" سمجھنے لگیں۔ آغا فیروز نے کئی اداکاروں کو دعوت دیدی۔

وہ خوش تھا اور اس خوشی میں کئی اور بھی شریک تھے۔ "تاج محل" سے اپالو بندر۔ پھر سمندر کی موجیں، آغا فیروز اور اس کی پارٹی سمندر کے کنارے شام تک گھومتی رہی۔ جہاں یہ حسن اور نغمہ جاتا ساری فضا معطر ہو کر نغمات سے معمور ہو جاتی۔ سمندر کے کنارے جب کوئی گستاخ لہر ان طلعتوں پر پانی پھینکتی تو فضا قہقہوں سے گونج اٹھتی۔ ایسا معلوم ہوتا گویا چاندی کے سکوں کی تھیلیوں کے منہ کھول دئے گئے ہیں اور ان کی جھنکار میں ایک تسلسل پیدا ہو گیا ہے۔

چاند کے طلوع ہونے کے ساتھ ساتھ سمندر کی لہروں کا تموج بڑھ رہا تھا۔ سمندر کے کنارے بجلی کے قمقموں کی مسلسل قطار ایک سفید دھاری دکھائی دیتی تھی۔ بلند و بالا محلات اور ان کے مہیب سائے میں بجلی کے چراغ، بمبئی کی زندگی میں دوسرا دور شروع ہو رہا تھا۔ سڑکوں پر موٹروں کی آمد و رفت بڑھ رہی تھی۔ چوراہوں میں سرخ اور سبز بتی جلد جلد اپنا کام کرنے لگی تھی۔ کاروبار میں مصروف دنیا جن کے نزدیک شاید روپیہ پیسہ ہی زندگی ہے، غروب آفتاب کے ساتھ نئی چولی بدل لیتی ہے۔ سمندر کے کنارے آباد ہو جاتے ہیں۔ بمبئی کا سارا حسن اور دولت یہیں کھنچ آتا ہے۔

حسن کو نمائش کا شوق ہے۔ دولت اور حسن مل کر اس نمائش کے لئے اور بھی مواقع پیدا کر دیتے ہیں۔ اس تماشہ گاہ میں ایسے بھی بہت لوگ ہوتے ہیں جن کے لئے حسن کی اس دنیا میں پہونچنا ہی زندگی ہے۔ انہیں یہاں تسکین ملتی ہے۔ ان کی خشک اور ناکام زندگی کسی کی مسکراہٹ یا غلط نگاہ سے بدل جاتی ہے۔ ان ہواؤں میں جو شام کے دھندلکے میں سمندر کے کنارے چلتی ہیں۔ کتنے رومان پیدا ہوتے ہیں اور پھر ان دل کے تاریک گوشوں میں پرورش پاتے ہیں اور ان کی زندگی کا مدار بن جاتے ہیں، جو کبھی بامراد نہیں ہوتے۔ تخیل کی جولانگاہ یہی کنارے ہیں۔ سمندر کی لہریں اٹھتی ہیں اور اپنے ساتھ ہزاروں ارمانوں اور تمناؤں کو بہا کر لے جاتی ہیں۔

یہ چہل پہل نصف شب تک رہتی ہے اور اس کے بعد ساری دنیا پر موت کی سی تاریکی چھا جاتی ہے اور چند لمحوں کے لئے جن زندگیوں میں ایک نئی لہر دوڑی تھی وہ ختم ہو جاتی ہے۔ رات کی تاریکی کے ساتھ ساتھ فیروز کی خوشی کم ہو رہی تھی۔ دن بھر اس نے اپنا خوشی کا سارا اندوختہ لٹا دیا اور اب ــــ وہ برباد انسان کی طرح گھر جانے سے ڈر رہا تھا۔ اس کی روح دن بھر نغمات اور حسن میں کھیلتی رہی۔ اور یہ کھیلنا ہی اس کی زندگی تھا مگر جب وہ گھر میں داخل ہوتا تو ــــ ایک کرخت آواز ــــ جیسے یکایک ساز کے تار ٹوٹ جائیں ــــ ایک کروٹ ــــ بدنما کروٹ اور صبح پھر اسے جھنجوڑا جائیگا!!

شیر محمد اختر

نوکری پر جاتے ہوئے

اندھیری راہوں پہ بھاری چھکڑے کے پہیے یوں چرچرا رہے ہیں
کہ جیسے مل جل کے چند حبشی غلام کچھ گا تے جا رہے ہیں
اداس تارے خموش جوہڑ میں ڈوب کر غوطے کھا رہے ہیں
شریر ٹھنڈے طویل جھونکے میں کے تیز نشتر چلا رہے ہیں

میرا وہ ننھا سا پیارا گاؤں نگاہ سے چھپتا جا رہا ہے
مرے گھروندے میں دور اب تمٹماتا دیا سا اک ٹمٹما رہا ہے
منڈیر کی آڑ لے کے شاید ضعیف ماں میری روتی ہوگی
مرے تصور میں آنسوؤں کی حسین لڑیاں پروتی ہوگی
پچھاڑیں کھا کھا کے میری آپا غریب بے ہوش ہوتی ہوگی
مری اصبوحی مرے ست چھپر کے نیچے بلک کے سوتی ہوگی

مرے گھروندے کا ذرہ ذرہ مجھے نہ پا کر اداس ہوگا
مگر سنا ہے کہ اب کے لاہور کا سفر مجھکو راس ہوگا
تلاش ہے نوکری کی لیکن دماغ میں آگ جل رہی ہے
جگر میں دوزخ بھڑک رہا ہے۔ رگوں میں بجلی چمک رہی ہے
کلیجہ غیرت کا کٹ رہا ہے۔ خودی کی تلوار گل رہی ہے
ندیم کی آہنی جوانی نرالے سانچے میں ڈھل رہی ہے

کبڈی کے دلفریب میلوں میں جس نے بانکے جواں گرائے
وہ ایک چھکڑے میں رینگتا جا رہا ہے بے چارہ سر جھکائے
میں جانتا ہوں کہ روندی جائے گی نوکری میں مری جوانی
فسانہ گوئی نہ ہو سکے گی۔ پنپ سکے گی نہ شعر خوانی
تباہ کر دے گی میری صبحیں اداس شاموں کی خوں چکانی
رہیں گے دو چار شعر میری حیات بے مایہ کی نشانی

میں جانتا ہوں کہ نوکری میں خود اپنا سر کاٹنا پڑے گا
خود اپنا دل چیرنا پڑے گا۔ خود اپنا خوں چاٹنا پڑے گا
میں جانتا ہوں ملازمت نے شباب کا سر دبا کے چھوڑا
گہر کو کنکر کا رنگ بخشا تو زر کو مٹی بنا کے چھوڑا
مسل مسل کر شگفتہ گل کو غبار راہ میں ملا کے چھوڑا
ہنسی ہنسی میں وہ پھونک ماری، چراغ غیرت بجھا کے چھوڑا

مگر مجھے بھی کبھی کبھی بھوک تنگ کرتی ہے کیوں نہ جانے
یہ طائر سدرہ بھی چگنے گا زمیں کی وسعتوں میں دانے
مجھے نہ بھولیں گی اپنے گاؤں کی تنگ و تاریک ترچھی گلیاں
وہ شام ہوتے ہی تنگ گلیوں میں نوجوانوں کی رنگ رلیاں
وہ آنکھوں میں بولتے ستارے۔ وہ گالوں میں کھلکھلاتی کلیاں
وہ پاؤں میں جھنجھناتے گھنگرو۔ گلے میں وہ ٹنٹناتی ٹلیاں[1]

وہ ناچ اور ناچ کے بہانے سے اپنے محبوب کو اشارے
دبی دبی مسکراہٹوں میں وہ لوٹ جانا خوشی کے مارے
مجھے نہ بھولے گا وہ کبڈی کے کھیل میں تن کے باہر آنا
وہ اپنے ہمراز دوستوں کو نئی نئی کسرتیں دکھانا
وہ ایک انداز سے مقابل کے نوجوانوں پہ مسکرانا
وہ برق بن کر تڑپتے جانا۔ بگولا بن کر لپکتے جانا

وہ شانوں کے گول گول پٹھے۔ وہ ابھرے اور لال لال سینے
نہ روح میلی۔ نہ کھوٹ من میں۔ نہ بات بے رس۔ نہ دل میں کینے
مجھے نہ بھولے گی پیاری امی۔ مجھے نہ بھولے گی بھولی آپا
مجھے نہ بھولے گا وہ گھروندا جہاں کا میں حکمراں رہا تھا
وہ کچی دیواریں، بوڑھی بیری، وہ آنگن اور وہ کبک کا پنجرا
وہ میرے ہنستے ہوئے پڑوسی وہ ایک شرمیلا دوست میرا

وہ میری معصوم سی صبوحی جو میری الفت سے بے خبر ہے
وہ کیفیت جس کے حسن میں ہے کہ ہر نظر اسکی کارگر ہے
میں جب کبھی اپنا کام کر کے سکون کی ایک آہ لوں گا
تو اپنی تخئیل کے خزانے سے تیز سی اک نگاہ لوں گا
پلک جھپکنے میں اڑ کے میں اس غریب گھر میں پناہ لوں گا
اگرچہ یہ راہ پر خطر ہے۔ یقین ہے۔ میں نباہ لوں گا

اٹھوں گا دفتر سے جس گھڑی بھاری میز پر فائلیں جما کر
تو اپنے گاؤں پہ آ کے منڈلاؤں گا تصور کے پر لگا کر
دیا بجھا دے۔ دیا بجھا دے۔ نہ رو۔ نہ رو۔ میری پیاری امی
ستارے اشکوں کے اتنی افراط سے نہ کھو میری پیاری امی
میں لوٹ آؤں گا کچھ کما کر۔ حزیں نہ ہو میری پیاری امی
بس اب تو وہ سیڑھیاں اتر اور جا کے سو میری پیاری امی
تیرا ندیم ایک روز لوٹے گا نوکری کا خزینہ لے کر
خزینہ لیکن یہ پائے گا اپنی شاعری کا دفینہ دے کر

احمد ندیم قاسمی

[1] ٹلیاں پنجابی میں گھنٹیوں کو کہتے ہیں۔

اِیراوتی

شام کی سُرخی آسمان پر اور دھرتی پر خاموش ایراوتی۔ یہ نظارہ مجھے مگن رکھتا ہے۔ چت لیٹی ہوئی ریت پر میں بھی لیٹ جاتا ہوں۔ سونظاروں کلسے ایک نظارہ۔ ایراوتی کا کنارہ۔

صدیوں سے ندی یوں ہی بہہ رہی ہے۔ وہ اس دیس کی ماں ہے۔ لوگوں کے قہقہوں کی امانت دار ہے۔ ان کی تاریخ اُسے یاد ہوگی۔ جیسے کہہ رہی ہو میں نے ہی انہیں ہنسنا سکھایا ہے۔ یاد نہیں آرہا کہاں پڑھا تھا کہ خوشی اور غم کے جذبے ہم میں ایک ساتھ رہتے ہیں۔ کوئی انہیں الگ الگ نہیں کرسکتا۔ کب اور کیسے وہ ایک دوسرے کی جگہ لیتے ہیں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ سوچتا ہوں کہ ان لوگوں نے ان جذبوں کو الگ الگ کرنا سیکھ لیا ہے۔ جدھر نگاہ اُٹھاؤ، ہنستے ہوئے چہرے۔ لوگ تو میں نے بہت دیکھے بھالے ہیں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ اتنے خوش لوگ پہلے دیکھے بھی ہوں تو یاد نہیں آرہے۔ اتنی بھی کیا خوشی ہے؟۔

بادبان کی طرح بازو پھیلا کر میں ناچنے لگتا ہوں۔ پھر ریت پر خود ہی گر پڑتا ہوں۔ صدیوں سے ریت یہاں موجود رہی ہے۔ صدیوں سے ایراوتی آدمی کو شانتی دیتی آئی ہے۔ یہ فضا مجھے پسند ہے۔ زندگی ہونی چاہیئے ندی کی طرح، کھلی اور آزاد ایراوتی کی طرح۔

اچھا ہوتا کہ رنگون سے مانڈلے تک ایراوتی کے پانیوں پر سفر کیا ہوتا۔ اس میں پورے سات دن لگ جاتے ہیں۔ مگر میں ریل کے راستے یہاں پہونچا۔ اور ایراوتی کو پہلے پہل میں نے یہیں دیکھا۔

کاکا کالیلکر کے الفاظ میرے ذہن میں گونج اُٹھتے ہیں: "اِراوتی کہیں یا اَیراوتی؟ میری سمجھ میں اس ندی کا نام 'اِرا' نام کی گھاس پر سے ایراوتی پڑ گیا ہے۔ اس کے کناروں کی قوت بخش گھاس چرنے والے ہاتھی کو ہی ایراوت کہتے ہونگے۔ یا پھر اندر کے ایراوت کی طرح بڑے ڈیل ڈول والی اور مست ہاتھی کی چال سے چلنے والی اس ندی کو دیکھکر کسی بودھ بھکشو کو یہ بات سوجھی ہوگی — بس اس کو ہم اَیراوتی کہینگے... ...ایراوتی کہیں ہندوستان میں ہوتی تو سنسکرت کے شاعروں نے اسکے بیان میں ایراوتی جتنی ہی لمبی چوڑی ندی بہادی ہوتی[1]..."

سبھی ندیاں پہاڑوں سے نکلتی ہیں اور وادیوں اور میدانوں کو پار کرتی ہوئی سمندر کی طرف بھاگی چلی جاتی ہیں۔ ایراوتی بھی دُور پہاڑوں سے آتی ہے۔

ایراوتی کا نکاس یہاں سے کتنی دُور ہے؟۔

سات سو میل۔

تو گویا یہ تیرہ سو میل لمبی ندی ہے؟۔

جی ہاں۔

پہلے پہل ایراوتی پہاڑوں کی گود سے نکل پڑی تھی تو کیا جانتی تھی کہ آگے چل کر "مائی کا" اور "مالکر" اُسے اپنا پانی دیکر دُور دراز سفر پر دھکیل دیں گی — تیرہ سو میل دُور۔ شروع میں کوئی دریا بھی یہ جاننے کی پروا نہیں کرتا کہ اُسے کتنی دُور جانا ہے۔ وہ بہنے لگتا ہے۔ یہی زندگی ہے۔

دُور سے کسی کے گیت کی آواز مجھ تک پہونچتی ہے۔ جیسے ایراوتی کہہ رہی ہو۔ یہ گیت اور کہاں ملیں گے؟ سچ کہتی ہے۔ ابھی کیا جلدی ہے؟ پھر بیٹھ جاتا ہوں۔

خدا حافظ ایراوتی! کل پھر سہی۔

میں ایراوتی سے اتنا متاثر ہوتا ہوں، پر کیا خود بھی ایراوتی کو متاثر کرسکا ہوں؟ پاؤں تیزی سے نہیں اُٹھتے۔ جانا تو ہوگا۔ قیامگاہ پر میزبان انتظار میں ہوگا۔ ایراوتی کچھ نہیں بولتی۔ بولے بھی کیا؟۔

۲

اُشا کا نظارہ بھی مجھے مگن رکھتا ہے۔ اب سدآنند بھی میرے ساتھ ایراوتی کے کنارے چلا آتا ہے۔ وہ بھی میری طرح ایک آزاد پرندہ ہے۔

ایراوتی گنگنا رہی ہے۔

جو کہنا ہے سب کچھ کہہ لے، ایراوتی!

سدآنند کہتا ہے: "آراکان" اور "پیگو یوما" کے پہاڑ ایراوتی کے پُرانے سنتری ہیں۔

میں کہتا ہوں: "سب پہاڑ دھرتی کی خودداری کے ترجمان ہیں، 'آراکان' اور 'پیگو یوما' بھی.... ٹیگور نے کہیں لکھا ہے 'گیت الاپتا ہوا دریا تیز دوڑتا ہے، سب رکاوٹوں کو پھاندتا ہوا۔ پر پہاڑ دریا کی یاد میں کھویا کھویا سا کھڑا رہتا ہے'.... اور میں تو سمجھتا ہوں کہ آراکان

---

[1] لوک ماتا (گجراتی)

اور پیگو ہما، دونوں ہمیشہ ایراوتی کے پیار میں اسی طرح کھوئے کھوئے سے کھڑے رہیں گے۔"

رنگون کی طرف جانے پر پہلے کونسا مقام آتا ہے؟

امراپور۔

امراپور کے بعد؟

آبھا۔

امراپور اور آبھا تاریخی شہر ہیں۔ ان کے بعد "من جی آن" بندرگاہ آتی ہے۔ یہ وادی کسی زمانے میں میدانِ جنگ رہ چکی ہے۔ "پوکوچو" شہر سے چند میل پرے چھندون ندی ایراوتی میں ملتی ہے۔ شان لوگوں کے علاقے سے آنے والی چھندون ایک غریب عورت کی طرح اپنا آپ لٹا دیتی ہے اور ایراوتی ٹھہری پکی سرمایہ دار! پھر "پیگان" آتا ہے۔ یہ شہر ہے۔ ہزاروں پیگوڈوں[1] کے کھنڈرات اس کی تاریخی حیثیت کے امانتدار ہیں۔ اس کے بعد اسٹیمر "ناؤ لا" کے مقام پر رکتا ہے۔ قریب ہی مٹی کے تیل کے کنویں ہیں۔ انگریز اور امریکن سرمایہ داروں نے اس سے بہت روپیہ پیدا کیا ہے۔ پھر سٹیمر بڑے پُرسکون علاقے سے گزرتا ہے۔ اونچے اونچے پہاڑ خاموش اور سنجیدہ بزرگوں کی طرح کھڑے ہیں۔ ساری فضا کسی گہرے خیال میں کھوئی کھوئی سی نظر آتی ہے۔ اس کے بعد سٹیمر بالترتیب "من جو"، "جائے تامیو" اور "پروم" پہونچتا ہے۔ پروم کے بعد ایراوتی نئی شاخوں میں بنٹ کر سمندر سے جا ملتی ہے۔

سدانند سے کئی بار جھگڑ چکا ہوں۔ اسی کی وجہ سے میں ریل کے راستے یہاں پہونچا۔ آگے کا سفر ریل میں طے کرنے سے باز آیا۔ یوں ہمارا سفر بدمزہ نہیں رہا۔ ہر چھوٹے بڑے اسٹیشن پر ہم دو دو تین تین دن ٹھہرتے ہوئے یہاں پہونچے تھے۔ تعارفی چٹھیوں کا سلسلہ برابر قائم رہا۔ رنگون سے تو اگلے اسٹیشن کے لئے ہی ایک چٹھی مل گئی تھی۔ جب ہمارے میزبان نے مہمان نوازی کا جوہر دکھایا تو میں سمجھ گیا کہ چٹھی میں ہماری سچی جھوٹی تعریف کے پل باندھے گئے تھے۔ اور یہ مہمان نوازی ہر مقام پر نصیب ہوئی۔

سدانند سنیاسی ہے۔ اس کا ادب مجھے ملحوظ ہے۔ سوچتا ہوں کہ وہ سنیاسی کیسے بن گیا۔ وہ مشرقی بنگال میں ایک دریا کے کنارے پیدا ہوا تھا۔ وہ بتاتا ہے کہ اس دریا سے اس کا بچپن اسی طرح وابستہ تھا، جیسے اب میں ایراوتی سے۔ اور پھر ایک طرح کی آوارگی کے خیال نے اسے گھر چھوڑنے کے لئے ابھارا تو وہ چل نکلا۔ مگر وہ سنیاسی کیسے بن گیا؟ تلاشِ حق کیلئے؟ نہیں تو۔

کسی ندی کے نکاس تک ہو آنا تلاشِ حق سے کم وقعت نہیں رکھتا۔

ٹھیک کہتے ہو۔

یہاں سے بھاموتک کتنے دن کا راستہ ہے؟

تین دن کا۔

ایراوتی کا پاٹ تنگ ہونے لگتا ہے۔ کناروں پر ساگوان ہی ساگوان نظر آتے ہیں۔ گھنے جنگل ہیں۔ پرے پہاڑ سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ ٹیگور نے کہیں لکھا ہے: "درخت، جو دھرتی کی بے قرار تمنائیں ہیں، پنجوں پر کھڑے آسمان کو جھانک رہے ہیں!" کیا اس دیس کے ساگوانوں پر بھی یہ بات لاگو ہوتی ہے؟ یہ درخت تو کاٹ ڈالے جاتے ہیں۔ کوئی پیٹے کوئی پیچھے! کوئی ان کا غمگسار نہیں، ہمدم نہیں۔ مانڈلے کے بعد "سن گن" اور "تھابی تاکن" شہر آتے ہیں، پھر "موپک" جہاں لعلوں کی کانیں ہیں۔ آگے بھامو ہے۔ اس سے آگے سٹیمر صرف برسات میں جاتا ہے اور وہ بھی "مٹ کنا" تک۔ بھامو سے مٹ کنا تک سمپان[2] بھی ملتی ہے۔ مگر پانی تیز ہے اور بہاؤ کے الٹ جانا آسان نہیں۔ مٹ کنا سے موٹر ملتی ہے۔ یہاں سے آٹھ میل پرے "مائی کا" اور "مالکر" ندیاں ایراوتی میں گرتی ہیں۔ اور ایراوتی کا نکاس بھی قریب ہی رہ جاتا ہے۔

سٹیمر کے پانی کاٹنے کی سرسراہٹ سنائی دے رہی ہے۔ جی چاہتا ہے آج ہی ایراوتی کے نکاس کی طرف چل دوں۔

سدانند مانتا نہیں۔

سٹیمر سیٹی دے رہا ہے۔

چلو ٹکٹ لے لیں، سوامی جی!

آج نہیں۔

مجھے غصہ آ رہا ہے۔ ہر روز "آج نہیں" کی رٹ! اس کے پاس کرایہ نہیں۔ پیسے میرے پاس بھی مشکل سے ایک ٹکٹ کے ہونگے۔ مگر کہیں درمیانی مقام کے دو ٹکٹ لئے جا سکتے ہیں۔ چلیں تو سہی۔ آگے دیکھا جائیگا۔ سٹیمر کی سیٹی سنتا ہوں تو بےچین ہو جاتا ہوں۔ سدانند کی صلاح بغیر میں قدم نہیں اٹھا سکتا، یہ وہ جانتا ہے۔

سنیاسی تو ٹکٹ کے بغیر بھی سٹیمر میں سفر کر سکتا ہے!

میں ایسا سنیاسی نہیں۔

پیسے کا تعلق سفر سے اسی طرح ہے جیسے بھاپ کا سٹیمر سے۔

ایسے سادھو سنیاسی تو ہزاروں نہیں لاکھوں ہیں جن کا نصب العین صرف

---

[1] پیگوڈہ۔ بودھ مندر۔

[2] دیسی کشتی۔

بھیک مانگنا رہ گیا ہے۔ مگر سدانند تو ایک طرح کا مزدور سنیاسی ہے۔ کہیں کوئی تقریر کردی اور مزدوری پہلے کھری کرلی۔ مگر کوئی کوئی انجمن بعد میں دھتا بتادیتی ہے۔ یا بوقتِ ضرورت کوئی انجمن پیسے دے کر تقریر کرانے پر تیار نہیں ہوتی۔ میرا اپنا حال بھی سدانند سے بہتر نہیں۔ کلکتے کے ایک رسالے کو مضمون بھیجا تھا۔ اب تک مزدوری نہیں آئی۔ اور اب تو یہ شک ہو رہا ہے کہ ناپسند قرار دے دیا گیا ہو۔ ناپسند سہی، اطلاع تو پہونچے۔ اُمید کہتی ہے کہ شاید کل ہی منی آرڈر آجائے۔

اپنی تنگدستی کو سدانند کبھی زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

سوچتا ہوں کہ خانہ بدوش ادیب اور مزدور سنیاسی سے تو ایراوتی کے ملاح ہی آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایراوتی گنگنا رہی ہے۔ شاید وہ میرے خیال کی تائید کر رہی ہے۔

ہر شخص کا وجود اپنی جگہ ضروری ہے۔ یہ بے اعتنائی تو کسی طرح جائز معلوم نہیں ہوتی۔ آخر کیوں بعض لوگوں کی زندگی بیکار اور بے لطف بنادی جائے۔ روزمرہ کی زندگی میں امیر اور غریب کے درمیان ایک خلیج کیوں حائل ہوتی چلی جارہی ہے؟ سدانند مُسکرا رہا ہے۔ اسکی دُور رس نظر نئے زمانے کو قریب آتے دیکھ رہی ہے۔ یہ سب کچھ دیکھکر اُس کے ذہن میں ہر وقت کوئی نہ کوئی سوال پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اور پھر شاید وہ خود ہی اپنے دل سے اس کا جواب پالیتا ہے۔

ایراوتی ہر نئے زمانے کا استقبال کرتی آئی ہے۔ وہ بہتی رہی ہے۔ بہنا ہی زندگی ہے۔ اُس میں طوفان بھی آئے ہیں۔ اور ابکے سماج میں بھی ایک بڑا طوفان آکر رہے گا۔ گھناونی رجعت پسندی کی جڑیں اُکھڑ جائیں گی۔ کوڑا کرکٹ بہہ جائے گا۔ اور پھر شاید ایراوتی کے پانیوں پر لوگوں کے آنسو کبھی نہیں گرینگے۔

۳

شام کی ہلکی تاریکی میں، جب زندگی سمٹ جاتی ہے۔ ملاّحوں کے گیت ہم پر گہرا اثر کرتے ہیں۔ بادبان کی طرح بازو پھیلا کر سدانند بھی کنارے کنارے بھاگنے لگتا ہے۔ پھر خود ہی گر پڑتا ہے۔ ریت پر چت لیٹ جاتا ہے۔

پُرانی کتابوں میں سنیاسی کے لئے یہ تلقین کی گئی ہے کہ وہ ایک مقام پر زیادہ نہ ٹھہرے۔ کہیں کہیں تو شاید یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ایک رات سے زیادہ نہ رُکے۔ سدانند اس کا پابند نہیں۔ آخر یہ پابندیاں کیوں لگائی گئی تھیں؟

سٹیمر سیٹی دے رہا ہے۔

چلو ٹکٹ لے لیں۔ اب تو روپے بھی آگئے۔

اتنی کیا جلدی ہے؟

سنیاسی کو کسی مقام سے اتنی دلبستگی نہ ہونی چاہیئے۔

میں ایسا سنیاسی نہیں۔

مگر حق تو یہ ہے کہ مجھے بھی ایراوتی کے اس کنارے سے دلبستگی ہوگئی ہے۔ یہاں کتنا سکھ چین نصیب ہوتا ہے! اب تو جی چاہتا ہے کہ بھری دوپہر کا وقت یہیں آکر کاٹا کروں۔

کوئی گاتا ہے:—

"تم ٹھہروگے نہیں؟
ہماری باتیں سنوگے نہیں؟
ہم ہیں ایراوتی کی لہریں!"

دن کا وقت ہوتا تو میں ملاح کا چہرہ دیکھ سکتا اور اندازہ کرسکتا کہ وہ لہروں کے بول سُنکر کتنا متاثر ہوا ہے۔

"پانی سے بھرے ہوئے بادل ابھی برس پڑینگے۔
منجدھار تو ابھی پار کرنا ہوگی"

مجھے یاد ہے کہ ایک پُرانے ملکی ناچ میں اس دیس کی کنواریاں بازو ہلا ہلا کر چپو چلانے کا نظارہ پیش کر رہی تھیں۔ اُنکے چہروں پر خوف چھایا ہوا تھا۔۔۔ کشتیاں منجدھار میں تھیں اور سر پر بارش کھڑی تھی۔

موسیقی کی ترنگ تیرتی ہوئی نہ جانے کہانتک چلی جاتی ہے؟—

"ایراوتی کی لہروں کی طرح
میری محبوبہ آزاد ہے"

صدیوں سے اس دیس کی عورت آزاد ہے۔ مرد نے اُس کی آزادی اور خوشی پر چھاپا نہیں مارا۔ اکثر وہ اپنے خاوند کی وفادار رہتی ہے۔ جب دیکھتی ہے کہ اس کی طبیعت کے مطابق نہیں رہا تو گاؤں کی پنچایت کے سامنے کھڑے ہوکر صاف کہہ دیتی ہے کہ وہ آئندہ اُس کی بیوی بنی رہنے کی پابند نہیں رہ سکتی۔ والدین سے ملی ہوئی جائداد پر اُسی کا حق رہتا ہے۔ اور وہ جسے پسند کرے اُس سے دوسری شادی کرلے۔

ملاحوں کے گیت پہلے بھی بہت سُنے ہیں۔ یہ بھی نہ بھولینگے۔

"ایراوتی، اری او میری ایراوتی!
او میری محبوب ایراوتی!
اور سب ندماں پیاری ہیں—
سب سے پیاری ہے ایراوتی!"

◆ ◆ ◆

"دن بھر میں ناؤ کھیتا ہوں،
تیرے پانیوں پر، او ایراوتی!
ملاح کی زندگی بجائے خود ایک گیت
تیرے پانیوں پر، او ایراوتی!"

٭ ٭ ٭

"سندر کنواریاں ناچ رہی ہیں۔ جھوم رہی ہیں۔
تیزی سے۔ کبھی دھیرے دھیرے۔
تم نے یہ ناچ کہاں سیکھا؟
بتاؤ بتاؤ، ایراوتی کی بیٹیو!
ہم ہیں مور اور تم ہو مورنیاں
مور مار ڈالے جائیں گے اور تم رویا کروگی۔
دریا کے اس موڑ پر یہ ناچ سیکھا تھا یا اس پہاڑ پر
جہاں سے ایراوتی نکلتی ہے؟
تم نے یہ ناچ کہاں سیکھا؟
بتاؤ بتاؤ، ایراوتی کی بیٹیو!"

٭ ٭ ٭

"ایراوتی میں ہمارے آنسو سماتے رہے ہیں، بھائیو!
ایراوتی کتنی میلی ہو رہی ہے،
اور جب غریبی ہمارے گلے گھونٹ دے گی
ایراوتی اسی طرح بہتی رہے گی!"

٭ ٭ ٭

بہتی جا، ماں ایراوتی، بہتی جا
تیزی سے، کبھی دھیرے دھیرے۔
ایراوتی! تو چپ کیوں ہے؟ اداس کیوں ہے؟
ہمارے آنسو شوق سے پیے جا۔
ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہم ہیں تیرے بیٹے،
ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تو ہے ہماری ماں۔
بہتی جا، ماں ایراوتی، بہتی جا
تیزی سے، کبھی دھیرے دھیرے"

ایراوتی گنگنا رہی ہے۔ شاید اپنی بیٹیوں کو آشیرباد دے رہی ہے۔ اس کی گنگناہٹ سے متاثر ہوکر میری ڈانواڈول طبیعت میں توازن آگیا ہے، ایک خاص طرح کی وسیع النظری بھی۔

میرا ذہن جو چند مہینوں سے پورا کباڑخانہ بنا ہوا تھا ـــ غیر ضروری اور انٹ شنٹ چیزوں کا بے ترتیب مال گودام اب بہت صاف ہوگیا ہے۔ یہاں بیٹھکر نئے نئے خیالات سوجھتے ہیں۔ روح ذی حس ہو رہی ہے اور ہلکے ہلکے سے تاثرات بھی اس ایسی پائدار تصویریں کھینچ رہے ہیں، جو شاید رہتے دموں تک بنی رہیں گی۔ اور سدانند بھی جیسے میرے ذہن میں بیٹھکر یہ سب تصویریں دیکھتا رہتا ہے۔ اپنا گول مٹیالا سر ڈھلکا کر وہ کبھی ایراوتی کے اس پار دیکھنے لگتا ہے اور کبھی میرے سر کے لمبے اور الجھے ہوئے بالوں کی طرف جن کی لہریں شاید وہاں کے ایسے پودوں کا نظارہ پیش کیا کرتی ہیں جنہیں ہوا تھپکیاں دے رہی ہو۔

صدیوں سے وہ یوں ہی بہہ رہی ہے۔ وہ برما کی ماں ہے۔ میں اس سے اتنا متاثر ہوتا ہوں پر کیا خود بھی اسے متاثر کرسکا ہوں؟ خدا حافظ، ایراوتی! کل پھر سہی!

اٹھو، سوامی جی، اب گھر کو چلیں۔

اتنی بھی کیا جلدی ہے۔[1]

دیوندر ستیارتھی

---

[1] ۱۹۳۲ء میں، جب میں برما گیا تھا، ان تاثرات نے جنم لیا تھا۔

تو پھر میں تمہیں کیا کہہ کر پکاروں؟

ستاروں کی ملکہ! پھولوں کی رانی! گیتوں کی دیوی!

واہ صاحب! یہ مسکراہٹ کیسی؟ گویا ایک تبسم سے آپ ہمارے تمام دعووں کو باطل کر دینا چاہتی ہیں۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ میں نے کہا غلط کہا۔ یا کم سے کم بہت بڑا مبالغہ کیا۔ نہیں، جانِ آرزو، ایسا نہیں! ہاں! دلوں کے احساس جدا جدا ہیں۔ میں صرف اپنے دل کا حال جانتا ہوں۔

ناہید، برجیس، کیوان، مریخ، سب میرے دیکھے ہوئے ہیں۔ چاند کے چڑھتے ہوئے شباب سے بھی آنکھیں بارہا کیف اندوز ہوئی ہیں۔ مگر چاند کے نظارہ سے بھی کبھی وہ سرور و سکون حاصل نہیں ہوا جو صرف تمہارے تصوّر سے حاصل ہو جاتا ہے۔ اس تصوّر سے میری رُوح جگمگا اٹھتی ہے میری خاک کا ذرہ ذرہ ایک ستارہ بن جاتا ہے۔ اور میں ایک ایسی فضا میں پہونچ جاتا ہوں جہاں نور ہی نور، سکون ہی سکون ہوتا ہے۔ آہ وہ عالمِ سرخوشی!

کاش میرے اختیار میں ہوتا کہ میں چاند اور ستاروں کو تمہاری کنیزیں بنا دیتا۔ سورج کی کرنوں کا تاج پہن کر تم اُن کے جھرمٹ میں بیٹھتیں اور میں چھپ کر تمہیں دیکھتا۔ چھپ کر اس لئے کہ تم شرما نہ جاؤ اور شباب کی رعنائیاں اپنی پوری قوت کے ساتھ عالم افروز ہوں۔

میری دُنیا سے دُور، سمندروں کے اُس پار پہاڑ کی چوٹیوں پر چکوروں کی طرح تن تن کر چلنے والی، میری ستاروں کی ملکہ! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اب تم غور سے سُن رہی ہو۔ شاید تمہیں میری باتوں کا یقین آتا جا رہا ہے۔ ہاں میری ستاروں کی ملکہ! میری پھولوں کی رانی، میری گیتوں کی دیوی، میرے لئے تم وہ سب کچھ ہو جو میں نے کہا اور سچ پوچھو تو میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ کاش مجھے وہ الفاظ معلوم ہوتے جو میرے جذبات کی صحیح ترجمانی کر سکتے۔

سمجھ میں نہیں آتا تمہارے اس سوال کا کیا جواب دوں کہ "کیا اب بھی تم مجھے ویسا ہی چاہتے ہو؟"

آہ زیبا! ؎

کیا محبت کو مری تم نے ہوس سمجھا ہے
کہ ہوئی یاس تو سرگرمیِ آغاز نہ ہو

یاس کی آندھیوں میں ہوس کی آگ بجھ جاتی ہے۔ محبت کی آگ نہیں بجھا کرتی۔ بلکہ وہ اور بھی زیادہ بھڑکتی ہے اور محبت کرنے والے کو ایک شعلہ زار بنا دیتی ہے۔ آغازِ کار میں ہوس اور محبت دونوں کا جوش یکساں ہوتا ہے۔ مگر جہاں مایوسیوں کی گھنگھور گھٹائیں چھائیں اور ناکامیوں کی تمنا سوز بجلیاں کڑک کڑک گریں، ہوس کے ولولے پانی کے بلبلوں کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن محبت اگر بے لوث اور صادقانہ ہو تو طوفانِ حوادث میں بھی اُس کے پاؤں ہمالیہ کی سر بلند چوٹیوں کی طرح جمے رہتے ہیں۔ اور محرومیوں کے باوجود زندگی کی آخری ساعتوں تک وہی ولولہ، وہی جوش قائم رہتا ہے جو ابتدا میں تھا یہی فرق ہے ہوس اور محبت میں۔

کیا سالہا سال کے تجربہ کے بعد بھی تمہیں مجھ سے یہ پوچھنے کی ضرورت ہے کہ میرے دل میں اب بھی تمہاری ویسی ہی محبت موجود ہے یا وہ محض ایک وقتی جذبہ تھا؟

زیبا! تمہیں پا لینے اور اپنا بنا لینے کا خیال تو اتنا ہی مجنونانہ ہے جتنا آسمان کے تارے توڑ کر اپنے گریبان میں ٹانک لینے کا مگر مجھے تو اب یہ بھی ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ زندگی میں کبھی دُور ہی سے ایک نظر دیکھ سکوں۔ لیکن قلب و رُوح کی تمام وسعتیں آج بھی تمہاری محبت سے اُسی طرح معمور ہیں جس طرح ان روح پرور ساعتوں میں تھیں جب تمہارے گیسو میرے بازو پر بکھرے ہوئے تھے اور تم نے اپنے لبوں سے بہشتی شراب مجھے پلائی تھی۔

انسانی فطرت ہے کہ مایوس ہونے کے بعد اس کے دل میں ایک قسم کی بے حسی اور جمود سا پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن خدا جانے تم کن ساحرانہ قوتوں کی مالک ہو کہ یاس کی روح فرسائیاں بھی تمہاری آرزو کو میرے دل سے نہ مٹا سکیں اور خارِ تمنا ہر وقت کھٹکتا ہی رہتا ہے۔ آہ ؎

میری طرح نہ ہو کوئی مجبورِ آرزو
مایوس ہو کے بھی خلشِ دل نہیں گئی

کئی دن سے میرا دل غیر معمولی طور پر بیقرار ہو رہا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے تمہارے خط کی طرف سے بالکل مایوسی ہو چکی تھی مگر سچ کہا ہے کسی نے کہ:۔۔۔

۵

شب سیاہ کا انجام ہے سپیدۂ صبح
ظہور کرتی ہے امید۔ ناامیدی سے

ابھی میں تمہارے خط کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ ملازم نے ایک بھاری "لفافہ" لاکر دیا۔ فارن (ہ ہ ہ ہ ہ ہ ہ) پھر دیکھتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ الٹ کر دیکھا تو تمہاری تحریر۔ آہ زیبا! کیونکر بیان کروں کہ اس وقت دل کی کیا کیفیت تھی۔ سارے بدن میں ایک لرزش سی پیدا ہوگئی۔ لفافہ کھولا تو خوشبو کی لپٹیں روح کو گدگدانے لگیں۔ پڑھا تو مسرت واندوہ کے چشمے سینے سے ابلنے لگے۔ خوشی اور رنج کا ایک جگہ جمع ہونا کسقدر عجیب بات ہے۔ آج معلوم ہوا کہ اجتماع ضدین ممکن ہے۔ محال نہیں۔ اللہ ری محبت کی کارفرمائیاں!

زیبا! تمہارے خدا نے میرے دل کے ساتھ وہی سلوک کیا جو شبنم پیاسے پھولوں کے ساتھ اور آگ سوکھی گھاس کے ساتھ کرتی ہے۔ ایک طرف تمہاری والہانہ محبوبیت اور دوسری طرف ہماری ابدی محرومی۔ آہ، میں تمہیں پاکر بھی تمہیں نہ پاسکا۔ اپنا بناکر بھی اپنا نہ سکا۔ دل کس قدر نازاں، کسقدر مسرور ہے اپنی محبت پر جس نے چاند کو چکور بنادیا اور کتنا رنجیدہ، کتنا بیزار ہے اپنی قسمت سے جس نے ارمانوں کی دنیا بساکر اسے لوٹ لیا اور خاک میں ملادیا۔

چاند زمین کا ایک ٹکڑا ہے۔ ٹوٹ کر زمین سے جدا ہوگیا ہے۔ رات دن اب بھی اسکے گرد گردش کرتا ہے۔ مگر اب کبھی زمین سے مل نہیں سکتا۔ قسمت نے ایسی ہی جدائی ہمارے درمیان ڈالی ہے۔ فطرت نے ایک ہی مادّہ سے ہماری تخلیق کی تھی۔ اسی لئے بیگانگی کے باوجود ہم نے ایک دوسرے کو اپنا بنالیا۔ ہمارے دل مل گئے۔ ہمارے جسموں کا اتصال ہوا۔ مگر کس طرح؟ جیسے ایک تیز پر قمری، صیاد جس کا پیچھا کر رہا ہو، دورانِ پرواز میں سرو کی چوٹی کو چھوتی ہوئی گذرجائے اور پھر کبھی زندگی بھر اس تک نہ پہونچ سکے ———— ہاں! مدت سے میں نے کچھ نہیں لکھا۔ کیا لکھوں۔ کیونکر لکھوں اور کس کیلئے لکھوں؟ تم کہوگی اپنی زیبا کیلئے! آہ، میری زیبا! دل گوارا نہیں کرتا کہ اپنی دکھ بھری کہانی سناکر تمہاری نیندیں اور تمہارا سکون تم سے چھین لوں۔ پہلے ہی تم کونسی خوش ہو کہ تمہارے سینے میں اور غم کے نشتر توڑدوں۔ زیبا! مجھے تمہاری روحانی اذیتوں کا اچھی طرح احساس ہے۔ تمہاری ہمت کو آفریں ہے کہ تم آنسوؤں کے طوفان کو تبسم کے دامن میں چھپالیتی ہو۔ خدا تمہیں سکون دے میں اچھا ہوں۔ زندگی خوش وناخوش بہرحال گذر رہی ہے اور گذرجائیگی۔ زندگی بھر کی ایک تمنا تھی آزادی کی چند ساعتیں اور تم۔ قدرت میرے لئے اتنی فیاض نہ ہوسکی۔ اسکی مرضی۔ دنیا میں ہم لاکھوں نامراد جیتے ہیں ایک اور سہی۔ ہوسکے تو خط جلد لکھ دینا۔ وقت تنگ ہے ڈاک جارہی ہے زیادہ لکھنا ممکن نہیں۔ باقی آئندہ۔ اچھا خدا حافظ۔

بہ تمنائے دیدار ولب بوسی۔ تمہارا ......

"ابنِ داؤد"

غزل

فدائے یار ہوں اوروں سے کام کیا ہے مجھے
جگر فگار ہوں اوروں سے کام کیا ہے مجھے

فضائے حشر میں بیٹھا ہوں یوں الگ سب سے
گناہگار ہوں اوروں سے کام کیا ہے مجھے

نہ میں پھروں گا ترے آستاں کی خیر رہے
وفا شعار ہوں اوروں سے کام کیا ہے مجھے

کہاں کہاں ہے مرے اضطراب کی دنیا
کہ بیقرار ہوں اوروں سے کام کیا ہے مجھے

نگاہ یار۔ سرفرش ہی نہ ٹک جاؤں
ذلیل و خوار ہوں اوروں سے کام کیا ہے مجھے

یہ بیخودی ہی بھلی ہے ترے تصوّر کی
نہ ہوشیار ہوں اوروں سے کام کیا ہے مجھے

مری خزاں بھی تو ہی ہے مرا چمن بھی تو ہی
لٹی بہار ہوں اوروں سے کام کیا ہے مجھے

تجھے قسم ہے ادھر ناوک افگنی فرما
کہ میں شکار ہوں اوروں سے کام کیا ہے مجھے

دل و جگر نہیں گریاں تو کیا کروں بہزاد
میں اشکبار ہوں اوروں سے کام کیا ہے مجھے

بہزاد لکھنوی

نغمۂ احساس

فضا میں نور کے چھینٹے اڑا رہا ہوں میں
ہوا میں گیت کی لہریں اٹھا رہا ہوں میں
جہاں کو نیند کی رو میں بہا رہا ہوں میں
خمار بن کے دو عالم پہ چھا رہا ہوں میں
تمہارے حسن کے نغمات گا رہا ہوں میں

یہ نغمے قلبِ غزلخواں پہ گائے جاتے ہیں
یہ نغمے اشکِ فراواں پہ گائے جاتے ہیں
یہ نغمے تارِ رگِ جاں پہ گائے جاتے ہیں
یہ نغمے تارِ رگِ جاں پہ گا رہا ہوں میں
تمہارے حسن کے نغمے سنا رہا ہوں میں

شراب و رنگ میں کھوئی ہوئی بہاروں کو
زمیں کے ذرّوں کو افلاک کے ستاروں کو
شباب و شعر میں ڈوبے ہوئے نظاروں کو
شباب و شعر کے قصے سنا رہا ہوں میں
تمہارے حسن کے نغمات گا رہا ہوں میں

مری فسردہ جوانی کی روشنی تم ہو
مرے ضمیر کی تابندہ چاندنی تم ہو
مری زندگی کی قسم، جانِ زندگی تم ہو
تمہیں کو اپنی تمنا بنا رہا ہوں میں
تمہارے حسن کے نغمات گا رہا ہوں میں

مرے شعور میں تنویر بن کے رہتی ہو
مرے کلام میں تاثیر بن کے رہتی ہو
مرے خیال میں تصویر بن کے رہتی ہو
خیال و خواب کی جنت بسا رہا ہوں میں
تمہارے حسن کے نغمات گا رہا ہوں میں

خیال و خواب کا افسانہ کہتا جاتا ہوں
ترے شباب کا افسانہ کہتا جاتا ہوں
مے و شراب کا افسانہ کہتا جاتا ہوں
مے و شراب کے ساغر لنڈھا رہا ہوں میں
تمہارے حسن کے نغمات گا رہا ہوں میں

اسیرِ گیسوئے عنبر فشاں ہے سب دنیا
ترے شباب کی افسانہ خواں ہے سب دنیا
تمہارے حسنِ جواں سے جواں ہے سب دنیا
جوان لے میں جواں گیت گا رہا ہوں میں
تمہارے حسن کے نغمے سنا رہا ہوں میں

دل و نظر کی کہانی سنائے جاتا ہوں
بیانِ ہستیِ فانی سنائے جاتا ہوں
حدیثِ حسن و جوانی سنائے جاتا ہوں
حدیثِ حسن و جوانی سنا رہا ہوں میں
تمہارے حسن کے نغمات گا رہا ہوں میں

مہک رہی ہو شبابِ گلاب کی صورت
برس رہی ہو فضا سے شراب کی صورت
سما رہی ہو دل و جاں میں خواب کی صورت
تجھے بہشتِ دل و جاں بنا رہا ہوں میں
تمہارے حسن کے نغمات گا رہا ہوں میں

ضمیر جعفری

پکنک

گا رہی ہے سانولی کانن[1] گراموفون پر
مچھلیوں کی تاک میں ڈالے ہوئے بنسی کی ڈور

گل رہا ہے جسم ندی میں "منوہر" جھوم کر
دھن رہا ہے زور سے سر "فیض احمد شاہزور[2]"

---

[1] نیو تھیٹرز کی ایک مشہور ایکٹرس، [2] ایک شاعر دوست۔

بھر رہا ہے تیل کے چولہے میں پھونک "احمد حسن" — کر رہا ہے صاف "اندر ناتھ" مُرغے کا بدن
نیم کے سائے میں بچے آم ہیں رکھے ہوئے — پیڑ پر کوّے جھپٹنے کو ہیں پر تولے ہوئے
گاؤں کا مرلی سا لتا آ گیا ہے سونگھتا — تازہ مکھن کی لپٹ اور خونِ تازہ مرغ کا
کر رہا ہے رقص "شوکت" بھیکے رقاصہ کا روپ — جسکو گھیرے میں لئے ہیں "نیم، عظمت او ربھوپ"
قہقہوں میں گھل رہی ہے بادلوں کی گھن گرج — ہنستے ہنستے ہوگئی ہیں کچھ کلاہیں سر پہ کج
دے رہا ہے "گوربچن سنگھ" اس طرح ڈھولک تھاپ — جیسے گونجے تھان سے چھوٹے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپ
تاش بکھرے ادھوری بازیوں کے ہیں نشاں — آج ان بیکار سے کھیلوں کی ہے فرصت کہاں
دفعتاً خوش رو "منوہر" زور سے چلّا اٹھا — "ملکیہ صاحب کی بتاؤ کون اٹھا کر لے گیا؟"
ایک کوّے پر نگاہیں سب حیران کی جا پڑیں — سب کے ہونٹوں پر ہنسی کی بجلیاں لہرا گئیں
شرم کے مارے "منوہر" یک بیک چپ ہوگیا — اتنے میں دور ایک کونے سے دوبارہ شور اٹھا
اس قدر شور آفریں خوش رنگ اندر ناتھ تھا — اے تجمل، اے بچن، دوڑو کہ مرغا پک گیا!"
اتنا سننا تھا کہ بزمِ رقص برہم ہوگئی — ٹوٹ کر یہ فوجِ بے ترتیب کھانے پر گری
کوئی تھوڑا اور کوئی سب سے زیادہ کھا گیا — کوئی خالی ہاتھ ہی ان سب کا مُنہ تکتا رہا
کشمکش سی تھی مگر شکوہ سرا کوئی نہ تھا — مسکراہٹ تھی لبوں پر اور گِلا کوئی نہ تھا

جن میں ہوں اس رنگ کے نغمے، محبت اور اُدھم
ایسے لمحے آدمی کی زندگانی میں ہیں کم

مخمور جالندھری

افکارِ تازہ

بہاروں نے پھر آ کے مژدہ سُنایا — گریباں کے ٹکڑے کئے جا رہے ہیں
یہیں ایک دن جشنِ اُمید ہوگا — جہاں غم کے قصّے کئے جا رہے ہیں
یہ کس نے کیا ذکر ان کا کہ غنچے — پسینے پسینے ہوئے جا رہے ہیں
مری زندگی کے طربناک نغمے — ترے غم میں آنسو ہوئے جا رہے ہیں
کہیں ہم نے دیکھی نہ تصویرِ الفت — زمانے سے قصّے سُنے جا رہے ہیں
مرے دل کی بے تابیاں بڑھ رہی ہیں — وہ جتنی تسلّی دئے جا رہے ہیں
نہ پوچھ آہ دنیا تری انجمن سے — تمنّائیں کیا کیا لئے جا رہے ہیں
سسکتی اُمیدیں، بجھی آرزوئیں — یہ کچھ زندگی ہے، جئے جا رہے ہیں

نہ پھر یاد کرنا شمیمِ حزیں کو
تری بزم سے ہم اُٹھے جا رہے ہیں

صفیہ شمیم ملیح آبادی

ایک روٹی

کسی نے بالکل سچ کہا ہے کہ فلسفی ہونے کیلئے صرف فلسفی ہونا ہی کافی ہے۔ عموماً فلسفی مادر زاد فلسفی پیدا ہوتے ہیں ان کے لئے نہ عمر کی قید ہے نہ تجربہ کی نہ علم کی حاجت ہے نہ عمل کی۔ ہر وہ شخص جو مسائل زندگی کو ذرا گہری نظر سے دیکھنے کی کوشش کرے فلسفی ہے حتیٰ کہ آپ نے فلسفی مُرغا بھی سُنا ہوگا جو مرغا اپنی ایک ٹانگ اٹھا کر ذرا سوچتا رہتا ہے لوگ اُسے بھی فلسفی کہہ دیتے ہیں۔ خیر قصہ کوتاہ ہمارے مرزا نادر حسین بھی فلسفی تھے اور بڑے جید قسم کے۔ علم تو اُن کا گھر سے مکتب ہی تک تھا لیکن تجربہ کا میدان اِس قدر وسیع تھا کہ مسائل حیات و ممات کی شاید ہی کوئی ایسی وسعت ہو جو اس میں سما نہ سکے۔ مرزا صاحب اکثر مغلوب الفلسفہ ہو جاتے اور پھر دُنیا دما فیہا سے بےخبر ٹکٹکی باندھ کر کچھ اس محویت سے سوچتے کہ پلک تک نہ جھپکتی بُت کی طرح بالکل ہی جامد و ساکت رہ جاتے۔ کئی دفعہ اُن کی اس حالت میں اُن کی بیوی یہ کہتی ہوئی دوڑ پڑیں "ہائے سکتہ ہوگیا انکو" اور بیچارے مرزا کو بُری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔

مرزا کے ذہنی خلجان میں اضافہ کرنے کیلئے بدقسمتی سے ان پر ایک اور مُصیبت بھی نازل تھی یعنی وہ صرف فلسفی تھے بلکہ لیڈر بھی۔ مرزا بیک وقت سوچتے بھی اور عمل کرنے کی بھی کوشش کرتے اور اِس دُنیا میں جہاں ایک انسان صرف ایک کام کرتا ہے مرزا کے یہ دُہرے فرائض ان کے اختلاج قلب اور ضعف معدہ کا باعث تھے۔ مرزا اُن کام چور لوگوں میں سے نہ تھے جو صرف فلسفہ کی گتھیاں سُلجھاتے اور افیم کی گولیاں کھا کر گھر میں پڑے رہتے، بلکہ مرزا ان بلند ہمت انسانوں میں سے تھے جو نہ صرف فلسفہ کے بال کی کھال نکالتے بلکہ اس کھال کو خود بھی اوڑھتے اور دوسروں کے سر پر بھی منڈھنے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ مرزا پاٹا نالہ کے میدان میں انسداد گداگری کے موضوع پر نہایت فصیح اور بلیغ تقریر فرما چکے تھے حاجی ننھو کے یہاں برزخ کے مسئلہ پر روشنی ڈال چکے تھے۔ عین امین آباد پارک میں عدم تشدد کی دھجیاں اُڑا چکے تھے۔ مسٹر جناح، مہاتما گاندھی اور علامہ مشرقی سے خط و کتابت کر چکے تھے۔ جوانی دیوانی کے زمانہ میں ہندوستانیوں کو باہمی اتحاد کی تلقین فرما چکے تھے۔ کلو نان بائی کی دوکان پر مدح صحابہ کے سلسلہ میں مناظرہ منعقد کرچکے تھے وغیرہ وغیرہ۔ دوپہر بھر مرزا سوچتے اور شام کو جس نتیجہ پر پہونچتے عوام میں اس کی اشاعت کرتے۔ صحیح معنوں میں مرزا فلسفی باعمل تھے۔

جس طرح شراب جتنی زیادہ پُرانی ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ نشہ آور ہوتی ہے اسی طرح فلسفہ جتنا زیادہ پختہ ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ دور رس ہوتا ہے۔ مرزا کا فلسفہ بھی اپنے ابتدائی مدارج طے کرکے روز بروز زیادہ سے زیادہ باریک بیں ہوتا چلا گیا۔ پہلے تو مرزا اپنے اور اپنے اہل محلہ کے اور زیادہ تر اہل شہر کے مسائل پر غور و فکر کیا کرتے لیکن رفتہ رفتہ ایک وہ دن بھی آیا جب مرزا کو ساری دُنیا کی فلاح اور بہبود کی فکر لاحق ہوگئی اور مرزا کوئی ایسا راستہ ڈھونڈھنے لگے جس پر خود چل کر اور دوسروں کو ہانک کر وہ تمام بنی نوع انسان کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے امن اور صلح اور خوشحالی سے ہمکنار کردینا چاہتے۔ جویندہ یابندہ کے مصداق بڑی زبردست ذہنی معرکہ آرائیوں اور تدبر اور تفکر کے بےتھاہ سمندر میں بے انتہا غوطہ زنی کے بعد بالآخر مرزا اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے اور انہوں نے سوسائٹی کی تمام بیماریوں اور پریشانیوں کا ایک مجرب نسخہ دریافت کرلیا اور یہ نسخہ ع فکر ہر کس بقدر ہمت اوست کی بہترین تفسیر تھا۔

مرزا نے فوراً ایک انجمن فلاح و بہبود عالم قائم کردی اور اُس کے اغراض و مقاصد حسب ذیل رکھے :-

۱- دُنیا سے تمام جرائم اور اگر ہوسکے تو جرائم پیشہ بہ جبر فنا کردئے جائیں۔

۲- ہر شخص کو کام کرنے پر مجبور کیا جائے اور بیکاروں کو پھانسی دیدی جائے۔

۳- بھیک مانگنا سنگین ترین جُرم قرار دیا جائے۔

۴۔ عورتیں بے پردہ ہوجائیں اور شادی کی رسم بردہ فروشی کی رسم کی طرح یک قلم مٹادی جائے۔

۵۔ تمام مذاہب کی ایک کانفرنس منعقد کرکے سب مذاہب کا معجون مرکب ایک مذہب بنادیا جائے۔ انفرادی حیثیت سے ہر مذہب فنا کردیا جائے اور اس کی تمام کتابیں نذرِ آتش اور اس کے مبلغین کو غرق آب کردیا جائے۔

اِن اغراض و مقاصد میں مرزا کی کیا کیا مصلحتیں پوشیدہ تھیں یہ صرف مرزا جانتے لیکن اس انجمن کی مقبولیت اس سے ظاہر تھی کہ اس کے قیام کے ایک ہی ہفتہ میں اس کے پانچ رکن ہوگئے مرزا صاحب خود۔ اُنکے سالے کبن نواب۔ کلو نان بائی۔ منشی واجد حسین کاذب اور راقم الحروف۔

انجمن فلاح و بہبود عالم کے قیام کا آٹھواں دن تھا۔ شام کے وقت مرزا صاحب اس کے متعلق بڑے سائز کے جلی پوسٹر مطبع سے گرم گرم لئے اور بغل میں دبائے قدم اُٹھائے قصد نی باڑہ سے اپنے مکان لال کنویں جا رہے تھے۔ کلو نان بائی نے اپنی دُکان سے اُنکو دیکھتے ہی آواز لگائی "مرزا صاحب! کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ ارے ذرا دم تو لے لیجئے۔ آپ کے سر کی قسم حقہ بڑے مزے میں آرہا ہے۔"

مرزا صاحب کو کلو کی یہ مداخلت بیجا کچھ ناگوار گذری لیکن کیا کرتے وہ اُن کی انجمن کا اسسٹنٹ سکرٹری تھا مجبوراً اُسکی دکان پر آکر بیٹھ گئے اور تازہ تازہ روٹیوں کی خوشبو سونگھنے لگے "کیا بتاؤں آج سارا دن مطبع میں پریشان رہا۔ مینجر کے سر پر بیٹھ کر یہ پوسٹر چھپائے ہیں۔ اب کل ہی اِن کو سارے شہر میں چسپاں ہوجانا چاہیئے" مرزا صاحب نے کہا۔

کلو نان بائی نے پوسٹروں کا پلندہ مرزا صاحب کے ہاتھ سے لے لیا اور اُس کو کھول کر ایک پوسٹر باآواز بلند پڑھنے لگا۔

ایک تیس بتیس سال کی بڈھی بدصورت فقیرن جس کے منہ سے ٹھیک آواز بھی نہ نکلتی، آئی اور دُکان کے سامنے کھڑے ہوکر تنور سے گرم گرم روٹیوں کے نکلنے کا تماشہ بڑی حریص نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"بھیک مانگتی ہے" انجمن فلاح و بہبود عالم کے صدر یعنی مرزا صاحب نے گرج کر پوچھا۔

"اور کیا کروں؟ اللہ بھلا کرے" فقیرن نے کہا۔ وہ اپنی شکل و صورت سے قبرستان کے مُردوں کو بھی شرما دیتی۔

مرزا صاحب تو کچھ چپ ہوگئے لیکن کلو نے جھڑک کر کہا۔ "چل! چل! آگے چل! آج باسی روٹی بالکل نہیں ہے"

"بڑی بھوک لگی ہے بابا!"

"تو کیا میں کچھ تجھے کیے جا رہوں تیرا!"

"کل شام سے نہیں پایا ہے کچھ" فقیرن نے پھر سوال کیا۔

اس دفعہ کلو کو غصہ آگیا اور اس نے دو تین بہت سخت گالیاں دیں۔ "حرامزادی کمینی! کچھ رکھا گئے تھے تمہارے باپ ہمارے پاس۔ روٹی نکلی نہیں تنور سے کہ یہ سور کے بچے بھیک منگے آکر بھنکنے لگے مکھیوں کی طرح۔ اور پھر کہدو کہ جاؤ تو ہٹتے نہیں۔ اُتار کر پچاس جوتے مارے ساری ڈھٹائی رکھی رہ جائے"

فقیرن مایوس ہوکر ایک طرف کونے میں دُکان سے کچھ فاصلہ پر کھڑی ہوگئی۔

دفعتاً پچھم کی جانب گلی کی نکڑ سے ایک شور و غوغا بلند ہوا جیسے کسی گھر میں آگ لگ گئی ہو اور لوگ چیخ رہے ہوں۔ مرزا صاحب اور کلو نان بائی اور اس کی دوکان پر دو تین کام کرنے والے دوڑ پڑے۔ فقیرن بھی اُنکے پیچھے پیچھے ہولی۔

برجموہن آڑتی کی دوکان پر ایک مجمع لگا ہوا تھا اور مجمع کے درمیان ایک بھینسے کا ٹھیلہ کھڑا تھا جس پر گیہوں کی بوریاں لدی ہوئی تھیں۔ اور پاس ہی زمین پر ایک بورا پھٹا ہوا پڑا تھا۔ اور اس میں سے نکلے ہوئے گیہوں بکھرے ہوئے تھے۔ برجموہن آڑتی شیر کی طرح دہاڑ رہا تھا اور بھینسے کا کوڑا لے ٹھیلہ والے کو سٹراسٹر مار رہا تھا اور ٹھیلہ والا بلبلا بلبلا کر چیخ رہا تھا اور رو رہا تھا۔ اُس کے جسم سے جا بجا خون جاری تھا اور لوگ تماشا دیکھ رہے تھے۔

اچانک فقیرن بڑھی اور اپنا دامن پھیلا کر نہایت اطمینان سے گیہوں سمیٹ سمیٹ کر اس میں بھرنے لگی۔ مجمع کچھ نہ سمجھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک چیخ کے ساتھ برجموہن ٹھیلہ والے کو چھوڑ کر فقیرن کی طرف بڑھا اور اپنی بھرپور طاقت سے ایک کوڑا اس کی پیٹھ پر مارا۔ "چور۔ حرامزادی باپ کا مال ہے" فقیرن کے منہ سے آواز بھی نہ نکلی اور وہ بیہوش ہوکر سیدھی لیٹ گئی۔

مرزا صاحب نے کلو نان بائی سے کہا "اچھا اب میں چلا مجھے گھر پر کام ہے"

کلو بولا "چلو میں بھی چلا یہاں تو ہر دم یہی ہوتا رہتا ہے"

مرزا صاحب اور کلو نان بائی چل کھڑے ہوئے۔ کلو کے پیر میں کچھ لنگ تھا لہٰذا وہ آہستہ آہستہ چلتا۔ مرزا اُس سے دو چار قدم آگے بڑھ جاتے لیکن پھر اس کے انتظار میں اُن کو رُکنا پڑتا۔

"لینا! لینا! پکڑنا" کلو نان بائی کی دوکان سے کسی نے پکارا اور ایک مزدور دوکان سے کوئی چیز لیکر اُتر والی گلی میں بھاگا۔

"پکڑو! پکڑو! سالے کو" کلو چیخا اور غیر اختیاری طور سے مرزا صاحب بھاگنے والے کے پیچھے دوڑ پڑے۔

"لینا! لینا! پکڑنا!" ہر طرف یہی شور تھا اور مرزا خود بھی یہی چیختے ہوئے بھاگ رہے تھے اور اپنے خیال میں قوم کی سب سے بڑی خدمت کر رہے تھے۔ مرزا سے آگے بھاگنے والا مزدور یا چور ان سے پندرہ بیس ہی قدم کے فاصلہ پر تھا اور مرزا کو یقین کامل تھا کہ وہ اُسکو ضرور گرفتار کر لیں گے۔ گلیوں سے بھاگتا ہوا چور قبرستان کے میدان میں نکل آیا اور مرزا کو اطمینان ہو گیا کہ یہاں ضرور وہ اپنے شکار کو پھانس لیں گے۔ کیونکہ جس طرف چور بھاگ رہا تھا اُس کے سامنے ایک بہت بڑا نالہ تھا اور اُس کو پھاندجانا ایک امر محال تھا۔ مرزا اور چور میں چار پانچ ہی قدم کا فاصلہ رہ گیا اور مرزا نے موقع کی نزاکت کا اندازہ لگاتے ہوئے انجمن فلاح و بہبود عالم کے پوسٹروں کا پلندہ چور کے سر پر مارا۔ نشانے نے خطا کی اور پورا پلندہ نالہ میں جا گرا۔ لیکن چور نے ایک اینٹ سے ٹھوکر کھائی اور مُنہ کے بل گر پڑا اُسکی ناک سے خون کی ایک نہر سی جاری ہو گئی۔ وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا اور اُس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ مرزا صاحب اس کو فوراً دبوچ بیٹھے اور اُس کی جامہ تلاشی لینے لگے۔

چور کی مٹھی میں ھونان بائی کی دوکان سے چُرائی ہوئی خون سے تر بتر ایک روٹی تھی۔ صرف ایک روٹی!

وہ چور تھا!

وجاہت سندیلوی

غزل

زندگی کا سازہی وہ ساز ہے
مطربِ فطرت کو جس پر ناز ہے

بوئے گُل سے کھل گیا رازِ چمن
زندگی اک ذات کی غماز ہے

زینتِ بامِ محبّت! جھانک لے
تیرے کوچے میں ترا جانباز ہے

اک معمّا ہے نگاہوں کے لئے
حیرت افزا شوخیٔ انداز ہے

طور پر کیا اور کچھ تھا اے کلیم؟
دل میں بھی اک نور اک آواز ہے

پا لیا ہے اُس نے رازِ زندگی
جس کو اپنی زندگی پر ناز ہے

زندگی شہبازِ فطرت ہے امیںؔ
جس کا جوہر سُرعت پرواز ہے

امینِ حزیں سیالکوٹی

زخمی چین

مِس نی

چین میں آپ کو ایسی عورتیں بہت کم ملیں گی، جو غیر شادی شدہ ہوں۔ کیونکہ قانون کی رو سے مرد کے لئے کثرت ازدواج کے رواج کو ممنوع قرار دیا گیا ہے لیکن لوگ پھر بھی ایک سے زیادہ شادی کر لیتے ہیں اور اس طرح وہ تمام بیکی عورتیں بھی شادی کے نظام میں جذب ہو جاتی ہیں۔ جنکو اور کوئی انسان بیاہنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ چینیوں کو شادی سے محبت ہے۔ وہ عورتوں سے بہت کم محبت کرتے ہیں۔ اس لئے آپ چینیوں میں سے ایسے انسان بہت کم پائیں گے جو شادی کرنے سے انکار کر دیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ سوائے شادی کرنے کے وہاں اور کوئی کام ہی نہیں۔ گو عورتوں کے لئے روزی کمانے کے لئے کئی شعبے کھلے ہیں اور وہ اب زندگی کے ہر شعبے میں شامل ہو سکتی ہیں۔ لیکن عموماً نئی طرز زندگی کی دلدادہ عورتوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انہیں ایک اچھی نوکری بھی مل جائے۔ اور اعلیٰ خاوند بھی۔ اور اسی دوڑ دھوپ میں وہ دونوں کو گنوا بیٹھتی ہیں۔ چند منچلی، نوجوان لڑکیوں نے شادی کو خیرباد کر کے نئی شاہراہ کو اختیار کیا تھا۔ لیکن تیس برس کی عمر میں انہوں نے اپنے سے کم عمر کے لڑکوں سے شادی کر لی۔

مس نی کبڑی تھی۔ شاید اُسکی یہ بدقسمتی تھی۔ کیونکہ اس کے کبڑے پن کی وجہ سے اُس کے ساتھ کوئی شادی کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ لیکن مس نی اتنی جلد ہمت ہارنے والی نہ تھی۔ اُس کے دل میں ایک عزم تھا۔ اور وہ عزم تھا شادی کرنے کا۔ اُس نے اپنے باپ سے اپنا جہیز مانگا۔ جیسے کہ وہ شادی کرنے جا رہی ہے۔ جو کچھ اُسے ملا اُسے لیکر اُس نے اپنے ماں باپ کے گھر کو خیرباد کہا۔ اور شہر کے ایک کونہ میں اپنا مکان لے لیا۔ اِس شہر میں مس نی ہی ایک عورت تھی۔ جو اکیلی بن بیاہی اپنے گھر میں زندگی کے دن کاٹ رہی تھی۔

گھر سے نکل کر وہ تنہائی محسوس کرنے لگی۔ گو پہلے پہل اُسکی مائیں، بھتیجیاں، پھوپھیاں اُسے ملنے کے لئے آئیں۔ لیکن جلد ہی ان کی ملاقاتیں کم ہوتی گئیں۔ اور مس نی کو اب تنہائی سے ڈر لگنے لگا۔ جب وہ گھر سے باہر نکلتی تو گلی کوچوں کے شرارتی لڑکے اُس پر آوازے کستے۔ کئی برسوں احساس کمتری اور بے عزتی نے اُس کے دل میں مردوں کے لئے ایک مبہم سا خوف پیدا کر دیا تھا۔ ہاں اُسے مردوں سے ڈر لگتا تھا۔ اب وہ تنہائی سے تنگ آ چکی تھی، اُسکے گھر کے نزدیک ایک گرجا تھا۔ اُس نے ایک دن بورڈ پر ایک نوٹس پڑھا کہ سوموار کے دن عورتوں کی ایک میٹنگ ہوگی مس نی نے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ کیونکہ اُسے اُمید تھی کہ اُس میٹنگ میں کوئی مرد نہ ہوگا۔

اُسے ان عورتوں سے مل کر کتنی خوشی حاصل ہوئی۔ یہ عورتیں باقی عورتوں سے کتنی مختلف تھیں، یہ عورتیں آجکل کی چھوکریوں کی طرح نہ تھیں۔ جو دن رات اقتصادی اور سیاسی مساوات کے راگ گاتی رہتی ہیں۔ گو ان عورتوں میں اِس بات کا جذبہ ضرور تھا کہ موجودہ سوسائٹی کو بہتر بنانے کے لئے عورت اتنے ہی اچھے کام کر سکتی ہے۔ جتنے کہ مرد۔ یہ خیال مس نی کے لئے ایک نیا خیال تھا۔ اور پھر ان عورتوں میں دوستی کا جذبہ کتنا گہرا تھا اور اُنھوں نے مس نی کو پھر آنے کیلئے کہا تھا۔ کیونکہ اگلی میٹنگ میں سپاہیوں کے لئے کچھ کپڑے وغیرہ سیئے جانے تھے۔ اب مس نی نے ہر روز جانا شروع کر دیا۔ اور وہ محسوس کرنے لگی کہ آخر اُس نے اُن لوگوں کو پا ہی لیا۔ جن کی اُسے مدت سے تلاش تھی۔ اب وہ کام بھی کرتی تھی۔ اُسے اکثر باقی عورتوں سے ملکر باہر جانا پڑتا تھا۔ جہاں کہ وہ بائیبل بیچتی تھی۔ اور اکثر ان عورتوں کو وعظ بھی کرنا پڑتا تھا۔ اور ایکدن جب کہ گرجا میں بارہ تیرہ عورتیں اکٹھی ہوئی تھیں تو مشنری نے مس نی کو دعا پڑھنے کے لئے کہا۔ مس نی جلد اُٹھی وہ اُسوقت برسوں کی غلامی اور بے عزتی اور ماضی کے تلخ واقعات کو بھول گئی اور اُس نے کھڑے ہو کر دعا پڑھی۔

دعا پڑھنے کے بعد مس بی نے ایسا محسوس کیا جیسے زندگی میں اُسے نایاب چیز مل گئی ہے۔ اُس صبح اُس کا دل خوشی سے اُچھل رہا تھا۔

مس بی کو گرجا جاتے ہوئے قریبًا ایک سال ہو چکا تھا۔ وہ اب اِس احساس کمتری کو جس نے اُس کے دل پر پورا تسلط جما لیا تھا۔ کم و بیش بھول چکی تھی۔ اُسے اکثر اپنے کبڑے پن کا احساس رہتا اور بدصورتی کا بھی۔ جس کی وجہ سے اس کے ساتھ کوئی شخص شادی کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ لیکن اب وہ خوش تھی۔ کہ چند عورتوں کے دل میں اُس کی عزت ہے جاہ ہے اور وہ لوگوں کے لئے کام کر رہی ہے۔ اور اُنہیں مدد دے رہی ہے۔

اور جب لڑائی شروع ہوئی تو مس بی نے ہر ممکن طریقہ سے گرجا کے احکام کو بجا لانے کی کوشش کی۔ اُس کے دل میں اُن خوبصورت عورتوں کے لئے حسد نہ تھا جو کھلے بازار میں خاکی سوٹ پہنے ہوئے گھوما کرتی تھیں۔ مس بی سپاہیوں کے لئے کپڑے چھانٹا کرتی اُن کے لئے جُوتے اور جرابیں بناتی اور زخمی سپاہیوں کے لئے پاجامے سیا کرتی۔ اُس کے بعد اُس نے فرسٹ ایڈ کے متعلق لکچر سُنے اور اچھی طرح یاد کیا۔ اور جب پہلا ہوائی حملہ ہوا تو گرجا کے دوسرے ممبروں کے ساتھ مس بی بھی آن پہونچی جہاں کہ ہوائی حملہ سے نقصان ہوا تھا۔ شروع شروع میں مس بی کو کچھ شرم محسوس ہوئی کیونکہ اُسے اس کام میں مہارت نہ تھی لیکن پھر بھی وہ کام کرتی رہی۔ اتنے عرصہ میں کچھ ڈاکٹر اور نرسیں آ گئیں۔ گروپ کے لیڈر نے مس بی کو چائے بنانے کے لئے کہا۔ وہ نہایت خوشی سے چائے بنانے لگی۔ اور کچھ دیر بعد مس بی چائے بانٹتی ہوئی نظر آئی۔ قریبًا گیارہ بجے رات تک مس بی کو کام کرنا پڑا۔

"آج میں جانیں بچائی ہیں" مس بی نے دبی ہوئی آواز میں گھر کی طرف آتے ہوئے کہا۔ یہ احساس اُسکی زندگی میں ایک نیا احساس تھا جو اُس نے پہلی بار محسوس کیا تھا۔ جب گرجا گھر کی ٹیم کو زخمی سپاہیوں کے زخم صاف کرنے کے لئے حکم ملا تو مس بی پہلے کچھ ہچکچائی، اصل میں بات یہ تھی کہ اُسے مردوں سے ڈر لگتا تھا۔ سپاہی عام طور پر سخت جان اور اکھڑ ہوتے ہیں اور مس بی اِس بات سے ڈرتی تھی کہ سپاہی اُس کے کبڑے پن اور اُس کی بھونڈی شکل پر ہنسیں گے۔ اِس خیال کے آتے ہی اُس کے قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔

مس بی کے لئے بہت مشکل تھا کہ وہ غیر مردوں کے جسموں کو ہاتھ لگاتی۔ ٹیم کے لیڈر نے مس بی کے دل کی بات جان لی۔ اور مس بی کو گھر پر رہنے کی اجازت دے دی۔ مس بی تمام دن گھر میں رہی اور کام کرتی رہی لیکن اُسے اپنی کمزوری پر غصہ آ رہا تھا۔

اُس کے چند دن بعد سرکاری طور پر زخمیوں کے لئے طبی امداد بہم پہونچائی گئی۔ شہر زخمی سپاہیوں سے بھرپور تھا۔ بڑے بڑے مندروں اور گرجا گھروں میں سپاہی فرش پر ننگے لیٹے ہوئے تھے مس بی اور اُس کی ٹیم کو ایک ہسپتال سونپا گیا اس ہسپتال میں قریبًا پانچ ہزار زخمی موجود تھے۔ طبی امداد کی خاص ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ ڈاکٹر اور نرسیں جو مشرقی محاذ سے بھاگ کر آ گئے تھے وہ طبی امداد دینے کے لئے کافی تھے۔ اس لئے گرجا گھر کی پارٹی کو سپاہیوں کے لئے سگرٹ اور وعظ کے لئے جانا پڑا۔ مس بی نے انتہائی کش مکش کے بعد فیصلہ کیا کہ وہ ضرور جائے گی۔ تو یہ چند عورتیں مس بی کو ساتھ لیکر سپاہیوں کو آرام اور تسکین دینے کے لئے چل پڑیں۔ یہ عورتیں خاص پڑھی لکھی نہ تھیں، بہت سی عورتوں نے نہایت مشکل سے پڑھنا سیکھا تھا۔ یہ عورتیں ہونہار یا عقلمند نہ تھیں عمر میں کافی بڑی تھیں۔ گو انکے چھوٹے چھوٹے پاؤں جوتوں کے اندر جکڑے ہوئے تھے۔ لیکن اُن کے دلوں میں لوگوں کی خدمت کے لئے ایک بے پناہ جذبہ موجزن تھا۔ گو اِس ملک میں جہاں غربت اور لاچاری اتنی زیادہ ہے کہ انسان بہت جلد اِس غربت اور مفلسی سے مرعوب نہیں ہوتا۔ لیکن پھر بھی یہ عورتیں اپنی غربت اور بے بسی کو بھولتی ہوئی اپنے دل کے اندر سچائی کا بے پناہ جذبہ لئے ہوئے سپاہیوں کی خدمت کے لئے آگے بڑھیں۔ بارش برس رہی تھی اور مشرق سے تیز و تند ہوا چل رہی تھی۔ راستہ میں کیچڑ بھی تھی۔ اور اِس لئے کئی عورتیں چلتے چلتے گر پڑیں۔ اُن کی کتابیں اور سگرٹ بارش سے کافی بوجھل ہو چکے تھے، آخر وہ سب کی سب سپاہیوں کے کیمپ میں پہنچ گئیں۔ جب مس بی کیمپ کے دروازے پر پہونچی تو سپاہیوں کی درد بھری آہوں اور چیخوں نے اسکا استقبال کیا۔ وہ کچھ دیر چپ چاپ کھڑی رہی۔ زخمی سپاہی لیٹے ہوئے تھے۔ قطاروں کی قطاریں۔ لکڑی کی دیواروں کی درزوں سے تیز و تند ہوا اندر آ رہی تھی۔ ہوا میں سڑے اور گلے ہوئے گوشت کی بدبو تھی۔ کئی سپاہیوں نے لحاف اوڑھ رکھا تھا۔ وہ

کئی نے فوجی کمبل اور کئی سپاہی براناٹ کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ سبکے سب اپنی اپنی وردیاں پہنے لیٹے ہوئے تھے۔ اُن کے زخموں سے خون اور پیپ جاری تھی۔ ایک دو جگہ سپاہی ننگے بیٹھے ہوئے تھے۔ کیونکہ بم کے پھٹنے سے اُن کے کپڑے بالکل جل چکے تھے۔ اور اُس وقت اتنے کپڑے میسر نہ تھے کہ سپاہیوں کے جسم ڈھانپنے کے لئے کافی ہوتے۔

جونہی عورتوں نے قدم رکھا۔ انھوں نے اپنا اپنا کام بانٹ لیا۔ مس پی کچھ کتابیں اور سگرٹ لیکر سپاہیوں کی طرف بڑھی۔ مس پی کو یہ تحفہ پیش کرتے ہوئے حیا سی محسوس ہوئی۔ قریب قریب وہ اپنے آپ کو بھول چکی تھی۔ جب اُس کے کانوں میں آواز آئی "کھڑی عورت" مس پی نے سگرٹ کا پیکٹ پیش کیا۔ سپاہی شرم سے پانی پانی ہوگیا۔ اور اُس نے دبی ہوئی آواز میں کہا "شکریہ"۔ ایک اور سپاہی نے اُس سے کتاب لے لی لیکن جلدی زمین پر پھینک دی۔ مس پی نے دیکھا کہ اُس کے گروپ کی تمام عورتیں سپاہیوں سے بات چیت کررہی ہیں۔ صرف وہ ہی اکیلی کھڑی تھی۔ جس سے کوئی انسان بات تک نہ کرتا تھا۔ مس پی چُپ چاپ کھڑی تھی۔ وہ نہیں جانتی کہ وہ ان لوگوں سے کیا بات کرے۔

سپاہیوں کی قطاریں ختم ہوتی دکھائی نہ دیتی تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ جلد یہاں سے چلی جائے۔

تب اُس کی نظر ایک آدمی پر پڑی جس نے اپنا برانڈ کوٹ اپنے کندھوں پر رکھا ہوا تھا۔ اُس کا ایک بازو کٹا ہوا تھا۔ اور دوسرے بازو کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔ سپاہی نے اپنی درد بھری آنکھیں مس پی کے چہرے پر گاڑ دیں۔ مس پی نے سگرٹ کا پیکٹ پیش کیا۔ لیکن سپاہی نے سر کو ہلا دیا۔

'میں سگرٹ پی نہیں سکتا' اس نے کہا۔

'کیا تم پڑھ سکتے ہو'

'نہیں'

مس پی نے قدم آگے رکھا۔ لیکن سپاہی نے پھر بُلا لیا۔

'ٹھیرو' اُس نے کہا 'میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ تم کون ہو؟ تم یہاں کیوں آئی ہو؟'

'ہم آپ لوگوں کو آرام و تسکین دینے آئی ہیں' مس پی نے کہا۔

'آرام' سپاہی نے حقارت کے لہجہ میں کہا 'بھلا میں کیا آرام کرسکتا ہوں۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ جس انسان کا ایک بازو ہو وہ کیا کرسکتا ہے'

مس پی نے سوچا کہ یہ سپاہی گفتگو کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ ٹھیر گئی۔

'تم کہاں زخمی ہوئے تھے'

'سوچو کے باہر۔ اس بات کو تین مہینے ہوگئے ہیں'

'تمہارا گھر کہاں ہے' مس پی نے پوچھا۔

'شانٹنگ۔ لیکن جاپانیوں نے اُس پر قبضہ کرلیا ہے۔ اور مجھے معلوم نہیں کہ میرے بال بچوں کا کیا حشر ہوا۔ ستمبر میں مجھے اطلاع ملی کہ میرا بھائی بم سے مارا گیا ہے۔ پھر اُس کے بعد کوئی خبر نہیں آئی'۔

سپاہی نے اپنی المناک کہانی سُنائی۔ جب وہ ظلم و استبداد کی کہانی سُنا رہا تھا۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی روح اِس نوحہ کو بیان کرتے ہوئے تڑپ رہی ہے۔

"میں چودہ ستمبر کو زخمی ہوا۔ سوچو کے ہسپتال میں ڈاکٹر نے میرا بائیں بازو کاٹ دیا۔ اُس کے بعد جاپانیوں کے آنے کی اطلاع ملی۔ اور ہمیں ہسپتال سے چلے جانے کے لئے کہا گیا۔ کیونکہ جاپانی زخمی سپاہیوں کو بھی گولی سے اُڑا دیتے ہیں۔ ہم سب اسٹیشن پر گئے لیکن میں گاڑی پر نہ چڑھ سکا۔ کیونکہ وہاں بہت زبردست مقابلہ تھا۔ میرا بائیں بازو کٹا ہوا تھا اور دائیں بازو کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔ اُس کے بعد مجھے چالیس میل پیدل جانا پڑا۔ تین دن متواتر سفر کے بعد میں یانگ کاڈ پہونچا۔ وہاں میں ایک ملٹری ہسپتال میں داخل ہوگیا۔ لیکن تین دن کے بعد اطلاع ملی کہ جاپانی فوج آرہی ہے۔ یہ خبر سُنکر ڈاکٹر، نرسیں سب بھاگ پڑے۔ اُن کے پاس لاری تھی اِس لئے وہ اُسی رات فرار ہوگئے اور میں اکیلا رہ گیا۔ اسکے بعد میں دایہو پہونچا۔ اُس ہسپتال کا ڈاکٹر ایک شریف النفس انسان تھا۔ اُس نے میرا دائیں بازو درست کیا، اُس کے بعد میں آن کنگ پہونچا۔ وہاں ایک مہینہ رہا۔ لیکن وہاں پر بھی جاپانیوں نے دھاوا بول دیا۔ وہاں سے فرار ہوکر ہانک کاؤ پہونچا۔ جب کشتی سے اُترے تو حکم ملا کہ ہم سب دریا کے کنارے شاہی حکم کا انتظار کریں لیکن اُس رات ہمیں کوئی اطلاع نہ ملی۔

میرے اردگرد بہت سے آدمی لیٹے ہوئے تھے وہ سردی کو برداشت نہ کر سکے اور راہی ملک عدم ہوئے۔ میرے پاس برانڈ کوٹ تھا اس لئے میں بچ گیا۔ ہانگ کانگ سے اب یہاں آیا ہوں لیکن ڈاکٹر میرے لئے بے سود ہیں۔ وہ مجھے کچھ فائدہ نہیں پہونچا سکتے۔ ڈیو کے ڈاکٹر نے کہا تھا کہ دایاں بازو تب ٹھیک ہو سکتا ہے کہ برقی رو سے اسکا علاج کیا جائے۔ میرا دائیں بازو کتنا سخت ہوتا جا رہا ہے اور دن بدن سکڑ رہا ہے۔ جب ہاتھ بیکار ہو جائیں تو زندہ رہنے سے کیا فائدہ۔ میں فارم میں بھی کام نہیں کر سکتا۔" یہ کہہ کر وہ مس بی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم کیا چاہتے ہو۔ میں تمہارے لئے کیا کر سکتی ہوں" مس بی نے کہا۔

"کچھ نہیں۔ میں خوش ہوں کہ کم از کم تم مہربان ہو لیکن اس زندگی کا کیا فائدہ۔ جب ہاتھ بیکار ہو جائیں"

مس بی کے پاس اس بات کا کیا جواب تھا" مجھے آپ معاف کریں گے" مس بی نے دبی ہوئی آواز میں کہا "مس شنگ مجھے بلا رہی ہیں۔ میں پھر آؤنگی"

اب مس بی ہر روز ہسپتال آیا کرتی۔ اور سپاہیوں کی دکھ بھری کہانیاں سنا کرتی۔ سپاہی اپنا دکھ بیان کرتے لڑائی کا حال سناتے وہ کس طرح زخمی ہوئے اور کہاں رہے اور کہاں ٹھیرے۔ اور پھر مستقبل کے متعلق تشویش کا اظہار کرتے۔

شوبنگ مس بی کا پہلا دوست تھا۔ لیکن مس بی نے اور سپاہیوں کی دکھ بھری کہانیاں سنیں مس بی جس کا مردوں سے بہت کم تعلق رہتا تھا۔ آج اپنے آپکو نئی زمین پر پانے لگی۔ جہاں مرد اس سے بات کرتے تھے۔ جہاں اس کے دل کی آرزو پایۂ تکمیل تک پہونچنے کے لئے راستہ تلاش کر رہی تھی۔ جب کبھی مس بی ایک یا دو دن ہسپتال میں نہ آتی تو اس کے آنے پر سپاہی سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتے اور شوبنگ جو اس کی انتظار میں دن رات ایک کر دیتا تھا۔ جب وہ آتی تو اپنی چمکتی ہوئی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ دیتا۔ جب وہ مس بی سے باتیں کرتا تو اسکے دل کو ایک ہلکا ہلکا آرام ملتا۔ اب وہ مس بی سے سبق لینے لگ گیا تھا۔ اور جو کچھ مس بی کہتی نہایت انہماک سے سنتا۔

وہ اپنے مستقبل سے ڈرتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا "اس زندگی سے کیا فائدہ۔ جب ہاتھ ہی بیکار ہو جائیں"

آہستہ آہستہ مس بی کے سوئے ہوئے سپنے بیدار ہونے لگے۔ یہ وہ ہی خواب تھا جس کے زیر اثر اس نے اپنے ماں باپ کو خیرباد کہا تھا۔ آج مس بی کو اپنا حسین خواب جس کی آرزو میں اس نے عمر کا بیشتر حصہ صرف کیا تھا۔ پایۂ تکمیل تک پہونچتا ہوا معلوم ہوا۔ کیوں نہ ہو وہ عصر جدید کی عورت ہے۔ وہ شوبنگ کو اپنے گھر لے جائیگی۔ وہ اس کی خدمت کرے گی۔ اور اگر شوبنگ نے شادی کے لئے درخواست کی تو وہ شادی کریگی۔ اس کے ماں باپ نے تو اب اس سے دور مغرب کی طرف گھر لے لیا تھا۔ اس لئے مس بی کو اپنے ماں باپ کی رضامندی کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اس نے خیال کیا کہ کہیں گرجا کی عورتیں اسکے اقدام سے بدنام نہ ہو جائیں۔ اور پھر مس شنگ نے اسے کئی بار تنبیہہ بھی کی تھی کہ وہ ہر روز کیمپ میں نہ جایا کرے لیکن مس بی نے اب فیصلہ کر لیا کہ وہ ان باتوں کے متعلق پرواہ نہ کرے گی اور جو اس کے جی میں آئیگا وہ کرے گی۔

مس بی نے اب تک شاہو کو اس راز سے آشنا نہ کیا تھا۔ مس بی نے سوچا کہ جب شاہو اچھا ہو جائیگا اور ہسپتال سے اسے چھٹی مل جائے گی تو پھر شاہو سے یہ تمام قصہ بیان کر دے گی۔ وہ جانتی تھی بلکہ اسے کامل یقین تھا کہ وہ اس کی بات مان جائے گا۔ شاہو کو بیس۲ ڈالر سے زیادہ انعام نہ مل سکے گا۔ اور پھر بیس۲ ڈالر دوں سے اس کے لئے بہت مشکل ہو جائیگا کہ وہ واپس گھر جا سکے اور دوبارہ گھر آباد کر سکے۔ مس بی نے آئندہ آنے والی زندگی کے متعلق مختلف نقشے بنائے۔ ہاں وہ اس کے بستر پر سو سکتا ہے۔ وہ خود اور کوئی بستر خریدیگی۔ اور صبح سویرے اٹھ کر کام کاج کریگی۔

ایک دن مس بی شاہو کو اپنے دل کی بات بتانے چلی گئی۔ وہ سن چکی تھی کہ کچھ زخمی سپاہیوں کو خارج کر دیا جائے گا۔ آج مس بی نے تمام گھر کو اچھی طرح صاف کیا کیونکہ آج اسکے مہمان کو آنا تھا۔ اس نے ایک نیا لحاف خرید لیا۔ کچھ سگرٹ کے پیکٹ اور اپنے تمام کپڑے اس نے کمرے سے نکال لئے جہاں کہ

اُس کے بیمان کو ٹھیرنا تھا۔ اُمنگوں کو سینے تلے دبائے وہ کیمپ کیطرف روانہ ہوگئی۔ آج وہ اپنے دل کا راز طشت از بام کردیگی۔ اور پھر.... اس کے بعد......

جونہی وہ گھبرائی سی شاہو کے بستر کے قریب پہونچی تو اُسے معلوم ہوا کہ شاہو کی جگہ ایک اور سپاہی نے لے لی ہے۔

"ہیلو" اگلے بستر پہ لیٹے ہوئے سپاہی نے کہا "شاہو آج صبح چلا گیا۔ بات یہ ہے کہ لڑائی کے محاذ سے بہت سے زخمی سپاہی اور آ رہے ہیں۔ اِس لئے جو مریض تندرست ہو چکے ہیں اُنہیں باہر بھیجا جا رہا ہے۔"

مس بی کے حلق میں روڑا سا اٹکتا ہوا معلوم ہوا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کے قلب کی حرکت بند ہوگئی ہے۔

"کیا تم جانتے ہو کہ شاہو کہاں گیا ہے؟"

"کوئی بھی نہیں جانتا۔"

"کیا اُس نے میرے لئے آپ سے کچھ کہا؟"

"کچھ نہیں۔ شاہو کو آج حکم ملا کہ وہ چلا جائے اور وہ آج ہی لاری پر سوار ہو کر چلا گیا۔" مس بی نے سوچا شاید شاہو اُسے خط لکھے۔ لیکن اُس کا دل کہتا تھا کہ شاہو اُسے خط نہیں لکھے گا۔ وہ تو لکھنا ہی نہیں جانتا اور چینی کسان ڈاکخانہ والوں پر بہت کم اعتبار کرتا ہے۔ صرف ایک ہی شعاع اُمید تھی اور وہ یہ کہ جب وہ مکمل طور پر راضی ہو جائے گا تو وہ خود بخود اُسکے پاس چلا آئیگا۔ لیکن وہ کیوں آئیگا؟ اُسے پھر خیال آتا۔ اُس نے شاہو سے کبھی اپنی دل کی تمنا کا اظہار تک نہ کیا تھا۔ مس بی نے اپنے دل کی حالت سے شاہو کو کبھی آگاہ نہ کیا تھا اور شاہو کو کیا پتہ تھا کہ وہ کب کی اپنی زندگی کی کشتی اُس کے ساتھ باندھ چکی ہے۔ شاہو کو کیا معلوم تھا کہ اُسکی میٹھی میٹھی باتیں اُس بُڈھی کنواری عورت کیلئے کیا قیمت رکھتی ہیں۔ اور اُسے کیسے پتہ لگ سکتا تھا کہ مس بی نے اپنے ارمانوں کی دنیا میں شاہو کو اپنا بادشاہ تسلیم کرلیا تھا۔ وہ اُس سے دور تھا بہت دور.... میلوں دُور، جہاں نہ خط جا سکتا تھا اور نہ کوئی پیغام۔

مس بی آجکل بھی کام کرتی ہے۔ لیکن میں محسوس کرتی ہوں کہ اُس کا دل کام میں نہیں لگتا۔ اُسکی روح نے پہلی بار کروٹ لی تھی۔ لیکن شاہو کے اچانک چلے جانے پر اُسکی روح اُداس اور مہجور ہوکر رہ گئی۔

احساسِ محبت

جب ہوتی ہے آشفتگیٔ حُسن و محبّت
ڈھل جاتی ہے خود پیکرِ ہستی میں شرافت
جب ہاتھ سے ملتا ہے کوئی صبر شکن ہاتھ
اور گرمیٔ خوں دیتی ہے پیغامِ جراحت
جب آنکھ سے لڑتی ہے کوئی سحر طراز آنکھ
اور دیتی ہے دل کو نگہِ ناز نرمیت
احساسِ محبّت سے پھڑک کر لبِ رنگیں
چھلکاتے ہیں محبوب تبسّم کی لطافت
یوں دانتوں سے دب جاتا ہے آکر لبِ زیریں
جیسے نگہِ ناز بہ ایمائے ندامت
بن جاتی ہے خود چینِ جبیں موجِ تبسّم
پیشانیٔ خنداں سے ٹپکتی ہے شرافت

کیوں سج کے چمکتی ہوئی آئی شبِ مہتاب
کیوں سینۂ فطرت میں ہے احساسِ لطافت
کیوں محفلِ گل میں کوئی ہنگامہ ہے برپا
کیوں بادِ بہار آئی اُڑاتی ہوئی نزہت
کیوں جھک کے ملیں مل کے جھکیں خود ہی نگاہیں
کیوں رنگِ تغافل میں ہے نیرنگِ محبّت
جاتا ہے کوئی کیوں نگہِ شوق سے بچ کر
ہوتی ہے بپا خاطرِ محزوں میں قیامت
مُنہ پھیر کے کیوں دیکھتا جاتا ہے کوئی شوخ
جیسے کہ حیاتِ ابدی سوئے قیامت
فرحت ہے یہ بیچارگیٔ شورشِ ارماں
اک صرف تجاہل کہ ہے احساسِ محبّت

اندھیرا

آنکھیں چڑھی چڑھی، چہرہ سُرخ سُرخ، سانس تیز تیز، اُس نے محسوس کیا کہ زیادہ ٹہلنا اچھا نہیں۔ وہ سُوئچ بورڈ کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ ٹیبل لیمپ کی کمزور نیلی روشنی کمرے کی سفید دیواروں پر اُمید اور بیم کی تصویریں بنا رہی تھی۔ اُس کی بے چین آنکھوں نے کلاک سے غمگساری کی درخواست کی۔

دو بج گئے۔

"وہ کیوں نہیں آئے؟"

اِس سوال کا جواب صرف آدھی رات کی خاموشی دے سکتی تھی۔

ٹِک ـــــ ٹاک۔ کلاک کی ایک ٹِک دوسری ٹِک سے کتنی دور تھی۔ زندگی کا دریا کتنا بے کیف، کتنا ساکن، کتنا سست تھا یکایک اُس نے محسوس کیا جیسے زمین کی گردش بند ہونیوالی ہے۔ وہ لرز گئی۔ اُس نے اضطراب کے ساتھ لیمپ بُجھا دیا۔

اب وہاں اندھیرا تھا۔ وہ اندھیرے میں تھی۔

تاروں کی مدھم روشنی ڈرتی ڈرتی اندر آئی اور اُس سے کہنے لگی "تمہارے چہرے پر غم ہے یا غصہ؟"

خاموش اور مضمحل، وہ اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئی۔

نیند کہاں!

اُس کا ماضی کتنا شاندار تھا جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ اسکول کو جایا کرتی تھی۔ وہ حسین رنگوں کے طوفان میں سب سے زیادہ حسین موج معلوم ہوتی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف طوفان میں بہہ جانے کی تمنا رکھنے والے ہزاروں دل آنکھیں بن کر رہ جاتے تھے۔ انتخاب کی بے قرار نظریں سب سے زیادہ اُبھری ہوئی رنگین موج پر پڑتی تھیں۔ کامیابی کا یہ احساس اُس کو اور بھی زیادہ حسین بنا دیتا تھا۔ اور جب کبھی اُس کو اپنے حُسن سے لذت اندوز ہونے کا خیال آتا تھا تو وہ اپنی سہیلیوں سے مخاطب ہو کر کہا کرتی تھی: "دیکھو تو یہ نامراد لڑکے کیسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں۔" وہ یکزبان ہو کر کہتی تھیں "تم ہو بھی تو دیکھنے کی چیز۔ ہمیں تو کوئی نہیں دیکھتا۔" وہ مسرت آمیز شوخی سے کسی ایک لڑکی کے رُخسار پر ہلکا سا طمانچہ مارتی تھی۔ اِس ہلکی سی ضرب نے کتنے دلوں کو زخمی کر دیا ہوگا، وہ یہ بھی جانتی تھی۔

منوہر اپنے زخمی دل کو لے کر راستے پر پڑا رہتا تھا۔ وہ میڈیکل کالج کا سٹوڈنٹ تھا۔ اُس کے مطالعہ کے کمرے کا ایک دروازہ سڑک پر کھلتا تھا۔ سکول جانے والی لڑکیاں اُس کے دروازے کے آگے سے گذرتی تھیں۔ جب تک ان لڑکیوں میں وہ اُس کو نہیں دیکھ لیتا تھا۔ اُس کو چین نہیں آتا تھا۔ وہ حسین غرور کے دلکش انداز کے ساتھ اُس کے سامنے سے گذر جاتی تھی۔ اُس دن اتفاق سے وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ منوہر رندانہ جرأت پر آمادہ ہوگیا۔ اُس کے دوپٹے کے گھسٹتے ہوئے کونے پر پاؤں رکھ دیا۔ اُس کے سر نے پیچھے کی طرف ایک جھٹکا محسوس کیا۔۔۔ وہ انتہائی تندی کے ساتھ پلٹی۔ اپنے دائیں بازو کی پوری جنبش کے ساتھ منوہر کے منہ پر طمانچہ مارا۔

بیچارہ منوہر بدصورت تھا۔

اُس نے ایک تلخ احساس کے ساتھ بستر پر کروٹ لی۔ گویا وہ منوہر کو اپنے ماضی میں جگہ دینا نہیں چاہتی تھی۔

آخر وہ وقت بھی آگیا، جب اُس کی سب سہیلیوں نے اُس کو مبارکباد دی۔ اُس کی منگنی شہر کے سب سے زیادہ امیر اور ٹینس کے سب سے زیادہ خوبصورت کھلاڑی سے ہوگئی۔ جب وہ ایم۔ اے میں تھا، پنجاب نے اُس کو ٹینس کا چیمپین تسلیم کر لیا تھا۔ انگلستان میں بیرسٹری کے مطالعہ کے دنوں میں وہ امریکہ کے چیمپین سے معمولی مارجن سے ہارا تھا۔ انگلستان سے واپس آکر اُس نے اپنی توجہ پریکٹس کی بجائے ٹینس پر مرکوز کر دی تھی۔ اب وہ ہندوستان میں بیرسٹر کی حیثیت سے مشہور نہیں ٹینس کے کھلاڑی کی حیثیت سے مشہور ہے۔

اِس نے اُس کو شادی سے پہلے صرف دو دفعہ دیکھا تھا۔ ایک دفعہ کالج ہال میں تقریر کرتے ہوئے۔ دوسری دفعہ پنجاب چیمپین شپ کے فائنل میں ٹینس کھیلتے ہوئے۔ منگنی کے بعد اس کی ایک تصویر اِس کے پاس اور اِس کی تصویر اُس کے پاس پہنچ گئی۔ اِس وقت وہ کتنی خوش تھی۔ وہ اس کو پسند کرتا تھا شادی سے پہلے اُس نے اِسکو چار خط شیکسپیئر کے آتشیں انداز میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد لکھے تھے۔ وہ اب بھی اُس کے پاس کسی دراز میں پڑے ہیں۔ نہیں

خطوں میں سے ایک خط اُس کو اُس دن ملا تھا جس دن اُس نے منوہر کے مُنہ پر طمانچہ مارا تھا۔

اِس خیال نے اُس کو تڑپا دیا۔ اُس نے بے قراری سے کروٹ بدلی۔ جسم میں درد محسوس ہوا۔ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اُس نے آدھی رات کی خاموشی سے پھر پوچھا، "وہ کیوں نہیں آتے؟"

اور رات کی خاموشی جیسے اِس روزمرہ کے سوال سے تنگ آ گئی ہے۔

وہ اور بھی زیادہ بے قرار ہو گئی۔

"پھر وہ مجھے شادی سے پہلے محبت بھرے خط کیوں لکھتے تھے؟"

اِس کا جواب پریشانی تھی، مایوسی تھی، نامرادی تھی۔

وہ پھر اُٹھ کر ٹہلنے لگی۔

یکایک باہر سے کار کی آواز آئی۔ اُس نے ٹیبل لمپ کا نیلا بلب پھر روشن کر دیا۔

دروازہ آہستہ سے کھلا۔ وہ اندر آ گئے۔

"تم سوئی نہیں ابھی تک؟"

"نیند نہیں آتی۔"

"نیند کی گولیاں جو تھیں تمہارے پاس۔"

"میں جاگنا چاہتی تھی۔"

"کیوں؟"

"تم جانتے ہو۔"

"لیکن میں نے تمہیں ہزار دفعہ کہا ہے کہ تم میرا انتظار نہ کیا کرو۔ تم بیمار ہو جاؤ گی۔"

"اور اگر میں بیمار ہو جاؤں تو؟"

"خیر بیمار تو سبھی ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی — یہ ہے نا — کہ — تمہیں۔ مثلاً کوئی ملیریا یا ڈیلیریا ہو جائے۔"

"پھر تمہیں کیا پروا؟"

"واہ! لوگ کہیں گے نہیں کہ فلاں بیرسٹر کی بیوی ہمیشہ بیمار رہتی ہے۔"

"بس اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں؟"

"اِس سے آگے سب حماقت ہے۔"

وہ نڈھال ہو کر بستر پر دراز ہو گئی۔ اُس کے جذبات میں ایک غیر معمولی شگاف ہو گیا۔ بیرسٹر کپڑے اُتار چکا تھا۔ اُس نے محسوس کیا، گفتگو ختم ہو گئی ہے۔ وہ بستر پر جانے سے پہلے ایک سگرٹ سے لطف اندوز ہونے کے لئے ایک آرام کرسی پر دراز ہو گیا۔ اُس نے اپنی بیوی کے اور اپنے درمیان دھوئیں کا ایک پردہ قائم کر لیا۔

"سو گئیں؟"

"نہیں۔"

"چُپ چُپ کیوں ہو؟"

"سوچتی ہوں کہ تمہارا دیر تک انتظار کرنے سے اگر میں بیمار ہو جاؤں تو تم کو کچھ پروا نہیں۔ لیکن اگر تم اتنی رات گئے تک روزانہ جاگ جاگ کر بیمار ہو جاؤ، تو مجھے تکلیف کیوں ہوتی ہے؟"

"تم بیوقوف ہو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں صبح کو دس بجے اُٹھتا ہوں۔ عدالت میں سب سے بڑا کام یہ کرتا ہوں کہ ۳۰ منٹ تک اخبار پڑھتا ہوں۔ پھر نیند آ جاتی ہے۔ آرام کرسی پر چار چار گھنٹے سویا رہتا ہوں۔ چوبیس گھنٹے میں بارہ گھنٹے سونے والے کو بیماری کہاں؟"

"تم سنگدل ہو۔"

"یہ سنگدلی میری صحت کا سب سے بڑا راز ہے۔"

اطمینان نہیں۔ سکون نہیں۔ بیرسٹر کا ایک ایک لفظ اُس کے نازک دل میں تیر بن بن کر اُتر رہا تھا۔ وہ رات کی تاریکی کی طرح خاموش ہو گئی۔ آنکھیں جذبات کی افتاد کے ساتھ ساتھ بوجھل ہونے لگیں۔ مُردہ مُردے سے بھی بدتر۔

بیرسٹر کے دھوئیں کے پردے اور زیادہ گہرے ہو گئے۔

ایک دفعہ پھر اُس نے اُن پردوں میں سے جھانکنے کی کوشش کی۔

"ظہور! تم مجھے پسند نہیں کرتے؟"

"کرتا ہوں۔"

"پھر یہ بے رُخی جیسی کیا ہے؟"

"کیا تمہارا مطلب ہے کہ میں تم سے ترشروئی سے پیش آتا ہوں؟"

"ترشرو تو تم کسی سے بھی نہیں ہوتے۔"

"ہونا بھی نہیں چاہیئے۔"

"لیکن میں تو اِس سے زیادہ کچھ اور چاہتی ہوں۔"

"کیا؟"

"محبت؟"

اُس کے قہقہے سے اُس کے اردگرد کا دھواں رفع ہو گیا۔

اُس نے سگرٹ کو ایش ٹرے میں بجھاتے ہوئے کہا:۔

"محبّت؟ ـــــ وہ محبت جس نے قیس کو دیوانہ بنادیا؟۔ وہ محبّت جس نے فرہاد کو تیشے سے ہلاک کردیا؟ ـــــ وہ محبّت جو عاشق کو محبوب کے آستانے پر جبیں سائی کے لئے مجبور کرتی ہے بلکہ ـــــ وہ محبّت جو زخمی دل کو آنکھ کے راستے سے خون بناکر محبوب کے پیروں میں بکھیر دیتی ہے؟ ـــــ وہ محبّت جس کے کشتے اپنے آپ کو زندہ ہی زمین میں دفن کرلیتے ہیں اور پھر اندر سے محبوب کو پکار پکار کر کہتے ہیں کہ آ اور میری تربت کو ہموار کردے ـــــ نہیں، نہیں۔ اس قسم کی محبّت مجھ سے ناممکن ہے۔ میں تو زندگی کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے بہت بہتر سمجھتا ہوں۔ ایک حکیم نے مجھے بتایا تھا کہ سونا صحت کے لئے بہت اچھا ہے۔ اس لئے اب میں عدالت میں بھی سویا رہتا ہوں۔ دیکھو میں تمہیں ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ تمہیں اس قسم کی محبّت کی بہت تمنّا ہے۔ کل شام کو بن سنور کر دریچے میں سے جگر کو نظر آجانا پھر دیکھنا وہ حضرت سٹیج پر آکر کیا کیا اپنے بال نوچتے ہیں! کس کس طرح اپنے گریبان کی دھجیاں اُڑاتے ہیں! کیسے کیسے خون کے آنسو بہاکر ٹائلوں کے قیمتی فرش کو گندہ کرتے ہیں! اور لوگ تو ایسے پاگلوں کو دیکھ کر خوش ہوا ہی کرتے ہیں ـــــ"

"لیکن جگر ایک انسان ہے۔ تم بھی ایک انسان ہو۔ پھر ـــ"

نہیں، نہیں، نہیں۔ بہت فرق ہے"

"کیا؟"

"وہ ایک بدصورت انسان ہے میں ایک خوبصورت انسان ہوں"

"تو کیا ہوا!"

"بدصورت آدمی محبت کرتا ہے۔ خوبصورت آدمی کو محبّت کرنے کی ضرورت نہیں"

"یعنی تم مجھ سے محبّت نہیں کرتے!"

"کیا تم مجھ سے محبّت کرتی ہو؟"

"ہاں!"

"پھر مجھے تمہارے عشق کے گیت گانے کی کیا ضرورت ہے۔ اُردو کی بیشتر شاعری عورت کے عشق میں نہیں کی جاتی۔ بلکہ عورت کو عشق پر آمادہ کرنے کے لئے کی جاتی ہے۔ عورت میں عشق کا جذبات پہلے ہی موجود ہوتے ہیں۔ ان جذبات کو ہیجان میں لانے کے لئے آدمی کا سب سے بڑا حربہ اُس کی قبول صُورتی ہے، قبول صُورتی سے عورت کے دل میں جو محبت بیدار ہوجاتی ہے، وہ زیادہ پائیدار، زیادہ لطیف اور زیادہ مسرّت انگیز ہوتی ہے۔ لیکن اگر آدمی قبول صورتی سے محروم ہو تو وہ عورت کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے ایک ذلیل حربے سے کام لیتا ہے، اُس کا نام خوشامد ہے۔ اور چونکہ قبول صورتی ایک نایاب چیز ہے۔ اور دُنیا میں شاعروں کی تعداد غیر محدود اس لئے بیشتر شاعر بدصورت ہوتے ہیں اور اُن کی شخصیت میں جتنی مقدار بدصورتی کی ہوتی ہے، اُن کی خوشامد میں اتنی ہی مقدار خوبصورتی کی پیدا ہوجاتی ہے۔ بدصورت شاعر خوبصورت خوشامد سے اپنی شخصی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور وہ اِس چیز میں جتنا زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ اتنا ہی بڑا شاعر اُس کو تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس نوع کے شاعروں میں سے اکثر ایسے بھی ہوتے ہیں جنہوں نے اپنی تمام عمر میں کسی محبوب کی شکل نہیں دیکھی ہوتی۔ وہ میرؔ۔ غالبؔ یا داغؔ کے دیوانوں سے اُن کے محبوبوں کو کھینچ نکالتے ہیں۔ اور اپنے تخیّل کے مندر میں بٹھاکر اُس کی پوجا شروع کردیتے ہیں۔ میں بھی شروع شروع میں اس قسم کی نقب زنی پر مائل تھا۔ اور ایک محبوب کو اُس کی چلمنوں میں سے باہر کھینچ لانے میں کامیاب بھی ہوگیا تھا۔ میں نے اُس کو باہر اپنے تخیل کی دھوپ میں رکھ دیا۔ لیکن اس کی طرف انتہائی غور سے دیکھنے کے بعد بھی میں پہچان نہ سکا کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ تنگ آکر میں نے اُس کو پھر کاغذوں کے پلندوں کے نیچے دبا دیا۔ اُس کے تھوڑے عرصے بعد مجھے معلوم ہوگیا کہ عورتوں کو مسخر کرنے کے آرٹ میں میں آدمیوں کی پہلی قسم سے تعلق رکھتا ہوں۔ اِس انکشاف نے مجھے جذبات کے بلیک کے خلاف انجکشن دے دیا۔ اور میں شاعری سے بالاتر ہوگیا۔ میں خوش ہوں"

"لیکن شاید تمہیں یاد نہیں کہ شادی سے پہلے تم نے بھی مجھے چار انتہائی جذباتی خط لکھے ہیں"

اُس وقت تمہاری منگنی میرے ساتھ ہوچکی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ تمہاری شادی بہرکیف مجھ سے ہوہی جائے گی ـــ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ منگنی سے پہلے تم مجھے دو دفعہ دیکھ بھی چکی ہو۔ اور میرا جادو تم پر اپنا کام کرچکا ہوگا، اس صورت میں۔ مجھے محبّت کے خطوط لکھنے کی چنداں ضرورت نہ تھی، جہاں تک محبّت کا تعلق ہے۔ میں تم سے اتنی محبّت نہیں کرتا تھا، جتنی محبّت میڈیکل کالج کے

اُس لڑکی کو تم سے تھی، جس کا نام منوبر تھا۔ اور جس کو اپنی گہری محبت کے اظہار کے قصد پر تم نے ایک طمانچہ مارا تھا۔ دراصل اُن دنوں مجھے بی۔اے کا امتحان دینا تھا۔ اور شیکسپیئر کو یاد کرنے کا بہترین طریقہ شیکسپیئر کے سٹائل میں لکھنے کی مشق کرنا ہے۔ جب میں نے اُن خطوط کا سلسلہ شروع کیا تھا اُس وقت مجھے اُن خطوط کے لئے تم سے بہتر مخاطب نہیں ملا۔ سکولوں اور کالجوں کے لڑکے اکثر ایسا کرتے ہیں۔ بیکاری کے بادل چھائے ہوئے ہوں، تو گندم کے بخارات سر کو چڑھ جاتے ہیں۔ اس جنونی سی کیفیت میں کئی کئی غزلیں ہو جاتی ہیں۔ اور اگر دائیں طرف کے ہمسائے کی لڑکی پاس سے گذرتی ہوئی دبی زبان میں کہہ دے۔ تم بہت اچھا لکھتے ہو، تو کہتے ہیں۔ تمہارے عشق نے سب کچھ سکھا دیا۔ تھوڑی دیر بعد بائیں طرف کے ہمسائے کی لڑکی پاس سے گذرتی ہوئی آہستہ سے کہتی ہے: تمہارے شعر وجد آفریں ہیں، تو جواب دیتے ہیں: تمہارے حُسن سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں۔ میں نے بھی وہ خطوط..... کے نام کے عنوان سے ایک میگزین میں شائع کراوئے تھے۔ اُس کے تھوڑے عرصے کے بعد مجھ سے میری کلاس کی چار لڑکیوں نے پیچھے بعد دیگرے علیحدگی میں پوچھا: وہ خطوط تم نے کس کے نام لکھے ہیں۔ میں نے ہر ایک کو جواب دیا: تمہارے نام۔"

"یعنی تم سے بہت لڑکیاں محبت کرتی تھیں؟"

"ہاں۔"

"حسین لڑکیاں؟"

"ہاں۔"

"پھر تم نے میرے ساتھ شادی کرنا ضروری کیوں سمجھا۔"

"تمہاری شادی کی شرطوں میں سب سے زیادہ دلکش شرط یہ تھی کہ تمہارے والد کی وفات کے بعد تمہارا خاوند اُس کی جائداد کا مالک ہو گا۔ کیونکہ تم اپنے ماں باپ کی واحد وارث ہو۔"

"بڑے خود غرض ہو۔"

"کیا تمہارا مطلب ہے کہ اگر میں تمہارے ساتھ تمہاری دولت کی وجہ سے شادی نہ کرتا، بلکہ تمہارے حُسن سے متاثر ہو کر تم کو اپنا بنانے کی کوشش کرتا، تو یہ خود غرضی نہ ہوتی؟ خود غرضی انسانی زندگی کا ایک نہایت ضروری جزو ہے، حقیقت یہ ہے کہ لوگ جس کو انسانی کردار کی خوبیاں کہتے ہیں، وہ انسانی کوشش کی گمراہیاں ہیں۔ غیر فطری تصنع کا وہ ارتقا جس کو انسان بڑے فخر کے ساتھ تہذیب کہتا ہے۔ انسان کو اپنے حقیقی راستے سے ہٹانے کی غلط کوشش ہے۔ انسان ایک جانور ہے۔ بالکل دوسرے جانوروں کی طرح! لڑنے والا۔ دوسروں کی چیزیں چھین کر کھا جانے والا، کمزور جانداروں کو موقعہ پا کر ہڑپ کر لینے والا۔ اپنے رقیب کی ہستی کو نابود کرنے کی تمنا رکھنے والا۔ اسی بنیادی کشمکش کا نام زندگی ہے۔ ایسے بھی پیدا ہوئے جن کو زندگی کے سمندر میں طوفان کی یہ ہنگامہ خیزیاں پسند نہ آئیں۔ وہ اپنے آپ کو بنی آدم کا بے غرض خیرخواہ کہتے تھے۔ انہوں نے موجوں میں جمود کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ تیر بہت دیر تک ایک ہنٹر کے ہنٹر کے ڈر سے اپنی خو سے دست بردار رہا۔ لیکن زمانے نے ہنٹر کو کمزور کر دیا۔ اور انسانیت اپنی فطرت پر لوٹ آئی۔ انسان خود غرض ہے اور خود غرضی کا یہ احساس اسکو زندہ رہنے کیلئے ایک بے پناہ قوت سے آراستہ رکھتا ہے۔"

"تم زندہ رہو چاہے کوئی دوسرا تمہارے پاس تڑپ تڑپ کر مر جائے۔"

"انگلستان کے قیام کے دوران میں مجھے بہت سی کلبوں کا تجربہ ہوا۔ ان کلبوں میں سب سے زیادہ دلچسپ وہ کلب تھی جو جذبات کے خلاف جہاد کی تلقین کرتی تھی۔ اُس کلب کی بنیاد ۱۸۳۹ء میں کیلیفورنیا کے ایک شخص نے ڈالی تھی۔ وہ اب بھی زندہ ہے۔ اُس کی عمر ۱۲۱ سال ہے۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مرنے والوں کی تفصیل یہ ہے۔ اُس کی ۱۱۰ بیویاں، ۱۹ بیٹے، ۴ بیٹیاں پوتے پوتیاں نواسے نواسیاں ۵۴۔ اُن کی آگے چلی ہوئی شاخیں ۷۶ وہ بڑے فخر کے ساتھ کہتا ہے کہ سوائے ایک منحوس موقع کے ان تمام عزیزوں کی موتوں پر اُس نے کبھی اپنے قیمتی آنسو ضائع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور وہ منحوس موقع جبکہ اُس کے بے بہا آنسوؤں کے دو قطرے خاک میں مل کر ضائع ہو گئے، واقعی ایک بڑا جانکاہ واقعہ تھا۔ اُس کی پیاری لومڑی جو تقریباً چھ سال سے اُس کے غموں اور خوشیوں میں شریک تھی، مر گئی تھی۔ وہ بتاتا ہے کہ اُس کی اتنی لمبی عمر اور ایسی شاندار صحت کا راز اُس کی جذبات پر فتحیابی میں ہے۔ میں اُس کلب کا ممبر ہوں۔"

"یعنی سنگدل اور باقاعدگی کے ساتھ سنگدل!"

اُس کی آواز گرتی جا رہی ہے، اُس کا دل ڈوبتا جا رہا ہے اُس کی آنکھیں چڑھتی جا رہی ہیں، اُس کا چہرہ زیادہ تمتماتا جا رہا ہے اُس کے بال زیادہ پریشان ہوتے جا رہے ہیں، اب وہ بار بار

گردش پہیے سے بھی تنگ آگئی ہے۔ چارپائی کے اس طرف کے تنائے پر اپنی دائیں پسلی کے بل ساکن پڑی ہے۔ بائیں ہاتھ کی مٹھی بستر پر اُس کی ٹھوڑی کو اُٹھائے ہوئے ہے۔ اس طرح سے اُس کے دانت بھنچ گئے ہیں۔ اور وہ بولتے ہوئے بھی اپنے بھینچے ہوئے دانتوں کو کھولنے کی پرواہ نہیں کرتی۔ ایک معمولی سی ٹھوکر اُس کو چارپائی سے نیچے گرا سکتی ہے۔ ایک بے جان مجسمہ!

اُس کے انداز میں بے پروائی ہے۔ وہ آرام کرسی کے بازوؤں کو کھول کر اُس پر اپنی ٹانگیں پھیلائے ہوئے اور دونوں ہاتھوں سے بنک کے اوپر والے تنائے کو پکڑے ہوئے بیٹھا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں نیند کا خمار ہے۔

"آخر یہ زندگی ہے کیا؟ دل کے پردوں کا اسقدر نازک ہونا کہ اگر اُس پر شبنم کا ایک چھوٹا سا قطرہ بھی گر جائے تو وہ جھکا کے اپنی کمزوری کا ثبوت بہم پہنچائیں۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایسے ناپائیدار پردے کسی بڑے صدمے کے بھاری قدموں کو کیوں کر برداشت کرسکتے ہیں۔ اور اگر انسان میں اپنے ماحول کا مقابلہ کرنے کی ہمت موجود نہیں، تو زمین کے لئے اُس منحوس ہستی کا بوجھ شرم کا باعث ہے یا نہیں؟ صدموں سے بچنے کا علاج صدموں کے لئے تیار رہنا ہے۔ صدموں کے لئے تیار رہنے والے موت سے نفرت کرتے ہیں اور زندگی سے محبت رکھتے ہیں۔"

"ایسے بھی تو ہیں جو موت سے محبت رکھتے ہیں۔"

"اُن کو میری طلب میں شامل ہوجانا چاہیئے۔"

"ظہور! تمہاری باتیں میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی ہیں!"

"آج شام کو مسز کھنہ شام نے بھی یہی کہا تھا۔ سب عورتیں مجھے یہی کہتی ہیں۔ میں نے اُن کو بہت دفعہ سمجھایا ہے کہ دل کے ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوسکتے۔ اگر دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں تو خون اِدھر اُدھر بکھر جائے اور انسان مر جائے۔"

"مسز کھنہ شام!"

"وہ جو کل دوپہر کے وقت یہاں آئی تھی۔"

"تو آج کی شام اُس کے ساتھ گذری؟"

"ہاں وہ کل یہی کہنے آئی تھی۔ وہ میرے ساتھ ٹینس کھیلنے کے لئے بے قرار تھی۔ ٹینس کے بعد کھانا اور کھانے کے بعد سینما میں دیر ہوگئی۔"

"لیکن تم تو کل اُس کے منہ پر ہی کہہ رہے تھے کہ میں اُس سے زیادہ خوبصورت ہوں۔"

"م! تم بہت خوبصورت ہو۔ اُن میں سے کوئی بھی تم سے زیادہ حسین نہیں۔ مسز کھنہ شام، مس طاہرہ طیب جی، مسز غفار کی چھوٹی بہن، مسز پرتاپ تیواری، پنجاب نیشنل بنک کی سٹینوٹائپسٹ، مس رُوبی، پرنسپل آنند ساگر کی دوسری شادی کی بیوی، ہمارے صوبے کے پرائم منسٹر کی نئی آیا۔ یہ سب حُسن میں تمہارا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔"

اُس میں جیسے جان سی پڑ گئی۔ وہ ایک مضمحل جنبش کے ساتھ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس کے لبوں پر ایک کمزور مسرت کا تبسم پیدا ہوا۔ اُس نے ایک لمحہ تک گڑی ہوئی نظروں کے ساتھ اپنے خاوند پر جذباتی تبدیلیوں کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی۔ اُس کو حیرت انگیز مایوسی کا سامنا ہوا۔ وہ اونگھ رہا تھا۔

اُس نے اُس کو جگانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "کیا میں حسین ہوں؟"

وہ چونک اُٹھا۔ اور لڑکھڑائی ہوئی آواز میں بولا۔ "ہیں؟ ہاں۔"

"میں پوچھتی ہوں کیا میں حسین ہوں؟"

"ہاں! ہاں!"

"مجھے کیسے معلوم ہو کہ تم سچ کہتے ہو؟"

"آدھا گھنٹہ ہوا، میں نیند سے پریشان ہوں اور پھر بھی تم سے باتیں کر رہا ہوں۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ تم خوبصورت ہو؟"

"ایسی خوبصورتی کو آگ لگے جو تم پر اتنا اثر بھی نہ کرسکے کہ تمہاری نیند اُڑ جائے اور میں تم سے ......"

"ہیں؟ کیا کہا؟ نیند اُڑ جائے ——— نہ نہ بھئی ——— دیکھنا کہیں کوئی مجھ پر ایسا جادو نہ کر دینا کہ میری نیند میرے پاس آنے کا نام نہ لے ——— نیند مجھے بہت پیاری ہے ——— وہ بیچارے لالہ سرن داس بیدی نیند کی گولیوں کے بغیر ایک منٹ آرام نہیں کرسکتے۔ کہتے تھے پہلے ایک گولی سے نیند آجاتی تھی، کل رات دس گولیوں سے بھی اچھی طرح سو نہیں سکے۔ اب ڈاکٹر کہتا ہے بارہ کردو۔ اور میں جب چاہتا ہوں، جہاں چاہتا ہوں سو جاتا ہوں، دفتر میں، دفتر سے عدالت کو جاتے ہوئے کار میں، بیس منٹ کے بعد اخبار آنکھوں پر رکھ کر بار روم میں۔ ایک دفعہ ملزم کے بیان ہو رہے

تھے، میں عدالت کے کمرے میں کرسی پر سوگیا۔ وہ میرا پہلا اور آخری مقدمہ تھا۔ آج رات کو مسز گمنشام کے ساتھ سینما میں تمام وقت سویا رہا۔"

"کیا تم میرے حسین ہونے کے ثبوت دے رہے ہو؟"

"کہا تو ہے کہ مجھ جیسا سونیوالا اگر انتہائی صبر کے ساتھ تمہارے ساتھ آدھا گھنٹہ باتیں کرتا رہے تو یقیناً اس کا یہ مطلب ہے کہ تم حسین ہو"

"لیکن ایسی خوش قسمت عورتیں بھی تو ہیں، جن کے ساتھ تم آدھی آدھی رات تک رہتے ہو۔ کیا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ حسین ہیں؟"

"کون عورتیں؟"

"وہی جن کے تم نے ابھی نام لئے"

ہاں ــــ وہ ــــ وہ ــــ دیکھونا ــــ بھئی یہ تمہارا کہنا بجا نہیں کہ میں اُن کے ساتھ رہتا ہوں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ رکھتی ہیں۔"

"اور میں بھی تمہیں جبراً روکے ہوئے ہوں۔ آج سے پہلے تو تم نے مجھ سے کبھی اتنی باتیں نہیں کیں۔"

"اوہو ــــ مشکل ہے! مشکل ہے! ــــ میری منطق فیل ہوگئی ــــ میں اپنی شکست کا اعتراف کرتا ہوں۔"

ایک غیر معمولی صدمے نے کمزور عورت کا کمزور دل پاش پاش کرکے رکھدیا۔

رُوح فرسا خاموشی ــــ نیلا ماتمیں ٹیبل لمپ ــــ قیامت کے وقفوں کے ساتھ ٹِک ٹِک۔

وہ لیٹ گئی۔

وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اوہ مجھے یاد آیا۔ کل کو پکنک پر جانا ہے، اب میں زیادہ نہیں ٹھہر سکتا۔ میں سوتا ہوں۔"

وہ دوسرے کمرے میں جانے کیلئے دروازہ تک پہنچ گیا۔

"ظہور!"

وہ دروازے کے پاس ہی پلٹ کر کھڑا ہوگیا۔

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہارا انتظار کر رہی تھی؟"

"تم نے ابھی ابھی یہی کہا تھا۔"

"نہیں۔"

"پھر؟"

"مجھے بخار ہے۔ ۱۰۴"

"کیا تم سچ کہتی ہو کہ تم میرا انتظار نہیں کیا کرتیں؟"

"ہاں۔"

"کیا تم سچ کہتی ہو کہ تم کو بخار ہے۔ اور ۱۰۴ درجہ کا بخار ہے۔"

"ہاں۔"

"میں خوش ہوں، میری منطق فیل نہیں ہوئی، مجھے نہیں شکست کا اعتراف تم کو کرنا ہوگا۔"

"میں سونا چاہتی ہوں۔"

"کل صبح میں اپنی کلب کے پریذیڈنٹ کو ٹیلیگرام کروں گا کہ ہماری کلب میں ایک نئے ممبر کا اضافہ ہوا ہے۔"

"میں تھکی ہوئی ہوں۔"

"تم بہت طاقتور کردار کی عورت ہو۔"

"جاؤ! ظہور!"

وہ چلا گیا۔

اُس کو ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کے بخار میں ایک غیر محدود اضافہ ہوگیا ہے۔ بے پناہ بے قراری کے اس عالم نے ایک لمحہ اُس کو بالکل ساکن رکھا۔ آخر وہ اٹھی۔ آہستہ آہستہ سُوِچ بورڈ کے پاس گئی۔ لمپ بجھا دیا، اُس نے اپنی بے قراریوں کو، پریشانیوں کو، نامرادیوں کو بے پناہ اندھیرے میں دفن کر دیا۔

ٹِک ٹِک ٹِک ٹِک۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فرہاد دودھ کی نہر نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔

دودھ کی نہر! سورج کی شعاع! ایک! دو! تین! چار! سات ہزار! بے شمار شعاعیں! صبح! صبح کو بیرسٹر الارم کے ساتھ اُٹھا ڈریسنگ گاؤن میں کمرے میں داخل ہوا۔

اِس طرف کے کونے میں پانی کی صراحی کے دو گز کے فاصلہ پر اُس کی بیوی کی لاش پڑی تھی۔

وہ دروازے کے پاس کھڑا ہوکر ایک لمحہ اُس کو دیکھتا رہا۔

"احمد!" احمد اُس کا نوکر تھا۔

"جی۔" احمد اندر آگیا۔

"اِن کو اٹھا کر بستر پر لٹا دو۔"

احمد لاش کی طرف بھاگ کر گیا۔ "او ــــ خدایا ــــ یہ کیا یہ تو سرکار! ــــ"

"ہاں ! ہاں ! ہاں ! ٹھیک ہے ۔ ان کو بستر پر لٹا دو ۔"

بیرسٹر فون پر گیا ——— ۱۵۰۴۲ ——— انگلی کچھ آہستہ کام کرتی تھی ۔

"کون ——— ہاں دیکھو ——— میں بیرسٹر ظہور ——— دیکھو مس طاہرہ مجھے پکنک کے لئے کچھ دیر ہو جائے گی ——— نہیں ! یہ تو معمولی بات ——— اوہ نہیں ، بہانہ نہیں ۔ میں آؤنگا ضرور ۔ لیکن ذرا ——— سنو تو سہی ——— میں مجبور ہوں ——— میری بیوی کا انتقال ہو گیا ہے ۔ اور اس دنیا میں وہی ایک عورت تھی جس سے میں محبت کرتا تھا ——— میں سچ کہتا ہوں کہ میں نے آج تک اس عورت کے سوا اور کسی سے محبت نہیں کی ——— او ۔ کے ۔"

انور ؔ

"خوابِ سحر"

چاندنی سے تھی منور چرخ کی روشن جبیں ‖ ہنس رہے تھے بال بکھرائے گلستاں میں حسیں

کائناتِ دہر پر تھی بیخودی چھائی ہوئی ‖ چاند سے تھی چاندنی اسوقت شرمائی ہوئی

ہنس رہا تھا میری آنکھوں میں جہانِ رنگ و بو ‖ باغ کی دوشیزگی کو تھی کسی کی جستجو

تھیں در و دیوار پر چھائی ہوئی رنگینیاں ‖ چاندنی میں بے تحاشا گا رہی تھیں ندیاں

گا رہے تھے جنگلوں میں مطربانِ لالہ زار ‖ بہہ رہے تھے کوہ کے دامن سے رنگیں آبشار

چاندنی میں آسماں پر بج رہا تھا جلترنگ ‖ اور یہاں مصروفِ نغمہ بربط و نَے اور چنگ

صبح کی دوشیزہ آ کر رات پر چھانے لگی ‖ چاند کے نغماتِ آخر کی صدا آنے لگی

دہر پر چھانے لگیں انوار کی پرچھائیاں ‖ خواب کو شانِ جہاں لینے لگے انگڑائیاں

روح کی تابندگی کا راگ دل کے ساز پر ‖ اس طرح گایا کہ روشن ہو گئے سب بام و در

یہ کمالِ روحِ انساں کب فرشتے دیکھتے ‖ چشمِ تر کے ساتھ مجھ کو دیکھکر ہنسنے لگے

دوست کے قدموں کی پھر آنے لگی بہم صدا ‖ اس فضا میں اور تو خاموش ہے بیٹھا ہوا

اس صدا سے بڑھ گئیں دل کی مرے بے چینیاں ‖ خود بخود بجنے لگیں غم سے بھری تنہائیاں

یک بیک بہنے لگیں پھر ندیاں جذبات کی ‖ جوش میں آئی فسردہ آنچ محسوسات کی

زندگی تھی کشمکش میں اور دل کو پیچ و تاب ‖ جانبِ مشرق سے نکلا یک بیک پھر آفتاب

وہ صدائے دل نشیں گم ہو گئی جاتی رہی ‖ اک صدا موہوم سی دل میں مرے آتی رہی

اس صدا کی جستجو میں دل مرا کھونے لگا ‖ اور کچھ ممکن نہ تھا تو بے سبب رونے لگا

اے صدائے دوست یہ کیا ظلم مجھ پر کر دئے ‖ درد و غم ، رنج و مصیبت میرے دل میں بھر دئے

سوز بنکر شام کے کافر اندھیروں میں بھی آ
ساز بنکر صبح کی پُر نور کرنوں میں بھی آ

جوہر فریادی ؔ

کھڑے ہیں۔ لالہ نے ایک دونالی بندوق سنبھال رکھی تھی۔ اسکی کنپٹی کے گرد ایک سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔

میری طرف کو دیکھتے ہوئے بہاں دو دھا ادھر زادہ رام داس صاحب بنتے ہوئے بولے "آؤ بڑکی تو ناشوں کے ڈھیر لگ جائیں گے۔"

عدالت تماشائیوں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ شہر کے خوش وضع ہونق بابس نسان بھی اس مجمع میں شامل تھے۔ اور گاؤں کے بھولے دہقان۔ جنکے چہروں پر حیرانی عیاں تھی۔ اور کچھ مایوسی کے آثار۔ وہ آج انسان کے انصاف کا مظاہرہ دیکھنے آئے تھے۔ رامو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ اسکے چہرے سے متانت ٹپک رہی تھی۔ اور اسے بھروسہ تھا انصاف پر جس کی پناہ لینے وہ آج یہاں آیا تھا اور راجو، وہ بھی عدالت میں جواب دہی کیلئے بلائی گئی تھی۔

آخر عدالت کے حکم کے موجب، لالہ ریشمی رومال سے اپنا منہ پونچھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے، اور ہجوم پر ایک پر معنی نظر ڈالتے ہوئے یوں گویا ہوئے۔

"حضور میں یہاں صداقت برتنے آیا ہوں۔" اور جج کی آنکھیں عینک کے پیچھے سے لالہ کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔

"آگے فرمائیے کہ اصل واقعہ کیا ہے؟"

"واقعہ حضور، واقعہ یہ ہے کہ برہسپت وار کے روز پانچ بجے کا عمل ہوگا کہ میں اپنے کمرے میں خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ یکایک کمرے میں انسانی پیروں کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ راجو بنی سنوری میرے سامنے کھڑی ہے۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ وہ کس کام کے واسطے وہاں پر آئی۔ لیکن اس نے کچھ جواب نہیں دیا اور آگے ہی بڑھتی چلی آئی۔ اور کہنے لگی "لالہ تم بڑے سندر ہو۔ میں تمہارے پاس رہونگی۔" اور میرے حیرانگی کی کچھ حد نہ رہی جب اس نے یکایک میری گردن میں اپنے ہاتھوں کو حمائل کر دیا۔"

"گردن میں ہاتھ ڈالدے۔ رام رام۔ جیسے سچ بولنا تو دنیا میں رہا ہی نہیں۔" اور گاؤں والوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

"آرڈر، آرڈر۔" اور عدالت میں پھر خاموشی طاری ہوگئی۔

"اس نے گردن میں اپنے ہاتھوں کو ڈالدیا۔ میں ٹھہرا ڈیڑھ ہڈی کا آدمی لاکھ کوشش کی کہ اس بن بلائی بلا سے چھٹکارا پاؤں، مگر وہ میری گردن کو گھونٹ دے رہی تھی اور آواز نکالے نہ نکلتی تھی۔" لالہ نے پھر ریشمی رومال کو جیب سے نکالا اور پیشانی پر نمودار پسینے کے ننھے ننھے قطروں کو پونچھا۔ اور رامو مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ اسے زبردست غصہ آرہا تھا لیکن وہ بے بس تھا۔

یکایک عدالت میں ایک ہلکا سا ہنگامہ برپا ہوگیا۔ راجو بیہوش ہوگئی۔ لوگ باگ اسے باہر ہوا میں لے گئے اور ہوش میں لانے کی ترکیبیں کرنے لگے۔

جب عدالت میں نئے سرے سے امن قائم ہوگیا تو لالہ کو اپنا بیان جاری رکھنے کیلئے حکم دیا گیا

"میری آواز بالکل مدھم پڑ گئی۔ اور میں اپنے کسی نوکر کو بھی آواز نہ دے سکا۔ جو کہ میرے باغیچے کے سب سے دور کونے میں کام کر رہے تھے۔ اور یہ ملزم کمرے میں ڈراتا ہوا گھسا۔ اسکے بعد مجھے معلوم نہیں کیا ہوا۔ ہاں جب آنکھ کھولی تو اپنے فرمانبردار سوہن کو سامنے دیکھا۔ اور سر پر پٹی بندھی ہوئی۔ اور کنپٹی سے خون جاری تھا۔"

"آپ اپنا بیان ختم کر چکے؟"

"نہیں حضور۔ اس لڑکی نے گاؤں والوں کو بہکایا کہ میں نے اسکی عصمت پر ہاتھ ڈالا۔ اتنا جھوٹ۔ بالکل سفید جھوٹ۔ اور گاؤں والوں نے میرے گھر پر حملہ کر دیا۔ وہ تو خیر ہوئی میں نے بطور حفظ ماتقدم پولیس کی امداد مانگ لی تھی۔" اور لالہ پھر اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

"کیا آپ ثابت کر سکتے ہیں کہ راجو اس روز آپکے پاس آئی؟"

"حضور گواہ پیش ہیں۔"

اور سوہن، موہن، اور نہ معلوم گاؤں کی کن کن ہستیوں نے جنہوں نے لالہ کا نمک بہت بری طرح کھایا تھا، یہ ثابت کر دکھایا کہ راجو لالہ کے گھر آئی تھی۔

"راجو کو پیش کرو۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ تم برہسپت وار کے روز لالہ کی کوٹھی پر گئیں؟"

"جی حضور۔ مجھے وہاں کام پر لگایا تھا۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ تم لالہ کے کمرے میں گئیں؟"

"جی۔"

اور سرکاری وکیل ناچنے لگا۔ "دیکھئے حضور۔"

"لڑکی کو آگے بولنے دو۔"

"جی حضور میں خود نہیں گئی۔ مجھے زبردستی اٹھا کر لیجایا گیا۔ اور لالہ مجھ سے پتا نہیں کیا کیا بولنے لگے ...." اور وہ آگے نہ بول سکی۔

"رامو ملزم اپنی صفائی پیش کرے۔"

"حضور۔ برہسپت وار کے روز میں اپنے کام سے جلدی آگیا اور راجو کو دیکھنے کیلئے چل دیا۔ لیکن راجو اپنی جگہ پر موجود نہ تھی۔ مجھے معلوم ہوا تو لالہ کی کوٹھی پر گیا۔ جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ لالہ راجو کی عزت بگاڑنے پر تلے ہوئے ہیں۔ بھلا میں یہ کب برداشت کر سکتا تھا میں مجبور تھا سرکار۔ میں نے لالہ کی کنپٹی پر ایک ہلکی سی چوٹ لگائی۔"

"کیا کوئی ثبوت کہ واقعی لالہ راجو کی عزت خراب کرنے پر تلے ہوئے تھے؟"

سپاہی سوا وہاں تھا ہی کون ؟"

اور سرکاری وکیل پھر دیوانوں کی طرح ادھر اُدھر گھومنے لگا۔

"ملزم نے ارادتاً لڑکی کو لالہ کے پاس بھیجا تھا کہ وہ جا کر لالہ کو میٹھی میٹھی باتوں میں لگائے اور وہ تھوڑی دیر بعد خود آ کر لالہ کی بے بسی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کسی قیمتی چیز کو اُٹھا لے جائے۔"

لالہ نے اور بھی نیک چلنی کا ثبوت دلوایا۔ شہر کے معزز روسا سے، رائے صاحب، رائے بہادر، خانصاحب، ڈپٹی صاحب وغیرہ وغیرہ سے۔

اور رامو۔ گاؤں والوں کی نیک چلنی کا ثبوت کون دے۔ گاؤں کا ذیلدار یا نمبردار۔ لیکن وہ چاندی کے جوتے کے تلے دبے ہوئے تھے۔

رامو کو اقدامِ ڈاکہ زنی اور ضرب شدید پہنچانے کے الزام میں دو سال قید سخت کی سزا ملی۔ اور راجو کو تاکید کر کے چھوڑ دیا۔

رامو اب قیدی ہے۔ راجو، نہ معلوم اُس کا کیا ہوا ہوگا۔ اور قیدی کے خیالات میں جذبات کا ایک زبردست سمندر موجزن ہوگیا۔ بے چاری نے کوئیں یا پوکھر میں ڈوب کر جان دیدی ہوگی۔ گاؤں کی لڑکی بھلا اس قدر بے عزتی کس طرح برداشت کر سکتی ہے۔

آج اُس کی طبیعت پریشان ہے۔ نہ معلوم کون سی ایسی بات وقوع میں آئی ہے۔ کیا اس کا دماغ بالکل بے کار ہوگیا ہے۔ اور وہ پھر سوچنے لگا۔ ہاں آج صبح گاؤں کے آدمی اس سے ملنے آئے تھے۔ لیکن نہ معلوم انہوں نے اُس سے کیا کہا تھا۔ کچھ نہیں محض وہم۔

"راجو۔ راجو۔ راجو" اور قیدی کو ایسا معلوم ہوا کہ جیل کی کوٹھری کے در و دیوار راجو۔ راجو پکار رہے ہیں۔ اور اُسے سامنے ایک چلتا سا یا دکھائی دیا۔

"کون ؟۔ راجو۔ راجو۔ تم آگئیں۔ تم روتی ہو" اور پھر راجو نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

ہاں آج اُس کے گاؤں والوں نے اُس سے کہا تھا کہ راجو اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ اور وہ اب تک زندہ ہے۔ تُف ہے ایسی زندگی پر۔

کھنکھناتی ہوئی ہتھکڑیاں، اور لوہے کی زنجیر۔۔ کتوں کے بھونکنے کی مسلسل آواز۔۔۔۔

سویرے سپاہی نے جیل کی کوٹھری کو کھولا اور رامو کو دیکھا۔ بے جان رامو کو۔ جابجا زنجیر سے جا لٹا تھا۔ اس کے گرداگرد لوہے کی زنجیر لپٹی ہوئی تھی اور پیشانی پر بڑے بڑے زخم تھے۔ شاید ہتھکڑیاں مار مار کر اُس نے اپنی پیشانی کو خون خون کر لیا تھا۔ اور زنجیر کے ذریعے اپنی زندگی ختم کر لی تھی۔

"مر گیا کمبخت۔ آپ جان سے چھٹا۔ اور ہمارے لئے مصیبت پیدا کر گیا" جیلر نے تشویشناک لہجے میں کہا۔

"یہ پیلے پیلے پھول کیا ہیں"

"ٹیسو کے پھول ہیں سرکار"

کوٹھری کے کچے فرش پر پڑے ہوئے زرد زرد سوکھے ہوئے ڈھاک کے پھول۔ وہ اس کی غیر فانی محبت کی نشانی تھے۔

اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ پھول سرمایہ داری کے مظالم اور انسان کے انصاف پر ماتم کر رہے ہیں۔

پریم ناتھ شرما

ایک ممتحن کی ترنگ

آج کا پیپاں : اصل کر دینا ضروری ہیں، لیکن ابھی ۵۰ کو تو دیکھا بھی نہیں۔ آخر کس طریقے سے یہ ہو؟ بت کی بیچارگی کا معاملہ ہے۔ یہ لڑکا بیحد خوشخط معلوم ہوتا ہے۔ خط، بیشک اس کونے میں بیٹھنے والے لڑکے کا "خط" بہت بھلا معلوم ہوتا ہے اور اس کے ہونٹ، یونان کے بت تراش۔ لیکن ہندوستان (قدیم ہندوستان) تو یونان پر فنونِ لطیفہ میں سبقت لے گیا تھا۔ لیکن فنونِ لطیفہ کے رسیے ہی سے کیا فائدہ ہے۔ ٹیگور نے لکھا ہے، میرے حافظے کا خدا ہی مالک ہے، ٹیگور نے کیا لکھا ہے، اور پھر جواہر لال کا بیان ہے کہ جس ملک میں پیٹ بھر کھانا اور تن ڈھکنے کو کپڑا تک میسر نہ ہو، وہاں فنونِ لطیفہ کا کیا کام؟ — فنونِ لطیفہ، ہاہا، چار سال کے لئے لد گئے، اب میاں کو لطافت کا مزہ معلوم ہوا ہوگا۔ تحفظ ہندوستان کے تحت میں مگر ہندوستان کا تحفظ ہی کہاں ہے؟" مجھے غصہ کیوں نہیں آتا؟ مگر کبھی کبھی آجانا چاہیئے۔ کل ہی اس صاف رنگ والی لڑکی کی یہ ہمت ہوئی کہ کہے: "اتنا طویل جملہ کیونکر پڑھا جا سکتا ہے؟" یہ یونیورسٹی کی لڑکیاں طویل، طول، شبِ فراق کا رنگ اڑ رہا ہے — ادب کی طالب علم ہیں اور ایک جملہ نہیں پڑھ سکتیں، نثر کا ایک جملہ۔ بیشک نثر کا درجہ شعر سے اعلیٰ ہے، لیکن انہوں نے یہ پرچہ مجھے جانچنے کے واسطے کیوں دیا ہے؟ میں نے شری دھر سے کہا۔ کیا — کیوں — یہ پرچہ تم نہیں لے لیتے اور مجھے دوسرا پرچہ دے دو۔ لیکن شری دھر تو اسٹاف روم میں ہمیشہ کھوئے ہوئے رہتے ہیں، مگر کون شخص کھویا ہوا نہیں رہتا۔ میں شاعر ہوں اور میری زندگی مجمل اور مفصل المیوں کا مجموعہ ہے — جی المیوں کا، مگر المیہ تو صرف محسوس کرنے والوں ہی کے لئے المیہ ہے، کیسا چیز محسوس کرنے والوں کے لئے؟ — ٹھیک ہے، ہیگل، جی ہیگل کہتا ہے: "بھلائی کا بھلائی سے مقابلہ" ہیگل بھی شاعرِ فطرت کے ساتھ ساتھ اس دنیا میں آیا تھا۔ ہیگل اور ورڈزورتھ، مجھکو اسی موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھنا چاہیئے، یہی موضوع میرے لئے مناسب ہے، جو موضوع میں نے پہلے منتخب کیا تھا، جب میں لکھنؤ گیا تھا۔ دل بغداد ہے لکھنؤ آنکھیں نثار لکھنؤ، اجی وہ باغات اور محلات سے بستا ہے، الٰہ آباد میں بھی ایک محل ہے: "ناٹک محل" ڈرامہ، "انگریزی ڈرامہ" از نکول، نکول اور نکل، مجھے بھی الفاظ پر کھیلنے میں ملکہ حاصل ہے، لیکن میں کھیلتا نہیں، مجھے کچھ کھیلنا چاہیئے، ڈاکٹروں نے مجھے مشورہ دیا تھا، لیکن ڈاکٹر صاحبان خود ہی کب کھیلتے ہیں، یہ روشنی اب کم ہوتی جاتی ہے، کپلنگ کا افسانہ "روشنی جو گل ہو گئی" میتزی، ہاں میتزی، مجھے اس سے شادی کر لینا چاہیئے تھا۔ "شادی اور اخلاق" از رسل۔ مجھے امن پسند ہے، دولت اور قوت۔ میری آنکھیں، میری آنکھیں دن بدن کمزور ہوتی جاتی ہیں۔ مجھے رات کے وقت پڑھنے میں بیحد دقت ہوتی ہے۔ "رات تیری ہے" "محبت کے لئے"، مجھے اس سے محبت تھی، لیکن اسے نہیں۔ مجھ سے کوئی بھی محبت نہیں کرتا، کوئی بھی نہیں، میری بیوی بھی نہیں، میری بیوی چڑیل ہے۔ شکسپیر کی تین چڑیلیں۔ لیکن شکسپیر نے رومیو جولیٹ بھی تو لکھا ہے۔ "ایک رات کی جولیٹ" مجھے ایک بھی نہیں ملی، باوجود خواہش کے، میں نے اسے دیکھا، اس نے بھی نظریں اٹھائیں پھر جھکا دیں، کیا منظر تھا، لیکن ایک منظر نظارے کے لئے نہیں ہوتا، تیز ہوا چل رہی تھی اور اس کی ساڑھی بغاوت کر رہی تھی۔ بغاوت جوانوں کا جذبہ ہے۔ جوان مرد اور جوان عورتیں۔ کیا تصور ہے! مجھے تصورات سے الجھن ہوتی ہے، مجھے سیدھے سادے آدمی پسند ہیں، جیسے چیراسی، اس کی آنکھیں ضرور خواب ناک ہیں، لیکن وہ کبھی خواب نہیں دیکھتا۔ مجھ سے اس نے ہی کہا تھا۔ اس کی بیوی ہے اور ایک درجن بچے۔ سب سے بڑا لڑکا جس کے گھنگریالے بال میں نے اسی روز رات کو دیکھا تھا، اس کے ماتھے پر اس طرح آئے تھے جیسے چاند پر بادل۔ غالب نے کہا ہے، لیکن غالب مفلس نہیں تھا اور نہ اسکے کوئی لڑکا بالا تھا، پھر بھی وہ غالب تھا اسداللہ خاں غالب، اس نے اپنا تخلص غالب اختیار کیا کیونکہ وہ شیرِ خدا کو مانتا تھا، میں تو شیر نہیں ہوں اور میں خدا کو نہیں مانتا۔ "خدا کا جنازہ" اسے تو ٹامس ہارڈی نے دفن کر دیا تھا جو دکھ سے محبت کرتا تھا، ہندوستان کے کروڑوں دکھیوں کی دیکھ بھال میرا کام نہیں ہے، میں یونیورسٹی میں پڑھانے کے لئے تنخواہ پاتا ہوں، میرے دادا نے بھی یہیں تعلیم پائی تھی اور میرے باپ نے بھی۔ ابا جان ہم لوگوں کی بے ادبی کی بیحد شکایت کرتے تھے۔ (بقیہ بر صفحہ [illegible])

نقد و تبصرہ

کارنامۂ پہلوی۔ مؤلف سید محمد حسن بلگرامی۔

ایران جدید کی ترقیوں اور رضا شاہ پہلوی کے اصلاحی کارناموں پر اب تک اردو میں کوئی مبسوط کتاب شائع نہیں ہوئی تھی، ہمیں مسرت ہے کہ کارنامۂ پہلوی لکھکر مولوی سید محمد حسن بلگرامی نے اس کمی کو پورا کر دیا۔

مؤلف نہایت وسیع النظر اور کثیر المطالعہ بزرگ ہیں خصوصًا ایران قدیم وجدید پر آپ کا مطالعہ بہت گہرا اور دقیق ہے۔ آپ نے ایران کی خود بھی سیاحت کی ہے اور بذات خود ایران جدید سے واقفیت بہم پہونچائی ہے۔ چنانچہ زیر نظر کتاب میں جو اگرچہ "موڈرن ایران" (سفرنامہ پروفیسر مولوی اسمٰعیل کالج بمبئی) کا آزاد ترجمہ ہے۔ جگہ جگہ مؤلف کی ذاتی معلومات، مشاہدات اور کاوشِ فکر کے نقوش ملتے ہیں۔

کتاب کے شروع میں ایک طویل اور فاضلانہ دیباچہ ہے۔ جس میں مؤلف نے موجودہ ایران کا تعارف کراتے ہوئے سرزمین ایران کی طبعی اور تمدنی خصوصیات کا نہایت بلیغ انداز میں تذکرہ کیا ہے اور ایرانِ قدیم کی تاریخ کا فلسفیانہ انداز میں جائزہ لیا ہے۔

اصل کتاب میں ایرانِ جدید کی تمدنی ترقیات اور معاشرتی اصلاحات کا نہایت تفصیلی ریکارڈ فراہم کیا گیا اور اسی ضمن میں رضا شاہ پہلوی کے ذاتی حالات اور خصوصیات پر بھی عقیدتمندانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

"موڈرن ایران" کے مصنف (پروفیسر مولوی) کو سرزمینِ ایران سے والہانہ محبت اور شاہ ایران سے بے پناہ عقیدت معلوم ہوتی ہے اور اس کو وہ اپنی مورخانہ حیثیت کے باوجود کمال بے تکلفی سے موقع بے موقع ظاہر بھی کرتے جاتے ہیں۔ مؤلف نے پروفیسر مولوی کے ان جذبات کو جوں کا توں اس کتاب میں برقرار رکھا ہے اور اسکے لئے مؤلف کا عذر یہ ہے ؎

کفرانِ نعمت گلہ مندان بے ادب
در کیشِ من ز شکر گدایانہ بہتر است

بعض مقامات پر پروفیسر مولوی ایران اور ایرانیوں کی محبت میں حدِ اعتدال سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اور بے سند ایسی بات کہہ جاتے ہیں جو حلق سے نیچے نہیں اترتی۔ مثلاً ایک جگہ پروفیسر مولوی لکھتے ہیں:۔

"خلیفہ ہارون الرشید کے وقت میں ایک ایرانی
بھی ایسا نہ ملتا تھا جو فارسی کا ایک آدھ لفظ بھی
جانتا ہو۔ اور خلیفہ مامون الرشید نے ایک
ایرانی کو جسے اپنی زبان کے کچھ اشعار یاد تھے
فوراً ہلاک کر دیا تھا۔" (صفحہ ۵۱)

عباسیوں پر یہ الزام اس کتاب میں تین چار مقامات پر لگایا گیا ہے لیکن ثبوت ایک جگہ بھی پیش نہیں کیا گیا۔

حیرت یہ ہے کہ پروفیسر مولوی ٹھیک انہی خلفائے عباسیہ پر اس جہالت کا الزام لگاتے ہیں جو اپنے بذل وکرم، عدلُ انصاف اور قدیم علوم وفنون کی سرپرستی میں مشہور چلے آتے ہیں۔! خصوصًا مامون الرشید کے متعلق تو تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ اس کے دربار میں ہر زبان کے عالم و فاضل جمع تھے اور اس کے حکم سے چینی، ایرانی، ہندوستانی اور یونانی زبانوں سے قدیم علوم وفنون عربی زبان میں منتقل کیا کرتے تھے۔ ایسے علم دوست خلیفہ پر بے سند و تحقیق تعصب اور جہالت کا الزام کم ازکم پروفیسر مولوی کے ذمہ دار قلم سے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ فاضل مولف نے بھی اس موقع پر پروفیسر مولوی کی چشم نمائی کی ہے لیکن بہتر ہوتا کہ وہ ایسے بے ثبوت الزام کو کتاب میں شامل ہی نہ کرتے!۔

ایک اور جگہ پروفیسر مولوی ایران کی محبت میں غلو کرتے ہوئے ایرانیوں کے اس فیصلے کی داد دیتے ہیں کہ انہوں نے صدیوں کے مستعمل اور مروجہ عربی الفاظ (جو فارسی میں اپنی مستقل جگہ بنا چکے تھے۔) بے تکلف اپنی زبان سے خارج کر دئے اور ان کی جگہ فارسی کے (نامانوس) الفاظ وضع کر لئے! (صفحہ ۲۷۰)

قومی زبان کی تعمیر میں کس حد تک اس جذبہ سے کام لیا جا سکتا ہے؟ یہ موضوع نہایت تفصیلی بحث کا محتاج ہے۔ فاضل مؤلف نے اس مسئلے میں پروفیسر مولوی سے اختلاف کرتے ہوئے ایک مختصر

مگر نہایت مدلل اور جامع نوٹ لکھکر اسے بڑی خوبی سے صاف کر دیا ہے!

ایران اور ایرانیوں کے ساتھ عقیدت اور محبت کے ان انتہائی مظاہروں کے باوجود کتاب نہایت مفید اور پُر از معلومات ہے۔ اور مؤلف کی شستہ زبان اور دلچسپ اندازِ بیان نے اس میں چار چاند لگا دئے ہیں۔

ایران جدید کے ہر شعبہ کے متعلق بڑی دلچسپ اور مفید معلومات بہم پہونچائی گئی ہیں۔ اور ایران کی تعلیمی اور معاشرتی ترقیات پر نہایت گہرا مشاہدہ پیش کیا گیا ہے جس سے ایران جدید کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

ایک جگہ ایران کی جدید معاشرتی ترقیوں کے متعلق ایران کے "موجودہ" مولویوں، ملاؤں اور مجتہدوں کی روش پر روشنی ڈالتے ہوئے وہاں کے بعض اخبارات کی تحریرات کے اقتباسات بھی دئے ہیں جو اس قدر دلچسپ اور سبق آموز ہیں کہ ہم ہندوستان کے مذہبی طبقے کی بصیرت کیلئے ان اقتباسات میں سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا اس جگہ نقل کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

"اخبار "ایران" میں "علما اور نقاب" کے عنوان سے یہ مضمون شائع ہوا۔

مختلف مقامات سے یہ خبریں آرہی ہیں کہ ہمارے یہاں کے علما زندگی کے ہر ایک جدید شعبے اور طریقے سے مانوس ہوگئے ہیں۔ نقاب اٹھانے کی رسم عملی طور سے اختیار کر کے وہ اپنی بے نقاب "مستورات" کے ساتھ شاہراہوں پر نظر آتے ہیں اور نہایت گرمجوشی سے ترک نقاب کی نسبت اُن کے وعظ و پند کا سلسلہ جاری ہے!

مسئلہ نقاب پوشی کی کافی چھان بین، تفصیلی مطالعہ اور پوری تحقیق کر چکنے پر اب وہ اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ کلام مجید کی رو سے عورتیں اپنا مُنہ، ہاتھ اور پاؤں چھپانے پر مجبور نہیں ہیں۔ اور بر افگندہ نقابی کسی طرح احکام اسلام کے خلاف نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کونسا مجتہد اس بات کو تسلیم کریگا کہ سارے مصائب، قیود اور پستی کی بیماری میں ہماری قوم کا نصف حصہ مبتلا تھا محض اس وجہ سے کہ ہم اسلام کے مسلہ اور سخت قوانین کے تابع تھے"

(صفحہ ۲۳۸-۲۳۰)

کتابت و طباعت نہایت دیدہ زیب، سائز ۲۶×۲۰، حجم ۳۲۰ صفحات۔ قیمت ہے؟

غالباً مؤلف (مولوی سید محمد حسن بلگرامی، صدر محاسب سرکار عالی۔ حیدر آباد دکن) سے مل سکتی ہے۔ "م۔م"

شمع مصنفہ اے، آر، خاتون دھلوی۔

یہ ایک دلچسپ معاشرتی ناول ہے۔ پلاٹ نہایت دلکش، زبان نہایت شستہ! پلاٹ کی تکمیل میں جزئیات تک پر نظر رکھی گئی ہے اور ہماری گھریلو معاشرت کی تصویر کھینچنے میں مشاہدے کی گہرائی کا ثبوت دیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ سیدھی سادی گھریلو زبان میں کردارِ افسانہ کا اس قدر صحیح انداز میں تعارف کرایا گیا ہے کہ افسانہ بالکل واقعہ معلوم ہونے لگتا ہے!

ان ادبی خصوصیات کے ساتھ ساتھ اس ناول کا "مقصد" بھی قابل توجہ ہے۔ ہماری معاشرت کے بعض اہم مسائل اس میں زیر بحث لائے گئے ہیں اور ان کے پلاٹ اور انداز بیان کی ہم آہنگی سے بڑے لطیف انداز میں تنقید کی گئی ہے۔

"مسلمان خواتین کی اعلیٰ تعلیم میں پردہ حارج ہے یا نہیں؟"
یہ بہت پُرانی بحث ہے اور ہماری سوسائٹی کی اکثریت نے بطورِ خود اس کے متعلق اپنا ایک نظریہ بھی قائم کر لیا ہے۔ لیکن محترمہ اے، آر، خاتون اس مسلہ پر اپنی ایک سموئی ہوئی رائے رکھتی ہیں۔

"آزادیٔ نسواں!" یہ بھی ایک پُرانی تحریک ہے اور اس پر بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن آزادیٔ نسواں کی "سرحدات" اب تک متعین نہیں ہو سکیں۔ خاتون محترم نے اُنہیں لطیف انداز میں متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

"شرافت ذاتی و خاندانی!" یہ بھی بہت پُرانا تخیل ہے۔ لیکن یہاں اس پر نئے زاویہ سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

"عشق و محبت!" اس سے ہر ناول میں بطورِ چاشنی کام لیا جاتا ہے اور ناول کی دلکشی کو بڑھانے کے لئے اس میں زیادہ سے زیادہ بےاعتدالی کو راہ دی جاتی ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ اس ناول میں یہ لغویت نہیں ہے۔ جس ثقہ انداز میں اس لطیف موضوع کو چھیڑا گیا ہے اس نے اس ناول کو امتیازی خصوصیت دیدی ہے۔

شمع اور منصور کے کردار بہت اونچے ہیں لیکن غیر فطری نہیں معلوم ہوتے۔ اگر ہماری سوسائٹی میں ایسے کردار پیدا ہوتے تو پھر

تو یقیناً ہماری سوسائٹی کا پایہ بہت بلند ہو جائے۔

"طاہر" نہایت دلچسپ کردار ہے۔ ایسا دلچسپ کہ اگر اس کو کتاب سے خارج کر دیا جائے تو کتاب کی دلکشی آدھی رہ جائے! اس کا معصوم مزاح، برجستہ مذاق، نہایت ثقہ لیکن شرارت میں ڈوبے ہوئے فقرے اس قصّے کی جان ہیں!

اُردو لٹریچر میں معاشرتی ناول بہت کم ہیں اور جو ہیں ان میں معیاری ناول اُنگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ ہمیں مسرت ہے کہ "شمع" نے اُردو لٹریچر میں گرانقدر اضافہ کیا ہے اور ہم محترمہ اے۔ آر۔ خاتون دہلوی کو ان کی اس کاوش پر مبارکباد دیتے ہیں۔

سائز ساقی کا۔ حجم ۴۵۴ صفحات۔ قیمت ؎۔ ملنے کا پتہ۔ جلال منزل، کوچہ پنڈت۔ دہلی!

"م۔م"

سلطان محمد قلی قطب شاہ۔

مولف ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، ایم۔ اے، پی ایچ ڈی۔

ناشر۔ سب رس کتاب گھر، خیریت آباد، حیدرآباد۔ دکن۔ قیمت پانچ روپے۔

گولکنڈے کے قطب شاہیوں میں محمد قلی بہت نامور اور باتدبیر سلطان گذرا ہے۔ اسی نے موجودہ شہر حیدرآباد کی بنیاد رکھی اور اسے تمدنی اور معاشرتی ترقیوں سے مالا مال کر کے "عروس البلاد" بنا دیا۔

یہ بادشاہ حسن تدبیر کے ساتھ فکر سلیم کا بھی مالک تھا، اپنی اصلی زبان فارسی کے علاوہ دکن کی مختلف زبانوں میں بھی شعر کہتا تھا۔ اُردو میں بھی اس نے طبع آزمائی کی ہے اور اپنے پیچھے کم و بیش پچاس ہزار اشعار کا سرمایہ چھوڑا ہے اسی لئے یہ اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر مانا جاتا ہے۔

ڈاکٹر زور نے اس کی لائف بڑی کاوش اور تحقیق سے لکھی ہے۔ اس کے ابتدائی حالات، اس کے طبعی اور ذہنی رجحانات، اس کی سیاست، اس کا انداز حکومت اور اس کے زمانے کی تمدنی اور معاشرتی ترقیات پر دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں محمد قلی کے اُردو اور فارسی کلام کے نمونے دیتے گئے ہیں اور ان پر نقد بھی کیا گیا ہے۔ کتاب شروع سے آخر تک دلچسپ اور پُر از معلومات ہے۔

طباعت و کتابت دیدہ زیب، حجم ۵۰۰ صفحات۔ مجلد۔ کتاب میں دو عکسی تصاویر بھی شامل ہیں۔

"م۔م"

مقدمہ تاریخ دکن۔

مولف عبدالمجید صدیقی۔ ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی؛

ناشر۔ ادارۂ ادبیات، خیریت آباد، حیدرآباد۔ دکن۔ قیمت ؏

پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے اس مختصر سے رسالے میں دکن کے ان (۲۵) شاہی خاندانوں کے شجرے جمع کر دئے ہیں جو تیسری صدی عیسوی سے اب تک دکن پر حکومت کرتے چلے آئے ہیں۔ ان شجروں میں فاضل مولف نے مختصر لیکن جامع نوٹ بھی دئے ہیں جن سے ان خاندانوں کی بنا پڑنے کی کیفیت اور باقی خاندان کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ ابتدا میں ایک چھوٹا سا مقدمہ بھی ہے جس میں دکن کی سرسری تاریخ پیش کی گئی ہے۔

شجرے نہایت کاوش اور تلاش سے مکمل کئے گئے ہیں اور ان میں حکمران افراد کے ہم جد عزیزوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ بادشاہوں کے سنہ جلوس اور وفات بھی تحقیق کے ساتھ درج نہیں۔ جن سے ان کا زمانۂ حکومت متعین کرنے میں آسانی ہوتی۔

زبان شستہ، اور انداز بیان دلچسپ ہے۔ تاریخ دکن سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس سے بہت کچھ استفادہ کر سکتے ہیں۔ سائز $\frac{۲۷ \times ۲۲}{۱۶}$ طباعت و کتابت عمدہ۔ حجم ۴۴ صفحات۔

"م۔م"

بین الاقوامی سیاسی معلومات۔

مولف اسرار احمد آزاد

ناشر۔ مکتبہ برہان نئی دہلی۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (؏)

آج کل کی بین الاقوامی صورت حالات کو ٹھیک طور پر سمجھنے کے لئے بین الاقوامی سیاسی اصطلاحات اور معاہدات کا علم حاصل کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے لیکن افسوس ہے کہ اُردو میں اب تک ایسی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی جو اس کمی کو پورا کر دے۔

"بین الاقوامی سیاسی معلومات" اسی غرض کو سامنے رکھ کر شائع کی گئی ہے اور ایک حد تک یہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی کہی جاسکتی ہے۔

یہ معلومات پانچ حصّوں میں منقسم ہیں۔ افراد و اقوام، ممالک و مقامات، اصطلاحات، مقدمات اور معاہدات، تحریکات و ادارات، اور متفرقات۔

ان عنوانات کے ماتحت لائق مولف نے جو معلومات جمع کر دی ہے وہ بلاشبہ مختصر اور مفید ہیں۔ اصل میں یہ سارے کا سارا والٹر تھیم کی کتاب "ہیگوئن پولیٹکل ڈکشنری" کا ترجمہ ہے۔ مولف کی جدت یہ ہے کہ اس ڈکشنری کو انہوں نے پانچ حصّوں میں تقسیم

کردیا۔ یعنی بین الاقوامی اصطلاحات حذف کردیں جن سے ان کے خیال میں اردو داں طبقے کو کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی تھی۔ مثلاً نیوڈیل، نیبسرام، نہلسٹ، مونٹ ریسے کنونش، آنچھ وغیرہ وغیرہ اور ہندوستان کے بعض مشہور افراد اور سیاسی تحریکات کا اس میں اضافہ کردیا جن سے اردو داں طبقے کو تعلق ہوسکتا تھا مثلاً عبیداللہ سندھی، محمود الحسن دیوبندی، ابوالکلام آزاد، خدائی خدمتگار، جمعیتہ العلما، مسلم لیگ وغیرہ۔ بہتر ہوتا کہ لائق مولف اپنے دیباچہ میں "پولیٹیکل ڈکشنری" کا کہیں حوالہ بھی دیتے!

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ طباعت وکتابت عمدہ۔ حجم ۳۰۳ صفحات۔ مجلد مع گردپوش۔

"م۔م"

نازیت کے کھلے راز

مترجم۔ نصیر یوسفی۔ ناشر۔ ملک دین محمد اینڈ سنز لاہور

قیمت درج نہیں۔

ہٹلر کی طرز حکومت اور نازسی حکومت کی اندرونی خرابیوں اور کمزوریوں پر ان خفیہ خطوط کے ذریعے روشنی ڈالی گئی ہے جو نازی جرمن پارٹی کے رکن جرمنی میں بیٹھ کر جرمنی سے باہر اپنے دوستوں کو لکھتے رہے تھے۔ یہ بارہ خط ہیں اور ان کا ترجمہ نصیر یوسفی صاحب نے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔

"م۔م"

قدرتی علاج

مرتب حکیم حافظ محمد سعید دھلوی۔ دفتر ہمدرد دواخانہ لال کنواں دہلی۔

قیمت بارہ آنے۔

ہمدرد صحت کے خاص نمبر فی الحقیقت اپنے آپ ہی جواب ہوا کرتے ہیں۔ یوں تو ہمدرد صحت کا ہر نمبر نہایت توجہ اور اہتمام سے مرتب کیا جاتا ہے لیکن خاص نمبر کی تیاری میں ہمدرد صحت کے بانی نگراں اور سرپرست حکیم حاجی مولوی عبدالحمید صاحب دہلوی جس توجہ و انہماک، جس تلاش و تفحص اور جس تحقیق و تدقیق کا ثبوت دیتے ہیں وہ فی الواقعی ان ہی کا حصہ ہوتا ہے۔ اس سال ہمدرد صحت کا خاص نمبر "قدرتی علاج" کے لئے وقف کردیا گیا ہے اور اس عنوان کے ماتحت ورزش اور غذا کے ذریعے صحت کو برقرار رکھنے اور اہم ترین بیماریوں کو دفع کرنے کے اصول بتائے گئے ہیں۔ مضامین سب کے سب دلچسپ اور محققانہ ہیں اور ہر اس شخص کے لئے جسے اپنی صحت عزیز ہے ان کا مطالعہ ضروری ہے۔ سائز ۲۰×۲۶/۸ کتابت وطباعت دیدہ زیب۔ حجم ۲۲۴ صفحات۔ قیمت صرف ۱۲/

"م۔م"

مورخ کے افسانے

جناب سید محمود مورخ۔ بی۔اے۔ سے ناظرین ساقی بخوبی واقف ہیں انہیں یہ سنکر خوشی ہوگی کہ حال ہی میں مورخ صاحب کے افسانوں کے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ایک کا نام "شہر خموشاں" اور دوسرے کا "مورخ کے افسانے" ہے۔ پہلا مجموعہ سائنٹفک افسانوں پر مشتمل ہے۔ اردو میں یہ افسانے اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل نئی چیز ہیں۔ سائنس کی موجودہ رفتار ترقی کو مدنظر رکھتے ہوئے مورخ صاحب نے افسانہ کے پیرائے میں بتایا ہے کہ مستقبل میں بہت سی ایسی باتیں بھی ممکن العمل ہوجائیں گی جو آج کل ہمیں قطعی ناممکن معلوم ہوتی ہیں۔ کون جانتا تھا کہ ہوائی جہاز اور ریڈیو جیسی حیرت ناک ایجادیں ہوسکیں گی۔ اسی طرح بہت ممکن ہے کہ افسانہ نگار نے جو نظریئے اپنے ان افسانوں میں پیش کئے ہیں وہ ربع صدی بعد مسلم حقیقتیں ثابت ہوجائیں۔ سب افسانے تخیلی ادب کے عمدہ نمونے ہیں۔ "مورخ کے افسانے" مجموعہ ہے دلکش افسانوں کا۔ اس مجموعے میں ہر قسم کے افسانے شامل ہیں۔ ان میں سے بعض زندگی کی سچی تصویریں ہیں اور بعض نیرنگی خیال کی کرشمہ سازیاں۔ سب افسانے اس لائق ہیں کہ انہیں پڑھا جائے۔ اور انہیں پڑھکر آپ محظوظ ہونگے۔ ہر مجموعہ کی قیمت ایک روپیہ (عہ) ہے۔ اور گلفروشس پبلشنگ ہاؤس۔ دھلی سے یہ دونوں کتابیں منگائی جاسکتی ہیں۔

"ش"

ایک ممتحن کی ترنگ

(بسلسلہ صفحہ ۶۶)

محبوب استدلال "تغیری دور" ایک مرد عورت بنتے ہوئے تغیری دور، سرمایہ داری کا آخری دور ــــ زندگی کی سرخ چڑھائی، سرخ رنگ میرا محبوب رنگ ہے، زندگی کا رنگ، شفق بھی سرخ ہوتی ہے اور یہ کوَر بھی تو سرخ ہے، ٹھیک ہے مجھے اب انہیں دیکھ لینا چاہیئے ہر کاپی سے ایک جملہ، چپراسی اب انہیں واپس لینے آتا ہی ہوگا۔ میری آمدنی تین سو روپیہ، روشنی، سرخ، زندگی .....

ارتضیٰ حسین

ہر سال ساقی کے دو خاص نمبر شائع ہوتے ہیں مستقل خریداروں سے ان کی قیمت الگ نہیں لی جاتی۔ قیمت فی پرچہ چھ آنے

دہلی

جرعات

ساقی ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے چندہ سالانہ پانچ روپے ششماہی تین روپے مع محصول ڈاک۔ ممالک غیر [illegible] شلنگ

جلد ۲۴ — ساقی دہلی۔ بابت ماہ ستمبر سنہ ۱۹۴۱ء — نمبر ۳

ضروری اعلان

جو مسودے ساقی کیلئے موصول ہوتے ہیں اُنہیں حفاظت سے رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاہم اس بارے میں دفتر ساقی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا۔ اس لئے اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھا کیجئے۔

جو مضامین قابل اشاعت قرار پائیں گے صرف انہی کے بارے میں مزید مراسلت کی جائے گی۔ مضامین ایڈیٹر ساقی کے نام بھیجئے [illegible]

ساقی ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو بھیجدیا جاتا ہے۔ پرچہ نہ پہنچنے کی شکایت ۱۰ تاریخ تک کرنی چاہیئے۔ اسکے بعد پرچہ دوبارہ [illegible]

تبدیلی کا نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے ورنہ تعمیل ارشاد ممکن نہ ہوگی۔ جواب طلب امور کیلئے محصول ڈاک بھیجنا ضروری ہے۔ [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

...ولین۔ عظیم بیگ چغتائی بھی بچھڑ گئے

رنگِ خوں فلک میں گہرا نظر آتا ہے مجھے   آج دامن پہ کلیجا نظر آتا ہے مجھے

کس دل سے یہ خبر بد ناظرینِ ساقی تک پہونچاؤں کہ میرے حبیب لبیب اور دنیائے ظرافت کے بے مثل ادیب مرزا عظیم بیگ چغتائی طویل علالت کے بعد ۲۰ راگست کو ہم سے ہمیشہ کیلئے جدا ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم چار سال سے صاحب فراش تھے۔ چلنے پھرنے سے معذور تھے۔ تیز تیز بخار چڑھتے تھے۔ شدت کی کھانسی سے سانس سینے میں نہیں سماتا تھا۔ ڈھیروں جیتا جیتا خون تھوکتے تھے اور جب اُن کی زندگی کی طرف سے مایوسی ہوجاتی تھی تو اُن کی حالت سنبھلنے لگتی تھی اور مرض کو افاقہ ہوجاتا تھا۔ یہ حالت اُن کی برسوں رہی ہے، برسوں! جب طبیعت ذرا سنبھل جاتی تھی تو اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کیلئے مضامین اور کتابیں لکھا کرتے تھے۔ صرف اُردو سے جب کام نہ چل سکا تو ہندی میں بھی لکھنے لگے تھے۔ یوں اردو میں بھی جتنی اُن کی قدر ہوئی شاید ہی کسی آجکل کے مصنف کی ہوئی ہو لیکن ہندی میں ان کی زیادہ قدر ہوئی۔ کیونکہ ہندی میں ظرافت نگاری واجبی واجبی ہی ہے۔ اُردو رسائل میں اُنہوں نے جتنے مضامین لکھے (اور اُن کی تعداد سینکڑوں پر ہے) جہاں تک مجھے یاد ہے کسی ایک مضمون کا معاوضہ بھی اُنہوں نے نہیں لیا بلکہ اگر کوئی معاوضہ پر اُن کو لکھوانا چاہتا تھا تو بُرا مانتے تھے اور چڑ جاتے تھے۔ کتابوں کی رائلٹی البتہ لیتے تھے لیکن جہانتک ممکن ہوتا تھا کم۔ ہندی مضامین کا معاوضہ لیتے تھے۔ فرماتے تھے کہ ان سے معاوضہ اس لئے لیتا ہوں کہ یہ لوگ دے سکتے ہیں۔ ساقی سے چغتائی صاحب کو والہانہ شیفتگی تھی۔ اس کا ثبوت وہ "چغتائی نمبر" ہے جو اکتوبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوکر مقبول ہوچکا ہے۔ آخری چند سال میں بیماری کے حملوں سے جب کبھی بھی موقع ملتا تھا کچھ لکھ لیا کرتے تھے اور جب مضمون پورا ہوجاتا تھا تو ساقی کے لئے بھیج دیا کرتے تھے۔ اُن کا آخری مضمون سالنامۂ ساقی ۱۹۴۱ء میں "برتھ کنٹرول" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اسکے بعد ان کی حالت اتنی نازک ہوگئی تھی کہ خط کی چند سطریں لکھنے میں بھی اُنہیں تکلیف ہوتی تھی۔ ۲۷ جولائی کو اُن کا چند سطری کارڈ آیا تھا۔ لکھا تھا۔ "شاہد بھائی کو معلوم ہو حالت ابتر ہے۔ خاتمہ قریب ہے۔ خط کا کیا جواب دوں؟ لکھنا لکھانا ناممکن۔ اسہال ہیں پیپ پیر ورم اور چہرے پر۔ جنبش مشکل۔ سخت تکلیف و یاس کی موت ہے۔ آپ سے اور مل لیتا!" میں نے فوراً جوابی تار دیا۔ اگلے دن جواب آیا:—

"Condition hopeless. See." ۲ راگست کی صبح کو جودھپور پہونچا۔ چغتائی صاحب کو دیکھا تو سکتہ میں رہ گیا۔ مہینے پہلے اور اب میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ آنکھیں نیم وا، چہرے پر مُردنی، جنبش تک مشکل۔ بہت کمزور آواز میں سلام کا جواب دیا اور آنے کا شکریہ ادا کیا۔ بہت مدھم نحیف آواز میں بولتے تھے۔ میں نے کہا "یہ کیا حالت ہوگئی؟" فرمایا "بس اب ختم ہے" آبدیدہ ہوگئے۔ بہت دیر بعد بولے "بولنے میں بہت ... ہوتی ہے۔ سخت تکلیف ہے" ملازم نے دو گھونٹ چھاچھ کے پلائے۔ چوبیس گھنٹے میں کل یہی غذا پہونچتی تھی۔ طبیعت کچھ بحال ہوئی تو آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ ساقی کی اشاعت اور مالی حالت کو پوچھا۔ بعض دوستوں اور بعض عزیزوں کا ذکر کیا۔ دوسرے دن طبیعت کچھ بہتر تھی۔ زیادہ باتیں کیں۔ ایک آدھ بات پر مسکرائے بھی۔ مرنے کا یقین ہوچکا تھا۔ فرماتے تھے کہ "میں دنیا سے ناکام یا نامراد نہیں جارہا ہوں۔ میں نے جو کام بھی کیا اس میں مجھے کامیابی ہوئی۔" دوسرے دن رات کو اُن سے رخصت ہوا۔ ہاتھ اُٹھا کر شکریہ ادا کیا اور بڑی مایوس نظروں سے دیکھکر رخصت کیا۔ شاید انہیں معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ ۸ راگست کو اُن کا آخری خط آیا۔ "بھئی مجھے جیسے بنے ہیٹے نیو ایک سو بھیجدو۔ ایک آگ ہے کہ بھڑک رہی ہے۔ حلق میں انگارہ۔ یہاں کوئی بھی کچل نہیں سوائے حق کے ممکن کیا۔" اور وہ ناپید ہو اسکے بعد اُن کا کوئی خط نہیں آیا۔ ۱۲ راگست کو اُنکے بڑے لڑکے کا خط آیا تھا کہ "اب حالت پہلے سے کچھ بہتر ہے" ۲۰ راگست کو تار آیا کہ "عظیم بیگ کا انتقال ہوگیا۔" ع۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! عظیم بیگ چغتائی کی موت اردو ادب کیلئے ایک سانحہ عظیم ہے۔ عرصہ دراز کے بعد ایک ظرافت نگار پیدا ہوا تھا۔ ع۔ خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود۔ اور اب عرصۂ دراز تک اس جگہ کا بھرنا ممکن نہیں جو چغتائی کے اُٹھ جانے سے خالی ہوگئی ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی قبر کو عنبریں کرے اور پسماندگان کو صبر کی توفیق دے۔

"شاہد"

تحلیلِ نفسی۔

مزاح اور نفسِ لاشعور

نقاب اُتارنا (Unmasking) کسی فرد کو بے حرمت کرنے کے لئے مضحکہ خیز تضمین یا تشبیہ (Parody — [illegible]) اپنا راستہ سب سے الگ نکالتی ہے یعنی یادگار افراد کی شخصیت یا تقریر یا ادبی قسم کے شاہ‌پاروں میں تبدیلی کر کے ان افراد کی صفات اور افعال و الفاظ کے تطابق کو زائل کر دکھاتی ہے اگرچہ اس طرح وہ لوازم [illegible] سے مختلف راستہ اختیار کرتی ہے پھر بھی انبساطِ ظرافت پیدا کرنے والی صناعی میں ان لوگوں کے نقشِ قدم پر چلتی ہے۔ یہی صناعی نقاب اُتارنے میں بھی قائم ہے، نیز اس ضمن میں اس صناعی کے علاوہ ان تمام ظرافت انگیز افعال کو استعمال کیا جا سکتا ہے جن میں مختلف افراد کی حرمت آمد ہونے کی خاطر اُن کے جسمانی نقائص کی طرف توجہ مبذول کرائی جاتی ہے۔ یعنی نقاب اُتارنے سے یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ فلاں فلاں فرد جسے آپ حضرات دیوتا سمجھ بیٹھے ہیں فی الحقیقت ہماری ہی طرح کا ایک عام انسان ہے۔ اسکے ساتھ ہی اس صناعی کی طفیل وہ تمام اکتا دینے والا بندھا ٹکا نفسی عمل جو نفسی کمالات کے پس پردہ نہاں ہوتا ہے اسٹیج پر بے نقاب ہو جاتا ہے۔

مزاح کی صناعی کے ذکر میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ نفسِ لاشعور میں کام کرنے والے اُصولاتِ تحلیل کو نفسِ لاشعور میں لا کر آزادی عطا کرنے سے بہت زیادہ قسم کے مزاح پیدا ہوتے ہیں اُس وقت ہم اُن کے مزاحیہ عناصر پر ایمان نہ لائے تھے اور ان کو مضحک لطیفے سمجھتے تھے۔ شاید یہ فطرتِ مزاح سے ناواقفیت کا اثر تھا۔ بعد میں ہم نے صناعی خواب کی مدد سے ماہیتِ مزاح کا مطالعہ کیا تو پتہ چلا کہ یہ مزاحیہ عناصر ایک ایسے سمجھوتے کی پیداوار ہیں جو صناعیِ مزاح کے طفیل ایک مدلّل نقاد کی ضروریات اور "الفاظی تفریح" یا "نامعقول انبساط" کے درمیان وقوع پذیر ہوتا ہے، یہ سمجھوتہ طرفین کی ضروریات کو بدرجۂ اتم پورا کرتا ہے اور تنقید کی بارگاہ میں باریاب ہونے کیلئے نت نئے چولے بدلتا رہتا ہے۔ البتہ اس سمجھوتے کی حدود سے باہر نکل کر یہ کسی نقاد کی خواہشات کو پورا کرنا لازم نہیں سمجھتا اور اس وقت یہ ہمارے سامنے خالص نامعقولیت کے طور پر پیش ہوتا ہے۔ یہاں یہ دھیان رہے کہ ایک نقاد کی نظروں میں یہ مزاح تبھی نامعقولیت معلوم ہو سکتا ہے جب یہ ان خیالات کا استعمال کرے جو نفسِ لاشعور میں تو عام ہیں لیکن جن کو نفسِ شعور میں آنے کی بندش ہے۔

مزاح اور ظرافت کا سنجوگ۔ ایک نقاد کی نفسی صدائے احتجاج کو روکنے کے لئے "غلط تخیل پردازی" کو صناعیِ مزاح کی بدولت ظرافت خیز بنا کر عقل کی آنکھوں میں خاک ڈالی جاتی ہے یعنی نفسِ لاشعور کو شعوری آزادی دے کر انبساطِ ظرافت کی پیدائش ہوتی ہے اور یہ بہت آسان کام ہے۔ کیونکہ نفسِ لاشعور کو شعوری آزادی دینے میں شعوری تحقیقات کی نسبت بہت کم نفسی قوت خرچ ہوتی ہے اور یہی کفایت شعاری انبساطِ ظرافت کی آفریدگار ہے۔ ایسی فریب دہ تخیل پردازی کے استعمال سے پیدا ہونے والا نامعقول مزاح ظریفانہ عناصر اپنے ساتھ لگا لاتا ہے اور اگر ہم مزاح کے جملہ عناصر کی جانچ پڑتال کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں تو ہمارے پیشِ نظر محض ایک مضحک لطیفہ رہ جاتا ہے مثال، ایک گاؤں کے لوہار سے ایک ایسا جرم سرزد ہو گیا جس کی قانونی سزا موت تھی۔ فیصلہ کرتے وقت محقق کے ججوں نے لوہار کے بجائے گاؤں کے ایک درزی کو پھانسی پر لٹکانے کا حکم صادر فرمایا۔ کیونکہ اُن کے نزدیک ایک تو جرم کی سزا لمنی اللازم تھی دوسرے اس گاؤں میں درزی تو تعداد میں دو تھے اور لوہار صرف ایک ہی تھا۔

مزاح اور ظرافت کے تقابل میں ایک نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ مزاحیہ خوشی کی ابتدا تو نفسِ لاشعور کی حدود میں ہوتی ہے لیکن ظرافت یا کی نمائش کیلئے نفسِ لاشعور کی وادیوں میں قدم رنجہ فرمانا ضروری نہیں یعنی ظرافت کی بنیاد تو نفسی خرچوں کے تقابل پر قائم ہے اور یہ دونوں خرچ صرف حدودِ شعوری ہیں اس لحاظ سے مزاح ایک قسم کا چندہ ہے جو نفسِ لاشعور سے ظرافت کی سرکار میں پہنچتا ہے۔

ظرافت نقل اگرچہ نقل (Imitation — [illegible]) کا بہترین قسم البدل ادب ہے لیکن لو ادبی نقل کی فطرت کی پوری [illegible] سرکھتے کیونکہ ہم اس محض خالص نقل (Imitation [illegible]) کا اخذ بھی داخل [illegible] [illegible]

پر کچھ روشنی ڈالنے کے لئے مشہور فلاسفر برگسان ([illegible]) کے نظریہ کی چھان بین کرنا لازم ٹھہرتا ہے۔ برگسان کے نزدیک ہر وہ چیز جو انسانی جسم میں مشینی حرکات پیدا کر دکھائے مضحکہ خیز ہے۔ اور انسانی جسم کا ہر ایک اشارہ فعل یا رویہ اسی نسبت سے خندہ انگیز ہے جس نسبت کے وہ انسانی جسم کو ایک بے جان مشین بنا دے۔ برگسان "ظرافتِ نقل" کی تشریح کے لئے اپنے ہم وطن فلسفہ داں پیسکل ([illegible]) کے مشہور مقالے "خیالات" کی مدد لیتا ہے۔ اس مقالے میں پیسکل اس بات پر تعجب کا اظہار کرتا ہے کہ ہمارے لئے دو مشابہ چیزوں کا تقابل کیوں اکثر اوقات خندہ خیز ہوتا ہے حالانکہ علیحدہ علیحدہ ان میں سے کسی ایک چیز کا نظارہ کبھی بھی ہنسی پیدا نہیں کرسکتا۔ اس کا قول ہے کہ جاندار اشیا کو کبھی ایک دوسرے کی نقل نہ کرنا چاہیئے اور یہ کہ مکمل یگانگت یا اعادہ ہمیں لامحالہ طور پر کسی بے جان مشین کی یاد دلاتا ہے اور یہ یاد بنہایت خندہ خیز واقع ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس یاد کی بدولت انسان ذلیل ہو کر بے جان اشیا کے درجے پر جا پہونچتا ہے۔

اب برگسان کے اس نظریہ کو فرائڈ کے اصولوں کے سانچے میں ڈھلتا ہوا ملاحظہ کریں۔ تجرباتی تعلیم کی بدولت ہم ہر ایک جاندار کو ایک علیحدہ جگہ دیتے ہیں اور اسے سمجھنے کے لئے (احساس و ادراک) قوت کا علیحدہ خرچ برداشت کرنا لازم سمجھتے ہیں۔ "نقل" یا "فریب نظر" کے باعث کسی نئے خرچ اٹھانے کے امکان بند ہو جاتے ہیں۔ ان حالات میں ایک "نفسی مایوسی" پیدا ہوتی ہے جو ایک قسم کے نفسی چھٹکارے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس طور منتظر رہنے کا خرچ مد فاضل میں جا پڑتا ہے اور خندہ بے محابا کی راہ باہر نکلتا ہے یعنی نقل میں انبساطِ ظرافت کا منبع ماحول کی ظرافت نہیں بلکہ انتظار کی ظرافت ہے۔

انبساط ظرافت کے منبع کی تلاش میں ہم پھر پہلے میدانِ تقابل میں آ پہونچتے ہیں اس وجہ سے ہم یہاں تقابل کے ظریفانہ عناصر کی جانچ پڑتال کریں گے۔ اس چھان بین کے سلسلہ میں پہلا مسئلہ تقابل کی معقولیت کا مسئلہ ہے یعنی کیا ہم اس کی بدولت واقعی ایک ایسی مشابہت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو آگے سے موجود تھی۔ اگرچہ ایک چیز کا دوبارہ تقابل کرنا بھی کچھ کم باعث انبساط نہیں لیکن تقابل کی خوشی پیدا ہونے کے علاوہ اس میں چند در چند راستے ہیں مثلاً تقابل سے دماغی کاروبار میں کافی سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ یا ہر ایک تقابل (خصوصاً مادی اور غیر مادی اشیاء کا تقابل) میں ایک قسم کا تنزل اور نفسی کفایت شعاری پنہاں ہوتی ہے۔ خیال رہے کہ یہ تقابل فوراً ہی ظرافت پیدا نہیں کر دکھاتا بلکہ دو نوں چیزوں کا فرق آہستہ آہستہ عیاں ہو کر انبساطِ ظرافت پیدا کرتا ہے یعنی دونوں اشیاء کا فرق خندہ خیز نہیں ہوتا بلکہ وہ "خالی الذہنی خرچ" ([illegible]) تقابل کے پلڑوں میں رکھے جاتے ہیں اور ان کے فرق ظاہر ہونے سے انبساط و خندہ پیدا ہوتے ہیں۔

ظرافتِ تقریر

فرائڈ کا خیال ہے کہ غیر ترقی یافتہ مزاج بارہا ایک مضحکہ خیز اثر پیدا کر دیتا ہے۔ اس قسم کا نیم پختہ مزاج یا تو تخیل پردازی کے لاشعوری طور طریقوں کو برسرِ عام لانے سے پیدا ہوتا ہے یا مکمل اور غیر مکمل مزاج کا تصوری تقابل ہی اس کا خالق بنتا ہے۔ اس قسم کے مزاج کی مثالیں پیش کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ مروجہ استعاروں میں کوئی بدعت پیدا کی جائے۔ انگریزی میں ایک محاورہ ہے "کسی کی روٹی کی ٹوکری کو اونچا لٹکا دینا" (hang one's bread-basket high) یہ کنایہ کسی شخص کو مشکلات میں دھکیل دینے کے معنی دیتا ہے۔ شگفتگی پیدا کرنے کے لئے اس کو یوں تبدیل کیا جاسکتا ہے "کسی کا قلم دوات اونچا لٹکا دینا" (یعنی کسی ادیب کو مشکلات میں ڈالنا)۔ دیگر مثال، نظریۂ ارتقا کے حامیوں نے حیاتِ بہترین (Survival of the fittest) کی ترکیب بہت مشہور کر رکھی ہے یعنی ان کے نزدیک زندگی کی کشمکش میں جیت ہمیشہ طاقتوروں کے ہاتھ رہتی ہے۔ اس ترکیب کو رسوائے عالم ادیب آسکر وائلڈ نے بکمال خوبی سے رنگ دیا ہے فرماتے ہیں:-

"ڈاروِن کے اصول "فحش ترین کی حیات" (Survival of the vulgarest) کے سبب ہماری ادبی کاوشیں آپ اپنی ہستی کی وجہ جواز پیدا کرتی ہیں"۔ اسی رنگ میں علامہ اکبر الہ آبادی مرحوم کا شعر ہے:-

بجن تزئین پائے خود بہ بوٹ و ڈاسن پتلون　　　که سر سید خبردار د ز رسم و راہِ منزلہا

جیسا کہ اوپر کہا جاچکا ہے اس قسم کی ظرافت دو اسباب سے پیدا ہوتی ہے، یا تو خیال پیدا ہونے کی مشین کی نقاب کشائی سے یا پختہ اور خام مزاج کے تصوری تقابل سے لیکن یہ بھی خیال رہے کہ اکثر اوقات یہ دونوں اسباب بیک وقت سرگرم کار رہتے ہیں۔ ایک ساتھ [illegible]

ضرب ہے کہ بے معنی ترکیبوں کو یوں بے معنی ظرافت میں تبدیل کر دینے میں ایک قسم کے ادھورے پن کا ہاتھ ہوتا ہے۔

ادھورے پن کی ظرافت — اس ادھورے پن کے طفیلی ظرافت پیدا کرنے کے چند ایک اور بھی طریقے ہیں جن کی مدد سے بے معنی ترکیبیں کشت زعفران بن جاتی ہیں۔ مثال: معمہ: وہ کیا چیز ہے جو کھونٹی پر لٹکتی ہے اور جس سے ہاتھ خشک کئے جاتے ہیں؟ ——— اب معمہ کی متین اور سنجیدہ فضا اجازت نہیں دیتی کہ جواب میں "تولیہ" کہا جائے۔ کیونکہ اس طرح معمہ بیت ہو جائے گا۔ چنانچہ جواب دیا جاتا ہے: "مچھلی"۔ اعتراض اٹھتا ہے: "یہ تو بتاؤ کہ مچھلی کھونٹی پر کب لٹکتی ہے؟" جواب: "لیکن آپ اسے کھونٹی پر لٹکا سکتے ہیں۔" مگر اعتراض ہوتا ہے لیکن اس سے ہاتھ کون صاف کریگا؟ جواب: آپ کی مرضی ہے آپ کو کون مجبور کرتا ہے۔

دیگر مثال: چند ادیب کھانے پر بیٹھے خوش گپیاں اڑا رہے تھے ایک نے کبابوں کی بہت تعریف کی۔ دوسرا بولا: "کیوں جی آپ کے خیال میں یہاں پر بیٹھے بیٹھے چاند کو چھونے کے لئے کتنے کباب کافی ہونگے؟"

پہلا گویا ہوا: "ایک ——— بشرطیکہ وہ کافی لمبا ہو"۔

صاف ظاہر ہے کہ اس قسم کے معمے کسی طور پر عقل کا امتحان نہیں لیتے بلکہ اپنے ادھورے پن کی بدولت وہ بے معنی حماقت کے زمرے سے نکل کر ظرافت کے دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں اس طرح چند ایک مقررہ ارکان کے ادھورے رہ جانے سے لطیفے معمے اور دیگر فقرے جو اپنے آپ ظرافت پیدا کرنے سے معذور ہیں ظرافت پیدا کر دکھاتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک مثال غیر شعوری تقریری ظرافت کی ملاحظہ ہو۔ ایک نئے شادی شدہ جوڑے کی بات چیت:۔

بیوی: "میں کس قدر خوشی محسوس کرتی ہوں"۔

خاوند: "اور میں بھی تو ازحد خوش ہوں کیونکہ تمہاری خوبیاں میرے انتخاب کی دانشمندی کا اظہار کرتی ہیں"۔

اب تک ہم یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ "نفسی قوتوں کے خرچ کا فرق ظرافت پیدا کرنے کا اصلی سبب ہے"۔ اب موقع ہے کہ ہم اس نقطے کی مناسب چھان بین کریں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ خرچ کے اس فرق پر ظرافت کی بنیادیں قائم ہیں۔ لیکن ہمارا مشاہدہ ہمیں بتلاتا ہے کہ اکیلا یہ فرق ہمیشہ ہی ظرافت پیدا نہیں کر سکتا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس بنیادی پتھر کے علاوہ کن چیزوں کا استعمال مناسب ہے اور کن امور کی روک تھام ضروری ہے۔ اس بحث میں داخل ہوتے ہی ہمیں دو امور غور طلب معلوم ہوتے ہیں۔ ایک: ایسے واقعات موجود ہیں جن میں ظرافت کسی مقررہ نظام کے تحت اور بغیر کسی خاص وجہ کے پیدا ہوتی ہے؛ دوم: اس کے برعکس ایسے واقعات بھی پیدا ہیں جن میں ظرافت کا پیدا ہونا کسی مخصوص واقعہ کے انفرادی ارکان اور دیکھنے والے کا مخصوص زاویہ نظر پر منحصر ہوتا ہے۔ نیز بعض اوقات نفسی قوتوں کے خرچ کا زبردست فرق ناسازگار ماحول کو اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے اور اس طرح انتہائی ضبط کے باوجود ظرافت پیدا ہو جاتی ہے ——— تجزیہ کرتے پر پہلی قسم کے امور کی دو چھوٹی قسمیں ملتی ہیں یعنی ناقابل تردید ظرافت (Unavoidable Comic) اور اتفاقیہ ظرافت (Accidental Comic) تجزیہ کی نظروں کو اور گہرا گاڑنے سے ان دونوں چھوٹی قسموں کی لوازم صفات آشکار ہوتی ہیں۔ مثلاً دوسری قسم یعنی اتفاقیہ ظرافت کے ضروری عناصر مندرجہ ذیل ہونگے:۔

ا: عام طور پر ظرافت کی خوشی پیدا کرنے کا سب سے بڑا سبب ایک قسم کی عام خوشی کی حالت ہے جس کے ماتحت انسان پہلے سے ہنسنے ہنسانے پر آمادہ رہتا ہے۔ اس کیف پرور حالت میں تقریباً ہر چیز ظرافت بداماں نظر پڑتی ہے۔ اس کے برعکس جب کسی فرد پر خوشی کی یہ حالت (جسے Good humour کہتے ہیں) طاری نہ ہو تو اسے ہنسنے ہنسانے کے لئے ظرافت اور مزاح کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر کسی فرد کو ہر طرف سے خوشی کی لہریں نہ پہونچ رہی ہوں تو وہ اپنے لئے یہ لہریں (مزاح یا ظرافت کے ذریعے) کسی ایک طرف سے پیدا کر لیتا ہے۔

ب: اس طرح کی ایک اور حالت جو ظرافت کے لئے ازحد سازگار ہے آنے والی ظرافت کے انتظار سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ایک فرد ایک ظریفانہ ڈرامہ دیکھنے کے لئے جاتا ہے وہاں جا کر وہ ان حرکات پر بھی اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے گا جو روزانہ زندگی میں بھی اسے ظرافت کی خوشی نہیں دے سکتیں۔ یہ سب کچھ ظرافت کے انتظار سے ہوتا ہے۔ انتہا کے واقعات میں وہ اپنی اس ہنسی کو یاد کر کے ہنستا ہے [illegible]

[illegible] کو ان کے ربط کرنے سے پہلے دیکھکر اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔

اگر انسان پہلے سے کسی قسم اس میں مشغول ہو تو یہ فعل ظرافت کی خوشی کو ناسازگار ماحول سے ٹکرا دینے کا باعث بن جاتا ہے [illegible] [illegible] یا کسی خاص مقصد پیدا ہو رہے ہیں نفسی قوتوں کے خارج ہونے کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں اور ایسے موقع پر [illegible] [illegible] کے خرچ میں بہت زیادہ فرق ڈالنے والی حرکات ہی ظرافت پیدا کر سکتی ہیں۔

کسی فرد کی توجہ سیدھی اس تقابل پر پڑے جس سے ظرافت پیدا ہو رہی ہے تو ظرافت کے پیدا ہونے کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ [illegible] جسمانی حرکت یا دماغی جنبش کو کسی اور معیار کے مطابق پرکھ رہا ہو تو اس پر اس حرکت یا جنبش کے ظریفانہ پہلو بند ہو جاتے ہیں [illegible] حضرات لڑکوں کی جوابی کاپیوں میں غلطیاں دیکھ کر ان سے ظرافت کی خوشی محسوس نہیں کرتے بلکہ صرف نمبر وضع کرتے [illegible] [illegible] کی ان غلطیوں پر زور زور کے قہقہے لگاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ناچ سکھانے والے پروفیسر پر اپنے شاگردوں کی [illegible] حرکات کبھی بھی ظاہر نہیں ہوتیں اور یہی سبب ہے کہ اخلاق کی تعلیم دینے والا مبلغ بنی نوع انسان کی اخلاقی کمزوریوں سے ناواقف رہتا ہے حالانکہ ایک مزاح نگار ان تمام امور کو کمال صفائی سے انگلیوں پر گن کر دکھا دیتا ہے۔

[illegible] ظرافت پیدا کرنے والا امر اپنے ساتھ علیحدہ طور پر کچھ جذباتی لہریں بھی پیدا کر دکھائے تو ظرافت کی قوتیں خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ چونکہ عام طور پر ظرافت انفرادی اور شخصی چیز ہوتی ہے اس لئے اسے زندہ رکھنے کے لئے جذبات یا دیگر تعلقات کا فقدان لازم ہے لیکن اسکے ساتھ ہی اکثر اوقات یہ جذبات نفسی قوتوں کے خرچ میں زبردست فرق بھی ڈال دیتے ہیں اور ان حالات میں ہنسی، طنز یا ناامیدی کا بہترین [illegible] اظہار رہتی ہے۔

دوبارہ کوئی ایک موجودہ خوشی ظرافت کی خوشی کے ارتقا کی رفتار کو تیز سے تیز تر کر دیتی ہے، یہ ایک قسم کے اُصولِ انبساط [illegible] اور جمالیاتی مزاح کے تعلقات کی نقل ہوتی ہے۔

چلتے چلتے ایک آدھ فقرہ فحش اور شہوانی ظرافت کے متعلق بھی سن لیجئے۔ یہاں ابتداً ہم انسانی جسم کو عریاں کر دینے پر دھیان رکھیں گے۔ اتفاقیہ طور پر جسم کے کسی حصے کا کھل جانا ظرافت پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ عام طور پر یہ نظارہ حاصل کرنے کیلئے کتنی نفسی قوتوں کا خرچ اُٹھانا پڑتا اور اب کتنے کم خرچ سے یہ نظارہ حاصل ہو گیا ہے۔ اس قسم کی نظارہ بازی کے وقت، یا کوئی فحش لطیفہ سنتے وقت ہم مزاح کا فرد [illegible] بن جاتے ہیں اور جو فرد اس طور عریاں کیا جا رہا ہوتا ہے وہ ظرافت خیز بن جاتا ہے۔ ہم بہت پہلے کہہ چکے ہیں کہ مزاح نظارہ بازی اور فحاشی کا نعم البدل بن کر گمشدہ ظرافت کی خوشیاں واپس لانے والا ہے لیکن آپ نے اکثر خیال کیا ہوگا کہ چوری چھپے نظارہ بازی کرنے والا کبھی نہیں ہنستا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے، وہ اپنی نفسی قوتوں کو اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنے اور دیگر تدابیر اختیار کرنے میں صرف کر دیتا ہے اور اس طور ظرافت کے بنیادی لوازم عائد ہو جاتے ہیں۔ اسکے لئے نظارہ بازی میں صرف جنسی مشاہدات کا حظ باقی رہ جاتا ہے، اب جب وہ یہ واقعہ کسی دیگر فرد کو سناتا ہے تو وہ شخص جس کو چھپ کر دیکھا گیا تھا ظرافت کا ہدف بن جاتا ہے۔ وجہ یہ کہ اس حالت میں وہ تمام نفسی قوتیں جو پوشیدہ رہنے اور دیگر احتیاطی تدابیر اختیار کرنے میں صرف ہوئی تھیں خرچ ہونے سے بچ رہتی ہیں۔ فحاشی اور شہوانی فضا میں ظرافت کے پھولنے پھلنے کے کئی اور اسباب بھی پیدا ہیں۔ مثلاً اس کی بدولت یہ امر بخوبی ظاہر کیا جا سکتا ہے کہ انسان مادی حاجتوں کا کس قدر محتاج ہے یا اسکی بدولت رومانی محبت کے پس پردہ جسمانی ضروریات کو بے نقاب کیا جا سکتا ہے

[illegible] ظرافت اور مزاح کی چھان بین کے سلسلے میں خوش مذاقی ([illegible]) کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اِس ضمن میں ہم دیگر اُمور سے پہلو تہی کرتے ہوئے اس مسئلے کو مزاح اور ظرافت کے متعلق بنائے ہوئے اُصولوں پر پرکھیں گے۔

یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ تکلیف دہ اثرات ہمیشہ ظرافت کے اثرات کی پیدائش کے راستے میں حائل ہوتے ہیں، ایسے موقع پر ایک ایسا فرد جو اپنے آپ کو ان تکلیف دہ جذبات سے محفوظ نہیں رکھ سکتا ظرافت سے ناآشنا رہ جاتا ہے۔ حالانکہ دیگر افراد کے لئے یہی ماحول ظرافت پیدا کرنے کے لوازم سے مرتب ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ خوش مذاقی تکلیف دہ جذبات کی موجودگی میں خوشی حاصل کرنے کا

برہنہ خداداد شمشیر کر لے

فلک کو سمجھتا ہوں پہچانتا ہوں
ستاروں کی چالوں کو میں جانتا ہوں

ہے میری نظر میں طلسماتِ ہستی
مرے سامنے ہے بلندی و پستی

[illegible]ہوں میں ہے سبز باغِ بہاراں
نہ اترائے اتنا گلِ سست پیماں

مرے ناخنوں میں ہے فطرت کے دل کی
ہے معلوم جو قدر و قیمت ہے گل کی

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیوں ہو رہا ہے؟"
کوئی جاگتا ہے کوئی سو رہا ہے!

خبر ہے مجھے ہے زمانہ بلا کیا
ضمیرِ زمانہ کا ہے مدعا کیا

ہے تقدیر کیا اور تدبیر کیا ہے
پڑی ہے جو پاؤں میں زنجیر کیا ہے

قوانینِ فطرت سے آگاہ ہوں میں
کبھی خندہ ہوں میں کبھی آہ ہوں میں

نظر میں ہے سب انقلابِ زمانہ
ہے دھوکا ہی دھوکا شبابِ زمانہ

یہاں کی خبر ہے وہاں کی خبر ہے
میں وہ ہوں دو عالم پہ جسکی نظر ہے

ترا جوہرِ دل عیاں ہو رہا ہے
ترے ظرف کا امتحاں ہو رہا ہے

غموں سے پلاتے چلے جا رہے ہیں
تجھے آزماتے چلے جا رہے ہیں

بظاہر کرم جو نظر آ رہا ہے
کڑی آزمائش بڑی ابتلا ہے

نہیں بے سبب میل روح و جسد کا
ہے مدِ نظر امتحاں نیک و بد کا

ترے سامنے جو طلسمِ جہاں ہے
ترا رستمِ دہر! یہ ہفتخواں ہے

نظر جو تجھے ماسوا آ رہا ہے
حسینِ زمانہ! تری کربلا ہے

حقیقت میں ہے تو ہی شمشیرِ فطرت
ہے تیرے ہی قبضہ میں تقدیرِ فطرت

عنایت تجھے "آمریت" ہوئی ہے
ترے ذمہ تسخیرِ فطرت ہوئی ہے

برہنہ خداداد شمشیر کر لے
یہ تسخیر کر لے، وہ تسخیر کر لے

"خلافت" مگر "کبریائی" نہیں ہے
بغاوت آمیں بادشاہی نہیں ہے

امینِ حزیں سیالکوٹی

اخلاقیات

عادتوں کی ہے کسوٹی مبحثِ اخلاقیات
جس میں جانچی جاتی ہے انساں کی ایک ایک بات

عادتیں انساں کی اچھی ہوں یا وہ ہوں بُری
سب کی خبر جس مرتب کرتا ہے اخلاق ہی

کارخانۂ زیست کا چلتا ہے جو یہ روز و شب
قوتوں کی ہے ہم آہنگی ہی چلنے کا سبب

اس کے کل پرزے ہیں امیال و عواطف خواہشیں
آڑ میں جن کی نہاں ہیں ہر طرح کی کاوشیں

ہستیِ انساں جہاں میں ایسی ہے مصروفِ کار
کچھ نہ کچھ کرتی ہی رہتی ہے یہ اپنا کاروبار

ایک حد تک اس کو کہہ سکتے ہیں خود مختار بھی
اس کی خواہش ہے مرتب عزم اور افعال بھی

کس طرح کا چاہیئے انسان کو طرزِ عمل
کس طرح روشن کرے اپنے خصائل کے کنول

قوتیں اس میں ودیعت ہیں بہت سی ور صفات
مرکزِ لذات و میلانات ہے انساں کی ذات

حاجتیں ہیں مختلف اور بے شمار انسان کی
یہ وہ ہستی ہے جو خالی ہی نہیں رہتی کبھی

ہستیِ فاعل فقط انساں نہیں اس کے سوا
اختیارِ ذات کی کشتی کا بھی ہے ناخدا

عزم کے ہاتھوں میں رہتی ہے زمامِ اقتدار
یہ جدھر موڑے اُدھر مُڑتی ہے حسبِ اختیار

اپنی طاقت سے یہ جو بھی کام لے ہوگا وہی
مستعد بھی بن سکے گا کاہلی کی پوٹ بھی

پاس اس کے عزم اور افعال کا وہ ساز ہے
حسبِ خواہش جس کی اونچی نیچی کر سکتا ہے لے

منفعت بخش اور مضرت خیز یہ دونوں عمل
اس کے قابو میں ہیں جو چاہے کرے یہ برمحل

جو بھی نصب العین ہو اس کے ارادوں کا ہدف
باگ اپنے عزم کی انسان موڑے جس طرف

جو تنے مقصود کی جانب پہونچنے کے لئے
اپنے فعلوں کی مدد سے ممکنہ کوشش کرے

ایسے نصب العین اور مقصد کا پیہم جانچنا
اور اسی کی ٹوہ رکھنا کام ہے اخلاق کا

ہے یہ تعیینِ عمل کی ایسی یونیورسٹی
جس میں ہو جاتی ہے تکمیلِ حیاتِ انسان کی

لازمی ہے عزمِ انسانی کی غایت کا وجود
کیونکہ تنہا عزم پا سکتا نہیں ہرگز شہود

اس لئے اخلاقیات اس کا لگاتی ہے پتا
کونسی غایت ہے یا وہ کونسا ہے مدعا

اپنے فعلوں کے سبب سے کونسی ایسی ہے شے
جس کے حاصل کرنے کی کوشش میں ہے مصروف یہ

موڑتا ہے باگ یہ اپنے ارادے کی جدھر
کونسی غایت ہے وہ جو اس کے ہے پیشِ نظر

فکر کی حیرت فزا قوت ہے اس میں جاگزیں
[illegible] سے اپنی ماہیت کا یہ پرکھتا ہے نگیں

فکرِ انسانی یہ وہ قوت ہے جس سے خود یہی
دیکھتا ہے اپنی کہنہ ماہیت کی روشنی

یہ وہ قوت ہے جو اس قابل بناتی ہے اسے
غایتِ ہستی کو یہ اپنی محقق کر سکے

رہنمائی کے لئے افعال اور کردار کی
قاعدے، قانون اس سے وضع کرتا ہے یہی

اس سے انساں میں نمایاں ہوتی ہے اک اور چیز
جو روا اور ناروا میں کرتی ہے باہم تمیز

یہ سبق دیتی ہے انساں کو فقط اخلاقیات
کون سی ہے چیز اس دنیا میں مقصودِ حیات

الغرض اخلاقیات ایسا یہ اک موضوع ہے
ماخذِ افعالِ انسانی ہے جس کا نام ہے

اور محرک فعلِ اخلاقی کے جو ہوں دمبدم
مدعا، قانون ہر اک کے یہ گنتا ہے قدم

ہم اخلاق و رجحانات و افعالِ بشر
اصل ماخذ ان کے، سب پر رہتی ہے اس کی نظر

ایک طرز نت بھانت ان کو ترغیبِ عمل
کون دیتا ہے، کہاں ہے اس محرک کا محل

کوزہ نتیجہ عمل ذریعہ ہے انساں کے لئے
کس طرح خمخانۂ ایام میں ساغر پئے

ذاتِ انساں میں ہے اک صورت بداہت مستتر
خارجی طاقت کا جس پر پڑ نہیں سکتا اثر

فعلِ اخلاقی اور اس کی ضد میں باہم امتیاز
باطنی احساس انساں فاش کرتا ہے یہ راز

جب تلک اخلاقی مسائل کا نہ تھا کچھ تذکرہ
جادۂ اخلاق کا انساں میں موجود تھا

جس سے یہ کرتا تھا انساں ایسے طریقوں پر عمل
جو کہ اس کے اقتضائے وقت کے تھے ماحصل

ان کا ماخذ یا تو احساساتِ وجدانی تھے اور
مذہبی احکام کے شامل تھے جس میں طرز و طور

یا کسی فرقے کے تھے ایسے نمایاں فیصلے
جن میں اغراضِ عمل کے تھے معین قاعدے

نوعیت ایسے قواعد کی رواجی تھی مگر
جب کہ استعمال سے پیہم ہوئے شیر و شکر

رفتہ رفتہ لازمی سب بن گئے یہ قاعدے
ان سے پھر رسم و رواجِ خاص کے جھکڑ چلے

جس کی پابندی خوش اخلاقی کہی جانے لگی
اور بد اخلاقی ہوئی وہ شکل ان کی ضد جو تھی

کہتا ہے رسم و رواج پابجی کو زنجیر
نخلِ افعالِ مقدر کردہ کا ہے یہ ثمر

ان معین قاعدوں کی ہوتی ہے جب ابتدا
رفتہ رفتہ آگے بڑھتا رہتا ہے یہ سلسلہ

فلسفہ اخلاق کا اقوام کا رسم و رواج
جب مرتب کرتا ہے رہتی ہے پھر یہ احتیاج

کرتا رہتا ہے کہاں، کیوں اور کدھر ایسے سوال
پہلے کرتا ہے رواج و رسم کا یہ انحلال

بعد اس تحقیق کے یا ان کو کرتا ہے پسند
یا نہیں تو کھینچ لیتا ہے توجہ کی کمند

فلسفہ اخلاق کا لیتا ہے اخلاقی مواد
اور بناتا ہے اسی سے قاعدے حسبِ مراد

جو کہ اعمالِ بشر کی رہنمائی کر سکیں
عزم کے ساغر کو اس صہبا سے پورا بھر سکیں

غور سے دیکھیں تو پورا مبحثِ اخلاقیات
یہ وہ ہے درسِ عمل جس سے سدھرتی ہے حیات

ہے یہی عادات و کردارِ بشر کا راز جو
جو معین کرتا ہے انساں کا نہجِ گفتگو

تھے جو پہلے خاص اخلاقی تصور مستتر
اب رواج و رسم کی دنیا میں ہیں وہ جلوہ گر

ان کی صحت جانچی جاتی ہے اسی اخلاق سے
ذہن میں آ جاتے ہیں جتنے ہیں ان کے ہتھکنڈے

ہستی اشیا کی اخلاقی دلیلوں کے سوا
قدرِ اشیا کے تعین کا ہے جتنا سلسلہ

طرزِ تشکیلِ حیات اور ضبطِ افعالِ بشر
زیست کے تابندہ مقصد کا تحقق بے خطر

گتھیوں پر گتھیاں پڑتی ہیں اور بڑھتی [illegible]
ان کو سلجھاتا ہے پیہم ناخنِ اخلاقیات

فیلسوفوں نے برابر مختلف ادوار کے
ذیلِ اخلاقی مسائل دیکھے فکر و غور سے

انتہائی خیر کیا ہے کہ پیہم عمر بھر
جستجو میں اس کی رہتا ہے جو سرگرداں بشر

اگلے وقتوں میں ہوئے یونان میں جو فلسفی
ان سوالوں کا جواب ان کی طرف سے تھا یہی

کسبِ لذت، یا مسرت، مدعائے زیست کا
لذتیت کی ہوئی یونانیوں سے ابتدا

کیشِ لذت، مسلکِ وجدانیت کا ہے حریف
آج کل کے فلسفی کہتے ہیں انسانِ ضعیف

چاہتا ہے جب مسرت یا کہ لذت کا حصول
تابعِ عقل و خرد رکھنے کا ہے اس کے اصول

آنے والی لذتوں سے حظ اٹھانے کے لئے
چھوڑ سکتا ہے بشر موجودہ لذّت کے مزے

اس طرح کی ہیں سکوں آور یہ ذہنی لذتیں
زحمتیں معلوم ہوتی ہیں سراسر زحمتیں

ذہن کو ورزیست میں ثابت قدم رہ کر بشر
ہر بلا کے سامنے آجاتا ہے خم ٹھونک کر

شخص ذہنی لذّ اندوزی سے ہے ایسی بارگاہ
بے مصیبت جھیلے پا سکتا نہیں انساں یہ راہ

ذہنی لذت جب ہے اس کے لئے یہ ہے ضرور
جو خرد کے تحت تا آنے نہ پائے کچھ فتور

صحت جسم اور سکونِ نفس سے جو انبساط
ہوتا ہے حاصل وہ بنتا ہے ترقی کی بساط

ہیں یہ سب باتیں اسی طرز روش کی برکتیں
اس طریقے کے نتائج ہیں سراسر رحمتیں

ہو نہیں سکتا کہ انسان مہذّب زندگی
اس طرح کاٹے کہ وہ عقل و خرد سے ہو تہی

عدل و عزّت کی حیات ایسی نہ ہو جو بہرہ ور
مطلقاً لذت سے یہ بھی ہو نہیں سکتی بسر

ضبط سے انسان کا پیہم مصائب جھیلنا
مستحق کرتا ہے اس کو دائمی آرام کا

آدمی میں ہے جو پنہاں حاسہ اخلاق کا
اس طرح کے حاسّے کا ماخذ و مبداء ہے کیا

باطنی تم کو یہ ماں گیا ہے جو رکھتا ہے بشر
کرتی ہے مجبور اس کے حکم کی تعمیل پر

غایتیں اور وہ مقاصد کیا ہیں جن کے کسب کی
اپنے اخلاقی عمل سے کرتا ہے جہد آدمی

اپنے فعلوں کے پرکھنے جانچنے کے واسطے
کونسی ایسی کسوٹی ہے کہ جو یہ کام دے

کس طرح معلوم کرتے ہیں یہ ہم اک خاص کام
فعل اخلاقی ہے یا اس کا ہے کوئی اور نام

کیسے کرتا ہے ضمیر انساں کا باہم امتیاز
یہ صواب اور یہ خطا، یہ خیر یہ شر کا ہے ساز

چند نسلوں، چند شخصوں، چند جگہوں پر جو کام
سمجھا جاتا ہے کہ اخلاقی ہے یہ پورا نظام

دوسرے ادوار میں اس کام کو برناڈ پیر
جانتے ہیں غیر اخلاقی سمجھتے ہیں حقیر

بعض نے غور و تامل سے دئے اس کے جواب
ایک حد تک ایسی کوشش میں ہوئے ہیں کامیاب

وہ یہ کہتے ہیں صواب و ناصواب خیر و شر
امتیاز ان میں کیا کرتی ہے خود طبع بشر

امتیاز ایسا ہر اک انسان میں موجود ہے
جو بتاتا ہے کہ یہ اچھی وہ ناکارہ ہے شے

اس میں کچھ رد و بدل ماحول اور حالات سے
ہوتا ہے لیکن ظہور اس کا ہی ہر اک ذات سے

ہر بشر بے واسطہ رکھتا ہے وہ علم نہاں
جس سے نصب العین اخلاقی کی قیمت ہو عیاں

اس طرح کا علم وجدانی ہے جو سیکھے بغیر
خود بشر محسوس کرتا ہے یہ شر ہے اور یہ خیر

یہ روش 'وجدانیت' کے نام سے موسوم ہے
کارلائل کے بھی مسلک کی یہی ہے خاص لَے

اور بٹلر کا بھی اس زمرے میں ہوتا ہے شمار
جرمنی کے کانٹ فشتے کا بھی ہے اس پر مدار

بالمقابل ان کے ہیں ایسے بھی اکثر فلسفی
جن کا دعویٰ ہے کہ خیر و شر کا طرزِ علم بھی

تجربے سے اور علموں کی طرح ماخوذ ہے
عمر، معلومات کے بڑھنے سے بڑھتی ہے یہ لَے

حاسہ اخلاق کا انساں میں وجدانی نہیں
تجربے کا ماحصل ہے سرِّ پنہانی نہیں

فعل صائب غیر صائب خیر و شر میں امتیاز
تجربے سے ہوتا ہے معلوم یہ پوشیدہ راز

اس خیال آرائی سے پیدا ہوئی اک تھیوری
'تجربیت'، 'ارتقائیت'، جو کہلانے لگی

ڈاروِن اور ولیس کی اک تھیوری ہے 'ارتقا'
ارتقا کی تھیوری پر اس کی قائم ہے بنا

ڈاروِن کی تھیوری قانونِ اخلاقی ہو کبھی
وِیمن، مِل، ہربرٹ اسپنسر کا اس میں نے کے
جسم پیداوار ہے جیسے حرارت کی ملال
نفس بھی حالات و کیفیاتِ ادنیٰ سے مدام
جو ہیں اخلاقی تصوّر، ان میں انساں بیشتر
فعلِ انسانی کی ہردم رہبری کے واسطے
ہے نتیجہ ارتقا کا جاتہٖ اخلاق کا
روشناسی ہوتی ہو انساں کی کس مقصود سے
کیفیت ایسی سکوں آور اور اطمینان زا
یہ ابیقوری یہی لیتے ہیں لذّت سے مراد
منطبق کرتے چلے آئے ہیں اکثر فلسفی
رندِ خم آشام مانے جاتے ہیں تحقیق سے
صدیوں سے جاری ہو جس میں پیشقدمی کا عمل
آگے بڑھتا رہتا ہے اعلیٰ کی جانب صبح و شام
تجربے سے کرتا رہتا ہے تغیّر بے خطر
عقل کا رہبر ہی ہے ہمراہ رہنے کے لئے
فعلِ اخلاقی ہے پیداوارِ کشتِ ارتقا
رہبری کردارِ اخلاقی کی آخر کس لئے
جو بشر کو محبسِ تلخی سے کرتی ہے رہا
جس سے رہتا ہو بشر اندوہ میں بھی شاد و شاد

فلسفے کی موشگافی روحِ انساں کے لئے
علت و معلول کا پھیلا ہوا اک سلسلہ
ہر گھڑی بڑھتا ہے آگے فلسفہ اس طور سے
اس کا یہ معلول وہ علت یونہی ہر گام پر
علت و معلول کی جب ختم ہو جاتی ہے راہ
سب کی خود علت ہو اور اس کی کوئی علت نہ ہو
صحنِ موجودات میں دیکھا گیا جو بارہا
آخری سرحد پہ آ کر اک وجودِ خاص کو
ذہن کے نزدیک بالکل غیر ممکن ہے یہ بات
چاہتا ہے فلسفہ اپنے انہی اوزار سے
کُند ہو جاتے ہیں سب اوزار اسکے ایک دم
آتی ہو مذہب کی پھر پُر رعب و پُر ہیبت صدا
ہیچ استدلال بن جاتا ہے اک طبلِ تہی
ڈینگیں استدلال کی تسکین تھوڑی ہیں جب
کس لئے اور کیوں کی جبتک رہتی ہے آلودگی
پوچھ گچھ کی پیاس بجھتی ہی نہیں ہرگز کبھی
فلسفے کی اس طرح بیچارگی کو دیکھ کر
کس لئے اور کیوں کا پھر رہتا نہیں کچھ اعتبار
بزم آرا تھے جہاں پہلے پُرانے فلسفی
اس مسیحیت نے جو کایا پلٹ کی فکر کی
اس طرح کے انقلابِ فکر کے آگے بھلا
چشمۂ اخلاق کو الحاد کے خاشاک سے
جمع کر سکتی نہیں تسکین کے اندوختے
جس میں کُل عالم کا عالم ہے بہم جکڑا ہوا
تجزیہ کرتا ہوا اشیا کا پیہم غور سے
جانچ پڑتال اس طرح کی رہتی ہے پیشِ نظر
ملتی ہے آخر میں سب کے اس طرح کی جلوہ گاہ
سلسلہ ہے علت و معلول کا زیرِ نگیں
علت و معلول کا پیہم تماشا جا بجا
مان لینا اس طرح جس کی کوئی علت نہ ہو
ایک ہی علت کی ہے معلول ساری کائنات
حسبِ سابق اس جگہ بھی تجزیہ پورا کرے
اور وہاں کیوں، کس لئے کا جب نہیں بڑھتا قدم
کانپ اٹھتے ہیں ادلّہ کے وہاں پر دست و پا
خود بخود وجدان کہہ اٹھتا ہے آمنّت بہٖ
راستی مذہب کی بنتی ہے تسلّی کا سبب
ایک لمحے کے لئے ملتی نہیں آسودگی
تشنگی بڑھتی چلی جاتی ہے استفسار کی
لیکے مذہب آتا ہے سرمایۂ روحِ بشر
غیب پر ایمان لانا ہوتا ہے انجامِ کار
مسندیں ان کی جگہ تھیں عیسوی زہّاد کی
ظلمتِ اوہام کی سرحد میں پھیلی روشنی
کیسے یونانی طریقے تھمے سکتے تھے ذرا
پاک و صاف ایسا کیا جیسا کہ ہونا چاہیئے

نیکیء سرمایہ دارِ کشورِ انفس ہے جو
جو مسیحیت نے وہی تعلیم دی ایسی ہی تھی
لگے وقتوں میں جو تھا اخلاق کا ہیچ صدا
کہتا ہے اس باب میں ہر حق کا ہر من لوٹنے
باقی ہے بالیدگی، نشو و نما و اقتدار
اقتدارِ ایسا یہودی کیش میں ہے خاص شے
وہ کمالات ہے یہ ہیں کہ جن کے واسطے
الفت بخشے اطاعت ایزدی احکام کی
زیستِ انساں کی غایت اور کمالِ انسان کا
ٹھیک استعمال فطری قوتوں کا برمحل
ہاں مسیحیت نے یہ لکھ دیا اخلاق کا
اعتنا ان پر نہیں زیبا ہے انساں کے لئے
روح کی فرماں روائی کا بڑھا اتنا اثر
ترکِ خواہشہائے فطرت کا قدم آگے بڑھا
آ گئی رہبانیت، مرتاضیت کے ساتھ ہی
اکتسابِ روحیت کے ولولے اتنے بڑھے
ہر گھڑی کی اس ریاضت نے نکالی اک یہ شو
خیر کا بامِ فلک فرسا ہے اس حد پہ بلند
ہو گئے ہیں بند اس کے منہ پہ ابوابِ نجات
کھول سکتا ہے انہیں یا رحم و لطفِ کبریا
عیسوی تعلیمِ اصلی اس خیالِ خام سے

کہتا ہے تجدید اقدار اس طرح کے طرز کو
جس سے آئینِ یہودیت نے پائی برتری
گونج اٹھی پھر اس صدا سے ساری مغرب کی فضا
اجتماعی ہو عمل یا انفرادی دونوں سے
جو کہ اخلاقی شعورِ خاص کا ہے رازدار
عزمِ ربانی کی ہیئت میں جو ظاہر ہوتا ہے
لازمی عدل و نکوکاری ہوئی ہر طرح سے
اور خلق اللہ کی الفت کی دل میں روشنی
اکتسابِ اکملیت کے لئے ساماں ہو گیا
ہے یہی اخلاقِ یونانی کا گویا ماحصل
جسم و خواہشہائے فطری کا ہے ادنیٰ مرتبہ
روح کی فرمانروائی ان پہ ہونا چاہیئے
زیست کے اغراض سے ہر ایک نے پھیری نظر
اور پھر عزلت گزینی کی بڑھی ایسی وبا
غیر فطری زندگی ہر اک کی بن کر رہ گئی
ہر طرف زہد و ریاضت کے بنے خلوتکدے
معصیت میں فطرتاً ہر آدمی محصور ہے
واں پہنچ سکتی نہیں انساں کی کوشش کی کمند
کیا مجال ان کو جو کھولے اقتدارِ کائنات
یا کبھی دستِ کلیسا ہوتا ہے عقدہ کشا
گر پڑی نیچے وقار و اعتلا کے بام سے

خود یہ نیکی کیا ہے اور انسان میں اس کا خیال
کہنے میں اک لفظ ہے لیکن ہے اشکال اس قدر
اس کی نسبت جتنے منہ اتنی ہی باتیں ہو چکیں
اس کی تعریفوں میں اس پر بھی تنوع ہی رہا
آگے بڑھ کر اصل و فرع دونوں زد میں آ گئے
خطۂ اخلاق میں گزرے ہیں یہ ایسے گروہ
ایک فرقہ ہے ضمیری اور افادی دوسرا
حسن و تقبیحِ فعل کا اصلی ممیز ہے ضمیر
اور افادیین کے نزدیک یہ سب سلسلہ
اختلاف ایسا افلاطون اور ارسطو کے یہاں
اس میں ایسا لے بی کورس اور زینو نے بھی حصہ لیا

کس طرح پیدا ہوا ہے غور کے قابل سوال
ہر زمانے میں اسے پرتالا ہے شام و سحر
کوششیں سب رفتہ رفتہ اپنی قوت کھو چکیں
ابتدا میں اختلافِ فرع سے زائد نہ تھا
دو گروہ اس اختلافی گرد سے ظاہر ہوئے
دشتِ فرہنگ و خرد کے ہیں یہ کوہِ پُرشکوہ
کشورِ اخلاق میں چرچا ہے جن کا جابجا
ہے یہ تحقیقِ ضمیریین کی سیدھی لکیر
ہے افادی حیثیت افعال کی اس کی بنا
پایا جاتا ہے مگر مجمل سا ہے اس کا بیاں
اور یورپ نے اسے تکمیل پر پہنچا دیا

یہ ضمیر جنت کہتے ہیں کہ کوئی بھی زباں
نیکی اور لفظِ افادیت ہے اِم معنی کہیں
ایسی صورت میں کوئی بھی کاریگ ایسا کہ جو
کس طرح اطلاق ہو سکتا ہے ان پہ نیک کا
اور افادی حیثیت اس فعل اور اعمال کی
ماننا ہوگا کہ نیکی کا وقار و منزلت
بہترین اخلاق کا سرمایۂ نازش ہے جو
اور مقدارِ مسرت نیز کیفِ ابتہاج
سخت افعالِ ذمیمہ لیں گے نورانی فضا
ہوگا پھر عفت فروشی کا محاسن میں شمار
ظلم کی تاریکیوں میں رحم ہوگا ناپدید
اس خرابی کے سوا یہ اور ہے، اک نیک کام
دوسرے کے واسطے یہ منفعت بخشی کبھی
ایسی حالت میں افادی حیثیت اسکی بھلا
چپ نہیں رہتی افادیین کی اس سے زباں
جب افادی حیثیت نیکی کی بعدِ علم پھر
تذکرے کے وقت فعلِ نیک کے یہ کیوں کہا
ہم اگر مانیں ممیز نیک و بد کا ہے ضمیر
اچھا، اک سفاک رہزن بیکسوں کے خون کی
وہ بُری عادت ہے اس بدکار و بدکردار کی
جب متاعِ زندگی کا دیکھتا ہے کارواں
اس طرح کرتا ہے پیہم طائرِ جاں کا شکار
ناتواں آہوں کے ہنگامے کو کرتا ہے پسند
بسملوں کی کروٹیں اس کے لئے جوشِ سبو
دو سرا رنج و الم کے تیروں سے سینہ فگار
اضطرابِ سوزشِ پنہاں ہے جس کی زندگی
سوزِ دل کا ہر طرف چھایا ہوا گہرا دھواں
اس پہ بھی صبر و رضا کا جگمگتا ہے ساتھ ساتھ
تلخیوں کی دھوپ میں ہمت شکن سامانِ یاس
پاسِ ناموسِ شرافت کا ہے اس کو ہر گھڑی
سختیاں سہہ سہہ کے حاصل کرتا رہتا ہے معاش
امتیازِ نام کی کیسے کھنچے ان میں لکیر
یہ ضمیرِ خود نما کا بھی عجب ہے فیصلہ

اس سے خالی ہے کہ اس میں اس طرح کا ہو لگا
جس سے بھی پوچھیں جواب اس کا یہی ہوگا نہیں
اکتسابِ منفعت ہی کے لئے وہ کام ہو
جبکہ نیکی اور افادیت کے معنی ہیں جدا
یہ اگر مانیں کہ نیکی کی محرک ہے یہی
پست ہو جائے رہے کچھ بھی نہ اوجِ مرتبت
سب کا سب بے اعتنائی کی فضا میں غرق ہو
ہو اگر ان کے مدارج پر تو یہ ہوگا رواج
اور محاسن کو چھپانے کی ذمائم کی ردا
اور ایثار و سخا پستی سے ہوں گے ہمکنار
اور خود غرضی منانے کی جہاں میں روز عید
ہے کسی کے واسطے تو منفعت آور نظام
ہو نہیں سکتی ضروری اور نہ بالکل لازمی
کیسے نیکی کو معین کر سکے گی برملا
وہ اڑاتے ہیں ضمیریین کی یوں دھجیاں
نیکی نیکی ہی نہیں رہتی تو یہ کیسا ہے سِر
اس سے حاصل ہوتا ہے ایسا اور اتنا فائدہ
اور افعالِ بشر کا ہے یہ رہبر بے نظیر
ہاتھ رنگتا رہتا ہے ناپاک خواہش کے لئے
خون کے فواروں سے بجھتی ہے جس کی تشنگی
آتشِ ظلم و ستم کا پھیل جاتا ہے دھواں
خون کی دھاروں سے سینچا جاتا ہے صحرا الالہ زار
نالۂ پُر درد ہے اس کے لئے صوتِ پسند
زخمیوں کی ہچکیاں ہیں اس کی شرحِ آرزو
جس کا دل ٹوٹا ہوا امید مرنے کا مزار
داغِ دل رکھتے ہیں جس کے برق کی تابندگی
حسرتوں کے قافلے کا سر برہنہ ساربان
اور اسکے ہاتھ میں ہے ضبط و خودداری کا ہاتھ
دیکھتا ہے پھر بھی جھکنے پر نہیں ادنیٰ ہراس
جانتا ہے زندگی کی ہے یہی دولت بڑی
کوچۂ عزت سے ہٹتی ہی نہیں اس کی تلاش
اسلئے کہ دونوں کے دونوں ہی رکھتے ہیں ضمیر
رہبری کی ایک کی اور ایک کو دھوکا دیا

پھر جب مذہب ہدایت مانا جاتا ہے اسے
اپنا مذہب حق ہے کیوں منکر کا باطل کس لئے

کیوں کسی ملت کا پیرو دوسروں کو برملا
کہتا ہے عاصی، گرفتارِ ضلالت وجہ کیا

ذیل کی صورت بھی اسکے ساتھ ہے پیشِ نظر
وہ جو کرتا تھا سیہ کاری میں مدت بسر

اہلِ عالم کی نجاست سے تھا ننگِ روزگار
جن کے افعالِ قبیحہ باٹتے تھے اشتہار

جو ہوس رانی کے میخانہ کا تھا پیرِ مغاں
جیسے دشتِ عزم میں تھا معصیت کا کارواں

آج اس درجے پہ پہونچا اتقاء و زہد کے
اُس کی پاکی شرم آور ہے فرشتوں کیلئے

ایسے ہی وہ جو نکوکاری میں تھا ضرب المثل
آج وہ رندوں میں آتا ہے صراحی در بغل

منبرِ پرہیزگاری پر جو تھا معروفِ پسند
آج اسکے ہاتھ میں ہے ہرزہ کاری کی کمند

اس طرح کی عملیت کی بڑھی آگے جو ئے
جانچنا لازم ہوا آخر کہ وہ کیا چیز ہے

جو نمایاں فرق کر دیتی ہے باہم بے مشیر
صاف کہدیتی ہے یہ جھوٹا یہ سچا ہے ضمیر

یہ ضمیرِ خود نما رہتا اگر اک حال پر
جب بھی گنجائش تھی پوری بحث کی اسمیں مگر

اس کی گھٹ بڑھ دیکھکر جو ہو تحیر آفریں
نکتہ چیں ذہنِ رسائی کچھ یہاں چلتی نہیں

عمر، صحبت، تجربہ، توسیعِ معلومات کی
ان سے حالت اسکی ہوجاتی ہے بالکل ہی نئی

جب خیالاتِ بشر میں کچھ ہوا ردوبدل
ساتھ ہی اس نے بھی چھوڑا اپنے رہنے کا محل

ایک مدت تک کسی مذہب کا پیرو رات دن
جن عقائد کی پرستش میں ہوا ہے وہ مگن

وہ پرستارِ عقائد اک ذرا سی بات میں
بدگماں ہو کر رہا کرتا ہے انکی گھات میں

اسکی نظروں میں جو باتیں صدق کی ہمدوش تھیں
اب وہی سرمایۂ کذب و تنفر بن گئیں

ہو گئے اگلے عقیدے زینتِ بزمِ دروغ
ایسی حالت میں نئے مذہب کو دیتا ہے فروغ

مذہبِ دیرینہ کا ڈھا دیتا ہے نفرت کدہ
اور بناتا ہے عقائد کا نیا عظمت کدہ

اس طرح کی جب تلون ریزیاں ہوں دمبدم
پھر ضمیرِ خود نما کا کیوں نہ کھل جائے بھرم

آنکھوں نے جو صورتیں دیکھیں وہ استثنا کی تھیں
لیکن آئندہ روش اس کی یہ رہنے کی نہیں

مضحکہ آور کہیں گے اس کو اربابِ خرد
بے سروپا بات جو ہو کیا بھلا اس کی سند

رہبری کی آرزو اُس سے جو ہو بہروپیا
رہبری کا فرض ہرگز کر نہیں سکتا ادا

کر چکے ہیں جو ضمیریین تعریفِ ضمیر
وہ افادیین کی نظروں میں ہے بالکل حقیر

ہے ضمیرِ انساں کا ایسا حاسہ پابندِ راز
کیفیاتِ انبساط و غم سے ہے جو بے نیاز

وہ ہمیشہ رہبری کرتا ہے اس انسان کی
اور ترغیبِ نکوکاری بھی دیتا ہے یہی

تھی یہ تعریفِ ضمیر اب رہ گیا یہ پوچھنا
آدمی میں ہوتا ہے یہ حاسہ کب رونما

یہ ہے مستغنی مسرت اور الم سے کس لئے
بے نیازی کی بھی کچھ توجیہ ہونا چاہیئے

جو ضمیریین نے اسکے دئے اب تک جواب
وہ حریفوں کی نظر میں ہیں جوابِ ناصواب

تھا جو یورپ میں رواجِ مسلکِ اخلاقیات
ایک مدت تک بدلی اسمیں کوئی بھی بات

مارٹن لوتھر نے پائی تھی جو طبعِ موشگاف
اس کی جدت نے بدل ڈالا وہ بوسیدہ غلاف

اس کا رجحانِ حقیقی تھا حقیقت کی طرف
ماسوا کو اس روش نے کر دیا ہے برطرف

جب تک تھی تعلیم، انساں اپنی استعداد سے
آدمی کے جتنے ہیں افعالِ اخلاق اور عمل
فلسفے نے دورِ حاضر کے اسی کو دیکھ کر
اس طرح اخلاق کا درجہ بڑھایا ٹھیک ٹھیک
کانٹ نے اخلاق کا اتنا بڑھایا مرتبہ
کہتا ہے قانون کا ماخذ ہے انساں ساتھ ہی
اس میں ہے جو رُوحِ اخلاقی وہ ایسی ہے قوی
اس لئے کہ رُوحِ اخلاقی ہے بالکل بے نیاز
ہے جو یہ قانونِ اخلاقی کا محکم سلسلہ
اقتدارِ باطنی یا حکمِ اطلاقی یہی
آدمی اپنے فرائض کا بنا تا ہے محل

زیست کے مقصد کو پا سکتا ہی جب کوشش کرے
ان سبھوں کی ہے نمائش کا یہی دُنیا محل
اور اس سے ایک قدم آگے بڑھایا بے خطر
استواری میں کیا اپنے برابر کا شریک
بامِ رفعت اُس کا گویا آسماں سے مل گیا
رُوحِ اخلاقی بھی خود مختار ہے اپنی زندگی
خارجی احکام کی پروا نہیں کرتی کبھی
خارجی طاقت کا چلتا ہی نہیں اس پر ان سا زباز
حکم اطلاقی کہا جاتا ہے اس کو برملا
وہ ہے جس کے تحت اپنے عزم کی رکھکر کڑی
اس طریقے کو کہا جاتا ہے اخلاقی عمل

سیّد ابوالقاسم سرورؔ

لاروے

میرے [illegible] قریب ہی ایک چھوٹا سا گڑھا ہے،
جسے گزشتہ [illegible] کی [illegible] سے بھر دیا ہے۔ بالکل ایک چھوٹے
سے دل کی طرح جس میں [illegible] کے مدوجزر پیدا ہوتے ہیں، اس
گدلے پانی والے گڑھے میں بھی لہریں اٹھتی ہیں، اپنے محدود ساحلوں
سے ٹکراتی ہیں، فنا ہو جاتی ہیں۔

کبھی کبھی میں اپنے گھر کے پاس بانسوں کے ایک ٹھنڈ پر
[illegible] کھڑا ہو جاتا ہوں اور اس گڑھے میں ملیریا کے جراثیم سے
بھرے ہوئے گندے پانی کو بڑے غور سے دیکھتا ہوں۔ اسے
[illegible] میں کچھ ایسے بادل پیدا کرتا ہوں اور دال بگھارتی ہوئی
عزیزہ کو آواز دیتے ہوئے کہتا ہوں: "عزیزہ! اگر یہ گڑھا ایک
خوبصورت جھیل ہوتا تو کیا ہوتا؟"

عزیزہ حسب معمول ایک سوکھی سی ہنسی ہنستے ہوئے میری
بات کو دہرانے پر ہی اکتفا کرتی ہے اور میں سوچتا ہوں اگر یہ گڑھا
نیلے پانی کی ایک خوبصورت جھیل ہوتا تب بھی شاید عزیزہ کے دل
کی دھڑکن ویسے کی ویسی رہتی... لیکن اس کے باوجود جھیل کا
خیال آتے ہی میرے دل کا تمام جراثیم سے پٹا ہوا، گدلا پانی متحرک
ہو جاتا ہے اور میں جذبات کے ڈونگے پر بیٹھا ہوا پانی میں بہت دور
نکل جاتا ہوں۔ غالباً چاندنی رات ہوتی ہے اور میں وحشیانہ انداز
سے گاتا ہوں — اومری چاندنی راتوں کے خدا... اس وقت
مجھ پر ایک عجیب سی مجنونانہ کیفیت طاری ہوتی ہے اور میں خوشی اور
روشنی کے ہر پرتو کو خوشی اور روشنی سمجھ کر جھیل کے وسیع پانیوں
میں ڈوب جانا چاہتا ہوں۔ کاشمیری ڈل کے تمام وہ نظارے میرے
ذہن میں پیدا ہو جاتے ہیں جو میں نے کبھی نہیں دیکھے۔ البتہ
ہر سال دیکھنے کا تہیہ کرتا ہوں لیکن یا تو سرکاری حکم کی تعمیل میں
بندوقوں والی بارکوں کا ٹھیکہ ختم کرنا ہوتا ہے اور یا میرا مختصر سا
اثاثہ عزیزہ کے وسیع المقاصل پر ختم ہو جاتا ہے....

بارش کے بعد چاند سا ہوتا ہے اور چاند کے بعد بارش،
بارش چاند کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور چاند بارش کا پیش خیمہ تھی کہ
[illegible] شریر سر پہ ہاتھ پھولی کھیلتے ہوئے گھر سے بہت دور
نکل جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد دھوپ رہ جاتی ہے اور نام اللہ کا۔
کچھ دن تک تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ نام اللہ کا بھی نہیں رہا۔ فقط دھوپ
ہی دھوپ رہ گئی ہے، اور اس عالم میں ننھا بھورا سائیں، بابا چاچا
پریتم داس آنریری مجسٹریٹ اور چیپر کمٹ کے بیڈے میں لگی ہوئی
عزیزہ، کسی کو توقع نہیں ہوتی کہ ذخیرے کے پیپل اور لسوڑے مل کر
تالیاں بجائیں اور نہ ہی کسی کو شیشم سے گرتے ہوئے پتوں کے لئے
نوحے کی توقع ہوتی ہے۔ نباتات، چرند و پرند خاموش، انسان و
حیوان خاموش کھڑے ہو جاتے ہیں جیسے قدرت کے ممتحن نے ان سے
کوئی نصاب سے خارج سوال پوچھ لیا ہو۔ اس وقت پریتم داس کا
ہیبتناک ڈنگو (کتا) اور میں دونوں زبانیں باہر نکالے ہوئے اس
گڑھے کی طرف رجوع کرتے ہیں... گڑھے میں بارش نہیں، اس کی
حسین یاد باقی رہ جاتی ہے جسے دیکھ کر یہ بہشتی خیال آتا ہے — کبھی بارش
ہوتی تھی، کبھی بارش ہوگی۔

ایک شام بارکوں کے لئے بھوس لدوا چکنے کے بعد جب میں
اس گڑھے کے قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ گڑھے کے پانی میں [illegible]
چھوٹے چھوٹے دمدار مینڈک اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر تیر
رہے تھے۔ اور گڑھے کے ساحلوں پر لاتعداد لاروے چپکے ہوئے تھے۔
کبھی کبھی کوئی لاروا یکلخت اپنے سمندر کے ساحل کو چھوڑ دیتا اور
لاپروایانہ، کھلنڈرے پن سے اپنی دم کو سر کے ساتھ لگاتا، چھوڑتا
ہوا بہت دور تک پانی میں نکل جاتا۔ اور گڑھے کی تہ میں اگی ہوئی
نباتات پر بسنے والے کرمکوں کے درمیان میں سے ہوتا ہوا ابھر کے
ٹھکانے کو لوٹ آتا۔ دمدار مینڈک ان ننھے ننھے جھانجوں کی طرح
بے ڈھنگے انداز سے قلابازیاں کھاتے ہوئے کبھی سطح پر پہنچ جاتے
اور کبھی تہ میں بیٹھ جاتے۔ میں نے اسی ٹھنڈ پر کھڑے ہو کر ان
جھانجوں کی ناقابل فہم حرکتوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ [illegible]
بظاہر بے مقصد اور بے معنی طور پر ادھر سے [illegible]
تیرنے کیلئے مجبور کرتی ہے کہتے ہیں [illegible]
کونسی سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے [illegible]

پھر بھلا یہ انسان اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کہتا ہے لیکن
ان کے خیال میں انسان کی خود ستائی پر ہنسنے سے کوئی باز نہیں
رکھ سکتا۔ مینڈک اپنے آپ کو خدا کی بہترین مخلوق سمجھتے ہیں۔ اور
اسے جھٹلانے کے لئے ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے... پھر
خیال آتا ہے شاید یہ لاروے، یہ جراثیم، یہ دُمدار مینڈک پراگندہ
خیالات ہیں جو گڑھے کے دل میں اُٹھتے ہیں۔ جیسے کبھی کبھی بیٹھے
بٹھائے مجھے خیال آتا ہے کہ کل ڈھولن کی بڑی بہو میری طرف دیکھ کر
مسکرائی تھی، اپنی انگلیوں سے سامنے کے قصاب خانے کی دیوار پر
اپنی انگلیوں سے کوئی نشان بناتی تھی... جی ہاں، اس قسم کا خیال
بھی تو ایک لاروا، ایک دُمدار مینڈک ہی تو ہوتا ہے جو اپنے مخصوص
گھناؤنے انداز سے تیرنے کے لئے دل کے ساحل کو چھوڑ دیتا ہے۔
اور پانی میں بہت دُور، موٹے اور فضول نباتات کے آبی مرغزاروں
میں ہوتا ہوا پانی کی سطح پر نمودار ہوتا ہے۔ اس کے بعد جب یاد آتا ہے
کہ مجھے بھورے سائیس نے میری گذشتہ ماہ کی انگشتی مار لی ہے تو مجھ
سے نقصان پہونچانے کے ہزاروں منصوبے گانٹھتا ہوں۔ لیکن محسوس
کرتا ہوں کہ یہ خیال بھی ایک جھانجھا ہے جو کہ تیرتا ہوا دور پانی میں
نکل جاتا ہے لیکن پھر ساحل پر آ چمٹتا ہے۔ گویا ساحل اس کے لئے
محض ایک منزل نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے۔ بالکل ایک ایسی
حقیقت ہے جیسے میرے منہ پر خشخشی ڈاڑھی ہے اور میں اچھی طرح سے
جانتا ہوں کہ اس ڈاڑھی کو دیکھ کر ڈھولن کی بڑی بہو کبھی مسکرا نہیں
سکتی۔ کبھی قصاب خانے کی دیوار پر اپنی انگلیوں سے نشان نہیں
بنا سکتی۔ ایسے ہی جیسے میرا تمام اثاثہ عزیزہ کی ایک فضول، دیرینہ بیماری
پر ختم ہو چکا ہے اور اسی وجہ سے میں کشمیر دیکھنے کے ناپاک ارادے
کو دماغ میں گھسنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

جوں جوں دن گذرتے گئے گڑھے میں اور کثافت پیدا
ہوتی گئی۔ اور اسی ضرب کے سیدھے سے ریاضی قاعدے کے
مطابق مزید انڈے اور لاروے پیدا ہوتے گئے۔ مجھے ان بدزیب،
بے ڈول، نامکمل جھانجھوں سے ایک قسم کا اُنس پیدا ہو گیا تھا۔ میں
ان کے لئے اپنے دل کے کسی کونے میں محبت کا جذبہ پلنے لگا۔
ایسا ہی محبت کا جذبہ جو میرے دل میں اپنے بڑے بیٹے فخرو کے
لئے پیدا ہوتا ہے یا اپنی شیرخوار بچی خالدہ کے لئے... اس گڑھے
میں گو کہ خطرناک جراثیم پل رہے تھے لیکن میرا جی چاہتا تھا کہ
[illegible] عزیزہ کی [illegible] اور ننھے [illegible] کو ملیریا ہو جائے بلکہ مجھے،
عزیزہ اور میرے سب بچوں کو یہ بیماری لاحق ہو۔

مجھے ان لاروؤں سے ایسا ہی اُنس تھا جیسے کہ مجھے اپنے
پراگندہ خیالات سے محبت تھی۔ اب بھی جب کبھی صبح کو ٹھنڈی ہوا
چلتی ہے تو میں چارپائی پر بیٹھا ہوا اپنے پراگندہ خیالات کی مدد سے
دنیائے حقیقت کے تمام ناممکنات کو ممکنات سے ہمکنار کر دیتا ہوں
مثلاً سوچتا ہوں کہ گڑھے کے سامنے کوٹھی میں رہنے والے سیٹھ کے
بادشاہ کی نوجوان لڑکی خود بخود میرے پاس چلی آئی ہے... آج
میں نے بڑے سردار صاحب کی تجوریوں سے نوٹوں کے تمام بنڈل
اُچک لئے ہیں اور عزیزہ کو ساتھ لئے، ایک کار میں بیٹھا کشمیر کی طرف
بھاگا جا رہا ہوں۔ اب کشمیر کے نشاط باغ میں ہوں میں اور عزیزہ
بڑے بڑے شہرۂ [illegible] جو کہ ڈاکٹر نے اس کے لئے مفید بتلائے
ہیں کھا رہے ہیں۔ ہماری ٹانگیں پانی میں ہیں اور یہ اتھاہ پانی
ہمارے پاؤں کو چھوتا ہوا دور کسی نامعلوم جنگل کی طرف جا رہا ہے
اور جس طرح میں اپنے دل کو من مانی کارروائیاں کرنے کے لئے
کھلا چھوڑ دیتا ہوں اسی طرح لے گڑھے میں لاروؤں کو تیرنے
سے کوئی نہیں روک سکتا۔

اب جبکہ گڑھے کا پانی سوکھتا جا رہا تھا میں سوچنے لگا
ان نرم نرم جھانجھوں اور ان مدبّر مینڈکوں کا کیا ہوگا۔ کیا یہ چہل پہل
کبھی ختم نہ ہوگی۔ ایک دن گڑھے کا پانی سوکھ جائے گا اور یہ سب
ہو جائیں گے۔ جیسے میرے دل کی آبیاری نہیں ہوتی ہے اسی طرح اس
گڑھے کی آبیاری کبھی نہ ہوگی۔ میں ہر روز آسمان کے کسی کونے میں
لٹکے ہوئے بادل کو دیکھا کرتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک معمولی سا
بادل بادلوں کی ایک فوج کے ہراول میں آ جاتا ہے... لیکن اس دن
کمیٹی کا داروغہ اس گڑھے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ میں نے قریب کھڑے
ہوئے کنیر کے پتوں سے اس گڑھے کو ڈھانپنے کی کوشش کی لیکن
مکھی کی طرح صفائی کا داروغہ بھی طبعی طور پر غلاظت کے تمام
اڈوں سے واقف ہوتا ہے اور اس داروغہ کو بھی اس گڑھے کا
علم تھا۔ اس کے ساتھ رامو کہار، ایک خاکروب، دو نوجوان، نو
ملازم ہیلتھ وزیٹر ... انسانی تہذیب کے لاروے بھی آ رہے
تھے۔ وہ لوگ اس گڑھے میں لال دوائی پھینک کر تمام جراثیم
ہلاک کرنا چاہتے تھے۔ میں نے کہا ۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ
تم لوگ میرے فخرو کو مار ڈالنا چاہتے ہو، میری عزیزہ کو ہلاک کرنے چلے
آئے ہو... لاؤ تمہارا کام میں آسان کئے دیتا ہوں [illegible]

کہ تمام شدت سے [illegible] ہوں اور مچھر کی نسل کے رقبے میں جراثیم کو [illegible] میں [illegible] زیادہ کوئی بھی آپ کا مددو معاون ثابت ہوگا۔

[illegible] وزیر نے پُر فکر نگاہوں سے میری طرف دیکھا [illegible] نے تمام دوائی میرے ہاتھ میں دیدی کہ ہر روز صبح [illegible] سے تمام گڑھوں میں پھینک کر ان لاروؤں کا خاتمہ کر دیا کرو۔ میں نے اِن سب کو یقین دلایا، جس کے بعد [illegible] گئے۔ اور میں نے وہ لال دوائی واٹر ورکس کی بیس ہزار گیلن والی ٹنکی میں پھنکوا دی۔

میں حسبِ دستور ہریکے کی طرف سے آنے والی سڑک کے پاس پل پر ٹانگیں لٹکائے اُس گڑھے کے قریب بیٹھا تھا۔ اور مچھر میرے سر پر سُریلی تانیں الاپتے ہوئے اُڑ رہے تھے۔ میں نہیں جانتا ان بے بضاعت سپتکوں نے اپنی بھاشا میں کیا اور کون سا راگ الاپ رہے تھے اور کہہ رہے تھے، اے اللہ کے نیک بندے! تو نے ہماری اولاد کی خبرگیری کی ہے، ہم تیری اولاد کی خبرگیری کریں گے، اور انہیں جلدی اس دنیا کے جیل خانے سے نجات حاصل کر دیں گے۔ یعنی ملیریا کے سب سے زیادہ تندرست جراثیم عزیزہ اور خالدہ کے جسم میں داخل کریں گے۔ میں نے جواباً کہا اے میرے عزیز مچھرو! میں نے تمہاری اولاد کو بچا کر تم پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ ایک معمولی انسانی فرض ادا کیا ہے۔

گرمیوں کے شروع میں چھاؤنی کے ہیڈکوارٹرز ڈلہوزی جا چکے تھے۔ اور انگریزی رجمنٹ کے بھی نصف سے زیادہ سپاہی ڈلہوزی اور لوئر ٹوپا پہنچ گئے تھے۔ اِن دنوں ننھے بھورے کا بیکار ٹھٹھرا دن تھان پر بندھا رہتا۔ اور ہر روز دوپہر کو ایک بجے کے قریب زور زور سے ہنہنایا کرتا۔ شاید وہ اس بیدار رسال غدرے والے جوئے کو یاد کرتا تھا جو کہ چند دنوں سے اُس کے کندھے پر نہیں ڈالا گیا تھا۔ ننھے بھورے کا ٹٹو ان بیکاری کے دنوں میں یا تو کثرت سے پیشاب کیا کرتا یا اپنی پچھاڑی سے لید کو چاروں طرف بکھیر دیتا۔ اس کے علاوہ اسے عزیزہ کی دونوں بکریوں سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ ان بکریوں کے نام گنگی اور جمنی تھے اور انہیں عزیزہ منٹگمری آباد سے جہیز میں ساتھ لائی تھی۔ جب گنگی اور جمنی [illegible] کنگروؤں کو بجاتی ہوئی سبک رفتاری کے ساتھ اس کے پاس سے گذرتیں تو وہ اپنی ٹانگوں کو ہوا میں اچھال [illegible] اور وہ تاثرات مگتا وہ اپنے جسم کو گرد ہونے والی مکھیوں کی بجائے بے ضرر بکریوں کو اپنا دشمن سمجھ لیتا۔ ٹانگیں ہوا میں اُچھالنے سے بکھری ہوئی لید میں پلنے والے تمام مچھر اُڑنے لگتے۔ اور کیہر و خاکروب ان مچھروں کو بھگانے کے لئے فوراً اٹھ کر اور شیشم کے سوکھے ہوئے پتوں میں آگ لگا کر گہرا دھواں پیدا کر دیتا۔ پیشاب اور لید کے تعفن، مچھروں کی گھوں گھوں اور دھوئیں کی کثافت سے عزیزہ کا دل اور بھی ڈوبنے لگتا۔

جب بارش کے خدا نے میری عرضداشت مسترد کر دی اور گڑھا زیادہ سوکھ گیا تو میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے بچائی گھڑ کے مالی سے گینتی مانگی اور ننھے بھورے کے ٹٹو کی ناند سے لیکر اس گڑھے تک ایک نالی بنائی۔ اور صاف اور تازہ پانی کو نالی میں انڈیل دیا۔۔ گڑھا پھر لبالب بھر گیا۔ میں پھر شام کو تاڑی لیکر گڑھے کے پاس جا بیٹھا اور کھانستے ہوئے انکی تمام نقل و حرکت کا اندازہ کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اس تازہ اور شفاف پانی نے ایک ہی [illegible] کو اتنا کمزور کر دیا ہے کہ وہ ڈھاب کے کناروں [illegible] اور نہ ہی ان میں وہ پہلی سی چستی اور کھلنڈرا پن رہا ہے۔

اِن دنوں آنریری مجسٹریٹ کشمیر جا رہا تھا۔ اور اسکی چھوٹی بیوی، عزیزہ کو بطور رفیقہ کے ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ میں حقیقت حال سے واقف تھا۔ اور جانتا تھا کہ وہ عزیزہ کو بطور خادمہ کے ساتھ رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن میں اس بات کے لئے فوراً رضامند ہوگیا۔ محض اس وجہ سے کہ وہ خواب جن کی تکمیل میں ابھی تک اپنی زندگی میں نہیں دیکھ سکا اپنی عزیزہ کی زندگی میں پورے ہوتے ہوئے دیکھ لوں۔ اس کے علاوہ خنک ہوا اور مصفا پانی میسر آنے سے عزیزہ کی صحت بھی اچھی ہو جائے گی صرف راستے کے اونچ نیچ کی وجہ سے اس کا دِل ڈوبنے کا احتمال تھا۔ لیکن مجسٹریٹ کی اپنی کار تھی۔ مجھے یقین دلایا گیا کہ وہ لوگ اسے بڑے آرام سے کشمیر لے جائیں گے۔ میں نے ایک ناقابل بیان خوشی میں گنگی اور جمنی دونوں کو بیچ دیا۔ اور ان پیسوں سے عزیزہ کے لئے کچھ کپڑے سلئے اور ایک کمبل خرید لیا۔ اور ان لوگوں کے ساتھ اسے کشمیر روانہ کر دیا۔

مجھ جیسے لوگ جو اپنے تخیل کی مدد سے کثیف [illegible] میں ہی خوبصورت جنتیں دیکھ لیتے ہیں، قسمت [illegible]

گڑھوں سے سیر ہو جانے کی استطاعت نہیں دیتی ۔ ۔ ۔ ۔ اس وقت جبکہ جیٹھ کی ٹھنڈی ہوا کہ رہی ہوگی میں اس گڑھے کے قریب بیٹھا ہوتا۔ کام کے وقت کا بیشتر حصہ اس گڑھے کے پاس ہی گذرتا تھا۔ لیکن صاف پانی کی وجہ سے پہلے جھانجے مر چکے تھے۔ پچھلی [illegible] کے مالی نے مجھے بتایا کہ پانی کے باسی اور گندے ہو جانے سے اور کیڑے پیدا ہو جائیں گے۔ اور دمدار مینڈکوں میں بھی ویسی پہلی سی چستی عود کر آئے گی۔ ننھے بھورے کے ٹٹو کا پیشاب بھی اسی نالے کے راستے سے گڑھے میں آنے لگا ۔ ۔ ۔

اور ایک دن میری خوشی کی انتہا نہ رہی جبکہ میں نے پھر مینڈکوں لاروں کو پانی میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر اپنے مخصوص، بے ڈھنگے انداز سے تیرتے ہوئے دیکھا۔ پانی کے باسی اور پیشاب وغیرہ کی وجہ سے گندے ہو جانے سے گڑھے میں پھر ایک بار رونق پیدا ہو گئی۔ اور میں ایک گونہ مطمئن کھاٹ پر لیٹ کر زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگا۔

دھوپ اتنی تیز ہو چکی تھی۔ اور چوماسا اس آفت کا تھا کہ پل کے ارد گرد کا سارا رقبہ کھمبوں سے بھر گیا۔ لیکن اس دن سے میں نے کبھی آسمان کی طرف بارش کے لئے نہیں دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ آسمان سے تازہ پانی پڑتے ہی یہ کیڑے ہلاک ہو جائیں گے۔ اور جب تک یہ پانی پھر کثافت سے آلودہ اور باسی نہ ہوگا مزید لاروے وجود میں نہیں آئیں گے۔

چوماسے کے دوسرے دن بڑی موسلا دھار بارش ہوئی۔ اس وقت میں تنِ تنہا اپنی جھونپڑی میں بیٹھا اپنا پھٹا ہوا پاجامہ سی رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ لالہ کا دو ماہ کا بِل کیسے ادا ہوگا کہ باہر کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے فوراً اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ میرے سامنے تار کا ہرکارہ تھا۔ عمر یہی پینتیس برس کے قریب ہوگی۔ چہرے کے سیاہ رنگ میں سے دو سرخ ڈوروں سے بھری ہوئی آنکھیں پھٹی پڑتی تھیں۔ اس کی خاکی وردی تمام بارش میں بھیگ چکی تھی۔ اور پانی کے قطرے اس کی کنپٹیوں سے ہوتے ہوئے داڑھی کے بالوں سے قطرہ بہ قطرہ ٹپک رہے تھے۔ ایک انگلی سے چہرہ پونچھنے کے بعد اس نے خاکی بلوز کے نیچے سے ایک بھیگا ہوا لفافہ نکالا اور بولا "میاں! نیز دیز [illegible] کے مختار آپ ہیں؟"

میں نے بغیر جواب دئے اس بھیگے ہوئے لفافے کو ہاتھ میں لیکر کھولا۔ تار پریتم داس کی طرف سے تھا۔ لکھا تھا۔ "تریو کو بہاڑ کا تندرست پانی راس نہ آیا۔ اُسے کل پل ڈھائی بجے دوپہر کو ڈیپتھیریا کی شکایت ہوئی اور آج اچانک صبح کے سات بجے وہ مرگئی۔ چونکہ تمہارا ایک دن میں پہونچنا مشکل ہے اِسلئے میں ڈاکٹر کی سند لے کر اُسے دفنا رہا ہوں۔ اپنی رضامندی بذریعہ تار بھیجو"

میرے دماغ نے اس حادثے کی اطلاع کو قبول نہ کیا۔ میں نے فقط دروازے تک پہونچتے ہوتے اتنا کہا۔ "اے خدا! تو اپنی بارش کو تھام لے"

(اے۔ آئی۔ آر۔ لاہور)

راجندر سنگھ بیدی

نامعقول ڈراما

(رات کے دو بجے ہیں۔ ایک ہال ہے۔ سامان بالکل مختصر ہے۔ بیچ میں ایک میز ہے۔ دو ہی کرسیاں ہیں۔ ان پر آمنے سامنے دو شخص بیٹھے ہیں، جعفری اور جوہری۔ دونوں جوش میں بھرے ایک دوسرے کو غصے سے تک رہے ہیں۔

ہال کی ایک دیوار شق ہوتی ہے اس میں سے ایک ذی شکل ہے۔ جسے جو بھی سمجھ لیا جائے۔)

جعفری اور جوہری۔ (گھبرا کر یک زبان ہوکر) تم کون ...؟

جواب۔ عقل

جعفری اور جوہری۔ کیا کہتے ہو؟

عقل۔ (صدا لگانے کے لہجے میں) آزادی، موت ہے۔ قید، زندگی ہے۔ (معمولی آواز میں) دیکھو کوئی بھی چیز۔ لے لو، لوہے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا یا ایک سوئی لے لو۔ اس میں ناکہ ہے، نوک ہے اور بیچ میں اس کا دھڑ ہے اس لئے سوئی بذاتِ خود موجود ہے۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو یعنی اس کے حصّوں کو اس قید سے جس سے کہ بندھے ہوئے ہیں آزاد کر دو، سوئی فنا ہو گئی، لوہے کے ٹکڑے رہ گئے۔ ان میں سے ایک ٹکڑے کو لے لو یہ لاکھوں ذرّوں سے بنا ہوا ہے، ان میں سے ہر ذرہ بذاتِ خود قائم ہی نہیں ہے بلکہ ہر برابر والے ذرّے سے جدا بھی ہونا چاہتا ہے۔ اسی ہیجان میں ہے۔ لیکن پھر بھی نہیں ذرّوں کی دماغیت کے ایک حصّے کا مجمع اور اس لئے ایک زبردست قوت ان کو قید میں جکڑے ہوئے ہے تو لوہا قائم ہے۔ اگر یہ قید نہ ہو تو ذرّے سے ذرّہ میلوں اور کوسوں دور جدا ہوتا ہی چلا جائے۔

جوہری۔ کس پاگل خانے سے آئے ہو۔

جعفری۔ بالکل ہی دماغ خراب ہے۔

جوہری۔ کس کا لینا اور کس کا دینا۔ یہ کب ہندوستانی ہیں اور انہوں نے کب ہندوستان کو وطن سمجھا۔ آپ اپنا ذرّہ اور لوہے کا فلسفہ رہنے دیجئے۔

جعفری۔ ذرا سی جائداد کے واسطے بھائی بھائی کا گلا کاٹ ڈالتا ہے۔ یہ ملکی معاملات ہیں ان پر تو نسلوں کا دارومدار ہے۔ بس رہنے دو، جو مثال تم نے دی وہ قوموں پر نہیں عائد ہوتی۔

عقل۔ آزادی موت ہے قید زندگی ہے۔ ایک درخت ہوتا ہے جس میں کئی کئی ڈنگلے ہوتے ہیں، ہر ایک الگ ہوا میں پھیلا ہوتا ہے ہر ایک میں اپنے الگ پتّے ہوتے ہیں۔ ڈنگلوں کے علاوہ تنا اور جڑ اور ہر چیز ہوتی ہے۔ سب کے سب جب ایک دوسرے میں جکڑے ہوئے قید ہوتے ہیں تو شاندار درخت ہوتا ہے۔ پھولتا ہے پھلتا ہے، سایہ دیتا ہے، ہرا بھرا رہتا ہے، گرمی اور سردی جھیلتا ہے، طوفان اور بارش کا مقابلہ کرتا ہے لیکن اگر تنے کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ڈالی ڈالی اور جڑوں کے سوتے سوتے الگ کر دو، ایندھن کا ایک ڈھیر۔ چنگاری دکھا دو جل جائے گا، پانی پڑے گا سڑ جائے گا، آندھی آئے گی اُڑ جائیگا۔

جعفری۔ کیا بچوں کی سی باتیں سمجھا رہے ہو۔ ہم یہاں حکمراں ہوکر آئے تھے، اتنے دن انگریزوں کی غلامی کی تو خیر، لیکن یہ نہ ہوگا کہ جو کل ہمارے غلام تھے اب ہم ان کے غلام ہو جائیں۔ بس چپ ہو یہ ملکی معاملات ہیں۔

جوہری۔ چھ سو برس مسلمانوں کی غلامی کی، چھ سو برس انگریزوں کی بھی کریں گے پھر جو ہوگا سو ہوگا اور اگر پرمیشور کو منظور ہے تو جب اتنی طاقت پیدا کر لیں گے کہ انگریزوں کو نکال دیں تو پھر مسلمانوں کو نکال دینا یا ختم کر دینا کون سی مشکل بات ہے۔ ہندوستان ہمارا ہندوؤں کا وطن ہے، ہم اس کے مالک ہیں، اور ہم اور صرف ہم ہی اس کے مالک بنیں گے۔ یہ مسلے ہندوستانی نہیں ہیں۔ ان کو ہندوستان میں کوئی حق حاصل نہیں۔ زیادہ بھیجا نہ چاٹو جا کر کہیں بچوں کو سمجھاؤ۔ یہ ملکی اور قومی باتیں ہیں۔

عقل۔ آزادی موت ہے قید زندگی ہے۔ قوموں میں قومیں ضم ہوکر ایک بڑی قوم بنتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے ایک محل تیار ہوتا ہے۔ پہلے بنیادوں میں مٹی ڈالی جاتی ہے، اس کے اوپر بنیاد کے ردّے لگائے جاتے ہیں ان کو دبا کر دیوار کھڑی کی جاتی ہیں، دیواروں پر چھت بنائی جاتی ہے اس پر پلستر کا ہلکا سا [illegible] دیا جاتا ہے تو اس مجمع سے عالیشان محل وجود [illegible]

کے سے ہیں کوئی پہلے شامل ہوتا ہے کوئی پیچھے کوئی اوپر کوئی نیچے، اینٹ اینٹ اور ذرہ ذرہ اپنی اپنی جگہ پر قید ایک مستحکم عمارت ہے۔ لیکن جب دیواروں کی اینٹیں ہلتی ہیں، ہل ہٹ پلستر پلٹ دن ہم کو بانے پڑا رہا تو پلستر گر جاتا ہے۔ جب بنیادیں شور کرتی ہیں سو برس سے ہم دبے پڑے ہیں اب نکلیں گے تو دیواریں گرتی ہیں اینٹ اینٹ اور روڑا روڑا آزاد ہوتا ہے۔ موت آگئی۔ محل کھنڈر ہو گیا۔ ہندو سے مسلمان، شیعہ سے سنی، برہمن سے ویش۔ الگ ہوتے چلے جائیں ہندوستانی قوم ختم ہو گئی۔

جوہری۔ یار یہ عامیانہ باتیں ہیں۔

جعفری۔ بھائی کچھ پڑھے لکھوں کی باتیں کرو۔

عقل۔ آزادی موت ہے۔ قید زندگی ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب

موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

جوہری۔ بیت بازی ہونے لگی۔

جعفری۔ شاعری ہونے لگی۔

جوہری۔ تمہارا مطلب ہے کہ ہم پچیس کروڑ ہندو دس کروڑ مسلمانوں کے واسطے اپنی پرانی تہذیب کو خیرباد کہہ دیں۔

جعفری۔ جی نہیں بلکہ ہم دس کروڑ دھوتیاں باندھ لیں۔

عقل۔ آزادی موت ہے، قید زندگی ہے۔ جوں جوں انکے فرد سے فرد آزاد ہوتے گئے ترکوں کی موت آتی گئی۔ پھر سنبھلے، مل جل کر قید ہوئے اور ایسے کہ تیرہ سو برس کی پرانی تہذیب، لباس، خوراک، خیالات، رسم و رواج، مذہبی جکڑ بندیاں اپنی زندگی پر سے قربان کر دیں۔

جوہری۔ بس نکل جاؤ یہاں سے اسی میں خیر ہے۔ تمہارا مطلب ہے کہ گنڈوں کے گلوں پر چھریاں چلا کریں اور ہم بیٹھے بڑے توتے کا قاعدہ بدلتی عربی فارسی پڑھا کریں۔

جعفری۔ جی نہیں، چونکہ اردو میں فارسی کے لفظ بھی شامل ہیں اسلئے آپ قبر میں سے سنسکرت کا جنازہ نکال لائیے۔ چاہے مردے زندہ ہوں یا نہ ہوں لیکن مسلمانوں کے وقت کی بنی ہوئی اصلی ہندوستانی زبان اردو باقی نہ رہے۔ آپ کی تھلیا، کٹوریاں اور گھنٹے جب بجے ہوں تو ہماری تو اذان تک نہ ہو لیکن جب ہم نماز پڑھتے ہوں تو باجے بجتے چلے جائیں۔ دیکھو جی ظلم غصہ اور نہ بڑھاؤ سیدی طرح سے بس اب چپ ہو جاؤ۔

جوہری۔ یہ جھگڑے یوں نہ سلجھیں گے جب تک خون کی ندیاں نہ بہہ لیں گی یہ قضیہ ختم نہ ہوگا۔

جعفری۔ ہاں ہاں ٹھیک ہے بالکل ٹھیک۔ بس اس کا ایک ہی سمجھوتا ہوتا ہے کہ اگر ہم وہی مسلمان ہیں جو ایک کروڑ بھی نہ تھے اور چھ سو برس حکومت کی تو ہم ہی رہیں گے نہیں تو یہ ہی۔

عقل۔ آزادی موت ہے قید زندگی۔ تم ان کے قیدی نہیں ہو اور نہ وہ تمہارے قیدی ہیں۔ دونوں کی موت ہے۔ تم ان کے قیدی ہو جاؤ وہ تمہارے۔ نہ تم باقی بچو اور نہ یہ۔ ایک نیا اور زندہ مجسمہ تیار ہو جائے گا جس کی بھی محبت اور ہندی بھی لاڈلی۔ دونوں کے گلوں پر چھری چلتی ہے۔ ہندی کو قربان کر دو گائے کو بچا لو۔ کعبے کی طرف منہ کر کے نماز بھی پڑھو گے اور لالہ کے آگے سر بھی نہ جھکاؤ گے۔ دونوں طرح پر ذلیل بنیوں کی دہلیز بھی چاٹنا پڑتی ہے اور وہاں کعبہ بھی روس اور یورپ کے پیچھے چھپتا چلا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں دبوگے تو عرب میں ابھرو گے۔

جعفری۔ یہ ٹھیک ہے، یہ ٹھیک ہے، مگر ہمارا ان کا میل بہت مشکل ہے۔

جوہری۔ کہتے تو تم ہو سچے ہی، مگر بھائی دلوں میں ملنا مشکل ہیں۔

جعفری۔ ہم تو تیار ہیں یہ تو اپنی ہر بات پہ اڑے ہیں۔

جوہری۔ ہم ضد پر ہیں کہ تم اپنی باتوں پر اڑے ہو۔

عقل۔ آزادی موت ہے۔ قید زندگی ہے۔ موت الہ دائی موت سر پر سوار ہے، کل ہند کے لاشے پر رونے والا بھی کوئی نہ ملے گا۔ زندگی چاہتے ہو تو تم انکے قیدی بن جاؤ وہ تمہارے قیدی ہو جائیں۔ مگر ہاتھوں میں لیکر میل نہیں ہوتے۔ خاک پر بیٹھ کر سمجھوتے ہوتے ہیں محبت کے رشتے خون سے دامن پر نہیں لکھے جاتے جس قوم کو آسمانوں پر سے زندگی ملنے کو ہوتی ہے اس کے سب فرد بختے اپنے گھروں میں بیٹھ کر عہد کر لیتے ہیں کہ ہم آج اپنا سب کچھ دوسروں کو دیکر آئیں گے پھر روتے ہوئے گھروں سے نکلتے ہیں تو اس پنچایت میں ملنے ہونے کے واسطے کچھ ہوتا ہی نہیں۔ وہ سب اپنی باہوں میں باہیں ڈالکر ایک گھیرا بنا لیتے ہیں پھر ان کی انفرادیت غائب ہو جاتی ہے انکی زندگی نئی ہوتی ہے۔ ان کے اغراضِ زندگی نئے ہوتے ہیں ان کے ولولے نئے ہوتے ہیں۔ ان کے جذبے نئے ہوتے ہیں جیسے اگر ان سے کہو تمہارے دادا نے چتوڑ کا قلعہ فتح کیا تھا تو تمہارے دادا نے چتوڑ کے قلعے میں مقابلہ کیا تھا تو سب ملکر ہنستے ہیں۔

کہتے ہیں ہاں ہمت کے زمانے تھے ہمارے بہادر بزرگوں کے [illegible] کا ہی نتیجہ ہماری زبردست قوم ہے۔ جب ہم [illegible] جکڑے ہوئے تھے اب ہم بندھ گئے ہیں، بن گئے ہیں۔

جوہری۔ کہتے تو ہو پتے کی مگر [illegible] تمہاری الٹی ہے۔

جعفری۔ کیوں صاحب اگر آزادی موت ہے تو بس آپکے خیال میں [illegible] ہم آزاد ہیں۔

عقل۔ آزادی موت ہے [illegible] ہے۔ تمہاری قومی ہستی لا وجود ہے کیونکہ تم قومی قیدوں سے قطعی آزاد ہو، تم قومی ذمہ داریوں، قومی پابندیوں سے آزاد ہو۔ تم قومی پابندیوں، قومی قربانیوں سے آزاد ہو۔ تم آزاد ہو جس کا جی چاہے دامن پکڑو جدھر جی چاہے جاؤ۔ ہر آدمی اگر اپنی [illegible] آپ بنائے یا ڈیڑھ اینٹ کی اپنی مسجد آپ بنائے تو بھی آزاد ہے۔ گاؤں گاؤں کعبہ بناؤ، گھر گھر تیرتھ مناؤ۔ آزاد ہو۔ مسجدوں کو مندروں سے لڑاؤ، اردو سے ہندی کو لڑاؤ۔ کٹیا سے لوٹے کو لڑاؤ۔ آزاد ہو۔ آزاد ہو۔ جس کو چاہے اور جو جی چاہے کہو۔ آزاد ہو۔ [illegible] جو جی چاہے کرو۔ قومی پابندیوں سے آزاد جانوروں سے بدتر ہو۔ [illegible] گلے اور غول بنا کر رہتے ہیں تم آندھی کا کوڑا ہو اس لئے تمہاری کوئی ہستی نہیں ہے۔

جوہری۔ ہاں بھائی ہے تو یہ سب سچ لیکن بڑی مشکلیں حائل ہیں میل ہونا مشکل ہے۔

جعفری۔ کون کہتا ہے کہ حالت افسوسناک نہیں مگر دو قومیں اور دونوں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہے تو کیسے بنے یہ اکثریت کے زور پر ہم کو اقلیت کا خوف؟

عقل۔ آزادی موت ہے۔ قید زندگی ہے۔ تم ان کے قیدی ہو جاؤ وہ تمہارے۔ صوبجاتی اور مرکزی حکومتوں کے نمائندوں کو انتخابات میں ہندو مسلمانوں کی رائے سے اور مسلمان ہندوؤں کی رائے سے منتخب کئے جائیں۔ وہ تمہارے نگہبان ہو جائیں اور تم ان کے۔

جعفری۔ ہائیں کیا بات کہی، منظور بالکل منظور۔

جوہری۔ خوب سلجھایا اس گتھی کو ہم کو بھی منظور۔ مگر اس قربانی کے مسئلے کا کیا ہوگا۔ گئو ہماری ماتا ہے اور اس کی قربانی یہ لوگ کرتے ہیں ان کے مذہب کا فرض ہے۔

جعفری۔ سنکھ کی آواز ہمارے واسطے حرام ہے۔ یہ کہتے ہیں انکے [illegible] واسطے فرض ہے۔ اور جب ہم نماز پڑھتے ہیں جب ہی یہ سنکھ بجاتے ہیں۔

عقل۔ آزادی موت ہے۔ قید زندگی ہے۔ تم آزاد ہو۔ مذہب کی اینٹ کو محل کہو اور تم پر ذمہ داری کا بار نہیں کہ مذہب کے جو جو قلعے ڈھائے جائیں ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لو۔ ہر دوار کی پوتر زمین گھٹتے گھٹتے ہر کی پیڑی کے گز بھر چبوترے میں رہ گئی ہے۔ سجدوں کی وسعت جائے نمازوں پر غلافوں تک رہ گئی ہے۔ تو کچھ بھی نہیں مذہبی دیوار قہقہہ آہستہ سے ٹوٹ جائے تو سب ذمہ داریوں سے چپکے چپکے آنکھیں بند کر لیں۔ ستی اور غلامی مذہباً جائز تھے ناجائز ہو گئے۔ کیا سب بھول گئے؟ کیا در اصل مذہبی غلطیاں تھیں؟ نہیں تو پھر اذان، سنکھ اور گھنٹہ سب بند کر کے پر مذہبی نمائش بند، جلسوں میں مذہبی مباحثے بند، مذہبیت کی تبدیلی اور گائے کی قربانی بند۔ اردو کی قربانی بند۔

جوہری۔ اردو؟ اردو؟ اردو؟

جعفری۔ یہ ٹھیک ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔

عقل۔ آزادی موت قید زندگی ہے۔ اردو کی آزادی اردو کی قربانی ہے۔ ایک طرف تم دن رات عربی فارسی کے ایسے دقیق الفاظ بھرتے چلے جا رہے ہو کہ جو کبھی نہ رائج تھے اور نہ ہو سکتے ہیں۔ دوسری طرف تم زمین میں سے کھود کھود کر مردہ سنسکرت کے لفظ ٹھسا رہے ہو۔ آزادی آزادی۔ خود فنا ہو رہے ہو اپنی زبان کو فنا کئے دیتے ہو۔ اردو تمہاری زبان ہو رومن تمہاری لکھاوٹ ہونا چاہیئے۔

جعفری۔ بھئی تم جو کچھ کہتے ہو سب مانا۔

جوہری۔ یار تمہاری باتیں بالکل سچی ہیں میں بھی مانتا ہوں۔

عقل۔ آزادی موت ہے قید زندگی ہے۔ تم ان کی خوشیوں کے پابند ہو جاؤ وہ تمہاری۔ تم اپنی باتیں ان پر سے قربان کر دو وہ اپنی ضدیں تم پر سے قربان کریں پھر دونوں اس طرح ایک ہو جائیں کہ ہندو مسلمان الگ نظر نہ آئے۔ (یہ کہہ کر عقل پھر دیوار میں غائب ہو جاتی ہے۔)

جعفری۔ ٹھیک ٹھیک بالکل ٹھیک اور ہاں دھوتی کا استعمال بھی بند۔

جوہری۔ نہیں بھئی پائجامہ ممنوع دھوتی تو سیدھی سادی چیز ہے۔ پھر دیکھو کیسی ——

جعفری۔ لاحول ولاقوۃ۔ پھر وہی جاہلانہ ضد۔ انسانیت کا جامہ چھوڑ کر دھوتی ——

جوہری۔ آ گئے اپنے غنڈے پن پر، آخر تھے عرب اور افغانستان کی [illegible]

جعفری۔ (دانت پیس کر) آخر ہو نہ وہی ہندو بچے۔ [illegible]

مجھے خوشبو آتی تھی

رشیاں اور نیکاں دونوں بہنیں سارا دن بنفشہ چنتی رہی تھیں۔ ان کا باپ ستار محمد ایک کھاتا پیتا زمیندار تھا۔ اگرچہ پہاڑوں میں قابلِ کاشت زمین بہت کم ہوتی ہے پھر بھی اس کے اپنے تین چار ہل چلتے تھے۔ کاشت کے علاوہ اس نے تھیاگلی پہاڑ کا ٹھیکہ بھی لے رکھا تھا۔ یوں تو ایبٹ آباد سے لیکر کوہ مری تک سب پہاڑوں پر بنفشہ اگتا ہے مگر تھیاگلی سے زیادہ بنفشہ اور کہیں نہیں ہوتا۔ ہر سال کوئی ساٹھ ستر من بنفشہ اس اکیلے پہاڑ سے اترتا ہے۔ اپریل اور مئی کے دنوں میں ستار محمد کے صحن میں بنفشہ کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں سی کھڑی ہو جاتی تھیں۔ جب بنفشہ سوکھ جاتا تو بیل گاڑیوں میں لاد کر وہ اسے راولپنڈی لے جاتا، وہاں یہ سو، سوا سو روپے فی من کے حساب سے بک جاتا۔

ستار محمد ڈونگل کا رہنے والا تھا جو تھیاگلی سے تین میل نیچے ایک مختصر سا گاؤں ہے۔ پکا نمازی اور خدا پرست ہونے کی وجہ سے اسنے گاؤں میں ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کروالی تھی۔ اگرچہ ایک ملا کا انتظام بھی تھا پھر بھی ستار محمد علی الصباح اٹھکر نمازیوں کے وضو کے لئے سقاوے میں پانی گرم کرتا اور اپنے ہاتھ سے مسجد میں جھاڑو دیتا۔ کئی بار وہ نماز کے لئے لوگوں کو گھروں سے بھی کھینچ لاتا۔ گرمی کے دنوں میں تو مسجد میں خاصی رونق رہتی لیکن سردیوں میں جب برف پڑتی تو لوگ کئی کئی دن اپنے گھروں سے باہر نہ نکلتے۔ بسا اوقات تو ملا بھی بھاگ جایا کرتا۔ مگر ستار محمد ہمیشہ مسجد ہی میں نماز پڑھتا۔ وہ کہا کرتا کہ اس کا ثواب بہت زیادہ ہوتا ہے۔ لوگوں نے اسے کئی بار برف پر مصلے بچھا کر نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ کئی بار تو نماز پڑھتے پڑھتے اس کی پشت اور کانوں پر دو دو انگل برف جم جاتی تھی۔

دیندار ہونے کی وجہ سے سارا گاؤں ستار محمد کی عزت کرتا تھا لیکن اس کے احترام کی سب سے بڑی وجہ تھی بنفشہ کا ٹھیکہ لیکر اس نے اپنے گاؤں والوں کیلئے ایک مستقل ذریعۂ معاش مہیا کر رکھا تھا۔ پو پھٹتے ہی گاؤں کی عورتیں بنفشہ چننے کیلئے نکل جاتیں اور شام کو کوئی سات آٹھ آنے کی ڈول کر کے گھر کو لوٹتیں۔

رشیاں اور نیکاں بھی بنفشہ چننے کیلئے جاتیں اگرچہ انہیں اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ ان کا باپ بھی اس بات کو پسند نہ کرتا تھا کہ اس کی لڑکیاں عام عورتوں کی طرح پہاڑوں پر ماری ماری پھریں۔ کئی بار جب وہ علی الصباح جھولیاں باندھ کر بنفشہ کی فراہمی کے لئے گھر سے نکلنے لگتیں تو ستار محمد ان کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا اور پیار سے کہتا، "کدھر چلی ہو تم؟ تمہیں اس مصیبت میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ خدا کا دیا بہت ہے، آرام سے بیٹھ کر کھاؤ۔" مگر جب وہ نخرے اور لاڈ سے پہلو بچا کر چلی جاتیں تو وہ خاموش ہو جاتا اور کچھ دیر کے بعد ان کی ماں سے ذرا تلخی سے کہتا، "کئی بار تو کہہ چکا ہوں، بچیاں کو کچھ کہنے پر مجبور نہ کیا کرو، خود ہی سمجھا بجھا لیا کرو۔ مرد کے منہ سے یہ روک تھام جچتی نہیں۔ مگر تمہیں سمجھ بھی ہو؟"

نیکاں کی عمر کوئی بارہ سال کی تھی۔ اسکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ تمام گاؤں کی لڑکیاں تو بنفشہ چنیں اور وہ نہ چنے۔ نہ جانے اس کا باپ اسے کیوں روکتا تھا۔ حالانکہ وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں میں کسی سے بھی کم بنفشہ نہ چنتی تھی۔ بنفشہ کے گیت بھی اس کو بہت یاد تھے اور گائے جاتی تھی۔ ابھی کل ہی اس کی بوا سنو تے۔ ... بنفشے جھنجے تلے چکے" والا گیت سنکر اس کا ماتھا چوم لیا تھا۔ شاید اس کا باپ اس لئے روکتا ہو کہ کہیں کسی پہاڑی سے پھسل کر مر نہ جائے۔ ایک دفعہ جب وہ سامنے والی پہاڑی کی ڈھلوان پر اپنی بکری چھڑکے پیچھے بے تحاشہ دوڑ رہی تھی تو اس کا باپ آوازیں دے دیکر نڈھال ہو گیا تھا۔ اس کی آواز میں کتنی گھبراہٹ اور التجا تھی۔ یہ سوچکر نیکاں کو ہنسی آیا کرتی۔ لیکن آج تک کبھی اس کا پاؤں پھسلا تو نہ تھا۔ اپنی بڑی بہن کے بارے میں بھی اس نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ مگر وہ تو اکیلی لڑکی کو ہی اٹھا کر لے جاتا ہے اور وہ تو اپنی بہن کے ساتھ بنفشہ چننے جایا کرتی تھی۔

رشیاں کی عمر کوئی سترہ سال کی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا باپ اسے کیوں روکتا ہے۔ پھر بھی اس کا جی پہاڑوں کی اونچی چوٹیوں کی طرف لپکتا رہتا۔ یہی جنگلیں اور ان کی چیز بہاڑیں ابھی نہ ... ہرسال میں نو مہینے گاؤں کی پست اور محدود وادی میں محبوس رہنے وہ ایک عذاب سمجھتی تھی۔ گاؤں کے نیچے مکانوں اور تنگ گلیوں سے دن بدن اس کا من اچاٹ ہو رہا تھا۔ ...

اس کی نظر چھت پر پڑتی تو اُسے بے حد نزدیک دیکھ کر اُسے اپنے باپ کی فارغ البالی پر شک ہونے لگتا۔ کبھی بار وہ سوچتی کہ آخر ان چھتوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔ شاید سردی سے بچنے کے لئے۔ لیکن اُسے تو کبھی سردی نہ لگتی تھی۔ نہ جانے گاؤں کے بوڑھے کیوں بازار میں سیلوں بیٹھے دھیرج سے اُون کاتتے رہتے ہیں۔ شاید وہ اس سے کمبل، ٹوپیاں یا جوتیاں بنتے کیا ان سب چیزوں کی ضرورت بھی ہے۔ وہ خود تو محض ایک شلوار اور ایک کرتے ہی میں جاڑا گذار لیتی تھی۔ نہ جانے اس کا باپ گرم پانی کے ساتھ کیوں وضو کرتا تھا۔ وہ خود تو ٹھنڈے پانی میں ہاتھ مار کر لذت محسوس کرتی تھی۔ اُس نے کئی بار برف کے گولے بنا بنا کر اپنے گالوں سے لگائے تھے۔ گالوں پر ملے تھے۔ کچھ حرارت سی پیدا ہوتی۔ بیچ بیچ میں چنگاریاں سی بھی اٹھتی تھیں۔ اسکے علاوہ برف کا سفید سفید رنگ اسے کتنا پیارا معلوم ہوتا تھا۔ لومڑی کی طرح برف کو اپنی انگلیوں سے کھود کھود کر وہ بہت نیچے سے دودھ جیسی سفید برف نکال نکال کر گولے بنایا کرتی۔ اسکی ماں کہتی رہتی کہ برف منہ پر نہ ملا کر، گال پھٹ جائیں گے۔ ہونہہ! اُسکے گال تو کبھی نہ پھٹے تھے۔ ابھی پچھلے سال ہی فضل برھئی کی لڑکی نے اُسے بتایا تھا کہ برف ملنے سے منہ گورا ہو جاتا ہے۔ بھلا وہ کیوں اپنا منہ گورا نہ کرے۔ فضل کی لڑکی تو سارے بدن پر برف ملا کرتی تھی اسی لئے تو برف جیسی ہو گئی تھی۔ وہ اس سے کہا کرتی تھی تو بھی سارے بدن پر برف ملا کر۔ ایک دفعہ زبردستی اُس نے برف کی ایک مٹھی ریشماں کے گریبان میں نیچے لڑھکا دی تھی۔ کتنی ٹھنڈک تھی وہ۔ اس نے کتنا گدگدایا تھا۔ مگر جلد ہی فضل برھئی کی لڑکی کی شادی ہو گئی تھی اور وہ اپنی سسرال چلی گئی تھی۔ جب وہ لوٹ کر آئی تو اُس نے کہا تھا کہ اُس کی سسرال کا گاؤں پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے۔ وہ خود بھی کسی پہاڑ کی چوٹی والے گاؤں ہی میں اپنا بیاہ کرائے گی۔ اس کا اپنا گاؤں تو بہت پست تھا۔ نیچے ہی نیچے، نیچے ہی نیچے۔ جیسے کوئی کنواں ہو۔ اُسے تمام نیچی جگہوں اور ان کی چیزوں سے نفرت تھی۔ وہ اُوپر کی طرف چڑھنا چاہتی تھی، اونچے پہاڑوں کی طرف، چیلوں سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کی طرف، شاید اسی لئے وہ ہر روز نیکاں کے ہمراہ بنفشہ چننے جایا کرتی۔

آج ریشماں اور نیکاں سارا دن بنفشہ چنتی رہی تھیں۔ نیکاں کی جھولی پھولوں سے اٹی ہوئی تھی پر ریشماں کی جھولی میں دو چار ہی پھول تھے۔ آج اس کا جی کام میں نہ لگا تھا۔ وہ کچھ اداس اور برداشتہ خاطر سی تھی۔ عام طور پر وہ پہاڑ کی بلندیوں پر خوش رہا کرتی۔ مگر آج اونچی سے اونچی چوٹی پر چڑھ کر بھی اس کا جی نہ لگا۔

چھ بجے کے قریب وہ گاؤں کی طرف اترنے لگیں۔ تھیا گلی کی سڑک پر ایک نیلے رنگ کی کار آکر کھڑی ہو گئی۔ ایک انگریز اور اُس کی بیوی اندر سے نکل کر نیچے پھیلی ہوئی وادی کا نظارہ دیکھنے لگے۔ اپریل کے آخری دن تھے، برفیں پگھل چکی تھیں۔ کہیں کسی نکڑ میں برف کی کوئی تہ جمی رہ گئی ہو تو ہو۔ ویسے روئے زمین کا ہر ٹکڑا ہرا بھرا ہو گیا تھا۔ ریشماں نے دیکھا کہ گاؤں کی کچھ لڑکیاں میم صاحبہ سے کچھ مانگنے کے لئے اُس کے گرد ناچ رہی ہیں۔ ریشماں نے آج تک کسی مسافر سے کوئی چیز نہ مانگی تھی۔ اور وہ مانگتی بھی کیوں۔ وہ کسی معمولی باپ کی بیٹی تھوڑا ہی تھی۔ مگر گاؤں کی لڑکیاں چڑھائی کے دنوں میں سڑک کا کنارہ ہی نہ چھوڑتی تھیں۔ فضل برھئی کی بیٹی ایک بار کسی سے انگریزی صابن کی ایک ٹکیہ مانگ لائی تھی۔ اور اُس نے یہ ایک بار ریشماں کو بھی استعمال کرنے کو دی تھی۔ نہایت لطیف خوشبو آتی تھی۔

آج اُس کا جی بھی کسی سے کچھ مانگنے کو چاہتا تھا۔ اُس نے نیکاں کے ساتھ مشورہ کیا اور دونوں بہنیں جلدی جلدی سڑک کی طرف اُترنے لگیں۔ مگر اُن کے پہونچنے سے پہلے ہی وہ لوگ موٹر میں سوار ہو کر سڑک کی چیلوں کے پیچھے گم ہو گئے۔ سڑک پر پہونچ کر جیسے ریشماں ایک دم تھک گئی ہو۔ اُس نے نیکاں کو تھوڑی دیر سستانے کو کہا۔ دونوں بہنیں سڑک سے دس پندرہ قدم نیچے اتر کر ایک چٹان پر بیٹھ گئیں۔ شام آہستہ آہستہ اُتر رہی تھی اور اپریل کا مہینہ ہونے کی وجہ سے ہوا کی خنکی بھی ہر لمحہ بڑھ رہی تھی۔ اُن کا گاؤں گویا اُنکے پاؤں تلے پھیلا ہوا تھا۔ ڈوبتے سورج کی مے ریز کرنیں مقابل کے پہاڑ پر سے اُترتی ہوئی بھیڑوں اور بکریوں کو رنگ رہی تھیں۔ گاؤں اب تاریکی میں تھا مگر مسجد کے مینار ابھی روشنی میں تھے۔

ریشماں چٹان پر خاموش لیٹی ہوئی تھی۔ نیکاں اُسے کئی بار گھر لوٹنے کو کہہ چکی تھی۔ مگر وہ جیسے کچھ سنتی ہی نہ ہو۔ ایک دو بار اکیلی ہی چلے جانے کی دھمکی دینے کی غرض سے نیکاں گھر کی جانب چل بھی دی مگر پندرہ بیس قدم چل کر ہنستی ہنستی لوٹ آئی اور جھولی میں سے پھولوں کی مٹھیاں بھر بھر کر، ریشماں کے منہ اور سینے پر برسانے لگی۔ مگر ریشماں ٹس سے مس نہ ہوئی۔ نہ ہی وہ اداس نظر آتی تھی اور [illegible]۔ نہ پُر اُمید نہ مایوس۔ اُس کی نگاہوں میں نہ نفرت تھی نہ محبت نہ [illegible]

گویا اس کی آنکھوں کے مختلف رنگ گھل مل کر ایک ہو گئے ہوں۔ اس کے تمام جسم کی بھی یہی کیفیت تھی، وہ ایک ایسی گداز حالت میں تھی جیسی کہ کسی صوفی کی مشاہدہ کے وقت ہوتی ہے کیف، بے کیف، بیرنگ بے رنگ، بانام بے نام، کون و مکاں کی قید سے آزاد۔ بنفشہ کی بھینی بھینی بھول کے مطابق وہ آنکھیں کھولتی اور میچتی۔ نیکاں نے اس سے پہلے اسے کبھی اس حالت میں نہ دیکھا تھا۔ وہ تھک کر ریشماں کے پاس بیٹھ گئی اور پھولوں کی تمام جھولی اُس پر انڈیل کر بولی "لو اگر تھوڑے پھولوں کے ڈر سے گھر نہیں جاتی تو میرے تمام پھول لے لو"۔

کچھ دیر بعد جب ریشماں نے کروٹ بدلی تو دیکھا کہ ان سے دس پندرہ قدم کے فاصلے پر دو مسافر سڑک کے کنارے بیٹھے ہیں۔ انکے قریب کوئی موٹر یا لاری نہ تھی۔ ہاں کچھ پرے ہٹ کر دو مزدور پشت کے ساتھ بندھے ہوئے بستروں اور سوٹ کیسوں پر تکیہ لگائے ستا رہے تھے۔ ظاہر تھا کہ وہ ایبٹ آباد سے کوہ مری تک پیدل جا رہے ہیں۔ تھیا گلی کی چھ میل کڑی چڑھائی چڑھ کر وہ نڈھال ہو چکے تھے۔ ان میں سے ایک بہت لمبا اور بے ڈول سا تھا۔ مگر دوسرا درمیانے قد کا ایک نہایت خوبصورت جوان تھا۔ ریشماں لگاتار اس کی طرف دیکھتی رہی۔ کچھ دیر کے بعد نوجوان نے سر سے ہیٹ اتار کر اپنے زانو پر رکھ لیا اور بالوں میں لانبی لانبی اور گوری گوری انگلیاں پھیرنے لگا۔ ہوا اُن کی سمت سے ادھر کو آرہی تھی۔ خوشبو کی ایک نہایت خوشگوار لپٹ اُڑ کر ریشماں اور نیکاں تک پہونچی۔ نیکاں کی اُن کی طرف پیٹھ تھی۔ اس لئے ابھی تک اسے ان کی موجودگی کی کوئی خبر نہ تھی، لیکن خوشبو آتے ہی اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پھر ریشماں کی طرف مڑ کر اُس نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت کا اظہار کیا۔

یوں تو ریشماں ہر روز ہی بنفشہ کی خوشبو سونگھا کرتی تھی مگر اُس نوجوان کی طرف سے آنے والی خوشبو میں کچھ اور ہی بات تھی۔ کچھ دیر کے بعد نوجوان نے بھی کروٹ بدلی اور اُس کی نگاہ ریشماں پر پڑی۔ وہ بہت تھکا ہوا ہونے کی وجہ سے دیر سے آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ مگر ریشماں نے جیسے اُسے نئے سرے سے تازگی بخش دی ہو۔ اس کی آنکھیں نیند سے جاگے ہوئے غزالوں کی طرح قلانچیں بھرنے لگیں! اچانک ہی گھوم کر اُس نے اپنے شتر قد ساتھی کو دیکھا۔ وہ ابھی آنکھیں بند کئے دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا۔

ریشماں نے آہستہ سے نیکاں کے کان میں کہا "چلو ان سے خوشبو مانگیں"۔

"چلو"۔

"تم ہی جا مانگ لاؤ"۔

"اکیلی تو میں کبھی نہ جاؤں گی"۔

"اری کیوں؟ تجھے کھا تھوڑا ہی لیگا"۔

"تم ہی کیوں نہیں جاتیں پھر؟"

"میں بڑی ہوں مجھے نہ دینگے وہ، تو چھوٹی ہے تجھے شاید دے دیں"۔

"میں تو نہیں جاتی بہن، ابا سے ڈر لگتا ہے، پتہ چل گیا تو مار مار کر اڑا دیں گے"۔

"ہونہہ! ڈرپوک کہیں کی، ابا کو کون بتانے چلا ہے"۔

"ڈرپوک ہی سہی، لیکن میں تو نہ جاؤنگی"۔

کچھ دیر کے لئے دونوں بہنیں خاموش ہو گئیں۔ نیکاں بنفشے کے بکھرے ہوئے پھول اکٹھے کرنے لگی اور ریشماں نوجوان کی طرف دیکھتی رہی۔ اُس نے بھی دو چار بار ریشماں کی طرف دیکھا حضرت شتر ابھی تک آنکھیں بند کئے پڑے تھے۔

"جا ری نیکاں حرامخور، کوئی کھاتا ہے تجھے کیا؟"

"تو خود کیوں نہیں جاتی؟ تجھے ہی کھا لیں گے؟"

ریشماں اُٹھ کر بیٹھ گئی اور نیکاں بنفشہ کی جھولی سنبھال کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"تو دونوں ہی کیوں نہ چلیں؟"

"انہوں نے انکار کر دیا تو؟"

"ساری شیشی تو مانگنی نہیں کہ انکار کر دیں، کہیں گے تھوڑی سی ہمارے کپڑوں پر لگا دو"۔

نوجوان نے اُن کی باتیں سن لی تھیں۔ وہ مسکرا کر بولا "خوشبو چاہیئے، آؤ لے لو"۔ اُس کے برف جیسے سفید دانت ریشماں کو شام کی تاریکی میں بہت خوبصورت معلوم دئے۔ وہ بھی مسکرائی، اُسکے دانت بھی برف کی طرح سفید تھے۔ مگر نوجوان انہیں دیکھ نہ سکا۔ وہ اپنے سر کے نیچے تہ کر کے رکھے ہوئے کوٹ کی جیبیں ٹٹول رہا تھا۔ اتنے میں دونوں بہنیں اُس کے پاس پہونچ گئیں، نوجوان نے جیب میں سے رومال نکال کر ریشماں کے ہاتھ دیدیا۔ اُس میں سے ایک عجیب طرح کی بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔ ریشماں نے ایک دو بار رومال نیکاں کی ناک سے لگایا۔ پھر خود سونگھا۔ پھر اُس نے کھول کر دیکھا۔ کپڑا ہلکے سبز ریشم کا تھا اور ایک کونے میں [illegible]

تعویذ نمک بر جگہ کے ریشمی دھاگوں سے کڑھی تھی۔ ریشماں نے رومال کو ہاتھوں میں رومال ایک بار پھر سونگھا۔ خوشبو نہایت خوشگوار تھی، مگر نوجوان کے بالوں سے اٹھ رہی لپٹ کی سی دلفریبی اُس میں نہ تھی۔ آخر کا جی چاہا کہ نوجوان کے بالوں کے ساتھ ناک لگا کر سونگھے۔ مگر یہ کیسے ہوسکتا تھا۔

اتنے میں حضرت ہلکتر بھی بیدار ہوگئے اور انہوں نے اپنے دُور دُور تک پھیلے ہوئے بازوؤں اور ٹانگوں کو نہایت بے ترتیبی اور بدآہنگی سے سمیٹا۔ نیکاں گاؤں کی طرف چل دی اور ریشماں بھی۔ نوجوان بھی اٹھ کر ریسٹ ہاؤس کی چڑھائی چڑھنے لگے۔ دس بارہ قدم چل کر ریشماں نے گھوم کر دیکھا۔ نوجوان بھی پیچھے مڑ کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ریشماں کچھ تردد کے بعد نیکاں کے کانوں میں قریب جھک کر بولی: "ذرا ٹھہر، میں دوڑ کر تھوڑی سی اور خوشبو مانگ لاؤں"۔

"اور کیا کرو گی؟ چلو چلیں اب، رات ہو رہی ہے"۔

"رومال پر سے تو گاؤں تک پہونچتے پہونچتے ہی اُڑ جائے گی۔ اللہ دے! شیشی کی شیشی ہی دیدے تو!"

"شیشی کی شیشی!"

"دے دیگا"

"دے دیگا ...." نیکاں نے منہ بنایا۔

"خدا کی قسم، میرا دل کہتا ہے، وہ ضرور دیدیگا"

اتنے میں نوجوان بھی اُن کے پاس آ پہونچا اور بولا: "اگر تمہیں خوشبو پسند ہے تو میں شیشی بھی دے سکتا ہوں۔ مگر وہ سوٹ کیس میں بند ہے۔ ریسٹ ہاؤس تک چلنے کی تکلیف گوارا کرو تو نکال دوں گا۔ یہاں سڑک پر کون اسباب کھول کر بیٹھے"۔

ریشماں نے نیکاں کی طرف دیکھا۔ مگر نہ جانے وہ کیوں گھبرا کر ایک دم گاؤں کی طرف چل اور بولی: "میں تو گھر چلتی ہوں تمہیں ضرورت ہو تو لے آؤ خوشبو"۔ اتنا کہہ کر وہ گاؤں کی طرف اترنے لگی اور نوجوان ریسٹ ہاؤس کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ حضرت ہلکتر اور قلی بہت آگے نکل گئے تھے۔ ریشماں بھی اُس کے پیچھے پیچھے چڑھ رہی تھی۔ مگر تھوڑی دور جا کر وہ کھڑی ہوگئی۔ گویا اُس کے پاؤں کسی نے زمین میں گاڑ دیے ہوں۔ اس کا دل کانپ رہا تھا۔ مگر نوجوان نے لوٹ کر اُسکے شانے پر ہاتھ رکھا اور وہ پھر سے چڑھائی چڑھنے لگی۔

نیکاں نے دو تین بار چارپائی سے اٹھکر دروازے پر کان لگائے۔ مگر ریشماں ابھی تک نہ آئی تھی۔ نیکاں کے جی میں آیا کہ ماں کو سب کچھ بتا دے مگر پھر تھوڑی دیر اور انتظار کر لینے کے خیال سے وہ لحاف میں منہ لپیٹ کر لیٹ گئی۔ باہر پانی برس رہا تھا۔ شاید اسی لئے ریشماں نہ آسکی ہو۔ اس کا ابا بھی ابھی تک مسجد سے نہ لوٹا تھا۔ وہ عموماً عشاء کی نماز ادا کر کے ہی گھر آیا کرتا تھا۔ کھانے کا قصہ وہ پہلے ہی سے نبیڑ لیتا تھا تاکہ اگر من مانے تو کچھ دیر تسبیح خوانی بھی کر لے۔

نیکاں کی ماں ابھی تک کام دھندے میں لگی ہوئی تھی۔ کوئی دس بجے کے قریب وہ مویشیوں کو باندھ کر، دودھ میں جامن ڈال کر اور دیگر کئی چھوٹی موٹی ذمہ داریوں سے فارغ ہو کر اندر آئی۔ نیکاں بازوؤں اور ٹانگوں کو پھیلا کر لحاف کو ذرا اونچا سا کر کے لیٹی ہوئی تھی تاکہ اس کی ماں سمجھے کہ دونوں بہنیں اکٹھی سو رہی ہیں۔ مگر عالیشاں نے آتے ہی لحاف کھینچ کر کہا: "اری ریشو، اٹھ، کھانا نہیں کھائے گی کیا؟"

مگر ریشماں کو موجود نہ پا کر وہ ایک تھکی ہوئی ہنسی ہنس کر بولی: "اری کہاں چھپی ہے؟ چھت جتنی بڑی ہو کر بھی اپنی ماں سے ٹھٹھا کرتی ہو"

ستار محمد بھی مسجد سے آگیا اور باہر برآمدے سے ہی بولا۔

"ریشو کی اماں، ارے ایندھن تو اندر رکھوا لیا ہوتا۔ دیکھو کس طرح گیلا ہو رہا ہے"۔ اتنے میں وہ اندر آگیا۔ نیکاں گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ خوف سے اسکی آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے۔

"کیوں بیٹا کیا ہوا ہے تجھے؟ اماں نے جھڑکا ہے کیا؟" ستار محمد نے نیکاں کو چمکارتے ہوئے کہا۔ "ریشو نے [illegible] کہاں ہے وہ بلا اُسے ٹھیک کروں، شریر کہیں کی"

ستار محمد اور عالیشاں کا خیال تھا کہ ریشماں نے نیکاں کو پیٹا ہے اور اب ڈر سے کہیں چھپی ہوئی ہے۔ انہوں نے اُسے آگے پیچھے تلاش کیا۔ پھر باقیماندہ دو تین کمروں میں، برآمدے میں، صحن میں اور آخر کار مویشیوں کے چھپر میں ڈھونڈا۔ مگر وہ کہیں نظر نہ پڑی۔ آخر یہ سوچکر کہ کہیں اپنی بوا کے گھر نہ سو گئی ہو، ستار محمد تھم اور لالٹین لیکر باہر چلا گیا۔ مگر عالیشاں کا مارے خوف کے دم خشک ہو گیا تھا۔ وہ نیکاں کے کمرے میں آئی۔ نیکاں بھی خوف کی وجہ سے چوکنی بیٹھی تھی۔ عالیشاں نے دلاسا دیکر پوچھا: "بیٹا! بتا دے کیا بات ہے؟ کہاں چھوڑ آئی ہو ریشماں کو؟"

"ہم دونوں اکٹھی بنفشہ چُن کر لوٹ رہی تھیں۔ گاؤں کے نزدیک پہونچکر ریشو بولی: نیکو ذرا میرا بنفشہ تھامیو۔ میں خدا [illegible] میں نے بنفشہ لے لیا اور وہ نیچے اُتر گئی"۔ نیکاں نے جھوٹ بولا۔

"ہاں تو پھر...؟"

"میں اندھیرا ہونے تک کھڑی انتظار کرتی رہی، جب وہ نہ لوٹی تو میں اکیلی ہی آ گئی۔"

"تو موقع تو نے مجھے تب ہی کیوں نہ بتایا۔ کیا تیری زبان کو سانپ ڈس گیا تھا؟ اُف اُف" عالیشاں نے انتہائی کرب سے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ اور بہت دیر اسی طرح بیٹھی رہی۔ اس کے دل میں کئی قسم کے خیالات گھومنے لگے، پھسل کر کسی غار میں نہ جا پڑی ہو، کسی بھالو نے تو نہیں کھا لیا۔ پھر اُسے یاد آیا کہ چڑھائی شروع ہو گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کسی مسافر کے ساتھ چلی گئی ہو۔ مگر نہیں، میری بچی ایسی نہیں ہو سکتی، اُس نے اگلے ہی پل پشیمانی ظاہر کی۔ آج تک کبھی کسی نے اُس کی نظریں اُونچی نہ دیکھی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی نے زبردستی کی ہو یا دھوکے سے اُسے بہکا لیا ہو....

بارہ بجے کے قریب ستار محمد ٹوٹا ٹوٹا اندر داخل ہوا۔ تیل ختم ہو جانے کی وجہ سے لالٹین بجھ چکی تھی۔ اُس نے لالٹین اور قلم ایک کونے میں رکھ دئے اور خود عالیشاں کے پاس اناج کی ایک بوری کے سہارے بیٹھ گیا۔ تسبیح اُس کے ہاتھوں میں کانپ رہی تھی۔ کافی دیر تک کچھ نہ بولا۔ کچھ دیر کے بعد عالیشاں بولی "نیکاں کہتی ہے پہاڑ سے حاجت کیلئے اُتری تھی اور پھر اُوپر نہیں چڑھی۔"

ستار محمد نے آسمان کی طرف مُنہ اُٹھا کر کہا "یا اللہ کسی غار میں گر کر مر گئی ہو، کوئی بھالو اُٹھا کر لے گیا ہو، مجھے شکایت نہیں۔ لیکن میری عزت کو داغ نہ لگا دیا ہو۔" اس کے بعد وہ کچھ نہ بولا۔ عالیشاں بھی کچھ نہ بولی، نیکاں بھی کچھ نہ بولی۔ ستار محمد ساری رات بیٹھا تسبیح پھیرتا رہا۔ عالیشاں بھی بیٹھی رہی۔ مگر بیچ بیچ میں وہ بوری میں سر دیکر رو لیتی تھی۔ نیکاں نے سر پر لحاف اوڑھ لیا تھا۔ مگر تمام رات اُسکی آنکھیں کھلی اور کان کھڑے رہے۔

صبح چار بجے کے قریب نیکاں نے مُنہ پر سے لحاف اُتارا۔ اُس نے باہر نرم سی دستک کی آواز سنی تھی۔ اس کی ماں نے بوری میں سر دے رکھا تھا اور ابا آنکھیں بند کئے تسبیح پھیر رہا تھا۔ نیکاں نے دبے پاؤں جا کر دروازہ کھول دیا۔ ریشماں اندر آ گئی۔

"بتا دیا کیا؟"

"نہیں تو۔"

ریشماں نے نیکاں کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ اور باہر برآمدے میں کھڑی ہو گئی۔ اُس کی ماں نے بھی آواز سنکر سر اٹھا لیا،

ستار محمد نے بھی آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھیں اُس کی حنا مالیہ مالا کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ اُس نے بیٹھے بیٹھے ہی ریشماں کی طرف آنکھیں پھیریں اور کچھ دیر دیکھتے رہنے کے بعد بولا "کہاں رہی رات بھر؟"

ریشماں چپ تھی۔

"بولتی کیوں نہیں؟"

ریشماں چپ تھی۔

"اری بولے گی یا نہیں؟" ستار محمد کھڑا ہو گیا۔

ریشماں چپ تھی۔

ستار محمد چپ تھا۔

عالیشاں چپ تھی۔

نیکاں چپ تھی۔

ستار محمد نے آگے بڑھ کر دو تین زور کے تھپڑ ریشماں کے مُنہ پر جڑ دئے۔

ریشماں چپ تھی۔

ستار محمد نے لوٹ کر لاٹھی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مگر عالیشاں اس کا ہاتھ روک کر بولی "خدا کے لئے یہ کام نہ کرو، مر گئی تو تمام گاؤں میں بدنامی ہوگی۔" پھر ریشماں سے مخاطب ہو کر بولی "بول، بولتی کیوں نہیں، پھسل پڑی تھی کہ کچھ ڈس گیا تھا کہ بارش میں گھر گئی تھی۔ کچھ ہی بک دے، کیا ہو گیا تھا تجھے، آخر کیوں نہ آئی؟"

"ایکدم پانی برس پڑا....."

ابھی ریشماں نے بات ختم بھی نہ کی تھی کہ ستار محمد نے ایک زور کی لات ریشماں کی چھاتی میں جڑ دی۔ "پانی کی بچی، اسکے لئے الگ برس پڑا تھا۔"

ریشماں کی چھاتی سے لہو بہ نکلا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اُسکی کُرتی میں سے ایک نہایت دلفریب خوشبو اُڑ اُڑ کر کمرے میں بھر گئی۔ کہاں لہو اور کہاں خوشبو۔ کچھ دیر عالیشاں حیران پریشان کھڑی رہی، پھر دوڑ کر اُس نے ریشماں کو گود میں لے لیا۔ ستار محمد تمام معاملہ سمجھ گیا تھا۔ اُس نے لاتوں سے ریشماں کو کچلنا شروع کر دیا۔

"بارش تھی..... نیکاں کے لئے کیوں نہ تھی؟..... یہ خوشبو کہاں سے آ گئی؟..... سچ نہیں بتائے گی؟..... نہیں بتائے گی؟ ...کیوں بتائے گی؟....."

عالیشاں، ریشماں کے اوپر لیٹ گئی۔ وہ چار لاتیں [illegible]

لگیں۔ اس نے اُٹھ کر ستار محمد کے پاؤں پکڑ لئے اور کہا: خدا کا واسطہ دیتی ہوں۔ بندی کا کہا مان لو۔ مر گئی تو دُنیا کا منہ کون بند کریگا۔ میری مالا اور مسجد کو چلے جاؤ۔ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ لوگ کہیں گے کیوں نہیں آیا۔ پچھلے چالیس برسوں میں ایک دن بھی نماز قضا نہیں کی۔ جاؤ مسجد کو جاؤ۔ بھی گھر میں رولا سب کچھ پوچھ لونگی۔۔۔"

ستار محمد ٹوپی پہن کر مسجد کی طرف چلدیا۔ عالشاں نے ریشماں کی کرتی کے بٹن کھولے اس کی چھاتی میں عطر کی شیشی ٹوٹ گئی تھی اند لہو تھمنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ عالشاں نے کانچ کے ٹکڑے چن کر زخم سے نکالے اور اپنی چادر سے لہو صاف کیا۔ پھر ریشماں کے سر کو چوم کر بولی: "ریشو بیٹا! بتادے اپنی ماں کو سب کچھ۔" نیکاں بھی پاس کھڑی تھی۔ ریشماں نے نیکاں کی طرف اس طرح دیکھا گویا اُسے سب بتا دینے کی اجازت دے رہی ہو۔ عالشاں پُر امید ہو کر بولی: "نیکاں بیٹی تو ہی بتا دے۔"

نیکاں نے سب کچھ بتا دیا۔

خوشبو سے تمام کمرہ بھر گیا تھا۔ ایک عجیب قسم کی دلفریب خوشبو تھی۔ عالشاں کو اپنی جوانی کے دن یاد آ گئے۔ اُسے یاد آیا کہ وہ بھی مسافروں سے چیزیں مانگا کرتی تھی۔ مگر وہ تو چیز لیتے ہی سر پر پاؤں رکھکر بھاگ جایا کرتی تھی۔ یہ سوچ کر اس کا دل پگھل گیا اور آواز میں رقت پیدا ہو گئی۔ اُس نے ریشماں کے سر پر ایک لمبا سا بوسہ دیا اور کہا: "مگر بیٹیا! تو اس کے پیچھے کیوں چلی گئی تھی؟"

"کیا کرتی، مجھے خوشبو آتی تھی۔۔۔" یہ کہکر ریشماں نے اپنی آنکھیں ماں کی گود میں چھپا لیں۔

موہن سنگھ، ایم۔ اے

غیر فانی سرمایہ

مجھے ماحول کی ظلمت سے سروکار نہیں

کیا ستارے مرے احساس کے بیدار نہیں

یہ قوانین۔ یہ شاہوں کے تراشے ہوئے بھوت

میرے نزدیک ہیں افتادِ تدبّر کے ثبوت

زر کی چادر میں یہ لپٹا ہوا عالم سارا

میرے نزدیک ہے بازیچۂ دلِ بے چارا

خانقاہوں میں یہ ریشم کی قباؤں والے

میرے نزدیک یہ سب ناگ ہیں کالے کالے

مدرسوں میں یہ نئے رنگ کے رخشندہ علوم

میرے نزدیک ہیں مشرق کیلئے بادِ سموم

میں نے ہر ذرّے کا دل چیر کے کھولے ہیں راز

میں نے ہر پہلو سے پرکھے یہ نرالے انداز

میں نے قطروں کو شعاعوں میں پرو کر دیکھا

اپنے سینے میں ہر اک شے کو سمو کر دیکھا

میں نے ہر بوند میں دریا کی روانی دیکھی

راکھ میں آگ کی انوار فشانی دیکھی

گو مرے نام کی دُنیا میں ابھی دُھوم نہیں

مطمئن ہوں کہ میں اس دور کا محکوم نہیں

کون کہتا ہے مجھے کشتۂ افلاس ندیم

ہے مرے پاس ابھی دولتِ احساس ندیم

احمد ندیم قاسمی؛

نیا ہندوستانی اور اُسکی مجبوریاں

ذہنی آزادی کے اس دَور کی ابتدا گذشتہ جنگِ عظیم سے ہوئی جو ایک ایسے بھونچال کے مانند تھی جس نے دُنیا بھر کی قوموں کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ ــــ اپنے اپنے ملکوں کی سرحدوں کے ــــ مقامی اثرات اور توہمات میں گرفتار تھیں اُنکے وطن سے دور لا پھینکا اور میدانِ جنگ میں ایک دوسرے کے برابر اور آمنے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس جنگ میں نہ صرف ملکوں کی قدرتی اور سیاسی سرحدیں ہی ٹوٹیں بلکہ اس ہلچل میں وہ چار دیواریاں بھی جڑ سے اُکھڑ کر گر پڑیں جن میں انسان کا ذہن صدیوں سے گھرا ہوا تھا۔ دُنیا بھر کی قوموں کا اتنا بڑا اجتماع میدانِ حشر میں ہو تو ہو مگر دُنیا میں پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ اس لمبی چوڑی دُنیا کی انسانی مخلوق گوشہ گوشہ سے سمٹ کر آگ اور موت کا خوفناک کھیل کھیلنے میدانِ جنگ میں پہونچ گئی تھی۔

گذشتہ جنگِ عظیم سے جو نقصان جان اور مال کا ہوا اُس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ اس سے ایک بڑا فائدہ بھی ہوا جو چیز مختلف قوموں کو میدانِ جنگ میں کھینچکر لے گئی تھی وہ آپس کی نفرت تھی، مگر موت کے قریب پہونچکر اُن میں یہ احساس پیدا ہوا کہ جن لوگوں کی نفرت اور دُشمنی اُنہیں وہاں مارنے اور مرنے کے لئے لے گئی تھی وہ لوگ بھی خود اُنہیں کی طرح انسان تھے، اُن ہی کی طرح کھاتے پیتے اور احساس اور شعور رکھتے تھے۔ اس نئے احساس سے جہالت کا وہ تاریک پردہ اُٹھ گیا جو ایک دوسرے سے ناواقفیت کی بنا پر ذہنوں پر پڑا ہوا تھا۔ نظروں میں وسعت پیدا ہو گئی اور تمام دُنیا کے انسانوں کے درمیان ایک ذہنی ربط اور لگاؤ پیدا ہو گیا۔ لڑنے والے میدانِ جنگ سے اپنے اپنے گھروں کو واپس ہوئے تو ان میں سے بہتوں کے دلوں میں نہ نفرت باقی تھی نہ پُرانی رنجشیں اور تعصبات، وہ لوٹے تو کچھ کھوئے ہوئے سے لوٹے ــــ رنجیدہ، مگر ایک نئے احساسِ انسانیت سے واقف ہو کر، یہ سوچتے ہوئے کہ آخر وہ اپنے ہی جنسوں کا خون بہانے کیوں گئے تھے!

اس نئی ذہنیت کی ترجمانی ہندوستان میں بنگال کے مشہور شاعر قاضی نذر الاسلام نے کی جو گذشتہ جنگِ عظیم کی ہولناک تباہکاری اور کشت و خون کو اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا تھا۔ وہ کہتا ہے۔

"مجھے خدا کی ضرورت نہیں
مجھے انسان کی تلاش ہے!"

ایک اور جگہ وہ کہتا ہے۔

"کتابوں کو چوم چوم کر یہ کمبخت مرے جاتے ہیں۔ یہ نا سمجھ کتابوں کی پرستش کرتے ہیں۔ کوئی اُنہیں بتائے کہ انسان کتابیں بناتا ہے، کتابیں انسان پیدا نہیں کر سکتیں۔ اور ان مُردہ کتابوں کے صدقہ میں زندہ انسان ایک دوسرے کا خون پی رہے ہیں"

یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ آگ اور خون کے سمندر کو تیر کر انسان نے انسان سے محبت کرنی سیکھی۔

جنگِ عظیم کے علاوہ اور بھی کچھ اسباب ایسے پیدا ہو گئے جنہوں نے پُرانے خیالات میں تبدیلی پیدا کی اور پرانی [illegible] کی جگہ نئی قدریں قائم کیں، سائنس کی حیرت انگیز ایجادوں سے یہ لمبی چوڑی دُنیا سمٹ سمٹا کر بہت چھوٹی رہ گئی۔ تیز رفتار ہوائی جہازوں نے زمان و مکان کے متعلق معمولی سوجھ بوجھ کے پڑھے لکھے آدمی کے خیالات کو بالکل بدل دیا۔ جب کبھی کوئی ہوائی جہاز ہمارے سَروں پر سے اُڑتا ہوا چلا جاتا ہے تو یہ نہ صرف ہوا بازی کے لئے ایک تجربہ ہوتا ہے بلکہ زمین پر سے دیکھنے والے بھی غیر شعوری طریقے پر اس تجربہ میں اُس کے شریک ہو جاتے ہیں، وقت اور فاصلے کے متعلق پُرانے نظریے بدل جاتے ہیں، اور انسانی دماغ (جو پہلے اپنے وہموں اور تعصبوں کی چاردیواری میں بند تھا۔) آزاد ہو جاتا ہے اور اُس ہوائی جہاز کے ساتھ فضا میں اُڑنے لگتا ہے!

یوں تو سائنس کی ساری ایجادوں نے زندگی کی مادّی حالت کے بدلنے میں مدد کی ہے لیکن سب سے اہم ایجاد جس نے ساری دُنیا کے لوگوں میں ذہنی یگانگت اور ہم آہنگی پیدا کرنے میں سب سے نمایاں حصّہ لیا ہے وہ "ریڈیو" ہے۔ اس نے [illegible] کو دُور کر دیا کیونکہ یہ ہر اُس چیز کو جو انسانی دماغ کی بہترین پیداوار کہی جا سکتی ہے بلا کسی قسم کی تفریق کے ہر شخص تک پہونچا [illegible]
اسی طرح سینما نے بھی [illegible]

نہیں بلکہ جو لوگ پچھلے لوگوں کے اخلاق و عادات بگاڑنے کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں ان کو تھوڑی دیر کے لئے یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اس نے ان لوگوں پر کتنا بڑا احسان کیا ہے جن کے تخیل کی فضا صرف ان کے گلی کوچوں تک ہی محدود تھی۔ سینما نے گھر بیٹھے ان کے سامنے ساری دنیا کے ملکوں کے مناظر، قومیں، ان کے رسم و رواج، عادات و اطوار، ان کی امیدیں، ان کے خطرات اور ان کے قطعے ستاروں پیش کر دئے ہیں، جو پہلے لوگوں کے خواب و خیال میں بھی نہ آتے تھے۔

اسی طرح ریل گاڑی، موٹر کار، موٹر سائیکل اور ٹیلیفون نے ہماری تنہائی اور علیحدگی کا خاتمہ کر کے ہم کو اپنے خول سے باہر نکلنے اور دوسرے لوگوں سے ملنے جلنے کا موقع مہیا کر دیا ہے اور ایک ایسی ذہنیت پیدا کر دی ہے جس نے "اچھائی" اور "برائی" کے پرانے معیاروں کو تہس نہس کر کے انسان میں ہمدردی اور محبت کا جذبہ پیدا کر دیا ہے اور اس میں سوجھ بوجھ پہلے کی نسبت زیادہ ہو گئی ہے۔

ان اثرات کے علاوہ خود مغربی تہذیب نے ہم ہندوستانیوں کو کافی متاثر کیا ہے۔ اس نے ہماری اجتماعی اور نجی زندگی پر بہت گہرے نقوش چھوڑے ہیں اور ہماری تہذیب، ہمارے تمدن، ہمارے اخلاق و عادات، حتیٰ کہ ہمارے کھانے پینے اور رہنے سہنے کے طریقوں تک اپنا اثر ڈالا ہے۔ مگر مشرقی اور مغربی تہذیب کی ٹکر کا سب سے بڑا نتیجہ وہی جنگ عظیم کے بعد والی ذہنیت ہے جو ہم میں پہلے نہ تھی اور جس نے زندگی کے متعلق ہم میں ایک نیا نظریہ اور نیا جذبہ پیدا کر دیا ہے جس کی وجہ سے اگر سب نہیں تو ہم میں سے کچھ ہی زندگی کے بلند مقصدوں سے واقف ہو گئے ہیں۔ یہ ذہنیت تعصبات، ظلم، ناانصافی، خود غرضی، ریاکاری اور جھوٹ کو روا نہیں رکھتی۔ اس کا ایمان محبت اور مسلک صاف گوئی اور سچائی ہے۔

یہی ذہنیت رکھنے والا انسان "نیا ہندوستانی" ہے۔ دراصل کوئی ایسی انوکھی اور اجنبی ہستی نہیں جس کی پہچان کیلئے اس کی شکل و صورت، وضع قطع، لباس اور رہنے سہنے کے طریقوں پر غور کرنا ضروری ہو۔ یہ تو ایک ذہنیت ہے جو ہم سب میں پیدا ہو گئی ہے اور رفتہ رفتہ ترقی پا رہی ہے۔ "نیا ہندوستانی" خود آپ کے اندر جنم لے چکا ہے۔ آپ بھی نئے ہندوستانی ہیں، گو آپ آسانی سے اس بات کو نہ مانیں گے۔ لیکن اگر آپ واقعی نئے ہندوستانی کو پہچاننا چاہتے ہیں تو خود اپنے آپ کو ٹٹولئے۔

نیا ہندوستانی زندگی کے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں۔ وہ زندگی کو جذبات یا تعصبات کی عینک لگا کر نہیں دیکھتا۔ زندگی کی روز بروز بڑھتی ہوئی کشمکش نے اسے صد درجہ حساس بنا دیا ہے۔ وہ زندگی کی مشکلیں، مصیبتیں، دکھ، بیماریاں، حماقتیں، خود فریبیاں اور دھوکے بازیاں دیکھ کر ان سے بھاگنا اور اپنی "خیالی فردوس" میں پناہ لینا نہیں چاہتا بلکہ وہ زندگی کا مردانہ وار مقابلہ کر کے اس کے الجھے ہوئے مسئلوں کو حل کرنا اور دنیا کی خوشیوں میں اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ اس نے اقبال سے خودی کی عظمت کا سبق پڑھا ہے، ٹیگور سے روح کی آزادی کا درس لیا ہے۔ مغربی تعلیم نے اس کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ وہ نام نہاد مذہب، قومیت، نسل، رنگ، ذات پات، فرقہ بندی اور رسم و رواج کی قید سے آزاد ہو کر مکمل انسان بننے کی خواہش رکھتا ہے اور ہر اس چیز کو جو اسے اس بلند مقصد میں کامیابی حاصل کرنے سے روکتی ہے اپنا دشمن سمجھتا ہے۔

مگر اس نئے ہندوستانی کی راہ میں چند رکاوٹیں ہیں جن کی وجہ سے وہ ابھی اپنے ملک اور دنیا کو زیادہ فائدہ پہنچانے سے معذور ہے۔

ان میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ تعصبات اور ذہنی اختلافات ہیں جو وقت کے تقاضوں کے باوجود ابھی تک دور نہیں کئے جا سکے ہیں۔ ان کی بنا ان شکایتوں اور عداوتوں پر ہے جو ہندوستانی قوموں کے درمیان اول اول ایک دوسرے کو دبانے کی کوشش کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھیں۔ آپس کا یہ بگاڑ اور رکھاؤ ہی قدامت پرستی کا باعث بنا۔ ہر قوم اپنی مخصوص پرانی روایات، مذہبی اور نسلی خصوصیات اور ان کے مجموعے کو جسے کلچر کہا جاتا ہے محفوظ رکھنے کی کوشش کرنے لگی اور ایک قوم نے دوسری قوم سے الگ تھلگ رہنے کی ہر ممکن تدبیر اختیار کی۔ وقتی مخالفت کے جوش میں انہوں نے یہ خیال نہ کیا کہ ان کی اس قدامت پرستی اور علیحدگی سے دوسرے انسانوں کو اور خود ان کو کتنا بڑا نقصان پہنچے گا۔ خود غرض شخصیتوں نے لیڈر اور مذہبی پیشوا بن کر ان اختلافات کو اور زیادہ بڑھایا چنانچہ معاشرتی اعتبار سے بہت سی تباہ کن رسمیں مثلاً پردے کی موجودہ صورت، چھوت چھات، ذات پات وغیرہ اسی شروع شروع کی رنجش اور نفرت سے پیدا ہوئیں۔ غضب تو یہ ہے کہ ان تمام رجعت پسند رسموں کو مذہب کا لباس پہنا کر اٹل بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کسی مذہب کا بھی یہ مقصد نہ تھا کہ نوع انسان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے مذہبی جھگڑے [illegible]

ہیں مگر آج کل ہوس، خود غرضی اور ناسمجھی نے مذہب کی صورت بھی بگاڑ دی ہے۔ مغربی تہذیب کے اثر سے ہمارے ظاہری اختلافات ایک حد تک دور ہو چکے ہیں۔ اور مغربی لباس میں اکثر یہ تمیز کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ کون شخص کس قوم کا ہے مگر پھر بھی وہ ذہنی اختلافات جو قدامت پرستی کے سبب غیر شعوری طور پر دلوں میں جگہ پکڑ گئے ہیں آسانی سے دور نہیں کئے جا سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں ایک متحدہ قوم کی حیثیت سے کوئی جذبہ اور اجتماعی احساس پیدا نہیں ہوتا نہ وہ چیز پیدا ہوتی ہے جسے National Spirit کہتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ عرصۂ دراز تک ایک ہی جگہ رہتے رہتے ایک قوم دوسری قوم کے تہذیب و تمدن سے کافی متاثر ہو چکی ہے، جس کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ سب ایک ہی زبان (ہندوستانی) بولتے ہیں اور مختلف مذاہب رکھنے والے افراد کے درمیان شادیاں بھی ہونے لگی ہیں اور ہر قوم ہندوستان کو اپنا وطن اور اپنے آپ کو ہندوستانی کہتی ہے لیکن دلوں میں ابھی تک وہی پرانی کھینچا تانی پہلے کی طرح باقی ہے، جو اُن کو اپنی اپنی پرانی روش اور جداگانہ حیثیت قائم رکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ حالانکہ وقت اور زمانے کا تقاضا ہے کہ اس کشمکش کو دور کیا جائے اور سب مل کر سب کی بھلائی اور بہبودی کے لئے کوشش کریں اور انسان میں جو بھی ربط ہے اُسے قائم رکھیں اور زیادہ مضبوط بنائیں۔

نیا ہندوستانی بھی یہی چاہتا ہے، کیونکہ وہ بھی زمانہ اور وقت ہی کی پیداوار ہے لیکن ابھی "پرانے ہندوستانی" کا زور کم نہیں ہوا ہے یا یوں کہئے کہ اس نئی ذہنیت کے مقابلے میں پرانے تعصبات اور ہٹ دھرمیاں ابھی زیادہ طاقتور ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ نیا ہندوستانی ظاہر ہو سکے گا اور پھر اُس کی تلاش کے لئے نفسیات کی مدد نہ لینی پڑیگی۔

چند جغرافیائی اسباب بھی نئے ہندوستانی کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ ایک تو یہ ملک اتنا بڑا ہے کہ اس پر ایک برّ اعظم کا دھوکا ہوتا ہے اور اسی وجہ سے یہاں کوئی تحریک شروع ہو کر کامیابی کے ساتھ اختتام تک نہیں پہونچ سکی ہے کیونکہ ملک کے ایک کونے سے شروع ہو کر دوسرے کونے تک پہونچتے پہونچتے وہ تھک کر ختم ہو جاتی ہے۔ مگر یہ کوئی ایسی بڑی رکاوٹ نہیں کیونکہ ریڈیو اور دوسرے وسائل کی مدد سے اب ذہنی ہم آہنگی کا ملک میں پیدا کرنا آسان ہو گیا ہے۔

دوسرا جغرافیائی سبب یہاں کی گرم آب و ہوا اور زرخیزی ملک کی وجہ سے لوگ کاہل اور آرام طلب ہو جاتے ہیں۔ لیکن دنیا کی اقتصادی حالت اب ایسی ہو گئی ہے کہ زرخیز سے زرخیز ملک میں بھی روزی ملنا مشکل ہو گیا ہے۔ زندگی کی کشمکش بہت سخت ہو گئی ہے اور ہر شخص جو زندہ رہنا چاہتا ہے پرانے طریقوں کو چھوڑ کر محنت کا عادی بننا پڑے گا۔ اس لئے یہ بھی نئے ہندوستانی کی راہ میں کوئی بڑی رکاوٹ نہیں، کیونکہ فطرت خود آڑے آئے گی اور لوگوں کی آرام طلبی کی عادت چھڑا دیگی۔

ایک بڑا خدشہ نئے ہندوستانی کو خود مغرب کی اس بڑھتی ہوئی مادی اور میکانکی تہذیب سے بھی ہے۔ آمد و رفت اور مراسلت کے ذریعوں میں ترقی ہونے کے باعث اور دنیا کے سمٹ کر چھوٹی سی جگہ بن جانے سے لوگوں کے تجربوں، مشاہدوں اور تاثروں کا کوئی حد و شمار نہیں۔ غور و فکر کے لئے اور تھکن دور کرنے کے لئے دماغوں کو سکون اور عافیت کے لمحے نہیں ملتے۔ سائنس کی یہ ایجادیں یعنی مشینیں، جو وقت کم خرچ کرنے اور انسان کو محنت مشقت سے بچانے کے لئے بنائی گئی ہیں، اعصاب پر بہت برا اثر ڈالتی ہیں۔ لوگوں کو صحیح معنوں میں فرصت اور آرام نصیب نہیں۔ گھر میں اگر ایک ٹیلیفون ہی لگ جائے تو گھر کے باہر کی دنیا سے ایک لمحے کو پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ مغربی قوموں کے افراد کی طرح نیا ہندوستانی بھی اس "اعصابی کھنچاؤ" (Nervous tension) کا شکار ہے۔ سکون اور آرام کی یہ کمی اور یہ رنگ برنگ کے تاثرات اور مشاہدے (جو زندگی کو گویا سنیما کا ایک فلم بنا دیتے ہیں!) دماغی توازن قائم نہیں رہنے دیتے۔

نئے ہندوستانی کو ابھی ایک ایسا طریق زندگی سوچ کر نکالنا ہے جس پر چل کر وہ مشینوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے اور خود مشینوں کا غلام نہ بن جائے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی دماغی ترقی بھی بہ حیثیت انسان جاری رکھے۔

(اے۔ آئی۔ آر۔ دلی)

مظہر عزیز

گوالن

گرمیوں کی صبح کیف آور کا عکسِ بے ضرر — ابر کے ٹکڑوں سے ٹکرایا ہوا زیر و زبر
پھر افق کے تختۂ سیمیں پہ دوڑا دی شراب — عارضِ و روئے شفق پر عود کر آیا شباب
پھر پہاڑی کی ہر اک چوٹی پہ ڈالی روشنی — اُجلے اُجلے برف کے سانچوں میں ڈھالی روشنی
پھر حسین چشموں سے مل کر وادیوں تک آ گیا — دامنِ فطرت سے فطرت زادیوں تک آ گیا
پھر درختوں سے اُتر کر فرشِ خاکی پر چلا — بدنمائی کی طرف ہر خوشنما منظر چلا

بج گئے جب دس تو پھر آفتاب تند خو — گرم ہو کر جوش میں آیا حرارت کا لہو
حدتِ شعلہ بجاں "تڑپی فضا میں ہر طرف — آتشِ برقِ تپاں جھپٹی ہوا میں ہر طرف
چھپ گئے فلسِ یبوست میں گلستانِ شکیل — نار کے پنجے میں آیا دامنِ نورِ جمیل
اب کہ سورج آ چکا تھا ٹھیک سمت الراس پر — اور سیدھی ہو کے کرنیں پڑ رہی تھیں گھاس پر
تازگی پودوں میں شاخوں میں عذوبت سو گئی — جا ملے ذرّے بگوں سے۔ رطوبت کھو گئی
نرم و نازک پتیوں پر گرد کی تہہ جم گئی — منہ اندھیرے کی طراوت ریزیِ شبنم گئی
آ گئی کاریز کے ہونٹوں پہ خشکی آ گئی — دُوب گولوں کے کنارے تھی مگر مرجھا گئی
دلکشی کافور گلشن سے۔ عیاں بے رونقی — مٹ گئی تنظیمِ برگ و بار، بیل رچ گئی
نور و نکہت کے ہواخواہوں نے اپنی راہ لی — خوشنما پھولوں سے تتلی نے معافی چاہ لی
رس بھرے گیتوں سے متوالا پپیہا باز تھا — موجِ دریا کے لبوں پر شعلۂ آوازہ تھا
لُو نے قبضہ کر لیا ہر سمت چھاپا مار کر — گاؤں کی جانب بڑھے دہقان ہمت ہار کر
وہ گوالن رہ گئی جس کی جوانی کی ترنگ — اپنے ڈھوروں کیلئے تھی دھوپ سے مصروفِ جنگ
سنگِ موسیٰ جس سے "عُرضہ کار" وہ مورت تھی وہ — ایک بیڈھنگی ہیولیٰ وضع کی صورت تھی وہ
اُسکے چہرے کے نقوشِ ناسبک آہن گداز — وسعت و قعرِ دہان بدنما۔ ہاون گداز
جنبشِ لب وہ کہ جیسے زخم سے پھاہا ہٹے — خندۂ بدزیب ہنستا تو ادل میں کٹے
عشوۂ ناساز میں لپٹی ہوئی نسوانیت — سختیِ اعصاب سے چپٹی ہوئی دہقانیت
پاؤں عزمِ جرأت سرشار سے ناآشنا — ہاتھ چاکِ دامنِ پندار سے ناآشنا
گفتگو کا طرز رسوائے غلط فہمی نہ تھا — چشمِ بے غمزہ میں ایمائے غلط فہمی نہ تھا
نیلگوں تہمد کا صد پیوند و بوسیدہ لباس — اتنا بوسیدہ کہ چشمِ استعارہ بدحواس

ہاتھ میں شیشم کی اک لکڑی چھڑی کے طور پر
گاسے کی رتی کلائی میں گھڑی کے طور پر

اس طرف عمر طبیعی سے وہ لاکھی چوڑیاں
بھر دیئے تھے میل نے جن میں نگینوں کے نشاں

سلوٹیں کھا کھا کے جلدِ پشتِ پا زنگی کی ڈھال
برہنہ پائی سے تلوے سخت جھانو کی مثال

حسنِ صورت کی یہ بد ذوقی مگر سیرت بلند
یعنی دل میں "بدعتِ حیوانیہ" عزلت پسند

یعنی وہ عورت تھی، عورت اور بیانِ زودِ دل
"آب و گل سے مٹ نہیں سکتی سرشتِ آب و گل"

اس کا احساس جوانی ظرف سے باہر نہ تھا
ساغرِ بدگل میں کیفِ مدعا مضمر نہ تھا

بات کرتے مطمئن تھا اس کا نسوانی وقار
"اعتمادِ نفس کو۔ کیا پاکباز و بدشعار"

جس طرح بھائی کنول سے منہ نہیں آتی کبھی
خوبیٔ باطن کثافت سے نہیں جاتی کبھی

یہ گوالن جس کا خاکہ ہے مرے اشعار میں
پاؤگے تم ہند کے ہر خطۂ نادار میں

وہ نہیں جس کے لئے ہم شاعرانِ بے عدیل
نام رکھتے ہیں بطرزِ نو بہ الفاظِ جمیل

یاد کرتے ہیں جسے اس والہانہ شان سے
جیسے انگلستان[1] جا پہونچے ہوں ہندوستان سے

وہ نہیں ماتھے پہ بندی ہو تو ساری زیبِ تن
اور سونے پر سہاگا گوشواروں کی پھبن

وہ نہیں جس کے گلے میں موتیوں کا ہار بھی
شانۂ عریاں پہ زلفِ عنبریں کے مار بھی

وہ نہیں جذبوں سے کھیلے جسکے سینے کا ابھار
"زخمہ جو" "مضراب آمادہ" "شبابِ ناگوار"

وہ نہیں جس کے لبوں پر مسکراہٹ بے نقاب
ناک سے پیوست عینک دور آنکھوں سے حجاب

بانسری میں جس کے دل کا چور ہو محوِ فغاں
زمزمے کے ساتھ ٹھنڈی سانس لینا انگڑائیاں

جسکے تیور پہ برستے ہوں سخاوت کے سبو
جس کی نبضوں میں اچھلتا ہو "اجازت" کا لہو

چشمِ ناظر کی رسائی جس کی ساقِ صاف تک
بلکہ طوفانِ تماشا کا تلاطم ناف تک

جس کی خواہش ہو کسی گردن میں باہیں ڈال دوں
اور کانوں میں تمنا کی صدائیں ڈال دوں

جو یہ چاہے۔ کوئی بھی ہو آ نہائے جوش میں
چوس لے میرے لبوں کو کھینچ لے آغوش میں

اس پہ یہ دعویٰ کہ ہم ہیں شاعرانِ حق نگار
"واقعیت سے" فزوں ہوگا ادب کا اقتدار

یہ دروغِ ناپسندیدہ بہ افراطِ خیال
خود فریبی کی ہر اک لغزش پہ سودائے کمال

دفترِ لغویتِ پیہم پہ طعنے للعجب!
جھوٹ سے لبریز جامِ جدتِ شعر و ادب

صرف کہنے سے صداقت کا اگر چل جائے کام
بھینس کو دیدیجئے "جنگل کی شہزادی" کا نام

شاد عارفی

---

[1] میری رائے میں گوالنوں کو حسین لکھنا مغربی تخیل ہے۔

ڈرائیور

علی الصباح مجھے ایک ضروری کام پر شوری جانا تھا۔
شوری چھوٹی سی جگہ ہے۔ مگر وہاں کے اسٹیشن پر ٹرین رکتی ہیں، چنانچہ میں وہاں ہمیشہ کار ہی سے جایا کرتی ہوں۔
میرا ڈرائیور کریم صبح دن کی چھٹی لیکر اپنے گھر گیا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کل صبح مجھے شوری جانا ہے۔ وہ یہ دعوی کر کے گیا تھا کہ مجھے شوری پہونچانے کیلئے وہ بروقت لوٹ آئیگا۔
رات کے کھانے کے بعد میں زوناش کی مدد سے کچھ ضروری کاغذات سفری بیگ میں رکھ رہی تھی کہ میں نے کہا: "زوناش! کریم اب تک نہیں آیا اور مجھے علی الصباح روانہ ہونا ہے۔"
"ساری رات پڑی ہے خاتون روحی۔ بے فکر رہیئے۔ وہ پہونچ جائے گا۔ وعدے کا بڑا پابند ہے۔" جبشن نے بیگ بند کرتے ہوئے جواب دیا۔
"پابند تو ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر کیا پتہ، کوئی ایسا اتفاق پیش آجائے کہ وہ نہ پہونچ سکے۔ میرے خیال میں احتیاطاً تم زلفی کو فون کر کے کہدو کہ ایک دن کے لئے اپنا ڈرائیور بھیجدیں۔"
"بہت اچھا، پر میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہ پڑیگی۔ کریم اپنے وعدے کا ایسا پکا ہے کہ جس طرح بھی ہوگا وقت سے پہلے پہونچ جائے گا۔"
"تم ٹیلیفون تو کردو۔"
ساڑھے گیارہ بجے میں نے برقی روشنی بجھادی اور اپنے بستر پر لیٹ کر دوسرے دن کے ضروری کاموں کی فہرست دل ہی دل میں مرتب کرنے لگی۔
دسمبر کی ستم انگیز رات تھی۔ سردی شدید تھی۔ بالسرا ور صنوبر کے سربلند درختوں پر خنک ہوائیں سائیں سائیں کررہی تھیں۔
میں ایک شوخ نارنجی رنگ کے لحاف میں بلی کی طرح دبکی دبکائی پڑی تھی۔ آتشدان میں چٹخنے والی صنوبر کی لکڑیوں کے شعلے کمرے کی تاریک دیواروں پر یوں لرزاں تھے جیسے کسی بھیانک غیر آباد راستے پر بدروحیں دبے پاؤں چل پھر رہی ہوں۔
اچانک گھڑیال نے بارہ بجائے اور میں نے آنکھیں نیند کے لئے بند کرلیں۔
چند ہی منٹ گذرے تھے، دفعتاً دروازے پر کسی کی دستک نے مجھے چونکا دیا۔
"کون ہے؟"
"ڈرائیور۔ کریم ہوں حضور۔"
میں نے قدرے حیران ہوکر پوچھا: "کریم؟ تم آپہونچے!"
"صبح آپ کو شوری جانا تھا نا۔"
میں لحاف میں لیٹے لیٹے بولی: "تم نے ناحق تکلیف کی۔ میں نے صبح کے لئے خاتون زلفی کے ڈرائیور کو بلالیا ہے۔ خیال تھا واپسی میں شوری سے تمہیں بھی ساتھ لیتی آؤں گی۔ تمہارا گھر کہیں اسی دیہات کے آس پاس ہے نا؟"
"جی۔"
"اچھی بات، خیال رہے، علی الصباح نماز کے فوراً بعد روانہ ہوجانا ہے۔"

---- ۲ ----

سردی کی پژمردہ اور تاریک صبح میں میں نے نماز پڑھی۔ زوناش نے گرم گرم کافی پلائی۔ پھر میں شال میں لپٹی لپٹائی باہر نکلی تو کار تیار ملی۔ یہاں تک کہ کریم اسٹرینگ پر ہاتھ رکھے پابہ رکاب بیٹھا تھا۔
میرے سوار ہوتے ہی کار چل پڑی۔
خنک ہوائیں جسم میں سوئیاں چبھو رہی تھیں۔ میں نے شیشے چڑھالئے اور سکڑ کر ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ بیٹھے بیٹھے اکتائی تو بیگ کھول کر پیری لوٹی" کا "صحرا" نکال لیا۔ اور مغربی افریقہ کی فرانسیسی نوآبادی کے پُراسرار اور پُرافسوں مناظر میرے تصور کی آنکھ کے آگے پھرنے لگے۔
میں دیر تک مطالعہ میں مستغرق رہی پھر نظر اٹھائی تو دیکھا کافی وقت گذر چکا ہے۔ سردیوں کے غیر دلچسپ پھیکے آسمان پر مریض سا سورج پژمردہ چہرے سے چمکنے کی کوشش کررہا تھا اور سفید دھوپ کہر کو چیر کر میدانوں میں اتر رہی تھی۔
میں نے کتاب بند کی۔ اِدھر اُدھر بے دلی سے دیکھا۔

جلائی اور بولی "تم پہلے اسی راستے سے جا چکے ہو نا؟ قریب ترین راستے سے چلنا۔ کیونکہ میرا وہاں ایک بجے تک پہونچنا بہت ضروری ہے"

"حضور میں بارہ بجے آپ کو وہاں پہونچا دونگا"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے، اس کے معنی یہ کہ میں ایک گھنٹہ آرام بھی کر سکوں گی۔ مگر دیکھو بہت تیز نہ چلو۔ کہیں ٹکرا نہ لگ جائے۔ ایک گھنٹہ دیر میں پہونچنا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ ہم کسی پہاڑ یا درخت سے ٹکرا جائیں اور کبھی نہ پہونچ سکیں"

یہ کہکر میں نے کتاب کھول لی اور پھر مطالعہ میں غرق ہو گئی۔

اچانک میں اپنی سیٹ پر اچھل پڑی اور کتاب میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے قدموں میں جا پڑی!

میں نے غصے سے کریم کی طرف دیکھا "یہ تم کیا کر رہے ہو؟ دیکھتے نہیں کار فی گھنٹہ ساٹھ میل پر جا رہی ہے"

"دیکھ رہا ہوں حضور۔ مگر بارہ بجے شوری پہونچنا ضروری جو ہے ـــــ"

"کوئی ضروری نہیں" میں نے غصہ کو ضبط کر کے کہا۔

مجھے لمحہ بہ لمحہ کار کی رفتار میں اور تیزی محسوس ہونے لگی۔ میں نے دیکھا اس نے رفتار ستر میل کر دی ہے۔ اطراف کے مناظر ایک ہیبتناک وارفتگی میں اُڑے جا رہے تھے۔ سڑک کے کنکر اُڑ اُڑ کر کار کے شیشوں پر لگ رہے تھے اور کار کے پیچھے کے شیشے میں سے گرد و غبار کے بگولے اُڑتے نظر آ رہے تھے۔

"کار روکو" میں نے انتہائی غصہ کی حالت میں کہا۔

"کار نہیں رُکے گی خاتون روحی۔ بارہ بجتے بجتے شوری پہونچنا ضروری ہے"

"ضروری ہے! کیوں؟"

"کیونکہ بارہ بجنے کے بعد ـــــ"

"بارہ بجنے کے بعد کیا ہوگا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"آپ پہونچ نہ سکیں گی"

"کیوں؟"

"جنازہ پہونچ جائے گا!"

"جنازہ!" میں نے کانپ کر کہا "کس کا؟"

اُس نے کار کی رفتار اور تیز کر دی۔ کار ضبط و احتیاط کو نظر انداز کر کے ایک بے عنان جنون میں اُڑی جا رہی تھی!

میں بدحواس ہو گئی چیخ پڑی "رو کتے ہو یا نہیں؟"

"نہیں!"

میرا خون جسم میں جم گیا۔ ہاتھ پاؤں سرد پڑ گئے۔ مجھے یقین ہو گیا یہ شخص ایک خوفناک جنونی ہے یا کسی شدید مرض میں مبتلا ہے۔ وہ میرے پاس چھ سال سے تھا میری تمام کار دل کا [illegible] نگراں تھا۔ بیحد محتاط تھا۔ ایسا گستاخ کبھی نہ تھا۔

میں کانپ گئی۔ جنازے کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ پیچھے گرد کا طوفان۔ سامنے کنکریوں کی بارش! دونوں طرف کے شیشوں کے ٹوٹنے کا ہر وقت خطرہ! میرا دل دھک دھک کر رہا تھا میں خدا سے دعا مانگ رہی تھی کہ جلد سے جلد کوئی حادثہ پیش آ جائے اور یہ خوفناک سلسلہ اختتام پر پہونچے۔

میں نے ڈرتے ڈرتے کریم پر نگاہ ڈالی۔ اور اپنے کو جھٹکوں سے محفوظ رکھنے کے لئے دریچے کے قریب کے ریشمی ڈورے کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ دہشت زدہ ہو کر کہا "کریم! تم بیمار تو نہیں؟"

"اب اچھا ہوں"

"یعنی! بیمار تھے؟"

"ہاں"

"تو پھر آئے کیوں؟ تمہیں آرام کی ضرورت تھی"

"آپ کو شوری جو پہونچانا تھا"

شدت خوف کے مارے میرے حلق سے اب آواز نہ نکلتی تھی۔ وہ لحہ بہ لحہ رفتار تیز کر رہا تھا۔ اور تیز ـــ اور تیز! سوئی اوپر کو چڑھتی جا رہی تھی۔ چڑھتی جا رہی تھی!! ستر سے اوپر ـــ اسی! اسی سے اوپر نوے۔ اور پھر ـــ نوے سے اوپر سو! باہر کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ معبود! میرے معبود!! ایک وحشی بگولا چیخیں مارتا ہوا مجھے فنا کی طرف لئے جا رہا تھا۔

میری چیخوں نے کہا "احمق! یہ کیا کر رہا ہے! اُف اُف۔ خدا کے لئے کار روک دو۔ دیکھو میرے ساتھ تم بھی ہلاک ہو جاؤگے ـــ کہاں جا رہے ہو؟ ـــ کہاں؟ لو شوری پہونچ گئے۔ اب تو روکو۔ یہ شوری کا قبرستان سامنے آگیا ـــ آگیا"

میں نے ایک دیوانہ وار چیخ مار کر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

کار اپنے جنون میں ایک مٹی کے ٹیلے پر چڑھ گئی تھی اور

پھر ——— ؟ اور پھر بڑے زور سے جیسے فنا کے قعر میں گر پڑی. ایک دھماکے کے ساتھ! جیسے آسمانوں سے گرجنے والے سمندر میں بجلی گرتی ہے.

جب آنکھ کھلی تو سوختہ قبرستان پر اپنی بے نیاز شعاعیں پھینک رہا تھا. میں [illegible] کے سائے میں لاش کی طرح پڑی تھی.

قبرستان کا دروازہ کھلا اور لوگوں کے ہجوم کی آواز آئی. میں نے نظر اُٹھائی تو دیکھا کہ لوگ ایک جنازہ لئے اندر داخل ہو رہے ہیں.

دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ گذشتہ رات بارہ بجے کے قریب ڈرائیور کریم کا ہیضے سے انتقال ہو گیا تھا. اس وقت بارہ بجے اُسے دفنانے کے لئے اس قبرستان میں لے آئے ہیں.

حجاب امتیاز علی،

نامعقول ڈراما

(بسلسلۂ صفحہ ۲۷)

جوہری:- (مٹھیاں بھینچ کر) آخر ہو نہ مچھ مُسلے.

جعفری:- کیوں بے کافر.

جوہری:- ڈشٹ پانی.

جعفری:- ہندو کے بچے، گائے کا مُوت پینے والے. (چھرا نکالتے ہوئے) لے یہ لے.

جوہری:- عزت کے لٹیرے، گائے کا خون پینے والے. (چھُرا نکالتے ہوئے) لے یہ لے.

(ایک دوسرے کے سینے پر چھُرا چلاتے ہیں اور دونوں مر کر گر پڑتے ہیں. خاموش کمرے میں دو لاشیں پڑی ہیں. مچھر اُن پر بھنبھنا رہے ہیں. سامنے دیوار پر کنگ جارج کی تصویر مسکرا رہی ہے.)

سید رفیق حسین،

ایک غزل پر

ہو گئی میرے "تقاضائے ترنم" پہ غزل
ان تقاضوں کو ہے دعوائے حیاتِ ابدی
شعر بنجاتے ہیں جب فکر کا احسان ہو جائے
کچھ بڑی بات ہے ضو گستری مثلِ خاور؟
ذرّہ وہ کب ہے جو خورشید بداماں ہو جائے!
کیا سلاست ہو کہ ہر شعر ہے یا سحرِ حلال
زلف ناگن۔ جو سنورنے میں پریشاں ہو جائے
کیا روانی ہے کہ تخیل کے ہلکوروں سے
موجِ تسنیم کا ہر لفظ سے پیاں ہو جائے
کیا صفائی ہے کہ اک اک مترنم مصرع
اِن کا پیکاں ہے جو مے میں ہمہ ارماں ہو جائے
ہر نہیں "شوخیٔ اسلوب کی گستاخی سے
کیا تماشا ہے کہ انکار ہی سے "ہاں" ہو جائے.
اک ذرا چھیڑ تھی جو خالقِ "افسانہ" بنی
میری ٹوٹی سی گلابی تھی جو میخانہ بنی
اشک جو ٹپکیں گے، فردوس بداماں ہونگے
پھر بہار آئی مرے خوں شدہ ارمانوں پر
کیف و مستی کا نیا باب کھُلا جاتا ہے
کہدو وحشت سے مسلط نہ ہو دیوانوں پر!
عرق آگیں ہُوا جاتا ہے الم کا مکھڑا
پڑتی ہے کس کی نگہ سوختہ سامانوں پر
"ہم نے دیکھے ہیں بہت زلف کے خم تیغ کے بل"
اس غزل کی ہی حقیقت تھی نہ ستم ہائے طرف پر
"کیا عجب ہو دلِ گم گشتہ ملے، ہاں ساقی
اک نظر اور بھی ٹوٹے ہوئے پیمانوں پر"
پھر وہی شعر کہ فرسودہ ہوئی جانِ امل
ہو گئی میرے "تقاضائے ترنم" پہ غزل

مختار صدیقی،

لہ غزل کی زمین تھی، سماںوں پہ تعلیم شعر۔ [illegible]

مردار سنگ کیوں کہتے ہیں

میرے ایک کرم فرما جو کیمسٹری کے پروفیسر ہیں آج کل اس جستجو میں ہیں کہ مردار سنگ کی وجہ تسمیہ کیا ہے۔ سیسے کی کان سے ایک معدن نکلتی ہے جس میں تھوڑی سی سونے اور چاندی کی آمیزش ہوتی ہے۔ بھٹی میں سونا چاندی الگ کرتے ہیں تو پتھر جیسا مادہ باقی رہ جاتا ہے، اسے مردار سنگ کہتے ہیں۔ اس کا دوسرا نام مُردہ سنگ یا مُرداسنگ بھی ہے۔ یہ لفظ کئی زبانوں میں رائج ہے۔ یعنی عربی، فارسی، ترکی، ہندوستانی، چینی اور جاپانی۔ شاید ایشیا کی دوسری زبانوں میں بھی موجود ہوگا۔ اوّل چار زبانوں میں اپنی اصلی شکل میں پایا جاتا ہے۔ سوائے اس فرق کے کہ عربی میں مُرداسنگ اور ترکی میں مردے سنک کہتے ہیں۔ طرز تحریر اور زبان کی ساخت کے اختلاف کی وجہ سے چینی میں اس کی شکل قدرے بدل گئی ہے۔ اس کی آواز چینی کے تین لفظوں میں ظاہر کی جاتی ہے۔ جن کا تلفظ یہ ہے: "می توؤ سونگ" یہی لفظ جاپانی میں رائج ہے۔

اسے انگریزی میں 'لتھارج' کہتے ہیں۔ یہ سیسے کا آکسائڈ ہے۔ یعنی سیسے اور آکسیجن کا کیمیاوی مرکب۔ سیسے کے دو آکسائڈ اور بھی ہیں۔ جن کی کیمیاوی ترکیب میں فرق ہے۔ مگر یہ دونوں خارج از بحث ہیں۔ عربی میں اس کا ایک نام اکسید الرصاص ہے جو کیمیاوی ترکیب ظاہر کرتا ہے۔ کیونکہ اکسید دراصل انگریزی لفظ آکسائڈ کا معرب ہے۔ عربی میں اسے مَرتک اور رَتک بھی کہتے ہیں۔

یہ صاحب لفظ مُردار سنگ کی توجیہہ کئی طرح کرتے ہیں۔ اوّل جب معدن بھٹی میں ڈالی جاتی ہے تو گرمی سے سونا اور چاندی پگھل کر باہر آجاتے ہیں۔ یہ گویا زندہ ہیں۔ بھٹی میں جو باقی رہ گیا وہ مُردہ یا مردار ہے۔ دھاتیں پگھل کر بہنے لگتی ہیں، اُن میں حرکت پیدا ہوجاتی ہے، اس لئے یہ زندہ ہیں۔ پتھر میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی اس لئے وہ مُردہ ہے۔ اسی وجہ سے فضلے کو مردار سنگ کہتے ہیں۔ دھاتوں اور معدنیات کے ساتھ زندہ مردہ کا تخیل وابستہ کرنا پرانے زمانے کا دستور تھا جب کیمیاگری کا زور تھا۔ حکماء پارس کی تلاش میں رہتے تھے کہ سیسے کو چھوا اور وہ سونا بن گیا۔ پارس کچا ہے تو چاندی تو بن ہی جائیگی۔ سیسے، سونے اور چاندی کا جوڑ غالباً اسی وجہ سے تھا کہ سیسے کی معدن سے سونا اور چاندی بھی نکل آتے ہیں۔

دوسری توجیہہ یہ ہے کہ سیسہ یا اس کی معدن کو تیز آنچ پر ہوا میں گرم کیا جائے تو سیسہ پگھل کر جلنے لگتا ہے اور مُردار سنگ بن جاتا ہے۔ گویا کہ مُردار سنگ ایک لاش ہے جو ہندوؤں کے مُردے کی طرح ہوا میں جلی ہے۔ اس کی تائید سنسکرت کے ایک لفظ مْرِیتکہ (میم ساکن) سے ہوتی ہے جس کے معنی ہیں انسان کی لاش۔ اسی لفظ سے مُردار سنگ کا لفظ نکلا ہے۔ مْرِیتکہ سے ملتا جلتا عربی کا لفظ مَرتک ہے جو مُردار سنگ کا مترادف ہے۔ چند توجیہیں اور ہیں جو بہت دور از قیاس ہیں اور قابل التفات نہیں۔

مذکورہ بالا توجیہوں میں کچھ تائیدی دلائل میں نے اپنی طرف سے بڑھا دئے ہیں۔ مگر میرے نزدیک پہلی توجیہہ صحیح ہے۔ دوسری توجیہہ پر بہت سے اعتراض وارد ہوتے ہیں جن کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں۔ اوّل تو سنسکرت لفظ مْرِیتکہ اور عربی لفظ مرتک ہم معنی نہیں۔ ایک کے معنی انسانی لاش اور دوسرے کے معنی معدنی پتھر۔ تلفظ کی مشابہت ایک اتفاقی امر ہے، ورنہ دونوں زبانیں بالکل مختلف ہیں۔ سنسکرت آرین زبان ہے۔ فارسی اور انگریزی کے بعض الفاظ سنسکرت الفاظ سے مشابہ ہیں۔ کیونکہ یہ بھی آرین زبانیں ہیں۔ مگر عربی سے کوئی مشابہت نہیں کیونکہ وہ سامی زبان ہو جو مختلف ماحول میں بنی ہے۔

مرِیتکہ اور مردار سنگ میں کوئی نسبت نظر نہیں آتی۔ نہ معنوی نہ صوری۔ دوسرا لفظ چینی زبان کی طرح پہلے لفظ کی توڑی مروڑی شکل نہیں ہو سکتا۔ مردار سنگ فارسی کے دو بامعنی الفاظ سے مرکب ہے، جو ایران کی زبان ہے۔ ایران کے نواحی ممالک کی زبانوں میں اس کی موجودگی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ لفظ ایران سے نکلا ہے اور چاروں طرف پھیل گیا۔ جاپان میں کافی مدت ہوئی

کہ تحقیق جاری رکھی جائے۔ اگر سنسکرت اور ہندوستان کی دیگر زبانوں کی تحقیقات کی جائے تو اغلب ہے کہ ان میں بھی یہ لفظ مل جائے گا۔

ایشیا کی قدیم زبانوں میں مردار سنگ کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ یہ لفظ از منۂ قدیم میں ایران میں بن کر باہر نکل چکا تھا۔ اس کے علاوہ ہندوؤں میں لاش جلانے کی رسم بعد میں جاری ہوئی ہے۔ پھر [illegible] مرگھٹ کا اطلاق مُردے پر جلانے سے قبل ہوتا ہے۔ جلانے کے بعد اس کو لاش نہیں کہتے بلکہ راکھ کہتے ہیں۔ برخلاف اسکے مُردار سنگ وہ چیز ہے جو جلانے کے بعد نمودار ہوتی ہے۔ جلانے سے قبل اس کا وجود نہیں ہوتا۔

پہلی توجیہ بہت مستحکم معلوم ہوتی ہے۔ پُرانے زمانے میں کیمیا گر علماء جمادات کو انسانی اوصاف سے متصف کرتے تھے۔ سونے چاندی کو شریف دھاتوں میں شمار کرتے تھے اور لوہے کو رذیل کہتے تھے۔ ہر شے جس میں حرکت پیدا ہو زندہ تھی اور جس میں جمود ہو مُردہ۔ چنانچہ پارے میں آثارِ حیات نہایت نمایاں تھے۔ سونے چاندی جیسی زندہ دھاتوں کے حل کئے پر جو چیز باقی رہیگی وہ مُردہ کہلانے کی ہی مستحق ہے۔ سونے چاندی کے مقابلے میں وہ چیز کوئی حقیقت نہیں رکھتی بلکہ مجس ہے۔ اور اسکی حیثیت مردار کی سی ہے۔

اس قسم کی تحقیقات سے قدیم تہذیب و تمدن پر بڑی روشنی پڑتی ہے اور ہمیں انسان کی تاریخ سمجھنے میں بڑی سہولت ہوتی ہے۔ ایشیائی زبانوں میں اس لفظ کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ ایرانی تمدن کا اثر چاروں طرف اس قدر پھیلا ہے کہ وہاں کی زبان کے الفاظ بجنسہ دوسری زبانوں میں داخل ہو گئے۔ ابھی اس لفظ کی تحقیق نامکمل ہے، اُمید کہ دیگر اصحاب اس پر مزید روشنی ڈالیں گے۔ ادبیات میں بھی اس لفظ کی تلاش کرنی چاہیئے۔ مجھے ذوق کا ایک شعر دستیاب ہوا ہے ؎

رہتا میں بسکہ جیفۂ دنیا سے تنگ ہوں
پارس بھی ہو تو جانئے مردار سنگ ہوں

غالباً یہاں ذوق کو اسکی ماہیت سے بحث نہیں بلکہ صرف لفظی معنی کی طرف اشارہ ہے۔ اگر ماہیت ظاہر کرنی مقصود ہے تو میری توجیہ کی تائید ہوتی ہے۔

نور الحسن برلاس

حوصلۂ نیاز

سر ترے سینے پہ رکھکر دُور جا سکتا ہوں میں
دُور اتنی دُور تارے چُن کے لا سکتا ہوں میں
آگ نبضوں میں تجھے چھو کر لگا سکتا ہوں میں
تیرے دل کی دھڑکنیں گِن کر بتا سکتا ہوں میں
ریشمیں ڈورے تری زلفوں کے لیکر ہاتھ میں
عمر کی زنجیر میں کڑیاں بڑھا سکتا ہوں میں
ختم کر دے خود ہی تو باہوں سے آزادی کی جنگ
اس طرح آغوش میں تجھکو دبا سکتا ہوں میں
دیوتا جس کے لئے ترسا کئے وہ بے خودی
تیری آنکھوں، تیرے ہونٹوں سے چُرا سکتا ہوں میں
جس کی پینگیں چُوس کر آئیں لبِ کوثر کا رنگ
گود میں ایسے تجھے جھولا جھلا سکتا ہوں میں
لَو نہ دیں جب تیرے گالوں کے دیئے مجکو پکار
اپنی سانسوں سے یہ قندیلیں جلا سکتا ہوں میں
میرے سائے ہی میں رہنے کی تمنا ہو تجھے
یوں تری اس نازکی مدامی چھلکتا ہوں میں
تُو ہے جس کی تیز دھاروں میں بہایا ہو مجھے
تیری رگ رگ میں بھی وہ طوفاں اٹھا سکتا ہوں میں
خال و خد پہ حشر تک جن کے نشاں باقی رہیں
ان پر ایسے پیار کی مہریں لگا سکتا ہوں میں
پھیر کر اعضائے یخ بستہ پہ تیرے نرم ہاتھ
سر سے پا تک تجھکو برقی رَو بنا سکتا ہوں میں
فرطِ مستی سے تجھے انگڑائیاں آنے لگیں
تجھ پہ اس انداز سے نظریں اٹھا سکتا ہوں میں
شاخ پر بیٹھے ہیں جیسے دو کبوتر پاس پاس
اپنے پہلو میں تجھے یوں بھی بٹھا سکتا ہوں میں
جا رہی ہے جیسے پگڈنڈی گُلوں کے جھنڈ میں
یوں بھی تیرے دل میں آنکھیں [illegible] سکتا ہوں میں
آ بھی جا خلوت میں دنیا کی کھل کر دوا گناہ!!
ذوقِ عصیاں کا [illegible] سکتا ہوں میں [illegible]

مزدور کا ہتوڑا

کامریڈ تپمبر نرائن مزدور سبھا کے سکریٹری تھے اور شہر کے اونچے گھرانے اور اہم ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ بی۔ اے کر لینے کے بعد جب ڈپٹی کلکٹری کی متواتر کوششوں میں ناکامی ہوئی تو ان کا خیال اپنے غریب دلیس کے ان لاچار بھائیوں کی طرف خود بخود چلا گیا جو مزدور کہلاتے ہیں اور اپنی تھوڑی سی آمدنی میں اپنا پیٹ بھی نہیں بھر سکتے۔ کامریڈ تپمبر کا خیال کچھ اس لئے اور بھی چمک اٹھا کہ زمانہ حال کے تمام رسالے، کتابیں اور اخبار کے صفحات کچھ اسی قسم کی ہمدردانہ باتوں سے پُر رہتے ہیں۔ ان کی عمر کوئی تیس سال کی تھی۔ ان کا رنگ سیاہی مائل گندمی تھا اور ان کا قد بھی مائل بہ پستی تھا۔ ان کی پیشانی تنگ، چہرہ مبہم وضع کا چھوٹا، ہونٹ موٹے اور لٹکے ہوئے اور ناک چھتری کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ دیش بھگتی اور ہریجن سیوا اور کچھ کفایت شعاری کے خیال سے وہ ہمیشہ کھدر کا کرتا اور دھوتی پہنتے تھے۔ کامریڈ تپمبر نے مزدوروں کی حالت سدھارنے کا گویا بیڑہ اٹھا لیا تھا۔ ان کی زندگی کے تین سال اس خدمت میں نہایت انند سے گذر گئے اور اپنے خیالات کے پرچار کیلئے ایک پندرہ روزہ رسالہ "بھائی لوگ" بھی جاری کر لیا جس میں طرح طرح کی طرز جدید میں نظمیں، مقالے اور افسانے خود لکھتے تھے اور دوسرے کامریڈوں سے بھی لکھواتے تھے۔ اس رسالے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ شہر کے تمام ایسے اصحاب جنکو بالواسطہ یا بلاواسطہ مزدوروں سے کچھ بھی تعلق تھا، اس کا نام سنتے ہی کانپ اٹھتے تھے اور کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے۔ مزدور کی روٹیوں کی تعداد میں اضافہ کرنے اور ان کی حالت سدھارنے کیلئے کامریڈ تپمبر نے اپنا ایک چھوٹا سا محکمۂ سراغرسانی بھی کھول رکھا تھا جس کے افراد مختلف ملوں کے مزدور تھے۔ یہ مزدور اپنے ذاتی بغض و عناد اور لڑائی جھگڑے کو مد نظر رکھکر ایسی خبریں لاتے اور ان خبروں کو کچھ اس طرح بڑھا چڑھا کر بیان کرتے کہ رائی کا پہاڑ اور سوئی کا بھالا بن جاتا تھا۔ چنانچہ "بھائی لوگ" کا کوئی نمبر اس قسم کی موٹی سرخی سے خالی نہ ہوتا۔ "مزدوروں کا ہتیا چاری پھر مزدوروں پر قیامت ڈھا رہا ہے"۔ "آج سرسوتی مل کے ڈائرکٹر نے بھائیوں سے آٹھ گھنٹے کام لیا"۔ "گنگا مل کے چار بھائیوں کی روٹی چھین لی گئی"۔ "سپرنٹنڈنٹ ظالم مل نے اندھیر مچا رکھا ہے"۔ "ایک بھائی کو پائخانہ جانے تک کی چھٹی نہ دی گئی" وغیرہ وغیرہ۔

اخبار کی قیمت فی پرچہ ایک پیسہ تھی اور یہ دیکھکر حیرت ہوتی تھی کہ اتنی کم قیمت کا پرچہ اپنے مدیر اور دیگر کارکنان ادارہ کا کیونکر ذریعۂ معاش بنا ہوا تھا۔

کامریڈ تپمبر نرائن کی استری شریمتی سرلا دیوی شہر کے ایک رئیس زمیندار گھرانے کی بیٹی تھی جس میں سات پشتوں سے امارت و دولت چلی آرہی تھی۔ مگر زمانے کے انقلاب پسند ہاتھوں نے اب سب کچھ تباہ و برباد کر کے رکھدیا تھا۔ شریمتی کے پتا جی مرے ہوئے کبھی کے سرگباش ہوچکے تھے اور ان کے محل کے کھنڈرات پر اب ان کا بھائی ڈنکے بجا رہا تھا۔ باپ دادا کی بچی کچھی دولت اور جائداد جس کی آمدنی کل سے بیس روپے ماہوار تھی شریمتی کے بھائی، بھاوج اور کسنے آٹھ دس بچوں کی تنہا کفیل تھی۔ خاندانوں سے دولت چلی جاتی ہے مگر ان کے افراد کے دماغوں سے پھسکے امارت نہیں جاتا۔ یہی حال ہماری شریمتی سرلا دیوی کے دماغ کا بھی تھا جس سے گذشتہ شان و شوکت کے خواب مٹائے نہیں مٹتے تھے۔

سرلا جب میٹرک پاس کر چکی اور بیاہ کر اپنی سسرال آئی تو پتی نے بی۔ اے پاس کیا تھا اور ڈپٹی کلکٹری کے لئے کوشش کر رہا تھا۔ پتی کی اس کوشش نے سرلا کے دماغ کو ایسا بہارستان بنا دیا تھا جس میں رنگ برنگ کے پھول کھلتے ہیں اور طرح طرح کی چڑیاں چہچہاتی ہیں۔ سرلا کا یہ رنگین سپن دو سال کے اندر ہی اندر کومل کلی کی طرح مرجھا کر رہ گیا اور اس کی ریشمی ساڑھیاں، اونچی ایڑی کے جوتے، گالوں کے غازے، لپ اسٹک اور سینٹ کی شیشیاں ایک ایک کر کے رخصت ہو گئیں اور ان کی جگہ پر کھدر کی ساریاں، چپل، عینک اور کھدر کا رنگین تھیلا آ گیا۔ آریہ ورت کی کنیائیں پتی بھگتی اور پتی سیوا کے لئے دور دور تک مشہور ہیں۔ چنانچہ جب امیدوں کا امڈتا ہوا دریا اتر گیا تو سرلا نے اپنی ڈوبتی ہوئی کشتی کو پار لگنے کا تہیہ کر لیا اور پتی دیو کے رنگ میں رنگ گئی۔ اب صبح شام، اٹھتے بیٹھتے اس کی زبان پر بھی مزدور مزدور کی رٹ تھی اور ان کے [illegible]

بھی کٹھنک سارٹسیاں تھیں جب کبھی کوئی جلسہ ہوتا اور اُن کے پتی سبھا کے پتی ہو کر جاتے تو یہ بھی اپنے ہاتھ میں کھدر کا رنگین تھیلا لٹکا کر جلسہ میں ضرور شریک ہوتیں۔ چونکہ تیمبر نرائن مزدور سبھا کے سرگرم کارکن ہونے کے سبب سے کامریڈ کہلاتے تھے اور اپنی استری کو بھی کامریڈ [illegible] کامریڈ سرلا دیوی مزدوروں کی بہن اور مزدور [illegible] تھیں۔ جلسوں میں جھنڈا لہرانا، باہر سے آئے ہوئے لیڈروں کو ہار پہنانا، مزدوروں کے بچوں کو مٹھائی تقسیم کرنا اور جلسوں کی [illegible] اپنی رس بھری آواز سے انقلابی گیت گا کر کرنا ان کے فرائض میں داخل ہو گیا تھا۔

کامریڈ تیمبر نرائن کا دست راست یونین مل کا ایک جمعدار کامریڈ سوبھا سنگھ تھا جو مل میں جمعدار ہونے سے پہلے مقامی میونسپلٹی میں بھنگی تھا میونسپلٹی کی نئی کچرا گاڑیوں کے خلاف بھنگیوں نے اسٹرائک کی تھی جس میں کامریڈ سوبھا سنگھ کی سرگرمیاں سب سے پیش پیش تھیں۔ اسٹرائک کے ختم ہونے کے بعد سوبھا سنگھ چوری اور قمار بازی کے جرم میں دو سال قید بامشقت کی سزا بھگت چکا تھا۔ جیل سے واپس آنے کے بعد سوبھا سنگھ نے اپنے نام کے ساتھ سنگھ کی خود ساختہ پدوی لگالی۔ اب اگلا سنہری زمانہ تو رہا نہیں کہ سنگھ کی پدوی پر اچھوت جاتی کا خون جوش کھانے لگتا اور ایک بھنگی کو سنگھ کی پوتر پدوی کا اختیار کرنے پر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ انگریزی راج ہے، ہر طرف آزادی کا پرچار ہے، ہر جگہ انجمنیں، سبھائیں، سیوا سمیتی، ہریجن سدھار، گاؤں سدھار، مزدور دل اور انقلاب زندہ باد کے نعرے ہیں، جوان نعروں کو جتنے زور سے لگائے اور سماج کی اونچ نیچ کی جس شدت سے دھجیاں اُڑائے وہی سب سے بڑا آزاد خیال، سمجھدار اور ملک و قوم کی سیوا کرنے والا مانس سمجھا جاتا ہے۔ سوبھا سنگھ اپنی تمام خباثتوں کے باوجود اپنے حلقوں میں خاص عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اور مزدوروں کے جلسوں میں اسے "آؤ سنگھ جی آؤ" کہہ کر پنڈال پر جگہ دی جاتی تھی۔

"بابو جی، سالے نے سمجھ کیا رکھا ہے، اس کی ایسی مٹی پلید کردوں کہ وہ بھی یاد کرے، مجدور جنتا کی پروا نہ کرنا کیا کوئی کھیل ہے۔"

"سنگھ جی، یہ سب کچھ تو ٹھیک ہے مگر ہم بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں۔ اس نے جو کچھ کہا ہے قانون کی رو سے درست ہے۔"

"بابو جی، میں کانون وانون تو جانتا نہیں، بھائی لوگوں پر [illegible] کی روٹی چھینی گئی ہے۔ ہمیں کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ آپ (مسکرا کر، مجدوروں کے دیوتا ہیں۔"

"یار، دیکھو، کچھ سختی کا برتاؤ کرتا ہوں تو پھر کے یہ سُور وہاں بیٹھا ہوا جو [illegible] ہیں بند ہو جائینگے۔"

"بابو صاحب، اس سالے کی کیا مجال ہے جو ہمارے چندہ کی ایک پائی بھی ہجم (ہضم) کرلے۔ ایک اسٹرائک میں بچے کے چھکے نہ چھڑا دوں اور سو کے دو سو نہ وصول کرلوں تو میرا نام (موچھوں پر تاؤ دیکر) سوبھا سنگھ نہیں۔"

مندرجہ بالا گفتگو کامریڈ تیمبر نرائن اور کامریڈ سوبھا سنگھ کے درمیان "بھائی لوگ" کے دفتر میں ہو رہی تھی کہ باہر کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ گویا وہ ایک دوسرے سے دریافت کر رہے تھے کہ یہ کون ہے؟۔

سوبھا سنگھ نے کھڑے ہوتے ہوتے ہنسکر تپاک سے کہا: "آیئے، شریمتی جی، آیئے، اور ہماری اس گتھی کے سلجھانے میں ہماری مدد کیجئے۔"

سرلا دیوی اس وقت کچھ اداس سی نظر آرہی تھی اور اُس کا دمکتا ہوا شباب جو اُس کے سینے، کولھے، بازو اور چہرے سے ہر وقت پھٹا پڑتا تھا اس وقت راکھ کے نیچے دبی ہوئی چنگاری کی طرح نظر آرہا تھا۔ اُس کی بڑی بڑی سیاہ اور سرمگیں آنکھیں ایسے جامِ شراب کی طرح تھیں جو خالی ہو گئے ہوں۔ اسکے کمان جیسے بل کھاتے ہوئے پتلے اور نازک لبوں کی سرخی جو ہر گھڑی رسیلی نظر آتی تھی اس وقت کملائے ہوئے گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح پھیکی نظر آرہی تھی۔ سوبھا سنگھ کے خیر مقدم نے سرلا کے تھکے ہوئے ابروؤں کے درمیان دو باریک کھڑی لکیریں پیدا کردیں، اُس کی آنکھوں کے اندر ایک ہلکی سی چمک پیدا ہوئی اور بجھ گئی، اسکے لب کچھ کھچکر تن گئے اور پھر ان پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"کہیئے، کہیئے، آخر وہ کونسی سیاسی گتھی ہے جس کو آپ جیسے دو مدبر بھی سلجھا نہیں سکتے؟" سرلا یہ کہتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور سامنے کھڑکی سے سڑک پر ایک بے معنی سی نظر ڈالنے لگی۔ جہاں ایک کمزور کتا ایک مضبوط کتے کو ہڈی چچوڑتے دیکھ کر بیکسی سے غرا رہا تھا۔ سرلا نے مڑکر اپنے شوہر کو دیکھا اور ایک اچٹتی ہوئی نگاہ سوبھا سنگھ پر ڈالی اور پھر ان کتوں کو دیکھنے لگی جو ایک ہڈی کے لئے ایک دوسرے کو کاٹ کھانے کیلئے تیار تھے۔ جہاں تیمبر نرائن نے اپنے کاندھے سے کھدر کی چادر کو علاحدہ کرتے ہوئے

کہا: مہارانی کو اپنے منتریوں کی سیوا شاید پسند نہیں! ؟"

سرلا نے شوہر کی طرف بغیر دیکھے ہوئے کہا: "اونہہ!" اُس کے دونوں شانے کچھ بلند ہو کر گر گئے۔ وہ سڑک پر اُن دو کتوں کو بدستور دیکھتی رہی تھی جو اب ایک دوسرے سے گتھ گئے تھے۔ پتمبر نرائن نے اپنے وار کو یوں خالی جاتے دیکھ کر تجربہ کار سیناپتی کی طرح لڑائی کا رُخ بدلا اور ہنس کر کہنے لگا: "سرلا، کہو کیسے آنا ہوا؟"

سرلا نے جواب دیا: "یونہی، بس آ گئی، گھر میں جی نہ لگا، سوچا چلو باغ کی سیر کر آئیں... کیوں آپ میرے ساتھ چلیں گے؟"

پتمبر نرائن جو اپنی بیوی کے شاہانہ دماغ سے واقف تھا گھبرا کر کہنے لگا: "چلونگا، ہاں ہاں، ضرور چلونگا۔ مگر یہ "بھائی لوگ" کا نیا پرچہ کل ہی شائع ہوگا اور اس کے لئے اب تک مضامین مہیا نہیں ہو سکے ہیں۔ اور... ہاں... سرلا تم نے بہنوں کے سدھار کیلئے ایک مضمون دینے کا وعدہ کیا تھا وہ کہاں ہے؟"

سرلا نے منہ بنا کر کہا: "لکھ رہی ہوں مگر ابھی مکمل نہیں ہوا ہے۔ آپ چلتے ہیں یا نہیں؟"

پتمبر نے بیکسی سے سوبھا سنگھ کی طرف دیکھا۔ سوبھا سنگھ نے موقع کی نزاکت کو تاڑ لیا اور کہنے لگا: "بابو جی کا ابھی دپھتر (دفتر) میں رہنا بہت جروری (ضروری) ہے۔ کل یونین مل کے دو کامریڈوں کی روٹی منیجر ہتھیاچاری نے چھین لی ہے، اُنکے لئے بابو جی کو کچھ کرنا ہے۔" آخری الفاظ پر سوبھا سنگھ نے ایک بامعنی نگاہ سرلا پر ڈالی اور بول اٹھا: "بائی جی، چلئے میں آپ کے ساتھ چلوں۔"

پتمبر نرائن نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور سوبھا سنگھ پر تشکرآمیز نگاہ ڈالی۔ سرلا اُٹھ کھڑی ہوئی اور یہ کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی: "اچھا تو میں جاتی ہوں۔" سوبھا سنگھ بھی اُٹھا اور پتمبر نرائن کے حکم کے مطابق سرلا دیوی کے پیچھے چل پڑا۔

اکتوبر کا مہینہ تھا اور شام کا وقت، دن کی وسعت سُکڑ کر جاڑے کے آنے کی خبر دے رہی تھی، آفتاب جلد جلد قدم بڑھاتا اپنے مسکن کی طرف جا رہا تھا۔ کوّے غول در غول اپنی رٹ لگاتے پورب سے پچھم کی طرف اُڑے جا رہے تھے، فضا میں ایک عجیب قسم کی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ تانگے، موٹر، سائیکل اپنی طرح طرح کی کرخت اور بھرائی ہوئی آواز سے فضا کی خاموشی کی دھجیاں اُڑا رہے تھے۔ لوگ اپنے اپنے گھروں سے سیر کی خاطر باہر نکل آئے تھے،

خوانچے والے اپنی باسی اور ٹھنڈی چیزوں کو تازہ اور گرم سودا کہکر بیچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سرلا ایک خاص انداز سے اپنی چال میں شباب کی شوخیاں بھرے اٹھلا کر چل رہی تھی، اُس کی نظریں جان بوجھ کر زمین پر گڑی ہوئی تھیں مگر اس طرح کہ وہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ سرلا اپنے انداز سے یہ ظاہر کر رہی تھی کہ اُسے اپنی طرف دیکھنے والوں کی کوئی پروا نہیں مگر اس کو غور سے دیکھا جاتا تو یہ محسوس ہوتا کہ وہ للچائی ہوئی نظروں کو محسوس کر رہی ہے اور دل ہی دل میں لطف لے رہی ہے۔ سوبھا سنگھ اپنی لمبی اور گھنی مونچھوں پر تاؤ دیتا کنکھیوں سے ان حضرات کو گھورتا جا رہا تھا جن کی نظریں سرلا پر ایک بار پڑ کر پھر دوبارہ پڑ رہی تھیں۔ یہ دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق پبلک گارڈن میں پہونچے۔ سرلا نے باغ کے ایک تنہا بنچ کو پسند کیا اور بیٹھ گئی۔

باغ میں تفریح کرنے والوں کی مختلف ٹولیاں اپنی اپنی دُھن میں مشغول تھیں۔ کوئی دوڑ رہا تھا تو کوئی تیزی سے چل رہا تھا اور کوئی اپنی موٹی اور لمبی چھڑی کو ہوا میں گھماتا ایسی شانِ استغنا سے چل رہا تھا جیسے وہ کسی زندہ قوم کا ڈکٹیٹر ہے۔ سوبھا سنگھ، سرلا سے کچھ فاصلہ پر اس کی پشت کی طرف گھاس میں بیٹھ گیا۔ اُس کی چندھی آنکھیں اس کے گھنے ابروؤں کے نیچے دمک رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں اس وقت ایسی روشنی تھی جو اس کے قلب کی کثافتوں کو نمایاں کر رہی تھیں۔ وہ اپنے محفوظ مقام سے بیٹھا ہر آنے جانے والے کو تاڑ رہا تھا۔ اور جب کوئی للچائی ہوئی نظر سرلا پر پڑتی تو وہ فوراً سرلا کی طرف دیکھتا اور پھر دیکھنے والے کی طرف۔ وہ عاشق مزاج نظر بازوں کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہا تھا اور اپنی تجربہ کار آنکھوں سے پرکھ رہا تھا کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ نمائش و دید اور جانچ پڑتال کا یہ سلسلہ یوں ہی جاری تھا کہ کچھ فاصلے پر ایک چمکدار بڑا سا سُرخ رنگ کا موٹر نہایت آہستگی سے آ کر رُک گیا۔ جیسے آسمان سے کوئی ستارہ ٹوٹے اور ہوا میں ایک منوّر لکیر کھینچتا ہوا بجھ جائے۔ موٹر کے اندر ایک نوجوان اپنی ترچھی اداؤں کے ساتھ خوب بن سنور کر بیٹھا سگریٹ کا دھواں اُڑا رہا تھا اور بہانہ بہانہ سے سرلا کو دیکھ رہا تھا۔ سرلا نے بھی اسے دیکھ لیا۔ وہ اب کبھی کبھی اپنی شرمیلی اداؤں کو خوب نمایاں کر کے خود بخود اپنی اس دانستہ نمائش پر شرمانے اور جھینپنے لگتی اور ایک آدھ بار ایک اچٹتی ہوئی نگاہ موٹر پر ڈال دیتی۔ شکاری سوبھا سنگھ نے دانہ و دام کے اجتماع کو [illegible] اور دل ہی دل میں ایسے سنہری موقع پر خوش ہونے لگا [illegible]

پر گیا کہاں مضبوط سے مضبوط شکاری جال میں پھنسنے کے لئے بے چین تو [illegible] اٹھا اور سرلا سے سمجھا کر کہنے لگا "دیوی جی! میرے ایک ملاقاتی، وہ دیکھئے سامنے [illegible] اور مجھے بلا رہے ہیں، میں ان سے مل کر ابھی آتا ہوں۔"

سرلا نے [illegible] دیکھا اور شرمائی ہوئی نگاہیں موٹر پر بھی ڈالیں اور اپنے خوبصورت سر کی جنبش سے اس کو جانے کی اجازت دے دی۔

سوبھا سنگھ ایسی دلیری سے جو صرف کہنہ مشق بدمعاش کے [illegible] کی چیز ہے موٹر کی طرف بڑھا اور موٹر نشین صاحب کو جھک کر ادب سے سلام کیا۔ یہ صاحب جو شاید اب تک "دور کا جلوہ" لوٹنے کے عادی تھے ایک اجنبی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر بہت سٹپٹائے اور اپنی نشست پر پہلو بدل کر موٹر کو اسٹارٹ کرنا چاہا۔ سوبھا سنگھ پرانا ماہر شکاری تھا، بابو صاحب کو بدکتے دیکھ کر اپنے انداز میں فوراً ایسی بے تکلفی پیدا کر لی اور خاص طرز سے مسکرا دیا کہ بابو صاحب کا سوئچ کی طرف بڑھتا ہوا بایاں ہاتھ ہوا میں معلق رہ گیا۔ سوبھا سنگھ نے بڑھ کر نہایت بےتکلفی سے رازدارانہ لہجہ میں کہا "بابو صاحب، میں تو آپ کا خادم ہوں۔ اگر حکم ہو تو ان بائی جی کو (سرلا کی طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے) آپ کی سیوا میں لا سکتا ہوں۔" اجنبی نے حیرت سے اپنے موٹے گال میں ہوا بھری اور اطمینان کا اظہار اس ہوا کو اپنے بھدے ہونٹ کے صفر سے باہر پھینک کر کیا اور بے قراری سے کہنے لگا "تو..... کیا..... وہ.....؟"

"جی ہاں، بس کچھ یونہی سمجھ لیجئے" سوبھا سنگھ نے ہاتھ جوڑتے ہوئے جھک کر نہایت نیازمندانہ انداز میں کہا۔

موٹے اجنبی کے منہ سے گویا رال ٹپک پڑی اور کمال بے چینی سے خوشامدانہ لہجے میں کہنے لگا "تو بھئی... لاؤ۔"

"سرکار سب کچھ لاتا ہوں مگر اس داس کو اس کا کیا انعام ملے گا؟" سوبھا سنگھ نے اپنی بائیں ہتھیلی میں داہنے ہاتھ کی پشت کو مَلتے ہوئے کہا۔

اجنبی نے بے ساختہ کہا "پچاس یا جو تم مانگو۔"

"حضور میں کیا کہوں... مگر یہ تو....."

"ساٹھ دیا۔"

"سرکار تو راجہ ہیں مگر بھاجی کا مول تول کر رہے ہیں۔"

اجنبی نے ذرا کھسیا کر کہا "اچھا جاؤ اسّی۔"

"حضور مال بھی کیسا ہے۔"

"بھئی سو لو اور معاملہ ختم کرو۔"

"حضور پہلے رئیس ہیں جو اس سنہری چڑیا کو پھنسانے لگے۔"

"آخر تم بھی کہو کہ کیا چاہتے ہو؟"

"پانسو۔"

قصہ مختصر سودا تین سو میں طے پا گیا مگر اس شرط پر کہ بابو صاحب ابھی سیر کو لے جائیں گے اور آہستہ آہستہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے چونکہ چڑیا ابھی نئی ہے اور صیاد کی گرفت سے نامانوس۔ سوبھا سنگھ سرلا کے پاس لوٹ کر آیا اور اپنی چکنی چپڑی باتوں سے دیوی جی کو اپنے دوست کے موٹر میں سیر کرنے کیلئے راضی کر لیا۔

کامریڈ پتمبر نرائن کا اخبار "بھائی لوگ" اپنے زہریلے مقالے اور رنگیک پھبتیوں کی وجہ سے دور دور تک مشہور ہو گیا۔ ان کا قلم مزدوروں کی ہمدردی میں ہر روز ایک نئی قسم کی جولانی دکھاتا تھا۔ مزدور، روٹی، بھوک، پیاس اور انقلاب زندہ باد کے نعروں سے وہ محلہ گونج اٹھا جس میں یہ رہتے تھے اور ان کا اخبار چھپتا تھا۔ اخبار چلانے اور اس کے مضامین کی تلخی بڑھانے کے لئے ان کو روز نئے ذرائع ڈھونڈھنا پڑتے اور جو چیز حقیقتاً غلط ہو اور جس کو کسی بدقسمت شریف آدمی کے ذاتی معاملات سے جتنا تعلق ہو وہ اتنی ہی جلی قلم سے شائع کی جاتی۔ ہر وہ شخص جس کے باپ دادا نے یا جس نے خود اپنی محنت، دماغ سوزی اور کد و کاوش کر کے دولت جمع کی تھی اور اب اپنی کمائی ہوئی دولت سے لطف اندوز ہو رہا تھا، کامریڈ پتمبر نرائن کی نظر میں سوسائٹی کی تمام کمزوریوں کا باعث تھا۔ اگر ان کا بس چلتا اور زمانہ موافق ہوتا تو یہ حضرت اپنے دیس میں بھی خون کی ندیاں بہاتے جو گنوار روسیوں نے اپنے ملک کے متمدن اور مہذب طبقہ کی گردنیں کاٹ کر بہائی تھیں۔ سرخ رنگ، ہتھوڑا، ہنسوا، پھاوڑا اور بیلچے قسم کے آلات سے وہ سوسائٹی کی غربت اور افلاس کی جڑیں کاٹنا چاہتے تھے۔ کامریڈ پتمبر نرائن کا انہماک مزدور کی حالت سدھارنے میں بڑھتا ہی گیا۔ حتیٰ کہ اس نے ایک نشہ کی صورت اختیار کر لی۔ کوئی جلسہ یا کوئی اسٹرائک ان کے بغیر مکمل نہ سمجھا جاتا تھا اور شہر کا بچہ بچہ ان کو مزدوروں کے آگے آگے اور قلیوں کے بیچ میں جھنڈا لہراتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ یہ تحقیق نہ ہو سکا کہ ان کی کوششوں سے مزدوروں کی حالت سدھارنے میں کہاں تک مدد ملی مگر [illegible] کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ گنوار اور جاہل مزدور طبقہ میں شدید قسم کی ہلچل پھیل گئی، اور ہر مزدور کو دولت اور امارت کے خواب

نظر آنے لگے۔ آقا اور خادم کا وہ رشتہ جو سوسائٹی میں امن اور نظام قائم رکھتا ہے ٹوٹ گیا اور ہر طرف ایک ابتری سی پھیل گئی۔ جیسے کوئی تسبیح ٹوٹے اور اس کے دانے تتر بتر ہو جائیں۔ اس کشمکش میں نیک اور محنتی مزدور جن کے گھر میں بیوی اور بچے تھے اپنی روٹیوں سے محروم ہو گئے اور وہ مسٹنڈے، ناکارہ قسم کے بدتمیز مزدور برسر روزگار ہو گئے جن کی موجودگی مل کے کاموں میں ہر جگہ روڑا اٹکانے لگی۔ یکے بعد دیگرے شہر کے تمام مل بند ہونے لگے اور اچھا خاصہ بارونق شہر دیکھتے دیکھتے ویران سا نظر آنے لگا۔

کامریڈ پتمبر نرائن کی زندگی کا یہ دور اپنی کامیابی اور فارغ البالی کے لحاظ سے نصف النہار پر تھا۔ مزدوروں کی سیوا اور رکھشا میں اُن کے چوبیس گھنٹے گذرتے تھے۔ ان کی خدمتوں کا سلسلہ نہ جانے یوں ہی کب تک قائم رہتا مگر کچھ ایسے واقعات رونما ہو گئے کہ ان کو عدالت کے دوا انصاف کو کھٹکھٹانا پڑا۔ اُن کا کامریڈ سوہجا سنگھ اور اس کے رفقا پر اپنی بیوی کے اغوا کا دعویٰ شہر میں کافی سنسنی کا باعث بنا اور سنسنی جو اب تک صرف "بھائی لوگ" کے پرچوں کے لئے مخصوص تھی آج شہر کے تمام اخباروں میں کھلے بند تقسیم ہو رہی تھی۔ یہ صدمہ کامریڈ پتمبر نرائن کی قوت برداشت کی چیز نہ تھی۔ اسکے بعد "بھائی لوگ" کا کوئی پرچہ شائع نہ ہوا اور شہر کے تمام مل یکے بعد دیگرے کھلنے لگے اور غریب مزدوروں کو کامریڈ پتمبر کی کاوشوں کے بغیر بھی صبح شام روٹیاں ملنے لگیں۔

محمد نصیر الدین

کچھ تو کر!

کملائی ہوئی روح کو یارب گلِ تر کر
اس جامِ سفالیں کو کبھی ساغرِ زر کر

جب تیرے اشارے سے چٹک جاتے ہیں غنچے
امید کی مرجھائی کلی پر بھی نظر کر

دل کو جسے خاکسترِ دل کہتی ہے دنیا
انوار کی لو ڈال کے تابندہ شرر کر

اب میرے لئے تنگ ہے یہ عالمِ بیرنگ
بوسیدہ ہے یہ قصر اسے زیر و زبر کر

کب تک ترے بندوں کی غلامی پہ کروں ناز
تاروں کے نشیمن سے بھی اونچا مرا سر کر

مجھ بندۂ بیچارہ پہ رحمت کی نظر ڈال
پیدا مری پُر درد دعاؤں میں اثر کر

گر نخلِ تمنا کو ثمرور نہیں کرتا
افسانۂ اکرام بعنوانِ دگر کر

اس پر بھی اگر تیرا کرم کچھ نہیں کرتا
گستاخ کلامی ہے مری۔ قطعِ نظر کر

یہ بھی نہیں منظور تو اے مبدءِ الطاف
احساس مرا چھین۔ مجھے خاک بسر کر

احمد ندیم قاسمی

فرار

بہادر خاں کو روٹی کھانے کو ملے یا نہ ملے مگر وہ ہر دوسرے تیسرے دن سینما ضرور دیکھا کرتا۔ اُسے ایک تسکین ہوتی تھی۔ ایک، دو، پہر وہ بھوکا رہ سکتا تھا لیکن کوئی نیا فلم آ جائے تو اُس کی نیند حرام ہو جاتی۔ اُس کا بوڑھا ساتھی کمال دین اُسے ہر بار ٹوکتا مگر نوجوان بہادر خاں "بچا آئندہ نہیں دیکھونگا" کا بہانہ کر کے ضرور چلا ہی جاتا۔

"تم بھی چچا تم تو بالکل مُردہ ہو گئے ہو" وہ اُسے کہا کرتا۔ "لیلا چٹنس کا بھی فلم میں پارٹ ہے، وہی لڑکی جو بی۔ اے تک پڑھی ہوئی ہے۔ پچھلے دنوں سب سے بڑے جج بہادر نے بلوایا تھا اور دعوت بھی دی تھی — بڑا اچھا کھیل ہوگا۔ تم بھی چلو۔"

"اوں!" بوڑھا جواب دیتا۔ گویا وہ بڑا پاکباز تھا۔ نہ جانے اسکی جوانی کیسے گذری ہوگی۔ مگر تب سینما کہاں کہ اڑھائی آنے دے کر تین گھنٹے سکرین پر زندگی کا تماشہ دیکھتے رہے۔ اس زمانے میں تو یہ سودا بہت مہنگا پڑتا ہوگا اور پھر تھوڑی دیر کے لئے تسکین مل سکتی ہوگی۔ "یہ چودھویں صدی ہے، عزت تو آپ چراغ لیکر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی — قیامت نزدیک ہے۔ یہ تماشہ ہے یا شیطانی کام۔ میں تو نہیں جاؤں گا" بوڑھا بات کو ٹالتے ہوئے کہتا۔ بھلا وہ اسکے ساتھ تماشہ دیکھنے جاتا اور اپنی عزت گنوا دیتا۔

مگر بہادر خاں قیامت کا قائل نہ تھا۔ قیامت کے دن دوزخ کا ڈر ہی ہو سکتا ہے۔ مگر وہ تو اس دُنیا میں ہی دوزخ میں تھا۔ اسکا دل ہر وقت بے چین تھا اور پھر لوہے کے ایک کارخانے میں ملازم تھا۔ جہاں جنگ کی وجہ سے کام اس قدر بڑھ گیا تھا کہ کارخانہ رات دن چلتا رہتا۔ لوہے کی مشینوں کے ساتھ ساتھ گوشت پوست کے انسان بھی مشین بن گئے تھے۔

"ایک نیا صاحب ولایت سے آیا ہے" ایک نے دوسرے سے رازدارانہ لہجہ میں کہا۔ اس کی نگاہیں دیوار پر مختلف زبانوں میں آویزاں نوٹس پر لگی ہوئی تھیں جس پر لکھا تھا "کارخانے کی چار دیواری میں جنگ کے موضوع پر گفتگو نہ کرو — " "وہ گولہ بنانے کا ماہر ہے"

"یار جنگ کا کیا حال ہے" بہادر خاں نے اپنے سامنے والے کاریگر سے پوچھا۔

"معلوم نہیں — پیسے اچھے بن جاتے ہیں آجکل، آجکل" "اور ٹیم" "لگتا ہے"

جنگ — بہادر خاں نے رات ہی ایک انگریزی کھیل دیکھا تھا۔ جنگی فلم تھا۔ مکالمہ تو وہ نہ سمجھ سکا مگر جنگ کے سین بڑے دردناک اور دہشت انگیز تھے۔ سمندر کی لہروں میں جنگی جہازوں کا دشمنوں پر بمباری کرنا۔ ہیبتناک توپیں، جن کے دہانوں سے آگ برستی تھی۔ آگ کی ضد پانی ہے۔ مگر بم کا گولہ پانی میں بھی کام کرتا تھا۔ توپ کی آواز کس قدر خطرناک تھی۔

فلم میں اس نے بے پناہ فوج دیکھی تھی جست و چالاک وردی پہنے ہوئے نوجوان جن کے فولاد ایسے جسم تھے۔ ان کی حرکت مشین کے پرزوں کی طرح یکساں اور باقاعدہ — میں بھی اگر ایسا ہی سپاہی بن جاؤں — وہ تن گیا، اُسے ایسا محسوس ہونے لگا گویا وہ ایک فوج کے ساتھ لفٹ رائٹ کرتا ہوا جا رہا ہے۔ گندے کمرے کی بجائے صاف اور ہوادار "بیرک" میں رہیگا — ایک سپاہی، ملکِ معظم کی فوج کا ایک پرزہ —

ملک معظم بہادروں کے سینوں پر تمغے آویزاں کر رہے تھے۔ ملکہ معظمہ نے بھی بہادروں سے ہاتھ ملایا۔ وہ چھاتی تانے بُت بنے کھڑے تھے۔ بہادر سپاہی — اس کی چھاتی پر بھی تمغہ آویزاں ہو گیا، وہ بھی بُت بن گیا۔

مگر بُت بننے سے مشین کا کام رک گیا۔ فورمین کی درشت آواز نے اُسے چونکا دیا۔

پھر اس کا دماغ پردۂ سیمیں کی طرف منتقل ہو گیا۔ میدان کارزار گرم ہے۔ انسان خزاں دیدہ پتوں کی طرح گر رہے ہیں۔ آہ و زاری، چیخ و پکار، کتنا دردناک سماں تھا۔ دردناک سماں، لاکھوں نوجوان موت کے گھاٹ اتر گئے، ابھی جنہیں اس نے سینہ تانے چلتے دیکھا تھا وہ سب کھیت رہے۔ اُن کی جوانی جس کو ابھی میدان میں کھیلنا تھا خاک میں مل کر خاک ہو گئی — جوان امنگیں، اس کی بھی تو سینکڑوں امنگیں تھیں، اسی لئے وہ مزدوری کرنے آیا تھا۔ اور اس کا بوڑھا چچا اُسے گاؤں سے کارخانہ میں کام کرنے کے لئے

[illegible] اسی لئے اُسے سینما دیکھنے سے روکتا تھا۔ تاکہ وہ کچھ اندوختہ جمع کرلے اور پھر ۔۔۔ گاؤں میں کتنی ہی کنواریاں اس کی منتظر ہونگی۔ بوڑھے کمال دین کی لڑکی بھی تو جوان تھی۔ اس نے کئی بار اشاروں میں اس کا ذکر بھی تو کیا تھا ۔۔۔

"اب جو نیا صاحب آیا ہے وہ ایک خطرناک گولہ تیار کریگا کہ ہٹلر کو نانی یاد آجائے گی" دوپہر کو کھانا کھاتے ہوئے بوڑھے نے بہادر خاں کو بتایا "گولے تیار کرنے کا ٹھیکہ ہمارے سیٹھ کو ملا ہے"

رات کا دیکھا ہوا کھیل ابھی تک اُسکے دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ گولہ ۔۔۔ انہیں گولوں نے ہمارے ملک کے ہزاروں نوجوانوں کو مٹا دیا اور یہی گولے دُنیا کے بہترین نوجوانوں کا صفایا کر رہے ہیں ۔۔۔ ولایت سے بڑے بڑے کاریگر انگریز آتے ہیں۔ مسکراتے ہوئے انگریز، بالکل بے ضرر انسان، کس پیار سے باتیں کرتے ہیں۔ جب مشین پہ کام کرنے لگتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ خود بھی ایک بے جان مشین ہیں۔ مگر لوہے کے بے جان ٹکڑے اُن کے ہاتھوں سے گولا بنتے ہیں اور پھر نوجوانوں کی موت ۔۔۔ ایک گولہ اس کے تنے ہوئے سینے پر آکر لگا۔ ملک معظم کا آویزاں کیا ہوا تمغہ اور ملکہ سے ملایا ہوا ہاتھ دونوں ۔۔۔۔۔۔۔

وہ چونکا اُس نے انگریزی تماشہ کیوں دیکھا۔ جنگ ہوتی ہے تو ہوتی رہے۔ اس میں اس کا کیا قصور۔ وہ اب کبھی انگریزی کھیل نہیں دیکھے گا۔ ہندوستانی کھیل کتنے مزیدار ہوتے ہیں، گانا، ناچنا، موٹر، ندی، کشتی کی سیر، جنگ کا کہیں نام نہیں، ناچ گانا ہی تو اُس کی زندگی تھا۔

پچھلے دنوں اُس نے ایک کھیل دیکھا تھا جس میں ایک حسینہ کا محبوب پردیس گیا ہوا تھا۔ ساون کا مہینہ تھا۔ پھوار پڑ رہی تھی۔ ایسے میں وہ پریم کی ماری باغ میں اپنی سہیلی کے ساتھ جھولا جھول رہی تھی۔ سہیلی اُسے خاموش دیکھکر پوچھتی ہے "کیوں جی! چُپ کیوں ہو؟ ایسے میں خاموش رہنا گناہ ہے" حسینہ چُپ کیوں رہے۔ مگر وہ دل کا حال کہتے ہوئے ڈرتی ہے۔ ملہار گاتی ہے اور یوں دل کی بات سکھی کو بتا دیتی ہے ۔۔۔

اُسے وہ گانا بڑا پسند آیا تھا۔ اُس نے گانوں کی کتاب دو پیسے میں خرید کر گانا یاد کر لیا تھا اور وہ اکثر گنگنانے لگتا۔

مستانہ ہوائیں آنے لگیں   ساون کا سندیسہ لانے لگیں
متوالی بدریا چھائی تھی

یہ رات سُہانی، کالی گھٹا   سرشار ہوا متوالی گھٹا
ساجن کی لہک لے آئی تھی
بادل کی گرج سے دل دھڑکے   بجلی کی چمک سے جی [illegible]
برکھا نہ ہمیں راس آئی تھی

رِم جھم، رِم جھم، میگھا برسے   ساجن سے ملن کو جی ترسے
میں پیت کئے پچھتائی تھی

وہ بھی پردیس میں آیا ہوا تھا۔ ساون میں آموں کے کنج میں اُسے بھی کوئی یاد کرتا ہوگا ۔۔۔ بوڑھے کی لڑکی، وہ تو ضرور یاد کرتی ہوگی ۔۔۔ جھولا بھرپور زوروں پر جھولا جا رہا تھا۔ نیلے آسمان پر چاندنی سرسبز باغ پر موتی نچھاور کر رہی تھی۔ وہ الھڑ لڑکیاں ایک دوسری سے چھیڑ خانی کرتی ہوئی گا رہی تھیں:۔

رِم جھم، رِم جھم، میگھا برسے   ساجن سے ملن کو جی ترسے
میں پیت کئے پچھتائی تھی

۔۔۔ اڑھائی آنے والے درجے میں بیٹھنے والے بھی یوں محسوس کر رہے تھے گویا وہ جانوروں کے ڈربے سے نکل کر فردوس کی طرف [illegible] ہیں۔ جھولے کی ہر لہر اُن کو اُڑا کر کہیں سے کہیں لے جاتی تھی ۔۔۔ [illegible] کو مشین کے ہچکولے جھولے کی لہر محسوس ہو رہی تھی۔ کان کے پردے پھاڑ دینے والا شور اس کے دماغی فلم کے لئے پس منظر کا گانا ثابت ہو رہا تھا۔ لوہے کا سفید بُرادہ اُسکے لئے چمکتے ہوئے تارے تھے۔ پسینے کے بڑے بڑے قطرات جو اسکے ماتھے سے اس بُرادے میں ٹپک کر گرتے تھے وہ شبنم کے قطرات تھے ۔۔۔ چاندنی رات میں گلشن پر قدرت موتی بکھیر رہی ہو ۔۔۔ کام کی رفتار کی تیزی کے ساتھ اس کا تخیل اور بھی بلندی کی طرف اڑا جا رہا تھا۔

"بہادر خاں آج تو تم بولتے ہی نہیں ۔۔۔ کیا سوچ رہے ہو؟" ساتھ والے کاریگر کی آواز نے اُسے بیدار کیا۔ "رات "مصر کی جنگ" والا کھیل کیسا تھا؟"

وہ اپنے ساتھیوں میں فلم کا بہترین نقاد سمجھا جاتا تھا۔ اسکے پاس کھیلوں کے گانوں کی بہت سی کتابیں تھیں، اُسے ایکٹرسوں کے نام یاد تھے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ فلاں ایکٹرس کس ڈائرکٹر کی منظور نظر ہے ۔۔۔ وہ فلمی دُنیا کا پورا علم رکھتا تھا، شاید اسی لئے بوڑھا کمال اُسے روکتا رہتا۔ اُسے ڈر تھا کہ وہ کہیں کسی فلم کمپنی میں نہ چلا جائے اور پھر اس کی کنواری لڑکی ۔۔۔

"بالکل بکواس ۔۔۔ جنگ کا کھیل تھا، تباہی، خون ۔۔۔ [illegible]"

— گھر ہی کھیلیں گے — تم نے کوئی کھیل دیکھا؟

— اور دیکھا تو نہیں۔ مگر آج اکٹھے چلیں۔ جیون نیا چل رہا ہے اور اس کا آخری دن ہے۔

— اچھا۔ مگر —

لنچ میں نیا صاحب آ گیا۔ وہ نئے طرز سے گولوں کی تیاری کے کام کو دیکھنے آیا تھا۔ وہی مسکراتا ہوا چہرہ، ننگے سر، آنکھوں پر بڑے بڑے شیشوں کا چشمہ۔ وہ کاریگروں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا — انگریز ہنس ہنس کر دل موہ لیتے ہیں — بم کے گولے بنانے کا ماہر ابھی نئے ولایت سے آیا تھا۔

نیا صاحب، کارخانہ کا منیجر اور اُن کے پیچھے پیچھے سیٹھ۔ کارخانہ کا مالک — گذر گئے۔ کاریگروں کے ہاتھ پھر ذرا سست ہو گئے، اب دو گھنٹے تک اور کوئی نہیں آنے والا تھا — بہادر خاں کا ہاتھ مشین کے ہینڈل پر تھا — وہ موٹر چلا رہا تھا۔ ایک لانبی سڑک صاف اور شفاف ایسی جیسے آسمان پر کہکشاں، موٹر میں لیلا چٹنس بیٹھی ہے، وہ اُسے کہیں لئے جا رہا ہے، اچانک وہ سڑک ایک ندی کے کنارے جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ موٹر رکتی ہے۔ اب بہادر خاں کی جگہ اشوک کمار کھڑا ہے اور لیلا چٹنس، دونوں ندی کے کنارے سیر کر رہے ہیں۔ چاندنی درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر اُن کے چہروں پر پڑ رہی ہے، دونوں ایک جگہ رکتے ہیں، ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں، آنکھوں آنکھوں میں باتیں ہوتی ہیں اور پھر دونوں قہقہہ مار کر ہنس پڑتے ہیں۔ ندی میں مچھلیاں سطح آب پر آ کر تڑپتی اور پھر پانی کی تہ میں غائب ہو جاتی ہیں۔ وہ دونوں محبت میں سرشار گھاس پر بیٹھے ایک دوسرے سے پریم کی باتیں کر رہے ہیں۔

اس کی توجہ مشین سے ہٹ گئی تھی۔ گڑگڑاہٹ کی آواز سے چونکا۔ لوہے کے ٹکڑے کو درست حالت پر رکھ کر اس کا ہاتھ پھر ہینڈل پر تھا — اس نے دو تین مرتبہ اُسے گھمایا اور پھر — ندی میں ایک کشتی چلی جا رہی ہے جسے بہادر خاں چلا رہا ہے۔ پھولوں سے آراستہ پیراستہ کشتی، آگے آگے چاند پانی میں تیر رہا ہے — بہادر خاں کے گلے میں پھولوں کے ہار ہیں۔ وہ راجکمار کا لباس پہنے کشتی چلا رہا ہے اور اس کے ساتھ اس کی محبوبہ بیٹھی ہے۔ پھولوں سے لدی ہوئی۔ وہ خود بھی ایک پھول معلوم ہوتی ہے، سندر پھول — حسینہ راجکمار کے گلے میں باہیں ڈال کر پوچھتی ہے —

— پریتم ہم کہاں جا رہے ہیں؟

— سجنی — ہم کہاں جا رہے ہیں! اس دنیا سے دور بہت دور جہاں کوئی تیسرا نہ ہوگا۔ اس دنیا میں جہاں دھرتی ماتا اپنا آنچل کھولے ہماری منتظر ہوگی۔ پھول اور سبز گھاس بچھونا بچھا دے گا۔ امبر کا سایہ ہماری چھت، جہاں چندرما رات کے اندھیارے میں چراغ [illegible]، چشمے کا ٹھنڈا پانی ہمارے من کی پیاس کو بجھائے گا —

— پریتم آج تو تم کوی ہو گئے ہو۔ تمہاری باتیں نہیں پریم کویتا ہے۔

— سجنی! پریم کی دنیا میں سب کویتا ہی کویتا ہے۔ تو سنو ندی بھی کویتا سنا رہی ہے۔ کہتی ہے آؤ پریمیو آؤ! پاپ کی دنیا کو تم چھوڑ چکے ہو۔ اب میرا سینہ کھلا ہے۔ اس پر کھیلو! میں خود پریم ہوں۔ جہاں جاتی ہوں پریم کی جوت جگا آتی ہوں۔ خشک دھرتی کے سینے سے پریم کا رس نکال کر اُسے باغ بنا دیتی ہوں تاکہ پریمی آئیں اور اُن کے من کے اندر پریم کی سوئی ہوئی جوت جاگ اٹھے۔

مگر مشین کا ہینڈل گھماتے گھماتے اُس کے بازو تھک گئے۔ وقت گذرتے اُسے محسوس نہ ہوا۔ وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ لیکن اسکی قسمت میں تو گندی کوٹھری ہی تھی جو سیٹھ نے بوڑھے کو اور اُسے دے رکھی تھی۔ تاریک اور بند کوٹھری جس میں ہوا کا داخل ہونا ناممکن تھا۔ صبح سے شام تک وہ لوہا کوٹتا اور شام کو آ کر خود کھانا تیار کرتا ہوتا۔ اس کی خوش قسمتی سے بوڑھا اس پر مہربان ہو گیا تھا۔ وہ اسے گاؤں سے ساتھ لایا تھا، اپنے مطلب کے لئے، دنیا میں مطلب پڑنے پر ہر کوئی خوشامد کرتا ہے۔ بوڑھا خانہ داری کے کام کا زیادہ حصہ خود کر لیا کرتا تھا — اور بہادر خاں کو سنیما دیکھنے کا موقع مل جاتا۔

چھٹی ہونے کا وقت نزدیک آ رہا تھا۔ کاریگر تھک کر چور ہو گئے تھے۔ نیا صاحب اور منیجر دن میں کئی بار کارخانے میں گھومتے ہوئے گذرے۔ آج مشینوں کی رفتار تیز کر دی گئی تھی۔ شاید نیا صاحب اسی لئے آیا تھا کہ مشینوں کی رفتار تیز کر دی جائے۔ کاریگر بھی تو مشین کا ایک پرزہ تھا، خود بخود تیز ہوتا گیا۔

سیٹھ نے اپنا بڑا بنگلہ نئے صاحب کے لئے خالی کر دیا ہے۔ ایک کاریگر دفتر میں گیا تھا وہاں سے یہ خبر لایا۔ سیٹھ کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ لاکھوں کا مال روزانہ تیار ہوگا۔ اسی لئے مشینوں کی رفتار تیز کر دی گئی تھی۔ سیٹھ کی تھیلیوں میں چاندی کے سکے مشین کی رفتار سے بھی زیادہ تیزی سے ڈالے جائینگے۔ جب انسان بھی مشین کا ایک پرزہ بن جائے تو اس لوہے اور گوشت کے امتزاج سے چاندی کے سکے بنتے ہیں۔

سیٹھ نے اپنا بڑا بنگلہ نئے صاحب کے لئے خالی کر دیا ہے
سیٹھ کا بنگلہ ایک لاکھ کا بنا تھا ـــــ پریذیڈنٹ کھیل میں سہگل نے ایک گانا گایا تھا ـــــ

اک بنگلہ بنے نیارا رہے جس میں کنبہ سارا
سونے کا بنگلہ چندن کا جنگلہ ....

سیٹھ کا بنگلہ بھی تو سونے کا بنگلہ تھا جس میں نیا صاحب رہیگا لیکن اس کا کوئی کنبہ نہیں۔ اُسے کنبے کی ضرورت بھی کیا تھی ـــــ سہگل کو بھی تو ایک لڑکی دیوار پھاندتی ہوئی مل گئی تھی ـــــ اگر میرا بیاہ ہو جائے تو میں بھی ایک گھر بناؤں گا ـــــ آسمان پر سفید بادل نمودار ہوئے۔ اُن کے پیچھے ایک چھوٹا سا محل اُڑا جا رہا تھا۔ ـــــ حاتم طائی کے کھیل میں اُس نے جادو کے محل دیکھے تھے ـــــ بادلوں میں بوڑھے کمال دین کا مسکراتا ہوا چہرہ نمودار ہوا۔ اس کے پاس ایک تھیلی تھی جس میں چاندی کے سکے تھے ـــــ بہادر خاں کی تنخواہ میں سے جمع کیا ہوا اندوختہ، اپنی بیٹی کے لئے ـــــ جوں جوں محل قریب آتا گیا وہ بڑھتا گیا اور آخر سیٹھ کے بنگلے سے بھی بڑا محل تھا جس کے چاروں طرف باغ تھا، روشیں تھیں، درمیان میں چھوٹی سی نہر بہ رہی تھی۔ وہ اندر داخل ہوا۔ محل سجا ہوا، زرق برق پردے، نفیس فانوس، آرائش کا سامان دیکھکر وہ دنگ رہ گیا۔ ـــــ اتنے بڑے محل میں وہ اکیلا رہے گا؟ نیا صاحب بھی تو اتنے بڑے بنگلے میں اکیلا رہتا ہے ـــــ بوڑھے کمال دین کا چہرہ ابھی تک اس کے سامنے اور پھر وہ تھیلی جس میں چاندی کے سکے ـــــ وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ اُسے کسی کے پاؤں کی آہٹ محسوس ہوئی ایک حسینہ اُس کی طرف آ رہی تھی، کافر ادا مسکراتی ہوئی آگے بڑھی گویا چاند زمین پر آ گیا تھا ـــــ بوڑھے کا چہرہ ابھی تک مسکراتا ہوا دکھائی دے رہا تھا ـــــ

چھٹی کا بگل بج گیا۔ مشین کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوتے بند ہو گئی۔ بہادر خاں کے ہاتھ بھی خود بخود رک گئے۔ وہ چونکا سارے کاریگر باہر نکل رہے تھے ـــــ "چچا چچا!" وہ بھیڑ کو چیرتا ہوا کمال دین کے پیچھے بھاگا۔ "اٹھنی آنے تو دیتے جانا۔"

"کیوں آج پھر سینما جاتا ہوگا ـــــ یہ ہر روز ـــــ"

"نہیں ـــــ ہاں وہ بھگت کہہ رہا تھا جیون نیا، چل رہا ہے۔ کل یہ کھیل بدل جائیگا۔"

شبیر محمد اختر

پھر آئی برسات

چھا گئی پھر آسماں پر اودی اودی سی گھٹا
رقص کرتی ہیں ہوائیں مسکراتی ہے فضا
ہر طرف بجنے لگیں برسات کی شہنائیاں
حسن بزمِ ناز میں لینے لگا انگڑائیاں
درد میں ڈوبی پپیہے کی صدا آنے لگی
بھینی بھینی موسمِ گل کی ہوا آنے لگی
ہائے کس انداز سے مطرب نے چھیڑا ہے ستار
ہنس رہی ہے مست ہو کر سبز کھیتوں کی بہار
سبز شاخوں کی رگوں میں ہے جوانی بیقرار
ندیاں اُمڈی ہوئی ہیں گا رہے ہیں آبشار
دوش پر گاگر اٹھائے جا رہی ہیں دیویاں
جنکی ہر جنبش ہے اک سیلِ ترنم ہے رواں
وہ جوانی دمبدم لیتی ہوئی انگڑائیاں
ہلکی ہلکی وہ پھواریں، بدلیوں کا وہ دھواں
آم کے باغوں میں وہ کافر پپیہے کی پکار
وہ ہواؤں کی لطافت، وہ فضائے مشکبار
نازنینوں کے وہ جلسے اور وہ صحرا کا سماں
دوش پر بکھری ہوئی زلفیں، ہنستی سارنیاں
سطح پر موجوں کے ہلکوروں کا وہ رنگیں سماں
وہ ہوائیں پیچ و خم کھاتی ہوئی وہ ندیاں
دہر کی افسردہ نبضوں میں حرارت آ گئی
پھول میں خوشبو ہواؤں میں لطافت آ گئی
بوندیوں پھر آ گئی کا دل تو گانے لگا
سبزہ لہکا، پھول [illegible] رنگ سا چھانے لگا

[illegible] فریادی

آخری چاک

وہ کالج کے دروازے پر خاموش کھڑا تھا۔
اُس کے کوٹ کی کچھ تھوڑی سی پھٹی ہوئی جیب میں ایک سفید چاک پڑا تھا۔ دودھ سے بھی زیادہ سفید، بیوہ کی ساری سے زیادہ چٹا۔ اتنا سفید جتنا کہ وہ بھوکے بادل ہوتے ہیں جو نیلے آسمان کے نیچے روئی کے گالوں کی شکل اختیار کر جھولا جھولتے ہیں۔
اُس کا ہاتھ ایک دم جیب کی گہرائیاں عبور کرنے لگا۔ اور اُسکی نازک انگلیاں چاک سے لہو ولعب میں مشغول ہو گئیں۔ وہ خواہ مخواہ اُس چاک کو باہر نکال کر دیکھنا چاہتا تھا۔ سورج کی روشنی میں، کالج کے دروازے کے سائے میں۔ اُس کی دو انگلیوں نے چاک کو تھاما وہ اُس بے جان ہستی کو دنیا کا نظارہ کرانا چاہتی تھیں کہ یکایک چاک ایکدم اُنکی گرفت سے چھوٹ گیا۔
کالج کا گھنٹہ بجا۔ اور ساتھ ہی ساتھ کالج کی دو تین طالبات دروازے پر نمودار ہوئیں اور بس کا انتظار کرنے لگیں۔
اُسکی نگاہ ایکدم اُن مغرب زدہ ہندوستانی لڑکیوں کی طرف مخاطب ہوئی مصنوعی حسن، بالکل بناوٹی، شیشہ کنگھا، پاؤڈر، غازہ کا ملکوم۔ آنکھ پر نازک عینک۔
وہ لعبتہائے عشوہ و ناز، گفتگو میں مصروف ہو گئیں۔
"تم نے "گون وِد دی ونڈ" دیکھا ہے ادشا؟"
"کیوں نہیں۔ مسٹر رؤف کے ساتھ گئی تھی"
"کونسے مسٹر رؤف؟"
"یہی بزم کے سکریٹری۔ کہتے تھے لڑکیوں کی نمائندہ بن جاؤ۔ یعنی بزم ادب کی نائب سکریٹری"
"ارے پھر بن کیوں نہیں جاتی" اندرا نے پاردسول کو ہلاتے ہوئے کہا۔
"جانے بھی دو اندرا۔ ان خشک چیزوں سے کیا سروکار، ارے ہاں اوشا"
"کیا ہوا؟"
"ابھی اس دیوالی شو میں بھی پارٹ لینا ہے یا نہیں۔ آپ ڈرامہ میں حصہ لیں گی یا نہیں"

موٹر کی پوں پوں نے اُن طالبات کی گفتگو میں رخنہ اندازی کی اور تینوں بس میں سوار ہو گئیں۔
وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔
لیکن اُسے ان چیزوں سے دلچسپی نہیں۔ بیکار بے مطلب۔
شاید وہ لڑکیاں بس میں بیٹھی اس کا مذاق تو نہیں اُڑا رہی ہوں گی۔
"ریاضی کا پروفیسر۔ نوجوان، مخبوط الحواس دروازے پر دھرنا مارے کھڑا ہے"
ٹھیک۔ مگر ریاضی کا پروفیسر وہ بنا ہی کب تھا۔ محض عارضی، عارضی لکچرار۔ اور آج اُس کا آخری دن ہے۔ جبھی تو کالج کے دروازے پر خاموش کھڑا ہے۔ چپ چاپ۔ کچھ نہیں۔ یوں ہی۔ اُسے محبت ہے۔ کالج کے در و دیوار سے۔ اپنے طالب علموں سے، کلاس روم سے۔ اور سٹاف روم سے یک گونہ اُنسیت۔
وہ سال بھر سٹاف روم میں روزانہ جاکر بیٹھا۔ لیکن اس کو ساتھی لکچراروں سے بولنے کی ہمت نہ پڑی۔ شاید اُس نے بولنے کی کوشش بھی نہ کی۔ اگر کبھی کی تو لفظ حلق میں اٹک اٹک کر رہ گئے ہیں۔ اور وہ سٹاف روم کے ہمیشہ دس منٹ تیز چلنے والے گھنٹے کی طرف دیکھتا رہا ہے۔ یا وقت گذارنے کے لئے اخبارات سے دل لگانے کی کوشش کی ہے۔ اور اگر اُس کا دل لگانا ایک بہت مشکل کام ہو گیا ہے تو باہر کورٹ یارڈ میں پڑی ہوئی بنچ پر جاکر بیٹھ رہا ہے۔ سٹاف کے معمر مگر بچوں ایسی خصلت رکھنے والے لکچراروں کی چیخ پکار سُنکر۔
"ہلو! کہئیے مزاج شریف"
"مہربانی"
"کیا سوچ رہے ہو یار" نووارد گدّے دار کرسی پر دھم سے بیٹھ کر کہتے ہیں۔
"کچھ نہیں"
"کچھ بھی"
"یار اس کالج میں خواہ مخواہ آیا۔ سرکاری نوکری کرتا تو آج پورے سات سو ملتے ہوتے۔ کہاں ان ساڑھے تین سو روپوں پر پڑا رہتا"

اور الگ بیت کی کرسی پر بیٹھا ہوا جونیر لکچرار اس گفتگو کو حیرت زدہ آنکھیں دکھاتا ہوا سنتا ہے۔ اور شاید سوچتا ہے گھنٹہ دو گھنٹہ کام مگر پھر بھی صبر نہیں۔ ساڑھے تین سو۔ اور یہاں کالج کے پہلے گھنٹے سے آخری گھنٹے تک دماغ فروشی کرنا، سینئر لکچراروں کی مزیدار باتوں کو سننا۔ اور تو اور کالج کا کلرک بھی تو سلام کرنا اپنی توہین سمجھتا ہے۔ غرضکہ چپراسی تک اپنی آنکھیں دکھاتا ہے۔ اور تنخواہ وہی ۔۔۔

کالج کا گھنٹہ پھر اس کو کلاس روم کی طرف لے جانے کی دعوت دیتا ہے۔ جہاں اُسے "مہربانی کرکے بیٹھ جائیے"۔ "خاموش ہو جائیے"۔ اور نہ جانے کیا کیا جتن کرکے، کالج کے طالب علموں کو لکچر دینے کے لئے مناسب ماحول بنانا پڑتا ہے۔ اور جب وہ کلاس چھوڑ کر جاتا ہے تو لڑکے پیچھے سے چلاتے ہیں "ماسٹر جی" "ماسٹر جی"۔ جس سے کالج کے نئے لکچراروں کو ازلی نفرت ہے۔ یعنی کالج کے لکچرار اور ماسٹر جی، باجہ بجانے والے، ہارمونیم سکھانے والے ماسٹر جی میں کچھ فرق ہی نہیں۔ لیکن "ماسٹر جی" بغل میں رجسٹر دبائے، گردن جھکائے خاموشی کے ساتھ سٹاف روم کا راستہ لیتے ہیں۔ اور پسینے میں تربتر ہو جاتے ہیں۔ سوچتے ہیں لڑکوں کو پڑھانا کتنا مشکل کام ہے!

اور وہ ٹھہرا ریاضی ایسے خشک مضمون کا لکچرار۔ گھنٹے کی آواز ہوتے ہی چاک سنبھال کلاس روم ہی کی طرف چل دیتا ہے۔ پورے چالیس منٹ سینما کے ایکٹر کی طرح ادھر اُدھر ہاتھ ہلانا، کبھی طالب علموں کی طرف اور کبھی تختۂ سیاہ کی طرف منہ پھیرنا۔ ڈسٹر (duster) اس کا جیون ساتھی ہے۔ اور چاک کے باریک ذرات اس کے کپڑوں اور بالوں میں بھر جاتے ہیں۔ اور اُسکے ہاتھوں میں چمٹ جاتے ہیں۔

شروع شروع میں وہ کچھ گھبرایا۔ لیکن جوں جوں اُس نے اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے لڑکے اس کے گرویدہ ہوگئے۔ پھر بھی وہ اپنے طالب علموں کو سلام کرنے میں سبقت کرتا ہے۔ وہ طالبعلموں اور لکچرار میں کچھ فرق نہیں سمجھتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ طالب علم اور لکچرار کا رشتہ رواداری اور برادرانہ تعلقات پر مبنی ہونا چاہیئے۔ اس لئے لڑکوں کو اُس سے ہمدردی ہے۔

آج وہ آخری بار اپنے طالب علموں سے ملنے آیا تھا۔ خیرباد کہنے۔ وہ اُن سے ملا اور ایک دوست کی طرح اُن کی کامیابی اور ترقی کی دعا دیتے ہوئے۔ سچے دل سے دُعا۔ گو اُس کا دل روتا تھا۔ مگر اُس کے چہرے پر بشاشت تھی، اور قناعت کا نور۔

اور کچھ سست سا کالج کے دروازے پر آکر کھڑا ہوگیا تھا۔ کالج کی محبت اُسے مجبور کر رہی تھی۔

اُسے اس طرح کھڑے کھڑے آدھ گھنٹہ ہوگیا۔

پھر اُس نے دیکھا ایک سینئر لکچرار کو۔ جو بصد شانِ امتیاز بجری کی سڑک پر گامزن تھے۔ ایک نیا انداز! ایک نئی چال۔ مستانہ روی اور شاید رُعب گانٹھنے کا سوانگ۔ مجال ہے کہ لڑکے اُن کے سامنے دانت نکال دیں۔ لڑکیاں بول سکیں۔

اور وہ چند گھنٹے پہلے ریاضی کا لکچرار اور اب ایک معمولی انسان۔ عوام الناس کا ایک جزو۔ سڑک پر چلنے لگا۔ سفید چاک اُسے بوجھ معلوم ہونے لگا۔ اُس نے جیب سے نکالا پھر ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ اور پھر اُس چاک کو بدرو میں پھینک دیا۔ شاید یہ آخری چاک تھا جو اُس کی جیب کی گہرائیوں میں سویا۔

پرتھوی ناتھ شرما

سلامِ شوق ...!

زیبا! میری [illegible] کتنا سادہ ہے تمہارا یہ طرزِ خطاب، مگر میرے لئے یہ دو لفظ "شوق" کا ایک دفتر ہیں۔ یہ الفاظ نہیں تمہارے جذبات کے آئینے ہیں۔ تمہاری آرزومند روح کی بیقراریاں ان کے آغوش میں مچل رہی ہیں۔ تمہاری جادوگر آنکھیں اپنی پوری ساحرانہ کشش کے ساتھ میرے سامنے ہیں اور تمہارا پیامِ شوق مجھے پہونچا رہی ہیں۔ تمہارے گلابی ہونٹ سرشار گلابیوں کی طرح میرے شوق کی آگ کو بھڑکا رہے ہیں۔ آہ، زیبا! میں کیونکر جواب دوں تمہارے سلامِ شوق کا۔ الفاظ تو ایک ناقص ذریعہ ہیں جذبات کے اظہار کا۔ کاش میں اس تحریر کے ساتھ اپنے دل کے ترجمان بھی تمہارے پاس بھیج سکتا۔ اس وقت تمہیں کچھ اندازہ ہوتا کہ تمہارے "سلامِ شوق" نے میرے سینے میں آرزوؤں کا کیا حشر برپا کر دیا۔ آنکھیں آنکھوں سے اور ہونٹ ہونٹوں سے ملتے تو بتاتے کہ دل کا کیا عالم ہے۔ مگر ؎

ممکن نہیں کہ دیدہ و لب خط کے ساتھ جائیں
تیرے سلامِ شوق کا پھر کیا جواب دوں

تمہیں یہ لکھنے کی ضرورت نہ تھی کہ "...... اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ مجھے اب پہلی سی محبت نہیں رہی"۔ زیبا! تمہارا دل ملمع کا زیور نہیں کہ حوادث کی آگ میں پڑتے ہی اپنی آب و تاب کھو دے، میری جان! یہ تو خالص کندن ہے۔ جتنا تپایا جائے اتنا ہی اور نکھرے گا، اور چمکے گا۔ تمہاری محبت پر جتنا اعتماد مجھے پہلے تھا اب اس سے ہزار گونہ زیادہ ہے۔ تمہارے ساتھ دس برس کے طویل تجربے نے مجھے بتایا کہ تم اُن عام اور ادنیٰ ذہنیت کی عورتوں میں سے نہیں ہو جن کے نزدیک محبت ایک وقتی کھیل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور جن میں یاد رکھنے سے زیادہ بھول جانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ زیبا! تمہارا وفا سرشت دل اس آبگینے کی مانند ہے جس پر محبت نے تمہارے ذوق کے مطابق ایک تصویر بنا دی ہے۔ ایسی تصویر جس کا رنگ اور جس کے نقش آبگینے کی سطح تک محدود نہیں بلکہ اس کے دوسری جانب بھی پھوٹ نکلے ہیں۔ بتاؤ اب اس تصویر کے اوپر کوئی دوسری تصویر کیونکر بن سکتی ہے؟ رہی قرب کی تمنا، تو میں اسکے لئے مجبور رہوں۔ کبھی تم نے دیکھا ہے کہ چکور چاند تک پہونچ جائے! نہیں پہونچتا اور کبھی نہیں پہونچ سکتا۔ مگر یہ ابدی محرومی و ناکامی کیا اسکے دل سے چاند کی محبت کو فنا کر دیتی ہے؟ زیبا تمہیں ایک نظر دیکھنے کی آرزو رہتی زندگی تک مٹنے والی نہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ؎

مجھے معلوم ہے خوب اپنی تمنا کا مآل
ہاں مرے سامنے انجام ہے پروانے کا

مگر جل جانے کے خوف سے کیا پروانہ شمع پر قربان ہونے سے باز رہ سکتا ہے؟ اس لئے خدارا ....

جن صاحب کے متعلق تم نے لکھا ہے کہ "جانے تمہارے کس کرم فرما نے اپنی قابلیت و شرافت کا انتہائی ثبوت دیا ہے" میں اُن سے مطلق واقف نہیں۔ زیبا! دوسروں کو آزار دینے میں بعض لوگوں کو لطف آتا ہے۔ "رقصِ بسمل" کا لفظ تو تم نے اکثر سنا ہوگا مگر اسکی حقیقت شاید تمہیں معلوم نہ ہو۔ اگلے وقتوں میں یہ دستور تھا کہ بادشاہوں کو اپنی اور دوسروں کی تفریح کے لئے جب یہ تماشا دیکھنا مقصود ہوتا تھا تو کسی "مجرم" کو قتل کراتے تھے اس طرح کہ جلاد کی تلوار اس کا سر گردن سے یکسر جدا کر دے۔ لوہے کا ایک توا پہلے سے آگ میں تپا کر سرخ کر لیا جاتا تھا اور وہ قتل کے بعد فوراً ہی مقتول کی گردن پر رکھ دیا جاتا تھا۔ آتشیں توا گردن سے چپاں ہو جاتا تھا۔ خون باہر نکلنے کے لئے زور کرتا مگر نکل نہ سکتا۔ رگ و پے میں ایک شدید تشنج پیدا ہوتا اور یہ سر بُریدہ جسم جسے کھڑا رکھتے تھے اب تڑپنے اور اچھلنے لگتا۔ اسی کا نام تھا "رقصِ بسمل"۔ لوگ اسے دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ اللہ ری خوں خوار مسرت۔

جس طرح اس بیسویں صدی میں بھی بعض شائستہ اور مہذب لوگ جانوروں کی لڑائی کا تماشہ دیکھنا پسند کرتے ہیں اسی طرح رومن لوگوں میں یہ رواج تھا کہ وہ انسانوں کو لڑایا کرتے تھے۔ بدنصیب غلام اس لڑائی کے لئے تیار کئے جاتے تھے۔ انہیں "Gladiator" "گلیڈی ایٹر" کہتے تھے۔ وہ تلواروں سے لڑتے تھے اور اس وقت تک لڑتے رہتے تھے جب تک ایک دوسرے کے ہاتھ سے قتل نہ ہو جائیں۔ ہزاروں آدمی یہ خونیں تماشہ دیکھتے تھے اور بہت خوش ہوتے تھے

اب دنیا کچھ آگے بڑھ گئی ہے۔ رقص بسمل، اب نہیں ہوتا۔ گلیڈی ایٹر کی لڑائی موقوف ہے۔ مگر دوسروں کو آزار پہنچا کر مسرور ہونے کا جذبہ ہنوز انسان کے دل سے مفقود نہیں ہوا۔ اس ظالمانہ جذبہ کی تسکین کیلئے نئی سے نئی تدبیریں کی جاتی ہیں۔ انہیں صورتوں میں سے ایک صورت وہ بھی جو تمیز کرم فرمانے اختیار کی۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ انسانوں کو انسان بننے کی توفیق عطا کرے۔ اس کے سوا اور کیا کہوں۔

زیبا! دنیا میں خوشی تھوڑی اور رنج بہت ہے۔ تھوڑی سی خوشی کس کس کو ملے۔ نامراد محبت کے حسرتناک انجام کی ذمہ دار تم نہیں، میری قسمت ہے۔ نا کردہ خطاؤں کی بار بار معذرت کر کے للہ مجھے شرمندہ نہ کرو۔ ذرا سوچو تو سہی، پھول توڑنے والے کے بیباک ہاتھ اگر کانٹوں سے زخمی ہو جائیں اور زنبور کا نیش کھائیں تو پھول کا اس میں کیا قصور؟ زیبا! تم نے محبت کی خاطر وہ کیا جسکی مثال افسانوں میں بھی مشکل سے ملتی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ ہر خوبصورت عورت زلیخا ہوتی ہے۔ کیونکہ دنیا میں اسکی مثالیں بیشمار ہیں۔ محبت کی آگ نے جہاں عورت کے ننگ و ناموس کے دامن کو چھوا، وہ فوراً پیچھے ہٹ گئی اور اپنے محبوب کو اس شعلہ زار میں دھکیل دیا۔ مگر زیبا! تم تو اس شمع کی مانند ہو جو پروانے کے ماتم میں خود بھی جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ اندھی دنیا صرف اتنا ہی دیکھتی ہے کہ شمع نے پروانے کو جلایا۔ مگر زیبا! محبت نے میری آنکھیں کھول دی ہیں اور میں حقیقت کو بے نقاب دیکھ رہا ہوں۔ جلنا اور جلکر خاک ہو جانا پروانے کی قسمت ہی میں لکھا تھا۔ شمع کا اس میں کیا قصور۔ اسی آگ میں وہ خود بھی جل بجھی۔ بس اتنا ہی اس کے اختیار میں تھا۔

زیبا! دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جنکی محبوب دولت ہے اور ایسے بہت ہیں۔ دوسرے وہ جن کی مطلوب محبت ہے اور ایسے تھوڑے ہیں۔ دونوں گروہوں میں ایک خاص فرق اور ایک خاص مشابہت ہے۔ فرق یہ کہ طالب دولت بسا اوقات تھوڑی سی دولت پاکر بھی مطمئن اور خوش ہو جاتا ہے لیکن محبت کا جویا جب تک اپنے محبوب کو تمام و کمال اپنا نہ بنالے اسکی تسکین نہیں ہوتی۔ دیکھنے سے اس کا جی نہیں بھرتا۔ چھونے سے اس کی پیاس نہیں بجھتی، جسمانی اتصال سے دل کی تڑپ نہیں مٹتی۔ وہ اپنے محبوب کو اپنے میں جذب کر لینا اور خود اس کی روح میں سما جانا چاہتا ہے۔

اور مشابہت یہ کہ جس طرح دولت کا شیدائی بعض اوقات حصول دولت کے اور تمام ذرائع سے مایوس ہو کر جوا کھیلتا ہے اور اپنی تھوڑی سی پونجی کو بھی اسکی کل کائنات ہوتی ہے ایک داؤں میں لگا دیتا ہے، اس امید میں کہ پانسے کا ایک ہی پلٹا اسے مالا مال کر دیگا۔ مگر قسمت ساتھ نہیں دیتی۔ وہ ہار جاتا ہے اور بالکل بے سروساماں رہ جاتا ہے۔ اسی طرح محبت کا پرستار جب ہر طرح سے مجبور و ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو اپنے ننگ و ناموس اور جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ اس امید میں کہ محبوب کو پالیگا۔ تقدیر اس کا کھیل دیکھتی ہے اور اس کی بیباکی پر ہنستی ہے۔ پانسے کا پھینکنا جواری کے ہاتھ میں ہے اور اسکا موافق آنا تقدیر کے ہاتھ میں۔ تقدیر پانسا پلٹ دیتی ہے۔ وہ ہار جاتا ہے اور سب کچھ کھو بیٹھتا ہے۔ وہ اس طرح گرتا ہے کہ پھر سنبھل ہی نہیں سکتا۔ دل میں امیدوں کی جگہ نامرادی کے داغوں کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ محبت کی یہ نہ مٹنے والی یادگار بھی اسے عزیز ہوتی ہے۔ اسکی مدد سے وہ ماضی کی اُن چند روح پرور ساعتوں میں سانس لے سکتا ہے جنہوں نے اس کی زندگی کو ایک رنگین خواب بنا دیا تھا۔

زیبا! میں نے بھی جوا کھیلا تھا، تمہیں پالینے کی امید میں۔ مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا۔ میں ہار گیا اور سب کچھ کھو بیٹھا۔ مگر تمہارا اس میں کیا قصور؟ تمہیں اپنے دل پر اختیار تھا وہ تم نے مجھے دیدیا اور ہمیشہ کے لئے دیدیا۔ اس سے زیادہ تم کیا کر سکتی تھیں۔ زیبا! میری مثال اُس کشتی کی سی ہے جو موجوں کے تھپیڑے کھا کھا کر صرف شکستہ ہی نہیں ہو گئی بلکہ ڈوب چکی ہے۔ اب اس ڈوبی ہوئی کشتی کو دریا کی تہ میں سے نکالنے کی کوشش کرنا بے سود ہے۔ اس کشتی کے مسافر فنا کے گھاٹ اتر چکے۔ زیبا! وہ مسافر میری امیدیں تھیں جو ایک ایک کر کے دم توڑ چکیں۔ تمہیں کھو کر میں نے سب کچھ کھو دیا۔ اللہ میں کس قدر بے سروساماں ہوں۔

وہ افسانہ پڑھا۔ لکھنے والے نے ماشاء اللہ خوب لکھا ہے۔ افسانے کے پردے میں آپ بیتی بیان کی ہے مگر حقیقت کہیں اہل نظر سے چھپتی ہے معلوم ہو ہی جاتا ہے کہ یہ رنگینی نقاب کی ہے یا روئے گلفام کی۔ وہاں تک رسائی ہوتی تو ستایش کے پھولوں سے "اُن" کا دامن بھر دیتا۔

ہو سکے تو خط کا جواب جلد لکھ دینا۔ اس سے زیادہ کی تم سے خواہش کرنا ایسا ہی ہے جیسے دھنک کا رنگین آنچل جھپٹ لینے کی کوشش کرنا۔ اچھا خدا حافظ۔ تمہارا۔ ہمیشہ کے لئے تمہارا......

ابن داؤد

کفن

زخمی چین

(شمالی صوبے میں قحط کے بعد، چنگ کنگ میں گورنمنٹ نے سات ہزار لوگوں کو کفن کے لئے کپڑا دیا۔ کیونکہ یہ لوگ اتنے مفلوک الحال تھے کہ اپنے مرے ہوئے عزیزوں کے لئے کفن بھی مہیا نہ کر سکتے تھے۔)

(چیانگ کیشک کے خطوط سے)

چین میں کہاوت ہے " زندگی میں سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ انسان اچھی طرح سے کفنایا جائے " اور لنگ اس کہاوت پر کامل یقین رکھتا تھا۔ وہ کافی عرصے سے کفن کلب کا ممبر تھا۔ اور ہر سال کچھ نہ کچھ چندہ دیا کرتا تھا۔ تاکہ مرنے کے بعد وہ نہایت شان شوکت سے کفنایا جائے۔ اس کی ساٹھویں سالگرہ پر اُس کے پانچ لڑکوں نے اپنے باپ کو ایک نہایت شاندار تابوت پیش کیا۔ یہ تابوت لکڑی کا بنا ہوا تھا اور تقریباً چھ انچ موٹا تھا، اور ایک نہایت خوبصورت ڈھکنے سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس پر تقریباً دس بار پینٹ کیا گیا تھا۔ اس کا رنگ سبز تھا۔

جس دن لڑکوں نے اِس تحفے کو پیش کیا، اُس دن اس خوشی میں سارے گھر میں جشن منایا گیا۔ ہوٹل سے تین میزیں کرایہ پر لی گئیں، اور میزوں پر نہایت خوبصورت کپڑے بچھائے گئے۔ اور تقریباً ۲۴ قسم کی مختلف چیزیں تیار کی گئیں۔ انہوں نے دیواروں پر چھوٹے چھوٹے پردے لٹکائے، جن پر " لمبی عمر " جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ اُس دن لنگ نے دکان بھی بند نہ کی۔

صبح کاذب ہوتے ہی لنگ کے لڑکوں نے پرانے مندر کے سامنے ایک میز پر چاولوں کی پلیٹ اور چائے اور ایک چمچہ رکھدیا۔ یہ چیزیں دیوتا کو پیش کی گئی تھیں۔ لنگ نے اس بات پر اعتراض کیا تھا۔ کیونکہ وہ اس قسم کی واہیات باتوں کو پسند نہ کرتا تھا۔ لیکن اُسے ان باتوں کو نظر انداز بھی کرنا پڑا۔ کھانے پینے کی چیزیں نہایت سلیقے سے رکھی گئیں۔ اور مہمان جوق در جوق آنے لگے۔ کم از کم ۳۰۰ مہمان تھے۔ مہمان آہستہ آہستہ چاولوں کی شراب پینے لگے۔ انہوں نے لنگ کا نام لیکر پیالے خالی کرنے شروع کر دئے۔ اور لنگ کو یہ محسوس کرانا چاہا کہ لنگ نے ۶۰ سال کی عمر پا کر نہایت ہی شاندار کارنامہ کیا ہے۔

تابوت پاکر وہ بہت خوش ہوا۔ وہ ہمیشہ ڈرتا رہتا تھا کہ اُسکے لڑکوں کے پاس اتنا روپیہ نہیں جس سے وہ اچھے طریقے سے کفنایا جاسکے۔ لیکن آج اُس کی تمنا بر آئی تھی۔ اور اُس کی آنکھوں کے سامنے اسکی آرزو زندہ ہو کر آ بیٹھی تھی۔ لکڑی کا تابوت اس کے سامنے پڑا تھا۔ وہ آج ہی مرنا چاہتا تھا، کتنا خوبصورت تابوت ہے۔ کاش آج ہی اُسے موت آجائے! اب وہ اپنے آپ کو غریب نہ سمجھتا تھا۔ گو اسکی دکان معمولی سی تھی۔ دکان میں اُس نے مختلف چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ مثلاً دیا سلائی کی ڈبیاں، موم بتیاں، سوکھی ہوئی مچھلیاں، پنکھے، ہیٹ، سینڈل، چائے اور لکڑیاں۔ ان اشیاء سے اُسے بہت نفع نہ ہوتا تھا۔ اور جب کنگ پی جوان ہوا اور اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے لگا تو کبھی کبھی پھل خرید لاتا، اور کہتا " آجکل لوگ پھل خوب کھاتے ہیں، اور ان کو معقول قیمت پر بیچا جا سکتا ہے "

لنگ پھل بیچنے کے حق میں نہ تھا۔ گو لڑکے سکول سے واپس آکر پھل خرید لیتے تھے۔ لیکن کس کو معلوم تھا کہ کل چھٹی ہو جائے گی اور اس طرح تمام پھل دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ اور دکان پر سڑ جائیں گے اور اکثر ان پھلوں کو کاٹ چھانٹ کر غریب قلیوں کو کم قیمت پر بیچا جا سکتا تھا۔ لیکن لنگ کو یہ سودا پسند نہ تھا۔ اور وہ پی کنگ سے اونچی آواز میں کہتا " ہمیشہ خشک پھل خریدا کرو۔ کم از کم وہ خراب تو نہیں ہوتے۔ کیا تم پھل خرید کر ہمیں برباد کرنا چاہتے ہو۔ ہمیں ایسا سودا لینا نہیں۔

کنگ پی ہنس پڑتا، اور اُس کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا۔ اور وہ اپنے باپ کی گھرکیاں سنتا رہتا۔ ایک ۶۰ سال کے بوڑھے کو زمانے کے ساتھ چلنے کیلئے کچھ کہنا بے سود ہے۔

اس نقصان کے باوجود وہ کچھ نہ کچھ کما لیا کرتے تھے۔ کنگ پی اور اس کی بیوی اور اُس کے دو بچے اندر کے کمرے میں سویا کرتے تھے۔ لیکن لنگ دکان پر سویا کرتا تھا۔ جب سے اُس کی بیوی کی وفات ہوئی تھی وہ دکان پر سوتا تھا۔ دراصل اُسے مچھلیوں کی بدبو بھاتی تھی۔ گو وہ ساٹھ سال کا بوڑھا تھا لیکن وہ دکان کا مالک تھا۔ وہ صندوق جس میں روپے وغیرہ رکھے جاتے تھے، وہ اس کے سرہانے کے نیچے

رکھا جاتا تھا۔ اور بڑے صندوق کی چابی اسکے پاس رہتی تھی۔ اور یہ چابی اس کی پیٹی کے ساتھ لٹکی رہتی تھی۔ وہ سونے سے پہلے تمام دروازے بند کر لیتا۔ لنگ سب سے پہلے اُٹھتا تھا۔ وہ لیمپ جلاتا، چولھے میں آگ جلاتا اور چائے بناتا۔ اور پی کنگ کو جگاتا، تاکہ وہ مارکیٹ میں جاکر چیزیں خرید سکے۔

جب لنگ چائے پی لیتا تو وہ کھڑکیاں کھولتا، اور تمام میزوں کو کپڑے سے صاف کرتا، اور پھل وغیرہ چُنتا، انہیں قرینے سے سجاتا، پھر تابوت کو صاف کرتا اور اپنے نرم ہاتھ اس خوبصورت تابوت پر پھیرتا۔ اُسے اس تابوت پر ہاتھ پھیر کر روحانی خوشی حاصل ہوتی، پھر وہ بائبل پڑھتا۔ مشنری نے اُسے ایک بائبل دی تھی۔ وہ ہر روز ایک باب پڑھتا۔ اور ایک دو ہفتے میں بائبل کو پڑھکر ختم کر دیتا اور پھر نئے سرے سے شروع کرتا۔ اکثر وہ اونچی آواز میں پڑھتا۔ اگر بائبل پڑھتے پڑھتے کوئی گاہک آجاتا تو وہ آنکھیں بند کئے ہوئے اور گاہک کی پروا نہ کرتے ہوئے بائبل پڑھتا رہتا۔ وہ اس وقت خدا کی بارگاہ میں ہے۔ وہ کس طرح گاہک کو چیزیں دے سکتا ہے۔ اگر گاہک تنگ آکر کھانستا تو بھی آنکھیں نہ کھولتا۔ لیکن اس کے باوجود وہ جانتا تھا کہ گاہک کیا کر رہا ہے۔ وہ گاہک کی ہر حرکت کو دیکھ لیا کرتا تھا۔ ایک دن کی بات ہے کہ ایک لڑکا صبح کے وقت پھل خریدنے آیا۔ لنگ اس وقت عبادت کر رہا تھا۔ لڑکے نے موقع پاکر سنگترے اُٹھانے چاہے۔ لیکن لنگ نے جھٹ لڑکے کا بازو پکڑ لیا اور خوب پیٹا۔ اور اس کے بعد پھر عبادت کرنے لگا۔ ایک بار ایک پادری نے لنگ سے کہا: "یہ جسم کچھ بھی نہیں۔ خاک سے پیدا ہوا خاک میں مل جائیگا۔ اصل چیز تو رُوح ہے۔ زندہ رہکر انسان اچھے کام کرے۔ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے اس کے متعلق سوچنے سے کیا مطلب۔ اور پھر اس بات کی آرزو کرنا کہ کفن اچھا ملا یا نہیں ایک بے معنی چیز ہے۔"

"لیکن بائبل میں لکھا ہے کہ ہم پھر زندہ ہونگے۔ اور اگر ہم خاک میں مل گئے تو پھر زندہ کس طرح ہونگے۔"

پادری ایک لمبا سانس بھرتا اور لنگ کو سمجھانے کی کوشش کرتا۔ اور لنگ سر ہلا دیتا اور کہتا: "بھئی تم ٹھیک کہتے ہو۔"

لیکن وہ دل میں جانتا تھا کہ اُس کے لڑکوں نے اُسے ایک نہایت عمدہ تابوت پیش کرکے اُس کی عزت افزائی کی ہے۔ عیسائیوں کے جنازے کچھ نہیں ہوتے، لیکن وہ خوش تھا کہ اُسکے لڑکوں نے اُسے ایک خوبصورت تابوت پیش کیا ہے۔ جس میں اُس کی رُوح نہایت چین سے رہ سکیگی۔

اور جب شمال میں لڑائی شروع ہوئی تو لنگ اور اُسکے لڑکے کچھ خوفزدہ نہ ہوئے۔ لنگ پی کہنے لگا: "ہمیشہ کہیں نہ کہیں لڑائی ہوتی رہتی ہے۔ ایک سال ہوا کہ سُرخ فوج نے ہمارے شہر پر حملہ کیا تھا اور ہمارا بھائی جنگ مارا گیا تھا۔ ان کمیونسٹوں پر خدا کی لعنت۔ یہ لوگ کوئی نہ کوئی شوشہ اُٹھاتے رہتے ہیں۔"

"لیکن اس بار تو کمیونسٹوں نے حملہ نہیں کیا۔ یہ حملہ کرنے والے تو جاپانی ہیں۔ اور انکے خلاف کمیونسٹ اور چینی گورنمنٹ مل کر لڑ رہے ہیں۔"

لنگ نے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا: "جاپانی اور کمیونسٹ ایک ہی مشین کے پرزے ہیں۔"

لنگ نے پائپ جلایا۔ اور دھواں نکالتے ہوئے کہنے لگا۔ "ساتھی، زندگی کیا ہے لڑائی اور جھگڑوں کا ایک مرقع۔ ہم کرسچین امن پسند ہیں، ارے بھئی گرجا میں جاکر وعظ سنا کرو۔ پچھلے اتوار ایک پادری نے نہایت شاندار وعظ کیا تھا۔ اس نے کہا کہ دُنیا ختم ہونے والی ہے۔ اس جنگ کے بعد دُنیا ختم ہو جائے گی۔ اور پھر ہر جگہ، خوشی، دولت ثروت ہوگی۔"

دوسرا بولا: "میرا لڑکا جو ہائی سکول میں پڑھتا ہے وہ کہتا ہے کہ مذہب ایک فرسودہ چیز ہے۔ کمیونسٹ ہمیشہ عوام کے لئے لڑتے ہیں، اور ایک نئے نظام کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں۔ ایک خوبصورت دُنیا کی تخلیق کرنا چاہتے ہیں۔ اب ہمیں جاپانیوں سے ضرور لڑنا چاہیئے اور انہیں اس ملک سے باہر نکال دینا چاہیئے۔"

لنگ جھٹ کہہ دیتا: "نہیں ساتھی، تم غلط کہتے ہو۔ سچی راحت اور خوشی ہمیں جنت میں ملے گی۔"

لڑکوں کا ایک گروہ پاس سے گذرا۔ انکے ہاتھ میں ایک جھنڈا تھا جس پر لکھا ہوا تھا: "جاپانیوں سے لڑو!" لنگ کا ساتھی بولا "آج جلسہ ہوگا، آؤ چلیں اور سنیں، یہ لوگ کیا کہتے ہیں۔"

لنگ نے زمین پر تھوکا اور کہنے لگا: "میں ان چھوکروں کی تقریریں نہیں سننا چاہتا۔ یہ صرف باتیں بنا سکتے ہیں۔ دھواں دھار تقریریں کر سکتے ہیں، اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ لڑائی میں شامل ہو جاؤ۔ لیکن خود جانے کا نام تک نہیں لیتے۔ پچھلی بار کچھ لڑکے میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ دس ڈالر چاہئیں۔ لیکن میں نے ایک ڈالر بھی نہ دیا۔ ہمارے لئے گورنمنٹ نے کیا کیا ہے کہ ہم انہیں

دس ڈالر دیں۔ جب کیونسٹوں نے حملہ کیا تھا تو یہ سب لوگ بھاگ گئے تھے اور یہیں کام چھوڑ گئے تھے
لیکن جنگ جو بہت دور دکھائی پڑتی تھی، لمحہ بہ لمحہ قریب آتی گئی۔ لنگ نے بہت بے دلی سے پولیس کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کیا۔ اُس نے اپنے بڑے لڑکے کو ساحل پر جانے کیلئے کہا تا کہ وہاں سے ریت بوریوں میں بھر کر لے آئے۔ کیونکہ دن بدن ہوائی حملے کا خطرہ بڑھتا جاتا تھا۔ ایک دن وہ پناہ گاہ دیکھنے کیلئے چلا گیا۔ ایک چھوٹی سی کھائی کھودی جا رہی تھی اور اس پر تختہ رکھکر مٹی ڈالی ڈالی جا رہی تھی۔

"میں تو اس کھائی میں خوف ہی سے جاں بحق ہو جاؤنگا"۔ ایک دن دو بچے اس پناہ گاہ کے کھیلتے کھیلتے مر گئے تھے۔ کیونکہ پناہ گاہ کی چھت گر پڑی تھی۔ اور پھر لنگ نے لوگوں سے کہا "بھئی ہم زمین پر صحیح سلامت رہ سکتے ہیں اور ہم پناہ گاہوں میں خود بخود جا کر مرنا نہیں چاہتے۔ میں ہوائی جہازوں سے بالکل نہیں ڈرتا۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ کبھی نہیں آئینگے"۔ شنگھائی اور پی کنگ کے درمیان ہوائی سروس کھل گئی تھی۔ اور لوگ ہوائی جہازوں سے کافی مانوس ہو گئے تھے۔ اسکے دوست لی کا بیٹا ہوائی جہازوں میں ہوا باز کا کام کرتا تھا۔ گو لوگ کہتے ہیں کہ گورنمنٹ نے اُسے ان فٹ کر دیا ہے لیکن پھر بھی اس کا باپ نہایت زور دار لہجے میں کہتا ہے کہ "اس کا لڑکا ہوائی جہازوں میں کام کرتا ہے"۔

جس دن ہوائی حملے کے خطرے کا الارم بجا تو لنگ بھی ہاتھ میں چھڑی لیکر ہجوم میں شامل ہو گیا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔ اور اِدھر اُدھر بھاگتا پھرتا تھا۔ الارم کی آواز موت کو ہر لمحہ قریب لا رہی تھی۔ اور جب الارم دوسری بار بجا تو پولیس نے لوگوں کو زبردستی گلیوں سے باہر نکال دیا۔ اور بیچارا لنگ ایک ایسے مکان میں داخل ہوا جہاں وہ کبھی بھی نہ گیا تھا۔

ایک عورت نے کہا "بوڑھے آدمی اندر آجاؤ"۔ وہ ایک کرسی لے آئی اور لنگ نہایت آرام سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ خوف سے کانپ رہا تھا، اور اس کا سانس نہایت مشکل سے آتا تھا۔ شہر میں سناٹے کا عالم تھا۔ کاریں ہارن نہیں بجاتی تھیں، جہازوں کی سیٹیاں بند تھیں۔ گلیاں اور سڑکیں ویران اور سنسان تھیں۔ لاکھوں انسانوں نے کام بند کر دیا تھا۔ گویا سب کے سب موت کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک کتے نے اِس سکوت کو توڑنا چاہا لیکن پولیس کے سپاہی نے گولی چلائی، اور کتا زمین پر لڑھک گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ایک بچہ رونے لگا۔

"خاموش!" اسکی ماں نے کہا "دشمنوں کے پاس ایسے آلات ہیں جن سے وہ ہر آواز کو سن سکتے ہیں، اس لئے بالکل چپ ہو جاؤ"۔

بچہ خوف سے کانپ گیا۔ اور لنگ کی طرف پریشان نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ بچے نے اپنی باہیں لنگ کی طرف پھیلا دیں۔ اور پھر لنگ کے زانو پر بیٹھ گیا۔

عورت کہنے لگی "کہتے ہیں کہ دشمن کے ہوائی جہازوں کی آواز ہمارے ہوائی جہازوں کی آواز سے مختلف ہے"۔

آخر کار خطرے کے دور ہو جانے کا الارم بجا۔ لنگ کھڑا ہو گیا اور بچے کو ماں کی گود میں دیدیا اور کہنے لگا "شکریہ۔ تم دوبارہ نہیں چلاؤگی اچھی لڑکی! اچھا خدا حافظ"۔

اس دوران میں لنگ کو ہوائی طیاروں کے انتظار کرنے میں کافی پریکٹس ہو گئی۔ اور اب اسے پناہ گاہ میں جاتے ہوئے تکلیف محسوس ہونے لگی۔ اب جب الارم بجتا تو وہ دکان سے باہر آجاتا اور وہاں بیٹھکر دشمنوں کے ہوائی جہازوں کے پرواز کی آوازیں سنتا۔ اب اُسے ان ہوائی حملوں سے کم خدشہ محسوس ہوتا۔ اُسکے پوتے کنگ لی اور اسکی بیوی، سب کے سب گاؤں میں چلے گئے تھے۔ اب وہ اکیلا رہ گیا۔ بہت سے لوگ شہر چھوڑ کر گاؤں چلے گئے تھے۔ اس لئے لنگ کی آمدنی میں کافی کمی واقع ہو گئی تھی۔ اب وہ جنگ کی تکالیف کو محسوس کرنے لگا تھا۔

ایک رات خطرے کا الارم رات کے نو بجے کے قریب بجا۔ اسوقت وہ بائبل پڑھ رہا تھا۔ اُس رات وہ کافی تھکا ہوا تھا۔ اور اسکی کمر میں درد تھا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور دھیمی آواز میں کہنے لگا "اے خدا خطرے کا الارم ابھی ابھی ہوا ہے لیکن میں بالکل نہیں ڈرتا۔ کیونکہ تم ہر جگہ موجود ہو۔ جیسا کہ بائبل میں لکھا ہے۔ جب میں اٹھتا ہوں میں تمہارے ساتھ ہوتا ہوں، آج تم مجھے اپنے ساتھ رکھو۔ کیونکہ مجھے نیند آرہی ہے۔ اور میں تم پر بھروسہ رکھتا ہوں۔ آمین"۔ وہ رضائی کو اپنے ارد گرد لپیٹ رہا تھا کہ اُسے خیال آیا کہ اُس نے تابوت کو صاف نہیں کیا۔ اس خطرے کے الارم نے اُسکے روزانہ کام میں کتنی رکاوٹ ڈالدی تھی۔ وہ بستر سے اُٹھا اور اندھیرے میں اپنی انگلیاں لکڑی کے تابوت پر پھیرنے لگا۔ "یہ ایک نہایت ہی عمدہ تابوت ہے مجھے چاہیئے تھا کہ یہ تابوت گاؤں بھیجدیتا۔ کیونکہ یہاں ہوائی حملے سے ٹوٹ جانے کا خطرہ ہے"۔ اس نے رضائی اپنے ارد گرد لپیٹ لی اور خطرے کے الارم کو بالکل نہ سنا۔ اور نہ ہی دھماکے کی آواز کو ۔۔۔ دس دن کے بعد لنگ کی لاش ملبہ کھود کر نکالی گئی۔ لکڑی کے چند ٹکڑے اُسکی لاش کے قریب پڑے ہوئے تھے۔ شاید یہی لنگ کا تابوت تھا۔۔۔ "اس تابوت کا اب کچھ فائدہ نہیں"۔ ایک والنٹیر نے کہا "بہتر یہ ہوگا کہ گلی کے نکڑ پر جو تابوت پڑا ہے اُسے استعمال میں لایا جائے"۔ اور ان والنٹیروں نے نہایت کاوش سے لنگ کی بچی ہوئی لاش کو تابوت میں رکھا اور اس پر کچھ لکڑیاں رکھکر آگ لگادی۔

مہندر ناتھ!

تہیۂ شوق

کچھ شکوۂ سوزِ غمِ پنہاں نہ کروں گا
میں حسنِ پشیماں کو پشیماں نہ کروں گا

گریہ کبھی چھپ کر تہِ داماں نہ کروں گا
دامن کو بھی ہمرنگِ گلستاں نہ کروں گا

اب خونِ جگر کو سرِ مژگاں نہ کروں گا
اس جنسِ گرامی کو میں ارزاں نہ کروں گا

سوزِ غمِ دل کو غمِ دوراں نہ کروں گا
اس محشرِ پنہاں کو نمایاں نہ کروں گا

اس بزم میں فرحت کو غزلخواں نہ کروں گا
اس قطرۂ ناچیز کو طوفاں نہ کروں گا

اس جلوۂ مستور کو عریاں نہ کروں گا
میں پیرویِ موسیٰ عمراں نہ کروں گا

ذکرِ دلِ محزوں کسی عنواں نہ کروں گا
یعنی گلۂ گردشِ دوراں نہ کروں گا

اک محشرِ خاموش نہاں دل میں رہیگا
دامن کو بہر حال گلستاں نہ کروں گا

لب تشنۂ فریاد رہے گا تو رہے گا
لیکن کبھی ذکرِ غمِ پنہاں نہ کروں گا

کیا ہوتا ہے آن پر اثرِ سوزِ محبت
اس فکر میں ایثار کو غلطاں نہ کروں گا

چاہوں گا رہے مشقِ جفا سعیِ وفا پر
میں عشق کو شرمندۂ احساں نہ کروں گا

کردونگا نثارِ ستمِ حسنِ جفا جو
شیرازۂ ہستی کو پریشاں نہ کروں گا

خودداریِ شاعر بھی زمانے سے الگ ہے
مرجاؤں گا پر منتِ درباں نہ کروں گا

"ارنی" نہ کہوں گا بہ سرِ طورِ محبت
میں برقِ تجلّی کو گریزاں نہ کروں گا

سوزِ غمِ الفت کو نہ دو صبر کے چھینٹے
میں درد کو شرمندۂ درماں نہ کروں گا

جس دل کے نہاں خانہ میں صورت ہے تمہاری
اُس دل میں کسی اور کو مہماں نہ کروں گا

جن خاک کے ذرّوں سے عبارت ہے مرا دل
ان خاک کے ذرّوں کو پریشاں نہ کروں گا

تصویر جو دل میں ہے وہ دل ہی میں رہے گی
اے جلوۂ پنہاں! تجھے عریاں نہ کروں گا

رکھونگا نگاہوں میں تجھے اے لبِ لعلیں!
ذکرِ یمن و لعلِ بدخشاں نہ کروں گا

ہونے دے ضیا پاش، رخِ زہرہ جبیں کو
میں پرسشِ مہر و مہِ تاباں نہ کروں گا

لب ہائے فسوں ساز کو ہونے دے گہربار
ذکرِ عدن و ملکِ بدخشاں نہ کروں گا

اے شامِ الم! تیری یہ کیفیتِ بے کیف
اب تذکرۂ صبحِ درخشاں نہ کروں گا

رکھونگا میں آہِ دلِ محروم کو محروم
اِس نغمے کو آشوبِ نیستاں نہ کروں گا

زحمت نہ تمہیں دونگا کہ گھر تک مرے آؤ
میں سروِ خراماں کو خراماں نہ کروں گا

گرویدۂ گیسوے گرہ گیر رہوں گا
اب تذکرۂ سنبلِ پیچاں نہ کروں گا

ظلمات کے پردے میں ہے خود چشمۂ حیواں
اب شکوۂ طولِ شبِ ہجراں نہ کروں گا

کفرِ نگہِ فتنہ گرِ یار کے صدقے
میں تکملۂ جذبۂ ایماں نہ کروں گا

آہوں سے بھی ہوجائیگا چاکِ دلِ مضطر
ہاتھوں کو گنہگارِ گریباں نہ کروں گا

فرحت ہے مری آتشِ پنہاں بھی غنیمت
روشن کوئی مشعل تہِ داماں نہ کروں گا

فرحت کانپوری

دُھواں

وہ جب اسکول کی طرف روانہ ہوا تو اس نے راستے میں ایک قصائی دیکھا جس کے سر پر ایک بہت بڑا ٹوکرا تھا۔ اس ٹوکرے میں دو تازہ ذبح کئے ہوئے بکرے تھے۔ کھالیں اتری ہوئی تھیں، اور ان کے ننگے گوشت میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا جگہ جگہ پر یہ گوشت جسکو دیکھ کر مسعود کے ٹھنڈے گالوں پر گرمی کی لہریں سی دوڑ جاتی تھیں پھڑک رہا تھا جیسے کبھی کبھی اسکی آنکھ پھڑکا کرتی تھی۔

اس وقت ساڑھے نو بجے ہوں گے مگر جھکے ہوئے خاکستری بادلوں کے باعث ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سویرا ہے۔ سردی میں شدت نہیں تھی، لیکن راہ چلتے آدمیوں کے منہ سے گرم گرم سماوار کی ٹونٹیوں کی طرح گاڑھا سفید دھواں نکل رہا تھا۔ ہر شے بوجھل دکھائی دیتی تھی جیسے بادلوں کے وزن کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ موسم کچھ ایسی ہی کیفیت کا حامل تھا جو ربڑ کے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کہ بازار میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی اور دکانوں میں زندگی کے آثار پیدا ہو چکے تھے آوازیں مدھم تھیں، جیسے سرگوشیاں ہو رہی ہیں، چپکے چپکے، دھیرے دھیرے باتیں ہو رہی ہیں، ہولے ہولے لوگ قدم اُٹھا رہے ہیں کہ زیادہ اونچی آواز پیدا نہ ہو۔

مسعود بغل میں بستہ دبائے اسکول جا رہا تھا۔ آج اس کی چال بھی سست تھی۔ جب اس نے بے کھال کے تازہ ذبح کئے ہوئے بکروں کے گوشت سے سفید سفید دھواں اُٹھتا دیکھا تو اُسے راحت محسوس ہوئی۔ اس دھوئیں نے اُس کے ٹھنڈے ٹھنڈے گالوں پر گرم گرم لکیروں کا ایک جال سا بُن دیا۔ اس گرمی نے اُسے راحت پہونچائی اور وہ سوچنے لگا کہ سردیوں میں ٹھنڈے یخ ہاتھوں پر بید کھانے کے بعد اگر یہ دھواں مل جایا کرے تو کتنا اچھا ہو۔

فضا میں اُجلاپن نہیں تھا۔ روشنی تھی مگر دُھندلی۔ کہر کی ایک پتلی سی تہہ ہر شے پر چڑھی ہوئی تھی جس سے فضا میں گدلاپن پیدا ہو گیا تھا۔ یہ گدلاپن آنکھوں کو اچھا معلوم ہوتا تھا اس لئے کہ نظر آنے والی چیزوں کی نوک پلک کچھ مدھم پڑ گئی تھی۔

مسعود جب اسکول پہونچا تو اُسے اپنے ساتھیوں سے یہ معلوم کر کے قطعی طور پر خوشی نہ ہوئی کہ اسکول سکتر صاحب کی موت کے باعث بند کر دیا گیا ہے۔ سب لڑکے خوش تھے جس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ اپنے بستے ایک جگہ پر رکھکر اسکول کے صحن میں اوٹ پٹانگ کھیلوں میں مشغول تھے۔ کچھ چھٹی کا پتہ معلوم کرتے ہی گھر چلے گئے تھے۔ کچھ آ رہے تھے اور کچھ نوٹس بورڈ کے پاس جمع تھے اور بار بار ایک ہی عبارت پڑھ رہے تھے۔

مسعود نے جب سُنا کہ سکتر صاحب مر گئے ہیں تو اُسے بالکل افسوس نہ ہوا۔ اُس کا دل جذبات سے بالکل خالی تھا۔ البتہ اُس نے یہ ضرور سوچا کہ پچھلے برس جب اس کے دادا جان کا انتقال ان ہی دنوں میں ہوا تھا تو اُن کا جنازہ لے جانے میں بڑی دقت ہوئی تھی اس لئے کہ بارش شروع ہو گئی تھی۔ وہ بھی جنازے کے ساتھ گیا تھا اور قبرستان میں چکنی کیچڑ کے باعث ایسا پھسلا تھا کہ کھدی ہوئی قبر میں گرتے گرتے بچا تھا۔ یہ سب باتیں اس کو اچھی طرح یاد تھیں۔ سردی کی شدت، اُس کے کیچڑ سے لت پت کپڑے، سُرخی مائل نیلے ہاتھ جن کو دبانے سے سفید سفید دھبے پڑ جاتے تھے۔ ناک جو کہ برف کی ڈلی معلوم ہوتی تھی اور پھر گھر آ کر ہاتھ پاؤں دھونے اور کپڑے بدلنے کا مرحلہ ـــــ یہ سب کچھ اُس کو اچھی طرح یاد تھا، چنانچہ جب اُس نے سکتر صاحب کی موت کی خبر سُنی تو اُسے یہ بیتی ہوئی باتیں یاد آ گئیں اور اس نے سوچا، جب سکتر صاحب کا جنازہ اُٹھے گا تو بارش شروع ہو جائیگی اور قبرستان میں اتنی کیچڑ ہو جائے گی کہ کئی لوگ پھسلیں گے اور ان کو ایسی چوٹیں آئینگی کہ بلبلا اُٹھیں گے۔

مسعود نے یہ خبر سن کر سیدھا اپنے کمرے کا رُخ کیا۔ کمرے میں پہونچ کر اس نے اپنے ڈیسک کا تالا کھولا۔ دو تین کتابیں جو کہ اُسے دوسرے روز پھر لانا تھیں اس میں رکھیں اور باقی بستہ اُٹھا کر گھر کی جانب چل پڑا۔

راستے میں اُس نے پھر وہی دو تازہ ذبح کئے ہوئے بکرے دیکھے۔ ان میں سے ایک کو اب قصائی نے لٹکا دیا تھا۔ دوسرا تختے پر پڑا تھا۔ جب مسعود دُکان پر سے گذرا تو اُس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ گوشت کو جس میں سے دُھواں اُٹھ رہا تھا چھو کر دیکھے، چنانچہ آگے بڑھ کر اس نے انگلی سے بکرے کے اُس حصے کو چھو کر دیکھا جو ابھی تک پھڑک

رہا تھا گوشت گرم تھا۔ مسعود کی ٹھنڈی انگلی کو یہ حرارت بہت بھلی معلوم ہوئی۔ قصائی دکان کے اندر چھریاں تیز کرنے میں مصروف تھا چنانچہ مسعود نے پھر گوشت کو چھو کر دیکھا اور وہاں سے چل پڑا۔

گھر پہونچ کر اُس نے جب اپنی ماں کو سکتر صاحب کی موت کی خبر سنائی تو اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے اباجی انہی کے جنازے کے ساتھ گئے ہیں۔ اب گھر میں صرف دو آدمی تھے۔ ماں اور بڑی بہن۔ ماں باورچی خانے میں بیٹھی سالن پکا رہی تھی اور بڑی بہن کلثوم پاس ہی ایک کانگڑی لئے درباری کی سرگم یاد کر رہی تھی۔

چونکہ گلی کے دوسرے لڑکے گورنمنٹ اسکول میں پڑھتے تھے جس پر اسلامیہ اسکول کے سکتر کی موت کا کچھ اثر نہیں پڑا تھا، اس لئے مسعود نے خود کو بالکل بیکار محسوس کیا۔ اسکول کا کوئی کام بھی نہیں تھا۔ چھٹی جماعت میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ گھر میں اپنے اباجی سے پڑھ چکا تھا۔ کھیلنے کے لئے بھی اُس کے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ ایک میلا کچیلا تاش طاق میں پڑا تھا مگر اس سے مسعود کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لوڈو اور اسی قسم کے دوسرے کھیل جو اُس کی بڑی بہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہر روز کھیلتی تھی اس کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ سمجھ سے بالاتر یوں تھے کہ مسعود نے کبھی ان کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اس کو فطرتاً ایسے کھیلوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

بستہ اپنی جگہ پر رکھنے اور کوٹ اتارنے کے بعد وہ باورچی خانے میں اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا۔ اور درباری کی سرگم سنتا رہا جس میں کئی دفعہ سارے گاما آتا تھا۔ اُس کی ماں پالک کاٹ رہی تھی۔ پالک کاٹنے کے بعد اس نے سبز سبز پتوں کا گیلا گیلا ڈھیر اٹھا کر ہنڈیا میں ڈال دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب پالک کو آنچ لگی تو اُس میں سے سفید سفید دھواں اٹھنے لگا۔ اس دھوئیں کو دیکھ کر مسعود کو بکرے کا گوشت یاد آگیا۔ چنانچہ اُس نے اپنی ماں سے کہا: "امی جان، آج میں نے قصائی کی دکان پر دو بکرے دیکھے۔ کھال اتری ہوئی تھی اور اُن میں سے دھواں نکل رہا تھا بالکل ایسے ہی جیسا کہ صبح سویرے میرے منہ سے نکلا کرتا ہے۔"

"اچھا!" یہ کہہ کر اس کی ماں چولہے میں لکڑیوں کے کوئلے جھاڑنے لگی۔

"ہاں اور میں نے گوشت کو اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تو وہ گرم تھا۔"

"اچھا۔" یہ کہہ کر اس کی ماں نے وہ برتن اٹھایا جس میں اس نے پالک کا ساگ دھویا تھا اور باورچی خانے سے باہر چلی گئی۔

"اور یہ گوشت کئی جگہ پر پھڑکتا بھی تھا۔"

"اچھا۔" مسعود کی بڑی بہن نے درباری کی سرگم یاد کرنا چھوڑ دی اور اُس کی طرف متوجہ ہوئی: "کیسے پھڑکتا تھا؟"

"یوں۔۔۔یوں۔" مسعود نے انگلیوں سے پھڑکن پیدا کر کے اپنی بہن کو دکھائی۔

"تو پھر کیا ہوا؟"

یہ سوال کلثوم نے اپنے سرگم بھرے دماغ سے کچھ اس طور پر نکالا کہ مسعود ایک لحظے کے لئے بالکل خالی الذہن ہو گیا: "پھر کیا ہونا تھا۔ میں نے تو ایسے ہی آپ سے بات کی تھی کہ قصائی کی دکان پر گوشت پھڑک رہا تھا۔ میں نے انگلی سے چھو کر بھی دیکھا تھا۔۔۔گرم تھا۔"

"گرم تھا۔۔۔۔۔اچھا مسعود یہ بتاؤ تم میرا ایک کام کرو گے؟"

"بتائیے۔"

"آؤ، میرے ساتھ آؤ۔"

"نہیں آپ پہلے بتائیے۔ کام کیا ہے؟"

"تم آؤ تو سہی میرے ساتھ۔"

"جی نہیں۔۔۔آپ پہلے کام بتائیے۔"

"دیکھو۔ میری کمر میں بڑا درد ہو رہا ہے۔۔۔میں پلنگ پر لیٹتی ہوں، تم ذرا پاؤں سے دبا دینا۔۔۔اچھے بھائی جو ہوئے۔۔۔اللہ کی قسم بڑا درد ہو رہا ہے۔" یہ کہہ کر مسعود کی بہن نے اپنی کمر پر مکیاں مارنا شروع کر دیں۔

"یہ آپ کی کمر کو کیا ہو جاتا ہے۔۔۔جب دیکھو درد ہو رہا ہے اور پھر آپ دبواتی بھی مجھی سے ہیں، کیوں نہیں اپنی سہیلیوں سے کہتیں۔" مسعود اٹھ کھڑا ہوا: "چلئے، لیکن میں یہ آپ سے کہے دیتا ہوں کہ دس منٹ سے زیادہ میں بالکل نہیں دباؤں گا۔"

"شاباش۔۔۔شاباش۔" اُس کی بہن اٹھ کھڑی ہوئی اور سرگموں کی کاپی سامنے طاق میں رکھ کر اس کمرے کی طرف روانہ ہوئی جہاں وہ اور مسعود دونوں سوتے تھے۔

صحن میں پہونچ کر اُس نے اپنی دکھتی ہوئی کمر سیدھی کی اور اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ مٹیلے بادل جھکے ہوئے تھے: "مسعود، آج ضرور بارش ہوگی۔۔۔۔۔" یہ کہہ کر اُس نے مسعود کی طرف دیکھا مگر وہ اندر اپنی چارپائی پر لیٹا تھا۔

جب کلثوم اپنے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گئی تو مسعود نے اٹھ کر گھڑی میں وقت دیکھا: "دیکھئے باجی گیارہ بجنے میں دس منٹ باقی

ہیں۔ میں پورے گیارہ بجے آپ کی کمر دابنا چھوڑ دونگا۔"

"بہت اچھا، لیکن تم اب خدا کے لئے زیادہ نخرے نہ بگھارو۔ اِدھر میرے پلنگ پر آکر جلدی کمر دباؤ ورنہ یاد رکھو بڑے زور سے کان اینٹھوں گی۔" کلثوم نے مسعود کو ڈانٹ پلائی۔ مسعود نے اپنی بڑی بہن کے حکم کی تعمیل کی۔ اور دیوار کا سہارا لیکر پاؤں سے اُس کی کمر دبانا شروع کر دی۔ مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں خفیف سا جھکاؤ پیدا ہوگیا۔ جب اُس نے پیروں سے دبانا شروع کیا، ٹھیک اُسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندتے ہیں تو کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہولے ہولے ہائے ہائے کرنا شروع کیا۔

کلثوم کے کولھوں پر گوشت زیادہ تھا، جب مسعود کا پاؤں اس حصے پر پڑا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اُس بکرے کے گوشت کو دبا رہا ہے جو اُس نے قصائی کی دکان میں اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تھا۔ اس احساس نے چند لمحات کے لئے اُس کے دل و دماغ میں ایسے خیالات پیدا کئے جن کا کوئی سر تھا نہ پیر، وہ ان کا مطلب نہ سمجھ سکا اور سمجھتا بھی کیسے جبکہ کوئی خیال مکمل نہیں تھا۔

ایک دو بار مسعود نے یہ بھی محسوس کیا کہ اُس کے پیروں کے نیچے گوشت کے لوتھڑوں میں حرکت پیدا ہوئی ہے، اسی قسم کی حرکت جو اُس نے بکرے کے گرم گرم گوشت میں دیکھی تھی۔ اس نے بڑی بددلی سے کمر دبانا شروع کی تھی مگر اب اُسے اِس کام میں لذت محسوس ہونے لگی۔ اس کے وزن کے نیچے کلثوم ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ یہ بھنچی بھنچی آواز جو کہ مسعود کے پیروں کی حرکت کا ساتھ دے رہی تھی اُس گمنام سی لذت میں اضافہ کر رہی تھی۔

ٹائم پیس میں گیارہ بج گئے مگر مسعود اپنی بہن کلثوم کی کمر دباتا رہا۔ جب کمر اچھی طرح دبائی جا چکی تو کلثوم سیدھی لیٹ گئی اور کہنے لگی۔ "شاباش مسعود، شاباش — لو اب لگے ہاتھوں ٹانگیں بھی دبا دو، بالکل اسی طرح — شاباش میرے بھائی۔"

مسعود نے دیوار کا سہارا لیکر کلثوم کی رانوں پر جب اپنا پورا وزن ڈالا تو اُس کے پاؤں کے نیچے مچھلیاں سی تڑپ گئیں۔ بے اختیار وہ ہنس پڑی اور دُہری ہوگئی۔ مسعود گرتے گرتے بچا، لیکن اُس کے پیروں میں مچھلیوں کی وہ تڑپ منجمد سی ہوگئی۔ اُس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ پھر اسی طرح دیوار کا سہارا لیکر اپنی بہن کی رانیں دبائے چنانچہ اُس نے کہا۔ "یہ آپ نے ہنسنا کیوں شروع کر دیا — سیدھی لیٹ جائیے میں آپ کی ٹانگیں دبا دوں۔"

کلثوم سیدھی لیٹ گئی۔ رانوں کی مچھلیاں اِدھر اُدھر ہونے کے باعث جو گدگدی پیدا ہوئی تھی اس کا اثر ابھی تک اُس کے جسم میں باقی تھا۔ "نا بھائی — میرے گدگدی ہوتی ہے — تم اوٹ پٹانگ طریق سے دباتے ہو۔"

مسعود نے خیال کیا کہ شاید اُس نے غلط طریقہ استعمال کیا ہے۔ "نہیں، ایکی دفعہ میں پورا بوجھ آپ پر نہیں ڈالوں گا — آپ اطمینان رکھئے، اب ایسی اچھی طرح دباؤں گا کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔"

دیوار کا سہارا لیکر مسعود نے اپنے جسم کو تولا اور اس انداز کو آہستہ آہستہ کلثوم کی رانوں پر اپنے پیر جمائے کہ اُس کا آدھا بوجھ کہیں غائب ہوگیا۔ ہولے ہولے بڑی ہوشیاری سے اُس نے اپنے پیر چلانے شروع کئے۔ کلثوم کی رانوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اُس کے پیروں کے نیچے دب دب کر اِدھر اُدھر پھسلنے لگیں۔ مسعود نے ایک بار اسکول پر تنے ہوئے رسے پر ایک بازیگر کو چلتے دیکھا تھا۔ اُس نے سوچا کہ بازیگر کے پیروں کے نیچے تنا ہوا رسا اسی طرح پھسلتا ہوگا۔

اِس سے پہلے کئی بار اُس نے اپنی بہن کلثوم کی ٹانگیں دبائی تھیں مگر وہ لذت جو کہ اُسے اب محسوس ہو رہی تھی پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بکرے کے گرم گرم گوشت کا اُسے بار بار خیال آتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اُس نے سوچا۔ "کلثوم کو اگر ذبح کر دیا جائے تو کھال اُتر جانے پر کیا اس کے گوشت میں سے بھی دھواں نکلے گا؟" لیکن ایسی بیہودہ باتیں سوچنے پر اُس نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا اور دماغ کو اس طرح صاف کر دیا جیسے وہ سلیٹ کو اسفنج سے صاف کیا کرتا تھا۔

"بس۔ بس" کلثوم تھک گئی۔ "بس۔ بس۔"

مسعود کو ایک دم شرارت سوجھی۔ وہ پلنگ پر سے نیچے اُترنے لگا تو اُس نے کلثوم کی دونوں بغلوں میں گدگدی کرنا شروع کر دی۔ ہنسی کے مارے وہ لوٹ پوٹ ہوگئی۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ مسعود کے ہاتھوں کو پرے جھٹک دے لیکن جب اُس نے ارادہ کر کے اُس کو لات جمانی چاہی تو مسعود اُچھل کر زد سے باہر ہوگیا اور سلیپر پہن کر کمرہ سے نکل گیا۔

جب وہ صحن میں داخل ہوا تو اُس نے دیکھا کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہے۔ بادل اور بھی جھک آئے تھے۔ پانی کے ننھے ننھے قطرے آواز پیدا کئے بغیر صحن کی اینٹوں میں آہستہ آہستہ جذب ہو رہے تھے۔ مسعود کا جسم ایک دلنواز حرارت محسوس کر رہا تھا۔ جب ہوا کا ٹھنڈا

ٹھنڈا جھونکا اس کے گالوں کے ساتھ مس ہوا اور دو تین ننھی ننھی بوندیں اس کی ناک پر پڑیں تو ایک جھرجھری سی اُس کے بدن میں لہرا اُٹھی۔ سامنے کوٹھے کی دیوار پر ایک کبوتر اور ایک کبوتری پاس پاس پر پھلائے بیٹھے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم پخت کی ہوئی ہنڈیا کی طرح گرم ہیں۔ گل داؤدی اور نازبو کے ہرے ہرے پتے اوپر لال لال گملوں میں نہا رہے تھے۔ فضا میں نیندیں گھلی ہوئی تھیں، ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے اور انسان کے اردگرد نرم نرم خواب یوں لپٹ جاتے ہیں جیسے اونی کپڑے۔

مسعود ایسی باتیں سوچنے لگا جس کا مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ ان باتوں کو چھو کر دیکھ سکتا تھا مگر ان کا مطلب اُس کی گرفت سے باہر تھا، پھر بھی ایک گمنام سا مزا اس سوچ بچار میں اُسے آ رہا تھا۔

بارش میں کچھ دیر کھڑے رہنے کے باعث جب مسعود کے ہاتھ بالکل یخ ہو گئے اور دبانے سے ان پر سفید دھبے پڑنے لگے تو اس نے مٹھیاں کس لیں اور اُن کو منہ کی بھاپ سے گرم کرنا شروع کیا۔ ہاتھوں کو اس عمل سے کچھ گرمی تو پہونچی مگر وہ نم آلود ہو گئے۔ چنانچہ آگ تاپنے کے لئے وہ باورچی خانے میں چلا گیا۔ کھانا تیار تھا، ابھی اُس نے پہلا لقمہ ہی اٹھایا تھا کہ اُس کا باپ قبرستان سے واپس آگیا۔ باپ بیٹے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ مسعود کی ماں اُٹھکر فوراً دوسرے کمرے میں چلی گئی اور وہاں دیر تک اپنے خاوند کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔

کھانے سے فارغ ہو کر مسعود بیٹھک میں چلا گیا اور کھڑکی کھول کر فرش پر لیٹ گیا۔ بارش کی وجہ سے سردی کی شدت بڑھ گئی تھی کیونکہ اب ہوا بھی چل رہی تھی مگر یہ سردی ناخوشگوار معلوم نہیں ہوتی تھی۔ تالاب کے پانی کی طرح یہ اُوپر ٹھنڈی اور اندر گرم تھی۔ مسعود جب فرش پر لیٹا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس سردی کے اندر دھنس جائے جہاں اُس کے جسم کو راحت انگیز گرمی پہونچے۔ دیر تک وہ ایسی ہی شیر گرم باتوں کے متعلق سوچتا رہا جس کے باعث اُسکے پٹھوں میں ہلکی ہلکی سی کھو... پیدا ہو گئی۔ ایک دو بار اُس نے انگڑائی لی تو اُسے مزا آیا۔ اُسکے جسم کے کسی حصے میں، یہ اس کو معلوم نہیں تھا کہ کہاں، کوئی چیز اٹک سی گئی تھی، یہ چیز کیا تھی اس کے متعلق بھی مسعود کو علم نہیں تھا۔ البتہ اس اٹکاؤ نے اُسکے سارے جسم میں اضطراب، ایک دبے ہوئے اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس کا سارا جسم کھنچ کر لمبا ہو جانے کا ارادہ بن گیا تھا

دیر تک گدگدے قالین پر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ اُٹھا اور باورچی خانہ سے ہوتا ہوا صحن میں آنکلا۔ نہ کوئی باورچی خانے میں تھا اور نہ صحن میں۔ اِدھر اُدھر جتنے کمرے تھے سب کے سب بند تھے۔ بارش اب رُک گئی تھی۔ مسعود نے ہاکی اور گیند نکالی اور صحن میں کھیلنا شروع کر دیا۔ ایک بار جب اُس نے زور سے ہٹ لگائی تو گیند صحن کے داہنے ہاتھ والے کمرے کے بند دروازے پر لگی۔ اندر سے مسعود کے باپ کی آواز آئی "کون؟"

"جی میں ہوں — مسعود!"

اندر سے آواز آئی "کیا کر رہے ہو؟"

"جی کھیل رہا ہوں"

"کھیلو..." پھر تھوڑے سے توقف کے بعد اُسکے باپ نے کہا۔

"تمہاری ماں میرا سر دبا رہی ہے — زیادہ شور نہ مچانا"

یہ سُنکر مسعود نے گیند وہیں پڑی رہنے دی اور ہاکی ہاتھ میں لئے سامنے والے کمرے کا رُخ کیا۔ اس کا ایک دروازہ بند تھا اور دوسرا نیم وا — مسعود کو ایک شرارت سوجھی۔ دبے پاؤں وہ نیم وا دروازے کی طرف بڑھا اور دھماکے کے ساتھ دونوں پٹ کھول دئے۔ دو چیخیں بلند ہوئیں اور کلثوم اور اس کی سہیلی بملا نے جو کہ پاس پاس لیٹی تھیں، خوفزدہ ہو کر جھٹ سے لحاف اوڑھ لیا۔

بملا کے بلاؤز کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور کلثوم اس کے عریاں سینے کو گھور رہی تھی۔

* * * * * *

مسعود کچھ سمجھ نہ سکا، اُس کے دماغ میں دھواں سا چھا گیا۔ وہاں سے اُلٹے قدم لوٹ کر وہ جب بیٹھک کی طرف روانہ ہوا تو اُسے معاً اپنے اندر ایک اتھاہ طاقت کا احساس ہوا جس نے کچھ دیر کے لئے اُسکی سوچنے سمجھنے کی قوت بالکل کمزور کر دی۔

بیٹھک میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر جب مسعود نے ہاکی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھٹنے پر رکھا تو یہ سوچا کہ ہلکا سا دباؤ ڈالنے پر ہاکی میں خم پیدا ہو جائے گا اور زیادہ زور لگانے پر ہینڈل چٹاخ سے ٹوٹ جائے گا۔ اُس نے گھٹنے پر ہاکی کے ہینڈل میں خم تو پیدا کر لیا مگر زیادہ سے زیادہ زور لگانے پر بھی وہ ٹوٹ نہ سکا۔ دیر تک وہ ہاکی کے ساتھ کشتی لڑتا رہا۔ جب تھک ہار گیا تو جھنجلا کر اُس نے ہاکی پرے پھینک دی۔

سعادت حسن منٹو

باغِ ہر رنگ

تغزل:-

نگاہِ مست کو مصروفِ ناز رہنے دے ۔۔ کچھ اور روز مجھے پاکباز رہنے دے
رد کیے اپنی مست نظروں کو ۔۔ ساری دنیا خراب ہوتی ہے
رحمت کی شان، شکر کے آنسو بہا کر دیکھ ۔۔ یعنی ہجومِ غم میں کبھی مسکرا کے دیکھ
اک ذرا سی اُمید پر یہ حال ۔۔ آدمی کی خوشی کو کیا کہیئے
غم سے گھبرا کر پکارا شادمانی چاہیئے ۔۔ اے دلِ بے تاب! تجھ کو شرم آنی چاہیئے
جب اُن کو مجھے اپنی محفل میں بلانا تھا ۔۔ پہلے مری نظروں کو آداب سکھا دیتے
اُس بزم کو یارب نظرِ بد سے بچانا ۔۔ وہ بزم کہ جس بزم میں ماہر کی کمی ہے

پیام:-

قفس کی فضا میں برابر ہیں دونوں ۔۔ کبوتر کی منقار، شاہیں کا بازو
جب تک کہ براہیم کی فطرت نہ ہو پیدا ۔۔ وجدان بھی آذر ہے، تخیل بھی ہے نمرود
تہائے فقر میں کونین پر حکومت کر ۔۔ خودی کی موت ہے آرائشِ در و محراب
نگاہ پست، یقیں خود فروش، دل تاریک ۔۔ کیا ہے دہر کو تہذیبِ مغربی نے خراب
جذب کر سکتی نہیں شبنم کو سورج کی کرن ۔۔ فطرتِ شبنم میں بس جائے اگر خوئے شرار

رومان:-

ادھر سے تو بھی کوئی جامِ آتشیں چھلکا ۔۔ گھٹا کی چھاؤں سر کو ہسار ہے ساقی
تاروں میں محبت کا جہاں ڈھونڈ رہا ہوں ۔۔ گذری ہوئی راتوں کے نشاں ڈھونڈ رہا ہوں
پانی سے چھلکتی ہوئی گاگر کو اُٹھایا ۔۔ لیتے ہوئے معصوم ہواؤں کا سہارا

قندِ پارس:-

رشکِ صنوبر و گلاب غیرتِ لالہ و سمن
من کہ خزانِ باغِ خود، تو کہ بہارِ ہر چمن

ماہر القادری؛

غزل

جوشِ گنہ پہ ناز کئے جا رہا ہوں میں ۔۔ رحمت کو بے نیاز کئے جا رہا ہوں میں
اُن کی نظر سے ساز کئے جا رہا ہوں میں ۔۔ دل کو امینِ راز کئے جا رہا ہوں میں
عکسِ جمالِ یار ہے وہمِ نمود و بود ۔۔ بے سود امتیاز کئے جا رہا ہوں میں
پردے اُٹھا رہا ہوں طلسمِ حیات کے ۔۔ سعیِ کشودِ راز کئے جا رہا ہوں میں
اب ہر نفس ہے اک پیامِ خلوصِ شوق ۔۔ ہستی پہ اپنی ناز کئے جا رہا ہوں میں

ناشاد ہر نفس ہے محبت کی داستاں
آہِ نفس نواز کئے جا رہا ہوں میں

سری دھر پرشاد ناشاد

التجا

قفس میں طائرِ سدرہ نشیں کا حال نہ پوچھ ۔۔۔ کجا نحوستِ زندان کجا فضائے چمن
حیاتِ موجِ چمن، سرخوشی و سرمستی ۔۔۔ حیاتِ مرغِ قفس درد و سوز و رنج و محن
زراہِ دیدہ دلم پارہ پارہ می ریزد ۔۔۔ نگاہِ لطف سوئے زخمِ دشنہ بار فگن
بگیر قطرۂ ناچیز را و گوہر کن ۔۔۔ تو ئی سحاب و توئی موج بحرِ شورِ عدن
اُٹھا کے ذرۂ پامال کو بھی لیتا چل ۔۔۔ نکل نہ جائے کہیں آنکھیں سمیٹ کر دامن
نشانِ منزلِ مقصود کیا عجب مل جائے ۔۔۔ تو دستگیر شو اے خضرِ پے خجستہ کہ من

پیادہ می روم و ہمرہاں سوارانند!

عبداللطیف تپش۔

سرِ راہے

شام کا رنگیں سماں ہے رونقیں ہیں چار سو ۔۔۔ بولتی ہے جنبشِ مژگاں میں دل کی آرزو
لالہ کاری سے شفق کی ہیں زمیں پر سرخیاں ۔۔۔ بچھ گئی ہیں شعلہ رنگ انوار کی پرچھائیاں
سر بسر اک خواب ساطاری گلستانوں پہ ہے ۔۔۔ پرتوِ رنگِ شفق اونچے صنم خانوں پہ ہے
سیر کرتی پھر رہی ہیں گل رُخوں کی ٹولیاں ۔۔۔ ضو فشاں جلووں سے بھر لی ہیں نظر نے جھولیاں
سبزۂ بیگانہ اور وہ مرمریں طرزِ خرام ۔۔۔ دیدۂ حسن آشنا کو ہے قیامت کا پیام
یہ سماں وہ ہے کہ ہوتے جاتے ہیں طائر خموش ۔۔۔ اب فضا میں ہے نوائے دلبراں لذت فروش
جس طرف دیکھو جھلک ہے جس طرف سونگھو مہک ۔۔۔ بارشیں جلووں کی ہیں آنکھوں میں اور دل میں کسک
ہے جہالت کی جبیں پر سایۂ گیسوئے علم ۔۔۔ جامۂ دیوانگی سے آرہی ہے بوئے علم
جلوۂ عقل و خرد ہر سو تجلی ریز ہے ۔۔۔ شانۂ کون و مکاں پر زلفِ عنبر بیز ہے

گم نظر تہذیبِ نو کی جلوہ افشانی میں ہے
اور دل ڈوبا ہوا ذوقِ ہوس رانی میں ہے

اختر ہوشیارپوری!

قطعات

دردِ نغمہ:- سیلاب [illegible] جیسے تھما جاتا ہے ۔۔۔ نبضوں میں مری خون جما جاتا ہے
یہ کس کے شکستہ دل کی تانیں ہیں نسیم ۔۔۔ یہ کس کا شباب لے میں بہا جاتا ہے

محرومی:- کانٹوں کی سرشت میں لطافت کیسی ۔۔۔ اس کار گہِ غم میں فراغت کیسی
شعلہ میں نسیمِ موجِ کوثر کیسے ۔۔۔ دنیا ہے یہ دنیا ہے مسرت کیسی

صفیہ شمیم ملیح آبادی

مشین

آج زہرہ سر بسر تھیں تم تو فردوسِ نظر
ساق پیشانی پہ تری ضیائے ماہتاب
بانہیں گھٹنے پہ جیسے رخسار رنگیں کنول
شوخ پورب کی ہوا آنچل کو سرکاتی ہوئی
زلف کی لٹ رخ پہ لہراتی ہوئی عشرت نشاں
گنگناتی چوڑیاں تھیں دستِ نازک کی رہین
سی رہی تھیں تم کسی بچے کا اک رنگیں فراک
کام کی دُھن، مہر کا جذبہ، تفکر کا اثر
کھیلتی تھی پھول سے لب پر کبھی موجِ سرور
حُسن و الفت کے اثر سے قلبِ آہن تھا گداز
انبساط آگیں ترنم تھا فضا میں موج زن
گُند اس منزل میں آلامِ جہاں کے نوکِ خار
یوں تو ہر دم دل ہے غم کے بار سے نام کناں
کیا دکھاؤں تم کو اے جان مسرت دل کے داغ
آہ یہ دُنیا، یہ کشت و خوں کے میداں، یہ فساد
زندگی پامالیوں سے دن کو ہے ڈرتی ہوئی
کانپتا ہوں خوف سے اُس دن کہ اے دل کے قرار
الاماں سرمایہ داری کی نگاہِ زہرناک
مفلسی کے جور سے پیسوں میں بکتی ہے حیات
الحذر! سرمایہ کے قبضہ میں جب آئے مشین
پڑ رہا ہے عصرِ نو پر برق و آہن کا وبال
ہے مگر لوہے کی فطرت میں بھی اندازِ جمیل
تم نے زہرہ بھر دیا دلکو مرے پھر آس سے
جانتا تھا میں کہ لوہے سے برس سکتے ہیں پھول
کون کہتا ہے؟ مشینیں باعثِ افلاس و جنگ
مانع ہے رُوح کی جولانگہِ علم و عمل

پُرسکوں چہرے پہ نورِ سرمدی تھا جلوہ گر
مطمئن نظروں میں نغمہ زن محبت کا رباب
نرم رَو موجوں کی طرح! بہ روشِ گیسو کے بل
ٹھیک تم کرتیں اُسے رہ رہ کے شرماتی ہوئی
رُوح کی تسکین جیسے پرچمِ امن و اماں
رقص پر دستے کے وہ گاتی ہوئی "سنگر مشین"
پیار کی نکہت میں ڈوبا تھا تمہارا انہماک!
عشرتِ تدبیر سے تھا رنگِ رُخ نورِ سحر!
ناچتا تھا گاہ انگڑائی میں شیریں ساغرِ ور
پُرزہ بے جان اشارے سے تمہارے گل طراز
دُور ہوتی جا رہی تھی رُوحِ دل کی سب تھکن
چین پاتا ہے تمہارے پاس یہ قلبِ فگار
اپنے دُکھ، ہمدردیٔ مظلوم اور فکرِ جہاں
ہو تہِ دامن چُھپا جیسے کوئی جلتا چراغ
حیف یہ تہذیبِ حاضر کا نظامِ بدنہاد
رات کی تنہائیوں میں سسکیاں بھرتی ہوئی
جب تمہارے سُکھ کو بھی کر لے نہ یہ ناگن شکار
کر رہی ہے مشرق و مغرب میں انساں کو ہلاک
جنگ کے مقتل میں ملتی ہے اسے غم سے نجات
چیخ اٹھتی ہیں فضائیں، خون روتی ہے زمیں
روز افزوں مادیت سے ہے انساں کا زوال
برق کی سوزش محبت سے ہو گلزارِ خلیل
علم کو زندہ کیا تم نے نئے احساس سے
آج میں نے اس حقیقت کو کیا دل سے قبول
اس ہلاکت کا سبب غارِ وطنیوں کی دل کا زنگ
کھلتا ہے فتحِ عناصر سے مرے دل کا کنول

دل مگر کیفِ محبت کے نشہ سے چور ہو
پھر تو یہ ظلمت کدہ رشکِ نہالِ طور ہو

اختر اورینوی

رابندر ناتھ ٹھاکر

تمہید:- رابندر ناتھ کی وفات سے بنگال کا سب سے بڑا ادیب و شاعر، ہندوستان کا قابل فخر محب وطن، جس نے نصف صدی تک ملک کی ہر جہتی قومی تحریکات میں قابل ذکر حصہ لیا، ہم سے رخصت ہو گیا۔ دُنیا ایک ایسے زعیم سے محروم ہو گئی جس نے اپنی ساری عمر روابط انسانی کے ارتباط اور تہذیب ملل کو یکجا و ہم آہنگ کرنے میں صرف کی تھی۔

ٹیگور کو بنکم چندر چٹرجی، گریش گھوش، مدھو سدن دت، اور دوجندر ناتھ لال رائے جیسے پیشرووں کی امانتِ ادب ملی تھی۔ اور بعض حالتوں میں وہ ان سب سے مجموعی طور پر بڑا تھا۔ کیونکہ اس کی غیر معمولی طباع ذہنیت ہر شعبۂ ادب میں نمایاں تھی۔ نہ صرف شاعر کی حیثیت سے وہ ایک بلند پایہ حیثیت کا مالک تھا بلکہ نغمہ ساز (Composer) کی حیثیت سے بھی اس کو ایک نابغہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کا نغمہ ساری کائنات سے ہم آہنگ تھا، یہی وجہ تھی کہ اس کے نغمات کچھ ایسے دلنشیں ثابت ہوئے کہ آناً فاناً سارے بنگال میں مقبول خاص و عام ہو گئے۔ اور پھر اُس کی شہرت اور زمینوں اور ملکوں میں بھی اپنا خراج وصول کرنے کے لئے نکل گئی۔ بہت کم نغمہ سازوں کو ایسی خوش بختی نصیب ہوئی ہو گی۔ واقعی لغوی طور پر اُس نے اپنے عوام کے اُداس اور ملول تصورات کو پُر اُمید نغموں کی شراب میں غرق کر دیا۔

ناول نویس کی حیثیت سے وہ بنکم چندر چٹرجی اور سرت چندر چٹرجی کے ہمدوش نظر آتا تھا۔ گو یہ ماننا پڑیگا کہ آخر الذکر اپنی زندگی ہی میں ٹیگور سے کہیں سر بلند نظر آیا اور اس کے منصب پر ٹیگور کسی عنوان نہ پہونچ سکا۔ کیونکہ جو فطری واقعیت بنگال کے دیہات کی ترجمانی کے باب میں ہمیں سرت کے ہاں ملتی ہے وہ غیر معمولی نزاکتوں اور صلاحیتوں سے لبریز ہے۔ ہاں البتہ مختصر افسانہ کی سرزمین پر کوئی اور تاجدار ٹیگور کا مقابلہ کرنے کیلئے ہمیں نہیں دکھائی دیتا۔ چند افسانہ نویس کہیں کہیں اس سے بڑھ جاتے ہیں۔ مختصر افسانے کے ذریعے ٹیگور نے لوگوں کے دلوں کا وہ تار چھیڑ دیا تھا جو مدت سے ایک فوقانی ضرب انداز کے زخمہ کا منتظر تھا۔ اس نے مختصر افسانہ کے ذریعے کہیں زیادہ وسیع دائرۂ انسانی کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اسکے ڈرامے، فلسفیانہ مضامین، لکچر، خطوط جو اس کی زندگی کے آخری حصہ میں اس قدر زبردست سیلاب کے ساتھ پے بہ پے اُمنڈ اُمنڈ کر صفحۂ قرطاس پر پھیلتے چلے گئے، ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ایک حقیقی عالمگیر انسانیت کا داعی اور مرنجان مرنج انسان تھا۔ ایک شدید احساس ہمدردی کا دم اس کے قلب میں موجزن رہتا تھا۔

جب تک کہ ٹیگور ایک صوبائی شاعر رہا اس کے نغمات بنگال تک محدود رہے۔ اور وہاں بھی سرد مہری، معاندانہ چشمک اور معاصرانہ نکتہ چینی سے وہ نہ بچ سکا۔ مگر جب اس کے کلام روحانی کا پہلا انگریزی مجموعہ ۱۹۱۳ء میں "گیتان جلی" کے نام سے شائع ہوا اور اس پر نوبل کا انعامِ ادب عطا ہوا تو ساری دُنیا کی نگاہیں اس نابغہ کی طرف جھک پڑیں۔ ہندوستان اور تمام دنیا انجہانی مسٹر ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس۔ (W. B. Yeats) کی ہمیشہ ممنون رہے گی کہ انہی کی کوشش سے "گیتان جلی" نے شاعر کی لاابالی طبیعت کی دستبرد سے نجات پائی اور دُنیا اس بیش بہا خزانہ سے مالا مال ہوئی۔ کتاب کا چھپنا تھا کہ ایک طوفان بپا ہو گیا اور دُنیا ٹیگور کی تعریف میں مصروف ہو گئی۔ انگریزی ادب میں (Lyricism) "غزلیت" کا مضمون اب تک مشتمل رہا تھا صرف انسانی احساسات و جذبات کے اظہار پر بالخصوص عشق کے اظہار پر جیسا کہ پالگریو (Palgrave) کے "منتخبات شعرائے انگلستان" سے یہ امر واضح ہے۔ گو ممکن ہے شیلے اور ورڈز ورتھ کے کچھ ...

شعری کو اس ضمن سے علیحدہ بھی سمجھا جاتے مگر یہاں معاملہ ایک بالکل نئی نوعیت کا تھا۔ ہمارا شاعر خدا کے حضور میں وہ جذبات اور اسلوب تکلم اختیار کرتا ہے جو آپ تک صرف محدود تھا ایک شدید عشق کے اظہار کے لئے۔ سوائے ایک دنیاوی عاشق کے جو صرف اپنی محبوبہ ہی کے لئے استعمال کرسکتا تھا۔ اب تک یہ اسلوب بیان اور کسی جگہ استعمال نہیں کیا گیا تھا۔

ٹیگور کی گیتان جلی کا کچھ حصہ اردو میں عبدالرحمن بجنوری نے کیا تھا اور اس کے بعد واحدی صاحب کے ایماء پر اس کا ترجمہ مولانا نیاز فتحپوری نے تمام و کمال کیا۔ اس کے بعد بھی کچھ تراجم اردو میں جستہ جستہ منتقل ہوئے لیکن قابل ذکر ترجمہ صرف نیاز کا ہے۔ نیاز، مرحوم خلیقی دہلوی اور شاہ دلگیر نے ٹیگوری طرز تحریر کی بنیاد اردو میں ڈالی اور ایک عرصے تک اردو پر اس نوع کی تحریروں کا سایہ قائم رہا جو رفتہ رفتہ کم ہوگیا۔

ٹیگور کے بے شمار مضامین افسانے، ڈرامے اور کئی ناول اردو میں ترجمہ ہوگئے ہیں۔ لیکن اس کی تحریروں میں ابھی تک بہت سی ایسی کارآمد چیزیں باقی ہیں جو ترجمہ کے لائق ہیں۔ بنگلہ سے براہِ راست ترجمہ کرنے والوں کے لئے اردو کو اس بیش بہا خزانہ سے مالامال کرنے کیلئے متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔

پیدائش:۔ بمقام کلکتہ۔ ۶ دوارکا ناتھ ٹیگور لین۔ قدیمی حویلی ٹیگور خاندان۔

والد کا نام:۔ مہرشی دیبندر ناتھ ٹیگور۔

والدہ کا نام:۔ شریمتی شاردا دیوی۔

عمر:۔ ۸۰ سال تین ماہ۔

تاریخ وفات:۔ بمقام کلکتہ، قدیمی حویلی ٹیگور خاندان۔ بتاریخ ۷ راگست ۴۱ء بوقت دوپہر ۱۲ بجکر ۱۳ منٹ۔

(کلکتہ ٹائمز)

ٹیگور سے

ذرّہ ہے مہرِ منیر، قطرہ ہے ماہِ تمام
مطلعِ انوار ہیں تیری نظر کے مقام

لیلیِٰ فطرت کا رُخ تو نے کیا بے نقاب
تیری بدولت ہوئی جلوہ گہ خاص، عام

حُسن کو تُو نے سکھائے نغمۂ سازِ الست
عشق کو تُو نے دیا تحفۂ سوزِ تمام

تُو نے خرد پر کئے رمزِ جنوں آشکار
تُو نے جنوں کو دکھائے عقل و خرد کے مقام

تیرے تخیّل نے کی دہر کی صورت گری
تیرا تصوّر ہوا نقش گرِ صبح و شام

تھا ترے احساس میں پرتوِ نورِ ازل
تھا ترے ادراک میں جلوۂ حسنِ دوام

تھا ترا شوقِ طلب ہر قدم منزل فروز
تھا ترا ذوقِ نظر جلوۂ بالائے بام

تیری ہر اک نثر ہے مطربِ شعلہ نفس
تیری ہر اک نظم ہے ساقیِ آتش بہ جام

موت نے ٹیگور فاش کر دیا تیرا یہ راز
عشق بقا آفریں عشق بقائے دوام

تابش دہلوی

ٹیگور — انسان اور ادیب

مختصر سوانح اور ادبی سرگرمیاں

پیدائش، تعلیم اور بچپن

رابندر ناتھ ٹیگور ۶ مئی ۱۸۶۱ء کو اپنے قدیمی مکان ۶ گلی بابو دوارکا ناتھ ٹیگور کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ کا نام مہرشی دیبندر ناتھ ٹیگور اور ان کی والدہ کا نام شریمتی شاردا دیوی تھا۔ ۱۸۶۹ء میں جبکہ ان کی عمر ۸-۹ برس کی تھی انہیں ایک قدیمی طرز کے مکتب میں داخل کیا گیا۔ جہاں چند مہینے رہنے کے بعد وہ کلکتہ کے نارمل سکول میں داخل ہوئے۔ تعلیم کے دوران میں انہیں کشتی لڑنے اور جمناسٹک کرنے کا بہت شوق رہا۔ دس سال کی عمر ہوگی کہ انہیں بنگال اکیڈمی میں داخل کیا گیا۔ یہ ایک اینگلو انڈین سکول تھا اور وہ رابن کو سخت ناگوار معلوم ہوتا تھا۔ سارے ہم جماعتوں میں وہ "بھگوڑے" کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ بولپور (بنگال) میں ۲ ایکڑ رقبہ کی زمین ان کے والد نے کئی سال ہوئے کہ خریدی تھی اور وہ یہاں ایک آشرم بنانا چاہتے تھے۔ ۱۲ سال کی عمر میں وہ اس مقام پر آئے اور اسی زمانے میں "پرتھوی راجہ پرجا" نامی نظم لکھی۔ اس نظم کی اصل اب گم ہو چکی ہے۔ اسکے کچھ عرصے بعد وہ اپنے والد کے ساتھ تمام شمالی ہندوستان کا دورہ کرنے نکلے۔ سفر کے دوران میں نیز بعد میں بھی ان کے والد نے رابن کو سنسکرت انگریزی اور فلکیات کے مضامین خود پڑھائے۔ ۱۸۷۴ء میں وہ کلکتہ واپس آئے اور انہیں سینٹ ایکس ویئر سکول میں داخل کیا گیا۔ پرائیویٹ اتالیق علیحدہ تعلیم دیتے رہے۔ اسی زمانے میں انہوں نے "میکبتھ" کا انگریزی سے بنگلہ زبان میں ترجمہ کیا جو مقبول ہوا۔

ابتدائی شاعری

۱۸۷۵ء میں ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ اسی زمانے سے انہوں نے بنگالی رسالوں میں نظمیں چھپوانی شروع کیں۔ ۱۸۷۶ء میں ایک "ہندو میلا" ہوا جس میں لارڈ لٹن کے "دہلی دربار" کی بھد اڑائی گئی تھی۔ جو یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو لاٹ صاحب نے منعقد کیا تھا۔ حالانکہ سارا ملک اس وقت نہایت سخت قحط کے عذاب میں مبتلا تھا۔ اس زمانہ میں ٹیگور ایک قلمی نام "بھانو سمہا ٹھاکر" کے تحت اپنا کلام شائع کراتے تھے۔ (لفظ ٹیگور قدیم انگریزوں نے "ٹھاکر" کو بگاڑ کر بنایا تھا جو بعد میں مقبول انام بن گیا) اسی زمانے میں ان کے مضامین اور متنوع ادبی کارناموں سے بنگالی دنیا واقف ہو چکی تھی: "انگریزی آداب و قرائن"، "اینگلو سیکسن قوم اور ان کا ادب"، "بیٹرس اور ڈانٹے"۔ چند نظمیں جیسے "بھارن"، "کوئی کہاں" وغیرہ ایسی معرکہ کی ہوئیں کہ سارا بنگال اس نووارد شاعر کے نام سے آشنا اور اس کے کلام کو پڑھ کر چونک پڑا۔

یورپ

عمر ۱۷ سال کی ہوگی کہ وہ اپنے بڑے بھائی ستیندر ناتھ ٹیگور (آئی۔ سی۔ ایس) کے پاس احمد آباد چلے گئے۔ ان کے ساتھ وہ یورپ گئے اور برائٹن کے سکول میں انہیں داخل کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ یونیورسٹی سکول لندن گئے اور یہاں انہوں نے انگریزی ادب سے لگاؤ پیدا کیا۔ انہوں نے گلیڈسٹون اور برائیٹ کو خود اپنے کانوں سے سنا۔ پروفیسر مارلے کی نگرانی میں ان کے ادبی ذوق کی نشوونما ہوئی۔ ادھر "برٹش میوزیم" کے کتبخانوں اور عجائبات نے ان کے دماغ میں علمی روشنی پیدا کی۔ اسی زمانے میں انہوں نے بنگالی رسالوں کے لئے بیش قیمت مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی زمانے کی سب سے اہم تصانیف "یورپ کے ایک مسافر کے خطوط" اور "بھاگنا ہردے" اور چند دیگر نظمیں ہیں۔ ۱۸۸۰ء میں وہ ہندوستان واپس آگئے۔ ولایت سے کوئی تعلیمی سند لیکر نہ آئے لیکن دماغ میں علم کی روشنی۔ خیالات میں استواری اور قدامت پرستی اور رسم نوازی کے خلاف ایک ایسا شعلۂ بغاوت پرورش کر لیا اس زمانے میں کہ وہی ان کی آئندہ شاعری کا سنگ بنیاد ثابت ہوا۔ ۱۸۸۱ء میں انہوں نے اپنا سب سے پہلا گیت ناٹک "بالمیکی پرتبھا" مکمل کیا اور خود اس میں بالمیکی کا کام کیا۔

اس چیز نے بنگال اور دیگر اہل نظر کو یہ جتا دیا کہ ادب کے دائرے میں ایک نیا آتش فشاں پھٹنے والا ہے جو ادب کی جاہلیت کو خس و خاشاک کی طرح جلا ڈالیگا۔

سیاست

صرف ادب اور ڈرامہ نویسی ان کا مشغلہ نہ تھا سیاست کا چسکا انہیں حال ہی میں پڑا تھا۔ اس زمانہ میں مسئلہ [illegible] پر تھا جس میں انگریز [illegible] فروشی کے سلسلے میں جو کچھ کر رہے تھے اگر اس کے خلاف [illegible] ہے تو کل کلکتہ یونیورسٹی کے میڈیکل [illegible] کے علمی موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں۔ غرض رابندر ناتھ کی زندگی بوقلموں عجائبات کا رنگین اور بعید [illegible] مرقع تھا۔

گھر کے لوگوں نے ما ر باندھ کر پھر انہیں ولایت بھیجنے کی تجویز کی۔ یہ جہاز میں روانہ بھی ہو گئے مگر مدراس سے ہی واپس آ گئے۔ گھر کے بڑے بہت ناراض ہوئے مگر باغی ٹیگور نے کسی کی پروا نہ کی اور اپنی شاعری میں دن رات غرق رہے۔ "بھارتی" اور پہلا ناول "درا چندا" "نئی رانیوں کا بازار" "سگھیہ سنگیت" اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

"جلوہ طور" نظر آیا

اس وقت ان کی عمر ۲۱ سال کی تھی کہ انہیں جمالِ خداوندی یا ایک روحانی جلال نظر آیا جو اکثر ان کی شاعری میں جھلکتا رہا۔ اس کا واقعہ یوں ہے کہ ایک روز وہ اپنے مکان نمبر ۱۰ صدر بازار میں ایک کٹہرے میں کھڑے ہوئے تھے کہ انہیں ایک "جلوہ" ([illegible]) دکھائی دیا جس نے بقول خود "ان کی آنکھیں کھول دیں اور دنیا کو بالکل آئینۂ مصفا کی طرح ان کو دکھا دیا۔ غیر اہم مقامات زندگی میرے لئے وزنی اور اہم بن گئے اور میں زندگی کے ان مقامات کے سفر میں منزل بہ منزل مشغول ہو گیا۔" اس "جلوہ" کا فوری تاثر، جو نظم کی شکل میں نمودار ہوا وہ "چشمہ کی جاگ!" تھا۔ ایک سال بعد انہوں نے مرنالنی دیوی سے شادی کر لی۔ اسی زمانے میں ان کو اپنی زندگی کا پہلا صدمۂ عظیم اپنے بھائی جوت اندرا ناتھ کی بیوی کی وفات سے پہونچا اور جیسا کہ ہم دیکھیں گے شاعر ٹیگور کے اندرونی شعلہ کو ہمیشہ ایسے ہی صدمات عظیم اکساتے رہے ہیں۔ چنانچہ اس موقع پر بھی ٹیگور کے قلم سے ادب انشا کے ایسے نوادر کا غذ پر آ گئے کہ اور کسی حالت میں شاید کبھی نہ پیدا ہو سکتے۔ شیلے، ایلزبتھ، بیرٹ، براوننگ اور دیگر انگریزی شعرا کے کلام کا بنگلہ ترجمہ بھی اسی عہد کی "ادبی بارش" کی یادگار ہے۔ اسی زمانہ میں بنکم چندر چٹرجی مشہور ناول نویس سے ان کی [illegible] تحریک کے موضوع پر خوب چلی۔ سنتری ڈرامہ "نلینی"

اور وشنو شعرائے عہد وسطیٰ کی طرز پر کچھ نظمیں بھی اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ ڈرامے، افسانے، مضامین، مزاحیہ سکیچ، عاشقانہ چیزیں، غرض کہ نا شعری ادب ایسا تھا جس میں ٹیگور کا قلم گہر رقم اپنے جوہر نہ دکھا رہا تھا۔ ایک طوفان تھا کہ امنڈا چلا آ رہا تھا۔ طبیعت موزوں، دماغ حاضر، قلم برجستہ زبان پر عبور اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "ستائشِ انام" نے ہمتیں بلند اور ارادے مستحکم تر ہوتے چلے گئے۔ اور اس عہد نے ٹیگور کو بنگالی مسلمات ادب میں جگہ دلوا دی۔

کانگریس

۱۸۸۶ء میں اُن کا پہلا لڑکا مدھرلتا پیدا ہوا۔ ابھی وہ ادب کے میدان میں نصف منزل طے کر پائے تھے کہ سیاست کے خارستان نے پھر اُن کا دامن کھینچا اور ایسا ہو چلا تھا کہ سیاست کا خارستان اُن کے ادبی چمن کو لے بیٹھے مگر حالات نے خود ہی کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ ادب نے اُنہیں نہ چھوڑا اور وہ ادب سے کچھ ایسے اُلجھے کہ اُلجھ کر رہ گئے۔ اور پھر کسی دوسری شراب نے انہیں مست نہ بنایا۔

۱۸۸۶ء میں دادا بھائی نوروجی کی صدارت میں کلکتہ میں کانگریس کا جلسہ ہوا۔ یہاں انہوں نے خود ود نظم پڑھی جس کا پہلا مصرع اس مضمون کا ہے:۔

"ماں کے بلاوے پر ہم یہاں آج سب جمع ہیں!"

۱۸۸۸ء میں ان کے والد نے شانتی نکیتن ("دار الامان") جو بول پور میں انہوں نے آشرم بنانے کے لئے لی تھی، رابندر ناتھ کے نام منتقل کر دی۔ اسی سال ان کا دوسرا لڑکا رتھ اندر ناتھ ٹیگور پیدا ہوا۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد انہوں نے مشہور زمانہ ڈرامہ "قربانی" مکمل کیا اور وہ اُن کے خاندانی مکان میں کھیلا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے ٹیگور خاندان کی ساری جائداد اور املاک کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مشہور ڈرامہ نویس کالی داس کے تتبع میں "بادلوں کا پیامی" ایک نظم لکھی جس کی ندرت و اسلوب نے سارے بنگال میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ اسی سال وہ یورپ پھر گئے۔ اٹلی، فرانس اور انگلستان کا دورہ کیا اور واپس آ کر "شیلی دہ" نامی گاؤں میں جا کر رہے جو ٹیگور خاندان کی زرعی راجدھانی تھی۔ یہاں انہیں اہل زراعت مزدور طبقہ، غریب اور بیکس انسانوں کے حالات بچشم خود دیکھنے اور ان سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا۔ اور وہ ان کی ذہنی بیداری اور رجحان طبیعت میں اثر انداز ہوا۔ لوگوں کے بیحد سخت اصرار پر انہوں نے اپنے کلام کی اشاعت کے لئے "سادھنا" رسالہ جاری کیا اور ایک

وجہ تھا رنگ بنگال کے تمدنی ارتقا اور اصلاح ادب کا وہ ایک ہی لائق ستائش آئینہ تھا۔ اس رسالے کی ادارت کے دوران ہی میں انہیں اتنا وقت مل گیا کہ "چت رنگدھا" ڈرامہ تصنیف کر لیا۔ اس کا انگریزی ترجمہ ان کے بہترین ادبی کارناموں میں سے شمار کیا جاتا ہے۔ آبنیدر ناتھ ٹیگور نے جو ان کے ہی ایک بھائی تھے، اس کتاب کو مصوّر کیا اور اسی کتاب اور اس کی تصاویر نے آبنیدر ناتھ کو رابندر ناتھ کی طرح آسمان شہرت پر پہونچا دیا۔

اسی زمانے میں ٹیگور کو کچھ تجارت سے شوق ہوا اور اسکی وجہ یہ تھی کہ سنہ ۱۸۹۴-۹۷ء کے تین چار سال ان پر سخت بھاری گذرے تھے۔ خاندانی جائداد تقسیم ہو گئی اور سب نے اپنا اپنا علیحدہ سلسلہ شروع کیا۔ چند چچیرے بھائیوں نے کچھ سودیشی صنعتوں کا سلسلہ شروع کیا تھا اس میں ٹیگور بھی شریک ہو گئے۔ مگر طبیعت نہ لگی اور چھوڑ چھاڑ دیا۔

سنہ ۱۸۹۷ء میں ناٹور کے مقام پر بنگال پراونشل کانفرنس انکے ہی بھائی کی صدارت میں منعقد ہوئی اور انہوں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح یہ لوگ کارروائی جلسہ بنگالی زبان میں جاری کریں مگر کسی نے نہ سنی۔ اور وہ اپنی ناکامی پر بددل ہو کر وہاں سے چلے آئے۔

پھر سیاسی کام

"قانون بغاوت سنہ ۱۸۹۸ء" کے خلاف انہوں نے ایک سخت مضمون لکھا اور کلکتہ ٹاؤن ہال میں جب وہ پڑھا گیا تو ساری بنگالی قوم میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ اس کے بعد کئی اور اہم گرما گرم سیاسی مضامین ان کے قلم سے نکلے۔ بال گنگا دھر تلک کی گرفتاری پر گورنمنٹ کے پیچھے پڑ گئے۔ اور تلک کے مقدمہ کے لئے چندہ جمع کرنے میں تن من دھن سب کچھ نچھاور کر دیا۔ اسکے بعد کے سال میں بھی انکی سیاسی سرگرمیاں جاری رہیں۔

شانتی نکیتن

سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۱۰ء تک رابن ٹھاکر کے قلم سے مضامین اور نظموں کا ایک دریا بے پناہ سیلاب کی صورت میں نمودار ہوا۔ جس میں اس وقت کی ملکی سیاست، اقتصادی حالت اور سماجی برائیوں پر نہایت سخت محاسبہ کیا گیا تھا۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں انہوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے خاندان کو لیکر شانتی نکیتن میں جاکر آباد ہو جائیں گے۔ یہاں آباد ہو کر انہوں نے "شانتی نکیتن سکول" قائم کیا اور لڑکوں کو خود پڑھانا شروع کیا۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں ان پر سخت مالی مشکلات کا حملہ ہوا۔ اور انہیں پوری کے اپنے مکان تک کو بیچنا پڑا۔ بیوی کو اپنا زیور بیچنا پڑا۔ ان کی مالی مشکلات کا بڑا سبب سکول کے اخراجات تھے۔ لارڈ کرزن نے اہل مشرق پر طنز کی تھی۔ ٹیگور نے اس کا دنداں شکن جواب دیکر دنیا میں مشرق کی عظمت کو پھر سے زندہ کیا۔ اور یہ اس سال کا خاص کارنامہ ہے۔ اسی سال ان کی بیوی بیمار پڑیں اور کلکتہ میں ٹیگور خاندان کے قدیم مکان میں انتقال کیا۔

تقسیم بنگالہ اور سیاست سے علیحدگی

اسی زمانے میں تقسیم بنگالہ کا معرکہ گرم ہوا۔ رابندر ناتھ ٹھاکر نے تعمیری عدم تعاون کی تلقین کی۔ مضامین کا ایک سلسلہ اور چند ولولہ انگیز نظموں نے سارے بنگال میں ایک آگ لگا دی۔ جس میں تمام سرکاری کوششوں سے تعمیری عدم تعاون کرنے کی تلقین کی گئی تھی۔ ایک جلسہ میں "قومی فنڈ" کیلئے صرف آدھ گھنٹے میں ۵۰ ہزار روپیہ جمع کر کے دیدیا۔

"بندے ماترم" گانے اور سیاسی جلسوں میں تقریر کرنے پر طلبہ کو بنگال گورنمنٹ نے منع کر دیا تھا۔ اس پر انہوں نے سخت احتجاج کیا اور انسانی دماغ کی آزادی پر، طلبہ کے حقوق علمی و شہری پر اسے سخت ناروا حملہ ثابت کیا اور کئی اسٹوڈنٹ کانفرنسیں ان کی صدارت میں ہوئیں۔ آئندہ سال بنگال کے سیاسی ایجی ٹیشن نے تشدد کا رنگ اختیار کر لیا۔ اس سے وہ بددل ہو گئے۔ ادھر ان کے معاصرین نے جو سیاسی میدان میں کام کر رہے تھے، ان پر سخت نکتہ چینی بھی شروع کر دی۔ ان چیزوں کو دیکھتے ہوئے شانتی نکیتن میں واپس آ گئے اور پالٹیکس سے قطع تعلق کر لیا۔

چند اہم تصانیف

اس علیحدگی سے یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ انہیں ادب کی طرف پھر ہم ایک بار پاتے ہیں۔ "گورا" ناول اور "گیتان جلی" کی نظمیں اسی زمانے میں لکھی گئیں۔ ڈرامہ "پرائشچت" بھی اسی عہد کی یادگار ہے۔ اسی زمانے میں ان کی بنگلہ نظم "بیکار پکار" [illegible] کا پہلا انگریزی ترجمہ نکلا۔ یہ ترجمہ ان کے ایک قریبی دوست لوکن پگت کا تھا۔ اس کے بعد "ماڈرن ریویو" کلکتہ میں ان کی ایک کہانی کا ترجمہ شائع ہوا۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں "پوسٹ آفس" ڈرامہ اور مشہور قومی نظم "جنا گانا مانا" لکھی گئی۔ اس اثناء میں شانتی نکیتن ہندوستانی تہذیب و علم کا ایک مرکز بن چکا تھا اور [illegible]

[illegible] تھی اس نے یہ کہہ کر جانے کیا کہ یہ سکول کسی سرکاری ملازم کے [illegible] لئے موزوں جگہ نہیں ہے۔ اس سال کے آخر میں وہ [illegible] ہو گئے اور یورپ جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنی [illegible] کا ایک مجموعہ انگریزی میں خود ترجمہ کر کے تیار کیا جو بعد میں گیتان جلی (Gitanjali) کے نام سے شائع ہوا۔

تیسرا دورۂ یورپ

آئندہ سال تیسرے دورۂ یورپ کے لئے وہ روانہ ہوئے۔ اس وقت انکے ہمراہ ان کا لڑکا اور لڑکی بھی تھے۔ لندن میں مشہور مصور لتقا روتھن شٹین سے وہ ملے۔ اس سے پہلے بھی اس ہستی سے ہندوستان میں مل چکے تھے۔ دوران گفتگو میں انہوں نے اپنے تراجم کا ذکر کیا اور روتھن شٹین نے اپنے مکان پر ایک مجمع چند ادب دوست احباب کا جمع کیا جس میں ڈبلیو۔ بی یٹس، فدرا پاونڈ، الیس مینل، ارنسٹ رائیس، ہنری نوین، سن اور دیگر ادیب جمع تھے۔ انڈیا سوسائٹی نے گیتان جلی کا ایک محدود ایڈیشن شائع کیا جس پر ڈبلیو بی یٹس کا دیباچہ تھا۔ اس میں روتھن شٹین کا ایک پنسل اسکیچ بھی شامل تھا۔ یہ کتاب بہت جلد دنیا کے شاہکاروں میں شامل ہونے لگی۔ انگلستان سے رابندر ناتھ امریکہ گئے اور شکاگو یونیورسٹی میں کئی لکچر دئے۔ جن کا موضوع تھا "قدیم تہذیب ہند کے تصورات بلیغ"۔ راچسٹر میں انہوں نے "اقوام اور نسل ہائے انسانی کی کانفرنس" میں بھی شرکت کی۔ ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ میں بھی انہوں نے کئی لکچر دئے جو بعد میں "سادھنا" کے نام سے شائع ہوئے۔

پھر وہ انگلستان سے واپس آئے اور ایک چھوٹے سے آپریشن کے لئے ایک نرسنگ ہوم میں داخل ہو گئے۔ ستمبر ۱۹۱۳ء میں انہیں ادب کا نوبل پرائز ملا۔ جونہی یہ خبر کلکتہ پہونچی بہت سے لوگوں نے جنہوں نے ابھی تک ٹیگور کی طرف توجہ کرنے اور اس کی شاعری کو وہ خود اعتنا سمجھنے کی زحمت نہ کی تھی ایک سپیشل ٹرین کا بندوبست کر کے شانتی نکیتن خراج عقیدت و تحسین ادا کرنے کے لئے پہنچے۔ شاعر نے ان کے جوش و خروش پر یہ کہکر ٹھنڈا پانی ڈال دیا کہ تم لوگوں میں سے اکثر ایسے ہیں جنہوں نے اپنی تحسین ظاہر کرنے سے پہلے بدیشی تعریف و تحسین کا انتظار کیا۔ ایسا کرنا ان کے لئے خود ایک پیام مرگ ہے۔

شانتی نکیتن کی مقبولیت

۱۹۱۴ء میں ان کے اعزاز میں لارڈ کارمائیکل گورنر بنگال نے گورنمنٹ ہاؤس بنگال میں دعوت کی اور شانتی نکیتن کو سرکاری طور پر تسلیم کیا گیا۔ لیکن انہیں سب سے زیادہ خوشی اور فخر اس وقت محسوس ہوا جب مہاتما گاندھی نے اپنا قائم کردہ فنا کس سکول فونکس (جنوبی افریقہ) کے سٹاف اور طلبہ کو شانتی نکیتن میں روانہ کیا۔ اسی سال شانتی نکیتن میں مسز کستوری بائی گاندھی بھی آئیں اور ٹیگور کو "سر" کا خطاب بھی عطا کیا گیا۔ ۱۹۱۵ء میں وہ ایک دفعہ پھر امریکہ گئے۔ یل (Yale) یونیورسٹی میں "قومیت" کے موضوع پر لکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔

"قومیت" اور "شہنشاہیت"

اس سفر کی خصوصیت یہ ہے کہ دنیا کی دو بڑی قومیں ٹیگور سے ناخوش ہوئیں۔ جاپان اور امریکہ۔ ہرچند کہ ان ملکوں سے سب باشندوں کے لئے ٹیگور کی کھری کھری باتیں ناگوار نہ تھیں مگر بہت سے لوگ ان باتوں کو ناپسند کرتے تھے۔ چین کے بارے میں جاپان نے جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی، اس کو ٹیگور نے یک قلم برا بھلا کہنا شروع کیا۔ ادھر امریکہ کا انگریز پرست طبقہ ٹیگور کی ان تقریروں سے ناخوش ہوا جو انہوں نے شہنشاہیت کے خلاف امریکہ میں کیں۔ امریکہ کیا ہر ملک میں شہنشاہیت اور رجعت پسند طبقہ میں اس چیز نے مخالفت کی لہر دوڑا دی۔ لیکن غرضمند طبقات کی اس سرد مہری کے باوجود امریکہ میں ٹیگور کا شایان شان استقبال ہوا۔ کوئی تعلیمی و تہذیبی مرکز ایسا نہ تھا جہاں اس کو مدعو نہ کیا گیا ہو اور ایشیائے قدیم کی حکمت و نکات کے اس مبلغ و مبصر سے پیغام روحانی نہ سنا ہو۔

۱۹۱۷ء میں وہ کلکتہ کے اجلاس انڈین نیشنل کانگریس میں شریک ہوئے۔ یہ جلسہ مسز اینی بیسنٹ کی صدارت میں ہوا تھا۔ یہاں انہوں نے اپنی مشہور نظم "ہندوستان کی پرارتھنا" پڑھی۔ اسی موقع پر ان کا ڈرامہ "پوسٹ آفس" اسٹیج کیا گیا۔ جس میں آنجہانی تلک، مہاتما گاندھی، مسز بیسنٹ اور مالوی جی وغیرہ سب بڑے آدمی شریک ہوئے۔ اس کے بعد ایک اور ادبی سیلاب آیا جس کے دھارے میں ہم "میرا بچپن"، "میرا جیون چرتر"، "قربانی" اور دیگر ناٹک دیکھتے ہیں۔ ۱۹۱۸ء خود شاعر کی نظر میں بہت مبارک سال تھا۔ ادبی کارگذاری کے باعث نہیں بلکہ "وشوا بھارتی" (بین الاقوامی یونیورسٹی) کے قیام کے باعث جو اس سال عمل میں آیا۔

"سر" کا خطاب واپس ۱۹۱۹ء میں جلیانوالا باغ امرتسر کا واقعہ فاجعہ پیش آیا اور اس ضمن میں رابندر ناتھ نے جو روش اختیار کی وہ قابل لحاظ ہے۔ اس زمانے میں وہ ایک بیمارک سے حال ہی میں آئے تھے کہ اس واقعہ کی اطلاع انہیں ملی۔ انہوں نے وائسرائے کو ایک خط لکھا کہ جو مظالم کئے گئے ہیں مجھے اُن پر سخت ملال ہے اور یہ نشانِ عزت یعنی "سر" کا خطاب بطریق احتجاج واپس کرتا ہوں۔

ولایت میں جو لوگ پہلے ٹیگور کی شاعری کے مداح تھے شاعر کی ان سرگرمیوں سے بدظن ہو گئے اور جب وہ ولایت پھر گیا تو یہ مدح سرایان ادب سیاسی اور نسلی افتخار و وقار کے باعث شاعر سے ملے تک نہیں۔ لیکن انگریزوں نے جو علیحدگی و سرد مہری برتی اس کی تلافی یورپ کے دیگر ممالک میں ہو گئی۔ فرانس، ہالینڈ، بلجیم اور دیگر یورپین اقوام و ملل نے شاعر کو عزت و وقار کے اونچے سے اونچے درجے پر بٹھایا۔ فرانس میں وہ برگساں سے ملا۔ سلوین لیوی اور دیگر عظیم ادبی ہستیوں سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اور پھر شانتی نکیتن واپس آ گیا۔ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے مصوری شروع کی اور اُن کے "عمل" فرانس میں خاص طور پر مشہور ہوئے۔ جہاں اُن کی ایک نمائش بھی منعقد کی گئی۔ جرمنی، اٹلی اور جنوبی امریکہ کا ایک بار انہوں نے پھر سفر کیا۔ مسولینی سے ملاقات ہوئی۔ لیکن فیسزم کے بارے میں کچھ کہنے سے انکار کر دیا۔ جرمنی سے ہوتے ہوئے وہ روس گئے جہاں انہوں نے صنعتی سکولوں اور مزدور طبقہ کی حالت کا اندازہ لگایا۔ ۱۹۳۲ء میں وہ ایران گئے اور شاہ نے بہت عزت و احترام کے ساتھ ان کی مہمانداری کی۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد وہ حیدرآباد گئے اور شانتی نکیتن میں "منصب تہذیب اسلامی" جاری کرنے کیلئے حضور نظام سے ایک لاکھ روپے کا عطیہ لیا۔ ۱۹۳۳ء کے بعد سے وہ شانتی نکیتن ہی میں رہے اور سوائے چند مخصوص بنگلہ جرائد کے اور کسی کے لئے کچھ نہ لکھتے تھے۔ علالت کی حالت میں انہوں نے مس راتھبورن کے خلاف ایک بیان لکھوایا۔ مس راتھبورن نے ہندوستان کی کشمکش آزادی کے متعلق جو کچھ لکھا تھا اس کا کافی جواب تھا۔

گذشتہ مئی میں شاعر کی ۸۰ ویں سالگرہ منائی گئی تھی۔ اور اس سے چند ماہ قبل سر ماریس گوائر چیف جج فیڈرل کورٹ نے آکسفورڈ یونیورسٹی کی طرف سے خود جاکر ڈاکٹریت کا اعزاز شاعر کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

شاعر کی موت سے گذشتہ صدی کے پیدا شدہ اکابر کی سب سے بڑی نشانی ہمارے درمیان سے اُٹھ گئی۔

◆ ◆ ◆

ٹیگور کا نظریۂ تعلیم

ہر شخص اس حقیقت سے باخبر ہے کہ ہندوستان ایک جاہل ملک ہے۔ عوام میں بیداری و علمی روشنی ہزاروں لاکھوں میں صرف چند گنے گنائے دماغوں میں آپ پائیں گے۔ تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی کتنے ایسے ہیں جنہیں حقیقی طور پر تعلیم یافتہ کہا جا سکتا ہے۔ حال ہی میں تعلیم عمومی (Mass Education) کی تحریک نے ملک میں زور پکڑا اور ہر طرف اسی کا چرچا ہونے لگا۔ اس تحریک کا اصل مقصود بھی ابھی تک واضح طور پر ہمارے سامنے نہیں آیا ہے۔ کیا یہ بھی ایک تقلید مغرب کی رَو ہے یا فی الحقیقت ہم نے کوئی ایسا اسلوب اختیار کیا ہے جس سے عوام الناس اس قابل ہو جائیں کہ وہ اپنا خط خود لکھ پڑھ سکیں۔ اپنا اخبار خود پڑھ سکیں۔ اس قسم کے اسباب موجود ہیں کہ اس تحریک کے مؤیدین کی آخرالذکر نسبت پر شک و شبہ کی نظر نہ ڈالی جائے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ یورپ ایک ذی ثروت سرزمین ہے اس کی خوشحالی اور ترقی و عروج کا راز عمومی تعلیم میں مضمر ہے۔ اگر ہندوستان بھی عوام گیر تعلیم سے مالا مال ہو جائے تو یہاں بھی ترقی و عروج کے دریا بہنے لگیں گے اور سونے کے پہاڑ کھڑے ہو جائیں گے۔ اسی لئے یہ لوگ عمومی تعلیم کی تحریک پر زور دیتے ہیں۔

لیکن ٹیگور کا مطمح نظر اس سے مختلف تھا۔ اس کا تصور کسی ایک فریق یا فرقہ کا نہ تھا بلکہ عمومی انسانیت کا تھا۔ ٹیگور کو اپنے نصب العین کی مطمئن کن تصویر اگر کہیں دکھائی دی تو وہ سوویٹ روس تھا۔ اسی لئے وہ روس کے طریقۂ تعلیم سے بہت متاثر تھا۔ روس کا نظریہ تعلیمات عامہ کامل طور پر [illegible] سے مشتق تھا اور [illegible]

تھی جسے ٹیگور نے چلایا تھا۔ تصور یہ تھا کہ ایک انسان دوسرے انسان کو بھی انسان ہی سمجھے۔ اس تصور کا ہندوستان جیسے ملک میں پھلنا پھولنا کیسے ممکن ہو سکتا تھا جہاں انسان صدیوں کے توہمات کے باعث چھوتوں۔ اچھوتوں میں بٹا ہوا تھا۔ اس لئے ٹیگور کے کے جو خیالات "روس کی چٹھیاں" پڑھنے پر آپ کو مل سکتے ہیں۔ اس کتاب سے ہندوستان کی عمومی جہالت کی وسعت کا صحیح اندازہ ہوگا۔ اور موجودہ طریقۂ تعلیم کی تنسیخ کے مسئلہ پر بھی روشنی آپ کو دکھائی دیگی۔ ٹیگور نے سب سے پہلے دیسی زبانوں میں تعلیم کی ضرورت کو محسوس کیا اور خود اس تجربہ کو شروع کیا۔ مغربی علوم کو مشرقی زبانوں کے توسط سے سکھانے کا ڈھنگ نکالا۔ لوگ پہلے اسے "شاعرانہ نازک خیالی" کہہ کر مذاق اڑایا کرتے تھے، لیکن چالیس سال تک وہ مضامین کے ذریعے اپنے اس تصور ذہنی کی اشاعت کرتا رہا اور ایک وقت ایسا آیا کہ لوگ اُسے صحیح سمجھنے پر بالکل مجبور ہو گئے۔ اس کے مخالفین ایک مثال بھی ایسی نہیں دکھا سکے کہ مغرب کے کسی ایک سکول یا کالج میں بھی تعلیم کا ذریعہ کوئی غیر ملکی زبان تھی۔ ٹیگور کے مخالفین کہتے تھے کہ یہ سب انقلاب انگیز خیالات ہیں اور تمام نظام تعلیم کو یکسر بدل دینا دانشمندی کے خلاف ہے اور جس اصولِ تعلیم میں وہ عرصۂ دراز تک تجربہ حاصل کر چکے ہیں اس کو یکایک بدلنا کیا معنی رکھتا ہے۔ ان خیالات سے ٹیگور کی رائے بالکل نہیں بدلی۔

اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ شاعر انگریزی تعلیم کے بالکل خلاف تھا۔ وہ اس بات کی ضرورت سمجھتا تھا کہ موجودہ حالات میں حکمرانوں کی اس ترقی یافتہ زبان کا سیکھنا از حد ضروری ہے۔ لیکن ٹیگور کسی شخص کو اپنی مادری زبان کے آگے ایک غیر ملکی زبان کو فوقیت دینے کے حق میں نہ تھا۔

یہ کیسا اچھا اتفاق ہے کہ انگلستان میں صرف محدودے چند ہندوستانیوں کو انگریزی پر یہ درجہ حاصل ہے کہ اُن کی تحریریں جواہر ادب مانی جاتی ہیں۔ ان میں سے بنگال کے دو ادیب راجہ رام موہن رائے اور رابندر ناتھ ٹیگور خاص طور پر قابل ذکر ہیں ——— اور یہ دونوں خود اپنی زبانوں میں کیا کم رتبے کے ادیب تھے؟!

ٹیگور ——— موسیقار

(بنگلہ اخبار "امرت بازار پترکا" سے ملخّص)

جس زمانے میں کہ مٹیا برج کلکتہ میں نواب واجد علی شاہ کی دربار منعقد ہوا کرتے تھے، ٹیگور کے گھرانے کے ایک بزرگ سریندر ناتھ ٹھاکر بھی ان محفلوں میں شریک ہوا کرتے تھے اور انہوں نے نواب ممدوح کے ایما سے ہندوستانی موسیقی کو اپنی سابق بلندی پر پہونچانے کی کوشش کی۔ لیکن واجد علی شاہ اور سریندر ناتھ صرف سرپرستوں کی حیثیت رکھتے تھے اصل کام دوسروں کو کرنا تھا۔ دُور دُور سے گویّے اور اعلیٰ درجے کے موسیقار مٹیا برج میں جمع ہو گئے تھے۔ ان کوششوں کے باعث ہندوستانی موسیقی جو غرقاب ہونے والی تھی بچ گئی۔ جو بیج مٹیا برج میں بویا گیا تھا وہ جوڑا سنکو" (ٹیگور خاندان کی رہائش گاہ) میں پھل پھول لایا۔ مذہب اور سماج کی زمینوں تک اس درخت کی جڑیں پھیلتی چلی گئیں۔ اس خاندان میں کئی لاجواب موسیقی نواز پیدا ہوتے جو اپنے علم کی دولت ہر چھوٹے بڑے کو (جو فن کی پیاس میں وہاں تک پہونچتا تھا) دینے میں دریغ نہیں کرتے تھے۔

شاعر ٹیگور کے بڑے بھائی جوت اندر ناتھ ٹھاکر (ٹھاکر اور ٹیگور ہم معنی الفاظ ہیں) نے ہندوستانی موسیقی کو ترقی دینے میں خاص طور پر حصّہ لیا۔ ان ہی نے شاعر کے دل میں موسیقی کا لگاؤ پیدا کیا۔ رابندر ناتھ گیت تیار کرتے تھے اور اُن کے بڑے بھائی ان گیتوں کو موسیقی میں ڈھالتے تھے۔ مشرقی اور مغربی تانوں کو ملا کر ایک نیا باب موسیقی میں کھولا جا رہا تھا جو آجکل ہر جگہ بنگال میں رائج ہو گیا ہے۔ اس طرح شاعر کے گیت ایسی موسیقی میں ڈھلے جاتے تھے جس میں نہ مغرب کی اندھا دھند تقلید ہوتی تھی اور نہ اُسے یک قلم خارج کر دینے کی کوئی عصبیت ہی تھی۔ پس منظر اس سرگرمی کا یہی رہتا تھا کہ مغرب کی اچھی چیزیں مشرقی مذاق کے

ہم آہنگ کر دی جاتیں۔ یہ تو تھا ماحول۔ اب تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھئے۔

رابندر ناتھ بچپن ہی سے ایک جہاں گرد ہستی تھی اور ایک جگہ ٹک کر نہ بیٹھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندستانی موسیقی کے جاننے والوں سے ان کا کہیں کہیں ملاپ ہو ہی جاتا تھا اور وہ ان سے جو کچھ معلوم کر سکتے تھے کر لیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں بنگال کے باول[1]، کیرتن[2]، اور بھٹیالی[3] گیت خوب آتے تھے۔ اس وقت موسیقی کا راج دربار اور امرا کے طبقہ سے متعلق و وابستہ رہنے کی وجہ سے غیر حقیقی اور مصنوعی ہو گئی تھی۔ ٹیگور نے اُسے "لمسِ واقعیت" ( ) بخشا اور وہ ایسی مقبول ہوئی کہ عوام کی قدر نے خواص و دربار کی سرپرستی کے افسانے بھلا دیے۔

موسیقی ہند کی اصلاح کی ان کوششوں کیلئے ہم شاعر کے ہمیشہ ممنون رہینگے۔

[1] ایسے گیت جو سنیاسی اور سادھو گاتے ہیں۔ [2] مذہبی بھجن وغیرہ۔ [3] شام کے وقت جو گیت کسان اور کشتی چلانے والے ملاح گاتے ہیں۔

ٹیگور ـــــ مُصوّر

بیشک ٹیگور ایک مصوّر تھا اور نئے طرز کا تصویری ذوق لیکر آیا تھا۔ اس کی مصوری اس لئے قابل اعتنا نہیں ہے کہ وہ ایک بڑے آدمی کے دماغ کا عکس ہے بلکہ اس وجہ سے زیادہ ہے کہ وہ شعر اور نقش دونوں کا امتزاج ہوتا ہے۔ اس کے نقوش نغمہ بھی ہوتے ہیں اور تخلیقی جودت کا نمونہ بھی۔ مذاق انسانی مختلف ہے کسی کو اس کے نقش پسند آتے ہیں کوئی محض دلچسپ پاتا ہے انہیں، کچھ کے نزدیک وہ بے معنی ہوتے ہیں، مگر یہ سب مانتے ہیں کہ دیکھنے والے کی نگاہ کو پکڑ لیتے ہیں اس کے مصوری شعر ایک خاص کیفیت اپنے میں پنہاں رکھتے ہیں۔ انساں کو تخیل کے اُس پار لے جاتے ہیں۔ اس کے نقش کشتی کے مانند ہیں جن پر سوار ہو کر صاحب نظر ماورا میں جاکر ساحل سے ہمکنار ہوتا ہے۔

اس کے نقش سادے، دلچسپ اور بہت سہل سے معلوم ہوتے ہیں۔ گو اُن کی رُوح کو پہچاننا ذرا پیچیدہ کام ہوتا ہے۔ چونکہ عام اصول نقاشی سے وہ مختلف ہوتے ہیں اس لئے ان پر اصولی نقطۂ نظر سے گفتگو محال ہے۔ نہ وہ ان قواعد کے پابند ہیں۔ کسی جگہ خود شاعر نے اپنے نقوش کے بارے میں کیا خوب کہا ہے۔

"میری خیالی تصویروں کے لئے مضامین آتے ہیں
دل کی گہرائیوں سے۔
وہ ہوا پر تیرتے ہوئے آتے ہیں،
قوانین کی قید سے آزاد۔
اور وہ چلے بھی جاتے ہیں۔ کھو جاتے ہیں۔
نہ معلوم وہ کہاں چلے جاتے ہیں۔
ایک نغمہ کی روح کی طرح ماورا میں معدوم ہو جاتے ہیں۔"

شاعر کی رائے تھی کہ قوانین اور رسوم آرٹ کو مُردہ اور بے اصل کر دیتے ہیں۔ آزاد و عکس طبیعت کسی رواجی پابندی کا قائل نہیں ہونا چاہیئے جو ہوا و تصنع اور آورد ہے۔ وہ کہتا تھا کہ یورپ کی نقاشی کو عروج ہی جب حاصل ہوا جب "عہد نو" (Renaissance) کے بعد پکاسو (Picasso) گنگین نے رسوم و قیود قدیم سے بغاوت کر کے مصوری کے نئے آثار مرتب نہ کئے۔

"مصوّر شاعر نے یہ الفاظ خود کہے ہیں۔
"یہ جیسی بھی ہیں
ٹیڑھی یا ترچھی
چند الفاظ کے ساتھ قلم کی جنبش کے نشانات ہیں۔"

تصویر میں جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ "بھاشا" یا زبان ہوتی ہے۔ سُن تصویر مُنہ سے بول اُٹھے کہ میں اس ارادہ و تصور کی ترجمان ہوں۔ مصوّر ٹیگور یک جنبش قلم سے اپنی گونگی تصویروں کو "نطق" "بھاشا" سے سرفراز کر دیتا تھا اور یہی اس کی بڑائی کا منصب تھا۔

اس سے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ رابندر ناتھ کی تصویروں کی خصوصیات کیا ہیں۔ اس کی تصویری خوبی یہی کہ

وہ کوئی چیز جو چھپی ہوئی ہر نقش میں چھوڑ جاتا تھا۔ جسے شرح کرنے کے لئے سلسلہ (بھاشا) کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس کی تصویر "جھنکار" (چول ہوئے بال)، اور "ایکاکنی" (اکیلی)، اس "کوئی چیز" (Some thing) کی اچھی مثالیں ہیں۔

کچھ لوگ ہیں جو اس کی تصویروں کو بھیانک بتائیں گے۔ مگر یہ انصاف سے بعید ہے۔ کون ہے جو "گھنٹے کرن" (فرانکنس بدھ) اور "کھاسا لبوری" (دمدار) کو بھیانک کہکر منصفی کرنے کا دعوی کرے۔

کچھ ایسے بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ٹیگور کی مصوری میں ایک بڑے دماغ کی طفلانہ سبکی پائی جاتی ہے۔ بلکہ کچھ کچھ احساس مضحک (Clown Complex) تک نوبت پہونچ جاتی ہے۔

اگر واقعی ایسا ہے تو تعجب ہے کہ اس قدر وسیع طبقہ مداحین اس کے نقوش نے کیسے پیدا کر لیا۔ اس قدر زیادہ دلوں میں ہمدردی کی جنبش کیسے پیدا ہو گئی۔ "گیچو بابا" اور "جیب بیر کورا کا متاوالا" جیسی تصویروں کو ہم اسی نوع میں رکھ سکتے ہیں۔ اور انہیں بے تکا نہیں کہہ سکتے۔ دراصل یہ بجائے خود ایک نوع ہے جسے قریب ترین صحیح نام اگر دیا جا سکتا ہے تو وہ "واہمہ کی خلاقی" کہہ سکتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے ٹیگور مصور نے کوئی اسٹائیل قائم نہیں کیا۔ بس جو Change (رجوع قلب) پیدا ہوا اُسے بجنسہٖ منتقل کر دیا۔ خواہ اس میں کسی قانون و رسم کہن کی شکست ہو۔ غمازی ہو سماج کے ناسور کی یا فریاد ہو کسی کی شوخیٔ تحریر کی!

* * *

ٹیگور کی تصانیف

شعر، ادب، ناٹک، ناول وغیرہ

ناول

گورا۔ (اردو میں ترجمہ ہو گیا ہے۔)
نوکا ڈوبی۔ "غرقابی سفینہ"
چوکھیر بالی۔ "آنکھ کی کرکراہٹ"
دو بی بون۔ "دو بہنیں"
مالنچ۔ "پلیٹ فارم"
گھرے باہرے۔ "گھر کے باہر"
راج رشی۔
جوگا جوگ۔ "یک لمحہ ذی شان"
شیشیر کویتا۔ "آخری نظم"
بہو ٹھاکرانی ایرہاٹ۔ "بہو بازار"
لیپار یٹری۔ "آنند بازار پتریکا" کے سالنامہ میں مکمل ناول
بھانو سنگھ پداولی۔ "بھانو سنگھ کی نظمیں"
(بھانو سنگھ ٹیگور کا قلمی نام تھا۔)

سندھیہ سنگیت۔ شام کے گیت
پربھات سنگیت۔ صبح کے گیت
شیش سپتک۔ آخری سپتک
چینیکا۔ مجموعہ کلام رنگین
وتھیکا۔ گیت مالا
نیٹر پوجا۔ ایکٹریس کی پوجا
گیتالی۔ گیت کی کتاب
گیتان جلی۔ عرض نغمہ (اردو تراجم ہو گئے ہیں۔ اسی پر نوبل پرائز ملا تھا۔)
چھبی اوگان۔ تصویر و نغمہ۔
اُتسرگ۔ نذر
سونار تری۔ سونے کی کشتی

افسانوں کے مجموعے

گلپ گچھہ۔ "افسانوں کا غنچہ" پہلا، دوسرا، تیسرا حصہ
لپیکا۔ تحریرات۔

گلپ چارتی۔	چہار داستان
چتورنگ۔	رنگارنگ۔
شے۔	دُو
پری شیش۔	آخری
پونشچ۔	پھر

چند مشہور نظمیں

ھوا۔	ایک پل۔ ہوا۔
پوربی۔	مشرقی
پرباہینی۔	دھارا
پتھے او پتھیر پرانتے۔	راستے پر اور راستے کے پاس۔
بنگلہ کا دیہ پری چے۔	بنگالی شاعری پر ایک نظر۔
کوڑی او رکمل۔	کوڑی اور کنول۔
کنیکا۔	تھوڑا سا (مزاحیہ)
کھنیکا۔	تھوڑی دیر رہنے والا (〃)
کلپنا۔	ارادے۔
کاہنی۔	کہانی۔
بن بانی۔	جنگل کی آواز۔
وچترتا۔	مختلف ومتفرق۔
تاشیر دیش۔	تاشوں کی دُنیا۔
شیشو۔	بچّہ
کھیا۔	اُس پار
پلاتوکا۔	بھگوڑی۔
شیشو بھولاناتھ۔	بچّہ بھولاناتھ۔

ڈرامے

چترانگدہ۔	ارجن کی محبوبہ کا نام۔
بانسری۔	
چنڈالیکا۔	چنڈال کی بیوی۔
کالیر جاترہ۔	وقت کا سفر (مارچ آف ٹائم)
وسرجن۔	قربانی
اَچلا تنین۔	کم چلن والا
پرائشچت۔	کفارہ

رِن شودھا۔	ادائیگی قرض
گرہیہ پرویش۔	شادی
پھالگنی۔	پھاگن
راجہ اور رانی۔	راجہ رانی۔
کھاپ چھاڑا۔	ناموزوں۔
چھیڑا رچھی۔	تصویری معمے۔
گرو۔	اُستاد
ڈاک گھر۔	
مکٹ۔	تاج
مکت دھارا۔	موج نجات
پنچ بھوت۔	پانچ بھوت
شیام اولی۔	ہرا
پتر لوٹ۔	مجموعہ خطوط
وشو پریچیہ۔	دُنیا کا تعارف
پراتنک۔	صوبجاتی
شاردا اتسو۔	درگا پوجا کا ہتوڑا۔

نقلیں

چرکمار سبھا۔	کنواروں کی کلب۔
پرہسن۔	مذاق۔
تپتی۔	تپتی کا قصّہ۔
ہاسیہ کوتک۔	(ہنسی مذاق)
بینگ کوتک۔	(〃 〃)

ادب

لوک ساہتیہ۔	سماج کا ادب
چترپوجا۔	بطل پرستی
جیون سمرتی۔	میرے حالاتِ حیات
شبد تتو۔	علم زبان ولغت
سنچیہ۔	مجموعہ تحریرات
سودیش۔	اپنا وطن
شکشا۔	تعلیم
دھرم۔	دین و مذہب

راجہ پرجا۔	راجی اور رعایا	ساہتیہ۔	ادب
آدھونک ساہتیہ۔	جدید ادب۔	جاتری۔	مسافر
پراچین ساہتیہ۔	قدیم ادب	رشیار چٹھی۔	روس کا خط
وچتر پربند۔	مختلف مضامین	بھانو سنگھ پتراولی۔	خطوط بھانو سنگھ۔ (شاعر کا قلمی نام)
سماج۔	معاشرہ	ساہتیر پتھے۔	ادب کے راستہ پر
چھنن پتر۔	پرزہ پرزہ خط	پاشچاتیہ بھرمن۔	سفرِ مغرب۔

آہنگِ آخر

عالمِ نزع میں رابندرناتھ ٹیگور کی آخری آواز

۳۰ جولائی ۱۹۴۱ء کو جو آپریشن ہوا وہ شاعر کے لئے کچھ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوا۔ وہ ڈوبتا ہی چلا گیا، شام کے وقت ایک شخص نے جو سرہالیں بیٹھا تھا، سُنا کہ عالمِ کرب میں شاعر کے لبوں پر کوئی نغمہ پرواز کے لئے مچل رہا ہے۔ مگر نقاہت، کربِ جانکنی کی تکلیف نے اس قدر نزار بنا دیا ہے کہ شاعر کی آواز قریب بیٹھے ہوئے تیمار دار کو بھی صاف سُنائی نہیں دیتی۔ اس نے لبوں پر کان لگا دیے اور شاعر کی یہ آخری گنگناہٹ اُس نے شاعر سے سُنکر لکھ لی۔ شاعر بار بار ایک لفظ دہراتا تھا اور لکھنے والا اُسے شاعر کی منشا کے مطابق لکھتا جاتا تھا ــــ یہ ہے شانِ نزول اس آخری کلام کی جسے براہِ راست بنگلہ زبان سے مشہور بنگالی روزنامہ "امرت بازار پترکا" مورخہ ۳ اگست ۱۹۴۱ء سے ہم یہاں ترجمہ کر کے شاعرِ اعظم کی ایک ادبی امانت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ہم نے حتی الوسع بنگلہ کی روح ترجمہ میں برقرار رکھنے کی سعی کی ہے۔ (ظفر)

کرب و آلام کی وہ شب تاریک جو بار بار میرے سنگ در پر
آ کر کھڑی رہی،

مجھے اس کا صرف ایک ہی حربہ نظر پڑا ــــ
اذیت و بلا کا ایک مسخ شدہ خطِ پیشانی۔
خوف و لرزہ کی تمام دہشت سامانیوں کے ساتھ۔
وہ اس کی بدلی ہوئی تیوریاں۔

کیا ہیں یہ سب ــــ؟
تاریکی میں اس کی فریب کاریوں کی تمہید ــــ!

اس کے خوف انگیز سوانگ کو جب بھی میں نے سچ سمجھا
ایک ہولناک کرب نے مجھے آدبوچا۔

آہ، یہ کھیل فتح و شکست کا۔
یہ سراب اک زندگی کا۔

یہ دہشتناک ہیبت ــــ
جو میرے قدموں کو زنجیروں میں جکڑنے
کے لئے طفلی سے مصروف تھی۔
یہ سب آخر ہے کیا؟
ایک مضحکۂ المیہ!
خوف و دہشت کی ایک بوقلموں صورِ متحرک۔
کیا ہے یہ طلسم ــــ؟
ظلمات میں جابدست موت کی صنعت گری!

رابندر ناتھ کا غیر مطبوعہ کلام

اپنی موت کے لئے شاعر کی خود نوشت دُعا

۷ اگست ۱۹۴۱ء کو جب رابندر ناتھ کی آخری رسم کلکتہ میں ادا کی جا رہی تھی، اُسی وقت شانتی نکیتن میں ایک قسم کی "نماز جنازہ غائبانہ" ادا کی جا رہی تھی۔ یہ مذہبی رسم شانتی نکیتن کے "دعا گھر" میں ادا ہو رہی تھی۔ پنڈت ستیش موہن سین نے اس پُر جلال و پُر نور رسم کو ادا کیا۔ رسم کے بعد مندرجہ ذیل گیت گایا گیا۔ یہ گیت خود رابندر ناتھ نے اپنی موت کے لئے لکھا تھا جس کو کئی مہینے پہلے ترتیب دیا گیا تھا۔ اور شاعر نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اسے "دعائے خیر" کے طور پر میری موت کے بعد پڑھا جائے۔

اس وقت تک یہ گیت کہیں شائع نہیں ہوا ہے۔ اور مشہور بنگالی روزنامہ "امرت بازار پترکا" مورخہ ۱۳ اگست ۱۹۴۱ء سے ہم نے براہ راست ترجمہ کر کے یہاں پیش کیا ہے۔ اور شاعر کے جذبات کے ساتھ ہم بھی ہمنوا ہیں ——— "

شانتی کا ساگر میرے سامنے ہے
اے مالک! ——— اے میرے کھیون ہار میری کشتی پار لگا۔
تو ہی میرا امر ساتھی رہے گا۔
لے لے مجھے، اے مالک مجھے لے لے۔
اپنی وسیع آغوش (رحمت) میں۔
وہ لامحدود راستہ جس پر مجھے جانا ہے ———
تو ہی میرے لئے قطب تارے کی طرح راہنما بنے گا۔

تیری رحمت، اے میرے ناجی و حافظ۔
اے وہ کہ تیرا کرم میرے لئے
اس سفرِ ابدی میں زادِ راہ بنے گا!
اے مالک! اس دنیاوی بندھن کو ہمیں توڑ دے،
اپنے بسیط اور لامحدود بازوؤں میں مجھے لے لے اور نکلنے دے۔
اور اے مالک! اس شئے عظیم سے جو لااسم ہے۔
میرے قلب کو لبریز کر دے!

* * *

اعتراف

بنگلہ کے اخبارات سے ترجمہ کرنے، نیز دیگر اُمور میں امدادی مشورہ میں مجھے اپنے عزیز دوست مسٹر سٹفین ایم سنگھ سے جو مدد ملتی رہی ہے اس کے لئے اظہار تشکر نہ کرنا سخت ظلم ہوگا، ان کے ساتھ کم، اپنے ساتھ زیادہ!

ظفر قریشی،

ٹیگور

خوں رو، ہاں خوں رو اے کشورِ ہندوستاں — تجھ سے دامن کش ہوا اک شاعرِ جادو بیاں

وہ نواگر جس کے نغموں کی وطن میں دھوم تھی — بلکہ یوں کہہ دہر کی ہر انجمن میں دھوم تھی

زیبِ سر تھا جس کے ملکِ شعر کی شاہی کا تاج — جس کو تحسیں کا ملا اقوامِ عالم سے خراج

وہ رشی تھا آس جو اپنے جہانِ یاس کی — درس تھا گوتم کا شعریت تھا تلسی داس کی

جھوم کر جب نغمۂ حبِّ وطن گاتا تھا وہ — وسعتِ کون و مکاں کو وجد میں لاتا تھا وہ

مردِ اعظم، شاعرِ رفعت نشاں جاتا رہا — یعنی اپنی سرزمیں کا آسماں جاتا رہا

زندگی بھارت کی، بھارت کا نواگر اُٹھ گیا — نغمہائے عشق و اُلفت کا نواگر اُٹھ گیا

عالمِ انسانیت کا آہ وہ غمخوار دل! — دہر کا بیدار انساں، دہر کا بیدار دل

وہ رہا کوشاں چمن کی رستگاری کے لئے — تھا قوی حجّت وطن کی رستگاری کے لئے

ایشیا کا ماہتابِ ضوفشاں گہنا گیا — آخر اُس کو ہند کا رنجِ غلامی کھا گیا

بھولتا عہدِ غلامی میں وہ کیونکر موت کو — شرم نے ترجیح دی محکومیت پر موت کو

ہند سے رخصت ہوا دلبند ہندستان کا — آہ وہ ٹیگور، وہ فرزند ہندستان کا

صفحۂ دل پر ابھی تازہ تھا داغ اقبال کا — سانحہ ہے قہر مرگِ بلبلِ بنگال کا

دیدۂ گنگ آبشارِ خوں بہائے رنج سے — اے ہمالہ اپنے پرچم کو جھکا لے رنج سے

ہم نے مانا اُس کے نغمے تا ابد گائے گا دہر — لیکن اُس عشقِ مجسّم کو کہاں پائے گا دہر

عمرہا[1] در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا جہانِ شعر را صورتگرے یابد حیات

نہال سیوہاروی؛

[1] اقبال بتصرف،

ایسٹ انڈین ریلوے

درگا پوجا کی چھٹیوں کیلئے رعایتی کرایہ کے ٹکٹ

ایسٹ انڈین ریلوے، چھٹیوں کے رعایتی واپسی ٹکٹ، ہر درجے کے، ۱۱ ستمبر سے ۱۶ اکتوبر ۱۹۴۱ء تک (اس عرصے میں دونوں دن شامل ہیں) جاری کر رہی ہے۔ یہ ٹکٹ ۱۰۱ میل یا اس سے زیادہ فاصلہ کے لئے ہوں گے۔

شرح کرایہ حسب ذیل ہے:۔

پہلے، دوسرے اور درمیانہ درجہ کیلئے:۔ ایک اور ایک تہائی یک طرفہ کرایہ۔

تیسرے درجہ کیلئے:۔ ایک اور نصف یک طرفہ کرایہ۔

ان رعایتی ٹکٹوں سے واپسی سفر تاریخ اجرا کی نصف شب سے ۴۵ دن میں پورا ہو جانا چاہیئے۔ لیکن ۱۷ نومبر ۱۹۴۱ء کی نصف شب سے پہلے پہلے؛ بریک جرنی یعنی سفر میں منزل سے پہلے کہیں راستہ میں قیام کرنیکی مزید سہولت بھی آپکو حاصل ہوگی؛

موٹر کار کے کرایہ میں رعایت

صرف مقامی بکنگ میں..۱ میل سے زیادہ سفر پر واپسی ٹکٹ صرف یکطرفہ کرایہ پر جاری کیا جائے گا؛

غیر استعمال شدہ ٹکٹ کی قیمت کی واپسی

ریل یا موٹر کار کے ان رعایتی کرایہ کے آدھے ٹکٹوں کی قیمت واپس نہیں کی جائے گی جن سے سفر نہ کیا گیا ہو مزید تفصیلات اسٹیشن یا شہر کے مقامی ٹکٹ گھر سے معلوم کی جا سکتی ہیں۔

مجرّب اور خالص ادویہ

اگر آپ کو مجرب اور خالص ادویہ کی ضرورت ہے تو آپ ہمارے دواخانہ سے طلب کریں۔ ہر قسم کی ادویہ ہم آپکو مہیا کرکے دینگے۔ اس کے علاوہ ہمارے دواخانہ میں خاص نسخے بھی تیار ہوتے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں۔

تریاق کبیر یہ گھر کا ڈاکٹر ہے۔ سر درد، پیٹ درد، دانت کے درد، گلے کے درد، سینہ کے درد، اسہال، سوء ہضمی، ہیضہ وغیرہ کے مریضوں کو اس دوا کے لگانے یا پلانے سے فوراً فائدہ ہوتا ہے۔ بچھو، بھڑ، سانپ کاٹے تو ایکے زخموں کے لئے یہ تریاق ہے۔ بخار وغیرہ میں بھی اس سے فائدہ ہوتا ہے۔ عام مرضوں میں ڈاکٹر کی ضرورت ہی نہیں رہتی ہے۔ ہر گھر میں اسکا موجود ہونا نہایت ہی ضروری ہے۔ قیمت چھوٹی شیشی ۸، درمیانی شیشی عہ بڑی شیشی ۱؎ اسکے اثر کے متعلق ذیل کا سرٹیفکیٹ ملاحظہ فرمائیں۔

جناب سید جلال الدین صاحب کشمیری تحریر فرماتے ہیں "آج عرصہ دو سال سے معدے کی سخت تکلیف تھی جس کی وجہ سے ایک چھٹانک غذا ہضم ہونی مشکل ہو گئی تھی۔ لیکن دواخانہ خدمت خلق قادیان سے تریاق کبیر بطور نمونہ لیا۔ اسے شروع کئے چند دن ہی گزرے ہونگے کہ اس نے حیرت انگیز فائدہ کیا۔ کھانا وغیرہ بخوبی ہضم ہو جاتا ہے اور خوب بھوک لگتی ہے۔ اور خدا کے فضل سے جو بدنی سستی کمزوری تھی اس میں بھی فائدہ ہو رہا ہے۔

سرمہ ممیرا خاص یہ سرمہ ایک پرانے اور مجرب نسخہ کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔ اور پرانے آشوب چشم خصوصاً جو نزلہ یا دماغی یا اعصابی کمزوریوں کی وجہ سے ہو۔ اسی طرح نظر کی کمزوری اور دھند کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہوا ہے۔ پرانے ککروں اور آنکھوں کی سرخی کیلئے مفید ہے۔ قیمت فی تولہ ۱۲؎ ۶ ماشہ عہ ۳ ماشہ ۱۰

سرمہ اکسیر چشم یہ سرمہ آنکھوں کی سب بیماریوں کے لئے مفید ہے۔ خصوصاً نئے اور پرانے ککروں کے لئے بہت ہی مفید ہے۔ نیز ناخنہ وغیرہ امراض کے لئے مجرّب ہے۔ قیمت فی تولہ ۱۲؎ ۶ ماشہ عہ ۳ ماشہ ۱۲

ان کے اثر کے متعلق ذیل کے سرٹیفکیٹ ملاحظہ فرمائیں:-

مکرمی جناب عبدالرحمن صاحب چک نمبر ۵ ضلع لائلپور سے تحریر فرماتے ہیں کہ "آپ سے سرمہ ممیرا خاص بطور نمونہ والدہ صاحبہ کیلئے منگوایا تھا جس سے انہیں ککروں کی شکایت بفضل خدا آرام ہے۔ براہ مہربانی فی الحال ۳ ماشہ سرمہ ممیرا خاص قیمتاً اور بھیجدیں"

(۲) مکرمی جناب محمد عارف صاحب ایل۔ ایم۔ ایس۔ ایچ قبولہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ "آپ سے سرمہ اکسیر چشم جو بطور نمونہ منگایا تھا میں نے ایک مریض کو استعمال کرایا جس سے اس کو بہت فائدہ ہوا ہے۔ سرمہ اکسیر چشم واقعی ہی اکسیر چشم ثابت ہوا ہے۔"

ہمیں مندرجہ بالا ادویہ اور اپنی دیگر ادویہ کیلئے مقامی ایجنٹوں کی ضرورت ہے جنہیں معقول کمیشن دیا جائیگا۔ جو صاحب یہ نعمت عام کرنا چاہیں وہ بھی ذیل کے پتہ پر خط و کتابت کریں۔ (نوٹ) دوسری خاص ادویہ کیلئے ہماری فہرست مفت طلب کریں۔

ملنے کا پتہ۔ دواخانہ خدمت خلق۔ قادیان۔ پنجاب؛

کھانا پکانے کی کتابیں

جنتی دسترخوان ۶/
مشرقی مغربی کھانے ۶/
اسلامی دسترخوان ۸/
دلی دسترخوان ۸/
مکمل باورچی خانہ ۱۲/
ناشتہ ۱۰/
جلیدوں کے کھانے ۱۰/
مذاقیہ کھانے ۶۰/

نظم

نغمۂ نور (بہزاد لکھنوی) عہ/
کیف و سرور 〃 عہ/
موج طہور 〃 عہ/
چراغ طہور 〃 عہ/
گیت بہزاد 〃 ۱۲/
شعلہ و شبنم (جوش ملیح آبادی) ۸ہے/
جنون و حکمت 〃 سے/
فکر و حکایات 〃 ۸گ/
نقش و نگار 〃 ۸گ/
فکر و نشاط 〃 ۸عہ/
شاعر کی راتیں 〃 ۸/
پیغمبر اسلام 〃 ۱۰/
در شہوار بیخود (وحیدالدین بیخود) ۶/
گفتار بیخود 〃 سے/
نشاط روح (اصغر گونڈوی) ۶/
سرود زندگی 〃 عہ/
باقیات فانی (فانی بدایونی) ۸عہ/
عرفانیات فانی 〃 ۸عہ/
شعلۂ طور (جگر مراد آبادی) ۸گ/
مختصر دیوان جگر 〃 عہ/
جگر کے سو شعر 〃 ۳/
بانگ درا (اقبال) ۸گ/
ضرب کلیم 〃 ۸گ/
مثنوی [illegible] 〃 ۸گ/
کلیات اکبر (اکبر الہ آبادی) ۸عہ/

نغمۂ روح (اختر انصاری) ۱۲/
آبگینے 〃 عہ/
تصویر احساس (الطاف مشہدی) ۶/
پریت کے گیت 〃 ۸/
تعلقہ (حاجی لق لق) عہ/
گلبانگ آزادی (بہار سہارنپوری) ۸/
حسن دونوں رخ (آنند انصاری) ۴/
معارف جمیل 〃 ۶/
کلیات ولی (ولی دکنی) للعہ/
انتخاب کلام میر (انجمن ترقی اردو) ۶/
انتخاب میر (مکتبہ جامعہ) ۸/
دیوان میر درد (مطبوعہ بدایوں) ۸عہ/
ایضاً (〃 دہلی) ۴/
قصائد مومن (مومن) ۱۲/
کلیات آتش (آتش) ۸عہ/
دیوان ذوق (مرتبہ آزاد) ۶/
قصائد ذوق (ذوق) ۶/
کلیات سودا (سودا) سے/
انتخاب سودا (جامعہ) ۸/
دیوان غالب قسم خاص (تاج اڈیشن) عہ/
〃 قسم اول 〃 ھ/
〃 قسم دوم 〃 ۸عہ/
〃 قسم سوم 〃 ۱۲/
〃 طاہر اڈیشن قسم اول ۸عہ/
〃 قسم دوم ۸/
〃 مرقع چغتائی ھ/
〃 نقش چغتائی ھ/
〃 شرح (نظامی) ۸گ/
〃 〃 (بیخود دہلوی) ۱۲/
〃 〃 (آسی لکھنوی) ۸ہے/
〃 〃 (آغا باقر) ۶/
کلیات شبلی اردو (شبلی) عہ/
〃 فارسی 〃 ۸عہ/
مجموعہ نظم شبلی 〃 ۸/
خمکدہ آزاد (آزاد) ۱۲/
مجموعہ نظم آزاد 〃 ۸/

مسدس حالی قسم اول (صدی اڈیشن) عہ/
〃 قسم خاص (تاج اڈیشن) سے/
〃 〃 اول 〃 ۶/
〃 〃 دوم 〃 ۸عہ/
〃 〃 معمولی 〃 ۶/
دیوان حالی (حالی) ۱۲/
بہارستان (ظفر علی خاں) للعہ/
بہار داغ (نذیر نیازی) عہ/
کلیات حسرت (حسرت موہانی) سے/
انتخاب حسرت 〃 ۱۲/
دردِ زندگی (احسان دانش) ۶/
نوائے کارگر 〃 ۸گ/
نطرت 〃 ۶/
چراغاں 〃 ۶/
آتش خاموش 〃 ۸عہ/
جادۂ نو 〃 ۱۲/
شاہنامۂ اسلام جلد اول (حفیظ جالندھری) سے/
〃 〃 〃 دوم 〃 سے/
〃 〃 〃 سوم 〃 سے/
سوز و ساز 〃 ۶/
نغمۂ زار 〃 ۸عہ/
تصویر کشمیر 〃 ۸/
کلام جوہر (محمد علی جوہر) ۸/
روح جذبات (اکبر حیدری) عہ/
زندان حماقت (احمق) ۶/
جوش و عمل (مختلف) ۱۲/
ظہور رحمت (رشاد عظیم آبادی) ۸/
چپ کی داد (حالی) ۲/
بیوہ کی مناجات 〃 ۲/
نغمۂ حرم (اختر شیرانی) ۸عہ/
خیاباں (محمود اسرائیلی) عہ/
بہار جاوداں (خان صابر) ۸گ/
قطعات خواجہ (خواجہ عبدالمجید) ۶/
انتخاب مذہبین (راس مسعود) ۸گ/
دیوان جان صاحب ۸عہ/
دیوان دلگین [illegible] ۸عہ/

عمر خیامی حصہ دوم (منتخب الصمد) عہ/
〃 〃 سوم 〃 ۱۲/
〃 〃 چہارم الف 〃 عہ/
〃 〃 چہارم ب 〃 عہ/
〃 〃 پنجم 〃 ۸/
〃 〃 ششم 〃 عہ/
〃 〃 ہفتم 〃 عہ/
قصائد عزیز (عزیز لکھنوی) سے/
جام طہور (اثر صہبائی) ۸عہ/
عالم خیال (شوق) ۱۲/
زہر عشق (مرتبہ مجنوں) ۸عہ/
مثنوی کلیات خسرو (امیر خسرو) [illegible]
تاج الکلام منظوم ترجمہ رباعیات عمر خیام ۶/
حقیقت کی سیر ترجمہ منظوم رباعیات سلطان ابو سعید ابوالخیرؒ ۱۴/
جواہر منظوم ترجمہ رباعیات سرمد مرحوم ۱۲/

بچوں کی کتابیں

مذہبی

ہمارے نبی ۳/
ہمارے رسول ۷/
خلفائے اربعہ ۸/
چار یار ۸/
الاسلام ۴/
الرسالت ۶/
الایمان ۴/
التوحید ۵/
الآخرت ۶/
الاعمال ۵/
حیات النبی ۵/
سیرت صدیقؓ ۴/
سیرت عمرؓ ۳/
سیرت عثمانؓ ۲/
سیرت علیؓ ۲/
قرآن پاک ۶/
اسلام کیسے شروع ہوا ۸عہ/
[illegible] اسلام ۸/

[illegible] ۲ر
[illegible] ۲ر
محاسن اسلام ۸ر
اچھی باتیں ۳ر
نبیوں کے قصے ۵ر
دس جنتی ۸ر
بی بی عائشہ ۵ر
مسلمان بیبیاں ۵ر
نامودان اسلام [illegible]
آخری نبی ۲ر
آنحضرت ۳ر
سرکار کا مدینہ ۸ر
سرکار دو عالم ۸ر
سیرت رسول ۵ر
رحمت العالمین [illegible]
چار یار ۸ر
خلافت راشدہ عہ ر

قصے کہانیاں

نقلی مرغابی ۲ر
بچوں کی کہانیاں ۲ر
لال مرغی ۲ر
مرغی اجمیر چلی ۲ر
تانبیل خاں ۲ر
پوری کڑھائی سے نکل بھاگی ۲ر
چھوٹا چھو ۲ر
شریر موتی ۲ر
قرقر ۲ر
چھومنتر ۲ر
چنبیلی ۲ر
نیت کا پھل ۳ر
شیدلا ۳ر
چھدو ۳ر
انعامی مقابلہ ۳ر
بے کاری ۳ر
[illegible] ۴ر
[illegible] ۴ر

دو بھائی ۴ر
بادل کا [illegible] ۲ر
شہزادی ڈلیاں ۴ر
بادشاہ بنوں گا ۴ر
پارسنگار ۴ر
استاد ۴ر
جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے ۴ر
شہزادہ بے نواز ۲ر
سنہری تارا ماتھے چاند ۲ر
صبر بادشاہ زادہ ۲ر
لعل شہزادہ ۲ر
دکھیارہ شہزادہ ۲ر
طرابلس کی شہزادی ۲ر
اتاترک ۲ر
از ظفرل ۲ر
فتح قسطنطنیہ ۲ر
عثمان کا خواب ۲ر
لنگڑا ماموں ۲ر
وزیر منصور ۲ر
تدبیر کی سرزمین ۲ر
شہزادہ عبدالرحمٰن ۲ر
خلیفہ عبدالرحمٰن ۲ر
جادو کا برج ۲ر
گڈریا سپہ سالار ۲ر
مزیدار کہانیاں ۵ر
شہزادی نیلوفر ۸ر
شیخ چلی کا پکوان ۱ر
مہری بوا ۴ر
بالشتیوں کی دنیا ۵ر
جاپانی کہانیاں عہ ر
ریچھوں کا بادشاہ ۲ر
خزانہ ۲ر
اورنگ زیب عالمگیر ۲ر
مور ۲ر
موروں کی شہزادی ۲ر
[illegible] ۴ر

محبت کا پھول ۴ر
نصیحت کا کرن پھول ۸ر
آسمانی دولہا ۱۲ر
طاؤ و پیانہ ۴ر
قیدی شیر ۴ر
ہندوستانی پہیلیاں ۲ر
تاریخ ہند کی کہانیاں ۸ر
تاریخ اسلام کی کہانیاں ۱۰ر
دہلی ۴ر
سمندر کا عجائب خانہ ۸ر
ہندوستان ۴ر
ایورسٹ کی داستان ۳ر
ننگا پربت ۵ر
دھوپ کی پھانسی ۸ر
کائنات ۴ر
دنیا کے بسنے والے ۵ر
دنیا کے بچے ۵ر
مزیدار پہیلیاں ۴ر
ہندوستانی کھیل [illegible]
تعلیمی کھیل ۳ر

ڈرامے

دیانت ۲ر
شریر لڑکا ۳ر
قوم پرست طالب علم ۳ر
بچوں کا انصاف ۳ر
اسکول کی زندگی ۳ر
کایا پلٹ ۲ر
جھوٹے سچے دوست ۴ر
پریم کی جیت ۲ر

نظمیں

قومی نظمیں ۴ر
بچوں کی نظمیں ۴ر
بچوں کے اسٹیل ۵ر
بچوں کی رباعیاں [illegible]
بچوں کے گیت [illegible]
بچوں کا تحفہ حصہ اول ۵ر

پہیلی نامہ [illegible]
لوری نامہ [illegible]

عورتوں کی کتابیں

الزہراء (راشد الخیری) عہ ر
نوبت پنج روزہ ؍؍ [illegible]
وداع خاتون ؍؍ ۵ر
امین کا دم واپسیں ؍؍ ۴ر
دلی کی آخری بہار ؍؍ عہ ر
بزم رفتگاں ؍؍ ۱۰ر
داستان پارینہ ؍؍ ۱۲ر
حیات صالحہ ؍؍ [illegible]
منازل السائرہ ؍؍ [illegible]
جوہر قدامت ؍؍ [illegible]
بنت الوقت ؍؍ ۸ر
سراب مغرب ؍؍ ۸ر
سنجوگ ؍؍ ۱۰ر
سوکن کا جلاپا ؍؍ ۶ر
فسانہ سعید ؍؍ ۸ر
سودائے نقد ؍؍ ۵ر
نغمۂ شیطانی ؍؍ ۱۲ر
سات روحوں کے اعمالنامے ؍؍ ۸ر
بیلہ میں میلہ ؍؍ ۱۲ر
ستونتی ؍؍ ۷ر
موءودہ ؍؍ ۷ر
تفسیر عصمت ؍؍ ۵ر
انگوٹھی کا راز ؍؍ ۶ر
منازل ترقی ؍؍ ۴ر
بچہ کا کرتہ ؍؍ ۴ر
ویدیا کی سرگذشت ؍؍ ۴ر
چہار عالم ؍؍ ۴ر
جوہر عصمت ؍؍ [illegible]
سیلاب اشک ؍؍ عہ ر
طوفان اشک ؍؍ عہ ر
قطرات اشک ؍؍ [illegible]
خدائی راج ؍؍ [illegible]
گوہر مقصود ؍؍ [illegible]

متمدن دنیا کی سب سے بڑی کشمکش!
دوسری جنگ عظیم
ملک کے نامور سیاست نویس مسٹر محمد مرزا دہلوی کے قلم سے
پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا نے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ اب دوسری کوئی جنگ نہ ہوگی بلکہ بین الاقوامی مفاہمت سے صلح و آشتی کا پیغام تمام دنیا کی بلند و پست اقوام تک وسیع کر دیا جائے گا لیکن انسان کی تعمیر میں مضمر ہے ایک صورت خرابی کی۔ اس کا خمیر بنا ہے آب و آتش سے۔ اس لئے پائدار و عالمگیر امن دور اولین سے اب تک لفظ بے معنی رہا ہے۔
جنگ کے فلسفہ اور ضرورت پر اس کتاب میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ موجودہ جنگ کی تاریخ سے پہلے پچھلی جنگ عظیم اور اس کے نتائج پر ایک نظر ڈالی گئی ہے تاکہ مطالعہ کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہنے پائے۔ موجودہ جنگ کی تاریخ کا جس نے شروع سے مطالعہ نہ کیا ہو وہ بھی اس کتاب کے مطالعہ کے بعد مطمئن ہو جائیگا۔ کتاب میں جن اہم مضامین پر بحث کی گئی ہے ان کا مختصر عکس یہ ہے:۔
جنگ اور انسانیت، پہلی جنگ عظیم کی مختصر تاریخ اور نتائج، ترکی کی حیات نو، ہندوستان اور مشرق کے اضطراب، کمیونزم، فاشزم اور نازی ازم، اسپین میں بغاوت، چین پر جاپان کا حملہ، روس و جرمنی میں معاہدہ، ڈائزنگ پولینڈ پر حملہ، یورپ کی جنگ میں امریکہ کا حصہ، ڈنمارک و ناروے پر ہٹلر کی تاخت، ہالینڈ بلجیم پر ایک ساتھ حملہ فلانڈرز کا سانحہ اور اٹلی کا اعلان جنگ، سقوط فرانس، مشرق بعید میں جاپان کے اقدامات، روس اور جاپان کے سیاسی تعلقات، امریکہ کا نیا قانون اسلحہ، مشرقی افریقہ کے اطالوی مقبوضات، یوگوسلاویہ اور یونان کی شکست، عراق میں انقلاب، ہیس کا جرمنی سے فرار اور اسکاٹ لینڈ پر آسمان سے ٹپکنا وغیرہ۔
غرض دنیا اس وقت تک جس ہذیانی دور سے گذر رہی ہے اس کا مکمل عکس ہے۔ یہ دنیا جو آج آپ دیکھ رہے ہیں پرانی ہو گئی ہے، اور نئے دور (نیو آڈر) کی تشکیل کے ساتھ عمل میں آ رہی ہے۔ جنگ کی بھٹی میں مستقبل کا چہرہ ڈھل رہا ہے۔ دنیا کے امن و تمدن کو کس طرح برباد کیا جا رہا ہے۔ اب تک کیا ہو چکا ہے، اور آئندہ آنکھیں کیا دیکھیں گی اور کان کیا سنیں گے اس کے لئے تیار ہو جائیے، اور اس تیاری کے لئے اس کتاب کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔ دنیا کی تمام ذی حیات تحریکوں افکار و حوادث کا سلسلہ وار مطالعہ اس سے بہتر کسی اور جگہ ملنا دشوار ہے۔ کتاب کی مانگ بہت زیادہ۔ جلد توجہ کیجئے۔
ضخامت ۲۱۲ صفحات۔ مجلد معہ گرد پوش۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ (عہ)
(محصول ڈاک بذمہ خریدار ہوگا)
کتب خانہ علم و ادب اردو بازار دہلی

سال ساقی کے دو خاص نمبر ہوتے ہیں مستقل خریداروں سے انکی قیمت الگ نہیں لی جاتی

ڈاک ۔۔۔ ۳ شلنگ

جلد ۲۲ | ساقی دہلی۔ بابت اکتوبر سنہ ۱۹۴۱ء | نمبر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

جناب مرزا فہیم بیگ چغتائی اطلاع دیتے ہیں کہ میرا ارادہ مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم کی سوانح عمری لکھنے کا ہے لیکن کیونکہ جتنے حالات مجھے معلوم ہیں کافی نہیں، اس واسطے مہربان دوستوں کی مدد درکار ہے۔ اگر وہ میرا ہاتھ بٹائیں تو ایک یادگار چیز تیار ہو سکتی ہے۔ مرحوم کے جو دوست اپنے اپنے تعلقات اور معاملات کے متعلق کچھ لکھنا چاہیں براہِ نوازش لکھیں۔ مجھ پر احسان ہوگا۔ اور ممکن ہے اُن تحریرات کے اقتباسات دُنیا کے لئے سبق آموز ہوں۔ مرزا فہیم بیگ صاحب کا پتہ یہ ہے:۔ معرفت شیخ محبوب احمد فاروقی۔ شیخوپور ضلع بدایوں۔

اُمید ہے کہ مرحوم کے احباب اِس کارِ خیر میں زیادہ سے زیادہ مدد دیں گے۔

اس اشاعت میں پروفیسر سراج حسین نقوی کا بصیرت افروز مضمون "ترقیِ نسواں" میں آنے والے زمانے کی ایک جھلک دیکھیے۔ دیویندر ستیارتھی، احمد ندیم قاسمی، بھارت چند کھنہ، فہیم بیگ چغتائی، شیر محمد اختر، پرتھوی ناتھ شرما اور آنوز کے دلکش افسانے شامل ہیں۔ آنوز کے افسانے زندگی کی تلخ اور عُریاں تصویریں ہوتی ہیں۔ ان میں بعض اوقات مبالغہ بھی ہوتا ہے۔ ان کے لہجے میں محاسبانہ سختی ہوتی ہے۔ لیکن افسانوں کا تعلق جذبات سے زیادہ خیالات سے ہوتا ہے۔ ساقی میں ان کے افسانے شائع ہو چکے ہیں ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آئندہ ان کے افسانے خاص وقعت حاصل کریں گے۔ پروفیسر بہلاس نے عرصۂ دراز کے بعد مضمون بھیجا ہے۔ مضمون بہت دلچسپ ہے اور ہمارے ہفت سالہ ارتقا کا آئینہ دار۔ اوپندر ناتھ اشک کا ڈرامہ نفسیاتی تحلیل کا اچھا نمونہ ہے۔ غلام یعقوب آنوز (یہ دوسرے آنوز ہیں) نے پنجابی دیہات کے مشہور گیتوں کا ایک سلسلۂ مضامین لکھنا شروع کیا ہے۔ ایسے پاکیزہ مضامین سے ہمارے لٹریچر میں مفید اضافہ ہوگا۔ منظر عزیز نے نئے ہندوستانی کی صلاحیتیں بہت اختصار سے بتائی ہیں۔ تاہم یہ اشارے ہی بہت وقیع ہیں۔ مس زبیدہ یزدانی نے نیویارک کا عالمگیر میلہ اس عمدگی سے پیش کیا ہے کہ ہمیں اس کے نہ دیکھ سکنے کا کچھ زیادہ افسوس نہیں ہوا۔ ماہر القادری نے ایک قابلِ قدر علمی مضمون لکھا ہے۔ محمد احمد سبزواری کے ہم شکرگزار ہیں کہ انہوں نے فانی مرحوم کی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ افسوس کہ اگست میں اس عظیم المرتبت سخنور کو بھی موت نے ہم سے چھین لیا۔ حصۂ نظم میں امینِ حزیں، ابوالقاسم سرور، تپش، مخمور جالندھری، جوش ملیح آبادی، صفیہ شمیم اور شاد عارفی کا کلام شریک ہے۔ ان کے علاوہ جلال ملیح آبادی، قیوم نظر اور نخشب جارچوی بھی پہلی مرتبہ بزمِ ساقی میں شامل ہوئے ہیں۔

سالنامہ ساقی

کاغذ کی گرانی کا شکوہ بے سود ہے۔ جس بھاؤ بھی اور جیسا بھی ملے گا لگانا پڑے گا۔ غضب خدا کا چار سو فیصدی قیمت بڑھ گئی ہے اور اس کا کوئی تدارک نہیں کیا جا سکتا۔ جنگ کی اگر یہی رفتار رہی تو اُمید ہے کہ دوا کے لئے بھی کاغذ دستیاب نہیں ہوگا۔ گورنمنٹ کی مہربانی سے جرائد و رسائل کو بذریعہ لائسنس رف کاغذ مل جاتا ہے۔ یہ بھی بہت غنیمت ہے کہ زندہ رہنے کا ایک بہانہ تو ہے۔ یکم جنوری کو حسبِ دستور ساقی کا سالنامہ شائع کرنا ہے۔ اس کے لئے مضامین کی فراہمی شروع ہو چکی ہے۔ سالنامے کی ضخامت دو سو سوا دو سو صفحات ہوگی اس لئے صرف چیدہ چیدہ مضامین ہی اس میں جگہ پا سکیں گے۔ اُمید ہے کہ آئندہ اشاعت میں ہم مفصل فہرستِ مضامین پیش کر سکیں گے۔

"شاہد"

ضروری اعلان:۔ جو مسودے ساقی کے لئے موصول ہوتے ہیں انہیں حفاظت سے رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاہم اس بارے میں دفترِ ساقی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا۔ اس لئے اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھا کیجئے۔ جو مضامین قابلِ اشاعت قرار پائیں گے صرف انہی کے بارے میں مزید مراسلت کی جائے گی۔ مضامین ایڈیٹر ساقی کے نام بھیجے جانے چاہئیں۔ ساقی ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو بھیجا جاتا ہے۔ پرچہ نہ پہنچنے کی شکایت ۱۵ تاریخ تک کرنی چاہیے۔ اس کے بعد پرچہ [illegible] نہیں بھیجا جائے گا۔

تہذیب کا مستقبل

ترقیِ نسواں

دُنیا میں غالباً کوئی دوسرا ملک شادی کو اس عزت و احترام کی نظر سے نہیں دیکھتا جو نقطۂ نظر اس رشتہ کے متعلق ہندوستان کا ہے۔ شادی عورت کی زندگی کا نصب العین ہے اور ہندوستانی لڑکی کو جتنا ناز اور فخر اپنی شادی پہ ہوتا ہے اتنا کتنی ہی دولت مل جانے پر بھی نہیں ہوتا۔ وہ دولت، مادی نہیں بلکہ اخلاقی، جو شادی کے ساتھ عورت کے ہاتھ آجاتی ہے، سیم و زر سے خریدی نہیں جا سکتی۔ کسی مرد سے لگاؤ ہو جانا اور اس کی ملکیت بن جانا صنفِ نازک کا مقصدِ حیات سمجھا جاتا ہے۔ رسومِ شادی سے بھی مرد کی برتری کا پتہ چلتا ہے اور ان رسوم کو اس روشن خیالی کے زمانے میں بھی معیوب نہیں خیال کیا جاتا۔ مثلاً جنوبی ہندوستان میں تھالی کی رسم، بنگال میں آہنی کڑے پہنانے کا رواج اور کشمیر میں شادی کے وقت دُلہن کے کان میں دھاگا باندھنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب وجہ کو شوہر کا پابند ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

آپ نے کبھی یہ بھی سوچا کہ ہندوستان میں شادی شدہ عورت کو کنواری عورت کے مقابلے میں کیوں زیادہ عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے؟ کیوں شادی شدہ عورت کو عموماً شادی کا زعم ہو جاتا ہے؟ غالباً ان کے جواب ماہرینِ نفسیات زیادہ خوبی سے دے سکیں۔ لیکن خاص سبب تو بالکل صاف ہے۔ اس ملک میں ماں کو دیوی کی سی عظمتیں حاصل ہیں۔ اور اگر خوش نصیبی سے وہ ایک لڑکے کی ماں بن گئی تو عوام کے خیال کے مطابق گویا اس کی زندگی کا مقصد پورا ہو گیا۔ اس تخیل کے ماتحت اگر کوئی عورت شادی سے گریز کرے تو اُس نے زندگی کا منشا ہی نہیں سمجھا۔

ماں بننے کی مسرتوں اور فرائض کے علاوہ بہتیرے دوسرے وجوہ بھی ہیں جن سے عورت کو شادی کا گھمنڈ ہو جانا جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ مردوں سے کہیں زیادہ عورتوں میں اپنانے کا فطری جذبہ پایا جاتا ہے اور شادی سے اس جذبے کی بڑی حد تک تشفی ہو جاتی ہے۔ قانون اور دُنیا کی نظروں میں اپنے شوہر کے دل پہ اس کی حکومت ہے۔ "وہ" اس کا ہے اور یہ حق اس سے تاحیات نہیں چھینا جا سکتا۔ اور پھر شادی ہوتے ہی چاہنے والوں کی فہرست میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ بھلا شوہر اور [illegible] کی نسبت عورت کی خواہش ہو سکتی ہے۔ "میرا بچہ" "میرا بیٹا" "میری بیٹی"! یہ ہیں وہ الفاظ جن سے ماں اپنے فخر کا اظہار کرتی ہے۔ اس ملک میں بیٹا اپنی ماں سے زندگی بھر جدا نہیں ہوتا۔ ماں کے آرام کا لحاظ اُسے ہر وقت رہتا ہے۔ بچے اور خصوصاً بیٹے ہندوستانی عورت کی نظر میں بُڑھاپے کی ڈھارس ہیں۔ مرنے پر تجہیز و تکفین کے فرائض انجام دینے کیلئے بیٹا موجود ہے۔ پس یہ عاقبت بخیر ہونے اور ابدی دنیا کی مسرتوں کے یقین کے لئے کافی ہے۔ ایک نا کتخدا لڑکی ان فوائد سے محروم ہے۔ پھر اگر عورت شادی کو باعثِ فخر خیال کرے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے!

ایک اور وجہ بھی شادی کے حق میں قابلِ توجہ ہے۔ شادی شدہ عورت کی زندگی مالی تفکرات سے بری، تنہائی کی اُلجھنوں سے مبرا اور شناساؤں کی تہمتوں سے محفوظ رہتی ہے۔

جہاں مغرب میں پیشہ یا شغل کا حصول عورت کے لئے شادی سے زیادہ مقدم تصور کیا جاتا ہے، وہاں مشرق کی ذہنیت عورت کو ایسے کام کا اہل نہیں سمجھتی اور نہ مشقت عورت کے شایانِ شان سمجھی جاتی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں لڑکیاں چاہے جتنے بھی خیالی پلاؤ پکالیں، اور سوئے ہوئے خوابوں کو جگالیں لیکن تعلیم سے فارغ ہوتے ہی تلاشِ بَر کے سوا اور کوئی جذبہ کام نہیں کرتا۔ بڑے بڑے ارادے، اصلاحِ قوم، ملک کی خدمت، ہندوستان کو جنتِ ارضی بنانے کا پروگرام وغیرہ وغیرہ جو کالج کی زندگی میں شب و روز دماغ میں چکر لگایا کرتے تھے قصۂ ماضی بن کر رہ جاتے ہیں۔ شادی ہوئی اور دل سے پرانے ڈھرے پر آلگیں۔ اچھے کپڑے اور قیمتی زیور پہننے کو مل گئے، موٹر سواری کے لئے موجود ہے، ڈنر، پارٹی، پکنک، ڈانس اور سینما جیسی رنگ رلیاں ہیں اور اس کے سوا چاہیئے کیا؟ قوم جائے جہنم میں، ملک جائے چولھے میں، ہندوستان دوزخ بنے یا جنت، ان کی اپنی زندگی تو جنت ہے۔ لیکن زندگی تو بغیر کالجوں میں پڑھے ہوئے بھی جنت بن سکتی تھی۔ انگریزی تعلیم سے اتنا فرق ضرور ہوا کہ یہ جنت بجائے گھر کی چار دیواری میں محدود رہنے کے گھروں سے باہر نکل گئی۔ یہ ہیں جناب! احساسات ان لوگوں کے جن کو [illegible] کہا جاتا ہے۔

جمہوریہ امریکہ میں یورپ اور امریکہ کی "ترقی نسواں" کی تحریک سے متاثر ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ ہندوستانی عورت کو جو درجہ ملنا چاہیے وہ ہندوستان نے اب تک اُس کو نہیں دیا۔ حصولِ تعلیم کے بعد بعض عورتیں [illegible] ستانی بن گئیں اور شاذو نادر ڈاکٹر ہو گئیں۔ الشاء اللہ خیر سلا۔ [illegible] اور تعلیم کے علاوہ اور کون کام ایسے ہیں جو ہندوستانی عورت بغیر مشقت اور توہین کے کر سکتی ہے؟ جواب ملتا ہے کہ تھیٹر اور فلم میں اداکاری کو فرسودہ خیال اور تنگ نظر لوگ باعثِ ذلت سمجھتے ہیں، ہندوستانی لڑکیاں ٹائپ اور مختصر نویسی کی طرف مائل نہیں ہوتیں، اخبار نویسی کے لئے عورتوں کو سہولتیں نہیں دی جاتیں اس لئے بلا معاوضہ تفریحِ طبع ہی کے لئے مضمون نگاری ممکن ہو سکتی ہے۔ اور یہ کام وہی عورتیں کر سکتی ہیں جو مالی تفکرات سے آزاد ہوں یعنی یا تو شادی شدہ عورتیں یا متمول گھرانے کی لڑکیاں جن کے پاس دنیائے صحافت میں نام کرنے کے لئے فرصت ہی فرصت ہے۔

وکالت کے پیشے میں زیادہ کشش نہیں، دکانداری اور تجارت کرنا خلافِ شان ہے۔ ایسی ذہنیت ہوتے ہوئے پھر کیوں نہ شادی کی طرف دل راغب ہو؟ انہیں "روشن خیال" افراد کا یہ بھی کہنا ہے کہ یورپ میں ناکتخدا عورتوں کی زندگی ویسی ہی آزاد اور مسرت آمیز ہے جیسی کہ مردوں کی، اس لئے کہ اُن کی فہم و فراست اُن کی مطلق العنانی اور خودداری کو عوام قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور حکومت اُن کے جذبات کا احترام کرتی ہے۔ یہ رہے ہمارے ملک کے اُس طبقے کے احساسات جن کی آنکھوں کو مغربی تمدن کی ہر تڑپ چکا چوند کر دیتی ہے۔

اب ذرا اس تحریک کے گہواروں یعنی یورپ اور امریکہ کی طرف تھوڑی دیر کے لئے توجہ کیجئے اور ہٹ دھرمی کو بالائے طاق رکھ کر تحقیق کی روشنی میں اس گورکھ دھندے کو دیکھئے تو آپ کو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی نظر آجائے گا۔ ان ملکوں میں "ترقی نسواں" کی تحریک کا مطمحِ نظر عورت کو مرد کا ہم پلہ بنا دیتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہوئی کہ شادی سے عموماً اور ماں بننے سے خصوصاً عورت کو متنفر کر دیا جائے۔ اس تحریک کے بانی عام طور پر وہ مرد اور عورت بتائے جاتے ہیں جن میں یا تو جنسی صلاحیت مفقود تھی یا جن میں ایسے فطری عیوب تھے جن کے سبب جنسِ مخالف کا میلان ان کی طرف نہ ہوتا تھا۔ اِس

تحریک کو تقویت اور رجحانات کے [illegible] پر دو ترغیبوں سے [illegible] ایک تو زیادہ متمدن بننے کی پکار اور دوسرے کاروباری [illegible] کی شورش۔ پہلی ترغیب کے زیرِ اثر شہر زندگی کی جڑیں [illegible] جہاں دیہات میں ایک نئے بچے کی آمد خوشی و مسرت کا [illegible] سے تصور کی جاتی ہے کہ خاندان کا ہاتھ بٹانے کے لئے دو [illegible] اضافہ ہو گیا۔ وہاں شہر میں بچے کا ہونا تعیش خیال کیا جا [illegible] الفاظ میں یوں سمجھئے کہ شہریوں کو اس لئے بچے پیدا کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ کہیں پڑوسیوں اور دوستوں میں میاں بیوی کے بانجھ ہونے کا شبہ نہ پیدا ہو جائے۔ یا صاف صاف یوں کہیئے کہ اولاد جنسی خواہشات کے حصول کا اتفاقیہ نتیجہ ہوتی ہے۔ انجام بالآخر یہ ہوتا ہے کہ شہری [illegible] صاحبِ عیال والدین پر پھبتیاں کسی جاتی ہیں اور انہیں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ سوسائٹی کے طنز کا اثر جو ہوتا ہے وہ تو سبھی جانتے ہیں۔ میاں بیوی میں غیر فطری تعلقات کا قائم ہو جانا لازمی ہو جاتا ہے جو حد سے متجاوز ہونے پر اکثر بربادی کا باعث ہوتے ہیں۔

دوسری ترغیب، یعنی کاروباری زندگی کی طرف میلان ہونے کا اثر یہ ہوا کہ مزدور ارزاں ہو گئے اور بچوں کی محبت کے سبب زیادہ تندہی کے ساتھ ان کے لئے قوت کا سامان مہیا کرنے پر ماؤں کی آمادگی سے کارخانوں کے مالکوں کی گرفت اس پر زیادہ ہو گئی۔ اس لئے مزدوروں کے طبقے میں ان بے درد مالکوں نے عورتوں کی تعداد بے دھڑک بڑھانی شروع کر دی۔ اور اس خود غرض ہمت افزائی نے تحریکِ ترقیِ نسواں کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔ لیکن ناسمجھ سرمایہ داروں کے دماغ میں یہ تخیل کبھی نہ آیا کہ اُن کے اس اقدام سے نچلے اور اوسط طبقے کی گھریلو زندگی کو کیا نقصان پہونچے گا اور نہ وہ یہ سوچتے کہ صنعتی انقلاب کے قبل جو خاندانی روایات ماں سے فطرتاً لڑکی کو ورثہ میں ملتے تھے ان پر کیا اثر ہوگا۔

اب سے پچھتر سال قبل اس موضوع پر ریمنر بارکس بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"عورتوں میں غیر جنسی رجحان پیدا کر دینے کی ذمہ دار نہ تو لندن کی عورتیں ہیں اور نہ وہ انجمنیں ہیں جو زمانہ کے مطابق استری سدھار کا کام کر رہی ہیں، بلکہ اس کی ذمہ داری اُن سرمایہ داروں اور تاجروں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے مزدوروں کے گھروں کو دن کے دس گھنٹے ماؤں سے خالی رکھا، گھروں سے نکال کر انہیں اپنے فطری فرائض انجام دینے کی مہلت نہ دی اور اگر یہ عورتیں کوشش کرتیں کہ خانہ تعلیم [illegible]

مالکوں نے بہت سے سرمایہ داروں نے بھی اس سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ اسکی مثال کے طور پر ہوئے ایک تقریب کے دوران میں لارڈ ڈانیشل نے برطانوی پارلیمنٹ میں بیان کیا کہ "مجھ سے ایک کارخانہ کے مالک نے ذکر کیا کہ وہ کپڑا بننے کے کارخانے میں محض عورتوں کو بھرتی کرتا ہے اور یہ بھی نہیں بلکہ شادی شدہ عورتوں کو عموماً اور بچے والیوں کو خصوصاً کنواری عورتوں پر ترجیح دیتا ہے اس لئے کہ وہ کام میں زیادہ محنتی، نیک اور دیانتدار ثابت ہوتی ہیں۔ کنواریوں سے زاید ایسی عورتوں کو ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے۔"

یہ ہیں جناب! طبقۂ نسواں کی خوبیاں۔ وہ عجیب خوبیاں جن کو غلط سانچے میں ڈھال کر عورت کو دُکھ پہونچایا جارہا ہے۔ جو خصوصیت کہ اس کی فطرت کا نفیس ترین جوہر ہے اس سے ناجائز فائدہ اُٹھایا جاتا ہے اور اس کی خوبی کو خود اسی کی پابندیوں اور مصیبتوں کا آلہ بنایا جاتا ہے۔

اس طرح پر بہتیرے اقدام نے نادانستہ تحریکِ "ترقی نسواں" کی اغراض پوری ہونے میں مدد کی۔ لیکن اگر اس "تہذیب" میں جولیت کے نمایاں عنصر، نسوانی نقطۂ نظر اور ضروریات سے غفلت اور تحریک کے رہنماؤں میں جنسی فقدان، وغیرہ کی پشت پناہ جسمانی مسئلوں اور خصوصاً جسمانی اختلافات سے عدم توجہی نہ ہوتی تو کوئی اقدام بھی اس تحریک کا حامی نہ ہوسکتا۔ سقراطی تخیل کے زیر اثر اس بنیادی میلان نے ہماری تمام زندگی ہی کو نہیں بلکہ ہماری سائنس کو بھی اپنے رنگ میں رنگ ڈالا ہے۔ یورپ اور امریکہ کی نئی پود کے لئے اس کا احساس بالکل ناممکن ہوگیا ہے کہ کس حد تک جسمانی اختلاف سے بے توجہی کا تخیل ان کے رگ و پے میں سمایا ہوا ہے۔ لیکن اگر تیس سال کے مرد یا عورت کو بے دانت دیکھکر انہیں اچنبھا نہیں ہوتا اور اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انسانی کمزوریوں اور ذلالت سے ہمیں اخلاق، تمدن، موسیقی، آرٹ وغیرہ کی تلقین ہوسکتی ہے تو یہ ذہنیت محض سقراط کی تعلیم اور اس کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ سقراط قدردانانِ حسن کے حلقے میں ایک کریہہ المنظر انسان تھا۔ اس کی شہرت اور مقبولیت کی خاص وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے عیب پر پردہ ڈالنے پر مجبور تھا۔ اُس نے ایک نئے فلسفے کی بنیاد ڈالی جس میں ہر طرح کی جسمانی کمزوریاں، ہر قسم کی انسانی ذلالت، کثافت اور کوتاہی کو ناقابل اعتنا بتانے کی کوشش کی گئی۔ وہ خود یہ مانتا ہے کہ تمام عمر اس لئے روح کو جسم پر فوقیت دینے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ جسمانی خوبصورتی معمولی امر ہے اور صرف روحانی خوبیوں ہی کو ترقی دینا انسانی زندگی کا مقصد اصلی ہو۔ اگر کسی شخص میں محض کوئی جسمانی عیب ہو تو ہمیں اس سے درگذر کرنا بلکہ اسے محبوب رکھنا چاہیئے۔ اس تعلیم کے زیر اثر جسمانی اختلافات کی طرف توجہ کم ہوتی گئی اور جب یہ سقراطی اثر جنس کی طرف منتقل ہوا تو یہ تخیل پیدا ہونے لگا کہ مردوں اور عورتوں کے جسمانی فرق سے ان کی فطرت، ذہنیت اور صلاحیت میں فرق ہونا لازم نہیں۔ اس خلاف عقل تعلیم پر روشن خیالی کے دور میں تو کوئی اعتنا نہ کرتا، لیکن سقراط کا زمانہ وہ تھا جب یونان اخلاقی پستی میں گر چکا تھا اور لوگوں میں امرد پرستی عام ہورہی تھی۔ خود سقراط بھی اس قبیح رواج کا شکار تھا۔ پھر بھی یونانیوں کو بہت جلد ہوش آگیا اور نوجوانوں کو بدچلن بنانے کے جرم میں سقراط کو موت کی سزا دیدی گئی۔ لیکن بدقسمتی سے اسکے دو شاگرد اس کی تعلیم کو آنیوالی نسلوں تک پہونچانے کیلئے زندہ رہ گئے اور اس طرح یہ اخلاق شکن فلسفہ ہم تک پہونچا۔

آج کل کا یورپ تو بالکل سقراطی تعلیم کا مدرسہ بنا ہوا ہے جس کی ادنیٰ مثال آپ کو انگریزی اور فرانسیسی لٹریچر سے مل سکتی ہے۔ ان ناولوں میں اپاہج، لاغر اور معذور لوگوں کو شادی کے قابل ثابت کرنے کی عجیب و غریب دلیلیں ملتی ہیں اور انہیں خاص اعزاز کے قابل بتایا جاتا ہے۔ کوئی تہذیب جس کا دامن سقراطی اثرات سے پاک ہے ایک پل کے لئے یہ گوارہ نہیں کرسکتی کہ ایسی اخلاق شکن کتابیں لکھی یا مطالعہ کی جائیں۔ بہرحال ایسے ماحول میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ "ترقی نسواں" کی تحریک نے مرد و عورت کی صلاحیتوں کے اختلافات کو جھٹلانے کی کوششوں میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا اور جب سقراطی اثر کے ساتھ تمدن میں رجولیت کا عنصر نمایاں طور پر شامل کردیا گیا تو لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مردانہ خوبیاں نسوانی حُسن کا بھی معیار بن گئیں اور فی زمانہ جوان لڑکیوں میں لڑکوں کی شباہت پیدا کرنا اور اس کی قدر ہمہ گیر ہوگئی۔ لیکن نسائی دنیا کا مردانہ رجحان عورتوں کے لئے کئی طرح سے بہت مضر ہورہا ہے۔ قبل اس کے کہ اس تحریک کے اثرات مادی عیوب کی شکل میں نمایاں ہوں یہ تو ظاہر امر ہے کہ مغربی تمدن سے نسائی خیالات، اثرات، جذبات اور احساسات رفتہ رفتہ زائل ہورہے ہیں۔ اس خیال کی حمایت میں دو مشہور خواتین کی رائے بطور نمونہ پیش کی جاسکتی ہیں۔ ان مصنفوں نے "ترقی نسواں" کی تحریک کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ آجکل کے روس نے اس تحریک کو جتنی ترقی دی ہے اتنی کسی اور ملک میں نہیں [illegible]

اس تحریک کے مطالبات کے مطابق برتھ کنٹرول اور اسقاطِ حمل کو قانونًا جائز کر دیا گیا ہے اور ان کی ترویج عام ہو گئی ہے۔ لیکن اسی ملک کی ایک مشہور معتقد ملیار جینو لکھتی ہے کہ "دنیا کے اس حصہ (روس) میں اب یہ کہنا فیشن ہو گیا ہے کہ روسی عورتوں نے انقلاب سیاسی کو اپنی ترقی کا ذریعہ سمجھ کر اس کا خیر مقدم کیا اور یہ ایک حد تک سچ بھی ہو۔ لیکن جب آپ تحقیق کی نظر سے ہمارے سوویٹ لٹریچر کا مطالعہ کر کے خیالات کی تہ تک پہونچنا چاہتے ہیں تو آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوتا ہے کہ ہر مصنف روسی عورت کو محض ایک بنی نوعِ انسان کی طرح پیش کرتا ہے، عورت کی حیثیت سے نہیں۔ اس کے لئے ہر راستہ کھلا ہے، وہ کوئی بھی پیشہ اختیار کر سکتی ہے۔ لیکن جہاں تک اسے اپنے بچے سے محبت کرنے کا حق اور اپنے محبوب مرد کی خبر گیری کے فرائض کا تعلق ہے ان سے وہ کوسوں دور کر دی گئی ہے۔ اور اس ستم ظریفی کا کون ذمہ دار ہے؟ مرد! سوا اس کے اور خیال آ ہی نہیں سکتا کہ ہم ایک ایسے دور اور ماحول میں رہ رہے ہیں جہاں اخلاق کا معیار مردانہ نقطۂ نظر سے قائم کیا گیا ہے کیونزم کی عمارت میں ایک اینٹ بھی ایسی نہ ملے گی جسے کسی تخیل کے ماتحت بھی نسائی کہا جا سکے......"

اب ذرا ایک مقتدر خاتون ڈاکٹر کی رائے بھی ملاحظہ کیجئے۔ ڈاکٹر ایستھر ہارڈنگ نے تحریک "ترقی نسواں" اور عورتوں کی رجولیت کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔ اس تحریک کے خراب اثرات کو وہ ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں:

"اکثر ہم یہ دعویٰ سنتے ہیں کہ حیاتیاتی تفریق کے علاوہ مرد و عورت میں کوئی فرق نہیں۔ بہتیری عورتوں نے اس نقطۂ نظر کو پسند کیا اور اس کی حمایت میں سرگرم ہوئیں۔ انہوں نے فراک میں مرد بن کر رہنا پسند کیا اور خود اپنے اندرونی نسائی اصولوں سے بے خبر رہیں۔ شاید سب سے بڑا راز جذبات کے مرنے اور مسرت کے عنقا ہو جانے کا اسی تخیل میں مضمر ہے۔ اکثر ایسی خواتین کی ذاتی زندگی مصائب و آلام کا شکار انہیں نسائی اصولوں سے بے توجہی برتنے کی وجہ سے ہوئیں۔ بہت جلد اس کی ضرورت ہے کہ اس نسائی اصول زندگی سے واسطہ قائم کر کے مغربی تہذیب میں جولیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک دیا جائے......"

لیکن اس سیلاب کو کس نے بڑھنے دیا اور کون روکے؟ اس کی ذمہ داری موجودہ سوسائٹی پر عائد ہوتی ہے اور خصوصًا والدین پر۔ یہ "روشن خیال" والدین لڑکیوں کی شادی کرنا اپنا فرض ہی نہیں سمجھتے۔ ان کا تو یہ تخیل ہے کہ لڑکی کو [illegible] دلا دی جائے یا اسے کسی پیشے کی مہارت حاصل کرا دی جائے اور پھر رجولیت پیدا کرنے کے ہر ممکن مواقع مہیا کر دئے تو [illegible] ان کے فرائض ادا ہو گئے۔

بعض افراد کا خیال ہے کہ اقتصادی مجبوریاں [illegible] یہ ذہنیت پیدا کرنے کی ذمہ دار ہیں اور یہی دلیل زیادہ [illegible] کے حق میں بھی پیش کی جاتی ہے۔ لیکن اقتصادی حالات کی تشکیل کرنے والا کون ہے؟ خدائی قانون نے تو یہ گورکھ دھندا بنایا نہیں اور نہ یہ مجبوریاں کسی اٹل انسانی قانون کی بنائی ہیں۔ یہ تو وقت اور زمانہ کے نصب العین، مرضی اور رجحان کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ صنعتی انقلاب غیب سے تو نازل ہوا نہیں، روس میں سوشلزم کسی آسیب کا کرشمہ تو تھا نہیں، پھر جب اقتصادی سہارا بگاڑ محض انسانی کھیل ہیں تو ان کی آڑ ڈھونڈنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مثال کے طور پر جرمنی کو لے لیجئے۔ وہاں انہیں اقتصادی حالات کو یوں آنًا فانًا پلٹ دیا گیا کہ شادیاں ہزاروں کی تعداد میں بڑھنے لگیں۔ اور یہ صرف سربرآوردہ مدبرین کے عوام کی ذہنیت اور رجحان کو بدل دینے سے ممکن ہوا۔ کوئی غیبی امداد انہیں نہیں پہنچی اور نہ خلافِ فطرت انسانی طاقت سے باہر قوانین کا نفاذ اس تبدیلی کا باعث ہوا۔

"ترقی نسواں" کے حامیوں میں مسز برٹرینڈ رسل کی ہستی بہت ممتاز ہے۔ ان کا بھی خیال ملاحظہ ہو کہتی ہیں کہ "عورت کے لئے اس کی جنس بغیر شادی اور بچوں کے بھی فخر، حسن اور مسرت کا باعث ہو سکتی ہے۔ فقدانِ جنس نہیں بلکہ جنس کے احساسات ہی اس کو آزادی سے روزی کمانے کا حق قائم کرنے کی تلقین دیتے ہیں۔ قطع نسل کے طریقوں کو استعمال کر کے جنسی خواہشات کو پورا کرنا عورتوں کے لئے ممکن اور روا ہے۔ غیر شادی شدہ عورت کے لئے "آزاد محبت" وہی مسرتیں بخش سکتی ہے جو شادی اور ماں بننے سے حاصل ہوتی ہے (اس سے مراد برتھ کنٹرول اور اسقاطِ حمل کا جواز ہے) اور پھر اس طرز زندگی میں وہ سب صعوبتیں نہیں جو شادی کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں......"

اسی قسم کے تخیلات رسکن اور اسٹوارٹ مل کے بھی ہیں۔ لیکن یہ طبقہ ان لوگوں کا ہے جن میں جنسی احساسات مفقود یا [illegible] کے برابر تھے۔ اس اصلیت کی طرف تو طبقۂ نسواں کی نظر ہی [illegible]

[illegible] ہماری حقوق اور دیگر دلفریب الفاظ ہیں کہ ایسی مادیت
[illegible] سوسائٹی کے دشمنوں اور طبقۂ اناث کے قاتلوں کی آواز
پر [illegible] صدائے لبیک بلند ہونے لگی اور ترقی نسواں کی
تحریک فیشن بن گئی۔ کسی کام کے کرنے سے پہلے صرف ایک سوال ہوتا
ہے کہ کیا وہ عورت کے لائق ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو بس پھر عورتیں
[illegible] کر سکتی ہیں۔ مختصر یہ کہ جو مشاغل ہمارے باپ دادا صرف
مردوں کے لئے مخصوص سمجھتے تھے وہ اس زمانے میں عورتوں کا
مشغلہ بنتے جا رہے ہیں۔ اس ذہنیت کی بڑی وجہ مبنی اصولوں سے
بے علمی ہے۔ اس کا تدارک صحیح تعلیم کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔
مغربی ممالک میں بیداری پیدا ہو رہی ہے اور سقراطی افراط کا
تدارک کرنے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں۔ سوسائٹی کے سمجھدار افراد کو یہ احساس
ہو رہا ہے کہ والدین نے کھٹے انگور کھائے لیکن دانت کھٹے ہوئے اُن کی
نسلوں کے۔ گذشتہ پچاس سال میں 'آزادی نسواں' کی پکار نے یورپ
میں جو آفت ڈھائی ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کے لفظی
معنی چاہے جتنے بھی دلفریب ہوں عملی نتیجہ مصیبت اور زوال
کے سوا کچھ نہیں۔ جنس اور زندگی کے قانون کے حدود سے الگ ہو کر ترقی
غلط راستے پر آزادانہ چلنے کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے، اور یہی مقصد زندگی
کا فوت ہو جانا ہے۔

یورپ اور امریکہ جب لعنت کو اپنے گلوں سے نکال پھینکنے کی
تدبیر کر رہے ہیں کیا ہندوستان کی غلامانہ ذہنیت اسے تحفہ سمجھ کر اپنے
گلے کا ہار بنانے کی متمنی ہے؟ سوچئے اور بار بار سوچئے۔ کہیں ہماری
[illegible] کورانہ تقلید ہماری سادہ اور مقدس تہذیب کو مغرب کی اگلی
[illegible] شراب کے پینے پر آمادہ نہ کر دے۔ ٹھنڈے دل سے تصفیہ کیجئے
[illegible] ضروریات کو دیکھتے ہوئے اس ملک کے آب و گِل میں کس قسم کی
[illegible] کو پالا اور پوسا جا سکتا ہے!

سراج حسین نقوی!

آدمی

رات کو ہمراہ تھے میرے شبابی آدمی
جتنے اس زمرے میں تھے سب تھے شرابی آدمی

جن کے چہروں پہ چمک تھی بادۂ گلرنگ کی
میکدے کی خلد میں تھے وہ گلابی آدمی

علم کی سنجیدگی تھی جنکے چہروں سے عیاں
تھے وہ اس صحبت میں بیچارے کتابی آدمی

جنکی آنکھوں میں چمک تھی جنکی نظریں تھیں دبنگ
باغیانہ قسم کے تھے، انقلابی آدمی

زرد پڑ جاتے تھے جو سنکر صدائے مے فروش
بخل کے مارے ہوئے تھے وہ حسابی آدمی

سخت سنولائے ہوئے چہرے تھے جن احباب کے
تھے شعاعوں کی زمیں کے آفتابی آدمی

مسکرا کر زرد پڑ جاتے تھے جو گم گشتہ حال
محفل عشرت میں تھے وہ اضطرابی آدمی

جنکے چہرے سخت ہوتے تھے کبھی پڑتے تھے نرم
خلوتوں کی یاد میں تھے وہ شبابی آدمی

جنکے رخساروں پہ تھیں بزم آرائیاں چھائی ہوئی
تھے سیہ مستوں کے طوفاں میں حبابی آدمی

جنکے چہرے پر تھی موسیقی کی موج بے پناہ
عالم تخئیل میں تھے وہ ربابی آدمی

جنکے چہروں پہ تھی رقصاں چاند کے کرنوں کی ضو
نرم و نازک قسم کے تھے ماہتابی آدمی

تھا اسی صحبت میں شامل قبلۂ ہندن جلال
اک شرابی، اضطرابی، انقلابی آدمی

خلجانِ خرد

سوال

زیست اے زیست تجھکو کیا کہئے؟ — آرزوؤں کا سلسلہ کہیئے؟
بزمِ عشرت ہے تو حقیقت میں — تجھکو یا رزمِ ارتقا کہیئے؟
کشمکش ہے تری جبلّت میں — بیقراری کی انتہا کہیئے؟
جوہرِ برقِ سوز و ساز ہے تو؟ — عکس تجھکو کہ آئینہ کہیئے؟
بلبلِ سدرہ آشیاں ہے کوئی؟ — تجھکو یا موجۂ صبا کہیئے؟
نور کا تو ہی کیا ہے سرچشمہ؟ — تجھکو یا مہر کی ضیا کہیئے؟
غرقِ دریائے فکرِ ذوقِ سلیم — بحر تجھکو کہ بلبلا کہیئے؟

کیف و کم تیرا اک معمّا ہے
زیست بتلا تو ہی کہ تو کیا ہے؟

جواب

کُن فکاں سے ظہور ہے میرا — سرمدی اک سرور ہے میرا
شعلہ ساماں شعاعِ مضطر ہوں — سرمدی اک سرور ہے میرا
لن ترانی کی آگ ہوں گویا — حاصلِ سوز نور ہے میرا
ذرۂ آفتاب سیرت ہوں — میری تابش حضور ہے میرا
سانس کے تار تار میں نغمے — ساز ہی ناصبور ہے میرا
خاک اگر مجھ سے پاک ہو نہ سکے — میں ہوں مجرم قصور ہے میرا
دامِ فکر و نظر بغل میں لئے — دشت پیما شعور ہے میرا

کیف و کم میری خود شناسی ہے
عکس آئینہ اس کا ناسپاسی ہے

نو روپے چَوَن آنے

اب تو خیر وہ ایک کامیاب آدمی ہے، سو فی صدی کامیاب نہیں تو پچھتّر فی صدی تو یقیناً، اور اتنی کامیابی آخر کچھ کم تو نہیں ہوتی۔ بلکہ اس بے ربط ناہموار زندگی میں تو پچاس فی صدی کامیابی کو بھی کسی آشیرباد کا پھل سمجھ کر قبول کرنا چاہیئے۔

بڑا گورا آبدار رنگ ہے اس کا۔ بانس کی طرح لمبا تڑنگ قد۔ آنکھیں پوری پوری کالی۔ بڑا ہی باحس اور من موجی بندہ ہے۔ تصوّف کے رس کا واقف۔ آپ اُسے دیکھ کر جھٹ کہہ اٹھیں گے کہ اُس کی رگوں میں براہ راست آریہ نسل کا خون دوڑ رہا ہے۔ مگر آپ تو ادھر گاؤں میں پیدا ہوئے یہیں بڑے بھی ہو گئے۔ کبھی شہر میں آؤ گے تو آپ کو اُن سے ملانے لے چلونگا۔

ادھر اُس نے کئی بہت اچھے افسانے لکھے ہیں۔ اور آپ تو جانتے ہی ہیں، پنڈت جی، کہ کچھ افسانے محض دلچسپ ہوتے ہیں۔ ہمارے دیس میں ان کی بہت کھپت ہوتی ہے۔ ہمارے دیس میں ہی کیوں، میں تو کہونگا سبھی دیسوں میں "دلچسپ" افسانے ہی مقبولِ عام ہوتے ہیں، مگر معیاری افسانوں کی بات کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ ان کی تخلیق کے لئے چاہیئے ذہانت — تجربے اور روشن خیالی میں بسی ہوئی ذہانت۔ یہ افسانے کی تہ میں چھپ کر بیٹھ جاتی ہے۔ یہ اس موتی کی طرح ہوتی ہے جسے حاصل کرنے کیلئے سیپی کا سینہ چیرنا پڑتا ہے۔ موثر حقیقت نگار تو وہ ہے ہی، اس کا افسانہ اُس کی اپنی شخصیت کو کسی نہ کسی طرح پڑھنے والوں کے روبرو شگفتہ کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کا مشاہدہ سدا ٹھیک بیٹھتا ہے۔ بیان کی بے ساختگی کو وہ کبھی ارادی پیچ و خم سے بہت بلند چیز سمجھتا ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ ادھر پہلے پہل اُسی کے افسانوں نے ترقی پسند ادب کی داغ بیل ڈالی تھی۔ معیاری افسانے گیہوں کے پلے ہوئے، بڑے بڑے دانوں کی طرح ہوتے ہیں، پنڈت جی، جن میں خوردنی مادہ کی بہتات ہوتی ہے۔ لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اچھے گیہوں کو ہر کوئی پسند کرتا ہے، اور ان افسانوں کو "دلچسپ" افسانوں کی مقبولیت سدا پچھاڑتی رہتی ہے۔

اُسے قطعاً پرواہ نہیں کہ اس کی چیزیں پڑھنے والوں کا حلقہ بہت محدود ہے۔ مگر وہ خوش ہے کہ اپنے اس حلقہ میں اُس کی عزت بڑھتی جا رہی ہے۔ اب تک اُس کے افسانوں کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اور

آپ یہ سنکر حیران رہ جائیں گے پنڈت جی، کہ اس نے اپنے پانچوں کے پانچوں مجموعوں کا انتساب اپنی بیوی کے نام کیا ہے۔

شروع میں اُس کی بیوی اُس کی اختراعی قابلیت کی کوئی بڑی مداح نہ تھی۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ شادی کے فوراً بعد ہی وہ یہ سمجھنے لگی تھی کہ وہ ایک بدقسمت عورت ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اُسے لے کر لاہور چلا آیا تھا۔ اُس کی بیوی اس گھوڑی کی طرح تھی جسے دن بھر تانگے کے آگے جُتنا پڑے مگر وقت پر دانہ یا کم از کم ہری گھاس بھی نصیب نہ ہو۔ بھوک بہت بُری بلا ہوتی ہے، پنڈت جی! چنانچہ یہ عورت چڑچڑی ہوتی چلی گئی۔ بھوکی، اور کھا پی کر موٹی ہوئی گھوڑی کی ہنہناہٹ میں بھی کتنا فرق ہوتا ہے۔ رو رو کر اس عورت نے اپنی آنکھوں کی بہت ساری سُندرتا گنوا ڈالی۔ اور اب وہ اپنے خاوند کی طرف نگاہ گاڑ کر دیکھنے لگتی تو وہ بے چارہ یہی سمجھتا کہ یہ نگاہ پتھر میں بھی سوراخ کر ڈالے گی۔ وہ جھنجلا اٹھتا۔ کیسی عجیب عورت ہے، کتنی کوری کوری آنکھیں ہیں — جذبات سے خالی! جیسے من کے ساتھ اِن کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ اور اس پر بھی وہ سمجھتی ہے کہ وہ ایک وفاشعار بیوی ہے، سپنوں میں بھی خاوند کے نام کی مالا جپنے والی —!

ایک دن وہ قلم لیکر بیٹھا تو اُس نے اپنے تاثّرات اپنی بیوقوف اور بھوکی بیوی کے گرد گھمانے شروع کر دیئے۔

حرامزادی!.... بڑی آئی ہے بیوی... بیوی... وفاشعار! بولتی ہے تو زخموں پر نمک چھڑکتی ہے۔ اور پھر جب غصّے کی آگ سرد ہو جاتی ہے تو نگاہ گاڑ کر کوری آنکھوں سے میرے آر پار دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔ اس سے تو خفیہ پولیس والوں کی آنکھیں ہی کم دہشتناک ہوتی ہونگی۔ اب میں اُسے کیسے سمجھاؤں کہ یوں وہ مجھے بہت ہی بدصورت نظر آتی ہے۔ آدھی خوبصورتی تو قدرت کا تحفہ ہوتی ہے اور آدھی عورت کے اپنے اختیار کی چیز ہوتی ہے۔ مگر وہ [illegible] سے ملی ہوئی خوبصورتی کو بھی غصّے کی آگ میں جھلس رہی ہے [illegible] عورت۔ کاش اُسے سمجھ آ جاتے کہ جب آنکھوں میں خوشی [illegible] تو یہ کتنی سندر ہو اٹھتی ہیں۔ آنکھوں کی [illegible]

کبھی اِدھر کبھی اُدھر، پھر اُدھر، پھر اِدھر۔ اور آنکھیں یوں مُڑا کریں کہ آنکھ بھی اس کے من ہی لگتا رہے .... مگر نہیں، یہ سب میرے حصّے میں نہیں ... بھرے نے ایسی نری کوری کوری آنکھیں اور ان کے پیچھے اُس عورت کا کھوکھلا دماغ جو شاید خرگوش کے دماغ سے بھی گیا گزرا ہو! ....

بھیک! ہاں بھیک تو دے ... ہے۔ مگر میں بھی تو بھوکا ہوں۔ اب کہاں بھیجوں اپنا من، اپنا من انہیں ... بھوکا نہیں ....

پھر اُس نے قلم پرے پھینک دیا اور کاغذ کا پُرزہ جس پر اپنے خیالات نقل کئے تھے۔ پھاڑ ڈالا۔

اُس کی کسی چیز سے تسلّی نہ ہوتی۔ وہ بار بار کچھ لکھنا شروع کرتا اور پھر اپنے ہی ہاتھوں سے کاغذ پھاڑ ڈالتا۔ جب بھی وہ کوئی نئی چیز لکھنے بیٹھتا اُسے یوں محسوس ہوتا کہ وہ سب ادھوری تحریریں، جنہیں وہ اپنے ہاتھوں سے پھاڑتا رہا ہے، اُس کے گرد آوارہ روحوں کی طرح ناچنے لگی ہیں۔ وہ ڈر جاتا۔ سچ مچ وہ ایک خونی ہے اور اُس نے ایک خون پر اکتفا نہیں کی بلکہ دس خون کئے ہونگے۔ اپنے بچّوں کا گلا گھونٹنا بھی تو جرم ہوتا ہے۔ اور آدمی کی اپنی تحریر اپنی اولاد ہی تو ہوتی ہے۔

ٹیوشن کے علاوہ اُسے ایک کتاب کے ترجمہ کا کام مل گیا تو اُس نے سوچا کہ اب وہ اپنی بیوی کو خوش کرے گا اور جب گھر میں شانتی ہو جائیگی تو شاید وہ اپنے تھکے ہوئے ڈانواڈول من کو اس قابل بنا لیگا کہ وہ علم و ادب کی تخلیق میں ڈٹ جائے۔ مگر اس کا خیال غلط نکلا۔ نئی آمدنی کوئی نئی خوشی نہ دے سکی۔

اُس نے سوچا کہ بہت سارا غم تو زندگی کیلئے نہایت ضروری ہے۔ اسی کی بدولت آنند آنند معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب نیا روپیہ آئے تو پُرانے غم کو تو بھاگ جانا چاہیئے! ... چولہا بجھ چکا ہے، ٹھیکرے سی ٹھنڈی روٹی حلق سے نیچے نہیں اُترتی ... دال میں جیسے تیزاب ملا دیا گیا ہے ....

یہ عورت کسی طرح مر جائے، وہ سوچنے لگتا، اب یہی ایک صورت ہو سکتی ہے اُس سے اپنے بچاؤ کی۔ پھر وہ من ہی من میں اپنے اوپر لعن طعن کرنے لگتا۔ یوں سوچنا تو انسانیت نہیں۔ وہ مر کیوں جائے۔ جئے، سو برس تک جئے۔ مگر ذرا ٹھیک ہو کر، ذرا پیار کے ساتھ۔ مورکھ عورت! جب وہ پہلے پہل آئی تھی تو ایک دن اُس نے کہا تھا کہ کلجگ میں تو پتی ہی استری کا بھگوان ہوتا ہے ... اب کہاں مر گیا وہ بھگوان! ... اس کلجگ کو شروع ہوئے پانچ ہزار برس ہونے کو آئے۔ لوگ کہتے ہیں ... پانچ ہزار برس! اور طلاق کا مسئلہ اتنے لمبے عرصے میں بھی حل نہ کیا جا سکا۔ اگر کسی طرح اس عورت کو چھوڑ سکوں یا یہ کچھ کر ... خود ہی چھوڑ دے تو مکتی ہو جاؤں۔ جی چاہتا ہے کہ اسے جنوبی ہند کے کسی مندر میں ہی چھوڑ آؤں، دیو داسی ہی بن جائے۔ کسی کام تو آئے .... نہیں نہیں، میں یہ کیا سوچ رہا ہوں!

پھر ایک دن یہ مشکل آسان ہو گئی۔ ترجمے کی مزدوری کی آخری قسط ساری کی ساری اُس نے اپنی بیوی کیلئے پازیب خریدنے پر خرچ کر ڈالی۔ چاندی کی پازیب۔ بیسویں صدی کے سُنار نے اس کی ساخت میں اپنی جدت پسندی کا ثبوت دیا تھا۔ بیچاری عورت کے پاس لے دیکر داہنے چھنگلیا میں کی انگوٹھی کے سوا کوئی دوسرا زیور نہ تھا۔ جب وہ لاہور آنے لگی تھی تو ساس نے اس ڈر سے کہ کہیں اس کا نالائق بیٹا اُسکے زیور نہ بیچ کھائے سب زیور اُتار کر رکھ لئے تھے۔

پہلے روز تو اس عورت نے پازیب کو چھونا بھی منظور نہ کیا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ مان گئی۔ عجب جھنکار نکلا کرتی تھی۔ جونہی پازیب کے سُر فضا میں گونج اٹھتے وہ سوچتا کہ اس کی بیوی ابھی ایک نئی دُلہن ہے، حیا کی پتلی جس کے من کے آسمان پر پیار دھنک کی طرح اُجاگر ہو رہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ دھنک ہر روز نظر نہیں آتی مگر اس کی یاد تو بچی رہتی ہے اور جب جب ہم اسکے رنگوں کو فراموش کرتے نظر آتے ہیں بیچ بیچ میں یہ پھر درشن دے جاتی ہے۔

اُسے یاد آیا کہ ایک فلسفی نے ادیب کو شاہوں کا شاہ بتایا ہے۔ مادی تکلیفوں کے روبرو اُس کی شانتی درہم برہم کیوں ہو جائے۔ غریبی تو آنی جانی شے ہے۔ اُسکے ذہن پر رنگ چڑھ رہا تھا جیسے یہ اُشا کے وقت کا آسمان ہو جس کے نیچے دھرتی چپ لیٹی رہتی ہے، شانتی سے لطف اندوز ہوتی ہوئی۔ پاس کے مکان سے کسی نئے ریکارڈ کے بجنے کی آواز آرہی تھی۔ اس میں کسی گرہستن کی شکایت تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ پو پھٹتے ہی دوجی منزل کی چھت پر بیٹھکر وہ روز دہی بلویا کرتی ہے۔ گھر کا ہر ایک فرد اُس کے ساتھ سخت کلامی سے پیش آتا ہے اور اگر اُسے کسی چیز نے زندہ رکھ چھوڑا ہے تو وہ ہے اپنے خاوند سے ملنے والی تسلّی۔ اگر اپنا خاوند بھی چڑچڑا ہو جائے، اس نے سوچا، تو بیچاری جھٹ خودکشی کرلے .... اس کا سارا دھیان اپنی بیوی کو زیادہ سے زیادہ تسلی دینے کی طرف ہو گیا۔

ایک دن بات چیت کے دوران میں اُس نے کہا تھا کہ زندگی بھی ایک سڑک سے مشابہت رکھتی ہے جسے سخت پتھروں کو کوٹ کوٹ کر تیار کیا جاتا ہے بڑے جتن سے۔ اور میں نے کہا تھا کہ جس طرح کچھ

وقت کے بعد سڑک کی مرمت کا سوال آ کھڑا ہوتا ہے۔ زندگی بھی وقتاً فوقتاً ٹھیک ٹھاک کی جاتی رہے تو بہتر نتیجے نکل سکتے ہیں۔ اور پھر سب سڑکیں ایک سی تھوڑا ہوتی ہیں۔ ادھر سڑکوں پر کولتار بچھانے کا رواج ہو چلا ہے۔ اس سے سڑک کی عمر تو بڑھ جاتی ہے جب اوپر سورج تپتا ہے کولتار کی تند سے بدبو اٹھ کر ہمیں پریشان کیا کرتی ہے۔ سڑکوں کے ساتھ ساتھ فٹ پاتھ بھی تو ہوتے ہیں جن پر کہیں بجری اور کہیں لکڑی کا بورا پھیلا دیا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ زندگی کو ایک سڑک کہہ دینے سے بات نہیں بنتی۔ زندگی تو ایک پیچ در پیچ شے ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ زندگی کے ہر پہلو کی قیمت ٹھیک اور مناسب مقرر کی جائے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ قیمتیں ہمیشہ بدلتی رہیں گی۔ پچھلے زمانے میں اپن دان کے عجیب سے فلسفے نے جنم لیا تھا۔ صدیوں تک اس کا عمل رہا۔ اب پتہ چلا ہے کہ اس سے ہم انسانی شخصیت کی سخت توہین کرتے ہیں۔ چنانچہ اپنے نئے نظام میں ہم اسے کوئی جگہ دینے کو تیار نہیں۔ دیا، پیار اور نرمی کی قیمتیں بھی ادھر بدل رہی ہیں۔ زندگی اب کتنی سبک رفتاری سے بیت رہی ہے۔ پیار کیلئے اب فرصت ہی نہ رہے گی۔ نرمی کا بھی الٹا اثر ہوتا ہے۔ نرم ہو کر دیکھ لیجئے۔ آپ تقریباً نامرد سمجھ لئے جائیں گے۔ مثل بھی ہے کہ سانپ کو پھنکارا ہرگز نہ چھوڑنا چاہیئے.....

ایک چھوڑ اُسے اب پانچ سات ٹیوشنیں مل گئی تھیں۔ خالی وقت ادب کیلئے وقف تھا۔ ان دنوں اُس نے بہت مطالعہ کیا۔ جیسے کہتے ہیں کتابوں کو کھا جانا، پی جانا، بس یہی اُس کا دستور تھا۔ کتابیں ہی کتابیں، کتابیں ہی کتابیں۔ بھلا ہو لائبریریاں بنانے والوں کا۔ حقیقی کلچر تو علم ہے اور یہ لائبریریوں کی چھتوں تلے خوب پھلتا پھولتا ہے۔

اس کی بیوی ایک نئی عورت بن گئی تھی۔ جیسے پازیب کی جھنکار کا بھی ایک سندیش ہو —— مسکراؤ اور ہو سکے تو ناچ کر سکھی، ذرا ناچ کر۔ نہ آنکھیں کوری کوری تھیں اور نہ اُس میں اور کوئی کسر تھی۔ ہاں اب ایک نیا ہی مطالبہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ اُسے اتنی دماغ سوزی سے بچنا چاہیئے۔ جب بھی خالی وقت ملا، پڑھنا پڑھنا پڑھنا۔ اس طرح تو آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔

اس مشکل کا حل اُسے میں نے ہی بتایا تھا —— بہت مطالعہ ہو لیا۔ اٹھاؤ قلم اور لکھے جاؤ۔ وہ لکھنے لگا۔ اُس کی بیوی خوش تھی۔ میں بھی خوش تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ہمارے ادب کو نئی چیزیں دینے کی قوت رکھتا ہے۔ اُسکی کیاریوں میں نیلے اودے پھول سر اٹھا رہے تھے۔

طبعاً وہ ایک انتہا پسند واقع ہوا ہے۔ لکھنے لگا تو ٹیوشنیں چھوٹنے لگیں۔ بیوی نے لاکھ سمجھایا کہ سمجھ کر چلو مگر وہ تو لکھ رہا تھا۔ یوں اس کی دُھن کی تو اُس کی بیوی بھی قائل تھی۔ اس عورت کا خیال تھا کہ کوئی اس سے دسواں حصہ بھی بھگوان کیلئے تپ کرے تو بھگوان کے درشن ہو سکتے ہیں۔ کسی طرح اُسے یقین ہو گیا تھا کہ پچھلے جنم میں اُسکے خاوند نے بہت تپ کیا تھا۔ اس تپ میں کچھ کمی رہ گئی تھی۔ اسی لئے کسی راجہ کے گھر پیدا ہونے کی بجائے وہ ایک درمیانہ طبقہ کے کنبے میں پیدا ہو گیا تھا۔ اب اس جنم میں بھلے ہی اُس کے مضامین پوری قدر و قیمت نہ پائیں، اگلے جنم میں اس کا شہزادہ ہونا یقینی امر ہے۔ اپنی بیوی کے اس خیال کو وہ ردّ عمل کا نتیجہ سمجھتا تھا۔ شہزادے کا جنم —— یہ تو کسی سراپ کا ہی نتیجہ سمجھا جانا چاہیئے! اس کا بس چلے تو اشتراکیت کا پرچار کر دے دلیں کے کونے کونے میں۔ نہ کوئی مالک رہے نہ نوکر۔ نہ امیر نہ غریب۔ مگر اس کی بیوی کہتی تھی کہ یہ امتیاز تو رہتی دُنیا قائم رہیگا۔ گائے بھینسوں اور بھیڑ بکریوں کی قیمت بھی الگ الگ پڑتی ہے۔

کسی رنگریز کا دھیان کیجئے، پنڈت جی، بس اُس کا من رنگریز کی ناند کی طرح تھا جس میں رنگ پکایا جا رہا ہو..... رنگریز ابھی تو نیا اپنا کام کرنے لگا ہے۔ ناند کو آنچ پر رکھ دیا گیا ہے۔ کسی بھگت کی طرح اُس کی آنکھیں پانی کی رنگت پر گڑ گئی ہیں۔ اپنے مخصوص انداز میں رنگ بدل رہا ہے۔ وہ یہ سب دیکھتا جاتا ہے۔ جونہی پانی کی رنگت تدریجی کیفیتوں میں سے گزر کر ایک خاص ٹھکاؤ پر پہنچ جائے گی، وہ ناند کو نیچے اُتارے گا..... مطلب یہ کہ جیسے ناند میں رنگ پکتا ہے، اُسکے ذہن میں اختراعی قابلیت پختہ ہو رہی تھی۔

وہ ایک افسانہ لکھ رہا تھا —— ایک طنز۔

وہ بیل اب بھی بیل ہیں۔ کہہ جو دیا۔ ذرا بھی جھوٹ ہو تو جو سزا شیطان کی وہ میری۔ بیسویں صدی تک کا لمبا سفر طے کرنے کے بعد بھی بیلوں کی حالت میں کچھ فرق نہیں پڑا؟ آپ پوچھ سکتے ہیں۔ پوچھئے مگر فائدہ؟ دیکھتے جائیے اور ہو سکے تو بیلوں کو سمجھائیے کہ وہ بیدار ہو جائیں، جُوا اُتار پھینکیں۔

بیل تو سارے ایک ہی کام نہیں کرتے۔ ہل کے بیل، کولہو کے بیل، خراس کے بیل، رہٹ کے بیل، چھکڑے کے بیل۔ کیا کبھی بیل کی گردن سے جُوا اتر بھی سکتا ہے؟

چیں چیں، ریں ریں کرتا ہوا چھکڑا چلا جا رہا ہے۔ بیل سمجھتے ہیں کہ سڑک اب ختم ہوئی اب ختم ہوئی، مگر سڑک ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتی۔ سچ پوچھو تو یہ سڑک بیگم گوری کے گھر کے سامنے سے گزرنے والی

[illegible]

کی طرح ہے ـــ اس جبڑے کی مانند جس کے آدھے دانت بڑھاپے کی وجہ سے سڑ گئے ہوں اور بلبلا کے ہلے ہوں اور باقی آدھے کالے پڑ گئے ہوں!

بیل کچھ نہ کچھ سوچتے تو ہونگے۔ شاید وہ کہنا چاہتے ہیں ـــ کچھ تو ترس کرو، مالک! مگر وہ آدمی کی زبان تو جانتے نہیں۔ مالک رحم نہیں کرتا۔ کرے بھی کیوں؟ وہ تو مالک ٹھہرا ـــ نِرا وحشی، نِرا بیدرد! اُن کے چہروں پر شدید درد کی علامتیں نظر آ رہی ہیں۔ مگر مالک تو اُدھر دیکھتا نہیں۔

ہر روز میں اس سڑک سے چھکڑے گزرتے دیکھتا ہوں۔ کبھی کبھی تو جی چاہتا ہے کہ گاڑیبان کو نیچے کھینچ لوں اور اُس سے کہوں۔ بھلے مانس، کچھ تو دیکھو۔ بیلوں کی گردنیں بُری طرح گھائل ہو رہی ہیں، جوئے کا گردنا زخموں کو چھو چھو جاتا ہے۔ اس کے گرد کپڑا ہی لپیٹ لیا ہوتا۔ اس صورت میں پیتل کی یہ ٹوپی دار کیلیں، جو صرف سجاوٹ کے لئے لگائی گئی ہیں، ضرور نظر سے اوجھل ہو جاتیں۔

چھکڑے آگے نکل جاتے ہیں، گاڑیبان بیلوں کو گالیاں دیتے رہتے ہیں۔ گردنوں سے لہو بہنا بند نہیں ہوتا۔

زخمی بیل تو دوسری سڑکوں پر بھی نظر آ سکتے ہیں۔ مگر میرے جذبات تو اسی سڑک پر پیدا ہوتے ہیں۔ کتنا ظلم ہوتا ہے دُنیا میں، سچ سچ کتنا ظلم، دوسروں کا لہو چوس کر اپنا الّو سیدھا کرنے کی دُھن زندگی کی رگ رگ میں سما چکی ہے۔ کتنا پیچ در پیچ ہے ظلم کا سلسلہ۔ خود گاڑیبان بھی کسی سرمایہ دار کے چھکڑے کا بیل ہی تو ہے۔

سُنا، بھئی گاڑیبان، کدھر جاؤگے؟

یہیں منڈی تک۔

شاید پہلی بار اِدھر آنا ہُوا۔

نہیں تو، ہر سال آتا ہوں، بابو!

ہر سال؟ ... مگر بیلوں کی گردنوں سے تو لہو نکل رہا ہے۔

یہ تو نکلے گا ہی۔ اسے تو بھگوان ہی روک کے تو روکے۔

بھگوان؟ ... پھر مت نام لینا اُس بدمعاش کا میرے آگے۔

بدمعاش؟ بھگوان بدمعاش؟ نہیں بابو نہیں۔ پاپ ہوگا۔ یہ تو کلجگ ہے، بابو! یہ سب اسی کا اثر ہے۔

کلجگ؟ ہا ہا ہی ہی۔ یہ سب وہم ہے۔

گاڑیبان کے ہاتھ میں چابک ہے۔ اس کے لئے چھرا کہاں ہے؟ شاید یہ کسی بیل کے چمڑے ہی سے تیار ہوا ہے۔ جتنا بھی افسوس کیا جائے تھوڑا ہے۔ اپنی جوتی اور اپنا ہی سر۔ کوئی کسی پر ترس نہیں کھاتا۔ ظلم کی مکروہ بدبو نے زندگی میں ذرا بھی آنند نہیں چھوڑا۔

رُک رُک کر بیل ہانپنے لگتے ہیں۔ اُن کی تھکاوٹ کی کسے پرواہ ہے۔ گاڑیبان کے مُنہ میں تو زہر بھرا ہے گالی پر گالی دیے جا رہا ہے۔ اکثر یہ گالیاں سنتے سنتے میں آگ بگولا ہو جاتا ہوں۔ میں سپنا تو نہیں دیکھ رہا۔ میرے ہونٹ اینٹھ جاتے ہیں۔ چاہتا ہوں کہ گاڑیبان کو گھونسا دکھا کر کہوں، خبردار بیٹا! پھر گالی دی تو زبان گُدی سے کھینچ لونگا۔

اب نیا دَور شروع ہوتا ہے۔ نئے اس کے مطالبات ہیں۔ کتر بیونت تو ضروری ہے۔ سب لعنتوں سے چھٹکارا بھی ضروری ہے۔ کسی کے اثر کو ہم غیر ارادی طور پر قبول نہ کرینگے۔ اپنا نیا سنسار بسائینگے۔ غلامی تو لِبس کا پیڑ ہے۔ جس کی چھاؤں میں ہم خواہ مخواہ چڑچڑے پن کے مریض بن جاتے ہیں۔ یہ تو کوڑھ ہے۔

سڑک کے کنارے کھڑے کھڑے میرے پاؤں سُن ہو جاتے ہیں۔ بیٹھ جاتا ہوں۔ پھر جب پاؤں میں نئی طاقت آنے لگتی ہے، میں مُنہ سے سیٹی بجاتا ہوں۔ وحشی گاڑیبان مجھے دیکھتے ہیں اور نہ جانے کہاں سے ایک عجیب سی مسکراہٹ اُن کے ہونٹوں پر ناچ اُٹھتی ہے۔ احمق ـــ اور نہیں تو؟ وہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ اُن کی مسکراہٹ کو میں بے حد ناپاک سمجھتا ہوں۔ ساتھ ہی کسی چھکڑے کی دھری چیخ اُٹھتی ہے۔ کِتنی غصہ دلانے والی آواز ہوتی ہے اس کی! خود گاڑیبان اِدھر دھیان نہیں دیتا۔ بلکہ وہ اپنا بیہودہ اور بے تکا گیت شروع کر دیتا ہے ـــ جاہل ـــ اور نہیں تو؟ وہ سمجھتا ہے کہ دھری کی چرچر کی تال بہت موزوں ہے۔

پانچ سات کسان شہر کی طرف جا رہے ہیں۔ کون جانے وہ کس گاؤں سے آ رہے ہیں۔ کوئی مقدمہ ہوگا۔ ان میں سے ایک اپنے گاؤں کا نمبردار ہے۔ باقی چاروں اُسے اسی نام سے مخاطب کرتے ہیں۔ نمبردار کہہ رہا ہے، خدا نے مدد کی تو فتح ہماری ہوگی۔

کون خدا؟ کہاں رہتا ہے وہ؟ کس جنت میں؟ کس دوزخ میں؟ دُنیا میں تو وہ رہتا نہیں۔ کتنا ردِ عمل ہے دُنیا میں باپ رے۔ غریب بیلوں کے لئے وحشی گاڑیبان خدا بنا بیٹھا ہے۔ اور کسی مقدمے کا فیصلہ تو مجسٹریٹ کرے گا۔ ہاں جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کر دکھانے والے وکیل کی مدد سے انکار کرنا بھی آسان نہیں۔ اس کی مٹھی گرم کرنی پڑتی ہے۔ وہ بھی ایک خدا ہے۔ عدالت میں خدا کو کون پوچھتا ہے! بس اتنا کافی ہے کہ حلف اُٹھاتے وقت رسمی طور پر اس کا نام لے لیا جائے

مقدمے ہی مقدمے۔ بیچ در بیچ مقدمے ہی مقدمے۔ کون کرے اِن کی گنتی۔ نمبردار کہہ رہا ہے کہ مقدمے تو آسمان کے تاروں کی طرح ہیں۔ ان گنت! وہ وقت پر عدالت میں پہونچ جانے کی جلدی میں ہے۔

پاؤں اُٹھاکر، سردارو، پاؤں اُٹھاکر۔

ہم آپ کے ساتھ ہیں نمبردارجی!

ٹھیک ٹھیک گواہی دینا۔

ہم بولیں گے ہم موقع پر حاضر تھے۔

جیتے رہو، سردارو، بڑے بہادر ہو تم۔

ہم تو تابعدار ہیں، نمبردارجی، ہم سے تو جو چاہو کہلوا لو۔

یہ گواہ تو چھکڑے کے بیل معلوم ہوتے ہیں۔ حکم ملتے پر انہیں سفید جھوٹ بولنا ہوتا ہے۔ اب تو وہ اس کے بُرانے عادی ہو چکے ہیں۔ نہ اُن کے پاؤں ڈگمگاتے ہیں، نہ زبان لڑکھڑاتی ہے۔ سوچتا ہوں کہ صدیوں سے گواہیاں جاری ہیں۔ کبھی ان کا سلسلہ رُکا نہیں۔

فرمانبرداری کے جوئے تلے پھنسے ہوئے بیلوں کو میں اپنی بات کیسے سمجھاؤں؟ ان کی زبان میں نہیں جانتا، میری زبان سے وہ خود بے بہرہ ہیں۔ سڑک پر کھڑے کھڑے میرے پاؤں پھر سُن ہو رہے ہیں، ذرا بیٹھ جاؤں۔

بیل آج بھی بیل ہیں۔ ذرا بھی جھوٹ ہو تو جو سزا شیطان کی وہی میری۔ انیس بیس صدیوں کا لمبا سفر طے کرنے کے بعد بھی ہماری تہذیب نے کوئی ایسی منزل طے نہیں کی جس پر اُسے فخر ہو سکے ......"

اُس نے یہ افسانہ مجھے سُنایا تو اس کا روپ افسانے سے کہیں زیادہ ایک مختصر مضمون کے قریب نظر آیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ کٹے دن کی زندگی کی یہ تصویر خواہ ادب کے کسی بھی شعبے میں کیوں نہ شمار کی جائے، اس کی داد تو اسے ملے گی ہی کیونکہ اپنے آپ میں یہ ایک کامیاب طنز ہے۔ کاش یہ بیل بیدار ہو جائے، آزاد ہو جائے۔

میں نے فوراً اِسے دہلی سے شائع ہونے والے ایک معیاری رسالے کو بھجوا دیا۔ غالباً چوتھے یا پانچویں روز ہی منی آرڈر آ گیا۔ ایڈیٹر نے لکھا تھا کہ اس افسانے کے ساتھ ہمارے افسانوں میں ایک نیا دور شروع ہوگا۔

سینے پر ہتھیلی سے طبلہ سا بجاتے ہوئے وہ اپنی بیوی کے پاس آ بیٹھا۔ بلکہ وہ تو چاہتا تھا کہ بچے کی طرح مچلنے اور پھر شرابی کی طرح ناچنے لگے۔ اور جب وہ پوچھے کہ یہ تماشہ کس لئے ہے، تو وہ بتانے کہ منی آرڈر آگیا۔ مگر وہ صرف طبلہ بجاتا رہا، نہ مچلا یا نہ ناچا۔

اُس کی بیوی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پازیب کی جھنکار فضا میں گونج اُٹھی۔ اُس کی آنکھوں میں نئی خوشی لہرا گئی۔ گالوں پر بھی سونے کا پانی پھر گیا۔ وہ بولا "گھوم پھر کر، سکھی، ذرا گھوم پھر کر۔"

اشتراکی زبان میں بجا طور پر وہ اپنی کو "کامریڈ" کہہ سکتا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اگر پازیب کی جھنکار اسی طرح گونجتی رہی تو وہ یقیناً نئے ادب میں نمایاں اضافہ کرے گا۔ کیونکہ وہ لکھتا چلا جائے گا اور گورکی کی طرح لوگوں کو بس ایک ہی یقین دلائے گا ــــ میں زندگی کی صدائے حق ہوں۔ میں اُن ٹھکرائے ہوئے اور روندے ہوئے مظلوموں کی آواز ہوں جو سماج کے سب سے نچلے زینے پر پڑے ہوئے ہیں۔ انہوں نے مجھے اپنا فسانۂ غم سنانے بھیجا ہے۔

"اتنی بھی کیا خوشی ہے؟"

"گھر میں لکشمی آگئی اور تمہیں خبر ہی نہیں ..... میرا افسانہ چھپنے جا رہا ہے .... مزدوری آ گئی ــــ نو روپے چودہ آنے!"

پھر معاً اُسے خیال آیا کہ کاش ایڈیٹر صاحب نے منی آرڈر کی فیس یعنی دو آنے بھی دفتر کی طرف سے خرچ کئے ہوتے اور اُس کے ہاتھ میں پورے دس روپے پہونچتے۔ کیا یوں سوچنا حماقت ہے؟ کیا اتنا لالچ بھی ناجائز ہے؟ کیا یہ بھی ایک ردّ عمل ہے؟ نہیں وہ کبھی ردّ عمل کا شکار نہ ہوگا۔ وہ تو زندگی کی صدائے حق ہے۔ ذاتی طور پر وہ بہت امیر ہو گیا تو کیا اور غریب رہا تو کیا، وہ لکھتا چلا جائے گا افسانے ہی افسانے، افسانے ہی افسانے۔ اگر وہ زندگی کے اسیروں کو آزادی کا سندیش دے سکا تو وہ سمجھے گا کہ اُس نے بہت قیمت پالی۔ صرف نو روپے چودہ آنے ہی تو کسی ترقی پسند افسانے کی قیمت نہیں ہو سکتی۔

دیوندر ستیارتھی

جمالیات

حُسن کا لفظِ سہ حرفی آج ہے موضوعِ بحث
علمِ حسیات و وجدانات و رُجحانِ بشر
کس طرح ہوتا ہے احساسِ جمالی کا ظہور
کیا سبب اس کا کہ اک شے ایک کرتا ہے پسند
کون سے اشیا کے ہیں ایسے نمایاں خط و خال
سحر ایسا کونسا پوشیدہ ہے آواز میں
جتنا اشیائے جمیلہ کا جتھا ہے سب کا سب
اس طرح کے اور جتنے بھی کئے جائیں سوال
ایسے استفساروں پر بحث اور پیہم غور و خوض
فطرت خاموش کے لاکھوں مناظر بے بدل
خوبصورت کوئی بُت یا کوئی تصویر جمال
دیکھتے ہی سنتے ہی فوراً بشر کے قلب میں
دل میں میلانِ مسرت کا بڑھا کرتا ہے جوش
یا خموشی اُس پہ چھا جاتی ہے ایسے وقت میں
لفظ تک اظہار کیفیات کے ملتے نہیں
شکل، حرکت، رنگ اور نیز اس طرح کا ارتسام
اطلاع ان کی دیا کرتے ہیں پیہم چشم و گوش
یہ وہی ہے جس کو کہتے ہیں جمالی التذاد
یہ وساطت سے حواس آدمی کے روز و شب
نفس میں پیدا کیا کرتا ہے میلانِ نفیس
حسیات احساس اور لذات کی دلچسپ بحث
کچھ نوا ہائے شنیدہ کچھ بہارِ دیدہ سے
خوشگوار احساس کا اُٹھتا ہے جب جوشِ طرب
حُسن کو سقراط ٹھہراتا ہے مانندِ مفید
جو تصور خیر برتر اور الوہیت کے ہیں
حُسن سے اشیائے عالم کل کے کل لبریز ہیں
حال کے نقاد کہتے ہیں نہیں ایسا نہیں
جو کسی شے کے تصور میں ہوا ہو ارتسام
پھر صفات، اعراض اشیا دیکھتے ہیں غور سے
اس کے ہر اک حرف کو تنقید سے ہے دیکھنا
پورا سرمایہ ہے یہ فنِ جمالیات کا
کون سی شے ہے جو ہو حُسنِ مجسّم برملا
دوسرا کرتا ہے نفرت وہ بھی کیسی ناروا
جن سے ہو جاتے ہیں وہ اشیا نہایت خوشنما
جس سے ہو جاتی ہے جذبِ سامعہ دلکش صدا
اشتراک آپس میں اسکے ہوتا ہے کیا ایک سا
ان سبھوں کا ہی جمالیات سے رشتہ جڑا
فن بالا میں رہا کرتا ہے اس کا مشغلہ
سطوت و عظمت پہ جن کے فہم عالم ہے فدا
کوئی عمدہ نظم یا دلکش صدا کا سلسلہ
خوشگوار احساس کا طوفان ہوتا ہے بپا
سازِ لب سے اُٹھتا ہے تحسین کا اک غلغلہ
جبکہ ہو جاتا ہے ذہن نارسا بید ست و پا
جوش دل لفظوں میں اس سے ہو نہیں سکتا ادا
دیکھنے یا سننے سے جن کا ہوا نشو و نما
جس سے پیدا ہوتی ہے احساسِ لذت کی صدا
اس کا باعث حُسن ہے جس میں نہیں چون و چرا
عقل و وجدان و تخیل کو ہے کرتا مُبتلا
رُوح کو پہونچاتا ہے تا حدِ بامِ اعتلا
ہے یہی وہ روزنِ در جس سے یہ ہے جھانکتا
دونوں سے مل کر بنا ہے اس کا سحر حشر زا
اس کو کہتے ہیں یہ ہے سیلاب حسنِ خود نما
اور فلاطوں کی نظر میں ہے یہ اس کا مرتبہ
حُسن ہے ایسے تصور کا مثیل و ہم نوا
یہ خیالاتِ فلاطوں کا ہے مجمل تذکرہ
یہ ہے احساس و حواسِ آدمی کا شعبدہ
اہل یورپ کرتے ہیں اپنی یہیں سے ابتدا
تاکہ حاصل ہو جمالی کیفیت کا مدعا

حُسن کی تخئیل سے حاصل شدہ لذّت وہ ہے
سب سے پہلے کانٹ نے اس امر کی تعین کی
اس کے احساس و شعورِ اوّلیں کے باب میں
جتنے گہرے رنگ رجحانات کو ہوں گے پسند
ہلکے رنگوں کی نفاست جلتی دل کو بھائے گی
حُسن کے قصرِ بصیرت زا کی جانب التفات
آبشاروں کی روانی چرخ آسا کوہسار
اور اجرامِ سماوی کے منوّر قمقمے
ابر کی اودی، سنہری، نیلی، پیلی ساریاں
اور شفق کا پھولنا اور اس کی زریں آب و تاب
قلزم و عمّاں کی موجوں کا خروشِ سہمگیں
ان کی لامحدودیت مرعوب کرتی ہے ہمیں
اس تصوّر میں اسی حد پر ہے احساسِ الم
بعد ازیں پاکیزہ رجحانات کرتے ہیں ہجوم
ایک ہی آواز یا صورت ہر اک پر اک طرح
ساخت عصبی ریشوں میں ہر شخص کے یکساں ہے پر
ذہن کی بالیدگی میں بھی بہت باہم ہے فرق
اک تخیل ہی نہیں اس حُسن کے زیر اثر
دلکشی آواز، حرکت، رنگ، خط میں جو بھی ہو
ان میں پیدا کرتے ہیں موزونیت فکر و شعور
قوتِ ذہنی ہیں انسان اور حیوان کی
مختلف رنگوں کی اک تصویر کو یا نظم کو
اس سے حیواں کو حصولِ کیف ہوتا ہی نہیں پر
کس طرح ہوتا ہے ظاہر یہ جمالی التذاذ
دل میں انساں کے یہی رہتی ہے خواہش جاگزیں
بتگری، معماری و موسیقی کلفت شکن
نیز نقاشی کہ جو دُنیا ہے نقش و رنگ کی
سب یہ ظاہر ہوتا ہے الفاظ یا اصوات سے
خارجی صورت میں ہم وجدان یا احساس کو
منفعل رہتا ہے یا خوابیدہ احساسِ جمال
فعل ہے افراطِ قوت کا نتیجہ اور یہی
دیکھتی ہے غیر مرئی چیز کو کس غور سے
پھر اسے مرئی بنا کے سامنے لاتی ہے یہ

مادّی اغراض کا جس میں نہ ہو کچھ شائبہ
حُسن کی لذّت نہ ہو وابستۂ حرص و ہوا
ماہرینِ فن نے لونیّت سے کی ہے ابتدا
سمجھا جائے گا تمدّن کا ابھی ہے بچپنا
اُتنا ہی ہوگا تمدّن کو عروج و اعتلا
ہر تمدّن بڑھتا ہے لیکر کمندِ ارتقا
نیّرِ تاباں کا چھپ چھپ کر نکلنا ڈوبنا
آج تک ہم بشر جن کی نہ گنتی گن سکا
جن کو پھیلاتی ہے بامِ چرخ پر بادِ صبا
تودۂ غبرا ہو جس سے صاف سونے کا ڈلا
دیکھنے سے ان مناظر کے ہے دل ہیبت کدہ
سامنے آنکھوں کے رہتی ہے جلالت کی فضا
جس سے، پہلے ہوتی ہے افسردہ کچھ طبعِ رسا
جن سے پھر بڑھتا ہے آگے ذوقِ دل کا حوصلہ
کیوں اثر کرتی نہیں اس کی ہے آخر وجہ کیا
اختلافِ عادت و تعلیم ہے اس کے سوا
بیش و کم تفریق کرتی ہے طبائع کو جُدا
عقل تک پھیلا ہوا ہے اس اثر کا دائرہ
یہ بہ امدادِ حواس اک فعل ہے ادراک کا
جن سے بنتا ہے یہ نقشہ عجب لذّت فزا
باہمی تفریق کو کرتی ہے ظاہر برملا
دیکھتا، سُنتا ہے حیواں بھی مگر بے فائدہ
جس سے وہ ظاہر کرے جذبہ کوئی اُبھرا ہوا
فعل اور تخلیق ہے اس کا ذریعہ واسطہ
جو کرے محسوس اس کو جوں کا توں کر دے ادا
شاعری، جس میں کہ رہتا ہے درِ تخئیل وا
ارتسامِ ذہنی و طبعی کا ان میں سلسلہ
نام صنّاعی ہوا ایسے ہی اظہارات کا
جب کریں ظاہر تو صنّاعی یہی کہلائے گا
عام لوگوں میں مگر صنّاع میں ہے جاگتا
جادۂ تخلیق سے کرتا ہے ظاہر دست و پا
صورت و رنگ و سنگ میں صنّاع کی طبعِ رسا
جس سے دل کے باغ میں چلتی ہے لذّت کی ہوا

یا یوں کہئے کام میں صنّاع سحر انگیز کے
ہو ذریعے سے حواسِ آدمی کے ذہن کو
روح کو دیکر سہارا پھر یہ کرتا ہے بلند
اس سے وجدانات اعلیٰ پاتے ہیں اوجِ کمال
قوتیں انسان کی کل اس کے ہیں زیرِ اثر
عام نظروں سے نظر صنّاع کی ہوتی ہے تیز
ساتھ ہی اس کے کسی پیرایۂ دلچسپ سے
اس بیاں میں اس جگہ پیدا یہ ہوتا ہے سوال
جو اعادہ کرتی ہے حسنِ ظواہر کا تمام
کیا نہیں اخلاق سے اس کا تعلق یا کہ ہے
ان سوالات عجیبہ کی ہے ایسی شاہراہ
نقل فطرت کی بعینہ یا تشابہ بس یہی
بعض کہتے ہیں مناسب ہی نہیں صنّاع کو
بلکہ کچھ ہو نقل اور کچھ ہو اضافہ ساتھ ساتھ
فطرت خاموش سے اشیا کو کر لے منتخب
ایسی صنّاعی جو ہو مخصوص خط و خیال کی
یہ حقیقت سے زیادہ منکشف ہوتی ہے اور
زد میں وجدانی اثر کے آ کر اک صنّاع کو
اس لئے پوری وہ کرتا ہی نہیں فطرت کی نقل
پھر یہیں سے اور پیدا ہوتا ہے مشکل سوال
تابع اخلاق صنّاعی کو ہونا چاہیئے
بعض اس بارے میں ساکن کے ہوئے ہیں ہم خیال
اپنے وجدانات اعلیٰ میں کرے ہم کو شریک
مقصد اعلیٰ ہے صنّاعی کا بس یہ ایک ہی
بعض کہتے ہیں کہ صنّاعی نہ ہو پابند قید
بعض گزرے ہیں جمالیئین میں ایسے بھی فرد
کہتے ہیں رتبہ جمالیات کا مافوق ہے
الغرض یہ ایسا دلکش روح پرور پھول ہے
چشمِ نظّارہ طلب میں اس سے سحر بے خودی
جنّت گوش اور فردوسِ نظر ہر ایک میں
روز و شب سمع و بصر کے پردۂ فانوس پر
سامعہ اور باصرہ کے ساز میں وہ تار ہیں
حسن کی تصویر کے دو مُصحَف ہیں و لوحِ الغریب

صاف ہے توضیح نصب العین کا نقشہ کھنچا
لیکے آغوشِ اثر میں اور بڑھتا ہے سوا
اور رجحانات پاکیزہ کو دیتا ہے جگا
یہ دماغ و دل کو دیتا ہے تاثر کی غذا
روح کی گہرائیوں میں بھی ہے یہ پیرا ہوا
وہ تعقل کرتا ہے جب ایک نصب العین کا
چوں کا توں کر دیتا ہے اس کا اعادہ بجنسہٖ
کیا ہے صنّاعی فقط تقلید کی بانگ درا
کوئی کیا اس کا بھی ہے مقصود و غایت، مدّعا
محض صنّاعی کی خاطر سیکھیں صنّاعی کو کیا
ماہرانِ فن یہیں سے ہوتے ہیں باہم جدا
بعض کے نزدیک صنّاعی کا مقصد ہے بڑا
نقل فطرت میں کرے فطرت کی پوری اقتدا
وہ اضافہ اپنے افکار اور وجدانات کا
ربط دے کر سترِ فطرت کو کرے ان سے ادا
یا تصوّر کوئی یا سیرت ہو جس سے رُو نما
ذہن کو پہناتی ہے فوراً تاثر کی قبا
فکر ہوتی ہے بنا دے فعل کی اس کو سہا
اتنی ہی کرتا ہے جو محسوس وہ خود کر چکا
جسکو کہہ سکتے ہیں پہلے کے مقابل دوسرا
یا نہیں، اخلاق سے بالا ہے ہما اس کا مرتبہ
کہتے ہیں اخلاق پر صنعت کی قائم ہو بنا
سب سے بڑھکر کارنامہ ہے یہی صنّاع کا
اس سے ہو اخلاق کی تعلیم کا نشو و نما
اس کو ہونا چاہیئے مطلق جمیل و خوشنما
جو جمالیات کی کرتے ہیں اس حد پر ثنا
اور ہے اخلاق سے بھی اس کا اونچا مرتبہ
جس کی خوبی سامعہ اور باصرہ کی ہے غذا
سامعہ میں اس کی لذّت کا ہے اک طوفاں بپا
جلوہ ہائے حسن کی رہتی ہے نور افشاں ضیا
کوندتی رہتی ہے اس کی برق استعجاب زا
جن کی جنبش میں نہفتہ ہے مسرّت کی صدا
باصرہ ہے ایک ان میں سامعہ ہے دوسرا

عشوہ سامان حسن میں باصرہ سے ہمکنار
دور تک پھیلا گلابی باصرہ کے گھاٹ پر
عشوہ و ناز و کرشمے کے خدنگ دل شکار
سامعہ کے باغ میں اٹکھیلیاں کرتی ہوئی
دل ربا رنگین تصویریں بصر کے ساتھ ساتھ
دونوں کی پہنائیاں لبریز کیف حسن ہیں
یہ الگ اشیائے عالم سے نظر آتا نہیں
ریگ کے ذروں میں اجرام سماوی میں یہی
کہکشاں کی چادر پر نور، قرص مہر و ماہ
سنگ خارا کی ردائیں اور نباتی جامہ وار
رنگ بیزی و نوا ریزی اسی کے ہیں نخل
باصرہ افروز جنگلوں میں گلوں کے ہے یہی
ساز کے پردوں میں خوابیدہ ترنم بھی یہی
با حجاب ساز اک محفل ہے ذوق گوش کی
یا یہ پردے اس کے رُخِ دلربا کے ہیں لقا
دہر کے خمخانۂ لذّت کا ساقی ہے یہی
رُوح بالیدہ ہو جس سے یہ ہے وہ کیف نشاط
مادیت پست کر دیتی ہے جب ذوقِ طلب
اس سے میلانات پاکیزہ کا ہوتا ہے ظہور
مادیت سے نکل کر سیر کرنے کے لئے
چشمِ باطن کو دکھا دیتا ہے ایسا جلوہ زار
حسن مطلق کا یہ اک پرتو ہے جو عالم میں ہے
یہ مقیدِ حسن، مطلق کی دلیل راہ ہے
وہ کشادہ راہ جس جا شش جہت گم اک قدم
ہر طرف پھیلی ہوئی ذوقِ طلب کی تیز دھوپ
اور اس سے آگے گل زارِ تحیر کی مہک
رنگ و بوئے یکسی کے ہیں سرمایہ دارِ التذاذ
گل فشاں ہے تصدّق لذت اور وہ سکوت
کیف و کم کی اس جگہ میزاں نہیں منت پذیر
نورِ عالم کل کا گل اس جا یہ اک داغ سیہ
مادیت تاب لا سکتی نہیں جس دید کی
لامکاں کے گوشۂ تقدیس میں اک عشوہ ریز
دیکھتا ہے آپ ہی اپنا جمالِ بے مثال
بے جھجک آگے بڑھتے جاتے ہو بس اُٹھ و سرور

سامعہ میں مژدہ ہائے رُوح کا نہ ہے جھمکٹا
سامعہ میں نور کی تانیں ترنم زا گلا
باصرہ کے گھر میں بنتے ہیں یہ پیکانِ قضا
ہر رگِ حِس پر پھرتی ہے نطق و تکلم کی صبا
سامعہ میں بستی ہے ضو ریز نغموں کی ضیا
بستیاں احساسِ لذت کی ہیں ہر اک میں جدا
یہ دکھایا کرتا ہے رہ کر انہیں میں معجزہ
جس جگہ جاؤ ملے گا اس کا قصر آراستہ
التہابِ برق اور رِم جھم نجوم کی ضیا
کسوتِ حیوان و انساں سب میں ہو یہ رونما
مختلف لذّت کی تصویریں ہیں جس میں جا بجا
سامعہ میں لحن کے آمیزوں کی یہ ہے جِلا
جب ذرا مضراب نے چھیڑا اٹھا ہنستا ہوا
حسن کے نغموں کا رہتا ہے جہاں اک جمگھٹا
جن کے اُٹھتے ہی شکیب و ضبط ہوتے ہیں فنا
جس نے پیمانوں کو احساسات کے یکسر بھرا
گلکدے دل کے مہک جاتے ہیں یہ ہو وہ صبا
پھو نکتا ہے آگے یہ انساں میں رُوحِ اعتلا
گلشنِ تہذیب اس سے پاتا ہے نشو و نما
جادۂ ادراک پر لے آتا ہے یہ رہنما
جس کا لپکا ذوقِ تشنہ سے نہیں پھر چھوٹتا
سایہ پھر سایہ ہے جس کو اصل سے نسبت ہی کیا
اس سے ملتا ہے ہمیں روحانیت کا راستہ
وہ بلندی جس جگہ ہفت آسماں تحت الثریٰ
دُور تک کوئی نشانِ رہ نہ منزل کا پتا
جس سے بے خود ہو کے رہ جاتا ہے ادراک رسا
اس جگہ دونوں کے دونوں بے حقیقت بے نوا
کل تبسّم ہیچ و ناکارہ شگفتہ وہ فضا
قید و بندش کا وہاں ادنیٰ نہیں کچھ واسطہ
اور فشانِ دہر اس جا ایسا جیسے نقش پا
اس طرح کا حسنِ مطلق ہر طرف پھیلا ہوا
سامنے جس کے ہے اپنی عزلت کا آئینہ
غیر فانی اپنی ہیچ کا ہے خود ہی مبتلا
کیا نہیں معلوم تم کو راستہ ہے کونسا

سات سال بعد وطن میں

پردیس میں سات برس گزارنے کافی مشکل ہیں۔ پھر ٹوکیو جیسے شہر میں جہاں ہندستانی عنقا ہیں۔ بیوی ساتھ نہ ہو تو آدمی باولا ہو جائے۔ جاپانی پردیسی سے بے تکلف نہیں ہوتے۔ اوپری باتیں کرتے کرتے دل اکتا جاتا ہے۔ سات برس تک برابر کام کرنے سے دل و دماغ دونوں تھک گئے تھے۔ تکان دور کرنے اور طبیعت میں تازگی پیدا کرنے وطن گئے۔ اتنی مدت تک باہر رہنے سے بقول کسے آنکھیں کھل گئی تھیں۔ نئے تاثرات پیدا ہوئے۔ جن باتوں پر پہلے نظر نہیں پڑتی تھی وہ دکھائی دینے لگیں۔ خوشگوار باتیں کم نظر آئیں ناگوار زیادہ۔

جہاز سے بمبئی میں اترے۔ وہاں کی رونق پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ سمندر کے کنارے کنارے دور تک نیا علاقہ آباد ہو گیا ہے۔ بڑی عالیشان عمارتیں اور صاف ستھری چوڑی سڑک۔ خوشحال لوگوں کے لئے بڑے آرام دہ فلیٹ بن گئے ہیں۔ متوسط الحال لوگوں کے لئے مرکز شہر سے کچھ دور نئی وضع کے کشادہ فلیٹ بن رہے ہیں۔ شاید مزدوروں کے لئے بھی کوئی اسکیم ہوگی۔ مسز برلاس ساڑھیوں کے نئے نئے ڈیزائن دیکھ کر لوٹ گئیں۔ یہاں جاپان میں تو چراغ تلے اندھیرا ہے۔ ہر سال لاکھوں کی ساڑھیاں بن کر ہندوستان جاتی ہیں۔ مگر یہاں رہنے والوں کو ایک نہیں ملتی۔

دہلی میں پہلی مرتبہ چاندنی چوک میں نکلا تو عجیب اثر ہوا۔ وہی بازار وہی دکانیں۔ مگر دل نہیں چاہتا تھا کہ اسے چاندنی چوک کہوں۔ سڑک تنگ ہو گئی، پٹڑیاں پتلی پڑ گئیں یا دلی والے رستہ چلنا بھول گئے! ہماری چاندنی چوک کا نام لے کر جاپانی تو یہ کہیں کہ ہمارے ٹوکیو میں بھی اس نام کا گنزا بازار ہے مگر وہاں یہ اودھم مچا ہوا ہے کہ رستہ چلنے کا ٹھیک نہیں۔ بیچ سڑک میں پیدل چل رہے ہیں۔ تانگے والے ہٹو بچو کا الگ شور مچا رہے ہیں اور بائیں سے دائیں کو چلے آرہے ہیں۔ دکانداروں کا وہی پرانا دستور ہے، گاہکوں کو باہر کھڑا رکھتے ہیں۔ آگے اسٹول یا خالی صندوق پڑے ہوئے ہیں۔ کہیں چارپائیاں پڑی ہیں۔ درختوں کے نیچے کباڑ خانہ جمع ہے۔ پھیری والے بھی موقع پاکر اڈا جما لیتے ہیں۔ پٹڑی اس طرح گھر گئی تو راہگیر سڑک پر اتر آئے۔

نئی دہلی کا شہر بہت خوبصورت بنا ہے۔ پانی کی افراط سبزے کی بہتات ہے۔ اسے شہر باغ کہنا بالکل بجا ہے۔ پھیلاؤ بہت ہے۔ کشادہ سڑکیں، چوڑی پٹڑیاں، جگہ جگہ کھلے میدان، ایک منزلہ مکانوں کی کثرت اور ان کے وسیع صحن۔ سب باتوں کے مل جانے سے بہت بڑا شہر بن گیا۔ ساتھ ہی بہت بڑا نقص پیدا ہو گیا۔ شہر میں تمدن کی تمام سہولتیں آسانی سے میسر آنی چاہئیں۔ یہاں پھیلاؤ زیادہ ہونے کی وجہ سے سب مقام دور ہیں۔ یہ بے شہر شہر بن کے رہ گیا۔ کاروبار کی قلت کی وجہ سے آمد و رفت کم اور سواریاں کمیاب ہیں۔ یا تو ذاتی سواری ہو یا فالتو نوکر کہ دور سے سواری ڈھونڈ کر لائے۔ خالی وقت بھی کافی میسر ہونا چاہیئے۔ اس شہر نے امیر و غریب کا فرق بہت نمایاں کر دیا۔ یہاں آزاد پیشہ غریبوں کی گنجائش نہیں۔ صرف نوکروں کے نوکر رہ سکتے ہیں۔

عورتوں کی آزادی کی تحریک بہت زور پکڑ گئی ہے۔ جب ہم دلی اسٹیشن پر پہونچے تو پلیٹ فارم پر برقعہ پوش عورتوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی جو مسز برلاس کو اتروانے آئی تھیں۔ سات برس پہلے یہ بات ناممکن تھی۔ برقعہ پوش عورتیں ہر جگہ کثرت سے دکھائی دینے لگی ہیں۔ بہتوں نے پردہ چھوڑ دیا۔ مسز برلاس کہتی ہیں کہ دلی کے مرد نیک بن گئے ہیں۔ پہلے پردہ والیوں کو خواہ وہ پیدل چلیں یا سواری میں ہوں بہت چھیڑتے تھے۔ اب کوئی نہیں پوچھتا۔ بے پردہ عورتوں کا زیادہ لحاظ کرتے ہیں۔ بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حسن پرستی اور تجسس فطری جذبات ہیں۔ پہلے عورت منظر عام پر نہیں آتی تھی۔ جب کبھی کوئی برقعہ دکھائی دیا تو نظریں اٹھتی تھیں اور نقاب کے اندر گھس جانا چاہتی تھیں۔ اب حسن سامنے آگیا اور برقعے بھی بہت دکھائی دینے لگے۔ کوئی کس کس کا پیچھا کرے۔ اب رکشا جیسی پردہ شکن سواری بھی آدھمکی آئی ہے۔ ریش دار بزرگ برقعہ پوشوں کو بغل میں بٹھائے بلا تکلف چلے جاتے ہیں۔

نوجوانوں میں بانکپن زیادہ آگیا۔ کریم اور پومیڈ لگانے کا شوق پہلے بھی تھا۔ اب پرمانٹ ویو بھی بنانے لگے ہیں۔ زنانہ بناؤ سنگھار اور نزاکت کے اظہار میں زیادہ جوش دیکھتے ہیں۔ طالب علم کی سپاہیانہ چال چھوڑ کر بانکپن میں زیادہ وقت بھیجتے ہیں۔

دلی کی عورت صنفِ نازک بن رہی ہے۔ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ میری طبیعت، تفریحِ طبع اور آسائش و آرائش کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ گھربار کے جھمیلے اور عورت کی ذمہ داریاں اس کے نازک کندھوں کے لئے بار ثابت ہونے لگی ہیں۔ ایک بہن سے ہندستانی عورت کی مشکلوں پر گفتگو ہوئی تو انہوں نے تمام برائیوں کا ذمہ دار مردوں کو قرار دیا۔ کہنے لگیں کہ ہندستانی عورت کے برابر کوئی کام تو کرلے۔ اس پر جو جلال آیا تو چلا اٹھیں "ہندستانی عورت کی جے"۔ مجھے بھی جے بولنی پڑی۔ مرد کی خواہ کتنی زیادتی ہو اس میں عورت کی آرام طلبی کو بڑا دخل ہے۔ یہ بڑا دل خوش کن حیلہ ہے کہ ہم مرد کی عزت کی حفاظت کر رہے ہیں۔ جو مرد دُنیا کے سامنے اپنی عزت گنوا دے عورت گھر میں بیٹھ کر اس کی حفاظت کس طرح کر سکتی ہے۔ دُنیا میں عزت اسی کو نصیب ہوتی ہے جو اس کی سختیوں کا مردانہ وار مقابلہ کرے۔ گریز کرنے سے آج تک کسی کو عزت نصیب نہیں ہوئی۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننے سے کچھ نہیں ہوتا۔

اُستاد شاگرد، ماں بیٹا اور بھائی بہن کی محبت کے بڑے پُردرد مناظر دیکھنے میں آئے۔ جے پور میں میرے اُستاد رائے بہادر پنڈت سورج نرائن شرما صاحب نے یاد فرمایا تھا۔ مسز برلاس بھی ساتھ تھیں۔ ہم دونوں کی تقریروں کا انہوں نے انتظام بھی فرمایا تھا۔ صوفی منش بزرگ ہیں۔ میں نے اُن کے زیر سایہ کئی برس تعلیم پائی ہے۔ یوں تو ہمیشہ مجھ پر شفقت فرماتے رہے ہیں۔ اس مرتبہ حد کردی۔ جب ہم اُن کے دولت خانے پر حاضر ہوئے تو فرمایا کہ گھر میں تمہیں یاد کرتی ہیں۔ مجھے کچھ حیرت ہوئی۔ پھر خیال آیا کہ اتنی پُرانی وضع کی پابند خاتون کی یادآوری نہایت عزت افزائی ہے۔ پُرانی رسموں کی سختی سے پابند ہیں۔ ٹھیٹھ سودیشی کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ سہاگ کا زیور کہنیوں تک لدا ہوا تھا۔ بڑی محبت سے بٹھایا اور باتیں کیں۔ مسز برلاس نے کہا کہ میں اپنے لڑکے کو آپ کی خدمت میں بھیجنا چاہتی ہوں جس کے باپ کو آپ نے ایسا قابل اُٹھایا ہے۔ فرمانے لگیں بھیج دیجئو۔

رائے بہادر صاحب نے اپنے ایک دوست مسٹر کھنّا کے لڑکے کو میرے پاس جاپان بھیجا ہے جو پہلا ہندستانی لڑکا ہے جس نے میری ہدایت پر داخلے کا امتحان پاس کر کے یونیورسٹی میں باقاعدہ تعلیم شروع کی ہے۔ جے پور میں ہم انہی کی کوٹھی پر ٹھہرے تھے۔ مسز کھنّا اپنے بیٹے کا حال سُن کر بہت خوش ہوئیں۔ ان کا کسی طرح دل ہی نہ بھرتا تھا۔ روز مزے مزے کے کھانے پکا کر کھلاتی تھیں اور ہر کھانے پر کہتی تھیں کہ یہ میرے گوپال کو بڑا بھاتا ہے۔ ان کا دل چاہتا تھا کہ جو جو کھانے اُن کے لڑکے کو پسند ہیں سب ہی تو ہمیں کھلا دیں۔ ان کے بیٹے کو بھی ماں سے کم محبت نہیں۔ یہاں واپس آنے پر جب مسز برلاس نے اس سے ذکر کیا کہ ہم جے پور میں تمہارے یہاں ٹھہرے تھے تو مارے خوشی کے اُن سے لپٹ گیا۔

ایک روز مسز برلاس مہاراجہ کالج میں تقریر کر کے نکلیں تو ایک طالب علم نے ہماری کار روک لی۔ ان سے کہنے لگا کہ آپ لڑکیوں کے مدرسے میں بھی تقریر کیجئے اور ہماری بہنوں کو یہ باتیں سُنائیے کہ وہ کچھ سیکھیں۔ انہیں شام کو عورتوں کے کلب میں تقریر کرنی تھی اور رات کو دہلی واپس جانا تھا۔ عدیم الفرصتی کا عذر کیا۔ لڑکے کا دل ٹوٹ گیا اور رونے لگا کہ بڑے بڑے گھروں کی عورتیں تو فائدہ اٹھالیں مگر ہماری غریب لڑکیوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اپنی بہنوں کا درد اُسے بے چین کر رہا تھا۔ مسز برلاس کو اس کی خواہش پوری کرنی پڑی۔ رائے بہادر صاحب نے اسی وقت دوڑ دھوپ کر کے تقریر کا انتظام کر دیا۔

ریاست جے پور میں ایک عجیب مدرسہ دیکھنے میں آیا۔ شہر سے پچاس ساٹھ میل پر ایک گاؤں میں مسٹر شاستری اپنی اہلیہ کی معیت میں دیہات سدھار کا کام کرتے تھے۔ وہیں اُن کی اکلوتی لڑکی کا بارہ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ ماں باپ نے لڑکی کی یادگار میں وناستھلی گاؤں میں لڑکیوں کا مدرسہ قائم کر دیا۔ اس وقت سوا سو لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔ ہائی اسکول تک تعلیم دی جاتی ہے۔ میرے نزدیک اسے ہائی اسکول سے نسبت دینی اس کی بے قدری ہوگی کیونکہ لڑکیوں کے ہائی اسکولوں سے نقلی لڑکے بن کر نکلتے ہیں جن کو اس بات پر فخر ہوتا ہے کہ ہم عورت کے فرائض سے نابلد ہیں اور ان کی انجام دہی ہمارے لئے عار ہے۔

وناستھلی کا مدرسہ سیدھا سادا ہے۔ ہوسٹل اس کے ساتھ ہے کیونکہ تقریباً سب لڑکیاں باہر کی ہیں اور وہیں رہتی ہیں۔ مٹی کی دیواروں کے کچے مکان ہیں جن پر جست کی چادروں کی چھت پڑی ہے۔ باوجود اس درماندگی کے یہ مدرسہ ہندستان میں بے بدل ہے۔ پراسپکٹس میں تو کہیں درج نہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لڑکیوں کو واجبی عورت بنا کر نکالنا مقصود ہے۔ کتابی علم کے علاوہ لڑکیوں کو خانہ داری کی تعلیم پڑھنے لکھنے سے [illegible]

اپنا اندرونی کل سب کام خود کرتی ہیں۔ باری باری سے کھانا بھی پکاتی ہیں۔ [illegible] کے علاوہ مردانہ ورزش اور فوجی کرتب بھی سیکھتی ہیں کہ وقت پڑے اپنی حفاظت خود کر سکیں۔ سائیکل اور گھوڑے کی سواری، ہٹی پھاندنا اور لاٹھی چلانا جانتی ہیں۔ کھیتی باڑی بھی کرتی ہیں اور کپڑا بنتی ہیں۔ مسز رتن شاستری مدرسے کی روح رواں ہیں۔ لڑکیوں سے اپنی بیٹی جیسا سلوک کرتی ہیں۔ بہی دور دور سے کھنچی چلی آتی ہیں، یہاں اکثر انجینیروں اور سرکاری عہدیداروں کی لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں۔ طالبات کے کپڑے بہت معمولی اور زندگی بہت سادہ ہے۔ مگر بڑی دلیر معلوم ہوتی ہیں۔ جلسے میں، ایک لڑکی نے جاپان پر بڑے چبھتے ہوئے اعتراض کئے۔

بمبئی میں نیو ایرا اسکول اپنی طرز کا نرالا مدرسہ ہے۔ جدید روش کا ہائی اسکول ہے۔ یہ بہت سی خصوصیات کا حامل ہے۔ لڑکے لڑکیاں ساتھ ساتھ پڑھتی ہیں۔ یہاں کے پرنسپل فرماتے ہیں کہ اخلاقی خرابیاں نمودار ہونے کے بجائے لڑکیوں کی موجودگی ڈسپلن قائم رکھنے میں بڑی ممد ثابت ہوئی ہے۔ لڑکے اس خیال سے شرارت سے باز رہتے ہیں کہ یہ لڑکیاں کیا کہیں گی۔ جدید وضع کی شاندار عمارت ہے۔ یہاں دوسرے مدارس سے کچھ زیادہ فیس وصول کی جاتی ہے۔ خوشحال متوسط درجے کے لوگوں کے بچے پڑھتے ہیں۔ مدرسے کا خرچ فیس سے نکل آتا ہے کیونکہ یہاں کا عملہ ایک اصول کے ماتحت ایثار سے قومی خدمت انجام دے رہا ہے۔ مسٹر دیاس یہاں کے پرنسپل ہیں۔ ان کے ولولے اور مقناطیسی شخصیت نے نہایت قابل عملہ اکٹھا کر لیا ہے۔ مثلاً اعلیٰ جماعتوں کی انگریزی زبان کی معلمہ ایک خاتون ہیں جو بمبئی یونیورسٹی میں انگریزی زبان کے بورڈ کی صدر ہیں۔ اُستادوں کو اپنی قابلیت کے اظہار کی پوری آزادی ہے کہ جا ہے جس طرح پڑھائیں۔ یہاں کے کئی اُستادوں کی لکھی ہوئی کتابیں مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں۔ میں نے ڈالٹن پلان کے متعلق دریافت کیا تو دیاس صاحب نے ایک ہی کتاب پر کئی اُستادوں کے اسائنمنٹ دکھائے۔ ہر ایک نے اپنے اپنے طریقے سے سبق پڑھائے تھے۔ ننھے بچوں کیلئے کنڈرگارٹن ہے۔ دیاس صاحب اسی اصول کو آگے چلانا چاہتے ہیں۔

بمبئی میں ایک مدرسہ پارسیوں کی سرپرستی میں گاڈیا گرلز [illegible] اسکول کے نام سے چل رہا ہے۔ یہ جدید طرز کا بہترین مدرسہ ہے۔ [illegible] کو خانہ داری کے علوم عملاً سکھائے جاتے ہیں۔ اسے دیکھنے کی [illegible]۔ جاتے وقت مطلق فرصت نہ ملی۔ آتے وقت صرف اسے دیکھنے کے لئے دہلی سے ایک دن پہلے روانہ ہوا۔ بمبئی پہنچ کر معلوم ہوا کہ کسی کے انتقال کی وجہ سے بند ہو گیا اور جاڑے کی چھٹیوں کا اعلان کر دیا گیا۔

دہلی میں لیڈی اروِن کالج غالباً اسی مدرسے کے نمونے پر کھولا گیا ہے۔ یہ بہت مفید مدرسہ ہے۔ مگر اس میں بڑا نقص ہے کہ لڑکیوں کو تعیش سکھایا جاتا ہے۔ سادگی جو تعلیم کا لازمی جزو ہونی چاہیئے یہاں مفقود ہے۔

ہندستان جاتے وقت سنگاپور پر دہلی کے ایک صاحب ملے تھے۔ وہاں درآمد برآمد کا کاروبار کرتے ہیں۔ دہلی میں ایک لاکھ کی جائداد وقف کر کے لڑکیوں کا مدرسہ کھولا ہے۔ مسز برلاس سے خواہش کی تھی کہ میرا مدرسہ ضرور دیکھنا۔ چنانچہ دہلی میں ان کی اہلیہ صاحبہ نے بڑے شوق سے بلایا۔ بڑا شاندار جلسہ کر کے انکی دعوت کی۔ وہاں انہیں کوئی خاص بات نظر نہ آئی سوائے اسکے کہ لڑکیوں کا بیشتر وقت دینی کتابوں کے پڑھنے میں لگتا ہے۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں نے لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں بڑی بے پروائی برتی ہے۔ یہ نہیں سوچا کہ انہیں تعلیم دینے کا کیا مقصد ہونا چاہیئے۔ اور وہ کس طرح پورا کرنا چاہیئے۔ عورت کے لئے کمال کا درجہ ماں بننا ہے۔ اس منزل میں قدم رکھنے سے پہلے اُسے کسی کی بیوی بننا پڑتا ہے۔ بیوی بننے سے پہلے وہ بیٹی بن کر زندگی بسر کرتی ہے۔ ان تین منزلوں میں سے گزرے بغیر کسی کو چارہ نہیں۔ ہر لڑکی کو ان منزلوں میں نیک اور مفید زندگی بسر کرنے کے قابل بنانا مدارس کا مقصد ہونا چاہیئے۔ ہر لڑکی کو گھر چلانے اور بچے اُٹھانے کا ہنر آنا چاہیئے۔ تمدن کی دیگر ضروریات انکے علاوہ ہیں۔

علیگڈھ میں مادری زبان کی جانب توجہ دیکھکر بڑا دل خوش ہوا۔ یونیورسٹی کی یونین نے بڑی عزت افزائی کی تھی کہ ہم دونوں کو تقریر کے لئے بلایا تھا۔ وہاں ابھی تک غیر زبان کے ذریعے علوم کی تعلیم دی جاتی ہے جس سے ٹھوس قابلیت بہم پہونچانی ناممکن ہے۔ البتہ نوجوانوں کے دماغ غیر ہندستانی قالب میں ڈھالنا آسان ہو جاتا ہے۔ پہلے ہر کام انگریزی میں ہوتا تھا۔ ایک زمانے میں مادری زبان کو غیر [illegible] میں بولنا علیگڈھ کا فیشن ہو گیا تھا۔ یونین کی تقریروں پر بھی اس کا اثر پڑتا تھا۔ مجھے ایک موقع یاد ہے۔ مقابلے کی تقریریں تھیں۔ دو مقرروں میں سخت مقابلہ تھا۔ ایک صاحب لکھنؤ کے تھے۔ بڑی [illegible] بولتے تھے۔ تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو معلوم [illegible]

رہی ہے۔ ملائم لہجہ اور شیریں زبان، دریا بہا بہہ رہا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ انکا منہ چوم لے۔ ایک شعر پڑھنے میں غلطی ہوئی۔ دو دفعہ پڑھا اور اٹکے۔ اسی سے کھیل بگڑ گیا۔ مقابلے پر دوسرے صاحب بڑے دبنگ تھے۔ آواز بھی کراری مگر تصنّع موجود تھا۔ شیریں زبانی اور ملائمت لہجہ غائب۔ دونوں تقریریں احتیاط سے تیار کی ہوئی تھیں۔ مگر پہلی میں آمد معلوم ہوتی تھی اور دوسری میں آورد عیاں تھی۔ انعام دوسرے کو ملا۔

اب یونین ہال میں بورڈوں پر ہندستانی لکھی دکھائی دیتی ہے۔ خط وکتابت بھی اسی زبان میں ہوتی ہے۔ یہ نیک فال ہے۔ پوری تعبیر اس وقت نکلے گی جب یونیورسٹی کی تعلیم اور جملہ کاروبار ہندستانی میں ہونے لگے گا۔

زمانہ بہت ترقی کر گیا ہے۔ مگر علیگڈھ کا معیار ابھی تک نہیں بدلا۔ ایک زمانہ تھا کہ ظاہری نمود کی ضرورت تھی۔ اب وہ کافی نہیں رہی۔ اب ٹھوس تعمیری کام کی ضرورت ہے۔ آج کل کیمسٹری، بجلی اور کلوں کا زمانہ ہے۔ اس میدان میں مسلمانوں کو علیگڈھ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ وہ ایک اور اہم علمی خدمت انجام دے سکتا ہے جو کسی اور ادارے کے بس کی بات نہیں۔ موجودہ تاریخوں میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ مسلمان ہندستان میں ہمیشہ تباہی اور بربادی کی فکر میں لگے رہے ہیں۔ اس سے ہمتیں پست ہو گئی ہیں۔ کوئی قوم صرف تباہ کاری کو اپنا شیوہ بنالے تو سو برس بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ مسلمانوں نے تو آٹھ سو برس تک حکومت کی ہے۔ علامہ شبلی نے مسلمانوں کے بہت سے کارنامے روشن کئے ہیں مگر وہ سب بیرونِ ہند کے ہیں۔ مسلمانانِ ہند کو خود اپنے اوپر اعتماد حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے کارنامے یاد کریں۔ وسیع تاریخی تحقیقات کی ضرورت ہے جو یونیورسٹی کا اہم فریضہ ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی قدیم تاریخ پر سینکڑوں چھوٹی موٹی کتابیں طبع کرا چکی ہے۔ مسلمانوں کا زمانہ تو صرف ایک ہزار برس کا ہے۔

دہلی کے اندر پرست گرلز کالج کی لڑکیاں اپنی زبان کی محبت میں بہت بے قرار ہیں۔ ہندستانی زبان کے ایک پرچارک کی تقریر تھی۔ مجھے جلسے کی صدارت کے لئے بلایا تھا۔ فاضل مقرر کی تقریر کے بعد سوالات شروع ہوئے جن سے طالبات کی بے چینی ظاہر ہوتی تھی۔ جو محاورے ان کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں انہیں چھوڑنے کو کسی طرح آمادہ نہیں۔ اپنی زبان سے ان کی محبت بہت قابل قدر ہے۔ دلی کی زبان کی عمر چند سو برس کی ہوگی۔ اسکے مقابلے میں ہندستان کی عمر کہیں زیادہ ہے۔ ہندستان پر دلی کا بڑا احسان ہے کہ ایک زبان کی تعمیر میں نمایاں حصہ لیا جو ہر جگہ سمجھی جاتی ہے۔ اسے یہی سزاوار ہے کہ فراخدلی سے کام لے اور ایسی زبان کی تعمیر میں امداد دے جو ہر جگہ بولی جا سکے۔ اہلِ ہند کو متحدہ قوم بننا ہے اور انہیں اپنے تمدن کا سکہ جمانا ہے۔

زبان کی توسیع کے ساتھ اس میں توسیع کی گنجائش بھی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ہندستانی کی مختصر نویسی کی تحریر، زبان کا دائرہ تنگ کر رہی ہے اور زبان بگڑ رہی ہے۔ پہلے جب فارسی اور عربی کی تحصیل، تعلیم کا جزو تھی اور غزل گوئی میں استادوں کی سند ضروری مانی جاتی تھی تو تلفظ محفوظ تھا۔ اب ان سے غفلت برتی جاتی ہے۔ نوجوانوں کا تلفظ عام طور سے بگڑ رہا ہے۔ تلفظ کی صحت جانچنے کا کوئی معیار نہیں رہا۔ ایک لفظ کو چاہے جس طرح پڑھ لیجئے پھر غیر مانوس الفاظ کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک لفظ کہاں ختم ہوا اور دوسرا کہاں شروع ہوا۔ اس نقص کا کوئی علاج کرنے کے بجائے رسالوں کے اڈیٹروں نے تو ہتھیار ڈال دئے ہیں۔ وہ ہندستانی تحریر کے ساتھ ساتھ لاطینی حروف بھی استعمال کرتے ہیں۔ اور انگریزی الفاظ انہی حروف میں لکھتے ہیں۔ گویا انھوں نے اپنے عجز کا اقرار کر لیا کہ ہم ان الفاظ کو اپنی زبان میں نہیں لکھ سکتے۔ اور یہ اعلان کر دیا کہ ہماری زبان انگریزی الفاظ کو برداشت نہیں کر سکتی یعنی اس جانب ترقی کا راستہ بند ہے۔

برخلاف اس کے بول چال میں انگریزی الفاظ کا استعمال بڑھ رہا ہے۔ بلکہ گفتگو کرتے وقت موقع بے موقع انگریزی الفاظ چھڑکتے جانا تعلیم یافتہ ہونے کا ثبوت مانا جاتا ہے۔ اس بارے میں طیب جی کے خاندان والوں کو میں نے یکتا پایا۔ بمبئی میں اس خاندان کے افراد نہایت روشن خیال شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے یہاں عورتیں بھی بڑی شستہ انگریزی بولتی ہیں۔ مگر ان کی ہندستانی بڑی پاک صاف ہے۔ اہلِ دہلی کو ان کا لہجہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب بولنا سیکھ رہے ہیں۔ لیکن ان کی زبان بڑی پختہ ہے۔ جسٹس بدر الدین طیب جی مرحوم کی صاحبزادی مسز رشید شیخ علی صاحب اور ان کے معزز شوہر کی مہمان نوازی سے ہمیں مشاہدے کا موقع دستیاب ہوگیا۔ انھوں نے ہماری خاطر بڑی تکلیف اٹھائی نہ صرف ہمیں ٹھہرانے کی تکلیف گوارا فرمائی بلکہ اپنے خاندان سے ہمارا تعارف کرا کے بڑی عزت افزائی فرمائی [illegible]

[illegible] خوشحال ہیں۔ ایک بات بڑی قابل قدر نظر آئی۔ کسی کو زندگی کی [illegible] بہتے ہوئے دیکھتے ہیں تو کوئی نہ کوئی اُسے اپنی پناہ میں لیکر اپنی سطح کی برابر لے آتا ہے اور اس کے معیار زندگی کو ایک خاص سطح سے گرنے نہیں دیا جاتا۔

تمام خاندان والے بڑی پاک صاف زبان بولتے ہیں۔ کہیں انگریزی لفظ نہیں سُنائی دیتا۔ اپنی ضرورت رفع کرنے کے لئے الفاظ کا ترجمہ کرلیا ہے۔ ان کا بچّوں کو ڈارلنگ کی جگہ جانی کہنا بہت بھلا لگتا ہے۔ یہ خریدنیاں کرنے بازار جاتے ہیں۔ یہ سرکار کو اپنی آمدنی پر زکوٰۃ دیتے ہیں۔ غرض تمام مطالب اپنی ہی زبان میں ادا کر لیتے ہیں۔
ایک استثنیٰ بھی نظر آیا۔ جناب عطیہ بیگم صاحبہ بڑی فصیح ہندستانی بولتی ہیں۔ لہجہ بھی ہمارا ہے۔ ان کی دونوں بہنیں بھی ان سے کم نہیں۔ یہ تین ستاروں کا جھمکا اس قدر مشہور ہے کہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ عطیہ بیگم صاحبہ انگریزی بھی بڑی فصیح بولتی ہیں اور بڑے فراٹے سے بولتی چلی جاتی ہیں۔ مگر یہ چار فقرے ہندستانی کے بولتی ہیں تو دو فقرے انگریزی کے بھی بول جاتی ہیں۔

بنیادی تعلیم کی اسکیم دیکھنی چاہتا تھا۔ کچھ ادبری معلومات حاصل تھی۔ کچھ اعتراض سُنے تھے۔ مگر اصل اسکیم نظر سے نہ گزری تھی۔ بازار میں تلاش کیا۔ کہیں کتاب نہ ملی۔ کسی مدرسے میں ابھی چلائی نہیں جاتی کہ وہاں عملی صورت نظر آتی۔ اوکھلے میں جامعہ ملیہ کے تحت اُستادوں کا مدرسہ کھولا گیا ہے جہاں اُستاد تیار کئے جارہے ہیں۔ یہاں جو کچھ میں نے دیکھا اس سے میرے اعتراض اور جڑ پکڑ گئے۔ کتاب یہاں بھی نہ ملی اور نہ کوئی سمجھانے والا ملا۔ قرول باغ میں تلاش کرنے کی ہدایت ہوئی۔ وہاں جامعہ ملیہ کے دفتر میں بھی کوئی سواد نہ نکلا۔ کتابیں ختم ہو چکی تھیں۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ تمام ہندستان میں تعلیم عام کرنے کے لئے اسکیم بنائی جاتی ہے اور متلاشیوں کی تشفی کرنے سے غفلت برتی جاتی ہے۔ اس کام کے لئے تو ایک مستقل شعبہ قائم کرنے کی ضرورت تھی۔ میرے قیام کے آخری زمانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سفر یورپ سے واپس تشریف لائے۔ انہوں نے لطف و کرم اپنی ذاتی کتاب مجھے عنایت کی اور میرے اعتراضات کے جواب بھی دیے۔ اُن کی گفتگو سے مجھے اتنی تسلی نہیں ہوئی جتنی کتاب دیکھنے سے آنکھیں کھلیں۔ اس اسکیم میں اتنی خوبیاں نظر آتی ہیں [illegible] گنایا [illegible] ہیں۔ ہندستان جیسے ملک کے لئے اس [illegible] تقریباً محال ہے جس بات پر سخت اعتراض کیا

جاتا ہے وہی کامیابی کی ضمانت ہے۔ ہندوستان میں تقسیم دولت کے جو اصول کارفرما ہیں اُن سے امیر غریب میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔ غریبوں کو اس قابل بنا دینا کہ وہ اپنے بچوں کو ابتدائی تعلیم دلا سکیں صرف انقلاب کے ذریعے سے ممکن ہے جو کوئی حکومت پسند نہیں کرتی اور جو ماہرین تعلیم کے دائرے سے قطعاً خارج ہے۔ ٹیکسوں سے اتنی رقم فراہم کرلینی محال ہے۔

اہل ہند کو اپنے ہاتھ سے کام کرنے میں شرم آتی ہے جو ہماری تباہی کا باعث ہوئی ہے۔ اس قومی عیب کو دور کرنے کے لئے بچّوں کے دل میں محنت مشقت کی عظمت بٹھانی اور اس کا عادی بنانا ضروری ہے۔ سوسائٹی کا یہ اہم فریضہ تمامتر ابتدائی مدارس کو انجام دینا ہے۔ اسی وجہ سے ہنروں کی تعلیم پر اتنا زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اس تعلیم سے مدرسے کا خرچ نکال لینا مجوزہ اسکیم کا گُر ہے۔ ایک پنتھ دو کاج والی مثل صادق آتی ہے۔ اندیشہ یہ ہے کہ بچوں کی دماغی نشو و نما سے غفلت برت کر مدرسین کی تمام قوت محنت مزدوری کے رواج پر نہ صرف ہو جائے۔ اگر قوم کی بدنصیبی سے تمام مدرسین کوڑمغز بن جائیں اور منتظمین اور نگراں عملے کی عقل پر بھی پردہ پڑ جائے تو امکان ہے کہ اگلی نسل مزدوروں کی ہو۔ پھر بھی اپاہجوں کی نسل سے بہتر ہوگی بلکہ اس صنعتی دور کے لئے وہی موزوں ہوگی۔

ہر مدرسے کے لئے کسی ہنر یا صنعت کو مرکز قرار دیکر جملہ مضامین کا رشتہ اس سے وابستہ کر دینا نہایت بلند معیار ہے۔ مگر کسی مدرسے میں اس نظریے کے فدائیوں کو جمع کر کے کامیاب کر دکھانا اس کے قابلِ عمل ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے مدرس کی بجائے مجدد درکار ہے۔ ملک کے چیدہ چیدہ مدرسین اکٹھے کر لئے جائیں تب بھی ہندوستان بھر میں پچاس مدارس سے زیادہ کا عملہ فراہم نہیں ہو سکتا۔ باوجود اس نقص کے مجوزہ معیار بڑا دلفریب ہے۔ اسے پست کر دینے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ مدرسین میں جوش و انہماک اور بلند ہمتی پیدا کرنے کے لئے بلند معیار ضروری ہے۔

کسی جلسے میں ایک صاحب نے پوچھا کہ جاپان میں مسلمان کیسا گوشت کھاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ جاپانی مسلمان تو ہیں نہیں۔ ہندستانی مسلمان جب وہاں جاتے ہیں تو چند روز مچھلی پر گزارہ کرتے ہیں۔ پھر بازار سے مرغی لاکر خود ذبح کر کے کھاتے ہیں جب اس سے بھی اُکتا جاتے ہیں تو گائے کا گوشت جیسا بازار میں [illegible]

وہی کھاتے ہیں۔ زبانِ قال سے کچھ نہیں کہتے مگر زبانِ حال سے یہ کہتے ہیں کہ ہم اُن ہی علما کے مسائل مانیں گے جو یہاں کی معاشرت سے واقف ہوں۔ یہاں آکر رہیں، اپنے دستِ و بازو سے روزی کمائیں اور مسئلے بنا کر اُن پر عمل کر کے دکھائیں۔

فرمانے لگے کہ بکرا ذبح کر کے کیوں نہیں کھاتے۔ میں نے کہا کہ یہاں کی اور وہاں کی معاشرت میں بہت بڑا فرق ہے۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں گائے بکری کی اتنی کثرت ہے جیسے بہشت میں پھلوں کی۔ کسی جنتی کو پھل کی خواہش ہوئی اور وہ اُسکے منہ میں موجود۔ اسی طرح ہندوستان میں کسی کا دل گائے بکری کو دیکھنے کیلئے چاہا اور وہ اس کے سامنے حاضر۔ جاپان میں برسوں گذر جاتے ہیں گائے بکری دیکھنے میں نہیں آتی۔ ٹوکیو جیسے شہر میں بکرے کا گوشت دوا کے لئے بھی نہیں ملتا۔ وہاں بکرے کی ضرورت ہو تو خدا معلوم کہاں کہاں کی خاک چھاننی پڑے۔ سب مسلمان ایک جگہ رہتے ہوں تو بکرے کا گوشت فراہم کرنا ممکن بھی ہے۔ الگ الگ شہروں میں مقیم ہوں یا اکا دکا دور دراز محلوں میں آباد ہوں تو انتظام نہیں ہو سکتا۔ فرمایا کہ نہیں، مسلمانوں کو بکرا تلاش کر کے ذبح کرنا چاہیئے۔ میں نے عرض کیا کہ مسلمان کیا ہوئے بھیڑئے بن گئے کہ بکرے کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

پرانے زمانے کے بزرگوں نے مذہب کے نام سے دنیاوی علوم سیکھنے سے باز رکھکر مسلمانوں کو دنیا کی ردی بنا دیا۔ جن علوم کے ذریعے سے جان و مال کی حفاظت ہو سکتی ہے ان کی مخالفت کر کے عزت کی زندگی حرام کر دی۔ نئی روشنی کے بزرگ اسی قسم کی روک ٹوک سیاست کے نام سے کر کے مسلمانوں کو دنیا کا سائیس بنانا چاہتے ہیں۔ ہندوستان کی صنعتی نشو و نما میں کندھا لگانا دیگر اہلِ وطن کی طرح مسلمانوں پر بھی فرض ہے۔ ہندو طلبا کو جاپان کے صنعتی اداروں میں پڑھتے دیکھکر کئی سال سے کوشش کر رہا تھا کہ مسلمان بھی فائدہ اٹھائیں۔ اسی ضمن میں میرے مضامین انگریزی اور ہندستانی کے اخباروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ میں نے ایک بزرگ کی خدمت میں یہ خیال پیش کیا تو انہوں نے سیاست کا بہانہ کر دیا۔ مخاطب کو خاموش کرنے کا یہ بڑا کارگر حربہ ہے۔ کاش کہ انہیں خبر ہوتی کہ حکومتہائے میسور و پنجاب و آسام و برما اور کلکتہ یونیورسٹی طلباء کو وظیفے دے دیکر جاپان بھیجتی ہیں۔ جس سال جنگِ یورپ شروع ہوئی ہے پنجاب و آسام اور بہار کی حکومتوں کے وظیفہ خوار طلبا جاپان میں موجود

تھے۔ اب دو سال بعد بھی حکومت برما کے طلبا تعلیم پا رہے ہیں۔ [illegible] طلبا ان کے علاوہ ہیں۔ اگر سیاسی فضا ایسی مکدر نہ ہوتی تو میں [illegible] جاری رکھتا۔ مگر آجکل ہندستان سے نکلنا خطرے سے خالی نہیں۔

دلی میں رمضان میں چائے کی پارٹی کا نرالا دستور [illegible] افطار کے وقت بلاتے ہیں جس سے دھوکا ہوتا ہے۔ کوئی روزہ دار گیا تو کھانے کی خوشبو کا منتظر رہتا ہے۔ پھل اور نلادن پر پارٹی ختم ہو جاتی ہے تو منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔

ایک دستور دیکھکر بڑا رنج ہوا۔ لوگ مشرقی گھر میں مغربی [illegible] برتنے لگے ہیں۔ چاندنی کے فرش پر جوتا پہنے چلے آتے ہیں۔ اپنے گھر میں آدمی چاہے جس طرح زندگی بسر کرے دوسروں کو دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ مگر جب غیروں کے گھر میں اُٹھنے بیٹھنے کی جگہ کوئی جوتا لیکر چلا جائے تو سخت ناگوار ہوتا ہے۔ میزبان منہ پر کچھ نہ کہے، دل میں بہت برا مانتا ہے۔ اپنے آرام کی خاطر دوسروں کو تکلیف دینا مشرقی شعار تو ہے نہیں۔ یہ باتیں مغرب سے سیکھنے کی نہیں ہیں۔ آداب سکھانا مشرق کا کام ہے۔ مغرب ابھی دورِ بہیمیت میں سے گذر رہا ہے۔ مشرق دورِ انسانیت کی تکمیل کر کے دورِ روحانیت میں داخل ہو چکا ہے بلکہ کئی منزلیں طے کر چکا ہے۔ مغرب سے سائنس اور تجارت سیکھنی چاہیئے۔ پھر یہ سمجھنا بھی تو غلط ہے کہ مغربی آداب دلآزاری کو جائز رکھتے ہیں۔

ذرا غور کرنے سے ایک عجیب احساس ہوا کہ ہم ہندستانی بھی نظریۂ ارتقا کے قائل ہیں۔ یورپین لوگ اپنی نسل بندر سے جا ملاتے ہیں۔ ہم اپنی نسل گئو ماتا سے نکالتے ہیں اور بڑی سختی سے اس پر عامل ہیں۔ اسی طرح پتوں کی جگالی کرتے ہیں۔ ہندستان میں ہم بھی پان کھانے لگے تھے۔

چاندنی چوک میں بھڑوالے کنوئیں کے پاس ایک کوٹھے پر لاؤڈ اسپیکر اشتہار کے لئے لگا ہوا دیکھا۔ ایسی کان پھوڑ آواز نکلتی تھی کہ اُس طرف جانے سے وحشت ہوتی تھی۔ اسکے نیچے ہی بڑی بڑی دکانیں تھیں۔ دکانداروں اور گاہکوں کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ بڑا تعجب ہوا کہ ریڈیو والوں نے ظلم کرنیکا نرالا طریقہ نکالا ہے اور لوگ برداشت کر لیتے ہیں۔

ہندستان پہونچکر ہم توس بنانا بھول گئے۔ یہاں ڈبل روٹی کے توس سینکنے کچھ مشکل نہیں۔ مگر دلی میں کسی کی نہ چلی۔ اچھی سے اچھی ڈبل روٹی تلاش کی جب توس سینکا، کھٹ کھٹ۔ نوکروں پر غصہ آیا تو خود کام سنبھالا مگر بے سود۔ ناچار توس چھوڑ کر [illegible] پر اُتر آئے۔ چنے خوب کھائے بلکہ یہاں تک [illegible]

... ت بہت سی لائے مگر جس چیز کے صحیح معلوم ہوئے ... بے حیرت ... ہے وہ دلی کی مٹی کی صراحی ہے جو وہاں کی آرٹ بہت اچھا نمونہ ہے۔

گانا سننے اور ناچ دیکھنے کا اشتیاق تھا، پورا نہ ہوا۔ ناٹک کو ... گیا۔ ہندستان میں ناٹک تو بیقدری کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اسکی بجائے سنیما کا سستا تماشہ ہر جگہ مقبول ہے۔ سنیما کی اشتہار بازی میں ہندستان جاپان سے سبقت لے گیا ہے۔ سنیما گھروں کے پھاٹک پر مقوی کاٹ کر جو منظر بناتے ہیں وہ یہاں ناپید ہیں۔ دہلی میں سنیما کے اوقات میرے لئے بہت نامعقول نکلے۔ اسی وجہ سے زیادہ نہ دیکھ سکا۔ رات کو بارہ بجے تک جاگنا مجھے کسی طرح منظور نہ تھا۔ شام کا گرم گرم کھانا چھوڑ کر چھ بجے جانے کو دل نہ چاہتا تھا۔ تین بجے مجھے فرصت نہ تھی۔ میرا قیام اسقدر قلیل تھا کہ اپنے اوقات میں وہاں کی متمدن زندگی سے مطابقت پیدا کر لینا ذرا مشکل تھا۔

اودے شنکر کا قدیم ناچ دیکھکر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ میں نے یہاں رام گوپال کے دیہی ناچ دیکھے ہیں۔ میرے نزدیک شیوجی کے ناچ میں گوپال افضل ہے۔ اس ناچ میں دیکھنے والوں کے دل پر ہیبت طاری ہونی چاہیئے جو گوپال پیدا کر دیتا ہے۔ اسے قوت مردانہ اور غیظ و غضب کے اظہار میں شنکر پر فوقیت حاصل ہے۔ شنکر اپنے بدن کے لوچ اور حرکات و سکنات پر کمال قابو کی وجہ سے اس ناچ میں نزاکت پیدا کرتا ہے جس سے طبیعت مسرور ہوتی ہے۔ شنکر کے ناچ میں دو باکمال رقاصائیں زہرہ اور سیمکی حسن و نزاکت کا اضافہ کر دیتی ہیں۔ انکی موجودگی شنکر کے ناچ کو زیادہ دلفریب بنا دیتی ہے۔ گوپال اکیلا ناچتا ہے۔ شنکر کے ساتھ سیمکی پاربتی کا رقص کر کے ناچ کی تکمیل کر دیتی ہے۔ کیونکہ شیوجی دیوتا اور پاربتی جی دیوی دونوں میں مقابلہ ٹھہرا تو دیوتا دُن کے جلسے میں دونوں ساتھ ساتھ ناچے تھے۔ یہ تینوں باکمال رقاص بڑے قابل قدر ہیں۔ خصوصاً اودے شنکر جن کے سر استادی کا سہرا ہے۔ ایک قدیم آرٹ جو مُردہ ہو چکا تھا اُسے زندہ کر رہے ہیں۔

اودے شنکر کے ناچ کی تنقید دیکھنا چاہتا تھا۔ انگریزی کے معتدد روزناموں میں بڑے شوق سے تلاش کیا۔ بہت مایوسی ہوئی۔ گول مول الفاظ میں بڑی عالمانہ تنقیدیں لکھی تھیں۔ جن کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ پوری کی پوری تنقید محض ایک لفظ کی تبدیلی سے ہر فنِ لطیف پر کھپ سکتی ہے۔ خواہ گانے کی تعریف کرنی ہو، خواہ نقاشی کی، خواہ بت سازی کی، ایک ہی جامع تنقید کافی ہے۔

نور الحسن ...

آہنگِ تپش

اُلٹ کر رکھدیا ساقی نے میخانے کا میخانہ
مری تقدیر پھوٹی تھی جو ٹوٹا مجھ سے پیمانہ

رہا کچھ دن اگر قائم یہی اندازِ مستانہ
پڑیگی جس پہ آنکھ ان کی وہ ہو جائیگا دیوانہ

نہاں ہے پردۂ ظلمت میں سوز و ساز کا عالم
مآلِ شمعِ ہستی کچھ نہیں جز خاکِ پروانہ

جسے نیرنگیٔ احوالِ عالم لوگ کہتے ہیں
مری تقدیر کے بننے بگڑنے کا ہے افسانہ

بہل جاتا ہے ہر وحشت زدہ کا دل یہاں آکر
یہی دراصل بستی ہے جسے کہتے ہیں ویرانہ

یہ جتنے بت ہیں کوہِ طور کے ٹکڑے ہیں اے زاہد
قیامت تک نہ ہوش آئے جو کہدوں رازِ بتخانہ

خدا کے سامنے دل بھی مرا اُن کی طرف نکلا
یہ کیسا آشنا تھا ہو گیا محشر میں بیگانہ

وفورِ عشق رعبِ حسنِ لیلیٰ پاسِ رسوائی
انہی باتوں نے شاید کر دیا مجنوں کو دیوانہ

یونہی عاشق کی پتلی کی لگی بھی پھونکنے دیتا ہے
جلا کرتا ہے لو پہ شمع کی جس طرح پروانہ

سُنا کر ذکرِ کوثر شیخ نے بہکا لیا آخر
ہمیں کرنی پڑی توبہ خلافِ شانِ رندانہ

تپش جس جا گمانِ خوابِ راحت ہے وہاں جاؤ
ادھر ہے خاک کا بستر اُدھر مسندِ شاہانہ

(عبداللطیف تپش)

سپنوں کا محل

ادراک اور شعور کی پرلی طرف میں نے سپنوں کا ایک محل بنایا ہے جو عنبر اور لوبان کی خوشبوؤں سے لبریز اور کافوری فانوسوں کی سیمیں روشنیوں سے منور ہے۔ یہاں میں نے اپنی اُمیدوں کی رانی کو ایک زمردیں سنگھاسن پر بٹھا رکھا ہے۔ میں گیت گاتا ہوں وہ طاؤس بجاتی ہے اور پریاں ہمارے سروں پر آکر منڈلاتی ہیں اور اپنے پروں کو اس طرح پھڑ پھڑاتی ہیں جیسے خاموش خوابگاہوں کے ریشمی پردے سرسراتے ہیں۔ میری اس شہزادی کا نام خدا جانے کیا ہے۔ لیکن میں اُسے شہزادی ہی کہہ کر پکارتا ہوں، کیونکہ اس کے انداز میں شاہانہ وقار اور امیرانہ طنطنہ ہے!

واللہ میں شاعری نہیں کر رہا۔ آپ شاید میرے جذبات و احساسات میں دلچسپی محسوس نہ کریں کیونکہ یہ بھاپ اور فولاد کا زمانہ ہے، سائنس کی مادی نظریات کا دور دورہ ہے۔ یہ "کیوں" اور "یہ کیسے؟" اور "کب؟" اور "کہاں" کا راج ہے۔ اور میں باتیں کر رہا ہوں خوابوں کی دنیا کی۔

یہ جو گاؤں سامنے نظر آرہا ہے نا۔ یہیں میں نے اُسے پہلی مرتبہ دیکھا۔ اُپلے تھوپ رہی تھی گلی کے کنارے۔ میں ایک گھوڑے پر سوار تھا۔ راستہ نہ پاکر میں نے کہا "لڑکی، ذرا ادھر ہو جا تاکہ گھوڑا گزر جائے۔"

"ذرا دیوار سے لگ کر نکل جا" وہ اپنی خوابگوں پلکیں اُٹھا کر بولی۔ اور میں دیوار سے ہو کر نکل گیا۔ پاؤں چھل گیا دیوار سے رگڑ کھا کر۔ لیکن اس کی آنکھوں کی تیکھا نہ چمک نے مجھے کسی گلے شکوے کی مہلت نہ دی۔ محکمۂ انہار کے ایک فولادی دل رکھنے والے ضلعدار پر ایک اُپلے تھوپنے والی نے ایک ایسا بے پناہ تیر پھینکا کہ فولاد موم کی طرح گداز ہو گیا اور نبضیں پھڑکنا اور آنکھیں جھپکنا بھول گئیں۔

جب میں ذیلدار سے مل کر پلٹا تو وہ چھت پر کھڑی منڈیر پر گیلے کپڑے پھیلا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "لڑکی۔ ہو سکے تو ٹھنڈے پانی کا ایک پیالہ لادے۔ پیاسا ہوں اور سفر طویل ہے۔ راستے میں کوئی ندی بھی نہیں پڑتی اور دھوپ بھی تیز ہے!"

بولی "چھاچھ پی لو گے کیا؟"

میں نے کہا "اگر خود تم نے ہی دودھ بلویا ہو تو چھاچھ ہی لا..."

"کیا مطلب؟" اُس نے اوڑھنی کا پھڑپھڑاتا ہوا پلو سینے پر ... اور چتون پر بل لاکر مجھے شاہانہ انداز سے گھورنے لگی۔

میں نے گھبرا کر کہا "میرا مطلب یہ ہے کہ میں وہی چھاچھ پیوں گا ... خود تو نے تیار کی ہو گی، آخر تم زمینداروں کے ہاں غلیظ میراثنیں اور دھوبنیں ہی کام کرتی ہیں نا۔"

"نہیں بھئی!" وہ بولی "میں خود بلوتی ہوں۔ ہم اتنے بڑے زمیندار نہیں!"

"اچھا! تو غریب گھرانے کی ہے یہ لڑکی! میری سرمایہ دارانہ رگ پھڑکی۔ اور جب وہ چھاچھ لیکر آئی تو بولی "تو کہاں جائیگا؟"

"لائل پور" میں نے کہا۔

"بہت بڑا شہر ہے؟" اُس نے پوچھا۔

اور میں نے جواب دیا "ہاں، بہت بڑا شہر ہے، تمہارے گاؤں سے دس گنا بڑا۔ وہاں یہ چھاچھ واچھ نہیں پیتے ہم لوگ۔ وہاں انگوری شربت ہوتے ہیں۔"

"شکر کے شربت؟"

"نہیں انگوروں کا رس!"

"اچھا!" اُس نے بھویں سکیڑ کر کہا۔ اور پیالہ لیکر اندر چلی ...

اب آپ خود اندازہ لگا لیں کہ اس گاؤں میں میرا دورہ ... روز ہوتا ہو گا۔ مہینے میں پندرہ دن۔ اور ان پندرہ دنوں میں اگر ایک شخص للچائی ہوئی نظروں سے ایک لڑکی کو دیکھے تو دو نوں دلوں ... تار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ سو میرے دل کے خفتہ تار بھی جھنجھنانے ... بھی میرے خوابگوں پلکوں کی جھپک میں یہ جھنجھناہٹ سی ... کنپٹیوں کے قریب جل ترنگ سے بجنے لگے۔ اُدھر اس نے ... منڈیر کے پاس میری تاک میں بیٹھنا شروع کر دیا ... تو کشاک نے ایک کنکر میرے لیے ... تجاہل عارفانہ سے پوچھتا ... وہ ...

جیسے پھیلا کر کہتی: "بنفشی ہے! ___ اور فضا میں ہزاروں پریاں پر پھڑپھڑانے لگتیں۔

ذیلدار کی چوپال میں میں رات کو سوتا تھا۔ اور جب سب سو جاتے تو میں وہاں سے کھسک آتا۔ گاؤں کے کتّے ہر راہ چلتے کو دیکھ کر بھونکنے میں شہری کتّوں سے زیادہ دریا دل واقع ہوتے ہیں۔ اس لئے میری دونوں جیبیں بڑی بڑی ڈبل روٹیوں سے بھری ہوتیں۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ وہ اپنے بوڑھے والدین کے ہمراہ چھت پر سویا کرتی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر نہایت مدّھم آواز میں کھنکارتا اور کہتا، "بنفشی!" اور منڈیر پر سے اس کا سر بلند ہوتا۔ بال بکھرے ہوئے، چولے کے بٹن کھلے ہوئے۔ اپنا سڈول بازو نیچے لٹکا کر کہتی: "ار رر رے! ابا ابھی خرّاٹے نہیں بھر رہے اور ماں ابھی مچھروں کی وجہ سے کھنکھلا رہی ہے۔ ابری گلی میں چل جا!"

اور میں کہتا: "اری اُدھر تو بڑا خوفناک کتّا ہے کسی کا۔ کمبخت ڈبل روٹیاں بھی قبول نہیں کرتا۔"

اور وہ مڑ کر چھت پر نگاہیں دوڑاتی اور پھر پلٹ کر کہتی: "لے میں آ گئی! ___ اور پھر ہم دونوں گلیوں میں چھپتے چھپاتے باہر کھیتوں میں چلے جاتے۔ مینڈھوں پر شبنم آلود گھاس سے جب ہمارے پاؤں مس ہوتے، گنجان کھیت سرسراتے، مینڈکے ٹیں ٹیں کرتے، رات سنسناتی، اور جب دور جیسے ستاروں کے قریب سے ٹیٹری کی درد بھری الاپیں سنائی دیتیں تو ہمارے دلوں میں گھنگروؤں کی جھنکار سی بلند ہوتی۔ ہماری انگلیاں اس قدر ٹھنڈی ہو جاتیں جیسے ہم کرّۂ زمہریر میں محوِ پرواز ہیں اور ہماری کنپٹیاں یوں تپنے لگتیں جیسے دھوپ میں ریت! ہم وہیں شبنم آلود گھاس پر بیٹھ جاتے یا صحیح الفاظ میں گر جاتے۔ وہ میری قمیص کے بٹنوں کو گھماتی اور پھر انہیں توڑ کر گنجان کھیتوں میں پھینک دیتی ___ ایک سہمے قہقہے کے ساتھ!

میں کہتا: "اری اگر میں تیرے چولے کے بٹن اسی طرح توڑ کر پھینک دوں تو بڑی چیخے گی!"

اور یہ سن کر اس کا جسم ڈھیلا سا پڑ جاتا جیسے ریشم کی گٹھڑی کی گرہیں آپ ہی آپ کھل جاتی ہیں۔ اس کی زبان گنگ ہو جاتی۔ اور مٹھی کو کس کر سینے پر پھیلا دیتی اور یوں معلوم ہوتی جیسے میو ہسپتال کی کوئی ملٹری نرس شب بیداری سے تھک کر بیٹھ گئی ہے۔ میں اسے جھنجھوڑتا اور وہ پرے کھسک کر کہتی: "ارے تو ایسی باتیں نہ کیا کر! میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔"

"دم گھٹنے لگتا ہے تیرا؟" میں اسے چھیڑتا۔ اور وہ بھاگ کر بُڑ بُڑاتی کھیت کے پرلے سرے پر جا کر بیٹھ جاتی۔ اور ہم جوار کے بہت سے بھٹے کھاتی۔ گندم کا نرخ۔ گندمی رنگ۔ گاؤں کے عشق گھوڑے۔ لاہور کا لارنس، دلّی کا چاندنی چوک اور پھر ___ ابا جاگ پڑے تو سمجھو کل میری چوٹی کٹ گئی۔"

میں کہتا: "میں لاہور سے تمہیں مصنوعی بال لا دوں گا۔ ابریشمی بال۔ چاند کی کرنیں۔"

وہ کبھی کہتی: "دودھ کو بہت زیادہ بلو لا جائے تو مکھن پگھل جاتا ہے۔ اور چھاچھ بے مزہ ہو جاتی ہے۔ لیکن تم کیا سمجھو چھاچھ واچھ کی باتیں، تم تو پینے کی چیزوں کے عجیب عجیب سے نام لیتے ہو۔ سناؤ تو دو ایک نام!"

اور میں کہتا: "اورنج سکوئیش، جانی واکر، برانڈی الیگزینڈر ہوئی۔"

"بڑے مزیدار ہوں گے یہ شربت؟" وہ پوچھتی۔

اور میں کہتا: "ہاں کبھی پلاؤں گا تمہیں۔"

"کب؟" وہ پوچھتی۔

اور یہ سوال سن کر میرے دل و دماغ پر سنگین تاریکیاں پھیل جاتیں۔ احساسات کا دھارا یکلخت تذبذب کے ریگزار میں غرق ہو جاتا۔ زبان ڈھیلا بن جاتی۔ میں اُسے اس "کب" کا جواب دینا چاہتا مگر نہ دے سکتا۔ مجھ میں جرأت نہیں تھی۔ میں بزدل تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میرا جواب اُسے بُرا لگا تو پھر وہ اپنے فطری شاہانہ طنطنے کو بروئے کار لا کر مجھے ٹھکرا کر گاؤں کو چل دے گی، اور مجھ سے یہ راتیں بھی چھن جائیں گی۔ وہ میری پسلیوں میں ٹہوکا دے کر کہتی: "ارے کب؟"

اور میں کہتا: "جب اللہ نے چاہا۔"

ہنسی کو ضبط کرتی وہ چٹکی بجاتی اور زبان اور تالو کی مدد سے پٹاخہ سا چلا کر کہتی: "ارے تو تو ملّاں ہی!"

ملّاں! ___ یعنی بزدل اور کم ظرف اور ریاکار اور جھوٹا اور فریبی اور لالچی اور ___ اور ___ اور مجھے ہر طرف طاعون زدہ چوہوں کا تعفّن سا محسوس ہونے لگتا!۔

اور جب میں چوپال پر واپس آتا تو دل میں جیسے بھڑیں ڈنک پر ڈنک لگائے جا رہی ہیں، کانوں کے قریب بھنبھنا رہی ہیں۔ قمیص میں گھس کر بدن پر رینگتی پھر رہی ہیں ___ لے بے! ___ میں چادر کو لاتوں کی چرخی چلا کر پرے پھینک دیتا۔ جیسے مروڑ کر پھینک دیتا۔ اور پھر اچانک اپنے پٹھوں کو اکڑا کر کہتا: "ارے ہمت کر۔ ہمت کر کمبخت!"

عورت کے انداز میں چاہے کتنا ہی وقار کیوں نہ ہو آخر وہ عورت ہے یعنی مجسّم کمزوری، مرد کی غلام۔ عورت آخر عورت ہی ہے نا!"

اور پھر مجھے ہیر یاد آجاتی ہے کہ کیسے وہ رانجھے کے عشق میں پریشان رہی۔ اور سسّی کہ کیسے وہ گھر بار چھوڑ کر تھل کے ویرانوں میں جا بسی۔ اور سوہنی۔۔ اور شیریں۔۔ اور لیلےٰ۔۔ اور۔۔ اور کلوپیٹرا!"۔۔۔

یہاں پہونچکر میرے دماغ میں نشتر سے تیر جاتے ہیں "کلوپیٹرا تو ملکہ تھی۔۔ شاہزادی!۔۔ بڑا وقار تھا اس میں۔۔۔ وہ انطونی سے عشق نہیں کرتی تھی۔ کھیلتی تھی اُس سے!۔۔ لیکن آخر وہ بھی عورت ہی تھی نا!۔۔ اور پھر سانپ کی مدد سے اُس نے اپنی نسوانی کمزوریوں کا مظاہرہ بھی کر دیا!"

بہت رات گئے تک میں یہی سوچا رہتا۔ اور جب لائل پور واپس آتا تو میری رگ و پے میں نئی زندگی سی حلول کر جاتی۔ اور میں مصمم ارادہ کر لیتا کہ اب کے تو اُسے اس کمبخت "کب" کا جواب دے ڈالوں گا۔ اگر اُس نے بُرا مانا تو جائے گی کہاں۔ اٹھوا لوں گا اُسے۔۔۔!"

اور ایک بار جب میں لائل پور سے چلا تو یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں نپولین ہوں اور روس پر یلغار کرنے جا رہا ہوں۔ نصف شب کو میں چوپال پر سے اُٹھا تو اس کے مکان کی دیوار سے لگ کر بولا۔ "ہے مجتسنی!"

منڈیر پر سے جھک کر وہ بولی "ارے آ گئے تم؟۔۔ میں تو اداس ہو گئی تھی"

اور جب ہم باہر کھیتوں میں شبنم آلود گھاس پر جا کر گر پڑے تو یوں ہی باتیں کرتے کرتے میں اُسے چھاچھ اور جانی واکر کے موضوع کی طرف کھینچ لایا۔

"کبھی پلاؤں گا تمہیں" میں نے کہا۔

"کب" اُس نے پوچھا۔

۔۔۔ اور کائنات قلابازی کھا گئی! ستارے ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر بجنے لگے۔ کھیت اوپر اُٹھکر فضاؤں میں معلق ہو گئے۔ دل و دماغ کی طنابیں کھچ گئیں۔ میرا دل ایک سیکنڈ میں سو بار دھڑک گیا۔ میں نے کانپتے ہوئے، جیب سے روپوں سے بھرا ہوا بٹوا باہر نکالا اور اس کی انگلیوں میں تھما کر بولا "تمہیں اپنے ہمیشہ کے لئے ساتھ لے جاؤں گا"

اور بٹوے میں سکّوں کا چھنا کا سنکر وہ ایک لمحہ کے لئے مجسّمہ کی طرح جم کر رہ گئی۔ اور پھر اچانک بٹوا دور کھیتوں میں پھینکتے ہوئے بولی "ارے سوداگر کہیں کے۔ تو مجھے خریدنے آیا ہے۔ ارے بدھو کیا تو نے مجھے ربڑ کی گڑیا سمجھ لیا ہے کہ دو کوڑی دیکر مول لے لیگا۔ بدمعاش کہیں کا۔ لچا۔ شہدا!"

اور وہ اونچی نیچی مینڈھ پر ناگن کی طرح تیرتی اندھیرے میں گھل گئی!

نپولین کی روس پر یلغار اور پھر اُس کی افسوسناک پسپائی!

۔۔۔ میں نے اپنے بال نوچ لئے۔ جی چاہا بڑھ کر اُسے اُٹھا لوں اور کاندھوں پر ڈال کر سامنے جنگل میں لے جاؤں اور ایسے اس قدر پیٹوں کہ اس کے۔۔۔ اس کے چولے کے بٹن ٹوٹ کر الگ جا گریں ۔۔۔! لیکن میرے ہاتھ پیر شل ہو چکے تھے۔ میرا جسم سو گیا تھا!

دوسرے روز صبح سویرے میں گھوڑے پر سوار ہو کر لائلپور کو روانہ ہوا۔ جب اُس کی گلی سے گزرا تو ہلکے ہلکے دودھ بلوئے جانے کی آواز کے ساتھ مجھے ایک گیت سُنائی دیا ؎

دھیرے دھیرے بلوری سہیلی
مکھن پگھلا جائے

میں اس کے بعد اُس گاؤں میں دورے پر کبھی نہیں گیا۔ یہیں سے کھیت وہیت دیکھ لیتا ہوں۔ مجھے وحشت سی ہوتی ہے وہ گلیاں دیکھکر۔ اور اسی لئے ادراک اور شعور کی پرلی طرف میں نے سپنوں کا ایک محل بنایا ہے جو عنبر اور لوبان کی ۔۔۔۔۔ ہائیں! آپ تو مسکرا رہے ہیں!۔

احمد ندیم قاسمی؛

پنجابی دیہات کے مشہور گیت۔

ہیر رانجھا

"قصہ کے طالب قصہ سُنکر خوش ہوں گے، اہلِ دل اِس مضمون کا خیر مقدم گریہ زاری سے کریں گے، درد اُٹھے تو ہائے نکلتی ہے۔ کون صبر کر سکتا ہے — اوروں کے نام لے لیکر اپنے دلبر کی بات کی جاتی ہے۔ کلام وہی ہے جو درد سے بھرا ہو — کما داور گواہی میں اس سے فرق ظاہر ہوتا ہے۔ دردمندوں کے شعران کے حال پر گواہی دیتے ہیں۔ جس کے کونے میں پھول بندھے ہوں اسی رومال سے خوشبو آتی ہو۔ جس میں اہلِ درد کے احوال کی کوئی پوشیدہ رمز نہ ہو، اے محمد بخش[1] ایسے سخن سے چُپ بھلی۔"

مثل رانجھے کی ابتدا کا ذکر ہے اور سرزمینِ پنج آب کا واقعہ، تخت ہزارہ (ضلع شاہ پور) کے چودھری موجو کا نوجوان لڑکا دھیدو[2] گوجروں کی برات کے ساتھ جھنگ وارد ہوتا ہے۔ براتی رنگا رنگ تماشوں میں مصروف ہیں۔ میاں رانجھا ایک طرف بیٹھے الغوزے بجا رہے ہیں۔

"رانجھا بانسری بجا کر خدا کی صفت صفات بیان کر رہا تھا کہ کہیں سے سیر کرتی کراتی سیال جاٹوں کی نوخیز لڑکی ہیر اپنی سہیلیوں سمیت ادھر کو ہو نکلی — جواتی پر آئی ہوئی البیلی ہیر اور بانکا البیلا رانجھا — آنکھوں آنکھوں میں تعارف ہو گیا۔"

برات پلٹی، رانجھا بھی ساتھ ہی واپس لوٹا اور قضا و قدر کے فرشتے ایک زبردست المیہ کا پہلا ورق الٹ کر ختم گئے، تھوڑے دنوں بعد رانجھا کا باپ مر گیا، بھائیوں اور بھاوجوں کا سلوک اونچنے کو بیٹھے کا بہانہ ہوا اور رانجھا اپنا گھر بار چھوڑ جھنگ کو چل نکلا، دریا کے گھاٹ پر اسکی ملاقات ہیر سے ہوئی۔ وہ حقیقت حال سنکر اسے اپنے باپ کے پاس لے گئی اور رانجھا ہیر کے والد کے ڈھور ڈنگر چرانے پر نوکر ہو گیا۔

"رانجھے کی بانسری سے سب گوری کالی بھینسیں مست ہو گئیں — اس کی مست آواز سے مست ہو کر وہ اس کے قدموں سے آلگیں۔ تمام بیلے میں رانجھے کی رچنا رچ گئی۔ ہر ڈالی سے رانجھا رانجھا کی آواز آنے لگی — وفا، رانجھے نے انا الحق کی بین بجائی تو تمام خوش بختوں نے اُسے مان لیا —"

میاں رانجھا کے کام سے خوش ہو کر اور اسکے حسب نسب کو جانتے ہوئے ہیر کے والدین نے اشارہ کنایہ سے رانجھا کو ہیر کا رشتہ دینے کا یقین دلایا اور رانجھا کو اپنی خوش بختی کا یقین ہونے لگا، چند دن بعد ادھر ہیر اور رانجھا کے درمیان محبت کے پینگ بڑھنے شروع ہوئے ادھر عشق اور مشک کا راز طشت از بام ہونا شروع ہوا۔ پہلے پہل تو ہیر کے والدین نے ان افواہوں پر کان نہ دھرا لیکن ایک دن برادری کی عورتیں ہیر کی ماں سے یوں گویا ہوئیں:-

"تیری بیٹی خراب ہے، ہم ماسیوں پھوپیوں کے دل اسکی باتیں سُن سُنکر اندر ہی اندر جل گئے ہیں — یہ سارے جہان میں نشر ہو چکی ہے۔ ہمیں تو اپنی جوان لڑکیوں کی فکر ہے — گھر سے قرآن لیکر مسجد کو جاتی ہے لیکن جنگل میں جا کر چرواہے کے ساتھ کوئی اور ہی کتاب پڑھتی ہے۔ قاضی شمس الدین سے پوچھ لو ایسی شوخ و شنگ بیٹی کا جلد نکاح کرنا ثواب کا کام ہے۔ ہیر شاہزادیوں سا دماغ رکھتی ہے اور چرواہا رانجھا نواب بنا پھرتا ہے۔ وارث شاہ[3] ہیر کے یہ چلن دیکھکر لوگ منہ میں انگلیاں ڈالتے ہیں —"

پہلے تو ہیر کے والدین نے اپنی بیٹی کو سمجھانا چاہا لیکن وہ بھلا کب مانتی تھی، مجبوراً انہوں نے یہ ٹھانی کہ ہیر کی شادی کسی اور جگہ کر دی جائے اور رانجھا کو نوکری سے جواب دیدیا جائے، بقول شاعر:-

---

[1] میاں محمد بخش صاحب مرحوم، مثنوی گو پنجابی شاعر، صوفیانہ طرز میں سادگی و پرکاری کے علمبردار۔ [2] بعض کے نزدیک ابھی لودھی حکومت کا چراغ گل نہ ہوا تھا۔ [3] دھیدو۔ وحیدو۔ یا وحیدالدین ولد موجو۔ معزالدین یا نواب معزالدولہ بہادر۔ رانجھا ذات کا جاٹ۔

[4] خان صاحب عبدالغنی صاحب وفا قریشی، ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ جیل بالقابہ۔

[5] سید وارث شاہ صاحب مرحوم پنجابی کے شاعر اجل۔

"دُنیا میں یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ ہیر کا رانجھے کے ساتھ تعلق ہے، عزت آبرو کے گوہر خاک میں مل گئے اور ننگ و ناموس کے بنے بنائے گھروندے گر پڑے — وارث شاہ وہ تنگ آ کر کہیں اس کی شادی کر دیں گے — وہ اسے شن کے رسّوں میں جکڑ کر بزور ہل میں لگا لیں گے۔ خواہ اس کے کوہان سے گوشت کے ٹکڑے اڑ جائیں —"

"دن رات سمجھا سمجھا کر والدین بھی اُکتا گئے — ان دونوں کی کمریں فکر سے ٹوٹ گئیں۔ سچ ہے چنتا تمام روگوں کی جڑ ہے — ہیر نے شرم و حیا کو گھول پیا اور والدین کی ناک کاٹ دی — ہیر رانجھا نے کوئی منصوبہ گانٹھا۔ ان پر سپاہیوں کی طرح ہر وقت کون پہرہ دیتا رہے۔ (لوگ کہتے) بھلا کنواری لڑکی کو زیب و زینت کی کیا پڑی ہے۔ یہ روز دنداسڑے کیوں ملتی ہے؟ وہ تیل ڈال کر پٹیاں جمالتی اور ٹھمک ٹھمک کرتی چلتی ہے۔ اُس کو آخر کار ضرور برہنہ ہونا ہے اور گائے کے دودھ میں مدار ٹپکا نا ہے — لوگ اٹھ جانے والی بیٹیوں کے سر میں خاک جھونکتے ہیں اور ننھیال والے اس کو جہیز نہیں دیا کرتے۔ کالیداس[1] چور اور عاشق قسموں سے شک رفع دفع نہیں کر سکتے —"

چند دن بعد ہیر کا رشتہ رنگپور (ضلع مظفر گڑھ) کے کھیڑا ذات کے جاٹوں کو دیدیا گیا۔ اور رانجھا کو کورا جواب لیکر سیال جاٹوں کے گھر سے نکلنا پڑا، چنانچہ وہ "لاٹھی پھینک، کندھوں سے کمبل اتار اور مویشی چھوڑ کر وہاں سے چل نکلا جیسے رات کو پاؤں کی چاپ سُنکر نقب زن نقب چھوڑ کر بھاگے، اس دیس کی طرف سے اس کا دل کھٹا ہو گیا۔ جلتے جاتے وہ ہیر کے والد سے گویا ہوا۔

"خدا نہ کرے تجھے تیری بھینسوں سے کوئی نفع پہونچے، تیرے بچھڑوں کو کوئی درندہ اُٹھا لے جائے — تیری بیٹی کو ہم کیا جانتے ہیں مجھے تو وہ کوئی پہاڑ نظر آتی ہے، مجھے چرواہا بننے کا کوئی خاص شوق نہ تھا۔ میں تو تیری بیٹی کے کہنے پر مجبور ہو گیا تھا — تو نے بھینسیں چرانے کی مزدوری سوخت کر لی، کھتریوں والے بھی کھاتے اندر ہی پڑے رہ گئے، تیری بیٹی تیرے پاس رہی اور طعنے مفت میں دے لئے، مجھے ہیر کا وعدہ دیکر فریب دیا — ہر جی! تم تو مجھے گھر بار کے مالک کا خطاب دیتے تھے — ہینگ لگی نہ پھٹکری — تو نے پیزار سے خرگوش مار لیا — وارث شاہ مستقبل میں تیری کونسی اُمید بر آوے گی، عہد ماضی میں تو نے کون سے پردے فاش کرنے سے احتراز کیا ہے —"

رانجھا کے سات بھائی اس کے چرواہے بننے میں اپنی بے عزتی سمجھتے تھے۔ انہوں نے اس سے پہلے بھی اُسے واپس لے جانے کی کوشش کی لیکن "دیار محبوب، تیاگنا" رانجھے کے بس کی بات نہ تھی، اب جب انہوں نے سُنا کہ ہیر کا رشتہ کسی دوسری جگہ ہو گیا ہے اور رانجھا کو صاف جواب مل گیا ہے تو اُنہوں نے اُسے واپس چلے آنے کا پیغام بھیجا، اس کے جواب میں رانجھا نے لکھا۔

"بھائی! جب خزاں کی رُت آ جائے تو بھونرے (آنے والی بہار کے) آسرے پر زندگی وہیں گزار دیتے ہیں — بلبل خشک درختوں کی سیوا کرتے ہیں، تب ان کے ساتھ پھل پھول لگتے ہیں — جب تب ہمیں اپنے راز کے محرم کے پاس ہی جانا ہے۔ بھائی! عشق سے صرف کمینے بھاگتے ہیں۔ ابراہیم ادھم اور حسن بصری دریائے وحدت سے شراب وصل کے پیالے پیتے رہے اور دُنیا کے جاہ و جلال پر نہ گئے۔ دل کی لگی کے پیچھے جوان جان پر کھیل جاتے ہیں۔ وارث شاہ طعنوں کے ڈر سے گھر نہیں لوٹتے کوئی دوسرا ڈیرہ تلاش کرتے پھرتے ہیں۔"

سیالوں کے گھر سے نکل کر رانجھا نے جوگیوں کے ٹلے (ضلع جہلم) کا رُخ کیا اور وہاں گورو بالناتھ کے ہاتھوں مندرے پہن بھبوت مل لیا، جوگ دھارنے کے بعد وہ گرو سے سیر کی آگیا لے گاؤں گاؤں پھرتا ہیر کی سسرال جا نکلا۔

"رانجھا بالناتھ کے استھان سے چل پڑا — ایک ایک دن گنتا — اس نے آس کے گھوڑے کو صبر کی باگ دیکر ایڑ بتائی، ہیر کے فراق میں حسرت — یاس — ارمان — درد — غم اس کے ہمرکاب ہوئے۔ ٹلے سے کھیڑوں کا دُشمن کالے بادل کی طرح اُٹھا، کعبہ کی طرف یلغار کرتا اور پرم آتما کا نام جپتا وہ رنگپور کے دائیں ہاتھ جا نکلا — چمٹا — کھپری — باہوڑی — ڈنڈا — کونڈا — بھنگ اور پوست سے لدا پھندا سورماؤں کی طرح شمشیر بدست حملہ پر کمربستہ، نشہ میں جھومتا جھامتا جیسے اونٹ پر بیٹھا ہوا ساربان یا لوٹ مار پر چڑھا ہوا ترک — وارث شاہ رانجھے کی پشت پر پیر کا ہاتھ تھا۔"

رنگپور پہونچکر رانجھے نے حکمت عملی کے ساتھ ہیر کی نند سہتی کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اُسے جوگ کے کرتب دکھلائے اور ساتھ ہی اُسے اُسکے یار مراد بلوچ سے ملانے کا وعدہ کیا، سہتی نے ہیر کو جھوٹ موٹ کی [illegible] لڑا کر جوگی کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ چنانچہ ایک رات رانجھا ہیر کو وہاں کو نکال کر جھنگ جا پہونچا۔ ہیر کی سسرال والوں کا وہاں کوئی زور نہ چلا [illegible]

[1] کوی کالیداس گوجرانوالہ جنہوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔

بیٹے کے والدین اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی ایسی بے عزتی ہوتی برداشت نہ کر سکے۔ چنانچہ اُنہوں نے ہیر اور رانجھے دونوں کو دھوکے سے زہر دلوایا۔

یہ ہے وہ قصہ یا حقیقت جس میں زیب داستان کیلئے زمین اور آسمان کے قلابے ملائے گئے ہیں۔ کسی نے کرداروں کے نام تبدیل کرنا مناسب سمجھا ہے تو دوسرے نے تمام واقعات کو ڈرامائی رنگ کے سانچوں میں ڈھال لیا ہے۔ کسی کے نزدیک اس واقعہ کے کردار پنجابی جاٹ ہیں، کسی کے نزدیک وہ دیومالا کے افراد، کوئی اسے راجا رسالو کی داستانوں کا واقعہ سمجھتا ہے تو کوئی محض واہمہ کا کرشمہ۔ پنجابی دیہاتیوں نے اس واقعہ کی صداقت پر زبان خلق کی مہر توثیق ثبت کی ہے تو سیال خاندان کے موجودہ افراد اس افسانہ کو تاریخی طور پر غلط ثابت کرتے ہیں۔

اس داستان کو ادب کے اسٹیج پر لانے کا سہرا فارسی اور بھاشا کے سر بندھتا ہے، اردو اساتذہ نے اپنا اس قصہ سے متعارف ہونا ظاہر کیا ہے اور پنجابی والوں نے اپنے ادب کی جملہ بنیادیں اسی واقعہ پر رکھدی ہیں۔ کم و بیش ہر شاعر نے اس قصّے کو مکمل یا نامکمل ضرور نظم کیا ہے۔ بلطف یہ کہ ہر ایک شاعر اس داستان کو نظم کرتے وقت مختلف تاثرات سے متاثر ہوا ہے۔ چنانچہ کسی نے اس داستان کو ایک رومان سے زیادہ وقعت نہیں دی اور کسی نے اس پر تصوّف کے رنگ جما کر قصہ کے مختلف کرداروں کو خاکی پتلا، رُوح، نفس امارہ، پرم آتما، شیطان، مورکھ وغیرہ وغیرہ بنا دکھایا ہے۔ آئیے اب پنجابی شیشہ گروں کی کارگہ فن اور بارگہِ ادب میں قدم رکھیں۔

نگاہ ادب روبرو ——————

ہشیار، خبردار ——————

جہاں پناہ شاہ حسن تشریف لاتے ہیں۔

"ہونٹ برگِ گل سے نازک تر، دہن موہوم نقطۂ خیال، دو لب گل رنگ، ایک لعل دوسرے لعل کا رکھوالا۔ سلکِ دنداں جوہریوں کا شاہکار، گال کا تل چشمۂ آب حیات پر پہونچا ہوا اسکندر یا درِ حرم کا حبشی فقیر، زلف کا کافر ناگ کعبہ کی طرف پاؤں پسارے۔ پھیلا کر بیٹھا ہوا ہما، چور خال کو پکڑنے والے کوڑے، رندوں کا دل بہلاوا کعبہ سے چڑھا ہوا سیاہ بادل — آنکھوں میں فتنے خنداں۔ گلنار رخساروں میں ہنستی ہوئی گلابیاں، انگڑائیاں لے لے کر اُٹھتا ہوا حسنِ فتاں، پردے تانتے ہوئی حیا، زلف مستی سے بھرپور گھٹا، شوخی بجلیوں کی اتالیق۔ [1] کوہ طور پر کیسی بارشں انوار ہے۔ اُٹھ تو بھی کچھ عرض کر لے ——————"

ساٹھ سکھیوں کے جلو میں ہیر قدم قدم چلتی آتی ہے ——

"روپ اور گمان کے نشہ میں مست۔ کانوں میں مٹھی بھر موتی۔ حور یا پری، سینہ میں کٹی چست چولی، نہ زمین کا ہوش نہ آسمان کی خبر۔ ناک کی بلاق قطبی تارہ — ایک قدِ آدم شدید طوفان — ایسے آویزوں والی! اتنا تکبر نہ کر، آگے بھی لوگ تکبر کے خیمے بلند کر چکے ہیں۔ میاں وارث شاہ یہ جوڑی تو غضب کے ہنکار اور رومان سے بھری ہے ——"

دوسرا ورق:—

"ساٹھ سہیلیوں کے ساتھ ہیر جھنگ شہر سے نکلی ہے، چہرہ آگ بگولا، رخساروں سے بجلیاں گرتی ہوئیں۔ پازیب کی جھنکار قُم قُم کی صدا، زلف کے چابک سے بازاروں میں مار دھاڑ کا سین۔ دانت موتیے کی کلیاں، ہونٹ گلاب کی پتیاں، انکھڑیاں نرگس، رانیں کیلے کے درخت جو ملکر دیوار قہقہہ کا نقشہ پیش کریں۔ رشی منی، امیر فقیر سب عشق کی زد میں۔ [2] اگر میں ناف کی تصویر کھینچوں تو تاتاری ہرنوں کے غول آنکھوں کے آگے دوڑ جائیں ——

ہیر کو عقاب کے پر لگے ہیں، اس کے قدم زمین سے ایک ایک بالشت اونچے رہتے ہیں۔ اڑتی ہوئی زلفیں سیاہ بادل کے ٹکڑے، خوںناب چہرہ دیکھ آفتاب کے ہوش گم، بجلی کی کڑک، شعلوں کی چمک اور نوکوں تنی کی لپک۔ مکھڑا کعبہ، ابرو محراب مسجد، عشاق کی سجدہ گاہ، گالوں پر نتھ کا گھیر چاند کے گرد ہالہ، انکھڑیاں ازلی نشہ سے بدمست، کاسۂ نرگس میں شراب ناب، صاف سینہ پر دو پستان بحر حسن کے دو حباب، دو کلاہ پوش منجھے فرشِ کمخواب پر محو خواب۔ اگر مانی خواب میں ناف کا عکس دیکھ لے تو تمام عمر گرداب کا نقشہ کھینچا کرے۔"

ادب عالیہ (Classic) اور ادب جمہور (Democratic) کی آویزش، شاعر ہیر کی تعریف لکھنے سے قاصر ہے — پیشانی پر چاند ہلکورے لے رہا ہے۔ شبرنگ لٹیں، چاند کو آغوش میں لئے ہوئے لیلی شب، شہابی چہرہ۔ نرگس، ممولا اور ہرن سے تشبیہہ کھانے والے نین۔ تابدار رخسار گلاب کے پھول، ابرو لاہوری کمان، روپ اور سندرتا بے انت۔ کاجل نینوں کی دھار میں طوفان جگائے، ہندوستان پر پنجاب کی یلغار، سکھیوں کے بیچ یوں جھومتی جھامتی جیسے عقاب کا شہپر، ترنجنوں میں لتاب کے مست ہاتھی کی طرح

[1] منشی مولا بخش صاحب کشتہ امرتسری؛ [2] عورتوں کے اکٹھا بیٹھکر چرخہ کاتنے وغیرہ کی جگہ۔

محمد، پاکیزہ چہرے پر خوشخط نصیر خاں کسی خوشنویس کا شاہکار۔ وارث شاہ جلیلۃ القدر کی زیارت کریں، یہ تو کارِ ثواب ہے ــــــ

گلرنگ ہونٹ لعلِ درخشاں، سیبِ ذقن کابل کا انتخاب، بینی ذوالفقار کی دھار، زلف کسی دفینے کی محافظ ناگن، دانت پھول ملا یا راج ہنس کی چگ (موتی)، انارِ حسن کے دانے ــ چینی مصوروں کی بنائی ہوئی حسنِ کشمیر کی شبیہ، باغِ بہشت کا سرو رواں، سارس کی گردن، انگلیاں روانہ کی پھلیاں، ہاتھ برگِ چنار، چھاتیوں کا بھرپور ابھار، دو ریشمی گیند، بلخی سیب، ناف حوضِ جنت کستوری سے معمور، کافوری سرین، مخمل پیڑو، ساق سیمیں ستونِ حسن۔ ہونٹوں کی سرخی، وند اسٹرے کا خون، مکھن سے پلی ہوئی باہیں، سینہ گنگا کی دھار کا سنگِ مرمر۔ پری کی بہن، پنج پھول رانی، ہزاروں میں ایک، چنچل سکھیوں میں شوخ، ڈری ہوئی ہرنی، بادامی آنکھیں، دہن مصری کی ڈلی یا مصری تلوار کی چمک، چاؤ کے ساتھ جھنکارتی ہوئی جٹی جیسے قندھاری حملہ آور۔ لنکا کی پری، اندر کی رانی، چاند کی کرنوں سے تراشیدہ کوئی حور، کوئی چینی مرقع جس پر رومی نقش نمودار، بیاباں کا چاند، کونجوں کی ڈار سے ایک اکیلی تیرتی ہوئی کونج، اہلِ دل کیلئے خنجر و تلوار، عشاق کے پار اُترنے کے لئے تیغ کا گھاٹ، بال بال سے عشق مترنم، زیر کی تار سے نکلتا ہوا راگ، اردبازار سے نکلا ہوا قزلباش، جلاد، خونی ترک، وارث شاہ اگران نینوں کا داؤ لگے تو کوئی بھی جوئے کی ہار سے نہ بچے ــــ"

مرقع کا ایک اور ورق الٹیے!ــ

سرو رواں، دراز قد شمشاد، شبِ دیجور کو نصفا نصف کرنے والی مانگ جو نصف شب کو قافلے لوٹ لے، پیشانی محرابِ مسجد یا عکسِ کعبہ ــ عشاق کو خدا کے سوا صرف یہاں سجدہ کرنا جائز، زلف دام، خال دانۂ دام، گیسو زنجیر سے منسوب، ہیر میر شکار اور نین خون سے باز نہ آنے والے باز، ہر دو چشم چشمۂ آبِ حیات، مژگاں کی بانک نینوں کے کارخانے کی ڈھلی ہوئی، بجلیوں کی چمک نینوں کو کالی گھٹا بنائے، اگر مرگ ان میں آنکھیں ڈالیں تو مرگ پاویں، اسی ڈر سے ہرن جنگلوں کی طرف رواں، خدا اِن اَبروؤں سے عشاق کی آبرو محفوظ رکھے، ابرو دھنک یا سیاہ گھٹا معلوم ہوں، بعض لوگ قابَ قوسین سے کنایہ لیں اور دیدار کو سورۃ الرحمٰن (یا ہیر کی صورت کو خدا کا دیدار) سمجھیں ــــ لب لعل و یاقوت یا روحوں کی قوت (خوراک)، مرجان جیسے لب عشاق کے مرجانے کا بہانہ، ناک تلوار کی دھار سے نازک تر، کھڑا چاند کا ٹکڑا، ماتھا قطب تارہ، دونوں رخسارے چاند سورج، رنگین ہاتھ برگِ چنار، سیبِ ذقن کابل کا قابلِ دید سیب، دانت موتیوں کی لڑی جس پر عاقل اور [illegible] ــــ خورد سال پستان، دو ہمعصر توام شاہزادے [illegible] کلاہ پوش شاہی نقیب، بلور کے جام، گلاب کے پھول [illegible] پیڑے، سرخی مائل زرد کشمیری سیب، خوشہ ہائے انگور، آم، انار، چینی کے پیالے، رستم و زال کے فولادی خود، عنقا و ہما، مصری کوزے، یوسف و عکسِ یوسف، دو مچھلیاں، دو تونبوں والی بین۔ ــــ نرم شکم مخمل، چاندی، سنجاب، قاقم، ناف نافۂ ختن، اس سے آگے دیوار قہقہہ فکر کا راستہ روکے، ساق شمع کافوری۔ فضل شاہ[1] قصہ مختصر کرو ہیر تو جنت کی حور ہے ــــ"

ــــ جٹی ہیر رانجھنا پیر کے لئے مالیدہ لیکر چلی ــــــ

ــــ مانسرور کی جھیل سے ایک ہنسنی موتیوں کی چوگ لیکر اڑی ــ

ــــ باغِ بہشت ایک پدمنی سنگلدیپ پر راج کرنے چلی ــــ

گورکھ رائے ایک چکوری چاند کو آغوش میں لینے کیلئے مائلِ پرواز ہوئی۔

---

[1] سید فضل شاہ مرحوم، پنجابی شاعری میں فارسی صنعتوں کے بادشاہ۔

غلام یعقوب انور

ہمارے بُزرگوار

یوں تو ہر پُرانی وضع کا انسان موجودہ روشنی کا دُشمن اور جدید سماجی رجحانات کا مخالف ہے، مگر ہمارے بزرگوار نے عجب طبیعت پائی ہے، اُن کے خیال میں موجودہ تہذیب کے کسی شعبے میں رتی برابر بھی خوبی نہیں، پُرانا نظام اپنے میں ہر ایک خاصیت اور اچھائی رکھتا تھا، موجودہ نظام ابتر اور اس نظام کے مرد، عورتیں اور بچے محض نالائق اور عقل و خرد سے بے بہرہ ہیں۔

ایسے خیالات کے انسان کا گھر میں ہونا بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ گھر موجودہ تہذیب کا نمونہ نہیں ہو سکتا، مگر گھر کے سب چھوٹے (کیونکہ بزرگوار سب سے بڑے ہیں) اپنے جذبۂ رواداری کو کام میں لاتے ہوئے بھی بزرگوار کے ہر ایک خیال اور کام کی داد نہیں دے سکتے اس لئے گھر میں ہر وقت طوائف الملوکی کا دور دورہ رہتا ہے، کسی معاملے پر کوئی اختلاف رائے کا مظاہرہ ہوتا رہتا ہے، تردید اور مخالفت کی ابتدا ہمیشہ بزرگوار کرتے ہیں اور جب مجبور ہو کر گھر کا کوئی چھوٹا یا چھوٹی اس تردید کو بے وجہ قرار دینے کی جرأت کر دے تو پھر بزرگوار بحث شروع کر دیتے ہیں۔

بحث سے عام طور پر وہ گفتگو سمجھی جاتی ہے جو دو یا زیادہ انسان کسی معاملے پر اختلاف رائے رکھتے ہوئے کریں، اور گفتگو سے مراد ہیں وہ باتیں جو دو یا دو سے زیادہ انسان آپس میں اس طرح کریں کہ اُنکی آواز یں ایک دوسرے تک پہونچ سکیں، مگر بزرگوار آہستہ بولنا بے سُود سمجھتے ہیں، عام طور پر وہ یوں گفتگو کرتے ہیں جیسے زمین دوز ریل گاڑی کے ڈبے، ہوائی جہاز یا کسی آبشار کے دامن میں کھڑے ہو کر بول رہے ہوں، میں اکثر اُن سے درخواست کر چکا ہوں کہ وہ بولتے وقت اپنے پھیپھڑوں کا اس شدت سے [illegible] نہ کیا کریں مگر میری درخواستیں، گڑگڑاہٹیں اور گریہ و زاری سب رائیگاں ثابت ہوئی۔ وہ مجھے ہمیشہ یوں جواب دیتے رہے ہیں :-

"ملے او بالشت بھر کے لونڈے تو بزرگوں کو نصیحت کرنے چلا ہے، آخر مجھے کس کا ڈر ہے کہ آہستہ بولوں ـــ آہستہ بولتے ہیں ـــ چند کہیں [illegible] اگر آہستہ بولوں گا تو سُنے گا کون؟ لعنت ہے اس موجودہ تہذیب [illegible] وغیرہ۔"

آخر تنگ آکر اب میں نے بُزرگوار کی آواز کو کم کرانے کی کوشش چھوڑ دی ہے، آخر پتھر سے سر پھوڑنے کا فائدہ، مجھے یقین ہو گیا ہے کہ بزرگوار ہر ایک کو بہرہ سمجھ کر مخاطب کرتے ہیں، اس عادت کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ نوکر ان کی بانگوں سے مانوس ہو کر واقعی بہرے ہو جاتے ہیں، شرافت سے اُنہیں بلایا جائے تو جواب نہیں، بزرگوار جو اکثر رسوئی کے آس پاس منڈلاتے رہتے ہیں نوکر کے جواب نہ دینے پر مسکراتے ہیں، پھر پکارنے والے کو کچھ بُرا بھلا کہہ کر اس زور سے نوکر کو آواز دیتے ہیں کہ گھر کے بچے ڈر کر ماؤں کی چھاتیوں سے چمٹ جاتے ہیں، خود بُلانے والا بھی چونک اُٹھتا ہے اور نوکر چاہے وہ پاتال میں کیوں نہ ہو فوراً حاضر ہو جاتا ہے، اسی طرح جس طرح علاءالدین کے قصّے میں چراغ رگڑنے سے جن!

یہ تو بزرگوار کے معمولی گفتگو کرنے کا ڈھب ہے مگر بحث کرتے وقت تو وہ خالص چنگھاڑیں مارتے ہیں، دلیل قوی ہو یا نہ ہو آواز ہمیشہ بلند ہوتی ہے، ایسی آواز کہ محلّے کے سب لوگ اپنے اپنے برآمدوں میں آ کھڑے ہوتے ہیں اور بغیر پیسہ خرچ کئے تماشہ دیکھتے ہیں۔ محلہ کی مائیں اپنے بچوں کو اُن کی آواز کا خوف دلا کر چُپ کراتی ہیں یا یوں سمجھئے کہ بزرگوار کی بحث کے درمیان ان کا رونا سُنائی نہیں پڑتا اور بچے اکثر بحث ختم ہونے سے قبل ہی تھک کر چُپ ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ ایسی بحثوں میں جو بزرگوار اور گھر کے کسی چھوٹے یا چھوٹی کے درمیان شروع ہو جاتے اس میں فتح ہمیشہ بزرگوار ہی کی ہوتی ہے کیونکہ محلہ والوں کو جمع ہوتے دیکھکر چھوٹا یا چھوٹی تو میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں اور بزرگوار کچھ دیر تک بحث کا موضوع جاری رکھ کر، تاکہ سننے والوں کو معاملے کے تمام پہلو معلوم ہو جائیں، اپنے کمرے میں تشریف لے جاتے ہیں۔ اس طرح ان کا سب سے زبردست حربہ اُن کی آواز ہے۔ بلکہ مجھے تو اب یقین ہو چلا ہے کہ اُنکو اپنی آواز سے اُنس ہے۔ کیونکہ بات کرتے ہوتے وہ اپنے مخاطب کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں اور خود ہی سوال کر کے خود ہی جواب بنا شروع کر دیتے ہیں ـــــ میں نے اُن کو اس انداز میں ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے تک متواتر بولتے سُنا ہے، ان حالات میں بعض سُننے والے

[illegible] کیے بغیر ہی چل دیتے ہیں اور بعض بیٹھے بیٹھے محض دماغی تھکان سے بے بس ہو کر سو جاتے ہیں اور جو سخت جان برابر دھیان دئے بزرگوار کے ترانوں کو اپنے کانوں میں جذب کرتے رہتے ہیں وہ بلا مبالغہ ایسی صحبت کے بعد سر درد کے علاج کی دوا تلاش کرتے ہیں۔

دراصل بزرگوار اپنی جوانی میں کام کرنے کے عادی رہ چکے ہیں، شاید کسی دفتر کے وہ افسرِ اعلیٰ تھے اور اُن کے ماتحت دس بارہ کلرک اور کچھ چپراسی رہے ہونگے، اب وہ پنشن یافتہ ہیں مگر کام کرنے کی عادت نہیں بھولی اس لئے کسی نہ کسی طرح خود کو مشغول رکھتے ہیں۔ کاش کہ ان کا شغل تعمیری ہوتا، مگر ہماری بدقسمتی سے اُنہوں نے تباہ کن اور انتشار پھیلانے کا پہلو اختیار کر لیا ہے، دن کے بیشتر وقت میں وہ نوکروں سے اُلجھتے رہتے ہیں، نکتہ چینی کرنا اور نقص نکالنا اُن کی طبیعت کا خاصہ ہے، اس کے علاوہ وہ اپنے دل بہلانے کا ایک اچھوتا طریقہ اُنہوں نے یہ ایجاد کیا ہے کہ اگر نوکر پہاڑی ہو تو اُس کو ٹھیٹھ شہری اور اگر شہری ہو تو اُسکو پہاڑی محاوروں میں ہدایات دیتے ہیں، اگر نوکر جنوبی ہند کا ہو تو اُس سے کشمیری زبان میں اور اگر وہ کشمیری ہو تو اُس کے ساتھ تلنگی میں باتیں کرتے ہیں، اور اگر اُن سے مؤدبانہ یہ عرض کیا جائے کہ "یہ غریب نوکر زبان داں نہیں ہیں براہِ کرم اُن کے ساتھ مادری زبان ہی میں گفتگو کیجئے" تو کہتے ہیں کہ "یہ حرامخور سب کچھ سمجھتے ہیں، محض کام نہ کرنے کے لئے بات نہ سمجھنے کا بہانہ کرتے ہیں!" کاش کہ بزرگوار صرف اسی مشغلے یعنی نہ جاننے والوں کے ساتھ غیر ملکی زبانیں بولنے پر اکتفا کرتے مگر ایسا نہیں ہوتا بلکہ جب کوئی نوکر قطعی طور پر غیر مانوس الفاظ کو سمجھنے سے انکار کر دے تو بزرگوار طیش میں آکر اُس کی جوتوں سے مرمت کرتے ہیں!

میں عرض کر چکا ہوں کہ بزرگوار کو باورچی خانہ سے خاص اُنس ہے، اس لئے ہم جس مکان میں بھی رہائش اختیار کریں اُن کا کمرہ باورچی خانہ کے پہلو میں رہتا ہے اس طرح وہ رسوئی خانے پر ضرورت سے زیادہ کنٹرول رکھ سکتے ہیں۔ مثلاً اگر نوکر گھڑے میں پانی بھر کر ایک جگہ رکھے تو اُسے حکم دیتے ہیں کہ یہاں سے ہٹا کر دو فٹ اُدھر کر کے رکھ دو، جب نوکر دوسری مرتبہ اُن کی بتائی ہوئی جگہ پر گھڑا رکھتا ہے تو اُسے دو فٹ اِدھر کر کے رکھنے کی تاکید کرتے ہیں، بزرگوار کی برکت سے ہمارے گھر میں نوکر ٹک کر نہیں رہ سکتے، جب سے جنگ چھڑی ہے قریب قریب پندرہ نوکر بزرگوار کی ہدایات سے پریشان ہو کر سلام میں شریک ہو گئے ہیں۔

تنگ آمد بجنگ رفت۔

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بزرگوار کسی دن علی الصبح گھر کے کسی فرد کے اُٹھنے سے پہلے ہی سب نوکروں کو دھکے دیکر نکال دیتے ہیں اور پھر جب تک نوکروں کا نیا سٹ تلاش کیا جائے گھر کے چھوٹے بڑے برتن مانجھنے، پانی بھرنے اور کھانا پکانے پر مجبور ہو جاتے ہیں، ایسا دن بزرگوار کے لئے نہایت [illegible] بخش ہوتا ہے، وہ اُس دن یہ اعلان کر دیتے ہیں کہ آج [illegible] سب کو کھانا پکا کر کھلاؤں گا ـــ اچھا ہوا جو یہ بدذات نکل گئے، آج تم سب کو معلوم ہو جائیگا کہ کھانا کس قدر لذیذ پک سکتا ہے" پکوان تو خیر جیسا پکتا ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، البتہ [illegible] ہم کی قابلِ ذکر بات کھانا تیار ہونے کا وقت ہے، ایسے دن گھر کے چند رکن تو معدہ صاف کرنے کی ٹھان کر جلاب کی دوا کھا لیتے ہیں اور فاقہ رکھتے ہیں، چند بازار جا کر اپنی اشتہا مٹا لیتے ہیں، اور جو بدبخت ان دونوں کارروائیوں پر عمل نہیں کرتے اُن کو ناشتہ دن کے اڑھائی بجے اور دن کا کھانا شام کے ساڑھے چھ بجے ملتا ہے، اور رات کا کھانا ـــ اسکے لئے کوئی بھی انتظار نہیں کر سکتا!!!

بزرگوار ہر پرانی روشنی کے انسان کی طرح اشیاءِ خوردنی سے خاص اُنس رکھتے ہیں، خصوصاً اُن چیزوں سے جو مرغن ہوں، مگر ان کی سب سے زیادہ چاہت کی چیز دودھ ہے۔ دودھ ہے بھی اچھی چیز اور اگر اس سے کوئی شخص غیر معمولی طور پر مانوس ہو جائے تو تعجب نہیں، کیونکہ بچہ پیدا ہوتے ہی دودھ پینا شروع کر دیتا ہے، مگر جو دودھ ہمارے بزرگوار کو پسند ہے وہ نرالی چیز ہے۔ ہر معمولی انسان اس کو ہضم نہیں کر سکتا، اس خاص دودھ کے لئے کچھ تشریح لازمی ہے، بزرگوار نے کچھ سال ہوئے رات کا کھانا ترک کر دیا تھا، انہوں نے ایسا کیوں کیا اس کی کوئی خاص وجہ نہیں بتلائی جا سکتی، ہمارے گھرانے کے محققین کی جنہوں نے اس موضوع پر کافی وقت صرف کیا ہے، یہ رائے ہے کہ بزرگوار نے رات کا کھانا محض اس لئے چھوڑ دیا ہے تاکہ دودھ پر اچھی طرح سے توجہ دے سکیں۔

ابتداءً اُن کا حکم ہوا کرتا تھا کہ اُن کے لئے ایک سیر دودھ اچھی طرح اُبال کر تیار رکھا جائے، چنانچہ ایک سیر دودھ اچھی طرح اُبال کر رکھا جاتا تھا۔ بزرگوار کی عادتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ رات کو جلد ہی سو جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ بلا ناغہ دودھ پینے سے پہلے ہی سو جایا کرتے تھے، نوکر اُنہیں جگا جگا کر تھک جاتے تھے مگر بزرگوار۔ ذرا دیر بعد کہیں جا کر آخر رات کے گیارہ بجے کے لگ بھگ نیم بیداری کی حالت میں دودھ پینے کے لئے تیار ہو جاتے تھے، دودھ کا ایک گھونٹ پی کر [illegible] سنائی جاتی تھیں کہ "کمبخت نے پھر شکر کم ڈالی ہے" چنانچہ نوکر [illegible] اور ڈال دیتا، بزرگوار پھر دودھ چکھتے اور کہتے "ابھی کم ہے" [illegible]

اور شکر ڈالنے۔ اب کے بزرگوار اس کو پھر گالیاں سناتے ہوئے کہتے کہ "اب میٹھا بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ اب اس میں تھوڑا دودھ اور ملا دو"۔ مختصراً یہ کہ نوکر بھاگتے ہوئے بازار جاتا اور کسی حلوائی کو جگا کر آدھ سیر دودھ لیکر آتا۔ حلوائی کا دودھ، گھر کے دودھ اور شکر کے مرکب میں ملا دیا جاتا اور نئے مرکب میں میٹھا پھر کم نکلتا، تھوڑی شکر اور ملانے کے بعد آخر دودھ پینے کا پروگرام رات کے ساڑھے بارہ کے قریب کہیں ختم ہوتا!

یہ شروع شروع کے زمانے کا ذکر ہے، ہمارے گھر میں ایک بھیا اور سخت جان نوکر تین سال تک رہا مگر اس کو بزرگوار کے منشا کے مطابق دودھ میں شکر ملانے کا اندازہ معلوم نہ ہو سکا، اسکے علاوہ بزرگوار کی ہمیشہ یہ شکایت رہا کرتی تھی کہ "دودھ پانی کی طرح پتلا ہوتا ہے"۔ چنانچہ وہ رسوئی خانہ میں بیٹھ کر نگرانی کرتے رہتے تھے تاکہ دودھ میں کوئی پانی نہ ملا دے۔ مگر اُن کی نگرانی کے باوجود بھی دودھ ہمیشہ پتلا ہی رہتا اور شکر کم زیادہ ہوا کرتی۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ بزرگوار کا دودھ عام انسان ہضم نہیں کر سکتے، پھر بھی یہ اُن کے اندازے میں گھٹیا قسم کا تھا اس لئے انہوں نے تنگ آکر گھر میں یہ اعلان کر دیا کہ "آئندہ سے میں اپنے لئے خود دودھ اُبالا کرونگا"!

چنانچہ آجکل یہ دستور العمل ہے کہ بزرگوار صبح سویرے مکان کے باہر ایک بڑا لوٹا لیکر کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ گوالا بھینس کے ساتھ آتا ہے۔ بھینس بھی بزرگوار سے مانوس ہو چکی ہے، اُن کو دیکھتے ہی فوراً پاس ہی کھڑی ہو جاتی ہے، گوالا اُس لوٹے کو جس میں وہ دودھ دوھتا ہے پہلے بزرگوار کے سامنے کسی مداری کی طرح اُلٹا کر کے اور اُس کے پیندے کو ٹھوک ٹھوک کر اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ "یہ لوٹا پانی سے خالی ہے"۔ پھر دودھ نچوڑنا شروع کرتا ہے، اس دوران میں بزرگوار کی نظریں گوالے کے ہاتھوں، بھینس کے تھنوں اور لوٹے پر اس طرح جمی رہتی ہیں جس طرح بیوہ کے شباب پر اوباشوں، یا چھوٹے پرندوں پر عقابوں کی۔ ڈھائی سیر دودھ اسی مستعدی اور نگرانی کے تحت لیا جاتا ہے۔

دودھ کے دیگچے کو کسی ماں کی طرح چھاتی سے لگائے اور اس خیال سے کپڑے سے ڈھانپے ہوئے کہ کہیں اتفاق سے بارش کے قطرے ناگہانی طور پر دودھ میں نہ گر پڑیں وہ اپنے کمرے کی طرف رُخ کرتے ہیں، جہاں لوہے کی انگیٹھی، کوئلوں کی بوری، شکر سے بھری ہوئی بوتلیں، دودھ رکھنے کی جالی دار الماری ایک کونے میں دھری رہتی ہے، انگیٹھی میں کوئلے ڈال کر سلگائے جاتے ہیں، دودھ کا دیگچہ انگیٹھی پر رکھ دیا جاتا ہے اور بزرگوار پاس ہی فرش پر بیٹھ جاتے ہیں اور دودھ کی طرف دیکھ دیکھ کر اسی طرح خوش ہوتے ہیں جس طرح ماں بچے کو گود میں لئے اور بچے کے باپ کو پاس ہی حقہ پیتے دیکھ کر خوش ہوتی ہے، سوچتے ہیں کہ اب جلد ہی کوئلے دہکنے شروع ہونگے دودھ اُبلنے لگے گا اور رفتہ رفتہ اسکا پتلا پن غائب ہو جائیگا یعنی گاڑھا ہوتا جائیگا اور پھر ــــ شام کا وقت، دودھ پینے کا وقت! کیسے رومان کا سماں ہوگا!!

یہ امر تو واضح ہو ہی چکا ہے کہ بزرگوار کو یقین واثق ہے کہ اگر اُن کی نظریں دودھ سے کچھ عرصے کے لئے چوکیں تو کوئی نہ کوئی نوکر یا گھر کا رکن ہی خود دودھ پی کر اُس میں پانی ملا دیگا، اس لئے انہوں نے یہ انتظام کر رکھا ہے کہ جب تک دودھ انگیٹھی پر دھرا رہتا ہے وہ دودھ کے سرہانے بیٹھے رہتے ہیں اور اُبلتے دودھ کی وہ نشہ آور خوشبو! بس.....

ع ؎ "جب ذرا گردن جھکائی سونگھ لی"

اور جب کبھی کسی ضرورت کے سلئے انہیں اپنا کمرہ چھوڑنے کی مجبوری محسوس ہو تو دودھ کو جالی کی الماری میں بند کر کے اس کو "اصلی چینبر" کا قفل لگا کر، قفل کی ہر دو کنجیاں اپنی صدری کی اندرونی جیب میں ڈال رکھتے ہیں اسی طرح جس طرح کسی عاشقِ صادق نے ـــ

ع ؎ اُن کی تصویر کو سینے سے لگا رکھا ہو

یوں تو بزرگوار کا دن نوکروں سے جھگڑنے، اخبارات یا کتابیں پڑھنے، خطوط لکھنے اور ڈاکیہ کا انتظار کرنے میں گزرتا ہے، مگر یہ سب کام جسمانی ہیں، ذہنی اعتبار سے وہ تمام دن شام کے منتظر رہتے ہیں کہ کب دن ڈھلے اور کب میں دودھ کو ایک آخری تاؤ دیکر پینا شروع کروں!

بزرگوار کے دودھ پینے کا طریقہ بھی نرالا ہے۔ شروع شروع میں جب نوکر دودھ اُبالا کرتے تھے تو بزرگوار بڑے گلاس میں دودھ بھر کر بڑے چمچے سے پیا کرتے تھے، رفتہ رفتہ انہوں نے گلاس ترک کر کے بڑا لوٹا استعمال کرنا شروع کر دیا اور اب یہ حالت ہے کہ دودھ کو اس دیگچے میں سے جس میں وہ اُبالا جاتا ہے علیحدہ نہیں کیا جاتا بلکہ شام کے وقت بزرگوار پوتر دھرتی پر بیٹھ کر دیگچہ سامنے رکھ لیتے ہیں اور کرچھی سے آہستہ آہستہ مزے لے لیکر دودھ پیتے ہیں اور اس امر سے جو آوازیں پیدا ہوتی ہیں وہ کسی نہ جاننے والے انسان کے لئے جو ساتھ کے کمرے میں بیٹھا ہو، ایسی معلوم ہوں گی جیسے کسی جھیل میں، کوئی آہستہ آہستہ چپو سے کشتی چلا رہا ہو اور کشتی میں بیٹھا ہوا کوئی وحشی کسی حسینہ کا منہ چاٹ رہا ہو!

کاش کہ بزرگوار اس عادت کو اپنے تک ہی محدود رکھتے مگر انہوں نے گھر کے کتے کو بھی اسی قسم کے دودھ کی عادت ڈال دی ہے، پہلے تو وہ ہر قسم کا دودھ پی لیا کرتا تھا مگر علی الحال میں اس کا مزاج عرش پر چڑھ گیا ہے

معمولی قسم کا دودھ اگر اُس کے سامنے رکھا جاتے تو ایک آدھ دفعہ سونگھ کر کونے میں جا لیٹتا ہے، اُسے فاقہ کرنا منظور ہے مگر عام قسم کا دودھ پینا منظور نہیں۔ اس لئے اب گھر میں یہ رواج ہو گیا ہے کہ کتّے کے لئے تین پاؤ دودھ لیکر وہ بھی بزرگوار ہی کے سپرد کر دیا جاتا ہے، وہ خود اس کو اُبال اُبال کر اس رنگ کا کر دیتے ہیں جیسے برسات کے موسم میں ندّی نالے ہوتے ہیں، کتا ایسے دودھ کو تپ تپ پی جاتا ہے۔

بزرگوار خط و کتابت میں بھی بہت دلچسپی رکھتے ہیں، دفتر میں کام کرنے کی عادت ایسی ہو گئی ہے کہ ہر ایک خط میں سرخی اور سیاہی دونوں کا استعمال کرتے ہیں، خط لکھنے کا کاغذ کبھی استعمال نہیں کرتے بلکہ بڑے بڑے فلسکیپ کاغذوں پر اپنے خطوط لکھتے ہیں جب ایسا کاغذ دو طرفہ بھر جاتے تو سُرخی سے سطروں کے درمیان لکھنا شروع کرتے ہیں، جس شخص کو اُنکے خطوط پڑھنے کی مہارت نہ ہو وہ تو اُن کے بھیجے ہوئے دستاویزوں کو معموں سے کسی حالت میں کم نہ سمجھے گا، اسکے علاوہ اُنکے ہر ایک اُردو یا انگریزی خط میں، اُردو، انگریزی، ہندی، فارسی اور گُرمکھی کے محاورے بمعہ اُن کے ترجموں اور تشریحوں کے درج ہوتے ہیں، لفافے خاکی کاغذ کے وہ خود بناتے ہیں تاکہ اُنکے لکھے ہوئے دستاویز اُن میں سما سکیں، اور اُن کا دعویٰ ہے کہ اُن کے لکھے ہوئے پتے کا خط کبھی اِدھر اُدھر نہیں جا سکتا، مثلاً اگر اُنہیں ایڈیٹر ساقی کو خط لکھنا ہے تو یہ پتہ لکھیں گے :-

(بذریعہ معمولی ڈاک۔ ٹکٹ ایک آنہ تین پائی کہ جس کا نصف آدھ آنہ ڈیڑھ پائی ہوتا ہے، پشت لفافہ پر چسپاں کر دیا گیا ہے)

بخدمت جناب مولٰنا شاہد احمد صاحب بی۔ اے دہلوی (سابق متعلم سینٹ اسٹیفن کالج دھلی) نبیرہ شمس العلماً خان بہادر ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مرحوم۔ ایل ایل۔ ڈی؛ ڈی۔ او۔ ایل؛ ایڈیٹر یعنی مدیر ماہوار ادبی رسالہ "ساقی" (جس کے سال میں دو خاص نمبر شائع ہوتے ہیں اور جن کی مستقل خریداروں سے علیحدہ قیمت نہیں لی جاتی۔)

بازار کھاری باؤلی، کوچہ نواب مرزا۔ مکان ڈپٹی صاحب، شہر دھلی۔ (جو کہ برطانوی حکومت ہند کا موسم گرما کا دار السلطنت اور جو شاہانِ مغلیہ کی راجدھانی بھی رہ چکا ہے۔)

بزرگوار کسی نوکر پر اس بات کا اعتبار نہیں کرتے کہ وہ خط ڈاکخانہ ڈال آئے، اگر بعض اوقات اُن کو مجبوراً نوکر کو اس مہم پر بھیجنا پڑ جاتے تو اس کو اس قدر ہدایات دیتے ہیں کہ وہ بیچارا دیوانہ ہو جاتا ہے کہتے ہیں: "سرخ رنگ کا گول وضع کا ڈبہ جو فلاں موڑ پر گڑا ہوا ہے، اُس میں غور سے دیکھنے پر تم کو ایک سوراخ نظر آئے گا، اُس سوراخ میں اس خط کو ڈالنا ہے اور ڈال کر واپس آجانا ہے، سمجھے یا نہیں سمجھے؟!"

اگر نوکر یہ جواب دے کہ "جی ہاں سمجھ گیا" تو پوچھتے ہیں کہ "کیا سمجھے؟" اور جب نوکر سمجھائے کہ وہ کیا سمجھا ہے تو کہتے ہیں کہ "کچھ سمجھ میں نہیں آیا!" چنانچہ ہدایات دیتے بزرگوار نوکر کے ساتھ ساتھ خود بھی لیٹر بکس تک پہونچ جاتے ہیں!

پھر جب چٹّھی رساں کے آنے کا وقت قریب ہو تو آپ بیقرار ہو جاتے ہیں، ہندوستانی عاشق کی طرح تڑپتے ہیں، برآمدے میں آکھڑے ہوتے ہیں، اگر اس پر بھی ڈاکیہ نمودار نہ ہو تو اس سمت جدھر سے وہ آتا ہے ننگے سر اور ننگے پیر چل دیتے ہیں اور بسا اوقات تو ڈاکخانہ تک اسی حالت میں پہونچ جاتے ہیں!!

بزرگوار کا ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ صاف ستھرا رہنا خدا کو بھولنا ہے۔ نئی وضع کے آدمی سفید پوش ہیں اس لئے بزرگوار گندہ رہنے میں فخر سمجھتے ہیں، کپڑے تب تک نہیں بدلتے جب تک کپڑے بدلنے کے لئے اُنکے خلاف خانہ جنگی نہ شروع ہو جائے، اور آخر جب کپڑے بدل لیتے ہیں تو شام سے پہلے پہلے ننگے فرش پر لیٹ کر، کوئلوں سے کھیلتے ہوے قمیص کے گریبان کو تولئے اور انگوچھے کی طرح استعمال کر کر کے دیکھنے والوں کو اپنے کپڑوں کے رنگ کے متعلق اس مشہور مصرعہ کی یاد دلاتے ہیں۔

ع:- اگر ئی کا ہو گماں شک ہے ملاگیری کا

دراصل کپڑوں کو میلا کرنے کی اسکیم کپڑے دھل کر آتے ہی شروع ہو جاتی ہے، بزرگوار کپڑوں کو صندوق یا الماری میں رکھنے سے اسلئے انکار کر دیتے ہیں کہ یہ نئی تہذیب کے رواج ہیں، وہ اُنکو ایک کونے میں پھینک دیتے ہیں اور ان میں چوہے رہائش اختیار کر لیتے ہیں، نیز گرد و غبار (جس کی ہندوستان میں کمی نہیں) کے پڑنے سے یہ کپڑے پہننے کے قبل ہی اپنی سفیدی کھو دیتے ہیں!

بزرگوار کے ریل کے سفر کے بھی عجیب غریب قصّے ہیں، آپ تیسرے درجے میں محض اس لئے سفر کرتے ہیں کہ وہاں انسان کو غیر معمولی صفائی برقرار رکھنے اور جدید تہذیب کا بیہودہ مظاہرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، جہاں دل چاہا بیٹھ گئے، جو کسی کی نظر چوکی تو ٹانگ پھیلا کر سو گئے اور جس سے چاہا، جس قدر چاہا، جس موضوع پر چاہا اسقدر زور سے چاہا دل کھول کر باتیں کیں!

اکثر یہ ہوا ہے کہ بزرگوار اگر رات کا سفر کر رہے تھے اور رات کے وقت کہیں ملی تھی تو بجائے حیدرآباد کے مدراس پہونچ گئے اور اگر صبح کو بہردوآ پہونچنا تھا تو لکھنؤ پہونچ گئے۔ اس لئے جب کبھی صبح بزرگوار کی اطلاع کے مطابق اُن کے آنے کی ہو تو اُنکے بجائے اُنکے تار کا انتظار رہتا ہے، تار عموماً مفصّل اور اس مضمون کا ہوتا ہے۔

میں بوجہ بہت غلطی سے فلاں جگہ پہونچ چکا ہوں، آج شام کی گاڑی سے یہاں سے سوار ہو کر اگر پھر ابتدائی منزل پر نہ جا نکلا تو کل تک منزلِ مقصود تک پہونچ جانے کی اُمید ہے۔"

آپ اس تار کے مضمون کو میری حاشیہ آرائی نہ سمجھیں کیونکہ واقعی بزرگوار اس قسم کے تار لکھنے کے ماہر ہیں اور اپنے خطوط کی طرح دوسری زبانوں کے الفاظ انگریزی موضوع میں گھسیٹرنے سے دریغ نہیں کرتے، بہت مرتبہ ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی تار بابو نے پریشان ہو کر تار لینے سے انکار کر دیا ہو اور بزرگوار مضمون بدلنے یا تار گھر بدلنے پر مجبور ہو گئے ہوں۔

اس کے علاوہ جب بزرگوار منزلِ مقصود پر پہونچ جاتے ہیں تو بلا مبالغہ ہمیشہ زادِ راہ سے خالی ہاتھ پہونچتے ہیں، کبھی صندوق بھول آتے ہیں، کبھی بستر پلیٹ فارم پر رہ جاتا ہے، ایک دفعہ ایسا بھی ہو چکا ہے کہ ایک صاحب ان کو سوتا دیکھکر ان کے جسم سے انکا کوٹ ہی اُتار کر لے گئے!!!

ایک مرتبہ مجھے بھی بزرگوار کے ساتھ سفر کرنے کا اتفاق ہوا، تیسرے درجے میں ہم سوار ہو گئے اور بزرگوار نے بہت جلد آس پاس کے مسافروں سے دوستانہ تعلقات قائم کر لئے، بزرگوار کو تو گفتگو کرنیکا موقع ہاتھ آیا اور میری حیثیت اُن سب کے مشترکہ نوکر کی سی بن گئی، کبھی میں کسی صاحب کے لئے پوریاں خریدتا، کبھی کسی صاحب کا بستر بچھاتا اور کبھی کسی صاحب کی اماں جان کی اوپر رکھی ہوئی گٹھڑی میں سے فلاں ڈبہ نکالتا اور ڈبے میں سے شلجم کا اچار نکال کر بزرگوار کو چکھاتا۔ ایک مولوی صاحب اپنے خورد سال پوتے کے ساتھ سفر کر رہے تھے، بزرگوار کے ساتھ موجودہ روشنی کی برائیوں پر بحث کرنے میں مشغول ہو گئے، اُن کا پوتا ایسا خبیث تھا کہ منٹ منٹ کے بعد پیشاب کی حاجت محسوس کرتا تھا اور اس پر طرہ یہ کہ بیت الخلا میں اپنی ضرورت رفع کرنے سے انکار کر دیتا تھا، ایک آدھ مرتبہ اُس نے ڈبے کے کونے ہی میں آبپاشی شروع کر دی، میں نے بزرگوار سے ڈرتے ڈرتے اعتراض سا کیا کہ صاحب بچے کو ایسا مت کرنے دیجئے" اس پر مولوی صاحب تو خاموش رہے مگر بزرگوار نے مجھے بہت کچھ بُرا بھلا کہا، بچے کی کمسنی اور معصومیت واضح کرتے ہوئے مجھے بیوقوف ثابت کیا، میرے لئے خاموش رہنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا، مگر بزرگوار نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ مولوی صاحب سے مسلسل گفتگو جاری رکھنے کے خیال سے مجھے حکم دیا کہ میں ہر ایک اسٹیشن پر مولوی صاحب کے پوتے کو اُتار کر پیشاب کروا لایا کروں۔

اُس وقت کے بعد سے میرا سارا دن اسی ڈیوٹی میں صرف ہوا، اُس دن کے سفر کا صرف ایک اور واقعہ قابلِ ذکر ہے، چلتی گاڑی میں ایک مردِ بزرگ، دراز ریش اور جن کی صرف ایک آنکھ میں بینائی تھی ڈبے میں داخل ہوئے اور مسافروں کی توجہ اپنی طرف کر کے وہ آنکھوں کے بڑی نعمت ہونے پر درس دینے لگے اور اپنے بناتے ہوئے سرمے کی خوبیوں کا پرچار کرنے لگے۔ پھرتے پھراتے وہ آ کر بزرگوار کے پاس ہی آ بیٹھے، حسبِ اُمید بزرگوار نے باتیں شروع کیں اور بہت جلد دونوں میں گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا، میں مولوی صاحب کے ننھے کو سنبھالے یہ تماشہ دیکھ رہا تھا، آخر بزرگوار نے سرمہ کی ایک شیشی اُن کانے صاحب سے خرید لی اور مجھ سے کہا "یہ سرمہ نہایت اعلیٰ قسم کا معلوم ہوتا ہے، اِسے آنکھوں میں ڈال لے تاکہ تیری آنکھیں دھول مٹی سے بچی رہیں۔"

میں نے عرض کیا کہ "مجھے اس نعمت سے معاف فرمائیے، مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس اکسیر کے موجد اس کا استعمال کر کے اپنی ایک آنکھ کھو چکے ہیں۔"

یہ سنکر بزرگوار پھر مجھ پر پل پڑے اور لگے آج کل کے فیشن پرست لونڈوں کو گالیاں سنانے۔ میں خاموش رہا، بعد میں سرمہ بیچنے والے حضرت نے اس بات کا اقبال کیا کہ واقعی انھوں نے اپنی ایک آنکھ تجربات کے دوران میں کھو دی تھی، مگر یہ سرمہ جو وہ خلقِ خدا کی بہتری کے لئے فروخت کر رہے ہیں آنکھوں کے لئے تریاق تھا۔ یہ سنکر بزرگوار نے اُنکے ایثار کی بہت تعریف کی۔ آخر خدا خدا کر کے شام کے آٹھ بجے گاڑی سہارنپور پہونچی، ہم کو کرکشیشر جانا تھا اور وہاں گاڑی رات کے اڑھائی بجے جاتی تھی۔

بزرگوار اپنے سب دوستوں کو الوداع کہتے ہوئے اُترے اور مجھے ننھے سے نجات حاصل ہوئی، ہم اُس پلیٹ فارم پر سامان اُٹھوا کر لے گئے جہاں سے کرکشیشر کو گاڑی جاتی تھی۔ بزرگوار نے پلیٹ فارم پر اپنا بستر بچھا دیا اور اس پر لیٹ گئے، میں پاس ہی ایک بنچ خالی دیکھکر اس پر بیٹھ گیا۔ بزرگوار نے ایک دودھ بیچنے والے کو پکڑا اور اس کے پاس جس قدر شکر اور دودھ نکلا، ملا کر پی گئے، پی کر فرمانے لگے "کچھ مزا نہیں آیا، دودھ

کیا تھا پانی تھا اور شکر میں بھی شاید آٹا ملا ہوا تھا۔"

میں نے پوچھا "کسی اور دودھ والے کو بلا لاؤں؟"

کہنے لگے۔ "وہ بھی اسی کا بھائی ہوگا، اب جانے بھی دو البتہ تم خود جاکر کہیں کھانا کھا آؤ!"

چنانچہ میں جاکر کھانا کھا آیا اور آتے ہوئے بک سٹال سے ایک ناول بھی خرید لایا تاکہ رات پڑھتے پڑھتے گذاروں، بزرگوار لیٹے ہوئے ٹائم ٹیبل کا مطالعہ فرما رہے تھے، شاید یہ دیکھ رہے تھے کہ اگر رات کی گاڑی چھوٹ جائے تو دوسری گاڑی کب ملے گی، آس پاس کچھ لوگ اور بھی لیٹے ہوئے تھے۔ اُن میں ایک جوان عورت بچے کو لئے پڑی تھی اور بچہ نہ معلوم کیوں رو رہا تھا۔ بزرگوار نے ان آجکل کی اماؤں کو خوب کوسا کہ وہ بچے بھی چپ نہیں کرا سکتیں، صرف اُونچی ایڑی کا جوتا پہن کر سرکس والوں کی طرح چلنا جانتی ہیں!

آخر بزرگوار نے مجھے حکم دیا کہ میں سو جاؤں اور وہ مجھے گاڑی کے وقت پر اٹھا دینگے، میں "بہت اچھا!" کہکر لیٹ رہا مگر سویا نہیں، مجھے معلوم تھا کہ اگر سو گیا تو صبح کا ناشتہ سہارنپور کے اسٹیشن پر کرنا پڑے گا، ناول دلچسپ تھا میں پڑھتا رہا، جب دو بجے کے قریب گاڑی پلیٹ فارم پر آگئی تو میں نے اُٹھکر دیکھا کہ بزرگوار لوٹتے لوٹتے بستر چھوڑ دس فٹ پرے سوئے پڑے ہیں! میں نے بستر باندھا اور بزرگوار کو جگایا، بزرگوار نے نیند میں جواب دیا: "ابھی جلدی کیا ہے!" میں نے پھر عرض کیا "گاڑی آگئی ہے آپ اُٹھکر گاڑی میں سو جایئے!"

بزرگوار نے نیم خوابی کی حالت میں جواب دیا: "ذرا ٹھہر جاؤ ابھی اُٹھتا ہوں"

میں ذرا دیر ٹھہرا، اب گاڑی چلنے کا وقت ہو چلا تھا، گارڈ سیٹی منہ میں دبائے اُس میں ہوا پھونکنے پر تیار نظر آتا تھا، میں نے بزرگوار کو پھر ہلایا کہ "قبلہ گاڑی چھوٹنے لگی ہے اب تو اُٹھیے"

اسی پہلے جیسی بے نیازی کے لہجہ میں جواب ملا: "ابھی نہیں چھوٹ سکتی!"

میں نے پھر کہا: "جناب وقت ہو چکا ہے گاڑی ہمارا انتظار نہیں کریگی!"

کہنے لگے: "کوئی پروا نہیں کل چلے جائینگے!" اب سکا میں کیا جواب دیتا۔ ایک بار پھر التجا کی کہ اس طرح سفر میں خراب ہونے سے کیا فائدہ۔ آخر بزرگوار نے سفر، گاڑی، انجن، گارڈ اور مجھ پر لعنتیں بھیجیں اور بمشکل اُٹھکر سامنے کے ڈبے میں جا بیٹھے جہیں نے قلی سے اسباب رکھوایا اور گاڑی چلدی!

اُس دن کے بعد میں نے بزرگوار کے ساتھ سفر کرنیکی جرأت نہیں کی، اگر ہم دونوں کو ایک جگہ جانا ہو تو میں ایک دن پہلے یا ایک دن بعد گھر سے نکل پڑتا ہوں، ویسے تو ریل گاڑی والا ماحول گھر میں بھی قائم رہتا ہے مگر بزرگوار کے متعلق ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ اُن سے گھر کی رونق ہے، اسلئے ہم چھوٹوں کی ہمیشہ یہی دعا رہی ہے کہ خدا بزرگوار کا سایہ ہمارے ننھے ننھے بے عقل سروں پر ہمیشہ قائم رکھے!

بھارت چند کھنہ

حُسنِ آوارہ

اڑ رہی ہے تیتری　　یا ہوائے دلبری
نازک و نحیف سی　　تو بر و نحیف سی
گھر نہ بار ہے کوئی　　اور نہ اپنی شے کوئی
بس جدھر نکل گئی نکل گئی
اُڑ رہی ہے اڑ رہی ہے تیتری

سرخوشی کو چھوڑ کر　　زندگی کے موڑ پر
باغ و راغ کاٹتی　　آبِ جو کو چاٹتی
بوئے گل ہی جھومتی　　خار و خس کو چومتی
جس طرح بھی جی سکی ہے جی رہی
اُڑ رہی ہے اُڑ رہی ہے تیتری

ایک بے دماغ نے　　کہنہ سالِ لالہ نے
زور حرص و آز میں　　شورِ برگ و ساز میں
اس کو جب مسل دیا　　دلکشی کا پھل دیا
آہ بھی نہ بدنصیب کر سکی
اُڑ رہی ہے اُڑ رہی ہے تیتری

اب وہ کسلئے مرے　　شہد جمع کیوں کرے
سونگھتی ہے پھول کو　　زرنگار پھول کو
پھر اُسے لتاڑ کر　　بال و پر کو جھاڑ کر
ڈھونڈتی ہے مسکرا کے [illegible]
اُڑ رہی ہے اُڑ رہی ہے تیتری

قیوم [illegible]

نیا ہندوستانی اور اُس کی صلاحیتیں

ہندوستانی، نیا ہو یا پرانا، بہرحال ہندوستانی ہے اور ہندوستانی ہی رہے گا اور اس وجہ سے اُس کی ایک پیدائشی خصوصیت بھی باقی رہیگی۔ شاید یہ ہندوستان کی آب و ہوا اور مٹی کی تاثیر ہے کہ یہاں کا باشندہ غور و خوض کرنے اور اصلیت کی تہ تک پہونچنے کا عادی ہے اور (تصوّف کی اصطلاح میں) کثرت میں وحدت کی تلاش کرتا ہے۔ بہت سی غیر ہندوستانی قومیں ذہنی طور پر بال کی کھال نکالنے کو گوارا نہیں کر سکتیں اور نہ ان میں وہ دماغی قوتِ تنظیم پائی جاتی ہے جس کی مدد سے روزمرّہ کی زندگی کے معمولی سے معمولی مختلف قسم کے مشاہدوں کو جمع کر کے بنیادی طور پر اُنکے ہم اصل ہونے کا اندازہ کیا جا سکے اور اس طرح کسی باقاعدہ فلسفہ کی داغ بیل ڈالی جا سکے۔

لیکن ہندوستانی دماغ تمام تجربوں سے گذرتا ہے اور ہر تجربہ کی بے رحمی سے چیر پھاڑ کرتا ہے اور پھر ان تمام تجربوں کی داخلی قدر و قیمت کا اندازہ کر کے اسکو ایک معقول فلسفۂ خیال "System of thought" کی صورت میں پیش کر دیتا ہے۔ وہ جزئیات میں گم ہو کر بھی "بظاہر ایک دوسری سے مختلف" چیزوں میں اُن کے اندر کی بنیادی ہم آہنگی کا احساس کر لیتا ہے اور جزو میں کل اور قطرے میں دریا کا نظارہ کرتا ہے۔ یہ اُسکے صد درجہ انفرادی ہونے کی دلیل ہے۔ اُس کی یہ انفرادیت گو ہندوستان میں آج کل کوئی اجتماعی احساس پیدا ہونے نہیں دیتی اور معاشرتی اور سماجی نقطۂ نظر سے ایک کمزوری کہی جا سکتی ہے، مگر میرا خیال ہے کہ اُس کی یہ کمزوری ہی آگے چل کر شاید پھر اُس کی عظمت اور قوت کا باعث بنے، کیونکہ موجودہ لڑائی میں دُنیا کو جن ہولناک تجربوں کا سامنا ہے ان تجربوں سے اگر کوئی شخص ایک بہتر فلسفۂ زندگی نکال کر دنیا والوں کے سامنے پیش کر سکتا ہے تو وہ ہندوستانی ہی ہے۔ اور اپنی ذہنی اور دماغی صلاحیتوں کے لحاظ سے وہ اس کام کیلئے موزوں بھی ہے!

اور یہ ممکن ہے کہ زندگی کی کشمکش کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں بھٹک کر اب جو فلسفۂ زندگی نیا ہندوستانی پیش کرے وہ اُسکے پرانے فلسفہ کی طرح محض روحانی ہی نہ ہو اور روحانی بلندیوں پر پہونچانے کے علاوہ زندگی اور اُس کے اُلجھے ہوئے سماجی مسئلوں کی گتھیاں بھی سلجھائے!

دُنیا کی تاریخ اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ انسان نے جو کچھ ترقی کی ہے اُس کا حاصل شخصی اور ذہنی آزادی ہے۔

اس وقت جمہوریت کے دُشمن لوگوں کے فطری حقوق اور ذہنی آزادی چھیننے پر تلے ہوئے ہیں۔ میں ابھی ابھی ہندوستانی کی انفرادیت کا ذکر کر چکا ہوں۔ نیا ہندوستانی ضرور اپنی انفرادیت کو خطرے میں دیکھکر باوجود اپنی بے سر و سامانی کے اس جنگ میں حصّہ لے گا۔

اس میں شک نہیں کہ اس کو بڑی بڑی قربانیاں دینی ہونگی، مگر دُنیا میں کسی نے کوئی فائدہ بلا قربانی پیش کئے نہیں اُٹھایا!

میں سمجھتا ہوں کہ جنگ ہی نئے ہندوستانی کے اصل جوہر کو چمکا سکتی ہے اور اُس کے لئے بہت ضروری ہے، کیونکہ جنگ جب حق اور انصاف کی حمایت میں ہوتی ہے تو بڑی فائدہ مند چیز بنجاتی ہے اور اُس آگ کے مانند ہوتی ہے، جو اگر اچھی چیزوں کو تباہ کرتی ہے تو ان کے ساتھ ہی تمام گندگیاں اور کوڑا کرکٹ بھی جلا کر راکھ کر ڈالتی ہے۔ آگ کا کام چیزوں کو جلا کر پاک کرنا ہوتا ہے!

نیا ہندوستانی بھی جب جنگ کی آگ میں تپ کر نکلے گا تو دیکھنے کے قابل ہوگا۔ اُس کی معاشرت کی تمام گندگیاں جل کر خاک ہو چکی ہوں گی اور صرف وہی چیز باقی رہ جائے گی جو کسوٹی پر پوری اُتر سکے۔

جنگ کے فوراً بعد ہی جو لوگ باقی رہ جائیں گے اُن کی زندگی پر کشت و خون کے نظاروں کا اثر ضرور باقی رہے گا۔ لیکن اُن کے بعد جو نسلیں آئیں گی اُن میں کوئی تلخی اور ذہنی کشمکش نہ ہوگی۔ نئے ہندوستانی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ پرانا ہندوستانی اور اس کے تعصبات ہیں۔ مگر یہ پرانا ہندوستانی اب تھوڑے ہی دنوں کا مہمان ہے۔ یا پھر جنگ کے سیلاب میں بہ جائے گا۔ اس ذہنی رکاوٹ کے دور ہوتے ہی لوگوں کے دلوں کی کھینچا تانی بھی ختم ہو جائے گی، کیونکہ نیا ہندوستانی ان پرانے تعصبات اور بُری رسموں سے آزاد ہو چکا ہوگا اور تب ہی اپنے ارمانوں اور بلند ارادوں کو پورا کر سکے گا۔ زندگی پر جو دھوکا [illegible] چھائی ہوئی ہیں ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ ایک تندرست

ہم اور صحیح دماغ رکھنے والی نسل آئے گی جو زندگی کے متعلق جہالت بڑھانے والی غلط فہمیاں نہ پھیلائے گی بلکہ صدورجہ صاف گوئی سے کام لے کر اس کو سمجھنے کی کوشش کرے گی اور ان تمام معاشرتی، جنسی، ذہنی اور جذباتی خرابیوں کو دُور کرنے کی کوشش کرے گی جو سینکڑوں برس سے جمع ہو ہو کر اب ایک پہاڑ بن گئی ہیں۔ وہ بے معنی سی وضعداری، شرم و حجاب اور نام نہاد شرافت کے نظریے جن کی وجہ سے موجودہ نوجوان زندگی کو زندگی سمجھنے سے قاصر رہے ہیں بالکل مٹ جائیں گے۔ نہ تعصب اور جہالت اور آپس کی نفرت کی پیدا کی ہوئی وہ رسمیں رہیں گی جن کے اثر سے موجودہ نسل کے نوجوان نہ صرف جسمانی لحاظ سے کمزور ہو گئے ہیں بلکہ ذہنی اور جذباتی اعتبار سے بھی مِٹے اور "چوں چوں کا مربہ" بن کر رہ گئے ہیں، کیونکہ ایک طرف اُن کے دلوں میں پرانے تعصبات، شکوک اور اوہام (جو اُن کو ورثہ میں ملے ہیں!) زور پکڑے ہوئے ہیں اور اُن میں کوئی قوتِ عمل نہیں چھوڑتے اور دوسری طرف نئے اثرات اُن کو اپنی طرزِ معاشرت اور طرزِ خیال بدلنے پر مجبور کر رہے ہیں ـــــ،

وہ وقت آنے والا ہے جب تمام انسانی تفرقے مٹ جائینگے اور سب ایک ہو کر آپس میں ایک دوسرے سے ہمدردی اور محبت کرنے لگیں گے!

پردہ کی موجودہ غیر فطری صورت جس نے ہندوستان کی آدھی آبادی کو چار دیواریوں میں بند کر کے ذہنی اور جسمانی اعتبار سے ناکارہ کر دیا ہے اور جس کی سزا فطرت نے موجودہ زمانے کے ہندوستانی مردوں کو اُلجھی ہوئی شخصیتوں اور گھبرائی ہوئی صورتوں کی شکل میں دی ہے، دُور ہو جائے گی۔ زندگی کی جدوجہد میں مرد اور عورت دونوں برابر برابر اور ساتھ ساتھ حصّہ لیں گے اور ہماری سماجی اور نجی زندگی کے بہت سے شرمناک اور گندے پہلو تھوڑے ہی عرصہ میں مٹ کر خواب و خیال ہو جائیں گے۔

بنگال کا مشہور شاعر قاضی نذر الاسلام شاید ہندوستان کی نئی پود ہی کی ترجمانی کر رہا ہے۔ سُنیئے:۔

"ساری دنیا کے انسان سُن لیں کہ ہم سب ایک ہی
کارواں کے مسافر ہیں۔
اگر ایک کو تکلیف ہوگی
تو سب کے دل اس کی کھٹک کو محسوس کرینگے۔
ایک کی توہین بنی نوعِ انسان کی توہین ہے!
ایک نئی دُنیا نئے ارمانوں اور نئے مقصدوں کے ساتھ راہِ حیات
پر گامزن ہو رہی ہے،
جسے دیکھ کر خدا مسکراتا ہے
اور شیطان خوف سے لرزتا ہے!!"

اس نئی دُنیا میں جس کا ذکر شاعر کرتا ہے خلوص، صداقت اور صاف گوئی کا دَور دَورہ ہوگا۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں اور بدنما داغوں کو تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعے چھپایا نہ جا سکے گا۔ رسم و رواج نے دونوں جنسوں (sexes) کے درمیان جو "علیحدگی" پیدا کر دی ہے وہ دُور ہو جائے گی، اور اس علیحدگی کے سبب سے جو ناواقفیت ایک دوسرے سے ہو گئی ہے وہ بھی باقی نہ رہے گی، اور اس ناواقفیت سے جو بُرے اثرات ذہنی اور جسمانی پیدا ہوتے ہیں وہ پیدا نہ ہو سکیں گے، کیونکہ ہر وہ چیز اپنی اصلی شکل میں لوگوں کے سامنے آ جائے گی جس پر مروّجہ رسم و رواج اور شرم و حجاب نے پردہ ڈال رکھا ہے۔ دماغوں سے گندے خیالات نکل جائیں گے کیونکہ ان خیالات کے اظہار میں رسمی شرم و حیا مانع نہ ہوگی، اور دماغوں سے باہر نکل کر پھر یہ گندے خیالات "تحت الشعور" میں نہ جم سکیں گے۔ اور ذہنیتوں میں اُلجھاؤ اور طبیعتوں میں جھجک اور ہچکچاہٹ پیدا نہ کر سکیں گے۔ گھناؤنی سے گھناؤنی بات بھی (جب تک وہ اپنی اصلی صورت میں پیش ہوتی رہے گی) لوگوں کے لطیف احساس کو ٹھیس نہ لگا سکے گی۔ اصلیت اور حقیقت (خواہ وہ کتنی ہی مکروہ کیوں نہ ہو) نئی پود میں کراہت اور نفرت پیدا نہ کر سکے گی۔ ہاں، وہ مکر و فریب، جھوٹے جذبات، بناوٹ، دکھاوے اور دھوکے کی اُن ٹٹیوں کو برداشت نہ کر سکیں گے جن کے پیچھے زندگی کے المناک پہلو چھپائے جاتے ہیں۔ ظاہری پاکدامنی اور تجرّد کو زندگی کا انکاری پہلو سمجھا جائے گا۔ جہالت، توہّم اور وحشی پن میں بہت کمی آ جائے گی۔ آنے والی نسلوں کے نوجوان ایک جرّاح کی طرح زندگی کے زخموں اور پھوڑوں کی چیر پھاڑ کریں گے اور کراہیت کے ساتھ ان پر پردہ ڈال کر علیحدہ نہ ہو جائیں گے۔ موجودہ نئے ہندوستانی مصنّفوں کی تحریروں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے اور زیادہ عرصہ گذرنے نہیں پائے گا کہ یہ خصوصیت عام ہو جائے گی۔

گذشتہ جنگ عظیم میں یورپ کی عورتوں نے اپنے فطری حقوق مردوں سے حاصل کئے تھے۔ موجودہ جنگ میں ہندوستانی عورت بھی بلا کسی قسم کی رکاوٹ کے اپنی آزادیاں حاصل کرے گی اور زندگی

کے مقابلے میں اپنی مغربی بہن کی طرح دوش بدوش رہ کر سوسائٹی کی اصلاح میں مدد دے گی۔ ہوائی حملوں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں رسم و رواج کی پرانی چٹانیں پاش پاش ہو جائیں گی۔ عورت گھروں کے اندر اور حرم سراؤں کی چار دیواریوں کے پیچھے سینکڑوں برس کے رسمی حجابات کی آڑ لیکر معطل نہ رہ سکے گی۔ زندگی کا جذبہ اُسے ان پردوں سے باہر نکال لائے گا اور لڑائی کے ہولناک نظارے اور موت کی سرگرمیاں دیکھنے اور خود زندگی کو موت سے بچانے پر مجبور کر دیگا۔

ایک دوسرے کو مارنے مرنے سے مَردوں میں جو وحشی پن پیدا ہو جائے گا اُس کو دُور کرنے کے لئے عورت کی موجودگی بہت ضروری ہوگی اور عورت اپنے فطری جوش کی بنا پر اپنے اس فرض کو پورا کریگی۔

عورتوں کو سسکتے ہوئے، دم توڑتے اور مرتے ہوئے سپاہیوں کی دیکھ بھال اور مرہم پٹی کرنی ہوگی۔ اُن کو اپنی رسمی نزاکت، بے بسی اور کمزوری کو خیرباد کہنا ہوگا۔

زندگی، بے حجاب ہو جائے گی!

اور جب جنگ کے بعد زندگی کی از سرِ نو تعمیر کی جائے گی تو عورت ہی اُس میں گُل بوٹے بنائے گی، اور سماج جس نے آج اُنکو اپنے ظلم و ستم سے ناکارہ بنا رکھا ہے خود اپنی مشاطگی کے لئے نئی ہندوستانی عورتوں کی دست نگر ہوگی۔ سماج پر اثر ڈالنے والی ہر تحریک میں عورتوں کا ہاتھ ہوگا۔ زندگی کے بہت سے اُن پہلوؤں پر جو مَرد نہیں سمجھ سکتے روشنی ڈالی جائے گی۔ عورتوں کی آواز کو مجالس قانون ساز سے لے کر ادنیٰ کمیٹیوں تک میں اہمیت دی جائے گی۔

عورتوں کے باہر نکل آنے سے زندگی سے جھوٹ اور مکر و فریب بھی دُور ہو جائے گا کیونکہ عورتوں کی نگاہیں مردوں کے ہر قول و فعل کا جائزہ لیں گی اور اُن کو "بے راہ" نہ ہونے دیگی۔

اور میرا خیال ہے کہ اخلاقی حالت پہلے کی بہ نسبت زیادہ سُدھر جائے گی۔ آپس میں ایک دوسرے کو سمجھنے اور بے نقاب دیکھنے کے بعد دونوں جنسیں (sexes) شاید کوئی ایسا طریقہ نکال لیں جس سے ایک دوسرے کی انفرادیت اور شخصیت کو نقصان پہنچائے بغیر ازدواجی زندگی زیادہ کامیاب اور خوش و خرم بن سکے اور جس کا اثر اُن کی اولاد کی بشاش طبیعتوں اور انسانی عادتوں کی شکل میں ظاہر ہو۔

"نئے ہندوستانی" کا اطلاق دونوں جنسوں پر ہوتا ہے۔ ایک کو دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ اور ایک دوسرے کی مدد کے بغیر کوئی روحانی اور جسمانی ترقی بھی نہیں ہو سکتی۔

میں نے موجودہ حالات اور واقعات کا رُخ دیکھتے ہوئے نئے ہندوستانی کی آئندہ زندگی کا ایک دھندلا سا خاکہ پیش کیا ہے۔ وقت کی جس شاہراہ پر نیا ہندوستانی چل رہا ہے وہ حدِ نظر تک تو دکھائی دیتی ہے مگر پھر "مستقبل" میں مل کر دھندلی ہو جاتی ہے۔

نیا ہندوستانی جوں جوں آگے بڑھتا جائے گا تو اُس میں کیا کیا صلاحیتیں پیدا ہوتی جائیں گی؟ اس کا جواب آپ کو آنے والا زمانہ ہی دے گا۔ میں نے تو محض وقت کی شاہراہ کے کنارے ٹھہر کر تھوڑی دیر کے لئے اس کارواں کو بڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کی منزل کہاں ہے، اس کا جواب دینے سے معذور ہوں ؎

لوں دامِ بختِ خفتہ سے اک خوابِ خوش ولے
غالبؔ یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں!

(اے۔ آئی۔ آر۔ دہلی)

مظہر عزیز

تڑپ

اُس نے تاروں کی طرف دیکھا۔ تاروں نے کہا: "گیارہ بج گئے ہوں گے۔"

دُور کوئی چھ فرلانگ کے فاصلے پر گاؤں نیند، خاموشی اور اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

کچی سڑک کے کچے کنارے پر، بے ڈول اینٹوں کے بیڈول مکان کے سامنے، کریلے اور گھیئے کی بیلوں، بینگن اور بھنڈیوں کے پودوں، کہیں کہیں گلاب اور گیندے سے بنے ہوئے اور کانٹے دار باڑ سے محفوظ کئے ہوئے چھوٹے سے آنگن کے درمیان، پرانی، ٹوٹی پھوٹی، کمزور چرچراتی چارپائی پر، پھٹے پرانے گندے چیتھڑوں کے نیچے والا مٹی کا گندہ ساحقہ لئے ہوئے، کچی اینٹوں اور مرمر کے ٹکڑوں کے درمیان کسی رنگ کی دلیسی دھوتی میں، زندگی کے بہت لمبے جہاد کے زخم خوردہ جسم کے ساتھ، وہ خیالات میں مستغرق بیٹھا تھا۔

اُس کے خیالات، رات کی تاریکی اور حقّے میں یگانگت تھی۔

تاروں نے ایک دفعہ پھر کہا: "گیارہ بج گئے۔"

لیکن تاروں کی زبان سے کہیں زیادہ میٹھی حقّے کی زبان تھی۔ اُس کے حقّے کی میٹھی باتوں نے اُس کی ہزاروں تنہائیوں میں سکو پاس بیٹھکر اُسکی غمگساری کی تھی۔ وہ بیٹھا رہا۔ بیٹھا رہا۔ بیٹھا رہا۔

یکایک اُسکے ایک بیل کے گلے میں گھنٹی کی آواز آئی۔

"کیوں؟ بیٹا! کیا بات ہے؟"

دونوں بیلوں کے گلوں میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔

"کون ہے بیٹا! کیوں گھبراتے ہو؟"

ایک بکھرے بکھرے بالوں والا، پتلے لمبے بدن کا آدمی، سفید قمیص میں اور غالباً فاختی رنگ کی پتلون میں، باڑ کے دروازے کے سامنے نظر آیا۔ کسان ایک اضطراری جنبش کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔

"گھبرائیے نہیں، میں ایک اجنبی ہوں، آپ کے پاس پناہ چاہتا ہوں۔"

کسان کو فیصلہ کرتے میں کچھ دیر لگی۔

"اندر آجاؤ۔"

اجنبی اندر آگیا۔ اُس کی عمر ۲۸ سال کے قریب ہوگی۔ اُس کا بھنچا ہوا چہرہ اُس کے افلاس کی طرف نہیں بلکہ اُس کی ورزشی عادتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اُس کا گندمی رنگ اندھیرے میں کالا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی گفتگو میں اضطراب ہے۔

"ہم سیر کیلئے آئے تھے۔ میرے ساتھی یہیں کہیں نزدیک ہی خیمہ زن ہیں۔ میں سیر کیلئے نکلا تھا، راستہ بھول گیا۔"

"بہت لوگ اس دُنیا میں راستہ بھول جاتے ہیں بیٹا!"

"میں آج رات یہیں رہنا چاہتا ہوں۔ دن کے وقت میں اپنا مقام ڈھونڈ لوں گا۔"

"لیکن بعض اوقات دن کی روشنی میں بھی راستہ نہیں ملتا، بیٹا!"

"آپ جو میری مدد کریں گے۔"

"بیٹھ جاؤ۔"

اجنبی چارپائی کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔ چارپائی کی چرچراہٹ نے اپنی پوری قوت کے ساتھ احتجاج کیا لیکن بے سود! کسان نے اپنا حقّہ اُٹھا کر چارپائی کے دوسرے سرے پر رکھ دیا۔ خود اُس کے مقابل چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چارپائی کا احتجاج دشمن کے بڑھے ہوئے بوجھ کے نیچے دب کر رہ گیا۔

"حقّہ پیتے ہو؟"

"میرے پاس سگار ہیں۔ پیوگے؟ بہت قیمتی ہیں۔ چار آنے کا ایک سگار!"

"میں چار آنے کے بھنڈیوں کے بیج لایا تھا، سارا گاؤں اُس سے فائدہ اُٹھا رہا ہے۔"

"تمہارے صحن میں بھنڈیاں بھی ہیں؟"

"بھنڈیاں، بینگن، کریلے، گھیئے اور بہت سی سبزیاں، اور کچھ پھول بھی!"

"اُف! کتنی دلکش ہوتی ہے دیہات کی فضا!"

"اور اگر تم دیہات کے باشندے ہوتے، تو کہتے: اُف کتنی دلچسپ ہوتی ہیں شہروں کی راتیں اور موٹریں۔"

"لیکن یہ تو سب جانتے ہیں کہ دیہات کی زندگی شہروں

زندگی سے اچھا ہے۔"

"سوائے عقلوں اور کتابوں کے ناتجربہ کار لڑکوں کے اور کوئی ایسا نہیں کہتا۔ اور یہی لڑکے بعد کو کسی پرائم منسٹر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں ——— آپ نے مڈل دیہات کے غیر تسلی بخش سکول میں پاس کیا۔ دیہات کی فضا آپ کی غیر معمولی قابلیتوں کے لئے ناسازگار تھی۔ اس لئے آپ کے والدین دیہات کی رہائش ترک کر کے شہر میں آ گئے لیکن آپ کی بے پناہ دماغی قوتوں نے وہاں بھی میدان تنگ پایا۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد آپ انگلستان گئے اور وہاں سے جرمنی۔ ملک نے آپ کو انہی دماغی کاوشوں کے صلے میں پرائم منسٹر کا عہدہ عطا کر کے اپنی فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ ——— اجنبی! کبھی تم نے کسی کو یہ کہتے بھی سنا ہے ——— آپ نے پرائم منسٹر کا عہدہ حاصل کرنے تک ہندوستان، جرمنی اور انگلستان کی ناسازگار فضا میں زندگی بسر کی۔ اس کے بعد آپ شہر کی رہائش چھوڑ کر گاؤں جا بسے۔ اور گاؤں والوں نے آپ کو اس عقلمندی کے صلے میں کسان کا عہدہ عطا کر کے آپ کی قدر افزائی کی ——— اجنبی! گاؤں چھوڑ کر شہر جانا ترقی ہے اور شہر چھوڑ کر گاؤں میں آنا تنزل ہے۔ تم نے کسان کی مشکلات کا مطالعہ کیا ہوگا۔ مختلف دماغ مختلف علاج تجویز کرتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک زمیندار کو شکست دینے کے لئے صرف ایک حربہ کارگر ہے۔ اگر کسان زمیندار کی چیرہ دستیوں سے بچنا چاہتے ہیں تو ان کو گاؤں چھوڑ کر شہر میں آباد ہونا چاہئے۔ پچھلے دنوں اس قسم کا سیلاب انگلستان میں آیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج گورنمنٹ کسانوں کو اپنی زمینیں آباد رکھنے کے لئے اور ان میں فصلیں اگانے کے لئے انعام دیتی ہے۔ زمینداری سسٹم نابود ہو گیا۔ اب اگر کسی انگریز کو زمیندار کہلانے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے تو وہ انگلستان کی بجائے کینیڈا اور آسٹریلیا میں زمینیں خریدتا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ کسان کے ساتھ زمیندار بھی گاؤں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ شہر میں کسان کو مزدور کہتے ہیں اور زمیندار کا نام بدل کر سرمایہ دار ہو جاتا ہے۔ اس طرح ان میں وہ پرانی دشمنی قائم رہتی ہے۔ لیکن گاؤں میں گاؤں کا گاؤں ہونا کسان کو نقصان پہونچاتا ہے اور شہر میں، شہر کا شہر ہونا، مزدور کی مدد کرتا ہے۔ گاؤں کسان کو سادہ لوحی اور شرافت جیسی بیوقوفی کے دوسرے اوصاف سکھاتا ہے۔ شہر مزدور کو فریب کاری اور مکاری جن پر زندگی کے جہاد کی شاندار عمارت قائم ہے، سکھاتا ہے۔ سوشلزم کی موجودہ کامیابی کا راز بھی شہر کا جادو ہے۔ شہر نے مزدور کو زیادہ تجربہ کار، زیادہ ہوشیار اور زیادہ لڑنے کے قابل بنا دیا تھا ——— "

"قطع کلامی معاف! لیکن میرا خیال ہے اتنی تفصیل کی ضرورت نہ تھی۔ جن حالات نے انگلستان کے کسانوں کو گاؤں چھوڑنے پر مجبور کیا تھا، وہ حالات ہندوستان میں موجود نہیں۔ انگلستان کے کسانوں نے جن دنوں گاؤں چھوڑنے کی تحریک میں حصہ لیا تھا، وہ ان کے صنعتی انقلاب کے دن تھے۔ زمینوں کو چھوڑ کر لوگ کارخانوں میں کام کرنے لگے تھے۔ لیکن ہندوستان میں صنعتی انقلاب تو کیا صنعتی تغیر بھی ابھی مکمل نہیں ہوا۔ پھر یہاں تمہاری تجویز کیلئے گنجائش کہاں؟"

کسان کے حقے کی گڑگڑاہٹ جیسے اجنبی کی باتوں پر ہنس رہی تھی۔

"اجنبی! میں تمہیں یہ نہیں بتا رہا کہ یہ چیز ممکن ہے اور وہ چیز ناممکن۔ میں تو صرف شہری زندگی اور دیہاتی زندگی کا مقابلہ کر رہا ہوں۔"

"ڈاکٹروں کی متفقہ رائے ہے کہ دیہات کی آب و ہوا شہروں کی نسبت زیادہ صحت بخش ہے۔"

"ڈاکٹروں کی متفقہ رائے ہے کہ دیہات شہری مریضوں کیلئے کم خرچ بالانشیں ہسپتال ہیں۔ لیکن پھر ہسپتال بھی تو کوئی اچھی جگہ نہیں ہوتی، کون ہسپتال میں رہنا پسند کرتا ہے؟"

اجنبی چپ ہو گیا۔ خاموشی کے ان شاق لمحوں کو حقے کی موسیقی نے رنگین بنانے کی بے سود کوشش کی۔ ستارے ہنس رہے تھے۔

"اجنبی! جو چیز ہماری دسترس سے باہر ہوتی ہے وہ ہمیں اچھی معلوم ہوتی ہے۔ موجودہ حالات انسان کو اطمینان نہیں بخشتے۔ وہ ہمیشہ اس چیز کی تمنا رکھتا ہے جو اس کی پہونچ سے دور ہو۔ دوری ظاہری خوبصورتیوں کو ہماری آنکھوں تک پہونچا کر چیزوں کو ہماری نظر میں زیادہ جاذب بنا دیتی ہے۔ نزدیکی باطنی کمزوریوں کو واضح کر کے چیزوں کی وقعت کو کم کر دیتی ہے۔ وہ دیکھو! ستارے کتنے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل وہ پتھروں کا ایک ڈھیر ہے۔"

حقے کی گڑگڑاہٹ ——— غبار آلود ہوا کی ہلکی ہلکی سنسناہٹ ——— بیلوں کے گلوں میں گھنٹیوں کی آواز ——— دور کہیں کسی کنوئیں کے چلنے کی ٹک ٹک ——— اجنبی کو اس دلکش دیہاتی فضا میں دیہاتی باتوں کی توقع تھی۔ دیہاتی باتیں، سادہ، بے رنگ، بے کیف، بے ربط، کمزور باتیں ——— کسان کی باتوں میں تصنع تھا۔ تصنع جس کو شہر کے لوگ تہذیب کہتے ہیں۔ اُسکے ادبیت سے لدے ہوئے شستہ فقرے بتاتے تھے کہ وہ ان کو بارہا دہرا چکا ہے۔

"اجنبی! میں ایک امیر زمیندار کا بیٹا تھا۔ اس گاؤں کے [illegible]

گاؤں کی تمام زمین ہماری تھی۔ ہمارا گھر پختہ اینٹوں سے بنے ہوئے شاندار مکان میں رہتا تھا۔ دیہاتی اور شہری دونوں قسم کی زندگی میرے لئے ممکن تھی۔ اونچی سے اونچی تعلیم، زیادہ سے زیادہ آسائش، کوئی چیز ایسی نہ تھی جو مجھے میسر نہ آسکتی ہو۔ لیکن میں ناخوش تھا۔ بیقرار تھا، ایک چیز کیلئے۔ وہ چیز میرے لئے بے اندازہ دلچسپی رکھتی تھی۔"

"کیا؟"

"جیل!"

اجنبی کی دلچسپی ہیجان میں آگئی۔ اُس نے کسان کو زیادہ سنجیدگی کے ساتھ سننا شروع کر دیا۔

"تو تم جیل بھی دیکھ چکے ہو، بابا؟"

"تین دفعہ۔ چوتھی دفعہ جانے کی اُمید رکھتا ہوں۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں، تم کو کیوں جیل بھیجا جاتا تھا؟"

"پہلی دفعہ جب میں سکول میں پڑھتا تھا، عدم تعاون کی تحریک میں حصہ لینے اور سکول میں قومی تحریک شروع کرنے کے جرم میں ایک سال۔ دوسری دفعہ جب میں نے ایک اخبار جاری کیا تھا، اور اپنے ایڈیٹوریل میں لکھا تھا کہ ریاست کے موجودہ تشدد سے بچنے کے لئے ریاست کے باشندوں کو ریاست چھوڑ کر چلا جانا چاہیئے۔ اس جرم میں تین سال۔ تیسری اور سب سے لمبی سزا ———"

اُس نے حقے کا ایک لمبا کش لگایا، جیسے وہ بہت لمبے واقعات کا اعادہ کرنے والا ہے۔

"لمبی سزا! کتنے سال؟ بابا!"

اجنبی کے لہجے میں تبدیلی آگئی۔ وہ کسان نہیں، وہ ایک پُرانا تجربہ کار ایڈیٹر ہے۔ دیہات کی شام نہیں، ایک ایڈیٹر کی زندگی کی شام۔ حقے کی گڑگڑاہٹ نہیں، انقلاب کے بگل کی مدھم صدا۔ بیلوں کے گلے میں گھنٹیوں کی آواز نہیں، قافلے کو جگانے کے لئے درا کا شور۔ دُور پرے کنوئیں کی ٹک ٹک نہیں، سوسائٹی کے پُرانے قوانین پر ہتھوڑے کی ضربیں۔

اُس نے پھر کہا: "کتنی لمبی سزا؟ بابا!"

کسان نے جواب دیا: "شاید بیس سال!"

"بیس سال!"

"جنٹلمین! ہمارے گاؤں کے پاس ہی ہماری ریاست کی شکار بارہی ہے۔ ہمارے مہاراج کبھی کبھی یہاں شکار کے لئے آتے ہیں۔ ایک دو ماہ قیام کرنے کے بعد چلے جاتے ہیں۔ میرے واقعات کا تعلق ہمارے مرحوم مہاراجہ سے ہے۔ وہ اکثر شکار باڑی میں آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ ایک دفعہ بہار کے موسم میں وہ یہاں آئے۔ اُس وقت میری عمر کچھ زیادہ نہ تھی۔ میں تین سال کی سزا ختم کرکے آیا تھا۔ بیکار تھا۔ میرے والدین میرے خیالات کی نوعیت سے ڈرتے تھے۔ اُنہوں نے میرے لاابالیانہ پن کا علاج ملازمت میں سمجھا۔ وہ پہلا موقع تھا جب مجھے دُنیا کی ایک بہت بڑی تلخ حقیقت سے پہلی دفعہ سامنا ہوا۔ مجھے معلوم ہوا کہ میری ایک بہن کی عصمت میری ملازمت پر قربان کی جارہی ہے۔ میرا خون کھول اُٹھا۔ میں نے ایک ترکیب سوچی۔ میری بہن رضامند ہوگئی۔ میں اُس رات اپنی بہن کے کپڑے پہن کر ایک خوبصورت لڑکی بن گیا۔ میری ساڑی کے نیچے دائیں طرف ایک تیز کی ہوئی بے رحم چھری تھی۔

مہاراجہ کی خلوت گاہ ننگی عورتوں کی تصویروں سے سجی ہوئی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ ایک نہایت قیمتی پلنگ پر ایک نہایت قیمتی بستر تھا۔ دیواروں میں دروازوں اور دریچوں کی جگہ تصویریں تھیں۔ ہوا کا انتظام بجلی کے پنکھوں سے کیا گیا تھا۔ سامنے کی دیوار میں خالی انگیٹھی کے سامنے ایک میز پر ٹیلیفون پڑا تھا۔ ٹیلیفون کے برابر ہی ایک میز پر ریڈیو سٹ تھا۔ چند کرسیاں تھیں۔

مہاراج اندر آگئے۔

میں اُس وقت ایک ننگی عورت کی تصویر کے پاس کھڑا اُسکو دیکھ رہا تھا۔

"اچھی ہے تصویر، ہے نا؟" مہاراج نے وہیں دروازے کے پاس سے کہا۔

میں چُپ چاپ وہاں سے ہٹ کر دروازے کے پاس آگیا۔

مہاراج نے کہا: "دروازہ بند ہے، اور یہ صبح تک بند رہیگا۔ تم کرسی لے لو۔"

میں وہیں کھڑا رہا۔

وہ بولے: "گانا سنو گی؟"

مہاراج نے ریڈیو کو ٹیون کرنا شروع کر دیا۔ میں نے پہلی دفعہ اُن کو دیکھا تھا۔ اُن کی پیٹھ میری طرف تھی۔ وہ ایک قیمتی ڈریسنگ گاؤن میں تھے۔

اُنہوں نے میری طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم کھڑی کیوں ہو؟ کیونکہ میں مہاراجہ ہوں؟ پاگل، ایک حسین لڑکی کے سامنے مہاراجے کی کیا حیثیت ہے؟"

وہ ایک آرام کرسی پر دراز ہوگئے۔ ریڈیو [illegible]

میں کافی دیر تک وہیں خاموش کھڑا رہا۔ آخر مہاراج نے اُٹھ کر میری طرف آتے ہوئے کہا: "پیا کو منانا ہی پڑے گا" اور پھر میرے نزدیک آکر کہنے لگے "ڈارلنگ!" میں وہاں سے ہٹ کر ریڈیو کی طرف چل دیا۔ میری ساڑی کا ایک پلو اُن کے ہاتھ میں آگیا۔ ناواقف ہاتھوں سے بندھی ہوئی ساری یکایک کھل کر نیچے گر پڑی۔ میں اضطرار کے ساتھ سفید قمیص اور نیلی نیکر میں ٹیلیفون کے پاس جا کھڑا ہو گیا۔

مہاراج وہیں کھڑے رہے۔

میں نے غضب آلود آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا: "مہاراج ـــ ہوس کے غلام ـــ جن جن معصوم عورتوں کی عصمت دری کے ثبوت میں اُن کے ننگے فوٹو تو نے اس ناپاک کمرے کی ناپاک دیواروں پر لگا رکھے ہیں آج تجھ سے اُن کا انتقام لیا جائے گا!"

مہاراجہ میری طرف بے پرواہی سے دیکھتا رہا۔

"میں اس گاؤں کے زمیندار کا بیٹا ہوں اور تجھکو یہ بتانے آیا ہوں کہ ہمارا گاؤں بے غیرتی برداشت کرنے سے پہلے مرمٹنا جانتا ہے۔" میں نے گڑی ہوئی نظروں کے ساتھ کہا۔

مہاراجہ نے سکون کے انداز میں کہا: "نوجوان! میں تیری دلیری کی داد دیتا ہوں۔"

میں نے جواب دیا: "میں اپنی دلیری کی داد نہیں چاہتا۔ میں تیری بدعنوانی کا جواب چاہتا ہوں۔"

اُس نے کہا: "تم بدعنوانی کس کو کہتے ہو، نوجوان؟"

میں نے کہا: "اِن ننگی تصویروں کو، اس کالی رات کو، تمہارے ناپاک ارادوں کو۔"

وہ بولا: "اور گاؤں کے اِردگرد اندھیرے میں ڈوبے ہوئے ہرے ہرے کھیت!"

میں نے سمجھا مہاراجہ غیر متعلق باتوں سے میرا وقت ضائع کرنا چاہتا ہے۔ میں چپ ہو گیا۔ سوچ رہا تھا کہ مجھ کو اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ فوری حملہ یا کسی زیادہ اچھے موقع کا انتظار۔

اُس نے کہا: "نوجوان! ننگی تصویریں، کالی راتیں، ناپاک ارادے اور گاؤں کے اِردگرد اندھیرے میں ڈوبے ہوئے ہرے ہرے کھیت! یہ سب بدعنوانیاں ہیں؟"

میں طیش میں آگیا: "یہ کیا کہتے ہو تم؟ مہاراج!" میں نے کہا۔

اُس نے جواب دیا: "میں کہتا ہوں، اس دُنیا میں کوئی چیز بدعنوانی نہیں۔"

"پھر ایک نوجوان لڑکی کا آدھی رات کے وقت تمہارے پاس آنا آخر کیا ہے؟" میں نے غصے سے کہا۔

"اور ایک بوڑھے کمزور کسان کا آدھی رات کے وقت اپنے کھیتوں میں جانا آخر کیا ہے؟" اُس نے سکون سے جواب دیا۔

"اگر تم کو بتانے کی ضرورت ہے تو ـــ" لیکن مہاراجہ نے مجھکو دائیں ہاتھ کے اشارے سے چپ کرا دیا۔

اُس نے آہستہ آہستہ میری طرف آتے ہوئے کہا: "میں جانتا ہوں۔" وہ میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا: "نوجوان! وہ کسان کھیتوں میں جاتا ہے زندہ رہنے کے لئے۔ وہ لڑکی میرے پاس آتی ہے زندہ رہنے کے لئے۔ میں اُن کی ننگی تصویریں لیتا ہوں زندہ رہنے کے لئے۔" میں اُس کے گفتگو کے انداز سے کسی قدر مرعوب ہو گیا۔ "یہ سب تجارتیں ہیں۔ دینا اور لینا۔ لینا اور دینا۔ تجارت گناہ نہیں ـــ" اُس نے اپنا دایاں ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا: "ہم سب تجارت کرتے ہیں۔ وہ کسان، اُس لڑکی کو بھیجنے والے۔ ان دیواروں پر یہ ننگی تصویریں۔ تجارت کے اس دور میں لڑکی کی تجارت سب سے زیادہ فائدہ مند ہے ـــ"

اب وہ میرے بالکل نزدیک تھا، اور میں کامیابی کے دروازے پر لیکن اس کی باتیں میرے لئے دلچسپی کا باعث ہوتی جا رہی تھیں۔ میں نے توقف گوارا کر لیا ـــ "لڑکی کی تجارت میں سرمایہ نہیں لگتا۔ منافع میں ہرے ہرے کھیت ملتے ہیں۔"

"ہرے ہرے کھیت!" میں نے تعجب سے کہا۔

وہ جلدی جلدی اُس تصویر کے پاس جا کھڑا ہوا، جس کو میں اُس کے اندر آنے سے پہلے دیکھ رہا تھا۔ اور وہاں سے بولا: "اس گاؤں کے اِردگرد اندھیرے میں ڈوبے ہوئے ہرے ہرے کھیت!"

میں نے کسی قدر غضب آلود حیرت میں پوچھا: "تم میرے باپ کی زمینوں کی طرف اشارہ کر رہے ہو؟"

اُس نے بے پرواہی سے جواب دیا: "مدت ہوئی تمہارے باپ نے تجارت کی تھی۔ اب وہ اس گاؤں کا زمیندار ہے!"

"تمہارا کیا مطلب ہے؟ مہاراج!" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اُس نے فون کی طرف جاتے ہوئے کہا: "دراصل مجھے بھی معلوم نہیں میرا کیا مطلب ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ آج ایک بیٹا ایک باپ سے ایک ماں کا انتقام لینے آیا ہے۔"

"مہاراج!" میری آواز میں شیر کی گرج تھی۔

وہ فون کے پاس پہنچ گیا۔ میرے جذبات کا ہیجان مجھے دیوانگی کی طرف لئے جا رہا تھا۔ میں نے کہا "مہاراجہ! میں تیرے الزام کا ثبوت چاہتا ہوں۔"

اُس نے کہا "یہ تصویر ـــ مجھے اُس تصویر پر ایک نمائش میں پہلا انعام ملا تھا۔"

اُس نے اُسی تصویر کی طرف اشارہ کیا جس کو میں اُس کے اندر آنے سے پہلے دیکھ رہا تھا۔ وہ تصویر مجھے کیوں دلچسپ معلوم ہوتی تھی؟ انکشاف مجھ پر صاعقے کی طرح گرا۔ وہ میری ماں تھی۔ جوانی میں۔ ایسے پوز میں جس کو پہچاننا مشکل تھا۔ میرے اوسان خطا ہوگئے۔ میری آنکھوں میں خون کا طوفان آگیا۔ میرا ہاتھ والہانہ انداز میں چھری پر پڑا۔ میرے پاؤں خوفناک سُرعت سے مہاراجہ کی طرف بھاگے۔ لیکن مجھے مہاراجہ سے دو قدم کے فاصلے پر ٹھہرنا پڑا۔ مہاراجہ کے پاس پستول تھا۔ اُس نے فون پر کچھ کہا۔ چند منٹ کے بعد پولیس موقع پر پہنچ گئی۔

مجھے عمر بھر کیلئے جیل میں پھینک دیا گیا۔

مغربی ملکوں کی سیاحتوں، شیروں کے شکاروں، شراب کے آبشاروں، ناچوں، گانوں اور تھیٹروں کے درمیان مہاراجہ کو اُس خوفناک رات کا خیال بھی نہ رہا جب ایک جوشیلے نوجوان نے اُس پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ وہ سب کچھ بھول گیا۔ وہ رات۔ اس رات کا اندھیرا۔ میری قید، میری قید سے رہائی۔

تقریباً بیس سال کے بعد ایک سہانی صبح کو معلوم ہوا کہ مہاراجہ شکارگاہ میں ایک شیر کے پنجے سے ہلاک ہوگیا۔

نئے مہاراجہ نے اپنی تخت نشینی کی خوشی میں بہت سے قیدیوں کو رہا کیا۔ مجھے بھی۔

باہر آکر مجھے معلوم ہوا کہ میرے اور مہاراجہ کے درمیان جو واقعات پیش آئے تھے، اُن کو دُنیا کے علم میں آنے سے روک دیا گیا۔ میرے والد کی تمام جائداد چھین لی گئی۔ اور وہ افلاس کے عالم میں دنیا چھوڑ کر چلے گئے۔ گاؤں والوں نے مجھے یہ جگہ رہنے کیلئے دے دی۔ میری یہ جگہ! میرے بینگن! میری بھنڈیاں! میرے پھول! اور میں۔"

کسان خاموش ہوگیا۔ حقہ بجھ گیا۔ رات زیادہ بھیانک ہوگئی۔

"اچھا تو یہ ہے تمہاری تیسری اور سب سے لمبی سزا۔" اجنبی نے گہرے سوچ کے انداز میں کہا۔

"ہاں" کسان کی آواز میں شعلے کمزور ہو رہے تھے۔

"اور چوتھی سزا جس کی تم کو تمنا ہے؟"

کسان نے بجھا ہوا حقہ ایک طرف کرتے ہوئے کہا "اجنبی! کیا میں پوچھ سکتا ہوں، تم کون ہو؟"

اجنبی نے جواب دیا "میں ایک سوداگر ہوں۔ مجھے سب سے بڑی تکلیف یہ ہے کہ میرے پاس بے اندازہ روپیہ ہے۔ اتنا کہ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس کو کہاں خرچ کروں۔ ایک تجربہ کار شخص نے مجھے بتایا تھا کہ روپیہ بے رحمی سے خرچ کرنا ہو تو کسی عورت سے عشق کرلو۔ لیکن میں عورت سے عشق کرنے کے اس لئے خلاف ہوں کہ عشق کا نتیجہ شادی ہے۔ فرض کرو کہ میں کسی عورت سے عشق کرکے شادی کرلوں۔ پھر بھی میری مشکل حل نہیں ہوتی۔ ایک عورت کے لئے میرا روپیہ کافی سے زیادہ ہے۔ میں نے ایک دفعہ اندازہ لگایا تھا، میری دولت کم از کم ۸۳! عورتوں کی ذمہ داریاں برداشت کرسکتی ہے۔ لیکن مذہب اور سوسائٹی اتنی شادیوں کی اجازت نہیں دیتے۔ پھر کئی دوستوں نے کہا، چلو ایک ہی شادی کرلو۔ کچھ دولت تو کم ہوگی۔ مجھے دوستوں کا یہ مشورہ پسند نہیں۔ جب خیال آتا ہے کہ میرے وارث کو اتنی بڑی دولت مفت میں ہاتھ آجائے گی، تو میں حسد سے جل مرتا ہوں۔ اور پھر یہ بھی تو ہے نا کہ اُسکو اتنا روپیہ خرچ کرنے کے سلسلے میں انہیں مشکلات کا سامنا ہوگا جو اِس وقت میرے سامنے ہیں۔ اس ملال میں زندگی گذر رہی ہے۔ اس غم کو غلط کرنے کیلئے تمہارے پاس آ بیٹھا ہوں ــــ"

کسان خاموش تھا۔

"پُل بنانا، چاہ بنانا، مسجد بنانا، تالاب بنانا۔ ان میں سے کوئی چیز مجھے مرغوب نہیں۔ یہ میونسپلٹی کے فرائض ہیں۔ ہم میونسپل کمشنروں کے فرائض انجام دے کر اُن کو لوگوں کا روپیہ غصب کرجانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایسے ثواب کے کاموں کے صلے میں ہمیں آخرت میں ۷ ہزار گنا ثواب ملتا ہے۔ لیکن خود مذہب جُوا کھیلنے کی اجازت نہیں دیتا۔ کون جانتا ہے کہ ثواب ملے گا یا نہیں۔ اور پھر میں تو جوا کھیلتے کھیلتے تنگ بھی آگیا ہوں۔ دس سال سے السٹریٹڈ ویکلی کے کراس ورڈ پزل حل کر رہا ہوں۔ اور اس میں کامیابیاں حاصل کر کر کے میرے پاس اتنا روپیہ جمع ہوگیا ہے کہ اب میرے سامنے اس کو خرچ کرنے کا مسئلہ درپیش ہے۔ سوچتا ہوں اگر اسی مقدار میں میرے پاس ثواب جمع ہوگئے تو میں اُن کو کیونکر اُٹھائے اُٹھائے پھرونگا۔"

کسان نے نہایت رازدارانہ لہجہ میں پوچھا "تم موجودہ مہاراجہ کے متعلق کچھ جانتے ہو؟"

"صرف اس قدر جانتا ہوں کہ وہ مہاراجہ ہے۔"

"اندھے جانتے ہیں کہ مہاراجہ اس زمانے کے بدترین جانور ہیں۔"

"ہوں گے"

"آج وہ اس شکار گاہ میں شکار کے لئے آیا ہے۔ اور وہ اپنے باپ کی ننگی تصویروں والے کمرے میں مقیم ہے۔ سنا ہے اُس نے وہ ننگی تصویریں اُتار ڈالی ہیں، شاید اس لئے کہ وہاں اُس کی اپنی لی ہوئی تصویروں کے لئے جگہ نہ تھی۔"

"تو کیا اُس کے لئے بھی کوئی انتظام ہو رہا ہے؟"

"بیشک!"

"کون کرے گا؟"

"میں!"

"تم! — کون جائے گی؟"

"میری بیٹی!"

سوداگر حیرت کی شدت سے چپ ہو گیا۔

کسان نے اپنی بات جاری رکھی "لیکن اس دفعہ چھری نہیں ہوگی، پستول ہوگا۔ باتیں نہیں ہونگی، عمل ہوگا۔ ننگی تصویر نہیں ہوگی، تڑپتی لاش ہوگی۔"

سوداگر چپ ہو گیا۔

کسان نے سونے کے لئے اپنی چٹائی نیچے بچھائی اور اس پر لیٹ گیا۔ سوداگر بھی چارپائی پر دراز ہو گیا۔

سوداگر نے لیٹے لیٹے کہا "لیکن تم کو وقت سے پہلے اپنی اسکیمیں بتانا نہیں دینی چاہئیں۔"

کسان نے بھی لیٹے لیٹے کہا "لیکن جو کچھ ہونا تھا ہو بھی چکا ہوگا۔"

"اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ پھر کیا ہوگا؟"

"پھر کیا ہوگا؟ چوتھی لمبی قید!"

"ہوں!"

خاموشی کا ایک لمبا وقفہ۔

نیند۔

صبح۔

صبح کی پہلی کرنیں اُن کو جگانے میں کامیاب نہ ہوئیں۔ ایک موٹر کے ہارن نے اُن کو جگایا۔

"مہاراج!"

"مہاراج!"

"یور ہائی نس"

"یور ہائی نس"

مغربی کپڑوں میں ملبوس چار آدمی موٹر سے باہر نکلے اور کسان کے باغیچے میں داخل ہو گئے۔

"مہاراج! ہم حضور کو تمام رات ڈھونڈتے رہے ہیں۔"

"توبہ توبہ! حضور نے ساری رات اِس ٹوٹی ہوئی چارپائی پر گذاری۔"

"آخر حضور کو سوجھی کیا؟"

مہاراج نے انتہائی تمکنت سے اُٹھتے ہوئے کہا "اس کسان کو گرفتار کر لو۔"

کسان گرفتار کر لیا گیا۔

"اور جیل میں ڈال دو۔"

کسان نے مہاراج کی طرف دیکھا۔ اُن چار آدمیوں کی طرف دیکھا۔ باغیچے اور بیلوں کی طرف دیکھا۔ اور اندھیرے سے باہر نکلتے ہوئے گاؤں کی طرف دیکھا۔

کار سب کو لیکر چلی گئی۔

بیلوں کے گلوں میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ بینگن کے اُودے پھولوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"انور"

نیویارک کا عالمگیر میلہ

نیویارک کے عالمگیر میلے ([illegible]) کا ذکر تو میں انگلستان میں بھی سن رہی تھی۔ لیکن یہ کبھی خیال بھی نہیں گزرا تھا کہ اسے دیکھنے کا موقع ملے گا۔ لندن ٹائمز اور دوسرے اخبارات میں اس کے متعلق بار بار اعلان چھپ چکے تھے۔ کیونکہ پیرس کی بین الاقوامی نمائش ([illegible]) کی طرح اس میں بھی انگلستان اور دنیا کے اور دوسرے سب آزاد ممالک کی چیزیں نمائش کے لئے بھیجی گئی تھیں۔ البتہ جرمنی شریک نہیں ہوا تھا۔ ہر ایک ملک کی علیحدہ علیحدہ عمارتیں سجائی گئی تھیں۔ خود نیویارک میں اس کی شہرت کچھ کم نہ تھی۔ لونگ آئلینڈ ([illegible]) جہاں یہ میلا ہوا تھا، پہلے بالکل ویران تھا۔ ہزاروں ڈالر کی لاگت سے میلے کی تیاری کی گئی۔ یہاں تک کہ اسکے لئے خاص ریلوں اور بسوں کا بھی انتظام ہوا۔ نیویارک ٹائمز میں ہر روز ایک کالم اسکے روزانہ نظام العمل اور تنقید کے بارے میں شائع ہوتا تھا، اسکے علاوہ اس کا چرچا ملک کے بچے بچے کی زبان پر تھا۔ اور ہر پبلک جگہ پر اسکے متعلق اشتہار چسپاں کئے جاتے تھے۔

کچھ خدا کی قدرت اور میلے کی کشش سمجھئے کہ میرا ایکایک نیویارک جانا قرار پاگیا۔ ہوا یہ کہ جب ڈنکرک سے "واپسی" کے بعد لڑائی کی حالت ذرا نازک ہوئی تو میرے والدین کو میری طرف سے بہت فکر ہوگئی۔ اور میرے والد مولوی غلام یزدانی صاحب نے عالی جناب سر اکبر حیدری نواب صدر اعظم بہادر سے مل کر لندن کے ہائی کمشنر کو یہ تار دلوایا کہ امتحان کے بعد میری واپسی کا انتظام ایسے راستے سے کیا جائے جو سب میں زیادہ محفوظ ہو۔ اس کے بعد نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات نے ازراہ کرم یہ مشورہ دیا کہ مجھ کو امریکہ کے راستے سے واپس بلایا جائے تو بہتر ہوگا۔ نظام گورنمنٹ کی فیاضی اور عالی جناب صدر اعظم بہادر اور نواب مہدی یار جنگ بہادر کی ہمدردی کی میں ہمیشہ شکرگذار رہوں گی۔ جن کی صلاح کی بدولت مجھکو امریکہ کے سفر کا نادر موقع مل گیا۔ اس سفر میں مجھ کو بہت سے سبق آموز تجربے حاصل ہوئے۔

زبانی امتحان[1] کے ختم ہونے کے بعد کالج کی پرنسپل کے ذریعے مجھے یہ اطلاع ملی کہ ہائی کمشنر صاحب میرے لئے جہاز کا انتظام کر رہے ہیں۔ پھر ۲۸ جون کو خبر ملی کہ ۳۰ جون کو مجھے روانہ ہونا ہوگا۔ اور اس تاریخ تک مجھ کو لورپول پہونچ جانا چاہیئے۔ لیکن جہاز کا نام اس وقت بھی نہیں بتایا گیا۔ ۳۰ کو جب میں لورپول پہونچکر بندرگاہ گئی تو معلوم ہوا "کیونارڈ لائن" کے "سمیریا" نامی جہاز میں میرے سفر کا انتظام ہوا ہے۔ راستے میں عجب سنسنی خیز واقعات پیش آئے جن کا قصہ طویل ہے اور کبھی علیحدہ بیان کیا جائے گا۔ لیکن اس واقعہ سے آپ ہمارے دلوں کی کیفیت سمجھ لیجئے کہ دوران سفر میں ایک جہاز کو جو ہمارے جہاز سے ذرا آگے جا رہا تھا جرمنوں نے تارپیڈو سے اڑا دیا اور تین سو کے قریب مسافر ڈوب گئے۔ "کیونارڈ لائن" کے جہاز عام طور سے پانچ روز میں "لورپول" سے نیویارک پہونچ جاتے ہیں، لیکن ہم اللہ اللہ کرکے پورے نو روز میں وہاں پہونچے۔

میں نیویارک میں [illegible] کی عمارت میں جاکر ٹھہری اس وقت [illegible] کے معتمدین کی کانفرنس ہو رہی تھی اسلئے عمارت میں خوب چہل پہل تھی۔ دو تین خواتین سے میرا بھی میل جول اور دوستی ہوگئی اور ان کے ساتھ نیویارک کی خوب سیر کی۔ ایک دن ان میں سے ایک خاتون نے مجھسے پوچھا کہ "کیا کل آپ میرے ساتھ دُنیا کا میلہ دیکھنے چلیں گی؟" اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، میں فوراً راضی ہوگئی۔ دوسرے دن ہم دونوں ناشتے کے بعد نو بجے جانے کے لئے تیار ہوگئے۔ بارش خوب زور کی ہو رہی تھی۔ لیکن یہاں کس کو پروا تھی۔ برساتیاں اور موٹے جوتے پہن کر میلے کے لئے روانہ ہوگئے۔ دروازے سے باہر نکل کر ٹریم میں بیٹھے اور اسٹیشن پہونچے۔ امریکہ میں بعض ریلوں میں جو بجلی سے چلتی ہیں یہ قاعدہ ہے کہ اُن کے لئے ٹکٹ خریدنے کا کوئی خاص دفتر نہیں ہوتا، بلکہ پلیٹ فارم کا دروازہ ہی اس وقت کھلتا ہے جب اس میں دس سینٹ کا سکہ جو ہمارے چھ آنے کے برابر ہوگا، ڈال دیا جائے۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا۔ پلیٹ فارم پر کرنے کے

---

[1] آکسفورڈ یونیورسٹی میں قاعدہ ہے کہ ڈگری حاصل کرنے کے لئے تحریری ([illegible]) امتحان کے ساتھ ساتھ ایک زبانی امتحان بھی دینا ہوتا ہے جو کہ عام طور پر ([illegible]) کہلاتا ہے اور جس کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔

[illegible] لوگ جس مقام کی ریل میں بیٹھنا چاہیں بیٹھ کر منزل مقصود پر پہونچ جاتے ہیں۔ اسان کر یہ یہاں ٹکٹ خریدنے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ لوکل ٹرینوں کا کرایہ مختلف مقامات کیلئے یکساں ہوتا ہے۔ ہم لوگ آئلینڈ کی ریل میں سوار ہوگئے اور آخر دنیا کے میلے میں پہونچ گئے۔

میلے کی تمام نمائشی اشیاء کو اچھی طرح دیکھنے اور اُن کو سمجھنے میں تو شاید ایک مہینے سے زیادہ عرصہ لگ جاتا اس لئے ہم نے پہلے ہی سے پروگرام پر نشان کر لیے تھے کہ کن کن شعبوں کی سیر کریں گے، اور انکے ہی دیکھنے میں سارا دن لگ گیا۔ چنانچہ جب ہم گھر واپس پہونچے تو کوئی رات کے پونے گیارہ بج رہے تھے۔ میلہ کیا تھا سائنس کے کمال کا ایک معجزہ تھا۔ ممالک متحدہ امریکہ نے جس طرح عناصر اور جغرافی حالات پر قابو پانے کی کوشش کی ہے اُس کو نہایت دلپذیر طریقے سے دکھایا گیا تھا۔ مثلاً بہت سی ایسی چیزیں جو ہم ہندوستانیوں کے نزدیک بعید از عقل معلوم ہوتی تھیں۔ میلے میں ان کو عملی صورت میں پیش کیا گیا تھا۔ ان اشیاء سے نہ صرف دولتمند اشخاص بلکہ معمولی طبقے کے لوگ بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔ مثلاً بجلی کے باورچی خانے۔ بجلی کے ذریعے گایوں کا دودھ نکالنے کا انتظام۔ بجلی کے ذریعے انڈے سینے اور بچوں کے نکلنے کا انتظام۔ مختلف کاموں کے لئے بجلی کے مصنوعی آدمی۔ بجلی کے موٹر سازی کے کارخانے۔ ٹیلی وژن کا مظاہرہ۔ گیس کے مختلف کرشمے۔ طرح طرح کے ہوائی جہاز، اور ڈبکنی کشتیاں۔ آئندہ سنین یعنی بیس برس بعد جو رسل و رسائل کے ذریعے ہوں گے اُن کے نمونے۔ امریکن طرز حکومت کی نمایاں خصوصیات اور سب میں دلکش آتشبازی جو پرستان کا نقشہ پیش کرتی تھی۔

یہ صرف چند شعبے تھے جو ہم سرسری طور پر دیکھ سکے۔ لیکن میلے میں انکے علاوہ ہزارہا تماشے اور دلچسپی کے سامان تھے جن کو دیکھنے کیلئے ہمارا دل چاہتا تھا لیکن وقت کی تنگی کی وجہ سے نہ دیکھ سکے۔ نمائش کو دیکھکر جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ ممالک متحدہ امریکہ کے رہنے والوں کو ایک آزاد قوم بنے ہوئے ایک سو پچاس سال ہوئے ہیں اور پھر اس بات کو سوچتے ہیں کہ اس عرصے میں امریکہ نے کلوں اور سائنس کی ایجادات میں ایسی ترقی کی ہے کہ دنیا کا کوئی ملک اور کوئی قوم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تو ہمارے دل میں خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس ترقی کے کیا اسباب ہیں۔

امریکہ کی تاریخ میرا خاص مضمون نہیں۔ لیکن میں اپنی ناچیز رائے کو اس ترقی کے بارے میں ظاہر کروں گی اور یہ بھی عرض کروں گی کہ آیا ہم ہندوستانی بھائی اور بہنیں بھی امریکہ والوں سے اس بارے میں کچھ سبق لے سکتے ہیں یا نہیں۔ لیکن پہلے ان چیزوں کے متعلق جو ہم نے دیکھیں کچھ تفصیل سنئے۔

پہلے بجلی کے باورچی خانوں کو لیجئے۔ ان باورچی خانوں کو دیکھ کر بے اختیار زبان سے نکل جاتا تھا کہ اے کاش ہمارے پاس بھی ایسے باورچی خانے ہوتے۔ میں مبالغہ نہیں کرتی حقیقت بیان کرتی ہوں کہ ہمارے ہندوستان میں تو اکثر متوسط خاندانوں کے رہنے کے کمرے بھی اتنے صاف ستھرے اور خوبصورت نہیں ہوتے جتنے کہ یہ باورچی خانے تھے۔ اور سامان کی ترتیب میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ گھر والی بیوی کو مختلف چیزوں کے نکالنے میں کسی قسم کی دقت نہ ہو۔ کھانا پکانے میں جتنا وقت صرف ہونا چاہیئے اس سے زیادہ صرف نہ ہو اور وہ دنیا کے اور کاموں میں بھی حصہ لے سکے۔ چنانچہ پکانے کے چولہے (Electric - Ranges) اور دھونے کے حوض (Electric - Sinks) اور اشیاء کو ٹھنڈا رکھنے کی الماری (Refrigerator) کو پاس پاس نہایت خوبصورتی سے نصب کیا تھا۔ ان کے اوپر دیوار میں فولادی الماریاں مسالوں اور باورچی خانے کے اور سامان اور ظروف رکھنے کے لئے لگی ہوئی تھیں۔ بجلی کے چولھوں کے متعلق ہم میں سے بعض بہنوں کا خیال ہے کہ جو کھانے دھیمی آنچ پر مزیدار پک سکتے ہیں وہ کبھی بجلی کی آنچ پر اچھے نہیں پک سکتے ہیں۔ یہ خیال سراسر غلط ہے۔ کیونکہ ان چولھوں میں آگ کو تیز، دھیما اور متوسط درجے کا جیسا بھی ہم چاہیں کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ دھوئیں، کالک اور ہر ایک عیب سے پاک ہیں اور گنجائش ایسی ہے کہ ایک ہی وقت میں کئی کئی وضع کے کھانے تیار ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان باورچی خانوں میں سب سے آرام دہ چیز دھونے کے حوض (Sinks) تھے۔ یہ حوض مونل (Monel) کے بنے ہوتے تھے، جو ایک خاص قسم کی دھات ہوتی ہے۔ یہ بہت مضبوط ہوتی ہے اور اس میں ٹوٹ پھوٹ کا کوئی جھگڑا نہیں ہوتا اور نہ اس پر گرمی کا اثر ہوتا ہے۔ نہ ترشی اور کھار کا۔ اس کے علاوہ یہ صاف بھی بہت آسانی سے رکھی جا سکتی ہے۔ اس لئے نیویارک کے بڑے ہوٹلوں میں برتن دھونے کے حوض اسی کے بنے ہوئے ہیں۔ یہ حوض عام طور سے (Cabinet) شسندرے کی شکل کے ہوتے ہیں۔ اور ان میں مختلف چیزوں کے رکھنے کے لئے خانے بنے ہوتے ہیں۔ جن سے بہت آرام ملتا ہے۔ بعض حوضوں میں برتنوں کے دھونے کا ایک آلہ نصب

ہوتا ہے کہ برتن دھونے اور پونچھنے کی ہاتھ سے بالکل ضرورت نہیں ہوتی۔ کھانے میں جو برتن استعمال کئے جاتے ہیں ان سب کو ایک کشتی میں جما کر برتن صاف کرنے کے آلے میں رکھ دیتے ہیں، جو اوپر سے چوکور فولاد کی ڈبے کی شکل کا ہوتا ہے۔ اور بجلی کا کھٹکا کھول کر خود اطمینان سے بیٹھ جاتے ہیں۔ تین چار منٹ میں سب برتن جب خود بخود دھل کر صاف ہو جاتے ہیں تو گھنٹے کی سی آواز ہوتی ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اب برتن صاف ہو گئے ہیں۔ اس وقت گھر والی بیوی برتن آلے میں سے نکالکر باورچی خانے کی الماری میں چن دیتی ہے۔

بجلی کے ذریعہ چیزوں کو سرد رکھنے کے آلوں (Refrigerators) سے تو ہماری ہندوستانی بہنیں واقف ہیں۔ ان میں بھی مختلف چیزوں کیلئے مختلف درجے کی ٹھنڈک کا انتظام ہوتا ہے۔ مثلاً گوشت کیلئے علیحدہ میوے کیلئے علیحدہ اور آئسکریم اور برف کے لئے علیحدہ۔

اسکے علاوہ ہر ایک باورچی خانے میں بجلی کے ذریعے ہوا پہنچانے اور صاف رکھنے کا آلہ لگا ہوا ہوتا ہے جس کی وجہ سے باورچی خانے میں ٹھنڈک ہی نہیں رہتی بلکہ کھانوں کی وجہ سے جو ایک خاص قسم کی بُو پیدا ہو جاتی ہے وہ بھی رفع ہو جاتی ہے۔ اس آلہ کے لئے بھی کھٹکا ہوتا ہے۔ گھر والی بیوی جب کھانا پکانے کے لئے باورچی خانے میں آتی ہے تو اس کھٹکے کو کھول دیتی ہے اور تازی صاف ہوا باورچی خانے میں آنے لگتی ہے۔

بعض باورچی خانے کے اندر ہی ایک طرف کپڑوں کے دھونے کا انتظام ہوتا ہے۔ یہ کام بھی بجلی کے ذریعے ہوتا ہے۔ مثلاً کپڑوں کے دھونے نچوڑنے، سکھانے اور استری کرنے کے لئے بجلی کے آلے نصب ہوتے ہیں۔ اور جو کام کہ ہمارے ہاں کی دھوبنیں بچاریاں دنوں میں کرتی ہیں وہ ان بجلی کی کلوں کے ذریعے منٹوں میں ہو جاتے ہیں۔ سچ ہے سائنس بھی معجزہ ہے۔

بجلی کے باورچی خانوں کی طرح بجلی کے ذریعے دودھ نکالنے کے انتظامات (Dairy Farms) بھی نہایت دلچسپ تھے۔ انکی مثال کیلئے ایک گول وضع کی عمارت تیار کی گئی تھی۔ جہاں گائے کو دودھ نچوڑنے کے لئے اسکے پہلے تھنوں میں بجلی کے آلے لگا دیتے تھے۔ دودھ نکل نکل کر نلی کے ذریعے ایک شیشے میں جمع ہونا شروع ہو جاتا تھا۔ اس شیشے پر سیاہی سے وزن کے نشانات بنے ہوئے تھے جن سے معلوم ہو جاتا تھا کہ ہر ایک گائے نے کتنا دودھ دیا۔ شیشے میں دودھ کا وزن معلوم ہو جانے کے بعد نلی کے ذریعے وہ ایک اور شیشے میں چلا جاتا تھا۔ جہاں اُسے جراثیم کے اثر سے پاک کیا جاتا تھا۔ تاکہ لوگوں میں دودھ کی خرابی کی وجہ سے کسی قسم کی بیماری نہ پھیلے۔ اے کاش ہمارے ملک میں بھی اس کا عام طور سے رواج ہو جائے۔ کیونکہ خبر نہیں کتنے لوگ دودھ کی خرابی کی وجہ سے ہر سال ٹائفائڈ میں مبتلا ہوتے ہیں — صاف ہونے کے بعد دودھ پھر نلیوں کے ذریعے سے بوتلوں اور بڑے ظروف میں بھرا جاتا ہے۔ جہاں سے ان پر مہریں لگا کر موٹروں میں خریداروں کے گھر بھیجدیا جاتا تھا۔ اس طرح مسکہ اور بالائی نکالنے کا انتظام بھی بجلی کے ذریعے سے دکھایا گیا تھا۔ اس عمل سے نہ صرف وقت بچتا ہی بلکہ کسی قسم کی ملاوٹ اور دغا کا بھی امکان نہیں رہتا۔

اس کے بعد ہم مرغبانی کے شعبے میں گئے۔ یہاں بھی بجلی کا ہی انتظام تھا اور جو آلات نصب تھے اُن سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ امریکہ والے کس طرح قدرت پر قابو پانا چاہتے ہیں۔ اِس شعبے میں دکھایا گیا کہ مرغی کے انڈوں پر بیٹھے بغیر بجلی کے ذریعے ایک خاص درجے کی حرارت پہونچا کر کس طرح خود بخود انڈوں سے بچے نکل آتے ہیں۔

اسی طرح بجلی کا مصنوعی آدمی تھا جس کو دیکھکر حیرت ہوتی تھی۔ یہ دھات کا بنا ہوا تھا۔ قد تقریباً پانچ فٹ کا ہوگا۔ یہ مصنوعی آدمی گھر کے چھوٹے موٹے کام کر سکتا ہے۔ مثلاً دروازہ بند کرنا۔ چائے کی کشتی لانا۔ لوگوں کو سگرٹ پیش کرنا، حتیٰ کہ خود بھی سگرٹ پی لینا۔ اور جب ان کے منہ سے دُھواں نکلتا ہے تو عجیب لطف آتا ہے۔ آپ بولتے اور گاتے بھی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ہم سب کا، جو آن کا تماشہ دیکھنے کے لئے جمع ہوئے تھے، اِن الفاظ میں شکریہ ادا کیا کہ "آپ نے مجھے دیکھنے کی جو تکلیف گوارا فرمائی ہے اس سے بہت ہمّت افزائی ہوئی۔ فدوی کا نام (Electro) یعنی بجلی کا پتلا ہے" بعد اس شکریہ کے ہم کو (Ding Dong Bell) گا کر سنایا۔ جو پتلے کے منہ سے ذرا مصنوعی معلوم ہوتا تھا اور آواز بھی ذرا کرخت تھی۔

ابھی تک (Electro) میں ایک کمی باقی ہے۔ وہ یہ کہ وہ خود کوئی کام نہیں کر سکتا۔ بلکہ ریڈیو کی طرح اُس کو بھی ایک آدمی کی ضرورت ہے جو اُسے چلاتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے امریکہ میں ابھی تک عام طور سے اس کا رواج نہیں ہو سکا۔ ہاں یہ تو میں بتانا بھول گئی کہ (Electro) ہنستے بھی ہیں۔

بجلی کے ذریعے سے موٹر سازی کا منظر بھی [illegible] نہ تھا۔ اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ موٹر کے مختلف پرزے کس طرح [illegible] سے بنتے ہیں۔ اور آخر میں وہ سب کس طرح بجلی کے ذریعے [illegible]

[illegible] صنعت میں لگ آئے گئے ہیں۔

اب تک آپ بجلی کے مختلف کرشموں کا حال سن رہے تھے، اب ذرا آپ ٹیلی وژن ([illegible]) کا بھی کچھ حال سنیئے۔ یہ مظاہرہ ([illegible]) کی طرف سے ہوا تھا جو ممالک متحدہ امریکہ کا ایک مشہور برقی ادارہ ہے۔ ایک کمرے میں اندر بہت زبردست لاسلکی آلات نصب کئے گئے تھے۔ اور باہر دیوار میں پندرہ بیس ٹیلیفون لگے ہوئے تھے۔ سننے کے آلے کو جب کان سے لگایا جاتا تھا تو کمرے کے اندر جو بات چیت ہو رہی تھی وہ سنائی دیتی تھی اور جو آدمی بات کرتا تھا اُس کی تصویر بھی دیوار پر دکھائی دیتی تھی۔ مجھے بھی بات چیت کرنے کا شوق ہوا لیکن اندر کمرے میں ہر ایک کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی جس کو مظاہرہ کرنے والا چاہتا تھا اندر بلا لیتا تھا۔ مگر میرے شوق کو دیکھ کر میری دوست لاسلکی کے ماہر سے ملنے گئیں اور کہا کہ میں بہت ممنون ہونگی اگر آپ میری دوست کو بھی بات چیت کا موقع دیں گے۔ اُس نے بہت خوشی سے مجھے اندر بلا لیا۔ جب میں اندر پہونچی تو اُس نے مجھے لاسلکی کے آلات سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا کر دیا اور خود مقابل میں کھڑے ہو کر مجھ سے مختلف سوالات کئے۔ مثلاً آپ کہاں سے آرہی ہیں آپ کا سفر کیسا گذرا وغیرہ وغیرہ۔ جس کا میں جواب دیتی رہی۔ وقت ختم ہونے پر اُس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ اور مجھے تحفے کے طور پر لاسلکی کی تصویر کے مظاہرے کا ایک کارڈ ([illegible]) پیش کیا۔ وہاں اُس کمرے میں گرمی بڑے غضب کی تھی۔ باہر آنے پر میں اپنے دوست کے سر ہوئی کہ اب آپ جائیے لیکن وہ اس بات پر راضی نہیں ہوئیں جس کا مجھے افسوس رہ گیا۔

اس کے بعد ہم ان رسل و رسائل کے طریقوں کو دیکھنے پہنچے جس کے جاری ہونے کا آئندہ بیس سال میں امکان ہے۔ لیکن اس سے قبل کہ ان کو بیان کیا جائے میں ممالک متحدہ امریکہ کے موجودہ رسل و رسائل کے بارے میں کچھ عرض کرونگی۔ وہاں فی الحال بھی رسل و رسائل کے ذریعے اتنے وسیع ہیں کہ دنیا کا اور کوئی ملک ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر اس ملک میں اتنی موٹریں اور ٹرکیں ہیں کہ دنیا کے کسی اور خطے میں نہیں پائی جاتیں۔ اس کا ظاہری ثبوت اس بات سے [illegible] کہ لوگوں کو اگر مکانات کی چار پانچ قطاروں کے پرے بھی جانا [illegible] ہو تو سواری میں جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ممالک متحدہ امریکہ [illegible] زیادہ پیدل چلنے کے عادی نہیں ہوتے۔ برخلاف اس کے انگلستان کے لوگ بہت پیدل پھرتے ہیں خصوصاً وہ لوگ جو [illegible] یا دیہات میں رہتے ہیں۔ موٹروں اور ٹرکوں کے علاوہ امریکہ میں زمین کے نیچے چلنے والی ریلیں بھی ہیں جو زیادہ تر بجلی سے چلتی ہیں۔ اسکے علاوہ زمین کی سطح سے سینکڑوں فٹ اوپر جانے کیلئے جھولوں کا بھی انتظام ہے۔ یہ جھولے بجلی سے چلتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض خود بخود بلا کسی آدمی کی مدد کے جاتے ہیں اور بعض کے چلانے کے لئے آدمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہت سے ایسے مقامات پر جہاں ٹریم یا ریل دھر اوپر تک چڑھائی کی زیادتی کی وجہ سے نہیں پہونچ سکتی وہاں جھولوں سے کام لیا گیا ہے۔ یہ تو صرف وہ ذرائع ہیں جو ایک ہی شہر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کیلئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ مگر امریکہ کی بر اعظمی ریلیں بھی نہایت اعلیٰ درجے کی ہیں۔ ان کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے۔ چنانچہ نیویارک سے بعض ٹرینیں فرانسیسکو کو چار پانچ روز میں پہونچا دیتی ہیں۔ ان کے انجن بھی بڑے زبردست ہوتے ہیں۔ اور اونچی سے اونچی چڑھائیاں اُن کے آگے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ ہم جب ([illegible]) (پہاڑی قطعات) میں سے گذر رہے تھے تو بعض بعض مقامات سمندر کی سطح سے دس ہزار فٹ بلند تھے۔ مگر ان ریلوں میں کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اسکے علاوہ ان ریلوں میں مسافروں کے آرام اور آسائش کا بھی بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ فرسٹ کلاس کے ہر مسافر کے لئے ایک کمرہ ہوتا ہے، جس میں تہ ہوتی ہوئی دو نشستیں ہوتی ہیں، جو رات کو ایک بہت آرام دہ مسہری کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ ہر دس مسافروں کی خدمت کیلئے ایک ([illegible]) ملازم ہوتا ہے۔ اکثر ریلوں میں خادمہ بھی ہوتی ہے جس کا فرض یہ ہوتا ہے کہ مسافروں کو اگر کسی قسم کی تکلیف یا شکایت ہو تو اس کو رفع کرنے کی کوشش کرے۔ ان ریلوں کے آخر میں نظارہ دیکھنے کے لئے علیحدہ ایک گاڑی بھی لگی ہوتی ہے۔ جہاں سے مسافر بیٹھکر منظر کا لطف اُٹھاتے ہیں۔

ریلیں تو ریلیں امریکہ کی بحری اور ہوائی قوت بھی غیر معمولی ہے۔ یہ آپ سب کو معلوم ہے کہ آجکل برطانیہ کی جیت کی ساری امید امریکہ سے ہوائی جہاز اور لڑائی کے سامان کے کافی مقدار میں ملنے پر ہے۔ جس کے لئے امریکہ کے سمندری بیڑے کی مدد کو ضروری سمجھا گیا ہے۔ وقت کی تنگی کی وجہ سے اس موضوع پر کچھ نہیں [illegible] اور یہ مضمون دنیا کے میلے سے متعلق ہے۔ [illegible] کی نمائش میں ذرائع کو زیادہ ترقی دیکھ [illegible]

[illegible] عمارت میں داخل ہوتے اور لفٹ کے زینے کے ذریعے بالا خانہ پر پہنچے اور کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے جہاں ہم سے کہا گیا کہ خوب پیچھے لگ کر بیٹھو تاکہ اچھی طرح دیکھ سکو۔ پھر سیڑھیاں بجلی کے ذریعے آہستہ آہستہ سرک رہی تھیں، تاکہ تماشائی کو پورا تماشہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہی اچھی طرح سے نظر آجائے۔ سب میں پہلے تو یہ دکھایا گیا کہ ۱۹۶۰ء میں ممالک متحدہ امریکہ کے ہر حصے میں شمال سے لیکر جنوب تک اور مشرق سے لیکر مغرب تک سڑکیں اس قدر چوڑی ہو جائیں گی کہ بیسیوں موٹروں کی قطاریں ایک ہی وقت میں سڑکوں پر آ اور جا سکیں گی۔ اور کبھی کسی قسم کی رکاوٹ سڑک کی تنگی کی وجہ سے نہ ہوا کرے گی۔ اس کے علاوہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہوائی اڈے قائم ہونگے اور آمد و رفت اور سفر کے لئے ہوائی جہاز، موٹروں اور ریلوں کی طرح عام ہو جائیں گے۔ بلکہ بہت سے آدمیوں کے پاس تو کچھ ایسے پر ہونگے جن سے وہ جہاں چاہیں گے اڑ سکیں گے۔ اس طرح دنیا کے مختلف ممالک کا سفر بالکل آسان ہو جائے گا۔ اسی طرح یہ دکھایا گیا کہ ٹیلیفون کے سلسلے بھی اسقدر وسیع ہو جائیں گے کہ دنیا کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں بات کرنا بالکل ایک معمولی بات ہو جائے گی۔ اور بہت سی ایسی باتیں جو اسوقت تو خیالی معلوم ہوتی ہیں لیکن امریکہ والوں سے کچھ بعید نہیں کہ وہ انکو بیس سال کے اندر ہی عملی جامہ پہنا دیں۔

نو بجے کے قریب ہم آتشبازی دیکھنے پہونچے۔ یہ خلیج اقوام (Lagoon of Nations) میں کی گئی تھی۔ نہر کے ایک طرف تو دنیا کے میلے کا نقشہ تھا۔ جس میں دنیا کو ایک عظیم الشان گنبد کی صورت میں دکھایا گیا تھا۔ اور نیویارک کے شہر کو ایک مخروطی شکل میں پیش کیا گیا تھا۔ نہر کی دوسری طرف قد آدم مجسمے تھے۔ ان میں سے ایک (Freedom of religion or Conscience) مذہب اور ضمیر کی آزادی تھا۔ دوسرا (Freedom of Press.) [illegible] (Freedom of Speech) بات چیت اور مباحثہ کے لئے کامل آزادی کا۔ تیسرا (Freedom of Public meeting.) لوگوں کے بحث و مباحثے اور تقریر کی غرض سے جمع ہونے کی آزادی کا۔ اور چوتھے (Freedom of Body.) کامل جسمانی آزادی کا۔

یہ اپنی کہانی آپ کہہ رہے تھے۔ ٹھیک سوا نو بجے آتشبازی شروع ہوئی۔ اس کی سرخی تھی "[illegible]" جو امریکہ کا ایک مشہور قومی گیت ہے۔ اس آتشبازی میں پانی، رنگ، آگ اور موسیقی نے مل کر ایک پرستانی منظر پیدا کر دیا تھا۔ منظر کا سلسلہ آسمان تک پہنچا تھا اور آتشبازی کے ختم ہونیکے بعد بھی کئی سکنڈ تک آسمان پر طرح طرح کے رنگوں کا فوارہ رہتا تھا۔ "[illegible]" کے گیت کے ختم ہونے کا مطلب آتشبازی سے بتدریج سمجھایا جا رہا تھا جو باجے کے اثر کو دوبالا کرتا تھا۔ جب آتشبازی کی روشنی قد آدم مجسموں پر پڑتی تھی جو امریکہ کی آزادی کے نگہبان تھے تو جیسا کہ انسان حقیقت کے انکشاف کے بعد خواب غفلت سے گھبرا کر بیدار ہو جاتا ہے ویسے ہی ہر ایک دیکھنے والے کے چہرے پر ایک حیرت سی معلوم ہوتی تھی گویا اسے ظاہر ہو رہا تھا کہ امریکہ کی ترقی اور عروج کا راز اس آزادی میں پنہاں ہے۔

حقیقت میں یہ آزادی کا ہی میلا تھا جس نے ان آزادی کے سپوتوں کو مادر وطن یعنی انگلستان اور یورپ کے دوسرے ممالک کو خیرباد کہنے پر مجبور کیا۔ اور ایک نئی دنیا میں جسکے حالات سے وہ زیادہ واقف نہ تھے رسا بسا دیا بعد ازاں آزادی کا ہی جوش تھا جس نے انکو انگلستان کے خلاف ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا اور اسوقت تک چین سے نہ بیٹھنے دیا جبتک آزادی کا جھنڈا انکے ملک پر نہ لہرانے لگا، اور دنیا نے ان کو آزاد قوم تسلیم نہ کر لیا۔ اس آزادی اور خود اعتمادی کا ہی نتیجہ تھا جس نے انکو سائنس کی دنیا میں ایسا پیش پیش کر دیا کہ دنیا کی ہر قوم تحقیق اور ایجادات میں انکے مقابلے میں کم ہوتے ہوئے شرمانے لگی۔ سچ ہے ہر ملک اور ہر قوم کے عروج اور ترقی کے لئے کامل آزادی کا ہونا ضروری ہے۔ وہ ملک اور قوم بھلا سائنس میں کیا ترقی کر سکتی ہے جہاں ([illegible]) ذاتی رائے بالکل مفقود ہو۔ جہاں ہر چیز تقلید پر منحصر ہو۔ جہاں ہر وقت یہ خیال لگا رہتا ہو کہ منہ سے کوئی بات ایسی نہ نکل جائے یا کوئی حرکت ایسی سرزد نہ ہو جائے جو کسی کے ناگوار خاطر گذرے۔ حالانکہ وہ بات یا وہ حرکت بالکل راہ حق پر ہی کیوں نہ ہو۔ میرا مطلب انفرادیت اور کامل آزادی سے ہرگز یہ نہیں کہ لوگوں کو حکومت کے خلاف ستیہ گرہ کرنے کی اجازت ہو۔ یا وہ کوئی بات یا حرکت ایسی کریں جس سے پبلک پر برا اثر پڑے۔ یا جس سے کسی فرد یا جماعت کو نقصان پہونچے۔ بلکہ میں اپنے ملک کے لئے وہ سچی آزادی دیکھنا چاہتی ہوں جس کا مہیا کرنا ہر حکومت کا فرض اولیں ہے اور جس کے بغیر انسان کامل انسان نہیں بن سکتا۔ امریکہ والوں کی ترقی کا راز اسی آزادی میں پوشیدہ ہے۔ اگر ہم ہندوستانی بھائی اور بہنیں چاہیں تو ہم بھی امریکہ والوں کی طرح اپنے ملک کے لئے اس سچی آزادی کو حاصل کر سکتے ہیں۔

ہمت مرداں مدد خدا۔

زبیدہ یزدانی۔ بی۔ اے، آنرز، [illegible]

زندہ در گور

میرے پھوپا جان کو وسط ہند میں جنگلات کا ٹھیکہ لیتے ایک زمانہ گذر گیا۔ اس وجہ سے گویا وہیں کے ہو رہے، دلی تو بالکل چھوڑ ہی دی۔ کنبے کی کتنی ہی تقریبیں نکل جاتی ہیں، انہیں شرکت کا موقع نہیں ملتا۔ برسوں میں کبھی کبھار اس طرف بھول پڑے تو بھول پڑے، ورنہ سہاگ پور میں بنگلہ بنالیا ہے سامنے وہیں رہتے سہتے ہیں، اس بنگلے سے کوئی سات ساڑھے سات میل موضع "صحرا" میں اُن کا ایک بہت بڑا گودام ہے۔

میں خود پھوپا جان کے پاس جاچکا ہوں۔ "صحرا" بہت پُر فضا مقام ہے، وسط ہند میں کہیں کہیں ہی کچھ غنیمت قطعے آگئے ہیں، ورنہ بھلا اُدھر ایسے دلکش مرغزار کہاں، کہ انسان دنگ رہ جائے اور وہاں سے ہٹنے کو جی نہ چاہے۔

"صحرا" کا نظارہ کیا بیان کروں، قطار در قطار اونچے اونچے درخت، جا بجا گنجان جھاڑیاں، ہر سمت ملائم ملائم دوب بچھی ہوئی، نرسلوں سرپتوں کے جھرمٹ میں "مان سرودر" کا سا نمونہ ایک صاف ستھرا تالاب، جس کی تہ کے سنگریزے آنکھوں میں کھُبے جاتے ہیں۔ جیسے کسی نے ایک چاندی کے تھال میں زنگا رنگ جواہرات چُن دئے ہوں، سطح آب پر درختوں کا سایہ اور سبزی بھری کنجوں کا عکس اس جنت ارضی کی پُر کیف رنگینیوں کو چار چاند لگا رہا ہے۔ آسمان اور بادل جھلکتے ہوئے پانی پر مچھلیاں پلٹے کھاتی ہیں تو یہ مزا آتا ہے جیسے متواتر بجلیاں لوٹتی پھرتی ہوں، خیال کیجئے قدرت کی ایسی فردوس نظر طلسم کاری دیکھ کر کہاں تک دل بے قابو نہ ہو، اور کیوں نہ ہو انسان مبہوت ہوکر رہ جائے۔

اس تالاب کے متعلق کچھ ایسی روایات بھی مشہور ہیں کہ یہاں جنات کی فوج اترا کرتی ہے، بارہا ٹھیکم ٹھیک دوپہر میں پریاں نہاتی نظر آتیں، اور اکثر آدھی رات کے وقت ناچ گانے کی آوازیں بھی سنائی دیا کرتی ہیں، اُدھر کا آدمی تو ذرا مشکل سے پھنستا ہے، البتہ اِکا دُکا پردیسی کا اللہ بیلی۔ چنانچہ وہیں کے لوگ کہتے ہیں کہ کبھی کوئی بھولا بھٹکا مسافر اس طرف جا نکلا تو بیچارہ واپس نہ آیا۔ کتنی ہی بار اس تالاب کے آس پاس ایک آدھ لاش بھی پڑی مل جاتی ہے۔

۲

غرض اس تالاب کے متعلق ایسے ہی عجیب غریب قصے مشہور تھے۔ جن کی نسبت میں کوئی رائے نہیں دے سکتا، کہ کہاں تک صحیح یا غلط ہیں، البتہ خاص میرے خاندان میں ایک حادثہ ضرور گذرا جو میں نے اپنی پھوپی اماں سے سُنا ہے۔ وہ فرماتی تھیں: "بیٹا! تیری پیدائش سے پہلے کا ذکر ہے، ایک دفعہ تیرے دادا جان تیرے تایا میاں کو سہاگ پور لائے تھے تو ہم لوگوں کو بڑی خوشی ہوئی تھی کہ شکر ہے مدتوں بعد ساتھ خیر کے ملے، دو چار روز یہاں پھر کر وہ دونوں تیرے پھوپا جان کے ساتھ گودام دیکھنے صحرا گئے۔ وہاں تیرے تایا میاں روزانہ صبح ہی صبح تالاب پر جاتے اور نہا دھو کر ناشتے کے وقت گودام کو پلٹ آتے تھے۔

ایک دن بڑی دیر ہوگئی، تیرے تایا میاں واپس نہ آئے۔ انہیں بُلانے آدمی بھیجے تو وہ اُن کو نہ ملے۔ اب تو فکر ہوئی، کیا ہوا کہاں چلے گئے۔ تیرے دادا جان اور پھوپا جان تلاش کرنے نکلے۔ تمام میں ڈھونڈتے پھرے چپہ چپہ چھان مارا، دن ڈھل گیا، انکا سراغ نہ چلا۔

اسی جستجو میں دو روز گذر گئے، تیسرے دن تڑکے ہی کسی نے خبر دی، کہ لیجئے وہ تالاب کے کنارے نرسلوں کی کنج میں پڑے ہوئے ہیں! فوراً تیرے دادا جان اور پھوپا جان دس پانچ آدمی لیکر دوڑے واقعی وہ ایک کنج میں پڑے ملے۔ اُن کے کپڑے پانی میں بھیگے ہوئے تھے، جیسے تالاب میں ڈبکی لگا کر ابھی ابھی لیٹ گئے ہوں۔ ڈوبے ہوئے آدمی کی طرح اُن کا پیٹ پھولا ہوا نہ تھا۔ چہرے پر وہی رونق، ہاتھ پاؤں نرم، لیکن سانس بند۔ دل کی دھڑکن کا پتہ نہیں اور نبض بالکل ٹھہری ہوئی۔ سب نے زور زور سے آوازیں دیں، بہتیرا جھنجوڑا، اُنہوں نے سانس نہ لی۔ آخر ہاتھوں پر اُٹھا کر انہیں گودام لائے پلنگ پر لٹایا، اور فوراً ڈاکٹر صاحب کے واسطے ہوشنگ آباد سوار کا روانہ کی۔ چند گھنٹے میں ڈاکٹر صاحب تشریف لائے ابھی تک جسم اُسی طرح نرم تھا۔ مگر سانس، دل کی دھڑکن، نبض وغیرہ بدستور بند۔ ڈاکٹر صاحب نے آلہ لگا کر دیکھا، ہاتھ پاؤں پکڑ پکڑ کر جھٹکے دئے مگر حالت درست نہ ہوئی۔ مجبور ہو کر ڈاکٹر نے کہہ دیا "بس صبر کیجئے! روح قالب چھوڑ چکی!!"

۳

اب کیا ہو سکتا تھا، نہلا دُھلا کر انہیں وہیں جنگل میں دفن کر دیا اور تیرے پھوپا جان نے ایک حافظ صاحب کو مقرر کیا کہ سات رات قبر پر جا کر قرآن خوانی کیا کریں۔

اُسی رات کھانا کھا کر حافظ صاحب تیرے تایا میاں کی قبر پر گئے۔ چراغ وراغ روشن کیا اور تلاوت کرنے لگے۔ وہ ایک ہی رکوع پڑھے ہونگے کہ ایک شیر کی دھاڑ سُنائی دی اور لمحہ بہ لمحہ وہ گرج نزدیک آتی گئی۔ یہانتک کہ بالکل ہی قریب آگئی۔ حافظ صاحب تھو کہ جلدی سے ایک درخت پر جا بیٹھے۔ انہوں نے دیکھا کہ شیر کچھ اِس قدر دردناک انداز سے دھاڑتا ہے جیسے کوئی شخص اپنے کسی عزیز کی موت پر بیقرار ہو ہو کر چیخیں مارے۔ بڑی دیر تک بچارا زور زور سے دھاڑیں مارتا تیرے تایا میاں کی قبر کے گرد پھرتا اور زمین پر لوٹتا رہا۔ پھر گردن ڈالے "ہاؤ ہاؤ" کرتا آہیں بھرتا جنگل کو چلا گیا۔

وہ حافظ صاحب اسی نواح کے باشندے اور ایک نیر انسان تھے۔ شیر کی روانگی کے بعد دو ایک منٹ ٹھہر کر درخت سے اُترے اور باقاعدہ تلاوت قرآن کر کے پلٹ آئے۔

تین رات لگاتار یہ سلسلہ جاری رہا کہ شیر آتا، شور و شیون کرتا اور لوٹ پوٹ کر چلا جاتا تھا۔ چوتھی رات سے نہ آیا، یہاں تک کہ سات راتیں پوری ہوگئیں، آٹھویں روز صبح ختم فاتحہ و نیاز نذر کر کے تیری دادا جان اور پھوپا سہاگ پور چلے آئے۔

اسکے دوسرے روز تیرے دادا جان کے کوئی پُرانے دوست نہ جانے کہاں سے تشریف لے آئے۔ سب کی خیر، خیر و عافیت کے سلسلے میں انہوں نے تیرے تایا میاں کی خیریت بھی پوچھی۔ ان کی حیرت انگیز موت کا حال سُنکر انہوں نے سینہ پیٹ لیا اور سر پکڑ کر رہ گئے۔

(۴)

کچھ دیر خاموشی رہی، پھر اُن صاحب نے کہا: "اُف! غضب ہو گیا۔ میاں عبدالجلیل زندہ دفنا دیے گئے، آہ!"

"ارے! یہ کیا فرمایا آپ نے.... زندہ دفنا دیے گئے" تیرے دادا جان اور پھوپا کی زبان سے نکلا۔

"جی ہاں! زندہ تو دفنا ہی دیے گئے، افسوس! آپ نے انہیں زندہ درگور کر دیا، میں یقین سے کہہ سکتا ہوں بالکل یقین سے!!"

"کس بنا پر؟" دونوں نے پوچھا۔

بولے "کس بنا پر؟ جناب من! بعض تالاب کچھ ایسے ہی پُراسرار ہوتے ہیں، جن کا بھید سمجھ میں نہیں آتا۔ چنانچہ ہماری طرف بھی اس قسم کا ایک تالاب ہے جس کے متعلق عجیب و غریب قصے سنے جاتے تھے۔ مگر وہ مقام ہے بڑا نظر فریب اور دلکش۔ میں نے اُن قصوں پر کبھی دھیان نہیں دیا۔ اکثر اس تالاب پر مچھلیاں پکڑنے جایا کرتا تھا، کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا اور میرا شغل جاری رہا۔

ایک روز کا ذکر ہے، میں ڈوگن ڈالے صاف شفاف پانی میں ہلکی ہلکی لہروں کا تماشہ دیکھ رہا تھا، رفتہ رفتہ ایسا محسوس ہونے لگا گویا وہ لہریں آنکھوں کی راہ دل کی گہرائیوں میں ڈوبتی جاتی ہیں۔ بڑا لطف آیا، کچھ ایسی محویت طاری ہوئی کہ آپے کی خبر نہ رہی۔ اسی بے خودی میں مجھے ایک صاف ستھری خوب کشادہ گلی نظر آئی جسکے دونوں طرف عالیشان حویلیاں کھڑی تھیں، رنگین شیشوں کی خوشنما جوڑیاں چڑھی ہوئیں، بعض حویلیوں کے بالاخانوں کے دروازوں پر چقیں نظر آئیں، کتنے ہی برآمدوں پر ٹین کی چادریں، ان میں نئی وضع کی عمارتیں بھی تھیں اور دیسی ساخت کی بھی۔ لیکن آدمی یا جانور کا پتہ نہیں، بالکل سناٹا ہی سناٹا چھایا ہوا۔ بہتیرے کان لگائے کسی کی آواز نہ سُنائی دی، آخر کہیں کوئی ہوتا تو بولتا بھی۔ میں حیران تھا، الٰہی کیا ماجرا ہے یہ کیا دیکھ رہا ہوں۔ ناگہاں ایک بالاخانے کا پردہ ہلا اور جیسے بادل چھٹ کر آفتاب نکلے، کوئی حسینہ جھانکی، اور پلک جھپکاتے نہ جانے کیا ہوئی، ابھی کچھ سمجھنے نہ پایا تھا کہ اُسی جگہ وہ صورت دوبارہ نظر آ کر روپوش ہوگئی۔ کتنی ہی بار جھانکی اور چھپی پھر جھم سے جنگلے کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ کن انکھیوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں ذرا آگے جھک کر غور کرنے کو تھا، یکایک کسی نے زور سے میری گردن دبائی اور میں قلابازی کھا گیا۔

کچھ نہیں کہہ سکتا پھر کیا ہوا۔ اتنا یاد ہے کہ میں نے خود کو ایک آراستہ کمرے میں پُرتکلف مسہری پر ہوش رُبا حسینوں کے جھرمٹ میں پایا۔ ایسی صورتیں تو مجھے کبھی خواب میں بھی نظر نہ آئی تھیں۔ یہ عالم ہوا، اِسے دیکھوں اُسے بھولوں، اُسے دیکھوں اِسی کو بھولوں۔

اتنے میں ایک غارتگرِ ہوش خوان میں کھانا سجا کر لائی۔ ان سب نے بڑی محبت سے کچھ کھانے پینے کی فرمائش کی مگر اس رُوح پرور نظارے کی محویت میں نوالہ کس سے ٹوٹتا۔

(۵)

وقت کی رفتار بدستور جاری رہی، مگر مجھے دن رات، شام سویرے کی مطلق خبر نہ ہوئی۔ یوں اندازہ لگا لیجئے کہ شاید دس

جب دوسرا عمران لایا گیا تھا، کہ اچانک کسی بڑی بی لگی ایک تھی ... اور ڈپٹ کر بولیں۔

"ہیں! ہائیں!! یہ کیا ہو رہا ہے؟ کمبختو! کیوں بیچارے کی جان کے پیچھے پڑی ہو، اگر یہ مر گیا تو اس کا خون کس کی گردن پر ہوگا؟"

سب کی سب دھکتے رہ گئیں۔ یکدم چھوٹی لڑکی نے میرا ہاتھ پکڑ کر زور سے جھٹکا، اور تیز چکر دیا۔ مجھے کچھ سُدھ بُدھ نہ رہی۔

جب آنکھ کھلی تو میں پیال کے ڈھیر پر کمبل میں لپٹا پڑا تھا۔ ہوش و حواس درست ہونے پر معلوم ہوا کہ تین دن غائب رہنے کے بعد میں پالنہیں شہر اور تالاب کے کنارے پا گیا ہوں۔ اُس وقت سانس، نبض اور دل کی دھڑکن بند تھی۔ حکیم صاحب کو دکھایا تو انہوں نے فرمایا۔

"گھبرانے کی بات نہیں، انہیں سکتہ ہوگیا ہے، رُوح نہیں گئی۔ ثبوت یہ کہ ہاتھ پاؤں نرم ہیں اور پتلیاں بے نور نہیں ہوئیں، انکو آرام سے پیال پر لٹا کر ایک بھاری سا کمبل اُڑھا دیا جائے، کچھ دیر کو خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔"

سکتے سے افاقہ ہونے پر کوئی ہفتہ عشرہ میں میری صحت بحال ہوگئی۔ وہ دن اور آج کی گھڑی ان خوبصورت بلاؤں کے خوف سے اُس تالاب کے خیال ہی سے میری جان سُوکھتی ہے۔

تو جناب عالی! اس بنا پر عرض کرتا ہوں کہ میاں عبدالجلیل زندہ در گور کر دئے گئے، گو انہیں دفنائے دن تو زیادہ ہوگئے، پھر بھی کیا ہرج ہے، اگر ایک بار قبر کھول کر دیکھ لیں!!"

اُن صاحب کے سمجھانے بجھانے سے، صحرا جا کر تیرے تایا میاں کی قبر کا تختہ ہٹایا گیا تو لاش خراب ہو چکی تھی، یہ تعجب ہے کہ کچھ بیٹھی ہوئی سی حالت میں ملی، اور کفن اِدھر اُدھر بکھرا ہوا تھا، جیسے میت اُٹھی ہو، پھر کوئی راستہ نہ ملنے کی وجہ سے وہاں کی وہیں گھٹ گھٹا کر رہ گئی۔

(اے۔ آئی۔ آر۔ لکھنؤ) **مرزا فہیم بیگ چغتائی**

رُباعیات

او ہام کو ہر اک قدم پہ ٹھکراتے ہیں
ادیان کو خطرے میں نہیں لاتے ہیں
لیکن جو مست کوئی کہتا ہے حسینؑ
ہم اہلِ خرابات بھی جھک جاتے ہیں

(۲)

صہبائے ولا کا جام لیتے جانا
ہاں کیف فزا پیام لیتے جانا
جانا ہو جو کربلا تو یارانِ عزیز
مستوں کا بھی سلام لیتے جانا

جوش ملیح آبادی

عربی مہینے

انسان اور حیوان میں سب سے زیادہ نمایاں مابہ الامتیاز چیز "مدنیت" ہے۔ حیوانوں میں میل جول اور تمدن سے آثار سرے سے ناپید ہیں۔ آج سے ہزاروں سال پہلے کوا، آڑے ترچھے تنکے اور ڈالیاں لیکر جس طرح گھونسلا بناتا تھا، آج بھی اسی طرح بناتا ہے۔ یہی حال دوسرے جانوروں کا ہے۔ دنیا کا کوئی انقلاب اُن کے طریقِ بود و ماند میں تغیر پیدا نہیں کرسکا۔ بات یہ ہے کہ تمدن اور سولزشن کی بنیاد "اجتماعیت" ہے، اور حیوان انفرادی زندگی بسر کرنے کے عادی ہوتے ہیں اسلئے وہ تمدن کی نعمتوں سے بہرہ ور ہونے نہیں پاتے۔ اسکے برخلاف انسان مدنی الطبع ہے، تجربات کی روشنی میں ضروریات کے سہارے، اپنے گرد و پیش کو بدلنے اور ترقی دینے کی صلاحیت اُس میں پائی جاتی ہے۔ مدنیت اور عمرانیت کی یہ بجلی جو انسان کی فطرت میں سمو دی گئی ہے، اُسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتی اور وہ کسی ایک چیز پر قانع ہو کر نہیں رہ سکتا، وہ اپنے گرد و پیش کو ادلتا بدلتا رہتا ہے اور ترمیم و ترقی کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ چقماق سے آگ نکالنے والا انسان، آج پانی کی موجوں کو بجلی کے شرارے پیدا کر رہا ہے۔ صنفِ نازک کے اسبابِ آرائش سے لیکر، آلاتِ حرب تک ایک ایک چیز بدل گئی اور بدلتی جارہی ہے۔ ہمارے مشرقی شاعروں نے حنا آلود پوروں اور ہتھیلیوں کی تعریف میں کیا کچھ نہیں کہا۔ مگر اس بیسویں صدی کے مہذب محبوب نے رنگ و روغن سے ناخنوں کو پینٹ کرکے مہندی کو اپنی بزمِ آرائش سے نکال باہر کیا اور اس ذوقِ تمدن کے آگے شاعروں کی "شانِ پیمبری" بھی دھری رہ گئی۔ اہرامِ مصری مضبوط دیواریں ہوں، یا قصرِ بلند کے نازک اور خوشنما ستون، تاج محل کے حسین بام و در ہوں یا شالامار کے فوارے، یہ سب کے سب تمدن ہی کے نقوش ہیں، کوئی نہیں بتا سکتا کہ تمدن کی بے چین روح، مستقبل میں کتنے نقوش ابھار کر رہے گی ــــ مستقبل کے کہرے میں دیکھنے والی آنکھ کو، مادہ پرستی نے تو اور زیادہ کمزور کر دیا ہے!

علم و زبان اور تمدن

زبان اور علم کی پیدائش اور ترقی میں بھی انسان کے ذوقِ تمدن کا [illegible] ضرورت ایجاد کی ماں ہی اور اس ماں نے اشاروں کے بچے جننے شروع کئے، ایک ایک بچہ پورے خاندان کا باپ بنا، یہاں تک کہ بے شمار ایجادیں ظہور میں آگئیں۔ اشیاء کے ساتھ ہی "اسماء" کا اضافہ ہوتا گیا، اور باہمی مستقل زبان بن گئیں۔ مجرد ایجادوں نے شاخ در شاخ ہونا شروع کیا اور نئی نئی اصطلاحوں نے سیدھی سادی زبان کو "علمی زبان" بنا دیا۔ ہندسہ، اقلیدس، طب، انجنیرنگ، تاریخ، شعر و معانی، یہ سب اصناف علوم تمدن ہی کا پرتو ہیں۔

تمدن ہی کی ضرورت نے انسان کو زمانہ کے تعین کی طرف مائل کیا۔ چنانچہ ہر ملک اور ہر قوم نے کسی خاص واقعہ کو بنیادی اور معیاری کن قرار دیکر، اسی سال سے زمانہ کا حساب لگانا شروع کر دیا۔ بکرمی سنہ ہو یا عیسوی سال، یہ سب ایک خاص تاریخی واقعہ سے متعلق ہیں۔

۱۸۵۷ء کا غدر، ہندوستان کی تاریخ کا نہ بھولنے والا واقعہ ہے، اور واقعات کو غلط شکل میں مسخ کرکے پیش کرنے کے باوجود ہندوستانی غدر کی "روحِ تحریک" کو نہیں بھولتے۔ یوں تو ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے گوشے تک ہر جگہ غدر کے اثرات محسوس کئے گئے، مگر صوبہ متحدہ (یو۔پی) اور دہلی اور نواحِ دہلی کو اس قیامت نے سب سے زیادہ متاثر کیا، چنانچہ یہ واقعہ بنیادی سال بن گیا ہے، اور یو۔پی کے اضلاع میں قصبات اور خاص طور پر دیہات کے باشندے زمانہ کا شمار، غدر کے سال سے کرتے ہیں۔ سنہ انگریزی کے مقابلے میں یہ "غدر کا سال" اگرچہ فروغ نہ پا سکا اور دفتری نظم و نسق اس کو قبول نہ کرسکا، مگر عوام کے گھریلو کاروبار میں اس کا رواج ہے اور غالباً اُس وقت تک رہیگا جب تک کہ کوئی غیر معمولی انقلاب، سنہ ستاون کے غدر سے بازی نہ لے جائے۔

سنہ ہجری کی ابتدا

عرب کے قدیم زمانہ میں سنہ ابراہیمی کا رواج تھا۔ لیکن بت پرستی کے چکر میں آکر، اس "مبلغ توحید" کو بھی لوگ قریب قریب بھول گئے اور سنہ ابراہیمی کا چلن بھی جاتا رہا۔ جاہلیت کے آخری دور میں سب سے زیادہ اہم واقعہ یہ پیش آیا کہ ابرہہ نے ہاتھیوں کی فوج سے کعبہ پر چڑھائی کردی، تمام عرب میں اس واقعہ نے تہلکہ مچا دیا۔ عرب اگرچہ بت پرست تھے، لیکن [illegible] کو وہ [illegible] احترام کی [illegible]

[illegible] جو شخص کی ہمی ہاتھیوں کے عظیم لشکر کا کیا بگاڑ [illegible] بیت کعبہ کو اپنے گھر کی حفاظت منظور تھی، مگر وہ ابابیلوں [illegible] کنکری پھینکیں نے ہاتھیوں کو فنا کر دیا۔ قرآن پاک کی سورۃ الم ترکیف میں اسی واقعہ کا ذکر ہے۔ واقعہ اپنی نوعیت [illegible] انتہائی اہم تھا، چنانچہ اس کو بنیادی سال قرار دیا گیا اور [illegible] اسی "عام الفیل" (Elephant year) [illegible]

حکومت الٰہی اور جمہوریت اسلامیہ کے خلیفہ دوم حضرت سیدنا عمر فاروق ابن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں "اسلامی سنہ" کے تعین کی ضرورت محسوس کی گئی، بزم مشورت آراستہ ہوئی۔ کسی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کو بنیادی سال قرار دیا جائے، کسی کی رائے تھی کہ غزوہ بدر کا واقعہ تاریخ اسلام کا دیباچہ ہے اسی سے سنہ اسلامی کی ابتدا ہونی چاہیئے۔ آخرکار خود حضرت عمر فاروقؓ کی نگاہِ حقیقت شناس زبان مشورت بن کر گویا ہوئی کہ حضرت رسول اللہ کی ہجرت کو "سنہ اسلامی" قرار دیا جائے کیونکہ ہجرت کا واقعہ اسلامی تاریخ کا سب سے پہلا عظیم الشان انقلاب، اور دوسرے الفاظ میں (turning point) ہے۔ رائے صائب اور مشورہ درست تھا، بزم شوریٰ کے تمام ارکان نے اسکو پسند کیا اور ہجرت کا واقعہ "سنہ ابتدائی" قرار پا گیا۔

مہینوں کا اختلاف۔

جو لوگ رسالہ "ساقی" کا کم از کم چار پانچ سال سے مسلسل مطالعہ فرما رہے ہیں، اُن کی نظر سے میرا وہ مضمون گزرا ہوگا، جس میں مَیں نے اِس بحث کو چھیڑا تھا کہ ملکوں اور شہروں کے نام اپنے اندر معنی رکھتے ہیں، اب میں عرض کرتا ہوں کہ ملکوں اور شہروں پر ہی منحصر نہیں ہے، ستاروں، دریاؤں، پہاڑوں، مہینوں اور دنوں کے نام بھی معنی رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ مضمون اسی تصویر کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھا گیا ہے۔

ایام جاہلیت میں اہل عرب اپنی ضرورت اور مصلحت کے لئے مہینوں کو اُلٹ پلٹ کر دیا کرتے تھے۔ قریش کعبۃ اللہ کے متولی تھے، حج کے مہینہ کی تقدیم و تاخیر اور گھٹانا بڑھانا اُنکی مرضی پر تھا۔ بعض قبیلوں کے مہینوں میں بھی اختلاف پایا جاتا تھا، قبیلہ مضر، جمادی الآخری اور شعبان کے بیچ کے مہینے کو رجب اور قبیلہ ربیعہ کے یہاں شعبان اور شوال کے بیچ کا مہینہ رمضان، رجب مانا جاتا تھا۔ کاروباری زندگی میں اس اختلاف

کی وجہ سے دشواری تھی۔ قدیم عربوں کے ہفتے کے دنوں کے نام بھی عجیب تھے، جن کا یہاں لکھا جانا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

اُردو	عربی	قدیم عربی
اتوار	الاحد	اول
پیر	الثنین	اہون
منگل	ثلاثاء	جبار
بُدھ	اربعاء	دبار
جمعرات	خمیس	مونس
جمعہ	جمعہ	عروبہ
ہفتہ	سبت	شیار

مہینوں کی ترتیب۔

حضرت پیغمبر اسلام (روحی فداہ) نے حج کے خطبہ میں ارشاد فرمایا۔

"زمانہ گھوم گھام کر اپنی اصلیت پر آ گیا ہے سال کے بارہ مہینے ہوا کرتے ہیں، جن میں سے چار حرمت و ادب والے ہیں......."

اہل عرب کے اکثر حج ذوالحجہ کے مہینے میں نہیں ہوتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس سال حج فرما کر یہ خطبہ ارشاد فرمایا اس سال حج اپنے ٹھیک مہینے (ذوالحجہ) میں ہوا تھا۔ اور اس وقت سے عربی مہینوں کی ترتیب، چاند کے حساب سے ٹھیک ہو گئی۔ اور گذشتہ اختلاف کو ہمیشہ کیلئے دُور کر دیا۔

شیخ علم الدین سخاوی نے اپنی مشہور تصنیف "المشہور فی اسماء الایام والشہور" (Book regarding the names of days and months) میں عربی مہینوں کے معنی لکھے ہیں جن کا ضروری اور مفید خلاصہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

(۱) محرم۔ تعظیماً اس کو "محرم" کہتے ہیں۔ ایام جاہلیت میں اہل عرب اس مہینے کو بدل ڈالتے تھے، جب چاہتے اس مہینے میں قتال و جدال شروع کر دیتے، جب دل میں آتا تلواریں نیام میں کر لیتے، اس لئے لفظ "محرم" میں اس بات کی تاکید ہے کہ حلت و حرمت کا انسانوں کو حق نہیں پہونچتا۔ اور اس مہینے کی حرمت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

(۲) صفر۔ اس مہینے میں اہل عرب اپنے گھروں کو چھوڑ کر جنگ یا سفر کے لئے چل دیتے "صفر" کے معنی "خالی کر دینے" کے ہیں۔

(۳) ربیع الاول۔ "ارتباع" کے معنی "اقامت" (ٹھہرنا) کے ہیں۔ اس مہینے میں اہلِ عرب کی اقامت ہو جاتی تھی۔

(۶) جمادی الآخری۔ اقامت کا دوسرا مہینہ۔

(۵) جمادی الاولیٰ۔ "جمود" کے معنی پانی "جمنے" کے ہیں۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ جس موسم میں اس مہینے کا سب سے پہلے نام رکھا گیا ان دنوں کڑاکے کے جاڑے پڑ رہے تھے اور پانی جم گیا تھا، اسی مناسبت سے مہینے کا نام "جمادی الاولیٰ" رکھا گیا۔

(۶) جمادی الآخری۔ پانی جم جانے کا دوسرا مہینہ۔

(۷) رجب۔ رجب کا ماخذ "ترجیب" ہے اور ترجیب کے معنی عظمت والے کے ہیں۔

(۸) شعبان۔ "تشعب" کے معنی ہیں پراگندہ ہونا، ایام جاہلیت میں عرب قتل و غارت گری کے لئے وادیوں میں منتشر ہو جاتے تھے اور اس مہینے میں خاص طور پر لوٹ مار ہوتی تھی۔

(۹) رمضان۔ اس مہینے کو "رمضان" اس سبب سے کہتے ہیں کہ اس مہینے میں اونٹنیوں کے پیر، گرمی کی شدت سے جلنے لگتے تھے۔ چنانچہ "شتر بچے" جب پیاسے ہوتے ہیں تو اس وقت "رمضت الفصال" بولتے ہیں!

(۱۰) شوال۔ اس لفظ کا ماخذ "شالت الابل" ہے۔ اس مہینے میں اونٹ مستی میں آکر دم اٹھا دیا کرتے تھے۔ اسی کی جمع شوال، شواول اور شوالات آتی ہے۔

(۱۱) ذی قعدہ۔ "قعود" کے معنی بیٹھنے کے ہیں۔ اہلِ عرب اس مہینے میں اپنے گھروں میں آکر بیٹھ جایا کرتے تھے، نہ سفر کرتے تھے اور نہ جنگ کیلئے نکلتے تھے۔

(۱۲) ذی الحجہ۔ حج کعبہ کا مہینہ۔

حرفِ آخر۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے یہ مضمون لکھ کر اردو کے "ریسرچ اسکالروں" کو اس طرف متوجہ کر دیا ہے کہ اردو کے لئے ہمیں تحقیق و اکتشاف کے بہت سے دشوار گذار راستوں سے گذرنا ہے۔ اور اردو ادب ہماری سعی و تحقیق اور ذوقِ اکتشاف کا ہر وقت منتظر ہے!

ماہر القادری

خریدارانِ ساقی سے التماس ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر ضرور دیا کریں۔ نیز پتہ خوشخط اور صاف تحریر فرمائیں۔ ورنہ تعمیل کی شکایت معاف۔

"مینیجر"

نہیں جاتی

بگولے لاکھ اٹھیں شعلہ سامانی نہیں جاتی
سحر تک شمع محفل کی درخشانی نہیں جاتی

جسے شیخ و برہمن نے عجب سانچے میں ڈھالا ہے
وہ شے محسوس تو ہوتی ہے پہچانی نہیں جاتی

قمر بے نور ہو جائے، تبسم چھوڑ دیں غنچے
بدل جائے زمانہ خوئے انسانی نہیں جاتی

بہاریں آئیں بھی اور ہو گئیں رخصت مگر اب تک
گلستاں میں گلوں کی چاک دامانی نہیں جاتی

کسی کا نام سن کر ضبط کے باوصف پہروں تک
مرے بے نور چہرے کی درخشانی نہیں جاتی

مری باغی تمنائیں الٹ دیں گی زمانے کو
ہے جب تک زندگانی شعلہ سامانی نہیں جاتی

مری فکر و نظر گرمِ سفر ہے ایسے عالم میں
جہاں کی وسعتوں تک عقلِ انسانی نہیں جاتی

شمیم حالات نے گو کر دیا باغی زمانے سے
مگر باتوں سے تیری بوئے انسانی نہیں جاتی

صفیہ شمیم ملیح آبادی

قتل

منٹو

طاہرہ نے میری گود میں جان دے ہی دی۔

جاں کنی کا وقت، خدایا! جب مجھے اس معصوم بچی کی یاد آتی ہو تو دل بھر آتا ہے اور آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں۔ لیکن اگر وہ نہ مرتی تو...

طاہرہ ایک سال کی تھی جب وہ مرگئی۔ چینی کی گڑیا، کتنی سندر اور پیاری بچی تھی۔ اس کی مسکراہٹ اب بھی یاد آتی ہے۔۔۔ اچانک اسے بخار آنے لگا۔ پھر انتڑیاں خراب ہو گئیں۔ آہستہ آہستہ وہ سوکھنے لگی اور کانٹا بن گئی۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ، پھر اس کی ایک آنکھ خراب ہو گئی، میری چینی کی گڑیا کتنی مکروہ صورت ہو گئی۔ اس سے مجھے ڈر لگتا تھا۔ خوف ہوتا تھا، میری امیدیں اور ہم دونوں کا کھلونا، قدرت نے یوں توڑ مروڑ کر خراب کر دیا۔ قدرت بڑی فیاض ہے مگر اس کا اظہار طاہرہ کو بگاڑنے میں خوب ہوا۔

اس کی بیماری کس قدر تکلیف دہ تھی۔ میری پیاری سلمٰی بھی اپنی صحت سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ اس کا مسکراتا ہوا چہرہ پژمردہ ہو گیا۔ اس کا سڈول جسم نڈھال ہو گیا۔ وہ بچی کی تیمارداری میں دن رات لگی رہتی۔ مجھے فکرِ روزگار سے فرصت نہ تھی کہ سلمٰی کا ہاتھ بٹا سکتا۔ صبح سے شام تک ایک دفتر میں کام کرنا پڑتا۔ لیکن پھر بھی مشکل سے اتنا میسر آتا کہ ہم بسر اوقات کر سکتے۔ اس اکیلی کو گھر کا سارا کام کاج کرنا پڑتا اور پھر اسے میری صحت کا بھی خیال تھا۔ اگر میں بیمار پڑ گیا تو۔۔۔ میری بیماری کا نتیجہ سب کے لئے فاقہ مستی تھا۔ فاقہ مستی، سسک سسک کر مرنا، میری رفیقۂ حیات سارے مصائب خود برداشت کر رہی تھی۔ وہ راتوں کو جاگتی۔ ممتا کی ماری ماں اپنی بچی کی بیماری کو بانٹ بھی تو نہ سکتی تھی۔ طاہرہ بے زبان بچی، مرض کی شدت سے صرف چیختی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ چلانا بھی بند ہو گیا۔ اس کا گلا بیٹھ گیا۔ اب وہ صرف تڑپتی تھی اور ساتھ ساتھ ہمیں بھی تڑپاتی رہتی۔

موت اور حیات دو ایسے الفاظ ہیں جن کے گرد دنیا گھوم رہی ہے۔ زندہ رہنے کے لئے ساری کائنات سرگرمِ عمل ہے اور نظامِ عالم کی رنگینی اسی حیات پر ہے۔ موت اسی نظام کے درہم برہم ہو جانے کا نام ہے۔ انسانی زندگی پر بعض دور ایسے بھی آتے ہیں جب یہی زندگی وبالِ جان بن جاتی ہے اور آدمی موت کے دامن میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ لیکن قانون اور مذہب دونوں اسے گناہِ عظیم سمجھتے ہیں، سسکتے رہو مگر جیے جاؤ۔ یہ ہے مذہب کا پیغام، ورنہ خودکشی کا جواز کیوں نہیں ہے۔

بچی کی اس مکروہ اور تکلیف دہ حالت کے باوجود میری بیوی کی یہی خواہش تھی کہ وہ زندہ رہے، مگر اس کو زندہ رکھنے کے اسباب مفقود تھے۔ دوائی، یہ وہ آبِ حیات تھا جو ہماری طاہرہ کو زندگی بخش سکتا تھا مگر اس کا مہیا کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ بیوی نے وقت بھر رو رو کر خدا سے دعائیں مانگیں، سجدوں میں گڑگڑائی۔۔۔ روزے رکھے۔ میں بھی اس کے ساتھ ان دعاؤں میں کئی بار شریک ہوا۔ مگر اس کے باوجود دوائی کے لئے پیسے میسر نہ آسکے۔ ہر شام جب میں خالی ہاتھ گھر لوٹتا تو سلمٰی پہلے میرے تھکے ہوئے قدم دیکھتی اور پھر سامنے لیٹی ہوئی طاہرہ کو۔۔۔ میں اپنی زمین کو دیکھتا ہوا مجرموں کی طرح اندر داخل ہوتا۔۔۔ زمین سونا اگلتی ہے۔ مگر میرے لئے اس کے خزانے خالی ہو گئے تھے۔ ایک دن مجھے بھی وہ اپنے اندر دبا لے گی۔ کیا میں بھی خزانہ ہوں؟

حرکت زندگی ہے، میں دن بھر حرکت ہوں، بالکل لوہے کی مشین کی طرح، نہایت باقاعدگی سے، مگر اس کے باوجود دو وقت کا کھانا تک میسر نہیں آتا، میرا آقا متحرک نہیں لیکن اس کے گھر میں سونا پہاڑ کی پاؤں تلے روندا جاتا ہے۔ حرکت زندگی نہیں موت ہے، سکوت زندگی ہے اور حرکت موت۔

دوائی حاصل کرنے کے لئے میں نے کوشش کی، چند بار کامیاب بھی ہو گیا۔ لیکن اس سے کچھ فائدہ نہ تھا۔ علاج مسلسل ہونا چاہیئے۔ مگر اس کے لئے رقم کا باقاعدہ مہیا ہوتے رہنا ناممکن تھا۔ تڑپتی ہوئی بیمار بچی، دوائی کی خالی شیشی، سلمٰی کی پُرنم آنکھیں، اور میری خالی جیب، یہ تھا میری حرکت کا نتیجہ۔

طاہرہ چارپائی پر پڑی کراہ رہی تھی۔ میں پاس دوسری چارپائی پر لیٹا آسمان کو تک رہا تھا، اندھیری رات میں ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ سلمٰی پاس بیٹھی عشا کی نماز پڑھ رہی تھی۔ سلمٰی مجھے ایک نورانی روح دکھائی دے رہی تھی۔ مصائب کے اندھا دھند طوفان میں بھی ایک مقام ایسا تھا، جہاں مجھے قرار مل سکتا تھا۔ دم بھر کے لئے میں ٹھہر سکتا تھا۔ اور وہ تھا میری سلمٰی کے صبر اور شکر کا دامن۔ وہ میری...

کی [illegible] شاکرتی کہ اس قدر مصائب میں بھی اُس نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا تھا۔ میں تو صبر اور شکر ایسے الفاظ کو منافی چیزیں خیال کرتا [illegible] کی تاریکی میں مجھے نور کی یہ مدھم کو ایک راستہ دکھانے لگتی تھی۔ اس کا ایثار، مامتا، اور میرے لئے محبت مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں سلمٰی کو دیوی جانوں اور میں اسی لئے اسکی پرستش کرتا ہوں۔

اندھیری رات میں ستارے ٹمٹما رہے تھے، ایسی ہی ایک رات تھی جب میں اکیلا لیٹا آسمان کو دیکھ رہا تھا، وقت گذرتا گیا۔ دھیرے دھیرے آسمان پر چاند نمودار ہونے لگا۔ تارے مدھم پڑ گئے اور میں چاند کو دیکھتے دیکھتے کہیں سے کہیں جا پہونچا۔

کالج کے زمانے میں میری زندگی کے آسمان پر کئی ستارے نمودار ہوئے، ٹمٹمائے اور پھر اپنی چند یادیں چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے کسی دوسرے آسمان پر چاند بن کر طلوع ہو گئے۔ چند اشعار یا افسانوں کے بعض اشارات اُن کی یادگار باقی ہیں۔ مگر سلمٰی کالج کے اُفق سے طلوع ہوا چاند نہ تھا۔ اُسے میں نے خود ڈھونڈا تھا۔ وہ میرا آدرش تھا۔ حُسن کا پیکر، نسائیت کا مجسمہ، میں نے اُسے غربت کی تاریکیوں سے کھودا اور پھر اُسے تراش کر ایک نگینہ بنایا۔ جسے زیب کلاہ کر کے مجھے فخر تھا، سلمٰی کو پاکر میں نے سب کچھ کھو دیا۔ چاند کی آمد ستاروں کو ماند کر دیتی ہے۔ اسی طرح کالج کے زمانے کے سارے رومان مجھے بھول گئے۔

میں پجاری تھا اور میری سلمٰی دیوی تھی۔ میں اُسے پوجنا ہی اپنی زندگی سمجھتا تھا۔ مگر اس پوجا سے بڑھ کر پیٹ پوجا زیادہ اہم چیز ہے۔ ہماری اس خوشی کی زندگی پر، جس کی عمر ابھی بہت ہی تھوڑی تھی۔ حوادث کی دھُند چھانے لگی۔ اُس نے ہمیں گھیر لیا۔ ساری خوشیاں، مسرتیں مایوسیوں میں تبدیل ہو گئیں، جوانی کے جذبات دب گئے۔ توقعات کے نتایج اُلٹے نکلے، میں نے اپنی قیمت غلط لگائی تھی۔ اسی غلط اندازے پر زندگی کا ڈھانچہ تیار کیا گیا۔ اندازے کی ذرا سی غلطی نے سارا بنا بنایا محل گرا دیا۔

مجھے اپنی صحیح قیمت معلوم ہو چکی تھی۔ اس رقم سے جو میں اپنی زندگی دیکھ بھال کر لایا کرتا ہوں اس قدر بھی نہیں کہ وہ ہم دونوں کی کفیل ہو سکتی۔ کہاں وہ کالج کی زندگی، آزادی اور بے پروائی، اور کہاں یہ تلخ حقیقت، ہم تو سمجھتے تھے کہ ہم زندگی کی دوڑ میں اسقدر کامیاب ہوں گے کہ بس، ہمارے لئے کالج ایک ایسا ہال تھا جس کے دروازے امپیریل سروس، پراونشل سروس، لیجسلیٹو اسمبلی اور خدا جانے کن کن اطراف کی طرف کھلتے تھے اور کچھ نہیں تو صحافت کا شاندار مستقبل ہمارے سامنے تھا ہی۔ مگر جب بازار میں ڈگری لیکر نکلے تو معلوم ہوا کہ یہ سب سراب تھا۔ جسے ہم نے پانی جانا تھا وہ چمکتی ہوئی ریت تھی۔ اس احساس نے گویا پیاس کو اور بڑھا دیا۔ اپنی ناکامی سے بڑھکر مجھے سلمٰی کا خیال تھا۔ بیچاری کیا خیال کرتی ہوگی۔ مگر اُس نے اپنے ٹوٹے ہوئے دل کے لئے دُعا کا مرہم بنا لیا۔ وہ عبادت کرتی اور اس طرح اُسے تسکین مل جاتی۔ میرے لئے اس کا اس طرح گڑگڑانا اور بھی تکلیف کا باعث بنتا تھا۔ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ صحافت کا روشن مستقبل اور بھی تاریک ثابت ہوا۔

بہت سے لوگوں کے لئے بعض چیزیں ضروریات زندگی ہوتی ہیں اور یہی چیزیں لاکھوں کے لئے عشرت کا سامان۔ وہ سب چیزیں جو ایک زمانے میں ہمارے لئے ضروریات تھیں اب عشرت کا سامان بن گئیں، اور میرا وہ تراشا ہوا نگینہ جلا سے محروم ہوتا جا رہا تھا میرا بت گرد و غبار سے اٹا ہوا محض پتھر کا ایک ٹکڑا تھا۔ جب میں شوقِ سجدہ سے بیقرار ہو کر اپنے خدا کے سامنے جھکنا چاہتا تو مجھے اپنا خدا بیجان معلوم ہوتا۔ میرا خدا خود میری وجہ سے برباد ہو گیا۔ اگر وہ کہیں اور ہوتا ــــ مگر نہیں نہیں، میں نے ہی تو اُسے خدا بنایا تھا۔ وہ کہیں اور نہیں جا سکتا تھا۔

دو سال کا عرصہ ایک بہت لانبا عرصہ تھا۔ جب ہم نے یہ زندگی شروع کی تو اس تاریکی کو نور کا پیش خیمہ خیال کیا۔ اِسے چھوٹا سا جانا۔ خیال تھا کہ ضرور بارش ہوگی۔ مگر ہوا کچھ نہیں بلکہ چھا سا بڑھتا ہی گیا۔ آنکھیں ابرِ کرم کے لئے ترس گئیں۔ شاید بادلوں میں پانی کی سوتیں سوکھ گئی تھیں۔

ہماری حالت اس خانماں برباد کی سی تھی، جس کا گھر اُجڑ گیا ہو اور وہ اپنا بچا کھچا اثاثہ لیکر اس اُمید پر کہیں چل نکلے کہ شاید اسکی بگڑی بن جائے اور اُس کا آشیاں پھر آباد ہو۔ مگر دُنیا کا کارخانہ کچھ ایسا ہے کہ یہاں برباد ذرا کم ہی آباد ہوا کرتے ہیں۔ ہم نے زندگی کے آغاز کو آئندہ کی اُمید پر رکھا لیکن اُمید پوری نہ ہوئی۔

اُمیدیں، جذبات، توقعات اور نہ جانے جوانی کی کیا کیا طاقتیں تھیں جو صرف ان دو سالوں میں مٹ گئیں۔ وہ علمی مشغلے، وہ فن برائے فن کی پُر لطف بحثیں، اور ادب میں تسکین ڈھونڈنے کے نظریے نہ جانے کہاں گئے۔ اب اُمید تھی تو وقت پر تنخواہ ملنے کی۔ جذبات تھے تو مالک کی زیادہ سے زیادہ غلامی کر کے اُسے خوش کرنے کے اور توقعات تھیں تو مایوسی کی، تسکین ملتی تھی صرف وہ وقت کا کھانا کھا کر اور لطف آتا تھا تو موہوم اُمید [illegible]

لئے ہوتے۔ اب تو ہمارا خدا بھی کسی اور خدا کی پرستش میں محو رہتا تھا اور ہم بیٹھے ہوئے اپنے خدا کو کسی اور کی چوکھٹ پر سرنگوں دیکھتے رہتے۔

پھر طاہرہ ہمیں کھیلنے کے لئے مل گئی۔ نحیف و لاغر کا خون چوسنے کے لئے فیاض قدرت نے ایک اور سامان کر دیا۔ سلمیٰ کی صحت بہت زیادہ گرگئی۔ بچی کو پوری خوراک بھی نہ مل سکتی تھی۔ بھوک سے بلبلاتی ہوئی بچی کو دیکھکر مجھے السٹریٹڈ ویکلی کے صفحات یاد آجاتے۔ جن میں اشتہار چھپتے تھے۔ کلیم "دی ایمن بریزر" "گلاکسو" "کاؤ اینڈ گیٹ ملک" پھر موٹے بچے، ماؤں کے لئے "سینوٹیجن" طاقت بخش اور دودھ پیدا کرنے والی ٹانک۔ یہ تصویریں میرے دماغ میں ایک ہلچل بپا کر دیتیں۔ ذہن اخبار کے صفحات پر ہنستے ہوتے بچے اور مسکراتی ہوئی ماں پیش کرتے مگر میرے سامنے دودھ کے لئے چلاتی ہوئی بچی اور بھوکی مریل ماں تھی۔ کاش کی زندگی اور حقیقت، ان میں کس قدر تضاد تھا۔ کاش وہ زندگی اور دراز ہو جاتی۔

سلمیٰ اب اور نڈھال ہو گئی۔ اچانک بچی بیمار رہنے لگی۔ شروع شروع میں اس کا معمولی علاج کرایا گیا۔ مگر مستقل علاج کی متحمل میری آمدنی نہ ہو سکی۔ درد حد سے گزر کر دوا ہو جاتا ہے لیکن طاہرہ کا درد حد سے بھی گزر کر دوا نہ ہو سکا۔ اس نے نہایت خطرناک صورت اختیار کر لی۔ بچی کے پیٹ کی انتڑیاں خراب ہو گئیں۔ اب وہ ماں کا خون بھی نہ چوس سکتی تھی، یہ ایک اور مصیبت تھی جس نے سلمیٰ کو بیمار کر دیا۔ دودھ کا رکاؤ مرض اختیار کر تا گیا۔

انتڑیوں کی خرابی کے بعد ایک آنکھ خراب ہونے لگی وہ ننھی سی، مورت جسے پاکر ہمیں بہت خوشی ہوئی تھی۔ گھر میں ایک کھلونا آگیا تھا۔ وہ ہمارے ہاتھوں میں بگڑ رہا تھا ــــ اب علاج بیکار تھا، اگر وہ تندرست بھی ہو جاتی تو بھی اس کی زندگی فضول تی۔ اس کا مستقبل تاریک تھا۔ بگڑی ہوئی آنکھ اس کو بدصورت بنا دیگی اور بدصورت لڑکی اپنے لئے وبالِ جان ہوتی ہے اور والدین کے لئے سوہان روح ــــ طاہرہ اب ہماری غربت کو اور بھیانک بنا رہی تھی۔

انگلستان کی پارلیمنٹ میں ایک مسودۂ قانون پیش ہوا تھا کہ لاعلاج مریض جن کی زندگی سماج کے لئے مصیبت کا باعث ہو انہیں زہر دیکر مار دیا جائے، اس قانون کی مخالفت ہوئی اور وہ پاس نہ ہو سکا اس فعل کو قتل قرار دیا گیا۔

کاش یہ قانون پاس کر دیا جاتا اور آج میں خود اپنے ہاتھوں سے طاہرہ کو زہر دے دیتا ــــ زہر دے دیتا، باپ ہو کر اپنی بچی کو خود مار ڈالتا لوگ مجھے سنگدل باپ کہتے، قاتل بناتے۔ مگر یہ قتل تو تھا؟ ننھی ہوئی بے زبان لاش، ہڈیوں کا بے گوشت ڈھانچہ، بدشکل ... جس کو مرض اندر ہی اندر کھا رہا تھا۔ ہماری غربت اور تنگدستی نے اسے اور بھی بیمار کر دیا۔ ماں کا خون دودھ بن کر طاہرہ کے لئے موجود مگر بچی پی نہ سکتی تھی۔ سلمیٰ کی زندگی بھی خطرے میں تھی۔ میری پریشانیاں روز بروز زیادہ ہو رہی تھیں ــــ ان کا علاج صرف طاہرہ کی موت تھا۔ زہر کی ایک خوراک ــــ قتل؟

قتل ــــ میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ کسی دوا ساز کی دکان پر گھس جاؤں اور وہاں جس شیشی پر "زہر" کا لیبل لگا ہوا ہو اُسے لے بھاگوں، طاہرہ کی زندگی کا خاتمہ کر دوں۔ بیچاری دکھوں سے نجات پا جائے گی۔ میری پیاری بچی طاہرہ۔ لیکن اگر یہ ظاہر ہو گیا تو ــ رسوائی، بدنامی، گرفتاری، میری اخبار نویس برادری کو ایک سنسنی خیز واقعہ مل جائیگا۔ وہ بات کو لے اُڑینگے۔ میں قاتل کہلاؤنگا۔ خود اپنی بیٹی کا قاتل ــــ

بیٹی ــــ طاہرہ بیٹی کو جوان ہو کر کسی کا گھر بسانا تھا۔ لیکن میری بدشکل بچی کسی کے قابل نہ رہے گی۔ جوان بچی گھر میں کب بٹھائی جاسکے گی۔ اس کے نتائج بھی رسوائی، بدنامی اور خدا جانے کیا کیا ہونگے۔ بدقسمت طاہرہ! اُس کی نجات کے دو ہی راستے تھے۔ قتل یا صحت، وہ تو ہمارے لئے بدنامی اور رسوائی کے موجب تھے۔

سلمیٰ یہ سب کچھ محسوس کر رہی تھی مگر وہ اس کا اظہار کر کے مجھے اور پریشان کرنا نہ چاہتی تھی۔ اس کی دعائیں قبول نہ ہو سکیں میں نے ایک بار بڑی ہمت سے کام لیا مگر میرا ہاتھ زہر کی شیشی تک نہ پہونچ سکا۔ کوئی طاقت مجھے روک دیتی۔ سلمیٰ رات کے وقت بچی کے پاس دیر تک بیٹھی اونگھا کرتی تو میں لیٹے لیٹے زہر کے مہیا کرنے کے طریقے سوچتا۔ میں چاہتا تھا کہ زہر بھی ایسا ہو جو تکلیف دئے بغیر بچی کی موت کا باعث بنے ــــ

اس لگاتار مصیبت نے عذاب کی صورت اختیار کر لی۔ عذاب کسی گناہ کی پاداش میں ملتا ہے۔ ہم نے نہ جانے ایسا کونسا گناہ کیا تھا جس کے لئے ہمیں تو خیر ہماری معصوم بچی تک کو بھی اس بری طرح گرفتار کر لیا گیا۔ جہاں تک میں سمجھ سکا میرا سب سے بڑا گناہ غربت تھا۔ ورنہ دنیا میں لاکھوں گناہگار، ڈاکو اور رہزن موجود ہیں جو خدا کے بندوں کو دن دہاڑے لوٹتے ہیں، خدا کے قوانین کو پیروں تلے مسل ڈالتے ہیں اور پھر خدا کے نائب بن کر ایسے ایسے کمالات دکھاتے ہیں کہ حضرت شیطان کے بھی کان کترتے ہیں۔ لیکن ان کے ... سامنے ...

زخمی لاکھوں موجود ہیں۔ وہ کسی سرکاری ہسپتال میں چلے جاتیں تو پبلک کے ان خدام کی قسمت جاگ اٹھتی ہے جو ایسے شفاخانوں میں ملازم ہوتے ہیں اُن کے چہرے خوشی سے چمک اٹھتے ہیں۔ یہ ہسپتال ایسے لوگوں کے لئے بنائے گئے ہیں جو امداد کے قابل ہوں تاکہ سرکاری طور پر اُن کی صحت کا خیال رکھا جائے ___ لیکن ان مستحق لوگوں کا حشر کیا ہوتا ہے؟ اس کا تصور بھی میرے لئے اور دُکھ کا باعث بنتا ہے۔ اسی خیال سے میں کبھی سرکاری شفاخانے کی طرف رُخ نہیں کر سکتا۔ وہاں جاکر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ساری دُنیا ہم ایسے دُکھی لوگوں سے ہی بھری پڑی ہے۔ کس مپرسی کی جیتی جاگتی تصویریں، کرب و بلا میں مبتلا! انسان، سماج کی لعنت ـ

سلمیٰ اور میں، کہاں گئے ہمارے ارمان بھرے دل، جذبات، وہ تو ایک ایسا لفظ بن چکا ہے جو کبھی شرمندۂ معنی نہ ہو سکا۔ جوانی، وہ تو شادی کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ اب سلمیٰ اور میں، دو بوڑھے انسان ہیں جن کی زندگی خود اُن کے لئے اجیرن ہو رہی ہے۔ طاہرہ کا وجود ایک روگ ہے جو اس "بڑھاپے" میں ہمیں اور بھی بے حال کئے جا رہا ہے۔ ہمارے بچاؤ کا ایک ہی راستہ تھا، بچی کی موت، جینی کی گڑیا کا ٹوٹ پھوٹ جانا، خوشی کی سوت جو ہمارے دلوں میں جاگی تھی اس کا بند ہو جانا۔ غریب کو خوشی راس آ ہی نہیں سکتی۔

وہ گھڑی آن پہونچی جس کو لانے کے لئے میں کئی ہفتوں سے منصوبے باندھ رہا تھا۔ تاریک رات میں ہم دونوں طاہرہ کے پاس بیٹھے اس کی جاں کنی کو دیکھ رہے تھے۔ بے چاری کی حالت قابل رحم تھی۔ شاید قدرت کمزور کو زیادہ عذاب دیتی ہے۔ چارپائی کے سرہانے مدھم سا چراغ ٹمٹما رہا تھا، یہ منظر موت سے بھی بھیانک معلوم ہوتا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی چیز خاموشی سے زیادہ وحشت افزا، تاریکی سے زیادہ سیاہ اور بھیانک دوڑتی ہوئی، ہانپتی ہوئی چلی آ رہی تھی ___ طاہرہ آہستہ آہستہ دم توڑنے لگی۔ مجھ سے اُس کی یہ حالت دیکھی نہ گئی میں نے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ اس کا سر میرے سینے کے ساتھ تھا۔ اُس کے پاؤں سرد ہو گئے۔ سلمیٰ کی پُرنم آنکھیں مجھے تک رہی تھیں۔ اس کی زبان پر سورۃ یٰسین تھی۔ صبر و شکر کا پیکر اس قدر صبر آزما موقع پر بھی متزلزل نہ ہوا۔ میں، میں بات نہ کر سکا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ میرے سینے میں اک ٹیس سی اُٹھ رہی تھی۔ میرا ہاتھ طاہرہ کے جسم پر سردی کی رفتار کو محسوس کر رہا تھا۔ آخری ایک ہچکی آئی اور طاہرہ کا سر جھٹکے سے ایک طرف گر گیا ___ ہم نے وداع ہونے والی ننھی رُوح کو آنسوؤں کے چند قطرے پیش کئے ___ یہی ہم پیش کر سکتے تھے، اپنا خونِ جگر۔

میں نے بچی کو چارپائی پر لٹا دیا۔ اس کی موت نے میری جان بچالی۔ ورنہ صبح میں زہر لانے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا ___ پھر ___ قتل، اخباروں کی سنسنی خیز سُرخیاں۔ پولیس، گرفتاری، عدالت، زہر کا ثبوت، سزا۔ میری سلمیٰ ___

کاش ہندوستان میں تو لاعلاج اور مایوس مریضوں کو مار ڈالنے کا قانون پاس ہو جائے۔"

شیر محمد اختر

مہندی کے کھیت

"بھائی جان کچھ ملا؟"

"اس تنے پر تو کچھ بھی نہیں۔ کوئی گھونسلا نہیں ہے؟"

"دوسرے تنے پر دیکھئے بھائی صاحب۔ میرا منگن کہتا ہو کہ ضرور دوسرے تنے میں طوطے کا گھونسلا ہے؟"

"اچھا مگر یار ادھر کانٹے بہت ہیں۔" سُدھیر کیکر کے ایک نکیلے کانٹے کو پیر میں سے نکالتے ہوئے بولا۔

"مگر بھائی جان تم ہی تو کہتے تھے، کیکر کے طوطے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ جلدی بولنا سیکھ جاتے ہیں۔"

"ذرا زبان روکو۔ کہیں تمہاری باتوں میں نیچے نہ آ رہوں"

"اچھا بھیا"

"ابے یار، اس میں تو سالے ٹوئیاں طوطے کا گھونسلا ہے"

رَندھیر اچھل پڑا۔ "بھیا بچے بھی ہیں دیکھنا"

سُدھیر نے اپنے نیکر کی جیب میں سے چمٹا نکال کر گھونسلے میں سے ایک ننھا منا طوطے کا بچہ نکال لیا۔ پیلی پیلی چونچ اور پنجے۔ اور بدن پر سبزی مائل بسنتی رنگ نئے نکلنے والے پروں کا رواں۔ نازک ملائم۔

ایک! دو! تین!

اُن بچوں کی ماں درخت پر اُڑ اُڑ کر آ رہی تھی۔ چلا رہی تھی۔ ٹیں ٹیں۔ ٹیں۔ اور مہندی کے کھیتوں اور آسمان کے درمیان خلا میں چکر پر چکر لگاتے جا رہی تھی۔

"کیا ٹائیں ٹائیں لگا رکھی ہے سالی نے" رَندھیر بولا۔

"دیکھ کر اُترنا بھیا۔ چمٹا پھینک دو"

"دکھانا ذرا"

"اوں ہوں" اور سُدھیر اُن طوطے کے ننھے ننھے بچوں کو دونوں ہاتھ کی ہتھیلیوں سے ڈھانپ اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ رَندھیر بھی اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ "دکھا دو بھائی صاحب۔ دکھا دو نا"

"لے دیکھ" اور سُدھیر کی ہتھیلی کی گہرائی میں تین ننھے ننھے بچے پڑے ہوئے تھے۔ بہت چھوٹے چھوٹے۔

"ذرا مجھے دو" اور رَندھیر ان بچوں کو لے، اُن کی طرف پُر از تعجب خوشی سے دیکھنے لگا۔

"مٹھو بیٹا۔ طوطا رام" رَندھیر نے اُن بچوں کے نرم نرم ریشمی تاروں ایسے بالوں پر نزاکت سے اُنگلیاں پھیرنی شروع کر دیں۔

"ارے کھیت پر چلنا ہے یا نہیں"

رَندھیر اور سُدھیر منڈیر کے سہارے کیکر والے درخت کو چھوڑ، مٹی کی ڈھلوان منڈیر کو پھلانگ مہندی کے کھیتوں میں گھس گئے۔ ہرے بھرے لہلہاتے ہوئے مہندی کے سرسبز کھیت حدِ نگاہ تک بھی پرے تک پھیلے ہوئے۔ خنک ہوا، جو دماغ کو تر کر دے۔ ہوا مہندی کے کھیتوں میں سے گذر کر نکھر جاتی ہے۔ مہندی کے پودوں کے پھولوں کی بھینی خوشبو میں ایک مستی ہو۔ جو دماغ کو ہی نہیں، خیالات کو ہی نہیں بلکہ انسان کی رُوح کو معطر کر دیتی ہے۔ مہندی کے پودے انسانی قدموں کے چلنے سے نزاکت سے جھک جاتے ہیں اور پھر ایکدم اُٹھ کر، پوربی ہوا میں ایک منظم رقص میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی کالے سانپ کے مستی سے پھن لہرانے سے مشابہ۔ مہندی کی تازہ نازک ٹہنیوں میں ایک لچک ہے۔ آپ اُن کو موڑ کر دوہرا کر دیجئے لیکن وہ پھر سیدھی ہو جاتی ہیں۔ پودے کی ٹہنیاں لطیف سرخ یا سفید رنگ کی ہوتی ہیں۔ بالکل کسی لعبتِ عشوۂ و نازکی مرمریں کلائی کی طرح ملائم۔ لیکن وہ ہر کافر ادا ماہرو کی طرح ظالم بھی ہیں۔ یعنی آپ ٹہنی سے پتے جدا کر کے اپنے بدن کے کسی کھلے ہوئے حصے پر ضرب لگائیے، وہ بالکل ہو بہو آپ کے بدن کے اُس حصے پر اُبھر آئے گی اور آپ سہلاتے رہ جائیں گے۔

مہندی کے پودوں میں جگہ جگہ شیشم اور پیلو کے خودرو درخت کھڑے رہتے ہیں جن میں بیا اپنے جھولتے ہوئے گھونسلوں کو بنتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی سُرخ گردن والے لال، سُرمئی چڑیاں، ہریل، گھاس پھونس کا گھر بنا کر رہتے ہیں۔ بلبل کو مہندی کے کھیتوں کی نکھری ہوئی فضا سے خاص رغبت ہے۔ لہٰذا وہ کسی شیشم کی نازک ٹہنی پر چہکتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی اس موسیقی کی پاک فضا کو ٹیری کی جگہ خراش آواز تتر بتر کر دیتی ہے۔ اور کالے کالے کوّوں کی خواہ مخواہ کائیں کائیں۔ شام کو وقت جب گائے اور بھینسوں کے ریوڑ مہندی کے کھیتوں کے نزدیک بہنے والی نہر کے پل کو پار کرتے ہیں، پاس والے آم کے باغ سے پپیہا پی کہاں، پی کہاں! کی مکرر آواز [illegible]

...شروع کر دیتا ہے۔ مہندی کے کھیتوں پر کام کرنے والے انسان گروہوں میں منقسم ہو موسم کے مطابق آلہا، رسیا، چہولی کے راگوں کو آوازیں ملا کر گاتے ہیں۔ اور مہندی کے کھیتوں کے بیچوں بیچ میں سے گذرنے والے محکمۂ نہر کے ٹیلیفون کے کھمبوں کے درمیان لگے ہوئے تاروں پر بیٹھے ہوئے ہریل، ہدہد، لال، شکرخورے، گرسلیں، بیائیں جو ہزاروں کی تعداد میں اس وقت ہوتی ہیں، مل کر ایک ایسی بے پناہ موسیقی کے سُر نکالتی ہیں جو ایا بیلوں کے گھونسلوں سے لسی ہوئی محراب کے نیچے بہتی ہوئی نہر کی گنگناہٹ سے زیادہ مست کن اور دلآویز ہے۔ اور ہرے ہرے طوطے سینکڑوں کبھی کبھی ہزاروں کی ٹکڑیوں میں مہندی کے کھیتوں کے اوپر سے اڑ کر اپنی اپنی رہائش گاہ کی طرف جاتے ہوتے ایسے معلوم پڑتے ہیں گویا مہندی کے ہرے بھرے کھیتوں کا سایہ فضا میں معلق ہے۔ اور جھکولے کھا رہا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت ان مہندی کے کھیتوں میں اپنی آغوش میں بے پناہ مسرتوں، پاکیزہ کیفیت آور مستیوں کو سنبھالے رکھتی ہو انسانیت کے دل و دماغ کو طراوت پہونچانے کیلئے۔

زمردیں آسمان کے تلے مہندی کے ان ہریالے کھیتوں کو پار کرتے، سدھیر اور رندھیر اپنے کھیت پر پہونچ گئے۔

"جے رام جی کی بابو جی" کھیت کا رکھوالا بولا۔

"جے رام جی کی"

چھجوا نے پکے کنوئیں کے بھنورے پر ایک ٹاٹ کا ٹکڑا بچھا دیا بھنورے پر نیم کے تناور درخت کا سایہ تھا۔ جس کی مختلف شاخوں پر بیٹھے ہوئے طوطے تبولی کتر رہے تھے جو پٹا پٹ بھنورے پڑے چکنی مٹی کے ڈھیلوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

"رندھیر بابو تمہارے ہاتھ میں کیا ہے"

رندھیر نے ہاتھ کی دونوں ہتھیلیوں میں سے اوپر والی ہتھیلی کو ڈھکنے کی طرح کھولا۔ اور اس کی دوسری ہتھیلی کی گہرائی میں وہ ٹیاں طوطے کے بچے ایک دوسرے سے چمٹے پڑے تھے۔

"رام رام بابو ان کا کیا کرو گے"

"پالیں گے اور کیا؟"

"کیسے پالو گے، ماں روتی ہوگی بیچاروں کی..."

"بھئی ڈروپر (فیلنے کی پچکاری) سے چونچ میں دودھ ڈال کر کھلا دینگے" سدھیر بولا۔

"واہ جی بابو جی تم بھی خوب ہو۔ بھلا یہ بچے اس طرح زندہ رہ سکیں گے"

"اچھا دکھا دینگے۔ شرط بدتے ہو" رندھیر تنک مزاجی سے بولا۔ اور اس نے وہ تینوں بچے کنوئیں کے بھنورے کی کچی مٹی کے ڈھیلوں سے پُر سطح پر چھوڑ دئے۔ جو صرف بھنورے کے کالے فرش پر تین پیلے گول گول دھبے بن کر رہ گئے۔

"چھجوا..." سدھیر مسکراتے ہوئے بولا۔

"کیا پوچھ رہے ہو بابو جی"

"تو نے شادی کرلی ہے بھئی" سدھیر زمین کو نیم کی کچی ٹہنی سے کریدتا ہوا بولا۔

"شادی کیسی۔ "کراؤ" کیا ہے بابو جی" چھجوا مرجھائے ہوئے چہرے کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

"کراؤ کیا؟"

"اجی۔ اگر کوئی آدمی مرجائے تو پنچایت اسکی بوہریا کو کسی دوسرے مرد کے حوالے کر دیتی ہے، ایسا ہوتا ہے "کراؤ" بابو۔ مگر..."

"مگر کیا؟"

"میں نے پنچایت سے نہیں پوچھا"

"کیوں؟" حیرانگی سے سدھیر نے پوچھا۔

"برادری کی دعوت کرنی پڑتی ہے۔ میرے پاس ٹکا تک بھی نہیں۔ چُپ چاپ کراؤ کرلیا"

"تو پنچایت نے کچھ نہیں کہا" سدھیر نے سنجیدگی سے کہا۔

چھجوا نے سر کو کھجایا۔ مہندی کے کھیتوں کی طرف نظر دوڑائی۔

"بڑی آفت آگئی۔ حقہ پانی بند کر دیا۔ جرمانہ کہاں سے دیتا"

"جرمانہ!"

"پچاس روپے جرمانہ نہیں تو حقہ پانی بند"

"ارے، تمہاری پنچایت بہت بُری ہے۔ فکر نہ کرو۔ بابو جی سے روپیہ لے لینا"

"اجی کہاں۔ ابھی تو تین مہینے کی تنخواہ لگا یا ہو۔ سالوں بیت گئے لیکن سات سے آٹھ روپے نہیں کرتے"

اتنے میں ایک ٹوتیاں طوطے کا بچہ چلنے کی کوشش میں لڑھک کر گر پڑا۔ سدھیر نے سنبھالا، رندھیر نے چمکارا اور پچکارا۔

"بابو سدھیر، تم انہیں وہیں چھوڑ جانا"

سدھیر جو ایک سنجیدہ فلسفی کی طرح گہرے سوچ میں ڈوب چکا تھا۔ بولا "اچھا"

"بھیا حقہ پانی بند کردیا ہے جھمرا کا ایں!"

"ہاں! چل ان بچوں کو وہیں چھوڑ آئیں۔"

"نہیں!" رندھیر منہ بناتے ہوئے بولا۔

"بھیا! بڑے ہوجائیں دس بارہ دن میں نکال کر لیجائینگے کہیں بھاگے تھوڑے ہی جاتے ہیں۔"

"اچھا!" رندھیر نے بے دلی سے اُن بچوں کو حوالے کرتے ہوئے کہا۔

سدھیر نے اُن بچوں کو اُسی کھوکھ میں چھوڑ دیا۔ بچوں کی ماں افسردہ درخت کی سب سے اونچی ٹہنی پر بیٹھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اپنے بچوں کے پاس واپس آگئی۔

آٹھ دس دن خاموشی سے بیت گئے۔ رندھیر نے سدھیر کو تنگ کرنا شروع کیا۔ "بھائی صاحب، طوطے کے بچے۔" رندھیر کہتا۔

"اچھا بھائی چلیں گے۔" سدھیر کہتا۔ "ارے یار ذرا دم لینے تو دو۔"

بھادوں کا مہینہ، محلہ میں کراری دُھوپ، سدھیر اور رندھیر دن کے تین بجے کھیت پر جانے کے لئے تیار ہوگئے۔ ماں نے منع کیا۔ "دُھوپ پڑ رہی ہے، بیٹا۔ نہ جاؤ۔" لیکن رندھیر، سدھیر کی طرف معصومیت بھری نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کر دیا۔ سدھیر نے سوچا پھر تنگ کریگا۔ "چھتری لے جا رہے ہیں ماں۔" کہتے کہتے دالان سے نکل کر صحن اور صحن کے دروازے سے ڈیوڑھی پر نکل گیا۔

"دونوں چھتری لے جاؤ، بیٹا۔ چھجوا دو دن سے نہیں آیا۔ بیمار تو نہیں پڑ گیا۔ حال پوچھتے آنا، اچھا۔"

"اچھا ماں۔" رندھیر نے چلّا کر جواب دیا اور دونوں یہ جا وہ جا۔

بازار سے گذرے۔ پنواڑی کی دُکان پر بیٹھے ہوئے لڑکے نے سدھیر کو پکارا۔ "ارے بھئی شہر میں پڑھنے کیا چلے گئے، اب تو ہمارے دوستوں سے بولتے بھی نہیں۔"

"بھلا دوست کب چھوٹتے ہیں گرجا۔ کوئی نئی بات چیت۔" سدھیر چھتری ہلاتے ہوئے بولا۔

"نئی بات؟ نئی باتوں کی کیا کمی۔ بڑے مزے کی بات ہے یار۔"

"کیا ہوا؟!"

"رام لال کو جانتے ہو۔ وہی یار جو ... تھا نا۔ ایک چماری کے ساتھ بھاگ گیا۔"

"ارے! کیسی تھی؟"

"میاں ایسی ویسی تھوڑی تھی۔ پاس ہی منڈی میں گھاس ... آتی تھی۔ گوری چٹی، خوبصورت، آنکھیں مست ..."

"سدھیر بھیا، تو رام لال کا حقہ پانی بند..." رندھیر نے ایک بزرگ انسان کی مانند اپنی خاموشی کو توڑا۔

"چھوٹے بھائی، یہ قصبہ ہے۔ کل ہی کا واقعہ ہے۔ ابھی آج رام لال کا بھائی شام لال منڈی میں مزے سے آکر حقہ گڑگڑا رہا تھا۔" گرجا بولا۔

"بھیا چلو نا!"

"اچھا بھئی پھر ملیں گے۔"

"سندری تھی ہی خراب، نہ معلوم کس کس کے ساتھ بھاگ چکی ہے۔ جھک مار کر دونوں واپس آجائینگے۔"

"اور تو اور کس نزاکت سے بولتی تھی۔ لالہ جی یہ گھاس چھ پیسے سے کم نہیں دونگی۔" دوسرے لالہ حقہ گڑگڑاتے ہوئے بولے

"سدھیر بابو جے رام جی کی۔ تم بھی آکر قصہ سُن لو۔ قصبہ ہے بھیا قصبہ۔"

پاس ہی جوتے گانٹھتا ہوا چمار بولا۔ "لالہ برادری کی ناک کٹ گئی۔ پنچایت میں معاملہ پیش ہوگا۔ وہ تو خیر ہمارے مطلب کی نہیں رہی، مگر ہم بھی اپنا زور لگائیں گے لالہ..." اور پھر وہ اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔

"چودھری بالغ ہے بالغ۔ عدالت بھی اس میں کیا کریگی۔"

"میاں بیوی راضی تو کیا کرے قاضی۔" ایک نووارد بول اُٹھے۔

"چلو بھیا، دیر ہو رہی ہے۔" رندھیر نے سدھیر کو ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔

رندھیر اور سدھیر دونوں قصبے کو پار کرکے نہر کے پُل پر پہنچ گئے۔ تھوڑی دُور پرے مہندی کے کھیت تھے۔ نیم کے درختوں کے سایہ میں ہوتے ہوئے وہ مہندی کی کیاریوں میں نکل گئے۔ دھوپ کی زیادتی سے مہندی کے کھیت مُرجھا گئے تھے۔ ... دکھائی پڑتے تھے۔ ٹیلیفون کے تار بالکل ... کسی کونے

[illegible] بلبلوں کی مکرر تائیں اس کی آواز آرہی تھی۔ کھیت پر پہنچے

"[illegible] بابو جی، آؤ بیٹھو"

"[illegible] کہاں ہے۔ کالے"

"بابو جی اس کا حقہ پانی کیا بند ہوا وہ تو فکر میں گھلا جا رہا ہے۔

[illegible] گئی ہے"

"ارے! کیسی طبیعت ہے اب اسکی"

"[illegible] بہت ہو گیا ہے بابو جی۔ بیچاری بوہریا دن رات کام کرتی ہے

[illegible] حال کچھ کر دوائی لے آتے ہیں"

"[illegible] تو آرام ہو گیا"

"ابھی تھوڑی کسر باقی ہے"

"اچھا ہم بھی اسے واپسی میں دیکھ جائیں گے"

لیکن رندھیر برابر سندھیر کا کرتا پکڑ پکڑ کر کھینچ رہا تھا "چلئے نا"

"اچھا بھائی پھجوا سے کہنا ماتا جی کہہ رہی تھیں کوئی فکر نہ کرے

[illegible] ہو جائے گا..... چلتا ہوں بھئی"

"ارے یہ رندھیر چونک اٹھا" وہ پیڑ تو گر پڑا"

وہ پانچ چھ دن پہلے غیر متوقع طور سے زبردست ہوا چلی تھی۔ تندو تیز جو کہ آہستہ آہستہ آندھی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اور وہ کیکر کا درخت اس کا شکار ہو گیا جس تنے پر طوطے کے بچے تھے وہ ٹوٹ کر زمین پر آرہا تھا۔

رندھیر نے جا کر دیکھا۔ طوطے کے گھونسلے میں جھانکا۔ ہاتھ اندر بڑھایا، اور کچھ ہڈی کے پنجر اسکے ہاتھ میں آگئے۔ کیکر کے درخت کا تنا آندھی کی زد میں آکر گر پڑا تھا۔ اور اسکے زبردست صدمہ سے طوطے کے چھوٹے چھوٹے بچے مر گئے تھے جو دھوپ میں سوکھ کر ہڈی کا پنجر رہ گئے تھے۔

[illegible] کا گوشت چیونٹیاں ہڑپ کر گئی تھیں۔

سندھیر کو آج بہت تعجب ہوا۔ دنیا میں کیا کیا واقعات رونما ہوتے ہیں۔ پھجوا کہ بے قصور حقہ پانی بند ہونے پر بھی اتنا غم ہے اور اس مہاجن کا [illegible] زبردست گناہ کا ارتکاب کرنے پر بھی حقہ پانی بند نہ ہوا اور معصوم طوطے کے بچے جو شاید آج اسکے گھر میں آرام سے ٹیں ٹیں کرتے ہوتے قدرت کی [illegible] شکار ہو گئے۔ اسکی زبان سے نکل گیا "واہ ری دنیا"

"کیا ہے بھیا" رندھیر بولا۔

"کچھ نہیں"

"کچھ نہیں کے سوائے اس دنیا میں رکھا ہی کیا ہے۔

پرتھوی ناتھ شرما

رباعیات

جن کی ذہنیتیں ہیں رہن مجی
جانتے ہیں مجھے ترقی نہ بھی
فکر ہر کس بقدر ہمت۔ لیکن
بھینس کے آگے بین مجھ سے نہ بجی

(۲)

ادب و احترام کر سکتا ہوں
"نئو" رکوعی سلام "کر سکتا ہوں
توہین خودی نہیں گوارا۔ ورنہ
معبود زمیں کو رام کر سکتا ہوں

(۳)

بازگشت صدائے گنبد حق ہے
غوغائے "منم" جہالت مطلق ہے
جوہری مجکو جانتا ہے "پتھر"
میں سمجھتا ہوں جوہری احمق ہے

(۴)

پاکبازی سے پیٹ بھرتے رہیئے
عاقبت پر نگاہ کرتے رہیئے
خوشنودی رب دو جہاں کی خاطر
ہر مصیبت پہ شکر۔ مرتے رہیئے

(۵)

چاہتا ہوں اداب نوازی کرنا
سستے داموں بجا رہا ہوں ڈنکا
پروپاغندہ تعلی کب تک
گھر کا بھیدی جو ڈھا رہا ہے لنکا

شاد عارفی

فانی بدایونی

ہندوستان کا کونسا ایسا گوشہ ہے جہاں شاعر نہ ہوں مگر ان میں بہت سے ایسے ہیں جو شعر گوئی تو کجا شعر فہمی کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے، شاعری دراصل ایک بہت مشکل آرٹ ہے، اور اس میں کامیابی حاصل کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں، پھر جس طرح ہر اچھے آرٹسٹ کو کامیاب ہونے میں ایک عرصہ لگتا ہے اسی طرح ہر عمدہ شاعر کو اچھا شعر کہنے میں کافی مدت درکار ہوتی ہے، البتہ خداداد ذہانت علمی استعداد، عام معلومات اور موزوں ماحول اس مدت میں کمی بیشی کر دیتا ہے، حقیقی شاعر بنتا نہیں پیدا ہوتا ہے مگر اس کی پیدائش عام نہیں ہوتی۔

ہندوستانی شعرا کو ان کے کلام کے اعتبار سے دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک رجائی اور دوسرے قنوطی، اگرچہ یہ تقسیم بالکل قطعی اور صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ بعض قنوطی شاعروں کے یہاں کہیں کہیں رجا کا رنگ جھلک آتا ہے، اور رجائیوں کے یہاں قنوط پیدا ہو جاتا ہے، مگر یہ تقسیم اس اعتبار سے بالکل صحیح ہے کہ ان کے کلام کا بیشتر حصہ کسی ایک نہ ایک رنگ کو ظاہر کرتا ہے، اور وہی اُن کا مخصوص رنگ کہلاتا ہے، قنوطی شعرا پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ زندگی کے مختصر لمحات کو جو خود ہی حُزن و ملال، رنج و الم، قنوط و یاس اور مصیبتوں و تکلیفوں سے پُر ہوتے ہیں۔ اپنے قنوطی خیالوں سے اور زیادہ بھیانک اور ڈراونے بنا کر پیش کرتے ہیں، انسانی زندگی کا بڑا حصہ خود ہی یاس و یاسیات پر مشتمل ہے، اور جب اسی کو اپنا مطمح نظر بنا لیا جائے تو پھر زندگی میں کیا باقی رہ جاتا ہے اسی لئے کہا ہے ؎

اے شمع تیری عمر طبعی ہے ایک رات
رو کر گزار یا اسے ہنس کر گزار دے

لیکن معترضین اس سلسلہ میں چند باتیں نظر انداز کر دیتے ہیں، سب سے پہلے یہ کہ اگر شاعری واقعی حقیقت بیانی کا نام ہے تو ایک ایسے شخص سے جس نے خود اپنی ساری عمر میٹھے اور دلکش نغمے نہ سنے ہوں یہ توقع کیسے رکھی جا سکتی ہے کہ وہ دوسروں کو دلکش اور شیریں نغمے سُنا کر اُن کے دلوں کو لُبھا سکتا ہو، لیکن اگر وہ تصنع و بناوٹ سے کام لیتا ہے تو حقیقت اور صداقت سے دُور ہو جاتا ہے، وہ ایک سوانگ بھرتا ہے جس کی اصلیت کچھ نہیں ہوتی، وہ جو کہتا ہے اسکو خود محسوس نہیں کرتا، وہ صرف روشن پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے، اور تاریک رخ کو جو ہماری زندگی کا اہم حصہ ہیں نظر انداز کر دیتا ہے، اس طرح نہ صرف وہ ادب میں تصنع اور بناوٹ کو داخل کر کے ادب کو نقصان پہونچاتا ہے بلکہ دُنیا کو دھوکا دینے کے علاوہ خود اپنے ضمیر کو بھی دھوکا دیتا ہے اور ایک بلند پایہ شاعر کی یہ شان کبھی نہیں ہوتی، اس کا کام تو یہ ہے کہ وہ جو کچھ اور جس طرح محسوس کرے، اس کو اسی طرح دوسروں کے سامنے پیش کر دے، اب یہ ہر انسان کے ذاتی محسوسات ہیں کہ وہ کس چیز سے کیا خاص تاثرات اخذ کرتا ہے اور یہ تاثرات اس کے ماحول، تربیت اور زندگی کے تجربات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک حافظ، صوفی، پہلوان اور ایک کنجڑا ایک جنگل میں جا رہے تھے کہ ایک تیتر بولا، کسی نے پوچھا کہ بتاؤ تیتر کیا کہتا ہے۔ حافظ نے کہا۔ اقرا بسما الفطرت، صوفی نے کہا سُبحان تیری قدرت، پہلوان نے کہا۔ کھا گھی اور کر کسرت۔ کنجڑے نے کہا۔ پیاز لہسن ادرک، دراصل تیتر کیا کہہ رہا تھا یہ کسی کو معلوم نہ تھا مگر ہر شخص نے اپنی استعداد اور ماحول کے مطابق اس سے اثر لیا۔ اور یہ اُن کے ذاتی محسوسات تھے جن کو انہوں نے ظاہر کیا، اور جو ایک دوسرے سے بالکل الگ تھے، بعینہٖ یہی صورت شاعر کے ساتھ پیش آتی ہے، وہ اپنی استعداد اور ماحول کے مطابق ایک چیز سے خاص اثرات قبول کرتا ہے اور ان کو بالکل اسی طرح دوسروں کے سامنے پیش کر دیتا ہے، یہی آرٹ کی کامیابی اور عمدہ شاعری ہے۔

دوسرے ہندوستان جیسے ملک میں جہاں بے روزگاری عام ہو، افلاس کا رونا گھر گھر ہو، فاقہ کشی کی مصیبتیں عام ہوں، محکومیت اور غلامی کا راج ہو، جہاں اہل فن اور اہل نظر کی قدر نہ ہوتی ہو جہاں انسانوں کے قہقہوں، چڑیوں کے چہچہوں، بُلبل کے نغموں اور بہار کے راگوں کی جتنی بھی کمی ہو ٹھیک ہے، پھر یہ سمجھنا کہ قنوطیت پست ہمتی کی طرف دھکیلتی ہے صحیح نہیں، جس طرح ڈاکٹر اور طبیب مریض کو تلخ سے تلخ دوائیں دے کر اُس کے مرض دُور کرنے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح ملک و قوم کو بھی تلخ جرعوں کی ضرورت ہوتی ہے [illegible]

[illegible] زندگی ہوتی تباہ کو ابھار کر ساحل سے لگا دیں ہ

شوکت علی خاں نام فانی تخلص تھا بدایوں کے رہنے والے تھے علی گڑھ سے بی۔ اے کے بعد ملازمت کر لی پھر ایل ایل بی کا امتحان پاس کر کے وکالت کی، مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر زمانہ میں حیدر آباد چلے گئے اور بلدہ کے ایک ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے۔ وفات سے دو ڈھائی سال پہلے ریاست کے ایک ضلع بیٹر میں تبادلہ ہوا اور وہیں مرحوم اس دُنیا سے رُخصت ہو گئے، نواب معظم جاہ بہادر (جو نیر پرنس) اور مہاراجہ سرکشن پرشاد آنجہانی ان کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے، اور مرحوم ان کی محفلوں کا ایک درخشاں ستارہ تھے، حضرت فانی کو اردو کے بلند پایہ شعرا میں ایک ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ ان کا رنگ سب سے جُدا گانہ تھا، اور یہ اپنے رنگ کے امام تھے، کون کہہ سکتا تھا کہ داغ جیسے رنگین استاد کا شاگرد حُزن کا بادشاہ بنے گا، مگر یہ بھی کسے معلوم تھا کہ شاگردِ رشید کی ساری زندگی ہی وقف رنج والم رہے گی، فانی کو زندگی بھر ایسے پُر درد واقعات پیش آتے رہے جنہوں نے ان پر ایک خاص اثر کیا اور یہ رنگ ان پر ایسا چڑھا کہ دل کی دُنیا ہی بدل گئی۔ ان کو گل کے بجائے خار وصال کے بجائے فراق اور اُمید کے بجائے یاس کا خیال آنے لگا، سُریلے نغمے ان کو محظوظ کرنے کے بجائے ان کے دل پر چوٹ لگانے لگے، لحن بُلبل جگر خراش بن گئی، موسم بہار چاک گریبانی میں اضافہ کرنے لگا، وہ آسمان اور زمین دونوں سے بیزار ہو گئے ان کو قرب و بعد منزل کسی کا بھی ہوش نہ رہا، مختصر یہ کہ ان کے "دل کے چمن کی ہر کلی جل گئی"! اور نہ ان کو دُنیا سے غرض تھی اور وہ چاہتے تھے کہ نہ دُنیا ان سے غرض رکھے۔ اس انقلاب کی تصویر ان الفاظ میں خود ہی خوب کھینچی ہے ۔

مشغول بیٹھے ہم ایک زمانہ ہوا ٭ محفل آرائی و خود آرائی
دل کہ تھا آشنائے ذوقِ نظر ٭ ہم کہ تھے وصل کے تمنائی
ہم وہی، دل، وہی تھی لیکن ٭ نہ وہ سودا نہ ہم وہ سودائی
فرصتِ شوق ہو رخصتِ ہوش ٭ کوچہ گردی نہ دشت پیمائی
لحن بلبل جگر خراش ہے اب ٭ نہیں بھاتی گلوں کی رعنائی

ان خیالات اور تاثرات کے تحت اُنہوں نے جس چیز کو جیسا پایا ویسا ہی پیش کر دیا، ان کو اس سے مطلب نہیں کہ دوسرے بھی اسے ایسا محسوس کرتے ہیں یا نہیں، چنانچہ زندگی کی تعریف یہ کی ہے ۔

ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا

ہر نفس آہ اور انفاس پہ جینے کا مدار
زندگی آہ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں

اپنے دل کی دُنیا کا نقشہ یوں کھینچا ہے ۔

غبارِ رشکِ خارستانِ حسرت یاس کے منظر
ہمارے دل کی دُنیا بھی کوئی دُنیا میں دنیا ہے

انسانی زندگی میں اُمید جو اہم حیثیت رکھتی ہے وہ شاید بادی النظر میں نمایاں نہ معلوم ہوتی ہو۔ لیکن کون ایسا فرد ہے جس کا دل اُمیدوں سے خالی ہو۔ زندگی اُمید ہی کا نام ہے، اور جب کوئی اُمید نہ رہے تو اسی حالت کا نام موت ہے۔ فانی نے اس اُمید کے کھیل کو یوں پیش کیا ہے۔

کھیل تھا سب اُمید کا یہ نہ رہی تو کچھ نہ تھا آرزوں کی کیا طلب شوق کا کاروبار کیا۔

جبر و اختیار حیاتِ انسانی کا ایک مختلف فیہ اور معرکۃ الآرا مسئلہ ہے، اس میں دو گروہ ہیں۔ ایک جبر کے حامی ہیں اور دوسرے اختیار کے قائل، یہ فیصلہ کہ کون صحیح ہے نہ ہمارا کام ہے، اور نہ کوئی شاعر ایسا حکم لگا سکتا ہے، مگر ایک دقیق نظر، باریک بین، بلند حوصلہ، عالی ظرف اور اولوالعزم انسان کو اگر دُنیا کچلنا شروع کر دے، آسمان اُس کی تباہی پر تُل جائے، گردشِ دوران اس کو جینے نہ دے تو پھر وہ اختیار کا قائل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ فانی بھی اپنے مخصوص خیالات اور فیصلہ کے تحت جبر کے حامی نظر آتے ہیں اور جا بجا انسانی اختیاری کو ظاہر کرتے ہوئے جبر کی پُر زور حمایت کرتے ہیں ۔

گنہگار کی حالت ہی رحم کے قابل ٭ غریب کشمکش جبر و اختیار سزا کیا
زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں ٭ ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں
دُنیا میں حال آمد و رفت بشر نہ پوچھ ٭ بے اختیار آکے رہا اور بے خبر گیا

وہ انسانی قصور صرف اس قدر بتلاتے ہیں ۔

وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا دے فانی
دو گھڑی ہوش میں آنے کے گناہگار ہیں ہم

اپنی مجبوریوں کا اظہار کرنے کے بعد سوال کرتے ہیں کہ اب ہم کو کیا کرنا چاہیئے ۔

جسمِ آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی رُوح
خیر جو چاہا کیا اب یہ بتا ہم کیا کریں

گو فانی جبر کے قائل نہیں مگر یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ باوجود
جبر کے ناانصافی نہیں ہو سکتی، اس کا کرم بے پایاں ہے، اور جب
خالق ہونے کی حیثیت سے اس کو انسانی لغزشوں، خطاؤں اور
گناہوں کا علم تھا مگر پھر بھی انسان کو پیدا کیا، اور بے اختیار بنایا۔
تو اس کا مقصد صرف یہی ہے کہ وہ اپنی شان کریمی کو پوری طاقت
اور شدت کے ساتھ ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

یا میرے بے شمار گناہوں سے در گذر
یا میرے عذر حسن کرم بے حساب سے

اور آخر میں فیصلہ کن لہجہ میں کہہ دیا ہے۔

کیا ہے خلق مجھے باوجود علم گناہ
یہ ابتدا ہے کرم کی تو انتہا کیا ہے

مندرجہ بالا سطور کے مطالعے کے بعد یہ رائے قائم نہیں کرنی
چاہیئے کہ فانی کے یہاں سوائے سوز و گداز کے اور کوئی نغمہ ہی نہیں
اس ساز سے اور بھی نغمے بلند ہوتے ہیں جو بہت گہرے اور اونچے
بھی ہیں، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں،
فانی کو جذبات کی مصوری پر قدرت تھی اور اسی کے ساتھ تخیل کی
بلندی واقعات و واردات کی نزاکتوں پر بھی پورا عبور رکھتے تھے،
فانی کا کمال ملاحظہ ہو ؎

کیا بلا تھی ادائے پرسش یار
مجھ سے اظہار مدعا نہ ہوا

لکھ چکے ہم، جا چکا خط، گر یہی حالت رہی
ہاتھ میں آیا قلم اور شوق کا دفتر کھلا

بلند خیالی اور سادگی کا جو اعلیٰ ترین نمونہ اس شعر میں پیش
کیا گیا ہے اردو میں فانی کے نام کے برقرار رکھنے کیلئے کافی ہے۔

ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

اخلاقیات کی تعلیم اکثر شعرا نے دی ہے، مگر فانی نے اپنے
اس شعر میں چند سیدھے سادے اور آسان الفاظ میں الٹ پھیر کر
عمرانیات کے ایک اہم کلیہ کی مدد سے کہ سہل ممتنع کے ذریعہ جس بڑے
اصول کو پیش کیا ہے اور جو بات کہی ہے وہ فانی ہی کا حصہ تھی۔

دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

طنز نگاری اکثر شعرا کا خاصہ رہی ہے اور بعض لوگ اس میں
حد سے بڑھ جاتے ہیں، مگر کامیاب طنز وہ ہے جس میں [illegible]
بات بھی کہہ دی جائے اور دوسرے کی اہانت اور [illegible]
فانی جیسے شخص سے یہ توقع تو کبھی ہی نہیں جا سکتی کہ وہ [illegible]
کیونکہ دکھا ہوا دل تو اس معاملہ میں بڑی احتیاط سے کام [illegible]
چنانچہ فانی بھی کبھی کبھی چوٹیں کرتے ہیں مگر اپنے خاص انداز میں۔ [illegible]
کہا ہے۔

فانی دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

بظاہر یہ شعر بہت معمولی معلوم ہوتا ہے، مگر جو لوگ حیدرآباد
سے اچھی طرح واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ وہاں ایک خاص اسپرٹ
ہے جو نہ صرف ملازمتوں اور سرکاری عہدوں تک محدود ہے بلکہ فن،
زبان، شاعری، موسیقی، مصوری غرضیکہ ہر شعبہ پر چھا گئی ہے اور
اور ہر موقعہ پر کسی نہ کسی صورت میں کسی نہ کسی کی جانب سے اس کا اظہار
ہو جاتا ہے نیز حیدرآبادی اپنے آپ کو ہندوستانی نہیں سمجھتے اور
نہ وہ اپنے خطہ کو ہندوستان میں شامل سمجھتے ہیں، ان کے یہاں
ہندوستان کا مطلب شمالی ہند ہے۔ فانی نے اس شعر میں دکن میں
آنے کے بعد جس عقدہ کے کھلنے کا اظہار کیا ہے اس کا پورا اندازہ وہی
لوگ کر سکتے ہیں جو حیدرآباد سے کافی واقف ہوں۔ لیکن [illegible]
فانی کا بہترین طنز غالباً اس شعر میں موجود ہے۔ "اللہ کا دشمن" قابل
غور ہے اور ذومعنی ہے۔

جو مجھ پہ ہوئی ایسی بیداد نہ کی ہوگی
اللہ کے بندوں پر اللہ کے دشمن نے

جنوری ۱۹۴۱ء میں بھوپال میں ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا تھا
جس میں جوش، جگر، دانش، سیماب وغیرہ کے علاوہ حضرت فانی
بھی تشریف لائے تھے، یہ آخری بڑا مشاعرہ تھا جس میں آپ شریک
ہوئے، اس میں آپ نے دو غزلیں سنائی تھیں، جو تازہ ترین تھیں
مگر بہت کم شائع ہوئی ہیں، ان کے چند اشعار تبرکاً پیش ہیں ؎

جی ڈھونڈتا ہے گھر کوئی دونوں جہاں سے دور
اس آپ کی زمیں سے الگ آسماں سے دور

شاید میں در خور نگہ گرم بھی نہیں
بجلی تڑپ رہی ہے مرے آشیاں سے دور

آنکھیں چرا کے آپ نے افسانہ کر دیا
جو حال تھا زباں سے [illegible]

ہے شیخ [illegible] میں دیرو حرم کا جوش
یعنی کہاں سے پاس ہو منزل کہاں سے دُور
[illegible] میں نہ ہے بندگی کی لاگ
اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دُور

دوسری غزل کے چند شعر یہ ہیں۔

زخم نصیب تھا جگر، زخمِ جگر سے کیا کہیں
ان کی نظر نے کیا کیا ان کی نظر سے کیا کہیں
آہ بھی کی ہے عطا، خیر وہ بے اثر سہی
[illegible] اپنی ہی باب اثر سے کیا کہیں
رمزِ نیاز ہے کہیں مُنہ سے نکالنے کی بات
سجدۂ دل کی واردات سجدۂ سر سے کیا کہیں
دل کے سوا یہاں کوئی محرم دردِ دل نہیں
بے خبروں سے کیوں کہیں اہلِ خبر سے کیا کہیں
دل کے چمن کی ہر کلی دیر ہوئی کہ جل گئی
بادِ سحر کو کیا غرض، بادِ سحر سے کیا کہیں

محمد احمد سبزواری

تعمیر میں تخریب

صبح کے رنگیں لبوں پر ہے تبسّم کی جھلک
گل متاعِ زر نچھاور کرتے ہیں کلیاں مہک
لیتی ہے انگڑائیاں غنچوں کے پہلو میں حیات
جگمگا اٹھی جھلک پڑتے ہی رُوحِ کائنات
بے تکلّف ہیں نظر کے سامنے دیوار و در
پنجۂ خورشید سے ٹکڑے ہے دامانِ سحر
اپنی مجبوری پہ اہلِ باغ نے سر دُھن لئے
ہر نے کرنوں کی پگوڈی سے موتی چن لئے
یہ سماں ہے میں ہوں اور لاہور کا لارنس باغ
گشت میں ہیں مغربی تہذیب کے چشم و چراغ
اس طرح نقشِ قدم ہیں سبزۂ نمناک پر
پڑ گئے ہوں جیسے دھبّے مخملیں پوشاک پر
ہے زمیں پر اس طرح قامت کے سایہ کا نشاں
آسماں پر جس طرح ہو پارۂ ابرِ رواں
سایہ میں یوں دست و پا کے مضطرب ہے تیرگی
آشنہ بازی میں ہو مصروف جیسے روشنی
پیکرِ شرم وحیا۔ شرم وحیا سے دُور ہے
سینۂ اخلاق میں رِستا ہوا ناسور ہے
ساریوں کے جمپروں کی نیم عریاں سی تراش
ناخنِ تدبیر کی ہے قلبِ فطرت پر خراش
چل رہی ہیں شوخیوں کی رَو میں اِٹھلاتی ہوئی
ہر قدم پر بے زری کی نعش ٹھکراتی ہوئی
سادگی رُخ پر کہاں ذوقِ نظر کی بھول ہے
یہ وہ تیور ہے کہ ہر انداز میں مقبول ہے
ظاہری صورت دلی جذبات کی تصویر ہے
بہکی بہکی سی نظر بیباک سی تقریر ہے
یہ مرقّع ہے اگر نخشب نئی تہذیب کا
رنگ آتا ہے نظر تعمیر میں تخریب کا

نخشب جارچوی

نقد و تبصرہ

دوسری جنگِ عظیم

اس اہم موضوع پر اُردو میں اب تک کوئی کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری۔ محمد مرزا صاحب نے، جو متعدد سیاسی کتب کے مصنف اور مشہور اخبار نویس ہیں، کتاب "دوسری جنگ عظیم" لکھکر وقت کی اس سب سے بڑی ضرورت کو پورا کر دیا۔ کتاب (۴۲) ابواب پر مشتمل ہے اور ان ابواب میں اتنی معلومات یکجا کی گئی ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد انگریزی کی ضخیم کتب پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے موضوعات میں ایک منطقی ربط پایا جاتا ہے۔ مصنف نے شروع میں "جنگ اور انسانیت" کے عنوان سے جنگ کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ اس کے بعد تاریخی شواہد کی روشنی میں ان تمام اسباب و علل کا جائزہ لیا ہے جن کا نتیجہ ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگِ عظیم کی صورت میں نکلا۔ پہلی جنگِ عظیم کی مجمل تاریخ اور اُس کے نتائج بیان کرنے کے بعد مصنف نے بتایا ہے کہ موجودہ جنگ پہلی جنگ عظیم ہی کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے تفصیل سے دولِ عالم اور بالخصوص دولِ یورپ کی گزشتہ ربع صدی کی تاریخ پیش کی ہے۔ جس میں جملہ سیاسی تحریکیں، اُنکے محرکات اور اُن کے نتائج کا احاطہ کیا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کا ایک ایک واقعہ تاریخی صحت کے ساتھ پیش کرنا اور اس پر مورخانہ غیر جانبداری سے اظہارِ خیال کرنا ایک بیحد دُشوار مرحلہ تھا۔ جسے مصنف نے بڑے سلیقے اور خوش اسلوبی سے طے کیا ہے۔ اس کتاب کی بڑی خوبی ایک یہ بھی ہے کہ مصنف نے اپنے دلکش اندازِ تحریر سے اِس خشک موضوع میں ایک لطیف ناول کا سا لطف پیدا کر دیا ہے۔ یہ کتاب ۲۰ مئی کو شائع ہوئی ہے اور اس میں ۱۵ مئی ۱۹۴۰ء تک کے مکمل واقعات درج ہیں۔ اُمید ہے کہ اس کتاب کی بہت قدر کی جائے گی کیونکہ اس پایہ کی کتابیں شاذ و نادر لکھی جاتی ہیں۔

ضخامت ۳۱۲ صفحے۔ مضبوط جلد۔ خوشنما سرورق۔ قیمت ایکروپیہ آٹھ آنے (عہ)

ملنے کا پتہ۔ کتب خانہ علم و ادب۔ اُردو بازار۔ دھلی۔

"یشس"

نقشِ اوّل

محترمہ صالحہ عابد حسین کے لکھے ہوئے ڈراموں اور افسانوں کا مجموعہ ہے۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں چھ ڈرامے ہیں اور دوسرے حصے میں چھ افسانے۔ یہ دونوں حصے ایک جگہ مجلّد ہیں۔ محترمہ موصوفہ سلیس اور موثر عبارت لکھنے میں خاص سلیقہ رکھتی ہیں۔ ڈراموں اور افسانوں کے پلاٹ ہندوستانی گھرانوں خصوصاً مسلمان شُرفا کی گھریلو زندگی سے لئے گئے ہیں۔ یہ سب مضامین "ادب برائے زندگی" کے ترجمان ہیں اور ایسے ہی ادب کی ہمیں ضرورت ہے۔ اُمید ہے کہ "نقشِ اوّل" کی قدر کی جائے گی۔ ضخامت (۳۴۰) صفحات۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ جلد خوش رنگ اور مضبوط۔ گرد پوش سے آراستہ۔ قیمت دو روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ حالی پبلشنگ ہاؤس۔ اُردو بازار۔ دھلی۔ "یشس"

محشرِ خیال

یہ علی گڑھ یونیورسٹی کے مشہور فرزند اور جواں مرگ ادیب جناب سجاد علی انصاری بی۔ اے؛ ال ال۔ بی۔ کے مضامین اور نظموں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ مرحوم بلا کے ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت آزاد خیال اور بیباک قلم تھے اور یہ مضامین اُن کے اُس زمانے کی یادگار ہیں جب نوجوان بالعموم بے پروا اور لااُبالی ہوتے ہیں۔ سجاد کی تحریر و تخیل کا رنگ دوسرے مضمون نگاروں سے الگ ہے۔ وہ مضمون نگار (essayist) بڑے اچھے تھے اور اپنے مضمون میں باریکیاں اور بات کی بات پیدا کرنے کی بھی ان میں بڑی صلاحیت تھی۔ اس مجموعے میں ایک طویل ڈراما "روزِ جزا" (نامکمل) بھی شامل ہے، جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں مصنف نے بعض باتیں بڑے مزے کی کہی ہیں [illegible] میں انہوں نے جس بیباکیٔ فکر اور جدت نگاری سے کام لیا ہے وہ بطورِ خاص داد چاہتا ہے۔

آخر کے بیس صفحات میں مرحوم کی نظمیں، غزلیں اور متفرق اشعار ہیں۔ بحیثیت شاعر سجاد کا درجہ بلند تھا۔ یہ وہی شاعر ہے جو بے دھڑک کہہ سکتا تھا ؎

میں نے ہجومِ حشر میں رکھ لی خدا کی شرم
ہر جرم پر کہا کہ مرا ہی قصور تھا

ان کے بعض اشعار تو ایسے دلگداز ہیں کہ فوراً یاد ہو جاتے ہیں۔ مثلاً

شرمندگیٔ عفو سے ہوں شعلہ بدامن
اے رحمتِ گستاخ، گناہوں کی حیا دیکھ!

محمود داری کہیں شرمندۂ رحمت نہ ہو
وہ گنہ کرتا ہوں میں جو عفو کے قابل نہیں

مانا کہ سکونِ غم ہے بہتر
پر غم کا بھی اعتبار کب تک؟

ہو گئے تو جھکو ملی منزلِ حیات
میں انتہائے یاس میں بھی کامیاب ہوں

کتاب کی ابتدا میں ایک دیباچہ بھی شامل ہے۔ جسے اگر شامل نہ کیا جاتا تو شاید کتاب زیادہ وقیع ہو جاتی۔

سائز ساقی کا نصف۔ کتابت، طباعت، کاغذ عمدہ۔ صفحات ۲۰۸ مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ قیمت قسم اول تین روپے اور دوم دو روپے۔ ناشر:۔ خان الیاس احمد مجیبی۔ قرول باغ نئی دہلی

"ص۔ ا"

زہریلی مکھی:۔ سید محمود مورخ۔ بی۔ اے۔ کے افسانوں کے دو مجموعے "شہر خموشاں" اور "مورخ کے افسانے" شائع ہو کر مقبولِ عام ہو چکے ہیں۔ اب اُن کا تیسرا مجموعہ "زہریلی مکھی" ... سے شائع ہوا ہے۔ اس میں ان کے دس عمدہ افسانے شامل ہیں ... صاحب نے فنِ افسانہ نگاری کا غائر مطالعہ کیا ہے۔ اور ان افسانوں ... دیکھنے سے اُن کی دقتِ نظر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ افسانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دلچسپ ہو۔ پڑھنے والا کسی افسانے کو شروع کرے تو آخر تک اُسے پڑھنے پر مجبور ہو جائے۔ مورخ صاحب کے افسانوں میں یہ خوبی موجود ہے۔ ان کا طرزِ بیان سیدھا سادا ہے مگر دلکش۔ افسوس ہے کہ کتاب کی چھپائی اچھی نہیں ہو سکی ... وقت داران کی بھی پریشانیاں ہیں۔ تاہم یہ مجموعہ بھی اپنے مجموعوں کی طرح قدردانی کا مستحق ہے۔ ضخامت (۱۴۰) صفحات ... ملنے کا پتہ:۔ گلفروش پبلشنگ ہاؤس۔ لال کنواں۔ دہلی۔

"یش"

...ب آدمی تھا:۔ دلی ریڈیو اسٹیشن سے اس عنوان کے تحت بہت اچھی تقریریں نشر ہوئی ... ان میں سے گیارہ تقریریں حالی پبلشنگ ہاؤس نے ایک خوشنما کتاب کی صورت میں شائع کی ہیں۔ راشد الخیری، حالی، نذیر احمد، چکبست، داغ، پریم چند، اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، اقبال، راس مسعود اور محمد علی پر اُن حضرات نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جو ان بزرگوں سے بے تکلف وابستگی رکھتے تھے۔ مقرروں کے نام یہ ہیں: ... واحدی، خواجہ عبدالمجید، مولوی عبدالرحمٰن، علامہ کیفی، بیخود دہلوی، جسندر رکمار، حکیم ذکی احمد، محمد غالب، ممتاز حسین، غلام السیدین اور عبدالماجد دریابادی۔

تقریریں سب کی سب بہت قابلِ قدر ہیں اور حالی پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی کا یہ ایک احسان ہے کہ اس کتاب کے ذریعے ان سب تقریروں کی صدا ابدی ہو گئی۔ ٹائیٹل رنگین۔ کتاب مجلد ہے۔ قیمت صرف ۸؍

"ش"

کمپنی کی حکومت:۔ مؤلف:۔ کامریڈ باری (علیگ) ناشر:۔ مکتبۂ اردو لاہور۔ قیمت مجلد دو روپے

"کمپنی کی حکومت" کا یہ دوسرا اور زیادہ مکمل ایڈیشن ہے۔ اس میں پہلے ایڈیشن کے مقابلے میں چند باب بڑھا دئے گئے ہیں اور حالات اور واقعات کی ترتیب میں زیادہ شرح وبسط سے کام لیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں کمپنی کے عہدِ حکومت سے متعلق انگلستان کے معروف مدبرین کے افکار وآرا بھی ایک جگہ جمع کر دئے ہیں جن سے کمپنی کی حکومت کے نقائص اور ہندوستان کی صنعتی تباہی کے اسباب پر روشنی پڑتی ہے۔

زبان صاف اور سلجھی ہوئی اور اندازِ بیان پُر زور اور مؤثر ہے۔ غرض کتاب شروع سے آخر تک دلچسپ اور سبق آموز ہے اور اُن حضرات کیلئے جو کمپنی کے دورِ حکومت کے ہندوستان سے واقف ہونا چاہتے ہیں اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ لکھائی چھپائی بہتر، جلد خوبصورت تختی چھوٹی۔ حجم ۳۸۴ صفحات۔

"م۔ م"

جزیرۂ سخنوراں:۔ از غلام عباس سب ایڈیٹر آواز۔ نئی دہلی۔ ناشر کتاب خانہ ہزار داستان نئی دہلی۔ قیمت عہ

یہ ایک دلچسپ "پیروڈی" ہے جس میں شعرائے قدیم، ان کے ماحول، ان کے کلام، ان کے معتقدات اور ان کے لگے بندھے تخیلات کی "طنزیہ تمثیل" پیش کی گئی ہے اور ان کی عملی زندگی میں اُن "اثرات" کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اس روایتی شاعری کا قدرتی نتیجہ ہو سکتے ہیں —— گویا قدیم شاعری پر نئے زاویہ سے تنقید کی گئی ہے اور اس اعتبار سے غلام عباس صاحب کی یہ جدت فی الحقیقت قابلِ داد ہے! لکھائی چھپائی عمدہ تختی چھوٹی حجم ۱۱۴ صفحات۔ ٹائیٹل پیج نہایت خوبصورت مجلد ... "م۔ م"

جہان ...

فہرست مضامین ماہ ...

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

سامانِ طباعت اور کاغذ کی بے انتہا گرانی کی وجہ سے جن دشواریوں سے اردو رسائل کو دوچار ہونا پڑا ہے ان کا [illegible] جا سکتا ہے کہ جس رسالے کا سالانہ خرچ دس ہزار تھا اب تقریباً پچیس ہزار ہو گیا ہے۔ ایک [illegible] جب [illegible] ہزار سالانہ کی لاگت میں بھی منافع نہیں تھا تو پچیس ہزار کی لاگت میں ذرا غور فرمائیے صاحب [illegible] ہوگا؟ پندرہ ہزار سالانہ کا نقصان خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کا بوتا اردو کے کسی رسالے میں تو ہے نہیں۔ لہٰذا اس خسارے سے بچنے کیلئے [illegible] رسائل نے چندہ بڑھا دیا، بعض نے ضخامت گھٹا دی۔ بعض نے دونوں تدبیروں پر عمل کیا۔ اور ایک تیسری تدبیر یہ نکالی کہ [illegible] شائع ہونے کے بجائے ڈیڑھ ڈیڑھ اور دو دو مہینے میں شائع ہونے لگے۔ بعض ان سب سے بڑھ گئے کہ پانچ پانچ مہینے کا شائع ہونے لگے اور اس پر بھی بڑی ہمت سے جاری ہیں۔ بعض نے تنگ آکر خودکشی کر لی۔ غرض اردو رسائل پر عجب وقت پڑا ہے۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ خریداروں سے مزید امداد کی اپیل کرنا ایک نامناسب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ ان کی یہی مہربانی کیا کم ہے کہ [illegible] سے میں رسالے کا چندہ ہی دیدیتے ہیں۔ اشتہارات کی مد ادبی رسائل میں ہوئی نہ ہوئی برابر ہے۔ گندے اور فحش اشتہارات ان میں شائع نہیں ہو سکتے، فلمی اشتہارات انہیں دیے نہیں جاتے، اور سرکاری اشتہارات سے تو بھلا انہیں واسطہ ہی کیا ہے۔ دو چار اچھے اشتہارات سے یہ گڑھا بھرا نہیں جا سکتا۔ ساقی نے اپنی بک ڈپو سے اس نقصان کو پورا کرنے کی کوشش کی اور اس میں خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی۔ لیکن وہی سامانِ طباعت اور کاغذ کی گرانی کا بھیانک سوال یہاں بھی پیش آنے لگا۔ لاگت زیادہ اور کتابوں کی قیمتیں وہی [illegible] گویا عذاب میں بک ڈپو بھی مبتلا ہو گئی اور ساقی کی کفالت پوری طرح نہیں کر سکتی۔ ساقی کی وجہ سے جتنی مالی زیرباری ہو رہی ہے اسے ادارۂ ساقی ہی کو برداشت کرنا پڑتا ہے، اس لئے قدردانِ ساقی سے درخواست ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس زیرباری میں مزید اضافہ اپنی طرف سے نہ ہونے دیں۔ یعنی رسالہ یا کتابیں بذریعہ وی۔ پی طلب کر کے واپس نہ کریں۔ رسالہ کا چندہ ختم ہونے پر اپنا چندہ بھیجدیں یا وی۔ پی وصول کر لیں اور اگر خریداری آئندہ منظور نہ ہو تو ایک کارڈ لکھ کر دفتر کو اطلاع دیدیں۔ جواب طلب امور کے لئے محصول ڈاک بھیجیں۔ نیز مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ اپنے مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھی بھیجیں تاکہ مضمون اگر قابل اشاعت ہو تو انہیں اطلاع دیدی جائے ورنہ واپس بھیجدیا جائے۔ جو حضرات محصول ڈاک نہیں بھیجیں گے افسوس ہے کہ انہیں دفتر سے کوئی جواب نہیں بھیجا جا سکے گا۔ بعض حضرات کے خطوط بیرنگ وصول ہوتے ہیں۔ آئندہ زیرباری سے بچنے کے لئے ایسے تمام خطوط واپس کر دئے جائیں گے۔ امید ہے کہ ہمدردانِ ساقی ہماری مشکلات کا اندازہ فرما کر اس کو نظر انداز نہیں کرینگے۔

اکتوبر کے ساقی میں حضرت امین حزیں کی نظم میں کچھ کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں، ناظرین ان کی تصحیح فرما لیں:-

"غلجانِ خرد" (اکتوبر ۱۹۴۶ء) کے دوسرے بند کے پہلے تین شعر یوں ہونے چاہئیں:-

کن فکاں سے ظہور ہے میرا — سرمدی اک سرور ہے میرا

شعلہ ساماں شعاعِ مضطر ہوں — حاصلِ سوز نور ہے میرا

لن ترانی کی آگ ہوں گویا — اور کفِ خاک طور ہے میرا

ادب اور جدید ایجادات

پیشتر اسکے کہ ہم ادب پر [illegible] جدید ایجادات کے اثرات کا [illegible] ادب میں ان اثرات کا اندازہ لگائیں جو مشینی دور [illegible] کے زیر اثر [illegible] یا ہو رہی ہیں، یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ادب [illegible] مفہوم سے غور کیا جائے۔ مشینی دور میں ادب کا دائرہ [illegible] حد تک وسیع ہی نہیں ہو چکا بلکہ ادب کے ذرائع نشر بھی [illegible] اور محسن پیچیدگی میں ادب سے بہت دفعہ غلط [illegible] منسوب کئے جا رہے ہیں۔ آجکل کہانیاں، ناول یا ڈرامے صرف کتابوں کے سیاہ حرفوں میں ہی نہیں لکھے جاتے، بلکہ روزانہ، ہفتہ وار اور ماہوار اخبار اور رسالوں میں بھی چھپتے ہیں۔ نشرگاہوں سے نشر کئے جاتے ہیں، اور فلمیں بنا کر ان کی دنیا کے ہر حصے میں نمائش کی جاتی ہے۔ عصرِ حاضر میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ صرف کتابی صورت میں چھپنے والی تحریریں ہی ادب ہیں اور دوسری نہیں، اور نہ ہی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمام کتابوں اور اخباروں میں چھپنے والی، براڈکاسٹنگ اسٹیشنوں سے نشر ہونیوالی، اور فلموں کے ذریعے نمائش کی جانیوالی چیزیں ادب ہیں۔ اس لئے ادب کے سلسلہ میں کسی بحث کو شروع کرنے سے پیشتر ادب کو واضح طور پر سمجھنا [illegible] ہوگا۔

ادب حیاتِ انسانی کی ترجمانی اور تنقید ہے۔ انسان کی تمناؤں اور [illegible] کی تفتیش اور تحقیق۔ اسکے دکھوں سکھوں، اچھائیوں اور برائیوں کی [illegible] حقیقت اور باحیات آئینہ داری۔ ادب کا ضروری مقصد انسان کے بنیادی جذبات کو بے نقاب کرنا ہے۔ یہ اپنی تخلیقی تحریک اس کی مشترکہ دائمی اور عمیق ہمدردیوں سے حاصل کرتا ہے۔ بقول نامور انگریز شاعر الیگزینڈر پوپ، نسلِ انسانی کے لئے اعلیٰ ترین مطالعہ خود انسان ہی ہے اور ادب کا نصب العین یہی ہے۔ اس کے بغیر کوئی تحریک ادب نہیں کہلا سکتی۔ اس کے علاوہ خیالات کی بلند پروازی اور اسلوبِ بیان کی اکملیت بھی ادب کے نہایت ضروری عناصر ہیں۔ قوتِ تحریر سے جب تک کسی تصنیف کو دھڑکتے ہوئے زندہ احساسات سے بھرپور کر کے ایک ایسی جیتی جاگتی مکمل اور کامل زندگی نہ بنا دیا جائے جو ہمیں [illegible] کی طرف پرواز کرنے کا سندیسہ دیتی رہے تب تک وہ تحریر ادب کے بلند معیار تک نہیں پہنچ سکتی۔ ایک بلند پایہ ادب انسان کی مضمر اور سوئی ہوئی قابلیتوں اور [illegible] کو بیدار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ہمیں بہتر انسان بننے کی تحریک کرتا ہے۔ [illegible] امنگوں اور آزمائشوں کے ساتھ ساتھ پرواز [illegible] نہیں کرتا [illegible] صبح کی طرح ہمارا خضرِ راہ بھی بنتا ہے۔ یہی وہ دیا ہے جس کی [illegible] میں نسلِ انسانی زندگی کے دائمی کوچ میں اپنا راستہ تلاش کرتی ہے۔ انقلابِ فرانس کا خیال کرتے وقت کون روسو کی تصانیف [illegible] کر سکتا ہے، اور نہ ہی انقلابِ روس کا ذکر کرتے وقت مارکس کے [illegible] کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

گبن کی کتاب "سلطنتِ روم کا انحطاط و زوال" اگر صرف خشک تاریخی حقیقتوں کا پرحسن بیان ہی ہوتا تو وہ کتاب ایک ادبی تصنیف نہ ہوتی اور اُسے لکھنے میں گبن کو بیس سال کے بجائے بیس مہینے بھی نہ لگتے۔ وہ کتاب اگر ایک ادبی جوہر ہے تو اس لئے کہ چند تاریخی واقعات کے علاوہ مصنف نے اپنے غیر معمولی اور [illegible] باریک بین بصیرت اور باکمال جادو بیانی سے اُن تاریخی واقعات کی بے جان ڈھانچے میں گوشت خون اور روح ڈال دی ہے یہانتک کہ ہم اس میں ایک زندہ قوم کا دھڑکتا ہوا دل محسوس کرنے لگتے ہیں اور اُس کی شاندار زندگی کی سبق آموزی کا احساس کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح ڈارون کی "ابتدائے انواع" (Origin of Species) یا جان سٹورٹ مل کی "آزادی" (On Liberty) اس لئے ادب سمجھی جاتی ہیں کہ ہم اُنکے بنیادی مدعا اور دلیلوں کو نظر انداز کر کے بھی اُن کی قوتِ تحریر سے اپنے آپ کو بے اثر نہیں رکھ سکتے۔ یہ کتابیں کسی خاص نظریہ کی حمایت یا تائید ہی نہیں کرتیں بلکہ اُن رفیع ذہنی کاوشوں کو بھی روشنی دیتی ہیں جن کے زیرِ اثر اُن نظریات کو قائم کیا گیا۔ یہ اُن بلند ولولوں اور جذبات کے نقوش اور اثرات کی عکاسی بھی کرتی ہیں جنہیں ان دلیلوں اور نظریات نے ادیب کے ذہن پر ثبت کیا۔ افلاطون کی تصانیف ہی کو لیجئے۔ اُس کا طرزِ بیان ہمیں اس کے اُصولوں سے ہی واقف نہیں کرتا بلکہ اس عملِ قیاس و استدلال سے بھی روشناس کرتا ہے جس کی اعانت سے وہ اپنے [illegible] پہنچا یہانتک کہ ہم جستجوئے علم کا لطف محسوس کرنے لگتے ہیں [illegible]

[illegible] ہم محسوس کرتے جاتے ہیں کہ ہم ایک [illegible] ہو رہے ہیں اور اپنے آپ پر ایک [illegible] محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ہم کسی ادبی عمل پر [illegible] لیکن اس کا مطالعہ بھی ہمیں اخلاقی بلندیوں کی طرف [illegible] کی سعی کرتا ہے۔

ادب کا یہ معیار اپنے سامنے رکھ کر ہمیں اس امر کا جائزہ لینا ہے کہ عصر حاضر میں وسائلِ نشر و اشاعت کی تحیر انگیز ترقی ادب پر کس طرح اور کس حد تک اثر انداز ہو رہی ہے۔ آجکل خود سائنس اس برق رفتاری سے ترقی کر رہی ہے کہ پہلے جو انقلابات صدیوں میں رونما ہوا کرتے تھے اب برسوں میں ہو رہے ہیں۔ کیا ادب بھی ان ناقابلِ اعتبار ترقیوں کے دوش بدوش آگے بڑھ رہا ہے؟

ادب کا سب سے آخری دور پندرھویں صدی میں چھپائی کی مشین کی ایجاد سے شروع نہیں ہوتا بلکہ اس کا آغاز بیسویں صدی سے ہوتا ہے۔ پریس کی ایجاد و ترقی نے کتابوں کی چھپائی کو آسان اور سستا بنا کر ادب کی رسائی عوام تک کر دی تھی لیکن ریڈیو، سینما، جدید صحافت، بے تار برقی وغیرہ نے ادب کے ذرائع نشر کو بہت وسیع کر دیا ہے جس سے اس کی عوام کی زندگی پر اثر انداز ہونے کی امکانی قوت بہت بڑھ گئی ہے۔ جدید ایجادات کا عوام کی روزمرہ زندگی پر اثر کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف آج ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ہر قابلِ تصور موضوع پر مختلف کتابوں کی پانچ لاکھ کے قریب جلدیں چھپ چکی ہیں۔ آج صبح وہاں ساڑھے تین کروڑ اشخاص نے اخبار بینی کی۔ آج شام وہاں ایک چھوٹے سے بکس سے نکلتے گانے یا ڈرامے کو تین کروڑ سے زائد مرد، عورتیں اور بچے سنیں گے۔ آج رات کو اسی ملک میں ایک کروڑ کے قریب شائقین مختلف فلموں سے محظوظ ہوں گے اور خاصکر یہ اخبار، فلم اور ریڈیو تو عوام کی زندگی کا اتنا ضروری عنصر بن چکے ہیں جو کتابیں کبھی بھی نہیں بن سکتی تھیں۔

مشینی دور سے پہلے ادب ایک خاص قسم کے سامعین تک محدود تھا۔ کسی مقرر کو جو کہنا ہوتا اسے وہی لوگ سُن سکتے تھے جو اس کی خلبہ گاہ یا ممبر کے ارد گرد اکٹھے ہو سکیں۔ سقراط کو ان چند تحقیق پسند شاگردوں سے اپنے آپ کو تسلی دینی ہوتی تھی جن کو اپنے روزمرہ کے کام سے اس کی تقاریر سننے کی فرصت میسر ہو سکے۔ کوئی شاعر، مورخ، فلاسفر یا سائنسداں کتابیں لکھ بھی لے لیکن اسے نقل کروانے کی انتہائی اُجرت

اُس کی تصانیف کو چند شائقین کے [illegible] کرتی تھی۔ کسی ڈرامہ نگار کے ڈراموں سے لطف [illegible] کی تعداد بھی محدود تھی کیونکہ ان کا کسی دوسرے شہر میں جاکر [illegible] مشکل و پرخطر تھا۔ لیکن آج کل ایک ہی [illegible] بیسیوں دور دراز شہروں میں ہوتی ہے۔ عصر حاضر [illegible] مقرر یا شاعر بغیر کسی سعی کے لاکھوں سامعین تک پہونچ سکتا ہے۔ جدید کلوں نے ہزاروں میل دور سمندر پار بیٹھے ہوئے لوگوں کو اسکے اتنا ہی قریب کر دیا جتنا کہ پیریکلز ( ) یا ڈیموستھنز ( ) کے سامعین انکے قریب تھے۔ اس کی آواز کا لب و لہجہ بھی دُنیا کی دوسری طرف بیٹھے ہوئے لوگوں تک پہونچ سکتا ہے اور وہ لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے بغیر کسی سعی کے اس کے کلام سے محظوظ ہو سکتے ہیں۔ اگر حضرت عیسیٰ ایک ہزار سال بھی زندہ رہتے تب بھی اُن کا پیام اتنے لوگوں تک نہیں پہونچ سکتا تھا جتنوں تک کہ برنارڈ شا کا اُسی وقت میں پہونچ جاتا ہے جبکہ اس کی آواز گونج ہی رہی ہوتی ہے۔ گاندھی جی، یا پریذیڈنٹ روزولٹ کا جنگ کے متعلق شام کو دیا ہوا بیان گھنٹے دو گھنٹے میں کرۂ ارض کے ہر حصے میں بے تار برقی کے ذریعے پہونچ جاتا ہے اور اگلی صبح چھپنے والے اخبارات سے تمام دنیا کو اس کا علم ہو جاتا ہے۔

اب اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہونا چاہیئے کہ جدید ایجادات نے ادب کے تصور اور رسوخ میں کتنی زیادہ تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کلوں کی یہ برقی ترقی ادب کے عام معیار پر کیا اثر ڈال رہی ہے، آیا اسے تنزل کی طرف دھکیل رہی ہے یا ترقی کی طرف لے جا رہی ہے اور آجکل کا یہ ریڈیائی، فلمی، اخباری اور کتابی ادب، ادب کے بنیادی مقصد کی تکمیل میں کہاں تک ہمارا معاون بن رہا ہے۔

---(۲)---

ریڈیائی، فلمی اور اخباری اداروں سے تو شاید اچھا ادب پیدا کرنے کی اُمید نہیں کی جا سکتی کیونکہ یہ سرمایہ کا مرہونِ منت ہے۔ کتابیں تو انفرادی طور پر چھپوائی جا سکتی ہیں لیکن یہ ریڈیائی، فلمی اور صحافتی [illegible] عموماً ترقی پسند ادیبوں کے وسائل سے بعید ہیں۔ سرمایہ کے طوق [illegible] میں اسیر یہ ادب تو اُسی کی تہذیب یا اقتدارِ تہذیب کے آئینہ دار [illegible] اِن سے اونچے ادبی معیار کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اوّل [illegible] سے ملکوں میں وہاں کی حکومت کے تحت میں [illegible] یا اراکینِ حکومت سے، جو عموماً اپنی اہلیت کی [illegible] دولت اور چالبازی کے ذریعے حکومت کی باگ ڈور [illegible]

[illegible] اپنا آپ کو دھکا دے کر وہ برادر کا شہنگ
[illegible] کے عوام کے دائرہ خیال کو
[illegible] نگاہ کو بصیرت افروز کرنے
کی کوشش کرتے [illegible] حصوں میں بکھرے ہوئے سینکڑوں
[illegible] استعمال کیا گیا ہوتا تو انسان کے مستقبل کا تصور اتنا
[illegible] نہ ہوتا۔ وہ تو اس کے برعکس اس کوشش میں ہمہ تن مصروف
رہتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے اور ان کا استثنائی رتبہ خطرے
میں پڑ جائے۔ ہمیشہ پڑوسی ملکوں اور قوموں کے خلاف گمراہ کن پروپگنڈا
[illegible] نشر کر کے پرجا کے سماجی جیون کو گرانے کی
کوشش کرتے رہنا وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

ریڈیو ایک اور پہلو سے ادب کے لئے خطرۂ عظیم ثابت ہو رہا
ہے۔ بادشاہوں، نوابوں کے زمانہ میں شاہانہ ایوانوں کے جلوۂ جلال
اور شان و شوکت کا مقناطیسی پتھر اربابِ سخن کو اپنی طرف کھینچ لیا کرتا
تھا جس سے وہ ادیب "غریبوں کی بغاوت کے قصیدے" لکھنے کی
بجائے "مدحتِ سلطان" میں ہی اپنی قوتِ تحریر کو زائل کر دیا کرتے
تھے اور بادشاہوں اور راجگان کی مدحت سرائی ہی ادب کا ارتقا
سمجھنے لگتے تھے۔ آجکل ریڈیو وہی مقصد پورا کر رہا ہے اور اچھے
اچھے ترقی پسند ادیبوں کو اپنی طرف کھینچ کر انہیں عوام کی جدوجہد
سے علیحدہ کرنے میں اتنا ہی کامیاب ہو رہا ہے۔ ہر ملک میں ریڈیو
ڈیپارٹمنٹ کی آرام دہ ملازمتوں کی رسیلی بین بڑے بڑے زہریلے
ناگوں کو مست اور بے ضرر بنائے جا رہی ہے۔

فلمی ادب کا معیار تو ریڈیائی ادب سے بھی گرا ہوا ہے۔ دس
سال ہوئے جب بین حور پر چالیس لاکھ ڈالر خرچ ہوئے تو وہ ایک
ریکارڈ تھا۔ آجکل تو اچھی فلموں پر ایک کروڑ سے بھی زائد ڈالر خرچ
ہو جاتے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ سماج کے
ترقی پسند طبقے کا اس پر اثر کتنا کم ہوگا۔ ہندوستان میں ہر سال
تقریباً ایک سو کے قریب فلمیں شوٹ کی جاتی ہیں اور سوائے ایک
دو کے کسی کا عوام کی بنیادی جدوجہد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہی
عشق اور محبت کے بے معنی اور بے معیاری افسانے، جن کا فنی معیار
[illegible] ہوتا۔ ہم کہ بہت دفعہ ان کے افسانوں کے ہی بے ہنر
[illegible] کی وجہ سے یہ فلمیں فیل ہو جاتی ہیں۔ فلمیں بنانے یا بنوانے
[illegible] کو ادب یا آرٹ کی کچھ سمجھ تو ہوتی ہی نہیں۔ انہیں
[illegible] کی ضرورت ہے جو انہیں ایسی فلموں سے ہمیشہ

[illegible] ہے۔ عام موضوع کے متعلق یہ کہنا ہی کافی ہے کہ اگر آپ اپنے دل
کو بھی گھر چھوڑ جائیں (اور بہت سے لوگ ایسا کرتے ہیں) تو بھی فلم کے دیکھنے
میں آپ کو کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ اگر [illegible] سال بعد کوئی ایسی
پکچر آتی بھی ہے تو ان ادنیٰ فلموں نے [illegible] کا معیار اتنا گرا رکھا ہے
کہ وہ فلم ناکامیاب رہتی ہے اور دوبارہ کسی کو ایسی فلم بنانے کا حوصلہ
نہیں ہوتا۔

۱۹۲۵ء میں تمام دنیا میں تقریباً پچاس ہزار سینما ہال تھے
جن میں سے تقریباً ۲۰۰۰۰ ریاستہائے امریکہ میں، ۴۰۰،۲ برطانیہ میں
۶۰،۲ جنوبی امریکہ میں، ۳۰۰،۷ اٹلی میں، ۴۰۰۰ جرمنی میں، [illegible]
فرانس میں تھے۔ اب یہ تعداد تین گنا نہیں تو دوگنی تو ضرور ہو چکی ہے۔ صرف
ریاستہائے امریکہ میں گیارہ کروڑ پچاس لاکھ (۱۱،۵۰،۰۰،۰۰۰) اشخاص
ہر ہفتے سینما گھروں میں جاتے ہیں جس سے ٹکٹوں کی آمدنی ۵۶ کروڑ
ڈالر سے زائد ہوتی ہے۔ اس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے
کہ سینما میں بھی ریڈیو کی طرح عوام میں ایک نئی زندگی بیدار کرنے کی کتنی
امکانی قوت پنہاں ہے۔

صحافی یا اخباری ادب بھی ریڈیائی اور فلمی ادب کی طرح سرمایہ
کی مہلک گرفت میں جکڑا ہوا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں انگلستان میں اخبارات
کی فروخت سے تین کروڑ پچیس لاکھ (۳،۲۵،۰۰،۰۰۰) پاؤنڈ حاصل
ہوئے۔ اس کے برعکس ان اخبارات کو اشتہارات سے تقریباً نو کروڑ
(۹،۰۰،۰۰،۰۰۰) پاؤنڈ کی آمدنی ہوئی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے
کہ بڑی بڑی فرموں، کمپنیوں اور کارپوریشنوں کا صحافی ادب پر کتنا باطل اور
مہلک اثر پڑ رہا ہے۔ پچھلے سال انگلستان کی لیبر پارٹی کے روزانہ اخبار ڈیلی
ہیرلڈ کے سوشلسٹ ایڈیٹر کا استعفیٰ تمام دنیا کے لئے ایک حیران کر دینے
والا صدمہ تھا۔ ڈیلی ہیرلڈ کی روزانہ بکری انگلستان میں دوسرے درجے پر
ہے۔ گیارہ بارہ لاکھ کی بکری کے باوجود اس اخبار کے منتظم اشتہار دینے والی
سرمایہ دار فرموں کے دباؤ کے آگے سرِ تسلیم خم کئے بغیر نہ رہ سکے۔

صرف انگلستان میں ۶۹۰۰ اخبار، رسالے اور میگزین چھپتے ہیں۔
جن کی فروخت سے چار کروڑ پاؤنڈ کے قریب آمدنی ہوتی ہے۔ صرف لندن
سے ۳۳۶ اخبارات نکلتے ہیں اور تمام برطانیہ سے دو ہزار سے زائد۔ اتنے
افراط اور تیزی سے چھپنے والی تحریروں سے کسی ادبی معیار کی توقع نہیں
کی جا سکتی۔ اس امر کو تسلیم کرنے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر ملک میں
چند اعلیٰ ادبی معیار کے اخبارات اور رسالے شائع ہو رہے ہیں لیکن [illegible]
ایک ہاتھ کی انگلیوں پر ہی گنا جا سکتا ہے اور ان کی مالی حالت بھی [illegible]

[illegible] ہر سال کئی ایسے نئے جرائد جاری یا بند ہوتے ہی رہتے ہیں۔ [illegible] میں [illegible] ریویو اور [illegible] اینڈ کو چند سال کی ہی نمایاں اور مفید [illegible] بند کر دینا پڑا۔ نیویارک کا نیو [illegible] شروع سے ہی [illegible] میں چل رہا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں چند سال ہوئے کالج [illegible] کی ضروری سزائے بیکاری جھیل رہا تھا تو میں نے اس فرصت [illegible] زبانوں کے سیکھنے میں صرف کرنا شروع کیا۔ ان دنوں میرے [illegible] پروفیسر دوست کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی کہے کہ فرانسیسی زبان کم از کم ہفتہ وار اخبار "دی نیڈ ریڈی" کے پڑھنے کیلئے ہی سیکھی جانی چاہیے تب بھی میں اسے مبالغہ نہیں سمجھونگا۔ یہ اخبار فرانس کے ترقی پسند ادیبوں کا اخبار تھا اور ایک دو سال میں ہی اس نے یوروپین ادب میں بڑا امتیازی رتبہ حاصل کر لیا تھا۔ جب میں نے فرانسیسی سیکھنے کے بعد لندن کی بین الاقوامی اخبار ایجنسی ڈاسن کو اس اخبار کے لئے لکھا تو اس کی اشاعت بند ہو چکی تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ہزاروں فرینک کے خسارے کے بعد اس اخبار کو مجبوراً بند کرنا پڑا۔ اشتہار ملنے تو ناممکن تھے ہی معیار کا بہت اعلیٰ ہونے کی وجہ سے وہ اخبار عوام میں غیر مقبول ہی رہا اور چند ہزار کی بکری اخبار کا خرچ پورا نہ کر سکی۔

۳

کتابی ادب کی حالت اگر ریڈیائی، فلمی اور صحافی ادب کی طرح مایوس کن نہیں تو اسے تسلی بخش بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کتابوں کی چھپائی اب پہلے سے بہت سستی ہو چکی ہے اور اس میں ترقی پسند ادیبوں کی انفرادی یا مجموعی کوششوں کی کامیابی کا احتمال ہے لیکن انہوں نے ابھی تک اس فوقیت سے فائدہ اٹھانے کی کوئی سعی نہیں کی۔ قدیم روم میں تاملی کے ملازم کاتب اور اسکندریہ میں تربیت یافتہ غلام کتابوں کو نقل کرکے ان کی تعداد کو بڑھانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ آجکل صرف انگلستان میں اخباری چھاپہ خانوں کے علاوہ ۲۶۹۳ چھاپہ خانوں میں ۱۶۳۰۰۰ اشخاص ملازم ہیں اور ان میں ہر سال گیارہ ہزار کے قریب کتابیں چھپتی ہیں۔ ہر سال فرانس میں چودہ ہزار کتابیں چھپتی ہیں۔ اٹلی میں ۱۲ ہزار، جرمنی میں ۲۵ ہزار۔ سوویٹ یونین میں انقلاب کے بعد آج تک ۵۰۰۰۰۴ سے زائد کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں وہاں ۴۰۰۰۵ کتابوں کی ۸۳ کروڑ جلدیں چھپی تھیں۔ جو تقریباً ۹۰ زبانوں میں تھیں۔ ۱۹۳۱ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ میں مختلف کتابوں کی ۱۵۲۲۳۵۰۰۰ جلدیں چھپیں۔ جو ۱۹۲۹ء سے ۳۵ فیصدی کم تھیں۔ ہندوستان میں بھی پچھلے سال ۱۴ ہزار کتابیں چھپیں۔ اگرچہ ان میں بہت سی دھار مک پوتھیاں تھیں [illegible]

جہاں قدیم رومن شاعر ہوریس ([illegible]) [illegible] بیس تیس برس پہلے صرف سو سی بھائیوں کی کتابیں [illegible] کا ذکر کیا تھا وہاں آج صرف ریاستہائے متحدہ امریکہ میں تقریباً [illegible] بڑے بڑے کتب خانوں کے ذریعے سالانہ ۳ کروڑ ڈالر کے قریب کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔

مذکورہ بالا اعداد سے کتابوں کی تعداد بڑھ جانے کے علاوہ اور کوئی معنی نہیں نکالنے چاہئیں۔ جدید ایجادات نے صرف کتابوں کی تعداد میں اضافہ کیا ہے ان کا عام معیار اونچا نہیں کیا اور نہ ہی حقیقی عالموں اور ادیبوں کی تعداد میں کوئی اضافہ کیا ہے۔ انسان کا ذہنی قد اتنا ہی ہے جتنا ایک ہزار سال پہلے تھا۔ اس کے خیالات کی پرواز، اس کے فہم کی گہرائی اور اس کی ہمدردیوں کا دائرہ ابھی اتنا ہی ہے جتنا قدیم ایام میں تھا۔ غیر معمولی قوت تحریر اور بصیرت والے انسان آجکل بھی اتنے ہی کمیاب ہیں جتنے سقراط، افلاطون یا ارسطو کے زمانے میں تھے۔ ادب کی ترقی تو جب سمجھی جا سکتی تھی جب حسن کار ادیبوں کی تعداد بھی اسی رفتار سے بڑھتی جس سے کتابوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ غالباً صاحب ہنر ادیبوں کا عام آبادی سے تناسب ابھی اتنا ہی ہے جتنا مشینی دور سے پہلے تھا صرف تعلیم عام ہو جانے کی وجہ سے کتابوں اور کہانیوں کی دن بدن بڑھتی ہوئی مانگ کو بازاری، ادنیٰ اور بے ہنر تحریروں سے پورا کیا جا رہا ہے۔ مشینی دور کا ادب اس لحاظ سے پہلے ادب سے مختلف ہے کہ اس میں ایسی بہت سی تصنیفوں کا اضافہ ہو گیا ہے جو حقیقی معنوں میں ادب نہیں صرف دلچسپی، دل بہلانے اور تفریح کا سامان ہوتی ہیں اور ہماری مذکورہ بالا ادب کی تعریف سے نیچے رہ جاتی ہیں۔ بلند پایہ ادبی تحریروں میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوا صرف وہ چیزیں جو پہلے میں گاؤں شہروں کے گلی محلوں تک محدود رہتی تھیں اب چھپائی کی ارزانی کی وجہ سے کتابی صورت اختیار کر رہی ہیں۔ کبھی کبھی اعلیٰ معیاری ادب بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن کتابوں کے اس بے پناہ سیلاب میں کتنے لوگوں کے ہاتھ ان بیش بہا موتیوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ اور ان ایک دو درجن کتابوں کی دوسری قسم کی لاکھوں کتابوں سے نسبت ہی کیا ہے۔ یہ نیم ادیب تو نیم حکیموں اور نیم ملاؤں سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو رہے ہیں۔ کیونکہ یہ ہماری مجموعی تہذیب کے لئے زہر بنتے جا رہے ہیں۔

مشہور انگریز ادیب ایچ۔ جی۔ ویلز کی کتاب [illegible] میں اس غذا کو کھانے والے "ابن غذا" انسان کے [illegible]

بجائے [illegible] کا ذہنی اور روحانی قد کہاں اسی رفتار سے بڑھ جاتا
[illegible] میں آ ٹکتا ہے اور لاتعداد ننھے ننھے
اِدھر اُدھر [illegible] مشغول انسانوں کو دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے اور ان سے
پوچھتا ہے "[illegible] تم کس کام میں اتنے مشغول ہو" ہم ابھی تک
ذہنی طور پر ننھے لوگ ہی ہیں اور ہمارا ذہنی قد اپنے آباؤ اجداد سے بڑھ
نہیں سکا۔ ہم ابھی برنارڈ شا کی کتاب "Back to Methuselah"
میں [illegible] کئے گئے تین سو سال جینے والے مجسمۂ عقل "بزرگ"
([illegible]) نہیں ہیں بلکہ وہی چالیس پچاس سال کی زندگی والے
انسان ہیں جو ابھی اپنا بچپن ہی عبور نہیں کر پاتے کہ انہیں موت دبوچ لیتی
ہے اور وہ کبھی بھی بالغ نہیں ہوتے۔

فلسفیانہ زعم اور شیخی کہ انسان عقل داں حیوان ہے۔ بدقسمتی سے
تاریخ کی کسوٹی پر ٹھیک ثابت نہیں ہوتی۔ ابھی تک دماغ غالباً انسان
کے وجود کا سب سے کم استعمال شدہ حصہ ہے اور عام ادیبوں کی اکثریت
ایسے انسانوں کی ہی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیئے
کہ اچھا ادب پیدا کرنے کے لئے اچھا انسان ہونا اشد ضروری ہے۔ ایک
بلند پایہ اخلاق اور ذہن والا شخص ہی بلند پایہ ادب لکھ سکتا ہے اور دورِ
جدید کے ادیب اس پہلو کو بالکل نظرانداز کر رہے ہیں۔ اس قسم کے غیرمعمولی
تخلیقی قوت رکھنے والے اشخاص آجکل بھی اتنے ہی کمیاب ہیں جتنے مشینی
دور سے پہلے تھے۔ مشینوں کی ترقی سے صرف کتابوں کی تعداد میں اضافہ ہوا
ہے ایسے ادیبوں اور ادب میں اضافہ نہیں ہوا۔

ادبی نقادوں نے بھی اپنی مایوسی کو بہت دفعہ چھپا کر نہیں رکھا۔ وہ
عام ادب کے گرے ہوئے معیار پر گریہ وزاری کرتے رہے ہیں۔ نیو سٹیٹسمین
اینڈ نیشن انگلستان کا مشہور ہفتہ وار اخبار ہے اور اپنے اعلیٰ ادبی معیار کے
لئے بین الاقوامی شہرت رکھتا ہے۔ میں صرف اس اخبار کے ماہ فروری
۱۹۶۱ء کے نمبروں سے جو ہندوستان میں مئی میں پہنچے نقادوں کی رائے
کا حوالہ دیتا ہوں۔ مسٹر کینڈر لر مارشل جو ایک مشہور اشتراکی ادیب ہیں ۵۔
فروری ۱۹۶۱ء کے نیو سٹیٹسمین میں لکھتے ہیں۔ "بہت سے ادیب جنہوں
نے پہلی جنگ عظیم کے بعد اپنی ادبی زندگی شروع کی میری طرح پچھلے
دس بیس برسوں پر غور کرتے وقت احساس کامیابی سے بھرپور نہیں
ہوتے بلکہ ناکامی اور شرم محسوس کرتے ہیں۔ ہم نے کچھ حاصل تو کیا ہے
لیکن یہ نسلِ انسانی کی موجودہ ضروریات سے بہت کم ہے اور اتنا
نہیں جتنا ہم کر سکتے تھے یا ہمیں کرنا چاہیئے تھا۔ اگر ہمیں اپنے فرائض
کا احساس ہوتا۔" ایک اور نقاد اسی مہینے کے ایک اور نمبر میں چند ناولوں

کا ریویو کرتے ہوئے لکھتا ہے: "مجھے بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جو
ناول آجکل بازار میں آ رہے ہیں وہ بہت ادنیٰ درجے کے ہوتے ہیں اور
ہماری یاد میں اس سے ادنیٰ ادب پہلے کبھی نہیں نکلا تھا۔"

اس مضمون کی محدود وسعت میں آجکل کے تمام یورپین اور امریکی
ادیبوں کا ذکر کرنا ناممکن ہے۔ اُن چند درجن ادیبوں کا ذکر تک اسے بہت
لمبا کر دیگا جن کے متعلق نیویارک ہیرلڈ ٹریبون کے ہفتہ وار ادبی ضمیمہ
"The Books" میں بحث ہوتی رہی ہے۔ ان میں سے بہت سے
دُمدار ستاروں کی طرح چند سالوں کے لئے نمودار ہوئے اور پھر گوشۂ
گمنامی میں کھو گئے۔ اناطول فرانس کی مدت کے بعد جب پال ویلری کا
اُن کی جگہ فرنچ اکیڈمی کیلئے انتخاب ہوا تو سب فرانسیسیوں کا خیال تھا
کہ چند سالوں میں ہی وہ دُنیا بھر کے چوٹی کے شاعروں میں شمار ہونے
لگے گا۔ اس کے برعکس اُس کی کتابیں اب اتنی کم بکتی ہیں کہ پبلشرز کے
سوائے کہیں اور نہیں ملتیں۔ یہی حال "Franz Werfel" کا جرمنی
میں "Karel Capek" کا چیکوسلوویکیا میں "Pio Baroja" کا سپین میں،
"Kostes Palamas" کا یونان میں۔
"Sibilla Aleramo" کا اٹلی میں اور "Sigrid
Undset" کا ناروے میں ہوا۔ اُردو ادب میں بھی ایسے ادیبوں
کو تلاش کرنا مشکل نہیں جو چند سال پہلے بہت مشہور تھے، اب اُنکی کہانیاں
ادبی رسالوں میں صرف اُنکی خدمات کے صلہ میں چھاپی جا رہی ہیں۔ کہیں
سو لکھنے والوں میں سے ایک ایسا ادیب نکلتا ہے جس کی ناموری کی وراثت
کو آئندہ نسل قبول کرتی ہے۔ کتابی ادب کے سلسلے میں یہ بیان کتنا ہی
قنوطیت پر مبنی کیوں نہ ہو اس میں تلخ سچائی کا کافی عنصر ہے۔

ایک انگریزی ادبی اخبار کے ایڈیٹر نئے شاعروں کو مشورہ دیا
کرتے تھے کہ انہیں اپنے شعروں میں آگ ڈالنے کی کوشش کرنی چاہیئے
اگر ایسا نہ ہو سکے تو انہیں اپنے شعروں کو آگ میں ڈال دینا چاہیئے۔ مرحوم
روسی انقلاب پسند ٹراٹسکی بھی یہی کہا کرتے تھے۔ اور انہوں نے اپنی
کہانیاں اپنے دوستوں کے احتجاج کے باوجود آگ کی نذر کر دی تھیں۔
شاپنہار نے بھی کہا ہے کہ کتابوں کی ایک کثیر تعداد کو چھپنے ہی نہیں
دیا جانا چاہیئے۔

۴

عام ادبی معیار کی اس افسوسناک گراوٹ کی وجہ شاید یہ بھی
ہو سکتی ہے کہ ہمارا زمانہ جسے عصر رفتار کہا جاتا ہے تیزی اور جلد بازی کا زمانہ
ہے جو ادب کیلئے کارآمد فضا پیدا نہیں کر سکتا۔ آج کل ادیبوں کو [illegible]

[illegible] کی اتنی فرصت نہیں ملتی جتنی ہمارے [illegible] تھی۔ افلاطون بہت دفعہ [illegible] بنانے کیلئے بیس تیس دفعہ لکھا کرتا تھا [illegible] پچھلے وقتوں میں ادیبوں پر اکملیت کا بھوت [illegible] بمشکل تصانیف ہی شائع ہو سکتی تھیں۔ ان کو [illegible] تصنیفوں کے آسانی سے چھپ جانے سے سستی شہرت [illegible] دیتی۔

[illegible] نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ "Lives of Henrie" کے لکھنے میں صرف کیا لیکن مرتے وقت اُس نے تمام نظموں کو جلا دینا چاہا کیونکہ ان میں سے چند شعر اُس کے اکملیت کے بلند معیار سے ذرا نیچے رہ گئے تھے۔ فلابیئر صرف ایک موزوں اور بامعنی لفظ کے انتخاب میں ہفتوں اور مہینوں اپنی نیند حرام کر دیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان ادیبوں کے ہاتھوں میں قلم جیسے کہ ایڈی پیشگو نے کہا ہے، جادو کی چھڑی بن جاتی تھی۔ ہوریس نے ادیبوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی تحریروں کو کم از کم نو سال اپنے پاس سنبھال کر رکھیں اور انہیں وقتاً فوقتاً بہتر بناتے رہا کریں لیکن آجکل تو "ادیب" بننے کا اشتیاق اتنا ناقابل ضبط ہو چکا کہ کوئی شخص اپنی تحریروں کو نو گھنٹے بھی سنبھال کر نہیں رکھ سکتا۔

مشینی دور میں ادیبوں کو کلوں کی تیز رفتاری سے ادب لکھنے کیلئے کہا جا رہا ہے۔ پبلشروں کو اپنے روزگار جاری رکھنے کیلئے کتابوں کی ایک معین تعداد ہر مہینے چھاپنی ہوتی ہے۔ اسلئے جتنی تیزی سے مشینیں کتابیں چھاپ رہی ہیں اتنی تیزی سے ادیب بھی کتابیں لکھتے جا رہے ہیں اور ان ادیبوں کو اپنی تصانیف میں زندگی کی تصویر کشی کرنے کیلئے انسانی جیون کا مطالعہ کرنے کی تو کیا ان کتابوں پر نظرِ ثانی تک کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ عصرِ حاضر میں بہت کم ایسے ادیب پیدا ہوئے ہیں جن کے متعلق خود بخود منہ سے نکل جائے جیسے کہ نپولین کے منہ سے ٹامپین کیلئے نکلا تھا "اسکا سونے کا بت ہر شہر کے وسطی چوک میں نصب کیا جانا چاہیئے" یا جن کے متعلق انگریز شاعر بائرن نے کہا تھا "ان کی سیاہی کی ایک ایک بوند ہزاروں نہیں لاکھوں آدمیوں کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے"۔ آج کل کے ادیبوں میں سے اکثر کو تو خود ہی سوچنے کی فرصت نہیں ملتی۔ اگر ادب وہ دیا ہے جس کی روشنی میں نسلِ انسانی اپنا راستہ تلاش کرتی ہے تو شاید ہم اس لئے اپنے صحیح راستے کی جستجو میں ناکام ہو رہے ہیں کہ دورِ جدید کے ادیب اس مشعلِ ہدایت کو روشن نہیں کر سکے۔

ڈیکنس نے چند صدیاں گزریں امید پرستی سے متاثر ہو کر لکھا تھا: چھپائی کی مشین کی ایجاد کے بعد [illegible] حاکم ہوں گی۔ ادیبوں کے ناخنوں میں [illegible] کی کرنوں سے بھی زیادہ باریک چمکیلے اور روشن [illegible] تلواروں اور جنگی ہتھوڑوں کی جگہ لیں گے۔ ان دو تین صدیوں میں سائنس کی ایجادات اور بھی بہت ترقی کر گئی ہیں لیکن یہ پیشگوئی ٹھیک ثابت نہیں ہوئی۔ اس بات میں شاید کسی کو شبہ ہو کہ ادب پر جدید ایجادات کا خراب اثر پڑ رہا ہے یا نہیں لیکن اس میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا کہ جو امیدیں ادب سے وابستہ کی گئی تھیں وہ ابھی تک پوری نہیں ہوئیں۔

شمشیر سنگھ نرولا

دعا

مری دنیائے دل آباد کر دے!
مجھے ماحول سے آزاد کر دے!
مرے نالوں کو نالوں کا جگر دے!
مری فریاد کو فریاد کر دے!

مری مٹھی میں ہو تقدیر میری!
بنے زیبِ سر مرا زنجیر میری!
چراغِ غیر سے بیزار ہوں میں
مری محفل میں ہو تنویر میری!

مجھے توفیقِ مشقِ کن فکاں دے!
مجھے سودائے سیرِ لامکاں دے!
مہ و خورشید کے شیشے میں اک کیف
جہانِ حیاتِ جاوداں دے!

چراغِ طور اپنا طور اپنا
مہ و خورشید اپنے نور اپنا
امیں واللہ جہانِ غیر سے دُور
جہاں کا آج نہ ہو دستور اپنا

امین حزیں سیالکوٹی

پانی کا بہاؤ

پانی نشیب کی طرف بہتا ہے۔ یہ قدرت کا اٹل قانون ہے۔ ہمیشہ ایسا ہی بہتا ہے اور شاید ہمیشہ ایسا ہی بہتا رہے گا۔ اسی طرح یہ ندی بھی بہتی ہے۔ میں نے اسے ہمیشہ ایسا ہی دیکھا۔ یہ کہاں سے آتی ہے؟ — میں نہیں جانتا۔ کہاں جائے گی؟ — یہ بھی نہیں جانتا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ امرکنٹک پہاڑ کے کسی کھوہ سے نکلتی ہے، کوئی اس کے نکاس کا پتہ نہیں جانتا۔ کیونکہ اس پہاڑ کے اطراف تاریک جنگلات اور ایک بڑی وسیع دلدل ہے۔ اس کا نکاس دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ تاریکی میں لپٹا ہوا ہے۔ زندگی کی حقیقت بھی انسان سے پوشیدہ ہے — یہ ندی ہم سے کتنی قریب ہے!

پرانے رشی ندی کو ماں کہتے تھے۔ ہندو لوگ اب بھی ندیوں کی پرستش کرتے ہیں۔ کیا صرف اس لئے کہ اس سے ہماری زراعت کو فائدہ پہونچتا ہے۔ ہمارے پیٹ بھرنے کے سامان مہیا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ مگر وہ لوگ تو روحانیت کے قائل تھے۔ مادی زندگی سے بے نیاز رہتے تھے۔ شاید انہوں نے ندیوں کی محض اسلئے پرستش کی کہ وہ ہماری زندگی سے قریب ہیں۔

ندی پہاڑ کی اندھیری کھوؤں اور تاریک جنگلات سے نکلتی ہے۔ پہاڑوں سے ٹکراتی، چٹانوں کو روندتی، وادیوں میں بل کھاتی، میدانوں میں ناچتی، خاموش سروں میں گاتی ہوئی، سمندر میں غائب ہو جاتی ہے۔

انسان تاریکی سے پیدا ہوتا ہے، اور تاریکی میں چلا جاتا ہے۔
زندگی کیا ہے؟ ہم کہاں سے آتے ہیں؟ کہاں جاتے ہیں؟
یہ کوئی بھی نہیں جانتا۔

ندی بھی کچھ نہیں جانتی — خاموشی اس کی روح ہے۔ خاموشی اس کی فطرت ہے — وہ کچھ نہیں جانتی۔ پانی کا بہتے رہنا اس کی زندگی ہے۔ وہ زندہ ہے اس لئے کہ وہ کچھ نہیں جانتی — ہم بھی تو کچھ نہیں جانتے۔

ندی ہماری زندگی سے کتنی قریب ہے۔

یہ ندی مجھے پسند ہے۔ مجھے اس سے عشق ہے۔ میں ایسی ہی زندگی چاہتا ہوں۔ ساکن۔ خاموش۔ ندی کی طرح جس میں طوفان نہ آئے۔ لیکن ندی میں کبھی کبھی چھوٹے سیلاب آتے ہیں۔ ہمارے دریائے جذبات میں بھی تو کبھی کبھی سیلاب آجاتے ہیں — مگر لوگ کہتے ہیں کہ ندی میں ہزار دو ہزار سال کے بعد ایک بڑا طوفان آتا ہے۔

ہم اپنے سفرِ حیات کے صرف پچاس ساٹھ سال سے واقف ہوتے ہیں۔ پھر تاریکی ہی تاریکی — ہزار سال دو ہزار سال — کون جانے اس تاریکی میں کیسے کیسے طوفان پنہاں ہوں۔ لیکن اگر انسانی زندگی کی تاریخ کو ندی کی سطح کی طرح ایک لانبی بساط پر ترتیب دیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان ہزار دو ہزار سال میں انسانی زندگی پر بھی کئی طوفان گذر گئے ہیں۔

لیکن مجھے طوفان کے نام سے وحشت ہوتی ہے — میں سکون چاہتا ہوں۔ سکون! سکون کی زندگی!! ندی کی زندگی۔ مجھے اس ندی سے عشق ہے۔ میں بائیس برس سے اس کی پرستش کر رہا ہوں۔ سال کا ایک طویل حصّہ جو مجھے اس سے دور گذارنا ہوتا ہے، میری روح پر بارِ گراں ثابت ہوتا ہے۔ یہ چند ماہ میں کس بے چینی سے گذارتا ہوں یہ کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ میں ندی کے فراق میں تڑپتا رہتا ہوں۔ میرے خیال میں ندی ہوتی ہے۔ میرے خواب میں ندی ہوتی ہے۔ میرے دماغ میں ہر شے اس طرح زندہ رہتی ہے گویا میں ان کے درمیان سانس لے رہا ہوں — وہ کنارے پر پڑا ہوا پتھر، جس کا بالائی حصّہ بگلوں کی بیٹ سے سفید ہو چکا ہے — اور وہ کالے پتھروں کا بنا ہوا گھاٹ جس پر عورتیں اور مرد نہاتے اور کپڑے دھوتے ہیں — اور وہ نسرین کے بنگلے کے پیچھے، ندی کے کنارے کھڑا اونچا بڑا پیپل کا درخت، جس کے قریب میں بیٹھا کرتا تھا اور چھپ چھپ کر نسرین کے بنگلے کی طرف دیکھتا تھا۔ یہ تمام منظر ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔ میں یہاں کے ایک ایک ذرّے سے واقف ہوں۔ آم کی وہ ٹہنی بھی مجھے یاد ہے جس پر بیٹھ کر کوئل گایا کرتی تھی — میں ہر وقت ان چٹانوں اور درختوں کو دیکھ سکتا ہوں جن پر نسرین کا نام لکھا ہوا ہے۔

[illegible] بدستور قائم ہے۔ درخت اسی طرح کھڑے ہوئے ہیں۔ [illegible] اسی طرح کھڑے ہیں۔ لوگ اب بھی گھاٹ پر نہانے اور کپڑے دھونے آتے ہیں۔ ماہی گیر کشتی لئے ہوئے مچھلی پکڑنے میں مشغول ہیں۔ درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔

ندی خاموشی سے بہی جا رہی ہے۔

یہی زندگی ہے — اس زندگی سے مجھے عشق ہے۔

لیکن آج میں اس سیاہ پتھر پر کسی کے انتظار میں تنہا بیٹھا ہوں۔

جب اچانک آم پر کوئل کوک اٹھتی ہے تو ندی کے سینے پر ہلکی ہلکی موجیں تڑپنے لگتی ہیں۔

زندگی انگڑائی لیکر اس بلندی کی طرح پرواز کرتی ہو جہاں جذبات عقل کی قید و بند سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔

میری نظریں خود بخود نسرین کے بنگلے کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔

لیکن ندی خاموش ہے۔

یہی میری زندگی ہے — ندی کی سی خاموش زندگی۔ اس زندگی سے مجھے عشق ہے۔ اور نسرین؟

نسرین وہ درخت نہیں جو دریا کے کنارے اگتا ہے — نہ وہ پھل ہے جو دریا کے کنارے کے درختوں میں لگتا ہے۔ نسرین اس قوت کا نام ہے جو میری روح کو جسم کی قید میں گرمائی رہتی ہو۔ نسرین اس سانس کا نام ہے جس کی آمدورفت پر میری زندگی کا دارومدار ہے۔

اس خوشبو کا نام ہے جس کی مہک سے میرا دماغ تروتازہ رہتا ہو۔

ندی کی زندگی بہتے ہوئے پانی پر ہے۔

میری زندگی نسرین کی نہ بھولنے والی یاد پر۔

لیکن حقیقت میں نسرین اس دوشیزہ کا نام ہے جو دریا کے قریب بنے ہوئے، میرے مخصوص — پیپل سے نظر آنے والے، خوبصورت بنگلے کے مالک، زمیندار محمد اسلم بی۔ اے؛ ایل ایل۔ بی کی صاحبزادی ہیں۔

میں نے اسے اس حالت میں بھی دیکھا ہے جب وہ خود ایک خوبصورت تتلی کی طرح رنگین تتلیوں کے تعاقب میں، اپنے بنگلے کے احاطے میں ادھر ادھر تھرکتی پھرتی تھی، اور میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ بورڈ کے پرائمری سکول سے بھاگ کر ندی کے کنارے بیر کھانے آتا تھا۔

میں نے اسے اس وقت بھی دیکھا جب مجھ میں دریا کے کنارے کی خوبصورت چمکیلی سیپوں کو چن کر انہیں حفاظت سے رکھنے کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔

میں نے اسے اس وقت بھی دیکھا جب میں رات کی تاریکی میں، ندی کی خاموش سطح پر تاروں کے عکس کو گھنٹوں دیکھا کرتا تھا۔

میری آنکھوں نے اس بت کو دیکھا — اس وقت دیکھا جب وہ اپنی مخفی قوتوں سے ناواقف تھا۔ میری نظروں نے زندگی میں جوانی کا رس گھولنا شروع کیا۔ اس فتنے کو بیدار کرنا شروع کیا جو معصومیت اور جوانی کی کشمکش کے درمیان پرورش پا رہا تھا۔

میں نے اسے دیکھا اور اتنا دیکھا کہ ساکن سمندر میں طوفان آہستہ آہستہ کروٹیں لینے لگا۔ خاموش ندی کی سطح پر لہریں تڑپ اٹھیں۔

میری نظروں نے اسے چاہا — پوجا اور اتنا پوجا کہ وہ جوان ہو گئی۔

حسن و شباب، شعر و شراب کی مکمل تصویر — خیام کا خواب اور اور دانتے کی زندگی کی تفسیر۔

نسرین بھی مجھے عرصے سے جانتی ہے۔ وہ اسی فضا میں جوان ہوئی تھی جس سے مجھے عشق تھا۔ وہ اسی ندی کے کنارے رہتی تھی جس کا میں عاشق تھا۔

لیکن گذشتہ دو سال سے ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئے۔ اتنے قریب جتنی زندگی سے روح ہوتی ہے۔

دو سال قبل کا ذکر ہے مجھے کالج سے آئے ابھی چند دن ہی گذرے تھے کہ ایک دن صبح والد صاحب نے کہا کہ زمیندار صاحب تم سے ملنا چاہتے ہیں۔

زمیندار صاحب یہاں کے سب سے بڑے رئیس ہیں، وکیل ہیں، ترقی پسند آدمی ہیں۔ انہوں نے مجھ سے درخواست کی — جی ہاں! درخواست کی کہ اس تعطیل کے زمانے میں میں ان کی بڑی صاحبزادی نسرین کو انگریزی اور حساب پڑھا دیا کروں۔ نسرین کو حساب میں چند نمبروں سے فیل ہونے کی وجہ سے پانچویں انگریزی میں پروموشن دیا گیا تھا۔ میں نے اسی سال ایف۔ ایس۔ سی کا امتحان دیا تھا۔ حساب میرا خاص مضمون تھا۔

وہ مجھ سے کتنی قریب ہو گئی۔

ندی کی زندگی میری زندگی سے قریب تھی۔

وہ ندی سے قریب تھی۔

[illegible] بہت قریب تھی
شاید یہی وہ [illegible] تھی جو ایک [illegible] ہوئی رُوح کو لامحدود تاریکی سے روشنی میں لے آئی۔

نسرین کے دو چھوٹے بھائی اور ایک بہن تھی۔ اسکی والدہ دائم المریض تھیں۔ بستر پر پڑی رہتی تھیں۔ والد زندہ دل آدمی تھے، ہمیشہ سیر و شکار میں لگے رہتے تھے۔

صبح میں اُسے پڑھاتا تھا اور شام کو ہم لوگ ندی کے کنارے سیر کرتے تھے۔ کاغذ کی ناؤ بنا کر پانی کے بہاؤ پر چھوڑتے اور زندگی کی بے ثباتی کا تماشہ دیکھا کرتے ـــــ کبھی کسی چٹان پر بیٹھ جاتے اور ٹیگور کالی داس، دیویکا رانی ـــــ نذیر احمد، راشد الخیری، اور پریم چند کی باتیں کیا کرتے۔

اور ندی سُبک رفتاری کے ساتھ، خاموشی سے بہتی رہتی۔
اسی طرح ہماری زندگی بھی بہتی رہی۔
اسی طرح ندی کنارے پانی کے بہاؤ کے ساتھ، آہستہ آہستہ سرکتی، کھسکتی ہماری چھٹیاں بھی بہہ گئیں۔

شہری زندگی سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ شہریوں کو سکون نہیں قرار نہیں، ہر شخص دوڑتا ہوا، بھاگتا ہوا نظر آتا ہے ـــــ آنکھیں کسی کی متلاشی ہیں۔ کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ آخر یہ لوگ اتنے بدحواس کیوں ہیں۔
مجھے انہیں دیکھ دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔
پورا سال گرمیوں کی تعطیل کی آس میں گذر گیا۔
اگلے سال اسے میٹرک کا امتحان دینا تھا۔ میں نے پھر پڑھانا شروع کیا اور پھر وہی زندگی شروع ہو گئی۔
ندی کا ذرہ ذرہ ہم سے واقف ہو گیا۔ درخت شام کو سرگوشیوں میں ہماری داستان دُہراتے تھے ـــــ درختوں کے باسی ہمارے راز کو دُور دُور تک اُڑا لے گئے۔ کنارے کی سیاہ چٹانوں نے سُبک موجوں کے کان میں کچھ کہا۔ اُن کے رخسار پر ایک ہلکا سا بھنور پیدا ہوا اور وہ مسکراتی ہوئی دُور تک نکل گئیں۔
جب کسی ٹہنی پر بیٹھا ہوا کوئی پرندہ نغمہ زن ہوتا تو میرا ہاتھ خود بخود نسرین کے گلے میں حائل ہو جاتا ـــــ نسرین! تم نے کبھی اس ندی کی زندگی پر غور کیا۔ یہ ندی جس کی سطح پر ہمیشہ ایک خاموش راگنی تیرتی رہتی ہے۔ کتنا سکون ہے اس کی زندگی میں ـــــ مجھے اس

زندگی پہ رشک آتا ہے [illegible] زندگی کی [illegible] ہے۔ زندگی کی ابتدا ہم کبھی نہیں جانتے [illegible] ـــــ گنگا جمنا، پہاڑوں سے اُبلتی، کودتی آتی ہیں، ایک [illegible] ہوتی ہیں، اپنی خودی کو فنا کر کے ایک دوسرے کی ہستی میں گم ہو جاتی ہیں اور ایک نیا جسم لیکر دُور تک خوشی سے بل کھاتی ہوئی نکل جاتی ہیں ـــــ
کاش ایسی ہی زندگی ہو ـــــ خاموش، پرسکون۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا سہارا لے زندگی کے سفر کی اس حد تک پہونچ جائیں جہاں سے منزل دھندلی دھندلی دکھائی دینے لگتی ہو؟

آج کئی دن گذر گئے وہ اب تک نہیں آئی۔ لکھا تھا امتحان دیکر فوراً گھر آؤں گی۔
مگر وہ اب تک نہیں آئی۔ سنا ہے اس کی والدہ کو زمیندار صاحب پہاڑ پر لے گئے ہیں۔
اُسے بھی شاید پہاڑ پر ہی بلوا لیا گیا۔
میں بڑی بےچینی سے دن گذار رہا ہوں۔ میں کاغذ کی ناؤ بنا کر پانی کے بہاؤ پر چھوڑتا ہوں۔ دُور تک جانے کے بعد کاغذ گل کر سطح پر ہموار ہو جاتا ہے ـــــ مجھے خیال ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی کاغذ کی ناؤ تو نہیں؟ ـــــ جسے کسی زندہ دل نے محض تفریحاً پانی کے بہاؤ پر چھوڑ دیا ہے۔
مگر ندی خاموشی سے بہی جا رہی ہے۔
اور میں بہت بےقرار ہوں ـــــ

وہ امتحان میں کامیاب ہو گئی۔ کل میں نے مبارکباد کا تار دیا تھا۔
کیا اُسے احساس نہیں کہ مجھے اس کا انتظار ہے۔ میں سخت بےقرار ہوں۔
کیا وہ اب نہیں آئیگی ـــــ میں کب تک انتظار کروں؟
انسان کی زندگی ـــــ کاغذ کی ناؤ ـــــ میں کب تک انتظار کروں؟

اب مجھے اس فضا سے وحشت ہونے لگی ہے۔ وہی ندی [illegible] وہی کالے پتھر، وہی بگلوں کی بیٹ سے ڈھکی ہوئی چٹان۔ وہی [illegible] میں ان چیزوں سے اُکتا گیا ہوں۔
مگر ندی خاموشی سے بہی جا رہی ہے ـــــ میری زندگی ـــــ؟
وہ میری زندگی سے دُور ہوتی جا رہی ہے۔

یہاں میں خود بھی گھٹن سی محسوس کر رہا ہوں۔
یہ درخت جو مدتوں سے ایک ہی جگہ کھڑے ہیں، کیسے بڈھے معلوم ہوتے ہیں!
اور وہ پرندے جو ہمیشہ خوشی کے ترانے گاتے ہیں، کاش انہیں کوئی دوسرا راگ بھی آتا ہوتا!

پہاڑ پر اُس کی شادی ہو گئی۔ ایک امیر کبیر ڈاکٹر سے۔ جسے تین سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔

ندی خاموشی سے بہی جا رہی ہے۔
مگر وہ میری زندگی سے کتنی دُور ہے
مجھے اِس فضا سے نفرت ہے۔ مجھے نفرت ہے اِن چٹانوں سے جو مُردوں کی طرح ایک ہی جگہ پڑی ہیں۔ ان درختوں سے جو ایک ہی جگہ کھڑے ہیں۔ اِن پرندوں سے جو ایک ہی راگ گاتے ہیں۔ اُن لہروں سے جو ساحل سے ٹکرا کر فنا ہو جانا ہی جانتی ہیں۔ اور اس ندی سے جو خاموشی سے بہی جا رہی ہے۔
اے امر کنک کی بیٹی! اُٹھ! — تجھے سیتا کی عصمت اور پدمنی کی غیرت کی قسم۔ اُٹھ! اور اپنی زندگی کا ثبوت دے۔ سُبک لہریں، سکون اور خاموشی موت کی نشانیاں ہیں۔ یہ بھی کوئی جینا ہے؟ یہ بھی کوئی زندگی ہے؟ اُٹھ کہ زندگی نام ہے حرکت کا۔ اُٹھ! اور اپنے سینے پر وہ بے پناہ موجوں کا طوفان لئے اُٹھ! جو مُردوں کی طرح پڑی ہوئی چٹانوں کو بہا لے جائے، مدت سے کھڑے ہوئے درختوں کو اکھاڑ پھینکے، اور زمانے کے بنائے ہوئے ساحل کے نشیب و فراز کو ہموار کر دے۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کیوں نہ اس ندی کو ایک بند باندھ کر پانی کا بہاؤ آبادی کی طرف کر دیا جائے، کیا زمین کی آبپاشی نہ ہوگی؟۔

ندی خاموشی سے بہی جا رہی ہے۔
مگر وہ میری زندگی سے بہت دور ہے۔
اور میں جانتا ہوں کہ ندی میں طوفان بھی آتے ہیں۔
جب آم کی ٹہنی پر کوئل کوکتی ہے تو میں شور مچا کر اُڑا دیتا ہوں۔

ریاض رؤفی

خوب سمجھتا ہوں میں

راز کو رکھو نہ راز خوب سمجھتا ہوں میں
تم ہو مرے چارہ ساز خوب سمجھتا ہوں میں

حیرتِ آئینہ کا کچھ نہیں مجھ پر فریب
حالتِ آئینہ ساز خوب سمجھتا ہوں میں

لب تو ہلے بھی نہیں آنکھ سے فرما دیا
حسرتِ دستِ دراز خوب سمجھتا ہوں میں

آپ نہ ٹھکرائیے آپ نہ ٹھکرائیے
آپ ہیں بندہ نواز خوب سمجھتا ہوں میں

رکھتا ہوں میں نظر رکھتا ہوں میں جگر
غزنوی ہو یا ایاز خوب سمجھتا ہوں میں

شمع ہی کے دم سے ہیں بزم کی یہ رونقیں
شمع ہے پروانہ ساز خوب سمجھتا ہوں میں

جور کا شکوہ نہیں ظلم کا شکوہ نہیں
یہ بھی ہے اک رنگ ناز خوب سمجھتا ہوں میں

بہزاد لکھنوی

منظومات

انتقام

مَیں افلاس کی گود میں پل رہی تھی ۔۔۔ مَیں آلام کی آگ پر جل رہی تھی
خوشی دل میں بھولے سے آتی نہیں تھی ۔۔۔ مسرت نگاہیں ملاتی نہیں تھی
مجھے بھی ضرورت تھی میں بھی جواں تھی ۔۔۔ مرے دل میں حسرت تھی میں بھی جواں تھی
مزا اب اٹھاتی ہوں دوشیزہ بن کر ۔۔۔ میں راتوں کو جاتی ہوں دوشیزہ بن کر
جوانی کو سکّوں میں تبدیل کرنے

مرا دل بھی تھا آرزوؤں کی بستی ۔۔۔ مجھے بھی تھی مرغوب فیشن پرستی
مری نرم باہیں تھیں چوڑے سے خالی ۔۔۔ نہ پھولوں سی رنگت نہ ہونٹوں پہ لالی
جوانی مری گنگناتی نہیں تھی ۔۔۔ دلوں کو دھڑکنا سکھاتی نہیں تھی
میں تانیں اُڑاتی ہوں دوشیزہ بن کر ۔۔۔ میں راتوں کو جاتی ہوں دوشیزہ بن کر
جوانی کو سکّوں میں تبدیل کرنے

مجھے بھی تھا کافرادا بن کے رہنا ۔۔۔ مجھے بھی تھا رنگیں قبا بن کے رہنا
مجھے بھی تھا ریشم کا ملبوس درکار ۔۔۔ بناتی تھی دیوانہ سکّوں کی جھنکار
مراحق نہیں تھا میں انساں نہیں تھی؟ ۔۔۔ کہ جیسے مرے جسم میں جاں نہیں تھی؟
میں دھومیں مچاتی ہوں دوشیزہ بن کر ۔۔۔ میں راتوں کو جاتی ہوں دوشیزہ بن کر
جوانی کو سکّوں میں تبدیل کرنے

جو آغوشِ راحت میں سوئی ہوئی تھیں ۔۔۔ امارت کے نشے میں کھوئی ہوئی تھیں
غریبوں کو جو دیکھ سکتی نہیں تھیں ۔۔۔ جفا کرتے کرتے جو تھکتی نہیں تھیں
جو چاندی کے ٹکڑے چباتی تھیں اُن کا ۔۔۔ جو سونے کے آنسو بہاتی تھیں اُن کا
تمسخر اُڑاتی ہوں دوشیزہ بن کر ۔۔۔ میں راتوں کو جاتی ہوں دوشیزہ بن کر
جوانی کو سکّوں میں تبدیل کرنے

بہت تلملائے غریبوں کے حامی ۔۔۔ غضب میں بھی آئے غریبوں کے حامی
مگر جھومتی رہی سرمایہ داری ۔۔۔ گجر دم چلے جیسے بادِ بہاری
یہ مشکل نہ آساں ہوئی لیڈروں سے ۔۔۔ وہ طاقت نہ حیراں ہوئی لیڈروں سے
میں محشر اٹھاتی ہوں دوشیزہ بن کر ۔۔۔ مَیں راتوں کو جاتی ہوں دوشیزہ بنکر
جوانی کو سکّوں میں تبدیل کرنے

محبت کو بیچا جوانی کو بیچا ۔۔۔ نگاہوں کی جادو بیانی کو بیچا
تبسم کی شیرینیاں بیچ ڈالیں ۔۔۔ تکلّم کی رنگینیاں ۔ بیچ ڈالیں

مگر اہلِ زر کا لہو چوس ڈالا ۔۔ یہ دیکھو تجوری یہ ہیروں کی مالا
میں پربت جھکاتی ہوں دوشیزہ بنکر ۔۔ میں راتوں کو جاتی ہوں دوشیزہ بنکر
جوانی کو سکوں میں تبدیل کرنے

مرے سرخ لب اور شرابی ادائیں ۔۔ شفق زار عارض گلابی قبائیں
تکبر کو نیچا دکھاتی رہی ہیں ۔۔ جھکاتی رہی ہیں مٹاتی رہی ہیں
فلک بوس ایواں ہیں اور بیکسی ہے ۔۔ غرورِ امارت ہے اور مفلسی ہے
فلک بھی جھکاتی ہوں دوشیزہ بن کر ۔۔ میں راتوں کو جاتی ہوں دوشیزہ بن کر
جوانی کو سکوں میں تبدیل کرنے

الطاف مشہدی

وطن سے دُور

دُور تجھ سے اے وطن کی سرزمیں جاتا ہوں میں ۔۔ اب ترے آباد ویرانے سے گھبراتا ہوں میں
تیرے پھولوں میں نہ پائی میں نے خوشبوئے وفا ۔۔ تجھ سے چھٹنا پھر بھی ہے میرے لئے صبر آزما
اے وطن شاید تجھے آئے کبھی میرا خیال ۔۔ تیرے سائے میں ہیں میری زندگی کے ماہ وسال
آنکھ کو پرنم نہ کرنا دیکھ میری یاد میں ۔۔ تو نہ ٹھنڈی سانس بھرنا دیکھ میری یاد میں
کچھ دنوں کے واسطے ہونا نہ تو اندوہ گیں ۔۔ ہو نہ جائے نم کہیں غم کے پسینے سے جبیں
جانتا ہوں مجھکو ڈھونڈیگی تری فصلِ بہار ۔۔ باغ کی رنگینیاں پوچھیں گی مجھکو بار بار
مسکراتے پھول دہرائیں گے میرے نام کو ۔۔ تذکرے احباب فرمائیں گے اکثر شام کو
چٹکیاں لیگی دلوں میں میرے نغموں کی مٹھاس ۔۔ شاید اب تالاب کی ساری فضا ہوگی اداس
غم کی ماری ماں کو میرا دھیان آئیگا ضرور ۔۔ کیا کروں خود ہو رہا ہوں دامنِ رحمت سے دور
چھٹ رہا ہوں اس کی آغوشِ محبت سے مگر ۔۔ یاد اُس کی ساتھ ہوگی، اور دعائیں راہبر
بدگماں ہونا نہ میں رسمِ وفا سے دور ہوں
چھوڑ کر تجھکو نہ جاتا اے وطن مجبور ہوں

جوہر فریادی!

شاعرہ کی موت

زیست میری جب فنا کی گود میں سو جائیگی ۔۔ جب متاعِ زندگی اے ہمنشیں کھو جائیگی
موت کے ہاتھوں اُجڑ جائیگا جب باغِ حیات ۔۔ رُوح غمِ دُنیا کے اندیشوں سے پا جائیگی نجات
منہ پہ جب احساس کے پڑ جائیگی کالی نقاب ۔۔ آرزوؤں کا مری جب ٹوٹ جائیگا رباب
سانس کا جب ٹوٹ جائیگا یہ رنگیں سلسلہ ۔۔ قطع ہو جائے گا رشتہ جسم کا اور جان کا

انجمن پھولوں کی ہوگی نوحہ خواں میرے بغیر ۔۔ ہوگی دیوی صبح کی حسرت فشاں میرے بغیر
ہر خس و خاشاک میں جب تازگی آجائے گی ۔۔ عارضِ قدرت پہ مایوسی سی اک چھا جائیگی

[illegible] تالاب کی ہو جائے گی
[illegible] کے آنسو شب کو جب ٹپکائیگی
[illegible] شفق کا دیکھنا اُڑ جائے گا
صبح کو چڑیاں جگانے کو بہت چلائیں گی
پھول فرقت میں مری ہو جائیں گے خستہ خراب
چاک دامانی کریگی میرے بن حورِ نسیم
جستجو میں میری آوارہ پھرے گا ماہِ تاب
روئیں گی شبنم کی لڑیاں میرے غم میں زار زار
قبر پہ میری عجب دھوم مچیں گی صبح شام
میری فرقت میں دِوانی تتلیاں ہو جائینگی
سسکیاں لیں گی مری تربت پہ ندہ حسرتیں

بہنے والی ہر کلی مایوس سی ہو جائے گی
رُوح میری آسمانوں پر بہت [illegible]
میرے بن کوئل کا دل گھبرا [illegible]
دیکھکر ساکت مجھے مایوس واپس جائیں گی
کھائے گی ہر شاخ میرے نام پر [illegible]
خاک اُڑائیگی مری فرقت میں پھولوں کی [illegible]
میرے بن تارے فلک پر ہونگے غرقِ اضطراب
ذکر سے میرے نگار رات ہوگی بے قرار
گائیں گے بیدار کرنے کو طیورِ خوش کلام
منتشر فرشِ زمیں پر پتیاں ہو جائیں گی
روئیں گی فرقت میں میری گلشنوں کی [illegible]

جب بھری برکھا میں سب مل کر ترانے گائیں گی
میری اُلفت خیز باتوں کو بہت ترسینگے کان
باغ سے آئے گی جب غمگیں پپیہے کی پکار
جب کہانی ہوگی جاڑوں کی سنہری رات میں
جشنِ رنگیں ہونگے جب۔ دھوم میں مچینگی بے پناہ
موسمِ باراں میں ہر سو حسن جب چھا جائے گا

شوخیاں میری بہت سکھیوں کو یاد آجائیں گی
پر نہ پائے گا کوئی میری محبت کا نشان
یاد آجائے گی سکھیوں کو مری بے اختیار
یاد کر لیں گی مری سکھیاں مجھے ہر بات میں
یاد میں میری نکل جائیگی سب کے منہ سے "آہ"
ساتھ اشکوں کے مرا سب کو خیال آجائیگا

نوحہ خواں بزمِ صحافت ہوگی میرے ہجر میں
سبزۂ علم و ادب کچھ زرد سا ہو جائے گا
پر الم نظمیں لکھی جائیں گی میری موت پر
ذکر میرا جب کبھی بزمِ سخن میں آئے گا
شاعری کی بزم ہو جائے گی غمگیں بیقرار
آئیں گے جب آسماں پر بادلوں کے قافلے
ہوگی فطرت غرقِ گریہ نوحہ خواں میرے لئے

ہوگا اک طوفاں بپا ہندوستاں کے بحر میں
شاعری کا کچھ دلوں جیسے مزا کھو جائے گا
مشرقی بہنیں میری فرقت میں ہونگیں نوحہ گر
ایک نشتر سا دلوں میں دفعتہً چبھ جائیگا
لکھنوی بہنیں مری فرقت میں ہونگیں سوگوار
یاد اہلِ ذوق کو آئیں گے میرے زمزمے
کچھ دلوں تک روئیگا ہندوستاں میرے لئے

ایک دن پھر من چلی دُنیا کو صبر آجائے گا
قصرِ امیدوں کا اک تازہ بنایا جائے گا

صفیہ شمیم ملیح آبادی!

انتظار

(گھڑی آٹھ بجاتی ہے)

منتظر۔ آدھا گھنٹہ — صرف آدھا گھنٹہ اور پھر اس کے بعد..... پٹن کی آخری ڈوبتی ہوئی گونج کتنی پیاری تھی — اور... اور...

منطقی وجود۔... اگر وہ نہ آئی — یعنی اگر...

منتظر۔ کیوں نہ آئے گی — ضرور آئے گی۔ (پھیکی ہنسی)... یہ اندیشے بالکل فضول ہیں (اپنے آپ کو تسلی دینے کے انداز میں) اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔

منطقی وجود۔ وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا۔

منتظر۔ کتنا لغو خیال ہے — کسی کے شعر کا ایک مصرعہ ہے شاید، لیکن کس قدر عامیانہ ہے — ایسی شاعری ہی نے تو..... وہ ضرور آئے گی اور شاعری... شاعری — اچھی چیز ہے — تپائی پر جو یہ گلدان پڑا ہے میں نے اس میں ابھی تک پھول کیوں نہ سجائے۔ (پھولدان اٹھاتا ہے)... یہ پھولدان اسے پسند ہے۔ آج وہ اسے اور بھی پسند کریگی۔ نرگس اور بنفشہ کے پھول اسے بہت بھلتے ہیں — یہاں پر یہ ٹھیک رہے گا — کیوں۔ (پھولدان پھر پھر رکھ دیتا ہے۔ سیٹی بجاتا ہے۔)

منطقی وجود۔ (اسی دھن میں یہ شعر گاتا ہے:-)

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

(وقفہ)

منتظر۔ (ایک ایک لفظ کر کے) وہ — آئیں — گھر — میں — ہمارے۔ خدا — کی — قدرت — ہے — خدا کی قدرت ہے (چونک کر) خدا کی قدرت — خدا کی قدرت یعنی اس کا آنا بالکل اچانک تھا۔ شاعر کو اس کی آمد کا یقین نہیں تھا — یقین ہوگا مگر ہمیں تو پورا پورا یقین ہے — کیوں؟۔

منطقی وجود۔... اگر... اگر....

منتظر۔ ہٹاؤ جی اس خیال کو — ہاں — تو میں کیا سوچ رہا تھا — سوچ کیا رہا تھا؟ — سوچنے کی بات ہی کیا ہے؟۔ وہ ضرور آئیگی — چند منٹوں کی بات ہے۔

منطقی وجود۔ ایک گھنٹے میں ساٹھ منٹ ہوتے ہیں — ساٹھ۔

منتظر۔ ستائیس منٹ اور رہ گئے ہیں — صرف ستائیس — (گھڑی کی ٹک ٹک بلند ہو کر پھر اپنی اصلی حالت پر آجاتی ہے۔) ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی ہے۔ پھولدان بھی سج گیا۔ سگریٹ سلگا لیتا ہوں۔ ایک سگریٹ کم از کم دس منٹ جلتا رہیگا۔

منطقی وجود۔ ساڑھے سات منٹ۔

منتظر۔ تو کیا ہوا... (سگریٹ سلگاتا ہے)

منطقی وجود۔ کش زور سے کیوں لے رہے ہو۔

منتظر۔ ساتھ ساتھ ٹہلتا بھی رہوں تو ٹھیک رہے گا۔ (ٹہلتا ہے) ہاں — تو یہ بات ہے۔

منطقی وجود۔ کیا بات ہے۔ تم کھوئے کھوئے سے کیوں ہو؟

منتظر۔ کوئی بات نہیں، بات کیا ہوگی۔ ایک صرف اتنا ڈر ہے کہ....

منطقی۔ موسم خراب ہے۔

(کڑک سی بلند ہوتی ہے۔)

منتظر۔ (گھبرا کر) یہ بجلی کی کڑک تو نہیں تھی؟

منطقی وجود۔ سگرٹوں کا ڈبہ جو آپ نے ابھی ابھی کھولا تھا اس کا ڈھکنا آپ کے پیر کے نیچے آگیا ہے۔

منتظر۔ (ہنستا ہے) آواز بالکل بجلی کی سی پیدا ہوئی.... کیا ڈھکنا ہی تھا؟ — ڈھکنا ہی تھا — (کھڑکی کھولتا ہے) موسم زیادہ خراب تو نہیں ہے۔ بادل؟ — وہ اب تو گھر سے چل پڑی ہوگی — یہ سگریٹ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا۔ انگلیوں میں مسلا گیا ہے۔

منطقی وجود۔ دوسرا سلگا لو یوں تھوڑا سا وقت بھی خرچ ہو جائیگا۔

منتظر۔ نہیں، زیادہ سگریٹ میں نہیں پیوں گا، منہ سے بو آئیگی۔ بہت ممکن ہے اسے ناگوار معلوم ہو — اس نے ایک بار کہا بھی تو تھا........

و۔ (یعنی جس کا انتظار کیا جا رہا ہے، اس کی آواز آتی ہے)۔ تمہیں میری ہی جان کی قسم جو آپ سگرٹ پیو......

منتظر۔ مجھے عدول حکمی نہیں کرنی چاہیئے۔ (وقفہ)

منطقی وجود۔ سگریٹ بجھا دیا — اب یہ وقت کیسے کٹے گا۔

[illegible] ہوا — ریکارڈ نکال کر باہر رکھ دوں، بہت ممکن ہے
[illegible] پسند ہے۔

منطقی وجود۔ [illegible] ریکارڈ ہے [illegible] منٹ تک بجتا رہیگا۔

منتظر۔ تین منٹ . . . (ریکارڈ لگاتا ہے) . . . تین منٹ تک بجتا رہیگا۔
[illegible] — موسیقی مجھے پسند ہے۔

(ریکارڈ بجایا جاتا ہے۔)

رات کٹی گن گن کے تارے

(ریکارڈ پر سے ایکدم سوئی ہٹا لیتا ہے۔)

منتظر۔ کیسا واہیات ریکارڈ ہے — رات کٹی گن گن کے تارے —

منطقی وجود۔ ابھی تو آٹھ بج کر کچھ منٹ ہوئے ہیں۔ ساری رات پڑی ہے۔

منتظر۔ ابھی آٹھ بجکر کچھ منٹ ہی ہوئے ہیں — تو اس کا کیا مطلب ہے — میں — میں اتنا بیتاب کیوں ہو رہا ہوں — آجائے گی — ایسی باتوں ہی سے تو ان لوگوں کا دماغ ساتویں آسمان پر پہونچ جاتا ہے — میں اس کا انتظار بالکل نہیں کرونگا — کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ میز پر یہ سفید کاغذ رکھا ہی ہے۔ اس پر اس مہینے کا حساب لکھنا شروع کر دیتا ہوں — ہاں — سگریٹ، پانچ روپے، . . . . . سگریٹ پانچ روپے . . . (یہ آواز فیڈ ہوتی جاتی ہے اور جس کا انتظار کیا جا رہا ہے اسکی آواز ابھرتی آتی ہے)

ق۔ تمہیں میری جان کی قسم جو اب سے سگرٹ پیو — دیکھو تو کتنے کمزور ہو رہے ہو — بادام کھایا کرو۔

منتظر۔ اسے میرا کتنا خیال ہے . . . . اب آ بھی جائے۔ مگر . . . .

منطقی وجود۔ ساڑھے آٹھ بجنے میں ابھی کافی دیر ہے۔

منتظر۔ میں سمجھتا ہوں یہ گھڑی فاسٹ ہے — کیا پتا ہے کہ . . . .

منطقی وجود۔ گھڑی سلو ہو۔

منتظر۔ اجی نہیں، اس گھڑی کا وقت بالکل صحیح ہے — ابھی پرسوں ہی تو ٹھیک کرائی ہے — (وقفہ) — کہیں اسکی گھڑی میں فرق نہ ہو۔

منطقی۔ ایسا ہو سکتا ہے۔

منتظر۔ تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ پانچ نہیں دس منٹ کا فرق ہوگا۔

منطقی۔ اس وقت سے لیکر اب تک دس منٹ مشکل سے گذرے ہیں — نہیں ابھی دس منٹ نہیں گذرے۔

منتظر۔ گھڑی میں ضرور خرابی ہے — کھول کر نہ دیکھ لوں۔

منطقی وجود۔ کھول کر آپ کو کیا نظر آجائیگا۔

منتظر۔ کچھ نہیں، میں نے تو یہ کہا تھا کہ یونہی تھوڑا سا وقت گذر جائے گا۔

منطقی وجود۔ تو چلئے پرزے کھول کر بیٹھ جائیے مگر یاد رہے اس کی طرح پھر جڑینگے نہیں۔

منتظر۔ (ہنستا ہے) کیسے کیسے عجیب خیال آتے ہیں۔ (ہنستا ہے پھر گاتا ہے) کیسے کیسے عجیب خیال آتے ہیں — نہیں وزن ٹھیک نہیں ہے —

منطقی وجود۔ یہ آپکو شاعری کیا سوجھی۔

منتظر۔ (خوب ہنستا ہے) یہ شاعری بھی اچھی رہی — اب آ بھی جائے — وقت کیا ہوا ہے — ساڑھے . . . .

منطقی۔ ابھی ساڑھے کہاں — سوا کہیئے۔ سوا۔

منتظر۔ مجھے کوئی کام بھی نہیں ہے آج۔

منطقی۔ اس مہینے کا حساب لکھنا تھا۔

منتظر۔ اجی لعنت بھیجو حساب کتاب پر۔ یہ بھی کوئی وقت ہے حساب کا — لیکن ایسے وقت میں کرنا کیا چاہیئے۔

منطقی۔ اسکو ایک خط لکھنا شروع کر دو۔

منتظر۔ بالکل ٹھیک — (وقفہ) — اس پیڈ کا کاغذ اچھا رہیگا۔

منطقی۔ ہاں — خوشبودار ہے۔

منتظر۔ کیا لکھوں — (وقفہ) — مضمون سمجھ میں نہیں آتا۔

منطقی۔ لکھو، میں تمہارا بہت انتظار کرتا رہا۔

منتظر۔ اور جب وہ آئے تو یہ خط اس کو دیدوں — خیال اچھا ہے — تو لکھتا ہوں — (وقفہ) . . . میرا خیال ہے کہ اب وہ گھر سے چل پڑی ہوگی — یہ خط اس کے آنے تک ختم نہ ہوگا۔

منطقی۔ تم خط لکھنا شروع تو کرو۔

منتظر۔ میری پیاری . . . . تم نے آج وعدہ کیا تھا کہ ساڑھے آٹھ بجے آؤگی۔ میں تمہارا شدت کے ساتھ انتظار کرتا رہا . . . . .

منطقی۔ کتنی پھسپھسی عبارت ہے۔

منتظر۔ پھسپھسی — نہیں تو — (وقفہ) — واقعی پھسپھسی ہے — اب تو وہ آتی ہی ہوگی۔ (کاغذ پھاڑ دیتا ہے) — خط کی کوئی ضرورت نہیں، میں اسکو زبانی بتا دوں گا۔

منطقی۔ بشرطیکہ وہ آجائے۔

منتظر۔ یہ شرط کیسی — وہ ضرور آئے گی۔

منطقی وجود۔ اگر.... اگر....

منتظر۔ نہیں نہیں۔

منطقی۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے۔

منتظر۔ کیسے بیہودہ خیال ہیں۔

منطقی۔ اگر وہ نہ آئی تو۔

منتظر۔ ضرور آئے گی۔

منطقی۔ دیکھ لیں گے۔

(دستک کی آواز)

منتظر۔ (خوش ہوکر) ... لو وہ آگئی۔ (گھبراکر) سب چیزیں ٹھیک ہیں نا؟ — سگرٹوں کا ڈبا! — اسے کہاں رکھوں؟ — کون ہے؟ — اس کا ڈھکنا کہاں ہے؟ — لعنت! — خالی ہی کہیں چھپا دیتا ہوں — اور — اور یہ — آیا! — بس اب سب ٹھیک ٹھاک ہے —

منطقی۔ اپنا دم تو درست کر لو — ہانپ رہے ہو۔

منتظر۔ دم وم سب ٹھیک ہے — میرا خیال ہے اس کو تھوڑا سا ڈرانا چاہیئے۔

(دروازہ کھولتا ہے اور پھر ایکدم ڈرانے کی خاطر "ہپ" کرتا ہے)

اخبار والا۔ (ڈرے ہوئے انداز میں) ... اجی صاحب — آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا — اف۔

منتظر۔ تم — ت — و — تم — تم کون ہو — تم اخبار والے کیوں ہو؟ — بھاگ جاؤ یہاں سے۔

اخبار والا۔ حضور یہ پوچھنے آیا تھا کہ دونوں اخبار اسٹیٹسمین اور ہندوستان ٹیمز لایا کروں یا اکیلا اسٹیٹسمین — جیسا آپ حکم دیں۔

منتظر۔ جتنے بھی ہوں لے آیا کرو۔

اخبار والا۔ بہت اچھا سرکار۔

(اخبار والا چلا جاتا ہے۔ دروازہ بند کر دیا جاتا ہے)

منتظر۔ اس اخبار والے کو بھی اسی وقت آنا تھا — کمبخت ڈر گیا تھا۔ (ہنستا ہے)

(ہولے ہولے دستک دینے کی آواز)

منتظر۔ (ہنسی روک کر) آگئی — آگئی —

(دروازہ کھولتا ہے اور پھر ایک دم "ہپ" کرتا ہے)

اخبار والا۔ (ڈرے ہوئے انداز میں) صاحب — یہ — یہ — آپ بار بار مجھے کیوں ڈراتے ہیں۔

منتظر۔ اوہ! — تم کیا چاہتے ہو؟ — اب پھر کیوں آئے ہو؟ —

خدا کے لئے جاؤ۔

اخبار والا۔ صاحب یہ پوچھنے آیا تھا کہ اردو کے اخبار بھی لایا کروں —؟

منتظر۔ فارسی، عربی، گجراتی، مرہٹی، پنجابی۔ سب زبانوں کے لے آیا کرو مگر خدا کیلئے اس وقت جاؤ۔

(دروازہ بند کر دیتا ہے)

منتظر۔ حد ہوگئی ہے۔

منطقی وجود۔ بڑے شرم کی بات ہے۔ وہ دل میں کیا کہتا ہوگا۔

منتظر۔ اجی ہٹاؤ — لیکن میں کہتا ہوں وہ ابھی تک آئی کیوں نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہو گیا.....

منطقی وجود۔ کہ وہ بھول گئی ہو۔

منتظر۔ ایسا بھلا ہو سکتا ہے۔ بس اب وہ آتی ہی ہوگی۔ یہاں سے اس کا گھر بھی تو کافی دور ہے۔ اور بہت ممکن ہے پیدل آئے۔

منطقی۔ تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ بہت دیر کے بعد آئیگی۔

منتظر۔ میرا مطلب یہ تو نہیں تھا۔ وہ گھر سے تو بہت پہلے کی چل پڑی ہوگی۔ گھڑی — گھڑی — یہ گھڑی ضرور خراب ہو گئی ہے — دیکھو نا اسکی سیکنڈ کی سوئی کتنی ہولے ہولے چلتی ہے۔

منطقی۔ سامنے کلاک موجود ہے۔

منتظر۔ دونوں کا وقت مجھے صحیح معلوم نہیں ہوتا — خیر کل پتا لگ جائیگا۔ — ابھی تک دس منٹ باقی ہیں — گذر کتنے چکے ہیں۔

منطقی۔ سترہ — تیرہ ابھی باقی ہیں۔

منتظر۔ میں دیوانہ ہو جاؤنگا۔

منطقی۔ کیا کہا۔

منتظر۔ کچھ بھی نہیں — تو یہ ناول پڑھنا شروع کر دیتا ہوں —

(لکڑی کے ساتھ کوئی چیز ٹکراتی ہے۔)

منتظر۔ (اچھل کر)..... لو وہ آگئی — آیا۔

منطقی۔ آپ کا پیر کرسی کے نچلے ڈنڈے کے ساتھ ٹکرایا ہے۔ دستک نہیں ہوئی۔

منتظر۔ پھر ٹکرائے گا — اٹھ کھڑا ہوتا ہوں — ٹہلتا رہوں گا اور پڑھتا رہوں گا۔

(بیقراری کے ساتھ ٹہلتا ہے — گھڑی کی ٹک ٹک کی رفتار مدھم ہو جاتی ہے مگر آواز بلند ہو جاتی ہے۔)

منتظر۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ عجب اوٹ پٹانگ عبارت ہے۔ (کت

(گلاس اور میز پر رکھنے کی آواز) ... پھر بیٹھ گیا۔

منطقی وجود۔ دل بیٹھتا کیوں جا رہا ہے۔

منتظر۔ کیا مصیبت ہے۔ پانی پیتا ہے (پانی پیتا ہے) ... تلخی ... کس قدر تلخی ہے حلق میں ... میرا خیال ہے ٹھیک وقت پر آئے گی۔ پورے ساڑھے آٹھ بجے۔ (چونک کر) ابھی ساڑھے آٹھ نہیں بجے ... میں ... میں ... بیٹھ جاتا ہوں۔ (گھڑی بڑے بڑے وقفوں کے بعد ٹک ٹک کرتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیکنڈ لمبے ہو گئے ہیں۔) مجھے کچھ ہو گیا ہے۔

منطقی وجود۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔

منتظر۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ (میز پر انگلیوں سے ڈھول بجاتا ہے) میں کیا کر رہا ہوں۔ (گھڑی کی بھیانک آواز)

(گھبرا کر اضطراب کے ساتھ ٹہلنا شروع کر دیتا ہے۔)

منطقی وجود۔ پیر لڑکھڑا رہے ہیں۔

منتظر۔ تو اچھا بھلا بیٹھا تو تھا ... اٹھ کر چلنے کیوں لگا ... حلق سوکھ رہا ہے۔ لیکن اب تو اس کے آنے میں کوئی دیر نہیں۔ چند منٹوں کی ...

منطقی وجود۔ چند منٹوں کی جن میں ... (گھڑی لمبے لمبے سانس لیتی ہے)

(کاغذ کھڑکھڑاتا ہے)

منتظر۔ آج ہوا کتنی تیز ہے۔ کیلنڈر کا کاغذ کھڑکھڑا رہا ہے۔

(برتن گرنے کی آواز)

منتظر۔ اس میری ہمسائی کے گھر میں ہر وقت برتن ہی گرتے رہتے ہیں۔

منطقی۔ آج تمہارے کان بڑے تیز ہیں ؎

فریبِ آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آوازِ پا سمجھے

منتظر۔ ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آوازِ پا سمجھے ... آوازِ پا ... دل کی دھڑکن ... (گھڑی زیادہ لمبے لمبے سانس لیتی ہے) ... یہ میرے دل کو کچھ ہو گیا ہے یا کلاک خراب ہو گیا ہے ... میرا حلق بھی سوکھ رہا ہے ... ابھی وقت نہیں ہوا۔ (اضطراب کے ساتھ ٹہلتا ہے)

(دروازے پر دستک)

منتظر۔ (کمزور آواز میں) ... آ گئی ... آ گئی ... خوشی سے میری آواز ہی نہیں نکلتی ... دروازہ .... دروازہ ....

منطقی۔ دروازہ آپ کے سامنے ہے۔

منتظر۔ ارے ہاں .... آیا ... آیا۔

(دروازہ کھولنے کی آواز)

دوست۔ السلام علیکم۔

منتظر۔ (ہکلا کر) و و و و ... وعلیکم السلام ... ک ... ک ... ک ... کیسے تشریف لائے۔

دوست۔ میں تم کو اس گھوڑی کی بابت کچھ بتانے آیا تھا۔

منتظر۔ گھو ... گھو ... گھوڑی۔

دوست۔ اماں وہی جس کی بابت کالے خاں کہتا تھا کہ بڑی دولتیاں جھاڑتی ہے ... بھئی تھی بڑی منہ زور ... پٹڑی نہیں جمنے دیتی تھی۔ بگدھریاں کرتی تھی بگدھریاں۔

منتظر۔ بگ ... دھریاں ... جی۔

دوست۔ منہ کی بہت کڑی تھی ... الف ہو جاتی تھی الف۔

منتظر۔ جی ... کسی سلوتری کے حوالے کر دی ہوتی۔

دوست۔ تم تو گھاس کھا گئے ہو۔ کہاں کا سوار کہاں کا سلوتری۔ قدم رکاب میں گیا اور سرپٹ ہو گئی ... اور مجھے تو پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتی تھی۔ ایسی چمکتی تھی جیسے بجلی ....

منتظر۔ میں .... میں ....

دوست۔ کاٹھیاواڑ کمیت کی تھی نا ... چھوٹے تو سرپٹ جائے۔ انجر پنجر ڈھیلے کر دے .....

منتظر۔ میں .... میں ....

دوست۔ یہ میں میں کیا کرتے ہو۔

منتظر۔ میں بیمار ہوں ... سخت بیمار ہوں ... آپ ... آپ ... اوہ ... ساڑھے آٹھ بجنے والے ہیں۔

دوست۔ (فکر مند لہجے میں) تم بیمار ہو۔ لیکن بھئی عجیب بیوقوف ہو۔ مجھ سے تم نے پہلے کیوں نہ کہا ... اب اطمینان سے اپنا سارا حال سناؤ۔ مجھے کوئی خدمت بتاؤ۔ بھئی واللہ کمال کر دیا ... اور ہاں، یہ ساڑھے آٹھ بجے تم نے کیا کہا تھا۔

منتظر۔ (مردہ آواز میں) ساڑھے آٹھ بجے ... ساڑھے آٹھ بجے مجھے دوا پینی ہے۔

دوست۔ لاؤ میں پلا دیتا ہوں ... کہاں ہے دوا ... ساڑھے آٹھ بجنے میں اب کونسی دیر ہے ... دوا کہاں ہے۔

منتظر۔ نہیں۔ نہیں۔ میں خود پی لوں گا۔ آپ تکلیف نہ کریں ... آپ ... آپ ... آپ جائیے۔

دوست۔ میں تمہیں یہاں بیمار چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں۔

منتظر۔ میں ... میں ... میں بیمار نہیں ہوں ... میں ابھی ٹھیک

جھٹکا — آپ جائیے — او خدا کے لئے آپ جائیے۔ مجھے دل کا دورہ پڑ جائے گا۔

دوست۔ دل کا دورہ — بھئی اب تو میں ہرگز نہیں جاؤنگا — بتاؤ دوا کہاں ہے۔

منتظر۔ دوا میرے پاس نہیں ہے — آپ جائیے — خدا کے لئے جائیے۔

دوست۔ تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر میں ڈاکٹر کے پاس بھی تو نہیں جا سکتا۔

منتظر۔ کیا کہا؟ — (اضطراب بڑھتا جاتا ہے۔ گھڑی کی آواز زیادہ لمبے لمبے سانس لیتی ہے) — کیا کہا؟ — آپ ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں جائیں گے — میں — میں مر جاؤں گا — خدا کے لئے ڈاکٹر کے پاس دوڑے جائیے — میری حالت بہت خراب ہے — میری — حالت — بہت — نازک — ہے — جائیے — (آواز کمزور ہوتی جاتی ہے۔)

دوست۔ غش طاری ہو گیا — کیا ہوا؟ — ڈاکٹر؟ — کہاں ملیگا ڈاکٹر — (گھبراہٹ کے عالم میں دوڑتا جاتا ہے) اب کوئی ڈاکٹر مل جائے اس وقت۔ (چلا جاتا ہے)

(گھڑی اصلی حالت میں ٹک ٹک کرتی ہے — یہ آواز ڈیڑھ سیکنڈ تک جاری رہتی ہے — آخر میں کلاک میں خرخراہٹ پیدا ہوتی ہے اور ایک ٹن کی آواز آتی ہے۔ اس ٹن کی گونج تھوڑی دیر قائم رہتی ہے۔ پھر گھڑی کی ٹک ٹک بالکل بند ہو جاتی ہے اور ایک سیکنڈ تک مکمل خاموشی طاری رہتی ہے — اس خاموشی کے بعد دروازہ کھلتا ہے اور جس کا انتظار کیا جا رہا ہے وہ آتی ہے۔)

وہ۔ دیکھو تو، کس مزے سے جناب سو رہے ہیں۔ گویا ان کو معلوم ہی نہیں میں آ رہی ہوں — کافی گہری نیند سو رہے ہیں — خدا جانے کہاں سے گھومتے گھامتے تھک کر آئے ہوں گے — (خفگی کیساتھ)۔ تو مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ یہاں بن بلائے مہمانوں کی طرح کھڑی رہوں.... (دروازہ بند کرکے چلی جاتی ہے)

———

سعادت حسن منٹو

وقت

وقت، بقیدِ مکاں، باعثِ ذوقِ نمود
وقت بقیدِ زماں، رونقِ بزمِ شہود

وقت سے صبحِ ازل وقت سے شامِ ابد
وقت کے امکاں میں ہیں کچھ بھی ہیں ہست و بود

وقت زمیں کیلئے نقش گرِ روز و شب
وقت سے شمس و قمر، جلوۂ چرخِ کبود

وقت تبسّم فروزِ صحنِ چمن کے لئے
وقت سے بزمِ فلک وقفِ نشاط و سرود

وقت کا افسانہ گو ہر ورقِ روزگار
وقت کا نقشِ وجود، عالمِ بود و نبود

وقت کی جلوہ گری مشعلِ راہِ خرد
وقت کا حسنِ نہاں منزلِ دل کا وجود

وقت میں جز حال اور کوئی زمانہ نہیں
وقت پہ عائد نہیں دہر کی رسم و قیود

وقت بقا آفریں وقت بقائے دوام
وقت کی وسعت ہوئی تنگیِ چشمِ حسود

تابش دہلوی

فساد کے دنوں میں

چاقو نے آم کے کئی ٹکڑے کر دیے۔

آم ــــ دنیا میں کتنے آم ہیں۔ سرخ، زرد، کھٹّے، میٹھے۔

اور چاقو ـــــ شاید چاقو آموں سے بھی زیادہ ہیں۔ تیز چاقو، چمکدار چاقو، انگلش چاقو، جرمن چاقو۔

چاقو آموں کو کتنی جلدی کاٹ ڈالتے ہیں۔ بیچارے نرم نرم معصوم آم، صرف اس گناہ میں کہ وہ نرم ہیں، کمزور ہیں، نرم اور کمزور آم مشرق کے آم اور مغرب کے چاقو۔ مغرب کے آم اور مشرق کے چاقو۔ لیکن مشرق میں چاقو کہاں اور مغرب میں آم کہاں؟

پلیٹ میں آم کی قاشیں گٹھلی کے ارد گرد اس طرح پڑی ہوئی تھیں جس طرح گیندے کے پھول کی نوچی ہوئی پتّیاں زمین پر اس کے ارد گرد پڑی ہوں۔

خزاں کے موسم میں زرد رنگ کے سوکھے ہوئے پتّے درختوں کے نیچے گر جاتے ہیں۔ شام کے وقت جب کسان اپنا اپنا کام ختم کر کے اپنے اپنے گھر کو جاتے ہیں، تند ہوائیں اُن پتّوں کو لیے لیے پھرتی رہتی ہیں۔ درخت ایک جگہ پر ساکن حسرت سے اپنے لباس کی دھجیاں اڑتی دیکھتے ہیں سورج کی زرد کرنیں اس منظر کو اکیلا چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔

یکایک مجھے پرسوں کے ایک خط کا خیال آیا۔ میرا دوست عتیق آ رہا تھا۔ اُس نے مجھے لکھا تھا کہ میں اشفاق کو ساتھ لیکر بمبے سنٹرل پر ملوں، ضرور ملوں، میں نے گھڑی دیکھی۔ سات بج چکے تھے۔ ٹرین کی آمد میں، ۵ منٹ اور تھے۔ کیا کروں، میں نے دیکھا کہ میرے ریکارڈ میں ہزاروں ایسے موقع آئے تھے جب میں نے وعدہ شکنی سے اپنے آرٹسٹ ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ اس انکشاف نے میری حوصلہ افزائی کی، اور مجھے ۵ منٹ ضائع کرنے میں بڑی راحت محسوس ہوئی۔ لیکن پھر مجھے خط کی تفصیلات نے پریشان کرنا شروع کیا۔ عتیق بغیر ٹکٹ آ رہا تھا، اُس نے سینکڑوں سفر بغیر ٹکٹ طے کئے تھے۔ وہ تمام ریلوے کمپنیوں کے ٹی۔ ٹی۔ ای۔ ڈیپارٹمنٹ کے سپرنٹنڈنٹوں کے نام جانتا تھا۔ اور بی۔ بی۔ اینڈ سی۔ آئی۔ آر۔ کے ٹی۔ ٹی۔ ای ڈیپارٹمنٹ کے سپرنٹنڈنٹ کا بیٹا اشفاق تو اس کا گہرا دوست تھا۔ وہ اس دفعہ اشفاق بن کر آ رہا تھا۔ وہ ہمیشہ فرسٹ کلاس میں سفر کرتا تھا۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔

ایک تو وہ تمام ریلوے کمپنیوں کے سپرنٹنڈنٹوں کا رشتے دار تھا۔ دوسرے اگرچہ وہ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں لیٹا بھی رہتا تھا، اکثر لیٹرین میں بھی جاتا تھا۔ دریچے بھی بند رکھتا تھا، لیکن پھر بھی ٹکٹ ایگزامنروں کو وہ کمپارٹمنٹ خالی خالی معلوم ہوتا تھا۔ اور ٹکٹ دکھانے کے امکانات تقریباً تقریباً صفر تھے۔ غالباً انہیں حالات میں وہ اب آ رہا تھا۔ اور اگر اشفاق اور میں اُس کو لینے کے لئے نہ جائیں تو بومبے سنٹرل میں اُس کے پکڑے جانے کے امکانات اگر زیادہ نہیں تو ایک بٹا دو فی صدی ضرور تھے۔ صرف ½ فی صدی۔ اس ریاضی نے میری حوصلہ افزائی کی، اور مجھے دوسرے ۵ منٹ ضائع کرنے میں بہت راحت محسوس ہوئی۔ لیکن پھر خیالات کے آتش فشاں پہاڑ نے آنکھ کھول دی۔ اگر وہ پکڑا گیا تو وہ فرسٹ کلاس کا کرایہ کہاں سے لائیگا۔ میں نے جو سرمایہ جمع کیا تھا اس کا کل ڈریسنگ ٹیبل خرید لایا۔ کیا وہ پھر بیچ دینا پڑے گا؟ اور اگر وہ نہ پکڑا گیا، تو کیا اُس کو میرا گھر مل جائے گا؟ ہاں میرے خطوں پر پتہ اس کی مدد کرے گا۔ لیکن فساد! ہندو مسلم فساد اور کرفیو آرڈر۔

میں نے سوچا اگر کل کو اخبار میں لکھا ہوگا کہ ایک نوجوان مسافر بمبے سنٹرل سے نکل کر لیمنگٹن روڈ پر جا رہا تھا۔ وہ کسی کی تلاش میں معلوم ہوتا تھا۔ ایک نامعلوم شخص نے اس پر چاقو سے حملہ کر دیا۔ نوجوان مسافر اسی جگہ پر مر گیا۔ اخبار میں یہ تو نہیں لکھا ہوگا کہ وہ نوجوان مسافر فرسٹ کلاس میں ٹکٹ کے بغیر سفر کر کے بمبئی میں پہونچا تھا۔ لیکن اس حادثے کے علاوہ بھی واقعات کچھ کم غیر معمولی نہیں۔ اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ پلیٹ فارم پر کوئی ٹکٹ چیکر اس کو پکڑ لے پھر کیا ہوگا؟ ــــ پھر ــــ پھر ــــ ڈریسنگ ٹیبل ــــ فساد ــــ چاقو ــــ آم کی قاشیں ــــ گیندے کا پھول ــــ

میں نے آم کے کھائے ہوئے چھلکے اور گٹھلی دریچے سے نیچے پھینک دئے۔

جب میں کپڑے پہن رہا تھا مجھے خیال آیا کہ آم کے چھلکے نیچے فٹ پاتھ پر بکھر گئے ہونگے۔ ممکن ہے اُنہوں نے وہ جگہیں [illegible] جہاں رات کو مزدور اپنے ٹاٹ کے بستر بچھا کر سوتے ہیں گندے [illegible] اچھا نہیں کیا، لیکن مزدور اُن کو آسانی کے ساتھ [illegible]

...ہیں آم کے چھلکے اُن کا مقابلہ نہیں کریں گے۔ وہ صبح سے لیکر
شام تک دوسروں کے لئے بھاری بھاری پتھروں کی شاندار آرامگاہیں
بنانے میں مشغول رہے ہیں۔ اور صلے میں ان کو صرف آٹھ آنے ملے تھے۔
کیا وہ رات بھر کا آرام صلے میں پانے کے لئے اُن آم کے چھلکوں کو اپنی
جگہ سے نہیں ہٹا سکتے۔

اتفاق سے میری نظر دریچے میں سے نیچے چلی گئی۔ آم کے چھلکے
نیچے فٹ پاتھ پر نہیں گرے تھے۔ ایک وکٹوریہ والا نیچے سے گذر رہا تھا،
اس کی پرانی پھٹی ہوئی گدے دار سیٹوں پر بکھر گئے۔ وکٹوریہ والے نے
اپنے سیاہ بھینچے ہوئے چہرے پر اپنی سرخی مائل زرد آنکھوں سے میری
طرف گھور کر دیکھا۔ میں پیچھے ہٹ گیا اور جب میں نے دوسری دفعہ
ڈرتے ڈرتے نیچے نگاہ ڈالی، تو دیکھا کہ وکٹوریہ والا آم کی گٹھلی کو چوس
رہا ہے۔ اتنی ہمت نہ ہوئی کہ کہدوں مجھے گاڑی چاہیئے۔ وہ چلا گیا۔
میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ وقت بہت تھوڑا تھا۔

ناگپاڑہ ـــ بھنڈی بازار ـــ پائیدھونی ـــ کالبا دیوی ـــ
دھوبی تلاؤ ـــ یہاں مجھے اشفاق کو اپنے ساتھ لینا تھا۔ اور وہاں سے
میرین ڈرائیو سبربن سٹیشن سے بمبے سنٹرل کے لئے الیکٹرک ٹرین کا
ٹکٹ مل سکتا تھا۔ سکیم یہ تھی کہ میں اور اشفاق تین پلیٹ فارم ٹکٹ لیکر
اندر چلے جائیں۔ اور پھر تینوں پلیٹ فارم ٹکٹ سے باہر آجائیں۔ رات
اشفاق کے گھر میں کرفیو کے علاقے سے باہر بسر کی جائے۔ اسکیم تو ٹھیک
تھی لیکن میں سٹیشن پر کس طرح پہونچوں۔ دھوبی تلاؤ تک راستہ ہندو
مسلم فساد کا سین تھا۔ اور کرفیو آرڈر بالکل نزدیک!

میں بھاگ نکلا۔

ٹرامیں، بسیں، وکٹوریہ گاڑیاں، سب بند ہوگئیں۔ پیدل
جانے پر مجبور ہوگیا۔

کاش وہ کمبخت خط یاد ہی نہ آتا، یا اگر یاد آیا تھا، تو میں اپنے
استدلال سے آپ ہی شکست نہ کھاجاتا۔

میں نے مغربی وضع کے کپڑے پہن رکھے تھے، لیکن بہت سے
لوگ جانتے تھے کہ میں عیسائی نہیں ہوں۔ راستے کا پہلا حصہ مسلمانوں
کا علاقہ تھا اور دوسرے حصے میں ہندو آباد تھے۔ ہندوؤں کے علاقے
کی نسبت مسلمانوں کے علاقے میں مجھے خطرے کا زیادہ احساس تھا کیونکہ
میں نہ مسلمان تھا نہ ہندو۔ اور مسلمان مجاہدین کے نزدیک کسی ہندو کافر کو
قتل کے مقابلے میں کسی ایسے کافر کو جس کا کافر ہونا اور کافر نہ ہونا واضح نہ
ہو قتل کرنا زیادہ ثواب کا موجب ہوتا ہے۔ میرے چاروں طرف خطرہ ہی
خطرہ تھا۔ بیشمار خطرے اور میں اکیلا۔

میں جارہا تھا۔ لیکن خطرے کے احساس کی شدت میں ایسا معلوم
ہوتا تھا جیسے میں نے ایک قدم بھی منزل کی طرف نہیں اٹھایا۔ سڑک دور
تک خالی خالی معلوم ہوتی تھی۔ اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سپاہی بندوق
لئے کھڑے تھے۔ قیمتی سامان کی تمام دکانیں بند تھیں۔ پان بیڑی سگرٹ
کی چند دکانیں، کباڑیوں کے کچھ کباڑ خانے، چند ہوٹل اور ایسی ہی کچھ
اور چھوٹی چھوٹی دکانیں جو دن کے بعد کھلی تھیں، بند ہو رہی تھیں۔
ماحول ہولے ہولے بھیانک سیاہی میں ڈوب رہا تھا۔ ہنگامہ ہولے ہولے
قبرستان بن رہا تھا۔ قبرستان! تہذیب کا قبرستان!

وہ سیلاب! انسان اپنی تمام قوتیں جمع کرکے اس کو روکنے
کی کوشش کرتا ہے۔ ساکن کرنے کی کوشش، تاکہ ساکن کرنے کے
بعد وہ اس کو آسانی سے پیچھے کی طرف دھکیل سکے۔ اور وہاں لے جائے
جہاں سے وہ شروع ہوا تھا۔ اندھیرے میں، جہالت کے اتھاہ اندھیر
میں، جہاں کوئی نہیں دیکھ سکتا جہاں سب ٹھوکریں کھا کھا کر گرتے ہیں۔
سیلاب ایک لمحے کے لئے ٹھہر جاتا ہے۔ انسان کی موہوم کامیابی پر مسکراتا ہے۔
اور پھر آگے چل پڑتا ہے۔ زیادہ تیز رفتار کے ساتھ، زیادہ قوی ارادے کے
ساتھ، وہ سیلاب! وہ زندگی کا بے پناہ طاقتور سیلاب!

میں جارہا تھا۔

اور جب کوئی پتلا جیسا، مریل جیسا، ہڈیوں کا سیاہ فام ڈھانچہ،
اپنی بے جان، بے رنگ آنکھوں سے میری طرف دیکھتا ہوا میرے پاس
سے گذر جاتا تھا، میرے دل میں ایک لرزے کی کیفیت طاری ہوجاتی
تھی۔ میں دور تک اس کو مڑ مڑ کر دیکھتا رہتا تھا۔ کیا جانے وہ کب حملہ
کردے۔ اور کون جانے وہ سخت سخت چیز جو مجھ کو اس کے ساتھ ٹکر
کھاتے وقت اس کی قمیص کے نیچے محسوس ہوئی، اس کی پسلی نہیں تھی
بلکہ چھری تھی۔ میں اور بھی زیادہ خوفزدہ ہوگیا۔ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا۔
جیسے اونچی اونچی بلڈنگیں بڑے بڑے خونخوار ٹینک ہیں۔ اور مجھ کو کچل
ڈالنے کے لئے حکم کے منتظر کھڑے ہیں۔ سپاہی بندوقوں کے ساتھ
ایٹ ایز کھڑے تھے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کانٹے والے کانشانہ بدلنے
کیلئے تیار ہیں۔ عنقریب سگنل ڈاؤن ہوجائے گا، اور غارتگری کی ٹرین
مجھ کو کچلتی ہوئی نکل جائیگی۔

او خدایا ـــ ہیں! ـــ خدا ـــ ہاں بھئی! ـــ خدا ـــ خدا کا
رسول ـــ اسلام ـــ

میں مسلمان ہوں، اور یہ علاقہ مسلمانوں کا ہے۔ بھنڈی بازار

تجھ لادیں اپنے مومن ہونے کا ثبوت دوں۔ اس طرح کسی مومن کے ہاتھوں مرنے کے امکانات کم ہوجائیں گے۔ قرآن میں نے مدت ہوئی بچپن میں پڑھا تھا ساری عمر رمضان کے مہینے میں کسی مسجد کی امامت نصیب نہیں ہوئی سب بھول گیا میرے والدین نے تو مجھ کو قرآن حفظ کرانے کی کوشش بھی کی تھی۔ لیکن آج شام کے ۶½ بجے تک میں قرآن کو حفظ کرنا دماغ کی تمام طاقتوں کو فنا کردینے کا مترادف سمجھتا تھا۔ اب میں نے اپنا وہ فیصلہ منسوخ کردیا۔ اس کا یہ مطلب بیشک نہ ہو کہ میں قرآن کو حفظ کرنے پر آمادہ ہوجاؤں گا۔ کم از کم بمبے سنٹرل پہونچنے تک تو میں اپنے غلط فیصلے پر عتاب نازل کرتا رہونگا۔ اسکے بعد ـــ

وہ کون ہے؟

ہر چند مجھے کسی نے بتایا تھا کہ حملہ کرنے والے نظر نہیں آیا کرتے پاس ہی کہیں چھپے ہوتے ہیں، اور اپنا کام کرنے کے بعد فوراً کہیں چھپ جاتے ہیں، لیکن معلوم نہیں مجھے اس سامنے سے آنے والے سے کیوں ڈر معلوم ہوا۔ چھوٹا سا، ہلکا سا، منحنی سا، مرطوب آب و ہوا کا بھگویا ہوا۔ ہفتوں کے فاقوں کا مارا ہوا۔ میرے ایک چانٹے کی مار۔ اس میں کوئی چیز مرعوب کرنے والی نہ تھی سوائے اس کے کہ وہ مسلمان تھا....

اور....اور....

"السلام علیکم"

حالانکہ میرے رشتے داروں کو مجھ سے شکایت ہے کہ میں کسی کو سلام علیکم نہیں کہتا۔

"وعلیکم السلام"

وہ اجنبی نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے میرے پاس سے گذر گیا۔

نام نہاد کامیابی کے اِس احساس نے مجھے ذرا تھوڑا سا دلیر کر دیا، اور جب مجھے دوسری دفعہ یہ خیال آیا کہ خطرہ فٹ پاتھ کی طرف زیادہ ہے تو میں فٹ پاتھ کو چھوڑ کر سڑک میں کنارے پر چلنے لگا۔ دماغ کو ذرا فرصت تھی۔ میں نے قرآن کی بھولی ہوئی آیتوں کو یاد کر کر کے جوڑنا شروع کر دیا۔ لیکن اس ثواب کے کام میں کامیابی محال معلوم ہوتی تھی۔ جب آیت کا کوئی ٹکڑا میرے دماغ کی مینوفیکچرنگ کمپنی میں قدم رکھتا تھا تو پاس ہی کوئی دکاندار اپنی دُکان کے دروازے کو بند کر دیتا تھا اور دروازے کی آواز سُنکر آیت کا وہ ٹکڑا جان بچا کر بھاگ جاتا تھا۔ اس طرح ایک مدت تک کارخانے میں کوئی چیز تیار نہ ہو سکی۔ اور اس سست رفتاری پر مجھے بہت غصہ آیا۔ جب کچھ دور ایک گلی میں

سے آدمیوں کا ایک گروہ نکل آیا۔ ان کی چال کے [illegible] کے بعد خوشی کے ایسے نقطے پر تھے جہاں پہونچ کر [illegible] پر آ کر اُن میں سے اکثر میری طرف مڑ گئے۔ اب میں نے [illegible] اِدھر اُدھر دیکھا۔ فٹ پاتھ کے اُس طرف دو بلڈنگوں کے درمیان قبر تھی، قلعی سے سفید کی ہوئی، جس کے تعویذ میں چراغ کا طاق [illegible] اور تیل سے سیاہ ہو گیا تھا۔ میں اُسکے پاس جا کے کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ [illegible] اور بائیں پاؤں سے بوٹ کھول کر فاتحہ پڑھنے لگا۔

فاتحہ کہاں پڑھنے لگا، صرف ہونٹ ہلا رہا تھا۔ اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشیطٰن الرجیم۔ اس کے بعد کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ شاید خوف سے [illegible] کی مہربانی ہے، یا بار بار آنے والے اس خیال سے کہ کنکھیوں سے دیکھوں وہ کہاں پہونچ گئے ہیں۔ بہرکیف میں آگے نہیں بڑھ سکا۔ اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ اس کے معنوں پر غور کرنے لگا۔ پناہ مانگتا ہوں میں اللہ سے ناپاک شیطان کے خلاف، ایک شیطان؟ یہ تو کئی [illegible] ہیں۔ ترمیم کی ضرورت ہے، اعوذ باللہ من الشیٰطین الرجیم۔ اب ٹھیک ہے ـــ یعنی یہ کہ ـــ کہ ـــ خیر ـــ عربی بھی کیسا واہیات مضمون ہے۔ مولوی صاحب کی مار سے کوئی کوئی بچتا تھا ـــ اَعُوذُ فعل مضارع، صیغہ واحد متکلم، اَعُوذُ ـــ اَعُوذَانِ ـــ اَعُوذُونَ ـــ تَعُوذُ ـــ تَعُوذَانِ ـــ ۱۸ صیغے ہیں ـــ ۱۴ گنتے پڑتے ہیں ـــ بہرحال ۱۸ ـــ اگر ۱۸ نہیں تو کم سے کم ۱۶ تو ضرور ہیں، اور میں اکیلا ـــ [illegible] کوئی رستم نہیں ـــ پھر میں بھی تو رستم نہیں ـــ یا خدا ـــ

خدا خدا کر کے وہ میرے پاس سے گذر گئے۔

مجھے اپنے آپ پر بہت غصہ آیا۔ مسلمان ہوں اور فاتحہ سورۃ یاد نہیں۔ میں نے ایسا محسوس کیا جیسے فاتحہ کے بغیر جان خطرے میں ہے۔ اور اب سامنے سے ملنے والا شخص سب سے پہلے یہ کہے گا: ذرا فاتحہ تو سُناؤ۔ میں نے دوبارہ بافندگی کا پیشہ اختیار کر لیا اور آیتوں کے ٹوٹے ہوئے تار جوڑنے شروع کئے۔ مجھے یاد آیا کہ فاتحہ اَعُوذُ بِاللّٰہ سے شروع نہیں ہوتی بلکہ بسم اللہ سے شروع ہوتی ہے اور اسکے قافیے اکثر [illegible] کے وزن پر ہیں۔ مثلاً مالِکِ یومِ الدین ـــ نستعین ـــ رب العالمین ـــ ولا الضّالین ـــ آمین ـــ میری آنکھوں کے سامنے امتحانوں کے وہ تمام پرچے آ گئے جن میں اکثر یہ سوال ہوتا تھا: خالی جگہیں [illegible] کرو۔ مجھے ایسے سوال حل کرنے کی مشق تھی۔ ذرا زیادہ [illegible] معلوم ہوا کہ میں نے قافیے آگے پیچھے رکھ دیئے ہیں۔ ذرا [illegible] سے کام لینے کے بعد میں نے سوال حل کر کے رکھ دیا۔ [illegible]

پر مجھے [illegible] نے قطرہ قطرہ پہنچانا شروع کیا۔ اور جب [illegible] میرے
پاس سے ایک شخص گزرا، میں نے اس کو سلام علیکم نہیں کہا، تو وہ سر
ہلا کے چلتا رہا۔ لیکن اس کمبخت نے یہ کیوں نہیں پوچھا کہ مجھے فاتحہ یاد
ہے یا نہیں؟

اب مجھے فاتحہ پر کچھ بھروسہ نہیں رہا۔
اس دفعہ ایک گروہ پیچھے سے آرہا تھا۔ ہنستا ہوا، کھیلتا ہوا، میں
ہم گیا۔ سنا تھا کہ اکثر حملے پیچھے سے ہوتے ہیں۔ تیز نہیں ہوا کہ وہ میری
طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ ٹھہرا نہیں کہ میرے پاس کوئی بہانہ نہیں تھا۔
میں ہولے ہو گیا۔ اتنا ہولے کہ میرے جذبات پر انکے قریب آتے ہوئے
قدم ہتھوڑوں کی طرح لگنے لگے۔ کس طرح ان کو بتاؤں کہ میں
مسلمان ہوں۔

میں نے گانا شروع کر دیا:
ڈرتے نہیں دنیا میں مسلمان کسی سے
پوچھ علیؑ سے

میرے پیچھے قہقہوں کا طوفان برپا ہو گیا۔
ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے تھا۔ وہ ڈگمگاتے ہوئے انداز کا ترنم جو
لفظوں کے ساتھ لپٹا ہوا میرے گلے سے نکل رہا تھا، میری بہادری کا کافی
ثبوت تھا۔ حضرت علی کے پاس جانے کی تو ضرورت بھی نہ تھی۔ ویسے بھی یہ
ندامت کیا کم تھی کہ اپنی بہادری کو آشکارہ کرنے کے لئے ثبوت وہ دیا ہے جو
[illegible] نہ سکے، نہ مُردہ بولے اور نہ میری بزدلی ظاہر ہو۔
"واہ بھئی واہ! بہت اچھا گاتے ہو۔"

وہ میرے ساتھ آملے۔
"کچھ اور ہو جائے پھر۔"
اب میں انکار کیسے کروں، انکار کر دوں تو وہ ناراض ہو جائیں،
اور شاید اسی ناراضگی کی بنا پر میرا قلع قمع کر دیں۔ میں نے کھسیانی سی
آواز میں کہا۔
"بھئی مجھے گانا وانا تو آتا نہیں۔ یہ تو جذبات ہیں جو کبھی کبھی بے رنگ
بے ڈھنگ شکل میں ابل کر باہر آگرتے ہیں۔ دراصل مجھے اپنے سچے اور
خالص مذہب، اسلام سے، اسلام کے پیروکاروں سے، اسلام کے بانی
سے اور خدا سے بے حد عقیدت ہے۔"
کسی نے کہا: "ہاں بھئی تو کچھ ہو جائے۔"
میں نے پھر گانا شروع کر دیا۔
بگڑی کو مری بنا دو محمدؐ پیارے

بگڑی کو مری بنا دو محمدؐ پیارے
بگڑی کو مری بنا دو

اذان ہونے لگی۔
میں دم بخود ہو کر کھڑا ہو گیا۔ میرے ساتھ وہ بھی کھڑے ہو گئے۔
سب سے زیادہ نازک وقت وہ تھا جب وہ سب کے سب ایک
مسجد میں داخل ہو گئے اور مجھے بھی اُن کے ساتھ اندر جانا پڑا۔ میں آہستہ
آہستہ اپنے بوٹوں کے تسمے کھولنے میں مشغول ہو گیا۔ وہ صحن میں پہنچ
گئے۔ میں نے میدان صاف پایا۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور چپکے سے باہر نکل گیا۔
اب میں پائیدھونی میں داخل ہو گیا۔ یہ ہندوؤں کا علاقہ ہے۔
مجھے ہندوؤں سے اتنا ڈر نہیں لگتا، جتنا مسلمانوں سے۔ وجہ معلوم نہیں
شاید اس لئے کہ ہندو مسلمانوں کے مقابلے میں ذرا زیادہ مہذب ہیں
اور تہذیب انسان کو بُردبار بنا کر بزدل بنا دیتی ہے۔ ہندوؤں کی یہ
تہذیب اُن کی جسمانی کمزوری پر مبنی ہے یا دماغی تعلیم پر؟ اسکے متعلق
سوچنے کے لئے میرے پاس وقت نہیں تھا۔ اتنی بات ظاہر ہو گئی کہ میں
ناگپاڑے اور بھنڈی بازار میں ڈر کے مارے کیوں بھاگا جا رہا تھا؟ کیونکہ
میں تعلیم، تہذیب، بردباری اور بزدلی کی تمام منزلیں طے کر چکا تھا۔
اور اب ناگپاڑے اور بھنڈی بازار کے خاردار راستوں پر گامزن تھا
اِن پتھریلے خطرناک راستوں کے بعد یہ ریتیلے دشوار گذار راستے کوئی بڑی
بات نہیں تھی۔ میں بے کھٹکے جا رہا تھا۔
پھر کالے کپڑے سے بنی ہوئی گتے کی ٹوپی یا کھدر کی بنی ہوئی
گاندھی کیپ میں وہ ہیبت کہاں تھی جو خونی رنگ کی ترکی ٹوپی اور [illegible]
انداز کی مصطفےٰ کمال کیپ میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ ماش کی دال [illegible]
سے پھولے ہوئے جسم مکا مارنے والے ہاتھ کے لئے زیادہ نقصان دہ
نہیں ہوتے۔ کیونکہ ایک نو دس سال کی ہندوستانی لڑکی اپنے نازک
ہاتھوں سے بارہ آدمیوں کے لئے آسانی کے ساتھ آٹا گوندھ سکتی ہے۔
ایک دفعہ دہلی میں میں نے ایک مسلمان تانگے والے کی پسلی پر مکا مارا
تھا، میرا ہاتھ سوج گیا۔ دو آنے کی ٹنکچر آیوڈین خرچ ہوئی۔
غرضیکہ میں جا رہا تھا۔
یکایک میرے سامنے دو گز کے فاصلے پر ایک سوڈے کی بوتل
آ کر پھٹی۔ ایک اور، ایک اور، بالکل میرے نزدیک۔ لیکن کوئی [illegible]
نہ لگا۔ میں بھاگا۔ بھاگا۔ بھاگا۔ بوتلوں کا گرنا اور میرا بھاگنا [illegible]
لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ شور مچ گیا۔ پل میں بازار خالی ہو گیا۔
ایک دفعہ پھر میرے دل میں خطرے کا احساس جاگ اٹھا [illegible]

[illegible] سمجھنا چاہیے۔ لیکن بھاگنا اچھا نہیں۔ میں تیز تیز چلنے لگا۔ ویسے بھی تیز ہی چلنا چاہیے تھا کیونکہ کرفیو شروع ہونے میں تھوڑا وقت باقی تھا کمبخت ہیں یہ ٹراموں، بسوں، ٹیکسیوں اور گاڑیوں والے کہ [illegible] سے آدھا گھنٹہ پہلے ہی سروس بند کر دیتے ہیں۔

اب میں کالبا دیوی میں تھا۔ یہ بازار مقابلتاً تنگ اور زیادہ [illegible] آباد ہے۔ لیکن "مارا ماری" کی خبر یہاں بھی پہونچ گئی تھی۔ اور [illegible] میں بازار خالی ہو گیا تھا۔ جو اکّا دکّا آدمی نظر آتے تھے وہ بھی کسی بھاگ کی طرف تیز تیز جا رہے تھے۔ اس بازار میں مجھے چاقوؤں اور چھریوں کے حملوں کا زیادہ اندیشہ نہیں تھا۔ سوڈے کی بوتلوں، پتھروں اور گندی چیزوں کا خطرہ تھا۔ دونوں طرف اوپر کی منزلوں میں اکثریت کے مکانات ہیں جن میں ہندو فیملیاں رہتی ہیں۔ فساد کے دنوں میں اُن کے فرائض یہ ہیں کہ وہ ٹوکریوں میں شیشے کے ٹکڑے، سوڈے کی بوتلیں اور پتھر وغیرہ جمع کر کے رکھ لیں اور اگر کوئی راہگیر اُن کے مکان کے نیچے سے گذرے تو اس کے سر پر اپنی ٹوکریاں الٹا دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام عورتوں کا ہے اور عورتوں کے دل میں اپنے ہم مذہبوں کیلئے زیادہ جذبہ ہوتا ہے، اس لئے میں ہندو بن گیا۔

میں گانے لگا۔

جے جے جگدیش ہرے
بھگت جنوں کے .....

بہت زور لگایا آگے یاد ہی نہ آیا۔ تنگ آ کے میں نے اِسکو چھوڑ دیا۔ اور پورن بھگت کا ایک بھجن گانے لگا۔

بھجوں میں تو بھاوے غری گر دھاری
ہر دے میں اب دھن ہے رام نام کی پیاری
بھو بھئے بھنجن
جن من رنجن
مسکل کشٹ ندو دھاری

ہر دے میں اب دھن ہے رام نام کی پیاری
بھجوں میں تو بھاوے شری گر دھاری
ہر دے میں اب دھن ہے رام نام کی پیاری

میں نے محسوس کیا کہ میری آواز اوپر کی منزل تک نہیں پہنچ [illegible] کوئی ایسا گیت ڈھونڈنا چاہیئے جو اونچے سُروں میں گایا جا سکے [illegible] سوچ میں کافی دور تک چلا گیا۔ کوئی ایسا گیت نہ ملا۔ اصل گیت [illegible] نہیں ملتا تھا۔ میرے حواس اب کچھ [illegible] ہوتے

جا رہے تھے۔ میری سوچنے کی قوت سلب ہوتی جا رہی تھی۔

میرے پیچھے ایک کی آواز آئی۔

"اوہ..... بچاؤ..... مر گیا۔"

میں بجلی کی تیزی سے پیچھے مڑا۔ میرے بالکل نزدیک ایک شخص دھڑام سے نیچے گرا، تڑپا اور ٹھنڈا ہو گیا۔ مقتول اپنے لباس سے مسلمان معلوم ہوتا تھا کوئی اس کی مدد کو نہیں پہونچا۔ سب منتشر ہو گئے۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے زندگی اور موت کے نقوش نظر آنے بند ہو گئے۔

"پولیس ـــــ پولیس۔"

قاتل نے بھاگتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

او خدا ـــــ یہ تو وہی وکٹوریہ والا ہے جس پر میں نے آم کے چھلکے پھینک دیئے تھے۔

میرا حوصلہ چکنا چور ہو گیا۔ وکٹوریہ والا اپنا انتقام لے گا [illegible] میں بھاگ پڑا، بے تحاشہ، سرپٹ۔ سارا کالبا دیوی کا بازار بھاگ کے عبور کیا۔ پیچھے مڑ کر کبھی نہیں دیکھا۔ اس بھاگنے کے سلسلے میں سب سے زیادہ ذکر کے قابل بات یہ ہے کہ میں جہاں پہونچتا تھا وہاں کے پیدل چلنے والے آدمی میرے ساتھ بھاگنے لگتے تھے۔ میرے بھاگنے سے وہ گھبرا جاتے تھے اور اُن کے بھاگنے سے میں زیادہ گھبرا جاتا تھا اس طرح میں بھاگ بھاگ کر ادھ مؤا ہو گیا۔ کوئی بڑی بات نہیں۔ مارے کر ادھ مؤا ہونے سے بھاگ بھاگ کر ادھ مؤا ہونا بہتر ہے۔ بالآخر میں ایک گلی کی طرف مڑ گیا۔ دراصل وہ گلی نہ تھی۔ مکانوں کے دروازے اس میں نہیں کھلتے تھے۔ وہ دو بلڈنگوں کے درمیان چھوٹا سا فاصلہ تھا۔ میں اس میں گھس گیا۔ ایک بیلکنی کے نیچے نڈھال ہو کر گر پڑا۔

معلوم نہیں میں وہاں کتنی دیر پڑا رہا یقیناً اتنی دیر جتنے عرصہ میں میرا دوست بمبے سنٹرل پر پہونچ کر گرفتار ہو چکا ہو گا۔

ہو جائے میں کیا کروں۔

پھر جب میرے حواس کچھ درست ہوئے، میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ یکایک کوئی سخت جیسی چیز میرے سر پر گری۔ اور کسی چیز کے ٹکڑے میرے جسم کے مختلف حصوں سے ٹکرائے میں بہت گھبرا گیا۔ میں نے سمجھا کسی نے میری طرف پتھر پھینکا ہے۔ میرے سر میں لگی ہو گی اور خون بہنے لگا ہو گا مجھے محسوس نہیں ہو رہا تھا [illegible] تھا بیٹھا یا جا رہا ہوں [illegible] دوسرے اندیشے بیدار ہو گئے۔ شاید کہ [illegible]

چکی [illegible] مجھے ہلاک کر دیگی مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیے۔
فوراً اسی وقت میں جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ جاتے جاتے مجھے خیال
آیا دیکھوں تو سہی آخر وہ کیا چیز ہے میں جھکا اور ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ وہ آم
کی گٹھلی اور چھلکے تھے۔

میں دوڑتا دوڑتا گلی کے منہ تک پہونچا میں نے دیکھا کہ میں دھوبی
تالاب کے نکا بجے پر ہوں کرفیو کا علاقہ مجھ سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر ختم ہوتا
تھا مجھے اپنی کم ہمتی پر بہت افسوس ہوا۔ اگر میں سو گز اور بھاگ جاتا تو
کرفیو کے علاقے سے باہر نکل جاتا۔

یکایک مجھ میں جرأت آگئی میں نے اِدھر اُدھر دیکھا کوئی پولیس مین
نظر نہیں آیا میں بھاگا اور ایک منٹ کے کسی حصہ میں کرفیو کے علاقے سے
باہر ہو گیا۔ وہاں سے اشفاق کا گھر ۵ منٹ کا راستہ تھا۔

میں نے گھنٹی بجائی، دروازہ کھلا۔

او خدا! یہ تو وہی وکٹوریہ والا ہے جس پر میں نے آم کے چھلکے
پھینکے تھے۔

"معاف کرنا بھئی میں نے سمجھا کہ یہ اشفاق صاحب کا مکان ہے۔"

"اشفاق صاب اندر ہیں۔"

"ہیں! اچھا اچھا! میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں، وہ میرے
دوست ہیں۔"

میں نے اندر کے دروازے کا پردہ اٹھایا۔ اشفاق اور عتیق
صوفے پر بیٹھے تھے۔ عتیق مجھ کو دیکھکر کھڑا ہو گیا۔

میں نے کہا: "عتیق! تم آگئے، تم نے تو آج مجھے مروا ہی ڈالا تھا۔"

"کیا ہوا؟" عتیق نے پوچھا۔

میں نے تمام کہانی سنا دی۔

"اور ان حضرت کو بھی تمہیں سزا دینے کی سزا مل گئی ہے۔ آپ
اسٹیشن پر بغیر ٹکٹ پکڑے گئے تھے۔ ۱۴۳ روپے ۱۰ آنے ادا کر کے
آیا ہوں۔"

کچھ دیر قہقہوں میں گذر گئی میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔
خاموشی کے ایک وقفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، کمرے میں
چاروں طرف دیکھکر، رازدارانہ انداز میں میں نے کہا: "اشفاق ۔!
دوسرے کمرے میں وہ شخص کون ہے جس نے میرے لئے دروازہ کھولا
تھا ۔؟"

"اس کا نام شریف ہے، وہ ایک وکٹوریہ والا ہے۔"

میں نے اور بھی زیادہ دبے ہوئے لہجے میں کہا: "میں اس کو
پولس کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کالبا دیوی میں بھیڑ کرانے
ایک شخص کا خون کیا ہے۔"

اشفاق نے شریف کو آواز دی۔ شریف اندر آگیا۔

"شریف! تمہارے کارنامے کا ثبوت مجھے مل گیا ہے۔ لو پانچ
روپے، اور بھاگو۔"

"اشفاق! تم کیا کر رہے ہو؟ مقتول مسلمان تھا۔"

"میں جانتا ہوں ــــ تم جاؤ! شریف!"

شریف چلا گیا۔

"میں اس کو نہیں جانے دونگا، اشفاق! وہ قاتل ہے۔"

"اگر تم نہ آتے تو بیچارے کو اس کی مزدوری نہ ملتی، وہ دیر سے
مجھے یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تمہاری گواہی فیصلہ کن ثابت
ہوئی۔"

میں بولنے کی اضطراری خواہش کو زبردستی دباکر اس کی طرف
حیرت سے دیکھنے لگا۔

اس نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا: "عتیق اور میں تمہاری
طرف آنے ہی والے تھے۔ ایک مدت کے بعد تین بچپن کے دوست جمع
ہوئے ہیں، ساتھ کھیلے ہوتے، ساتھ پڑھے ہوئے، مل کر شرارتیں کرنے
والے، مل کر بحثوں میں وقت کھونے والے، مسجد کو جا جا کر دکھانیوالے،
روزے کھا کھا کر ثواب حاصل کرنیوالے ــــ"

اشفاق ٹہل رہا تھا۔ اس کی باتیں لیکچر کی شکل اختیار کرتی جاتی
تھیں: "ہم نے اکٹھے بی۔ اے کیا۔ پھر زندگی کی تلخ حقیقتیں سامنے آئیں،
ہم جدا جدا ہو گئے۔ بیکاری کے تھپیڑوں نے ہماری ہمتوں کے ساحلوں
کو کھوکھلا کر دیا۔ ہمیں معاش کی فکر نے ایک مدت تک ایک دوسرے
سے بیگانہ رکھا ـــ"

وہ ایک کرسی کی بیک پکڑ کر میری طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔
"پھر میں نے تمہارے لئے ایک ملازمت ڈھونڈ کے تمہیں یہاں بلا لیا! آج
عتیق بھی آپہونچا ہے۔ آج ہم تینوں دوست پھر اکٹھے ہو گئے ہیں۔ آج
ہماری زندگی کا قافلہ پھر روانہ ہوتا ہے۔ نئے عہد کے ساتھ، نئے عزم کے
ساتھ، نئے ارادوں کے ساتھ، ہم کو پھر نزدیک سے ایک دوسرے کا
مطالعہ کرنے کا موقع ملے گا۔ اور جب ہم ایک دوسرے کو اپنے حقیقی
رنگ میں دیکھیں گے تو ہم حیران رہ جائیں گے۔ ہم کو معلوم ہوگا کہ ہم
پہلے سے بہت زیادہ تبدیل ہو گئے ہیں۔ ہم کو اس تغیر پر پریشان
نہیں ہونا چاہیئے۔ تغیر دنیا کی ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ زندگی

[illegible] سے پہلے ہم تعمق سے بڑے بڑے نظریے بنا لیتے ہیں۔ لیکن وہ نظریے زندگی کی چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ پھر عمل ہماری مدد کرتا ہے۔ ہماری زندگی کی عمارت نئی اور زیادہ پائدار بنیادوں پر قائم ہوتی ہے۔ ہم اپنے آپ کو ایک زیادہ خوشگوار [illegible] پاتے ہیں ——"

وہ ہنسنے لگا۔ اُس کے چہرے پر سنجیدگی کی بجائے مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ "مجھے [illegible] کی سول نافرمانی یاد ہے۔ ہمارا اُس سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لینا بھی یاد ہے۔ اور جب مجھے اپنی وطنیت کی وہ شوریدہ سری یاد آتی ہے تب مجھے بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ کیونکہ ہماری وہ غیر معمولی قربانیاں ملک کی آزادی کیلئے نہ تھیں بلکہ لیڈر بننے کیلئے تھیں ——"

وہ سنجیدہ ہو گیا۔ اور ایک مقام پر ساکن ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ "تجربوں نے مجھے سکھا دیا ہے کہ ہماری سب سے بڑی ضرورت ملکی آزادی نہیں بلکہ انفرادی آزادی ہے۔ انفرادی آزادی جس کی بنیادیں دولت اور تعلیم پر ہیں۔ تعلیم ہمیں دُنیا کو دھوکا دینا سکھا دیتی ہے۔ اور دولت سے ہم ہر چیز خرید سکتے ہیں، لیڈری بھی۔ دولت سے لیڈری خرید کر تعلیم سے اُس کو قائم رکھا جا سکتا ہے۔ ہم تینوں کے پاس تعلیم ہے، لیکن ہم تینوں دولت سے محروم ہیں۔ پچھلے دنوں میں میں نے کافی تفکر کے بعد ایک اسکیم تیار کی ہے۔ اس اسکیم کی کامیابی کے ساتھ ہم اپنی اقتصادی حالت کو مضبوط کر سکتے ہیں۔ مجھے اپنے دوستوں سے کامل توقع ہے کہ وہ اس مہم میں میرا ساتھ دیں گے۔ اس مہم کے سلسلے میں مجھے تم سے جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، وہ خاموشی ہے۔ پبلک کو ہماری کارگزاریوں کا علم نہیں ہونا چاہیئے۔"

میں نے کہا۔ "اشفاق! تمہاری اسکیم کے متعلق کچھ جاننے سے پہلے میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم اس قتل پر پردہ کیوں ڈالنا چاہتے ہو؟"

اشفاق نے جواب دیا۔ "میں نے اِس اسکیم کو کامیاب بنانے کیلئے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس انجمن کا نام ہے —— انجمنِ تنظیمِ فسادات۔ وہ شخص میرے معمولی قسم کے دوستوں میں سے تھا۔ میں اس کو اپنی انجمن کا ممبر بنانا چاہتا تھا۔ لیکن ہماری انجمن کے بہت سے رازوں کو جان لینے کے بعد اس نے مجھ سے مخالفت شروع کر دی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کا وجود انجمن کے مفاد کے خلاف تھا۔ میں نے اُس کو آج کالا دیکا [illegible] سے قتل کروا دیا۔"

—— اور اس جرم پر آمادہ ہونے کے صلے میں شریف کو پانچ روپے انعام ملنے؟" میرے فقرے میں طنز تھا۔

"شریف سارے دن کی سرتوڑ کوشش کے بعد [illegible] ایک روپیہ کماتا ہے۔ صرف ایک [illegible] تم [illegible] کم سمجھتے ہو؟"

"قیمت کے کم یا زیادہ ہونے کا سوال نہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایک قتل کے پانچ پانچ روپے ادا کر کے جرموں کی [illegible] کہاں تک روا ہے؟"

"پچھلے مہینے میں نے ایک ہزار روپے دیا ہے [illegible] ایسے بھی ہیں جو مجھ سے زیادہ رقم دینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس [illegible] نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے جو جنگ کے میدان میں دوسرے نوجوانوں کو زندگی سے محروم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

میں کسی قدر کھسیانہ ہو گیا۔

اُس نے کہا۔ "فضول گفتگو میں وقت ضائع کرنے کی بجائے ہمیں ایسے ذرائع پر غور کرنا چاہیئے جو 'انجمنِ تنظیم فسادات' کو ارتقا کے زینہ کی طرف لے جائیں ——"

مجھے ہنسی آگئی۔

"انجمنِ تنظیم فسادات، اور جب مجھے یاد آتا ہے کہ ۱۹۳۱ میں تم [illegible] مسلم اتحاد کے کتنے بڑے حامی تھے! اُف تلوّن!"

"تلوّن نہیں تغیر۔"

"تغیر کبھی اوپر سے نیچے کو نہیں ہوتا۔ تغیر نیچے سے اوپر کو ہوتا ہے۔"

"بہرکیف میں نے محسوس کیا کہ ——"

"بہرکیف تم نے محسوس کیا کہ مسلمان ہندوؤں سے ہر لحاظ سے مختلف ہیں اسلئے اُن میں اتحاد نا ممکن ہے اور اسلئے ہندو مسلم فساد۔"

"لوگ اس کشمکش کو ہندو مسلم فساد کہتے ہیں۔ یقیناً ایسے فسادات کی ابتدا کسی مذہبی آکساہٹ سے ہوتی ہے۔ مثلاً کسی نئے مندر کے کلس کا کسی مسجد کے میناروں سے اونچا ہونا مسلمانوں کو بھڑکا دیتا ہے یا مسجد کے سامنے سے ہندوؤں کا باجہ بجاتے گذر جانا مسلمان برداشت نہیں کر سکتے۔ معمولی حالات میں ایسا بہت دفعہ دیکھا گیا ہے کہ کسی مسجد کے مینار شہر کے تمام مندروں کے کلسوں سے اونچے ہیں یا نماز کے وقت مسجد کے سامنے سے مسلمانوں کی ہزاروں باراتیں گذر جاتی ہیں۔ [illegible] کی وجہ اِن وجوہات سے زیادہ واضح ہے۔ مسلم لیگ کے اقتدار [illegible] کی اسکیم نے مسلمانوں کو ہندوؤں سے بہت دُور لیجا کر پھینک دیا ہے۔ اتنی دُور جہاں پہونچ کر غیریت دشمنی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ پھر کوئی معمولی واقعہ بہت بڑے فساد کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ لیکن جب [illegible]

[illegible] نہیں ہوتا۔ فرقہ وارانہ جنگ سرمایہ دار
[illegible] کی لوٹ مار اور مقتولوں کے خون کا انتقام
کا اصل نتیجہ ہوتا ہے۔ یہاں ہماری انجمن وجود میں آئی ہے۔ ہماری انجمن کا
نام ہے — انجمن تنظیم فسادات — ایک خفیہ انجمن کا کافی مضحکہ خیز نام ہے
لیکن ہماری توجہ اپنے عظیم الشان مقاصد کی طرف اتنی مبذول رہتی
ہے کہ ہم کو اپنی انجمن کے نام کی تضحیک کا موقع ہی نہیں ملتا۔ ہماری انجمن
انقلاب بلکہ اشتمالی اشتراکیت کی حامی ہے۔ ہماری انجمن مہاتما گاندھی
کے عدم تشدد پر اعتماد نہیں رکھتی، ہماری انجمن منظم طریقے سے سرمایہ داروں
کے کارخانوں، فرموں، اور دفتروں کو آگ لگا کر اور ڈاکہ زنیوں سے
اپنے ممبروں کو اپنی مالی حالت سدھارنے کا موقع دیتی ہے۔ ہماری انجمن
اپنے مقروض ممبروں کو اُن کے قرض کے کاغذات اور قرض کا تقاضا کرنے
والوں سے ابدی چھٹکارا دلانے میں مدد کرتی ہے۔ ہم دولت کو مساوی
مساوی تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ دولت اس دنیا
کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ یہ طاقت انفرادی آزادی کی بنیاد ہے۔
کہا جا سکتا ہے کہ انفرادی آزادی کے اس حصول کے لئے اوپر بیان
کئے ہوئے ذرائع اخلاقی معیار سے گرے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے ایسا ہو
لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اخلاقی معیار ہے کیا چیز؟ اچھا اور برا۔ جو
چیز آج اچھی ہے کل بری تھی، جو چیز آج بری ہے وہ کل اچھی ہوگی۔
انسان کے اپنے بنائے ہوئے قانون، جس کی ہزاروں شکلیں ہو سکتی ہیں
جس کی ہزاروں شکلیں ہوں گی۔ دولت کا غلط حصول جائز ہے اگر
دولت کا صحیح استعمال آتا ہو۔ پچھلے مہینے میں نے وار فنڈ میں ایکہزار
روپیہ دیا۔ مسلم لیگ کو ڈیڑھ روپیہ چندہ بھیجا۔ جے جے ہسپتال میں
غریبوں کے لئے ایک آپریشن بلوک بنوادیا جس کے ایک کونے
میں مرمر کے ٹکڑے پر میرا نام لکھا ہوا ہے۔ کئی سکول، کئی یتیم خانے
اور کئی ایسے ادارے مجھ سے ماہوار چندہ حاصل کرتے ہیں اور لوگوں
کی نظروں میں میری آمدنی کے ذرائع میرے چند ہوٹل، بمبئی میں دو
بلڈنگیں اور بزنس ہے۔ میں شہر کی ممتاز ہستیوں میں شمار ہونے لگا
ہوں۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ سب آمدنی مجھے ڈھاکے، احمد آباد کانپور
اور بمبئی کے فسادوں سے ہوئی ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ میں انجمن تنظیم
فسادات کا پریذیڈنٹ ہوں۔"

میں اشفاق کے ان انکشافات پر دنگ رہ گیا۔

اُسنے میری طرف دیکھا: "میں نے تمہارے اور عتیق کے سامنے
اپنے تمام راز رکھ دئے ہیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صرف تم ہو، صرف تم دو،
جن کے سامنے میں اپنے اتنے خطرناک راز رکھ سکتا تھا۔ مجھے مددگاروں
کی ضرورت ہے۔ میں اکیلا اتنا بڑا کام نہیں کر سکتا۔ مجھے مختلف مقامات
پہ دوڑ دوڑ کر جانا پڑتا ہے۔ اب یہ کام ہم تینوں مل کر کریں گے۔"

وہ چپ ہو گیا۔

عتیق نے کہا: "اشفاق! میں تمہاری مدد کیلئے تیار ہوں۔"

میں نے کہا: "اور جب میرے نہایت گہرے دوستوں کو میری ضرورت
ہو تو میں کیسے انکار کر سکتا ہوں۔"

اشفاق خوشی سے اچھل پڑا۔

"عتیق! میں تم کو دہلی بھیجوں گا۔ وہاں ہندو مسلم فساد کی اشد ضرورت ہے۔
اور تم —" اُسنے میری طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا: "تم حیدرآباد جاؤ گے۔
دکن کی دولت ہمارا انتظار کر رہی ہے۔"

اُس نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔

"آج تم کو تمہارے آنیوالے فرائض کا سب سے پہلا تجربہ ہوگا۔ آج رات
ڈھائی بجے موتی بازار اور منگل داس مارکیٹ میں آگ لگائی جائیگی۔ آگ کے
پردے میں تالے توڑے جائینگے، پھر ہیرے، جواہرات اور قیمتی کپڑے۔ میں نے
اس کیلئے پولس کو پانچہزار روپے ادا کئے ہیں۔ پٹرول اور آدمی تیار ہیں۔
ہمیں بہت پہلے وہاں پہونچنا چاہیئے۔ چلو، اٹھو۔"

عتیق کھڑا ہو گیا۔

میں نے کہا: "میں تھکا ہوا ہوں۔ سونا چاہتا ہوں۔"

اشفاق نے کہا: "مجھے تم پر بھروسہ ہے۔"

وہ چلے گئے۔

گھڑی میں آٹھ بجے تھے — آٹھ — سوا آٹھ — ساڑھے آٹھ —
پونے نو — نو — ساڑھے نو — دس — گیارہ — بارہ — مجھے نیند نہ آئی۔
آخر میں اٹھا۔ گورنر کے سکریٹری، پولس کمشنر، پریذیڈنسی مجسٹریٹ، میونسپل
پریذیڈنٹ، سب کو فون پر کہدیا کہ آج رات کو ڈھائی بجے موتی بازار اور
منگل داس مارکیٹ کو آگ لگائی جائے گی۔

دوسرے دن صبح کو اخباروں کے سپیشل ایڈیشنوں میں یہ خبر
دیکھی گئی، اشفاق اور عتیق کو اُن کے گروہ کے ساتھ موتی بازار اور منگل داس
مارکیٹ کو آگ لگانے سے پہلے گرفتار کر لیا گیا۔

آم — چاقو — مشرق کے آم اور مغرب کے چاقو — مشرق کے
چاقو اور مشرق کے آم ———— اُف!

* انور *

روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

حدِ تاخیر پہ رات اُس نے پڑھا یہ مصرع
"ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا"

کہا میں نے کہ ہیں جس دور سے گزرا ہوں ابھی
"اُس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا"

وقت موعود سے کچھ قبل۔ فلاں .... منزل میں
ایک مجمع ہی نہیں۔ محشرِ تقریر بھی تھا

جنگِ موجود میں۔ یعنی ہند کی شرکت پہ یہ بحث
"آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا"

اس پہ افسوس۔ کہ ہٹلر سے یہ روسی درخواست
"بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا"

یہ بھی تھا ذکر کہ خاموش لبوں سے فن لینڈ
"نالہ کرتا تھا و لے طالبِ تاثیر بھی تھا"

چین کی جان بچانے کو نہ پہونچا نہ سہی
"آخر اُس شوخ کی ترکش میں کوئی تیر بھی تھا"

ختم اس ٹیپ پہ تھا مرثیہ ایرانی
"کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا"

بوڑھے پٹیاں پہ تھے اس قسم کے فقرے چسپاں
"ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا"

خوش تھے اس بحث میں "نالائقِ آزادیِ ہند"
"ہاں کچھ اک رنجِ گرانباریِ زنجیر بھی تھا"

میں وہاں گوشۂ تاریک میں سر دھنتا تھا
منتظر یاں در پے منتِ زنجیر بھی تھا

بولی۔ اس طرفہ بیانی کا یہ مطلب ہے .... نا
"آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا"

اور کیا! ورنہ ترے پاس پہونچنے کے لئے
میں بھی مضطر دلِ صد حیلہ و تدبیر بھی تھا

طرب آموز سہی "نامہ برہ" کا اصرار
احترام تپشِ گرمیٔ تحریر بھی تھا

کششِ خلوتِ رنگیں ہی نہ تھی دامن کش
جذبۂ شوقِ ہم آغوشیٔ شبگیر بھی تھا

مری تقدیر میں لکھا ہے ترا نام مگر
حسنِ انجام پہ میں منکرِ تقدیر بھی تھا

چشمِ تنسیخِ امانت کو نظر آتا تھا
خواب۔ وہ خواب جو شرمندۂ تعبیر بھی تھا

ڈگمگاتا تھا قدم۔ وسوسۂ مستقبل
دل کئی حال میں آمادۂ تقصیر بھی تھا

مئے تہذیبِ نوی۔ منہمکِ درسِ خطا
ذوقِ مسحوریٔ۔ دست بہ شمشیر بھی تھا

شاد اس ہرزہ سرائی پہ وہ مریم صورت
"گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعذیر بھی تھا"

---

[1] معنی مطلق مراد ہے؛ [2] شاید کوئی اعتراض کرے اس لئے، حالی مرحوم فرماتے ہیں [illegible]

میرا دیس

میں جس دیس کی بات کرتا ہوں وہ اُس دیس سے بالکل الگ ہے جہاں گاڑیاں چلتی ہیں اور موٹریں بھنبھناتی ہیں، جہاں ریشمیں ساریاں سرسراتی ہیں۔ اور یاسی ہونٹ ہمیشہ لپ اسٹک کے محتاج رہتے ہیں۔ میں تو اُس دیس کی باتیں کرتا ہوں جہاں چلنے کے لئے پاؤں استعمال کئے جاتے ہیں، اور سنگار کے لئے ارغوانی پھول۔ وہاں ایسی صاف سڑکیں بھی تو نہیں ہوتیں۔ تپلی تپلی پگڈنڈیاں کھیتوں میں لہراتی، ڈھیریوں پر لپکتی، پھرتی پھرتی، ہزاروں پاؤں کے مبہم نشانوں سے سجی ہوئی افق کے دھندلکوں میں ڈوب جاتی ہیں۔ دراصل میں جس دیس کی باتیں کرتا ہوں وہ دیس تمہیں بھائیگا نہیں لیکن کیا کیا جائے کہ یہ باتیں مجھے ضرور کہنی ہیں اور تمہیں ضرور سننی ہیں۔

وہ دیکھئے، وہ سامنے گاؤں کی تنگ گلی میں ایک چھوکری سر پہ گھاس کا بہت بڑا گٹھا دھرے لڑکھڑاتی آرہی ہے۔ یہ ایک کسان کی بیٹی ہے جس کی زمینیں قرق ہو چکی ہیں اور جو زمیندار کی ایک بیگہ زمین کاشت کرکے اپنی بیوی بچی کا پیٹ پالتا ہے۔ چھوکری جوان ہے، چہرے پر سرخی ہے مگر بے رونق سی، جیسے اینٹ جو دھوپ میں پڑے پڑے تپ گئی ہو۔ اسکے بانہوں میں بھی ملائمت ہے لیکن بجھتے ہوئے انگاروں پر ابھری ہوئی راکھ کی طرح۔ اسکی چال میں بھی لچک ہے لیکن ٹوٹی ہوئی ٹہنی کی آخری ہلاؤ سا ہلکورے جیسی۔ یہ گھاس کا گٹھا جو اُس کے سر پر ہے اُسکی سپید گردن کی رگوں کو نیچے کے فیتوں کی طرح کھینچے ہوئے ہے۔ پاؤں میں جوتا ہے جس کے تلے میں سوراخوں کی وجہ سے چیتھڑے دبا رکھے ہیں۔ اور ایک چیتھڑا اسی سوراخ سے باہر لٹک کر میلی گلی میں ایک آڑی ترچھی لکیر بناتا گھسٹتا آتا ہے۔ جیسے بیچاری اپنی تقدیر آپ ہی لکھے جارہی ہو۔ ٹیڑھی میڑھی سی لکیر، مٹی میں لہراتی، کانٹوں میں الجھتی، کوڑے کے ڈھیر میں سے ہوتی دھول کی گہرائیوں میں زخمی سانپ کی طرح دوڑی جارہی ہے!

اس بیچاری کو گھر جاکر بہت سے کام کرنا ہیں۔ پہلے تو گھاس کا گٹھا زمیندار کی جھونپڑی تک پہنچایا جائیگا۔ جہاں زمیندار کے ڈھور [illegible] اسکے منتظر ہوں گے۔ واپس آکر گھر کے صحن میں [illegible] اسکے لمبے گھنگھریالے بال جو اس کی پیٹھ پر کالے بادل کی طرح پڑے ہیں، مٹیلے ہوجائیں گے۔ اُس کی جذبات بھری پلکیں جن کا تناؤ کلیوں پر ٹیڑے کی انی کی طرح پڑتا ہے، دھول سے اٹ جائیں گی۔ اُس کا پھٹا ہوا دوپٹہ جس کے ایک کونے میں اُسنے شاید گڑ یا پیاز باندھ رکھی ہے، ڈھلک کر ایک طرف گر جائے گا۔ اور اُسکی ماں پکاریگی "اری سر پر دوپٹہ اوڑھ لے۔ کنواری لڑکیاں ننگے سر نہیں پھرا کرتیں، ورنہ نگلی، آسمان ٹوٹ پڑتا ہے!" وہ آسمان کی طرف دیکھکر مسکرائے گی۔ ایسی مسکراہٹ جیسے زندگی سے مایوس انسان کی جسے طبیب لاعلاج کہہ کر چھوڑ گئے ہوں۔ ایک سمجھنے بوجھنے والے کی مسکراہٹ جسے سمجھ بوجھ کے ابتدائی اصول سمجھائے جارہے ہوں ــــ نہایت تلخ اور نکیلی مسکراہٹ۔ جس کی تلخی اور جس کی نوک خود اس کی روح محسوس کرتی ہے ــــ وہ مسکرا کر دوپٹہ سر پہ لے لیگی۔ اور یونہی جھاڑو پھیرتی جائے گی۔ بوڑھے بیلوں کا گوبر اٹھا کر چھت کی منڈیر پر تھوپے ہوئے اپلوں کی قطار سجائے گی۔ نیچے آکے بیلوں کے آگے خشک جوار کے آٹھ دس ٹانڈے پھینکے گی۔ اور سر پر دو گاگریں اور کولھے پر ایک گاگر رکھ کر کنوئیں پر جائے گی۔ اور رستے میں سوچیگی۔

"اری تو کس ماں باپ کے گھر پیدا ہوئی کہ تجھے سانس لینے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ کس گناہ کی پاداش میں تجھے دنیا کے اس دوزخ میں جھونکا جارہا ہے۔ پرسوں مولوی وعظ میں کہہ رہا تھا کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں۔ اگر سب انسان بھائی بھائی ہیں تو زمیندار میرے باپ کو گھرکتا کیوں ہے، میرا باپ زمیندار کو کیوں نہیں گھرک سکتا۔ میرا باپ اُسے اپنے گھر بلاکر اور ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر یہ کیوں نہیں کہتا: آج میری طبیعت کچھ ناساز سی ہے۔ جنگل میں جاکر خشک لکڑیوں کا ایک گٹھا لادے۔ اور دیکھو لکڑیاں پرانے مردے کی ہڈیوں کی طرح خشک ہوں۔ اگر ذرا بھی گیلی ہوئیں تو سمجھو تمہاری قسمت پھوٹی"۔ آخر یہی الفاظ تو ہیں جو زمیندار ابا کو کہا کرتا ہے۔ اور پھر اگر سب انسان بھائی بھائی ہیں، تو میں زمیندار کی بیٹی کو یہ کیوں نہیں کہہ سکتی "اری ہاتھوں میں مہندی پھر رچانا۔ اور آنکھوں میں کاجل بھی بعد ہی میں لگا لینا۔ یوں کہ یہ تین گاگریں اٹھالے اور لپک کر کنوئیں سے ٹھنڈا پانی بھر لا، میں نہاؤں گی۔ اور دیکھو اگر کوئی گاگر رستے میں ٹوٹی تو سمجھو تمہاری قسمت پھوٹی!"

[illegible] تے ہنس پڑے گی۔ اور سوچے گی: "بھئی بہت لطف آئے [illegible] آئے، وہ باہر نکلے تو لڑکے اُسے چھیڑیں۔ اور اُسکے عجیب عجیب نام [illegible] بھری، دھڑکا لا دُم سنہری! چھپکلی نازوں سے پلی! مسسی بلی، [illegible] مونچھیں آنکھوں پہ جھلی۔ پھر کوئی ادھر سے کنکر اُٹھا کر "کٹاک" [illegible] پھینک دے! اور پھر لطف آجائے اُس کے رونے کا۔ بھیگ جائے۔ ٹوٹی ہوئی گاگر کے سامنے گھٹنوں میں مُنہ چھپا کر بیٹھ جائے اور بسورنے لگے۔ اتنی روئے کہ اس کی ناک پکی مرچ کی طرح لال پڑ جائے، گال شلغم کی طرح اُبھر آئیں۔ اور آنکھیں گاگر کی ٹھیکریاں بن جائیں۔ واپس آئے تو میں برس پڑوں۔ اری مونڈی کاٹی! اے کنار تیے میں چھوکروں سے گاگروں کو نشانہ بنواتی پھرتی ہے۔ لے تیرے لیکھ نہیں نہ جاگیں۔ کیا یونہی پانی بھرا جاتا ہے۔ اگر روز ایک گاگر ٹوٹی تو سمجھو تمہاری قسمت پھوٹی!"

وہ مسکرائے گی — وہ مسکراہٹ جو اُس کا خاصہ بن چکی ہے۔ واپس آکر گیلے ٹانڈوں میں پڑوس سے لائے ہوئے انگارے رکھکر پھونکیں مارے گی۔ اور اتنی دیر تک پھونکیں مارے گی کہ سارے ڈھل جائیں گے۔ اس کا سینہ اُبھرے گا اور بیٹھ جائے گا۔ اُس کے گلابی نتھنے لرزنے اور اس کے گال تمتانے لگیں گے، اس کی آنکھیں راکھ اور دھوئیں اور تھکن سے پتھرا سی جائیں گی! اور باجرے کی دو موٹی موٹی روٹیاں پکا کر اور چھاچھ کا ایک پیالہ بھر کر بوڑھی ماں کے آگے رکھدیگی۔ چھاچھ کے برتن پر موٹی روٹی رکھکر اور اپنی پھٹی ہوئی چادر سے ڈھانپکر باہر کھیتوں میں اپنے باپ کے پاس چل دے گی۔ جو اُسے دیکھکر کہے گا: "آگئی میری بچی۔ بچی۔ آج کتنی دُھوپ ہے۔ آج تو جیسے زمین کے نیچے تنور سُلگ رہے ہیں۔ اور بچی، تیرے جوتوں کے چیتھڑے تو شاید رستے ہی میں گر گئے۔ کوئی اور چیتھڑا ڈال لے، لے۔ یہ میری پھٹی ہوئی پگڑی کا پلو لے۔ اور بچی، آج تو نے مُنہ کیوں نہیں دھویا۔ دیکھ تو گرد سے تیرا سارا چہرہ اَٹ رہا ہے۔ تو ہمیشہ کھوئی کھوئی سی رہتی ہے بچی۔ تو کھوئی کھوئی نہ رہا کر۔ میں بوڑھا تیرے سہارے تو جی رہا ہوں۔ تیرے بل پر تو میں اس دوزخ میں آڑا پھرتا ہوں۔ ورنہ میری بچی۔ میرے پاؤں کے تلوے تو کب کے قبر کی سردی کو چھو رہے ہیں!" — اور وہ کہیگی "ابا۔ دراصل مجھے بھیا بہت یاد آتے ہیں۔ وہ اگر زندہ ہوتے تو آج بچے [illegible] جوان ہوتے، ہیں نا ابا؟ سوچتی ہوں نہ ریل بنتی نہ وہ پٹڑیوں کے نیچے کٹتے۔ ابا کیا بھیا پھر واپس نہ آئیں گے؟"

اور اس کا ابا کہے گا: "اری، اگر مرنے والے واپس آسکتے تو خدا کو کون مانتا!" — وہ سب کچھ جانتے ہوئے [illegible] صرف اس لئے کرتی ان باتوں تلے اپنی وہ آگ چھپا سکے [illegible] سینے میں دہک رہی ہے۔ وہ سلگتی ہوئی [illegible] اپنی لپیٹ میں لیکر انگارہ بنا ڈالتی ہیں۔ اور وہ اکثر سوچا کرتی ہے کہ کئی لکڑیوں کے انگارے پڑے پڑے راکھ بن جاتے ہیں اور کئی لکڑیوں کے انگارے پڑے پڑے پھوٹ پڑتے ہیں اور آس پاس بیٹھنے والوں کے ریشمیں لباسوں میں کالے کالے سوراخ ڈال دیتے ہیں — انگارے کبھی کبھی پھوٹ بھی پڑتے ہیں!" — انگاروں کے پھوٹنے کا خیال اس کا بہت بڑا سہارا ہے، وہ سوچا کرتی ہے کہ جس طرح پل پل اور گھڑی گھڑی اس کی قسمت پھوٹتی ہے، اسی طرح کبھی — اگر ایک بار — صرف ایک بار یہ کنوارا انگارہ پھوٹ لے تو کیا لطف آئے۔ سوراخ ڈالدے آس پاس بیٹھنے والوں کے ریشمین لباسوں میں اور پھر خود چاہے ننھی چنگاریاں بن کر اُن کے جوتوں تلے مسلی جائے۔

خالی برتن اُٹھا کر واپس گھر آئے گی۔ ماں کی مٹی چپ لی کے بعد وہ درانتی اور رسی اُٹھا کر پھر جنگل کا رستہ لے گی۔ بہت دیر تک تنکا تنکا گھاس کاٹتی پھرے گی۔ اور جب چاند مغربی پربتوں پر گلاب کے پھول بکھیر دیگا۔ اور جب قدرت کا ہاتھ اندھیرے آسمان پر سُنہری خاک چھڑک دیگا تو وہ اپنی قسمت کی سی اُڑی ترچھی پگڈنڈیوں پر تیز تیز قدم اُٹھاتی گھر آئے گی۔ اس کا بوڑھا باپ گیلے ٹانڈوں پر پھونکیں مار مار کر روٹیاں پکا رہا ہوگا۔ وہ قہقہے زہر مار کرکے اکیلی تو اُس کی ماں کہے گی "اری جلدی جلدی لوٹا کر۔ تو تو جہاں جاتی ہے وہیں کی ہو رہتی ہے۔ کنواری لڑکیاں رات گئے بہت دیر تک باہر نہیں رہا کرتیں، بجلی، آسمان ٹوٹ پڑتا ہے!" اور اس کا ابا کہے گا "ہاں میری بچی جلدی آجایا کر۔ لیکن آخر تو کیسے جلدی [illegible] گوت بھی تو تو ہی کرتی ہو اور بھوسہ بھی تو تو ہی چھانتی ہے۔ [illegible] چلا کر بیٹی۔ سانپ بچھو کی رُت ہے۔" اور وہ [illegible] مسکرائے گی۔ اور سر پر گٹھا رکھکر زمیندار کی ڈیوڑھی کا [illegible] جب چاند پربت کے کسی غار سے اُبھرے گا، اور [illegible] جب ٹھنڈی ہوا بوڑھے درختوں میں خوفناک گیت [illegible] اپنے ڈنگ تولے پگڈنڈیوں پر بیٹھ جائیں گے، [illegible] پریشان بال، سُرخ گال [illegible] سینہ، ٹھنڈی آنگلیاں اور [illegible] اور سینے میں [illegible]

زہریلی بجلی بھرے تیروں کی طرح گھسیں گی۔ اور اس کی چال میں میگساری کی شان پیدا کر دیں گی۔

"ہے گی تو! آج پھر تو نے منہ ہاتھ نہیں دھوئے! اری میرا کہا مان لے بن ٹھن کر رہا کر اور گھاس کاٹنے کے لئے اس بوڑھے فقیر کو بھیج دیا کر یہی غضب ہوا ہے۔ اور اس بڑھیا کو کھاٹ سے کھینچ کر چولہے کے قریب بٹھا دیا کر تاکہ اپنا کھانا خود پکا لے۔ اور تو شام ہوتے ہی ادھر آجایا کر۔ اری تو تو اپنی جوانی برباد کر رہی ہے، تو تو شراب کو گھورے پر ڈال رہی ہے پگلی۔ تو تو سونے کی ڈلیاں دلدل میں پھینکے جا رہی ہے دیوانی! اری بھولی۔ تیری یہ کافر جوانی اور پھر یہ اپلے اور لیپے ہانڈی اور کھردری گھاس اور ——— یہ ——— یہ پھٹے ہوئے جوتے، اور یہ چولا ——— دیکھ تو تیری چھاتیاں اور تیرا پیٹ اور تیری بانہیں ——— سب کچھ تو نظر آرہا ہے ——— اس سے بہتر ہے کہ کپڑے اتار کر ننگی چلا پھرا کر۔ تف ہے! میں کہتا ہوں تو مجھ سے ریشم کے انبار لے۔ سونے کے زیور لے۔ مخملی جوتے لے۔ جو کچھ تو چاہتی ہے میں تجھے لا دوں گا، پر خدا کے لئے اپنی حالت سنبھال۔ تو نئی نئی کلی ہے اور اپنے ہی بوجھ سے زمین کی طرف جھکی جا رہی ہے۔ زمین گرم ہے اور تو جھلس جائیگی۔ پھر مجھ پر الزام نہ دھریو! ———"

اور پھر اس کی اپنی آواز "زمیندار جی۔ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ ——— آپ میری جوانی چاہتے ہیں نا۔ لے لیجے میری جوانی اور مجھے رخصت کیجئے کہ میرے بوڑھے ماں باپ پڑے کراہ رہے ہوں گے۔ آپ کی یہ مہربانی کیا کم ہے کہ شام کی اس ذرا سی روحانی اور جسمانی محنت کا صلہ آپ یوں دے رہے ہیں کہ میرے بوڑھے باپ کو ایک بیگہ زمین کاشت کے لئے دے رکھی ہے۔ جلدی کیجئے مجھے جانا ہے۔"

"اری تو تو پگلی ہے۔ دیوانی۔ پھول اور کڑوی خوشبوئیں پھیلائے۔ پگلی! اور تیرا یہ جسم کیوں جل رہا ہے؟" اور پھر اس کے گالوں پر انگلیاں کھیلنے لگیں گی۔ اس کی باہوں پر ہاتھ پھرنے لگیں گے جیسے سانپ ڈسنے کے لئے کوئی نرم جگہ تلاش کر رہے ہیں۔ اور اس کے بعد اس کا دل قیامت خیز رفتار سے دھڑکے گا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی گھر آئے گی اور کھاٹ پر ایک بے جان لوتھڑے کی طرح گر جائیگی۔ اس کے والدین پوچھیں گے "اتنی دیر کیوں لگا دی تو نے؟" اور وہ کہے گی "زمیندار کے مہمان آگئے تھے۔ گھوڑوں کے آگے چارہ ڈالنا پڑ گیا۔"

اور اچانک اسے اپنا سارا وجود ایک انگارے کی شکل اختیار کرتا محسوس ہوگا۔ اور وہ سوچے گی کہ یہ انگارہ کب پھوٹے گا۔ کب پھوٹے گا یہ انگارہ کہ میں چنگاریاں بن کر ان زمینداروں، ان مولویوں اور ان پیروں کے ریشمیں ملبوس میں کالے کالے سوراخ ڈال دوں۔ ان کے دیدوں میں گھس جاؤں۔ ان کی کنپٹیوں سے چمٹ جاؤں!۔

صبح تک یہ انگارہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ وہ پھر اٹھے گی۔ وہی گھاس کا گٹھا ہوگا، اور وہی جوتوں کے چیتھڑوں کی آڑی سیدھی لکیر ——— وہی لپٹا ہوا چولا اور وہی جھلکتی ہوئی چھاتیاں!

یہ انگارہ یوں ہی تپے گا۔ ٹھنڈا ہوگا۔ تپے گا۔ ٹھنڈا ہوگا۔ اور زمیندار کے شبستان میں اسی طرح ——— تم انگڑائیاں لے رہے ہو، شاید تھک گئے یہ متعفن باتیں سن کر۔ اچھا ——— !

احمد ندیم قاسمی

ہم کیا کریں؟

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر
(اقبال)

ادب کا فرض کیا ہے؟ زندگی کی صحیح ترجمانی کرنا۔ یہ فقرہ بظاہر صوفیوں کا سا ارشاد معلوم ہوتا ہے لیکن ایک لمحہ کا غور و خوض اسکے معنی آپ پر آشکار کر دیگا۔ زندگی، جیسا کہ ہر ایک کا تجربہ ہے شب و روز کے ہنگاموں کا نام ہے اور ہنگامے بھی ایسے جن کا ہر ہیجان ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ ایک شخص کو آپ چاقو لئے ہوئے تیزی سے گھر میں گھستے دیکھتے ہیں تو معًا یہ خیال کرتے ہیں کہ یا تو وہ کسی کو قتل کرنا چاہتا ہے یا اُس کی نیت خودکشی کی ہے۔ حالانکہ وہ صرف تربوز تراشنے کے لئے چاقو لایا تھا۔ یا اذان کی آواز سنتے ہی ایک مولانا غڑاپ سے مسجد میں داخل ہوتے ہیں تو آپ کو مسرّت ہوتی ہے کہ آج ایک اچھا سا وعظ سننے میں آئے گا لیکن بعد اداء نماز واقعہ کی غلط ترجمانی آپ کو آگاہ کرتی ہے کہ آپ کے نئے کے نئے جوتے غائب ہیں ــــــــ!

زندگی کو اگر محض اس طرح سمجھنے کی کوشش کی جائے جس طرح وہ رات دن گلی کوچوں میں اپنا عکس دکھاتی رہتی ہے ـــ اور اسی کو زندگی سمجھا جائے تو اس سے زیادہ خطرناک غلطی نہیں ہو سکتی۔ زندگی یہ ہے کہ آپ اُڑتے ہوئے واقعات، بہتے ہوئے سانحات اور منجمد حوادث کو پکڑ پکڑ کر ہلائیں، پہچانیں سے جو کپکپاتے ہوئے ہنگامے اور تھرتھراتے ہوئے ہیجانات جھکیں ان کو چن لیں پھر ان کی اس طرح ترتیب دیں کہ ان کو دیکھنے والا ہر شخص یہ سمجھے کہ یہ میری سوانح میں سے چرایا ہوا ایک جزو ہے ــــــ یہ ادیب کا سب سے بلند فرض ہے، یہی ادب ہے اور یہی زندگی!

کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ Journalism that lasts is literature and literature that does not last is journalism.

جب زندگی نام ہوا ایسی ماہرانہ عکاسی کا تو اب سوال یہ ہے کہ ہم ہندوستان میں کس طرح اس کے سین عوام کو دکھائیں۔ لیب میں تو سیدھا طریقہ ہے کہ اگر ان کو سماج کا یا کسی فرد کا یا نفسیات عامہ کا کوئی پہلو عریاں کرنا ہوا (تعمیر کے سلسلہ میں) تو فورًا ایک جیتا جاگتا ڈرامہ لکھ ڈالا جس کو ایک ہی شب میں کئی کئی تھیٹر کمپنیاں کر چند ہی ہفتوں میں اس کی نشر و اشاعت کر دیتے ہیں۔ یعنی جن گنہگاروں کی خبر لی گئی وہ سرنگوں ہو گئے اور سوسائٹی بھی اُن کے کرتوتوں سے آگاہ ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا کے نامور ترین تمثیل نگار اور سوفوکلیز، ایسکائلس اور یوریپیڈس سے لیکر شیکسپیر، مولیئر، اِبسن اور برنارڈشا تک ہر ایک نے یورپ کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا ہے۔ مگر ہم ہندوستان میں کس طرح ذہنی انقلاب پیدا کریں؟ کس طرح سوسائٹی کے ناسور کا اندمال کریں۔ کیونکر افراد و جماعت کو ان کی کمزوریوں پر ٹوکیں؟ یہاں تو اوّل زبان ہی کا قضیہ چل رہا ہو۔ یہاں تو قرآن کے حروف میں لکھی جانے والی زبان سے خطرہ ہے کہ وہ کہیں بھوت بن کر نہ چمٹ جائے، یہاں تو ڈر ہے کہ سنسکرت کے حروف پراچین تہذیب کی ڈکاریں لیتے ہوئے کہیں ہم کو ہڑپ نہ کر جائیں۔

یہ مان لیا کہ ہندوستان متحدہ قومیت کا گہوارہ نہیں ہے اور یہ خواب شاید کبھی شرمندۂ تعبیر بھی نہ ہوگا مگر اس کے یہ تو معنی نہیں ہیں کہ یہاں مختلف قوم کے جتنے افراد بستے ہیں وہ انسان نہیں بلکہ جن بھوت غول بیابانی اور جانور ہیں۔ لاکھ ہندوستان میں مختلف المذاہب لوگ آباد ہیں۔ تسلیم ہے کہ یہاں قومی تخیل اس بُری طرح پاش پاش ہے کہ کوئی اچھوت ہے، کوئی شودر، کوئی چھتری ہے کوئی پوتر برہمن ہے اور کوئی ملیچھ مسلمان۔ مگر کیا یہ سب کے سب ناطق حیوان انسانیت میں بھی باہم مشترک نہیں؟ آپ انگریزی یا فرانسیسی زبان کا ایک اخلاقی ناول پڑھتے ہیں جس میں بتایا گیا ہے کہ ہیرو کو قوم نے بہت ستایا ہے اس کو پیٹا گیا ہے، بھوکا مارا گیا ہے اور جیل میں ٹھونس دیا گیا ہے۔ آپ سات سمندر پار کی آفت رسیدہ انسانیت پر ظلم کے حالات پڑھ کر یہاں متاثر ہونے لگتے ہیں۔ لیکن آپ کے وطن میں آپ کی عین آنکھوں کے سامنے وحشیانہ ایک فرقہ دوسرے کا سر پھوڑ رہا ہے روادار سے روادار اخبار تک اس فعل کی مذمت نہیں کرتا ہے اگر کرتا کہتا ہے تو اپنے مخالف فرقے کو بُرا کہتا ہے۔ آپ کا لیڈر رہنمائی کے تعریف میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کرتا

[illegible] ہندو کے کسی دوسرے مقابلے میں اس کا اپنا فرقہ جنگ میں غالب رہے۔ دوسرے فرقے کے لیڈر اپنے افراد کے سینوں میں جذبۂ شہادت بیدار کرنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں تاکہ ان کے جو بھیڑیں تو بھیڑیے ہی بن جائیں۔ اس کے بعد مظلومین کی دیکھ بھال کو بھی فرقہ وارانہ ہی وفد جاتے ہیں یعنی مخالف فرقے کے اگر کئی ہزار افراد خانماں برباد اور زخمی ہیں تو ان کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ان تمام حرکات سے یہ ثابت ہوا کہ دونوں قومیں ان فرقہ وارانہ جنگ کو جائز سمجھتی ہیں۔ اگر جائز نہ سمجھتیں تو نفسِ فساد کی برائی میں ضرور اُنکے اخبارات میں مضامین نکلتے۔

ہندوستان کا ادب یہ سب کچھ بیٹھا ہوا ایڈیٹروں کے کمروں اور ادیبوں کی کوٹھڑیوں میں سے جھانکا کرتا ہے۔ بعض اوقات اسکے جسم کے دونوں ٹکڑے (قرآن کے حروف سے بنا ہُوا ٹکڑا اور سنسکرت کے شبدوں سے بنا ہُوا حصہ) حرکت تو کرنے لگتے ہیں مگر جب تک جسم الگ الگ دو حصّوں میں تقسیم ہے وہ کسی کام کا نہیں۔

میرا مقصد یہ ہے کہ ادب قومی عصبیت سے پاک ہونا چاہئے۔ ہندی اُردو کی رسّا کشی کو ختم کر کے اب جدید ادیب کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ وہ سینکڑوں ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی انسانیت کو متحد کرے۔ اُردو کے ادیب ہندی کے ادیبوں سے اور ہندی کے ادیب اُردو ادیبوں سے تعاون ایک اٹوٹ تعاون قائم کر کے ہندوستان میں ایسا انقلاب لائیں جس میں خون کے دریا بہنے کے بجائے پھولوں کا مینہ برسے اور پاش پاش شدہ انسانیت کی لاش کے عضو عضو کو جمع کر کے اپنی یکجائی جدّوجہد پھر اس میں زندگی کی روح پھونک دیں۔

لیکن اس بابرکت اقدام سے پیشتر ادیب کو ایک زبردست جہاد کرنا ہے۔ اس کو دیوتا قسم کی ہستیوں سے ٹکرانا ہے۔ اس کو پرستش کی جانیوالی شخصیتوں سے الجھنا ہے۔ اس کو بر خود غلط کے بتوں کو چُور چُور کرنا ہے۔ اس کو مرعوبیتِ مجہول کے جالے کو چیر چیر کرنا ہے۔ اس کو اقبال میں تسامح ڈھونڈنا ہے اور ٹیگور پر حرف گیری کرنی ہے۔ اس کو کسی سے مطمئن نہ ہو کر خود اعتمادی کی ایک طرح تو ڈالنی ہے۔ اس کو تنقید کی بے لاگ چھلنی میں تمام قابلِ ذکر لوگوں کو جمع کر کے بڑے زور سے ہلا ڈالنا ہے تاکہ اس چھان پھٹک میں کوڑا، کرکٹ، بھوسی ایک طرف ہو جائے اور [illegible] ایک طرف۔ اس کو رواں بدیہات پر اُنگلی رکھنا ہے، [illegible] پر شبہ کا اظہار کرنا ہے، اس کو ایک ایسی انقلابی [illegible] ایک زبردست جھاڑو پھیرنی ہے کہ خاک کے

[illegible] ہوئے ذرّے چمک اٹھیں اور جو خواہ مخواہ کے سورج بنے بیٹھے ہیں ان پر منوں خاک پڑ جائے۔ اس کو تنقیح اور استقراء کی ایسی شدید چھلنی چلانی ہے کہ کھن خوردہ ہستیاں نہ ٹھہر سکیں ——— غرض اس کو ایک اعلیٰ ترین آدمیت، ایک بہت ارفع انسانیت کا تخیل پیش کر کے اپنے میں سے ہی مافوق الانسان ہستیاں پیدا کرنی ہیں ——— !

لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ ادیب جدید تخریبی نظام لیکر اُٹھیگا۔ ہاں بلند عمارت قائم کرنے کے لئے بیشک پہلے وہ کھنڈرات کو مسمار کریگا۔ میں نہیں سمجھتا کہ جدید ادیب کندن کو پیتل اور آفتاب کو خفتہ ثابت کرے گا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ کندن کو بھی کسوٹی پر کسے گا اور آفتاب کے بجھے ہوئے اجسام میں پھر حرارت، تابانی اور رجوت پیدا کرے گا۔

میرے تمثیلی ادیب کا یہ فرض ہوگا کہ وہ [illegible] (محنت) اور [illegible] (سرمایہ) دونوں کے رشتہ سے [illegible] (قابلیت) کے پیچھے لے گا۔

ہمارا ادب مدّت سے ایک ڈھرّے پر چلا جا رہا ہے۔ کہانیوں میں عورت و مرد کے تعلقات پر پاک محبت، عفت اور عشقِ مجازی کا پردہ ڈال کر حقیقت کا ناس کیا جا رہا ہے۔ میں اس پردے کو صرف اس حد تک سراہتا ہوں جس حد تک یہ احتیاط کی کمزور کڑیوں سے ملا دیا جاتا ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ فسانوں میں جنسی تعلقات پر سے بعض اناڑیوں نے اس پردے کو ہٹا کر نہایت بھونڈے پن سے عریاں نگاری کا ثبوت دیا ہے۔ اسکے متعلق یہی کہا جاسکتا ہے کہ نہ تو ان کو لکھنا آتا ہے اور نہ ان کو فحش و حقیقت میں تمیز کرنا آتا ہے۔

جدید ادیب حقیقت نگار ہوگا۔ ادب میں جنسیات ناگزیر ہے، مگر یہ افسانے انسانوں کے لئے لکھے جاتے ہیں یا فرشتوں کے لئے جن میں مرد و عورت ایک دوسرے کو پسند کر لینے کے بعد شادی تک کے لئے جنسی لغزش سے کلیتاً معصوم اور خالی بنا دئے جاتے ہیں۔ اُن کو بھڑکا کر کیوں نہیں ان کو بے احتیاطی کا خمیازہ چکھا یا جاتا ہے۔ کیوں نہیں ان میں تعدیہ امراض، قطع نسل اور [illegible] کی تخویف پیدا کی جاتی [illegible]

اچھا تو میرے اس مضمون کا عنوان ہے "ہم کیا کریں؟" کس طرح بھٹکی ہوئی، ٹوٹی ہوئی انسانیت کو وحدت [illegible] مستحکم کریں؟ ہمارے اس انسان کی [illegible]

کمپنیز نہیں ہیں۔ ہماری تمام فلم کمپنیاں سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہیں
ادبی دیوانوں کے ہاتھ میں نہیں۔ جو شب و روز اس کوشش میں
لگی رہتی ہیں کہ ایک خاص تہذیب کی ایک خاص زبان کی تمام
ہندوستان میں نشر و اشاعت ہو جائے۔ بشریت چاہے الگ
الگ پڑی ہوئی سسکتی رہے، چاہے انسان بدکرداری میں شیطان
کا بھائی بنا رہے ان کے ذہن نہ کبھی اس طرف منتقل ہوئے ہیں نہ
ہوں گے۔ اس لئے سب سے پہلی تو ہماری یہ کوشش ہونی چاہیئے
کہ ان تمام بے جان فلم کمپنیوں کا ہم مقاطعہ کریں، ان کو ڈھا دیں،
ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں۔

اب ہمارا یہ فرض ہونا چاہیئے، اوّلیں فرض کہ اُردو ہندی کا
ادب اپنے اندر سے تعصب کی گندگی کو نکال کر ایک دوسرے سے
تعاون کرے اور استفادے کے لئے آمادہ ہو جائے۔ جب یہ مبارک
گھڑی آ جائے تو اُردو ہندی کا جتنا سڑا ہوا لٹریچر ہے اس کو
نکال کر گہری قبر میں دفن کر دیا جائے۔ ادیبوں پر، ایڈیٹروں پر اور
پبلشروں پر قدغن قائم کیا جائے۔ بے لاگ تنقیدیں شائع ہوا
کریں۔ ایک Writers' Association (ادارۃ المصنفین)
قائم ہو۔ اسی طرح ایڈیٹروں اور پبلشروں کا بھی ایک ادارہ
ہو جو بے جان، متعفن اور ناکارہ ادب کو دوڑانے پر بھی ٹوک دے،
اور وہ ادب جو اوپر بیان کئے ہوئے اُمور کا حامل ہو مسند پر بٹھایا
جائے۔۔۔!

میں نے یہ بہت ہی مختصر الفاظ میں ایک تعمیری تخیل پیش
کیا ہے۔ کیا میں اُمید رکھوں کہ اس کی تائید یا تردید میں کوئی صاحب
کچھ لکھیں گے؟ ارے میاں کون جھنجھٹ مول لے۔ بول کبڈی تارا

سلطان میر ملدا۔

میرے معجزے

تجھے یوں عشق کا اعجاز دکھایا میں نے

کر دیا آگ سے لبریز تری سانسوں کو
بھر دیا برق کی لہروں سے ترے ہونٹوں کو
جسم میں تیرے حسیں لوچ سموئے میں نے
فتنے اعضائے جواں میں ترے [illegible] میں نے

چال میں تیری کیا رقص بھنوں کا پیدا
نرم سا ڈال دیا تیری کمر میں جھولا
تیرے گالوں کو گڑھے بانٹ دیئے شعلوں سے
ساغر آنکھوں کو بھی چھلکتے حسیں [illegible]

تیری سانسوں کو دیا تیز سی دھاروں کا بہاؤ
قدِ رعنا کو عطا کر دیا شبنم کا تناؤ
گفتگو میں تری رس گھول دیا پھولوں کا
تیرے لغموں کو دیا ساز رواں جھرنوں کا

پہلے تھا شانۂ بلور ترا ایک چٹان
اب ہے دو تازہ بگولوں کی جواں [illegible]
رکھ دئے تیری نگاہوں میں اشارے میں نے
قافلے پلکوں پہ مستی کے اتارے میں نے

بند دل میں رکے طوفان کے سب توڑ دئے
سینے میں قید اُمنگوں کے ہرن چھوڑ دئے
گیت رگ رگ میں تری چھیڑ دئے ساون کے
بھرے خوشبو سے کٹورے بھی [illegible]

کھینچ کر تیرے لبوں تک ترا دل لے آیا
تیرے ٹھٹھرے ہوئے جذبات کو بھی [illegible]
تری آغوش کی فردوس کا در کھول دیا
نرم باہوں کو تری حلقۂ زنجیر [illegible]

تجھے انگڑائی سے اظہارِ تمنا بخشا
نیچی نظروں سے تجھے [illegible]
تیرے اعضا کو بہکنا بھی سکھایا میں نے
تیری [illegible]

[illegible] تجھے اس طرح [illegible]

قیسی رامپوری!

خیراتی

"خیراتی! کہاں چلا گیا خیراتی!" خیراتی کے بڑے بھائی جمعراتی نے زور سے پکارا۔

"ان کا بھی کچھ ٹھکانا ہے؟ وہ تو بس کھانے کے وقت آئینگے" جمعراتی کی بیوی بخاتن نے کہا۔

خیراتی نے یہ بھی سنا اور اس کے علاوہ اور بھی جو باتیں ہوئیں وہ بھی سنیں لیکن کچھ نہ بولا اور اپنی جگہ پر خاموش پڑا رہا۔ نیلے آسمان کی سنہری دھوپ میں وہ بتاور کے ایک جھنڈ کی آڑ میں ٹانگیں پھیلائے پڑا تھا۔ اس کے بالکل سامنے ببول کا ایک لنڈ منڈ سوکھا درخت کھڑا تھا جس پر ایک بیمار چیل بیٹھی ہوئی تھی۔ درخت کی تین شاخیں تین انگلیوں کی طرح آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں اور خیراتی کو یاد دلا رہی تھیں کہ اس کو اپنے وطن جگت پور واپس آتے ہوئے تین مہینے گذر گئے۔ سامنے ایک کمیت چھوڑ گھوڑے کا ایک بہت بڑا ڈھیر تھا اور بچھوا ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے جب اس پر سے اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے آتے تو خیراتی کو سوندھے اور کچھ گرم معلوم ہوتے۔ بائیں ہاتھ کی طرف ایک اوسر پہاڑ تھا جو جہاں تک نظر جاتی چلا گیا تھا۔ خیراتی کو کچھ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ دنیا کے ایک چھور پر آگیا اور اب اس کے آگے دنیا ختم ہے۔ داہنے ہاتھ کی طرف درختوں کی آڑ میں جگت پور تھا۔ دور کہیں ایک کوا بول رہا تھا۔ اس سناٹے میں اسکی آواز بھی بھلی معلوم ہوتی۔

خیراتی نے بھائی اور بھاوج کی آوازیں اور باتیں بھی سنیں، شبراتن کو گھورا ڈالتے بھی دیکھا لیکن وہ بالکل بے حس و حرکت پڑا رہا۔ آج وہ کسی دوسری ہی دھن میں تھا۔ اُسے اپنی پچھلی زندگی یاد آرہی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ اپنی پرانی زندگی کا جائزہ لے رہا تھا اور اس گھورے کے ڈھیر کو گھور رہا تھا کہ شاید کوئی ایسی چیز نکل آئے جس کے سہارے وہ اپنی آئندہ زندگی بسر کر سکے، لیکن اس کی یہ کوشش بالکل ہی ایسی تھی جیسے کوئی شخص برسوں کے راکھ کے ڈھیر کو اس امید میں ٹٹولے کہ مبادا اس میں سے کوئی دہکتا ہوا انگارہ نکل پڑے۔ خیراتی کی آنکھوں کے سامنے بھولی بسری یادوں کی پرچھائیاں اُسے منہ چڑاتی دوڑتی ہوئی چلی جاتیں۔

خیراتی کو اپنے مرے ہوئے ماں باپ پر غصہ آتا کہ انہوں نے اس کا نام خیراتی کیوں رکھا! اس کو اپنی تمام مایوسیوں اور پسپائیوں کی سب سے بڑی وجہ یہی معلوم ہوتی کہ اس کا نام خیراتی تھا۔ جہاں کہیں بھی وہ گیا ہر شخص نے سب سے پہلے اس کا نام ہی سنکر منھ بنا دیا۔ لاہور میں تو وہ ایک گودام سے محض اپنے نام ہی کی وجہ سے نکال دیا گیا۔ بڑے صاحب آئے ہوئے تھے اور گودام کے مزدوروں میں سے ایک مزدور کو ہٹانے کا سوال درپیش تھا۔ بڑے صاحب نے مزدوروں کی فہرست منگا کر دیکھی۔ اس میں کسی مزدور کا نام تھا جنگ بہادر، کسی کا نام تھا رنجیت سنگھ، کسی کا نام تھا جمن علی خاں، کسی کا نام تھا رام کھلاون اور سب سے آخر میں اس کا نام تھا خیراتی۔ بڑے صاحب نے لال پنسل اٹھائی اور اس کے نام کے آگے ایک موٹی سی لکیر کھینچ دی۔ فوراً وہ نوکری سے علیحدہ کر دیا گیا اور محض اپنے نام کی وجہ سے اسکی تقدیر کا دروازہ بند ہو گیا۔

خیراتی اپنی پچھلی زندگی کے کسی کارنامے سے خوش تھا تو اس سے کہ جب وہ مولوی سبحان اللہ کے مکتب میں پڑھنے کے لئے بٹھایا گیا اور اس پر بہت زیادہ لات گھونسے اور ڈنڈے برسنے لگے تو اس سے ایک دن اتفاقیہ مولوی صاحب کی بدھنی ٹوٹ گئی۔ مولوی صاحب نے اُسے مارتے مارتے بیدم کر دیا اور اپنے مکتب سے یہ کہکر نکال دیا "جا کمبخت تیرا اس مکتب میں کوئی کام نہیں۔ میں آج بیس برس سے اس مکتب میں پڑھا رہا ہوں اور نہ معلوم کتنے گدھوں کو آدمی بنا کر چھوڑ دیا۔ لیکن اب تک تیرا ایسا کوئی کمینہ، پاجی، بدمعاش، حرامزادہ لڑکا نہیں آیا جس نے کہ میری بدھنی توڑ دی ہو"

خیراتی کی گردن میں ہاتھ دیکر جب مولوی صاحب نے اُسے مسجد کے باہر دھکیلا تو مسجد کے نیچے کھڑے ہو کر خیراتی نے اپنی زندگی میں پہلا اور شاید آخری اطمینان اور آزادی کا سانس لیا تھا۔ گھر پہ باپ نے بھی بہت مارا لیکن اس سے زیادہ نہیں جتنا کہ مکتب میں روزانہ لات گھونسوں اور ڈنڈوں کے پڑنے کا اوسط تھا۔ مکتب سے آزادی مل گئی اور خیراتی خوش تھا کہ سستی مل گئی۔

لوگ کہتے ہیں کہ جب وہ اپنا بچپن یاد کرتے ہیں تو انہیں افسوس ہوتا ہے کہ ہائے کیسے اچھے دن تھے جو گزر گئے اور جواب پلٹ کر نہیں

[illegible]نہیں گے۔ بے فکری کے ان سہانے دنوں کو یاد کر کے وہ اپنا کلیجہ مسوس مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن خیراتی کے لئے یہ بات بالکل ہی اُلٹی تھی۔ [illegible] بچپن کے دن یاد کرتا تو کراہ اُٹھتا۔ دو برس تک تو وہ مولوی [illegible] سبحان اللہ قصائی کے انتہائی ظلم و ستم کا شکار رہا۔ پھر خدا خدا کر کے وہاں سے نجات ملی تو تھوڑے ہی دنوں میں وہ ایک بالکل ہی نئی مصیبت میں گرفتار ہو گیا جس نے مولوی سبحان اللہ کے ظلم و ستم کو بھی بھلا دیا۔ لالہ تیتھا مل جو پہلے "تھو بنیہ" کہے جاتے تھے، انہوں نے قصبہ کے باہر اینٹوں کا ایک بھٹا لگا دیا۔ مزدوری کم دینے کے مارے لالہ جوانوں کے بجائے لڑکوں کو لگاتے۔ دام کم خرچ ہوتے اور کام خوب چوکھا ہوتا۔ لالہ لڑکوں سے کام خوب دھانس دھانس کر لیتے۔ ان پر خوب اینٹیں لدواتے ایک ایک بوجھ میں چودہ چودہ سولہ سولہ۔ اور پھر ہر وقت ایک ڈنڈا ہاتھ میں رکھتے۔ ادھر کوئی اینٹ گری اور اُدھر دھوں سے ڈنڈا پڑا۔ اِدھر ذرا سی دیر ہوئی اور اُدھر انہوں نے لدائیں بیس اینٹیں۔ اور پھر اگر سورج نکلنے سے پیشتر کام پر نہ پہونچ جاؤ تو فوراً مزدوری کٹ جائے۔ دوپہر میں کھانا کھانے کے لئے صرف پل بھر کی مہلت ملتی۔ ذرا سی دیر ہو جائے تو مزدوری الگ کٹے اور مار الگ پڑے اور پھر ان تمام باتوں کی مزدوری آٹھویں روز ایک روپیہ!! جس روز مزدوری ملنے والی ہوتی اُس روز ایک گھڑی دن رہے خیراتی کا باپ بھٹے پر پہونچ جاتا۔ لالہ جی مزدوری کا روپیہ اُس کے ہاتھ میں دیدیتے اور خیراتی مُنہ تکتا ہی رہ جاتا۔ اگر کچھ پیسے کٹ جاتے اور مزدوری ایک روپے سے کم ہوتی تو خیراتی کا باپ بلبلا اُٹھتا اور گھر پر آکر خیراتی کو خوب دُھنکتا۔

دو ڈھائی برس تک خیراتی اسی طرح مرتا اور پستا رہا لیکن پھر شاید لالہ جی کو ترس آگیا۔ انہوں نے ایک دن اس سے کہا: "ابے او سؤر کے بچّے! اب کل سے تو کام پر نہ آئیو۔ نمک حرام، کام چور! بہت موٹا ہو گیا ہے کھا کھا کر۔ ہم نے دوسرا انتظام کر لیا ہے اب تیرے ایسے حرام خوروں کی ضرورت نہیں!"

خیراتی اب پندرہ برس کا تھا اور اپنے ہاتھ مُنہ کا ہو گیا تھا۔ لیکن اس کا باپ اب بھی ہر وقت لٹھ لئے اس پر سوار رہتا۔ اُسے دیکھ کر ہمیشہ بڑبڑایا کرتا: "تجھے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے۔ نہ کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا!" خیراتی نے گھر میں کبھی سُکھ نہ دیکھا۔ ہمیشہ روٹی کی ہائے ہائے پڑی رہتی۔ دن میں صرف ایک وقت شام کو چولہا جلتا لیکن تب بھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہ ہوتا۔ خیراتی کے باپ کا دو بیگہ کھیت تھا اور وہ بھی بٹائی پر۔ اتنا بھی غلّہ نہ پیدا ہوتا جو گھر کے آٹھ پیٹوں کے لئے گت سے تین چار [illegible] بھر کھیت میں جُٹا رہتا۔ بڑا بھائی جمراتی زمیندار کے یہاں [illegible] تھا۔ اور تین روپے مہینہ اور کھانا ملتا۔ ماں اور تین [illegible] ایک بیوہ تھی اور دو بن بیاہی چکّی پیسا کرتیں یا دھان کوٹتیں [illegible] باپ کے ساتھ کھیت پر چلی جاتیں۔ بیوہ بہن کا لڑکا کرّو آٹھ دس برس کا تھا وہ مویشی چرانے جاتا۔ خیراتی کا چھوٹا بھائی فطرتاً پیدائشی لنگڑا، لولا، اندھا اور محض گوشت کا ایک لوتھڑا تھا۔ جو گُدڑی بنا پیال پر ایک طرف لیٹا رہتا۔ لیکن بھوک اسے بھی لگتی اور جس وقت روٹی بٹتی اس کا بھی حصّہ لگایا جاتا۔ گھر کا گھر خیراتی سمیت دن بھر کولھو کے بیل کی طرح کام کاج میں لگا رہتا لیکن تب بھی اتنا نہ ہوتا کہ پیٹ بھر کھانے کو موٹا جھوٹا ہی مل جاتا۔

بھٹے سے الگ ہو جانے کے ایک سال بعد تک خیراتی کو کہیں مزدوری نہ ملی۔ ندی کے اُس پار گاؤں میں سوکھا پڑ گیا [illegible] وہاں کے لوگ محنت مزدوری کر لئے جگت پور بھاگ آئے تھے اور چار چار چھ چھ پیسے پر دن بھر ڈلیاں ڈھونے پر تیار رہتے تھے۔ [illegible] باپ نے اس سے بہت بہت کہا کہ وہ گھاس ہی کھودے لیکن خیراتی نے مار بھی کھائی اور فاقے بھی کئے لیکن اس سے کچھ نہ ہو سکا۔ وہ دن بھر آوارہ گرد کھیتوں اور اوسروں میں یا پھر قصبہ کی گلیوں اور سڑکوں پر گھوما پھرا کرتا۔ اُسے اُس کے ہی جیسے چار چھ آوارہ گرد لڑکے اور مل گئے تھے، اور ان کے ساتھ اس نے اپنی دلچسپی کا [illegible] سامان پیدا کر لیا۔ اُسے اب کھانے پینے کی بھی مصیبت نہ رہی تھی۔ لڑکوں کی یہ چھوٹی سی فوج کھیتوں اور باغوں پر باقاعدہ دھاوا بولتی اور انہیں لوٹتی کھسوٹتی۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی دعوت رہتی۔ کبھی چنے کے ساگ کی۔ کبھی مٹر کی پھلیوں کی۔ کبھی ککڑیوں کی۔ کبھی پھوٹوں کی۔ کبھی خربوزوں، کبھی تربوزوں کی۔ بیروں، امرودوں اور آموں کی تو خاص سہالک تھی۔ ان لوگوں سے زیادہ شاید قصبہ بھر [illegible] نہ کھاتا۔ قصبہ میں ان لوگوں کی دال ذرا کم گلتی۔ لیکن [illegible] اور مونگ پھلی کے ٹھیلوں سے یہ لوگ کچھ نہ کچھ [illegible] اِن دھاووں میں کبھی کبھار ایک آدھ ساتھی کھیت [illegible] دشمن کے ہاتھ پڑ جاتا اور خوب خوب اذیتیں اُٹھاتا۔ [illegible] غنیمت کافی مقدار میں ہاتھ لگ [illegible] تھی۔ اس قسم کی زندگی میں مسرت [illegible] ہر سولہ سترہ سال [illegible]

پڑے گونج رہے تھے، اوسر کی جھاڑیاں تھیں، کھنڈر اور ویران گھروں کے ڈھیر تھے۔ اور سنسان راستے۔ شکار کا موقع ہو پھر شکار ملتے کیا دیر لگتی ہے!

پچھلے رومانوں کی یاد نے خیراتی کے جسم میں ایک جھرجھری سی پیدا کر دی اور ایک ہلکی سی آہ بے اختیارانہ اس کے منہ سے نکل گئی۔ تھوڑی دیر خیراتی کا دل کچھ گرمایا لیکن پھر وہ اپنی بیکسی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گیا۔

ایک دن وہ اور شبراتن — وہی شبراتن جو ابھی گھونگھٹ ڈال رہی تھی اور اب کلو فقیر کی بیوی اور چھ بچوں کی ماں ہے — او کھیت میں ایک ساتھ پکڑ لئے گئے! پھر کیا ہوا؟ — ہزاروں لاتیں گھونسے اور جوتے جب اس پر برس چکے اور وہ مرا سمجھ کر ایک طرف سڑک پر ڈال دیا گیا تو وہ لنگڑاتا، کراہتا اسٹیشن پہونچا اور بغیر کچھ سوچے سمجھے جو سب سے پہلی گاڑی جگت پور کے اسٹیشن پر رکی اس پر بیٹھ گیا اور ایک نامعلوم منزل کیلئے روانہ ہو گیا۔

وہ پندرہ برس بعد جگت پور لوٹ کر آیا تھا! کیسی کیسی قسمت آزمائی کر کے! لیکن اب بھی وہ موچی کا موچی ہی تھا۔ وہی پرانا خیراتی —!!

"اللہ میاں! کیا قصور کیا تھا میں نے؟" اس نے عاجزی سے کہا۔ لیکن یک بیک غصہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا: "کیوں پیدا کیا تھا آخر مجھے!" وہ باآواز بلند بڑبڑایا۔

دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکلے اور اسکے رخساروں پر آکر رک گئے۔ اور سوکھ گئے!

آسمان بھورا ہو چکا تھا! کوؤں کا ایک غول کائیں کائیں کرتا اس کے سر پر سے نکل گیا!!

وجاہت سندیلوی

کلامِ فرحت

باغ و بہارِ باغ کی، دل میں کوئی ہوس نہیں
رنگ و رُخ چمن میں کیا سلسلۂ قفس نہیں

کنجِ خلوصِ شوق میں، کشمکشِ ہوس نہیں
کوئی بھی ہمنوا نہیں، کوئی بھی ہمنفس نہیں

بل نہیں بال و پر میں اب ریشۂ و رگ میں کس نہیں
مجھ میں کوئی سکت نہیں، باز درِ قفس نہیں

میرے کلامِ شوق میں، ذوقِ جہاں کا رس نہیں
نغمۂ روحِ عشق میں، نغمۂ بوالہوس نہیں

اصل میں دونوں ایک ہیں، رنگِ مذاق ہی جدا
شمع کے سوز میں نہاں، سوزِ پرِ مگس نہیں

حُسن ہی شعریت نواز، عشق ہی شعریت پرست
حسن میں شعریت ہے کم، گو کہ مزاج ٹھس نہیں

بات کسی سے کیا کہوں، عشق کسی سے کیا کروں
میرے سخن میں رس نہیں، میرے جنوں میں حس نہیں

لاکھ نصیحتیں سنیں، لاکھ فضیحتیں سہیں
عقل ہوئی وبالِ جاں، دل ہے کہ ٹس سے مس نہیں

کاش نگاہِ نازِ یار، فصدِ جنوں ہی کھولدے
نشترِ غم کے واسطے، خون نہیں کہ نس نہیں

فرحتِ بے نیازِ عقل، عقل سے کام لے ذرا
دل کی تو بات ہی ہے اور، دل پہ کسی کا بس نہیں

چشمکِ برقِ ناز کا، کس سے خطاب راز ہو
بزمِ جمالِ یار میں فرحتِ نکتہ رس نہیں

فرحت کانپوری

فانی مرحوم

دم بخود، سکتہ کا عالم، مُردنی چھائی ہوئی
رنگ میری زندگی کا میری میت پہ کھُلا (فانیؔ)

موت کے متعلق اہلِ دانش، اربابِ فکر اور صاحبانِ دل کے مختلف نظریے ہیں، عربی میں موت کو "الجسر یوصل الحبیب الی الحبیب"[1] کہا گیا ہے۔ ہندو ویدانت میں موت، انتقالِ جسم کی ایک شکل ہے، یعنی جو ہم کو مرتا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ مرتا نہیں ہے "چولا" بدل لیتا ہے۔

حکمائے مشائین میں سیافیدس سیکیت نامی ایک حکیم اور فلسفی گذرا ہے، اس نامور حکیم نے، دُنیا والوں کے مکر وفن سے بیزار ہوکر، لوگوں سے ملنا جلنا اور بات کرنا چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ بادشاہ وقت کے پیہم اصرار اور مسلسل خواہش پر، اُس نے ملنے سے صاف انکار کر دیا۔ آخرکار راج ہٹ کو حکیم کے اُصول کے سامنے سپر انداختہ ہونا پڑا۔ بادشاہ نے سیافیدس کے پاس چند سوال لکھ بھیجدے اور خواہش ظاہر کی کہ ان کے جوابات لکھ دیئے جائیں۔ حکیم نے اس بات کو منظور کر لیا۔ ان دس سوالات میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ موت کیا ہے؟

سیافیدس نے اس کے جواب میں لکھا۔

"بے بیداری کی نیند، تونگروں کی ہیبت، صوفیا کی آرزو"

فانیؔ بدایونی نے بھی تمام عمر موت کی آرزو کی، فانیؔ کو فنا سے محبت اور مرگِ ناگہاں کی تمنا تھی۔ کوئی شک نہیں کہ فانیؔ مرحوم کی اس تمنا میں زندگی کی تلخیوں کا احساس بھی شامل تھا۔ مگر فانیؔ نے اپنے بعض اشعار میں، زندگی کو حجاب اور نزع کو راز و نیاز سے تعبیر کیا ہے، اس لئے کیا عجب ہے کہ تمنائے مرگ کی آڑ میں وہ کسی حقیقتِ منتظر کی تلاش میں ہو!

موت کتنی یقینی چیز ہے! لیکن ہوس کا غلام انسان موت سے اکثر بے خبر رہتا ہے۔ ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے چتاؤں پر لاشوں کو جلتے اور قبروں میں مُردوں کو دفن ہوتے نہ دیکھا ہو! ہمارے دیکھتے دیکھتے کتنے بہت سے، ہم ہی جیسے انسان پیوندِ زمین ہو گئے۔ موت کا فولادی پنجہ بادشاہ کے نرم و نازک حلقوم اور فقیر کی سخت گردن میں کوئی امتیاز نہیں کرتا، موت اُن ناقابلِ تسخیر قلعوں میں بھی پہونچ جاتی ہے؛ جہاں آہنی دروازوں پر سنگینوں کا پہرہ ہوتا ہے۔

مادہ پرست اس دُنیائے آب وگِل کی زندگی کے بعد کسی زندگی کے قائل نہیں ہیں، مذہب کہتا ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک زندگی اور ہے، ایک مرتبہ حضرت پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام قبرستان میں تشریف فرما تھے، جنازہ رکھا ہوا تھا، قبر کھودی جارہی تھی، آپ نے مٹی کریدتے ہوئے صحابہ سے فرمایا:-

"لوگو اس دن کے لئے کچھ کر رکھو"

مذہب "حیات بعد الممات" پر بہت زور دیتا ہے اور جو دُنیا کی رنگ رلیوں میں خالق کو بھول جاتے ہیں، اور آخرت کی جزا و سزا پر یقین نہیں رکھتے، مرتے وقت اُن کو دُنیوی زندگی پر بے انتہا متاسف ہوتے دیکھا گیا ہے، نزع کے وقت مرنے والے کو آنیوالی زندگی کی کچھ جھلکیاں سی نظر آتی ہیں اور منکر وملحد کے لئے وہ گھڑی بڑی ہی سخت اور پشیمان کن ہوتی ہے۔ کاش! دُنیا اُس پشیمانی اور ندامت سے بچنے کی فکر کرسکتی، جس کی تلافی محال اور جس کا انجام دردناک ہے۔

لکھ رہا تھا فانیؔ پر، اور ذکر چھڑ گیا موت کا، مگر لفظ "فانی" کو فنا اور موت کے ساتھ جو ربط ہے، اس کے لحاظ سے اس تمہید کو خلافِ موضوع نہیں سمجھا جاسکتا۔ مذہب بیزار طبقہ، تمہید کے بعض جملوں پر غالباً مسکرائے گا، مگر میں لوگوں کے طعن وطنز سے [illegible] بات منافقت کے پردے میں چھپا نہیں سکتا۔

حضرت فانیؔ مرحوم حیدرآباد دو دفعہ آئے، پہلی مرتبہ [illegible] دن حیدرآباد میں رہ کر واپس چلے گئے، میں اُس زمانہ میں [illegible] نہیں آیا تھا، دوسری مرتبہ جب وہ حیدرآباد میں [illegible] تو میں اُن کے آنے سے تین سال قبل یہاں آچکا [illegible] مرتبہ آنے کے بعد یہیں بس گئے [illegible] زمانہ قیام کی ناتمام یادداشت ہے [illegible] چاہتا ہوں۔ فانیؔ کی سیرت مرتب کرنے والوں کے لئے [illegible] کوشش کارآمد ثابت ہو۔

---

[1] ایک پل جو دوست کو دوست سے ملاتا ہے۔

اشعارِ فانی کا پہلا تاثر :- مجھ میں شعر و ادب کا شعور جس زمانے میں پیدا ہوا ہے اسی زمانے میں فانی کی شاعری سے ہندوستان کی فضا گونج رہی تھی، بچے بچے کی زبان پر فانی کی یہ غزل تھی:-

ماَلِ سوزِ غمہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ

لوگوں کی زبانی فانی کے اشعار سن کر بے حد اثر ہوا۔ نوجوانی کا زمانہ رنگ و بو کا زمانہ ہوتا ہے، لیکن اس وقت میری طبیعت کا یہ عالم تھا کہ فانی کے مرگ و نزع کے اشعار سن کر آنکھیں بے اختیار ڈبڈبانے لگتی تھیں۔ اسکول میں ایک ہم جماعت دوست کی عنایت سے علی گڑھ میگزین پڑھنے کو مل جاتا تھا، نگاہیں میگزین کی فہرست میں سب سے پہلے فانی بدایونی کا نام ڈھونڈتی تھیں، فانی کی غزل کا یہ مطلع مجھے اب تک یاد ہے:-

میں ندامت جان کر خوش ہوں یہ منظر دیکھنا
وہ تڑپ کر تڑپا کے مجھ کو پھر نہ مڑ کر دیکھنا

آدمی کی فطرت کا خاصہ ہے کہ جب کسی سے دلچسپی اور تعلقِ خاطر ہو جاتا ہے، تو اس کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے، اسی ذوقِ تجسس نے فانی کے متعلق عجیب عجیب معلومات سے مجھے روشناس کرایا۔ بہت سی باتیں لوگوں کے ذہنوں کی تراشی ہوئی تھیں۔ بڑے آدمیوں کے متعلق شاید افسانے گھڑے جاتے ہیں۔

پہلی ملاقات :- مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت آنجہانی کی منظوم کہانی "پریم درپن" فلم کے لئے ڈرامہ کی شکل میں تبدیل کی جا رہی تھی، اسی سلسلہ میں رسالہ نگار کے ایڈیٹر جناب نیاز فتحپوری حیدر آباد آئے ہوئے تھے، انکے یہاں میرا آنا جانا رہتا تھا۔ ایک دن شام کے بعد نیاز صاحب کے یہاں، علی اختر، نیاز، اور میں برج کھیل رہے تھے کہ ہوش بلگرامی اپنی موٹر میں ایک صاحب کو لئے ہوئے آئے۔ نیاز صاحب نے "فانی" کہتے ہوئے آنے والے کو گلے لگایا، میرا اور جناب علی اختر کا بھی تعارف کرایا [illegible] ادھر اُدھر کی بات چیت رہی اور فانی صاحب موٹر میں [illegible] فانی سے ملنے کی بڑی تمنا تھی، اس اچانک ملاقات [illegible] کہنے کو تو فانی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی، مگر ان [illegible] میں اُن سے بارہا مل چکا تھا، وہ میرے [illegible] اثنائے گفتگو میں فانی صاحب کی قیام گاہ کا پتہ دریافت کر چکا تھا دوسرے دن صبح سویرے نظامیہ ہوٹل پہونچا۔ فانی صاحب نہا دھو کر کپڑے بدل چکے تھے اور بالوں میں کنگھا کر رہے تھے مجھے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے، بڑی گرمجوشی سے ملے، اور تھوڑی دیر بعد بیاض نکال کر غزل سنانی شروع کی، میں تو اُن کی زبان سے ان کا کلام سننے کیلئے آیا ہی تھا، اور آن سے فرمائش کرنے کے لئے موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ اس "نوازشِ بے طلب" نے میرا حال اس پیاسے جیسا بنا دیا تھا، جس کے بارے میں یونانِ قدیم کے افسانے میں کہا گیا ہے کہ دریا کی موجیں خود بخود اس کے ہونٹوں سے جا ملیں۔ فانی غزل سنا کر بیاض بند کرنے ہی والے تھے کہ میں نے کہا: "ایک غزل اور عنایت فرمائیے" انہوں نے دوسری غزل سنائی اور بولے:-

"ماہر صاحب! مجھے دوسروں کو اپنا کلام سنانے کا شوق نہیں ہے۔ چونکہ میں تم سے غزل سننا چاہتا تھا اس لئے اپنا استحقاق پیدا کرنے کے لئے میں نے پہل کی ---"

انکے کہنے پر میں نے اپنی غزل سنائی، اور اصرار پر دو غزلیں اور عرض کیں، فانی صاحب نے دل کھول کر داد دی، جو اُن کی عالی ظرفی کی دلیل تھی، مجھے خوب یاد ہے کہ میرے اس شعر کو انہوں نے کئی مرتبہ پڑھوایا:-

نبضِ اُمید چھوٹ گئی شاید
آج دل کیوں سکوں پہ مائل ہے

اپنی غزل سنانے کے بعد میں نے پھر کہا کہ ایک آدھ غزل اگر تکلیف نہ ہو تو اور سنائیں۔ اُنہوں نے اپنے کرم سے پھر ایک غزل سنائی۔ فانی کا ترنم بہت ہی سادہ اور دلآویز تھا۔ آواز میں بلا کا اثر تھا۔ وہ پڑھ کیا تھے سچ مچ دل میں چٹکیاں لیتے تھے، انکا ترنم انکی زندگی کی طرح درد انگیز اور اُن کی شاعری کی طرح پُرسوز تھا۔

ذرا سی دیر کی ملاقات میں فانی مجھ سے بے تکلف ہو گئے، نظامیہ ہوٹل سے ہم دونوں ٹہلتے ہوئے دار الترجمہ پہونچے، اُس وقت دار الترجمہ نامپلی اسٹیشن کے محاذی چمن کے سامنے کی دو منزلہ عمارت میں تھا، جس میں آجکل رائل ہوٹل ہے۔ فانی صاحب یہاں جوش ملیح آبادی سے ملنے کے لئے آئے تھے، جو اُس وقت دار الترجمہ کے ناظرِ ادبی تھے جوش، فانی کو دیکھ کر لپٹ گئے، طرفین نے ایک دوسرے کی مزاج پرسی کی، جوش صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ فانی نظامیہ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں، تو بولے:-

"فانی! میرے ہوتے ہوئے تم نظامیہ ہوٹل میں ٹھہرے!"

اور بہت کچھ شکوہ کیا۔ شام کے تین بجے تک [illegible]

[illegible] صاحب کے پاس رہے۔ کئی گھنٹے شعر، شاعری رہی، پھر بکثرت بہت پر لطف باتیں، قہقہوں سے دار الترجمہ کا کمرہ گونج گیا ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس کمرے کے بیٹھنے والوں کو دُنیا کا کوئی غم ہی نہیں ہے۔ شام کو فانی اور ہم نظامیہ ہوٹل واپس آتے، اور میں اُن سے رخصت ہو کر مکان چلا آیا۔ چند گھنٹے کی ملاقات میں فانی سے میں بہت قریب ہو گیا، بہت پرانے دوست کی طرح! ان کی عظمت، کمال، کبر و نخوت کی آلودگی سے پاک تھی۔

حیدرآباد میں مستقل قیام

جوش ملیح آبادی کے شدید اصرار پر فانی چند دن کے لئے جوش صاحب کے یہاں ہوٹل سے اُٹھ کر آگئے۔ اسکے بعد "صلح سرائے" میں چلے آئے اور تقریباً ڈھائی مہینے وہیں بالائی منزل کا ایک کمرہ کرایہ پر لیکر رہے۔ فانی کے آنے کی شہر میں خبر پھیلی تو آنے جانے والوں کا ایک تانتا بندھ گیا، وہ تمام لوگوں سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے تھے۔ اگرچہ بعض لوگوں کا ناوقت آنا، اُنکے اوقات میں خلل انداز ہوتا تھا۔ صلح سرائے کی صحبتیں بڑی پُر لطف تھیں، جوش ملیح آبادی، حکیم آزاد انصاری، ابرار حسین اثر، احمد عارف اڈیٹر صبح دکن، اور حیرت بدایونی اس بزم کی رُوحِ رواں تھے۔ جہاں اتنے بہت سے شاعر جمع ہو جائیں اس بزم کی رونق اور ہنگامہ آرائی کا کیا پوچھنا!

مہاراجہ کشن پرشاد بہادر نے حضرت فانی کو ایک مرتبہ دکن سے واپس نہ ہونے دیا، اُن کے مصارف کے لحاظ سے تنخواہ مقرر کی گئی۔ اور بہت زمانے تک مہاراجہ بہادر اپنی جیب خاص سے ماہوار عنایت کرتے رہے، صلح سرائے سے فانی، محکمہ آرائش کی تعمیر کردہ بستی ملے پلی جدید میں چلے آئے، اور مرتے دم تک اُسی مکان میں رہے۔ حیدرآباد میں تین مرتبہ اُنہوں نے نقل مکان کیا، مگر ہر مرتبہ اپنی مرضی سے! چوتھی مرتبہ موت نے اُن کو گھر سے بے گھر کیا، اور اب ....
آہ....! ؎

کہاں جاتے ہو یہ ہے قبرِ فانی دیکھتے جاؤ
تم اپنے مرنیوالے کی نشانی دیکھتے جاؤ

سرکاری ملازمت

مہاراجہ کشن پرشاد بہادر، فانی کی بیحد قدر کرتے تھے۔ فانی نے کئی مرتبہ حیدرآباد سے آگرے واپس جانا چاہا، مگر مہاراجہ بہادر کی محبت اور تواضع نے اُن کے پائے عزم میں زنجیریں ڈال دیں۔ بہت سے سرکاری محکموں میں فانی کے لئے کوشش کی گئی [illegible] فوقانیہ دار الشفا[1] کی صدر مدرسی پر اُن کا تقرر ہوگیا۔ سرکاری [illegible] میں منسلک ہوتے وقت فانی کی عمر پچپن سال کے قریب تھی [illegible] میں ملازمین کو وظیفہ پر سبکدوش کیا جاتا ہے، اور فانی اس [illegible] دائرۂ ملازمت میں شامل ہوئے۔ یہاں بھی فانی کی انفرادی عظمت باقی تھی، دوسروں کی انتہا فانی کی ابتدا تھی۔

ہاں! یہ تو بھول ہی گیا کہ حیدرآباد کے قانونِ ملازمت کی رُو سے فانی غیر ملکی تھے اس لئے مہاراجہ بہادر کے معروضہ پر فرمانِ شاہی کے ذریعے اُن کو قیدِ ملکی سے مستثنیٰ کیا گیا ؎

فانی دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دُور

قیدِ ملکی سے مستثنیٰ ہونے کے بعد عمر کا مسئلہ پیش ہوا۔ مجھے ٹھیک طور تو یاد نہیں رہی ان کی مدت ملازمت میں غالباً پانچ یا چھ سال کی توسیع کی گئی، دار الشفا ہائی اسکول میں وہ میٹرک کی جماعت کو اُردو پڑھاتے تھے، باقی وقت اسکول کی نگرانی میں صرف ہوتا تھا۔

دُنیا سے فانی کی یہ قدرے مطمئن زندگی نہ دیکھی گئی، بلدۂ حیدرآباد سے اُن کا اضلاع میں کسی جگہ تبادلہ کیا گیا۔ اور اسی نقطہ سے فانی کی تباہ حالی شروع ہوگئی، محکمہ کے اس طرزِ عمل نے فانی کو بہت دُکھ پہونچایا یہاں تک کہ اُن کو ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا۔ فانی اب خانہ نشین ہوگئے، مہاراجہ بہادر نے صدارتِ عظمیٰ سے علیحدہ ہونے کے بعد کے حالات کے تحت، امداد سے ہاتھ کھینچ لیا۔ فانی کے لئے بڑی مشکلات کا سامنا تھا، وہ اپنا دردِ دل کسی سے کہتے نہ تھے، انتہائی پریشانی اور تنگدستی کی حالت میں بھی خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے اور پہلے کی طرح بدستور مُسکراتے اور ہنستے، لوگ اُن کی یہ حالت دیکھکر سمجھتے تھے کہ وہ مطمئن اور خوشحال ہیں، فانی نے اپنے بہت سے دوستوں تک کو یہ بات معلوم نہ ہونے دی کہ فانی کے قہقہوں کا پس منظر گریہ و ماتم ہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کی موت نے رہے سہے سہارے کو بھی ختم کر دیا [illegible] فانی کے لئے یہ دور انتہائی پریشان کن دور تھا، ان کا بال بال قرضہ میں ڈوب چکا تھا، آئے دن کی بیماری، قرضہ کی زیادتی، بڑھاپا، زندگی کی پردیس اور بیکسی کے عالم میں موت، ذوجوان بیٹے کی [illegible] اور کفالت، فانی رج رج۔ کفن خاکستر، اور [illegible] بن کر رہ گئے تھے، اُنہوں نے دُعا بھی تو کی تھی۔

---

[1] ہائی اسکول۔

اپنے دیوانہ پر اتمامِ کرم کر یارب
درو دیوار دیے ہیں انہیں ویرانی دے

فطرتِ آزاد

فانی نے ناز و نعم میں پرورش پائی تھی، انکا بچپن اور جوانی کا ابتدائی حصہ بے فکری اور خوشحالی میں گذرا تھا جس کا اثر آخر تک باقی رہا۔ پیسہ اُن کے ہاتھ میں رکتا نہ تھا۔ "فکر فردا" کی اصطلاح سے اُن کی کتاب زندگی یکسر خالی تھی۔ کفایت شعاری اور میانہ روی سے اُن کی فطرت کو بیر تھا، روپیہ آتا تو دل کھول کے خرچ کرتے، اس معاملے میں وہ مآل اندیش نہ تھے۔ دار الشفاء ہائی اسکول سے ان کا مکان تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھا۔ دوپہر کے وقفہ میں اپنی موٹر میں بیٹھکر کھانا کھانے کے لئے مکان جاتے اور گھنٹہ سوا گھنٹہ میں کھانا کھا کر اسکول واپس آتے۔ بہت سی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ وہ شام کو اپنی موٹر میں میرے گھر پر آگئے اور مجھے لیکر شہر سے باہر دس پندرہ میل نکل گئے، میں کبھی دبی زبان سے ٹوکتا تو برا مانتے۔ شاہزادہ والاشان نواب معظم جاہ بہادر کے یہاں سے فانی کے لینے کو موٹر آتی، مگر وہ ہمیشہ اپنی موٹر میں ہی شاہزادہ والاشان کے یہاں جاتے۔ بات یہ تھی کہ بعض وقت وہی موٹر جو فانی کو لینے کیلئے آتی تھی دوسروں کے یہاں بھی جاتی تھی، اور فانی کی فطرتِ آزاد کو یہ پابندی گوارا نہ تھی۔ جے پور کے آل انڈیا مشاعرے میں تمام شعراء "یادگار" میں ٹھہرے اور فانی نے ہوٹل میں قیام کیا۔ وہ دعوتوں سے خوش نہ ہوتے تھے۔ کہتے تھے میں اپنی طبیعت کے موافق کھانا کھانے کا عادی ہوں، دعوتوں میں بھوکا رہجاتا ہوں، میرا پیٹ نہیں بھرتا۔

اپنے اوقات کے شدت سے پابند تھے، اسکول میں وقت پر آتے اور وقت پر جاتے، فرض کا احساس اُن میں پایا جاتا تھا، طبیعت میں استغنا بے حد تھا۔ اپنی تعریف اور شہرت سے کون خوش نہیں ہوتا مگر فانی پروپگنڈے کی شہرت سے بالطبع متنفر تھے، پروپگنڈے کا فن اُن کو آتا ہی نہ تھا۔ دونوں وقت چائے پینے کے شدت سے عادی تھے۔ میں نے ایک دفعہ پوچھا کہ چائے کے اتنے عادی آپ کیوں ہیں، تو بولے۔ "چائے تو میری گھٹی میں پڑی ہے"۔

فانی کا رنگِ طبیعت

اُن کی طبیعت کا میلان "عقیدۂ جبر" کی طرف تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، ٹھیک ہو رہا ہے، آدمی بالکل پابند اور مجبور ہے، اپنی مرضی سے وہ تنکا بھی نہیں توڑ سکتا۔ میں نے ایک دفعہ فانی سے کہا آپ نے اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ نہیں کی۔

اس پر بولے "ماہر! تمہیں وہ واقعہ یاد نہیں ہے جبکہ منصور حلاج پر لوگ پتھر پھینک رہے تھے اور منصور مسکرا رہا تھا، لوگوں کی دیکھی حضرت جنید نے ایک پھول منصور کی طرف پھینک دیا، منصور نے اس پر آہ کی، لوگوں نے پوچھا یہ کیا کہ پتھروں کی چوٹ پر مسکراتے ہو اور ذرا سے پھول کے لگنے پر آہ نکل گئی، منصور نے کہا کہ پتھر مارنے والے حقیقت سے بے خبر ہیں، جنید تو سب کچھ جانتے ہیں انہیں ایسا نہ کرنا تھا۔

تو ماہر! تم سب کچھ جانتے ہوئے ایسی بات کہتے ہو!"

میں نے محسوس کیا کہ فانی نے یہ الفاظ انتہائی تاثر کے ساتھ کہے، اُس دن سے اس قسم کی باتوں پر میں نے انہیں ٹوکنا چھوڑ دیا۔

نحس و سعد کی طرف بھی اُن کی طبیعت کا میلان تھا، نواب نثار یار جنگ بہادر مزاج وظیفہ یاب، دل تعلقدار ریٹائرڈ (پولیس) نے ایک مکان کرایہ پر لیا۔ اتفاق کی بات کہ اس نئے مکان میں آکر اُن کے گھر کے کئی آدمی بیمار پڑ گئے، فانی صاحب کا اصرار تھا کہ مکان فوراً بدل دیا جائے، مکان کا رُخ منحوس ہے اور اس رُخ کے مکان میں کوئی آدمی سکھی اور مطمئن نہیں رہ سکتا۔

یاس اور غم اُن کی فطرت میں گھل مل گئے تھے، اُن کی نظر ہر مسئلہ کے تاریک پہلو پر پڑتی تھی، اُن کی طبیعت خوشی میں غم اور نغمہ میں فریاد ڈھونڈتی تھی، طبیعت فلسفیانہ اور نکتہ رس پائی تھی، بات میں بات پیدا کرتے، گفتگو ذرا مفصل کرنے کے عادی تھے، کسی واقعہ کا ذکر چھیڑتے تو تمام جزئیات بیان کرکے دم لیتے۔ فانی کی باتیں بہت دلچسپ ہوتی تھیں، سننے والا اکتاتا نہ تھا۔

اُن کی مسکراہٹ دلکش اور بعض وقت معنی خیز ہوتی تھی، ہونٹوں کے ساتھ آنکھوں کو بھی جنبش دیتے تھے، میں اُنکی مسکراہٹ کو تھوڑا بہت سمجھنے لگا تھا۔ طبیعت میں مزاح اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، مگر ظرافت میں سنجیدگی اور متانت کا عنصر شامل تھا۔

درباروں میں

امیروں کے دربار میں آداب کا پورا لحاظ رکھتے، طبیعت کے استغناء کے باوجود نہایت مزاج آشنا اور ادا شناس تھے۔ خاص محفلوں میں مجھے برابر ٹوکتے رہتے کہ آداب کا خیال رکھو، بے تکلفی نہ برتو! ایک مرتبہ دوست میں فانی نے کرسی پر بیٹھ کر بتایا کہ "ماہر اس انداز میں بیٹھنا ... کو چوپال سمجھ کر!"

میں نے کہا "فانی صاحب! ابھی شروع ... شروع ..."

بیٹھا ہوں اور خیال رہتا ہے کہ میں بڑے آدمی کی محفل میں ہوں، لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس بات کا دھیان نہیں رہتا۔ میں کیا کروں، اپنی [illegible] سے مجبور ہوں، آپ مجھے بدتمیز کہہ سکتے ہیں۔"

اس پر فانی مسکرا کر بولے "بھئی! تمہارا نازِ معشوقانہ ہر جگہ

[illegible]

فانی کی مشقِ سخن پچاس سال سے کم نہ تھی، مگر اُن کے تمام اشعار کا مجموعہ میں سمجھتا ہوں چار ہزار شعروں سے زیادہ نہیں ہے۔ فانی شعر بہت سوچ سوچ کر کہتے تھے، جلد شعر کہنے کے عادی نہ تھے، آج ایک شعر کہہ لیا، کل دوسرا، تین دن تک کوئی شعر ہی نہیں ہوا۔ اس طرح ایک غزل کئی دن میں مکمل ہوتی تھی۔ آتش لکھنوی کی غزل پر (دل سوا شیشہ سے نازک، دل سے نازک خوئے دوست) غزل کہنی شروع کی، مجھے خوب یاد ہے کہ ایک ہفتہ میں یہ غزل مکمل ہوئی، اس غزل کا مطلع تھا۔

پھر فریبِ سادگی ہے رہنمائے کوئے دوست
مٹنے والی آرزوئیں لے چلیں پھر سوئے دوست

میں اُن کی بزم میں بہت بے تکلف تھا، میں نے ٹوکا اس شعر پر۔

گرا کے قطرۂ شبنم گلوں کے دامن پر
تجلیات کے دریا بہا دئے تو نے

اعتراض کیا کہ "گلوں کے دامنوں" ہونا چاہیئے، یا پھر "دامنِ گل" بنا دیجئے، تو خاموش ہو گئے، نہ تو بُرا مانا اور نہ کوئی جواب دیا۔

اسی طرح اُن کے اس شعر پر۔

اک عالمِ دل ہے، وہی دُنیا وہی فردوس
ہر شے نظر آتی ہے، نظر آئی ہوئی سی

میں نے کہا کہ میں تو پہلا مصرع اس طرح پڑھتا ہوں۔

اک عالمِ دل ہے، وہی دُنیا وہی عقبیٰ

اس پر فانی نے کہا: "میں نے اس شعر میں اس حدیث شریف کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں وارد ہے کہ اہلِ فردوس اور جنتی، خلد و فردوس کی نعمتوں کو دیکھ کر کہیں گے کہ یہ چیزیں تو ہمیں دُنیا میں نظر آ چکی ہیں۔"

فانی کی اس توجیہ پر میں خاموش ہو گیا۔

فانی غزل کے پرزور حامی تھے، بے راہ روی اور مغرب زدہ شاعری کے وہ سخت مخالف تھے۔ ترقی یافتہ شاعری (جس میں قافیہ اور ردیف تو درکنار بحر کی بھی سرے سے پابندی نہیں ہوتی) سے اُن کو نفرت تھی۔ لاہور کے ایک مشہور بہت کا ذکر آیا تو کہنے لگے "میں نے تو ایک دفعہ دیکھ کر اُسے دیکھنا ہی چھوڑ دیا۔"

آخری منزل

فانی کی بیماری کے زمانہ میں بار بار اُن کے یہاں آنا جانا رہا۔ پلنگ پر لیٹے ہی لیٹے گفتگو کرتے تھے، بہت نحیف اور کمزور ہو گئے تھے، مگر باتوں میں اگلی سی گرمی اور طبیعت میں وہی شوخی اور نکتہ رسی تھی۔ ایک دن بولے۔

"میں دسمبر اور جنوری میں ٹھنڈے پانی سے نہا کر ململ کا کرتہ پہنے ہوئے چہل قدمی کیا کرتا تھا۔ آج میں بالکل بدل گیا ہوں۔ چلنے پھرنے، کھانے پینے، مسکرانے اور خوش رہنے، غرض ایک ایک چیز کا گن گن کر حساب لیا جا رہا ہے!"

ایک دن کراہتے ہوئے فرمایا۔

"ماہر! میں بدایوں جا کر مرنا چاہتا ہوں، یہاں مرنا نہیں چاہتا۔"

پھر تھوڑی دیر سوچ کر بولے۔

"لیکن میری یہ تمنا پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔"

چنانچہ یہی ہوا۔ اقلیمِ تغزل کا تاجدار فانی دکن ہی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔

موت وہ دن بھی دکھائے مجھے جس دن فانی
زندگی اپنی جفاؤں پہ پشیماں ہو جائے

فانی کی موت پر قدر ناشناس دُنیا کو پشیمان ہونا چاہیئے۔ مگر دنیا کا ضمیر سخت ہو گیا ہے، احساسِ پشیمانی کی قابلیت بھی باقی نہیں رہی۔

میں غزل کو اُردو شاعری کا "نصف بہتر" کہتا ہوں۔ غزل اُردو شاعری میں ہمیشہ باقی رہے گی۔ غزل کے ساتھ فانی کا نام بھی زندہ رہے گا۔ فانی زندگی ہی میں بقائے دوام حاصل کر چکا تھا۔ ان کی شہرت غیر فانی ہے۔ فانی کی شاعری میر اور غالب کے افکار کا سنگم ہے۔ توقع نہیں یقین ہے کہ اُردو ادب کے جسم میں یہ سنگم رگِ جاں بن کر رہے گا۔ رحمتِ الٰہی کا نزول ہو اس کی قبر پر جو شعر و ادب خانۂ [illegible] بن کر پکار اُٹھا۔

تو کہاں ہے کہ تری راہ میں یہ کعبہ و دیر
نقش بن جاتے ہیں منزل نہیں ہونے پاتے

ماہر القادری

دہلی کی گلیاں

دہلی کی گلیاں، ہر نئے آدمی اور اجنبی سے پکار پکار کر کہتی ہیں، ہم نے مغلیہ خاندان کی سلطنت کا عروج و زوال دیکھا ہے، شاہی کروفر کے نظارے دیکھے ہیں، ہاتھی، گھوڑے، پالکی، خاصہ بردار۔ اب بھی آس شان و شوکت کے کھنڈر کہیں کہیں سفید پوش بوڑھے گردن ہلاتے شاہزادہ میں دکھائی پڑتے ہیں۔ جن کے جسم شاہی زمانے کی یاد میں اتنے نازک پڑ گئے ہیں کہ وہ اپنے ماہواری وظیفے پر بسر اوقات کرنا ہی غنیمت سمجھتے ہیں۔ اور اُن کے بچے، وہ کیا کریں گے انہیں معلوم نہیں۔ وہی پیٹ کا دھندا کھانا، شام ریاضت، اور پھر پیٹ کے دوزخ کو جوں توں بھر کر کسی [illegible] کوٹھری میں پڑ رہنا۔

لال قلعہ، شاہجہاں، سب قصۂ ماضی۔ ایک ایسے ماضی میں ڈوب گئے ہیں جس کی تہ حدِ انداز سے بھی زیادہ گہری ہے، لیکن پھر بھی انسان اس کھوئے ہوئے زمانے کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ماضی کو اُبھارنے کی جستجو، مبہم بالکل فضول خیال۔ تم کہتے ہو کہ دہلی کی گلیوں کی ہر ایک سِل کو اکھاڑتے وقت ماضی کے انسانوں کی روح کی آواز آہ کی شکل میں تبدیل ہو کر سنائی دیتی ہے۔ بالکل غلط۔ دہلی کی ہر گلی میں، سطح سڑک کے نیچے بڑی بڑی بدرو نالیاں ہیں جن میں ساری شہر کی غلاظت بہہ کر نیچے چلی جاتی ہے۔ اور پانی کے نلکے، جن کا پانی دہلی والوں کو بہت مرغوب ہے۔

دہلی کی گلیوں کی ہر فرسودہ دیوار سے شہنشاہی آنسو نکلتے ہیں؟ بالکل حقیقت سے بعید۔ آج اُن دیواروں پر سینما کے لمبے لمبے چوڑے چوڑے اشتہار چپتے ہیں۔ اور پوشیدہ بیماریوں کی دوائیوں کے فحش اشتہارات۔ دونوں مردانہ و زنانہ پوشیدہ بیماریوں کے علاج کے بارے میں لمبے چوڑے رنگین مقطعے اُردو یا ہندی زبان میں چھپے ہوئے اشتہار، ایسے ایسے کونوں پر چسپاں کئے جاتے ہیں، جہاں ہر ایک خواندہ انسان کی نظر خواہ مخواہ اُن پر پڑے۔ اگر موجودہ انسانیت کے دور میں کوئی بدترین لعنت ہے تو یہ دوائیوں کے فحش اشتہارات۔ ان کے خلاف احتجاج کیا جاتا ہے، دیواروں پر بورڈ لگائے جاتے ہیں: اشتہار لگانا منع ہے۔ خلاف ورزی کرنے والوں کو [illegible] "لیکن

جہاں جہاں بھی ایسی تختیاں لگائی جاتی ہیں، وہیں دیواروں کو رنگ برنگے اشتہارات سے اہتمام کے ساتھ سجایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ دیواروں پر ان اشتہاروں کی چھ چھ انچ تہ جم جاتی ہے۔ جس کو شہر پرچے کبھی بانس یا کھپچی سے کرید کرید کر اکھاڑ لے جاتے ہیں، اور یا مالک مکان کو سفیدی کرواتے وقت عجیب عجیب مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ سفیدی بھی صرف چند روزہ ہوتی ہے۔ اور اشتہار چپکانے کے لئے ایک بہترین سطح (گراؤنڈ) تیار کر دیتی ہے۔

دہلی کی گلیوں میں، پنساری خاموشی کے ساتھ بیٹھے رہتے ہیں سر پر ہاتھ دھرے ہوئے، تم اُن کی دکانوں میں سگرٹ، ماچس، چاول آٹا دال تو ضرور پاؤ گے۔ لیکن جو چیز سب سے نمایاں تم کو وہاں نظر آئیگی وہ ہے بناسپتی آئل کے مختلف برانڈوں کے خوبصورت کنستر — بادی النظر میں خوبصورت، لیکن وہ تمہارے جگر کو گھلا گھلا کر راکھ کر دیتے ہیں۔ دہلی میں اچھا گھی نہیں ملتا۔ گھی کا کچھ صحیح اندازہ نہیں رہا ضرورت بھی کیا ہے کہ تم اپنے نونہالوں کو اصلی گھی کھِلا کھِلا کر موٹا تازہ کر دو، اُن کے دماغ کو ترقی دو، مدبر بناؤ، سیاست دانی کی تربیت دو۔ ارے بناسپتی کھاؤ۔ اس میں وٹامن سی وٹامن ڈی سب موجود ہیں۔ یہ تمہارے دل و دماغ دونوں کو ترقی دیگا۔ روز اس بیسویں صدی کے نئے گھی کے بارے میں اشتہارات نکلتے ہیں۔ فلاں ڈاکٹر نے اس کی خوبیوں کا یوں ذکر کیا ہے۔ فلاں ریاست کے دیوان نے یوں تعریف کی ہے۔ اور دہلی کا ہر ایک باشندہ بناسپتی گھی کھا کر جی رہا ہے۔ خبر نہیں کیوں۔ اور پھر لوگ کہتے ہیں کہ قطعی گھی نہ کھاؤ محض سوکھی روٹیاں، بالکل سوکھی، پھر آپ جئیں کیسے۔ دفتر میں بارہ نہیں کبھی کبھی پندرہ سولہ گھنٹے متواتر اپنے قلم کو کیسے چلائیں۔ اپنے لاغر جسم کو جو صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا ہے کس طرح ان گلیوں میں چلتے پھرتے سنبھالتے پھریں۔ تمہارے بچے کس طرح تعلیم حاصل کریں، اور صبح سویرے مکلف بگھیوں، موٹر بسوں، رکشاؤں، پالکیوں میں اُجلے اُجلے لباس پہنے لڑکیوں کو سکول جاتے ہوئے دیکھیں۔ جو شاید تمہارے [illegible] کے میلے نیکروں کو دیکھ کر آپس میں کانا پھوسی شروع کر دیتی ہیں [illegible] دہلی کے بہادر تو عمر طالب علم بانا کے ربڑ کے جوتے پہن کر [illegible]

[illegible] سنبھلے، بے دھڑک اس گلیوں میں سے گذر جاتے ہیں۔ سینما کو اشتہارات کو دیکھتے اور لڑکیوں کو منہ چڑاتے ہوئے۔

دہلی کی گلیاں۔ دن کے بارہ گھنٹے زندگی کا مرکز بنی رہتی ہیں۔ [illegible] چھ بجے سے جو پانچ چھ سال کے لڑکے لڑکیوں سے لیکر [illegible] نوجوان اور دوشیزاؤں کا تانتا لگتا ہے تو سات بجے [illegible] میں نہیں آتا۔ دہلی کے نوعمر طالب علم نیکر اور قمیص پر اکتفا کرتے ہیں۔ کالج کے زنگروٹ سوٹ اور نکٹائی کو بے دھڑک استعمال کرتے ہیں۔ اور دہلی کی سکول میں تعلیم پانے والی لڑکیاں، انہوں نے ساری، آنکھوں پر نازک چشمہ، سینڈل یا چپلوں کو اپنا مخصوص لباس بنا رکھا ہے۔ ان کی ساری کا رنگ سب سے اجلا یعنی سفید۔ سفید رنگ دہلی کی طالبات کو بہت پسند ہے جو دہلی کی گلیوں کے میلے پن کو کاٹتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اور دکانوں پر بیٹھے ہوئے دقیانوسی خیالات کے لالہ للچائی ہوئی نظروں سے ان سادگی پسند لڑکیوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ نہ معلوم دہلی کی طالبات اتنی بھولی کیوں ہیں وہ کیوں نہیں لاہور کی طالبات سے ٹکر لیتیں۔ نت نئے فیشن، دن میں چار بار ساڑھی بدلنا، شام کو لارنس گارڈن کی سیر کو جانا، سینما دیکھنا، طالب علموں سے ملنا، بحث مباحثے میں شرکت کرنا۔ دہلی کی لڑکیاں سینما دیکھتی ضرور ہیں مگر [illegible] کے ساتھ کناٹ سرکس کی سیر کو جاتی ہیں ضرور۔ لیکن ماں بہن کے ساتھ۔ تو پھر کناٹ پلیس پر بھی آپ تنہا لڑکیوں کو کیوں گھومتے پھرتے دیکھتے ہیں۔ جی بجا۔ بالکل بجا۔ لیکن وہ دہلی کی لڑکیاں تھوڑا ہی ہیں۔ یہ ہیں باہر سے آکر بس جانے والی موٹی موٹی تنخواہ پانے والے سرکاری دفتروں کے افسروں کی، انشورنس کمپنیوں کے منیجروں کی لڑکیاں، بمبئی کی طرف کی پارسنیں اور بنگالی دوشیزائیں۔ دہلی کی لڑکی آزادی کا سانس لینا چاہتی ہے لیکن اسے جھجک ہے۔ شاید ابھی ان کے گھروں میں پرانے توہمات اور خیالات کی سلطنت ہے۔ وہ اپنی ماں سے برتری کا دعویٰ کرتی ضرور ہے مگر پھر بھی اس کی ہمت نہیں پڑتی کہ وہ کلب میں جائے، بیڈمنٹن کھیلے، اگر بہت ہمت کرتی ہے تو دہلی کی لڑکی اپنی ماں کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر کسی شادی شدہ عورت کے ساتھ کبھی کبھی دہلی کے کپڑے کے کنٹرولوں میں جو کہ تنگ و تاریک گلیوں میں بسے ہوتے ہیں، کپڑا خریدنے چلی جاتی ہیں۔ یا شاذ و نادر گلی، محلے کی سہیلیوں سے اکیلے [illegible] ملاقات کر آتی ہیں، اور بس۔ لیکن گلی پار بازار میں اکیلے قدم رکھنا انہیں نہایت دشوار مرحلہ دکھائی پڑتا ہے۔ کیا ان کی مائیں سر پر ڈنڈا لئے کھڑی رہتی ہے۔ یا انکے بھائی تاکید کرنے کے لئے موجود

ہیں۔ لیکن پھر بھی دہلی کی لڑکیاں کچھ گھر کی [illegible] رکھتی ہیں۔ [illegible]
یہ مدت سے دہلی کی ان گھٹی گھٹی تنگ و تاریک، روشنی سے خالی [illegible]
گلیوں میں رہنے کا اثر ہے۔ یا پھر ان کا ماحول [illegible] کہ باہر [illegible]
کھلا ماحول بالکل پسند نہیں آتا ہے۔ جی نہیں۔ دہلی کی لڑکیاں با[illegible]
جانا پسند کرتی ہیں، خرید و فروخت کی شائق ہیں۔ لیکن اصلی گلی [illegible]
محلے اور بازار کے کنارے سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ یہ جھجک دہلی کی
لڑکیوں کی خصوصیت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نہ دہلی کے نوجوانوں کو بازاروں، پارکوں [illegible]
سینماؤں اور ریسٹورانوں سے زیادہ دہلی کی گلیاں پسند ہیں۔ لہذا
شام کے وقت دہلی کی زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے نوجوان [illegible]
کاروباری، کالج اور سکول کے طالب علم، گلی کی دکانوں پر گروہ [illegible]
گروہ میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اور ہر گذرتی ہوئی لڑکی پر دل کھول کر [illegible]
تبصرہ کرتے ہیں۔ لیکن دہلی کے نوجوانوں کی بھی ایک خصوصیت
ہے۔ یعنی وہی جھجک۔ ان میں شلوار میں اٹک جانے والی چپلوں کی [illegible]
پر کھلنے کی جرات نہیں۔ وہ حسن کے خاموش نقاد ہیں، اور بس۔
وہ انگریز کے مقولے "Beauty is to see, not to touch." پر
عمل پیرا رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے نوجوان صحت مند نہیں۔ اور [illegible]
ان کے جسم میں لکھنوی نزاکت آگئی ہے۔ ان کے دانت گلی کے نہاری [illegible]
کے پان کھانے اور سوڈا لیمنڈ کے پینے سے خراب ہو گئے ہیں بلکہ [illegible]
گھسنا سڑنا شروع کر دیا ہے۔ ان کی کلائیاں عورتوں کی کلائیوں سے [illegible]
بھی نازک ہیں۔ مگر نہ معلوم دہلی کے لوگوں کو کرشن چند [illegible]
دلیس ہے دلی ہے کے خیال کے مطابق کیوں گھر سے اور گھر کے [illegible]
گلیوں سے اتنی زبردست انسیت ہے۔ باہر کے لوگ ہوٹلوں، پارکوں [illegible]
کلبوں، سینما ہال میں رومانس کی تلاش میں بھٹکتے ہیں لیکن دہلی کے
نوجوان گلیوں میں رومانس کا کھوج نکالتے ہیں۔ وہ تاڑتے سو [illegible]
ہیں۔ لیکن رومانیت دہلی کی گلیوں میں پل نہیں پاتا۔ یہ صرف [illegible]
دفعہ تاکا جھانکی پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ دہلی کے نوجوان خاندانی [illegible]
کا لحاظ رکھتے ہوئے اس معاملے میں بہت خشک واقع ہوتے ہیں۔
اور لڑکیاں وہ اپنی ماؤں اور ان کی سہیلیوں کے درمیان [illegible]
خودکشیوں، اغوا کے واقعات سن کر کان میں انگلی دیتی ہیں۔ دہلی کی
گلیوں کو ہم ایک ایسی سرزمین نہیں کہہ سکتے جہاں [illegible]
کی نشو و نما ہو سکے۔ صرف ایک نظر دیکھ لینے کا طریقہ [illegible]
خصوصیت ہے۔ یا اگر یہ محبت زیادہ ترقی یافتہ ہو [illegible]

ہر ایک گلیوں میں کسی فرسودہ بیٹھک میں اٹھا جا کر دوستوں کے مابین دلی کی کسی لڑکی کے بارے میں زبردست تنقید و تبصرے کئے جاتے ہیں لیکن ایک ایسی دبی آواز میں جس کو گھر کا کوئی بزرگ، اور باہر کا کوئی راہگیر نہ سن سکے۔

دلی کی گلیوں میں گھر بیٹھے ہی کھانے پینے کی سب چیزیں مہیا ہو جاتی ہیں اس لئے خریداری کے لئے عورتیں اپنے خاوندوں سے خواہ مخواہ نہیں لڑتیں۔ علی الصباح گرم گرم چنے بیچنے والے بھڑبوجے سے مٹھائی کے خوانچے والے تک، سب ہی گلیوں کا چکر لگاتے رہتے ہیں اور ایک نئے انداز او موسیقی نواز آواز سے اپنی اشیاء خوردنی کو مشتہر کرتے ہیں۔ دہلی کے لوگوں اسلئے عورتوں کو خوانچہ والوں کی آواز بہت پیاری لگتی ہے۔ جوانِ گھٹی گھٹی گلیوں میں گونج کر موسیقی ہال کے مغنّی کے پُرسوز راگ سے ٹکر لینا شروع کر دیتی ہے۔ گھر کی عورتیں اور بچے دروازوں پر اپنا خوانچہ والوں کو پکار کر بٹھا لیتی ہیں۔ اور حسب منشا خرید لیتی ہیں۔ صبح سویرے حلوا پوری، دوپہر کو آئسکریم و قلفی کی برف، دوپہر ڈھلے دہی بتاشے والے اور کچی سبزی ترکاری فروخت کرنے والے آن موجود ہوتے ہیں۔ اسلئے دہلی کے شادی شدہ انسان خیر مناتے ہیں، چلو ان کی بیویاں باہر کسی کیفے، ریستوران، حلوائی کی دکان کو دیکھکر ایک دم نہیں مچل اٹھینگی۔

دہلی کی گلیوں میں موسیقی ہے۔ ترنم ہے۔ نغمہ ہے۔ آپ کہینگے ان ردی سوکھی سڑی لمبی گلیوں میں؟ جی انہی میں۔ دہلی کی لڑکی اکثر و بیشتر گھر میں رہنا پسند کرتی ہے۔ پھر آپ کہیں گے اس گھرے گھرے ماحول میں موسیقی کس طرح پھوٹ پڑتی ہے۔ ہارمونیم کی مضرابوں میں، جسکو ان گلیوں میں بسنے والی دوشیزائیں اپنی نازک انگلیوں سے چھیڑتی ہیں۔ اور کلکتہ کے نیو تھیٹر سے لیکر پونہ والی پربھات اور بمبئی کے بمبئی ٹاکیز کو سارے فلمی راگ [illegible] کے بعد ایک گانا شروع کر دیتی ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہو[illegible] کی لڑکی بہت کم شاذ و نادر ہی سینما دیکھتی ہے، تو پھر سینما کے [illegible] سے دہلی کی گلیاں کیوں گونج اٹھتی ہیں۔ بالکل سیدھی بات، ریڈ[illegible] گانوں کے پروگرام، متحرک تصاویر کے گانوں کی [illegible] کتابیں، جو دہلی کے گھروں میں سکول یا کالج کے طالب علم [illegible] لیے کس آتی ہیں، ان دوشیزگانِ موسیقی نواز کے علمِ [illegible] کا معاون بن جاتی ہیں۔ گھر کی لڑکی چوکا برتن مانجھتے وقت گاتی رہتی ہے: "پھر کاہے کی لاج رہے بچپن یاد دلا دیا!" نند گاتی ہے: "میری بھابی کے نخرے بڑے"، بھابی کہتی ہے: "میری نند کے نخرے بڑے"۔ پھر دہلی کی گلیوں میں سادھو بیٹھ کر اپنے چنگ و نے، دف یا ڈھولک

سے تان میں تان ملا کر بھجن گاتے ہیں۔ بیڑی والے ہارمونیم اور ڈھولک کی مدد سے اپنی بیڑیوں کا گا گا کر advertisement کرتے ہیں۔ فقیر دروازے پر کھڑا ہو کر خاص ترنم سے گاتا ہے: "او کالی کملی والے" اور اپنے ۸ا انچی ڈنڈے کو ہلا ہلا کر، ہاتھ میں پہنے ہوئے لوہے کے کڑوں سے ٹکرا کر اگر مناسب ساز مہیا کر لیتا ہے۔ بینجو (Banjo) کو نزاکت سے سنبھالے، اور منہ میں دو چھوٹی چھوٹی کھپچیوں کے درمیان لگی ہوئی ربڑ کی سیٹی کو دبائے، بینجو والا مینہ کی خوشگوار پھوار میں گذرتا ہوا بڑے آرام سے گاتا ہے: "گھر آئے سے بدروا کارے۔ کٹ گئے ہمارے سیاں"۔ پھر بھی باہر کے لوگوں کو شکایت ہے کہ دہلی والوں کو گانے کا شوق نہیں۔

دہلی کی گلیوں کی بارہ گھنٹے روشن زندگی میں سب سے زیادہ حقارت نہیں تعفن آمیز وہ وقت ہوتا ہے، جب صبح سات بجے سے نو بجے تک، دہلی کی غلاظت نالیوں میں بہتی ہے، اور سر میدان بہتی ہے۔ شاید میونسپل کمیٹی کی مہربانی یا پھر نئی پود کی نازک مزاج اٹھلاتی ہوئی بھنگنوں کی جدت۔ اس بات سے دہلی والے نالاں ہیں۔ دہلی والے ہی نہیں باہر سے آکر دہلی میں بس جانے والا ہر ایک انسان بیزار ہے۔ مگر مجبور ہے۔ اسکی عادت پڑ گئی ہے، ان فقرہ طراز بھنگنوں کی گلی کے چوک میں اکٹھا ہو کر، اور ردی کے ٹوکروں کو سامنے رکھکر مزیدار باتیں کرتے ہوئے، سننے کی۔ ان مجلسوں میں لڑائی جھگڑے کے تذکرے سے لیکر کسی کہاری کے سالویر خاوند چھوڑنے، یا کسی دفتر کے رنگیلے بابو کے ان خوش گلو پری چہرہ چوکا برتن کرنے والی کہاریوں سے ناجائز تعلقات کے بارے تک گفتگو جاری رہتی ہے۔ ان کہاریوں کے بارے میں بیشک وہ تذکرے، جو رنگ برنگے لہنگے اور آن پر بسنتی دھوتیاں پہن کر ان گلیوں میں دن بھر ادھر اُدھر پھرتی ہے، بالکل ایک خود بخود چلنے والی مشین کی طرح۔ دن تھک جاتا ہے لیکن ان اللہ کی بندیوں کے پاؤں کا چکر نہیں تھمتا۔ یعنی دہلی کی گلیوں میں اور گلیوں کے مکانوں میں کہاریاں ہی کہاریاں ہیں۔ کیوں؟ دہلی کی نازک حال مخترماؤں کے ہاتھ چوکا برتن کرتے ہوئے گھستے ہیں۔ اور وہ کام کام کرتے بہت جلدی تھک جاتی ہیں۔ شاید شاہی محلات کی نازک مزاج، نفاست پسند بیگمات کی یاد ابھی ان دہلی کی گلیوں سے محو نہیں ہوئی ہے۔ لہٰذا دہلی کی ہر ایک گلی میں کہاروں کی بستی ہے۔ بلکہ ان کے محلات ہیں۔ ایسے محلات جن میں چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں ہوتی ہیں، اور پورے کے پورے خاندان ان کوٹھریوں میں زندگی کے دن بسر کرتے ہیں۔ اور رات ہوتے ہی ان محلا کی آبادی صحن میں اکٹھی ہو جاتی ہے۔ عورتیں ڈھولک بجا کر دل

ایک مزاج انسانوں کے کانوں کے پردے پھاڑنا شروع کر دیتی ہیں۔ اب ان کہاریوں کے گھروں میں فلمی گیت رائج ہو گئے ہیں، وہ صرف سیتلا، [illegible] ماتاؤں کی بندمنا (پرارتھنا) ہی نہیں گاتیں۔ بلکہ اب [illegible]، پریم کے پُرسوز راگ اپنی انوکھی طرز اور ڈھولک اور مجیرے [illegible] آرکسٹرا کی مدد سے خوب آنند سے گاتی ہیں۔ اور اُنکے خاوند ولوا [illegible] ہوئے میں جیتے ہوئے روپوں کی شراب پی پی کر اس صحن میں مغلظات سنانا شروع کر دیتے ہیں۔ اور طبلہ اور ڈھمرو کی تال پر اِن بمبئی کی چالیوں سے مشابہ عمارت کے صحن میں ان دوشیزہ کہاریوں کے سامنے ٹھمک ٹھمک کر ناچتے ہیں۔ لیکن ان سے یہ مطلب نہیں کہ وہ انسان نہیں ہیں۔ وہ حساس ہیں۔ یہی اُن کی زندگی ہے۔ یہی اُن کی خوشی ہے۔ دہلی کی گلیاں اُن کو سنبھالتی ہیں۔ اُن کی زندگی میں راگ نہیں ہے۔ صرف مسرت کے چند لمحے۔ خواہ اُن کو شراب نوشی سے تعبیر کیا جائے یا اِس بیہودہ ناچ گانے سے۔

دہلی کی گلیوں میں پنواڑی، تیل پھلیل والے، درزی، حلوائی سب ہی کی دکانیں ہیں۔ اور جب شام کے سائے دُور افتادہ پہاڑ کے دامن میں لمبے ہونے شروع ہو جاتے ہیں، اور رات تاریکی کی کالی چادر اوڑھ لیتی ہے، تو دہلی کی گلیوں کی ان دکانوں میں بجلی کے قمقمے چمکتے ہیں۔ دفتر کے بابو، کپڑے کی دکانوں پر کام کرنے والے منیم، انشورنس ایجنٹ، غرضکہ زندگی کے ہر ایک طبقے سے تعلق رکھنے والے انسان اِن دکانوں پر آکر جمع ہو جاتے ہیں۔ اور ہندوستان کی آزادی اور موجودہ جنگ عظیم سے لیکر دہلی کی کسی تنگ و تاریک گلی میں واقع شدہ [illegible] تک چرچا کرتے ہیں۔ لیکن اُن کے خیالات عام طور پر صرف سطحی ہوتے ہیں، محض واقعات کا بیان۔ جو موٹی موٹی سُرخیوں پر ختم ہو کر گلیوں کی فضا میں منتشر ہو جاتے ہیں۔ نہ معلوم دہلی کے لوگ ابھی تک سطح کے نیچے کیوں نہیں تلاش کرتے۔ شاید ان گلیوں نے اُنکے دماغ کے دروازے اتنے تنگ کر دئے ہیں کہ وہ جلدی کسی نئی چیز کو قبول نہیں کرتے۔ کسی بات کی گہرائی تک پہونچنا اِن دکانوں پر بیٹھنے والوں کے لئے ایک نہایت دشوار ترین مرحلہ ہے۔ اُنہیں کیا مطلب کہ دُنیا کس رَو میں بہی جا رہی ہے۔ اُنہیں تو صرف پنواڑی کے پان، حلوائی کی گلاب جامن، اور اُن دکانوں کے آگے بچھی ہوئی کرسیوں یا بنچوں پر بیٹھکر اپنے خورد سالہ بچوں سے پیار کی باتیں کرنی آتی ہیں۔ بچے اُن کی گودیوں میں مچل رہا ہے اور وہ اُسے چمکارے جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دہلی کی عورتیں سرِ شام ہی سو جاتی ہیں، اور اُن کے خاوند بچوں کو لاکر اُن کے پاس سُلا دیتے ہیں۔ لیکن دہلی کی گلیوں نے [illegible] کنوئیں سے باہر نکلنے کا سبق ہی کب دیا ہے۔ سیاست کا [illegible] لیکن دہلی کے ان بیکار باتوں میں حصہ لینے والے انسانوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اور وہی پُرانی تہذیب کا راگ الاپا جاتا ہے بے وقت راگ۔ یہی وجہ ہے کہ ادھیڑ عمر انسان بلا تامل آجکل کے نوجوانوں، خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقے پر دل کھول کر تنقیدیں کرتے ہیں۔ دہلی کا نوجوان اِن باتوں کو سُن سُن کر اِن گھٹی گھٹی گلیوں سے دُور بھاگنا چاہتا ہے۔ پُرانے آداب، کورنش بجاتے بجاتے وہ تنگ آگیا ہے۔ اُسے اپنے آباؤ اجداد کی عزت کا خیال ضرور ہے، مگر وہ تکلف کے شکنجہ میں اتنا کھنچ گیا ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بیسویں صدی کے کنارے تک نہیں پہونچتا۔ گو اس کا لباس دھوکا دیتا ہے۔ اس میں مغربیت کا رنگ ہے۔ مگر اُس کی گفتگو میں اب بھی انیسویں صدی کی بُو آتی ہے۔ شاید اُس نے موجودہ انقلاب کے زمانے میں زندگی کو دُرست طریق سے نہیں پیا ہے۔ زمانے کی تلخیوں سے بہرہ آوری پیدا نہیں کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی کی گلیوں کو باہر کے لوگ آکر سونگھتے ہیں، نبض کی تفتیش کرتے ہیں، لیکن کوئی تغیر نہیں پاتے۔ لیکن اس کی بجائے وہ کیا دیکھتے ہیں؟۔ تپ دق دسل۔ رسم و رواج کے بندھنوں میں مضبوطی سے جکڑی ہوئی عورتیں، خاموش ترقی پسند انسان، جو اپنے خیالات کا اظہار نہ کرنے کی وجہ سے گھلے جاتے ہیں۔ امیروں کے گھوڑے اور بگھیاں، جن میں ناخواندگی بڑے کروفر سے تشریف رکھتی ہے، اور ذہانت سر جھکائے گذر جاتی ہے۔ اور سب سے نمایاں چیز جو وہ دیکھتے ہیں، وہ ہے جگہ جگہ ہومیوپیتھی کے ماہر ڈاکٹروں کی دُکانیں اور [illegible] اور اس جم غفیر میں کوئی سند یافتہ ڈاکٹر بھی مل جاتا ہے۔ وجہ؟ دہلی کے انسان ازلی نازک واقع ہوئے ہیں۔ ذرا ذرا سی تکلیف میں ڈاکٹر کا سہارا لیتے ہیں۔

باہر سے آنے والوں کا دہلی کی تنگ و تاریک اور نہایت بدصورت قبیح گلیوں میں سے گذر ہوتا ہی نہیں ہے۔ جن میں انسانیت اپنی تمام تر بدصورتیوں، قباحتوں کو لیکر نمودار ہوتی ہے۔ تانگے والوں کے اصطبل جن میں اُن کے کالے کالے بدصورت بچے روتے پھرتے ہیں اور [illegible] عورتیں کھانا پکاتی ہیں۔ نالیاں دوزخ کا منظر پیش کرتی ہیں۔ [illegible] ذرا ذرا سی بات پر دنگا فساد ہوتا رہتا ہے، اور غریبی اور بے بسی اپنے اپنے دروازوں پر بیٹھکر گذرنے والے انسانوں کا ایک عجیب [illegible] مطالعہ کرتی رہتی ہے۔ ایک ایسی مایوسی جس سے دبے ہوئے [illegible]

آنار پکتی ہیتے ہیں۔ لیکن شاید وہ سُن نہیں پاتے۔ اُس آواز کو جو دہلی کی گلیوں میں گونجتی رہتی ہے۔ مکرّر پیہم۔

یہ آواز موجودہ زمانے میں نہیں شروع ہوئی ہے بلکہ برسوں سے دہلی کی گلیوں میں گونج رہی ہے۔ مگر اس کے راگ مختلف برسوں میں مختلف بنتے ہیں۔ اور آج اِس آواز میں ترقی پسند نوجوانوں کی شکایتیں ہیں۔ اور یہ صدا بیماروں کی پکار ہے، تپ دق کے مریضوں کی چیخیں، خانگی جھگڑوں کو کمبخت شور و غل، تعلیم یافتہ لڑکیوں پر اُن کے بزرگوں کی لعن طعن کی بوچھاڑ ہے۔ دبے ہوئے دلوں کے جذبات کے شعلے ہیں یہ گلیاں ترقی پسند طبقہ کی قبر، اور ذہنی و دماغی عروج کی قتل گاہیں ہیں۔ اور یہ صدا اُن احساسات کی ہلکی سی دھمک ہے جو نوجوانوں کے سینوں میں پرورش پاتے ہیں مگر دہلی کی گلیوں نے اُنکے مُنہ بند کر دیئے ہیں۔

اے خدا، اے رحیم، اے پرمیشور، نہ معلوم اِن سوتی ہوئی گلیوں میں پھر کب سے زندگی کا نیا احساس سانس لے گا۔ دہلی کی گلیاں سوتی ہیں۔ اور کیا پتہ مستقبل قریب میں سوتی رہیں گی۔ اور ان مسجدوں اور مندروں کے سائے میں کب خلوص اور رواداری کی نیک خواہشات جنم لیں گی۔ اور ان گلیوں کے مرجھائے ہوئے چہرے پر پھر کب شگفتگی کی لہر دوڑے گی۔

لیکن شاید یہ مبہم خیال ہے اور موہوم اُمید۔ اور ایک تمنا جو مستقبل قریب تو درکنار، مستقبل بعید میں بھی بالکل دُھندلی دکھائی دیتی ہے، شام کے اندھیرے کی ایسی دُھندلی۔ پتہ نہیں دہلی کی ان تاریک گلیوں میں روشنی کی کرنیں کون سے دُور افتادہ زمانے میں پورے طور سے روشنی بہم پہونچائیں گی!

مگر میں نے اِن گلیوں میں ایک مندر کے شکھر پر ایک سفید جھنڈے کو پوربی ہوا میں جھکولے کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک ایسی پتاکا جس کی دھجیاں اڑ گئی تھیں۔ شاید وہ کسی تاریک گلی میں اب بھی اپنی زندگی کے آخری سانس پورے کر رہی ہے، اور وہ پکار پکار کر خالق سے درخواست کر رہی ہے کہ،

"اے خدا دہلی کی اِن گلیوں میں زندگی کب نئے سرے سے پھوٹے گی"

پرتھوی ناتھ شرماؔ

برسات کی رات

کالی کالی بہت ہی کالی

بے ربط مگر جواں حسینہ

کیا رکھتی ہے زیست کا قرینہ

ہلنے لگے اُس کے سُرمگیں لب

دانتوں کی لکیر ہے درخشاں

یا رُوحِ بہار ہے پرافشاں

آئی ہے صدا وہ قہقہے کی

کانپ اُٹھی ہے کائنات ساری

ہے ذوقِ جنوں پہ وجد طاری

اب بندھ گیا تار آنسوؤں کا

روتی ہے عجیب سادگی سے

پُرہول مہیب دلکشی سے

نمناک ہوئے ہیں خار و خاشاک

دل چاک ہُوا کلی کلی کا

بڑھنے لگا درد زندگی کا

قیوم نظرؔ

پھر ــــ!

ـــــ اور اس کی جھولی بھی بالکل خالی تھی۔ اب اس میں چھوٹے ٹکڑوں کی بجائے میل کچیل اور روٹیوں کی گھٹی ہوئی تیز لپٹ بھری تھی اس کی جھولی ـــ کل رات کو اس کا پیٹ بُری طرح تن رہا تھا اور اب پچک گیا۔ جیسے دانت گر جانے سے مُنہ پوپلا ہو جایا کرتا ہے۔ تو گویا اس کی جھولی کا مُنہ بھی پوپلا ہو گیا تھا۔ ہینھ ہینھ ہینھ۔ اُسے کیسی اچھی بات یاد آ گئی۔ اب اگر وہ چاہے تو اُسے موٹر کے بھونپو کی طرح انگلیوں سے دبا سکتا ہے۔ پوں پوں پوں، ہٹ جاؤ موٹر آتی ہے ـ پر اس میں سے آواز نہیں نکلتی۔ جھولی میں سے بھوں بھوں کی آواز کیسے نکل سکتی ہے۔ اس میں تو بھیک رکھی جاتی ہے۔ پر اب وہ خالی جو ہو گئی تھی تو اُسے کندھے پر سے اٹھا کر گردن میں تو لپیٹا جا سکتا ہے۔ کلکٹر صاحب بھی تو گلوبند لپیٹ لیتے ہیں! اگر اس کی جھولی گلوبند ہو جائے تو وہ بھی اُسے گردن میں لپیٹ لے۔ پر وہ کلکٹر کیسے ہو سکتا ہے، وہ تو بھکاری ہے۔ بھکاری کلکٹر ہو جائے تو کلکٹر کیا کرے۔ مگر اس کی جھولی تو اب خالی ہی تھی۔ اور دن پہ دن پھٹتی جا رہی تھی۔ اُسے پیوند لگانا بھی نہیں آتا۔ اور ڈوری بھی کٹنے لگی تھی جب جھولی بالکل پھٹ جائے گی۔ پھر کیا ہوگا۔ پھر تو وہ بھوکا ہی رہا کریگا نا!

اوہو ـــــ

اس وقت وہ کچھ کچھ یہ بھی سوچ سکتا تھا کہ ایک بڈھا مزدور اپنے بھاری بوجھ کو کم اور بھی کم اور بالکل ختم ہوتا دیکھکر کیوں خوش ہوتا ہے۔ پر وہ کیا مزدور تھوڑا ہی تھا؟ اور وہ مزدوری کرنا بھی کیا جانے۔ وہ تو مانگتا ہے اور بس مانگنا ہی جانتا ہے! اور کیا؟ وہ مزدور تھا ہی کب جو اپنی جھولی کا بوجھ ختم ہوتا دیکھکر خوش ہوتا۔ وہ تو بڈھا رامو تھا ـــ رامو بھکاری۔ اگر وہ خالی جھولی دیکھکر ہی خوش ہوتا ہے ــــ پر خوشی سے کیا پیٹ بھر جاتا ہے۔ پیٹ تو روٹی ہی سے بھرتا ہے اور پیٹ بھرے ہی کی تو خوشی ہوتی ہے۔ اس کی جھولی میں جوں جوں ٹکڑے جمع ہوتے جاتے ہیں اُس کا پیٹ پھولتا جاتا ہے، جیسے بچے والی کا! ہوں ہوں ہوں، اور اُسے خوب خوشی ہوتی ہے۔ اور اس کی بُھوک بھی خوب! ـــ پر اب تو اس کی بُھوک بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ پہلے وہ پوری جھولی بھر کر ٹکڑے کھا جاتا تھا۔ اب اتنا کہاں کھایا جاتا ہے۔ جبڑے بھی، آئے رام، چباتے چباتے دُکھ جاتے ہیں اور دانت! ہاں دانت بھی تو اب ٹوٹتے جا رہے ہیں۔ کل ہی ہڈی چبانے میں ڈاڑھ ہل گئی اور ایک دانت تو اس کی پیٹ میں آ ہی گیا۔ کیسا پیلا پیلا لمبا سا کوڑی کا ٹکڑا لگتا تھا۔ اندر کی طرف سے کالا کالا ہو رہا تھا اور جڑ میں سے جیسے ــــ اگر اس کے پاس پیسے ہوتے تو وہ بھی دانت بنوا لیتا۔ بڈھے بھی تو اب دانت لگوا کر جوان ہو جاتے ہیں!!

آج اس کا دل بہت خوش تھا، بہت! اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ کسی سے بھی کچھ نہیں مانگے اور اس کی جھولی اپنے آپ بھرتی چلی جائے۔ پر ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ایسا تو ہوا ہی نہیں۔ ہاں پرماتما ایسا کر سکتا ہے۔ پر اُس کو ایسی کیا پڑی کہ میری جھولی کی پروا کرے۔ وہ تو موٹے موٹوں کی تھیلیاں پہلے بھرتا ہے۔ اب جیسے وہ سیٹھ جی جس کا بیٹا اس دن مر گیا، کیسی بڑی توند ہے اس کی، جیسے اس میں منوں بچے بھرے ہوں۔ اُس کی جھولی تو اس توند کے آگے کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ اپنی جھولی تو وہ خود مانگ مانگ کر بھرتا ہے اور اس کی توند پرماتما بھرتا ہے۔ کہاں پرماتما کہاں بڈھا بھکاری! اگر پرماتما بڈھا ہو جائے تو وہ تنی ہوئی توند بھی پلپلی ہو جائے۔ پر ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ پرماتما آپ کیوں بڈھا ہونے لگا۔ وہ تو دوسروں کو بڈھا کرتا ہے۔ چاہے کوئی ہو یا نہ ہو۔ وہ تو کرتا ہی ہے، پرماتما جو ٹھہرا ـــــ پرماتما!

وہ ایسی اچھی اچھی باتیں کر سکتا ہے پھر بھی اُسے پاگل جان کر کوئی اس کے پاس نہیں آتا۔ وہ پاگل تھوڑا ہی ہے۔ اب تو وہ پتھر بھی نہیں مارتا، ہاں لکڑی ...... ! پر لکڑی کی چوٹ کیا لگتی ہے۔ اور اس کی لکڑی تو دیکھو کیسی پتلی ہے۔ پر وہ سپاہی اگر اُسے پکڑنے آئے گا تو وہ ضرور لاٹھی سے اس کا سر توڑ دیگا۔ چاہے کچھ ہی ہو۔ بس ایک لاٹھی، کھٹ! اور پھر آنکھ میچ لیگا۔ اب کیا کوئی وہ پاگل تھوڑا ہی ہے۔ اب اُسکی گدڑی میں موت کی باس کہاں آتی ہے ــ چاہے دیکھ لو!!

چھوٹی چھوٹی، تنگ، دھوئیں سے اٹی ہوئی سیاہ کوٹھڑیں اور بوسیدہ چھپروں کے دروازے اس کے انتظار میں مُنہ کھولے کھڑے تھے اور کہیں کہیں بڑے بڑے مکان بھی۔ اور ان کی اوٹ میں بہت سے ننگ دھڑنگ، میلے کچیلے، لولے لنگڑے بچے ہاتھوں میں کنکر لئے اُسے مارنے کے واسطے چھپے کھڑے تھے۔ وہ اُسے روز مارتے تھے اور

جب وہ اپنا سوکھا ہوا اجڑا بھینچ کر انہیں گالیاں دیتا تو وہ ہاتھوں سے ملیدہ بنا کر اس کے سامنے ناچتے کودتے اور ہنس ہنس کر اس کا منہ چڑاتے۔ لیکن وہ اس کی لکڑی سے ڈرتے تھے اور جب وہ لکڑی سیدھی کرکے ان کے پیچھے لپکتا تو وہ "چھالے لے" کہکر گھروں میں جا چھپتے۔ اور موقع پاکر پھر اس کا پیچھا کرتے۔ پر آج وہ ان بچوں کو کچھ نہیں کہتا۔ آج تو اس کا جی یہی چاہتا تھا کہ وہ کہیں سے کچھ نہیں مانگے اور اس کی جھول اپنے آپ بھرتی چلی جائے — یہ بڑے بڑے مکان اور چھوٹے چھوٹے چھپر کیسے معلوم ہوتے ہیں جیسے پھنسیوں میں پھوڑے نکل آتے ہیں — جیسے مگرمچھ اور کچھوے — اور سامنے وہی ٹوٹی ہوئی دیوار تھی۔ بیچ میں سے کبڑی۔ یہ بھی تو اب اس کی طرح بڈھی ہوگئی تھی۔ اگر وہ بھی بچہ ہوتا تو اس دیوار پر چڑھتا اور اس کا گھوڑا بنا کر ٹخ ٹخ کرتا۔ وہ روز اُسے دیکھتا ہے۔ راستے کے سہارے کھڑی ہوئی، پر وہ ابھی گر نہیں سکتی۔ اسے تو پرماتما ہی گرا سکتا ہے — اس کبڑی دیوار کو!!

ٹوٹی ہوئی دیوار کے نیچے پہونچکر وہ ایک لمحہ کے لئے رکا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ آج یہاں تھوڑی دیر بیٹھ کر دم لے۔ اُس دیوار کے پاس جو اسکی لکڑی کی طرح اب کبڑی ہوگئی تھی۔ اگر اس کی ماں ہوتی تو وہ ضرور اس بات پر اُسے مارتی اور گھر سے نکال دیتی اور پھر اُسے بھوکا ہی سونا پڑتا۔ اچھا تو آج وہ بیٹھ ہی جائے۔ پر ابھی تو اُسے بہت دور جانا تھا۔ کہاں، یہ اُسے خود معلوم نہ تھا۔ جہاں اس کا جی چاہے۔ جہاں اس کا پیٹ لے جائے۔ اس ذرا سی دیر قدم روک لینے سے اُسے یہ محسوس ہوا جیسے اس کی سوکھی ٹانگیں سنسنا رہی ہیں، خون مرجھائی ہوئی رگوں میں بہت تیزی سے دوڑ رہا ہے اور ایک ہلکی ہلکی سی اینٹھن پنڈلیوں سے لیکر رانوں تک گوشت کی سطح کے اوپر ناچ رہی ہے — جیسے اب وہ تھک کر بے دم ہوجائے گا اور پھر زمین پر گر پڑے گا۔ — اور لوگ دور سے دیکھکر کہیں گے، دیکھو وہ پاگل بڈھا مرگیا۔ جس نے تھانیدار کے لٹھ مارا تھا۔ لیکن جب وہ اُس کے پاس آ پہنچے تو وہ آنکھ کھول دیگا اور جب وہ پوچھیں گے۔ "ابے رتے کیا ہوا تجھے" تو وہ جواب میں اپنی افسردہ نگاہیں اُن کے چہرے کی طرف اُٹھا دیگا۔ اور — نہیں بلکہ جب وہ لمبا لمبا لیٹا ہوگا تو ذرا سی دیر کے لئے اپنا سانس تو روک ہی لے گا تاکہ یہ ہانپنا بند ہوجائے اور — پھر بھی جانے لوگ اُسے بیمار سمجھ کر اسپتال لے جائیں گے کیا؟ وہاں تو اُسے دودھ ڈبل روٹی ہی ملے گی کھانے کو — دودھ، کتنی عمدہ

لائم میٹھی چیز جیسے مخمل کھا رہے ہوں اور موٹے موٹے اونی کمبل اور گاڑھے کی چادریں اور .... ہا ہا ہا!" اُونہہ اونہہ اجی ڈاکٹر صاحب ابے رام، میں کڑوی دوائی نہیں پیوں گا!" اگر ڈاکٹر اسے کڑوی دوائی پلائے تو وہ اُسے اپنی گدڑی دے دیگا۔

لیکن اگر آج وہ ایسے ہی بیکار بیٹھ گیا تو اُسے بھیک کہاں سے ملے گی۔ پھر تو اُسے بھوکا ہی رہنا پڑے گا نا۔ اور پھر بھوک کے مارے اُسے نیند بھی نہیں آئے گی۔ وہ کیا اب بچہ تھوڑا ہی ہے جو بہل جائے گا۔ نیند تو پیٹ بھرے ہی سے آتی ہے — اور کھانسی! اسے کھانسی ہی تو اُٹھنے لگی ہے اب۔ پہلے وہ بھیک زیادہ ملنے کے لئے کھانسی کا بہانہ کرلیتا تھا۔ پر یہ تو کچھ ترکیب اُلٹی ہوگئی۔ اِدھر وہ جھوٹ موٹ آنکھیں نکال نکال کر پیٹ پکڑ کر کھانسنے لگا، اُدھر راہ گیر کوئی منہ پھیر کے کوئی منہ پر رومال رکھے تیزی سے گذر گیا اور کسی کسی نے "ابے ہٹ یہ کتا کھانسی ہمارے لگائے گا۔ سرک نہیں دیتا ہوں لات" — اور پھر اس کی کھانسی، کھانسی کیا اب تو عادت سی ہوگئی تھی۔ پر یہ عادت کتنی بُری تھی۔ اس سے اُلٹی بھیک اور ملنی بند ہوگئی اور اب تو بغیر کھانسے چین ہی نہیں آتا، نہ جانے کیوں، اور کھنکار الگ۔ گلا بھی تو کیسا دُکھنے لگ گیا ہے۔ سی، سی، آہ، کیسا بُرا درد ہوتا ہے جیسے کسی نے اُنگلیاں ڈال کر چیر دیا ہو اور گردن بھی تو کیسی پھول جایا کرتی ہے۔ کھانسی، معمولی کھانسی میں گردن کہاں پھولتی ہے۔ یہ تو کچھ اور ہی ہے!!

اُس کی ٹانگوں کی اینٹھن رفتہ رفتہ دھیمی ہوتی گئی، اب تو سنسنی کی ایک خفیف سی لرزش باقی تھی۔ جیسے کسی دور کی چیخ کا ایک بکھرا ہوا ریزہ ہوا کے تھپیڑوں سے اُلجھتا ہوا آہستہ سے کان کے پاس سے گذر جاتا ہے۔ اس نے اپنے دونوں سوکھے ہوئے میلے ہاتھ جو کندھوں سے لٹک رہے تھے، اُٹھانے کی آہستہ سے خواہش کی۔ چرررچوں چوں اس کے کندھوں میں سے آواز آئی اور اس کی کبڑی لکڑی کبڑی دیوار کا سہارا لیکر کھڑی ہوگئی۔ اور تھوڑا سا جھکا.... اووں اب تو سُسری کمر بھی دُکھنے لگی۔ جب اُس نے اپنی ہتھیلیوں کو اپنے گھٹنوں پر جمایا تو ایک ایسا کھٹا کا ہوا جیسے مشین میں پرزہ جم جاتا ہے۔ چاروں انگلیاں ایک طرف، بیچ میں گھٹنے کی چپنی اور دوسری طرف انگوٹھا — یہ مسلمان بھی تو نماز پڑھنے میں یوں ہی جھکتے ہیں۔ نماز — اور اُسے آج یہ خیال کس قدر عجیب معلوم ہوا۔ یہ مسلمان نماز کیوں پڑھتے ہیں۔ وہ بیسیوں آدمیوں کو روز نماز پڑھتے دیکھتا ہے۔ کوئی دھیرے کوئی بہت دھیرے۔ کوئی تیز کوئی بہت تیز۔ پھر یہ نماز کیا ہوتی —

اور سب اسی طرح جھکتے ہیں۔ بابہ اور ڈھوک بھی تو دیتے ہیں۔ کیا کہتے ہیں اُسے۔ قجرو تو سیردا کہتا ہے۔ سیردا، قجرو اور نماز سب پڑھتے ہیں اور جانے کیا بولتے رہتے ہیں۔ اسے نماز پڑھنی نہیں آتی نہیں تو وہ بھی ایک دن پڑھ کر دیکھتا۔ جانے وہ کیسا لگتا۔ لوگ ہنستے۔ پر اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ اپنا اپنا دھرم ہے۔ آج قجرو کی طرح وہ اپنی گدڑی پر ضرور اسی طرح ڈھوک دیگا۔ اور پھر یہ ہات اُونچے کر کے جانے کیا کرتے ہیں۔ مالک سے مانگتے ہونگے۔ کیا مانگتے ہوں گے۔ یہی روٹی پیسہ اور ــــ جانے کیا ــــ پر وہ مندر میں تو جاتے اور ہی ترکیب سے وہ پنڈا گھنٹی بجایا کرتا ہے۔ بس ایک ہاتھ ہلتا رہتا ہے اور ننگے بدن اور ماتھے پہ چوٹی کیسی ہلا کرتی ہے۔ ہا ہا ہا۔ اور پھر ہاتھ جوڑ کر وہ بھی مانگتا ہی ہوگا اور کیا؟ پر وہ جھکنا اچھا۔ پر سند تو یہ بھی ہے، ہاتھ ہی تو ہلتا رہتا ہے۔ سیٹھ جی بنے چوکی پہ بیٹھے ہیں۔ پر یہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر جانے کتنا مانگتے ہیں۔ بھگوان بچائے ان سے۔ یہ بھی تو بھکاری ہیں۔ اور پھر انہیں اَن داتا کہو ساب۔ نہیں تو گالیاں دیتے ہیں۔ اور مالک کے سامنے کیسے بلی کی طرح چُپ چاپ بیٹھتے ہیں۔ پر جو نہیں مانگتا اُسے مالک بہت دیتا ہے۔ یہ صاحب لوگ انڈے کھاتے ہیں اور مُرغی اور جانے کیا کیا۔ اور کسی سے نہیں مانگتے۔ پر یہ کسی کو دیتے بھی تو نہیں۔ ان کے یہاں کتے ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے۔ وہ گھسنے نہیں دیتے۔ وہ بھی ڈبل روٹ کھاتے ہیں۔ اگر اس کا بھی ایسا ہی لال رنگ ہوتا اور لوٹ پاؤ اور ــــ اہا ہا تو وہ بھی گٹ پٹ کرتا۔ انڈا لاؤ، مرغی لاؤ، بھوک۔ اور پیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہتا۔ جلدی، سور۔ لاؤ جلدی۔ انڈا مرغی ــــ!

گھٹنوں پر زور دینے سے اُس کی ٹانگوں کے جوڑوں میں ایک ہلکی سی چرچراہٹ ہوئی، جیسے زنگ خوردہ مشین بغیر تیل دئے چلانے سے آواز دیتی ہے۔ اور پھر ایک میٹھا میٹھا درد۔ سوچتے ہوئے پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے سے جو مزہ آتا ہے ــــ پھر اس کی میل سے ڈھکی ہوئی پیشانی کی جلد ملائم سی پڑنے لگی۔ مسامات میں سے پسینہ نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بغل میں سے بھی کوئی چیز سرکتی ہوئی معلوم دی۔ کیا ہو سکتی ہے۔ جوں ہوگی۔ پر جُوں اتنی موٹی کہاں۔ تو کھٹمل ہوگا۔ گدڑی میں سے آگیا ہوگا۔ کھٹمل، اور اُسے فوراً اپنی پھٹی ہوئی گدڑی یاد آگئی۔ اس میں وہ بھی سوتا ہے اور کھٹمل بھی۔ پر یہ کھٹمل آپ بھی نہیں سوتے نہ دوسروں کو سونے دیتے ہیں۔ اور کاٹتے جو ہیں۔ کتنے موٹے موٹے ہوتے ہیں۔ جامنی، بینگنی، سیاہ اور چکنے جیسے تل کی شکل ہوتی ہے ــــ اور پیشانی اور زیادہ نم آلود ہوگئی۔ پسینہ اوپر چھلکنے لگا۔ خفیف سی کھجلی۔ میل پھول رہا تھا۔ اور بغل میں پھر وہی ملی سی چیز سرسراتی ہوئی معلوم دی۔ اور پھر پسیلی ہوئی بدبو۔ اوہو ــــ پسینہ تھا۔ ہینہ ہینہ۔ کھٹمل کہاں سے آتے۔ میں بھی تو کھوں پہ گھوڑے سے کیا دوڑ رہے ہیں۔ پر یہ پسینہ کیا ہوتا ہے اور سب کے نکلتا ہے لیکن سردی میں جانے کہاں چلا جاتا ہے ــــ اوہو، اب کے سردی میں دیکھو کیا بنتی ہے۔ گدڑی تو بس مالک کا نام جپ رہی ہے۔ روٹی والے نے بھی دُکان اُٹھا دی۔ نہیں تو اسکے تندور سے بڑا بچاؤ تھا۔

پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے اس کی پیشانی پر نمودار ہونے لگے۔ کنپٹی کی رگیں پھر آہستہ آہستہ پھڑکنی شروع ہوئیں اور اس نے اپنی میل سڑی ہوئی جھولی گلے میں سے اُتار کر زمین پر رکھدی۔ آہستہ آہستہ بیٹھنا شروع کیا ــــ اور بیٹھ گیا۔ کھو کھلے سینے میں سے اطمینان کی ایک لمبی سانس سنسناتی ہوئی نکلی۔ جیسے ہوا زمین دوز نالی میں سے چکر مارتی ہوئی نکل جاتی ہے ــــ یہ اس کے سر میں کیا ہو رہا تھا۔ یہ جانے کیا ہونے لگا ہے اُسے۔ ارے یہ مکان کیا دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ یہ پیڑ بھی تو بھاگ رہے ہیں۔ ابے کہاں جاتے ہو۔ ارے آدمیوں تمہارے گھر بھاگ رہے ہیں۔ دیکھو پھر مت کہنا رآمو نے تمہیں بتایا نہیں ــــ ہاں! ــــ اور ارے! اہاہا اس کی لکڑی، کبڑی لکڑی بھی، اس کبڑی دیوار کے ساتھ مل کر کیسی ناچ رہی ہے۔ واہ جی واہ۔ یہ مجھے کون دھکے دے رہا ہے۔ ہیں مانتا ہی نہیں۔ ابے چھوکرو آؤ، ایک ایک پیسہ ناچ۔ بس ایک پیسہ ہی۔ اچھا ایک روٹی ــــ ایک ٹکڑا۔ کبڑی لکڑی کا ناچ ایک ٹکڑے میں، جاؤ، نہیں جاتے۔ مفت دیکھو گے۔ تمہارے باپ کا دینا آتا ہے۔ ہیں! ٹھہرو تمہاری ــــ اچھا اچھا آؤ۔ بھاگ گئے، ہت تمہاری کی۔

اس کے سامنے وہیں پر بہت سی کنکریاں پڑی تھیں۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ سب پھولنے لگیں اور سب انڈے بن گئے۔ اور وہ اُسے اور زیادہ غور سے دیکھنے لگا۔ اس وقت بھوک اس کے دماغ میں ناچ رہی تھی۔ لیکن پیٹ ابھی خاموش تھا۔ اس کی طرف سے ابھی فریاد شروع نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ ابھی تو رات کی بچی کھچی سوکھی روٹیوں کے ٹکڑے اس کی انتڑیوں میں ملائم بھی نہ ہونے پائے تھے لیکن بھوک کا خیال آتے ہی اُسے یہ معلوم ہوا جیسے اس کا دم بھوک کے مارے نکلا جا رہا ہے۔ اس کا پیٹ چلا رہا ہے روٹی لاؤ، مجھے بھوک لگ رہی ہے لاؤ، اور پھر وہی انڈے مرغی، لاؤ، سور جلدی ــــ اسے یہ کان پر کسی نے کاٹ کھایا۔ اس نے جلدی سے اپنے کان کو نوچا مگر وہ

کوئی چیز دبی ہوئی تھی جسے اُس نے اپنی میل بھری بودار ہتھیلی پر ڈال دیا۔

ـــــ ایک، دو، تین، ارے، اوہو لیے سالے، آگے کے دو آنکڑے چھوڑ کے، دو آگے، دو بیچ میں، دو پیچھے، پورے چھ، چیونٹی کے چھ ہاتھ پاؤں اور آدمیوں کے چار ہی ہوتے ہیں۔ چیونٹی کتنی اچھی ہوتی ہے۔ پر یہ کاٹتی ہے یہ بُرا۔ پھر اس کی نگاہ اپنے میل سے لپے ہوئے سیاہ سوکھے ہوئے پاؤں پر پڑی۔ اس کا ایک پاؤں چیونٹی کے کتنے پاؤں کی برابر ہو سکتا ہے۔ پانچ، اسّی، اُنیس، لاکھ۔ لاکھ کتنے ہوتے ہیں۔ لاکھ تو اوہو لاکھ تو بہت ہوتے ہیں، لاکھ سے تو یہ سب میدان بھر جائیگا۔ جانے کیسا ہوتا ہے لاکھ۔

چیونٹی اُس کے کھُردرے ہوئے ہاتھ پر تلملا کر رینگتی رہی۔ اُسکے ہاتھ پاؤں چٹکی میں دب جانے سے سنجیاسے گئے تھے۔ لیکن وہ تھوڑی دیر میں بالکل ٹھیک ہوگئی اور اِدھر اُدھر میل کو سونگھتی ٹھہرتی ہوئی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اگر یہ چیونٹی یہیں رہ جائے تو وہ اُسے گھر لے جائے گا۔ اور گدڑی میں سلائے گا اپنے پاس۔ جوں، کھٹمل، چیونٹی اور وہ خود، سب ساتھ سویا کرینگے۔ پر جانے وہ چیونٹی چلے گی بھی یا نہیں۔ روٹی کے ٹکڑے تو کھاتی ہی ہے۔ اُس نے اپنی خالی جھولی میں ہاتھ ڈال کر کھنگولا۔ دو تین روٹی کے ریزے اُڑ کر اسکی گھائیوں میں چپک گئے۔ اُس نے اپنا ہاتھ آہستہ آہستہ باہر نکالا اور ایک ریزہ چیونٹی کے سامنے رکھا۔ وہ اپنے دونوں انکڑوں کو اُوپر نیچے ہلا کر پیچھے ہٹ گئی۔ وہ اس وقت بھوکی نہیں تھی اور پھر تیزی سے اُس کے ہاتھ پر دوڑنے لگی۔ کتنی سی جگہ وہ آگے رُکی آگے ہوتے بال سے ٹکرائی، رُکی۔ اندازے سے کچھ ٹٹولا، کچھ میل کی بو آئی سونگھا غصہ سے منہ چوڑا کیا، ایک آدھ زور آزمائی کی، پھر آگے بڑھ گئی۔ اس کی نظریں چیونٹی کا پیچھا کر رہی تھیں۔ کس طرح ایک کے بعد دوسرا پیر اٹھاتی ہے۔ اور جب اس نے دوڑتے دوڑتے رُک کر اپنے آگے والے دونوں پاؤں تین چار بار اپنے انکڑیوں پر پھیرے تو اُسے بہت حیرت ہوئی۔ ارے یہ تو مونچھوں پہ تاؤ دیتی ہے اوہو ہو، جیسے وہ بھولا بنیا دونوں ہاتھوں سے اپنی چوہے کی دُم جیسی لمبی مونچھ سہلایا کرتا ہے۔ یہ چیونٹی بھولا کا باپ ہے، اہاہا۔ اور اس کے اپنے ہاتھوں کی جھرّیاں ـــــ اُسے یاد آیا جیسے بہت پُرانے ربر کے ٹکڑے کو کھینچنے سے اُس کی اُوپری سطح پھٹ جاتی ہے اور اس میں دراریں سی پڑ جاتی ہیں ـــــ بھگوان! وہ تو بڈھا ہوتا جا رہا تھا۔ کیسے لگتا تھا اس وقت کتنا بُرا اور عجیب معلوم ہو رہا تھا۔ وہ بڈھا

ہوگیا اور اب مرجائے گا۔ پھر کیا ہوگا؟ پھر اُسے جلائیں گے۔ پر وہ جلنا نہیں چاہتا۔ وہ تو کچھ بھی نہیں چاہتا۔ اگر اُسے جلایا تو وہ اخ تھو اُنکے مُنہ پر تھوک دیگا اور لکڑی زور سے مار کر دُور بھاگ جائے گا۔ اگر کسی نے اُسے پکڑا تو خوب روئے گا۔ اری مائی ری، ارے باپ رے۔ لیکن اس کا باپ کون تھا؟ باپ! اُسے تو اس نے دیکھا ہی نہیں۔ کیسا ہوگا۔ جیسے لاٹ صاب۔ اگر اس کا باپ ہوتا تو وہ اُس کی کمر پر خوب چڑھتا، اور جانے ن اسے پیسے بھی دیتا کیا۔ جانے اُس کا باپ کہاں رہتا تھا؟

لیکن اُس نے نہ جانے کیسے دیکھ ہی لیا کہ وہ مرا پڑا ہے۔ یہ خیال جتنی تیزی سے اُس کے دماغ سے نکل گیا تھا اتنی ہی تیزی سے پھر آگیا اور وہ پھر سے موت کے بُرے بُرے خیالات میں گھِرتا جا رہا تھا۔ اس کے سامنے اُس کی لاش پڑی تھی۔ اینٹھی ہوئی اکڑی ہوئی لاش۔ آنکھیں کھلی ہوئی، ان میں چیونٹیوں کے گچھے لپٹے ہوئے، اور سفید اور نیلی ملی جلی چمک، اور سفید سفید دانت پھٹے ہوئے منہ سے نظر آتے ہوئے، اس میں مکھیاں بھری ہوئیں، جیسے روٹی کے ٹکڑے کے ریزے بھرے ہوں۔ اور آنکھ ناک منہ سب میں مٹی لتھڑی ہوئی۔ اور اُس نے اپنی آنکھیں دونوں ہاتھوں سے بند کرلیں۔ جیسے وہ ڈر گیا۔ پر وہ ڈر کیسے سکتا تھا۔ وہ تو روز مُردوں کو دیکھتا ہے۔ ارتھیوں کو اور جنازوں کو بھی۔ ان ہی سے تو اُسے اچھی بھیک ملتی ہے۔ پیسے اناج اور کبھی کبھی کپڑا اور روٹی۔ ہاں روٹی بھی۔ پھر وہ جلا دئے جاتے ہیں یا گاڑ دئے جاتے ہیں۔ کیا بات ہوئی۔ وہ کیوں ڈرے۔ پر وہ برم راکس تو چمٹ ہی جاتا ہے۔ اور اُس نے زور سے آنکھیں میچ لیں ـــــ لیکن بھوک، بھیک اور جھولی، دماغ پر ایک ہتوڑا سا پڑا اور اس نے دیکھا وہ اٹھ گیا ہے اور آہستہ آہستہ لکڑی ٹیکتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ دور بہت دور۔ پھر نہ جانے کہاں غائب ہوگیا۔

جب اس نے آنکھ کھولی تو ایک مریل سا کتا اُس کے پاس سے گذر رہا تھا۔ نہ جانے کیا سوچتا ہوا جا رہا تھا۔ لیکن تین چار قدم نکل جانے کے بعد وہ مڑا اور اس طرح غور سے دیکھتا ہوا آیا جیسے کسی وقت کی بہت پُرانی جان پہچان ہو۔ آنکھوں سے پانی بہتا ہوا۔ کویوں میں پیلے پیلے چیپڑ کی گولیاں لگی ہوئی جیسے مکا کے دانے چپک رہے ہوں۔ اس کی نگاہیں کتے کی نگاہوں سے ملیں اور کتے کی دُم ہلنے لگی۔ جیسے ہوا سے پتلی سوکھی ٹہنی ہلتی رہ جاتی ہے۔ اس نے اپنی سمٹی ہوئی جھولی کا اپنے دماغ میں پھر جائزہ لیا اور پھر آنکھوں نے کتے سے یہ کہہ دیا ابھی بھیک نہیں

ادہو لیکن یہ کتا بھی تو اسی کی طرح بھکاری تھا۔ اگر وہ کتا ہوتا تو اُسے جھولی کی ضرورت ہی نہیں رہتی، نہ لکڑی کی اور نہ کچھ کہنے کی۔ نہ کسی کے آگے گڑگڑانے کی۔ بس وہ خوب دُم ہلاتا اور اُسے روٹی کے ٹکڑے ملتے نہیں تو پھر وہ خوب بھونکتا اور غراتا۔ اور اس سپاہی کو ضرور کاٹتا جو اُسے رسی میں باندھ کر پاگل خانے لے گیا تھا۔ اُس نے تھانیدار کے لکڑی ماری، ہاں [illegible]۔ تھانیدار نے اُسے کیوں دھمکایا، وہ کیا اُس سے روٹی تھوڑا ہی مانگ رہا تھا۔ وہ تو سڑک پر بس مُوت رہا تھا۔ اور اب بھی اگر وہ کتا ہو جائے تو اس بنئے کو ضرور کاٹے گا جس نے اُسے ماں کی گالی دی تھی۔ اس نے کوڑی مانگی تھی ماں کی گالی تھوڑا ہی مانگی تھی۔ گالی سے کیا پیٹ بھرتا ہے۔ پیٹ تو روٹی سے ہی بھرتا ہے۔ پر بنئے نے تو کبھی روٹی دی ہی نہیں ——— اور پھر وہ کتے کو غور سے دیکھنے لگا۔ اگر یہ کتا بات کرتا تو وہ بڑے گہرے دوست ہو جاتے اور اسی گدڑی میں سوتے۔ اور اوہو، اگر وہ چیونٹی کتا ہو جائے اور کتا روٹی کا ٹکڑا ہو جائے تو وہ اُسے ابھی جھولی میں کھا لے اور بنئے کو کچھ نہ دے۔ اس نے بڑی محبت سے کتے کو چمکارا اور پھر اس کی دُم پکڑ کر جب اُونچا کیا تو کتا چوں چوں کرنے لگا۔ اُس نے کتے کو زمین پر چت پٹک کر اپنے ایک ہاتھ سے اس کا گلا آہستہ سے دبا لیا۔ اور ایک پاؤں پھیلا کر کتے کے پیٹ پر رکھ دیا۔ پھر دوسرے ہاتھ سے اُس کے گنجے خارشی پیٹ کو دبانے لگا۔ اس میں سے تیرے بچے ہونگے، پھر وہ چوں چوں کر کے تیرا دودھ پئیں گے، اور اس نے دو تین کنکر اُٹھا کر کتے کے پیٹ پر اس طرح چپکا دئے جیسے وہ پلوں کی گردن پکڑ کر دودھ پلا رہا ہے۔

یہ سوکھا سا پلا ——— اہہ، جب وہ چھوٹا سا تھا تو اس کی ماں کی گود میں بھی ایک سوکھا سا پلا رہتا تھا۔ جو ہر وقت اُس کی ماں کی چھاتیاں جھوڑا کرتا تھا اور اُسے ان سے کھیلنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اوہ یہ تو اس کی بہن تھی۔ چاہے اس کی ماں سے پوچھ لو اور وہ اپنی ماں کے ساتھ مانگنے جایا کرتا تھا اور وہ آدمی جو کبھی کبھی ان کی کوٹھری میں آتا تھا تو اُس کی ماں بہن کو اس کی گود میں دیکر باہر بھیجدیا کرتی تھی۔ پر اُس کی ماں اور بہن کہاں گئی۔ ماں تو مر گئی اُسے یاد آیا۔ ایک دن سانپ نے کاٹ لیا تھا اور اُس نے کتے کو اس طرح دیکھا جیسے وہ سانپ تو نہیں تھا۔ پر وہ بہن، اور وہ دونوں ساتھ ساتھ مانگنے بھی تو جایا کرتے تھے۔ لیکن وہ اُسے اپنے ساتھ نہیں کھلاتی تھی۔ وہ اس کی رال سے گھن کرتی تھی اور اُسے مارتی بھی تھی اور پھر آپ ہی اس کے ساتھ مانگنے نہیں جاتی۔ کیسی بُری تھی اُسکی بہن۔ جب کبھی اس کی ماں اُسے اکیلا بھیجتی تو وہ جھولی لٹکائے گلیوں میں کھیلتا پھرتا تھا ——— اور پھر گھر پٹ لوٹ آتے بھوکے ہی سونا پڑتا۔ اور لڑکے بھی اُسے خوب مارتے تھے۔ پھر جب بہن بڑی ہو گئی تو اُسے کھیلنے کا بہانہ نہیں ملتا تھا اور وہ جاکر ماں سے چغلی کھا دیتی تھی۔ لیکن بہن کے ساتھ اُسے بھیک خوب ملتی تھی۔ پھر جب اُسکی بہن اور بڑی ہو گئی تو ایک دن اُس کی ماں نے اُسے خوب مارا اور وہ لڑ کر نکل گیا۔ جب وہ کنوئیں میں گرنے گیا تو اُسے ڈر لگا۔ کتنے ہی دن بعد جب وہ گھر آیا تو اس کی ماں اکیلی تھی اور بہن۔ جانے کہاں چلی گئی تھی اور پھر آئی ہی نہیں۔ ایک جانے کہاں اُس نے ایک عورت دیکھی تھی۔ اس کی بہن سے کتنی ملتی جلتی تھی۔ دو تین بچے بھی ساتھ تھے لیکن اس کی بہن کے بچے کہاں تھے؟ یہ اس کی بہن کیسے ہو سکتی تھی ——— اور وہ جمعدار جو انہیں دونوں کو گھر بلا لیا کرتا تھا۔ اور ہر دفعہ اُسے پیسے دیا کرتا تھا۔ اور اُس کی بہن کو بھیک دینے الگ لے جاتا تھا۔ کتنا اچھا آدمی تھا وہ ——— اور یہ بنیا، یہ بُرا ہے اور وہ سپاہی بھی بُرا ہے ——— اس نے غصہ میں آکر سپاہی کو مارنے کے لئے لکڑی اُٹھالی۔ حالانکہ وہ جھولی کا مُنہ کھول کر کتے کو اس میں بلا رہا تھا۔

سامنے بہت سے آدمی ایک جنازہ لئے ہوئے آرہے تھے۔ اُس کی آنکھیں دیوانگی اور مسرت سے چمک اُٹھیں۔ اس نے جلدی سے کھڑے ہوتے ہوئے جھولی کندھے میں پہنی اور لکڑی اُٹھا کر کتے پر دے ماری۔ اہاہا اور لیجا پاگل خانے، اب باندھے نا رسی سے۔ پیچھے سے کھڑ کھڑ ٹخ ٹخ ہوئی، موٹر اِکّے والے نے للکار کر کہا: "ابے رستے، ہٹ مریگا کیا؟" جیسے اُس نے پروا ہی نہیں کی اور بھاگتے بھاگتے اپنی لکڑی زور سے ہوا میں گھمائی ——— ہونہہ لے تو لے پہلے۔ دیکھوں کیسے لیتا ہے۔ لمبر تو میرا ہے۔ منگتا کہیں کا۔ اور نہیں تو!!

"آوارہ گرد"

کل اور آج

سورج کی حسین اور ننھی کرنوں نے آ ہستہ تھپ تھپا کر جگایا، وہ آنکھیں ملتی ہوئی نرم گرم بستر سے بیدار ہوئی۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا وہ کوئی پر لطف خواب دیکھ رہی ہے۔ اس نے انگڑائی لی۔ چند لمحے وہ کسی آواز کی منتظر رہی، مگر ہر طرف خاموشی تھی، غیر معمولی خاموشی، اس کی زندگی میں یہ پہلا دن تھا کہ وہ اتنی دیر تک سوتی رہی۔ اس کو جگانے کے لئے آج سورج کی روپہلی کرنیں آئیں ورنہ روزمرہ تو آنکھ کھلنے کے وقت ہی مالکن کی کرخت آواز "ارے او فاطمہ ــــ کب تک سوتی رہے گی" جگایا کرتی تھی اور پھر "ارے! ماما کو بلا لا، باورچن کو جگا دے، پانی گرم کر دے، اور یہ کر دے ــــ وہ کر دے ــــ" مگر آج وہ اپنی مرضی سے سوئی اور اپنی مرضی سے جاگی، سارے گھر میں وہ تھی ــــ اور مرملانے میں سلیم۔

جب ذرا نیند کا خمار اُترا تو اُسے گذشتہ رات کے واقعات یاد آنے لگے، مالک اور مالکن ایک تقریب پر کسی دوسرے شہر گئے تھے، اس لئے انہوں نے اس کے سپرد سارا گھر کر دیا۔ شام کو جب روانگی کا وقت تھا تو مالکن نے اُسے بار بار نصیحتیں کیں۔ گھر کا یوں خیال رکھنا فلاں کام یوں کرنا۔ جب تک سواری روانہ نہ ہوئی ہدایات کا سلسلہ برابر جاری رہا اور پھر سلیم کے بارے میں کہا گیا، ــــ اُسے صبح ناشتہ احتیاط سے دیا جائے، کھانا وقت پہ تیار ہو، دیکھنا چھوٹے میاں کو تکلیف نہ ہو۔ سلیم والدین کے ساتھ نہ جا سکا، کیونکہ اُسے امتحان کی تیاری کرنی تھی ــــ سلیم نے ایک بار فاطمہ کی طرف دیکھا تھا لیکن وہ اُسکی نگاہ کا اندازہ نہ لگا سکی۔

جب سواری روانہ ہونے لگی تو سلیم جاتی ہوئی فٹن کو دیکھ رہا تھا اور فاطمہ سلیم کو تک رہی تھی۔ فاطمہ کا دل ایک اضطراب محسوس کرنے لگا وہ اتنے بڑے گھر میں اکیلی رہنے سے گھبرا رہی تھی، ــــ اور پھر سلیم بھی تھا۔ اس نے چاہا کہ وہ مالکن سے صاف صاف کہہ دے کہ وہ اکیلی نہیں رہیگی۔ مگر بات حلق میں آکر اٹک گئی۔ اس کے قدم رک گئے اور نگاہیں سلیم کے پاؤں پر جم کر رہ گئیں ــــ سواری روانہ ہو گئی۔ سڑک پر غبار کا ایک دھواں باقی رہ گیا تھا اور گاڑی جا چکی تھی ــــ لیکن جب رات آئی تو وہ اپنا آپ بھول کر ایسی سوئی کہ دن چڑھے تک سوتی رہی۔

جب وہ جاگی تو سلیم کی غلط نگاہی ابھی تک اس کے دماغ پر منقش تھی، لیکن وہ اسے بھول جانا چاہتی تھی، اُس نے کھڑکی کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنا شروع کر دیا۔ سورج کی کرنیں شیشوں پر کھیل رہی تھیں۔ آج وہ کس قدر حسین معلوم ہوتی تھیں، حسین اور نرم و نازک ــــ اس سے قبل یہی کرنیں اُس کی نیند کے شیریں خوابوں کا خاتمہ کر دیا کرتی تھیں ــــ "فاطمہ! دھوپ سر پر آ گئی ہے اور تو ہے کہ ابھی تک سو رہی ہے!" یہ فقرہ اس کے لئے سوہانِ روح ہوتا تھا۔ اس پر زیادہ سونے کا الزام تھا اور یہی کرنیں اسکی غمازی کرتی تھیں۔

لیکن آج حالات بدل گئے تھے، وہ جب چاہتی سو سکتی تھی۔

کل تک سورج جب اپنی شعاعوں کی کمند پھینکا کرتا اور نیند کی دیوی کو قید کر لیتا، یہ فاطمہ کے لئے اس کی دن بھر کی محنت کے شروع کرنے کا پیغام ہوتا۔ اُسے کل پرزوں کی طرح رات گئے تک مالک اور مالکن کے اشاروں پر ناچنا پڑتا تھا، ذرا سی لغزش جھڑکیوں کا ایک تانتا باندھ دیتی، آرام تو اس کی قسمت میں ہی نہ تھا، اس قدر کام کرنے کے باوجود مالکن نے اُسے "کام چور" کا خطاب دے رکھا تھا ــــ لیکن آج سورج دیوتا کی سنہری کمند نیند کو قید کرنے کی بجائے فاطمہ کے گرد حائل ہو گئی، وہ حسین اور جمیل کرنوں میں رانی بنی بیٹھی تھی، سورج دیوتا کی دیوی ــــ فاطمہ۔

کل بیدار ہونے کے بعد اس کا پہلا کام یہ تھا کہ کمرے کی کھڑکیاں بند کرے، کپڑے بدلے اور کام میں مصروف ہو جائے ــــ مگر آج ابھی تک کھڑکی کھلی تھی ــــ اُس نے پہلی بار محسوس کیا کہ اُنکے گھر کے گرد ایک باغ بھی ہے، اُسے پرندوں کے چہچہانے کی آواز سنائی دی، یہ آواز اس کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو گئی ــــ کل اگر یہی چہچہانا سن پاتی تو اُسے یہی معلوم ہوتا کہ پرندے اسکا مذاق اُڑا رہے ہیں، اُسے کہہ رہے ہیں "لو وہ جاگی کام چور ــــ بہت سونے والی فاطمہ!" پھر وہ آنکھیں ملتی ہوتی بھاگتی، باورچن کو جگاتی، پانی گرم کرتی، مالکن کا لباس نکالتی، اسے کنگھی کرتی ــــ اور یہ مشین چلتی ہی جاتی ــــ لیکن آج پرندے گا رہے تھے، آزاد پرندے،

یا ابھی تو آج آزاد تھی ـــــ وہ گنگنانے لگی۔ بچپن کا ایک گیت، آج وہ پرندوں سے زیادہ سُریلا نغمہ گا سکتی تھی۔

سلیم کی وہ نگاہِ غلط انداز پھر اُسے یاد آ گئی اور وہ گھبرا گئی، اُسے سڑک پر اُڑتے ہوئے غبار کا دھواں نظر آنے لگا ـــــ کار رکی جا چکی تھی، سلیم "پورچ" میں کھڑا تھا اور وہ برآمدے میں، اس کے قدم زمین پر گڑ گئے تھے ـــــ اب اس کی نظر سورج کی کرنوں پر تھی، وہ بھی ایک سفید غبار بن چکی تھیں۔ اُس نے اپنے گرد پھیلے ہوئے غبار کو دونوں بازوؤں میں لے لیا اور اپنا گال یوں آگے کر دیا گویا وہ کسی سے بغلگیر ہو کر اپنا چہرہ اس کی چھاتی پر رکھے تھی ـــــ پھر اُس کے لب خود بخود مِلکر وا ہو گئے۔

وہ گھر کی حفاظت پر مامور تھی، اُسے شب خوابی کے کپڑے تبدیل کرنے تھے اور پھر سلیم کے لئے ناشتہ تیار کرنا تھا۔ کمروں کی صفائی باقی تھی، وہ اُٹھنے لگی لیکن اُسے یوں محسوس ہوا گویا کوئی اُس کے کان میں کہہ رہا ہے "پگلی! آج تو گھر کی مالکن تو ہے ـــــ سلیم، اس کا کیا وہ بھی تو ابھی تک سو رہا ہوگا" وہ پھر رک گئی، سلیم کے خیال سے اُسکے بدن میں جھرجھری سی آ گئی ـــــ کرنیں اس کے اور قریب ہو کر ناچنے لگیں، فاطمہ کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا، وہ پھر دراز ہو گئی۔ فاطمہ آج ایک حور تھی جو کِرنوں کے تخت پر بیٹھی کھیل رہی تھی، اس کے پریشان بال، ڈھیلا ڈھالا لباس، شباب کی مستی، خواب سے مخمور آنکھیں اور پھر نہایت شانِ بے نیازی سے وہ بستر پر دراز تھی، یہی فاطمہ کل تک ایک معمولی خادمہ تھی لیکن آج وہ پریوں کی شاہزادی معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کا حُسنِ سادہ کِرنوں کی جلا سے چمک اُٹھا تھا۔

وہ آنکھیں نیم وا کئے دراز تھی۔ اُس نے ایک شانِ استغنا سے گھر کا جائزہ لینا شروع کیا ـــــ یہ تھا اس کا کمرہ، اس کے ساتھ دوسری چھوٹی مالکن کا کمرہ تھا۔ پھر لباس تبدیل کرنے کا کمرہ، غسل خانہ پھر ـــــ دوسری طرف مردانہ ڈرائنگ روم، جاگیردار کا نجی دفتر۔ لائبریری، اور اس کے ساتھ سلیم کا کمرہ ـــــ یہاں اُس کے خیالات کا سلسلہ رُک گیا۔ زنانے کے سارے کمرے مقفل تھے، مردانے میں صرف سلیم کا کمرہ اس کی توجّہ کا مرکز بن گیا ـــــ سلیم، اُس کا سارا انتظام اُسے کرنا تھا۔

سلیم ـــــ وہ بھی ابھی تک دراز سگریٹ پی رہا ہوگا، کتابوں کا ڈھیر اس کے اِردگرد ہوگا ـــــ کتابیں اُس کے بستر پر، میز پر، فرش پر، جہاں دیکھو کتابیں، کتابیں ـــــ وہ تو تنگ آ جاتی تھی اُسکی کتابیں درست کرتے کرتے ـــــ کل تک تو اُسے گھر کے کام کاج کے علاوہ سلیم کا کمرہ بھی صاف کرنا ہوتا تھا۔ جب بھی وہ وہاں گئی ـــــ وہ اس وقت وہاں جاتی تھی جب سلیم کمرے میں نہ ہوتے ـــــ تو کتابوں کا ایک انبار ہر طرف پڑا ہوتا، بستر کی حالت ایسی خراب گویا کوئی اس پر کشتی لڑتا رہا ہو، سگرٹوں کے جلے ہوئے ٹکڑے، کمرے میں تمباکو کی بو سے اُس کا دم گھٹنے لگتا۔ مگر اس کے باوجود فاطمہ کا یہی جی چاہتا تھا کہ وہ دن بھر یہیں بیٹھی کتابیں دُرست کرتی رہے، کتابیں ـــــ سلیم کی کتابیں، جو ہر وقت اس کے پاس رہتی ہیں، وہ اُن کے ساتھ سوتا ہے، کاش وہ بھی ایک کتاب ہوتی ـــــ

لیکن آج اُسے کیا پروا! اگر وہ کتابوں میں گھرا ہوا ہے تو رہے کمرے کی صفائی نہیں ہو سکتی تو نہ سہی، کر لی جائیگی۔

وہ نہایت شان سے کمر پر ہاتھ رکھے اِدھر اُدھر ٹہل رہی تھی وہ شب خوابی کا گون پہنے ہوئے تھی۔ پردے ابھی تک اُٹھائے نہیں گئے تھے۔ گھر کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں، سلیم کے لئے گرم پانی تیار نہیں ہوا تھا۔ آج وہ واقعی کام چور بن گئی، وہ نازسے انگڑائیاں لیتی ہوئی اور گون کے کمربند کو انگلی کے گرد گھماتی ہوئی بالکنی کی طرف جا پہنچی ـــــ مکان کے پچھواڑے چند معمولی مکان تھے۔ انہیں مکانوں میں سے ایک مکان میں وہ پیدا ہوئی تھی، بچپن میں وہ جاگیردار کے باغ میں آجایا کرتی تھی۔ سلیم بھی ابھی بچّہ تھا۔ دونوں پہروں مل کر کھیلا کرتے۔ اس کی نحیف اور کمزور ماں اکثر مالکن کے پاس آتی جاتی تھی۔ سلیم اور اُسے اکٹھے کھیلنے سے کوئی نہیں روکتا تھا۔ وہ اُسے "سیمی" کہہ کر پکارا کرتی اور وہ اُسے فاطمہ ہی کہتا ـــــ شاید فاطمہ نام بگاڑا نہیں جاتا ـــــ ان کے وہ معصوم کھیل کتنے پیارے تھے، جاگیردار اور مالکن اکثر انہیں اسی بالکنی سے دیکھا کرتے تھے۔ دونوں اس سے پیار کرتے تھے۔ حالانکہ دوسرے بچّوں کو باغ میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ کئی بار اُس نے سلیم کے ہاں بھی کھانا کھایا ـــــ سلیم کے گھر میں کوئی اور بچّہ نہ تھا ـــــ ایک دن اُس کی ماں مر گئی۔ جاگیردار اور مالکن اُن کے ہاں گئے ـــــ ماں کا جنازہ اُٹھا اور وہ جاگیردار کے ہاں آ گئی۔ دُنیا میں شاید اس کا کوئی نہ ہوگا ـــــ چند دن تو اُسے کچھ نہ کہا گیا لیکن پھر اس سے کام لیا جانے لگا ـــــ سلیم تعلیم حاصل کرنے کے لئے کسی اور شہر بھیج دیا گیا، وہ اکیلی دن بھر مالکن کا کام کرتی رہتی ـــــ کام ـــــ مشین کی طرح، مگر اب جاگیردار اور مالکن اسے پیار سے نہیں پکارتے تھے۔ بات بات پر ڈانٹ دیتے تھے۔ کبھی کبھی اس

جا کر نہ کھاتی بلکہ دوسرے خادموں کے ساتھ کھانا ملتا ـــــ اس کا کوئی خواہ بہت تو اس کی کوٹھری، جہاں وہ اس وقت بستر پر دراز یاد رفتہ میں کھوئی تھی۔

سلیم سال بھر میں ایک دو بار آتا، اب اُس کی باتیں پہلے کی طرح بھولی بھالی نہ تھیں۔ اس کی آنکھوں میں شرارت آچکی تھی۔ اکیلے میں اُسے جب بھی موقع ملتا وہ فاطمہ پر کوئی فقرہ چست کر دیتا۔ اس کے آنے سے فاطمہ کا کام اور بڑھ جاتا، مگر اُسے سلیم کے کام میں بہت لطف آتا۔ وہ راحت محسوس کرتی، لیکن وہ اس کے مذاق سے گھبراتی تھی، اُس کی شرارت سے پُر آنکھوں سے اُسے خوف آتا تھا، وہ ہمیشہ یہی کوشش کرتی تھی کہ اسکے کمرے میں تب جائے جب وہ موجود نہ ہو۔

اس نے ایک انگڑائی لی ـــــ وہ شراب حسن سے بدمست ہو رہی تھی، وہ اب جوان تھی، اس کا جی چاہا کہ وہ بھاگتی ہوئی جائے اور مالکن کے سنگار کمرے میں جاکر قد آدم شیشے کے سامنے کھڑی ہو جائے مگر کمرہ بند تھا۔ وہ صرف انگڑائی لیکر کروٹیں بدلنے لگی۔

سلیم بھی تو جوان ہو گیا تھا، بانکا جوان اور سڈول جسم، جب وہ سوٹ پہن کر نکلتا تو فاطمہ کلیجہ تھام کر رہ جاتی۔ اس کا "سیمی" اب مرد تھا۔ سُرخ و سفید چہرہ، مسکراتا ہوا، ہر وقت اس کے سامنے رہتا تھا۔ وہ بھی جوان تھی مگر سلیم کو جی بھر کر نہ دیکھ سکتی تھی ـــ کام کاج سے اُسے فرصت ہی کہاں، لیکن اگر فرصت ہوتی بھی تو ـــــ وہ مالک تھا اور فاطمہ اُن کی ایک خادمہ، مالکن کو پتہ چل جاتا تو چمڑی ہی اُدھیڑ دیتی ـــــ

اس کے کانوں میں پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں آرہی تھیں ـــــ ایک کہہ رہا تھا "سیمی" اور دوسرا جواب دیتا "فاطمہ" ـــــ گویا دو بچے کھیل رہے تھے، مگر اب یہ کہاں، صرف اسکی دُھندلی سی یاد باقی تھی۔

کمرہ دُھوپ سے بھر گیا ـــ اس وقت تک تو سارا گھر ناشتے سے فارغ ہو جاتا تھا۔ وہ ابھی تک لیٹی ہوئی تھی ـــ کام چور ـ وہ مسکرائی، اس کا جی نہ چاہتا تھا کہ وہ بستر کو چھوڑے۔ اُسے اس طرح بیکار سوچنے میں ایک لطف آرہا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹے ـــــ وہ روز کام کرتے کرتے تھک جاتی تھی۔ کل تو اُسے بہت زیادہ کام کرنا پڑا تھا۔ بیچاری دن بھر سامان باندھتی رہی۔ مالکن نے تو حد کر دی۔ اس نے اس طرح جانیکی تیاری کی گویا وہ کہیں ہمیشہ کیلئے جارہی ہے، دُنیا بھر کا سامان باندھ لیا ـــ پھر سارا گھر صاف کرایا۔ اس کے بعد بے شمار ہدایات دیں۔ وہ اُن کو سنتے سنتے تنگ آگئی تھی۔ ابھی تک وہ تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی۔ اس کا جی اُٹھنے کو نہ چاہتا تھا ـــ اگر سلیم نے شکایت کر دی کہ اُسے وقت پہ ناشتہ نہیں ملا تھا تو اسکی شامت آجائے گی، اس کا دُنیا میں ہمدرد تھا بھی کون، وہ کس کے پاس جا سکتی تھی۔

بہر حال اُسے ناشتہ تیار کرنا تھا۔ کھانا پکانا تھا۔ گھر کی صفائی باقی تھی۔ سلیم کا کمرہ دُرست کرنا تھا ـــــ آج تو وہ کمرے میں ہی ہوگا ـــ اس کے مذاق ـــ

"اوہ! سرکار ابھی تک سو رہی ہیں۔ ہمیں آج ناشتہ نہیں ملیگا؟" سلیم دروازے میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔

شیر محمد اختر

الاؤ کے گرد

[illegible] اور ڈھاک کی آوازیں کونین سے آرول کی طرف [illegible] [illegible] یوں کے سروں پر منڈلا رہی تھیں اور اونچی ٹھنڈی چوٹیوں [illegible] گہری اور بھیانک گھاٹیوں میں گرتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں، جن میں نہ معلوم کتنے خچروں اور راہگیروں کی ہڈیاں پڑی ہوئی نئی ہڈیوں کا انتظار کر رہی تھیں۔

سورج، بان اور برا س کے گھنے سایوں کے پیچھے چھپ گیا تھا اور اس کی کرنیں خشک چٹانوں پر، جو کہیں کہیں سر ابھارے کھڑی تھیں، پھیکی زردی پھیلا رہی تھیں۔ ہمارے ہاتھوں میں برف کے ڈلے تھے جو ہم نے راستے میں جمی ہوئی برف کی چٹان سے توڑ لئے تھے۔ انہیں اچھالتے ہوئے اور ان سے کھیلتے ہوئے ہم چلے جا رہے تھے اور اس وقت ہمیں ایک ایسا سرور سا محسوس ہو رہا تھا جسے واضح کرنے کیلئے میرے ذہن میں اس وقت کوئی لفظ نہیں۔

اس وقت ہم جس جگہ تھے یہ ہمارا آج کا پڑاؤ تھا۔ یہ لکڑی کے موٹے موٹے اور دلدار تختوں کی بنی ہوئی ایک چوکی تھی جو ایک اجنبی کی طرح سب سے الگ تھلگ کھڑی تھی۔ اس کے سامنے ایک ڈھلواں میدان پھیلا ہوا تھا اور دیودار کے درخت اسکے چاروں طرف ایک دائرے کی شکل میں اُگے ہوئے تھے۔ شمال میں ایک چھوٹے سے خلا میں سے دودھ والوں کے دو تین گھر دکھائی دے رہے تھے جو سورج کی دم توڑتی ہوئی شعاعوں میں نکھرے ہوئے سورج کی طرح چمک رہے تھے۔

”کیا نام ہے بھلا اس جگہ کا“ میں نے اپنے کندھے پر سے سفری تھیلا اتارتے ہوئے علوی کو آواز دیکر پوچھا۔

”کھاٹو اسے جی یہ“

میں نے پلٹ کر دیکھا، ایک دبلا پتلا، پست قد، زرد رو انسانی ڈھانچہ میرے سامنے کھڑا تھا اور اس کی گول گول آنکھوں میں زندگی ٹوٹی ہوئی امیدوں کی طرح لڑکھڑا رہی تھی۔ اس کے خشک ہونٹ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اس طرح کھل گئے تھے، جیسے کسی زرد لفافے کا منہ کھل جایا کرتا ہے۔ یہ یہاں کا منشی تھا، جو اس چوکی سے دوسری چوکی تک ڈاک لے جایا کرتا تھا۔ چاندی کا ایک پتلا سا تار اس کے کان میں پڑا تھا، ایک چھوٹا سا حلقہ، جس سے معلوم ہو رہا تھا کہ انسان کی غلامی کا دور ابھی ختم نہیں ہوا۔

چوکی کی ڈھلان سے اتر کر ایک چشمہ تھا ایک گڑھے کی صورت میں، کثیف اور گدلا، صحیح معنوں میں آب حیوان، تاریکیوں میں گم! ایک گہرا غبار ہر طرف چھا گیا تھا اور سنہرے جال سے جو دن بھر درختوں کی چوٹیوں پر پھیلے رہے تھے اب گل کر گر گئے تھے اور صاف آسمان کی نیلاہٹ پریوں کے حسین بازوؤں کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔

میدان میں ایک الاؤ جل رہا تھا، بھیڑوں کے ایک ریوڑ کے درمیان اور اس کے شعلے بھڑک بھڑک کر چیخ رہے تھے۔ لکڑی کے موٹے موٹے تنے اس کے اندر جل رہے تھے۔ الاؤ سے دھواں ٹھہر ٹھہر گول دائرے بناتا ہوا تاریک سایوں کی طرح ناچتا ہوا ہوا میں جذب ہو رہا تھا۔ برابر میں گڑی ہوئی ایک دوشنگی لکڑی پر ایک پانی کا مشکیزہ لٹک رہا تھا۔ ایک بوڑھا گڈریا بھیڑوں کے پاس کھڑا تھا۔ چلتے پھرتے اس کا سایہ طویل ہو کر تھرتھراتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا اور کرخت آواز کبھی کبھی تاریک جنگل میں گونجنے لگتی تھی، ہو ہو ہو، لہ لہ لہ اور اس کی آواز پر ایک خوفناک کتا گرج اٹھتا تھا۔

اس کے ساتھ اس کی لڑکی تھی۔ وہ اس جنگل کی شہزادی معلوم ہو رہی تھی، ان دل کش مناظر کی دیوی، اس طلسم آباد کی ساحرہ۔ وہ مجھے ایک وحشی ہرنی کی طرح دیکھنے لگی۔ اس کے پاؤں میں بالوں دار کھال کا جوتا تھا اور وہ اپنے لمبے سے کرتے کے اوپر ایک پوستین پہنے ہوئے تھی، سفید اور نازک پوستین، جس کے چھوٹے چھوٹے بال موجوں کی طرح لہرا رہے تھے اور ہم دونوں کا سایہ ایک ہی سمت میں الاؤ کی روشنی میں لرز رہا تھا۔ اس نے مجھے ایک عجیب انداز سے دیکھکر اپنی نظریں جھکا لیں اور زمین پر موہوم سے خطوط بنانے لگی۔ بوڑھا چلکر میرے قریب آگیا۔

”آؤ آؤ مسافر، کہاں سے آنا ہوا؟“

”بہت دور، پورب دیس سے“

”پورب دیس سے“ اس نے میری طرف دیکھا اور ایک موٹا سا تنا الاؤ میں لڑھکا دیا۔

"جلتی ہوئی آگ کے پاس جنگلی جانور نہیں آتے، جنگلی جانور آگ سے ڈرتے ہیں"

قریب ہی کے جنگل سے کسی جانور کے چلانے کی آواز آئی۔

"یہ ہرن کی قسم کا ایک جانور ہے" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "کسی شکاری کی بو پاکر جانور چلا اٹھتا ہے"

اور اس کی آواز پھر جنگل میں گونجنے لگی "ہو ہو ہو، لہ لہ لہ"

الاؤ کی لپٹیں اونچی ہو ہو کر موجیں مارنے اور بل کھانے لگیں اور اس کے گرد پڑے ہوئے لکڑی کے تنوں پر، جن کی باری بھی آنے ہی والی تھی، آگ کی لہریں ناچ رہی تھیں۔

میں نے کہا "یہاں پینے کا پانی بہت خراب ہے تم اور کوئی انتظام کیوں نہیں کر لیتے"

"یہاں رہتا کون ہے جو کچھ کرے، آج ہم یہاں ہیں، کل کہیں اور چلے جائیں۔ ابھی تھوڑے دنوں میں یہاں سخت سردی اور برف پڑنے لگے گی۔ برف کی موٹی موٹی سلوں کے نیچے تمام زمین ڈھک جائے گی۔ ان دنوں میں ہم اپنی بھیڑیں لیکر نیچے کے علاقوں میں اتر جاتے ہیں، یہاں کوئی نہیں ٹھہرتا"

صاف نیلے آسمان میں تارے مسکرا رہے تھے۔ چاروں طرف بلند پہاڑ خاموش کھڑے تھے۔ اور پیچ در پیچ مڑتے ہوئے پہاڑی راستے ایک گہری نیند میں ڈوب گئے تھے۔ پہاڑی پھولوں کی میٹھی سی خوشبو ہر طرف بکھری ہوئی تھی اور اونچے اونچے پیڑوں کی جڑوں میں اگی ہوئی فرن اور رس بھری کی جھاڑیاں سر سے سر ملائے کھڑی تھیں۔

بوڑھے نے لڑکی کی طرف دیکھکر کہا "یہ پالو ہے، میری لڑکی۔ جب میری شادی ہوئی تھی ہم چار بھائی تھے اور جب پالو کی ماں مری تھی اس وقت میں تنہا تھا، تنہا محافظ بھیڑوں کے اتنے بڑے ریوڑ اور پالو کا۔ ہم چاروں بھائیوں کی ایک ساتھ شادی ہوئی تھی" اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "سنا ہے تمہارے دیس میں ایک مرد ایک ہی عورت سے شادی کرتا ہے"

"نہیں مرد تو کئی کئی عورتوں سے شادی کر لیتا ہے مگر عورت صرف ایک ہی مرد سے شادی کرتی ہے"

بوڑھے کی آنکھوں میں ایک نفرت کا جذبہ تھا اور پالو کی گردن بنفشہ کی نرم ڈالیوں کی طرح کسی بوجھ سے دبی جا رہی تھی اور میں نے ایسا محسوس کیا جیسے اس کی آنکھیں کہہ رہی ہیں "مسافر مجھے بچاؤ، مجھے اس دیس میں لے چلو جہاں ایک عورت صرف ایک مرد کی ملکیت ہوتی ہے۔ میں یہ ذلت گوارا نہیں کر سکتی، میں صرف ایک آدمی سے محبت کر سکتی ہوں۔ بولتے ہوئے جانوروں کے پورے گلے سے نہیں۔ مجھے اس دنیا اور ان چرواہوں سے نفرت ہے جو ایک ہی عورت کو کئی مل کر اپنی آغوش میں پیس ڈالتے ہیں، سخت نفرت!"

بھیڑوں کی اون کی بساند ہوا میں مل کر اڑنے لگی تھی اور الاؤ کے شعلے اس پر قہقہے لگاتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ بوڑھا اونگھتے اونگھتے سو گیا تھا۔

پالو تاروں کی دھیمی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی بھیڑوں کی حفاظت کر رہی تھی۔ اس کی نرم پوستین اس کے رخساروں سے مس ہو رہی تھی اور اس کی انگلیاں ایک موٹی سی لاٹھی کا سہارا لیتے ہوئے تھیں، اور وہ گاہے گاہے اپنی بھیڑوں کے گرد ایک چکر لگا آتی تھی۔ ہوا میں گھنگرو سے بج اٹھتے تھے جب وہ مہین آواز سے ہو ہو ہو، لہ لہ لہ کہتی تھی اور اس کا خوفناک کتا سایوں کو جانور سمجھکر گرجتا ہوا ان پر جھپٹ پڑتا تھا۔

اس نے اپنی لچک دار گردن اٹھا کر مجھ سے پوچھا "مسافر تمہاری دنیا تو بہت اچھی ہوگی!"

میں اس کے غلط اندازے پر کچھ نادم سا ہو گیا اور اسے نہ بتا سکا کہ وہ دنیا جسے تم حسین خیال کر رہی ہو اس سے کہیں زیادہ کریہہ اور بدصورت ہے۔ شاید تم ہم لوگوں کے لباس اور ہماری چال ڈھال سے ہمارا اندازہ لگا رہی ہو۔ یہ غلط ہے۔ ہم عمدہ عمدہ لباس صرف اپنی حقیقت کو چھپانے کے لئے پہنتے ہیں۔ ہم اپنے اوپر ایک پردہ ڈالنا چاہتے ہیں، ایک رنگین پردہ۔ لیکن حقیقت یہ ہے ہم جتنے بھاری بھاری اور قیمتی لباس اپنے گرد لپیٹتے جاتے ہیں اتنے ہی عریاں ہوتے جاتے ہیں۔ یہ لباس ہماری تہذیب و شرافت کا کفن ہیں۔ قیمتی کفن، اور ہماری عورتوں کے ہونٹوں کی سرخی مختلف ہونٹوں کے نشانات کو چھپانے کا ایک ڈھنگ ہے۔ جب ایک شخص کے ہونٹوں کا دباؤ انہیں نیلا کر دیتا ہے اور ان کی سرخی زائل ہو جاتی ہے، جب وہ کنول کی مرجھائی ہوئی پتیوں کی مانند دکھائی دینے لگتے ہیں تو سرخی کی دوسری تہ انہیں پھر لنظر فریب بنا دیتی ہے۔

مجھے پالو کی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کی موت پر بھی رشک آنے لگا۔ وہ مر کر بھی حسین اور دلکش ہی رہے گی۔ اس کی خاک اڑ کر سیب، انجیر یا زرد آلوؤں کی کھاد بنے گی اور بہار کے موسم میں ان پر پھولوں کا ڈھیر لگ جایا کرے گا۔ جنہیں ایسی ہی یا اس ہی کی جیسی

[illegible] پہننے کے لئے آیا کریں گی۔ اس کی زہرنگی شہد اور دلکش رنگوں میں تبدیل ہو جائے گی۔ وہ میری خاک کسی کیکر یا بیری کی جڑ میں جا پڑے گی جس کے کانٹے راہگیروں کو تکلیف دیا کریں گے یا پھر کسی سود خوار بنئے کی رقم کا پہیا ان پر گھومتا جائے گا۔ میں نے یہ بات اس لئے کہی کہ انسانی فضائل کا چشمہ انسانی خباثت سے پھوٹتا ہے۔

اس نے میرے شانوں کو جنبش دیتے ہوئے کہا "تم چپ کیوں ہو گئے۔ بولو نا!"

"یہ دنیا بہت اچھی ہے، میری دنیا سے کہیں خوبصورت"

اسکی آنکھوں میں پھر ایک نفرت کا ہلکا سا جذبہ امنڈ آیا۔

پالو نے ایک عجیب انداز سے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی [illegible] میں ایک تلخی تھی۔

دور آسمان کے کونے سے ایک بڑا سا تارا ٹوٹا اور تھرتھراتا ہوا ایک روشنی کی لکیر بن کر گھنے جنگل میں غائب ہو گیا۔ الاؤ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی روشنی ہمارے اوپر پڑ رہی تھی۔ اور میں تھوڑی دیر کے لئے سوچنے لگا کہ یہی ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر پہاڑی عورتوں کی گود میں جا گرتے ہیں، بالکل خاموشی کے ساتھ، کچھ عرصہ وہاں پرورش پاتے ہیں اور پھر خوبصورت پہاڑی لڑکیوں کی صورت میں زمین پر اتر آتے ہیں اور غالباً پالو بھی انہی ٹوٹے ہوئے تاروں میں سے ایک ہے جو آج سے پندرہ سولہ سال پہلے اس پہاڑی عورت کی گود میں جا گرا تھا جو بیک وقت چار تنومند چرواہوں کی بیوی تھی۔

اس کی آنکھوں میں ایسے ایسے بے شمار تارے ناچ رہے تھے اور مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ میں آسمان میں پہونچ گیا ہوں بہت سے چمکتے ہوئے، جگمگاتے ہوئے تاروں کے درمیان اور چمکدار ذرّے اڑ اڑ کر میرے اوپر گر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ میں اُس میں ڈھک گیا ہوں۔ حسین لمحات مسکراتے ہوئے آئے اور آنکھ بچا کر گذرے چلے گئے۔ اس طرح کہ ہمیں خبر بھی نہ ہوئی۔

اُس نے جھجکتے ہوئے مجھ سے پوچھا "تم چلے تو نہیں جاؤ گے —؟"

"میں کل صبح چلا جاؤں گا!"

"صبح چلے جاؤ گے!"

اُس نے اپنی لمبی لمبی پلکیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور اسکی گردن ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح ایک طرف کو گر گئی۔

وہ کھڑی ہو گئی، اور دو روشن، ٹمٹماتے ہوئے تارے اُسکی آنکھوں سے ٹوٹ کر گھاس میں جذب ہو گئے [illegible] زمین کی نرم نرم گھاس میں جہاں بنفشہ کے پھول اُگ آئیں گے ایک [illegible] رنگت کے ہوتے جیسے پالو کے آنسو تھے۔

"تم مت جاؤ مسافر" اُس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا اور میرے کوٹ کے اٹھے ہوئے کالر میں اس طرح جھانکنے لگی جیسے وہ اس کے اندر چھپ جانا چاہتی ہے۔ میرے دل میں جذب ہو جانا چاہتی ہے —

"تم نہیں جانتی پالو، میرے ساتھی اس چیز پر راضی نہ ہونگے"

اُس نے میرا دامن چھوڑ دیا اور گردن جھکائے ہوئے بھیڑوں کے ریوڑ کی طرف چل دی۔ میں نے چوکی کے سامنے آن کر اس کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ اُس نے جلتے ہوئے الاؤ میں دو تنے اور لڑکا دئے شعلے تیزی کے ساتھ چٹخنے لگے۔ دھواں اُٹھ کر پیچ و تاب کھاتا ہوا پہاڑی پگڈنڈی کی طرح آسمان کی طرف بڑھنے لگا۔ الاؤ کی لپٹوں کا سایہ درختوں اور جھاڑیوں پر سسکیاں سی بھرنے لگا۔

پالو کی ٹوٹی ہوئی آواز مردہ جنگل میں گونج رہی تھی۔

ہو ہو ہو، لہ لہ لہ،

صبح ہوتے ہی روانگی کے لئے ہم نے اپنے سفری تھیلے اپنے کندھوں پر لاد لئے۔ شمال میں خون کی گہری گہری لکیریں سی تیر رہی تھیں۔ دیودار کی چوٹیوں پر دھند کے جالے سے جمے ہوئے تھے اور پہاڑی راستے بل کھاتے، انگڑائیاں لیتے تندی سے بیدار ہو رہے تھے۔ میں نے نکل کر الاؤ کی طرف دیکھا وہاں چند بجھی بجھی چنگاریاں اور راکھ کا ڈھیر نظر آ رہا تھا اور جل کر الگ پڑے ہوئے ایک موٹے سے تنے سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ جگہ سنسان تھی اور اس پر ایک اداسی سی برس رہی تھی۔ پالو اور اس کا بوڑھا باپ اپنی بھیڑیں لیکر جا چکے تھے!

اختر الایمان
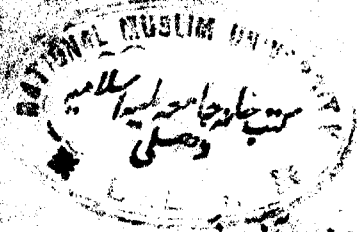
عرفان

مسافر

مہیب رات ہے تاریکیاں ہیں چھائی ہوئی ۔ تجلیات کو ہے آج نیند آئی ہوئی
فضائے تیرہ میں جب بدلیاں کڑکتی ہیں، ہزاروں بھتنوں کی پرچھائیاں لپکتی ہیں
مرے کلیجے کو پیہم مسل رہا ہے کوئی ۔ مرے خیال کے صحرا میں چل رہا ہے کوئی
گھناؤنی ہے، پُر اسرار ہے فضا ساری ۔ مرے دماغ پہ مبہم سا خوف ہے طاری

میں اک غریب مسافر ہوں کوئی راہ دکھائے
مجھے قریب کی بستی میں کوئی پہنچا آئے

آواز

یہ امتحاں ہے ترا۔ ہر قدم سنبھل کے اٹھا ۔ شروعِ عشق ہے، نومیدیوں میں ڈوب نہ جا
یہ ابتدا ہے ابھی سے نہ انتہا کو بلا ۔ ابھی نہ ڈوب۔ ابھی سے نہ ناخدا کو بلا
ترے خیال کی منزل ابھی قریب نہیں ۔ تری نگاہ میں کیا جلوۂ حبیب نہیں؟
دل و دماغ سے اب خوف کی نقاب اٹھا ۔ سہارا لے کے کسی آرزو کا، بڑھتا جا

اگر یہ مرحلۂ سخت تیرے بس کا نہیں
تو تیرا ولولۂ شوق ایک خس کا نہیں

مسافر

نہیں نہیں مرے آن دیکھے دوست بات بھی سن ۔ مرے نیاز پہ نومیدیوں کے جال نہ بن
نہ چھیڑ ولولۂ شوق کی کہانی کو ۔ کہ ٹھیس لگتی ہے میری حزیں جوانی کو
نہیں ہے بے سر و پا خواہشِ وصالِ حبیب ۔ کہ چھا رہا ہے مری روح پر جمالِ حبیب
حریمِ دوست میں ہی سر جھکا کے دم لونگا ۔ پٹخ پٹخ کے میں سر، ورنہ، جان دیدونگا

مگر گماں بھی نہ تھا مجھکو ان مصائب کا
تو ہی بتا کہ یہ صحرائے بیکراں ہے کیا!

آواز

نہیں ہے پختہ ابھی خواہشِ وصال تری ۔ بہت نڈھال ہے روحِ شکستہ حال تری
اندھیری راہوں میں سر نوچتا پھریگا ابھی ۔ سمندروں میں سفینہ ترا گھرے گا ابھی
ترے افق پہ ستارہ نہ کوئی دمکے گا ۔ کوئی چراغ نہ اِن ظلمتوں میں چمکے گا
اِسی تلاش میں کٹ جائے گی حیات تری ۔ اِنہیں خطوط پہ گھومے گی کائنات تری

تجھے جہان میں جب کچھ نظر نہ آئے گا
تو خود ہی پردۂ محمل سرکتا جائے گا

احمد ندیم قاسمی

ماں

جاگیردار فضل حسین کے گھر شادی کی دُھوم دھام تھی، باجوں کی تانیں، مہمانوں کی آمد و رفت، فقیروں اور بھکاریوں کی چیخ و پکار! سارے لوگ سینما کے اداکاروں کی طرح بنے سنورے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے، عورتیں بھول بیٹھی تھیں کہ ان کے بچے بھی ہیں اور بچوں کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ اُن کے ماں باپ بھی ہیں یا نہیں۔ ہر شخص مصروف! ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی۔ لیکن ——

لیکن کس قدر حیرت! کتنا تعجب!! ساری دُنیا سرور و کیف میں ڈوبی ہوئی اور کوٹھی کے پیچھے ایک سیل بھری کوٹھڑی میں رحمین پڑی سسکیاں بھر رہی تھی ——

کتنی مدت بیت گئی ٹھیک ٹھیک نہیں بتایا جا سکتا۔ ملک میں ہر طرف خشک سالی کی مہلک وبا پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بے رحم پنجے انسانی تباہی و بربادی میں کونسی کسر اُٹھا رکھتے ہیں؟ ناممکنات ممکنات بن جاتے ہیں۔ بے شمار انسان تڑپ تڑپ کر جان توڑ دیتے ہیں! اولاد ماں باپ سے بچھڑ جاتی ہے، بیوی شوہر کی پروا نہیں کرتی۔ گھر کی عزیز ترین چیزیں آنکھوں کے سامنے برباد ہوتی ہیں، بس ایک قیامت ہوتی ہے! شاید امیروں اور دولتمندوں کو اس کا احساس بھی نہ ہوتا ہو مگر ہزاروں غریب ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہیں اور پانی بھی میسّر نہیں آتا ——

ایسے ہی قحط میں رحمین کا شوہر اس سے بچھڑ گیا۔ اس نے رحمین کو قحط کی تیرہ و تار کھائی میں ایک ڈیڑھ سالہ بچّی کے ساتھ تنہا چھوڑ دیا۔ خود اُس کے اپنے جینے کے لالے پڑے تھے تو بھلا بچّی کو دودھ کہاں؟ کئی کئی دن فاقوں میں کٹ جاتے! کوئی بھیک بھی نہیں دیتا تھا، اور دیتا کیونکر؟ جب خود لوگوں کی اپنی زندگی دوبھر تھی! کئی دفعہ اُس نے سوچا کہ بچّی کو راستے پر ڈال کر چل دے۔ ایک دو مرتبہ کوشش بھی کی، لیکن رات کو سڑک پر ڈال کر چند ہی قدم جاتی اور پھر محسوس ہوتا —— کوئی موذی ڈس لے، کوئی جانور کچل دے یا وہ رونے لگے۔ اور پھر کب تک روتی رہے؟ —— نہیں! اسے اس طرح مرنے نہ دونگی۔ خود مر جاؤنگی —— اور پھر اُٹھا لیتی ——

ایک روز اچانک اس کے دماغ میں کوئی خیال آیا۔ وہ فوراً بچی کو کنوئیں پر لے گئی، اس کے ہاتھ مُنہ دُھلائے اور ایک سفید کپڑا اس پر ڈال کر سرِ شام گھر سے نکل پڑی۔

وہ جب جاگیردار کی ڈیوڑھی کے قریب پہونچی تو قہقہے سنائی دیے۔ وہ ٹھہر گئی، وہ گڑگڑائی —— ہم غریب وہ کونسا گناہ کرتے ہیں کہ ہمیں تو پانی بھی نہ ملے؟ اور یہ موٹر اُڑاتے پھریں؟ رنگ رلیاں منائیں؟ —— لیکن قدرت بھی ایسے وقت کب سنتی ہے۔ وہ باغیچے کے پھاٹک کے پاس کھڑی ہو گئی۔ آس پاس کسی کو نہ پاکر اندر پہونچی اور بچّی کو قریب ہی ایک گملے کے پاس رکھ کر پلٹی، لیکن پھاٹک سے باہر نہ نکل سکی۔ قدم اُٹھتے ہی نہ تھے۔ وہیں مٹی کے ایک ڈھیر کے پیچھے دب کر بیٹھ گئی۔

آدھ گھنٹہ گذر گیا، کوئی باہر نہ آیا۔ وہ کئی دن کے فاقہ سے تھی، اور تھکان سے چور چور تھی۔ وہیں پڑے پڑے غنودگی سی طاری ہو گئی۔ چند آوازوں نے اُسے جگا دیا۔ جاگیردار کا نوکر فضلو اپنے مالک سے کہہ رہا تھا۔

"پھاٹک بند کر کے پلٹا تو اُجلا کپڑا نظر آیا۔ میں سمجھا کوئی چیتھڑا پڑا ہوگا۔ مگر جب قندیل لایا تو دیکھا بچّہ!"

"کتنا خوبصورت بچّہ ہے،" جاگیردار کی بیوی کہہ رہی تھی: "قدرت بھی عجیب ستم ظریف ہے! دیکھ فضلو کسی سے نہ کہنا۔ ہم پال لینگے اس بچّی کو۔ ہمارے کوئی بچّی ہے بھی تو نہیں۔"

"چل، گھر لے چل اسے،" جاگیردار کہنے لگا: "معلوم ہوتا ہے ابھی ابھی کوئی چھوڑ گیا ہے۔ دیکھ پھاٹک کے باہر کوئی عورت تو نہیں ہے؟"

وہ چپ چاپ آنکھیں بند کئے پڑی رہی۔ سانس روک لیا۔ کوئی ادھر آ نکلے تو؟ لیکن کوئی آیا نہیں۔ کام بچانے کی خاطر یا پھر اپنی عقلمندی جتانے کی غرض سے وہ کہنے لگا: "نہیں حضور! اس طرح بچّہ چھوڑ کر قریب کون بیٹھے گا؟ کیا اسے جیل جانے کا شوق ہے؟"

بچّی اندر لیجائی گئی! رحمین نے اُسے چھوڑ دیا، ہمیشہ کیلئے۔ آج بھی وہ لڑکی زندہ ہے لیکن رحمین کی نہیں بلکہ جاگیردار کی!

دو برس تو رحیمن نے جاگیردار کے گھر کا رخ بھی نہ کیا۔ رحیمن نے گاؤں چھوڑ دیا۔ دو برس بیت گئے اور پھر وہ لوٹ آئی۔ اُسنے جاگیردار کے پاس نوکری کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اور وہ کھانا اور دو روپے ماہوار پر نوکر رکھ لی گئی۔ سچ پوچھو تو اسے تنخواہ کی مطلق خواہش نہ تھی۔ اُسے تو اپنی لڑکی کا قرب چاہیئے تھا! وہ بہت خوش تھی کہ اس کی مُراد بر آئی۔ اُس کی عطیہ اُس کے سامنے سے گزرتی لیکن وہ اُسے اپنی بچی تک نہیں کہہ سکتی تھی۔ وہ اسے "چھوٹی بیگم" کہنے لگی تھی۔

نئے سال سے عطیہ مدرسہ جانے والی تھی۔ اُسے محسوس ہوا ——— اس کی عطیہ اب سمجھدار ہوجائیگی، لکھنا پڑھنا سیکھے گی! اور سب سے اہم جزا اسے مدرسے پہونچانے کا کام بھی اُسے ہی سونپا جائیگا ——— وہ بڑی مسرور تھی!

واقعی عطیہ بڑی ذہین اور چنچل نکلی۔ اب وہ تیسری جماعت میں پڑھتی تھی۔ وہ کامیاب ہوگئی اور اعلیٰ درجے میں! جاگیردار کے گھر والے سب خوش تھے۔ ہر شخص عطیہ کو چوم رہا تھا۔ رحیمن بھی کھڑی دیکھ رہی تھی۔ اس کی ممتا کا سوتا پھوٹ پڑا۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ فضلو پاس ہی کھڑا تھا۔ کہنے لگا: "ارے تو کیوں رو رہی ہے؟"

"میری بھی ایک ایسی ہی بچی تھی۔ مرگئی بیچاری۔ مجھے اس کی یاد آگئی۔" رحیمن نے کہا۔

"اوہو! تیری چھوکری اور ایسی! کہیں گدڑی میں بھی لعل ہوتا ہے؟" اس نے کہا۔

لیکن اس بیچارے کو کیا معلوم کہ اصلی لعل گودڑی ہی میں ہوتا ہے اور کوئلے ہی میں سے ہیرا نکلتا ہے ———

عطیہ نے اپنی عمر کی بارھویں منزل میں قدم رکھا، جوانی اور بچپن کا کتنا دلفریب سنگم! ——— اس کی سالگرہ تھی۔ وہ قیمتی کپڑے پہنے شہزادی کی طرح گھوم رہی تھی۔ رحیمن کتنی دیر اُسے دیکھتی رہی۔ برتن مانجھتے مانجھتے اس کے ہاتھ رک گئے، غیرارادی طور پر آہستہ سے اس کے منہ سے نکلا: "بیگم! میں تمہیں پیار کرلوں؟"

"ہشت! گندی کہیں کی۔ بہت بڑھ چلی ہے۔ میں اب کوئی چھوٹی ہوں کیا؟ تو نوکرانی ہے، بھول گئی کیا؟ ایسا حق جتا رہی ہے جیسے میری ماں! چل کام کر اپنا۔ برتن میلے پڑے ہیں نا!"

رحیمن کا ہاتھ اک دم برتنوں پر پڑا اور آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔ اس کے آنسوؤں کے سیلاب سے وہ بھی نہ بچ سکی۔ کہنے لگی: "ارے تو نے بُرا مانا؟ اب پھر کبھی نہ کہونگی! تو مجھے اچھی تو معلوم ہوتی ہے پر لوگ کہتے ہیں، رحیمن نوکرانی ہے۔ اس سے زیادہ میل جول اچھا نہیں۔ پھر میں کیا کروں؟"

آنسو خشک ہوگئے، ہاتھ بڑی تیزی سے برتنوں پر چلنے لگا۔ وہ عطیہ کی طرف دیکھکر مسکرائی اور بولی: "یہ لوگ سچ کہتے ہیں، میں بیوقوف ہوں، مجھ سے رہا نہیں جاتا۔ تم اسی طرح ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ کیا کرو تو شاید میری عادت چھوٹ جاتے۔"

اندر سے آواز آئی اور عطیہ چلی گئی۔

عطیہ عیش و تنعم کی لہروں پر تیر رہی تھی۔ ایک روز رحیمن باورچی خانے کی کھڑکی کے پاس بیٹھی برتن مانجھ رہی تھی کہ جاگیردار کا دوست آیا۔ بڑی دیر تک ان میں باتیں ہوتی رہیں۔ جمیل بھی وہیں موجود تھا۔ باتوں باتوں میں جاگیردار کے دوست نے پوچھا کہ "جمیل کیلئے انہوں نے کہیں کوئی لڑکی بھی دیکھی ہے؟"

جاگیردار نے کہا: "اس زمانے میں لڑکیوں کی کیا کمی ہے۔ اسے پڑھائی تو ختم کر لینے دو۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کر کے تم عطیہ کو اس کے پلے باندھ دوگے۔" دوست نے کہا۔

"نہیں، یہ بات نہیں۔ مگر ایسا ہو بھی جائے تو کیا بُرا ہے؟"

"بُرا تو کچھ نہیں۔ رنگ و روپ تو خوب ہے۔ مگر اسکے حسب نسب کا بھی کچھ پتہ ہے؟"

"پتہ کیوں نہیں؟ جمیل کی خالہ زاد بہن ہے۔" جاگیردار نے کہا۔

"ارے یار کیوں چھپاتے ہو؟" دوست کہنے لگا: "فضلو نے تو کہا کہ یہ کہیں پڑی مل گئی۔"

"ایک ہی کہی۔ تو کیا تم یہ سمجھتے ہو ہم ایرے غیرے بچوں کو اس طرح گھر میں رکھتے ہیں؟" جاگیردار نے کہا: "میاں، بات یہ ہے کہ فضلو کو ہم نے نوکری سے علیحدہ کر دیا۔ اسلئے وہ اس قسم سی بدنام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

آج تک عطیہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آئی؟ وہ جمیل کو اپنا خالہ زاد بھائی ہی سمجھتی اور اس کی ماں کو خود بھی "ماں" کہتی تھی۔ لیکن آج جمیل نے مدت سے دبی ہوئی چنگاریوں کو ہوا دی۔

جمیل شہر میں پڑھتا تھا۔ جب کبھی وہ گھر آتا تو گھنٹوں عطیہ کے ساتھ گزار دیتا۔ اور وہ دونوں کس مزے سے کھیلتے۔ انہوں نے کبھی ایک دوسرے کو جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ دو معصوم دل کبھی

[illegible] سے قریب ہو رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو بےحد پسند تھے۔ [illegible] کے واقعہ نے جمیل کے خیالات میں ہیجان سا پیدا کر دیا۔ کسی [illegible] سے اختلاف پر جمیل نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو اس کے والد کے [illegible] تھا وہ عطیہ کو خوب بنا لیگا۔ بس پھر کیا تھا! عطیہ کے [illegible]۔ ادھر رحیمن کا بھی یہی حال ہوا۔ وہ نہ جان سکی کہ اس ڈرامے [illegible] ہوگا؟۔

ان ساری باتوں نے عطیہ کو بےحد ملول کر دیا تھا۔ اس کو یہ خیال بُری طرح ستا رہا تھا کہ وہ اس گھر کی نہیں ہے۔ شام کو رحیمن اپنی کوٹھڑی میں بیٹھی قندیل صاف کر رہی تھی کہ عطیہ آئی۔ وہ رونے لگی۔ رحیمن سے دیکھا نہ گیا۔ رحیمن نے اُسے سینے سے لگا لیا۔ اس کی چھاتی بھر آئی ــــــ

"بے وجہ ہلکان کر رہی ہو تم اپنے آپ کو۔ جمیل ناسمجھ ہے۔"

"اُس نے ٹھیک کہا۔ دوسرے سب لوگ کچھ چھپاتے ہیں۔ تو تو میم بتا۔ تو یہاں بہت زمانے سے رہتی ہے نا؟"

"میں جانتی ہوں! جب تمہیں یہاں لایا گیا تو میں اُسوقت یہیں تھی۔"

عطیہ کو قدرے تسلی ہوئی۔ لیکن ماں کو یاد کر کے وہ پھر رونے لگی۔

رحیمن نے کہا "چھوٹی بیگم! تمہیں کیا کمی ہے؟ بیگم تو تمہیں تمہاری ماں سے زیادہ چاہتی ہیں نا؟ تمہاری ماں بیچاری غریب ہے۔ خیال تو کرو وہ تمہیں اتنا پڑھا سکتی تھی؟"

"غریب ہی سہی ــ مجھے میری ماں چاہیئے۔ بیگم پیار تو کرتی ہیں لیکن اس میں ماما نہیں ہے۔ میری ماں تمہاری طرح نوکرانی بھی ہو تو مضائقہ نہیں وہ مجھے گود میں تو لیگی۔"

رحیمن سے ضبط نہ ہو سکا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمنڈ آیا۔ قندیل صاف کرنا رہ گیا۔ اتنے میں نوکر قندیل مانگنے آیا اور معاملہ یہیں ختم ہو گیا۔ لیکن ــــــ

اس کے بعد عطیہ اور جمیل دُور دُور رہنے لگے۔ ان کی زندگی کے راستے الگ الگ ہو گئے۔ معصوم دلوں میں کدورت پرورش پانے لگی ــــ

عطیہ نے پندرھویں برس میں قدم رکھا۔ جاگیردار کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ اُس نے اپنی بیوی سے اس معاملے میں گفتگو کی [illegible] بولی "ہمیں کہیں اور جانے کی ضرورت ہی کیا ہے میں لے ہرگز باہر نہ جانے دوں گی۔ میرا جمیل ہے! [illegible] ہوگا؟"

جمیل کو خط لکھا گیا۔ شادی کے بارے میں اس کی رائے دریافت کی گئی۔ اس خط نے جمیل کے دل و دماغ میں ایک ہلچل ڈال دی ــ عطیہ خوبصورت ہے، جوان ہے، تعلیم یافتہ ہے۔ پھر مجھے اور کیا چاہیئے! لیکن اس کا نسب؟ ذات سے کیا کام؟ کوئی کیوں نہ ہو! میرے والدین تو راضی ہیں نا! بس! ہم دونوں میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ اس کو مٹا دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اختلافات کے بغیر گرہستی بھی تو خوشگوار نہیں بن سکتی ــــــ وہ جوں جوں یہ خیال کرتا گیا عطیہ اس کے خیالات پر چھانے لگی۔ اُس نے لکھا "آپ کی مرضی و منشا میری عین رضامندی ہے!"

رحیمن کتنی ہی مدت سے ایسے انقلابات دیکھ رہی تھی۔ اس کی لڑکی اس کے قریب تھی لیکن وہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ اُسکی ہے ــ آج عطیہ کی شادی تھی۔ کل وہ اپنی گرہستی سنبھالنے والی تھی۔ لیکن رحیمن اس کی ماں ہو کر بھی اس کے اور دُنیا والوں کے نزدیک ایک نوکرانی ہی تھی ــ کتنی تلخ حقیقت!؟

* * *

اس دن کے بعد سے رحیمن کو کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ زندہ ہے یا مر گئی؟ کون جانے! لیکن اس کی کہانی کے کردار آسودگی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کی متاہل زندگی سے مسرت و شادمانی کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں ــــ

محمد عبدالقادر فاروقی

پروازِ جنوں

تھک تھک کے رہ جاتے ہیں میرے پاؤں
اور سرگوشیاں کرتا ہے یہ سارا گاؤں
ایک کہتا ہے: "یہ دیوانہ کدھر جائے گا!"
دوسرا کہتا ہے: "تا حدِ نظر جائے گا!
جی میں آئی تو اُفق سے بھی گذر جائے گا!
گر کے بیچارہ کسی کھوہ میں مر جائے گا!"
میں روانہ ہوں مگر ایک کمنڈر کی جانب
تشنہ لب جیسے بڑھے ساغرِ زر کی جانب

شام پڑتے ہی جو بستی سے نکل آتی ہے
سامنے اجڑے ہوئے قصر میں چھپ جاتی ہے
بیٹھی ہوگی کسی دیوار کے سائے میں خموش
اپنی نوخیز جوانی کے نشے میں مدہوش
کیف آنکھوں میں، تمناؤں کا سینے میں خروش
عیش امروز کی دنیا میں نہ فردا ہے نہ دوش
سر پہ دوپٹہ سیاہ رنگ کا ڈالے ہوگی!
اپنی اڑتی ہوئی زلفوں کو سنبھالے ہوگی!

چاپ سنتے ہی مرے پاؤں کی، چونک اٹھے گی
دلِ معصوم میں اک آگ سی ہونک اٹھے گی
جب مجھے سامنے پائے گی تو شرمائے گی،
سر جھکائے گی، لجائے گی، سمٹ جائے گی
میں بلاؤں گا تو پلکوں کو وہ جھپکائے گی
اور جس وقت بہم ہم کو ہنسی آئے گی
وہ یہ پوچھے گی: "بھلا آپ یہاں کیوں آئے؟"
میں کہوں گا: "یہ مرے بخت سے پوچھا جائے!"

اور ہو جائے گی جب دہر پہ مستی طاری
میرے پہلو میں سمٹ آئے گی میری پیاری
میں سناؤں گا اُسے درد بھرے افسانے
کیوں چھلک جاتے ہیں لبریز ہوں جو پیمانے
اپنے بن جاتے ہیں اک آن میں کیوں بیگانے
کیسے دیوانوں نے آباد کئے ویرانے
اور جب کھولوں گا ماحول و وراثت کے راز
تیز سانسوں میں بدل جائے گی اُس کی آواز

ماند پڑ جائیں گے جب چرخ پہ تاروں کے ہجوم
پھیل جائیں گے پُر انوار غباروں کے ہجوم
بولے گی دھیرے سے رکھکر مرے شانے پہ سر
"دل میں قوت ہو تو ماحول سے کیا خوف و خطر
میں کسی اور کی ہو جاؤں تو لعنت ہے مجھ پر
مرے اس عہد کے ضامن ہیں مرے دیدۂ تر
دہر کا خوف نہیں، آپ اگر میرے ہیں
آپ اک آج نہیں، زندگی بھر میرے ہیں!"

یہ کھنڈر ہے، یہ فصیلیں ہیں، مرے دل! خاموش!
ہو نہ جائے وہ کہیں شرم کے مارے روپوش،
— لیکن افسوس یہ کیا سانحہ اب یاد آیا!
اُس نے ماحول کے عفریت سے دھوکا کھایا!
اُس نے مدت سے مجھے یاد نہیں فرمایا!
مفت میں اُس نے مرا غنچۂ دل چٹکایا!
بک گئی وہ تو کسی اونچے زمیندار کے ہاتھ
اور سونپا ہے مجھے تعذیرِ فسوں کار کے ہاتھ

احمد ندیم قاسمی

شمالی چین کا طالب علم

[illegible] نے اعلان کیا کہ پی کنگ کے شہری ہانکو کے فتح [illegible]۔ پانچ دن تک نشاط و عیش کا بازار گرم رہے، ہر دکان [illegible] ایک جھنڈا ہو، و نیشنل گورنمنٹ کا [illegible]۔

پی کنگ کی گلی کوچوں کو نہایت شان و شوکت سے سجایا گیا۔ اس شہر کی گلیوں نے کئی بار باہر سے آنے والی فوجوں کا خیر مقدم کیا تھا اور آج بھی فاتح کے حکم کے سامنے انہیں اپنا سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ [illegible] کو جگہ جگہ پر جھنڈے لہرانے پڑے۔ کئی جگہ پر یہ لکھا ہوا تھا۔ "ایشیا میں نئے نظام کی آمد پر خوش آمدید"۔ "عوام کے دشمنوں کو [illegible] آؤ آپس میں مل کر ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالیں"۔ "چیانگ کائی شیک کی گورنمنٹ کو تباہ کر دو"۔

جگہ جگہ لوگوں کا ہجوم تھا، لیکن اس ہجوم کے پیچھے مسلح سپاہی تھے جو بندوقیں ہاتھوں میں لئے کھڑے تھے۔ بازاروں اور گلیوں میں مشین گنوں اور مسلح سپاہیوں کی اچھی طرح سے نمائش کی گئی تھی۔

جلوس کے آگے بینڈ بج رہا تھا۔ اور خوبصورت گھوڑوں پر فاتح قوم کے سپاہی سوار تھے، اور اس کے بعد چھوٹے چھوٹے ٹینک، مشین گنیں، اور [illegible] بازہ، قطاروں کی قطاریں لگاتے مارچ کر رہے تھے، اور اس کے ساتھ ساتھ، خوبصورت قیمتی موٹریں، جن میں فوجی افسر تھے، نظر آئیں۔ لیکن یہ فوجی افسر چاروں طرف سے مسلح سپاہیوں سے گھرے ہوئے تھے، اور اس کے بعد چھوٹے چھوٹے بچے، جنہوں نے لال رنگ کی قمیصیں پہن رکھی تھیں، چل رہے تھے اور پھر قلی، رکشا چلانے والے، لوہار، مستری، سب کے سب آگے بڑھتے ہوئے نظر آئے۔ ان لوگوں کی قمیصیں جا بجا پھٹی ہوئی تھیں۔ انہوں نے میلے کچیلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اسکے بعد شہر کے روسا، بڑے بڑے ساہوکار اور شہر کے شرفا کی ایک قطار نظر آئی۔ ان لوگوں نے لمبے لمبے چغے پہنے ہوئے تھے، اور آہستہ آہستہ جا رہے تھے اور آپس میں گفتگو کرتے جاتے تھے اور کبھی کبھی اچٹتی ہوئی نگاہ سے ادھر ادھر دیکھ لیتے تھے، اور ان کے چہروں سے ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے انہیں کسی بات کا خدشہ ہے۔

اور پھر بچوں کی قطاریں نظر آئیں۔ جو دو دو کی ٹولی بنا کر چل رہے تھے، بچے نہایت خوبصورت اور صاف ستھرے معلوم ہوتے تھے ہر سکول کا اپنا جھنڈا تھا، جس پر سکول کا نام لکھا ہوا تھا، اور بہت جھنڈوں پر لڑکوں نے اپنے سکولوں کا نصب العین لکھا ہوا تھا۔

اور سب سے آخر میں یونیورسٹی کے طلباء نظر آئے، جوان، بے اور طاقتور، وہ سپاہیوں کی طرح چل رہے تھے، اور ان کے ساتھ کالج کی لڑکیاں بھی چل رہی تھیں، یہ جلوس نہایت ہی عجیب معلوم ہوتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب لوگ خود نہیں چل رہے بلکہ کسی آہنی طاقت کے زیر اثر وہ جلوس میں شامل ہو گئے ہیں، انکے چہروں سے خوشی، انبساط نام کو نہ تھی۔ تماشائیوں کے چہروں پر مردنی چھائی ہوئی تھی، طلباء کے چہرے زرد تھے، لیکن ان کے چہرے ڈرے ہوئے تھے۔ بوڑھے آدمیوں کے چہروں سے ٹپکتا تھا، یہ وہ چہرے ہیں جن کی امیدیں اور امنگیں کچلی گئی تھیں، وہ بالکل ناامید نظر آتے تھے کیونکہ نہ تو انہیں اس زندگی پر بھروسہ تھا اور نہ ہی اس نئے نظام پر ——— !

آہستہ آہستہ یہ جلوس ایک کھلے میدان میں جا نکلا جہاں ایک اونچا پلیٹ فارم بنایا گیا تھا۔ مسلح پولیس لوگوں کو پیچھے ہٹا رہی تھی تا کہ گڑبڑ پڑ جانے پر وہ ان پر آسانی سے قابو پا سکے۔

بڑے بڑے افسر پلیٹ فارم پر چڑھ گئے۔ انکے چاروں طرف مسلح گارد کھڑی تھی۔ تقریر کرنے کے بہت سے سپیکر بلائے گئے تھے ان میں سے ایک نہایت موٹا بھدا سا جرنیل تھا، جس نے خاکی وردی پہنی ہوئی تھی، دو بوڑھے جاپانی تھے، جن کی داڑھیاں کافی لمبی تھیں۔ اور ایک جاپانی جنٹلمین لمبا چغہ پہنے ہوئے کھڑا تھا، پلیٹ فارم کے عین سامنے ایک تختہ آویزاں تھا، جس پر فلاسفر کنگ کے الفاظ کندہ تھے، اور جب کوئی سپیکر تقریر شروع کرتا، تو وہ تختہ کی طرف دیکھ کر تین بار جھک کر سلام کرتا، اور پھر تقریر شروع کرتا۔ سب سے پہلے [illegible] الفاظ میں تقریر کی، اسپیکر نے اس خوشی کے موقع کی نوعیت بتائی، اسکے بعد جرنیل کسی کا تعارف کرایا اور بیٹھ گیا۔

[illegible] کی کرسی سے اٹھا اور اُس نے جاپانی زبان میں تقریر شروع کر دی، اس تقریر کا ترجمہ ایک چلا چینی کر رہا تھا۔
"آج ہم اس عظیم الشان فتح کی خوشی میں، جو ہمارے بادشاہ کی فوجوں نے دشمنوں پر غلبہ پا کر حاصل کی ہے، خوشی منا رہے ہیں۔ ہم نے ان ڈاکوؤں کو شکست دی ہے، جو اس ملک میں شیطان کی حکومت کی بنیاد ڈال رہے ہیں۔ یہ وہ ڈاکو ہیں جو اشتراکیت کو اس ملک میں پھیلانا چاہتے ہیں اور اس طرح اس ملک کے امن، سکون کو برباد کرنا چاہتے ہیں، اور ملک کی تمام دولت، صنعت، حرفت کو ـــــــ"

یکایک وہ چپ ہو گیا، پستول کے چلنے کی آواز آئی، اور گولی اس کے سر کے ساتھ سرسراتی ہوئی گذر گئی، مسلح سپاہیوں نے اسپیکروں کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ اور پولس نے ہجوم کی طرف گولی چلا دی۔ پلیٹ فارم کے نیچے کھڑی ہوئی پولس نے ایک نوجوان لڑکی کو گرفتار کر لیا۔ لڑکی کے ہاتھ میں پستول تھا۔

ایک سپاہی نے لڑکی کو دھکا دیکر زمین پر پٹخ دیا۔ لوگوں کو معلوم نہ ہوا کہ کیا بات ہے۔ لیکن ہجوم نے شور و غل مچانا شروع کیا۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکے دینے لگے۔ اور باہر کی جانب بھاگنے لگے۔ گولی چلنے سے بہت سے لوگ زخمی ہو گئے تھے۔ اور ہجوم کے منتشر ہونے سے بہت سے لوگ کچلے گئے تھے۔ ان کچلے ہوئے لوگوں کا زمین سے اٹھنا ناممکن تھا۔ لوگ جلد ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ پولس نے جلد ہی ان لوگوں پر گھیرا ڈال کر گرفتار کر لیا۔ جو اشخاص گرفتار کئے گئے تھے، اُن میں زیادہ تعداد طلبا کی تھی۔ ایک مشین گن پلیٹ فارم پر لائی گئی اور اس کا منہ ہجوم کی طرف کر دیا گیا۔ جب لوگوں نے مشین گن کو دیکھا تو خوف زدہ ہو گئے اور بے تحاشہ بھاگنے لگے۔ اسی عرصے میں ٹینک چلنے لگے۔ اور مسلح فوج نے ہجوم پر دو تین بار گولی چلائی اور بہت سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔

کچھ عرصہ کے بعد بارش ہو گئی۔ اور ہجوم منتشر ہوتا ہوا دکھائی دیا اور فاتح فوج اپنی اپنی بارکوں کی طرف چلی۔ [illegible] کاریں پہونچ گئی تھیں، اور زخمی اور مردہ لوگوں کو موٹروں میں ڈال کر لے جایا گیا۔ اور شہر میں مارشل لا نافذ کیا گیا۔

فتح نانکنگ کی خوشی میں جو محفلیں آراستہ کی گئی تھیں وہ اب ماتمی جلوس بن گئیں۔ اور اس طرح خوشی و مسرت کے بجائے [illegible] ختم ہوئیں۔

[illegible] Holy Cross University کے ہوسٹل کے ایک کمرہ میں چھ جوان لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں، اور آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ ویننگ سین سگریٹ پی رہی تھی، اور سگریٹ کا دھواں کمرے کی فضا میں آہستہ آہستہ تحلیل ہو رہا تھا، کہنے لگی۔ "کیا تم جانتی ہو کہ آج کس نے حملہ کیا تھا؟"

چنگ سوئین نے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا: "کلب کی میٹنگ میں رمن نے اپنے آپ کو پیش کیا تھا، مگر وہ ڈر گئی تھی، لیکن وہ ایک عرصے سے اس بات کی خواہشمند تھی۔ اس کا بھائی ایک ماہ سے گم ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ اُس کی گولی نشانہ پر نہ بیٹھے گی۔ اور پھر ایک سال تو اس نے پریکٹس بھی نہ کی تھی۔"

لنگ جو اس کی بہن تھی، اس نے اپنے ہاتھوں اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ اور کہنے لگی: "کیا انہوں نے ـــــــ" پھر وہ چپ ہو گئی۔ "ہمیں کبھی معلوم نہیں ہوگا کہ اُس نے افیون کی گولیاں کھائیں یا نہیں؟"

سوئین نے سر ہلا دیا: "ہاں ـــــ میں اس کے سامنے کھڑی تھی، اور میں نے دیکھا کہ گولی چلانے کے بعد وہ اپنا ہاتھ منہ کی طرف لے گئی، اُسے معلوم تھا کہ ہر حالت میں اُسے مرنا ہے۔ کاش وہ کامیاب ہو جاتی۔"

اُس نے طشتری سے ایک سیب اٹھایا اور چھیل کر کھانے لگی۔ سوئی سن نے اپنا ہاتھ طشتری کی طرف بڑھاتے ہوئے سیب اٹھا لئے، تب وہ سیدھی بیٹھ گئی اور بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی، اور دروازے کی طرف گئی، اور باہر کی طرف نظر ڈالتے ہوئے دروازے کو بند کر دیا۔ اور پھر کہنے لگی: "ہم کیوں ایسی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ سب چیزیں فضول ہیں۔ ہم یہاں دشمن کو قتل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ چاروں طرف سے جاسوسوں نے گھیرا ڈال رکھا ہے۔ دشمن کی فوج ہر طرف موجود ہے۔ ہم یہاں کیوں رہتے ہیں۔ آؤ ہم بھی مغرب کی جانب چلیں جہاں چینی ابھی تک آزاد ہیں۔ جہاں ہم فاتح کے غلام نہیں رہیں گے جہاں ہم اپنے ملک کے لئے لڑ سکتے ہیں، اور آزادی کو حاصل کر سکتے ہیں۔ شمال میں ہم نہیں لڑ سکتے۔ "چین کو بچاؤ" بھلا ہم چین کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ہم یہاں [illegible]"

ویننگ سن جس کا جسم بہت بھاری تھا اور جس نے عینک لگا رکھی تھی۔ کہنے لگی: "لیکن روپیہ ـــــ؟"

"ہمیں صرف کشتی کے لئے کرایہ چاہئے۔ ایک [illegible]

[illegible] اس بات کی حد تک پہنچ کے لئے گئی تھی، اور [illegible] ایک صحت مند بچے کی طرح تھی، اس نے [illegible] اس کی ماں، اس کے رشتہ دار اس گھر کے نوکر، سب کے سب [illegible] کر رہے تھے اور ایک دوسرے کو شک کی نظروں سے دیکھ رہے تھے کسی نے بھی نہیں بتایا کہ خبر درست ہے یا نہیں۔ آخر وہ [illegible] کے پاس گئی تھی۔ وہ غصہ سے بھری پڑی تھی۔

اُسکے چچا نے کہا "تمہیں اصلیت سے آگاہ ہونا چاہیئے جاپان کا یہاں سکہ چلتا ہے۔ اگر وہ یہاں ایک اچھی مضبوط گورنمنٹ بنا سکتے ہیں، تو کیوں نہ اُن کی مدد کی جائے۔ بھلا سنٹرل گورنمنٹ نے ہماری کیا مدد کی تھی۔ ہم اُن لٹیروں کے متعلق کیا جانتے ہیں۔ ہم تو اس امید پر زندہ ہیں کہ جاپانی اپنا روپیہ لگا کر ہماری تجارت کو دوبارہ زندہ کر رہے ہیں اور ہمیں اُن کی مدد کرنی چاہیئے۔"

"لیکن چین — ہمارا وطن، وہ ہمارے دشمن ہیں۔" لی سن نے کہا۔

"یہ ملک تو کمیونسٹوں کی خانہ جنگی کا گھر بن گیا ہے۔ بے فائدہ جنگ —"

"دشمن سے روپیہ لینا ایک دغا باز کا کام ہے۔" لی سن نے اونچی آواز میں کہا۔

"خیر کوئی مذائقہ نہیں۔ اگر میں دغا باز ہوں تو تم بھی دغا باز ہو، اگر میں نے اپنے ملک سے غداری کی ہے، تو تم لوگوں نے بھی اس غداری کے نتیجے کو معاف کرنے کے لئے کوئی خاص بات نہیں کی۔ شاید تم بھول جاتی ہو کہ تم اور تمہاری ماں اور تمہارے بھائی بہن انہی روپوں پر پلتے ہیں۔ کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ میں اتنے بڑے کنبے کو کیسے پال سکتا تھا۔ ان روپوں کے بغیر میں کس طرح ان لوگوں کے لئے روٹی مہیا کر سکتا تھا۔ تم جانتی ہو کہ ہماری زمین دو سال سے کمیونسٹوں نے چھین لی ہے۔ [illegible] سے ایک پیسہ بھی آمدنی نہیں ہوئی، اگر مجھے اس گورنمنٹ سے تنخواہ نہ ملے تو کیا سارا کنبہ بھوکا نہ مرجاتے۔ تم صرف باتیں کرنا جانتی ہو۔ ملک کی محبت میں بڑے بڑے فقرے کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن تم ایک دغا باز، ایک غدار کے سہارے پلنا کوئی خاص عیب نہیں سمجھتیں۔"

لی سن نے سب کچھ سُنا۔ اُسکے چچا نے جو کچھ کہا تھا درست کہا تھا۔ اُس کے باپ کے مرنے کے بعد اُس کے چچا نے ان لوگوں کو گھر میں پناہ دی تھی اور کھانے پینے کا بندوبست کیا تھا۔ وہ مجبور تھی وہ کیا کر سکتی تھی۔ اس نے مستقبل کی جانب نگاہ کی۔ زندگی کے متعلق وہ بہت کم تجربہ رکھتی تھی۔ اس نے دنیا میں دیکھا ہی کیا تھا لیکن [illegible] کی ہوائیں اُسے پکار رہی تھیں۔

وہ زمین جہاں اُمیدیں از سر نو زندہ ہو رہی تھیں، جہاں ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی جا رہی تھی، اُس نے ارادہ کر لیا کہ وہ ضرور جائیگی۔ گو اُس کی ماں آنسو بہائے گی۔ لیکن وہ اس بات کی پرواہ نہیں کریگی۔ "ہاں میں انہیں پھر بلا سکتی ہوں۔" یہ سوچتے سوچتے وہ سو گئی۔

اور پھر لی سن اپنے چچا کے پاس گئی۔ اُس کا چچا نہایت پیار انداز سے ملا، لی سن نے اپنے چچا سے کہا کہ اُسے ایک سو ڈالر کی ضرورت ہے —!

"کیا تم کل پریڈ کرنے گئی تھیں" اُسکے چچا نے پوچھا۔

"جی ہاں"

"مجھے معلوم ہوا ہے، تم اور تمہارے دوستوں نے ایک ایسی سوسائٹی بنائی ہے جو مجھے اور دوسرے افسروں کو ہلاک کرنے پر تلے ہوتے ہیں" اسکے چچا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"لیکن میں تو اس کی ممبر نہیں ہوں" لی سن نے کہا "وینگ [illegible] اور سو کی نے مجھے ممبر بننے کے لئے کہا تھا۔

"کیا وہ ممبر ہیں؟" اسکے چچا نے پوچھا۔

لی سن کے چہرے سے خدشہ کے آثار نمودار ہوئے۔ اور وہ کہنے لگی کہ اُسے کسی کا نام نہیں لینا چاہیئے تھا۔

"مجھے تو معلوم نہیں" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"کل کا واقعہ ایک ہولی کر اس یونیورسٹی کے طالب علم نے کیا تھا مجھے معلوم ہوا ہے کہ حملہ کرنے والے دو تھے۔ لیکن وہ سرا فرار ہو گیا"

"مجھے معلوم نہیں" اور پھر وہ چُپ ہو گئی۔

"تمہارے لئے یہ موزوں ہو گا کہ تم اس انقلابی تحریک میں حصہ لینے سے باز آجاؤ"

اُسکے چچا نے دو نام ایک کاغذ پر لکھ لئے۔ لی سن یہ دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی۔

"چچا!" اُس نے کہا۔

"ٹھیرو" اُس کے چچا نے کہا "تمہیں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھنا چاہیئے کہ تمہارا رشتہ دار [illegible] تمہیں یہاں سے چلے جانے کا فوراً انتظام کرنا چاہیئے اور [illegible] بہتر ہو گا کہ تم اب کالج مت جاؤ۔ اور میں تمہیں خود [illegible]

...[illegible] بند ہوگیا۔ وہ بولنے سے [illegible] تھی، وہ جال میں پھنس چکی تھی۔ [illegible] چچا نے اسکی طرف دیکھا۔ اسکی آنکھوں میں شرارت ٹپک رہی تھی "میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تم اور تمہارے دوست بالکل ناسمجھ اور ناہل ہیں۔ وہ حالات کا اچھی طرح جائزہ کر نہیں سکتے۔ اور آنکھوں پر پٹی باندھے ایک گہری کھائی کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ مجھے آج ہی ایک لسٹ ملی ہے جس میں ان [illegible] کے نام لکھے ہوتے ہیں، جن کو آج گرفتار کر لیا جائیگا اور حالات گرفتار [illegible] نہیں گولی سے اڑا دیا جائیگا۔ تمہارا نام بھی اس لسٹ میں موجود ہے لیکن مجھے امید ہے کہ میں تمہیں گرفتاری سے پہلے باہر بھیج سکتا ہوں۔ یہ لو، ایک سو ڈالر۔ اپنی ماں سے ایک لمبا چغہ لیلو، اور اسے پہن لو۔ تاکہ تم ایک طالب علم معلوم نہ ہوسکو۔ اور تمہارے بیگ میں کوئی کتاب یا کاغذ کا پرزہ نہیں ہونا چاہیئے۔ تم چھبجے یہاں سے روانہ ہوجاؤ گے اب فوراً جاؤ اور اپنی ماں سے مل لو"

لی سن نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "کہیں جانے سے پہلے میں اپنے دوستوں کو اس بات سے آگاہ تو کردوں۔ وہ میرے دوست ہیں نا"

"تم ایسا نہیں کرسکتیں، اب بہت دیر ہوگئی ہے، یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تم یہاں آگئی ہو۔ ورنہ پولیس نے اب تک تمہیں گرفتار کر لیا ہوتا"

لی سن کی آنکھوں میں آنسو ڈھلک آئے "وہ سمجھیں گے کہ میں نے غداری کی ہے۔ میں انکے ساتھ مرنا پسند کرونگی"

اسکے چچا نے اسکے شانوں کو پکڑتے ہوئے کہا "پگلی لڑکی، اس سے کیا بنے گا۔ تمہارا دماغ اس وقت عرش پر ہے۔ تم تو کہتی تھیں کہ تم چین کے لئے کام کرنا چاہتی ہو۔ اب کام کرنے کا وقت ہے۔ اور تم اس وقت فلم کی ہیروئن کی طرح پارٹ کر رہی ہو"

لی سن بے اختیار رونے لگی۔ یہ سب کچھ درست تھا۔ وہ کیا کرسکتی تھی۔ اب کالج میں جاکر کیا بنے گا۔ شاید اسکے تمام ساتھی جیل کی ہوا کھا رہے ہونگے۔ وہ انہیں کس طرح یقین دلاسکتی ہے کہ اس نے غداری نہیں کی۔ قربانی کا جذبہ مدھم پڑگیا۔ اور اب اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے وطن کی خاطر باہر نہیں جا رہی، بلکہ اپنی جان بچانے کے لئے بھاگ رہی ہے، حالات نے اسے مجبور کر دیا تھا لیکن اب وہ کیا کرسکتی تھی۔ اسی کشمکش و پیچ، ڈر، اور انتہائی کشمکش کے بعد لی سن اپنے گھر سے روانہ ہوگئی۔

مہندر ناتھ

ساقی بک ڈپو کی دلکش کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
[illegible]	قیمت عا	آدمخور	قیمت ہجر	نرگس	قیمت ہجر
[illegible]افت	ہجر	تعویض	۵ر	رقاصہ	عمہ
[illegible]لطافت	ہجر	فرزند سرحد	۵ر	طلسم سامری	ہجر
[illegible]چی	۱۲	قرآن اور پردہ	ہجر	ریڈیو ڈرامے	عہ
[illegible]	۲ر	حدیث اور پردہ	عہ	تعلیم زدہ بیوی	۸ر
[illegible]کی ختم [illegible]	۸ر	نجم السحر	عا	پروین و ثریا	عہ
[illegible]مدی	عہ	تائیں	عا	دلی کا آخری دیدار	۱۲ر
شہزوری	۸ر	سلامبو	تمے	چار چاند	۸ر
چغتائی کے افسانے	تمہ	ہر دوپاس	۱۲ر	کہکشاں	عا
مضامین چغتائی	۱۲ر	دانتے کا جہنم	۱۲ر	ظالم محبت	عا
کمر پا بہادر	عہ	چنگیز خاں	۱۲ر	نغمات موت	۶ر
فل بوٹ	عہ	انطونی کلا بطرہ	عہ	شمشہ کا دوسرا رخ	عاہ
کیوں در کیسے	۱۲ر	ہیملٹ	عہ	ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش	عا
دیکھا جائیگا	عمہ	نغمۂ نور	عمہ	فرانسیسی افسانے	۴ر
جنت کا بھوت	۱۲ر	کیف و سرور	عمہ	دوشیزۂ صحرا	عہ
ملفوظات شامی	۱۲ر	موج طہور	عہ	فاؤسٹ	ہجر
[illegible]بیوی	ہجر	سحر بنگال	۴	سرگذشت عروس	ہجر
[illegible]خانم	للعہ	چندرا موہنی	عمہ	نرگس جمال	عمہ
مرزا جی	۱۲ر	نجمہ نوری	۱۲ر	محبت لعنت	ہجر
قرض	۵ر	سلے	۸ر		

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بک ڈپو۔ دھلی؛

کہکشاں

اُردو کے جواں مرگ ادیب رفیقی اجمیری کے چونتیس (۳۴) افسانوں کا پُرکیف مجموعہ۔ رفیقی کے افسانوں جیسے افسانے آپ نے آج تک نہیں پڑھے ہونگے۔ پلاٹ دلچسپ طرز بیان دلکش۔ ہر افسانہ زندگی کا ایک چمکتا ہوا ٹکڑا۔ حسین و متوفر۔ ضخامت ۲۴۴ صفحے۔ بڑی تقطیع۔ قیمت صہ روپے۔ محصولڈاک مع رجسٹری ۶ر

ملنے کا پتہ۔ ساقی بکڈپو۔ دھلی؛

سالنامۂ ساقی جنوری ۱۹۴۲ء

ساقی بارہ سال سے جاری ہے اور ہر سال جنوری میں اس کا سالنامہ بڑی آب وتاب سے شائع ہوتا ہے۔ اس سال بھی سامانِ طباعت اور کاغذ کی گرانی کے باوجود اس کا شاندار سالنامہ شائع ہونے والا ہے۔ مستقل خریداروں سے اس سالنامہ کی قیمت علیحدہ نہیں لی جاتی۔ ریلوے اسٹیشنوں یا شہر کے اخبار فروشوں سے عمہ میں خریدا جاسکیگا۔

مندرجہ ذیل حضرات کے مضامین موصول ہو چکے ہیں

مولانا عنایت اللہ دھلوی؛ ایم۔ اسلم۔ ماہر القادری؛ دیوندر ستیارتھی؛ عصمت چغتائی؛ احمد ندیم قاسمی؛ بھارت چند کھنہ؛ ظفر قریشی دہلوی؛ پرتھوی ناتھ شرما؛ انصار ناصری؛ اوپندر ناتھ اشک؛ سعادت حسن منٹو؛ سند باد جہازی، سید رفیق حسین؛

مندرجہ ذیل حضرات کے مضامین موصول ہونیکی اُمید ہے۔

حضرت خواجہ حسن نظامی؛ کرشن چندر، ایم۔ اے؛ حجاب امتیاز علی؛ صادق الخیری؛ پروفیسر محمد مسلم؛ راجندر سنگھ بیدی؛ عندلیب شادانی؛ ممتاز مفتی؛ انور مختار؛ شمشیر سنگھ نرولا؛ محمد حسن عسکری؛ چراغ حسن حسرت؛ اشرف صبوحی؛ شیر محمد اختر؛ محمد احمد سبزواری؛ اختر الایمان؛

مندرجہ ذیل شعرا کا کلام شامل ہوگا۔

امین حزیں؛ آزاد انصاری؛ جوش ملیح آبادی؛ شاد عارفی؛ ساغر نظامی؛ منظور؛ کوکب شاہجہان پوری؛ فرحت کانپوری؛ ن۔ م۔ راشد؛ نہال سیوہاروی؛ تابش دھلوی؛ قیوم نظر؛ صفی شمیم؛ جرم فریادی؛ مخمور جالندھری؛ تپش؛ الطاف مشہدی؛

قینچی [illegible] رسٹ واچ مفت انعام

[illegible] ہر ایک قینچی کے خریدار کو ایک معمولی رسٹ واچ مفت دینے کا فیصلہ کیا [illegible]
[illegible] جس کی گارنٹی دس سال ہے اگر اس عرصہ میں خراب ہو جائے تو ہم دوسری [illegible]
[illegible] ہندوستانی ایجاد کو قدردانوں کے ہاتھوں تک پہنچانے کی غرض سے شروع کیا گیا ہے اس لئے جن اصحاب کو [illegible]
[illegible] کے لالچ سے منگانے کی تکلیف گوارا نہ فرمائیں۔ ایسے آرڈروں کی تعمیل نہیں کی جائے گی قیمت فی قینچی ایک روپیہ [illegible]
قینچی [illegible] محصول ڈاک و پیکنگ خرچ گیارہ آنے اور دینے پڑیں گے۔ مگر تین قینچی کے خریدار کو صرف پانچ روپیہ دینے پڑیں گے [illegible]
[illegible] اور تین [illegible] رسٹ واچ بطور انعام مفت ملیں گی۔

پتہ:۔ امریکن کمرشل سٹور۔ ایس۔ ڈی۔ ناہن۔ انبالہ

آپ دولت کی تلاش کر رہے ہیں

گھر بیٹھے ۵۰، روپے ماہوار کمائیں

آپ فرنچ گولڈ کی ایجنسی لے کر ۵۰ روپے ماہوار کما سکتے ہیں یہ سونا کسوٹی پر اصلی سونے کا رنگ دیتا ہے۔ اور اصلی سونے کی طرح کوٹا اور پگھلایا جا سکتا ہے اس کا رنگ کبھی خراب نہیں ہوتا۔ آج کل کے فیشن کے مطابق ہر طرح کے زیورات ہمارے اسٹاک میں موجود ہیں۔

آپ اپنے شہر کی ایجنسی کیلئے جلدی لکھیں

تمام زیوروں کی مکمل فہرست اور تین تولہ فرنچ گولڈ دو جوڑی فینسی چوڑی دو انگوٹھی اور دو جوڑی بندے نیو ڈیزائن بطور نمونہ بھیجے جاتے ہیں۔ ہوشیار اور محنتی ایجنٹوں کو ہر قسم کی سہولت دی جاتی ہے آج ہی باقاعدہ ایجنسی طلب کریں

ایجنسی سپرنٹنڈنٹ فرنچ گولڈ سپلائی کمپنی
(رجسٹرڈ بائی دی گورنمنٹ آف انڈیا) ایس۔ ڈی۔ ناہن انبالہ

ضرورت ہے

ایک کلرک کی جو اردو اچھی طرح لکھ پڑھ سکتا ہو۔ اور خط و کتابت کر سکتا ہو انگریزی جاننے والے کو ترجیح دی جائے گی۔

تنخواہ چالیس روپے ماہوار۔ آئندہ ترقی کا موقع ہے

گپتا اینڈ کو۔ ایس۔ ڈی۔ ساڈھورہ۔ انبالہ

ایک لاکھ روپے کے نقد انعام

بیمہ زندگی مفت

شادی و بچہ کی پیدائش کے وقت معقول امداد

ایجنٹوں کی ضرورت ہے
تفصیلات کے لئے لکھئے

اورینٹل کیمیکل ورکس۔ ایس۔ ڈی۔ ناہن۔ انبالہ

پہلے آرام بعد میں رام

مکمل آرام نہیں تو کچھ نہیں

اپنی بیماری کا مفصل حال لکھ کر بھیجیں

اصلی ہندوستانی شفاخانہ۔ ایس۔ ڈی۔ [illegible] انبالہ

ضمیمہ ساقی دہلی

آتاترک

(لائبریری اڈیشن)

از:۔ محمد مرزا دہلوی

ترکی کے نجات دہندہ اور بیسویں صدی کے حیرت انگیز آہنی انسان غازی مصطفےٰ کمال اتاترک کی ایک ایسی سوانح حیات مرتب کی گئی ہے جسے معلومات اور اس جلیل القدر ہستی کی سیرت کی لاجواب انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو بجا ہے۔ یہ کتاب اتاترک کے مخالف اور موافق حضرات کی لکھی ہوئی پچاسیوں کتابوں کے مطالعہ کے بعد لکھی گئی ہے۔ جمہوریہ ترکی کی تاسیس و دستوری حکومت کا انتخاب، ملاؤں اور درویشوں کی قدامت پرستی اور شورش۔ اتاترک کے انقلابی ہنگامے۔ آئندہ ترکی کی پوزیشن سیاست میں کیا ہوگی۔ اتاترک کی شخصیت کیا معنی رکھتی ہے۔ اس کے ذاتی خصائل نے ترکی کی تشکیل و تعمیر میں کیا کیا مدد دی اور اس قسم کے دیگر سوالات کا جواب آپ کو مصطفےٰ کمال کی کسی سطحی سوانح عمری میں نہیں ملے گا۔ "اتاترک" اس کا صحیح عکس آپ کے سامنے پیش کریگی۔ تین سو صفحات کی ضخامت۔

اس کتاب کے متعلق ہندوستان کے مشہور اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے مستند ادبی رسالے "اردو" نے جولائی ۱۹۳۹ء میں یہ رائے ظاہر کی ہے:۔

"اس کتاب میں محمد مرزا صاحب دہلوی نے اتاترک غازی مصطفےٰ کمال کے حالات زندگی بڑی محنت اور غائر مطالعہ کے بعد لکھے ہیں اور یہ غازی اعظم کی تمام و کمال سوانح عمری ہے اور اسکی زندگی کے ہر پہلو اور ہر کارنامے سے بحث کرتی ہے۔ آخری باب میں اتاترک کی سیرت کی بہت ہی اچھی تصویر کھینچی ہے۔ اردو میں اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن ایسی جامع کتاب اب تک ہماری زبان میں نہیں لکھی گئی تھی"

اور ملک کا دوسرا مشہور ادبی رسالہ "نگار" اپنی جولائی ۱۹۳۹ء کی اشاعت میں لکھتا ہے:۔

"اتاترک" غازی مصطفےٰ کمال اتاترک کی سیرت پر اردو میں سب سے آخری کتاب ہے۔ جس میں عصمت انونو جانشین اتاترک کے بھی مختصر حالات درج کر دیئے گئے ہیں۔ اتاترک دنیا کی ان مشہور ہستیوں میں سے تھا جس پر ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھا جائیگا اور دنیا مختلف حیثیتوں سے اسے یاد رکھے گی۔ یہ کتاب جناب محمد مرزا دہلوی کی تالیف ہے اور باوجود مختصر ہونے کے بہت جامع ہے۔ اس بطل اعظم کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو ترک کر دیا گیا ہو۔ فاضل مؤلف نے کافی محنت و کاوش سے اسے مرتب کیا ہے اور زبان و انداز بیان بہت شگفتہ ہے۔ متعدد تصاویر بھی شامل ہیں اور طباعت و کتابت بہت پسندیدہ ہے"

کتاب کا ڈیزائن اردو میں بیمثال مانا گیا ہے۔ دیگر تصاویر اور نایاب نقشے اردو میں اس تصنیف کو مدت العمر یادگار بنائے رہیں گے۔

ان خصوصیات ادبی اور طباعتی خوبصورتیوں کے باوجود قیمت صرف دو روپیہ علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ:۔ دائرۂ ادبیہ، دریا گنج دہلی

چند علمی و ادبی شہپارے

سلامبو شہرۂ آفاق انشا پرداز گسیتو فلابیر کا شہپارہ جس میں قرطاجنہ قدیم کی مٹی ہوئی تہذیب اس طرح الفاظ نویس تعمیر کی گئی ہے کہ اب سے دو ہزار سال پہلے کی تصویر آنکھوں کے آگے آجاتی ہے۔ ضخامت ۵۰۰ صفحات۔ قیمت ہر دو حصص مکمل تین روپے علاوہ محصول ڈاک۔

نجم السحر پانچہزار سال پہلے جب مصر کی تہذیب اپنے معراج کمال پر تھی تو رب عمون کی بیٹی ملکہ نجم السحر نے سر بفلک محلوں میں آنکھیں کھولیں۔ پروان چڑھی، جوان ہوئی اور پھر اسکی داستان عشق شروع ہوئی۔ ضخامت ۵۰۰ صفحات۔ قیمت عہ؍ علاوہ محصول ڈاک۔

محبت اور نفرت ملک کے جدت طراز ادیب اختر حسین رائپوری کے سولہ افسانوں کا مجموعہ جو ملک میں بہت مقبول ہو چکا ہے۔ قیمت ایکروپیہ علاوہ محصول ڈاک۔

مضامین محمد علی مرتبہ پروفیسر سرور صاحب، مولانا محمد علی کی مذہبی سیاسی، ادبی اور اجتماعی زندگی کی سرگرمیوں کا نہایت دلاویز مرقع۔ قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے۔

خانم مرزا عظیم بیگ چغتائی کی معرکۃ الآرا تصنیف جس کا ہر افسانہ بیحد مقبول ہو چکا ہے۔ قیمت مجلد چار روپے۔

چمکی مصنفہ مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ یہ ناول مرزا صاحب کا شاہکار تسلیم کیا گیا ہے۔ قیمت قسم اعلیٰ عہ؍ قسم دوم عہ؍۔

روح ظرافت چغتائی صاحب کے آٹھ نہایت دلکش افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت ایکروپیہ آٹھ آنے۔

مسٹر کرٹھلے یعنی اعلیحضرت ہز ہائنس ڈیوک آف ونڈسر کی نام کھلا مکتوب مرزا صاحب کی عجیب و غریب تصنیف۔ قیمت ایکروپیہ۔

کولتار چغتائی صاحب کا وہ ناول جو اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے بہت مشہور ہو چکا ہے پہلا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا دوسرا اڈیشن چھپکر تیار ہے۔ قیمت دو روپے علاوہ محصول ڈاک۔

روح لطافت چغتائی صاحب کے آٹھ چیدہ چیدہ افسانوں کا مجموعہ ہر افسانہ بیحد مقبول ہو چکا ہے۔ قیمت عہ؍ علاوہ محصولڈاک

شعلے غلامی کی خس و خاشاک جلانے والے افسانے۔ دوسرا اڈیشن مجلد ایکروپیہ۔

دیکھا جائیگا چغتائی صاحب کا مختصر معرکۃ الآرا ناول ہے جسمیں دکھایا گیا ہے کہ عام طور پر آجکل "محبت کا کیا مفہوم ہے" قیمت ایکروپیہ علاوہ محصول ڈاک۔

کمزوری "اے عورت تیرا نام کمزوری ہے" چغتائی صاحب کا ایک اور زبردست شاہکار، قیمت صرف دو روپے علاوہ محصول ڈاک۔

چغتائی نمبر اس میں مرزا صاحب کے دو ناول "شہزوری" اور "سوانح کی روحیں" اور پندرہ افسانے شامل ہیں قیمت ۱۲؍

تائیس یورپ کے بہترین مصنف کی بہترین تصنیف کا اردو کے بہترین مترجم مولوی عنایت اللہ دہلوی کے قلم سے ترجمہ۔ قیمت دو روپے

افسانۂ پدمنی چتوڑ کی رانی پدمنی اور سلطان علاؤ الدین خلجی کی داستان عشق اور اس کی مورخانہ تحقیق۔ قیمت ایکروپیہ علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ:- دائرۂ ادبیہ دریا گنج دہلی

ہر سال ساقی کے دو خاص نمبر شائع ہوتے ہیں مستقل خریداروں سے اُن کی قیمت الگ نہیں لی جاتی

جُرعات

چندہ سالانہ پانچ روپے
ششماہی تین روپے
مع محصول ڈاک
ممالک غیر سے ۱۰ شلنگ

جلد ۲۴ — ساقی دہلی۔ بابت ماہ دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء — نمبر ۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

[illegible] سے اس سال جتنا نقصان رسائل کو پہونچا اتنا نقصان گزشتہ بیس سال میں کبھی نہیں پہونچا ہوگا۔ [illegible] گرانی ناقابلِ برداشت نہیں کی [illegible] میں عذاب جان بن گئی۔ ہندوستان کے کارخانے پوری قوت سے کام کر رہے ہیں لیکن [illegible] کا غذ مقتا ہے۔ کاغذی کہتے ہیں کہ ملوں ہی سے ہمارے پاس کاغذ نہیں آ رہا، ہم گاہک کو کہاں سے دیں؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ کاغذیوں کو پوری نہیں تو آدھی مقدار میں [illegible] سے کاغذ ضرور مل رہا ہے جسے وہ دُگنی اور تگنی قیمت پر بازار میں بیچ رہے ہیں۔ جب کارخانوں کے ہیڈ آفسوں سے اس ناجائز نفع بازی کی شکایت کی جاتی ہے تو اس کا کوئی تدارک نہیں کیا جاتا۔ اس لئے گاہک جو کاغذ خریدنے پر مجبور ہے کئی کئی گنی قیمت دیکر کاغذ خریدتا ہے۔ اخبارات نے جب سخت احتجاج کیا تو حکومت نے انہیں لائسنس دیدیا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ اخبار والے باہر سے خود کاغذ منگانے لگے اور کاغذیوں کا شکار بننے سے بچ گئے۔ لیکن ایسے لائسنس صرف اُن رسائل و اخبارات کو دئے گئے ہیں جنہوں نے [illegible] سے اب تک [illegible] کاغذ لگایا ہے۔ جو رسائل عمدہ سفید کاغذ پر چھپتے رہے انہیں یہ لائسنس نہیں دیا گیا۔ اب ذرا اُن رسائل کی بے بسی پر غور کیجئے جو سفید والی زیر باری گوارا کر کے اب تک سفید کاغذ پر چھپتے رہے۔ اِدھر تو سفید کاغذ بازار سے انہیں ملنا بند ہوگیا اور اُدھر حکومت نے بھی انہیں لائسنس دینے سے انکار کر دیا۔ ازاں شو راندہ وازیں شو درماندہ۔ گویا اس جنگ کے زمانے میں صرف اخبارات کو زندہ رہنے کا حق ہے۔ باقی رسائل وجرائد اگر زندہ رہ سکتے ہوں تو رہیں ورنہ جہاں اُن کا جی چاہے چلے جائیں۔ آخری صورت یہ باقی رہ گئی تھی کہ براہ راست ملوں سے رحم وکرم کی درخواست کی جائے کہ اِن بدنصیب رسالوں کو جن میں سے بعض تیس پینتیس سال سے ان ملوں کا کاغذ خرید رہے ہیں، اِس آڑے وقت میں کچھ کاغذ مل جایا کرے۔ لیکن بفضلہ وہاں سے بھی ٹکا سا جواب مل گیا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ یہ وقت نفسا نفسی کا ہے۔ احسان یا امداد کی توقع جس نے رکھی اس نے ع۔ دماغ بیہودہ پخت و خیال باطل بست۔ اب تو جہاں سے بھی اور جس قیمت پر بھی کاغذ ملے خریدو اور لگاؤ، ورنہ وہاں چلے جاؤ جہاں سب کو دیر سویر جانا ہے۔

اس مصیبت کے وقت میں ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ساقی کا سالنامہ شائع ہو رہا ہے! اور کوشش یہ ہے کہ جو روایت قائم ہو چکی ہے اس میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہماری اور ہمارے ساتھ ناظرینِ ساقی کی توقعات کہاں تک پوری ہوتی ہیں۔

احمد ندیم صاحب قاسمی اطلاع دیتے ہیں کہ اُن کے قطعات کا مجموعہ "دھڑکنیں" عنقریب اُردو اکیڈمی لاہور سے شائع ہونے والا ہے۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے اس کا دیباچہ لکھا ہے۔ ناظرینِ ساقی کو یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ قاسمی صاحب جدید شاعری میں ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ ساقی بک ڈپو سے چند نئی کتابیں دسمبر ہی میں شائع ہونے والی ہیں۔ حضرت بہزاد لکھنوی کا نیا مجموعۂ کلام "[illegible]" کے نام سے شائع ہونے والا ہے۔ اس کے بعد عصمت چغتائی کے مضامین کا مجموعہ "کلیاں" شائع ہوگا اور اُمید ہے کہ دسمبر ختم ہونے سے پہلے [illegible] کے بیس افسانوں کا مجموعہ "دھواں" بھی شائع ہو سکے گا۔ ان کتابوں کی اشاعت کے بعد دو اور عمدہ کتابیں جنوری میں شائع ہوں گی [illegible] کی تصنیف "گنہگار" ہے اور دوسری مسٹر اوپندر ناتھ اشک کا ناول "ستاروں کا کھیل"۔ اُمید ہے کہ ان سب کتابوں سے [illegible] اضافہ ہوگا۔ شائقین ان کتابوں کے منتظر رہیں۔

شاہد

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا سالنامہ ڈاک میں ضائع نہ ہو تو [illegible] کے ٹکٹ اس کی رجسٹری کیلئے دفتر ساقی کو بھیجئے [illegible]

[illegible] دوبارہ بھیجنا ہمارے لئے ممکن نظر نہیں آتا تاہم اپنے ناظرین کو ہم یقین دلانا چاہتے ہیں کہ [illegible] خریدار حضرات [illegible]

[illegible]

[illegible] بہت [illegible] انقلاب عظیم نہیں پیدا کیا بلکہ ہمارے اخلاق [illegible] کو بھی یکسر بدل ڈالا۔ گھر کی حد بندیاں کر کے ہماری ذہنیت [illegible] کے مطابق اولاد کی تعداد کو کم رکھنے کی فکر ہو گئی۔ [illegible] تو یہ ہوا کہ ہمارے بچوں کے مستقبل کو زبردست [illegible] یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید آنے والے دور میں ماہرین نفسیات کو انسانوں کی تفریق ان کے مکانوں کی ساخت کے مطابق کرنی پڑے۔ گھروں میں جگہ کی تنگی کا ایک نتیجہ تو یہ ہو رہا ہے کہ شادی کے بعد بجائے والدین بننے کی تیاری کے لوگوں کو قطع نسل کے مطالعے سے زیادہ دلچسپی ہو جاتی ہے۔ ہمارے نوجوان شادی شدہ جوڑوں کو [illegible] لوح افراد بہت حیرت سے دیکھتے ہیں۔ انہیں خود غرض اور عیاش مزاج کہا جاتا ہے اور پیدائش کی تعداد گھٹنے پر نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ ایسے بھی کچھ لوگ ملیں گے جن پر یہ الزام صادق آتے ہوں لیکن بڑی تعداد درمیانی طبقہ کے شہریوں کی ایسی ہے جن کو اس فعل کی بنا پر خود غرض کہنا انصاف کا خون ہو گا! اور ان کے اس فعل کو ایک حد تک خود غرضی تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس خود غرضی کے ذمہ دار وہ حالات ہیں جن سے معترضین کو مڈبھیڑ کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

آج کل کی شہری زندگی میں بچوں کی تربیت پچھلی پشت کے مقابلے میں بہت زیادہ دشوار ہو گئی ہے۔ اب نہ ملازمین سستے ہیں اور نہ وہ خلوص کے ساتھ اپنا گھر سمجھ کر مالکوں کی خدمت کرتے ہیں۔ پہلے مکان اتنے کشادہ ہوتے تھے اور بند اور کھلی جگہ کی اتنی بہتات تھی کہ قطع نسل کا تخیل ہی کسی کے ذہن میں نہ آتا تھا لیکن آجکل کے فلیٹ میں رہنے والے درمیانی طبقے کے نوجوان میاں بیوی یہ محسوس کرتے ہیں کہ پہلا بچہ ہوتے ہی گھر حوالات کا نمونہ بن جائے گا، برسوں تک بیوی میاں کے ساتھ باہر نہ جا سکے گی۔ زیادہ ملازمین رکھنے کی ان میں استطاعت نہیں، دوستوں کے گھر دور دور ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی مرد کی تفریح عورت کی دلچسپیوں سے الگ ہو جاتی ہے اور ابتدا ہی سے گھریلو زندگی میں اتحاد کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کو یہ خاکہ مبالغہ آمیز نظر آئے تو ذرا اپنے چاروں طرف نظر دوڑائیے اور اولاد والے احباب کی زندگی سے بے اولاد دوستوں کی زندگی کا تقابل کیجئے۔ کتنے نوجوان والدین اسی آزادی سے زندگی بسر کرتے ملیں گے جو آزادی اب سے پچاس سال قبل ممکن تھی۔ قبل اس کے کہ آپ بے اولاد جوڑے پر طعن کریں ان کے حالات کا جائزہ تو لیجئے۔

آپ دیکھیں گے کہ شہروں کے نناوے فی صدی مکان ایسے ہیں جن میں بچوں کی نشوونما کے لئے مطلق سہولتیں نہیں ہیں۔ اگر بچوں کو اپنے فطری رجحانات کی پوری آزادی دیدی جائے تو شاید ان "عافیت گاہوں" میں زندگی دشوار ہو جائے۔ فرش، دیوار اور چھتیں جن کا فعل آج کل آواز کو بجائے مدھم کرنے کے تیز کرنا ہو اکرتا ہے ننھی جانوں پر طرح طرح کی پابندیاں عاید کر رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اوپر والے نیچے والے اور پہلو والے ہمارے بچوں کی جا و بیجا روک ٹوک کرتے رہتے ہیں اور اُن کو جذبات کے اظہار کی پوری آزادی نہیں [illegible] ہوتی۔ کمروں کی جسامت اور احاطہ کا اختصار دیکھئے اور بچوں کی فطرت پر نظر ڈالیئے۔ ہمیں تو بچپن میں کھیلنے کے لئے بڑے بڑے میدان اور باغ ملے لیکن ہمارے بچوں کے لئے یا تو پندرہ فٹ مربع کمرہ ہے اور یا فلیٹ کے آگے چند مربع گز زمین جسے تسکین خاطر کے لئے ہم باغ کہہ لیتے ہیں۔ اگر بچے کے جذبۂ تجسس نے اسے احاطہ کی دیوار پر چڑھنے کو اُبھارا تو پڑوسیوں نے ڈانٹ کر اُسے ٹھنڈا کر دیا۔ درخت کی [illegible] مٹی کے تودے جن سے طرح طرح کے کھیل وہ اپنے لئے خود ایجاد کریں انہیں کہاں نصیب! اور اس طرح تحقیق و اختراع کی صلاحیت جو کہ تعلیم کا نہایت ضروری عنصر ہے ان کو کہاں سے میسر ہو؟ آپ کہیں گے کہ بچوں کی تفریح گاہوں اور پارکوں میں ان کے لئے بہتیرے کھیل مہیا کر دئے گئے ہیں، جہاں وہ آزادی کے ساتھ اُچھل پھاند کر سکتے ہیں، لیکن بنے بنائے ہنڈولے اور جھولے میں وہ خوشی نہیں پیدا ہو سکتی جو درخت کی شاخ کھوج کر اور مٹی کا تودہ تیار کر کے اپنے ہاتھوں سے ہنڈولا بنانے میں بچوں کو ہوتی ہے۔ گرتے ہیں اور بار بار اس کا توازن ٹھیک کرتے ہیں اور اس طرح کھیل ہی کھیل میں بہت کچھ سیکھتے ہیں۔

جس طرح آج کل کے والدین کی بعض مشکلات بالکل انوکھی ہیں اسی طرح ان کا حل بھی نئے سرے سے دریافت کرنا ہوگا۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ نہ والدین پہلے کبھی بچے کی تربیت کے اہل تھے اور نہ اب ہیں۔ ہاں پہلے ان کی تعلیم کے اثرات اتنے نمایاں نہ تھے جتنے اب ہو جاتے ہیں کیونکہ پہلے والدین کے بہتیرے [illegible] بچوں کو کافی موقع ملتا تھا لیکن آج جبکہ تہذیب [illegible] مجبور کر رہی ہے اور لوگوں میں عموماً ایک بچے سے [illegible] نہیں پیدا ہوتا تو نااہل والدین بچے کے لئے [illegible] بچے کی دیکھ بھال کے سلسلہ میں کہیں کہیں [illegible]

[illegible] یہ بات اہم نہیں سمجھی جاتی ہے کہ بچے کی صحت جسمانی کا لحاظ
اب سے [illegible] بھی اس خیال سے نہیں کیا گیا۔ اس کا لباس، اس کی غذا
اس کے لئے تازہ ہوا اور روشنی، سائنس کے دریافت کردہ اصولوں
کے مطابق ہیں۔ لیکن اس تازہ ہوا کی ضرورت کے احساس نے نوجوان
ماؤں کیلئے مزید مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ جہاں ایک پشت قبل یک
طرف گھر کا کاروبار ہوتا تھا تو دوسری طرف کپڑوں میں لپٹے لپٹائے
انہیں گرم اور گھٹے ہوئے کمروں میں بچے رینگا کرتے تھے وہاں آجکل
کی ماں کو اپنے خانہ داری کے فرائض اس طرح ترتیب دینے پڑتے
ہیں کہ صبح و سہ پہر کا زیادہ وقت وہ اپنے بچے کے ساتھ کھلی جگہ پر
گذار سکے اور اس طرح ماں کی مصروفیتوں میں بہت بڑا اضافہ
ہوگیا۔

دوسری ظاہری ترقی عورت کے فرائض میں مرد کے شریک
ہوجانے سے ہوئی۔ اور اپنی خود غرضی کی بنا پر کسی طرح سے مرد نے
بہتر ماں بننا ثابت کر دیا۔ مرد فطرتاً دایہ تو ہے نہیں اس لئے وہ بچّو
کی طرف سے جو مفید لاپرواہی برتتا ہے وہ بچے کی نشو و نما کے لئے
بہتیرے تعلیمی فوائد کی حامل ہوتی ہے۔ اور یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ
بچے کا نفسیاتی مطالعہ زیادہ تر مردوں ہی نے کیا۔ کیونکہ وہ اس
نتیجے پر پہونچا کہ جو ہاتھ گہوارہ جنبانی کرتا ہے وہ دُنیا کو تباہ بھی کر سکتا
ہے۔ جس ماں کے قدم کے نیچے جنت ہو سکتی ہے اُنہیں قدموں کے
تلے دوزخ بھی ہو سکتی ہے۔ اس نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ لوریوں سے
بچے کو کوئی تسکین نہیں ہوتی بلکہ ان کا وہی اثر ہوتا ہے جو آج کل بچوں
کے خاص ریڈیو پروگرام کا ہوتا ہے۔ ہمارے بڑے بوڑھے جو گہوارنے
اور لوریوں کے بڑے حامی تھے بڑی حد تک اس رواج کے ذمہ دار
ہیں۔ غالباً انہیں کے مضر اثرات کا یہ نتیجہ ہے کہ رات کے کلب اور
شب کی محفلوں کا رواج اب بھی عام ہے۔ ان میں شریک ہونیوالے
وہ پیر نابالغ ہیں جنہیں جوانی میں بھی لوریوں کی لت سے مفر نہیں
اور جب تک جمانے کی سریلی آوازیں انکے کانوں میں نہ گونجیں یا ڈانس
کے ذریعہ جھولے کا لطف نہ اٹھالیں انہیں نیند ہی نہیں آتی۔

افسوس اس پر ہوتا ہے کہ پچھلی پشت کی طرح آجکل کے
والدین بھی بچے کی دماغی صحت کے اصولوں سے بالکل نابلد ہیں۔
[illegible] جسمانی صحت پر دیتے ہے۔ لیکن پہلے تو اس کا احساس ہی
[illegible] بچے کے ذہن میں بھی اثر لینے کی صلاحیتیں اسی طرح موجود
[illegible] اس کے [illegible] کو صرف معلومات کا گنجینہ

تصور کیا جاتا تھا اور وہ بھی ہمیشہ صحیح معلومات نہیں بلکہ ضرورت سے
زیادہ محتاط والدین کے منتخب کردہ معلومات کا۔ ان کو سچائی کے
چھپانے پر فخر ہوتا تھا اور بالآخر اپنی غلط بیانیوں کے سبب خود بھی
غلط فہمیوں کا شکار بن جاتے تھے۔ کیونکہ بچے کو اصلیت جاننے کی
جستجو ہونی لازمی ہے اور اپنی تحقیقات کو ایسے والدین سے پوشیدہ رکھنا
بالکل فطری۔ اس نظریہ کی تشریح کے لئے شاید یہ واقعہ مفید ثابت
ہو۔ ایک صاحب نے اپنے بچے کو جس کی عمر چھ سال کی تھی اپنے
پاس بلایا۔ اور کہا کہ مالی نے آج صبح گوبھی کے کھیت سے تمہارے
لئے ایک ننھی سی بہن لاکر دی ہے تم اپنے بڑے بھائی کو (جس کی عمر آٹھ
سال تھی اور جو بورڈنگ اسکول میں پڑھتا تھا) لکھدو کہ تم دونوں
کے لئے مالی نے بڑی پیاری بہن لاکے دی ہے۔ بچہ نہایت ہی
معصومیت سے گیا، خط لکھا، اُسے بند کیا اور ڈاک میں بھیجنے کے
لئے باپ کو لاکر دیدیا۔ باپ کو تشویش پیدا ہوئی کہ دیکھیں بچے نے
لکھا کیا ہے۔ خط پڑھا تو والد صاحب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں
لکھا تھا۔

"پیارے بھائی۔ تم شرط ہار گئے۔ اب تو میں لڈّو لے لوں گا۔ اماں
کے ہاں لڑکی ہوئی ہے"

آج کل قطع نسل نے دلچسپی ہونے کے سبب جنسی مسئلے زیادہ
سمجھداری کے ساتھ مطالعہ کرنے پڑتے ہیں اس لئے لوگوں کو اعضا
کے سمجھنے اور اُن کے افعال جاننے میں شرم دامنگیر نہیں ہوتی۔ تاہم
ایسے والدین بھی بہت ملتے ہیں جو اپنے بچوں کے فطری سوالات کا
صحیح جواب دینے میں کوتاہی کرتے ہیں۔ یہ لوگ ندامت اور غیرت
میں فرق نہیں سمجھتے۔ ان کے اس تجاہل سے بچے کو یہ تخیّل ہونے لگتا
ہے کہ اس کا جسم کثیف ہوگا اسی لئے والدین راز فاش کرنا نہیں چاہتے۔
والدین یہ خیال کرتے ہیں کہ سمجھ آنے پر بچے کو خود علم ہوجائیگا لیکن
جھوٹ کا اثر جھوٹ کے ظاہر ہوجانے پر بھی باقی رہتا ہے۔ ایک چھ
سال کی لڑکی پڑوس کے مکان میں کھیلنے گئی۔ وہاں ایک چار سال
کے لڑکے کو ماں نہلا رہی تھی۔ اس عورت نے بچے کے نہلانے میں
اس لڑکی کی امداد چاہی تو لڑکی نے ناک بھوں چڑھا کر جواب دیا۔
"اماں کہتی ہیں لڑکے گندے ہوتے ہیں ان کو ہاتھ نہ لگانا" [illegible]
مخالف کے متعلق اس قسم کی ابتدائی تعلیم کے اثرات [illegible]
ہوں تعجب نہیں۔ بچے کی ساری زندگی پر [illegible]
اور بلوغ کے بعد جب [illegible]

[illegible] معیوب اور قبیح سمجھے
[illegible] سے ناواقفیت کے
[illegible] روشنی ڈالنے اور معلومات
[illegible] دورِ ماسبق میں اس لاعلمی کے
[illegible] نمایاں نہ تھے۔ مگر اب جبکہ زندگی
[illegible] اور بچوں کا والدین سے چو بیسر
[illegible] خرابیاں پیدا ہونے کے اندیشے بھی بڑھ گئے ہیں۔
[illegible] کے والدین اس الزام پر ناک بھوں چڑھائیں کہ
انہیں [illegible] اور پدری فرائض انجام دینے کے لئے نااہل قرار دیا
گیا۔ لیکن [illegible] اور بار بار وہ خود اس کمزوری کا اقرار کرتے رہتے
ہیں۔ اپنے بچے کے متعلق اکثر والدین کو میں نے یہ کہتے سُنا ہے
معلوم نہیں اسے کس طرح درست کیا جائے، اس کا مزاج میری
سمجھ میں نہیں آتا، میرا اس پر کوئی قابو نہیں چلتا، نہ جانے یہ کیوں سُست
ہوگیا ہے، یہ بچہ بھی ایک معمّہ ہے" وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ حضرات اپنے
ان بھولے بھالے محبت آمیز فقروں سے خود یہ بتاتے ہیں کہ وہ اپنے
فرائض کو سمجھے نہیں اور اماں یا دا بننے کی اہلیت کو ناقابلِ رجحان
مسئلہ خیال کرتے ہیں۔ اپنی غلطیوں سے لاعلمی کا کس حسن کے ساتھ
اظہار ہوتا ہے! بچے کے مسئلوں کا حل کرنا ان کے بس میں نہیں،
اس لئے کہ کبھی اس کے ذہنی رجحانات کا مطالعہ کرنے کی فکر ہی نہیں
کی اور والدین بننے کے بعد مصروفیتیں اس کی اجازت نہیں دیتیں
کہ اس مطالعہ پر وقت صرف کیا جا سکے۔ بچّہ پیدا کرنے کی صلاحیت
کسی طرح بھی ان کی تربیت کی اہلیت کا ثبوت نہیں ہو سکتی۔ لیکن
باوجود لاعلمی کے بڑے اطمینان و استقلال کے ساتھ بچّوں کی تربیت
کی ذمہ داری لینے کو مستعد ہیں۔ کبھی یہ بھی تو نہیں سوچتے کہ اگر کوئی
جانور پالنے کا ارادہ ہوتا ہے تو پہلا خیال ذہن میں یہی آتا ہے کہ
کسی تجربہ کار سے مشورہ کر لینا چاہیئے۔ اس کے خصائل، غذا، صفائی
اور مناسب ماحول کے متعلق ضروری باتیں جاننے کی فکر ہوتی ہے۔
لیکن اب تک لوگ پدریت کے علم کو سیکھنے کی چیز نہیں سمجھتے۔ ہاں!
مادریت کی تعلیم دی جانے لگی ہے۔ دورانِ حمل اور وضعِ حمل کے
بعد کی احتیاطوں اور طرزِ رہائش پر کثرت سے تقریریں ہوا کرتی ہیں
اور کتابیں تصنیف ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن صحیح معنوں میں ماں باپ
بننے کی اہلیت حاصل کرنے کی سہولتیں بہت کم بلکہ نہ ہونے کے
برابر ہیں۔ کتنے والدین آپ کو ایسے ملیں گے جنہوں نے بچے کے

بطنِ مادر میں آنے سے سال دو سال قبل [illegible]
حاصل کرنے کی فکر کی ہو؟ بس [illegible] اس وقت [illegible] ہوتی
ہے جب استقرارِ حمل ہو چکتا ہے۔ لیکن اس کے بعد [illegible] طرح
کے نئے مسئلوں سے سابقہ ہونے کے باعث باوجود کوشش کے بھی
وقت نہیں ملتا کہ بچے کے متعلق نفسیاتی مطالعہ کیا جاسکے۔ نتیجہ یہ
ہوتا ہے کہ پہلے دو سال تک تو بیچاری ماں غیر محدود قربانیاں کرکے
بچے کو پالتی ہے لیکن آنے والی غیر متوقع مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی
خود میں استطاعت نہیں پاتی۔ مشکلات کا حل مسئلوں کے [illegible]
ہونے سے قبل سوچ لیا جاتا ہے۔ ناعاقبت اندیشی کے باعث وہ
آنکھ بند کرکے اپنے والدین کے بتائے ہوئے ڈھڑوں پر لگ جاتی
ہے۔ لیکن وہ طریقے آجکل کی بدلی ہوئی فضا اور نئے ماحول کے لئے
موزوں ثابت نہیں ہوتے۔ بچے کو ایک شکل تو یہ تھی ہی کہ اسے مصنوعی
دُنیا کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنا تھا اس پر اس کی تربیت کا مقصد
زندگی کے خلاف ہونے کی مزید مشکل اس کی لغزشوں میں اور بھی
اضافہ کر دیتی ہے۔

پہلے سال تو عموماً ماں کو بچے کی ارتقا کی تمام منازل سمجھ میں
آتی رہتی ہیں۔ وہ جانتی ہے کہ اس کا بچّہ چھ مہینے بعد کیسا ہوگا۔ آٹھ
مہینے کا ہوگا تو کیا کیا کرے گا، اور سال بھر بعد اس کی ذہنیت کیسا
ہوگی؟ لیکن آپ اس سے پوچھئے کہ تین سال کے بچے کو کن کن
کھیلوں سے دلچسپی ہوتی ہے۔ چار سال کے بچے کو کیا کیا معلومات
ہونی چاہئیں اور پانچ سال کے بچے کو کس قسم کی [illegible]
تو آپ کو صحیح جواب نہ مل سکے گا۔ اور میں تو کہتا ہوں [illegible]
فرائض ہیں بھی نہیں۔ ماں اور بیوی کے فرائض ہی [illegible]
کیا کم ہیں کہ بچے کی تربیت کا بوجھ بھی اس پر ڈالا جائے۔ لیکن [illegible]
نے یہ ذمہ داری بھی اس غریب کے سر منڈھ دی ہے۔ گھر کی دیکھ
بھال کے ساتھ معلمہ کے فرائض، دو بالکل مختلف پیشے، اور ہر پیشے
میں مہارت کے لئے کافی تجربہ اور مطالعہ کی ضرورت۔ [illegible]
دُہرے کام کسی اکیلے فرد کے لئے تقریباً ناممکن ہیں۔ [illegible]
میں تو غریب گھروں کی ماؤں کو اقتصادی حالات نے [illegible]
چھوڑ کر کسبِ معاش پر مجبور کر دیا ہے۔ امیروں کے [illegible]
ہی نرالا ہے۔ یہاں بچے کو ماں [illegible]
بھی جاہل و بدتمیز عورتوں کے سپرد [illegible]
کی دیکھ بھال کیا اور رشد [illegible]

[illegible] کی پوری آزادی ہونے کے اس طبقہ [illegible] زیادہ ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ملک کے [illegible] ہے مگر جن والدین کو بچے کی تربیت کی فکر نہیں [illegible] کوئی استحقاق نہیں۔ یہ درمیانی طبقے کی خواتین کی [illegible] ہے کہ انہیں دونوں فرائض پورے کرنے ہوتے ہیں۔ انکی [illegible] پڑتی ہے لیکن افسوس ہے کہ ان کے ایثار کو کوئی [illegible] صورت نکلنے کی بجائے ماں اور بچہ دونوں کے لئے مضرت کی مضرت ہے۔ جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں، بچے کے لئے خود کو ماحول [illegible] اور ماحول کو اپنی ضروریات کے مطابق بنانا ہی کافی دشوار ہے۔ اگر شفقت و محبت کے ساتھ اس کی مشکلوں کو کم کرنیکی کوششیں اس کی الجھنیں بڑھاتی اور دقتوں کو زیادہ کرتی ہوں تو یقیناً اُن کے اثرات مضر ہونگے۔

ہم میں سے اکثر والدین بچے کو اپنا جیسا انسان بنانا چاہتے ہیں، یہ نہیں خیال کرتے کہ وہ ایک مخلوق ہے جسے تجربات زندگی خود اونچ نیچ سے آگاہ کردیں گے۔ ہم پچھلی روایات پر چلنے والے یہ نہیں سمجھتے کہ ہمارا مستقبل بچے کا حال ہے اور بچے کا مستقبل کیا ہوگا، وہ ہمیں معلوم نہیں۔ لیکن اُسے اپنی منزل دکھائی دیتی ہے اور اُس پر کامیابی سے پہونچنے ہی کی تیاری میں وہ سرگرم ہے۔ ہمارے لئے جو باتیں عجائبات تھیں وہ اس کے لئے معمولی واقعات ہیں۔ ہمارے سامنے جو لاحل مسئلے تھے اس کے سامنے اس کا حل ہے۔ ہمارے اسکول پر سے جب کوئی ہوائی جہاز گزرتا تھا تو سارا اسکول طیارہ کو دیکھنے کے لئے استعجابانہ دوڑ پڑتا تھا لیکن اب سینکڑوں ہوائی جہاز ہمارے گھروں پر سے گذرتے ہیں اور ہمارے بچے نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ ہمارے عجائبات تو اُن کے لئے معمولی باتیں ہوگئیں۔ لیکن انکے عجائبات ہمارے خواب میں بھی نہیں آسکتے۔ لہٰذا بحیثیت والدین کے ہمارا فرض ہے کہ اپنی شخصیت اور بچے کی ذہنیت میں تناسب کا پوری طرح اندازہ کریں۔ ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم اپنے خیالات انکے دماغوں پر چسپاں کریں۔ اُن کے ذہن کی ترقی کے لئے پوری آزادی ہونی چاہئے۔ ان کے جسم کی دیکھ بھال ہمارا فرض ضرور ہے لیکن اپنی روح کے [illegible] ان کی شخصیت کے ڈھالنے کے لئے ہمارا سانچہ [illegible] ہمیں یہ فکر نہ کرنی چاہئے کہ ان کی زندگی ہماری گذشتہ زندگی کے مطابق ہو اور نہ ہم ان کو یہ بتا سکتے ہیں کہ ان کا مستقبل کیا [illegible] ہم [illegible] سے ان کا مستقبل جان ہی نہیں سکتے۔

یہ مقولہ کہ اگر طول عمر چاہتے ہو تو ماں باپ کا احترام کرو، [illegible] ایک رخ ہے۔ لیکن اگر ہم اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کا احترام کریں [illegible] لیں تو دنیا میں ہماری زندگی کہیں زیادہ طویل ہو جائے کیونکہ [illegible] سے مستقبل میں ہمارا نام باقی رہیگا۔ لیکن بچے سے احترام کی توقع [illegible] سے اس عملی زندگی میں عموماً خدمت مراد ہے کسی طرح بھی والدین [illegible] حق نہیں ہے۔ ہمیں کیا حق ہے کہ اس دنیا میں جو بیماری، فساد، [illegible] اور جنگ وجدل کا گہوارہ بنی ہوئی ہے، بغیر اس کی خواہش کے [illegible] کو پیدا کرکے اس سے تشکر اور اطاعت کے متمنی ہوں! بلکہ ہمیں [illegible] آنے والے کا خیر مقدم نہایت تپاک سے کرنا چاہئے۔ اس دنیا میں [illegible] ہزاروں بیماریوں سے ہلاک ہوتے ہیں، جہاں ہر روز سینکڑوں [illegible] کا شکار ہوتے ہیں، جہاں لاکھوں بچے، جوان اور بوڑھے بے [illegible] کی نیند سلا دئے جاتے ہیں، اس دنیا میں جہاں باوجود اپنی مہارت و صلاحیت کے والدین دشواریوں اور صعوبتوں کا اب تک کوئی حل نہ نکال سکے۔ جہاں شانتی نام کے لئے بھی نظر نہیں آتی۔ ایسی دنیا میں جہاں اس کو بھی طرح طرح کی مشکلات سے دوچار ہونا ہے ہمیں اس نئے آنے والے کو ہاتھوں ہاتھ لینا چاہئے۔ اور جب تک وہ خود یہ نہ دیکھ لے کہ دنیا میں آنے سے اسے کیا ملا ہمیں اس سے تشکر یا بددعا کی توقع نہ کرنی چاہئے۔ اور خوش قسمتی سے وہ وقت آنے تک ہم اس احساس سے عاری ہوچکے ہونگے۔

آپ نے غالباً محسوس کرلیا کہ آجکل کے بہتیرے مسئلے کیسی خاص نوعیت رکھتے ہیں۔ لیکن ہم اکثر یہ جواب سنتے ہیں کہ فطرت خود اِن مسئلوں کا حل نکال لے گی۔ اس خیال کے حامیوں کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ فطرت اُن مسئلوں کے حل کرنے میں ممد ہوتی ہے جو فطری طور پر رونما ہوتے ہیں۔ اب ذرا غور کیجئے کہ کس طرح فطرت کو اس نئی خلقت یعنی اکلوتے بچے کے مسائل حل کرنے میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ موجودہ حالات میں پہلے اور دوسرے بچے کے درمیان طویل وقفے کا ہونا ضروری ہوگیا ہے۔ اور اکثر یہ وقفہ قریباً پانچ سال تک پہونچ جاتا ہے تاکہ ماں کو کچھ دن دم لینے کا موقع مل جائے — مردم شماری کے لحاظ سے تو پہلا بچہ دوسرے کی ولادت کے بعد [illegible] کہلانے کا مستحق نہیں رہتا لیکن اس کی ذہنیت اکلوتے بچے کی [illegible] سی رہتی ہے کیونکہ پانچ سال میں اس نے خود کو ایک [illegible] کے مطابق بنالیا ہے جس میں اس کی شخصیت کا [illegible] اور ماں کی طرف اسکے رجحانات مستحکم ہوچکے ہیں۔ [illegible]

[illegible] آتا۔ بلکہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے
[illegible] ہو جاتا ہے۔ اس طرح اکلوتے
[illegible] کرتی ہے۔ والدین کے فطری
[illegible] کا کام کرتے ہیں۔ عورت
[illegible] ہوتا ہے۔ مادریت کے جذبے
[illegible] عورت کو خندہ پیشانی کے ساتھ
[illegible] کے پاس ان جذبات اور غیر فطری
[illegible] کے تصادم سے پیدا کی ہوئی مشکلات کا کوئی علاج نہیں۔
[illegible] تمام محبت جو کئی بچوں میں بٹنے کیلئے ودیعت
[illegible] ایک ہی پر صرف کرنے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے۔ اس میں
بچے [illegible] ختم ہونے پر بھی بچہ سمجھتے رہنے کا میلان ہوتا ہے۔
وہ [illegible] اکلوتے بچے پر سارے ناز و نعم ختم کر دیتی ہے کیونکہ اگر وہ جاتا
[illegible] اس کی ساری آرزوئیں خاک میں مل جائیں گی۔ وہ اس کے
ان معاملات میں بھی دخل دیتی ہے جن کا صرف بچے کی ذات سے سروکار
ہے۔ وہ اس کے خطرات و مشکلات کو پہلے سے سوچ لیتی ہے اور ان
سے بچائے رکھنے میں سرگرداں رہتی ہے، وہ اس کے ساتھ خود بھی
بچہ بن کر کھیلتی ہے اور ہر دم سائے کی طرح ساتھ ساتھ رہتی ہے اور
اس طرح شفقت مادری نادانستہ بچے کے راستے میں طرح طرح کی
رکاوٹیں اور اس کی آزادی میں خلل ڈالتی رہتی ہے۔ سمجھدار والدین
جانتے ہیں کہ اس رویہ میں بچے کی بھلائی نہیں۔ اسکول کی عمر پر
پہونچکر ماں باپ کے اثرات بڑی حد تک کم ہو جاتے ہیں۔ لیکن پہلے
کے مہلک رجحانات بچے کی رگ رگ میں سرایت کر چکے ہوتے ہیں۔
ان کا اثر اس کی ساری زندگی پر پڑتا ہے اور اسکے خراب نتائج اسکی
شخصیت اور سوسائٹی کو بھگتنا پڑتے ہیں۔ جس طرح بچپن میں ماں اسکی
جا و بیجا ضدیں پوری کرتی تھی، جس طرح والدین اس کی ہر مشکل کو بلا
عذر حل کر دیا کرتے تھے اسی طرح وہ بڑا ہو کر بھی کسی نہ کسی کا سہارا
ڈھونڈنے پر مجبور ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ لڑکے سے ماں اور لڑکی
سے باپ زیادہ مانوس ہوتے ہیں۔ انہیں محبت کے اظہار کا ایک
نیا راستہ مل جاتا ہے۔ باپ اپنی بیٹی میں وہ سب خوبیاں جمع کرنا
چاہتا ہے جو ماں میں نہ تھیں۔ وہ اسے عورت کا ایک ایسا نمونہ دیکھنا
چاہتا ہے جس کا عکس اسکے قیاس نے کھینچا ہوا ہے۔ اسی طرح ماں کی
خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے بیٹے میں وہ تمام اوصاف اکٹھا کر دے
جو شوہر میں اسے نہیں ملے۔ اس طرح میاں بیوی کے رجحانات میں بھی
ایک عجیب تغیر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن [illegible]
حد سے تجاوز کرنے کے باعث اولاد کے ان [illegible]
جو آگے چل کر شوہر یا زوجہ کا حق ہوتے ہیں۔ [illegible]
وہ تمام باتیں چاہے گی جو وہ اپنے باپ [illegible]
ان خصوصیات کی متلاشی نہ ہوگی جو اچھے شوہر [illegible]
بلکہ وہ خصوصیات ڈھونڈے گی جو ایک اچھے باپ [illegible]
اسی طرح اگر صاحبزادے کو شادی کی فکر ہوئی تو ان کو بھی عورت
سے وہی خدمات اور امداد کی توقع ہوگی جو بچپن میں انہیں بعد بلوغ
ماں سے ملتی رہی ہیں لیکن بیوی سے یہ امیدیں رکھنے کا ان کو کوئی
حق نہیں۔ عموماً تو یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایسے لڑکے ماں کے لاڈ اور
پیار سے محروم ہو جانے کے اندیشے سے شادی کرنے پر آمادہ
آمادہ بھی نہیں ہوتے اور دوسری عورتوں سے مل کر ان کی
بے نیازیوں کو دیکھ دیکھ کر ماں کے ایثار کا سکہ اور بھی ان کے
دل پر بیٹھتا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ساری عمر یہ پیر [illegible]
"اماں کا بچہ" ہی بنے رہتے ہیں جس کا انجام آدم بیزاری اور
سوسائٹی سے تنفر ہوتا ہے۔

لڑکا ہو یا لڑکی، ایسی اولاد جس کو والدین کے بے پایاں
رجحانات کے سبب ماں یا باپ کی محبت سے جائز و ناجائز فائدہ
اٹھانے کی لت پڑ جاتی ہے بہتیرے حوادث اور ناگزیر تجربات کا
شکار رہتی ہے۔ حد درجہ تنک مزاجی، ذرا اشتعال یا تکلیف پہ
گھر کی یاد، کھیل میں شوخ لڑکوں کی شرارتوں اور تمسخر کا نشانہ بننا
وغیرہ ایسی کمزوریاں اور بے لطفیاں ہیں جن سے اسے مفر نہیں۔
ایسے شخص کی ازدواجی زندگی بھی کبھی خوش نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ
شادی ہر فرد کا وہ حیاتیاتی نصب العین ہے جسے انسانی
جذبات کی تکمیل کہا جاتا ہے۔ لیکن جس شخص نے کبھی محبت کرنا
سیکھا ہی نہیں، جس میں بے لوث، خود فراموش اور ایثار پسند
محبت کی صلاحیت ہی نہیں وہ اس لطیف رشتے کی کفالت
کیونکر کر سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ بچے کی زندگی پر گھر یلو طرز معاشرت [illegible]
اہم ہے۔ ماہرین نفسیات مانتے ہیں کہ [illegible]
کی وجہ اکثر گھریلو زندگی کے اثرات میں [illegible]
اثرات کا باعث عموماً جذبۂ ایثار اور [illegible]
مشکل اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ [illegible]

اصل میں اپنی جستجو تُو ہے

دامنِ تار تار کی سوگند!
بوئے "جانِ بہار" کی سوگند!

جنبشِ برق کی قسم مجھکو
گردشِ چشمِ یار کی سوگند!

زمزمۂ مطربِ محبت کی
اور دل کے ستار کی سوگند!

خون زخمِ جگر کے رِسنے کی
آنکھ کی آبشار کی سوگند!

صبح کے طورِ شعلہ ساماں کی
شام کے لالہ زار کی سوگند!

شبِ تارِ خزاں کی ظلمت کی
نورِ صبحِ بہار کی سوگند!

چشمِ صیادِ منتظر کی قسم
دامِ "عنقا شکار" کی سوگند!

مشرقِ مہرِ ممکنات ہے تُو
جس کا دن خلد ہو وہ رات ہے تُو

"عرشِ رفعت"، ملک جناب ہو تو
چشمِ فطرت کا انتخاب ہے تُو

ایمنِ کائنات کے موسیٰ
سحرِ ماحول کا جواب ہے تُو

انجم و مہر و ماہ ذرّے ہیں
ایک تابندہ آفتاب ہے تُو

بیخبر! تُو ہے جوہرِ قابل
عکس واللہ ہے تو نہ خواب ہے تُو

اپنے نغموں کو آپ پیدا کر
دستِ مطرب ہے تو رباب ہے تُو

چشمِ نگرانِ موج ہے بجندا
کون کہتا ہے اک حباب ہے تُو

کن فکاں کی کتابِ کہنہ میں
"شرحِ فکر و نظر" کا باب ہے تُو

اصل میں اپنی جستجو تو ہے
یعنی سوزِ دروں سے تو تو ہے

امین حزیں سیالکوٹی

جنازے

میرا سر گھوم رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کاش ہٹلر آجائے اور اپنے آتشیں گولوں سے اس نامراد زمین کا کلیجہ پھاڑ دے جس میں نا پاک انسان کی ہستی بھسم ہوجائے۔ ساری دُنیا جیسے مجھے ہی چھیڑنے پر تل گئی ہے۔ میں جو پودا لگاؤں محال ہے کہ اُسے مرغیوں کے بیدرد پنجے گُریدنے سے چھوڑیں۔ میں جو پھول چنوں بھلا کیوں نہ وہ میری سہیلیوں کو بھلے اور وہ کیوں نہ اُسے اپنے جوڑے کی زینت بنالیں۔ غرض میرے ہر فعل اور قول سے دُنیا کو بَیر ہوگیا ہے۔ اور میری دُنیا بھی کتنی ہے؟ یہی چند بھولے بھٹکے دوست، دو چار سیکنڈ ہینڈ عاشق مزاج اور کچھ بھوٹر لڑاکا اور فیشن پر مرنے والی سہیلیاں۔ یہ بھی کوئی دُنیا ہے؟ بالکل تھکی ہوئی دُنیا۔ میرے تخیلات سے کتنی نیچی اور دُور۔ اور اب تو اس دُنیا میں اور بھی دُھول اُڑنے لگی۔ معلوم ہوتا ہے میں قبل از وقت پیدا ہوگئی ہوں۔ تغلق جسے دُنیا دیوانہ کہتی تھی وہ بھی اپنے وقت سے پہلے آیا تو حواس باختہ ہوگیا، پھر میں کیا چیز ہوں؟ لیکن ایک زمانہ ہوگا جب دُنیا میری ہم خیال ہوجائے گی۔ لوگ میری بھی سُنیں گے۔ اور کشور؟ کشور کے واقعہ نے تو مجھے بالکل نیم مُردہ کردیا۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ یہ میری چیخ پکار! یہ پھڑکتا ہوا دل جس میں انسانی ہمدردی اور اخوت کا سمندر لہریں مار رہا ہے۔ جس کے خواب ملک کی بہتری کی نذر ہوچکے ہیں۔ جس کے جذبات مذہب اور انسانیت میں غرق ہیں۔ یہ سب کچھ بیکار بالکل بیکار۔ بیل گاڑی کی چوں چوں اور مریل گھوڑے کی ٹاپوں میں بھی تو اس سے زیادہ اثر ہے!

"یہ بھی کوئی دُنیا ہے، یہ بھی کوئی دُنیا ہے" میں کرسی پر جھوم رہی تھی۔

"کس کی دُنیا؟ میری؟" راحت اندر آکر تخت پر بیٹھ گئی۔

راحت۔؟ آپ نے چند موم کی پتلیوں کو تو دیکھا ہوگا۔ ننھی منی کھیل کود کی شوقین۔ جن کا مقصدِ زندگی کھیلنا ہے۔ گڑیوں سے کھیلنا۔ کتابوں سے کھیلنا۔ اماں ابا سے کھیلنا۔ اور پھر عاشقوں کی پوری کی پوری ٹیم سے کبڈی کھیلنا۔ ابھی میرے بدنصیب بھائی کے ساتھ ٹینس کھیل کر آرہی تھی۔

"تمہاری دُنیا؟ راحت تمہاری دُنیا تو ٹینس کے کورٹ پر ہے" میں نے تلخی سے کہا۔

"کون... میری؟ تمہارا مطلب ہے ضمیر؟ توبہ کرو۔ وہ تو تمہارا بھائی ہے، پر ہے چغد۔ معاف کرنا۔ اللہ قسم ایسے ہاتھ چلاتا ہے جیسے ٹینس کے بجائے فٹ بال کھیل رہا ہے۔ اور پھر مزہ یہ ہے کہ اگر جناب کے ساتھ نہ کھیلو تو... یہ کہ... بس"

یہ میرے بھائی صاحب کی شان میں میرے منہ پر فرمایا جارہا تھا۔ اگر میں بھی شہنشاہ اکبر کی طرح طاقتور ہوتی تو اس بے ایمان چھوکری کو انارکلی کی طرح دیوار میں زندہ چنوا دیتی۔ یہ پُرفن لڑکیاں بیوقوف لڑکوں کو خون کے آنسو رُلواتی ہیں اور موت کی ہنسی ہنسواتی ہیں اور پھر چٹ کہیں اور کسی کی ہو رہتی ہیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ ضمیر اُلّو ہے اور رہے گا۔ کیا جناب کی تھرڈ کلاس پسند ہے۔ وہ لڑکی جس میں نام کو عقل نہیں۔ جس میں نہ قوم کی ترقی کا جوش نہ قربانی کا جذبہ نہ ملک کا پیار، جو بی۔ اے کرنے کے بعد بھی نہ مرد کی اصلی فطرت کو سمجھی اور نہ عورت کے جذبات سے واقف۔

"مگر آپ کو اسکی اتنی دلداری کیوں منظور ہے۔ آپ دوسروں سے کھیلیں، دیکھیں کون آپ کو روک سکتا ہے؟"

"بھئی واہ، روکے گا کون۔ پر اچھا نہیں لگتا۔ وہ... مجھے بچارے پر رحم آتا ہے۔ دوسرے...."

"خوب رحم آتا ہے۔ اُسے جیسے... جیسے دوسری کوئی نصیب نہ ہوگی" میرا خون کھول گیا۔

"اے لو ملے گی کیوں نہیں.... یہ میں کب کہتی ہوں... مل جائیگی۔ مل ہی جائیگی" راحت ہکلانے لگی۔

"مل ہی کیا جائے گی۔ اُسے کمی نہیں۔ یہ تو.... وہ بیوقوف ہے ـــ"

"ہاں ـــ یہ بات ہے۔ جبھی تو میں کہتی ہوں" راحت خوشی سے چہکی۔

"جبھی تو کیا....؟" میں نے جل کر پوچھا۔

"اے بھئی یہی کہ... بھئی مجھے نہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ مجھ میں تمہاری جیسی عقل نہیں اور نہ مجھ سے بحث کی طاقت نہیں

ہے کہ میں تو کوئی... بالکل... کبھی کبھی بحث کر ہی نہ سکی۔ یہی تو بات ہے کہ ضمیر....“

”ہاں کیا ضمیر“ میں نے اُس کی شکست سے خوش ہو کر کہا۔

”یہی... یہ مجھے ضمیر پہ... یہی کہ بس خیال آتا ہے کہ وہ بچارا ـــ“

”اوہو تم کتنے فخر سے اُسے بچارا کہتی ہو“ میرا منہ کڑوا ہوگیا۔

”آج تو بے طرح تم بگڑ رہی ہو کیا ہوا ـــ کیا سعید نے ڈانٹا ابھی سے اینٹھتا ہے؟“

سعید کے نام سے میرے بدن میں پتنگے لگنے لگتے ہیں۔ آپ ایک اور راحت جیسی رُوح رکھنے والے انسان ہیں۔ آپ نے کمال فرمایا تھا کہ ایک دفعہ مجھ پر عنایت کی۔ کمال۔ میرے جواب سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اُن کا کیا حال ہوا ہوگا۔ پہلے تو ذرا متعجب ہوئے پھر خوب متعجب ہوئے اور پھر اور زیادہ ہوئے۔ بعد میں سُنا تھا اپنی غلطی پر بہت شرمندہ ہوئے۔ ضمیر سے بولے کہ ”میں انہیں غلط سمجھا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ شاید.... مجھے ان پر ترس آیا تھا“ خدا جانے یہ انہیں مجھ پر ترس کھانے کا کیا حق تھا۔ اور کیسا ترس؟ یہ مجھ پر آج تک واضح نہیں ہوا۔

لیجئے اتنا لمبا قصہ سعید کا ہی ہوگیا۔ وہ تو میں نے کہا نا کہ میں تو بات بھی کروں تو اس کو بھی تو گڑبڑا دیتے ہیں یہ دُنیا والے!

”ہونہہ سعید کی ہمت۔ وہ ہیں کیا چیز؟۔ اگر سعید ذرا بھی کچھ ہوتے تو مجھے یہ الفاظ کیوں استعمال کرنا پڑتے؟“

”اتنا چوڑا چکلا اور اونچا انسان اور تم ”کچھ“ لئے پھرتی ہو“

”انسان کی بڑائی چوڑے چکلے ہونے سے نہیں ہوتی۔ عقل.....“

”اُونہہ! آخر عقل مند ہونے کی ایسی کیا مار ہے۔ اور عقلمند میاں میں ایسے کیا لعل جڑے ہوتے ہیں۔ بیکار میں رعب گانٹھتا ہے۔ اور پھر تمہیں کہتی ہو کہ مردوں کی حکومت نہ سہنی چاہیئے۔ میرے خیال میں ضمیر.... بھئی نہ میاں ضرورت سے زیادہ عقلمند ہوگا نہ ہم کو دبایا جائے گا“

”تم میں کاش ذرا سوچنے کی بھی ہمت ہوتی۔ بحث کرنے لگی ہو۔ مگر... خیر، یہ بیا اس وقت مستو کا کیا ذکر۔ میں تو کشور کو کہہ رہی ہوں“

”کون کشور؟“

”روٗنی والی“

”کون روٗنی؟“

”اللہ! اتنا بننا!“

”اُونہہ تو گویا میں تمہاری کشوروں اور روٗفیوں کے رجسٹر لئے اُن کی مثنوی لکھا کرتی ہوں۔ تمہارا مطلب کشور سے ہے ـــ وہ روٗنی کشور؟“

”جی وہی۔ روئے نہ تو غریب کیا کرے۔ ہم عورتیں تو رونے ہی کے لئے پیدا ہوتی ہیں“ یہ چند آخری الفاظ میں نے خود سے کہے۔ اور ٹھنڈا سانس نہ روک سکی۔

”ہاں رونے سے آنکھوں میں چمک پیدا ہوتی ہے۔ سارا گرد و غبار.....“

”اور تمہارا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ جاؤ راحت میں اِس وقت تمہاری بد مذاقی سہنے کے لائق نہیں۔ جاؤ ٹینس کھیلو“

”ہوں۔ ٹینس کھیلو، جیسے تمہارے بھیا کو آتی بھی بڑی خیر ہے ـــ میں تو آئی کہ چلو بھئی ہو آئیں ذرا۔ اور آپ ہیں کہ...“ راحت بُرا مان گئی۔

”تو تم سمجھتی ہو میں بڑی خوش بیٹھی ہوں کہ تم مجھے آ کر جلاؤ۔ ایک تو تم بار بار ضمیر کو بُرا بھلا کہے جا رہی ہو۔ آج میں ویسے ہی پریشان ہوں۔ کشور سے ملی تھی۔ تمہیں کیوں یاد ہوگی کشور؟ تم کوئی اُسکی مثنوی تھوڑا ہی لکھ رہی ہو“

”ہاں ہاں پھر کیا ہوا“

”اُس کی شادی ہو رہی ہے“ میں نے اُٹھتے ہوئے طوفان کو دبایا۔ کئی دن سے دبا رہی تھی۔

”اچھا۔ کب؟“

راحت کو کشور کے دُکھ سے سُکھ نہ پہونچے گا تو کیسے پہونچے گا؟ کشور ٹھہری میری دوست اور میں ضمیر کی بہن اور ضمیر، راحت کے زبردستی کے عاشق۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ آج میں ہوں اور ضمیر۔ سٔور کہیں کا!

”کیا اُسی مرگھلے سے تو نہیں ہو رہی ہے؟“ راحت ڈر گئی۔ یہ مرگھلا روٗنی کو کہا جا رہا تھا۔ اور کیوں؟ وہ اس لئے کہ راحت اُس کے اشعار سے نفرت کرتی تھی۔ کہیں بیٹھ کر یہی فرماتی تھیں ”بہت ڈھیلے ڈھیلے شعر کہتا ہے“ اب شعر [illegible] جاتے ڈھیلے اور تنگ شعر کیسے ہوتے ہیں؟

"تم اسے مرگھلا کہتی ہو۔ لیکن کشور کے دل سے پوچھو"

"کشور تو صدا کی سڑن ہے"

"بس راحت زیادہ بنو مت۔ تم سے زیادہ . . ."

"اے ہے معاف کرو، باز آئی میں تمہاری کشور کے قصہ سے ختم بھی کرو۔" راحت منہ بنا کر ٹانگیں سکیڑ کر لیٹ گئی۔

"تمہیں معلوم ہے کہ وہ مر جائے گی مگر رونی کے سوا کسی سے شادی نہ کرے گی۔ اور اماں کہتی ہیں کہ میں تو شوکت سے کروں گی"

"اے ہے! بڑھیا! شادی کر رہی ہے۔" راحت چونک کر اٹھی۔ "تمہیں خدا کی قسم"

"اوہو او ہو۔ جیسے کچھ اترانے میں بھی مزہ ہے۔ کشور کی شادی کا ذکر ہے اور بننے لگیں"

"ارے ... میں بھی۔ خیر ... پھر؟"

"کشور کہتی ہے کہ زہر کھا لوں گی مگر رونی کے سوا ...."

باوجود ضبط کے میرا گلا گھٹ گیا۔

"ارے ... مگر کونسا زہر کھائے گی؟ میرے خیال میں سائنائیڈ ٹھیک رہیگا"

راحت۔ پتھر کا کلیجہ اور لوہے کا دل اسی کو کہتے ہیں۔ ساتھ کھیلے، ساتھ پڑھے، ساتھ اسکول گئے اور پھر کالج۔ مگر اس بے حس گوشت کے لوتھڑے کو ... افوہ۔ میرا خون پھر کھول گیا۔

"چپ رہو بے رحم! کاش بجائے انسان کے خدا تمہیں ایک چٹان بناتا جس پر۔ جس پر ..." مجھے کوئی پُرمعنی لفظ ہی نہ ملا "تمہاری بے رحمی دوسروں کو دکھ نہ پہونچاتی۔ ذرا سوچو بیقصور کشور نے تمہارے ساتھ کیا بدی کی ہے؟ اُس نے تمہیں کیا دکھ پہونچایا۔ وہ جو ایک معصوم چڑیا سے بھی معصوم ہے۔ وہ جس نے سر جھکا کر دنیا کے دکھ سہہ لئے، اور سہہ رہی ہے۔ وہ جسے اُسکی ظالم ماں دولت اور شہرت کی بھینٹ چڑھا رہی ہے۔ جو سر لٹکائے راضی برضا قربانگاہ کی طرف جا رہی ہے" میری زبان کے ساتھ ساتھ جملے جملے تیزی سے چل رہے تھے "جس نے قصائی کے سامنے گردن ڈالدی ہے اور خاموش اُس کی چھری کی دھار کو دیکھ کر اپنا ہی خون جلا رہی ہے۔ تم بھی اُسے وہ باتیں کہہ لو۔ مگر خدا کے واسطے جاؤ میری آنکھوں سے۔ جاؤ راحت"

"اے ہے توبہ ... ماشاء اللہ تم تو بڑی بدمزاج ہو!"

راحت ڈر کر سکڑ گئی "ایسا میں نے کیا کہدیا؟"

"تم نے کیا کہا؟ اور اوپر سے یہ بھی پوچھنے کی ہمت ہے؟ تم اس کی موت پر ہنس رہی ہو۔ اس کا خون ہو رہا ہے، تم ہنس رہی ہو، وہ مرغ بسمل ہو رہی ہے اور تم ہنس رہی ہو ۔۔۔ اس کی لاش ۔۔۔ ہاں اس کی لاش پر تم دانت نکال رہی ہو" مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا سوائے ایک معصوم کے جنازے کے۔

"اوہ ... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اللہ کا واسطہ چپ ہو جاؤ، ابھی ذرا بجلی جلا دو مجھے ڈر لگ رہا ہے" راحت پیلی پڑ گئی۔

"تم سمجھتی ہو تمہارے اوپر اس کا کچھ اثر نہ ہوگا۔ تم ہنستی ہی رہو گی، اس کی موت پر ۔۔۔ مگر یاد رکھو راحت، کشور تمہیں نہیں چھوڑے گی۔ وہ مر جائے گی مگر کیا وہ تم سے سوال نہ کرے گی، اُس کی روح ...."

"ہائے بجلی جلاؤ میں .... اچھی بہن میرا دم نکل کر دم نکل جائے گا" راحت بزدلوں کی طرح چلائی۔ اور جلدی سے اپنے پیر تخت کے اوپر رکھ لئے گویا تخت کے نیچے سے کشور کی روح ابھی سے اُسکے پیر کھینچ رہی تھی۔

"تم اس کو بچاؤ۔ بچاؤ گی۔ تم اُسکی مدد کرو گی" میں نے ایک مسمریزم کا تماشہ کرنے والے کی طرح کہا۔

"ہاں مگر بجلی ۔۔" راحت کانپ رہی تھی "ہاں ... اب ..."

"تم اُس کی ماں کو مجبور کرو گی کہ وہ اُسکے قتل سے باز آئے"

"مگر وہ ... تو ... بہن اُسکی ماں سے ڈر لگتا ہے مجھے" میری آواز کی نرمی سے اُسکی گئی ہوئی ہمت واپس آ گئی۔

"میں اور تم اس کی ماں کو مجبور کریں گے کہ وہ کشور کو زندہ دفن نہ کرے"

"ہاں تم کرنا ... ریحانہ تم بہت بہادر ہو۔ تم۔ تم واقعی بہت زبردست ہستی ہو۔ تم انسانیت کا بہترین مجسمہ ہو۔ ریحانہ اگر ہماری قوم میں ایسی ہی چند لڑکیاں پیدا ہو جائیں تو ہم غلام کیوں رہیں، کیوں رہیں۔ اور اب تم بجلی جلا دو۔ میں زمین پر نہیں اتروں گی۔ میرا جوتہ بھی تو نہ جانے کدھر ہے" وہ کانپتی آواز میں ایک بھٹکے ہوئے راستے سے واپس لوٹ رہی تھی۔

"ہم اس سے لڑیں گے، اور یہ قربانی نہ ہونے دیں گے" میں نے اپنے آپ کو ایک طیارے پر سے بم گراتے محسوس کیا جس کے شعلے شوکت اور کشور کی ماں کو نگل رہے تھے۔

"مگر... وہ کشور خود جو اپنی ماں سے لڑے نا۔ ایسی نبھی ہے کب...؟"

"وہ خود لڑے؟" مجھے پھر جوش آیا۔ "وہ پڑھی لکھی ہے تو کیا ہے۔ راحت [illegible] عورت ہے۔ وہ بے شرمی نہیں لا دکھتی۔ وہ کچھ بھی ہو کہ خواہ کچھ ہو جائے وہ زبان ہلائے بغیر جان دیدے گی تم جانتی ہو نا سدا کی کمزور دل ہے۔"

"تو بہن میں کونسی پہلوان ہوں۔" راحت اور کونے میں دبک گئی۔

"تم ہو یا نہ ہو مگر میں کروں گی۔ میں خود کروں گی۔ راحت میں اب تک تمہیں بے رحم ہی سمجھتی تھی۔ اب معلوم ہوا کہ تم بز دل بھی ہو۔ چوہے سے ڈر جانے والی لڑکیاں! یہی تو ہماری قوم کی غلامی کی ذمہ دار ہیں۔"

"اوہو کوئی بھی نہیں۔" شکست خوردہ آواز میں کہا گیا۔

"سچ بتاؤ کشور... وہ میرا مطلب ہے راحت، کبھی تمہارے دل میں اپنی جنس کی ابتری کا خیال بھی آتا ہے۔ کبھی یہ بھی سوچتی ہو کہ ہم کب تک ظالم مردوں کی حکومت سہیں گے۔ کب تک وہ ہمیں اپنی لونڈیاں بنائے چہار دیواری میں قید رکھیں گے۔ کب تک یونہیں ہم دبے مار کھاتے رہیں گے۔ بتاؤ۔ بولو۔" مجھ پر پھر جوش سوار ہو رہا تھا۔

"سوچا کیوں نہیں... سوچتی ہی ہوں۔"

"کیا سوچتی ہو۔ ذرا بتاؤ کیا سوچتی ہو۔"

"یہی کہ بھئی — یہی سوچا کرتی ہوں کہ اب... اصل بات تو یہ ہے کہ میں تو کچھ بھی نہیں سوچتی۔ اور بھلا سوچوں بھی کیا...؟"

"یہی سوچو۔ یہی کہ کس طرح تم اپنی قوم اور ملک کے لئے قربانی کر سکتی ہو۔ کس طرح تم اپنے علم سے دوسروں کو فائدہ پہونچا سکتی ہو۔ اٹھو راحت وقت ہاتھ سے ابھی نہیں گیا۔ یہ تمہارا ٹینس بھلا قوم کو کیا بلندی پر لے جا سکتا ہے؟"

"بلندی؟" راحت نے خاموشی کو توڑا۔ "ریحانہ مجھے آج یقین ہو گیا کہ واقعی تم کچھ ہو۔ تم... میں تمہیں جھکی اور سچ بحث کہا کرتی تھی۔ مگر آج... معاف کر دو، معاف کر دو مجھے۔ تم کچھ ہو تم... تمہارا کہنا مانوں گی۔ بتاؤ... میں کل ہی اپنا ریکٹ توڑ دوں گی..... کیوں توڑ دوں؟ اور میں ضمیر... اسے بھی... میں اب ٹینس ہی نہیں کھیلوں گی، میں اس سے شادی بھی نہیں کرنے کی۔ میں اس سے کہہ دوں گی کہ تم اب اس خیال کو چھوڑ دو اور تمہیں اب انگوٹھی کے ڈیزائن تلاش کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔" راحت کے لہجے میں پشیمانی اور رقت بھری تھی۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی۔ میں کل کشور کے پاس جاؤں گی، اور اُسے یقیناً اس ٹیکرے کے پنجے سے نجات دلاؤں گی تم چلوگی... کیوں چلوگی نا؟"

"ضرور، مگر تم اب بجلی جلا دو۔ دیکھو کس قدر اندھیرا ہے۔"

راحت کچھ نیم مُردہ اور پریشان سی چلی گئی۔ برآمدے میں میں نے اُسے ضمیر کے شانے پر سر رکھے سسکیاں بھرتے دیکھا۔ نہ جانے وہ کیا بڑبڑا رہے تھے۔ "اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" وہ نہ جانے کیسے کہہ رہی تھی!

رات میرے لئے لمبی اور اندھیری تھی۔ مگر دُور مجھے ایک روشن ستارہ نظر آرہا تھا۔ یہ میری قوت فیصلہ تھی جو میری ہمت بڑھا رہی تھی۔ میں کشور کو بچاؤں گی۔ میں ایک معصوم چڑیا کو شکرے کے خوفناک پنجوں میں سے نکال لاؤں گی۔ شوکت کو اپنی دولت کا گھمنڈ ہے، اپنی صورت پر ناز ہے اور تعلیم پر اکڑتا ہے۔ یہ سب کچھ دھرا رہ جائے گا۔

سہ پہر کو راحت اور میں کشور کے یہاں پہونچ گئے۔ اور کشور کو دیکھ کر میرا دل مسل کر رہ گیا۔ وہ مجھے عجیب گھبرائی اور کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے نظر بھر کر نہ دیکھ سکتی تھی۔ شاید ان آنسوؤں کو وہ بیکار چھپانے کی کوشش کر رہی تھی جو خون بن کر اسکے رخساروں پر دمک رہے تھے۔ گو اُس کی آنکھیں خشک تھیں۔ وہ ایک شنگرفی رنگ کی ساڑھی پہنے آئینے کے سامنے جوڑے میں پنیں لگا رہی تھی۔ اُسے اس بھڑکیلے لباس میں دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ ستی ہونے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ مگر اب میں آگئی تھی۔ میں نے پیار سے اس کی ٹھوڑی چھوئی، اور وہ ایک مُردہ ہنسی میں ڈوب گئی۔

"ڈرتی کیوں ہو؟" میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

مگر وہ بچا گئی اور ناخونوں کی پالش کی شیشیاں نکال کر اپنی ساری پر رکھ کر موزوں رنگ چھانٹنے لگی۔

"جو کچھ ہونا تھا ہو گیا میری قسمت — راحت یہ ٹھیک ہے؟" اُس نے راحت کو ایک شیشی دکھائی۔

"کچھ بھی نہیں ہوا۔ تم جو چاہو گی وہی ہوگا۔ کسی کی مجال نہیں کہ

وہ تمہاری مرضی کے بغیر تمہیں اس بے پسند کی شادی کی آگ میں جھونک دے۔"

وہ گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی اور جلدی سے ناخون رنگنا شروع کر دیئے۔

"تم ڈرتی کس سے ہو؟" وہ اور بھی گھبرائی "میری بات سنو کشور....."

"چھوڑو ریحانہ اِن باتوں کو۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ تمہاری کتاب......"

"میری کتاب کو تو ڈالو چولھے میں۔ اور تم یہ بتاؤ یہ آخر تمہاری والدہ......"

"جانے بھی دو" اُس نے جلدی سے بات کاٹی "ہاں اُحت کہ تمہارے ٹینس کا کیا حال ہے" اُس نے میرے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ٹینس... ٹینس... تم... وہ اب... خیر بتاؤ شوکت کہاں ہیں" راحت نے پوچھا اور کشور کا رنگ تمتما اُٹھا۔

"ہاں کہ شوکت صاحب کہاں ہیں، ذرا مجھے اُن سے بھی دو دو باتیں کرنی ہیں —— بے رحم انسان.... اگر انسان کہلانے کے........"

"ہٹاؤ بھی ریحانہ، جو میری قسمت میں لکھا.... تھا" وہ ڈر کر اور گھبرائی۔

مجھے معلوم ہو گیا کہ کشور کسی سے ڈر رہی تھی۔ گھبرا گھبرا کر وہ برابر والے کمرے کی طرف ایسے دیکھتی تھی گویا اب کوئی شیر اس میں سے نکلکر اُسے پھاڑ کھائے گا۔ شوکت، میرا جی چاہا اُسے.... اُسے نہ جانے کیا کروں۔ ایک معصوم لڑکی کے دل میں اُس نے نہ جانے کیا دہشت بٹھا دی تھی کہ وہ اس کے ذکر ہی سے گھبرا جاتی تھی۔ میرا ارادہ اور بھی مستقل ہو گیا، فولاد کی سی سختی آگئی۔ میں نہ صرف کشور کو ہی بچاؤں گی بلکہ میرا ہاتھ دُور دُور پہونچ کر ہزاروں بیکس لڑکیوں کو پناہ کے احاطے میں لے لیگا۔ راحت کی طرح ساری کی ساری لڑکیاں قوم کی داسیاں بن جائیں گی اور پھر —— پھر ہندوستان آزاد ہو جائے گا —— آزاد!

"کشور چھ بجنے میں صرف پانچ منٹ" قریب کے کمرے سے ایک بھاری سی مردانہ آواز آئی۔ اور کشور سر سے پیر تک لرز گئی۔ وہ جھپٹ کر سنگھار میز کے پاس گئی۔ میں بھونچکی گئی۔ اس سے قبل کہ وہ دراز کھولے اور سمِ قاتل اُس کے ہونٹوں سے گذرے، میں پہونچ گئی اور اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اُس کی ساری کا پلو گر گیا اور وہ بے طرح گھبرا گئی۔

"کشور... اتنی بزدلی... جانتی ہو خودکشی....."

"اُونہہ میں تو بٹوہ نکال رہی ہوں۔ بیٹھو ریحانہ میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتی...." وہ کچھ چھپا رہی تھی مجھ سے۔ بہت کچھ۔

"کشو تیار ہو چکو" وہ کڑ یہہ اور بھرائی ہوئی آواز پھر گونجی۔ اور کشور اور بھی پریشان ہو گئی۔ میں جانتی تھی اس وقت اُس کی کیا حالت ہوگی۔ جس طرح سولی پر چڑھانے سے پہلے خوفناک گھڑیال بھیانک آواز میں گھنگھناتا ہے، اسی طرح یہ آواز.... پھر آئی ہے۔

"اور لیلا رام کے یہاں بھی تو جانا ہے" اور پھر ایک سیٹی شروع ہو گئی۔

"ذرا ٹھہرو ریحانہ میں ابھی آئی" میں نے اُسے روکنا چاہا لیکن راحت نے میرا ہاتھ روک دیا۔

"ریحانہ کیا ہے۔ تم بالکل ہی بچہ ہو... سنو تمہیں نہیں معلوم کہ........"

میں نے اس کی بات ایک نہیں سُنی۔ پاس کے کمرے سے وہی گڑگڑاتی آواز قہقہہ لگا رہی تھی۔ دبے ہوئے گہرے قہقہے، اور کشور گویا سسکیاں لے رہی تھی۔ باریک اور دبی ہوئی آہیں۔

"لاحول ولاقوۃ" وہ موٹی آواز بولی۔

"سنو تو... سنو تو" کشور کی پریشان آواز آئی۔ وہ اس مردود کی التجائیں کر رہی تھی۔ پھر ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی کسی کو پکڑ کر گھسیٹ رہا ہو۔ اور وہ خوشامد کرے۔ جاں کنی میں.... پناہ مانگے۔

اور پھر اور بھی گھٹی گھٹی آوازیں آنے لگیں۔ گویا کوئی زبردست درندہ کشور کو بھنبوڑ رہا ہو۔ میری کنپٹیاں پھڑپھڑانے لگیں۔ نسیں کھنچ گئیں اور ہاتھ اکڑ گئے۔ کہ وقت آپہونچا تھا۔ میں ایک دم کھڑی ہو گئی!

"ہیں ہیں ریحانہ کیا کرتی ہو" راحت نے مجھے روکا۔

"کشور... میری کشور" میں بے ساختہ چیخ پڑی اور دوسرے لمحے دروازے کا پردہ الگ ہو گیا۔

اوہ، تھوڑی دیر کے لئے میری ساری [illegible]

بیچ بیچ کمرے میں ایک الماری سے [illegible]

نیرنگِ ہستی

بزمِ دُنیا میں نہ تھا سوز و گدازِ ہستی　　پردۂ قدس میں مستور تھا رازِ ہستی
حُسن کو جلوہ نمائی ہوئی فرحت منظور　　عِشق نے چھیڑ دیا نغمۂ سازِ ہستی

پھول برساتی ہو دُنیا میں بہارِ ہستی　　برگ و گُل سے ہیں عیاں نقش و نگارِ ہستی
کس کو امیدِ وفا عمر سے ہوگی فرحت　　اک نہ اک دِن کبھی اُترے گا خمارِ ہستی

آج ہر شے پہ ضیا پاش ہے نُورِ ہستی　　ذرّے ذرّے سے ٹپکتا ہے سُرورِ ہستی
رات بھر چین سے بس فرحتِ غافل سوئے　　صبح ہو جائے گا کافور غرورِ ہستی

کتنا پُرکیف نگاہوں میں ہے باغِ ہستی　　پھول بن بن کے چھلکتا ہے ایاغِ ہستی
ابھی دو دن ہوئے فرحت نے قدم رکھا ہے　　پھر بھی لالے کی طرح دل پہ ہے داغِ ہستی

ذرّے ذرّے سے نمایاں ہے نشانِ ہستی　　قطرے قطرے میں ہے اک رُوحِ روانِ ہستی
صرفِ تعمیرِ عمل رُوحِ جہاں ہے فرحت　　کاش تجھ پر بھی کھُلے رازِ نہانِ ہستی

کِتنا پُرکیف ہے یہ نغمۂ سازِ ہستی　　سانس کے پردے میں پوشیدہ ہے رازِ ہستی
میری آنکھوں نے اُسے دیکھ لیا اے فرحت　　لاکھ پردوں میں چھُپا نغمہ نوازِ ہستی

مجھ سے مت پوچھئے کچھ حالِ زبونِ ہستی　　کر سکا کام نہ کچھ سحر و فسونِ ہستی
ہو گیا چاک گریبانِ حیات اے فرحت　　کیا ہوا شعبدۂ جوشِ جنونِ ہستی؟

تھا نہاں رفعتِ ہستی میں زوالِ ہستی　　بن گیا جلوۂ موہوم جمالِ ہستی
کر دیا خبط مصائب نے کچھ ایسا فرحت　　جس سے اب وہم ہے سب تجلیِ اجمالِ ہستی

فرحت کاظمی

میری دوسری بیوی

گھر میں نئی بہو آئی۔

جیسے ہی رُوما رنگین اور زرکار بنارسی ساڑھی پہنے میرے ساتھ موٹر سے اتر کر کھڑی ہوئی ویسے ہی سہیلیوں کے ایک چمکدار جھرمٹ نے ہم دونوں کو گھیر لیا۔ یہ تو بیشک کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ جوڑا ناموزوں ہے لیکن اس وقت میرا سب سے بڑا نقص جو لوگ دیکھ سکتے تھے وہ میرے سر کا وہ حصہ تھا جہاں سے بہت سے بال اُڑ چکے تھے اور باقی سفید ہونے شروع ہو گئے تھے، اس کے علاوہ میرے چہرے پر ایک غیر معمولی سنجیدگی بھی پائی جاتی تھی جو ایک دولہا کے لئے قطعی ناموزوں کیفیت ہے۔

رُوما کی ہم عمر لڑکیاں حسب دستور طرح طرح کے ہنسی مذاق کر کے اس کو ہنسانے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن رُوما پر کوئی اثر ہی شاید نہ ہوتا تھا۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر نہ معلوم کس ترکیب سے رُوما کے گدگدی کر دی اور ہنستے ہوئے بولی "بہن، ایسا فلسفی دولہا تیری ہی قسمت میں لکھا تھا، دیکھو نا بیچارے کو ہنسنا تک نہیں آتا"۔

اس پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

سکھیوں کی اس چھیڑ چھاڑ میں گویا بادل کی سی ایک گرج اچانک سنائی دی۔ کسی نے اس سوال کا جواب دیا "اس کی نہ تو ہنسی مذاق کرنے کی عمر ہی ہے اور نہ شوق ہی۔ بیاہ تو اس نے اس لئے کیا ہے کہ دوسرا گھر بسائے بغیر کام نہیں چلتا تھا"۔

اس کے بعد بولنے والی نے دُلہن کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اس بہو کے ساتھ اس بہو کا بھلا کیا مقابلہ؟! وہ کالج میں نہیں پڑھی تھی تو کیا ہے بالکل جاہل بھی تو نہ تھی۔ ابھی تک اس کی کتابوں کی بھری بھری پڑی ہے جسے ادا دی بڑی محبت سے دیکھتا رہتا ہے ... ادا دی"۔

یہ میری بڑی بہن تھیں اور بولے جا رہی تھیں، میں کبھی [illegible] ... بیٹھا ... ایک ایک کتاب کی گرد اپنے ہاتھوں سے جھاڑتا ... آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے"۔

[illegible] ... سے خرچ ہو کر بولیں "چلو ادا دی ...

ان لڑکیوں کو تو بہو کے ساتھ ہنس بولنے دو اور تم چل کر تھوڑی دیر دوسرے کمرے میں آرام کر لو"۔

دُلہن کی دلجوئی کا یہ طریقہ کچھ ایسا انوکھا لگا کہ لڑکیاں کچھ نہ بولیں اور ایک ایک کر کے کھسکنے لگیں۔ کمرے میں رُوما اور دایہ رہ گئی۔

گھر کی دایہ کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ سسرال کا گھر بار رُوما کو سونپ دے۔

دن کا زیادہ حصہ رُوما اپنے کمرے کی تنہائی میں بسر کرتی کیونکہ میں تو صبح ہی کالج چلا جاتا تھا۔ رُوما کے کمرے میں میری پہلی بیوی رینوکا دیوی کی ایک قد آدم تصویر بھی دیوار پر آویزاں تھی۔ ایک کونے میں الماری رکھی ہوئی تھی، جس پر میں نے یہ لفظ لکھوا دئے تھے۔

"رینوکا کی یاد میں ۔۔۔!"

اس الماری کی کنجی میری بڑی بہن ساوتری جی کے پاس رہتی تھی، دراصل میری پہلی بیوی کے مرنے کے بعد ساوتری جی ہی اس گھر کی مختار کل تھیں۔ گفتگو کے دوران میں رُوما کو یہ بتا دیا کہ رینوکا دیوی کی وفات کے بعد میں نے اپنی بڑی بہن کو بڑی مشکل سے اس بات پر راضی کیا تھا کہ وہ آکر میرا گھر چند سے سنبھال لیں۔ اس سے پہلے وہ بریلی میں خاندانی جائیداد اور زمینداری کے کاموں کی دیکھ بھال ماموں جی کی مدد سے کیا کرتی تھیں۔ وہ بیوہ تھیں اور بہت خود سر۔

۲

رینوکا کی بے وقت موت نے مجھے سخت صدمہ پہنچایا تھا۔ میں نے غم غلط کرنے کے لئے کیا کیا جتن نہ کئے تھے حد یہ کہ شاعری تک اتر آیا، مگر دل کو سکون نہ میسر آیا۔ "فراق" اور "ہجر" کے جلتے مضمون اپنی شاعری میں باندھے انہیں فرضی اور بجا اس سمجھ کر ... کر دیا۔ کالج میں لکچر دیتے وقت میں اکثر از خود رفتہ ہو جاتا ... کو نوٹ لکھواتے وقت عجیب عجیب بدحواسیاں کرتا جن کی وجہ سے طلبا نے میرا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔

میری سکنڈ ایر کلاس میں ایک لڑکی تھی۔ ... تو وہ بھی ہم جماعت لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ مل کر ...

[illegible] تھی، لیکن جس دن سے اُس نے بہت غور و فکر کرنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ یہ غلطیاں درحقیقت میری عزیز بیوی کے غم کا نتیجہ ہیں، تو اسی دن سے رُوما کے خیالات میں ایک عجیب تبدیلی سی پیدا ہو گئی اور رفتہ رفتہ یہ حقیقی ہمدردی میں بدل گئی۔

ایک دن کالج بند ہونے کے بعد رُوما "بس" (Bus) کے انتظار میں کالج کے پھاٹک پر کھڑی تھی کہ میں حسبِ معمول اپنی موٹر اسٹارٹ کرنے میں مشغول ہو گیا۔ مجھ کو دیکھتے ہی رُوما کے دل میں نہ معلوم کیا خیال پیدا ہوا کہ وہ آگے بڑھی اور میری جانب متوجہ ہو کر کہا: "مسٹر سیمن، معاف کیجئے گا، مجھے آپ کو ایک تکلیف دینی ہے۔ کیا آپ مہربانی فرما کر تھوڑی دُور مجھے اپنی کار میں لے چلیں گے؟ مجھے اپنی ایک سہیلی کے ہاں جانا ہے، آپ کے تو راستے ہی میں پڑیگا!"

میں نے رُوما کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا اور نفسیاتی جائزے سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ کچھ مجل سی ہے۔ یہ درخواست محض اضطراری اور وقتی جذبہ کے ماتحت اس نے کر دی اور کچھ متعجب سی ہے، بلکہ کچھ گھبرائی گئی ہو اور بات بنا کر نکل بھاگنے کی فکر میں ہو۔ میں نے اس کو زیادہ پریشانی میں دیکھنا پسند نہ کیا اور جھٹ موٹر کا دروازہ کھول دیا اور جھک کر کہا: "شوق سے تشریف رکھیئے۔ میں بہت خوشی سے آپ کی ہر ممکن مدد کرنیکو تیار ہوں!"

اور جب رُوما ڈرتے ڈرتے موٹر کے پچھلے دروازے کی طرف بڑھی تو میں نے یہ کہکر روک دیا: "سامنے کی سیٹ پر تشریف رکھیئے۔ یہاں ہوا بھی اچھی لگے گی اور.... اور.... اور یہ کہ..... میرا مطلب یہ ہے کہ ہوا تو خیر ہے ہی، بات چیت بھی کرتے جائیگے!"

اس واقعہ کے بعد میرا معمول سا ہو گیا تھا کہ تقریباً روز کالج ختم ہونے کے بعد موٹر لیکر رُوما کے انتظار میں کھڑا رہتا اور جب وہ آجاتی تو اس حسین بوجھ کو بڑے فخر کے ساتھ اپنی کار میں لاد کر نہ معلوم کن کن راستوں کی سیر کراتا ہوا بڑی دیر کے بعد اس کو گھر پہونچاتا۔

کالج کے لڑکے لڑکیوں سے بھلا یہ بات پوشیدہ رہ سکتی تھی۔ چند ہی دن میں چہ میگوئیاں پھول پھول کر افواہیں بننے لگیں۔ اس کے گھر والوں کو بھی خبر ہو گئی اور وہ رُوما پر سخت بگڑے۔ خیر انجام یہ ہوا کہ جس دن میری پہلی بیوی رینو کا دیوی آنجہانی کا اِلاٹمنٹ ولایت سے تیار ہو کر آیا میری شادی رُوما سے ہو گئی!

(۳)

رُوما کو یہ شکایت تو ہرگز نہیں ہو سکتی تھی کہ اس کا شوہر اس سے کافی محبت نہیں کرتا۔ شادی سے پیشتر دو تین ماہ کتنی ہنسی خوشی بیتے تھے ہم دونوں۔ ہر روز کالج کے بعد کسی ہوٹل یا رسٹورنٹ میں چائے کی دعوت۔ ہنسی مذاق۔ اس کے بعد کنارِ دریا موٹر کی سیر۔ رات کو سینما اور پھر اپنے اپنے گھر۔ وہاں اگر جاگتے ہوں تو ایک دوسرے کی یاد اور اگر سوتے ہوں تو ایک دوسرے کے خواب — یہ سب کس قدر خوبصورت اور دلگیر آغاز تھا۔

لیکن بیاہ کے پہلے ہی دن رُوما کا یہ حسین خواب برہم ہو گیا اور میں مجرم ہوں کہ میں نے اس کو اصلیت سے آگاہ نہ کیا تھا۔ میں نے اس کو نہیں بتایا تھا کہ میرے گھر میں ابھی تک میری پہلی بیوی کی خوشبو سے فضا لبریز ہے۔ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا جب دربان نے آتے کے ساتھ ہی نئی دلہن کو سلام کیا اور کہنا شروع کر دیا۔

"پہلی بہوجی تو ہم غریبوں پر بہت مہربان تھیں، بڑا خیال رکھتی تھیں۔ انہوں نے تو آتے ہی میری بیوی کو ایک ریشمی ساڑھی دلائی تھی اور پانچ روپے نقد بھی دیتے تھے!"

پھر کھانے کے وقت رسوئیے نے بھی ایک جملہ کچھ اسی مضمون کا کہا تھا: "اجی، پہلی بیوی جی کو میرا پکایا ہوا کھانا پسند تھا تو نئی بہوجی کو کیوں نہ پسند آئیگا!"

اس کے علاوہ بہن جی نے جو باتیں برملا کہنی شروع کیں، ان کا ذکر چھوڑیئے میں یہی سوچتا رہا کہ اس قسم کی بے محل باتوں سے لوگوں کو منع کر دونگا لیکن وہ موقع ہی نہیں آنے پایا۔

رُوما کوئی بچہ تو تھی نہیں کہ میری خاموشی اور سنجیدگی کا مطلب نہ سمجھتی۔ اس گھر کی ایک ایک چیز رینو کا دیوی کے جہیز میں آئی تھی۔ رینو کا نے ہی خود اپنے ہاتھ سے اس سب سامان کو قرینہ سے سجایا تھا۔ ہر بات رُوما کو یہی یاد دلاتی تھی کہ وہ کسی اور کی خالی جگہ کو پُر کرنے آئی ہے، ہر چیز زبانِ حال سے اس سے کہتی تھی کہ رُوما تو اس گھر میں غیر ہے، نووارد ہے۔ رُوما کو حاصل کر کے میں جس کو بھول جانا چاہتا تھا آج اس گھر میں رُوما کی آمد سے اسی کی یاد پھر تازہ ہو گئی تھی!

میں گھریلو معلومات اور معاملات میں شروع ہی سے [illegible] اور بڑی بہن کے سامنے میری ہستی کم ہو جاتی [illegible]

یہ تمہارا روما کی اور میری زندگی کا آغاز سفر۔ روما چاہتی تھی کہ اپنی مرضی کے مطابق اپنا گھر سجاتے، اپنے بیاہ کے تحفوں سے بیٹھک کی خوبصورتی بڑھائے لیکن جب کبھی اس آرزو کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتی تو بہن ساوتری جی بول اُٹھتیں "مرے ہوؤں پر بھی اتنی بے رحمی۔ اس بچاری نے کتنی محنت سے مصیبتیں اُٹھا کر اس گھر کو سجایا بنایا تھا اور تم نے سب اُلٹ پلٹ کرکے رکھدیا"

روما اس کی کوئی خاص پروا نہ کرتی مگر پھر بھی اس کا دل بیٹھ جاتا اور منہ سے ایک لفظ نہ نکالتی۔

ایک دن روما نے نوکروں سے کپڑوں کی وہ الماری اُٹھوائی جس پر "رینوکا کی یاد میں!" لکھا ہوا تھا اور اس کو اپنی نند کے کمرہ میں بھجوا دیا۔ اس کی جگہ روما نے اپنی نئی آئینے دار الماری رکھوادی۔ گھر پر آیا تو معلوم ہوا کہ اس پر ساوتری بہن سخت ناراض تھیں، جونہی رینوکا کی الماری اُن کے کمرے میں پہونچی وہ غصہ میں پیر پٹختی ہوئی آئیں اور رینوکا کی تصویر بھی روما کے کمرے سے نکال کر لے گئیں اور میری لائبریری میں ایک الماری پر اُسے رکھدیا۔ میرا گھر میں پہونچنا تھا کہ ایک کہرام مچ گیا اور شکایتوں کے دفتر کھل گئے:-

"نئی بہو کے سینے میں دل نہیں پتھر کا ٹکڑا ہے۔ دیکھو بچاری مری ہوئی پر اتنا ظلم۔ اس کی کوئی نشانی بھی چھوڑنا نہیں چاہتی میرا کیا ہے۔ میں تو کل ہی گھر چلی جاؤں گی...... اپنی پیاری رینوکا کی یہ توہین نہیں دیکھ سکتی، تمہارا کلیجہ بیشک ٹھنڈا ہوتا ہوگا اپنی چاہیتی کو دیکھکر، کیوں نہ ہو آنکھ لگا کر لائے ہو نا!"

میں ساوتری بہن کی ان باتوں سے آگ بگولا ہوگیا لیکن جب کچھ بولنے پر آیا تو ہمت جواب دے گئی۔ میں گھر میں شانتی رکھنا چاہتا تھا اور یہاں اس کے سب سنبندھ ٹوٹ رہے تھے۔ سُنا تھا کہ مرد کو غصہ آنا چاہیئے اس لئے ذرا تن کر بیٹھ گیا۔ ساوتری جی پر غصہ اُتارنا تو میرے بس کی بات تھی نہیں ہاں روما کو خوب جھاڑ سکتا تھا، اس کو یہ بھی اندازہ کرانا تھا کہ میں صرف محبت ہی محبت نہیں ہوں مجھے غصہ بھی آتا ہے۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ روما اپنی صفائی میں کچھ کہے میں نے خواہ مخواہ آواز میں سختی پیدا کرکے کہا "اتنی گڑبڑ اور ہنگامے کی ضرورت کیا تھی؟ بھلا وہ الماری اور تصویر اس کمرے میں تمہارا کیا لیتی تھی۔ گھر میں جگہ کی کمی تو نہیں ہے۔ اس میں اپنا سامان رکھوا لیتیں، یا تمہیں بہن کا دل دُکھانا ہی منظور تھا!"

روما نے کوئی جواب نہ دیا۔ میرا غصہ ٹھنڈا کرنے کے

زبان سے آگے میری جھجک کمزوری کا مظہر بن جاتی ہے اور مجرم سا بن کر سب کچھ سنتے جاتا ہوں اور ایک لفظ منہ سے نہیں نکال سکتا۔

حالات کی یہ رفتار دیکھکر روما رو پڑی ایکدم۔ میں بھی اُس کے ساتھ بیکل ہوگیا لیکن روما ایسی لڑکی نہ تھی کہ اس کا شوہر اُس کے سامنے ملول ہو اور وہ ٹکٹکی دیکھے جائے۔ اُس نے جب مجھے غمگین دیکھا تو ہاتھ جوڑکر کہنے لگی "ناتھ! تم جس چیز کو ڈھونڈ رہے ہو وہ میں تم کو دیدوں گی۔ تمہارے ٹوٹے ہوئے دل کو بھی میں جوڑ بیٹھوں گی، لیکن تم مجھ پر رحم تو کرو!" مگر میں اپنے خیالات میں، جن کا کوئی نتیجہ نہ نکلتا تھا، گم تھا۔ اور کچھ نہ سمجھ سکا کہ روما کا مفہوم کیا ہے۔

میں نے رینوکا کی تصویر کی طرف دیکھا تو بے اختیار دل بھر آیا اور بیساختہ یہ نکلا "جو مرگیا اس سے کیا دشمنی؟ بہت ہی بھلی تھی بیچاری۔ میں اس سے بہت ہی محبت کرتا تھا لیکن تمہیں پاکر میں سب کچھ بھول گیا ہوں، روما۔ تم نے مجھے ایک نئی زندگی بخشی ہے"

میرے منہ سے یہ جملہ سنکر روما کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور بولی "آپ اس کو بھولے نہیں ہیں، ناتھ! وہ آپ کو اب نہیں مل سکتی، اسی لئے تو آپ مجھے لائے ہیں"

میں نے اس کو سمجھانے کی خاطر سمجھایا "دیکھو تم بھی اگر اسے دیکھتیں نہ، تو اس کی گرویدہ ہوجاتیں۔ خیر۔ اب تو وہ ہماری پہونچ سے بہت دُور چلی گئی ہے.... روما۔ آؤ ہم دونوں مل کر عہد کریں کہ اس کی یاد کو ہمیشہ مقدس رکھیں گے — بولو کیا کہتی ہو؟ .... روما میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اگر تم مجھے نہ ملتیں تو میں ضرور پاگل ہوجاتا.... تم نہیں سمجھ سکتیں روما کہ میں تم سے کس قدر محبت کرتا ہوں......" اور روما کو روتے دیکھکر پیار سے جھڑکتے ہوئے کہا "ارے! یہ کیا پگلی ہوگئی ہو کیا؟ ایک بے جان تصویر...... ایک بے جان یادگار سے اتنا حسد! بس بس روما، خاموش ہوجاؤ۔ خواہ مخواہ کیوں روتی ہو؟"

آخر روما بچاری کو خاموش ہونا ہی پڑا۔ اس نے میری غمزدہ آنکھیں دیکھیں اور دلی جذبات کو دبا کر محبت آمیز لہجے میں کہا۔ "ناتھ تمہارے دکھ کو دیکھکر ہی تو میں نے تم سے محبت کی تھی میں تمہاری مقدس یادگار میں ہرگز کوئی رخنہ نہ ڈالوں گی اور تمہاری خوشی کو ہی اپنی خوشی سمجھوں گی"

[illegible] کے بیٹھا یا میں پی کر باہر چلا گیا۔ چلتے وقت [illegible] بات تک نہ کی۔ مجھے اب واقعی غصہ آنے لگا تھا۔

***

میں یہاں تک اس یادداشت کو لکھنے پایا تھا کہ رنونا نے اس کو پڑھ لیا۔ اول تو اس پر ردوکد ہوتی رہی کہ نجی معاملات کی تفصیل تم نے لکھی کیوں۔ بڑی مشکل سے اس کو بھی افسانوں کی افادیت کا قائل کیا بلکہ اس پر آمادہ کیا کہ اس قصہ کا بقیہ حصہ وہ قلمبند کرے۔ چنانچہ اب اس کی کہانی خود اس کی زبانی سنیے۔

۵

اب میں زیادہ عرصے تک یہ سلوک برداشت نہ کر سکتی تھی۔ میں نند کے برتاؤ کی تو پرواہ نہ کرتی لیکن شوہر کے بدلتے ہوئے تیور دیکھکر کیونکر خاموش رہ سکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب مجھے بھی کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ لیکن کیا؟ بہت کچھ سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ کسی کو کانوں کان خبر کئے بغیر مجھے اپنے پتاجی کے گھر چلا جانا چاہیئے۔ وہاں پہونچکر بھی کسی کو پتہ نہ دونگی کہ کیا ہے۔ اسی طرح تھوڑے ہی دنوں میں مجھے معلوم ہو جائے گا کہ پروفیسر اتادی ناتھ سین جو فلسفہ کتب کے منتہی اور فلسفۂ خانہ داری کے اناڑی تھے مجھے بھی چاہتے ہیں یا صرف مرحومہ کی یاد میں مرتے ہیں۔

بہرکیف، پروفیسر صاحب کے جانے کے بعد میں نے معلوم کیا کہ اس وقت زحل کس برج میں ہے۔ معلوم ہوا کہ بہن ساوتری جی محلے کے کسی گھر میں گئی ہوئی ہیں۔ میں نے موقع مناسب سمجھا۔ ہینڈبیگ میں کچھ نقدی رکھی، جوتے پہنے اور شال اوڑھ کر اپنے کمرے کی کھڑکی سے باغ میں کود گئی۔ لیکن ابھی باغ کے پھاٹک تک بھی پہونچنے نہ پائی تھی کہ گھر کی نوکرانی دوڑتی ہوئی آئی۔ اس وقت کیا ارادہ فسق کیا ہے میرا کہ مزا آگیا۔ کہنے لگی "کوئی آدمی آپ کو پوچھتا ہے' ملنے آیا ہے۔ بیٹھک میں بٹھا دیا ہے" بنے بنائے کام کے اس طرح بگڑ جانے پر مجھے غصہ بھی آیا اور رنج بھی ہوا۔ لیکن خیر، میں بیٹھک میں آئی تو دیکھا کہ یہاں ایک نووارد جن سے نہ کبھی کی جان نہ پہچان بیٹھا ہے۔ اس کے چہرے پر بدچلنی اور بدقماری کے آثار، قبل از وقت پڑ جانے والی جھریوں کی صورت میں نمایاں تھے، ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا جس پر اپنے بھاری جسم کو سہارا دیکر چلتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی یہ شخص کھڑا ہو گیا اور بولا، "معاف کیجئے گا۔ مجھے مسز سین سے کچھ کام ہے؟"

میں نے ذرا متعجب سا ہو کر جواب دیا: "میں ہی [illegible] ہوں۔ خیر، فرمایئے۔ آپ کو کیا کام ہے؟"

اس پر نووارد نے کہا: "میرا نام وجے گوس ہے۔ میں مسز سین کو خوب اچھی طرح جانتا ہوں... لیکن... آپ تو..."

میں سمجھ گئی تھی اس لئے بات کاٹ کر جواب دیا: "اچھا، آپ مسٹر سین کی پہلی بیوی کا ذکر کر رہے ہیں! تعجب ہے کہ ان سے آپکی ملاقات بھی تھی اور پھر بھی آپ کو یہ معلوم نہیں کہ انکے انتقال کو آج [illegible] سال سے اوپر ہونے کو آیا ہے؟"

نووارد پر کچھ مایوسی سی چھا گئی: "صاحب، بات یہ ہے کہ مجھے مسز سین سے کسی زمانے میں محبت تھی۔ یہ دیکھئے کہ میرے پاس انکے ہاتھ کے لکھے ہوئے خط بھی ہیں، آپ تو پہچانتی ہونگی ان کے دستخط؟"

یہ کہکر اس نے ایک خط جیب سے نکال کر رعشہ سے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے مجھے دکھایا۔ گو میری آواز غصہ سے کانپ رہی تھی۔

"اگرچہ مرحومہ میری سوت ہی سہی لیکن آپ کو یہ یاد رہے کہ انکی وفات کے بعد ان کی توہین برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ میرے شوہر کی عزیز بیوی تھیں اور ہم دونوں نے عہد کیا ہے کہ ان کی یاد کو ہمیشہ عزیز اور پاکیزہ رکھیں گے"

نووارد اس پر ہنس پڑا اور بڑی بے رحمی کے ساتھ کہنے لگا: "تب تو میرا کام اور بھی سہل ہو گیا۔ غالباً آپ دونوں ہی نہیں چاہتے کہ رینوکا کی بدنامی ہو.... آپ اس خط کو اچھی طرح دیکھ لیجئے کہ یہ رینوکا کے ہاتھ کا ہی لکھا ہوا ہے یا نہیں..... اس نے یہ خط مجھے اس وقت لکھے تھے جب اسے بھی مجھ سے پریم تھا.... اسکے علاوہ اور بھی کئی ایسے ہی خط میرے پاس ہیں.... ان خطوط کے ذریعے میں رینوکا کی کافی بدنامی کر سکتا ہوں جس سے مسٹر سین کی اور ان کے خاندان کی بے عزتی ہوگی.... آپ اس ایک [illegible] خط کو کھول کر دیکھ لیجئے"

میں نے اپنی مرضی کے بالکل خلاف اس خط کو [illegible] رینوکا ہی کی تحریر تھی! میں نے پروفیسر صاحب کے [illegible] خط دیکھے تھے، میں نے خط کو پڑھنا شروع کیا [illegible] گیا تھا اور خط کے نیچے تحریر تھا "صرف تمہاری رینو!"

میں غضبناک ہو گئی اور غصہ [illegible]

تمہارا اس سارے تماشے سے مطلب کیا ہے؟ [illegible]

کس غرض سے آئے ہو؟"

وجے نے جواب دیا: "میں آپ کو جانتا بھی نہیں ہوں اور نہ میں آپ کے پاس آیا تھا۔ مجھے یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ رینوکا انتقال کر گئی ہے۔ میں تو اس غرض سے آیا تھا کہ رینوکا کے شوہر کو یہ خط دکھا کر بدنامی کا خوف دلاؤں گا اور تھوڑا بہت روپیہ وصول کر دونگا۔ میری ملاقات رینوکا سے اس کی شادی سے پہلے ہی ہو گئی تھی . . . . محبت ہوئی . . . . دو تین سال تک آپس میں خط و کتابت ہوئی اس نے کبھی تحریر میں شادی کرنے کا مجھ سے وعدہ بھی کیا تھا۔ نہایت یہ معاملے نہ ہونے پایا تھا کہ بدقسمتی سے پولیس نے ایک جھوٹے الزام میں میرا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ میں بھیس بدل کر بھاگ نکلا۔ چار پانچ برس ادھر اُدھر آوارہ پھرتا رہا۔ معاملہ رفع دفع ہو جانے کے بعد واپس آیا تو معلوم ہوا کہ رینوکا کی شادی پروفیسر نادی ناتھ سین سے ہو گئی ہے —— اب مجھے روپے کی سخت ضرورت ہے۔ اگر مجھے (۵۰۰) روپے نقد مل جائیں تو میں یہ خط دیدونگا اور آئندہ اس معاملہ میں کچھ نہ بولونگا۔"

میں نے سوچا یہ اُسی رینوکا کی داستان ہے جس کی یاد میں میرا شوہر آج تک بے چین ہے۔ یہ وہی رینوکا ہے جو اُن کی زندگی کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ وہ کسی اور سے بھی محبت کرتی تھی، اور صرف اُسی کی رینوکا ہونے کے باوجود وہ کسی اور کی بھی رینوکا بن گئی تھی۔ کیا عجب ہے کہ سب کے ساتھ "صرف اسی کی رینوکا" کسی کے ساتھ کسی کی بھی رینوکا نہ ہوئی ہو؟!"

اگر میرے شوہر کو یہ بات معلوم ہو جائے تو وہ ضرور میری عزّت کرنے لگیں گے اور پھر میری زندگی نہایت خوشگوار ہو جائیگی۔ موقع تو بہت اچھا ہے، اس وقت اس لوِدارو کو روک لو اور جب وہ آئیں گے تو میرے ہی سامنے اپنی پیاری رینوکا کی داستانِ عشق و محبت سُن لیں گے۔ اس کے خط پڑھ لیں گے۔ یہ بدلہ لینے کا خوب ہی اچھا موقع ہے۔

لیکن یہ خیالات چند لموں کے لئے تھے۔ میں اپنے شوہر کی عزّت کرتی تھی، اُس سے محبت کرتی تھی۔ میری دلی خواہش تھی کہ میرے شوہر کے لئے اس دنیا میں رونا کے علاوہ اور کچھ نہ ہو۔ پھر میں ان کا دل کیونکر دکھا سکتی تھی؟ انہوں نے اپنے دل میں رینوکا کی جتنی خوبصورت یادگار قائم کی ہوئی تھیں کسے بھلا کیسے اُجاڑ سکتی تھی [illegible] . . .

"نہیں، نہیں، جس کو میں دل سو چاہتی ہوں اس کو اس قدر رنج ہرگز نہیں پہونچا سکتی! مرحومہ کی یادگار کو مقدس رکھا جائیگا۔"

میں نے دبی آواز سے کہا: "خطوں کے اس پلندے کے بدلے میں آپ جو کچھ مانگتے میں دینے کو تیار ہوں، لیکن میرے پاس دینے کے لئے نقد روپیہ اور عزّت نہیں ہے۔ ہاں ایک قیمتی ہار بیشک میرے پاس ہے جو اس قیمت سے جو آپ مانگ رہے ہیں کہیں زیادہ کا ہے۔ وہ دے سکتی ہوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ ان خطوں کے علاوہ اگر رینوکا کی کوئی اور بھی نشانی آپ کے پاس ہو تو وہ بھی مجھے لا دیں اور یہ وعدہ کریں کہ آئندہ کبھی اس واقعہ کا بیان کسی کے سامنے نہ کرینگے!"

وجے نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے خط میرے حوالے کئے۔ میں اُسے لئے ہوئے اُوپر چلی گئی اور اپنی مرحومہ ماں کی نشانی، قیمتی موتیوں کا ایک ہار لیکر آئی۔ اُسے آخری بار چوما کیونکہ وہ اب مجھ سے جدا ہو رہا تھا۔ وہ اب اپنے پاکیزہ ماحول سے نکل کر ایک بدمعاش کی زندگی کے گندے نالے میں گرنا چاہتا تھا۔ مجھے اپنی ماں کی یادگار کو ایسے گھناؤنے طریقے پر غیر مقدس کرنے کا کس قدر رنج ہوا۔ مگر میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ اپنے عہد سے پھر دل، اور رینوکا کی یاد کو خراب ہونے دوں۔ میں اپنے شوہر کی دل شکنی بھلا کیسے برداشت کر سکتی تھی۔

وجے کچھ دیر تک حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر کو انسان تھا۔ اُس کی آنکھوں میں بھی آنسو ڈبڈبا آئے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا: "عورت کا دل بھی ایک معمہ ہے! —— خیر۔ مجھے معاف کیجئے گا، میں نے یہ سخت ضرورت سے مجبور ہو کر کیا ہے۔"

وجے کے باہر جاتے ہی میں پھر اسی کھڑکی سے باغ میں کودی اور ایک جھاڑی کے پیچھے خطوط کو خشک ٹہنیوں کی ارتھی میں رکھ کر ہمیشہ کے لئے ان کی مالک کے پاس شعلوں کے کاندھوں پر رکھ کر پہونچا دیا —— !

یہاں سے قصّہ خود میری زبانی ہے ! ——

---

(۶)

جب میں ناراض ہو کر چلا گیا اور ایک باغ میں جا کر بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے مجھے اس کا خیال ہوا کہ میں نے رونا کے ساتھ کتنی ناانصافی کی ہے۔ اگر یہ میری دوسری بیوی ہے تو کیا ہے۔ رونا کا تو یہ پہلا ہی بیاہ ہے۔ اس نے اپنے دل میں نہ معلوم کیا کیا اُمیدیں اور [illegible]

کام کر رہی ہو گی۔ لیکن میں اسے لاکر مصیبت میں پھنسا چکا ہوں۔ قدم قدم پر اس کی [illegible] جا رہی ہے۔ میرے ہوتے کی عزت کی خاطر زندہ کے [illegible] بنا رہا تھا۔ ہر وہ معمولی سا واقعہ جو رُوما کے رنج کا باعث ہوا تھا میرے ذہن میں اس وقت ایک ایک کر کے آنا شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ میرے گھر کی تمام کشیدگی کا باعث ساوتری بہن ہے۔

رات کا وقت تھا، چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ آسمان کے تارے چمک رہے تھے، وہاں تنہائی میں بیٹھ کر میں نے خدا کے سامنے گواہی دی کہ آج ہی اور ابھی گھر جا کر رُوما سے معافی مانگو نگا اور رینوکا کی تصویر اور دیگر یادگاریں ایک علیحدہ کمرے میں بند کر دونگا۔

گھر پہونچکر روزمرہ کی طرح بیٹھک میں رُوما کو ڈھونڈا پھر اندر کمرہ میں گیا ادھر اُدھر دیکھا کہیں نہ پایا۔ آخر ساوتری جی سے نہ رہا گیا اور وہ بولیں: "انادی تم کسے ڈھونڈ رہے ہو؟ رُوما کو؟ چلو ذرا لائبریری میں تو آؤ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

مجھے ذرا حیرت ہوئی: "کیوں۔ کیا بات ہے؟ رُوما کو تو کچھ نہیں ہو گیا؟ کہیں غصہ ہو کر چلی تو نہیں گئی؟!"

ساوتری بہن نے مجھے آرام سے بٹھا کر کہنا شروع کیا۔

"سنو اناادی۔ رُوما کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہے۔ تم یہ نہ سمجھ لینا کہ تم ہی اکیلے اس کی محبت کے حقدار ہو۔ اس میں اور بھی حصہ دار ہیں۔ تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ شادی سے پہلے اس کی کتنوں سے راز و نیاز کی باتیں ہو چکی ہیں؟ یہ بھی کوئی رینوکا کی طرح "ستی سیتا" ہے؟ آج میں ذرا کام سے محلہ میں گئی تھی کہ میدان صاف دیکھ کر ایک چھوکرا آن پہونچا۔ بہت دیر تک دونوں کی بیٹھک میں کھسر پھسر باتیں ہوتی رہیں۔ دو چار ایسے ویسے فقرے میرے کانوں میں بھی پڑے جو میں نے دروازے کی آڑ میں کھڑے ہو کر سن لئے تھے۔ وہ کوئی بدمعاش غنڈہ تھا، اُس کے چہرے ہی سے معلوم ہو رہا تھا کہ لچا ہے۔ خطوں کا ایک بنڈل دکھا کر رُوما کو ڈرا رہا تھا کہ اگر پانسو روپے نہ دئے تو یہ خط دکھا کر بدنامی اور بے عزتی کر دونگا۔ رُوما اوپر کے کمرے میں گئی اور وہاں سے نہ معلوم کس کا ایک موتیوں کا ہار لاکر اُسے دیدیا اور وہ خاموش ہو گیا۔ اس سے یہ وعدہ لیا گیا کہ اس واقعہ کا کسی کے سامنے ذکر نہ کرے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس رذیل چھوکرے نے کوئی قیمتی زیور کبھی دیکھا نہ تھا چیل کی طرح اُس پر جھپٹا اور خط یہیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ بس اس کا جانا تھا کہ رُوما کھڑکی کے راستہ باغ میں کود ی اور وہاں پہلے تو ایک ایک خط کو پڑھا اور پھر انہیں جلانا شروع کیا۔ جب سے یہی تماشہ ہو رہا ہے۔ میں بچاری کہتی نہیں بولی مجھ کیا غرض تھی۔ اور میں ہوتی کون ہوں۔ اب میں زیادہ عرصے تک چپ رہ نہیں دیکھ سکتی۔ تمہیں آگاہ کر دیا ہے اب جو کچھ اچھا سمجھتے ہو کرو۔ بھائی ایک بات میری سن لو۔ تمہاری یہ بیوی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی اور نہ وہ مجھے یہاں دیکھنا پسند کرتی ہے۔ بھائی، میری زبان پر تو صدا رینوکا کا نام رہا ہے اور رہیگا۔ توبہ، اس قدر جلن! اوروں کے ہاں بھی تو دوسری بیویاں ہوتی ہیں لیکن وہ تو مری ہوئی سے اتنا کپٹ نہیں کرتیں! اور یہ رُوما تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر رینوکا کی لاش دیکھ پائے تو "خون" چوس لے! اُفوہ! رے یہ چھل بازیاں۔ ایک طرف تو کہتی ہے کہ میرا شوہر ہی میری زندگی کا مرکز ہے اور چھپ چھپ کر نہ جانے کس کس سے ملاقاتیں کرتی پھرتی ہے۔ حرافہ کہیں کی۔"

میں نے دھیان دیکر ساوتری جی کے اس بیان یا دھواں دھار تقریر کو مطلق نہیں سُنا۔ اس وقت صرف ایک خیال میرے دماغ میں چکر لگا رہا تھا اور وہ یہ کہ جب تک ساوتری جی گھر میں ہیں رُوما کو چین نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں نے اپنی رائے پر کسی کو غالب آنے سے پہلے فوراً منہ کھول دیا۔

"اگر میرے ساتھ شادی ہونے سے پیشتر رُوما کو کسی اور سے محبت تھی بھی تو کیا ڈر کی بات ہے؟ میں بھی تو اس سے بیاہ کرنے سے پہلے پریم کرتا تھا۔ میں ایسا کمینہ نہیں ہوں کہ یہ سب باتیں دریافت کر کے اُسے شرمندہ کروں۔ بتاؤ۔ رُوما کہاں ہے اس وقت؟"

بہن ساوتری جی نے جب دیکھا کہ بھائی کے تیور کچھ بُری طرح بگڑے ہوئے ہیں تو وہ سمجھ گئیں کہ رُوما نے جادو کر دیا ہے اور یہ جرأت مجھے صرف اس وجہ سے ہوئی ہے۔ باغ کی طرف اُنگلی اُٹھا کر کہا۔

"اس طرف۔"

یہ کہکر وہ تو اپنے کمرے کی طرف چلدیں اور میں "رُوما! رُوما!" کہتا ہوا دوڑا۔

گھر کے باغ میں پہونچا تو دیکھا کہ رُوما ایک لکڑی کی مدد سے کاغذ آگ کے ڈھیر میں ڈال رہی ہے۔ میرے اس طرح یکایک عین موقع پر آموجود ہونے پر وہ ہکا بکا رہ گئی۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا، آواز گلے میں گھٹنے لگی اور بڑی مشکل سے یہ لفظ اس کے منہ سے نکل سکے۔ "تم، تم یہاں... تم یہاں کب آگئے ناتھ؟"

میں نے دیکھا کہ واقعی کاغذوں کا ایک انبار سلگ رہا ہے۔ پاس ایک گلابی رنگ کا ریشمی فیتہ بھی پڑا ہوا ہے۔ [illegible]

بلند و بند جاہوا تھا۔ اب مجھے طیش آیا اور جل کر کہا: تو کیا یہ سچ ہے کہ تم اس وقت اپنے ـــــ ہار کے بدلے یہی خط ملے تھے نا؟ جلا رہی ہو؟ موتیوں کے ہار کے بدلے یہی خط ملے تھے نا؟ تم کو یہ خوف تھا کہ مجھے معلوم ہو جائیگا اس لئے تو تم نے اپنی ماں کا دیا ہوا ایک ہزار روپے کا مال ان کاغذوں کے پرزوں کے بدلے میں دے دیا؟ ..... روما اس کی کیا ضرورت تھی؟ مجھ سے تم نے کیوں یہ بات چھپانے کی کوشش کی۔ روما سچ سچ بتا دو۔ روما کیا تم اب بھی کسی اور سے محبت کرتی ہو؟ اگر کرتی ہو تو میں تمہارا راستہ روک کر کھڑا نہ ہونگا اور خوشی سے تمہیں چھوڑ دونگا۔ مجھ سے جو محبت کی گئی یا ہے تم کو، وہ دراصل ایک بناوٹی چیز ہے۔ ظاہری.. .... بولو؟ روما وہ ہے کون؟ سچ سچ بتا دو، کیا یہ صحیح ہے کہ تم نے اس کو وہ ہار دیدیا جس کو تم جان کی برابر عزیز رکھتی تھیں، کیونکہ وہ تمہاری ماں کا دیا ہوا تھا؟"

روما خاموش تھی۔ وہ شاید سوچ رہی تھی کہ اس قدر جلد یہ خبر مجھ تک پہونچی کیسے۔ اب راز فاش کرنا ہی پڑیگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسی بدمعاش کا کام ہے۔ راستے میں میری اس کی ملاقات ہو گئی اور اس نے جھوٹی جھوٹی باتیں بنا دیں۔ اور بجائے رینوکا کے اس کا نام لے دیا۔ اب اگر انکار بھی کروں تو کیا میں اس کی بات کا یقین کر لونگا۔ کاغذ تو سب جل چکے ..... روما نے گلا صاف کر کے کہا: "ہاں، ان خطوں کو حاصل کرنے کے لئے مجھے موتیوں کا ہار دینا پڑا۔ کیونکہ خطوں کا دینے والا نقد روپیہ مانگ رہا تھا جو میرے پاس نہیں تھا۔"

میں نے نظریں نیچی کر لیں۔ یہ نظریں میری زندگی میں ایک نقطۂ انقلاب ثابت ہوئیں۔ اگر ان نظروں کے نیچا ہونے میں سکنڈ کے ہزارویں حصہ کی بھی دیر ہو جاتی تو نہ معلوم میری زندگی کس قدر ملول، مشکوک اور مجروح ہو چکی ہوتی۔

جونہی میری نظریں نیچی ہوئیں، جلتے ہوئے کاغذوں کی طرف نظر گئی۔ اچانک میری نگاہ ایک کاغذ کی طرف گئی اور میرے منہ سے چیخ سی نکل گئی۔

"ارے یہ کیا؟ ـــــ یہ تو رینوکا کی لکھت ہے۔ کہاں سے ملی تمہیں اس کی یہ چٹھی... یہ تم کو ....؟"

آگ میں جلا ہوا ایک کاغذ نکالا جو آدھا جل چکا تھا۔ یہ کسی خط کا آخری حصہ تھا۔ کاغذ کے ٹکڑے پر اب بھی صاف طور پر پڑھا جا سکتا تھا ـــــ "تمہارے وجے!"

اب مجھے یاد آیا کہ بہت کافی عرصہ ہوا رینوکا نے شادی سے پہلے کی کسی غلطی کا مجھ سے اعتراف کیا تھا۔ اور معافی چاہی تھی۔ رینوکا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کبھی وجے بوس نامی کسی شخص سے محبت کرتی تھی لیکن وجے نے نہایت سنگدلی سے اس کو بھلا دیا تھا اور آخرکار قید کے ڈر سے ایسا فرار ہوا کہ پھر خبر ہی نہ لی تھی۔ ہاں رینو نے یہ سب باتیں مجھے بتا دی تھیں!

میں نے روما کو گلے سے لگا لیا اور کہا: "روما مجھے معاف کر دو۔ میں نے تم سے بہت برا سلوک کیا ہے!"

روما اب بھی خاموش رہی اور سسکیوں کے ساتھ روتی رہی۔

"یہ خط تمہیں کیسے ملے؟ کہاں سے آئے تمہارے پاس؟ روما تم ان کو خاموشی کے ساتھ کیوں جلا رہی تھیں؟ دیکھو مجھ سے مت چھپاؤ صاف صاف بتا دو روما۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا وہ وجے بوس یہاں آیا تھا؟ ساوتری بہن نے جو کچھ کہا میں نے ٹھیک طرح سنا نہیں۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟ روما۔ یہ کس کے خط ہیں اور تم کیوں انہیں جلا رہی ہو!"

روما نے میرے سینے پر سر رکھکر جواب دیا: "لیکن آپ نے مجھ کو کبھی کچھ کہنے کا موقع بھی دیا؟!"

اس کے بعد روما نے سب کچھ بتا دیا، بہت اصرار کے بعد اس نے یہ بھی اقرار کر لیا کہ وہ گھر کی دوزخ سے تنگ آ کر چپکے سے نکل کر بھاگ جانا چاہتی تھی اور اپنے باپ کے گھر پہونچکر میری محبت کا امتحان لینا چاہتی تھی۔

وہ کہہ رہی تھی:۔

"تمہارے بے قرار دل کو چین اور تمہاری روح کو تسکین دینے کے لئے میں نے بہت سی قربانیاں کی ہیں۔ لیکن ان قربانیوں سے میرے دل کو جو راحت نصیب ہوئی ہے انہیں لفظوں میں بیان کیونکر کروں۔ کبھی ان قربانیوں کی کلفت مجھے ستاتی نہیں۔ بھلا میں یہ کیسے برداشت کر سکتی ہوں کہ تمہاری پیاری مرحومہ کی مقدس یادگار کو کوئی میری آنکھوں کے سامنے ناپاک کرے ـــ؟!"

مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے اس فرشتے کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

یہ میری دوسری بیوی ہے۔

ظفر قریشی، دہلوی

مسجد

دُور برگد کے گھنے پیڑ کے سائے کے قریب
وحشتیں ایک سبکدوش سپاہی کی طرح
ایک ویران سی مسجد کا شکستہ سا کلس
اور ٹوٹی ہوئی دیوار پہ چنڈول کبھی
گرد آلود سے طاقوں میں دیوں کے ٹکڑے
اور جاتے ہوئے سورج کے وداعی انفاس
ایک میلا سا، اکیلا سا، فسردہ سا دِیا
"تم سلگتے بھی ہو ہنستے بھی ہو کیا راز ہے یہ؟"
حسرت شام و سحر بیٹھ کے گنبد کے قریب
جو ترستی ہی رہیں آہ اثر کی خاطر!
یا ابابیل کوئی آمدِ سرما کے قریب
اور محراب کے دامن میں سمٹ کر اکثر
ایک بوڑھا سا گدھا سایۂ دیوار کے ساتھ
یا مسافر کوئی ویرانئ در سے ڈر کر
فرش جاروب کشی کیا ہے سمجھتا ہی نہیں
طاق میں شمع کے آنسو کے نشاں باقی ہیں
سو گئی حیلۂ خدمت کی فسوں کاری میں
ہو گئے کاوشِ امروز سے ماؤف دماغ
چاند پھیکی سی ہنسی ہنس کے گذر جاتا ہے
جس طرح بھوک کے مارے ہوئے کمزور یتیم
ایک میلا سا، اکیلا سا، فسردہ سا دِیا
"تم جلاتے ہو کبھی آکے بجھاتے بھی نہیں"
تیز ندی کی ہر اک موج تلاطم بردوش
کل بہالے گی تجھے توڑ کے ساحل کی قیود

جس جگہ رات کے تاریک کفن کے نیچے
سانس لیتی ہوئی سو جاتی ہیں چپکے چپکے
پاس بہتی ہوئی ندی کو تکا کرتا ہے
گیت پھیکا سا کوئی چھیڑ دیا کرتا ہے
روز مٹی کی نئی تہ میں دبے جاتے ہیں
روشنی آکے دریچوں کی بجھا جاتے ہیں
ٹمٹماتے ہوئے تاروں سے کہا کرتا ہے
کروٹیں لیکے یونہی صبح کیا کرتا ہے
اِن پریشان دعاؤں کو سنا کرتی ہے
اور ٹوٹا ہوا دل تھام لیا کرتی ہے
اس کو مسکن کے لئے ڈھونڈ لیا کرتی ہے
داستاں سرد ممالک کی کہا کرتی ہے
اونگھ لیتا ہے کبھی بیٹھ کے جاتے جاتے
لوٹ جاتا ہے کہیں دور سے آتے آتے
واقفِ قطرۂ شبنم بھی نہیں ہے حمام
نے مصلّے ہے نہ منبر نہ مؤذن نہ امام
خام چہروں میں جھلکتی ہوئی تہذیب کی لو
دب گئی پرسشِ اصنام میں احساس کی رو
تھرتھراتے ہوئے سائے سے اتر آتے ہیں
ایک نادار کے سینے پہ مچل جاتے ہیں
روز رعشہ زدہ ہاتھوں سے کہا کرتا ہے
ایک جلتا ہے مگر ایک بجھا کرتا ہے
چیخ اٹھتی ہے وہیں دور سے فانی، فانی!
اور پھر گنبد و مینار بھی پانی، پانی!

اختر الایمان

اصغر گونڈوی کی شخصیت اور شاعری

میں ایک زندہ انسان ہوں، اس لئے میرے نزدیک کسی انسان کی شخصیت کا اندازہ کرنے کے لئے صرف ایک معیار ہے — یہ دیکھنا کہ اس میں زندگی کرنے کی کتنی صلاحیت ہے اور زندگی کے لئے اس میں کتنا جذبہ ہے!

اگر اس اعتبار سے اصغر کو دیکھا جائے تو اس کو کسی شخصیت کا مالک نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ اس میں زندگی کی کوئی امنگ، کوئی جوش، کوئی ولولہ اور کوئی جذبہ نہ تھا۔ اس نے ایک زندہ انسان کی طرح کبھی زندگی کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ وہ زندگی سے، حواسِ خمسہ کی زندگی سے، اس زندگی سے جو جسم کی گرمی اور خون کی روانی سے عبارت ہے، بیگانۂ محض تھا۔ زندگی کے بارے میں اس کا شعر ہے ؎

سنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی کچھ خواب ہے، کچھ اصل ہے، کچھ طرزِ ادا ہے!

زندگی کی بوقلموں نیرنگیوں، دلچسپیوں، امیدوں، امنگوں اور رومانوں سے اُسے کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔ وہ گویا ایک تماشائی تھا جو تماشہ دیکھنے آیا اور تماشہ دیکھکر چلا گیا، نہ خود تماشہ میں کوئی حصہ لیا نہ اِس تماشا گاہِ ہستی کا جزو بن سکا۔ ایک فقیر تھا کہ "اپنی کمال میں مست" آیا اور اسی طرح چلا گیا۔

آخر عمر میں تو وہ "ہستی" کو "خواب" سے بھی کم درجہ کی کوئی چیز سمجھنے لگا تھا۔ کہتا ہے ؎

اے کاش میں حقیقتِ ہستی نہ جانتا اب لطفِ خواب بھی نہیں احساسِ خواب میں

زندگی اُس کے لئے "ایک" دھوکا" تھی۔ وہ تصویر سے زیادہ مصوّر میں منہمک ہوگیا تھا ——

؎ جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے پردہ پہ مصوّر ہی تنہا نظر آتا ہے

اصغر کے اشعار میں کہیں بھی زندگی کی گرمی، تپش اور چمک نظر نہیں آتی۔ وہ روحانیت سے مملو ہیں اور روحانیت ہی کی طرح "سرد" بھی ہیں، مگر اس کے باوجود ان میں ایک سماوی شان اور خوبصورتی پائی جاتی ہے —— ہمالیہ کی برف آلود سربفلک چوٹیوں کی خوبصورتی کی مانند جب سورج کی شعاعیں ان پر طرح طرح کی رنگ آمیزیاں کرتی ہیں! اس خوبصورتی کا اندازہ سطحِ زمین پر کھڑے ہوکر نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے ناظر کو خود بھی اونچا اُٹھنا پڑتا ہے۔ اُس بلندی پر انسانی تعلقات، جسم کی گرمی اور خوبصورتی اور زندگی کی گوناگوں کیفیات کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی شخصیت ٹھٹھر کر خود اپنے اندر سکڑ گئی تھی کیونکہ اسکو وہ بالیدگی اور نشو و نما نصیب نہیں ہوئی جو ایک زندہ انسان کو ملنی چاہئے۔ اب یہ خدا جانے یا فرائڈ[1] [illegible] کہ کن محرومیوں، کن ناآسودہ تمناؤں نے اُسے اِس خارجی زندگی سے بیزار کرکے "اندرونی زندگی" بسر کرنے پر مجبور کیا۔ میرے خیال میں وہ اُس سرور اور "سوز و سازِ زندگی"، ([illegible]) سے لطف اندوز ہونے کا اہل نہ تھا —— جو ایک [illegible] محسوس کرسکتا ہے۔ اُس کے خون میں سورج کی شعاعوں سے گرمی اور روانی پیدا نہ ہوسکتی تھی۔ نفس کی آمد و شد اس کے لئے ایک نشاط انگیز تجربہ نہ تھا۔ مناظرِ قدرت سے وہ خارجی احساسات کی مدد سے لذت گیر نہ ہوسکتا تھا۔ انسانی محفلوں کی ہماہمی اور دار و گیر، مرد و عورت کے تعلقاتِ باہمی، حسنِ انسانی اور خواہشاتِ جنسی اُس میں وہ جذبہ پیدا نہ کرسکتے تھے جو ایک "عام شخصیت رکھنے والے" انسان میں پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح حسن کو اپنا بنا لینے کی خواہش، اس پر قبضہ کرلینے کے خیال، رشک اور رقابت کے جذبوں سے بھی وہ ناآشنا ہی رہا۔ کہہ نہیں سکتے کہ یہ "سردی" یا "سرد [illegible]" اُس کی زندگی کے کسی خاص واقعات کی بنا پر پیدا ہوئی یا فطری تھی۔

اگر اصغر کبھی زندگی سے اور دُنیا میں رہنے والوں کی طرح لطف اندوز ہوا ہوتا تو ناممکن تھا کہ اس کے کلام میں کہیں نہ کہیں غیر شعوری انداز میں ان تجربات کی کوئی جھلک نظر نہ آتی۔ اس کا کلام زندگی سے یکسر خالی ہے، اُسی طرح جیسے وہ خود "زندگی" سے خالی تھا۔ ملاحظہ کیجئے ؎

اصغرِ افسردہ ہے محرومِ موجِ زندگی تو تو اے رنج یہ دیکھ کس اصل پر ہے؟

[1] آسٹریا کا مشہور ماہرِ نفسیات جو چند سال ہوئے مرا ہے۔

یہاں اِس حقیقت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ اصغر صوفی منش تھا اور قاضی عبدالغنی منگلوری مرحوم سے ارادتِ خصوصی رکھتا تھا۔ مگر تصوف کی طرف بھی تو انسان اُسی وقت مائل ہوتا ہے جب وہ زندگی میں دلچسپی لینا چھوڑ دے، اور انسان زندگی میں دلچسپی لینا اُسی وقت چھوڑتا ہے جب اُسے زندگی سے کوئی زبردست روحانی صدمہ پہونچے اور کوئی زبردست مایوسی ہو!)

بظاہر وہ ایک خوش اطوار، نفاست پسند، خلیق اور متواضع انسان تھا جس کے پاس گھنٹوں بیٹھکر بھی کوئی اُکتا نہ سکتا تھا۔ اس کی دو تصویریں جو "سرودِ زندگی" میں شامل ہے اس کی ظاہری شکل و صورت کو اچھی طرح پیش کرتی ہے۔ اس کی گذشتہ زندگی کے بارے میں مَیں اتنا ہی جانتا ہوں جتنا وہ لوگ جانتے ہوں گے جنہیں اس سے ملنے کا کبھی اتفاق بھی نہیں ہوا۔

مَیں اصغر سے ملنے سے پہلے اس کا کلام پڑھ چکا تھا۔ اُس کے اشعار زندگی سے اتنے زیادہ بعید اور واقعیت سے اتنے زیادہ مبرّا نظر آتے تھے کہ مجھے خواہش پیدا ہوئی کہ اصغر سے مل کر کچھ اندازہ کیا جائے کہ آخر اس تحریکِ شعری کا باعث کیا ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ بغیر کسی دنیاوی تجربہ کے انسان روح کی اُن بلندیوں تک کیسے پہونچ سکتا ہے جن کا پتہ اُس کے اشعار میں ملتا ہے، چنانچہ ایک دوست کی وساطت سے تعارف ہوا اور اس کے بعد مراسم بہت بڑھ گئے۔ مگر چونکہ مجھے طبعًا دوسروں کی زندگی کے رازوں کی جستجو کرنے سے بڑی نفرت ہے اس لئے میں نے کبھی براہِ راست اصغر سے کوئی استفسار اس کی گذشتہ زندگی کے بارے میں نہیں کیا اور خاموشی سے اُس کے اقوال و افعال سے نتائج اخذ کرنا زیادہ بہتر سمجھا۔

میرے ایک اور دوست (جنہیں جمالیات اور نفسیات دونوں میں شغف ہے) کو بھی یہ فکر تھی کہ کسی طرح اصغر سے اُس کی گذشتہ زندگی کے حالات، ذہنی کاوشیں، تجربات وغیرہ معلوم کریں تاکہ اُس کی شاعری کا "پس منظر" سمجھ میں آسکے۔ چنانچہ اُنہوں نے ایک دن یہ سوال کر ہی لیا مگر اصغر نے قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ اس کی زندگی میں "جنسیات" کو کبھی دخل نہیں رہا۔ اور میرے نزدیک کوئی وجہ نہیں کہ اصغر کے اس بیان کو سچ نہ مانا جائے۔

اصغر ایک نفسیاتی معمہ تھا۔ وہ ایک "زاہدِ مرتاض" اور "آرٹسٹ" دونوں کا ایک عجیب مجموعہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ فطرتًا دُنیا کے لوگوں سے جذباتی تعلق (Emotional Contact) پیدا کرنے اور اُن میں جذباتی دلچسپی لینے سے معذور تھا۔ بہت سے لوگ پیدا ہوتے ہیں، لوگوں میں مل جلکر رہتے ہیں اور مرجاتے ہیں مگر اپنے "روحانی کفن" سے باہر کبھی نہیں نکلتے، اور اصغر بھی اُن ہی لوگوں میں سے تھا۔ خود اعتراف کرتا ہے ؎

یہ راز ہے میری زندگی کا پہنے ہوئے ہوں کفن خودی کا

ایسے آدمی دُنیا میں رہتے ہیں مگر "بیگانوں" کی طرح، کیونکہ ان کی "خودی" لوگوں سے زیادہ خلا ملا گوارا نہیں کرسکتی۔ وہ خود اپنی روح کی گہرائیوں میں گم ہو کر بھی ایک پُرکیف (Ecstasy) حالت اپنے اُوپر طاری کرسکتے ہیں۔ اُنہیں ہر لحظہ یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ اگر کہیں وہ لوگوں میں جذب ہونے لگے تو اُن کی "خودی" کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس لئے وہ دُنیا میں لوگوں سے مجبورًا ملتے تو ضرور ہیں مگر "دامن بچائے ہوئے"؛ ہجوم میں گھِر کر بھی وہ "تنہا" ہی رہتے ہیں۔ وہ اپنی "خودی" کی اس درجہ حفاظت کرتے ہیں یا خود اپنے آپ میں اتنے کھوئے رہتے ہیں کہ اُن کے ملنے والوں کو بھی اُن سے آگاہی نہیں ہوتی۔

اصغر سے جو کلام یادگار ہے وہ صرف دو مختصر مجموعوں — "نشاطِ رُوح" اور "سرودِ زندگی" — پر مشتمل ہے اور یہ اُس کی آخیر عمر کا کلام ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُس کا پہلا کلام کیا ہوا اور وہ کیسا تھا؟

قرائن بتاتے ہیں کہ اُس نے شاعری بہت دیر میں شروع کی۔ میرے خیال میں شعر کہنے سے پہلے وہ عرصہ تک شدتِ احساس کی مشق کرتا اور حسرتوں کی پرورش کرتا رہا۔ چنانچہ خود کہتا ہے ؎

نہ پوچھو مجھ پہ کیا گذری ہو میری مشقِ حسرت سے قفس کے سامنے رکھا رہا ہے آشیاں برسوں

اُس کے پہلے مجموعۂ کلام کا نام "نشاطِ روح" واقعی بہت موزوں ہے، کیونکہ اُس کے اشعار رُوح کے نشاط انگیز اور نشاط افزا تجربات کا آئینہ ہیں، مگر جب مرنے سے تقریبًا ایک سال پہلے اصغر نے اپنا دوسرا مجموعۂ کلام شائع کیا اور اس کا نام "سرودِ زندگی" رکھا تو مجھے اس سے اختلاف تھا (گو میں نے اس وقت اپنی رائے ظاہر نہ کی کیونکہ اُن دنوں اصغر پر فالج گرا ہوا تھا اور اُن سے کسی قسم کی بحث کرنا مناسب نہ تھا)۔

اصغر تو زندگی سے بالکل ہی ناواقف تھا، ایک ایسی رُوح تھا جو اس دُنیا میں بھٹک آئی تھی اور یہاں اپنے لئے جگہ نہ پا کر [illegible]

کو یہی ہو گئی تھی۔ پھر اس کا کلام "سرودِ زندگی" کیونکر کہا جا سکتا ہے؟ ہاں، جو لوگ اصغر ہی کی طرح رُوحانی زندگی بسر کرتے ہیں اُن کے لئے وہ یہ درس رکھتا ہے، مگر عام زندگی سے اُسے کوئی سروکار نہیں۔

اصغر کا خیال آتے ہی مجھے بے ساختہ ایتھل مینن (Ethel Mannin) کے ناول "Ragged Banners" کا ہیرو "[illegible]" یاد آجاتا ہے، جس کو زندگی نے قبول نہ کیا اور جو زندگی کو قبول نہ کر سکا اور جو اِس دُنیا اور زندگی سے الگ ہوکر "[illegible]" کی طرف چلتے چلتے آخرکار اُن ہی میں جذب ہو گیا۔

اصغر بھی اُن ہی "شمالی روشنیوں" کا پروانہ ہے۔ دُنیا میں اُس کے لئے کوئی دلچسپی نہیں، اس لئے وہ بھی اُسی نور، اُسی شعلۂ آسمانی کی جستجو کرتا ہے اور تمام قیودِ جسمانی سے بے تعلق رہتا ہے۔ اُس کی رُوح علائقِ دُنیوی سے آزاد ہے۔ دُنیا میں رہنے کے باوجود بھی وہ اس تیرہ خاکدان سے کہیں اونچا اُٹھ جاتا ہے۔ چند فارسی اشعار میں یہ حقیقت صاف جھلکتی نظر آتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے ؎

بہ شب ہائے سیاہے چند آہے کردہ ام پیدا   بہ ہر سیارۂ صد رسم و راہے کردہ ام پیدا
جمالِ لالہ و گل را ہزاراں رنگہا بخشم   زفیضِ جلوۂ حسنِ ات نگاہے کردہ ام پیدا
تو در قیدِ جہاں پابستہ و صد شکوہ سنجی ہا   من از ہر ذرّہ سازے کردہ راہے کردہ ام پیدا
غبار از دامنِ خود بارہا افشاندہ ام اصغر   بہ ہنگامِ جنوں صد مہر و ماہے کردہ ام پیدا

زندگی کی "شب ہائے سیاہ" میں سوائے "سیاروں" سے رسم و راہ رکھنے کے وہ اور کر ہی کیا سکتا تھا؟ اس سے پہلے بھی اُردو شعرا نے زندگی کو تنگ آکر نکل بھاگنے کی خواہش ظاہر کی ہے مگر اُنہیں کوئی راہِ فرار نظر نہ آئی۔ ذوق کا شعر ہے ؎

احاطہ سے فلک کے ہم تو کب کے   نکل جاتے، مگر رستہ نہ پایا

مگر اصغر نے ہر ذرہ سے ساز کر کے اپنے لئے راہ پیدا کر لی تھی۔ کہتا ہے ؎

اب قفس بھی ہم اسیروں کو پرِ پرواز ہے   بندشوں سے اور بھی ذوقِ رہائی بڑھ گیا

چونکہ زندگی اُسے قبول نہ کر سکی، اس لئے اُسے بھی اس دُنیا کی حاجت نہیں ؎

مرا بس است کہ رنگینیِ نظر دارم   بگیر عالمِ خود، عالمِ دگر دارم!

اور اِس "عالمِ دگر" میں وہ اس درجہ منہمک ہے اور اُس کی رنگینیوں میں اتنا زیادہ کھویا ہوا ہے کہ اُسے اور کسی بات کا ہوش ہی نہیں، حتیٰ کہ اپنا بھی پتہ نہیں۔ کہتا ہے ؎

سما گئے مری نظروں میں چھا گئے دل پر،   خیال کرتا ہوں ان کو، کہ دیکھتا ہوں مَیں
نہ کوئی نام ہے میرا نہ کوئی صورت ہے   کچھ اس طرح ہمہ تن دید ہو گیا ہوں مَیں
نہ کامیاب ہوا میں نہ رہ گیا محروم   بڑا غضب ہے کہ منزل پہ کھو گیا ہوں مَیں
جہاں بھی ہو کہ نہیں جسم و جاں بھی ہیں کہ نہیں؟   وہ دیکھتا ہے مجھے، اس کو دیکھتا ہوں مَیں
ترا جمال ہے، تیرا خیال ہے، تُو ہے   مجھے یہ فرصتِ کاوش کہاں کہ کیا ہوں مَیں"؟
چہ درد؟ و چارۂ درد از کجا؟ نمی دانم   منے کہ خود بہ رگِ خویش نیشتر دارم!
نہ کچھ فنا کی خبر ہے نہ ہے بقا معلوم   بس ایک بیخبری ہے، سو وہ بھی کیا معلوم؟
ہجومِ شوق میں اب کیا کہوں مَیں کیا نہ کہوں   مجھے تو خود بھی نہیں اپنا مدعا معلوم!

اور اِس "کھوئے ہوئے" شخص کے کلام میں لوگ زبان اور محاورے کی غلطیاں نکالتے تھے، اُس پر آوازے کستے تھے ـــــ محض اس وجہ سے کہ وہ ان سب سے مختلف تھا!

دُنیا والوں کو یہ گوارا نہیں ہوتا کہ کوئی شخص اُن سے کسی طرح مختلف ہو اور اپنے "اصلی روپ" میں ظاہر ہو۔ تہذیبِ انسانی "انفرادیت" کو گھونٹ کر تیار ہوتی ہے۔ جہاں کوئی پگلی ہوئی، فرسودہ راہ کو چھوڑ کر اپنی راہ پر چلا اور اِن تہذیب و تمدن کے علمبرداروں نے شور مچانا شروع ہو جاتا ہے

کر لیتا، ایسا، جانے نہ پائے!

اس ہمدردی کے فقدان اور ناقدرمی کے احساس کا اور بھی اثر ہوا کہ اصغر خود اپنے ہی اندر سکڑتا گیا اور اپنے گردوپیش سے غافل ہوتا گیا۔ شکایتاً کہتا ہے ؎

نوائے راز کا سینے میں خون ہوتا ہے — ستم ہے لفظ پرستوں میں گھر گیا ہوں میں

اُس کے معیارِ زندگی دُنیا والوں کے معیاروں سے مختلف تھے ؎

اُبھرنا ہو جہاں، جی چاہتا ہے ڈوب مرنے کو — جہاں اُٹھتی ہوں موجیں، ہم وہاں ساحل سمجھتے ہیں
اسی سے دل، اسی سے زندگیِ دل سمجھتے ہیں — مگر حاصل سے بڑھ کر سعیِ بے حاصل سمجھتے ہیں
نہ ہوگا ہستیِ بے مدعا کا رازداں برسوں — وہ زاہد جو رہا سرگشتۂ سود و زیاں برسوں

اس کی شاعری میں وہ عملی جوش اور ولولہ نہیں جو اس دُنیا میں زندگی بسر کرنے والوں کا خاصہ ہے۔ جو کچھ جوش و خروش ہے وہ "خود اسکے اندر" رونما ہوتا ہے اور خارجی طور پر کوئی مظاہرہ اس اندرونی ہیجان کا نہیں ہوتا۔ اس کی زندگی کی صحیح تصویر ان اشعار میں نظر آتی ہے ؎

ذوقِ سرمستی کو محوِ روئے جاناں کر دیا — کفر کو اِس طرح چمکایا کہ ایماں کر دیا
تُو نے یہ اعجاز کیا اے سوزِ پنہاں کر دیا! — اس طرح پھونکا کہ آخر جسم کو جاں کر دیا

یہ واقعہ ہے کہ اصغر نے اپنے "سوزِ پنہاں" اور "شدتِ احساس" کی مدد سے "جسم" کو واقعی "جاں" بنا دیا تھا۔ وہ محبوب کی صفات اور اوصاف بیان کرنے کے لئے تشبیہات تک غیر شخصی اور غیر جسمانی استعمال کرتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے ؎

کیا میرے حال پہ سچ مچ انہیں غم تھا، قاصد! — تو نے دیکھا تھا ستارہ سرِ مژگاں کوئی؟
یُوں مُسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی — یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا
روشنی ہو جگنو کی جیسے شبستان میں — وہ نقاب کا عالم تیرے مُسکرانے سے
لالۂ و گل پہ جو ہے قطرۂ شبنم کی بہار — رُخِ رنگیں پہ جو آئے تو حیا ہو جائے
نظر اُس حُسن پر ٹھہرے تو آخر کس طرح ٹھہرے — کبھی جو پھول بن جائے کبھی رُخسار ہو جائے
اُس عارضِ رنگیں پر عالم وہ نگاہوں کا — معلوم یہ ہوتا ہے پھولوں میں صبا آئی

آپ ہی بتایئے، کہیں بھی ان تشبیہات میں زندگی کی گرمی محسوس ہوتی ہے۔ میرے عزیز دوست روش صدیقی نے اصغر کا کلام سنکر ایک مرتبہ کہا تھا "اِس شخص نے تغزل کو معصوم بنا دیا ہے" اور اس قول کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حسن و عشق کا تذکرہ ہی اصغر کی شاعری کی جان اور مخصوص موضوع ہے مگر اس لطافت اور معصومیت کے ساتھ ہوتا ہے کہ جواب نہیں۔ اصغر کا ایک شعر ہے ؎

چمن میں چھیڑتی ہے کس مزے سے لالہ و گل کو — مگر بادِ صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی

شاید خود اُس نے بھی بادِ صبا ہی سے "چھیڑ چھاڑ" کا یہ طریقہ سیکھا تھا۔ اُسکے خیال میں عشق آپ اپنا صلہ اور مقصود ہے ؎

خاک کر دیں تپشِ عشق سے ساری ہستی — پھر اسی خاک کو خاکِ درِ جاناں کر دیں

اس کے کلام میں خستگی، افتادگی، ناکامی اور محرومی کی جو تصاویر پیش کی گئی ہیں، وہ بے مثل ہیں۔ اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حالتیں کتنی شعلہ انگیز اور شعریت سے مملو ہوتی ہیں، نرم رفتار دریا کتنا زیادہ عمیق ہوتا ہے، سکون میں کیسا حشر بپا رہتا ہے اور "خاموشیوں" میں کتنی "گویائیاں" پنہاں اور کتنی "خوں گشتہ آرزوئیں" نہاں ہوتی ہیں ؎

سب رنگ و لطافت ہے افتادگیِ غم میں — میں خاک ہوں اور مجھ میں سب رازِ گلستاں ہے
مزہ الم میں ہے، کچھ لطف خستگی میں ہے — غرضکہ نشو و نمائے روح کی اسی میں ہے
سارا حصولِ عشق کی ناکامیوں میں ہے — جو عمر رائگاں ہے وہی رائگاں نہیں
انتہا کیف کی افتادگی و پستی ہے — مجھ سے کہتا تھا یہی دُردِ تہِ جام ابھی

ایک ایک تنکے پر سو شکستگی طاری
برق بھی لرزتی ہے میرے آشیانے سے

ہے خستگی کے دم سے رعنائی تخیل
میری بہارِ رنگیں پروردۂ خزاں ہے

رازِ فتادگی نہ پوچھ، لذتِ خستگی نہ پوچھ
یاں تو ہزار جبرئیل چھپ گئے گردِ راہ میں

کوئی سرگشتۂ راہِ طریقت اسکو کیا جانے
یہاں افتادگی کو حاصلِ منزل سمجھتے ہیں

لذتِ دردِ خستگی، دولتِ دامنِ تہی
توڑ کے سارے حوصلے، اب یہ مجھے صلہ دیا

دیکھئے اُس کی ناآسودہ تمناؤں نے کیا شکل اختیار کی ہے ؎

سُنا ہے حشر میں شانِ کرم بیتاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

نہ ہوا ول کو اگر ذوقِ عبادت، نہ سہی
اب اِسے صرفِ رہِ لذتِ عصیاں کر دیں

اُس حسنِ کاروبار کو مستوں سے پوچھئے
جس کو فریبِ ہوش نے عصیاں بنا دیا

فن کار (؟) کی حیثیت سے اصغر کا سب سے بڑا کارنامہ میرے نزدیک یہ ہے کہ اُس نے بغیر کسی خارجی محرک کے اپنی رُوح کی تاریک گہرائیوں میں گم ہوکر محض شدتِ احساس کی مدد سے وہ جواہر پارے برآمد کئے جن کی چمک سے نہ صرف اُس کی رُوح منوّر ہوگئی بلکہ دوسروں کو بھی اپنی رُوح کے اندر پہونچنے کا راستہ نظر آنے لگا۔ خود کہتا ہے ؎

اصغرِ خاکسار وہ ذرّۂ خود شناس ہے
حشر سا کر دیا بپا جس نے جہانِ راز میں

کچھ چیدہ اشعار سنیئے:۔

جمالِ یار کی زینت بڑھا دی رنگِ صورت نے
قیامت ہے قیامت میرا پابندِ نظر ہونا

کچھ تو کہو یہ کیا ہوا، تم بھی تھے ساتھ ساتھ کیا
غم میں یہ کیا سرور تھا، درد نے کیوں مزا دیا؟

زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا
رُخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

ہر حال میں بس پیشِ نظر ہے وہی صورت
میں نے کبھی روئے شبِ ہجراں نہیں دیکھا

ڈوبا ہوا سکوت میں ہے جوشِ آرزو
اب تو یہی زبان ہے مدعا کی ہے

مستانہ کر رہا ہوں رہِ عاشقی کو طے
کچھ ابتدا کی ہے نہ خبر انتہا کی ہے

یہ بھی فریب سے ہیں کچھ دردِ عاشقی کے
ہم مر کے کیا کریں گے کیا کر لیا ہے جی کے

شرح و بیانِ غم ہے اک مطلبِ مقید
خاموش ہوں، کہ معنی صدہا ہیں خامشی کے

خاکِ پروانہ کی برباد نہ کر بادِ صبا
یہی ممکن ہے کہ کل تک مرا افسانہ بنے

بہت لطیف اشارے تھے چشمِ ساقی کے
نہ میں ہوا کبھی بے خود نہ ہوشیار ہوا

گم کر دیا ہے دید نے یوں سر بسر مجھے
ملتی ہے اب اُنہی سے کچھ اپنی خبر مجھے

کیا دردِ ہجر اور یہ کیا لذتِ وصال
اس سے بھی کچھ بلند ملی ہے نظر مجھے

شیشے میں موجِ مے کو یہ کیا دیکھتے ہیں آپ
اِس میں جواب ہے اُسی برقِ نگاہ کا

اُس جلوۂ بے کیف سے محروم ہی رکھا
کمبخت کبھی ہوش کبھی بے خبری نے

نہ مدعا کوئی میرا، نہ کچھ ہراس مجھے
کہ عاشقی ہے فقط بیدلی و بے جگری

ہے آرزو کہ آتے قیامت ہزار بار
فتنہ طرازیٔ قدِ رعنا لئے ہوئے

رگ رگ میں اور کچھ نہ رہا جز خیالِ دوست
اُس شوخ کو ہوں آج سراپا لئے ہوئے

جانِ بلبل کا خزاں میں نہیں پرساں کوئی
اب چمن میں نہ رہا شعلۂ عریاں کوئی

بے محابا ہو اگر حسن تو وہ بات کہاں
چھپ کے جس شان سے ہوتا ہے نمایاں کوئی

پردۂ لالہ و گل بھی ہے بلا کا خوں ریز
دل میں اک بوند لہو کی نہیں، رونا کیسا؟
کہہ کے کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردہ میں نے
سارے عالم میں ہے بیتابی و شورش برپا
پردۂ حرماں میں آخر کون ہے اس کے سوا
حسرتِ ناکام میری کام سے غافل نہیں
ہے تلوّن سے ترے جلوۂ نیرنگِ حیات
علم و حکمت کی تمنّا ہے نہ کونین کا غم
ذرّہ ذرّہ علم و حکمت کا ہے سب بکھرا ہوا!
صحنِ حرم نہیں ہے، یہ کوئے بتاں نہیں
مدّت ہوئی کہ چشمِ تحیّر کو ہے سکوت
فطرت سنا رہی ہے ازل سے اسی طرح
دیکھوں ہجومِ غم میں نہ لے کس طرح خبر
وہی تھا حال میرا جو بیاں میں آ نہ سکتا تھا
وہاں کیا ہے، نگاہِ ناز کی ہلکی سی جنبش ہے
محبت ابتدا سے تھی مجھے گلہائے رنگیں سے
سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
اک شورشِ بے حاصل، اک آتشِ بے پردا
خیرگیِ نظر کے ساتھ ہوش کا بھی پتہ نہیں
اشک اب نہیں تھمتے، دل پہ اب نہیں قابو
بیخودی کا عالم ہے، محوِ جبہ سائی ہوں
کامیابِ شوق کی ناکامیوں کو دیکھئے
اب مجھے خود بھی نہیں ہوتا ہے کوئی امتیاز
ہو کے رازِ عشق افشا، بن گیا اک راز اور
حجاب اس کا ظہور ایسا ظہور اس کا حجاب ایسا
یہاں میں ہوں نہ ساقی ہے نہ ساغر ہے نہ صہبا ہے
رقصِ مستی دیکھتے، جوشِ تمنّا دیکھتے
کچھ سمجھ کر ہم نے رکھا ہے حجابِ دہر کو
صد زمان و صد مکاں ایں جہان و آں جہاں
ترے ہی در پہ مٹ جانا لکھا ہے میری قسمت میں
نگاہیں دیکھتی ہیں، روح قالب میں تڑپتی ہے
ترے قربان ساقی، اب یہ کیا حالت ہے مستوں کی
وہ سامنے ہیں، نظامِ حواس برہم ہے

اب زیادہ نہ کرے حسن کو رسوا کوئی
اب ٹپکتا نہیں آنکھوں سے گلستاں کوئی
مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا
ہائے اس شوخ کا ہم شکلِ تمنّا ہونا!
لے خوشا درد کہ نزدیکی بھی ہے دوری بھی ہے
اک طریقِ جستجو یہ دردِ مہجوری بھی ہے
میں تو مر جاؤں جو اُمیدِ وفا ہو جائے
میرے شیشے میں ہے باقی مئے گلفام ابھی!
یہ غنیمت ہے درِ میخانہ اب تک باز ہے!
اب کچھ نہ پوچھئے کہ کہاں ہوں کہاں نہیں
اب جنبشِ نظر میں کوئی داستاں نہیں
لیکن ہنوز ختم مری داستاں نہیں
یہ اس کا امتحاں ہے مرا امتحاں نہیں
جسے کرتا رہا افشا سکوتِ راز داں برسوں
مزے لے لے کے اب تڑپا کریں اربابِ جاں برسوں
رہا ہوں آشیاں میں لے کے برقِ آشیاں برسوں
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے
آتشکدۂ دل میں اب کفر نمایاں ہے
اور بھی دور ہو گئے آ کے ترے حضور میں
خود کو آزما بیٹھے مجھ کو آزمانے سے
اب نہ سر سے مطلب ہے اور نہ آستانے سے
حرفِ مطلب محو ہے جوشِ دعا کے سامنے
مٹ گیا ہوں اس طرح اس نقشِ پا کے سامنے
سب زباں پر آ چکا ہے سب ابھی تک دل میں ہے
ستم ہے خواب میں خورشید کا یوں جلوہ گر ہونا
یہ میخانہ ہے، اس میں معصیت ہے باخبر ہونا
سامنے لا کر تجھے، اپنا تماشا دیکھتے
توڑ کر شیشے کو پھر کیا رنگِ صہبا دیکھتے
تم نہ آ جاتے تو ہم وحشت میں کیا کیا دیکھتے
ازل میں یا ابد میں ہیں کہیں ہوتا نہیں ہوتا
مرا کیا حال ہوتا تو اگر پردہ نشیں ہوتا
کبھی عالم تو ہوتا ہے کبھی عالم نہیں ہوتا
نہ آرزو میں سکت ہے نہ عشق میں [illegible] ہے

زمیں سے تا بہ فلک کچھ عجیب عالم ہے! یہ جذبِ مہر ہے یا آرزوئے شبنم ہے؟
بردائے لالہ و گل، پردۂ مہ و انجم جہاں جہاں وہ چھپے ہیں عجیب عالم ہے!
کسی طرح بھی تری یاد اب نہیں جاتی یہ کیا ہے روزِ مسرت ہے یا شبِ غم ہے
کہاں زمان و مکاں پھر کہاں یہ ارض و سما جہاں تم آئے یہ ساری بساط برہم ہے
اب تو خود شاق ہے یہ ہستیِ بے جا مجھکو پھونک دے پھونک دے اے برقِ تماشا مجھ کو
لالہ و گل کا جگر خون ہوا جاتا ہے سب سمجھتے ہیں جو ناکامِ تمنا مجھکو
تیرا جلوہ، ترا انداز، ترا ذوقِ نمود اب یہ دنیا نظر آتی ہے وہ دنیا مجھکو
بوئے گل بن کے، کبھی نغمۂ رنگیں بن کے ڈھونڈ لیتا ہے ترا حسنِ خود آرا مجھکو
ایک میرا ہی فسانہ ز ازل تا بہ ابد! یوں نہ کرنا تھا مرے سامنے رسوا مجھکو
ہمہ تن ہستیِ خوابیدہ مری جاگ اٹھی ہر بُنِ مو سے مرے اس نے پکارا مجھکو
اس طرح بھی کوئی سرگشتہ و برباد نہ ہو اک فسانہ ہوں جو کچھ یاد ہو کچھ یاد نہ ہو
حسن کو وسعتیں جو دیں، عشق کو حوصلہ دیا جو نہ ملے نہ مٹ سکے وہ مجھے مدعا دیا
اب نہ یہ میری ذات ہے اب نہ یہ کائنات ہے میں نے نوائے عشق کو ساز سے یوں ملا دیا
"کہاں خرد ہے؟ کہاں ہے نظامِ کار اس کا؟" یہ پوچھتی ہے تری نرگسِ خمار آلود

اصغر نے خود اپنی جو تشریح کی ہے اُس سے بہتر شاید ہی کوئی پیش کر سکے۔ کہتا ہے ؎

وہ اُن کا اک بہارِ ناز بن کر جلوہ گر ہونا مرا وہ روح بننا، روح بن کر اک نظر ہونا!

واقعی اصغر بذاتِ خود ایک نظر، بلکہ یوں کہیئے کہ "طرزِ نظر" ہو کر رہ گیا اور اس طرزِ نظر اور مذاقِ سوزِ پنہاں کی اِس پُرآشوب اور الم زدہ دُنیا کو سخت ضرورت تھی۔

اُس کے عقیدے کے مطابق "حسن" کوئی خارجی چیز نہیں بلکہ خود ناظر کے اندر ہوتا ہے اور اُس کی اپنی ہی شخصیت کا پھیلاؤ (Extension) ہوتا ہے۔ اصغر پہلا شاعر ہے جس نے اُردو شاعری میں "حسنِ ذہنی و باطنی" (Intellectual Beauty) کو ایک ممتاز درجہ عطا کیا اور حسن و عشق کی جمالیاتی تفسیر پیش کی۔ اُس نے "جمالیات" میں بھی "خودی" کی اہمیت جتلائی اور "حسن" کو "عشق کا پرتو" قرار دیا۔ ظالم حد کر دیتا ہے۔ حسنِ مطلق کو بھی اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے ؎

غضب ہوا کہ گریباں ہی چاک ہونے کو تمہارے حسن کی ہوتی ہے آج پردہ دری
نہ جانے مری بگڑی ہوئی اداؤں پر کہ عاشقی میں مری حسن کی ہے جلوہ گری
جو شوخیوں سے لیا ہے جمالِ بیتابی تو جوشِ حسن سے پائی ادائے جامہ دری
لئے ہیں زلف سے آشفتگی کے سب انداز نگاہِ مست سے پہونچا ہے حسن بے خبری
داستاں اُن کی اداؤں کی ہے رنگیں، لیکن اس میں کچھ خونِ تمنا بھی ہے شامل میرا
ہاں وادیِ ایمن کو معلوم ہیں سب قصے موسیٰ نے فقط اپنا اک ذوقِ نظر دیکھا
میرا دائے حسن آئینہ میں آتی ہے نظر یعنی خود کو دیکھتے ہیں مجھکو حیراں دیکھکر
پھر گئی آنکھوں کے آگے وہ ادائے برقِ حسن چیخ اُٹھے سب مرا چاکِ گریباں دیکھکر
کارفرما ہے فقط حسن کا نیرنگِ کمال چاہے وہ شمع بنے چاہے وہ پروانہ بنے
ادائے عشق کی تصویر کھنچ گئی پوری وفورِ جوش سے یوں حسن بیقرار ہوا
اپنے انداز پہ ہو شاہدِ فطرت بیخود رکھدے آئینہ اگر دیدۂ حیراں کوئی

ایسا بھی ایک جلوہ تھا اُس میں چھپا ہوا | اُس رُخ پہ دیکھتا ہوں اب اپنی نظر کو میں
نہیں معلوم کتنے جلوہ ہائے حُسن پنہاں ہوں | کوئی پہونچا نہیں گہرائیوں میں اشکِ پیہم کی
شعاعِ مہر خود بیتاب ہے جذبِ محبت سے | حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی
اک شعلہ اور شمع سے بڑھکر ہو رقص میں | تم پھاڑ کر تو سینۂ پروانہ دیکھئے
وہیں سے عشق نے بھی شورشیں اُڑائی ہیں | جہاں سے تونے لئے خندہ ہائے زیر لبی
حُسن کے فتنے اُٹھے میرے مذاقِ شوق سے | جس سے میں بیچین ہوں وہ خود مری آواز ہے
بجھ گئی کل جو سرِ بزم وہی شمع نہ تھی | شمع تو آج بھی سینے میں ہے پروانوں کے
دید کیا، نظارہ کیا، اُس کی تجلی گاہ میں | وہ بھی موجِ حسن تھی جسکو نظر سمجھا تھا میں
باقی نہ تابِ ضبط رہی شیخ و شاب میں | اُنکی جھلک بھی تھی مری چشمِ پُر آب میں
اِک نگارِ مجوبی اشکِ خوں میں پنہاں ہے | حُسن کی نمائش ہے عشق کے بہانے سے
اشکِ پیہم کو سمجھ لیتے ہیں اربابِ نظر | حُسن تیرا مرے چہرے سے جھلکتا دیکھیں
مزے آگئے ہیں عشوہ ہائے حُسنِ رنگیں کے | تڑپتے ہیں ابھی تک رقصِ بسمل دیکھنے والے
عکس کس چیز کا آئینۂ حیرت میں نہیں | تیری صورت میں ہے کیا جو مری صورت میں نہیں

اصغر کا کلام پڑھیئے تو آپ کو خود اپنے اندر کی موسیقی سنائی دے گی جو دُنیا اور زندگی کے بے معنی شور و شغب میں آپ کبھی نہیں سُن سکتے۔ اس سے آپ کی رُوحانی واماندگی دُور ہو جائے گی۔

اُس کی شاعری کو نفسیات کی اصطلاح میں اگر "ارتفاعِ حسی" ([illegible]) کا نتیجہ بھی مان لیا جائے، تب بھی وُہ ارفع ([illegible]) ہے اور صحیح معنوں میں نشاطِ رُوح ہے۔ رُوح کے جن مقامات عالی سے وُہ ہمیں آشنا کر گیا ہے وہ اُردو شاعری کے لئے مایۂ ناز ہیں۔ جن کیفیات اور وارداتِ قلبی کو اُس نے ادا کیا ہے کسی اور نے نہیں کیا۔ صوفیانہ شاعری کی اُردو میں کمی نہیں۔ (مولوی صاحبان اور شارحین کا خدا بھلا کرے!) ہر شعر میں مجاز اور حقیقت دونوں کو ٹھونس کر دکھایا جاتا ہے۔ مگر اصغر کی شاعری اور عجیب و غریب زندگی میں جو ہم آہنگی تھی یہ اُسی کا نتیجہ ہے کہ گو زندگی میں لوگ اُسے نہ پا سکے، مگر وہ آج بھی اپنے اشعار میں اپنی انفرادی خصوصیات کے ساتھ نمایاں ہے ؎

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا | اشعار میں سُنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

---

۳۰ نومبر ۳۶ء کی صبح کا واقعہ ہے۔ میں اتفاق سے صرف دو دن کے لئے دہلی سے الہ آباد گیا ہوا تھا کہ اچانک اصغر کے انتقال کی خبر ملی۔ میں فوراً اُن کے مکان پر پہونچا مگر باہر ہی سے لوٹ آیا۔ نہ آخری دیدارِ میت ہی کی ہمت پڑی نہ جنازہ کے ہمراہ قبرستان تک جانے کی کیونکہ میں یہ گوارا نہ کر سکا کہ اپنے آپ کو یہ یقین دلا دوں کہ اصغر اب اس دُنیا میں نہیں رہا۔ زندگی میں بھی میں نے اصغر کو بارہا "کھویا ہوا" پایا تھا اور لئے صرف یہ خیال دل میں لیکر میں واپس چلا آیا کہ اب وہ "موت" کے بہانے سے کہیں روپوش ہو گیا ہے۔ اس کو مرے ہوئے ایک عرصہ ہوا مگر مجھے اُس کی موت کا اب بھی یقین نہیں۔ میرے نزدیک اصغر مرا نہیں کیونکہ اس کا کلام موجود ہے، اور اُس میں خود اُسی کے قول کے مطابق وہ "کچھ کچھ نمایاں" ہے ——— اتنا زیادہ جتنا وہ زندگی میں نہ تھا!

میں اب بھی اکثر حیرت آمیز لہجہ میں اُسی کا شعر پڑھا کرتا ہوں ؎

خدا جانے کہاں ہے اصغرِ دیوانہ برسوں سے | کہ اُس کو ڈھونڈتے ہیں کعبہ و بتخانہ برسوں سے!

نوٹ۔ اس مضمون کا کچھ حصہ آل انڈیا ریڈیو دلّی سے نشر ہو چکا ہے۔

منظر عزیز

تیمور کی موت

پانچ سو برس سے کچھ زیادہ عرصہ ہوا جب ایک آدمی نے ساری دنیا پر قابض ہونا چاہا۔ جس کام میں اس نے ہاتھ ڈالا کامیاب ہوا۔ نصف دنیا سے زیادہ کے لشکروں کو اس نے یکے بعد دیگرے نیچا دکھایا۔ کئی شہروں کو بیخ و بنیاد سے اکھیڑ پھینکا۔ ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ کئی سلطنتوں کی دولت اپنے قبضے میں لایا اور جس طرح جی چاہا اسے صرف کیا۔ پہاڑوں کی چوٹیاں کاٹ چھانٹ کر ان پر تیز بہت گاہیں بنائیں۔ دریاؤں کے رخ بدل ڈالے۔ سڑکیں اور راستے ایسے بنائے کہ دو براعظموں کی تجارت کا مال ان پر سے گذرنے لگا — اس خونخوار اور جنگجو آدمی کو ہم تیمرلین یا تیمور لنگ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

ایشیا اس سے خوب واقف ہے، اس پر ناز بھی کرتا ہے اور افسوس بھی۔ بعض لوگ اسے گرگ سیاہ کہتے ہیں مگر بعض ایسے بھی ہیں جو اسے شیر ژیاں اور گیتی ستاں کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ مشہور شاعر ملٹن نے عزازیل کی شاندار تصویر میں جو عجیب رنگ بھرے ہیں معلوم ہوتا ہے تیمور لنگ کے قصوں پر غور کرنے کے بعد ہی اس کے قلم میں یہ بلا کا زور آیا تھا۔

شاعروں نے اس ہیبتناک انسان پر خیال آفرینیاں کیں، مگر مؤرخوں پر سکوت کا عالم طاری رہا کہ وہ تیمور کو کس زمرے میں تصور کریں۔ وہ کسی شاہی خاندان کا رکن نہیں تھا لیکن اپنی ذات سے البتہ وہ ایک شاہی خاندان کی بنا ڈال گیا۔ غارت گر تھا، ڈھانے اور گرانے والا تھا مگر جب بنانے کی طرف راغب ہوا تو بے مثل عمارتیں اس نے تعمیر کرائیں۔ اسکندر کی طرح کسی بادشاہ کا لڑکا نہیں تھا اور نہ چنگیز کی طرح کسی لاؤ لشکر والے کا وارث۔ سچ مندا اسکندر کے پاس مقدونیہ کے لوگ اور چنگیز خاں کے پاس مغلوں کے گروہ شروع سے موجود تھے۔ مگر تیمور نے خود اپنے لئے ایک قوم فراہم کی۔

انتہا درجے کی نفرت اور انتہا درجے کی محبت جیسی تیمور کے ساتھ ظاہر کی گئی ہے ایسی کسی دوسرے بادشاہ کے ساتھ ظاہر نہیں ہوئی۔ تیمور کے دربار کے دو بڑے مؤرخ گذرے ہیں۔ ایک نے اس کو شیطان بتایا ہے۔ دوسرے نے لکھا ہے کہ اس جیسا عالی مقام اور عالی ظرف کبھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ عرب شاہ لکھتا ہے کہ وہ ایک بے رحم قاتل، مکر و فریب میں استاد کامل اور سفاکت و انتقام میں عدیم المثال تھا۔ ملا شرف الدین لکھتے ہیں کہ ہمت و شجاعت نے اس کو تمام تاتاری شہنشاہی پر ممتاز کیا اور تمام ایشیا کو اس کے سامنے جھکا دیا۔

تیمور اگرچہ دنیا کے بڑے لڑنے والوں میں بہت بڑا درجہ رکھتا ہے لیکن بادشاہوں میں وہ بدترین بادشاہ تھا۔ لائق تھا، بہادر تھا، فیاض تھا لیکن شہرت کا خواہاں، سخت گیر اور ظالم تھا۔ اپنی ذاتی شان و شوکت کے مقابلے میں وہ دوسرے انسانوں کی خوشی کو پرکاہ سے زیادہ نہ سمجھتا تھا۔ اس کی ذاتی شہرت نے اس کی قوت کے عالی شان محل کو سلامت رکھا لیکن جب وہ مرا تو یہ محل بھی اس کے ساتھ ہی گر پڑا — اس کی سلطنت اس کی موت کے ساتھ ہی مٹ گئی۔

اس مختصر خاکے میں جو ہم آپ کی خدمت میں پیش کریں گے، تیمور لنگ کی زندگی کے آخری باب کی ایک جھلک دکھلائی جائیگی جبکہ موت اس کے دروازے پر دستک دیا چاہتی تھی۔

فرشتۂ موت۔ (موٹی اور ڈراؤنی آواز میں) تیمور — ادھر دیکھو — یہ لاشیں پہچانتے ہو؟

تیمور۔ (بے پروائی سے) لاشیں — کس کی لاشیں —

فرشتۂ موت۔ دیکھو، یہ لاش کس کی ہے — پہچانتے ہو!

تیمور۔ پہچانتا ہوں۔ یہ میرے بڑے بیٹے جہانگیر کی لاش ہے۔ مگر اس کو مرے تو ایک زمانہ ہو چکا ہے۔

فرشتۂ موت۔ (ہنستا ہے) اور یہ؟

تیمور۔ یہ عمر شیخ کی لاش ہے مگر اس کو انتقال کئے بھی ایک مدت ہو چکی ہے۔

فرشتۂ موت۔ (ہنستا ہے) یہ؟

تیمور۔ یہ — یہ میرا پوتا امیرزادہ محمد سلطان ہے — ظالم موت نے اس کو بھی نہ چھوڑا — بڑا دلیر اور شجاع تھا۔ تمام لشکر اس کی [illegible] کیا کرتا تھا۔ مجھے اس کی موت پر بہت افسوس ہوا تھا۔ [illegible] اس نوجوان شہزادے نے اقبال و نصرت کی حالت میں دنیا کو [illegible] آہ بھر کر، دیکھو وہ ہیں جو یہ مرحوم سمرقند سے اپنے ساتھ [illegible] سرداروں کی لاش کندھوں پر اٹھا کر سمرقند لائے [illegible]

کی جگہ سیاہ ماتمی جھنڈے تھے۔ اس کا میں نے زیادہ خیال نہ کیا لیکن جب مرحوم کے دو دو مہینے بچے میرے سامنے لائے گئے تو مجھے سخت صدمہ ہوا اور کئی دن تک اپنے خیمے سے باہر نہ نکلا۔

فرشتۂ موت۔ (ہنستا ہے) کیا اب بھی تمہیں معلوم نہیں ہوا کہ تم سے بڑھ کر بھی دنیا میں کوئی طاقت موجود ہے۔ ایسی قوت جس نے تمہارے بہترین ساتھیوں کو تم سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا ہے۔ تمہارے شروع زمانے کے تمام بڑے بڑے اُمراء آج اپنی قبروں میں بے خبر پڑے سو رہے ہیں۔ حاجی شیخ سیف الدین کہاں ہے؟ تمہارا وہ جاں نثار جاکو برلاس کہاں ہے؟ امیرزادہ محمد سلطان تمہارے فرزند رشید کا لختِ جگر کہاں ہے؟ جس پر تمہیں اتنا ناز تھا۔ اور تمہارا وہ وفا کیش اور نمک حلال امیر آق بوغا کہاں ہے جس کی خدمات کے صلے میں تم نے ہرات کی حکومت بخش دی تھی۔ کہاں ہیں یہ سب لوگ؟ تم نے جب اپنے پوتے محمد سلطان کی علالت کی خبر سنی تھی تو تم بھاگے بھاگے اُس کے پاس گئے تھے، جیسے تمہاری آمد سے موت کا فرشتہ اپنے پر سمیٹ کر ایک کونے میں دبک جائے گا۔ لیکن مریض کی زبان ایسی بند ہوئی کہ آخر دم تک نہ کھلی۔ وہ تم سے بات تک نہ کرسکا۔ (دیوانہ وار ہنستا ہے)

تیمور۔ (گھبرا کر جاگتا ہے) بند کرو اس ہنسی۔ بند کرو اس شیطانی ہنسی کو۔ یہ کون تھا! یہ کون تھا؟

سرائے خانم۔ کیا حضرت صاحبقراں نے آج پھر کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا؟

تیمور۔ (توقف کے بعد) ہاں۔ جب سے ہم اپنے عزیز پوتے کی لاش لیکر سمرقند آئے ہیں عجیب عجیب خواب دیکھنے سے ہماری نیند خراب ہوگئی ہے۔ سرائے خانم کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ خواب کیوں ہمیں ستا رہے ہیں۔ کیا ہم بڈھے تو نہیں ہوگئے۔

سرائے خانم۔ (ہنستی ہے) امیر گورگاں جو آدھی دنیا فتح کر چکا ہے کیسے بڈھا ہو سکتا ہے۔ اور ابھی تو آدھی دنیا باقی ہے جو حضور کے قدموں کے نقش سے خالی ہے۔

تیمور۔ تم ٹھیک کہتی ہو سرائے خانم۔ ابھی آدھی دنیا باقی ہے جو ہمارے قدموں کے نقش سے خالی ہے۔ (ہنستا ہے) جو آدمی ایک دفعہ پاؤں رکاب میں رکھتا ہے اُسے کاٹھی پر پہونچنا ہی پڑتا ہے۔ ابھی تو ہم نے رکاب ہی میں پاؤں رکھا ہے۔ کاٹھی پر پہونچنا ابھی باقی ہے۔

سرائے خانم۔ کاٹھی ملک چین ہی ہو سکتی ہے۔ دشتِ شامو کے خواب آپ کو [illegible] دیکھتے رہے ہیں۔

تیمور۔ تم بلا کی زیرک ہو سرائے خانم۔ کئی دنوں سے ہم خاندانِ چنگیزی کے خواب میں دیکھ رہے ہیں۔ جانتی ہو تم یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے بڑے بڑے لشکر لے کر ملک خطا چین میں پہونچے تھے۔ کل رات ہم نے خواب میں اپنے والد صاحب کو کئی دیکھا تھا۔ وہ مجھ سے کہہ رہے تھے۔

سرائے خانم۔ (دلچسپی لیتے ہوئے) کیا کہہ رہے تھے۔

تیمور۔ اُنہوں نے اپنے قبیلے کے قومی امیروں کی داستانیں مجھے سنائیں کہ کس طرح مویشیوں اور لشکروں کو ساتھ لئے وہ گشت کیا کرتے تھے۔ پہاڑوں پر جب برف گرتی تو نیچے اُتر آتے اور جب برف پگھلتی تو پھر پہاڑوں پر پہونچ جاتے۔ کاروان کی سڑکوں پر کمیں گاہوں میں بیٹھ جاتے اور اپنے جھنڈے کے سائے میں جس پر سینگ بنے ہوئے تھے چلتے چلتے ملک خطا چین تک پہونچ جاتے۔ پورا قبیلہ پانچ سو میل کی کوہستانی زمین پر دو دو مہینے تک سیر و شکار میں مصروف رہتا۔ انہوں نے سفید گھوڑوں کی قربانی کا بھی ذکر کیا جو قبیلے کے سردار کی قبر پر ذبح کئے جاتے تھے۔ یہ گھوڑے آسمان کے دروازے میں جہاں شمال کے ستارے روشن ہوتے ہیں داخل ہو جاتے تھے تاکہ اُن رُوحوں کی خدمت کریں جو آسمانوں سے بھی اوپر کسی طبقے میں رہتی ہیں۔ پھر اُنہوں نے ملک خطا کی اُن شہزادیوں کا نام لیا جو اپنے ملک سے خانانِ تاتار کے پاس بیاہی آتی تھیں اور جہیز میں حریر و کتان اور عاج کی چیزیں گاڑیوں میں بھر کر ساتھ لائی تھیں۔ پھر اُنہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ظفرمند خاقانِ تاتار جس پیالے سے منہ لگا کر گھوڑی کا دودھ پیتے تھے وہ دشمن کی کھوپڑی کا ہوتا تھا اور اُس پر سونا منڈھا ہوتا تھا۔ (توقف کے بعد) سرائے خانم۔ دشتِ شامو کا اب ایسا تصور بندھا ہے کہ ایک لمحے کو لئے بھی یہ دماغ سے نہیں نکلتا۔

سرائے خانم۔ ہندوستان کی حکومت آپ اپنے پوتے محمد سلطان کے بھائی کے حوالے کر چکے ہیں اور خراسان کی حکومت شاہ رخ کو دے چکے ہیں۔ آپ کی پریشانیاں اب بہت حد تک کم ہو گئی ہیں۔ ملک خطا چین پر چڑھائی کر دیجئے۔

تیمور۔ یہی سوچ رہے ہیں۔ فقط یہی ایک سلطنت ایسی رہ گئی ہے جو ہمارا مقابلہ کر سکتی ہے۔ یعنی جس کو زیر کرنے میں ہم خوشی محسوس کر سکتے ہیں۔

کسی سردار یا امیر پر تیمور نے اپنے اس مقصد کو ظاہر نہ کیا جائے کا زمانہ تھا اس لئے مجبور ہو کر جس قدر قطعہ تبریز کی چراگاہوں میں گئی وہیں رہنے دی۔ لڑائیوں سے جہاں تمام وہ ہم برہم ہو گیا تھا اس کی [illegible] لئے تبریز میں کچھ مدت قیام کیا لیکن [illegible]

روانہ ہونے لگا وہ مشرق کی طرف سمرقند جانے کی خاطر اپنے لشکر اور امرائے دربار سمیت روانہ ہوگیا۔ اگست کے مہینے میں سمرقند آکر باغ دلکشا میں ٹھہرا۔ جامع مسجد جو نئی نئی بن کر تیار ہوئی تھی اُس کا معائنہ کیا۔

تیمور۔ (غصہ کی حالت میں) ... میرِ تعمیر کو ابھی تک ہماری خدمت میں کیوں حاضر نہیں کیا گیا۔

(وقفہ)

تیمور۔ ہم نے تم سے کچھ کہا تھا شاہ ملک۔

شاہ ملک۔ حضرتِ صاحبقراں گورگان اعظم کے حکم کی تعمیل ہوا ہی چاہتی ہے۔ میرِ تعمیر بس اب حاضر ہوا ہی چاہتا ہے۔

تیمور۔ اس نابکار نے مسجد کا ستیاناس کر دیا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ اپنے فن میں خوب مہارت رکھتا ہوگا مگر اس کی بنائی ہوئی مسجد دیکھ کر ہمیں معلوم ہوا کہ وہ فنِ تعمیر میں محض کورا ہے۔ اس کمبخت نے اندر کے دالانوں کو زیادہ وسیع کیوں نہیں کیا۔ محمد جلد کہاں ہے؟ یہ سب اسکی غفلت کا نتیجہ ہے۔ ہم نے تعمیر کا یہ تمام کام اس لئے اس کے سپرد کیا تھا کہ وہ اپنی نگرانی میں ہماری مرضی کے مطابق مسجد بنوائے مگر وہ بالکل نااہل ثابت ہوا ہے۔

چوبدار۔ حضور محمد جلد قدم بوسی کی اجازت چاہتے ہیں۔

تیمور۔ حاضر ہونے دو ــــ (وقفہ) ... ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے دالانوں کو زیادہ وسیع کیوں نہیں کیا ــــ

محمد جلد۔ غلام کورنش بجالاتا ہے صاحبقراں۔

تیمور۔ تمہاری کورنش قبول نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے کہ تم نے ہمارے احکام کے مطابق مسجد تعمیر نہیں کرائی ــــ تم نے یقیناً اپنی مرضی کو ہمارے احکام پر ترجیح دی ہے اور ایسی عدول حکمی کی سزا تم جانتے ہی ہو بہت کڑی ہوا کرتی ہے۔

محمد جلد۔ مگر عالی جاہ....

تیمور۔ ہم کوئی عذر سننے کے لئے تیار نہیں۔ ہم تمہیں اس مسجد کا نقشہ اچھی طرح سمجھا چکے تھے جو ہم نے ہندوستان میں دیکھی تھی۔ اس نقشے کے مطابق تمہیں ایک مسجد سمرقند میں تیار کرنے کے لئے ہم نے حکم دیا تھا۔ اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے کہ دالان اتنے چھوٹے کیوں بنوائے گئے ہیں؟ ــــ کیا تم اس کام کو جس کا ہم نے کل معائنہ کیا ہے صنعتِ عمارت گری کی معراج سمجھتے ہو۔ کیا اس قسم کی عمارت پیش کر کے تم ہماری داد کے طالب تھے؟

محمد جلد۔ عالی جاہ غلام کا اب بھی یہی خیال ہے۔ چاہے وہ غلط ہی ہو کہ یہ مسجد ہمارے معماروں کی صنعت کا بہترین نمونہ ہے۔ غلام اگر اس عمل کے ماتحت داد کا طالب ہوا تو قصور اس خیال ہی کا ہے۔

تیمور۔ چونکہ خیال تمہارا ہے اور ابھی تک تم اس خیال کو اپنے دماغ میں جگہ دے رہے ہو اس لئے تم اور تمہارا خیال دونوں ہمیشہ کے لئے مٹ جانے چاہئیں۔ تم اب جاسکتے ہو۔

محمد جلد۔ بہت اچھا عالی جاہ۔

(وقفہ)

تیمور۔ شاہ ملک۔

شاہ ملک۔ ارشاد حضرتِ صاحبقراں۔

تیمور۔ محمد جلد کی تمام جائداد املاک گورگانِ اعظم کے حق میں ضبط کرلی جائے۔

شاہ ملک۔ حضرتِ صاحبقراں کے حکم کی تعمیل ہوجائے گی۔

تیمور۔ اور محمد جلد کے لئے ہم موت کی سزا تجویز کرتے ہیں کہ وہ اسی لائق ہے۔

اس زمانے میں تیمور نے اُن وزیروں کا کام بھی دیکھا جن کو اپنی عدم موجودگی میں وہ حکومت کا کام سپرد کر گیا تھا۔ کسی کو انعام دیا کسی کو پھانسی پر چڑھا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دل کی وہ قوت حیرت انگیز ہوگی جس نے اس بڑھاپے کے جسم کو زندہ کر رکھا تھا۔ تیمور کو اس کی مطلق پروا نہ تھی کہ اب اس کا کیا وقت ہے۔ دو برس سے بصارت کم ہوتی جاتی تھی۔ آنکھوں کے پپوٹے ایسے گرے رہتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا سو رہا ہے۔ عمر اس وقت ایک کم ستر کی ہوچکی تھی۔ اس زمانے میں ایک فرمان جاری کیا کہ ایک جشن جاری رکھا جائے۔ پورے دو مہینے تک اور کوئی کسی سے نہ پوچھے کہ یہ جشن کس تقریب میں کیا گیا ہے۔ چنانچہ بڑی شان اور بڑے اہتمام سے جشنوں اور ضیافتوں کا سلسلہ جاری ہوا اور دو مہینے تک جب دھندلا آفتاب سمرقند کے نیلگوں پہاڑوں کے پیچھے چھپتا تھا تو تمام سمرقند ایک عالم جنات معلوم ہوتا تھا۔ جشن کا زمانہ ختم ہوا تو امیر تیمور نے شہزادوں اور امیروں کی مجلس منعقد کی۔

تیمور۔ (بلند آواز میں) ... ہم نے تمام ایشیا کو سوائے چین خطائی کے فتح کرلیا ہے۔ ہم نے ایسے بڑے بڑے بادشاہوں کو سرنگوں کیا ہے کہ ہمارے کارنامے دنیا میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ [illegible]

[illegible] ہمارے ساتھ [illegible] کبھی ایسا نہیں ہوا کہ تمہیں فتح نہ ہوئی ہو۔ [illegible] اس کو فتح کرنے کے لئے بڑے زور اور بڑی قوت [illegible] ہیں۔ بس اب تم [illegible] چین ہمارے ساتھ چلو۔ فتح و نصرت [illegible] آگے [illegible] ہے۔ ہم اپنے بزرگوں کی مرز و بوم اور [illegible] سے ہوتے ہوئے ملک ختا میں پہنچیں گے۔ دو لاکھ کا لشکر [illegible] ہو جائے گا۔ اسے ہم مختلف دستوں میں تقسیم کر دیں گے۔ اور ان چھاؤنیوں کی طرف روانہ ہوں گے جو چین کی سڑک کے کنارے ہم نے بنوا رکھی ہیں۔ جاڑے کے ختم ہونے اور بہار کے آنے کا انتظار ہم مناسب نہیں سمجھتے۔ بہار کا موسم وہیں چین میں ہم اپنی فتح کی خوشی میں گذاریں گے۔ لشکر کے ایک حصے کی کمان ہم خلیل سلطان کے سپرد کرتے ہیں۔ دوسرے حصے کو جسے امیرزادہ محمد سلطان اپنے ساتھ لیکر چلا کرتا تھا، ہم خود لیکر چلیں گے۔ رسد کا سامان بہت زیادہ ہونا چاہیئے تاکہ سپاہ کے لئے کسی چیز کی کمی نہ ہو۔

لشکر نے سمرقند کا دریا یعنی آب زرافشاں عبور کیا۔ تیمور گھوڑے پر سوار تھا۔ پہلو بدل کر اس نے شہر کی طرف دیکھا۔ مگر نظر اتنی نہ رہی تھی کہ اس کے برج اور مینار نظر آتے ــــ نومبر کا مہینہ تھا۔ جاڑا بہت زور پر تھا۔ جب سمرقند سے آگے ایک پہاڑی درّے میں سے گذر کر لشکر آگے بڑھا تو برف گرنی شروع ہوئی۔ شمال کے ملکوں سے سرد ہوائیں اٹھ اٹھ کر میدانوں میں شدت کے ساتھ چلنے لگیں۔ کہر اور کالے بادلوں نے فضا کو تاریک کر دیا۔ جب فوجیں کچھ اور آگے بڑھیں تو تمام دنیا برف سے سپید نظر آئی۔ دریاؤں اور ندیوں کا پانی جم گیا تھا۔ سڑکوں پر برف کے تودے لگے تھے۔ آدمی اور گھوڑے سردی سے مرنے شروع ہوئے۔

خلیل سلطان۔ برف سے محفوظ رکھنے کیلئے میں نے تاشکند کے پاس پھونس کے مکان بنوائے ہیں۔ میرا لشکر انہیں مکانوں میں ٹھہرا ہے۔ حضرتِ صاحبقراں بھی وہیں تشریف لے چلیں۔

تیمور۔ نہیں امیرزادہ خلیل سلطان ہم وہاں نہیں جائیں گے۔

خلیل سلطان۔ حضرتِ صاحبقراں برف باری ناقابل برداشت حد تک زیادہ ہو گئی ہے۔ گاڑیوں اور اونٹوں کی قطاریں جو سپید زمین پر ایک لکیر سی معلوم ہوتی ہیں آگے نہیں بڑھ سکیں گی۔ سیر دریا آج کل یخ بستہ ہے۔ تین گز موٹی برف اس کی سطح پر جمی ہوئی ہے۔

تیمور۔ تو کیا ہے [illegible]

خلیل سلطان۔ اس دریا کو عبور کرنا بہت مشکل ہے۔

تیمور۔ مگر ناممکن تو نہیں۔

خلیل سلطان۔ درست ہے حضرتِ صاحبقراں، مگر برف کی ان سلوں کو کاٹنا بڑا کٹھن کام ہے۔ اس قدر سردی ہے کہ رگوں میں خون منجمد ہوا جا رہا ہے۔

تیمور۔ کئی سال ہوئے سیر اوردہ پر فوج کشی کے وقت بھی ہمیں ایسی ہی برفانی سلوں سے سابقہ ہوا تھا مگر سفر برابر جاری رکھا گیا تھا۔

خلیل سلطان۔ حضرتِ صاحبقراں، میں ایک بار پھر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سردی بڑی بے رحمی سے ہر چیز کو غارت کر دینے پر تلی ہوئی ہے برف باری، ژالہ باری اور بارشوں کی انتہا نہیں رہی ہے۔ ترچھے سورج کی زرد روشنی برف کی سطح پر چمکتی ہے مگر اس میں حرارت نہیں۔ آپکے جو نمدے کے خیمے نصب کئے ہیں وہ بھی اس غضبناک سردی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہزاروں مویشی مر گئے ہیں، سینکڑوں سپاہی موت کی ہم آغوش میں سو چکے ہیں۔

تیمور۔ خلیل سلطان تم ہمارے بیٹے کے بیٹے ہو۔ پند نصیحت کی یہ پٹاری بند رکھو ــــ سنو۔ جب رستے صاف ہو جائیں تو اپنی سپاہ کو فوراً اترار لیکر پہنچو۔ ہم اترار میں کچھ دیر آرام کریں گے اور بہار کے شروع ہوتے ہی جب سردی میں ذرا سی تخفیف ہوگی آگے بڑھ جائیں گے۔

اس حکم کے مطابق مارچ سنہ چودہ سو پانچ کا آتا تھا کہ تیمور کا لشکر اٹھا اور چلا۔ پرچم اور پھریرے اڑتے گئے۔ کورکہ کی صدا بلند ہوئی۔ فوجوں نے معائنے کے لئے صفیں باندھیں۔ ہزارہ جات کے افسروں نے اپنے اپنے نقارچیوں کو جمع کیا کہ رات گذرتے پر نفیر و نے بجا کر صبح کی سلامی اتاریں۔ نفیر کی آواز بلند ہوئی۔ کوس اور نقارے گرجنے لگے۔ لاکھوں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز بھی اس شور میں شامل تھی ــــ یہ سلامی تو بیشک تھی مگر اگلی جو دنیا سے چل بسے تھے۔ اترار میں تیمور کا انتقال ہو گیا۔ لشکر حکم کے مطابق شمال کی سڑک سے حرکت میں آیا۔ شاہی علم کے سامنے [illegible] ــــ تیمور کا گھوڑا ــــ تیار کھڑا تھا مگر اس پر کوئی سوار نہیں تھا ــــ تیمور اس وقت عالت نزع میں تھا۔

سرائے خانم۔ میں نے حضرتِ صاحبقراں کی علالت کی خبر [illegible] سنی۔ بہت تیزی سے سفر طے کر کے اترار پہنچی ہوں ــــ [illegible]

خدا جانے اب اُن کا کیا حال ہے۔

فضل اللہ تبریزی۔ ملکۂ عالم، حضرت صاحبقراں کا مرض علاج سے باہر ہے۔

سرائے خانم۔ تو کیا۔۔۔ تو کیا۔۔۔

تبریزی۔ مشیت میں کس کو چارہ ہے۔۔۔ اب حضرتِ صاحبقراں کا وقت قریب ہے۔ ہزاروں جتن یہ غلام کر چکا ہے۔ بڑے بڑے لاجواب نسخے تجویز کر چکا ہوں، مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ ایک مقوی عرق کشید کروایا تھا، اُس کی کئی بوتلیں پلوا چکا ہوں مگر جسم میں حرارت پیدا ہی نہیں ہوتی۔ اب کچھ دنوں سے قرآن خوانی اور دعائیں مانگنے کا سلسلہ جاری ہے۔

(دوسرے کمرے میں)

تیمور۔ (نحیف آواز میں) شجاعت و مردانگی کے ساتھ ہمیشہ تلوار کے قبضے پر ہاتھ رہے۔ آپس میں اتفاق و یک جہتی رکھنا۔ نا اتفاقی میں تباہی ہے۔ ملکِ خطا کی فوج کشی ہرگز ہرگز ملتوی نہ کرنا۔۔۔ سُن رہے ہو نا۔

نورالدین، شاہ ملک۔ سُن رہے ہیں حضرتِ صاحبقراں۔

تیمور۔ جب میں مر جاؤں۔۔۔ جب میں مر جاؤں تو کپڑے نہ پھاڑنا۔ دیوانوں کی طرح بھاگتے نہ پھرنا۔ کیونکہ ایسی باتوں سے پریشانی اور بدنظمی پیدا ہوتی ہے۔ نورالدین۔ شاہ ملک، تم دونوں ذرا اور قریب آجاؤ۔

تیمور۔ قریب آگئے۔ سنو۔ جہانگیر کے فرزند پیر محمد کو میں اپنا جانشین مقرر کرتا ہوں، اسے سمرقند میں رہنا ہوگا۔ تمام لشکر اور دیوانی معاملات پر اُسے پورے اختیارات ہوں گے۔ میرا حکم ہے کہ تم سب اپنی تمام عمر اس کی تابعداری میں صرف کرنا۔ اسے تمام دور دراز کے ملکوں اور سمرقند پر حکومت کرنی ہوگی۔ اگر تم نے اس کی اطاعت نہ کی تو پھر اس کا نتیجہ تشویش و نزاع ہوگا۔

شاہ ملک۔ حضرتِ صاحبقراں کی وصیت کے مطابق ہی عمل ہوگا۔ مگر عرض ہے کہ آپ اپنے اور پوتوں کو بھی طلب فرمالیں تاکہ یہ احکام وہ بھی اپنے کانوں سے سُن لیں۔

تیمور۔ (اضطراب کے ساتھ) بس یہ آخری دربار ہے۔۔۔ خدا کو۔۔۔ خدا کو یونہی منظور تھا۔ دفعتہً سرد آہ بھر کر۔ اس وقت اور کوئی تمنا بجز اسکے نہ تھی کہ اپنے پوتے شاہ رخ کو ایک مرتبہ اور دیکھ لیتا۔۔۔ مگر یہ ناممکن ہے۔

یہ "ناممکن" کا لفظ غالباً عمر میں پہلی مرتبہ تیمور کی زبان پر آیا۔ جس فولادی طبیعت نے زندگی کی راہ اس طرح طے کی تھی جیسے کوئی سنگلاخ زمین پر ہل چلاتا چلا جائے۔ اُس نے زندگی کے خاتمے کو بھی بلا عذر و شکایت تسلیم کیا۔

سعادت حسن منٹو

جنازے

(بسلسلہ صفحہ ۱۵)

اور ظالم بازوؤں میں ایک مُردہ چڑیا کی طرح کشور نڈھال ہو رہی تھی اور وہ۔۔۔۔۔ یہ سمجھ لیجئے کہ کبوتر کو آپ نے کبھی بچے کو دانہ بھراتے دیکھا ہو۔ بس بالکل ویسے ہی۔ بالکل اُسی طرح۔

دوسرے لمحے شوکت تو سر کُھجا کُھجا کر پاس ٹنگی ہوئی تصویر میں رنگوں کی آمیزش دیکھ رہے تھے اور کشور جلدی جلدی اپنا بٹوہ کھول اور بند کر رہی تھی۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور چہرہ لال تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ شوکت ہے، ریحانہ۔۔۔ شوکت" کشور کہہ رہی تھی۔

جب میں برآمدے میں سر لٹکائے لڑکھڑاتے قدموں سے واپس ہو رہی تھی تو میں نے ضمیر کو ایک لمبا سا پارسل لئے دیکھا۔ وہ اس میں سے اس کے لئے نیا ریکٹ نکال رہا تھا۔ وہ خود اپنی انگلی پر انگوٹھی کی چمک دیکھنے میں غرق تھی۔ وہ ہنسے۔

مگر میرے کان میرے جسم سے دُور کہیں موت کا سا نغمہ سُن رہے تھے۔ اور میری آنکھیں فضا میں ہزاروں جنازوں کے جلوس گذرتے دیکھ رہی تھیں!!!

عصمت چغتائی

ایک ہندوستانی کی پیدائش

تقریباً ہر ہندوستانی مکان میں اگر وہ مکان خود ہی ایک اندھیری کوٹھڑی نہ ہو تو ایک اندھیری کوٹھڑی ضرور ہوتی ہے جسے ہندوستان کے نئے شہریوں کی پیدائش کے لئے متعین کیا ہوتا ہے، یا جیسے بچوں کے ڈرانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک ایسی ہی کوٹھڑی کے گرد بھرے طاقچے پر پڑے ہوئے ایک پرانے مٹی اور کالک میں لپٹے ہوئے دیئے کی چند روزہ زندگی کو پھر روشن کر دیا گیا۔ دیئے کی کانپتی پھڑپھڑاتی لو اپنی جھپکتی ہوئی آنکھوں سے کوٹھڑی میں اِدھر اُدھر جھانک کر اپنی واقف و مانوس چیزوں کی تلاش کرنے لگی۔ اُسی طرح بوڑھی شکستہ چارپائی کوٹھڑی کے متعفن بھیانک ندیر سے ڈری سہمی کسی معصوم ابلا کی طرح دیوار سے چمٹی ہوئی تھی اور گرد کی پوشش میں چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُسی طرح خوفزدہ مغموم لحاف، دریاں اور چیتھڑے جنہیں ہر زچگی کے موقع پر استعمال کیا جاتا تھا اس کی ٹانگوں سے چمٹ رہے تھے۔

دیئے کو اس کی کوٹھڑی میں محبوس ہوئے یہ ساٹھواں سال تھا اور یہ چارپائی، دریاں، لحاف تب بھی ویسے ہی تھے جیسے کہ اب۔ اس عرصے میں اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس کو چھپّن دفعہ روشن کیا جا چکا تھا۔ چھپّن عورتوں نے اُس کی جھپکتی ہوئی آنکھوں کے سامنے نئے ہندوستانی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ چھ تو اِسی کوشش میں کام آئیں، چار اِس اذیّت کو آخر تک سہار نہ سکیں اور ایک لحاف میں چھپے ہوئے بچھو کے کاٹنے سے مر گئی۔ تین بچے تو مرے ہوئے ہی پیدا ہوئے، آٹھ بچے پیدا ہونے کے چند دنوں بعد مر گئے اور جب کبھی اسکو گُل کرنے کے تھوڑا عرصہ پہلے ماں بچے کو باہر نکالا جاتا تو وہ سوچا کرتا کہ یہ نیم جان زندگیاں باہر جا کر کیا زیادہ دیر جیتی ہونگی؟۔

دیا روشن کرنے کے بعد شیاما نے چارپائی کو زمین پر بچھا دیا۔ اُس پر قریب پڑی ہوئی پرانی گرد اور خون کے دھبّوں سے بھری دریاں بچھا دیں اور پھر اپنی سوتن لیلا کو لا کر اُس پر لٹا دیا۔ کوٹھڑی کی گھٹن اور جیٹھ کے دوپہر کی گرمی کے باوجود اُس نے لحاف کو لیلا پر ڈال دیا۔ اُس کے زرد و بھیانک چہرے پر کالی کڑی بے چینی اپنے گھناؤنے پر پھیلا رہی تھی۔ ایک ناقابل ضبط تھرتھری اُسکی ہڈیوں کو ہچکولے دے رہی تھی۔ زچگی کو قریب جان کر شیاما نے لالہ [illegible] کو دائی لیکر جلدی آنے کیلئے کہلا بھیجا۔

لیلا لالہ رادھے شیام کی تیسری بیوی تھی اور شیاما پہلی۔ لالہ جی کی پہلی شادی ہوئے چودہ سال بیت چکے تھے۔ اُس سے صرف ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی جو اب بارہ برس کی تھی۔ اس کے بعد کوئی اور بال بچہ نہیں ہوا۔ [illegible] نے بہت جنتر منتر کئے۔ پانچ سال تک ہر اماوس کو تعوری کا پاٹھ کروایا۔ کئی دفعہ ایک سو ایک دن تک گوپال سنتان منتر کا سمپٹ پاٹھ کروایا اور بہت سے منتروں کا جاپ کروایا۔ کئی سادھو سنتوں کی سیوا کی۔ گائیوں اور [illegible] کی پوجا کی، اُن کے چرن دھو کر پیتے اور چوری چوری اُنکے کپڑے کتر کر جلا کر کھاتے تاکہ اُن کی بجائے وہ خود خوش قسمت ہو جائے۔ آخر میں کرواچوتھ کی رات کو پرسوت میں مری ہوئی ایک عورت کی چتا پر جا کر ننگی نہائی، لیکن پچھلے جنم کے کھوٹے کرموں کا پھل! اِتنا کچھ کرنے پر بھی اُس کی گود ہری نہ ہوئی۔

لالہ رادھے شیام کو پُتر ضرور چاہیئے تھا۔ اس کے بغیر اُن کی مکتی ہونی ناممکن تھی۔ مرنے کے بعد کھوپری کو توڑ کر اُن کی آتما کو آزاد کرنے کے لئے اور اُس کے بعد مختلف مواقع پر مختلف چیزیں براہمنوں کو دان کر کے اگلے جنم میں اُن تک پہونچانے کیلئے بیٹے کا ہونا ضروری تھا۔ وہ دن رات یہی سوچا رہتا۔ ہر وقت گھر میں غم اور تشویش کا اندھیرا چھایا رہتا۔ بیٹا تو گھر کا دیا ہوتا ہے۔ اُسکے بغیر اُجالا ہو ہی کیسے سکتا ہے۔

آخر لالہ جی نے دوسری شادی کر لی۔ سو داسستے داموں ہی ہو گیا۔ لڑکی والوں کی طرف سے بھی شادی کا تمام خرچ کرنے کی [illegible] جس پر سوا ڈیڑھ سو سے زائد خرچ نہ آیا۔ لڑکی کی عمر دس سال تھی۔ شاردا ایکٹ کی گرفت سے بچنے کیلئے شادی قریب ہی کی ریاست رامپور میں ہوئی اور لالہ جی نئی بیوی اور نئی جوانی لیکر گھر لوٹ آئے۔

نئی بیوی کی تھیں کچی بالک ہڈیاں اور لالہ جی بھاری بھرکم۔ [illegible] ہی جب وہ سیج چڑھی تو لالہ جی کے نام تک سے [illegible] لگی۔ جب [illegible] کی شکل دیکھتی تو کانپنے اور رونے لگتی۔ ڈری سہمی اِدھر اُدھر روتی چھپتی پھرتی۔ لالہ جی اُس کے پیچھے پیچھے بھاگتے۔ اُنہیں اپنی مکتی کے لئے جلد سے جلدی بیٹا چاہیئے تھا۔ وہ اپنی ٹانگوں کو سمیٹ [illegible] میں گھس جاتی اور لالہ جی اُسے پکڑ کر باہر گھسیٹتے، مارتے، [illegible] خرچ کئے ہوئے پیسوں کے ضائع جانے کے خیال سے اُن کا غصہ اور بھی بھڑک اُٹھتا۔ وہ اسوقت تک اُسے گالیاں دیتے اور پیٹتے رہتے جب تک [illegible] نیم جان جسم فرش پر چت نہ لیٹ جاتا۔

اس دہشت سے نئی بیوی کا دماغ ہلنے لگا۔ روز بروز اسکی حالت خراب ہوتی گئی۔ وہ پاگل ہوتی جا رہی تھی۔ اُس کا جسم مجھر مچکا تھا، اُدھ مُچکا تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی بھی ہڈیاں ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ اور اُس کی کمر خم کھا گئی تھی۔ اُس کا ننھا بچوں سا چہرہ چند ہفتوں میں ہی بوڑھا اور غیر قدرتی معلوم ہونے لگا اور اس کی ڈراونی شکل پر چڑیلوں اور ڈائنوں کی پرچھائیاں دوڑنے لگیں۔ اُس کے چہرے کی جھریوں میں چھپا ہوا خوف ہر وقت رحم کی التجا کیا کرتا۔ اُس کی ہڈی ہڈی سے درد کے تیر چھوٹتے رہتے۔ اُٹھنا بیٹھنا مشکل ہو چکا تھا لیکن لالہ جی کے جلدی سے جلدی باپ بننے کے خبط میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ایک دن انہوں نے لیلا کے سُکڑتے چیختے تڑپتے جسم کو اتنا پیٹا کہ وہ ایسی لیٹی کہ پھر نہ اٹھی۔

تیسری شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ پچھلی دفعہ سو ڈیڑھ سو روپیہ گنوا کر لالہ جی نے سبق سیکھ لیا تھا۔ اس دفعہ ایک پندرہ سال کی لڑکی کا انتخاب کیا۔ لڑکیوں کا بھلا کیا کال! اُتنے ہی پیسوں میں پھر سودا ہو گیا۔ وہ تمام دوائیاں جن سے مزید بچہ گارنٹی کیا جاتا ہے انہوں نے اپنی بیوی کو بطور احتیاط کھلوا دی تھیں اور اُمید بر آنے پر کئی قسم کی کتھا، چڑھاوے اور دان کا وعدہ کیا تھا۔ اُن کو لڑکا چاہیئے تھا اور اس کے لئے وہ ہر ایک قیمت دینے کے لئے تیار تھے۔ مرجانے پر جب تک اُن کا لڑکا اُن کی کھوپڑی کو [illegible] اُن کی آتما کو آزاد نہ کرے اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً اُس تک پہنچانے کے لئے براہمنوں کو مختلف چیزیں دان نہ کرتا رہے تب تک اُسکی مکتی ہونی ناممکن تھی۔

لالہ جی کی رام بن میں اناج کی دُکان تھی۔ رام بن وسط یو۔ پی۔ میں ایک چھوٹی سی منڈی تھی جو اَب کسی نامعلوم وجہ سے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ جدی پیشہ سے حلوائی تھے لیکن منڈی کو ترقی کرتا دیکھکر انہوں نے بھی اناج کی دُکان کھول لی تھی۔ آٹے میں باریک تنکے بُرادہ گرد نمک میں دودھ بجری۔ ہلدی میں حقانی مٹی، مرچوں میں گیرو ملیں کر "عمدہ اور سستی" چیزیں بیچا کرتے تھے۔ دال اور چاول وغیرہ کو بھاری کرنے کے لئے اُس میں چھوٹی چھوٹی کنکریاں ڈال دیا کرتے تھے۔ لکھنؤ، کانپور میں بڑے بڑے ہوٹلوں سے چائے کی استعمال شدہ پتی خرید کر اُن پر رنگ چڑھا کر "خالص چائے" بھی فروخت کیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے تمباکو کے ضائع شدہ پتوں میں گھوڑے مجھک [illegible] بیچنے کی بیس بکنے والی بیڑیاں بنانے کا کارخانہ بھی کھول رکھا تھا۔ لالہ جی کی [illegible] باقی دُکانداروں نے بھی مختلف طریقوں سے کی تھی جس کا نتیجہ یہ [illegible] بھی باقی ہندوستان کی طرح کسی نا معلوم وجہ کا [illegible]

رام بن میں کوئی لیڈی ڈاکٹر تو تھی ہی نہیں۔ ان کی اونچی ایڑیوں والے جوتے ابھی ہندوستان کی ان کچی سڑکوں کی خلیجوں کو عبور نہیں کر سکے تھے اور نہ وہاں کوئی ہسپتال یا زچہ خانہ تھا۔ اتفاق سے ایک سند یافتہ مڈوائف وہاں حال ہی میں آئی تھی۔ پیغام ملنے پر لالہ جی اُسے اور اپنی بوڑھی خاندانی دائی کو لیکر گھر آ گئے۔

لالہ جی کی پہلی بیوی شیاما نے مڈوائف کو تو لوٹا دیا۔ وہ بیوہ تھی، اس لئے اُس کا زچہ کے سامنے جانا اچھا شگون نہیں تھا۔ دوسری بڑھیا، چندھی کاہل سی دائی، ڈھیلے ماس، جھریوں اور سلوٹوں کی بنی ہوئی ایک عجیب سی چڑیل تھی جس کے اعضا حرکت تک مشکل سے کر رہے تھے۔ اُس کی مُرجھاتی ہوئی چمڑی پر میل کی تہیں جمی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور میل اور گرد کی وجہ سے اُس کے بال رسیاں بن چکے تھے۔ دائی کے پاس میلے سیاہ خون کے دھبوں سے بھرے ہوئے غلیظ متعفن کپڑوں کی گٹھڑی تھی جن کو وہ ہر زچگی کے موقع پر استعمال کرتی تھی۔ اُس نے دروازے کے کواڑ کی اوٹ میں کھڑے ہو کر ان کپڑوں کو پہن لیا اور اُس اندھیری کوٹھڑی میں چلی گئی۔

کوٹھڑی کی دیوار میں کھڑکی کی جگہ ایک چھوٹا سا سوراخ تھا جسے دائی نے آتے ہی بند کروا دیا۔ کواڑوں کو بند کر کے اُن پر ایک چادر لٹکا دی تاکہ کہیں درزوں تک سے ہوا اندر نہ جائے کہ زچہ کو بخار ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ کمرے میں پہلے ہی حبس تھا اب اور بھی دم گھٹنے لگا۔ گرمی جسم میں تشنج پیدا کر رہی تھی۔ پسینے کی دھاریں چھوٹ رہی تھیں۔ لحاف میں لپٹی ہوئی گرمی سے بے چین لیلا کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ایک اُبلتے ہوئے پانی کے حوض میں اُسے ڈبو دیا گیا ہے۔ دیئے کی اندھیرے سے اَٹی ہوئی کرنیں کالک، سیلن اور گرد سے لپٹی ہوئی دیواروں اور جالے سے بھری ہوئی چھت کی طرف جھانک رہی تھیں۔

لیلا کی سوتن ایک انگیٹھی میں کوئلے سلگا کر لے آئی اور اُس کو چارپائی کے نیچے رکھ دیا۔ سات سبز ڈنڈی والی سُرخ مرچوں کو اُس نے لیلا کے سر کے اِرد گرد پھرا کر آگ میں ڈال دیا۔ تاکہ اگر کوئی نظر گزند ہو تو اس کا اثر زائل ہو جائے۔ مرچیں آگ کی لمبی لمبی زبانوں میں تبدیل ہو گئیں اور اُن کے جلنے سے کمرے کی ہوا اور بھی سڑاند سے بھر گئی۔ لیلا کا دل ایسے پھڑپھڑا رہا تھا جیسے دیئے کی لَو پھونک لگنے سے پھڑپھڑانے لگتی ہے۔ اس کی کپکپی [illegible] میں ایک مبہم گھڑی کی بھیانک ٹِک ٹِک اُسے آنے والے دشوار وقت سے خبردار کر رہی تھی۔ اُس کے پسینے سے بھیگے ہوئے چہرے پر کئی برسوں سے ملی ہوئی سلوٹوں میں چھپا ہوا ہوتی تمنائیں نمودار ہو رہی تھیں۔ [illegible]
تمنائیں جنہوں نے کبھی اُمید کی جھلکیں [illegible]

الٹاتک مجھ رہیں بیں بیٹے ہوئے دُکھ بھرے سے گی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ اُس کے دانت کٹے اور کیلے ہوتے جا رہے تھے۔ اسکی چیخیں اور آہیں اندر سے کُرید کُرید کر اسکی زندگی باہر نکالتی معلوم ہو رہی تھیں۔

دائی لیلا کے جسم کو اپنی نربل سُست مٹھیوں سے گوندنے لگی۔ اس کی تمام انگلیاں میل سے سیاہ ہوئی ہوئی چاندی کی انگوٹھیوں اور چھلّوں سے بھری ہوئی تھیں اور باہیں گوردن، کنٹھے، بالوں اور چوڑیوں سے جو اگرچہ بھانت بھانت کی تھیں لیکن میل اور سیاہی نے انہیں ایک جیسا بنا دیا تھا۔ وہ لیلا کے جسم پر کھڑی ہو کر اُسے کچلنے لگی۔ دائی لیلا کے جسم پر اوپر نیچے چلتی جا رہی تھی اور لیلا کا پتلا سوکھا نیم جان جسم اتنا بوجھ نہ سہار سکنے کے باعث اِدھر اُدھر تڑپنے اور کروٹیں لینے کی کوشش کر رہا اور وہ "بس کر دو میں مری" چیختی جا رہی تھی۔ آخر لالہ جی کے کہنے سے دائی نیچے اُتری اور پھر اس کا پیٹ گوندنے لگی۔

لالہ جی ایک پیڑھا لے کر چارپائی کے قریب آ بیٹھے۔ اُن کی لمبی لمبی مونچھیں نچلے لب کے نیچے تک طوطے کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی تھیں۔ مُنہ کے کناروں پر بالوں کی گھنی جھاڑیاں تھیں جن پر ڈھیلے ڈھالے پُرشکن آسودہ حال گال لٹک رہے تھے۔ لمبی لمبی پلکوں اور بھوؤں کے گچھوں نے آنکھوں کو نیم پوشیدہ کر رکھا تھا۔ کانوں میں سے بھی جو حیوانوں کے کانوں کی طرح اکڑے ہوئے تھے، بال لٹک رہے تھے۔ اُس کے بنجر مشین سے صاف کیے ہوئے سر میں سے ایک چھوٹی سی چوٹی ایسی لٹک رہی تھی جیسے کسی گھِسے ہوئے پائیدان میں سے اُدھڑی ہوئی رسّی۔ طوطے کی چونچ نے حرکت کی۔ چھدری کھچڑی مونچھوں کی چلمن میں سے پیلے کیلے ناہموار بے ترتیب دانتوں کی قطاروں نے جھانکا۔

لالہ جی گنگنائے: "لڑکا ہوگا لڑکا۔ میری دائیں آنکھ پھڑک رہی ہے۔ جب میں دائی کو بلانے گیا تھا تو مجھے ہیتر ملا تھا۔ اس سے اچھا شگون اور کیا ہو سکتا ہے؟"

یہ کہکر لالہ جی اپنے دائیں انگوٹھے سے ماتھے کے پسینے کو نچوڑنے لگے۔ اُن کی کھدر کی بنڈی بھی بالکل بھیگ چکی تھی۔ ایک آہنی ہنسی اُن کے چہرے پر رینگنے لگی۔ اور وہ اپنی غیر قدرتی طور پر اُبھری ہوئی دوہری ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ لیلا کسی ناقابلِ فہم سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پتلی تیکھی ناک سُرخ سے سُرخ تر ہوتی جا رہی تھی۔ اُس کے سر کے بالوں تک سے پسینہ نچڑ رہا تھا۔ شدّتِ درد اور حبس سے اُس کے پتلے پپڑیاں جمے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

لالہ جی بھی سوچنے لگے کہ اگر لڑکی ہوئی تو — بے معنی غصّے سے اُن کے اعضاء کپکپانے لگے۔ اُن کی آنکھوں میں چنگاریاں چمکنے لگیں۔ دانت پیستے ہوئے بڑبڑائے: "اگر لڑکی ہوئی تو ماں بیٹی دونوں کو نکال دوں گا۔"
[illegible] اس وقت مت نکالے [illegible] لالہ جی کی

پہلی بیوی نے منت کی۔ لیلا اپنے پھٹے ہوئے ہونٹوں پر [illegible] اس کی طنز بھری آنکھیں پھر پروہت کی طرف اٹھی ہوئی تھیں [illegible] اڑاتی معلوم دے رہی تھیں۔

"بڑا انتظار کروایا ہے اس پُتر نے۔" لالہ جی نے پھر کہنا شروع کیا۔ "بڑا قسمت والا ہوگا۔ بڑی منتیں چڑھاوے لیکر آیا ہے۔ ہم اس کا کوئی [illegible] نام رکھیں گے۔ اس دولت رام، گوری شنکر، رام ناتھ، اوم پرکاش سے تو میں اُکتا چکا ہوں۔ ایسا نام رکھوں گا کہ لوگ کہیں گے کہ لالہ جی نے نام بھی [illegible] ایک رکھا ہے۔"

لالہ جی بڑے پُراشتیاق طریقے سے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے اور مسکرانے لگے۔ لیکن انہیں ایسا محسوس ہوا کہ یہ مسکراہٹ اُن سے اُمید چھیننے اور انہیں آزردہ بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ دردِ زہ سے ستائی ہوئی لیلا کے کانوں میں توتیاں بول رہی تھیں۔ اپنے خاوند کو مسکراتا دیکھ کر اُس نے بھی اپنے لب کھول دئے۔ ایک بے دلی ہنسی کی کپکپاتی ہوئی لہریں اُس کے چہرے پر سنسناہٹ پیدا کرنے لگیں۔ کمرے کی بند ہوا سے اُس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اُس نے دروازہ کھولنے کیلئے اشارہ کیا۔

"نہیں دروازہ مت کھولنا۔ ہوا لگنے سے بخار ہو جاتا ہے۔" دائی اپنے پوپلے مُنہ کو ہلاتے ہوئے تُتلائی۔

کمرے کی ہوا بہت بھاری ہو چکی تھی۔ دیئے کی بتی میں سے کالک کی ایک لمبی لکیر نکل رہی تھی۔ لالہ جی نے باہر سے اپنا حقہ منگوایا اور اسے گُڑگُڑانے لگے اور جیب میں پڑی ہوئی بنارسی پھولدار سفید ڈبیہ میں سے پان نکالا اور جُگالی کرنے لگے ساتھ ساتھ سُرخ تھوک سے دیوار کی پتائی بھی کرنے لگے۔ لیلا پر ذرا اور جھک کر انہوں نے ننھے بیٹے کے لئے عجیب عجیب سے پندرہ بیس نام دُہرائے اور خود ہی انہیں نامنظور کرتے گئے۔ پھر اپنی بیوی کے بالکل ہی قریب ہو کر بڑے پیار سے بولے: "پھر تم ہی بتاؤ اس کا کیا نام رکھیں؟" لیلا نے صرف ایک پھیکی مسکراہٹ سے اُنکے سوال کا جواب یا جس نے اُنکے دکھیا چہرے کو اور بھی ڈراؤنا بنا دیا۔

دائی نے لیلا کو اٹھا کر دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا اور اسکے پھولے ہوئے پیٹ کو گوندنے، رگڑنے، تھپکنے اور اُس پر [illegible] لگی اور پھر اسکے نچلے حصّے پر ایک میلا پلید کپڑا جو وہاں اسی مطلب کے لئے رکھا ہوا تھا باندھ دیا تاکہ زچگی کے بعد [illegible]۔ اسکے بعد [illegible] دوبارہ چارپائی پر لٹا دیا گیا۔

[illegible] عرصے میں برادری کی عورتیں [illegible]
آہستہ آہستہ آ [illegible]

[illegible] دائی اب پہلے غلیظ انگوٹھیوں کی جھریوں سے لدے ہوئے ہاتھوں سے بچہ پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ "تم لوگ دائیوں کو بالکل سر چڑھی پر ہی بلاتے ہو کہ کہیں زیادہ پیسے نہ لے جائے" دائی نے طعنہ دیا۔ "اگر پہلے دبانے گھونٹنے اور مالش کرنے کے لئے کبھی کبھی بلا لیا ہوتا تو اتنی تکلیف کیوں ہوتی؟"

"تکلیف تو ہوگی ہی" ایک بوڑھی عورت نے اپنے نتھنوں میں چھالیا کو پیستے ہوئے کہا۔ "یہ آجکل کی چھوکریاں تو کسی کا کہنا ہی نہیں مانتیں پہلے وقتوں میں گابھن استریاں ہر مہینے تلسی ماتا کی پوجا کیا کرتی تھیں پیپل کو دودھ چڑھایا کرتی تھیں۔ منگل وار کا برت رکھا کرتی تھیں۔ کبھی بھی گوگھرو کی جھاڑیوں پلتے ہوئے کھیتوں کے قریب نہیں جاتی تھیں۔ پورنماشی کی رات کو گھر سے باہر نہیں نکلتی تھیں۔ کسی کی ارتھی کی طرف بھول کر بھی نہیں دیکھتی تھیں۔ نہ چکی پیستی تھیں۔ نہ لکڑیاں توڑتی تھیں اور نہ کوئلوں یا دوسری کالی چیزوں کو ہاتھ لگاتی تھیں۔ آجکل تو کوئی پرانے رسم و رواج کو مانتا ہی نہیں۔ دکھ تو آپسے آپ ہوگا"

"گابھن عورتوں کو کنوئیں کے قریب بھی نہیں جانا چاہیئے۔ آجکل تو سب جاتی ہیں" ایک سوکھی ہوئی زرد رنگ کی نوعمر لڑکی نے بار بار کھانس کر کہا۔

دیئے کی لو مدھم پڑ چکی تھی۔ لالہ جی کی پہلی بیوی شیاما نے گل جھاڑ کر بتی کو اونچا کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تو کسی شاستر میں نہیں لکھا"

"شاستر واستر تو مجھے پتا نہیں" اس لڑکی نے منہ پر ہاتھ رکھکر کھانستے ہوئے کہا۔ "لیکن ایسا کرتے نہیں۔ ہمارے گاؤں میں ایک براہمن تھا جگادری۔ اس نے ایک کنواں کھدوایا بہت گہرا لیکن اس میں پانی نہ آیا۔ بہت کوشش کی لیکن کنواں خشک ہی رہا۔ ایک رات کو اندر دیوتا نے اسے درشن دے کر کہا کہ اگر تو اپنی بہو کو جو اس وقت گابھن تھی، جل دیوی کی بھینٹ کر دیگا تو کنوئیں کی گود ہری ہو جائے گی۔ اس نے کنوئیں کی خشک تہ پر جل دیوی کو بھوجن کھلانے کا ڈھونگ کیا۔ ایک لمبی سیڑھی کی مدد سے اپنی بہو کو لیکر نیچے اترا۔ کھانا وغیرہ تہ پر بچھایا اور پھر وہ اور چیزیں لانے کے بہانے اوپر آگیا۔ اوپر آکر اس نے سیڑھی کو اوپر اٹھا لیا۔ کنوئیں کی تہ سے فوراً ہی پانی پھوٹ پڑا۔ اس دن سے کوئی پیٹ والی کنوئیں کے قریب نہیں جاتی کہ کہیں جل دیوی [illegible]"

اس پر [illegible] عورتوں نے جن کا اب اچھا خاصا جمگھٹا ہوگیا تھا اپنی [illegible] اور اپنا اپنا اضافہ کیا۔

[illegible] کوشش میں مصروف تھی اور یہ عورتیں اپنا اپنا [illegible] کئے جا رہی تھیں۔ دیئے کی لو سوچ رہی تھی کہ ان اندھیری کوٹھڑیوں میں پیدا ہونے والی قوم کے دل میں اگر ہمیشہ تاریکی ہی رہے تو کیا تعجب ہو۔

اس وقت تک دائی بچہ پیدا کرنے کے وہ تمام ذرائع ختم کر چکی تھی جو اس نے پچھلے بیس برس کے تجربے سے سیکھے تھے۔ اس کوشش میں اس کی بوڑھی قوت اب بالکل تھک چکی تھی۔ پسینے کی موٹی موٹی بوندیں اس کے جھریوں سے بھرے ہوئے چہرے سے ٹپک رہی تھیں اور اس کی میل سے بھری ہوئی گردن بالکل بھیگ چکی تھی۔ اس کی بھوؤں کے تشویش سے اکٹھے ہوئے بال سوچ رہے تھے کہ کیا کیا جائے۔ جوں جوں بچہ پیدا ہونے میں دیر ہوتی جا رہی تھی لالہ جی بیتاب ہوتے جا رہے تھے۔ ان کا حوصلہ ٹوٹ رہا تھا۔

لیلا کا درد اب بہت بڑھ چکا تھا۔ درد کی تیز لہریں اس کی ڈھیلی ہڈیوں میں پھنس کر چیخ رہی تھیں۔ اس کا سر کندھوں میں ڈوبتا جا رہا تھا اور وہ بڑی بے ترتیبی سے سانس لے رہی تھی اس کی مٹیالی سوجی ہوئی آنکھوں میں لال ڈورے نمودار ہو رہے تھے۔ اس کے دماغ میں کوئی شے گیند کی طرح اچھل رہی تھی۔ اس کمرے کی ساکت دنیا میں سے غیر مانوس ڈراونے خیالات کی قطاریں اس کی طرف رینگ رہی تھیں۔ لیلا کی سوتن اور ایک دو اور عورتیں آگے بڑھکر اس کے جسم کو دبانے رگڑنے لگیں۔ دائی اب بچہ پیدا کرنے کے لئے اپنے ہاتھ پاؤں اور تمام بوڑھی عقل استعمال کر رہی تھی۔

دائی ہر پانچ منٹ کے بعد اپنے ہاتھوں کو کوٹھڑی کے کچے فرش کی گندی مٹی پر رگڑ کر اس عمل کو دہرانے لگی۔ لیکن ہر دفعہ ناکامیاب رہتی۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے جوؤں اور پسینہ بھرے سر کو بھی کھجاتی جاتی اور اپنے بوڑھے کھانستے حلق میں سے بلغم کے گولے اگلتی جاتی۔ اس طرح آدھا گھنٹہ اور گذر گیا۔ اداسی اور مایوسی آہستہ آہستہ کمرے میں رینگتی چلی آرہی تھی۔ عورتوں کی آوازیں بھی اب مدھم پڑ چکی تھیں۔ شدت حبس سے سب کا دم گھٹ رہا تھا۔ لالہ جی کے چہرے پر کبھی غم کی گہری سیاہیاں [illegible] لگتیں اور کبھی غصہ سے ان کے ماتھے پر ننھی ننھی سنپولیاں حرکت کرنے لگتیں۔ لیلا کی آنکھوں کے کناروں میں اٹکی ہوئی آنسوؤں کی دو بوندیں [illegible] کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں۔

لالہ جی کی پہلی بیوی باہر سے ایک کتھا کی پستک اٹھا لائی اور ایک ادھیائے نکال کر اس نے دیئے کے قریب بیٹھی ہوئی ایک عورت سے پڑھنے کے لئے کہا۔ وہ پڑھنے لگی: "شری [illegible] [illegible] سے پوچھا [illegible] [illegible]

عورت تینوں دیوتاؤں سے اُس نے پوچھا کہ تو کس لئے اتنا کٹھن تپ کرتی ہے؟
عورت بولی ، مجھے پتر کی واسنا ہے اُس کارن یہ تپ کرتی ہوں۔"

ابھی وہ پڑھ ہی رہی تھی کہ ایک عورت جس کے لمبے لمبے دانت بڑے وحشیانہ طریقے سے ہونٹوں کے باہر جھکے ہوئے تھے ، بولی: "یہ تو پریم ساگر ہے۔ اس وقت تو گوپال سنتان منتر یا درگا پاٹھ کا دیہی اتیا دی منتر کا جاپ ہونا چاہیئے۔ کسی براہمن کو کیوں نہیں بلا بھیجتے۔"

ایک براہمنی تو باہر آئی ہوئی تھی۔ بچہ ہونے پر سب سے پہلے اُسے ہی دکشنا ملنی تھی لیکن وہ کوٹھڑی کے اندر نہیں آ سکتی تھی کیونکہ جس وقت ایک عورت قوم کو ایک نئی زندگی کا تحفہ دے رہی ہوتی ہے اُس وقت کو ہندوستان میں اس کی زندگی کا ناپاک ترین عرصہ سمجھا جاتا ہے۔ باہر ہی وہ اور اس کا خاوند لمبی بحر میں پڑھنے لگے: "دیکھا نتی الیستیم۔ بھالگیم سورے جنم کا رنم شکل پکھشے ..." کی قسم کی آوازیں سب کے کانوں میں سنسنی پیدا کرنے لگیں۔

لیلا کی قوت کا چھوٹا سا ذخیرہ اب بالکل ختم ہو چکا تھا۔ اُس کا سارا بل چوسا جا چکا تھا۔ انتہائی گرمی کی وجہ سے اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے اردگرد بہت سی بھٹیاں دھکا دی گئی ہیں جن کی تپش سے اس کا جسم جھلسا جا رہا ہے۔ وہ اب بالکل بیدم ہو چکی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے آگے ڈراؤنی بھیانک پرچھائیاں پھیل کر سکڑ رہی تھیں۔ قریب بیٹھی ہوئی عورتیں اُسے میلوں کے فاصلے پر معلوم دے رہی تھیں۔ دیوار پہ لالہ جی کے پان کی پیکیں اُسے چڑیلوں بھوتوں کی خون سے بھری زبانیں دکھائی دیتی تھیں۔ اُس کی طرف نا واقف وحشت خیز سائے بڑھتے چلے آ رہے تھے ــــ!

کمرے کی ہوا اب بالکل دھواں بن چکی تھی۔ سب کا دم گھٹ رہا تھا۔ ایک عورت نے آگے بڑھ کر دیوار کے سوراخ پر سے کپڑا اٹھا دیا۔ باہر بیٹھی ہوئی وہ پہرا اندر جھانکنے لگی۔ چند لمحات کے بعد دائی نے سوراخ دوبارہ بند کروا دیا۔

دائی بچہ پیدا کرنے کی آخری کوشش میں انگوٹھیوں کی جھریوں سے لدے ہوئے ہاتھوں کو بڑے ظالمانہ طریقے سے استعمال کر رہی تھی۔ اِدھر اُدھر گھما کر جو کچھ ہاتھ میں آتا باہر کھینچنے کی کوشش کرتی۔ لیلا بڑے دردناک طور پر چیخ رہی تھی۔ اُس کے پھٹے ہوئے دیدوں میں سے ، جو اب اور بھی باہر نکل آئے تھے ، گرم گرم گدلے آنسو اُس کے تنے ہوئے نیلگوں چہرے پر ٹپک رہے تھے۔ آسے اپنی کمر بیچ میں سے ٹوٹی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اُسے زمین سے گھما کر ہوا میں پھینک دیا گیا ہے اور وہ ایک بے پناہ آندھی میں ایک تنکے کی طرح ہچکولے کھا رہی ہے ـــــ اور یہ دُنیا ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے جو اوروں کے لئے تو کیا اپنے لئے بھی غیر ضروری ہیں اور ایک تنکے سے زیادہ قوت نہیں رکھتے۔ اُس کا بھورا مٹیالا رنگ اب سیاہ پڑ چکا تھا۔ اُس کی سُرخ آنکھیں ہر ایک کی طرف غضبناک نظر سے دیکھ رہی تھیں۔ اور وہ کبھی کبھی انہیں زور سے بھینچ لیتی تھی۔ ایک پتنگا دیئے کی مدھم لو پر دیوانہ وار سر پٹخ رہا تھا۔

دائی نے پھر ہاتھوں کو اِدھر اُدھر گھمایا۔ پھر زور لگایا۔ پیچھے کو ہٹی ـــــ اُس کے ہاتھوں میں انسانیت کا ایک چھوٹا سا پیچھڑا تھا۔ چند سوکھی ہوئی ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ جس کا ایک بازو چھل کر اندر ہی رہ گیا تھا۔ اُس نے وہ بازو بھی باہر نکالا۔ لیلا نے کچھ افاقہ محسوس کیا۔ لالہ جی نے لپک کر دیکھا۔ لڑکا تھا۔ خوشی سے اُن کی باچھیں کھِل گئیں۔ اُن کے دل پر میٹھی میٹھی خوشی کی ٹھنڈی ٹھنڈی پھواریں برسنے لگیں۔ اب وہ آرام سے مر سکے گا۔ ایک نئی خوشی کی کپکپاتی لہریں اس کے جسم پر دوڑنے لگیں۔ "ہے بھگوان۔ دھنواد۔" اُس کے منہ سے خود بخود نکل گیا۔

لیلا بھی مسکرائی۔ ہلکی سی مسکراہٹ۔ وہ اب باعزت جی سکتی تھی۔ وہ اب ایک بیٹے کی ماں تھی۔

لیلا کی آنکھوں سے ابھی تک نہ بھولنے والا دُکھ جھانک رہا تھا۔

"پچھلے جنم میں بیچاری نے بہت پاپ کئے ہونگے جو اتنا کشٹ اٹھانا پڑا۔" ایک عورت نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔

دیئے کی تڑپتی ، پھڑپھڑاتی مدھم غمگین لو ہمدرد آنکھوں سے ماں بیٹے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ اِس ننھے بچے نے بھی پچھلے جنم میں بہت پاپ کئے ہونگے جو ہندوستان میں پیدا ہوا۔ اور پیدائش ہی میں اس کا ایک بازو چھن گیا۔

شمشیر سنگھ نرولا

حریف

آخر وہ تنگ آکر گھر سے نکل پڑا، اُسکے حریف نے فتح پائی، اور وہ بے سرو سامانی کی حالت میں کہیں چلا گیا۔ نجانے کہاں۔

اُس کا حریف خود اُس کی بیٹی تھی، گیارہ برس کی عمر، تیز اور شوخ، سیمابی فطرت لیے ہوئے وہ پیدا ہوئی تھی۔ اُسی لڑکی نے اس کا جینا دوبھر کر دیا۔ باپ کی ساری خوشیاں چھین لیں اور بالآخر اُسے مجبور کیا کہ وہ گھر چھوڑ جائے۔

وہ باپ تھا اور خاوند، اُس کے تین بچے تھے، ایک لڑکی اور دو لڑکے ـــ لڑکی بڑی تھی، اُس کی بیوی اتنے بچوں کی ماں ہونے کے باوجود ابھی تک قدرے حسین تھی، بچے بھی خوب چست و چوبند تھے۔ مگر وہ بالکل مریل سا ـــ

یہ ایک اوسط درجے کا گھرانہ تھا، معمولی گھر، معمولی سامان، مگر ایک بات ایسی تھی جو عام گھرانوں میں نہ پائی جاتی تھی۔ وہ خود نکھٹو تھا اور بیوی محکمہ "امداد باہمی" میں ملازم تھی، وہ کماتی اور خاوند گھر کا سارا کام کاج کرتا ـــ علی الصبح وہ جاگتا، گھر کی صفائی کرتا۔ آگ جلاتا، چائے تیار کرتا۔ بیوی بستر ہی میں پڑی ایک پیالی پیتی۔ پھر وہ اُٹھتی، بچوں کو جگاتا، اُن کو نہلاتا، کپڑے پہناتا ـــ یہ کام دیکھنے میں معمولی تھے مگر وہ بیچارا ہی جانتا تھا کہ گھر سنبھالنا کتنا دشوار کام ہے۔ اگر بچے رونے لگتے تو گھر کو سر پر اُٹھا لیتے۔ ایک کو روتا دیکھکر دوسرا بھی رونے لگتا۔ ان کو چُپ کرانے کے لئے وہ سو جتن کرتا۔ مُنہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالتا، لوریاں گاتا، برتن بجاتا، ناچتا، گھوڑا بنتا ـــ بدقسمت مرد نکھٹو بن کر کیا کیا بنتا ہے۔

دن بھر اُسے کھانا پکانا، بچوں کو کھلانا اور بازار سے سودا سلف لانا ہوتا تھا اور شام کو سب کے لئے بستر لگانے پڑتے تھے، اس کے ساتھ ہی وہ محکمہ امداد باہمی کی کتابوں میں اپنی بیوی کا چپراسی درج تھا۔ اُس کی پندرہ روپے تنخواہ بیوی وصول کرتی تھی۔ اس لئے بعض اوقات اُسے سرکاری کاغذات کا پلندہ اُٹھا کر بیوی کے پیچھے پیچھے بھاگنا پڑتا۔ جب وہ کسی سے باتیں کرتی تو وہ پاس کھڑا مُنہ دیکھا کرتا ـــ اپنی بیوی کا خاوند۔

اس کے باوجود بیوی اُس کے کام سے ناخوش رہتی۔ افسر اپنے ماتحت کے کام سے کم ہی خوش ہوتے ہیں۔ وہ کچھ نہ کچھ نقص نکال دیتی، سالن جل گیا ہے، گھر صاف نہیں رہتا، بچے گندے ہیں، تم نے انہیں خراب کر دیا ہے۔ بعض دفعہ تو نوبت یہاں تک پہنچتی کہ جب اُس سے ملنے کے لئے کوئی عورت آتی اور اُس کی خاطر تواضع میں ذرا سی کمی رہ جاتی تو اُس کی بیوی مہمان کے سامنے اُسے ڈانٹنے لگتی۔ گویا وہ باورچی یا بیرا تھا ـــ چپراسی تو تھا ـــ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا، وہ جواب میں زبان نہ ہلا سکتا تھا۔ بولنا اعلانِ جنگ تھا جس میں اس کی شکست لازمی تھی۔

کئی بار اِن ہنگاموں سے تنگ آکر وہ گھر سے نکلا، اس نے چاہا کہ وہ کہیں چلا جائے، وہ چلتا گیا، بڑے بڑے مکان اُسے دیو معلوم ہوتے تھے، کھلے آسمان سے اُسے خوف محسوس ہونے لگتا تھا، بازاروں میں بھیڑ دیکھکر اس کا دل بیٹھ جاتا تھا۔ وہ کہاں جائے، اتنی بڑی دُنیا میں اُسے کہاں جگہ مل سکے گی۔ پھر اُسے گھر کا خیال آتا۔ اس کے بغیر گھر کے کام کون کر سکے گا۔ اس کے بوجھل قدم واپس گھر کی طرف اُٹھنے لگتے وہ بھاری دل لے کر پھر اندر داخل ہوتا یہی اسکی دُنیا تھی جس سے وہ مانوس ہو چکا تھا اسی میں اُسے سکون بھی ملتا تھا۔

اس کے سکون کو درہم برہم کرنے کے لئے اس کا حریف پیدا ہو گیا۔ ایک دن وہ بازار سے سودا سلف لیکر لوٹا تو اُس نے دیکھا کہ اس کی لڑکی بھائیوں کو نہلا رہی ہے، وہ رک گیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا گویا چور اُس کے گھر میں گھس آیا ہے۔ وہ چُپ کر اُسے دیکھنے لگا۔ لڑکی نے بچوں کو کپڑے پہنائے۔ وہ ایک تتلی کی طرح اِدھر اُدھر اُڑ رہی تھی ـــ اس پر بجلی گری، وہ تو سمجھتا تھا کہ سارے گھر کا انحصار اس پر تھا مگر آج اس کا یہ بھرم ٹوٹ گیا۔ اس کے بغیر بھی گھر کا کام ہو سکتا تھا۔ دونوں لڑکے نہاتے وقت گھر کو سر پر اُٹھا لیتے تھے، مگر آج وہ بھی مُسکراتے ہوئے نہائے۔ اُسے بہت صدمہ ہوا، اسکی مملکت کا دوسرا دعویدار پیدا ہو گیا۔

اُس نے شروع میں اس دخل کو معمولی جانا، ایک دن حسبِ معمول اُس نے لڑکی کو سر کے بال دھونے کے لئے کہا۔ وہ گرم پانی کا آفتابہ اُٹھائے کھڑا تھا۔ اُس نے پیار سے اُسے بلایا۔ مگر اس کی حیرانی کی حد نہ رہی جب اُسکی بیٹی نے اُسے جھڑک دیا۔

"بیٹی! کیا بات ہے؟" اُسے بیٹی کی یہ حرکت سمجھ میں نہ آئی۔

بیٹی خاموش تھی مگر اس کی آنکھوں میں [illegible]

"کیا بات ہے لاڈلی؟" اُس نے چمکارا۔

وہ پھر خاموش رہی، خاموشی [illegible]

"کیا بات ہے بچی!" اس نے بچی کو سینے سے لگانا چاہا۔ مگر وہ زخمی سانپ کی طرح بل کھا کر رہ گئی۔

"آپ کو کیا میرے بالوں سے۔"

"مجھے کیا تیرے بالوں سے؟ پگلی ہوگئی ہے؟ بدبو کرنے لگے گی۔"

"میں خود بال دھولوں گی۔ آپ انکی فکر نہ کریں۔"

"آپ اس کی فکر نہ کریں"۔ یہ کھلم کھلا اعلانِ جنگ نہیں تھا تو اور کیا تھا۔ وہ بچوں کو باپ سے چھین چکی تھی اب وہ خود باغی ہوگئی۔ اُسے کب یہ گوارا تھا کہ اس کے کام کوئی دوسرا کرے۔ اس کی اپنی بیٹی اسکے خلاف یوں اعلانِ جنگ کردے۔ اُس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "بیٹا! تم سے اپنے بال صاف نہ ہوں گے۔"

"کیوں نہ ہوں گے" حقارت سے جواب ملا۔ لڑکی نے ہاتھ چھڑانے کی ناکام کوشش کی۔ آخر تنگ آکر اُس نے باپ کا ہاتھ کاٹ کھایا۔ وہ بلبلا اُٹھا۔ وہ اُسے پیٹنے لگا تھا کہ بیوی نے دخل دے دیا۔ اس کا سارا غصہ ٹھنڈا ہوگیا۔ وہ مُسکرانے لگا۔ اس مسکراہٹ میں ہزاروں غصّے اور سینکڑوں نفرتیں پوشیدہ تھیں۔

معاملہ یہیں تک رہتا تو خیر تھی۔ اُس نے اس واقعہ کو ایک آنے والا خطرہ محسوس کیا۔ اگر اسی طرح آہستہ آہستہ وہ سارے کام سنبھالتی رہی تو اس کا کیا بنے گا۔ پھر اُس کی اہمیت اور ضرورت بالکل نہ رہے گی اور ممکن ہو کہ اُسے گھر چھوڑنا پڑ جائے۔ وہ کھڑا سوچ رہا تھا، کہ لڑکی نے گرم پانی کا برتن لیکر اپنے بال خود دھونے شروع کر دئے۔ ماں سامنے بیٹھی اُسے ہدایت دے رہی تھی۔ کمبخت نے بڑی پھرتی سے سب کام کر لیا۔ اور پھر تولیہ سے بال خشک کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں وہ کپڑے پہن چکی تھی اور دونوں لڑکے بھی تیار تھے۔ وہ حیران کھڑا گھر کی اس بغاوت کو دیکھتا رہا تھا۔ دن بھر وہ بےچین رہا۔ اس کی معمولی زندگی میں ایک انقلاب آگیا تھا۔ اس کا ذہنی توازن قائم نہ رہا۔ وہ سوچنا چاہتا تھا مگر سوچ نہ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح یہ لڑکی اُس کی راہ سے ہٹ جائے۔ مگر بیوی کا خوف اُسے کسی سخت اقدام سے روکتا تھا۔ ورنہ وہ تو اُسے ــــــ

ایک دن موقع پا کر اس نے لڑکی سے پوچھ ہی لیا۔ "لاڈلی! یہ تمہیں کس نے سکھایا کہ میرے کاموں میں دخل دو۔"

وہ خاموش رہی۔

"کیا امی نے تجھے ایسا کرنے کو کہا تھا۔"

"نہیں۔"

"پھر کس نے کہا تھا۔"

"میں نے خود سوچا۔"

"تم نے خود سوچا ـــ بدبخت تم نے کیا سوچا ـــ میں تمہارا باپ ہوں۔"

وہ کھسیانے لگی۔

"سُنا، میں تمہارا کون ہوں۔" اُس نے لڑکی کو روک لیا۔ "میں تمہارا باپ ہوں۔ میرا حکم ماننا تمہارا فرض ہے، اگر تم نے میرا کہا نہ مانا تو یاد رکھنا کھال کھینچ لونگا، سمجھی ـــ"

وہ غصہ میں آپے سے باہر ہوگیا۔ اُس کی آواز شور بن گئی۔ اُسکے شور نے چھوٹے بچے کو جگا دیا۔ لڑکی بجلی کی طرح بچے کی طرف لپکی۔ اُس نے بھی چاہا کہ وہ جاکر بچے کو گود میں لے لے مگر لڑکی بھائی کو اُٹھا چکی تھی اور وہ اُسے لوری دینے لگی۔ "سوجا رام دُلارے سوجا"۔ یہی لوری وہ بھی بچوں کو دیا کرتا تھا۔

بچہ پھر سو گیا۔ حالانکہ اُسے بچے کو دوبارہ سُلانے میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ مگر اسکے برخلاف لاڈلی کی گود میں بچہ فوراً سو گیا۔ لڑکی نے بڑے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "ابا آپ ادھر جائیں، میں اسے سلا لونگی۔"

اُس سے اب برداشت نہ ہو سکا۔ بیوی بھی گھر میں نہ تھی۔ بہانہ بھی مل گیا تھا۔ جب لڑکی بچے کو بستر پر لٹا کر باہر نکلی تو باپ نے پیٹنا شروع کر دیا۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ اتنے میں بڑا لڑکا صحن سے اور چھوٹا لڑکا کمرے سے نکل آئے۔ دونوں نے بہن کو پٹتا دیکھکر اس سے چمٹ گئے اور رونا شروع کر دیا۔ تینوں نے مل کر گھر کو سر پر اُٹھا لیا۔ یہ نئی مصیبت اس سے دیکھی نہ گئی، وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی خوب زور سے روئے۔

جونہی وہ کمرے میں گیا لاڈلی نے آنسو پونچھے اور لمحہ بھر میں دونوں بھائیوں کو خاموش کرلیا۔ وہ اُن کو لے صحن میں چلی گئی۔ شام کو جب اُن کی ماں آئی تو تینوں اس کے گرد جمع ہوگئے اور ہر ایک نے اپنی اپنی زبان میں واقعہ بیان کیا۔ یکایک تینوں پھر رونے لگے۔ پہلے سے زیادہ شور مچ گیا۔ اُسکی بیوی کا چہرہ غصہ سے لال پیلا ہوگیا۔ وہ چارپائی پر خاموش بیٹھی خاوند کو گھور رہی تھی۔ اس کی شربار آنکھیں خاوند کو بھسم کر دینا چاہتی تھیں۔ آخر وہ زخمی شیرنی کی طرح اس پر جھپٹی اور بولی۔ "کیوں جی! آخر اس کا انجام کیا ہوگا؟"

وہ خاموش رہا۔

"کیا اب سانپ سونگھ گیا ہے۔ بولتے کیوں نہیں تم انسان ہو یا باولے کتے، تمہاری جگہ یہ گھر نہیں پاگل خانہ ہے ـــ میری بدقسمتی کے

بجے تم نے تو مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے ـــــ تمہیں شرم نہ آئی بچوں کو مارتے ہوئے ـــــ"

اُس نے جواب دینا چاہا۔ آخر وہ باپ تھا، کیا باپ اتنا بھی حق نہیں کہ وہ خودسر بچوں کو سزا دے۔ مگر بات اُس کے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

"بولو گے کیا ـــــ میں کماؤں اور تم کھاؤ، میرے پلے تم ایسے پڑے ہو کہ مجھے چھوڑتے ہی نہیں۔ سات برس ہو گئے۔ میں کما رہی ہوں اور تم کھاتے ہو۔ تمہاری ضروریات پوری کروں ـــ اپنی جان پر مصائب جھیل کر ان بچوں کو پالوں ـــ اس کا نتیجہ یہ کہ گھر میں ہر وقت کل کل ہوتی رہتی ہے۔ آدمی ہو یا جانور ـــــ محنت کرتے کرتے میں نے جوانی تباہ کر دی، مجھے اتنا میسّر نہیں کہ میں چند دن آرام کر سکوں اور تم ہو کہ نواب بنے دن بھر پڑے سوتے ہو۔ بچوں کو تو میں نے کھلایا مگر بیوی کی کمائی کھانے والا مرد ڈھونڈے بھی شاید ہی ملے ـــــ واہ میرے میاں! کہاں قسمت میں تم ایسا پتھر لکھا تھا ـــ"

اُسے جواب کیا دینا تھا۔ بیچارے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے رحم بھری نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا۔ اور بولا "نازو! تم نے تو دل کا غبار نکال لیا۔ مگر اب میری بھی تو سنو۔ لاڈلی نے مجھے جواب دیا ہے، بیٹی باپ کو کیوں جواب دے سکتی ہے؟"

"اچھے باپ ہو؟" بیوی کا غصّہ بدستور تھا "بیوی دربدر ماری پھرے، کما کر لائے اور خاوند نرا باپ بنا بیٹھا رہے، واہ! باپ صاحب!! واہ!!! ـــ"

"اسے تمہاری شہ نے خراب کیا ہے۔"

"اور تم نے اسے مار مار کر ٹھیک کرنا چاہا۔ شرم نہ آئی بیٹی پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے۔"

"مگر یہ میرے کاموں میں دخل کیوں دیتی ہے؟"

"مردوں کے یہی کام ہیں جو تم کرتے ہو ـــــ شرم کرو، تمہارا کام روپیہ کمانا ہے، گھر سنبھالنا عورت کا کام ہے ـــــ لاڈلی عورت ہے اور گھر سنبھالنا اس کا فرض۔"

"اب سمجھا ـ" وہ جوش میں آگیا "تم نے گھر سے نکالنے کے لئے لاڈلی کو میرے منہ لگا دیا ـــ خوب! بیٹی باپ کی عزّت اتارے۔"

آخر اس جنگ کو ختم کرنے کیلئے اُسے ہی ہتیار ڈالنے پڑے۔ اب وہ زیادہ محتاط ہو گیا۔ لاڈلی کو کام کرنے کا موقع نہ دیتا اور گھر میں پھر امن ہو گیا۔ اس امن کو قائم کرنے کیلئے اُسے زیادہ چست ہونا پڑا۔

اس قدر ذلت کے باوجود چند سالوں میں ایک وقت ایسا آتا تھا جب اُسے اپنے خاوند ہونے کا احساس ہوتا۔ نازو آخر اس کی بیوی ہی تھی ـــــ وہ حاملہ ہو گئی۔ بچّہ پیدا ہونے کے دن جوں جوں قریب آ رہے تھے اسی قدر اُسے زیادہ خوشی ہوتی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی بیوی آخر اس کی بیوی ہے۔ وہ اکثر اب شام کے بعد سیر کو چلا جاتا۔ ایک رات وہ زیادہ دیر سے آیا۔ گرمیوں کے دن تھے، سارے لوگ باہر صحن میں سو رہے تھے۔ چاندنی رات تھی۔ اس نے چارپائیوں پر نگاہ ڈالی ـــ تین بچّے اور اُن کی ماں سو رہی تھی ـــ ایک، دو، تین ـــ تین بچّے، وہ اُن کا باپ تھا، باپ، اس کی بیوی ایک طرف لیٹی تھی، وہ اُسے دیر تک دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہ بیوی کے پیٹ پر تھی۔ اس کے جگر کے ٹکڑے ـــــ تین بچّے، رفیقہ حیات بیوی، ایک وہ خود، کل پانچ ـــــ وہ پانچ تھا۔ چند دنوں تک وہ چھ ہو جائیگا ـــــ وہ کائنات عالم میں تخلیق کا موجب تھا۔ تخلیق ـــ خدا کا کام اس کے ذریعے ہو رہا تھا، اس کی ہستی! کون اُسے غیر ضروری کہہ سکتا ہے۔

ماں کی بیماری کی وجہ سے لاڈلی کو کام کرنے کا اور موقع مل گیا۔ رات کو اگر کوئی بچّہ ذرا بھی چونکتا تو وہ فوراً اُٹھ کر اُسے بہلانے لگتی۔ اب تو اُس نے گھر کے دوسرے کام بھی سنبھال لئے تھے۔ اُس کی ماں نے رخصت لے رکھی تھی۔ اس لئے وہ لاڈلی کو روک ٹوک بھی نہ سکتا تھا۔ وہ خود بھی ہر کام اُسے ہی کہتی تھی۔ وہ ماں بیٹی کی ان حرکات سے تنگ آ گیا تھا۔ اُسے بیوی کی صحت کا بڑا خیال تھا۔ اس لئے وہ جھگڑا کرنے سے حتی المقدور بچتا رہتا۔ ایک دن وہ سالن پکا رہا تھا کہ لاڈلی کھانستی ہوئی آئی اور چمچہ اُس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

"ابّا! آپ نے تو سالن جلا دیا ـــ دیکھئے نا سب کھانس رہے ہیں۔"

"تمہیں کیا! چمچہ چھوڑ دو۔"

"ابّا! آپ چوڑیاں بھی پہن لیں، عورت بننے کا شوق ہے کیا؟"

اُس نے لاڈلی کو پکڑنا چاہا۔ مگر وہ بچ گئی۔ ادھر نازو نے زور سے قہقہہ لگایا۔ وہ کھسیانا ہو گیا۔ رات بھر وہ غصّہ کی وجہ سے سو نہ سکا۔ دوسرے دن اُسے موقع مل گیا اور اُس نے بیٹی کی خوب مرمّت کی۔ اُسے لہولہان کر دیا۔ اُسے یہ خیال نہ تھا کہ معاملہ طول پکڑ جائیگا اور ہمسائے کے لوگوں کو اس میں دخل دینا پڑیگا۔ اس کا نتیجہ اس کے حق میں ہمیشہ خراب ہی نکلا اور اُسے خفت اور رسوائی ہوئی۔

لڑکا پیدا ہوا۔ وہ کس قدر خوش تھا۔ مگر لاڈلی اس سے بھی زیادہ خوش
اُسے بیٹی کی خوشی سے دُکھ ہونے لگا۔ مگر وہ مجبور تھا بیٹی کو کچھ نہ

تھا۔ ورنہ اس کا جی چاہتا تھا کہ لاڈلی بچے کے لئے ایک مسلسل عذاب میں مبتلا ہو جائے مگر یہ اس کی طاقت سے باہر تھا۔

بچے کی پیدائش پر اسے مبارکباد دی جانے لگی۔ وہ خوش تھا۔ وہ ایک اور بچے کا باپ بن گیا تھا ـــ باپ، اُسے نوزائیدہ بچے کا بہت زیادہ خیال تھا۔ ایک شکست خوردہ سپاہی کی طرح اس نے اپنی ساری توجہ اس بچے کی طرف مبذول کر دی۔ لاڈلی گھر کا سارا کام کاج کرنے لگی۔ اور وہ دن رات بچے کی نگہداشت کرتا رہتا۔ بیوی سو رہی ہوتی تو وہ رات کو کئی بار اٹھ اٹھکر بچے کو دیکھتا۔

ایک دن بارش کی وجہ سے سردی زیادہ ہو گئی۔ علی الصبح وہ بازار اشیائے خرید نے گیا ہوا تھا کہ کہیں لاڈلی نے بچے کو اٹھا لیا۔ اسے ہوا لگ گئی۔ جب وہ واپس آیا تو بچہ بیمار تھا۔ اُسکے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ دن میں کئی بار بھاگا بھاگا ڈاکٹر کے ہاں گیا۔ سب نے اُسے تسلی دی۔ مگر اُس کا دل نہیں مانتا تھا۔ اُسے آنے والے خطرے کا احساس ہو چکا تھا۔

رات آگئی، تاریک رات نے اسکے دل کو اور خوفزدہ کر دیا۔ بچے کی ماں گہری نیند سو رہی تھی مگر اس کا جی بےچین تھا۔ وہ رات بھر سرہانے بیٹھا بچے کو سانس لیتے دیکھتا رہا۔ اچانک بچے کا سانس رُک رُک کر چلنے لگا ـــ بچے کا جسم سرد ہوتا جا رہا تھا ـــ چند گہرے سانس لئے اور بچہ ہمیشہ کیلئے سو گیا ـــ سارے گھر پر نیند طاری تھی۔ اسی نیند نے اس کا لخت جگر اس سے چھین لیا۔

اس نے بیوی کو جگانا چاہا لیکن کسی خیال سے وہ رک گیا۔ وہ لاڈلی کی طرف بڑھا۔ اُسے بُری طرح جھنجوڑ کر اٹھایا اور پھر چلا کر بولا: "لاڈلی! لاڈلی!! تمہارا بھائی ـــ ننھا مر گیا ہے"۔ اسکے لب و لہجہ کا انداز فاتحانہ تھا۔ وہ بہن کو بھائی کی موت کا صدمہ پہنچا کر خوش ہونا چاہتا تھا۔ اسکی آواز نے پڑوسیوں تک کو بیدار کر دیا۔ ماتم ہونے لگا۔ مگر وہ خوش معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے لڑکی کو بازوؤں سے پکڑ کر اُسے گھمانے لگا۔ جب لڑکی نڈھال ہو کر گر گئی تو وہ زور زور سے قہقہے مار کر ہنسنے لگا۔ اسکے قہقہوں میں ٹوٹے ہوئے دل کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ بچے کی اچانک موت، خاوند کی یہ حالت، بیوی کیلئے ناقابل برداشت صدمے تھے۔ آئے ہوئے لوگ بھی سمجھ نہ سکے کہ اُسے کیا ہو گیا تھا۔ انہوں نے اُسے تسلی دی، صبر کی تلقین کی مگر سب بے سود۔

"میرے بچے کو اس چنڈال نے مار ڈالا ہے" وہ لاڈلی پر جھپٹا۔ مگر بیوی نے بڑھکر اُسے روک دیا۔ پھر وہ بچے کی طرف گیا۔ لاش کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ "ننھے میاں! تمہیں تمہاری بہن نے مار ڈالا ـــ تم جا رہے ہو اچھا جاؤ، مگر دیکھنا بدلہ ضرور لینا قتل کا بدلہ قتل ـــ" وہ وحشیوں کی طرح چلا رہا تھا اور دیوانہ وار قہقہے لگا رہا تھا۔ سارے گھر پر ایک وحشت طاری تھی سب خوفزدہ ہو رہے تھے۔ اُسے نم [illegible]

بچے کو بوسہ دیکر بستر پر لٹا دیا۔ اس پر چادر ڈال دی۔ اسکی [illegible]
وہ اسی حالت میں دروازے کی طرف بڑھا۔ [illegible]
ہو گیا۔

شہر [illegible] اختر

نغمۂ نور

غم نہیں ہے ہمیں ملال نہیں
حال یہ ہے کہ کوئی حال نہیں

اب ستم ہو تو کیا کرم ہو تو کیا
اب کسی بات کا خیال نہیں

اک نظر کہہ گئی جو کہنا تھا
ہر نظر مائلِ سوال نہیں

اب تو کچھ کچھ سکوں بھی ملتا ہے
مضطرب ہوں مگر وہ حال نہیں

ایسی بربادیوں کا کیوں غم ہو
یہ تو آغاز ہے مآل نہیں

مل چکا جو بھی مجھکو ملنا تھا
اب مجھے حسرتِ سوال نہیں

بیت جاتے ہیں دن بھی ساون کے
اپنی توبہ کا اب وہ حال نہیں

اب تو ہے اپنی جستجو مجھکو
ان کا ملنا تو کچھ محال نہیں

اب تو یہ سر ہے اور وہ نقشِ قدم
سر اٹھاؤں مری مجال نہیں

تیرا جلوہ رہے قیامت تک
عشق پابندِ ماہ و سال نہیں

اب وہ شورش نہیں ہے پہلو میں
اب وہ نیرنگِ ہجر و وصال نہیں

ضبط کرنا کمال ہے ہمدم
آہ کرنا کوئی کمال نہیں

[illegible] لکھنوی

اپنی محبوبہ سے

خدارا نہ آنکھوں سے آنسو بہاؤ — مرے غم میں دل کو نہ بیکل بناؤ
یہ آنکھیں شرابوں کے پیالے ہیں جن میں — جوانی نے جادو جگائے ہیں جن میں
اِن آنکھوں کی زد سے بہت دُور ہوں میں — وطن کی محبت پہ مجبور ہوں میں
ضرورت ہے میرے لہو کی وطن کو

اگر تیرا رونا قدم ڈگمگا دے — مرے عزم سنگیں کی گردن جھکا دے
اگر وقف کر دوں نگاہوں کے سجدے — ادا ہوں ترے در پہ آہوں کے سجدے
تو ہستی کے سینے پہ ناسور ہوں میں — وطن کی محبت پہ مجبور ہوں میں
ضرورت ہے میرے لہو کی وطن کو

ترے سُرخ لب اور سیہ فام گیسو — یہ ڈسنے کے عادی یہ بدنام گیسو
نگاہوں کے میخانے ویران کر دوں — وطن کی محبت پہ قربان کر دوں
زمانے میں گو تیرا مشہور ہوں میں — وطن کی محبت پہ مجبور ہوں میں
ضرورت ہے میرے لہو کی وطن کو

یہ سب جانتا ہوں کہ لُٹ جاؤ گی تم — جوانی میں جینے سے اُکتاؤ گی تم
جوانی تمہاری ہے دلشاد مجھ سے — تصوّر کی دُنیا ہے آباد مجھ سے
دھڑکتی تمنّا میں مستور ہوں میں — وطن کی محبت پہ مجبور ہوں میں
ضرورت ہے میرے لہو کی وطن کو

مجھے مسکرانے کی فرصت نہیں ہے — نظر تک ملانے کی فرصت نہیں ہے
وطن کے غریبوں کی حالت تو دیکھو — یہ مر مر کے جینے کی وحشت تو دیکھو
مجھے اِن سے اُلفت ہے مزدور ہوں میں — وطن کی محبت پہ مجبور ہوں میں
ضرورت ہے میرے لہو کی وطن کو

چُھپا لو دمکتے ہوئے عارضوں کو — ہٹا لو دمکتے ہوئے عارضوں کو
تمہارا نہیں ہوں مجھے بھول جاؤ — فسیلِ نظر سے نہ بیخود بناؤ
شجاعت کی صہبا سے مخمور ہوں میں — وطن کی محبت پہ مجبور ہوں میں
ضرورت ہے میرے لہو کی وطن کو

تمہاری محبت سے بیگانہ ہو کر — وطن کی محبت میں دیوانہ ہو کر
گلابی لبوں کی حلاوت سے بچ کر — شرابی لبوں کی حلاوت سے بچ کر
تمہیں کیا خبر کتنا مسرور ہوں میں — وطن کی محبت پہ مجبور ہوں میں
ضرورت ہے میرے لہو کی وطن کو

یہ کیا کہہ رہی ہو کہ کٹ جاؤ گے تم — [illegible]

حوادث کے جھگھٹ میں گھِر جاؤ گے تم — جوانی کی نظروں سے گر جاؤ گے تم
زمانے کے ماتھے پہ مستور ہوں میں — وطن کی محبت پہ مجبور ہوں میں
ضرورت ہے میرے لہو کی وطن کو

یہ چیخوں کی دنیا یہ آہوں کی بستی — یہ افلاس زادی گناہوں کی بستی
محبت کو یہ راس آئے تو کیسے — جوانی یہاں گنگنائے تو کیسے
تری دسترس سے بہت دور ہوں میں — وطن کی محبت پہ مجبور ہوں میں
ضرورت ہے میرے لہو کی وطن کو

اگر ایک لڑکی کی اٹھتی جوانی — بدل جائے پیری میں یوں ناگہانی
تبسم کراہوں میں تبدیل ہو جائے — غم آلود آہوں میں تبدیل ہو جائے
تو اے جانِ الطاف مجبور ہوں میں — وطن کی محبت پہ مجبور ہوں میں
ضرورت ہے میرے لہو کی وطن کو

الطاف مشہدی

تاج مہتاب کی شعاعوں میں

مہتاب کی جاں بخش جب آتی ہیں شعاعیں — سوئے ہوئے گلشن کو جگاتی ہیں شعاعیں
نغمے سے ہر اک سمت برستے ہیں فضا میں — کچھ ساز بجاتی ہوئی آتی ہیں شعاعیں
تاروں کی خنک چھاؤں میں وہ تاج کا منظر — بجلی سی نگاہوں پہ گراتی ہیں شعاعیں
شب آتی ہے یا تاج کے رنگین رخوں سے — ماضی کا نقاب آ کے اٹھاتی ہیں شعاعیں
دل تاج کا ہو جاتا ہے جب خواب سے بیدار — اک نور کی چادر سی بچھاتی ہیں شعاعیں
پھولوں کے دلوں میں جو ابھرتی ہیں امنگیں — سینے سے انہیں آ کے لگاتی ہیں شعاعیں
ہر ذرے میں ہوتی ہے غمِ دل کی لطافت — ہنس ہنس کے غزل کوئی سناتی ہیں شعاعیں
دامن میں چھپائے ہوئے اسرارِ محبت — ہنستی ہوئی بہکی ہوئی آتی ہیں شعاعیں
ہو جاتی ہیں گم تاج کی آغوش میں شب بھر — اور صبح کو جمنا میں نہاتی ہیں شعاعیں
وہ تاج کی غمگین فضا، اور وہ تجلی — سینے میں مرے آگ لگاتی ہیں شعاعیں
پھر جاتی ہے آنکھوں میں وہی عظمتِ ماضی
میں کیف میں روتا ہوں رلاتی ہیں شعاعیں

جوہر فریادی

صبح سے شام تک

نظام بیکار تھا۔

شام کو جب وہ اپنے کام کو چھوڑ کر چلا تھا تو وہ ایکدم تھک سا گیا تھا۔ وہ سڑک جس پر وہ ہر روز لاپروائی اور فراغت کے قدم اٹھاتا، سڑک پر پڑے ہوئے ڈھیلوں کو لڑھکاتا، دکانوں پر تنقیدی نگاہیں ڈالتا چلتا تھا اب بھونڈی معلوم پڑی۔ بالکل بدصورت۔ اس عورت کی مانند، جو سیاہ فام ہو، چیچک کے ستاروں نے آسمانِ خوبصورتی پر چار چاند لگا دیے ہوں۔ اور جو اندھیری رات میں دانت پھاڑ کر بجلی کی روشنی میں بہادر سے بہادر انسان کو ڈرا دے اور مجسم ارتعاش بنا دے۔ سویرے کی وہ دلہن نکھری ہوئی دوشیزہ، مست شباب اور مخمورِ حسن، اتنی جلدی بوڑھی ہو چلی! اُسے رہ رہ کر تعجب ہو رہا تھا۔ سڑی بسی دکانیں، کوڑا کرکٹ غلاظت، میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے بچے، سیاہی مائل دیواریں، اُسے نفرت کا جذبہ برابر انگیختہ کئے جا رہا تھا۔ یہ شہر ہے اور شہر کی رونق۔ اور وہ اِن چیزوں کو دیکھکر بار بار ناک بھوں سکیڑے جا رہا تھا۔ اوں ہوں! کیسا انتظام ہے؟ شہر کے نمائندے تو بن جاتے ہیں، مگر گدے دار کرسیوں اور بجلی کے پنکھے کی ہوا کھا کر حفظانِ صحت کے اُصول، صفائی اور شہر کی بہتری کی سینکڑوں باتیں بھول جاتے ہیں۔ جب بازاروں میں اتنی گندگی ہو تو گلیوں کا کیا کہنا۔ جہاں دیکھو بیماری کے جراثیم۔ آخر اِن جراثیم کو ہلاک کیوں نہیں کر دیا جاتا۔ اِن بچوں کو ہی دیکھو، بال پریشان، مُنہ پر مکھیاں بھنکتی ہوئیں، سیروں میل، ریت اور مٹی میں لتھڑے ہوئے، ان کی مائیں مُنہ دھونا تک نہیں جانتیں، دُنیا میں لاتے ہی سڑکوں، بدروؤں، تنگ و تعفن آمیز گلیوں میں آوارہ گردی کرنے، اِدھر اُدھر کی سینکڑوں بُری باتیں سیکھنے کے لئے چھوڑ دیتی ہیں۔ کیا کہنے، صاحبزادے کے بدن پر مکمل لباس تو درکنار ریشمی پُرانی لنگوٹی شرم ڈھانپ رہی ہے، اور حضرت کے مُنہ میں ادھ جلا سگرٹ، جو کوئی شوقین مزاج انسان پیتے پیتے پھینک گئے ہونگے، اُٹھا، اور سڑک کے کنارے پڑے ہوئے چوکھونٹے پتھر پر بیٹھ آرام سے کش پہ کش لگا رہے ہیں۔ اُن کا انداز پینے کا ڈھنگ کسی [illegible] سلطنت کی کابینہ کے ذمہ دار رکن سے کم نرالا نہیں۔ اور اسی [illegible] کے دھوئیں میں وہ میلی کچیلی چار چار پانچ پانچ سالہ لڑکیوں کو [illegible] میں [illegible] جاتے ہیں اور وہ معصوم ریت اور مٹی کے چپٹ جاتے

سے زنگ خوردہ چھکران حضرت کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔ کرنجی پتلیاں، ریت کے رنگ والے سُنہرے بال، کالے کالے پاؤں اور بے ڈھنگے پنجے.....!

بڑے میاں نے مُرغی کو ٹانگ سے پکڑا۔ اور بسم اللہ.....

لیکن ان سڑی لمبی گلیوں میں اُس نے ایسی ہی سینکڑوں مُرغیوں کو کٹتے ہوتے دیکھا ہے۔ بھوری بھوری چھریاں ہوتی ہیں اور مُرغیاں آنکھتے ایک منٹ نہیں دو منٹ نہیں ہفتے دو ہفتے اور کبھی کبھی سالوں تڑپتی رہتی ہیں۔ بال و پر نوچ ڈالنے کے بعد بھی وہ تڑپتی رہتی ہیں۔ اس نے اُن کو روتے ہوتے تک سُنا ہے۔ چیختے چلاتے، پھڑکتے پر پھڑپھڑاتے نزع کی حالت میں آسمان کی طرف التجا اور رحم کے دیوتاؤں کو پکارتے ہوتے دیکھا ہے۔ لیکن التجا، التجا کرتے ہوتے اُن کی زبان لڑکھڑاتی ہے۔ اور رحم وہ اب بوڑھا ہو چلا آخر صدیوں سے اُس نے اپنی روح کو مقید رکھا ہے نا۔ اور بزرگ جاندار کا دماغ ہمیشہ مضمحل، ناکارہ ہو جایا کرتا ہے۔ بلکہ وہ سٹھیا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب ہم جوان تھے تو ہم نے بھی انصاف کو پکارا تھا، رحم سے التجا کی تھی۔ لیکن..... لیکن کیا؟ ان کی کسی نے نہ سُنی۔ تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ اگر وہ گلیوں میں تڑپتی ہوئی ہستیاں کے گلے پر چھری پھیرتے دیکھکر نہ بچا سکے تو کیا اب بھی مُرغیاں کٹتی رہیں، سراسر ظلم ہے۔ اور وہ چھری اُس کے ہاتھ میں پہونچتی ہوئی دکھائی دی۔ کیا ہرج ہے، جب دُنیا کا دستور ہی یہی ہے تو وہ کیوں نہ اپنی چھری کو پہلے سے تیز کرے۔ کس لئے، کس واسطے۔ کسی غریب، معصوم، شریف حیادار مرغی کی گردن پر بھونڈے انداز سے پھیرتے رہنے کے لئے، تڑپتا ہوا دیکھنے کے لئے۔ موت اور زندگی میں کشمکش کے رقص سے لطف اندوز ہونے کے لئے۔ حتیٰ کہ وہ مرغی سرد ہو جائے..... اور بڑے میاں کی مرغی بھی تو سرد ہو چلی اور اس کے بعد۔ کچھ نہیں وہی دن اور وہی رات۔ سڑک، مکانات، کلب، سنیما ہال، تماشے، ناچ اور جو کچھ کیا۔ اور جب وہ صبح اپنے گھر سے چلا تھا تو اس کے خیالات [illegible] تھے۔ یعنی اس کا دماغ آرام کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے جو چیزیں آئی خوب گھر کے اُن سے کیا سروکار۔ [illegible] اُس نے قدم [illegible] تھی [illegible] نا [illegible] کا اظہار کیا [illegible]

نظام صفائی پہل پہل سب سے مطمئن تھا۔ ایک دم خوش۔ اُسے رہ رہ کر تعجب ہو رہا تھا کہ آج غیر متوقع طور پر قدرت کیوں اتنی نکھر چلی ہے۔ نیلا آسمان، صاف شفاف، شہر پر طنبو تانے ہوئے۔ لطیف دھوپ اور اُسکے سنہری بالوں میں چمکتی ہوئی عمارتیں۔ سڑک کے دو رویہ جھومتے ہوئے درخت، صاف پٹری، دُھلی دُھلائی سڑک، خاموشی، ٹریم گاڑی اور موٹر کاروں کے ہلکے لطیف مست کُن نغمے، جمنا اشنان سے واپس مڑتی ہوئی عورتیں اور سکول جانے والی لڑکیوں کے اُجلے لباس۔ اُسے یہ سب چیزیں نہایت پسند تھیں۔ اُس کے بدن پر گھٹیا کپڑے کا سوٹ ہی کیوں نہ ہو مگر تھا وہ صاف و شفاف۔ صفائی پسند تو وہ شروع سے ہی تھا۔ اور گلی سے نکلتے ہی اُس نے داروغہ صفائی کی سقّوں اور بھنگیوں کو ڈانٹ ڈپٹ دیتے وقت خاموش داد بھی دی تھی۔ اور شاید وہ سوچ بھی رہا تھا کہ بغیر دھمکائے سالے کام ہی نہیں کرتے۔ اگر اس طرح کام چلے تو شہر کی تمام غلاظت، گندگی دُور ہو جائے، تپ دق، سِل آخر پھیلے کیوں۔ لاتوں کے بُھوت باتوں سے نہیں مانتے اور وہ چُپ چاپ داروغہ صفائی کے اسلوبی کار کو دیکھکر رُکا بھی تھا۔ لیکن وقت کی قلت کی وجہ سے اور اس ہجوم سے گھبرا کر وہ آگے بڑھ گیا۔

ایک!

دو!!

تین!!!

بس! وہ آدمی بھی عجیب بیوقوف معلوم ہوتا تھا۔ صرف تین گرم گرم طمانچوں پر ہی اکتفا کیا۔ آجکل کے بچّے بہت بگڑ چکے ہیں۔ بزرگوں کا کہنا نہیں مانتے۔ بچّہ بسور بسور کر رونے لگا۔ ہوگا کوئی نو دس سال کا۔

"ابے پھر کھیلیگا گولیاں۔ شرم نہیں آتی۔ دُکان پر ایک منٹ نہیں ٹِکتا۔ بول نہیں تو لگاؤں ایک چپت"

"نہیں۔ اوں۔ اوں اوں" اور ساتھ ہی وہ اپنی کہنی کو آگے کئے دیتا تھا۔ تاکہ اس کے باپ کا بھرپور ہاتھ اس کے چہرے کو کسی کشمیری دوشیزہ کے سیب ایسے رنگت والے رُخساروں ایسا نہ بنا دے۔ اور اس معصوم سرزمین میں ایک کے بعد دوسری گلاب کی کلی نہ چٹکنی شروع ہو جائے۔

"ابا میں اب ... میں اب نہیں کھیلوں گا۔ وہ لالہ کا لڑکا تو دن بھر کھیلا کرتا ہے۔ صبح سے شام تک ..." اور اُس نے آستین بھرے [illegible] کو پونچھنا شروع کر دیا۔ آستین گیلی ہو چلی۔ مگر ابا کا غصہ [illegible] معلوم دیتا تھا۔

ابا نے اپنے دونوں ہاتھوں کو آگے بڑھایا۔ لڑکے کے گال [illegible] ہوتے "امیر زادے تو اُس لالہ کے لڑکے کی برابری کریگا۔ ابے [illegible] کھیل ہی کھیل، مفت کھانا مل جاتا ہے نا۔ کھانا کھایا اور دن بھر کھیل کود میں گنوا دیا۔ ناخلف، تجھے شرم نہیں آتی۔ چل بیٹھ جا کر دکان پر ..."

پہلے معصومیت گالوں پر گلاب کے پھول بن کر نمودار ہوئی اور اب وہ کان کرن کے پھول کی سرخ پتیاں بن چلے۔ لڑکا برابر کان درست کئے جا رہا تھا ہولے ہولے انکو دبا رہا تھا۔ اور ابا کی نگاہیں ساری چیزوں کی جلتی معلوم دیتی تھیں۔ لیکن؟۔

کچھ نہیں۔ وہ تو صرف دیکھنے کے لئے کھڑا ہو گیا تھا۔ مگر اُسے لطف بالکل نہیں آیا۔ اس لڑکے کو سزا بہت کم ملی۔ بالکل رگڑ رگڑ کر رکھ دینا چاہیئے تھا۔ کبھی گھونسا تو کبھی لات۔ تو کبھی گرم گرم طمانچے۔ اور سر پر دھپ۔ اور اگر کچھ بس نہ چلے تو کم از کم اس کو چار فٹ اونچے پلیٹ فارم سے نیچے دھکیل دینا چاہیئے تھا۔ کیا کان مسل دئے، بس! اُسے اچھی طرح سے یاد ہے کہ جب وہ قصبہ کے سکول میں پڑھتا تھا تو ڈاکٹر کا لڑکا خواہ مخواہ لڑکوں پر اپنی برتری گانٹھتا تھا۔ جب دیکھو اپنی شان بگھار رہے ہیں۔ اُسے یہ باتیں سُن سُن کر بہت غصہ آیا کرتا تھا اور ایک روز اُس نے ڈاکٹر صاحب کے لڑکے کا مار مار کر بھرکس ہی جو بنا دیا۔ اسکے بعد وہ پھر کبھی نہ بولا۔ ہاں وہ بھی کم ہمت تھوڑی ہی تھا۔ بہادر آدمی ہے۔ ڈرنا کس لئے چاہیئے۔ ہمیشہ سر اونچا کر کے چلنا چاہیئے۔ آخر وہ بھی دوسرے انسانوں کی طرح خدا کا آفریدہ ہے۔ خواہشات، رجحانات، اور دیگر صفات کا مالک ہے۔ اُسے ضرورت کیا کہ خواہ مخواہ دوسروں کو سلام کرے۔ یہ اُسکی زبردست توہین ہے بلکہ ہتک عزت ہے۔

اُس نے سڑک پر پڑے ہوئے روڑے کو شوکی ٹھوکر سے ہٹا کیا۔ اور وہ دس گز کی دوری پر جا کر ٹھہرا۔ خواہ مخواہ راستے میں پڑے رہتے ہیں۔ زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔ رکاوٹیں ہوتی ہیں جو انسان ان کو دیکھ کر ڈر جاتا ہے وہ ناکامیاب اور جو اُن سے نہ ڈرے بلکہ ڈٹ کر مقابلہ کرے کامیاب۔ کامیاب ترین ہستی، صفحۂ گیتی پر مجرد کامیابی کا مجسمہ۔ اور لمحہ بہ لمحہ وہ تن سا چلا۔ اپنے کوٹ اور پتلون کی طرف دیکھا۔ سب درست ایکدم صحیح، اور اُس نے پٹڑی پر چڑھ بنواڑی کے قدِ آدم شیشے میں جھانکا ایکدم دلآویز، وہ کتنا خوبصورت انسان ہے۔ کیا چہرہ مہرہ ہے اور بال بالکل اس طریقے سے سنوارے ہیں کہ ہر عقلمند اور تعلیم یافتہ آدمی اسے دیکھکر اندازہ لگائے کہ نوجوان آدمی ذہین، ایک عظیم فلسفی [illegible] مفکر یا زاہد تعلیم یافتہ یا سیاستدان ہے۔

سڑک بھر دلق پر ساحت فرزلی ہو رہی تھی۔ اور وہ برابر ہر قدم پر وقت کے لمحوں، یعنی ثانیوں، ثانیہ کے بعد سیکنڈوں، سیکنڈوں کے بعد منٹوں کو دُنیا سے چھیننے لئے جا رہا تھا۔ اس کے قدم نہ پھر اسی طرح سڑک پر پڑیں گے نہ ہی وہ گذرا ہوا وقت کبھی واپس ہوگا۔ ثانیے، سکنڈ، منٹ، ایک، دو، تین، چار، پانچ ... جلدی جلدی ختم ہو جانے والے وقت کے لمحے، وقفے...

ٹن۔ ٹن... ٹن... ایک مرتبہ نہیں دو مرتبہ نہیں دس مرتبہ۔ گرجا گھر کا گھنٹہ خاموش ہو گیا۔

اُس نے اپنی پتلون کی جیبوں کی گہرائی میں سے ہاتھوں کو نکالا۔ دس پورے دس بج چلے۔ اور کلائی کی طرف نگاہ جو جاتی تو گھڑی ندارد۔ مگر وہ بھولنے والا انسان تو واقع نہیں ہوا تھا۔ اُف۔ سراسر محویت اور غیر حاضر دماغی۔ اُسے یاد آ گیا۔ اس نے ساری عمر گھڑی ہی نہیں باندھی۔ کلائی کی دُلہن، ٹک ٹک کرنے والی گھڑی۔ اور اُس نے کبھی بھی اس دُلہن سے التفات کیا۔ کتنا لاپروا آدمی ہے وہ۔ ہمیشہ سے ایسا واقع ہوا ہے۔ دس بج چکے ہیں۔ اور وہ... اُسے کیا کرنا ہے۔ ارے! کلاس انتظار کر رہی ہوگی۔ جلدی جلدی سٹاف روم میں گھسا رجسٹر سنبھالا اور چاک تین چار جتنے بھی ہاتھ میں سنبھال سکا سنبھالے۔ اور خالی ہاتھ کو بالوں پر پھیرتا، سر کھجاتا، سٹاف روم کے میونسپل کمیٹی کی مال گاڑیوں کی سستی مات کرنے والے گھنٹے کی طرف دیکھتا اور غیر ارادی طور سے سٹاف روم میں تشریف رکھنے والی ہر ہستی کو سلام کرتا وہ بجری کی سڑک کی چھاتیوں کو چیرتا، آخر کلاس روم میں پہنچ ہی گیا۔

"بیٹھ جائیے" (انگریزی میں)

حاضری لینے کے بعد اُس نے رجسٹر کو سنبھالا اور بلیک بورڈ کو رگڑ رگڑ کر صاف کرنا شروع کر دیا۔ اُسے ان دس مہینوں میں تختۂ سیاہ صاف کرنے کی مشق ہو چلی۔ چاک کے باریک ذرات اُس کے کوٹ کی آستینوں اور سر کے بالوں میں چھپنے لگے۔

اُس نے کوٹ کی آستین کو ہلکے ہلکے جھٹکا اور پھر کلاس کی طرف ایک نظر دوڑا کر۔

"کوئی مشکل پیش آئی آپ کو" کتاب کو کھولنا شروع کیا "صفحہ ۲۳۱ میرے خیال میں یہی صفحہ ہے۔ کوئی مشکل..."

"سر..."

"معاف فرمائیے، کہیے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ" وہ بولا۔

"آج آپ کا آخری لیکچر ہے۔ آپ پھر اس کالج میں آئینگے؟"

"اوہ۔ مجھے تو امید نہیں۔ کچھ ایسا ہی ہے۔ اچھا کوئی سوال پوچھنا ہے آپ کو؟"

"جی نہیں"

آخر وہ کتنا غیر حاضر دماغ واقع ہوا تھا۔ اُسے خیال تک بھی نہ تھا کہ آج اس کا آخری دن ہے۔ وہ کرسی پر مضمحل سا ہو کر بیٹھ رہا۔ کتاب کو غیر ارادی طور سے ہاتھ میں سنبھالا رجسٹر کو بغل میں دبایا۔ کوٹ پر جمے ہوئے چاک کے ذرات کو جھاڑا۔ رومال سے منہ صاف کیا۔ "اچھا تو آپ لوگ جا سکتے ہیں"

سُست قدم۔ کتنے مُردہ اور خالی از زندگی۔ ہر ایک صدا، طالب علموں کا شور و غوغا اُس کے تخیل کو درہم برہم کرنے لگا۔ کیا اتراتے ہوئے چلتے ہیں بجری کی سڑک پر... کیا ہرج ہے کسی روز بڑے آدمی بن جائیں گے۔ ہندوستان کے نام کو چار دانگ عالم میں بلند و بالا کر دینگے۔ کالج کے طالب علموں کی طرزِ گفتگو، طالبات کا لباس اور نزاکت بھرے قدم، سب مصنوعی۔ بس اُونچا کالر کیا اور لگے اترا کر چلنے۔ اور لڑکیاں اُن کو دماغ ہی نہیں ملتے، کتنی قنوطیت، جذبۂ برتری کی حامل ہیں وہ۔ وہ چھ سال کالج میں پڑھا مگر ان چھ سالوں میں اس کے دماغ نے جواب دیدیا۔ آخر وہ کب تک سوچتا رہے کہ اُسے بننا کیا ہے۔ اور اس ساتویں سال کے بعد اُسے پھر محسوس ہوا کہ وہ سات سال... سات سال جن میں وہ گم سا ہو چلا تھا گیا وہ پھر واپس آ سکیں گے۔ لوگ کہتے تھے کہ کالج کی زندگی بہت پُرلطف ہوتی ہے۔ مگر اُسے وہ لطف وہ مزا کبھی حاصل ہوا؟ کبھی نہیں۔ ہوتا بھی کیسے۔ کلاس روم سے سٹاف روم تک جاتے جاتے چہرہ پژمردگی کا شکار ہو چلا۔ مگر اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کونے میں پڑی ہوئی بیت کی کرسی پر جا ڈٹا۔ گدّے دار کرسیوں کا اُسے حق ہی کیا ہے۔

سٹاف روم سے ملحق لڑکیوں کے کامن روم سے آنے والی آوازیں، سٹاف روم کے گھنٹے کی بے معنی ٹک ٹک، اور سینیر لکچراروں کی بڑی بڑی باتیں... یا خدا! وہ سر جھکا کر سوچنے لگا اُس کے جذبات کیوں اتنے مُردہ ہو چلے ہیں۔ وہ کیوں نہ ان پروفیسران کی پُرلطف گفتگو میں برابر کا حصہ دار بن جائے۔ اُن سے دریافت کرے کہ ان کی خوشی کا راز کیا ہے۔ وہ کیوں مطمئن ہیں۔ وہ گفتگو کر سکتے ہیں اور کبھی کبھی ہنسنے لگتے ہیں اور جب کبھی سٹاف روم کے دروازے پر کوئی لڑکا اُن کا [illegible] تو اُس کے ساتھ تمکنت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ آخر اُس کی [illegible]

مقصد اور منتہائے مقصود کیا ہے۔ کچھ نہیں۔ تھوڑے دن میں وہ لکھا پڑھا سب بھول جائے گا۔ ایک دم ..... دُنیا کہیگی کہ ایک ذہین آدمی بیکار ہو گیا۔ عجب احمق ہیں ہنسنے والے بھی۔ اورے ذہانت کا پیسہ تھوڑا ہی ملتا ہے۔ پیسے کو پیسہ کماتا ہے۔ جہاں کہیں تم چلے جاؤ۔ بیت العلوم، دار الفنون، ہر جا، ہر جگہ پیسے کو پیسہ کماتا ہے۔ ذہانت خریدی جا سکتی ہے، بڑے آرام کے ساتھ۔ اور تو اور آسے یاد نہیں رہا۔ کیا نام......
اس کا دماغ اتنا کیوں ماؤف ہو چلا۔ اُسے آخری ٹیوشن کے پیسے بھی وصول کرنے ہیں۔ مگر وہ کیسے وصول کریگا۔ جب وہ کالج سے فراغت پا چکا تو پیسوں سے بھی ہاتھ دھو لینا چاہئے۔

سٹاف روم کا گھنٹہ برابر ٹک ٹک کئے جا رہا تھا۔ مکرر، پیہم، متواتر، آخر کب تک، جب تک اس سٹاف روم میں نئے چہرے آئیں گے اور چلے جائیں گے۔ کورٹ یارڈ میں گلاب، موتیا، اور سنبل کے پھول کھلتے ہیں۔ شہتوت کے درخت میں ہرے ہرے شہتوت نکلیں گے اور ان بجری کی سڑک پر کھلتے ہوئے چہرے اور ہنستی ہوئی دوشیزائیں پُر از اُمنگ قدم رکھتی ہیں۔ اور وہ ... کچھ نہیں۔ کالج کا بہترین طالب علم ہوتے ہوئے بھی اب ایک بیکار انسان بن جائے گا۔ اور سٹاف روم کے ساکنوں کے سامنے آنے میں شرم محسوس کریگا۔ انتہائی شرم و حیا... ذہانت شرمیلی ہوتی ہے اور خوبصورتی، اصلی خوبصورتی وہ بھی شرمیلی ہوتی ہے۔ بالکل حیا کی دیوی اس کی .... نہیں دس مہینے تک اس کی خاموش مددگار۔ نیلما بھی تو کتنی شرمیلی ہے۔ نہایت شرمیلی۔ جب وہ اس کے مطالعہ کے کمرے کے سامنے سے گذرتی ہے تو اُس کے رخسار تمتما جاتے ہیں اور اس کی نگاہیں ایک دم جھک جاتی ہیں۔ اور اس کے دل کے تاروں پر جھنجھناہٹ سی پیدا ہو جاتی ہے... سوچتے سوچتے اس کے رُخساروں پر حیا کی سُرخی دوڑنے لگی۔ نہیں سٹاف روم کی جہاندیدہ آنکھیں اُسکے چہرے سے اندرونی حالات کا پتہ نہیں لگا سکتیں۔ اور بیت کی کرسی، وہ بھی اتنا حساس دل نہیں رکھتی کہ اس کے دل کی ٹک ٹک کو سُنے۔
دھک، دھک... دھک... دھک...!

اُف وہ کس قدر کمزور انسان ہے۔ بیکاری اور محبت... بیکاری کے دنوں میں محبت یا پھر بیسویں صدی کی اختراع رومان یعنی صرف نیاز کا طلبگار رہنا۔ خیر وہ متفقہ طور پر نہیں کہہ سکتا کہ یہ محبت انیسویں صدی کی پاگل پن کی حد تک پہونچانے والی سوحانیت ہے یا وقت کی لپیٹ میں آ کر جل جانے والا رومانی جذبہ ہے۔ لیکن نہیں! اس کی یہ محبت یا یہ رومان ایک عجیب قسم کا رومان ہے۔ شام کے سایوں میں پہاڑی کی دامن میں لپی ہوئی جھیلوں کے پانیوں ایسی خوش رنگی میں ملی جذباتی آغوش میں پلا ہوا جذبہ۔ جس نے اس کو اتنی بلندی پر پہونچا دیا کہ اُسے ہر شے سے محبت ہو گئی... ارے آخر وہ اتنا کیوں کھو جاتا ہے۔
ایک دم اُٹھا اور سٹاف روم کے گھنٹے کی سُست مگر معنی خیز آنکھوں کو دیکھتا ہوا سکڑتا سکڑاتا، لرزتا سا، بچتا بچاتا آخر وہ سٹاف روم سے باہر نکل ہی گیا۔ ہر لمحہ نلیما کا خیال اس کے دل کی حرکت کو فزوں سے فزوں تر کئے جا رہا تھا۔ خیر۔ اُس نے سٹاف روم کے سامنے لگے ہوئے باغیچے میں سے ننھے منھے جامنی رنگ کے پھولوں کو توڑا اور کوٹ میں آویزاں کر لیا۔ آخری بار، بالکل آخری بار۔ اور جب وہ اِن پھولوں کو آویزاں کر رہا تھا تو چند طالبات ادھر سے گذری تھیں، تو وہ ہلکی ہلکی شرم محسوس کرنے لگا تھا۔

"نمستے"
"نمستے۔ کہئے کیسے مزاج ہیں آپ کے"
"عنایت ہے۔ تو آپ اب پھر کالج میں نہیں آئیں گے۔ آپ جیسا لائق انسان، آپ ہم کو بہت یاد آئیں گے"
"شکریہ۔ لیکن مجھے کچھ پریشانی نہیں۔ اس سات سالہ زندگی کا مجھ پر بوجھ ہے۔ اُتار پھینکوں گا۔ جلد یا دیر میں۔ اور کام، کام میں نے سمجھ لیا ہے۔ نہایت عمدہ" اور کوٹ میں آویزاں پھول ہنستے ہوئے معلوم پڑتے۔
"کیا کام؟"
"یہی۔ قلم اور کاغذ۔ سویرے سے شام لکھتے رہنا۔ ڈرامے، افسانے اور کیا کروں"
"عجیب"
"اس میں تعجب کی بات ہی کیا ہے۔ پانچ سال حساب پڑھایا اور اب لٹریچر کی دُلہن سے دوستی گانٹھ لی۔ تبدیلی اور زندگی کا راز ہے تبدیلی۔ کتنا اچھا combination ہے، ریاضی اور لٹریچر.... ہا ہا ہی ہی.... تو آپ مجھے اس طرح تو یاد کر سکیں گے۔ اور جب چاہیں آپ میرے پاس آ سکتے تھے۔ بشوق، جب چاہو"
"شکریہ"
لڑکا چلا گیا۔ اُس کا محبوب ترین طالب علم۔ مگر اُسے کبھی ہمت نہ پڑی کہ کسی سینیئر لکچرار سے طالب علمی کے زمانے میں بات کرے۔ وہ ڈرتا تھا، نہیں! قطعی غلط بات۔ اس کی زندگی نے، ماحول نے سجھا دیا تھا کہ رہنما کا ذرا سا اشارہ کافی ہوتا ہے۔ اس لئے بار بار کسی ... کی ... تک پہونچنے میں ناکام ہوتے ہوتے ... [illegible]

کہ وہ کبھی ان مشکلات کو دُور ہٹا پھینکنے میں کامیاب ہو ہی جائے گا۔
لیکن بجری کی سڑک دن کے دوسرے حصّے میں رنگت کھوتی معلوم ہوتی تھی اور وہ کن انکھیوں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسکے کان ماہب علموں کی گفتگو، لکچراروں کی کمرہ درکمرہ گونجنے والی آوازوں، کالج کی گھنٹی کی ٹن ٹن، سب سے بے بہرہ ہو چلے۔ دو... تین... چار... ایک کے بعد ایک پیریڈ گذر گیا لیکن وہ کونسی کلاس سے، وہ بھولتا جارہا تھا اُن مسئلوں کو جنہیں طالب علمی کے زمانے میں وہ چٹکیوں میں حل کرلیتا تھا۔
کتنی پُرامید زندگی تھی وہ۔ گھنٹوں کسی مسئلے پر اڑے رہنا اور جب کامیابی اپنی تمام تر رعنائیوں کو ساتھ لئے اُس کے سامنے نمودار ہوتی تو وہ کتنا خوش ہوتا تھا۔ یہ ہی اسکی دولت تھی اور یہ ہی سرمایہ۔ کتنی لذید شے...
خیر۔ آخر ہر بات پر یہی کہنا پڑتا ہو نا۔
ڈھلتی ہوئی دُھوپ میں ہر لحظہ رنگت بدلنے والی بجری کی سڑک ہر لمحہ نااُمیدی اور یاس کا خاکہ بنتی جارہی تھی۔ دس بجے اُس میں کتنی چمک تھی، آب وتاب، زعفران کی کھیتیاں، کالج کی دیواروں کے سائے میں پھلتی پھولتی۔ شفق کے رخساروں ایسی رنگت اور اب وہی سڑک سیاہی مائل، کھردری، بوٹوں تلے آکر کھسر کھسر بولنے والی، بن چلی۔ اور اس سڑک پر جوتوں کے پڑنے سے پیدا شدہ آواز اس کے ضعیف دل پر بارِ گراں ثابت ہو رہی تھی۔ کتنی مکروہ آواز، گویا موسیقی کی گردنِ زار پر بھونڈی چھری پھیر دی گئی ہو۔ غصّہ، سراسر نفرت کا جذبہ، ہر چیز سے ناراضگی کا اظہار، اور وہ اس بجری کی سڑک پر روانہ ہو گیا سر جھکائے، سنجیدہ فلسفی کی مانند، ہلکے ہلکے قدم رکھتا، تاکہ اُسکے بوٹوں کے دباؤ سے سڑک کی مکروہ آواز اُس کی رُوح کی گہرائی میں چرکہ نہ لگا نا شروع کردے۔ مگر برابر بجری کھسر کھسر بولے جارہی تھی۔
سڑک، گندگی اور تڑپتی ہوئی مرغی... اور وہ چھری جو اُسکے ہاتھ میں آچلی تھی۔ کہیں کس واسطے؟ نلیما کو اپنی بیٹھک میں بیٹھے بیٹھے ذبح کرنے کے لئے۔ آخر وہ دو تین بار ادھر سے گذرتی ہے نا۔ اور وہ اُسے کبھی اس کا انتظار رہتا ہے۔ اور جب کبھی اُس کی مُرغی اس کے کمرے کے سامنے سے گذرتی ہو تو اس کی ذہانت روتی ہے۔ چہرہ رنگت بدلنا شروع کر دیتا ہے۔ اور دل، ضعف ونقاہت کے آخری درجے پر پہونچ جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ نلیما کو پا سکتا ہے۔ کوئی رکاوٹ نہیں برادری ایک، ذات سب ایک، لیکن اس کے گھر میں دقیانوسی خیالات کی حکومت ہے۔ چاندی سونے کی جھنکار کی پہچان ہے۔ اور وہ [illegible] ہے کس حد سے کہے کہ اُسے نیلما کی ضرورت ہے

شدّت کے ساتھ چاہ ہے۔
"بیوقوف"
نہیں وہ نہیں کوئی اور...
وہ دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا۔
"بیوقوف آخر تجھے وہ لڑکی کیوں درکار ہے۔ دیکھ دُنیا میں رکھا ہی کیا ہے۔ دوسری لڑکی کا گھرانہ مالدار۔ باپ انجنیر، بھائی تحصیلدار اور لڑکی... لڑکی خوبصورت عقلمند۔ کیا لڑکی ڈھونڈی ہے، بھونڈی شکل، کیا دیدینگے اُس کے ماں باپ"
"جی۔ اس سے اچھا ہو کہ آپ میری شادی نہ کیجئے۔ یہ میری انتہائی بدقسمتی ہے کہ میں جو چاہتا تھا نہ ہوسکا"
"بیکاری ہی میں ایسی باتیں سوجھتی ہیں صاحبزادے۔ برادری میں ناک نہیں کٹوانی..."
وہ آگے کھسکا۔ وہ بھی تو بیکار آدمی ہے۔ اور نلیما، کیا وہ اسکو پا سکے گا۔ نہیں! کیوں نہیں؟ اس کا جواب، گنبد کی بلندیوں میں گونجنے والی آواز دے سکیگی؟ کیسے وہ گنبد سے سوال کریگا۔ کیا؟ اُسے نلیما چاہئے۔ وہ غریب لڑکی ہے۔ اُسے پسند ہے اور وہ بیکار آدمی ہے۔ کیا جواب دیگا گنبد، کچھ نہیں یہ صاحبزادے بیکاری میں ایسی ہی باتیں سوجھا کرتی ہیں"
ہا ہا ہی ہی ہو ہو ہو.....
سڑک بدلی۔ سڑک کا ماحول بدلا۔ صبح شام کے سفر کو تیار۔ اُس نے مکان کی بلندیوں کو عبور کرکے کوشش کی کہ وہ شفق کے نظارے کی ایک جھلک دیکھے۔ لیکن شہر کی مہذب ہوا اور اُونچی عمارتوں سے شفق کی دلہن شرماتی ہے۔ بیکار آدمی کو تسلی ہے تو کیا کہ وہ کم از کم قدرت کے نظاروں سے دل کو بہلا لے۔ جب طبیعت پریشان ہو کسی پارک میں جا کر پڑ رہے۔ دریا کے کنارے دُور دُور تک چلا جائے۔ اور شفق کے عارضِ گلگوں کو دیکھتا رہے۔ مکرر۔ متواتر ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہے۔ اور اس کے ہاتھ پرندوں کے بازوؤں کی طرح پھڑپھڑانے شروع کردیں۔ ایک فضول کوشش میں، شفق کے عارضِ گلگوں کو نزدیک سے دیکھنے کے لئے۔
لیکن صبح اتنی جلدی شام میں کیوں تبدیل ہو چلی۔ گھر پہونچ کر وہ اپنے مطالعہ کے کمرے میں گھسا۔ پہلی نظر گلی کی طرف پھیری تو کیا گذرتی ہوئی نلیما۔ چھری وہ بھول آیا۔ کہاں کس جگہ۔ اس نے ایک ہاتھ کی ہتھیلی دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر رگڑنی شروع کردی۔ آخر چھری تیز کرنی پڑے گی۔ وہ دن بھر اسی بیٹھک میں بیٹھا چھری [illegible] رہیگا۔ نلیما کی گردن پر آہستہ آہستہ حرکت [illegible]

اُس کے ہاتھ کی ہتھیلیاں گرم ہوئیں اور دھاگا ہوگئیں۔

"کیا کر رہے ہو تم؟"

"کچھ نہیں! چھری ... نہیں ذرا ہتھیلی میں چوٹ آگئی تھی سو کر رہا تھا۔ اب تو ٹھیک ہے۔ کالج سے فرصت مل ہی گئی ہے۔ سوچ رہا ہوں اب کیا کروں ...؟"

"پھر کبھی سوچ لینا۔ کھانا کب کھاؤ گے؟"

"جب تک نہیں کھاتا تب تک یہ صبح شام میں نہ تبدیل ہو جائے۔"

اس کی ماں چلی گئی۔ اُس نے ایک کے بعد ایک ریاضی کی کتاب کو میز کی نزدیکی سے دُور کاٹھ کے صندوق میں مقفل کر دیا۔ فاؤنٹین پن میں سیاہی ڈال، کاغذ کے چار دستے، جو اُس نے چند دن پہلے ریاضی کے مسئلے حل کرنے کے لئے خریدے تھے، باقاعدہ قرینے کے ساتھ میز پر رکھے۔ بس اب اُسے درکار ہی کیا ہے۔

کاغذ۔ موجود۔

قلم۔ موجود۔

اور وہ لکھتا رہے گا، افسانے۔ صبح سے شام تک۔

اور انتظار کریگا، کہ کتنی بار صبح اور شام کے درمیان وہ ملیا کے جذبات، اور خاموش محبت کی نازک محبت پر ہلکی چھری پھیرتا رہے۔ پیشانی پر پسینے، خیالات کی زیادتی سے دماغ کی گہرائیوں سے اُمنڈ آنے والے پسینے۔ اس نے ان کو پونچھنے کی کوشش کی، اور پھر وہ ایک شکست خوردہ انسان کی طرح اٹھا۔ شام نزدیک تھی اور وہ اپنی ماں کے پاس پژمردہ چہرہ بنا کر بیٹھ گیا۔

"اب کیا کریگا؟"

"کیا کروں گا۔ لکھتا رہونگا صبح سے شام تک۔"

صبح، شام میں تبدیل ہو گئی۔ اور وہ ایک ہتھیلی کو دوسری ہتھیلی سے رگڑنے لگا۔ گلی کی معصوم مُرغی کے کمزور گلے پر ہولے ہولے پھیرتے رہنے کے لئے۔

پرتھوی ناتھ شرما

ہوٹل

چار سُو ستھرے سلیقوں کی نمائش کا ظہور
ہر طرف نکھرے قرینوں کی طراوش کا غرور
اُٹھ رہا ہے بند کمروں سے یوں ہلکا شور سا
جس طرح بازار رہتا مدفزا لاہور کا
ہر رنگا پردہ ہے پردہ ایک گہرے راز کا
ہر جھروکے میں چھپا رکھا ہے نغمہ ساز کا
سبزیاں پکنے کی لپٹیں اشتہا انگیز ہیں
چوکھٹوں میں مست تصویریں قیامت خیز ہیں
بیرے سج دھج کر کھڑے ہیں گاہکوں کی آس میں
لے رہے ہیں درجنوں کھانوں کا نام اک سانس میں
بج رہی ہیں میز پر چھریاں کھنکتے ہیں گلاس
چل رہے ہیں مُنہ، فضا میں ہے ٹوکا روں کی بھرمار
لمبے لمبے قہقہے کچھ چپکی چپکی گفتگو
ایک گوشے میں خموشی اک میں حشر ہاؤ ہو
ہر طرف نیرنگیِ پوشش میں زخمی اتحاد
کیا تقابل ہے، پلیٹیں بھی ہیں لبریزِ تضاد
بیرے اپنے کام میں چالاک ہیں ہشیار ہیں
یہ اشارے "اور بھی کچھ چاہیے" اصرار ہیں
نام ہوٹل کا مگر تخریب کا آئینہ دار
میکدے اور قحبہ خانے کی روش کا کاروبار
بدقماشی کا ٹھکانہ، بدمعاشی کی دُکان
چار سُو ستھرا تعفن ہر طرف بکھرا دُھواں

زندگی

کس کو اپنی پیدائش یا بچپن کے حالات معلوم یا یاد ہوتے ہیں جو اُسے ہوتے۔ اُسے یہ تو خیال نہیں کہ وہ کتنے برس کا تھا مگر اُسکے ذہن میں خود اپنی جو پہلی تصویر ہے وہ اس وقت کی ہے جب وہ پاؤں پاؤں چل سکتا تھا سردی کا زمانہ تھا اور شام کا وقت، اس کے باپ نے اُس کو ایک سنہرے رنگ کلاوتی ٹوپ لاکر دیا۔ اُس نے جلدی سے اس کو پہن لیا، پیشانی اور کانوں پر اُون کے بھولے بھولے گچھے لٹکے ہوئے تھے، گلے پر بندوں کے نیچے دو موٹے موٹے گچھے تھے جو چلنے پھرنے میں چھوٹی چھوٹی گیندوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگتے تھے، اور اس کے ننھے سینے پر رقص کرتے معلوم ہوتے تھے، وہ اس وقت بہت خوش تھا۔ اس نے ماں کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور زور سے لپٹ گیا۔ ماں نے بھی اس کو دو چار پیار کئے، پھر وہ باپ کی گود میں چڑھ گیا، وہ اس وقت اُچھل اور کود رہا تھا، اور اگر کسی نے اُس کو گود میں لینے کی کوشش کی تو وہ ان کی گود سے نکلا پڑتا تھا، اگر اس کے پر ہوتے تو وہ فضائے بسیط میں چھوٹے چھوٹے ننھے ننھے بادلوں کی طرح آزادی سے اِدھر اُدھر دوڑنا چاہتا تھا، مگر وہ اپنی اس کمزوری پر مغموم نہیں تھا، آخر جب اس سے نہ رہا گیا تو وہ بیتاب ہو کر تیزی سے باہر دوڑا کہ راستے میں اس کو ایک جگہ ٹھوکر لگتے لگتے بچی، گھر کے سامنے اس کے ہم عمر دوست کھیل رہے تھے، وہ بڑے فخر و غرور سے ان کے سامنے ٹہلنے لگا، بچے اس کے چاروں طرف جمع ہو گئے اور اُس کی بیش بہا چیز کو غور سے دیکھنے لگے، جب کوئی بچہ فرط شوق سے ٹوپ کے پھندنے کو ہاتھ لگانا چاہتا تو وہ اس کو توتلی زبان میں جھڑک دیتا، مگر وہاں سے ہٹتا نہ تھا۔ انسان کی سرشت میں بچپن ہی سے نمائش کا مادہ ہوتا ہے، اور وہ اپنی چیزوں کی نمائش کرنا چاہتا ہے مگر اُن کو خراب کرانا نہیں چاہتا، وہ بالکل بھول جاتا ہے کہ اچھی سے اچھی چیز استعمال سے خراب ہو جاتی ہے۔

وہ آج بہت خوش تھا کیونکہ آج وہ پہلی مرتبہ اسکول گیا، ماں نے اس کا ہاتھ منہ دھلا یا، نئے کپڑے پہنائے، اور دوپہر کا کھانا ایک ناشتہ دان میں رکھکر اس کو اسکول روانہ کیا۔ اسکول میں چاروں طرف سے لڑکوں نے آکے گھیر لیا۔ کوئی اس کا دوست اور ہمدرد بننا چاہتا تھا کوئی اس کو ستانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسکول کے بڑے لڑکے اِدھر اُدھر آتے جاتے اُس پر نظر ڈالتے اور مسکراتے تھے چپراسی بھی کی خوشامد میں لگے تھے کہ ان کو کچھ انعام و اکرام مل جائے۔ کلاس میں جو ماسٹر آتا وہ اس سے کوئی بات پوچھتا تھا اور ایک آدھ سوال ضرور کرتا تھا، اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ سارا اسکول اسی کا منتظر تھا، اسکے بغیر اسکول میں نہ کوئی کیف تھا اور نہ کوئی دلچسپی، اسکے آنے سے اسکول میں ایک زندگی پیدا ہو گئی، اور اس احساس کے تصور سے مارے غرور کے اس کا چہرہ تمتما اُٹھا، انسان ہر ماحول میں اپنی اہمیت سمجھتا ہے مگر وہ بھول جاتا ہے کہ کائنات میں اس کی حیثیت ایک حقیر کیڑے سے زیادہ نہیں ہے۔

آج وہ بہت خوش تھا کیونکہ اس کا پہلا مضمون ایک رسالے میں شائع ہوا۔ اُس نے سب سے پہلے مضمون اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو سنایا، حالانکہ ان میں اس کے سمجھنے کی قابلیت ہی نہ تھی۔ پھر وہ محلے کے ہر گھر میں گیا اور ان بڑی بوڑھیوں کو سنایا جن کو آج تک مضمون سننے کا اتفاق نہ ہوا تھا، اور جب وہ تعریفیں کرنے لگیں تو اس نے بتایا کہ وہ عنقریب مصورِ جذبات اور ادیب انقلاب بننے والا ہے، اس نے اشاروں اور کنایوں سے اپنے بزرگوں سے بھی داد حاصل کی، آج وہ بہت جلد اسکول چلا گیا، اور رسالہ اپنے ساتھ لیتا گیا، پہلے اپنے بے تکلف دوستوں کو مضمون سنایا، اور جب کوئی درمیان میں آجاتا تو وہ پھر شروع سے مضمون پڑھتا تھا۔ پھر رسالہ اس نے ساری کتابوں کے اوپر رکھدیا تاکہ ہر شخص اس کو دیکھ سکے، اس کی خواہش تھی کہ آج جماعت میں سبق نہ ہو بلکہ ماسٹر صاحب اس کا مضمون ہی سب کو سنائیں، وہ چاہتا تھا کہ اسکول میں ایک جلسہ ہو، جہاں ہیڈ ماسٹر، دوسرے اساتذہ اور لڑکے جمع ہوں، اس کو مضمون لکھنے پر مبارکباد دی جاتے، پھر وہ اسٹیج پر کھڑے ہو کر گلا صاف کرکے اپنا مضمون سب کو سناتے، اور لوگ تالیاں بجائیں۔ گو اس کی یہ آرزوئیں پوری نہ ہوئیں لیکن وہ خوش تھا جب اِدھر سے آتا جاتا کوئی لڑکا اس کا رسالہ اُٹھا لیتا اور دو چار لڑکے اس کے گرد جمع ہو کر رسالہ پر نظر ڈالتے اور کہتے کہ "اچھا اس میں تمہارا بھی مضمون ہے" تو اس کا دل بلیوں اچھلنے لگتا [illegible] رسالہ کی [illegible]

خیال سے نہیں کہ اس کا رسالہ چھپ کر بیکار ہو جائے گا بلکہ اس اندیشے سے
کہ اس طرح آئندہ نمائش کا ذریعہ مفقود ہو جائیگا۔

آج وہ بہت خوش تھا کیونکہ آج بی۔ اے کا نتیجہ آیا تھا اور وہ
امتحان میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ اسٹیشن سے اخبار میں نتیجہ دیکھکر تیز تیز
سائیکل چلاتا ہوا گھر کی جانب چلا۔ راستے میں اس کو جتنے آدمی ملے وہ
ان کے منہ دیکھتا تھا کہ شاید وہ اس سے نتیجہ دریافت کریں، بالخصوص
جب وہ چار واقف کاروں سے ملاقات ہوئی، جن کو یہ بھی معلوم تھا کہ
آج نتیجہ آنے والا ہے تو اُس نے اپنی سائیکل آہستہ کی اور سلام بھی کیا
مگر وہ سلام کا جواب دیکر تیزی سے نکل گئے، اور اس کو خود بھی نتیجہ سنانے
کا موقع نہ دیا۔ جب وہ گھر کی گلی پر پہونچا تو چھوٹے بھائی نے دُور ہی سے
پوچھا: "بھیا پاس ہو گئے"؟

"ہاں ہاں پاس ہو گیا"۔ اُس نے چیخکر کہا، اور وہ جلدی سے
گھر میں اطلاع دینے بھاگا۔ قریب ہی محلہ کی بھنگن جھاڑو دے رہی تھی
اُس نے پوچھا: "بھیا کیا پاس ہوئے"؟

"اری بی۔ اے ہو گیا، بی۔ اے"!

وہ نہ معلوم کیا سمجھی کہنے لگی: "اچھی اچھی بابا"!

مگر اس کے پاس اس کے سمجھانے کو وقت کہاں تھا، اُس نے
سائیکل دروازے کے باہر پھینکی اور جلدی سے باپ کو سلام کرتا ہوا گھر کے
اندر گھس گیا۔ سارا گھر دروازے پر جمع تھا۔ وہ ماں سے لپٹ گیا، ماں
نے بھی اس کو زور سے گلے سے لپٹا لیا۔ اس کی بہنیں اتراتی ہوئی
محلے میں خبر کرنے دوڑیں، کیونکہ اب وہ ایک گریجویٹ کی بہنیں ہو چکی
تھیں۔ دن بھر گھر میں ہنگامہ رہا، محلے اور عزیزوں میں مٹھائی تقسیم کی
گئی۔ دوست احباب اور رشتہ دار مبارکباد دینے آرہے تھے، باہر
سے مبارکباد کے تار وصول ہو رہے تھے۔

آج وہ بہت خوش تھا کیونکہ وہ ملازم ہو گیا تھا، ملازمت
بھی اچھی اور معقول تھی، اس زمانے میں ملازمت اور وہ بھی اچھی
ملازمت عنقا ہے، پھر اگر اس کو اس کامیابی پر خوشی تھی تو اس میں
کیا تعجب، محلے اور دوست احباب کے حلقوں میں اسی کا تذکرہ تھا،
ہر جگہ اس کا ذکر ہو رہا تھا۔ لوگ اس کو خوش قسمت بتا رہے تھے، اُسکی
تعریف ہو رہی تھی اور وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔

آج وہ بہت خوش تھا، کیونکہ آج اُس کی شادی ہوئی
تھی، اس کو حسین، نوجوان، لکھی پڑھی اور شایستہ بیوی ملی تھی، وہ
[illegible] جو اس نے [illegible] ان سے وہ اب
خود محظوظ ہو رہا تھا۔ اس کی دُنیا سمٹ کر ایک [illegible]
کائنات مختصر معلوم ہونے لگی تھی، وہ محسوس کرنے لگا [illegible] زندگی
کا دوسرا نام ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ پریم کی کشتی میں بیٹھا پریم کی
ندی میں بہا چلا جا رہا ہے، جس کا کنارہ ہی نہیں ہے، اس کا خیال
تھا کہ دُنیا کے پردے پر ایک عورت ہے اور وہ اس کی بیوی ہے،
وہ اس کی پجارن ہے، وہ اس کو اپنا معبود سمجھتی ہے، اس کی ہر بات
پر سر تسلیم خم ہے۔ اور اس کے ہر اشارے پر اپنا تن، من، دھن،
نثار کرنے کو تیار، دُنیا میں اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا
ہو سکتی ہے۔

آج وہ بہت خوش تھا کیونکہ اس کو اپنی ذات سے زیادہ بیوی
سے محبت تھی۔ اور آج اس کو ان دونوں ذاتوں کا عکس ایک معنوی صورت
میں نظر آرہا تھا، وہ محبت جو اب تک ان کے دلوں میں موجزن تھی اس
نے اب ایک ہیکری صورت اختیار کر لی تھی، دونوں دلوں کی محبت،
اُلفت اور اتفاق و اتحاد کا زندہ نمونہ آج ان کے ہاتھوں میں
تھا!

آج وہ بہت خوش تھا کیونکہ آج اُس نے اپنی اولاد کو زندگی
کے اس عظیم الشان روحانی راستہ پر لا کر کھڑا کیا تھا جہاں سے
خود اس کی زندگی میں تبدیلی ہوئی تھی، وہ اولاد جس کو اُس
محبت و شفقت سے پالا پوسا، جس کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ
اُٹھا نہ رکھا، جس کو ایک پل کیلئے اپنے سے جُدا نہ ہونے دیا، آج
اس کو ایک غیر کے حوالے کر رہا تھا اور اپنے پدری رشتوں کو توڑ کر
اپنے حقوق سے دوسرے کے حق میں دست بردار ہو رہا تھا۔ وہ یہ
کام نادانی اور بھول سے نہیں کر رہا تھا اور نہ اس پر کوئی جبر تھا،
بلکہ وہ خوشی اور اپنی مرضی سے کر رہا تھا اور اپنے اس عمل پر مسرور
تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ ایک نئے رومان کی بنیاد رکھ رہا ہے جس
سے آئندہ دوسرے سینکڑوں رومان پیدا ہونگے۔

آج وہ بہت خوش تھا کیونکہ آج اُس کی وہ [illegible]
دی گئی جو ۲۵ سال پہلے اس کے ڈالی گئی تھی۔ اب وہ آزاد [illegible]
دن اور رات اس کے ہو گئے۔ اس نے اپنی خدمات کو جس طرح
انجام دیا اس کو اس کا دل ہی خوب جانتا تھا، مگر ہمیشہ اس کی خدمات
کا اعتراف کیا گیا، اس کی جان سوزیوں کو سراہا گیا، اس کی خدمت
کی داد دی گئی، اس کی تنخواہ [illegible]
انعام، [illegible] خطاب [illegible]

سبکدوش کردیا گیا۔ گو بعض لحاظ سے اس کو نقصان پہونچا مگر وہ اس خیال سے خوش تھا کہ اس نے اپنی عمر نیک نامی اور آرام سے گذاری، کبھی اس کے متعلق کوئی شکایت نہیں ہوئی، اس کے افسران اور اسکے ماتحت ہمیشہ اس سے خوش رہے، اور اس کے دشمن کم اور دوست زیادہ رہے۔ اس نے خود خوب فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو فائدہ پہونچایا۔

آج وہ کچھ پریشان ہے، وہ عرصہ سے بیمار ہے، اس کو اپنی زندگی کی اُمید نہیں رہی، گو اس کی زندگی ہمیشہ اچھی طرح گذری، اسکی سادی آرزوئیں اور خواہشیں پوری ہوتی رہیں مگر پھر بھی وہ اس دُنیا کو چھوڑنے پہ تیار نہیں۔ وہ بسترِ مرگ پر لیٹا ہے، اس کے معالج، بیوی، اولاد، دوست احباب اس کے چاروں طرف جمع ہیں۔ وہ آنکھیں بند کئے سوچ رہا ہے کہ دُنیا کیا ہے، انسان کو کیوں پیدا کیا جاتا ہے، انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے، انسان کا مطمحِ نظر کیا ہونا چاہئے۔ اور اس کو اپنی زندگی کس طرح گذارنا چاہئے، کیا خود اس کی اپنی زندگی کامیاب گذری؟ دراصل یہی سوال ہے جو اُس کو بے چین اور بیتاب کئے ہوئے ہے، نہ معلوم کیوں اس کا دل بیٹھا جارہا ہے، دہشتناک اور ہیبتناک خیالات اس کی رہی سہی ہمت توڑے دے رہے ہیں، اسکے ہوش و حواس جواب دے رہے ہیں، اس کی قوتیں کمزور ہوتی جارہی ہیں، اس کا بدن سرد ہوتا جارہا ہے، معالج اس میں گرمی پہونچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر دواؤں کا اثر قلب کی گہرائیوں تک نہیں پہونچ رہا۔ اس کی بیوی، اولاد، اولاد کی اولاد، خاص خاص احباب، رشتہ دار اور ملازم اس کے ارد گرد موجود ہیں مگر کوئی اسکی مدد نہیں کرسکتا۔ اور اسکی پریشانیوں کا خاتمہ کسی کے بس کی بات نہیں۔ اس نازک وقت میں اگر کوئی چیز اس کے دل کو ڈھارس دے رہی ہے، اور ناامیدیوں کی تاریکیوں میں اُمید کی کوئی ہلکی سی کرن نظر آرہی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ اسکے بعد بھی اس کا ذکر ہوتا رہیگا چنانچہ اُسنے مسکرا کر ایک طویل سرد آہ کھینچی اور ہمیشہ کیلئے خاموش ہوگیا۔

اُسکے جنازے میں کافی لوگ شریک ہوئے، راستے بھر لوگ اسکے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ مرحوم کی خوبیوں، اخلاق اور خوش قسمتیوں کا ذکر ہوتا رہا، جنازے کو سپردِ خاک کرنیکے بعد لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

رات کو جب سب گھر والے کھانے پر بیٹھے تو ایک چار سالہ بچے نے پوچھا دادا جان اب کہاں گئے ـــــ

"چپ رہو، دادا جان اب ہم سے بہت دور چلے گئے، اب نہیں آئینگے۔"

یہ اوراق

بھرپور نہ تھے کیا خوشیوں سے

مَیں اور مری رنگیں دُنیا

فطرت کی بہاریں تابش سے

رہتی تھی منوّر جو ہر دم

جس کے ایوانوں کے نقشے

بنتے تھے جنُوں کے دامن پر

جن سے نغمات میں ڈھل جاتے

اُلفت کے فسانوں کے طوفاں

اک بہکی ہوئی سرگوشی سے

اور فکر نہ رہتا کسی شے کا

بھرپور ہیں کیا خوشیوں سے

میں اور مری دُنیائے وفا

چاہا تھا جس نے محبت کو

پرکھا ہے زمانے نے ایسے

وارفتہ سی ہے بشاش ہے گو

یوں سیمٹی ہے پابستۂ دل

محرومِ تکلّم جیسے ہو

مبہوت سی ہو کر دیکھتی ہے

آنکھوں میں لئے موتی سے دو

گردوں کی پُرانی رعنائی

آغوش میں لے کے فرشتوں کو

اور جانے سوچتی ہے کیا کیا

آتا ہے کیوں یہ خیال اکثر

بھرپور نہ تھے کیا خوشیوں سے

وہ دن کہ جوان تھے ہم دونوں

بھرپور نہیں کیا خوشیوں سے

یہ دن کہ ہیں بوڑھے ہم دونوں

اور ضبط کا یارا بھی نہیں رہتا

خویش سے خطاب

اے مرے لختِ جگر، دلبند، فرزندِ عزیز
ہے تو یہ بیوی مگر باندی رہے گی عمر بھر
نوکرانی کی ضرورت ہوتی ہے گھر کے لئے
دست بستہ ہو کے ہر خدمت بجا لائیگی تری
اپنے سر پر لے گی تیرا ایک دُنیا کی کڑی
زندگی کے مرحلے جتنے بھی ہیں دشوار تر
دُکھ اُٹھائے گی مگر راحت تجھے پہونچائیگی
تو اگر ہوگا کبھی افکارِ دُنیا سے زہیر
میل بھتے ہیں جسے ہرگز نہ دل پر لائے گی
یہ ہنسائے گی تجھے گر تو کبھی ہوگا اداس
یوں تو یہ کمزور ہے بے بس ہے عورت ذات ہے
جس طرح بازار سے اک آبخورہ لیجئے
یا چمن سے پھول لاکر عطر بیز و خوشنما
بس اسی صورت سے بالکل حال ہے خاوند کا
اس لئے اب تجھ سے اے فرزند اتنی عرض ہے
پیکرِ بیچارگی ہوں اک غریب انسان ہوں
تو نہ میری غربت و افلاس کا کرنا گِلا
یہ تری بچی رفیقہ ہے تری دل سوز ہے
وقف ہے تیری پرستش کیلئے دن اور رات
گو نہیں کمخواب و دیبا اور اطلس اسکے پاس
ہاں نہیں بیشک میسّر اُس کو زیور اور زر
ظاہری جو کچھ نمائش ہے مادی چیز ہے
خُلق کی تمثال ہے ایثار کی تصویر ہے
خون ہر رگ رگ میں اسکی اک شریف انسان کا
مفلسی میں دولت عصمت سے مالا مال ہے
اس کی فطرت چاہتی تھی اک شفیق زندگی
نیک و بد جو کچھ بھی ہے وہ سب ترے ہاتھوں میں ہے
یہ امانت تیری حاضر ہے تجھے ہے اختیار
جو تجھے ماں باپ کے کچھ دن کے لئے اُٹھا رکھے

تیری خدمت کے لئے دیتا ہوں تجھکو اک کنیز
حکم سے تیرے اُٹھائے گی نہ ہرگز اپنا سر
یہ تری تابع رہے گی زندگی بھر کے لئے
مثل ماماؤں کے روٹی بھی پکائے گی تری
تیری راحت کی مگر جویا رہے گی ہر گھڑی
ساتھ دے گی یہ مقدر حدِ امکاں توڑ کر
تجھ سے بھی آگے تری اُلفت میں یہ بڑھ جائیگی
مشورہ دے گی تجھے ہر بات میں بنکر مشیر
خود حریفِ حادثاتِ زندگی بن جائے گی
دل بڑھائے گی ترا ہوگا اگر دل میں ہراس
اُسکے جوہر کا نکھرنا! اب یہ تیری بات ہے
اب اُسے مسجد میں یا میخانے میں رکھدیجئے
روند ڈالو پاؤں سے یا لو اُسے سر پر چڑھا
بیوی کو بیوی کرے یا دے اُسے باندی بنا
رسم شادی کیا ہے گویا اک مقدس فرض ہے
ہر طرح سے سرنگوں ہوں بندۂ احسان ہوں
یہ سمجھنا جس نے بیٹی دیدی سب کچھ دیدیا
عفت و نیکی مجسّم ہے وفا آموز ہے
بس خدا کے بعد اسکے واسطے ہے تیری ذات
وقرِ نسوانی سے ہے پُرکار یہ سادہ لباس
آبرو کے موتیوں سے ہے مزیّن سر بسر
جوہرِ عزّت ہی عورت کی حقیقی چیز ہے
پیکرِ شرم و حیا ہے واقفِ توقیر ہے
دل میں غیرت ہے جبیں پر نور ہے ایمان کا
مختصر یہ ہے کہ بس گدڑی میں گویا لال ہے
تجھکو قسمت نے کیا آخر رفیقِ زندگی
اسکی قسمت کا نوشتہ اب ترے ہاتھوں میں ہے
تا قیامت دونوں کا حامی رہے پروردگار
یہ پرائے گھر کی شے تھی! ہم امانت دار تھے

ایشیائی مادی تہذیب

جذبۂ قومیت ونسلی برتری، قومی تاریخ کے ساتھ بیجا تعصب نے یورپ کے نہ صرف [illegible] اور تعلیمیافتہ افراد بلکہ اکثر ان ماہرین تاریخ کو بھی جنہیں اپنے بےلاگ مطالعہ اور خالص سائنسی نقطۂ نظر پر فخر ہے، تہذیب کے ارتقاء عناصر کے ایک سچے اور حقیقی نظریہ کے پیش کرنے سے باز رکھا۔ تمدن و تہذیب کسی خاص قوم یا ملک یا براعظم کی پیداوار یا اجارہ نہیں ہے یہ تمام افراد انسانی کی جدوجہد ومحنت کے مجموعی نتیجے کا نام ہے جسکے ایک سرے پر وحشی افراد ہیں تو دوسرے پر یورپ وامریکہ کے باشندے۔

تہذیب کی جڑیں نوع انسانی کی ابتداء تک پہونچتی ہیں یعنی اسوقت تک جبکہ انسان اور بندر میں تمیز مشکل تھی۔ بیسوی صدی کی تحقیقات نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ موجودہ تہذیب کے بنیادی عناصر، انہیں لوگوں کا ورثہ ہیں جنہیں ہم "وحشیوں" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

وحشیوں کی اس میراث میں "عہد حجری" نے نہایت اہم اکتشافات کا اضافہ کیا ہے جن سے تہذیب کے ارتقا کو بڑی تقویت پہونچائی۔ اس عہد نے آگ کو معلوم کیا، اوزار ہتیار اور مختلف، سنکاریوں کی ایجاد کی۔ اور اُس اقتصادی نظام کی بنیادیں رکھدیں جو صنعتی انقلاب کے جدید دور تک باقی رہا۔ اس عہد کے ابتدائی زمانے میں ہی تمدن کے دو بیش بہا عناصر یعنی مصوری اور سنگتراشی معرضِ وجود میں آگئے تھے۔ اسکے بعد زراعت اور جانوروں کے پالنے اور سدھارنے کا انکشاف ہوا۔ اور فن تعمیر، کوزہ گری، طب اور حمل و نقل جیسی متنوع چیزیں وجود میں آئیں۔ الغرض اسی ابتدائی دور میں جسے ہم دورِ حجری کہتے ہیں اقتصادی وسیاسی زندگی کے ضروری عناصر کا ارتقا ہو چکا تھا مذہب اور اخلاق کی بنیادیں قائم ہو چکی تھیں۔ اور زبان، ادب اور فنون بھی ہزاروں سال کی جدوجہد ومساعی کے بعد معرضِ وجود میں آگئے تھے۔ "دھاتوں"، "تحریر" اور "ریاست" کے علاوہ تمدن کی ساری بنیادیں قائم ہو چکی تھیں۔

عہد حجری کے بعد ایک ایسا تغیر پذیر دور آیا جس میں تانبا اور لوہا جیسی دھاتوں کا انکشاف ہوا۔ ان اکتشافات کا سہرا افراد کے کسی خاص گروہ کے سر نہیں ہے کیونکہ اس کے آثار ایشیا، یورپ اور امریکہ میں مختلف [illegible] تہذیب کے ایک اور بنیادی عنصر یعنی فن [illegible]

(ـــ [illegible]) کے طور پر اس نے نشوونما پائی اور بالآخر ۳۰۰۰ سال ق م میں یہ حروف تہجی میں متبدل ہو گئے۔

تحریر کی نشوونما ترقی نے اور دھاتوں کے استعمال نے تمدن کی رفتار کو تیز کر دیا۔ جبکہ پتھر اور تانبے کے عہد کے وحشیوں نے تمدن میں اتنے کثیر اجزاء کا اضافہ کیا تو یہ بات کوئی تعجب خیز معلوم نہیں ہوتی کہ دنیا کے سب سے بڑے براعظم یعنی ایشیا نے ہماری حالیہ معلومات سے کہیں زیادہ تمدن عالم کو اس کے بیش بہا خزانوں سے مالا مال کیا ہوگا۔ درحقیقت اب اس کا احساس کیا جانے لگا ہے کہ یونانی اور رومی تمدن، جنہیں غلطی سے ذہن جدید کا ماخذ سمجھا جاتا تھا، ایشیائی تہذیب کی بنیادوں پر قائم ہوتے تھے۔ اور ایشیائی ذہن ہی کے مغربی مظہر تھے۔ گو کہ ایشیا کے قدیم تمدن کے متعلق ہمارا علم نامکمل ہے مگر پھر بھی اس قدر ضرور ہے کہ ہم اپنے ذہن میں اس کے عظیم الشان کارناموں کا ایک خاکہ کھینچ سکیں۔ اور انسانی تمدن و تہذیب میں جو اس کا زبردست حصّہ ہے اس کا اندازہ لگا سکیں۔

یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ دنیا کے چار بڑے مذاہب نے یعنی بدھ مت، ہندومت، عیسائیت اور اسلام نے ایشیا میں ہی جنم لیا۔ ان کی قوت اور افادیت کا اندازہ ہزار ہا برس گذرنے کے بعد بھی ان کروڑوں افراد کو دیکھکر کیا جا سکتا ہے جن کی زندگی ان کے نظریات کے مطابق اور ان کے احکام کے تابع ہے، ایسی مثال یورپ کی تاریخ میں ایک بھی نہیں ملتی۔ ان مذاہب کے ذریعے ایشیا نے نوع انسان کو اس کی تاریخ کے تاریک ترین ادوار میں بھی امید ورجا اور تسلی وتسکین کا پیغام دیا۔ مذہب کے نقائص خواہ کچھ ہی ہوں اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُس نے انسانی کردار کو معتد بہ طور پر بلند و برتر کیا۔ سماجی نظام کو بہت تقویت پہونچائی۔ اور شر کی قوتوں کو انسان پر غلبہ پانے سے روکا۔ مذہب ہی نے انسان کے دل ودماغ کے بعض بہترین واعلیٰ ترین خواص کو اجاگر کیا اور بیشمار افراد میں بے لوث خدمت وایثار اور انسانی کے جذبات کو بیدار کیا۔

مذہب کے جلو میں فلسفہ، شاعری اور اخلاقیات [illegible] گوتم بدھ، کنفیوشس اور دوسرے [illegible] شامل ہیں۔ [illegible]

ہمدردی اور اخلاقی شعور، ان سب کی تخلیق اور نشوونما یونان اور روم سے پہلے ہو چکی تھی۔

اقتصادی تنظیم میں ایشیا کا حصہ اتنا ہی معتد بہ ہے جتنا کہ سیاسیات میں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا اور اہم کام زرعی ضرورتوں کے لئے ہل اور دھن کا استعمال ہے۔ مصر اور سمریا میں سب سے پہلے ہل اور بیلوں کے ذریعے کاشت کی گئی اور زراعت کو مزید تقویت اس وقت پہونچی جب سمیریوں نے ۴۰۰۰ سال ق۔م میں اپنے مشہور و معروف آبپاشی کے سسٹم کی داغ بیل رکھی۔ قدیم ترین پہیوں کی گاڑی بھی سمیریا میں بمقام کش دستیاب ہوئی ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بری حمل و نقل کا طریقہ وہیں سے شروع ہوا۔ آبی حمل و نقل سے بھی وہ لوگ آشنا تھے۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دریائے سندھ کا تمدن ممکن ہے مصر و عراق کے تمدنوں سے بھی قدیم تر ہو اور وہیں یہ چیزیں پہلے ایجاد ہوئی ہوں۔ تاریخ کی موجودہ معلومات ہمیں کوئی قطعی بات کہنے کی اجازت نہیں دیتیں۔

سمیریا ہی نے سونے اور چاندی کو معیار قدر کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا۔ معاہدہ کا طریقہ ایجاد کیا اور قرض و ہنڈی کے طریق کی تاسیس کی۔ انسانی سماج کی اقتصادی زندگی کی تشکیل اور ارتقا میں ان تینوں عناصر کی اہمیت عظیم ترین ہے۔ حقیقت میں جدید اقتصادی نظام بہت کچھ انہی بنیادوں پر قائم ہے۔ اس کے بعد بابل کا دور شروع ہوتا ہے جس نے یورپ کو یونانیوں کے ذریعے ناپنے اور تولنے کے پیمانوں سے آشنا کیا۔ اور مالیات کے سسٹم کو ترقی دی۔ سرکاری سکہ سازی کی قدیم ترین مثال اسیریا میں (۷۰۰ ق۔م) ملتی ہے۔ ۵۶۰ ق۔م میں لیڈیا کے بادشاہ کروسس نے نہایت اعلیٰ درجے کے سکوں کو ڈھلوایا اور ان پر لکھی ہوئی قدر کی سرکاری ضمانت دی۔ قومی کرنسی کا یہ پہلا باقاعدہ نظام تھا۔

رائج الوقت سکوں میں دھات کے تناسب کا طریقہ فارس کے بادشاہ دارا کا ایجاد کردہ ہے۔ فارس نے بڑی بڑی سڑکوں اور پلوں کو بنا کر رسل و رسائل اور حمل و نقل کو معتد بہ ترقی دی۔ ہندوستان کی عظمت کا صحیح اندازہ اس وقت کیا جاسکے گا جبکہ سندھ کی تہذیب کے متعلق ہماری معلومات مکمل ہو جائیں گی۔ موہن جودارو میں جو سکے ملے ہیں دنیا کے قدیم ترین تصور کئے جاتے ہیں۔ یہ امر قرین قیاس ہے کہ مغربی ہند اور جنوبی فارس کے انکشافات تمدن کی قدامت کے متعلق بہت سے نظریات [illegible] اداروں کی تحقیق، طریق ہائے بود و باش اور تنظیم

کے بہت سے تصورات میں ترمیم و تنسیخ کا باعث ہوں گے۔

عہد موریا اور اس سے پیشتر کے زمانے کے قدیم ہندوستانیوں نے تجارتی اخلاق کا معیار بہت بلند کر دیا تھا۔ ہندوستانیوں نے سب سے پہلے سونے کی کان کنی کی، روئی کی کاشت ہندوستان میں ہر جگہ سے قبل شروع ہوئی۔ اس جنس نے نہ صرف پارچہ بافی کی صنعت میں نمایاں تبدیلیاں کیں بلکہ خود جدید صنعتی زندگی اس سے بہت متاثر ہوئی۔ ہند صنعت و حرفت کی تمام شاخوں میں سارے ایشیا کا راہبر تھا۔ لکڑی کا کام، ہاتھی دانت کا کام، دھاتوں کی صنعت، رنگ سازی، فن و بافت صابن سازی، گلاس سازی، بارود سازی، آتشبازی، سمنٹ سازی وغیرہ سب صنعتیں یہاں فروغ پر تھیں۔ اس کی مصنوعہ اشیاء کو ہر جگہ پسند کیا جاتا تھا۔ صرف روم پونے دو کروڑ روپے کی مالیت کی اشیا ہندوستان سے درآمد کرتا تھا۔ یہاں کے سامان کی مانگ افریقہ، جنوبی ایشیا اور چین تک میں کافی تھی۔

اٹھارھویں صدی سے قبل چین کی صنعت اپنے اوج پر تھی۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ملک اس کا مقابلہ کر سکتا ہو۔ وہاں کی ریشم کی صنعت آج سے تین ہزار سال قبل بھی ترقی یافتہ تھی۔ وہیں سے یورپ والوں نے ۵۵۰ء میں ریشم کے کیڑوں کے پالنے کا طریقہ معلوم کیا۔ مختلف پیشوں کی تنظیم ہندوستان کی طرح سے برادریوں (   ) میں کی جاتی تھی۔ صنعتی نظام میں ان برادریوں کو سوراج حاصل تھا۔ وہ اپنے قوانین کی تدوین خود کرتیں اور اپنی ذمہ داری پر انہیں نافذ کرتیں۔ تاجروں عمال کے درمیان مابہ النزاع مسائل کا فیصلہ ثالثی بورڈوں کے ذریعے ہوتا جو فریقین کے مساوی نمائندوں پر مشتمل ہوتے۔

وثیقہ ہائے قرض کا استعمال چین میں نویں صدی کے اوائل میں شروع ہوا اور دسویں صدی کے اواخر میں اس نے ترقی کر کے قومی زر کاغذی کی شکل اختیار کی۔ یہ نوٹ بلاک کی چھپائی کے طریقے سے بنائے جاتے تھے۔ ایرانیوں نے زر کاغذی کا طریقہ چین سے حاصل کیا اور تیرھویں صدی میں اپنے ہاں رائج کیا۔ یورپ میں زر کاغذی سترویں صدی کے وسط تک استعمال نہ ہوا تھا۔ چینی ان لوگوں میں سے تھے جنہیں سب سے پہلے بارود کا استعمال معلوم تھا۔ بارود اور قطب نما نے (جو بارھویں صدی سے قبل چین میں ایجاد ہوا) فن جنگ، سیاسیات، انکشافات، تجارت اور خود تہذیب کی رفتار کو متاثر کیا۔

اسی طرح ایندھن کے لئے کوئلے کا انکشاف اپنے نتائج میں دور رس ثابت ہوا۔ دوسری قبل مسیح میں چینی کان کنی [illegible]

اور اینڈھن کے لئے استعمال کرتے تھے۔ گو کہ مصر کے لوگ کاغذ اور سیاہی بنا سکتے تھے۔ مگر چینیوں نے ۱۰۵ء میں سستے اور ہلکے کاغذ چھالوں، چیتھڑوں اور سن سے بنانے کا طریقہ ایجاد کیا۔ انہوں نے اس فن کو تکمیل کو پہونچایا۔ عربوں نے ان سے آٹھویں صدی میں یہ فن حاصل کیا اور انہی کے ذریعے تیرھویں صدی میں وہ یورپ پہونچا۔ اس سے بھی زیادہ اہم فن طباعت کی ایجاد ہے۔ جدید تمدن میں جو انقلاب اس کے رواج سے ہوا اسکی صراحت کی یہاں ضرورت نہیں۔ اس فن کی تاسیس چین میں چھٹی صدی سے قبل ہوئی جبکہ پتھر کے ذریعے سے چھپائی ہوتی تھی، چھٹی صدی میں اس مقصد کیلئے لکڑی سے کام لیا جانے لگا۔

سیاسی فکر و تنظیم میں ایشیا کے حصہ کی طرف تاریخ کے محققین نے نسبتاً کم توجہ کی ہے اور اس کا صحیح اندازہ لگانے میں وہ قاصر رہے۔ قدیم ایشیائی تمدنوں کے متعلق بالعموم اور چینی تمدن کے بارے میں بالخصوص جدید تحقیقات نے اس نظریہ کو بہت تقویت پہونچائی ہے کہ ایشیا کی سیاسی فکر و ادارت نشو و ارتقا کے اعلیٰ منازل طے کر چکے تھے۔ یورپ کے فلسفۂ سیاست کی بنیاد بھی ایشیائی فکر پر استوار ہوئی۔ حقیقت میں افلاطون کے زمانے سے روسو کے دور تک شاید ہی کوئی بات ایسی کہی گئی ہو جس سے ایشیائی مفکرین لاعلم تھے۔ کنبہ اور گاؤں سے زبردست سلطنتوں تک شاید ہی کوئی ادارہ ایسا ہو جس پر ایشیا والوں نے تجربہ نہ کیا ہو۔ سمیریا کی تہذیب نے جو ۲۵۰۰ ق۔م میں بھی قدیم سمجھی جاتی تھی، دُنیا میں سب سے پہلے مجموعۂ قوانین کی تدوین کی اور قدیم ترین ریاستوں اور سلطنتوں کی بُنیاد رکھی۔ بابل نے اس جانب ایک اور لانبا قدم بڑھایا اور مشہور و معروف "عظیم مجموعۂ قوانین" کی تدوین کی۔ یہ وہ زمانہ ہے جو سولن اور قوانین روم سے صدیوں قبل کا ہے۔ ہمورابی ۲۰۸۴ء سے ۲۱۲۳ء ق۔م میں اپنے مجموعے کے دیباچے میں اس کا اعلان کرتا ہے کہ حکومت کا مقصد "طاقت ور کو کمزور پر جبر و ظلم کرنے سے باز رکھنا، ملک کو بیدار کرنا اور لوگوں کی فلاح و بہبود میں اضافہ کرنا ہے"۔

مقامی اور صوبائی حکومت کا طریقہ اسیریا والوں کا ایجاد کردہ ہے یہاں سے وہ فارس میں رائج ہوا اور بعد کو مقدونیہ اور روم پہونچا۔ قدیم فارس نے آنے والی نسلوں کے سامنے ایک بے مثال شہنشاہی نظام پیش کیا ہے جس کی ہمہ گیر صلاحیتوں کا کوئی محقق منکر نہیں ہے۔ بادشاہ اور اس کے مشیروں کی مجلس، سات ججوں پر مشتمل عدالت عالیہ، مقامی عدالتیں، وکلا جنہیں "خطیب قانون" کہا جاتا تھا ایک مستحکم صوبائی نظم و نسق اور سول سروس۔ یہ وہ ادارات ہیں جو ایرانیوں نے مقدونیوں اور رومیوں کو دئے۔ حکومت کو رواداری کا بھی کامل احساس تھا وہ اپنی متنوع رعایا کے مذہب، اخلاق، قوانین، رسم و رواج، زبان یہاں تک کہ زر رائج تک کا تحفظ کرتی تھی۔ فارس کی شہنشاہی حکومت کو بہت سی محکوم قومیں اپنی قومی حکومت سے زیادہ پسند کرتی تھیں۔

سمیریا۔ بابل و اسیریا کا نظام ریاست، ریاست کے مقابلہ میں فرد کے حقوق کا تحفظ نہ کر سکا تھا۔ اُن کے نظریۂ ریاست میں یہ چیز شامل نہ تھی مگر فلسطین نے اس سلسلے میں ایک راہ نکالی جبکہ مقتدر اور امیر لوگوں کی سنگدلی کے خلاف وہاں کے پیشوایانِ مذہب نے آواز بلند کی۔ عوام میں اس کا احساس ایسا شدید پیدا ہو گیا کہ وہ اشتراکیت کی طرف راغب ہو گئے۔ شعور عمرانی یہاں ایک خاص ہیئت اختیار کرتا ہے اور وہ ایک ایسے نظام کا متلاشی ہوتا ہے جہاں افلاس اور جنگ، امن و اخوت انسان کی بیخ کنی نہ کر سکیں۔

نظامِ سیاست میں ہندوستان کا حصہ بھی کسی طرح کم نہیں ہے۔ یہاں کے ادارات میں مقامی و بلدی حکومت کا طریق ایسا ترقی یافتہ تھا کہ نہ صرف قدیم یونانی مورخین نے اس پر تعجب کا اظہار کیا ہے بلکہ جدید تاریخ داں جیسے اسمتھ بھی یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ یونان کی شہری ریاستیں بھی اس سے بہتر طور پر منظم نہ تھیں۔ مرکز میں امپیریل حکومت اور شہروں اور دیہاتوں میں مقامی حکومتوں کا نظام مکمل، منظم اور مستحکم تھا۔ اصول رواداری جو ایرانیوں نے سیاسی مصلحت کی بنا پر اختیار کیا تھا ہندوستانی بادشاہوں اور بالخصوص اشوک کے سیاسی مسلک کا روح رواں تھا۔ برہمنوں کی ذات میں ہندوستان نے نسل و ثقافت پر مبنی ایک ایسے اشرافیے کی تشکیل کی ہے جو بغیر دولت یا فوجی و سیاسی اقتدار کی مدد کے تاریخ کا سب سے دیرپا اشرافیہ ثابت ہوا ہے۔

فکر سیاسی میں چین کا حصہ دوسرے تمام ایشیائی ممالک سے بڑھا ہوا ہے۔ زندہ تہذیبوں کی اس "قدیم ترین و اعلیٰ ترین تہذیب" نے عملی و سیاسی اخلاقیات پر دوسری تمام قوموں سے زیادہ وسیع و گہری نظر ڈالی ہے اور غور و فکر کی ہے، اُس نے ایک ایسے طرزِ حکومت، سماجی نظام اور معاشری اخلاقیات کی تشکیل کی جو تاریخ عالم میں سب سے زیادہ دیرپا ثابت ہوئے۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ انسان کی کوئی صنعت بھی کامل نہیں ہوتی، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چین نے ایک ایسی مثالی ریاست کی نشو و ارتقا کی جس میں جمہوریت و اشرافیت [illegible] کے اوصاف بڑی خوبی سے سموئے گئے تھے جس میں حکومت [illegible] کرتی تھی اور جس میں ہر فرد کو [illegible]

نقد و تبصرہ

خار وگل۔ ایم۔ اسلم کے متعلق یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ دورِ حاضر کے سب سے بڑے مصنف ہیں۔ کم وبیش آٹھ ہزار صفحات اُن کی جنبشِ قلم کے مرہونِ منت ہیں۔ یوں تو ہر صنفِ ادب اِن سے فیضیاب ہوئی ہے لیکن مزاح اور افسانے پر ان کے ناقابلِ فراموش احسانات ہیں۔ کچھ عرصے سے ان کی تمامتر توجہ افسانہ نگاری ہی کی طرف ہے۔ ہر سال متعدد افسانے مُلک کے مشہور رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس مہینے اُن کے سولہ افسانوں کا مجموعہ "خار وگل" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ مجموعہ اِس لحاظ سے سابقہ مجموعوں پر فوقیت رکھتا ہے کہ سب افسانے ایک خاص پیچیدہ سوال کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ "زندگی واقعات سے بنتی ہے یا واقعی تخلیقِ آدم سے ہم زندگی کے فریب میں مُبتلا ہیں؟" پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "اگر زندگی کی تشکیل واقعات پر مُنحصر ہے تو پھر اِن واقعات کے خوشگوار یا تلخ ہونے کا ذمہ دار کون ہے؟" یہ گویا تقدیر و تدبیر کا مسئلہ ہے جسے اُردو کے ایک بہت بڑے اور کہنہ مشق افسانہ نگار نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ اسلم صاحب نے اپنے دلکش طرزِ بیان میں یہ سولہ افسانے لکھے ہیں۔ ان میں ایک مخلص حقیقت نگار کی طرح اپنے کرداروں کے وقائعِ حیات پیش کئے ہیں اور خود اپنی طرف سے کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا ہے بلکہ پڑھنے والوں پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ خود پیش کردہ واقعات کی روشنی میں فیصلہ کرلیں۔ یہ کتاب "بانگِ درا" سائز پر شائع ہوئی ہے اور اس کی ضخامت (٣٥٠) صفحات ہے۔ کتاب مجلّد ہے۔ جلد پوش کا ڈیزائین مشہور مصوّر عبدالرحمٰن چغتائی نے بنایا ہے۔ عمدہ افسانوں کے شائقین کے لئے "خار وگل" کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ غالباً تین روپے ہوگی؛ ملنے کا پتہ:۔ اُردو اکیڈیمی۔ لوہاری دروازہ۔ لاہور۔

"ش"

ماورا۔ مسٹر ن۔ م۔ راشد اپنی آزاد شاعری کی وجہ سے اتنے مشہور ہیں کہ ان کے تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔ حال ہی میں اُن کی منتخب نظموں کا مجموعہ مکتبۂ اُردو۔ لاہور سے "ماورا" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ مصنف کی نظموں سے ہماری شاعری میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا ہے۔ [illegible] ان کی مقبولیت اسی سے ظاہر ہے کہ مقلد اور نقال روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ راشد نے پہلے عام روش سے انحراف کیا اور بغاوت کر دی۔ دس بارہ سال کا عرصہ ہوا کہ راشد نے اپنی ابتدائی نظمیں پیش کیں۔ ان نظموں میں بحر و قافیہ کی پابندی کی ہے لیکن خیالات و تاثرات ہماری روایتی شاعری سے یکسر جداگانہ ہیں۔ جیسے جیسے ان کے کلام میں پختگی آتی گئی ہے قافیہ کی پابندی اتنی ہی کم ہوتی گئی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو الفاظ وہ کسی خیال کی ادائیگی میں صرف کرتے ہیں۔ اتنے مترنم ہوتے ہیں کہ قافیہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تاہم ان کی جدید نظموں میں بھی قافیہ کا ترنم معدوم نہیں ہے۔ بحر کے ارکان میں بھی تاثر کی مناسبت سے کمی بیشی کی گئی ہے اور اس طرح نظم کا مجموعی اثر بجائے کم ہونے کے کچھ زیادہ ہی ہوگیا ہے۔

راشد کی شاعری نئے موضوعات نفسی تحلیل، اچھوتے خیالات، نادر تشبیہیں اور نئے نئے الفاظ کا ایک دلکش مجموعہ ہے۔ راشد صحیح معنوں میں شباب و رومان کا شاعر ہے۔ اسکی ہر نظم جوانی کی ترنگ اور محبت کی اُمنگ کا سوگ ہے ـــ حسین و مؤثر۔

اس مجموعے میں ٣٧ نظمیں شامل ہیں۔ ابتدا میں مسٹر کرشن چندر کا بصیرت افروز تعارف اور خود راشد کا دیباچہ شامل ہے۔ راشد کی نظموں سے پوری طرح لُطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ان کا مطالعہ کرلیا جائے۔ کتاب بہت عمدہ چھپی ہے۔ مجلّد ہے اور جلد پوش کا ڈیزائین مشہور مصوّر عبدالرحمٰن چغتائی نے بنایا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ غالباً عہ ہوگی۔

"ش"

ہوائی قلعے۔ مسٹر کرشن چندر ایم۔ اے؛ اُردو کے صفِ اوّل کے افسانہ نگار ہیں۔ افسانوں کے علاوہ انہوں نے تنقیدی مضامین، ڈرامے اور ادبی مضامین (Essays) بھی لکھے ہیں۔ "ہوائی قلعے" ان کے بیس ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین میں ظرافت و طنز کا رنگ گہرا ہے اور افسانوی عنصر بھی نمایاں ہے۔ یعنی سادہ پُرکار طرزِ بیان ان مضامین کی جان ہے۔ امریکہ کے مشہور ظرافت نگار اسٹیفن لیکاک نے اس خصوص میں بہت شہرت حاصل کی لیکن کرشن چندر ان مضامین میں لیکاک سے بہت آگے نکل گئے [illegible] اس بات کا ثبوت ہے کہ [illegible]

والوں سے بہتر لیکن ناقدری نے انہیں گدڑی کا لال بنا رکھا ہے۔ جن حضرات کو جدت و ظرافت، نفسیاتی مطالعہ اور اچھوتے طرز بیان کو یکجا دیکھنا ہو "ہوائی قلعے" اُن کے لئے ایک نادر تحفہ ہے۔ ضخامت ۲۵۶ صفحات۔ مجلد۔ رنگین دلکش جلد پوش۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ۔ اُردو بک سٹال۔ لاہور۔

"ش ب"

حیاتِ میر مومن۔

مولف ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ۔ قیمت ۵؎۔ ناشر ادارہ ادبیات۔ حیدرآباد دکن۔

یہ سلطنت قطب شاہیہ کے مشہور اور نامور وزیر میر محمد مومن کی سوانح عمری ہے ڈاکٹر زور [illegible] صاحب کے حالات زندگی کافی تلاش اور تفحص سے جمع کئے ہیں [illegible] ان کے رفاہی، علمی اور سیاسی کارناموں پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ کتاب دلچسپ پُر از معلومات ہے۔ ہندوستان کی اسلامی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔ حجم ۲۱۲ (مع تصاویر) مجلد۔

"م۔م"

ادبی تاثرات:

مرتبہ مرزا قدرت اللہ بیگ۔ ناشر ادارہ ادبیات۔ حیدرآباد۔ دکن۔ قیمت عہ

ڈاکٹر زورؔ کے کچھ مقدمے اور چند تبصرے جو انہوں نے اُردو کی بعض کتابوں پر لکھے تھے، اس مجموعے میں شائع کئے گئے ہیں۔ اس سے غالباً ڈاکٹر زور کے طرز نگارش اور طریقہ تفحص پر روشنی ڈالنی مقصود ہے اور اس میں مرتب صاحب کو یقیناً کامیابی ہوئی ہے ـــــ سائز چھوٹا کتابی۔ حجم ۱۴۴ صفحات۔ مجلد۔

"م۔م"

خطابیات

مولف شیخ رحیم الدین کمال آبادی۔ ناشر ادارہ ادبیات۔ حیدرآباد دکن۔ قیمت ۱۲؎

شیخ رحیم الدین صاحب نے اس مختصر سی کتاب میں فن خطابت پر گفتگو کی ہے اور ہندوستان کے چند مشہور مقررین کے طرز خطابت پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ موضوع کی اہمیت کے لحاظ سے یہ کتاب بہت ہی مختصر ہے۔ ضرورت ہے کہ اس فن پر جامعیت کے ساتھ قلم اُٹھایا جائے۔ ہمیں توقع ہے کہ ادارہ ادبیات اردو اس ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کریگا۔ سائز چھوٹا۔ حجم ۱۱۲ صفحات۔ غیر مجلد۔

"م۔م"

بلقان

صدیقی۔ بی۔ اے۔ ایس سی۔ ناشر ادارہ ادبیات اُردو۔ حیدرآباد۔ دکن۔ قیمت ۳؎۔

ادارہ ادبیات نے عام معلومات کے سلسلے میں یہ چھوٹا سا پمفلٹ شائع کیا ہے۔ [illegible] ریاستہائے بلقان، اُن کی جائے وقوع اور اُن کی سیاسی اور معاشی حالت [illegible] عام معلومات کو بڑھانے کیلئے اچھی چیز ہے۔

سالنامہ ساقی جنوری سنہ ۴۲ء

ساقی بارہ سال سے جاری ہے اور ہر سال جنوری میں اس کا سالنامہ بڑی آب و تاب سے شائع ہوتا ہے۔ اس سال بھی سامانِ طباعت اور کاغذ کی گرانی کے باوجود اس کا شاندار سالنامہ شائع ہونیوالا ہے۔ مستقل خریداروں سے اس سالنامہ کی قیمت علیحدہ نہیں لی جاتی۔ ریلوے اسٹیشنوں یا شہر کے اخبار فروشوں سے عہ میں خریدا جاسکیگا۔

مندرجہ ذیل حضرات کے مضامین موصول ہوچکے ہیں

مولانا عنایت اللہ دہلوی؛ ایم۔ اسلم؛ ماہر القادری؛ دیوندر ستیارتھی؛ عصمت چغتائی؛ احمد ندیم قاسمی؛ بھارت چند کھنہ؛ ظفر قریشی دہلوی؛ پرتھوی ناتھ شرما؛ انصار ناصری دہلوی؛ اوپندر ناتھ اشک؛ سعادت حسن منٹو؛ سندباد جہازی؛ سید رفیق حسین؛

مندرجہ ذیل حضرات کے مضامین موصول ہونیکی اُمید ہے۔

حضرت خواجہ حسن نظامی؛ کرشن چندر ایم۔ اے؛ حجاب امتیاز علی؛ صادق الخیری؛ پروفیسر محمد مسلم؛ راجندر سنگھ بیدی؛ عندلیب شادانی؛ ممتاز مفتی؛ انور مختار؛ شمشیر سنگھ نرولا؛ محمد حسن عسکری۔ اشرف صبوحی؛ چراغ حسن حسرت؛ شیر محمد اختر؛ محمد احمد سبزواری؛ اختر الایمان؛

مندرجہ ذیل شعرا کا کلام شامل ہوگا۔

امین حزیں، آزاد انصاری؛ جوش ملیح آبادی۔ شاد عارفی؛ سید علی منظور؛ کوکب شاہجہان پوری؛ فرحت کانپوری؛ ن۔ م۔ راشد؛ نہال سیوہاروی؛ تابش دہلوی؛ قیوم نظر؛ صفیہ شمیم؛ سحر [illegible]؛ مخمور جالندھری؛ تپش؛ الطاف مشہدی؛

تار کا پتہ - حنا - لکھنؤ   ٹیلیفون نمبر ۱۳۹

گذارشِ احوالِ واقعی

جو حضرات مدت دراز سے کارخانہ کی تیار کردہ اشیا استعمال کر رہے ہیں اُن سے مخفی نہیں کہ کارخانہ نے ۱۸۳۹ء سے ابتک سو سال سے زیادہ زمانہ میں اُن کے سامنے ہمیشہ خالص چیز پیش کی۔ زمانہ کی رفتار کے موافق جن لوگوں سے ہمارے کارخانہ کی روز افزوں ترقی نہ دیکھی گئی انہوں نے کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے اور کارخانہ کی تیار کردہ اشیا کے متعلق بھی بے بنیاد باتیں ملک میں صرف اس لئے پھیلائیں تاکہ وہ اپنی تیار کردہ اُن اشیا سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں کلام ہے۔ اگرچہ وہ اشیا خوشبو وغیرہ کے لحاظ سے بوجہ انگریزی عطروں کی آمیزش ہونے کے ہمارے تیار کردہ مال سے بہتر معلوم ہوتی ہیں، اور قیمت میں بھی ارزاں ہیں، مگر استعمال کے بعد آپ کو پتہ چلتا ہے کہ آپکو دھوکا دیا گیا۔ علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ بعض وقت اس قسم کی آمیزش صحت کے لئے مضرت رساں ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے اپنے اُن خریداروں سے خصوصاً جو کارخانہ کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں۔ اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے۔ اور یقین کیجئے کہ خالص سودیشی عطریات روغنیات وتمباکو وغیرہ منگانے کے لئے آپ کو اپنے قدیم کارخانہ کو مندرجہ ذیل پتہ کے ساتھ یاد رکھنا چاہیئے۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر حنا بلڈنگ لکھنؤ۔

Regd. L. No. 2627

Printed at the Mahbob-ul-mataba Press, Delhi and published by
Shahid Ahmad B. A. (Hons) from the office of the "SAQI" Delhi